كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ

اَخْبَارُ الاَنْدُلُسْ

یعنی

جناب س پ سکاٹ کی مستغنی عن الصفات

ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ

کی

جلد اوّل

کا

اردو ترجمہ

مترجم

(منشی) محمد خلیل الرحمٰن صاحب

سپرنٹنڈنٹ دفتر ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور

(مترجم نفح الطیب و مولدین و تاریخ الخلفاء وغیرہ)

سنہ ۱۳۴۰ ہجری

میں

متصدق الرحمٰن ایم اے نے بصیر کا [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا

تقریب

خدا کے فضل و کرم سے اُردو زبان کے لئے وہ مبارک زمانہ آگیا ہے کہ اُس میں نہایت مفید کتابوں کے ترجمے ہورہے ہیں۔ ایک طرف تو حضور پرنور اعلےٰ حضرت قدر قدرت آصف جاہ سابع فرمان فرماء سلطنت عالیہ حیدرآباد خلد اللہ ملکہ و شمتہ کا زرین کارنامہ یعنی کلیۂ جامعۂ عثمانیہ اپنے شعبۂ تالیف و تراجم کے ذریعہ سے فلسفہ، ہئیت، ریاضی، سائنس، منطق، تاریخ و جغرافیہ غرض کہ جملہ علوم و فنون کے بہترین جواہرات عربی، فارسی اور انگریزی کے علمی خزانوں سے لیکر اُردو زبان کی زیب و زینت بڑھا رہا ہے، دوسری طرف بیروں ممالکِ محروسۂ سرکار آصفیہ علم دوست حضرات، اپنے ذاتی شوق سے مختلف زبانوں کی بہترین کتابیں اُردو میں ترجمہ کرکے ہماری زبان کو بھی دنیا کی بہترین زبانوں کے ہم پلہ و ہم رتبہ بنانے میں جان و دل سے کوشاں ہیں۔ ان ہی شائقین علم میں ایک ہمارے کرم فرما مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب ہیں، جن کی خدماتِ علمی نے اس ملک میں اُن کو بخوبی روشناس کرادیا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہمارے مکرم دوست نے دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے لئے علامۂ مقری کی تاریخ "نفح الطیب" کے تاریخی حصّوں کا اُردو میں ترجمہ کرکے ایک ایسی ضرورت کو رفع کیا ہے، جو طلبۂ تاریخ اندلس کو برسوں سے محسوس ہورہی تھی، اور اب مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ شائقین علم سے اپنے مکرم دوست کا تعارف اس تقریب سے کراؤں کہ آپ مسٹر سکاٹ امریکانی کی کتاب "ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ" کے لائق ترجمہ ہیں۔

مسٹر سکاٹ کی اس کتاب کا موضوع فریدا ور مقصود وحید یہ ہے کہ اس قوم کے تاریخی و تمدنی و اخلاقی حالات سے لوگوں کو آگاہ کریں جو یورپ میں سب سے پہلی قاسم تہذیب موجود

علوم وفنون کی بانی اور محرک تھی۔ اس کتاب کے لکھنے میں مسٹر سکاٹ نے تمام عربی و یورپین ماخذوں سے مدد لی ہے جن کی تعداد سات سو سے متجاوز ہے، اور غالباً انگریزی میں مائہ حال کی یہ سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو لکھتے وقت مسٹر اسکاٹ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی صاف گوئی، اور صحیح وقائع نگاری میں وہ یورپ و امریکہ کے لومتہ لائم سے نہ ڈرینگے۔ غالباً اُن کو یہ خیال بھی تھا کہ اگر کوئی مسلمان بھی اُنکی تصنیف کو پڑھے تو وہ اُس کو اپنے خط وخال کا آئینہ ہی سمجھ کر وقف خود نمائی نہ ہو جائے، بلکہ اس کو بھی دیکھ لے کہ اُس میں کیا کیا نقص و معایب تھے کہ جنہوں نے اُس کو عالم بالا سے تحت الثریٰ میں پٹک دیا۔ اسی لیئے اُن کی یہ کتاب اور اُس کا اُردو ترجمہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ قابل قدر ہو جاتا ہے۔ جب اس کو خیال کیا جائے کہ مصنف نے اس کتاب کے لکھنے میں اپنی زندگی کے بیس برس صرف کئے ہیں تو اُن کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے مکرم مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب نے بھی اپنا جس قدر بیش بہا وقت اُس کے ترجمہ میں صرف کیا ہے، اور محنت شاقہ اُٹھائی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ تقریباً ڈھائی ہزار انگریزی صفحوں کا نہایت فصیح و بلیغ اردو میں ترجمہ کرنا، اور پھر تعلیقات اضافہ کر کے اُن میں مزید جغرافی و تاریخی معلومات درج کرنے، جو طلبہ کے حق میں نہایت مفید اور عوام کے لئے بے انتہا قابل قدر ہوں، کچھ آسان کام نہ تھا۔ اگر دنیا کو مسٹر سکاٹ کا ممنون ہونا چاہیئے تو ہندوستان کو جناب مترجم جیسے جفاکش اور علم دوست بزرگوں کا ہمیشہ شکر گذار رہنا چاہیئے۔

ترجموں کی ضرورت اور اہمیت اس سے ثابت ہے کہ دنیا میں بہت کم قوموں کا ادب ایسا ہے جس نے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے نفع نہ اُٹھایا ہو۔ تقریباً ہر زبان و ملک کے علم ادب کے مدارج ترقی میں ایک زمانہ ترجموں کا آتا ہے، بالخصوص ایسے علوم وفنون کے ترجموں کا جو اُس زبان میں پہلے سے موجود نہ ہوں یا ناکافی ہوں۔ پھر جب ترجموں سے ضروری علوم مہیا ہو جاتے ہیں، تو خود اُسی زبان میں تالیف و تصنیف کا زمانہ آتا ہے لیکن

بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ گو اُن کے ترجموں سے اپنی زبان کا سرمایہ بہت بڑھ جاتا
ہے، مگر جب تک خود اسی زبان میں تالیف و تصنیف نہ کی جائے کبھی نہ تشفی ہو سکتی ہے نہ
ترقی۔ ایسے مضامین میں مسلمانوں کے لئے خاص کر تاریخ ہے کہ پہلے بذریعہ ترجمہ عربی میں
آئی اور بعد میں اہل عرب نے اپنے اس متبنّیٰ کی اس طرح نشوونما اور تربیت کی کہ چند ہی روز
میں وہ نامِ خدا ایسی جوان ہوئی کہ دُنیا اُس کو دیکھتی ہے اور حیران ہوتی ہے۔ یوں تو واقعات
ماضی سے واقف ہونے کا شوق خواہ وہ اپنے ہوں یا پرائے، انسان کا ایک طبعی جذبہ ہے
جس کی وجہ یہ ہی ہو سکتی ہے کہ بنی آدم سب ایک ہیں اور گو زمانہ حال و مستقبل پر ہمارا قابو نہ ہو
لیکن عہد ماضی کے واقعات، جو گذر گئے ہیں، اپنے ہو چکے ہیں، اور جو چیز اپنی ہو چکی ہو اُس کا
علم حاصل کرنا خواہ کسی ذریعہ سے ہو گویا اپنے حق کو پہنچنا ہے۔ اس خیال کے صحیح ہونے میں
کلام نہیں۔ تقریباً ہر شخص کو اپنوں یا دوسروں کے حالات سے آگاہ ہونے کا، خواہ وہ حالات
کسی کی زبانی سنے جائیں، شوق ہوتا ہے لیکن جس پر بیتی ہو جیسے وہ اپنی کہانی، اصلیت سچائی
اور جوش کے ساتھ سنا سکتا ہے دوسرا نہیں سنا سکتا، بالخصوص جب کہ اپنوں اور دوسروں
میں حریفانہ تعلقات رہے ہوں۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جب مبصران یورپ اسلامی تاریخ
کو اپنی جدت طرازی کی محک پر رگڑتے ہیں تو اس سے وہ جدت پیدا کر دیتے ہیں، جو بڑھ کر
تحقیر کا حکم رکھتی ہے، اور شدہ شدہ مسلمانوں کے لئے تپ دق بن جاتی ہے، جس کی تکلیف
برسوں دور نہیں ہو سکتی۔ تکلیف سے بچنا انسان کی خلقت میں ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ مؤرخین
یورپ کی کتابوں کے ترجمہ سے کچھ ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے، یوں ہماری تکلیف لاعلاج ہے۔
تاوقتیکہ اس میدان میں پہلے کی طرح ہمارے اہل الرائے مؤلف اور مصنف نہ پیدا ہوں،
اس کا متوقع ہونا کہ یہی یورپ کے اہل قلم عام طور پر اسلامی پہلو کو مدنظر رکھ کر ہمارے
احساسات کا اندازہ کر کے مسلمانوں کی تاریخ لکھیں، ایک امید لاحاصل، بلکہ گویا چھت کے ساتھ
دوسرے کا منہ تکنا ہے، کیونکہ ایشیا اور یورپ، اسلام اور مسیحیت کے درمیان ایک پردہ نہیں،

بلکہ بہت سی دیواریں حایل ہیں، مثلاً اختلافِ رنگ، اختلافِ ملک، اختلافِ مذہب، اختلاف اساسِ سیاسی، جو یوروپین مورخوں کو اس عمل پر مجبور کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے چہرہ کو بدنما کرکے دکھائیں، یہی اصول اُن کا "فنِ تاریخ" ہے۔ مذہب، رنگ اور ملک کا فرق تو ایک مجبوری ہے، لیکن یورپ کے اساسِ سیاسی ایسے زبردست ہیں کہ وہ کبھی ایشیائی طرز کی خودمختار حکومتوں کے ساتھ، جن کی سرگذشت ہماری تاریخ کا بڑا حصہ ہے، ایسا انصاف نہیں کرسکتے، جس کے ہم اپنی سادگی یا وفاداری کے باعث متوقع رہتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور چیز ہے جس نے یورپ کو مسلمانوں کا عدو الدینا دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یورپ واقعی یا ادعائی عیسائی ہے، جس وقت سے دنیا میں مسلمان پیدا ہوئے اُن کی تاریخ کا بڑا حصہ اُن ملکوں میں گزرا جو پہلے وحشی عیسائیوں کے قبضہ میں تھے، اب ہم نے اُنھیں لے کر مہذب و متمدن بنانا چاہا، عیسائیوں نے کہا کہ ہم آتش و شمشیر لئے پھرتے ہیں، ہم نے دعوے کیا، اور ثابت کرکے دکھلا دیا کہ ہم نور کے ذریعہ سے ظلمت کو مٹانے آئے ہیں، غرض یوں کچھ اوپر تیرہ صدیاں عیسائیوں اور مسلمانوں کی کشمکش میں گزرے۔ تقریباً چھ سو برس تک ہم بڑھے اور وہ گھٹے، پھر کچھ دنوں سکون رہ کر ہم گھٹنا شروع ہوئے اور وہ بڑھنے لگے، یہاں تک کہ وہ نوبت آئی جو آج ہر کس و ناکس پر روشن ہے۔ یہ کایا پلٹ صدیوں میں ہوئی، اس کے اسباب پر بحث کرنا ایک عمل طول ہے، مختصر طور سے اس کے بواعث کا سلسلہ علی الترتیب یوں ہے، دہشت، تعصب، مذہبی معاندت، جوشِ انتقام۔ یہ جذبات ابتدا میں تو بتدریج پیدا ہوئے لیکن صدیوں کی داشت و پرداخت سے یہ سب عیسائیوں (یا یورپ) کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں، اور اُن کا اظہار ہر ہر بات میں ہوتا رہتا ہے مثلاً یورپ کے مورخوں کی نظروں میں اندلس میں ہماری آٹھ سو برس کی رسمِ گذشت صرف اتنی ہے کہ "آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسپین کے عیسائیوں پر اُن کے گناہوں کے سبب خدا کا قہر مسلمانوں کی شکل میں نازل ہوا کہ دو تین برس کے عرصہ میں وہ عیسائیوں کے تقریباً کل ملک کے مالک بن گئے لیکن پھر اسی گنہگار اور کاہل عیسائی،

قوم سے ایک نسل، زیادہ چست اور ایمان والی، پیدا ہوئی جس نے یہ ثواب کا کام کیا کہ طرح طرح کے فتنہ وفساد اسلامی حکومت کے خلاف ملک میں برپا کر کے اس حکومت کے قواء کو مضمحل کرنا شروع کیا۔ اُس کے بعد اس سے بھی بڑھ کر ایمان والی اور ہوشیار نسلیں پیدا ہوتی گئیں، اور اُن کا بھی یہ ہی پاک شیوہ رہا، حتے کہ آٹھ سو برس کی مسلسل اور متواتر کوششوں کے بعد ۱۴۹۱ء میں ایک خدا پرست مسیحی پادشاہ، اور اُس سے بھی زیادہ خدا پرست اُس کی ملکہ نے اپنے ملک اور وطن کو مسلمانوں کی حکومت سے بالکل پاک کر دیا اور بس۔!" ان مورخوں کے نزدیک ہماری اندلسی سلطنت صرف اس لئے دُنیا میں ظاہر ہوئی تھی کہ اُس کے مٹانے میں عیسائیوں کی حریت اور وطن پرستی کے کارنامے مکمل ہوں۔ فاعتبروا یا اولوالابصار!

زیادہ تر یہی مقصد ہے جس کو پیش نظر رکھ کر یورپ کے مورخوں نے اہل عرب کی اندلسی حکومت پر کتابیں لکھی ہیں۔ ایسے مصنفوں سے ہم کو زیادہ بحث نہیں ہے البتہ اُن چند مورخوں سے جن کی نسبت اہل یورپ کہتے ہیں کہ انہوں نے "اسلامی پہلو" سے اندلس کی تاریخیں لکھی ہیں ہم کو زیادہ واسطہ ہے۔ میرے خیال میں لین پول اور سکاٹ کی تصنیفات اسی شمار میں ہیں اور اُن کے بہت سے حصّے ایسے ہیں کہ ایک مسلمان انہیں پڑھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کتابیں انصاف کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اس میں ہرگز شبہ نہیں کہ یہ مصنفین عربوں کے تمدن اور اُن کی ترقیوں کا حال (جو حکومت اندلس کے زمانہ میں اُن سے ظاہر ہوئیں) بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ مسٹر لین پول نے اپنی " ہسٹری آف دی مورز ان اسپین" میں مسلمانان اندلس کے کارنامے بعض مقامات پر اس قدر خوبی اور جوش سے لکھے ہیں کہ ایسے کہیں اور نظر سے نہیں گزرے۔ پھر بھی ان مصنفوں سے جیسی شکایتیں ہم کو ہوتی ہیں وہ اُن مورخوں سے نہیں ہوتیں جنہوں نے اندلس کی تاریخ انصاف یا اسلامی پہلو سے نہیں لکھی۔ یہ حق پسند بھی جب مسلمانوں کی تمدنی ترقیوں کے اسباب بیان کرتے ہیں تو فن تحقیق کی اُلجھنیں پیدا کر کے کچھ ایسے عالمانہ داؤں پیچ سے، ہر چیز میں غیروں کو مسلمانوں

کا ساجھی بنا دیتے ہیں کہ اُن ترقیوں میں خاص مسلمانوں کا حصہ ہماری آنکھوں کے سامنے بہت ہی کم آتا ہے۔ ہماری سلطنت اور حکومت کے حال میں ان انصاف پسند مصنفوں کے قلم میں بھی پورا زور وہیں آتا ہے جہاں عیسائیوں نے مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ جو لوگ ہمارے نزدیک باغی تھے، وہ اُن کے نزدیک محسن قوم تھے، جو ہمارے نزدیک لٹیرے اور قزاق تھے، وہ اُن کے نزدیک قوم کے نجات دہندہ تھے، جو ہمارے مذہب کو گالیاں دیتے تھے، وہ اُن کے نزدیک رحمت کے فرشتے تھے، جن کا نام ہم نے بغیر لعنت کے نہیں لیا، اُن کی تعریف میں اُنہوں نے قصائد لکھ مارے، غرض یورپ کا ہر نقاش چاہے اُس کا احسان ماننے کی دلیل ہم رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، جب ہمارے مرقع میں کہیں روشنی پیدا کرتا ہے، تو وہ صرف اتنی ہی ہوتی ہے کہ اُس تصویر کی تاریکیاں زیادہ واضح کر دے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ شکایتیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ تاریخ میں تین بڑی چیزیں ہیں، ایک واقعات، دوسرے واقعات سے اخذ نتائج، تیسرے واقعات اور تاریخ پر چند اخلاقی یا سیاسی قواعد کے مطابق رائے قائم کرنا۔ واقعات کا صحیح دریافت کرنا، اور اُن کو عمدہ اسلوب سے ترتیب دینا، وہ چیزیں ہیں جن کے لئے یورپ کے مورخوں کا ہم کو ہمیشہ احسان مند رہنا چاہئے۔ وہ واقعات کی چھان بین میں اس قدر محنت اُٹھاتے ہیں، اور اس قدر عمدہ ترتیب سے اُن کو بیان کرتے ہیں، کہ جو مطالب عربی تاریخوں کے ترجموں سے سمجھ میں نہیں آتے، وہ انگریزی تحریروں سے سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن واقعات سے اُن کی نکتہ چینی، اور پھر ان پر رائے زنی زخم پر نمک کا کام دے جاتی ہے، اور اسی سے وہ شکایتیں پیدا ہوتی ہیں جن کا اوپر ذکر آیا۔ سو پس ان شکایتوں کو رفع کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس مضمون پر خود مسلمان کتابیں لکھیں۔

ہم کو اپنی تاریخ کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ ہمارے مذہب سے شروع ہوتی ہے، اور حکومت اور سلطنت مسلمانوں میں سب سے پہلے اہل عرب

کو نصیب ہوئی؛ اس لئے عربی سلطنتوں کی تاریخ کے ساتھ تمام دنیا کے مسلمانوں کو خواہ اُنکی قومیت کچھ ہی ہو بہت لگاؤ ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ آج کل کے مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ کو کس شکل و صورت میں پڑھنا مفید سمجھتے ہیں اور اس امر میں اُن کی قومی حمیت کس بات کی مقتضی ہے۔ اس کا جواب مجھ کو یہ نہ ملنا چاہئے کہ "کیا آپ مسلمانوں کا دل خوش کرنے کے لئے کوئی تاریخ گھڑ وا کر لکھوانی چاہتے ہیں؟" نہیں ہرگز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تاریخ بزم سخن نہیں بلکہ مجلس تحقیق ہے۔ اس میں جہاں اور باتیں ہیں وہاں بُرے اور بھلے پرکھے بھی جاتے ہیں لیکن یہ جو کچھ ہو اس طرح ہو کہ تاریخ نویسی میں ہمیشہ اسلاف کے حفظ مراتب کا لحاظ رکھا جائے۔ اسلاف کی بزرگی میں، اُن کی شجاعت اور دلیری میں، اُن کی اولوالعزمی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ جس زمانہ میں وہ پیدا ہوئے آج اُس کا اندازہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ دنیا میں اُن کی اکثر بڑی حکومتیں اپنی زندگی پوری کر کے مدت کی فنا ہو چکی ہیں۔ پیدائش سے موت تک اُن کی زندگی کے حالات ہماری کتابوں میں درج ہیں۔ اب وہ زندہ نہیں ہیں جن کی نسبت یہ اندیشہ ہو کہ آگے اُن کی قسمت میں کیا لکھا ہے!! اُنکی کہانی پوری ہو چکی ہے؛ پس شرافت کا مقتضا یہی ہے کہ ہمارا موضوع اپنی کسی مرحوم سلطنت کے حالات لکھنے میں وہی ہو جو اپنے اسلاف میں کسی بزرگ کی سوانح عمری لکھنے کا ہوتا ہے؛ یعنی اُن کی پیدائش، صغر سنی، جوانی، پختہ عمری، ضعیفی اور پھر موت کے حالات لکھیں، اور موت کے بعد اُن کے حق میں دعائے خیر کریں۔ زندگی میں اُن کے اچھے اور بُرے کاموں کو لکھیں مگر پاس ادب برابر ملحوظ رہے۔ اُن کی غلطیوں کو بشریت پر، اُن کے اچھے کاموں کو اُن کی نیک نفسی پر محمول کریں، اور اُن کی معذوریوں کو وقت و حالات کا مقتضا سمجھیں جو زمانہ انہوں نے پایا تھا اُس کو سمجھیں اور اگر سمجھ سکیں تو اسی کے مطابق اُن کی بُرائیوں اور بھلائیوں کا اندازہ کریں۔ ممکن ہے کہ اس شخصی سوانح نویسی کی مثال جو میں نے پیش کی ہے فن تاریخ میں حد تک نہ چل سکے، لیکن جہاں تک چل سکے اُس کو ملحوظ رکھنا

مسلمانوں کی مرحوم سلطنتوں کی تاریخیں لکھنے میں میرے نزدیک مسلمانوں کا فرض ہے۔

اسلامی تاریخ میں اندلس کی تاریخ بڑی عظمت رکھتی ہے۔ یہاں اہل عرب نے آٹھ سو برس سے کچھ اوپر حکومت کی۔ کچھ کم تین سو برس سلاطین اموی اپنے والیوں کے ذریعہ یا خود اسپین و پرتگال کے بڑے حصوں پر حکمران رہے۔ سو برس سے کچھ کم ملوک الطوائف کے قبضہ میں ملک کا بڑا حصہ رہا۔ تقریباً سوا سو برس تک مرابطین و موحدین افریقہ نے خود اندلس میں رہ کر حکومت کی یا اس کو اپنی مراکشی سلطنت کا ایک حصہ بنائے رکھا۔ اس اثنا میں مسلمانوں کے مقبوضات عیسوی حکومتوں کے زور پکڑ جانے سے کم ہوتے گئے تھے۔ آخر میں غرناطہ و المریہ کی حکومت ان کے پاس رہ گئی تھی جس کی وسعت سابقہ وسعت سلطنت کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی۔ مگر یہاں بھی ڈھائی سو برس سے کچھ اوپر سلاطین بنی نصر نے بڑی شان سے سلطنت کی۔ غرض ۹۲ھ ہجری سے ۸۹۷ھ ہجری تک مسلمان اس ملک میں صاحب حکومت رہے۔ ملک کے ہر حصہ سے حکومت اٹھ جانے کے بعد بھی ۱۰۲۳ھ ہجری یعنی تقریباً سوا سو برس تک اندلس میں ان کی حکومت رہی۔ اس کے بعد عیسائی حکومت نے ملک سے اُن کو قطعی نکال دیا۔ لیکن مسلمانوں کی کل مدت حکومت میں اسپین اور پرتگال کا کوئی حصہ سوائے شمال کے کوہستانی اضلاع یا شمال مغربی گوشہ ملک کے ایک حصہ کے ایسا نہ تھا جہاں اُن کے قدم نہ پہنچے ہوں اور جہاں ایک معقول مدت تک انہوں نے حکومت نہ کی ہو۔

وطن سے تقریباً تین ہزار میل کے فاصلہ پر یورپ کے بالکل مغربی سرے پر ایک وسیع ملک میں آٹھ سو برس تک ان کا صاحب حکومت رہنا اور ایک ایسا تمدن پیدا کرنا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یورپ میں موجودہ تمدنی ترقی کا موجب اُسی کی مدد ہی ہوئی۔ تاریخ کے حیرت انگیز واقعات میں سے ہے۔ سلطانان اندلس کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانی دنیا میں جو نہیں تمدن جن چیزوں کی ترکیب کا نام تھا اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس میں مسلمانوں نے قابل رشک ترقی نہ کی ہو۔ ان تمام ترقیوں کے حالات مسلم کا شف

اپنی کتاب میں جا بجا نہایت خوبی وصراحت اور پوری لیاقت سے بیان کئے ہیں مسلمانوں کی قابل یادگار ترقیوں کے نشانات تو موجودہ یورپ کے تمدن میں بتائے جاتے ہیں لیکن سپین و پرتگال کے جغرافیہ پر غور کیجے تو اب بھی ہزارہا قصبے و قریے صدہا شہر قلعے اور گڑھیاں، بہت سے دریا اور پہاڑ اپنے بگڑے ہوئے عربی ناموں سے اُن کی یاد میں مصروف معلوم ہوتے ہیں سپین کی زبان اور ادب پر جو اثر اہل عرب نے پہنچایا وہ محتاج بیان نہیں۔ بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں کی زبان میں اب بھی عربی الفاظ کی تعداد اور زبانوں کے الفاظ سے زیادہ ہے۔ بلنسیہ کے علاقے میں کچھ اوپر پانسو برس اسلامی حکومت رہنے کے بعد عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ملک کی اصلی زبان بدل گئی ہے، عیسائی بھی عربی بولتے ہیں، حتےٰ کہ لاطینی زبان کی انجیل کو جو گرجاؤں میں سنائی جاتی ہے، مطلق نہیں سمجھ سکتے۔ یہ حال دیکھ کر عیسائی بادشاہ مجبور ہوا کہ انجیل کا عربی میں ترجمہ کرائے۔ عیسوی حکومتوں نے مذہبی تعصب کی وجہ سے مسلمانوں کی مساجد اور مقابر کو مٹا دیا۔ یہ کام مشکل نہ تھا، لیکن جس طرح مسلمانوں نے اپنا خون باشندگان سپین و پرتگال کے خون میں ملا دیا اُس کو دور کرنا ممکن نہ تھا۔ مسلمانوں نے اُن کی صورت، اُن کے اطوار و عادات کو بدل کر ایک ایسا تمدن اُن کو دیا جو حقیقۃً تو رہنما یورپ کی ظلمت میں صدیوں تک چمکتا رہا آٹھ سو برس کی مدت حکومت ہی پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عیسوی سپین و پرتگال کس طرح اسلامی و عربی اندلس بن گیا ہوگا جس میں ہزارہا محدث، فقیہ، شاعر اور ادیب، فلسفی، حکیم پیدا ہوئے۔

آٹھ صدیوں تک وطن سے تین ہزار میل دور یورپ کے ایک وسیع ملک پر حکمران رہنا میرے خیال میں ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کی مثال ماضی و حال میں ملنی مشکل ہے۔ اہل روما جن کو دنیا کا مالک کہا جاتا تھا ایشیاء کوچک کے بعض حصوں پر بارہ سو برس تک حکومت کرتے رہے تا آنکہ ترکان سلجوق نے اُن کو معزول کیا لیکن ایشیاء کوچک میں اہل روما اپنے مرزوبوم سے اتنا فاصلہ رکھتے تھے جس قدر کہ اہل عرب [illegible] افریقہ

کے مغربی ساحل پر دریائے سوس تک اُن کا پہنچنا، اور افریقہ سے بحر زقاق کو عبور کر کے
کُل اندلس کو روندتے ہوئے، جبل ابرانس کے پار، فرانس کے وسط تک دھاوا مارنا، اسکندر اعظم
کی لشکر کشی سے کسی طرح کم نہ تھا، جو مقدونیہ سے چل کر ایشیاء کوچک، بابل، ایران، خراسان
وکابل ہوتا ہوا، پنجاب تک آیا تھا۔ اسکندر کے بعد اُس کے جانشینوں نے، جن کی تاریخوں
سے یورپ کا لٹریچر بھرا پڑا ہے، ایشیا اور مصر میں جس مدت تک حکومت کی وہ اہل عرب کی
حکومت اندلس کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ شام اور ایشیاء کوچک میں سلوقس اور انتی گونس کے
خاندانوں نے دو سو برس سے بھی کم سلطنت کی۔ مصر میں بطلیموسیوں کا آفتاب اقبال تین سو
برس میں غروب ہو گیا۔ رومانی اُن کے جانشین ہوئے کہ پونے سات سو برس حکومت کر کے
اہل عرب کے لئے تخت حکومت خالی کر دیں۔ مگر یہ پونے سات سو برس بھی اُس مدت حکومت
سے کم تھے جو اندلس کے لئے مسلمانوں کی قسمت میں اُتری تھی۔ پھر روما یا قسطنطنیہ سے مصر
کا فاصلہ اتنا نہ تھا جس قدر کہ عرب سے قرطبہ کا تھا۔ اگر اور باتوں سے قطع نظر کی جائے تو کیا یہ
چیزیں اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ مغرب میں اندلس کی حکومت کو اسلامی
تاریخ میں کیا رتبہ حاصل ہے، اور ہمارے دلوں میں اس قدیم عربی حکومت کا کیا احترام ہونا چاہئے
افسوس ہے کہ آج ہم اُن باعظمت قدیم سلطنتوں کے حالات پڑھنے کے لئے ہم کو زیادہ تر
اُن مورخوں کی کتابوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جن میں بکثرت [illegible] اگر کہیں ہم کو اچھا کہا ہے تو ذرا دبے
دل سے اور کوسا ہے تو سچے دل سے۔ میرا یہ قول مسٹر سکاٹ امریکانی کی کتاب سے جس کا ترجمہ
میرے مکرم دوست نے کیا ہے، کوئی خاص تعلق نہیں رکھتا۔ ترجموں کے مفید ہونے کی نسبت
میں اور جگہ عرض کر چکا ہوں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی ترجموں کی بدولت قومی غیرت حرکت میں آئی،
اور ہم میں ایسے چند دوست پیدا ہوئے جنھوں نے اسلامی تاریخ کے بعض حصوں پر کتابیں لکھ کر قوم
کے [illegible] پہنچایا [illegible] ترجموں کی ضرورت ہے [illegible]
[illegible] سے آگاہ کر [illegible]

لیکن زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ خود ہم اپنی زبان میں اپنی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔

مجھ کو امید ہے کہ ہمارے مکرم دوست کے اس ترجمہ کے بعد خود ہمارے مولانا یا قوم کا کوئی اور ہمدرد اندلس کی تاریخ پر قلم اُٹھائیگا۔ اب میں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ قوم کو اپنے محسن مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اُنھوں نے اندلس کی اسلامی تاریخ کا ایسا بیش بہا سرمایہ اُردو زبان میں مہیا کر دیا ہے جو عدیم المثال ہے۔ یہاں مجھ کو اس بات کے بیان کرنے میں بیحد مسرت ہے کہ ہمارے مولانا کا ذوق علمی اُن کے فرزندان سعادت اطوار میں بھی اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کا مصداق بن کر نمایاں ہوا ہے۔ ہمارے مولانا کے فرزند رشید مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم۔ اے مددگار پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ "بیان المغرب" مصنفہ ابن العذاری کا اُردو میں ترجمہ کر رہے ہیں؛ اور اُن کے دوسرے فرزند مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے نے حال میں علامہ مراکشی کی کتاب "المعجب" کا فصیح اور شستہ زبان میں ترجمہ کر کے اور اُس کو بہترین شکل میں چھپوا کر ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ مختصر یہ کہ مغرب اور اندلس کی اسلامی تاریخ کو اُردو کی علمی دنیا میں لانا ہمارے مولانا کے خاندان کے ساتھ مختص ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو ہمیشہ کامیاب رکھے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مکرم دوست کے صاحبزادہ مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب نے عربی تصانیف سے جو خلاصہ تاریخ اندلس کا لکھا ہے وہ اضافہ کر دیا جائے۔ اس سے مسٹر سکاٹ کی کتاب کے مطالب زیادہ واضح ہو جائینگے اور صاف طور پر سمجھ میں آ جائینگے۔

محمد عنایت اللہ

ناظم شعبۂ تالیف و ترجمہ

جامعۂ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

۲۰ [illegible] ۱۳۴۲ھ

ملخص تاریخ اندلس

الف

(۱) فتح

کم وبیش آٹھ سو برس کے واقعات تاریخی کا اگر اختصار بھی ہو تو کہاں تک مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک خواب ہے کہ بحالت نوم مسلمانوں کی قوم نے دیکھا، دماغ نے یاری کی کہ یاد رہا، مگر نصیب نے یاوری نہیں کی کہ بحالت یقظہ اُس کی تعبیر معکوس پائی۔

سپین میں مسلمانوں کے عروج اور تباہی کا خلاصہ تو مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ "چوں آب بجوی آمد و چوں ریگ رواں رفت"، مگر بمقتضاء "مالایدرک کلّہ لایترک کلّہ" جو سرشک آنکھوں سے ٹپک کر کاغذ پر اپنے نقش کر گئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ:—

حضرت عقبہ ابن نافع رضی اللہ عنہ نے افریقیہ فتح کر کے تمام ملک مغرب کو روند ڈالا لیکن یہ "حملہ" ایک چھاپا تھا کہ کوئی مستقل اثر پیدا نہ کر سکا۔ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے جانشین اپنی اپنی ولایت کے جھگڑوں میں اس طرح پھنسے رہے کہ مغرب اقصیٰ پر تسلط کرنے کا خیال تک اُن کو نہ آنے پایا۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتے رہے کہ کسی طرح افریقیہ ہی میں مسلمانوں کے علم کو برقرار رکھ لیں اور بربریوں کے عدوان وطغیان ہی کا سدباب کئے رہیں۔ حسان ابن نعمان جب افریقیہ کے والی مقرر ہو کر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک کاہنہ عورت نے مذہب کے بہانہ سے تمام بربریوں کو اس طرح رام کر رکھا ہے کہ اپنا ہی نام جپوا رہی ہے اور اس عورت کا عروج مسلمانوں کے لئے سخت مخدوش ہے۔ ناچار انہوں نے فوج کشی کی، مگر اس پہلی ہی لڑائی میں ایسی فاش شکست کھائی کہ خود حسان کو برقہ میں جا کر پناہ لینا اور امیرالمومنین عبدالملک سے استمداد کرنا پڑی۔ جب وہاں سے قرار واقعی فوج آئی تو انہوں نے [illegible] اپنی شکست کا بدلہ لیا،

اور اس کو قتل کر کے بربریوں کو سزا دی۔ اس کے بعد حسان نے عربی دستوں کو گرد و نواح میں اس
غرض سے بھیجا کہ جہاں کہیں بربری یا رومی گروہ ملے اس کو منتشر یا قتل کر دیں۔ اس کے ساتھ
ہی انہوں نے چند جماعتیں بربریوں کو مسلمان کرنے اور خانہ بدوشانہ زندگی ترک کر کے مدنی زندگی اختیار
کرنے پر مائل کیا۔ چنانچہ بہت سے بربری مسلمان ہو گئے۔ یہ ۸۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد حسان نے افریقیہ
کا انتظام کیا۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ اسی وقت سے افریقیہ کم و بیش مستقل طور سے مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا۔
اسی سال عبدالعزیز بن مروان عامل مصر نے حسان کو معزول کر کے اپنے دوست اور پروردہ موسیٰ
بن نصیر کو افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ ان کی ولایت کے ساتھ ہی تاریخ افریقیہ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

اس وقت افریقیہ میں امن و امان تھا۔ تھوڑی بہت جو ابتری تھی وہ موسیٰ نے وہاں پہنچتے
ہی تین فوجی مہمیں بھیج کر رفع کر دیں۔

چونکہ ادھر سے اطمینان ہو گیا تھا اس لئے بالکل بےفکر ہو کر مغرب اقصیٰ کی طرف توجہ کی۔
اس کو انہوں نے نہ صرف عقبہ بن نافعؓ کی طرح روندا ہی بلکہ مستقل طور پر فتح بھی کر لیا۔ موسیٰ
کو ایک یہ ترکیب سوجھی اگر بربریوں کو اسلام سے روشناس کر دیا جائیگا۔ تو ان کی وحشت کچھ
نہ کچھ کم ہو جائیگی چنانچہ اس غرض سے انہوں نے سترہ عرب مقرر کئے۔ اسلام و تہذیب کے پہلو
بہ پہلو انہوں نے ملکی انتظام سے بھی چشم پوشی نہیں کی بلکہ اپنے مولا طارق کو طنجہ کا والی مقرر کر دیا۔

فتح کا سلسلہ ۸۶ھ سے ۹۲ھ تک جاری رہا۔ اور اس اثناء میں موسیٰ کا تعلق سبتہ کے
قلعے سے ہوا۔ جو حقیقت میں تو مشرقی رومی سلطنت کا ایک مقبوضہ تھا مگر اس وقت اس کا گورنر
شاہان سپین کے متعلق ہو گیا تھا۔

سبتہ کے گورنر جولین نے ملکی دستور کے موافق اپنی بیٹی کو راڈرک شاہ سپین کے دربار میں
تعلیم و تربیت کے لئے چھوڑا ہوا تھا جہاں بادشاہ کی بدعنوانی کی وجہ سے جولین کو بدلہ لینے کے
لئے تیار ہونا پڑا۔ (مورخین یورپ آج اس واقعہ سے انکار کر رہے ہیں اور یہ کوشش کرتے
ہیں کہ کسی طرح اس کا نام و نشان بھی نہ رہے چنانچہ سپین کی جو تاریخیں اب لکھی جا رہی ہیں۔

اُن میں یہ واقعہ نہیں بیان کیا جاتا) اُس نے موسےٰ کو جواب تک سبتہ کے فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے، اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد موسےٰ نے خلیفہ ولید کی اجازت سے اندلس پر فوج کشی کا ارادہ کیا، اور اپنے مولا طارق ابن زیاد کو (جس کو انہوں نے اس سے قبل طنجہ کا والی مقرر کیا تھا) بارہ ہزار آدمی دے کر اندلس روانہ کیا۔ راڈرک شاہ سپین اس وقت شمال سپین میں ایک بغاوت فرو کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ جب اُس کو اس نئے دشمن کی فوج کشی کا حال معلوم ہوا، تو وہ بسرعت تمام جنوب کی طرف آیا، اور اپنی سلطنت کی تمام طاقت کو ایک جگہ مجتمع کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ جنگ میں طارق کو فتح ہوئی، اور راڈرک کام آیا۔ یہ شکست ایسی فیصلہ کن تھی کہ اس نے گاتھوں کی سلطنت کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، پھر کبھی اُن کو میدان جنگ میں لانا نصیب نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ فتح مسلمانوں کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ طارقؒ کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ تین دن کی جنگ میں وہ اس لق و دق ملک کے مالک بن جائیں گے۔ بہرحال انہوں نے اس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ انہوں نے اپنے آقا موسےٰ کو اس فتح کی خبر دی، اور خود بغیر توقف آگے بڑھتے چلے گئے، چنانچہ ۹۲ھ کے دوران ہی میں انہوں نے قرطبہ، مالقہ، غرناطہ، مرسیہ اور طلیطلہ فتح کر لیا۔ موخر الذکر شہر کے شمال میں ان کو "مائدہ سلیمانؑ" ملا تھا۔ طارقؒ نے جو اپنے فتوحات کی خبر اپنے آقا کو دی تھی اُس کے جواب میں انہوں نے حکم دیا کہ اُن کے اندلس میں آنے تک وہ آگے نہ بڑھیں، مگر ملک کی حالت ایسی تھی کہ آگے نہ بڑھنے کا نتیجہ حقیقت میں پیچھے ہٹنا تھا۔ اس لئے تمام حالات و واقعات پر غور کرنے کے بعد طارقؒ اور اُن کے ماتحت افسران نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت مصلحت اسی میں ہے کہ موسےٰؒ کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے، اور پیش قدمی جاری رکھی جائے، یوں طارقؒ کی اکثر فتوحات موسےٰؒ کے علی الرغم عمل میں آئیں۔

۹۳ھ میں موسےٰ بھی طارقؒ کی طرف سے غیظ و غضب سے بھرے ہوئے اندلس میں داخل ہوئے، اور جو راستہ طارقؒ نے اختیار کیا تھا اُس کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا، اور

سنہ ۹۴-۹۵ھ میں برابر جنگ و فتوح میں مشغول رہے۔ ان کے راستہ میں جو مقامات اور قلعے آئے ان کو فتح کر لیا، اور جو فوج اُن کے مقابل ہوئی اُس کو شکست دی۔ مورخین کا بیان، اور خود موسےؒ کا دعوےٰ ہے، کہ کبھی اُن کی فوج کو شکست نہیں ہوئی، اُن کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہؤا۔ یہ ایسا فخر ہے کہ دنیا کے شاذ و نادر سپہ سالاروں کو حاصل ہؤا ہے۔ چنانچہ ایک مورخ کہتا ہے کہ موسےؒ اپنی فتوحات کی رو میں افریقیہ کے مستقر لیطون تک چلے گئے، اور کہیں اُن کو خیال پس پائی نہیں آیا۔ یہاں پہنچ کر مسلمانوں کو یہ خوف ہؤا کہ کہیں اپنے مستقر سے اتنی دور چلے آنے کی وجہ سے ان کو روزِ بد دیکھنا پڑے۔ انہوں نے موسےؒ سے واپس ہونے کی التجا کی، جو بمجبوری منظور ہوئی، اور موسےؒ واپس چلے آئے۔

اس فوجی مہم کے دوران میں مسلمانوں کے ہاتھ سے اگر کوئی مقام بچا تو وہ جبال قرقوشہ، جبال نبلو، صخرۂ جلیقیہ تھے۔ موخر الذکر مقام میں صرف تین عیسائی باقی رہ گئے تھے، جن کے متعلق خیال تھا کہ بھوک پیاس کی تکلیف سے وہ خود بخود مرجائیں گے، مگر بمصداق "تقدیر زندہ خندہ" یہی بڑھتے رہے، اور آخر مسلمانوں کے اخراج کا باعث ہوئے۔ موسےؒ کی بڑی بڑی فتوحات میں قرمونہ، اشبیلیہ، مارده اور لبلہ شامل ہیں۔

ان فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ بارگاہ خلافت سے حکم آیا کہ موسےؒ اور طارقؒ دونوں دمشق واپس چلے آئیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ دونوں ولید کے زمانہ خلافت میں دمشق پہنچے یا سلیمان کے، مگر اس میں شک نہیں کہ خلیفہ سلیمان ابن عبدالملک نے فاتحین اندلس، بالخصوص موسےؒ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ ان (موسےؒ) کو جلتی دھوپ میں تمام دن باہر کھڑا رکھا، اور اُن پر معتدبہ جرمانہ کیا، جس کے مقدار میں مورخوں کا اختلاف ہے۔ مسٹر سکاٹ کا یہ خیال یقیناً غلط ہے کہ موسےؒ بھیک مانگتے ہوئے مرے اور گمنامی کی حالت میں حجاز میں داخل ہوئے، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ یزید ابن مہلب نے اُن کو اپنی ضمانت پر رہا کر کے جرمانہ ادا کر دیا تھا، نہ صرف یہی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ خلافت میں پھر اُن کو بار مل گیا، اور وہ دربار کے ایک رکن رکین بن گئے، کیونکہ جب سلیمان نے سنہ ۹۷ھ میں حج کیا ہے تو موسےؒ اُن کے

ہمرکاب تھے اور اسی سفر کے دوران میں انھوں نے بماہ ذی الحجہ حجاز میں انتقال کیا۔ مرنے کے پیشتر انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "کل وہ شخص مر جائیگا، جس کے ذکر سے مشرق و مغرب پُر ہو گیا ہے" خدا تعالےٰ اُن پر رحمت کرے، انہوں نے جو کچھ کہا صحیح کہا۔

(۲) زمانۂ امارت

موسےٰ اور طارق کی جاں بازیوں سے اندلس فتح تو ہو چکا تھا، اب دیکھنا یہ تھا کہ دربار خلافت اس کی نگاہ داشت اور انتظام کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عرب حمیری اور مضری، دو گروہوں میں منقسم تھے۔ یہ دونوں گروہ ہمیشہ دست و گریباں رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور تفریق بھی تھی۔ شامیوں نے اہل مدینہ پر ظلم ڈھائے، اور اہل مدینہ اپنا وطن چھوڑ کر، افریقیہ اور اندلس کے فتح کے بعد، اندلس میں منتقل ہو گئے تھے۔ موخر الذکر ملک میں انہوں نے شامیوں سے بدلہ لینے کا مقصد کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان دونوں فرقوں کی اس مخالفت سے اندلس میں اکثر خرابیاں واقع ہوتی رہیں۔ ان دو فریقوں کے علاوہ تیسرا فرقہ بربری تھے، جنہوں نے اندلس کی فتح میں مدد دی تھی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان ہی کے زور بازو سے اندلس فتح ہوا تھا۔ مگر عرب اپنی قومیت کے فخر میں مست تھے، اور تمام مفتوحہ اقوام کے ساتھ غلامانہ سلوک کرنے کے عادی تھے۔ یہی سلوک انہوں نے بربریوں سے کرنا چاہا، مگر بربری بھی عربوں ہی کی طرح ذاتی آزادی کے دلدادہ تھے، اور ہر قسم کی غلامی سے متنفر۔ چنانچہ یہ لوگ کچھ تو عربوں کے سلوک سے تنگ آکر اور کچھ اپنی جبلی عادات و خصائل کے اقتضاء سے متواتر بغاوتیں کرنے پر تلے رہتے تھے۔ بارگاہ خلافت کے سامنے، اب جہاں تک اندلس کا تعلق تھا، سب سے اہم مسئلہ تھا کہ ان مختلف عناصر کو کس طرح مجتمع کیا جائے، اور ملک میں کیونکر ایسا امن و امان قائم کیا جائے کہ وہ جنگ کی آفات و حادثات کو بھول کر پھر امن کے ثمرات سے مالا مال ہو، اور بد امنی کا نام و نشان مٹ جائے۔

اگر بہ نظر امعان دیکھا جائے تو خلافت نے اس مسئلے کے حل کی کوشش نہیں کی۔

بنوامیہ کی پالیسی بالعموم وقتی ہوا کرتی تھی، مستقبل ان کے نزدیک بالکل ہیچ تھا۔ اُن کی اس پالیسی کا اثر اندلس کی حکومت پر بھی پڑا؛ اور یہاں بھی دربار دمشق نے کوئی ایسے اصول اختراع نہیں کئے جن سے حکومت کی کچھ حد بست ہو جاتی؛ اور امن کے قیام کے لئے قرین صواب قوانین اختراع کر لئے جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۵ھ سے ۱۳۸ھ تک کا زمانہ سخت بدامنی اور فتنہ و فساد کا گزرا چونکہ اندلس کو عامل افریقیہ نے فتح کیا تھا؛ اس لئے یہ ملک اُسی کے تحت میں چھوڑ دیا گیا؛ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن امراء کے عزل و نصب میں کسی اصول کا خصوصیت سے خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اہل اندلس ایک امیر کو بطور خود معزول کر کے اپنی ہی طرف سے، اور اپنے آپ ہی جس کو چاہتے تھے؛ والی مقرر کر لیتے تھے؛ اور عامل افریقیہ سے استصواب ضروری نہ سمجھتے تھے۔ اگر حالت بہت نازک ہو جاتی؛ اور حمیری او مضری فساد کی وجہ سے تمام کام ہاتھ سے نکلتا معلوم ہوتا؛ تو عامل افریقیہ سے فرمائش کی جاتی کہ وہ کسی امیر کو اندلس بھیج دے۔ اس کا قیام بھی اُس وقت تک رہ سکتا تھا کہ جب تک وہ حمیری اور مضری دونوں فریق کو ایک آنکھ سے دیکھے؛ یا خود اس کا فریق غالب ہے۔ معمولی سی بیجا حرکت سے انقلاب واقع ہو جاتا؛ اور امیر کی جان پر بن جاتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ براہ راست خلیفہ سے درخواست کی گئی ہے کہ والی کا تقرر کر دیا جائے؛ مگر اس کا انجام بھی اُن والیوں سے کچھ بہتر نہیں ہوا جن کو خود اہل اندلس نے مقرر کیا؛ یا عامل افریقیہ کی طرف سے مقرر ہو کر آئے تھے۔ بہرحال نتیجہ یہ تھا کہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا؛ اس پر بربریوں کی بغاوتیں اور تازیانہ کا کام کرتی تھیں۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ چالیس برس کا یہ زمانہ محض ان ہی جھگڑوں میں گزرا اور کوئی مفید کام مسلمان نہ کر سکے۔ اور تمام باتوں سے قطع نظر کر کے ان امراء کا یہی کارنامہ کچھ کم نہیں کہ باوجود اس انتشار کے وہ اس نو مفتوحہ ملک کو اپنے تصرف میں رکھ سکے؛ اور شمالی پہاڑوں عیسائیوں کو ہاتھ پیر نکالنے دیئے بھی نہیں؛ اگرچہ فی نفسہ یہ بھی بہت بڑا کارنامہ ہے؛ لیکن بڑا کام تو یہ ہے کہ ان امراء میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اپنی حکومت کی سرحد کو عبور کر کے پائرینیس کے چھوٹے

فرانس پر حملہ کیا، ان حملوں میں بعض ایک حد تک کامیاب بھی رہے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں فرانس میں مسلمانوں کی ایک مختصر سی سلطنت قائم ہو گئی اور ایک عرصہ تک باقی رہی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایسے قوانین بھی جاری کئے جو قیام سلطنت کے لئے ضروری تھے۔ ایسے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی جو کسی فریق سے ل کر نہ رہنا چاہتے تھے جہاں تک ہو سکا کوشش کی کہ کاشت کاری تجارت اور دیگر پیشوں اور پیشہ وروں کی حفاظت ہو جو زمانہ امن میں لابدی ہیں۔

اس چالیس برس کے انتشار کا ایک ادنے ثبوت یہ ہے کہ اٹھارہ والی اور امراء حکومت کی اسٹیج پر ظاہر ہوئے اور غائب ہو گئے۔ ان سب کے نام گنوانا ضروری نہیں۔ ان میں سے دو البتہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ایک عبدالرحمان ابن عبداللہ الغافقی اور دوسرے ابوالخطار حسام ابن ضرار الکلبی۔ پہلے والی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اندلس میں داخل ہوئے، مگر اپنی خداداد قابلیت سے انہوں نے وہ ترقی کی کہ دو مرتبہ اندلس کے والی ہوئے۔ دوسری دفعہ جب ان کو باشندگان اندلس نے ان کو اپنا والی بنایا، تو انہوں نے اپنے چند پیشرو والیوں کی طرح فرانس پر حملہ کیا، اور ٹورس کے مقام پر چارلس مارٹل کے ہاتھ سے شکست کھائی اور شہید ہوئے۔ یہ شکست ایسی تھی کہ مسلمان پھر کبھی اس ساز و سامان سے فرانس پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ اسی وجہ سے یورپی مورخ اس جنگ کو دنیا کی ایک فیصلہ کن جنگ سمجھتے ہیں، اور چارلس مارٹل کو اپنا اور یورپی تہذیب کا ناجی خیال کرتے ہیں لیکن اگر اور تمام باتوں سے قطع نظر کر لی جائے تو نہ معلوم یہ یورپین مورخ چارلس مارٹل کی اس حماقت کا کیا جواب دینگے کہ اس نے راڈرک کی طرح 'قوم فرنیک کی تمام قوت کو ایک میدان میں لا کر جمع کر دیا، اور نہ صرف فرانس، بلکہ تمام یورپ کا فیصلہ صرف ایک جنگ پر منحصر کر دیا۔ اگر کہیں مسلمان اس جنگ میں کامیاب ہو جاتے تو کیا فرانس وغیرہ کا وہی انجام نہ ہوتا جو چند سال قبل اندلس کا ہو چکا تھا؟ کیا چارلس کی شکست کے بعد پھر کوئی ایسی طاقت یورپ میں باقی تھی جو مسلمانوں کی روک تھام کر سکتی؟ یقیناً نتیجہ یہ ہوتا کہ چارلس مارٹل بجائے یورپ کو مسلمانوں سے نجات دلانے کے خود مسلمانوں کا حلقہ بگوش بنتا۔ بہر حال دیکھنا یہ ہے کہ

عبدالرحمٰن کی شکست سے دنیا، یا کم از کم یورپ کو نفع ہُوا یا نقصان۔ اس کا جواب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ یورپ پر تاریکی چھائی رہی، اور وہ اُن تمام برکات تہذیب و تمدن سے مستفید نہ ہو سکا جس سے اس وقت تمام ایشیا، بالخصوص اندلس، مالا مال ہو رہے تھے۔

دوسرے قابل ذکر والی، ابوالخطار حسام ابن ضرار الکلبی ۱۲۵ھ میں اندلس آئے، اور آتے ہی حکومت کا ایسا ڈھنگ ڈالا کہ تمام فریقوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ فساد کا اصل باعث مختلف عناصر کا ایک ہی شہر میں جمع ہونا ہے۔ اس کا علاج اُنہوں نے بہت معقول سوچا کہ عربوں اور شامیوں کو ملک کے مختلف جہات میں، ہر ایک کے وطن کی آب و ہوا کے موافق آب و ہوا دیکھ کر بسا دیا۔ یوں دونوں عنصر ایک جگہ بھی نہ رہے، اور دونوں کی قوت منتشر ہو کر اتنی کم ہو گئی کہ ایک دوسرے و دست و گلو بھی نہ ہو سکے۔ مگر یہ عادل و عاقل والی بھی عربوں کی عام لعنت سے نہ بچ سکا، اور حمیریوں کی طرف داری کر کے تمام مضریوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ امراء کی سلطنت کے خاتمے اور بنو مروان کی مغربی سلطنت کی بنیاد پڑنے کے اسباب یہی ہیں۔

عین اسی زمانے میں کہ ابوالخطار اندلس کے والی مقرر ہو کر آئے، ایک اور شخص بھاگ کر شام سے اندلس آیا۔ یہ صمیل ابن حاتم تھا، جو شمر یعنی حضرت امام حسینؓ کے قاتل کا پوتا تھا۔ یہ شخص سخت جاہل، ان پڑھ کندۂ ناتراش تھا، مگر فصیح و بلیغ شاعر، اور عربی تہذیب و تمدن اور معاشرت کا پورا نمونہ تھا۔ ایسے شخص سے بہتری کی کیا امید ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے آتے ہی عربی عناد و پرخاش کی بارود میں آگ کا کام کیا، اور والی اندلس (ابوالخطار) کے خلاف مضریوں کا سرگروہ بن گیا۔ فریقین میں حسب دستور جنگ و جدل کا میدان گرم ہُوا۔ آخر ۱۲۸ھ میں ابوالخطار کو ہٹ جانا پڑا۔ مگر اس سے اندلس کی حالت میں کوئی خوبی پیدا نہ ہوئی، بلکہ چار ماہ تک بدامنی کا میدان گرم رہا۔ جب بہت ہی برا حال ہوا، تو لوگوں نے یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری کو والی مقرر کیا۔ یوسف برائے نام ہی والی تھے، حکومت کا تمام و کمال کام صمیل کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک طرف تو یمینیوں پر ظلم و ستم ڈھا رہا تھا، اور دوسری طرف اپنے مضری ساتھیوں میں انعام و اکرام، اور نجدۃ و شرافت کی وجہ سے ممتاز اور معزز بن

رہا تھا۔

ادھر یورپ میں تو یہ گلچپ ہو رہی تھی، ادھر ایشیا میں عظیم الشان خلافت بنو امیہ کا انتزاع شروع ہو گیا تھا۔ بنو عباس کے داعیوں نے اپنے کام میں وہ سرگرمی دکھائی کہ پچیس ہی برس کے عرصہ میں بنو امیہ کی جڑ کھوکھلی کر کے رکھدی، اور بنو عباس سیاہ جھنڈے کو بلند کر دیا۔ آخر ۱۳۲ھ میں عبداللہ ابن علی ابن عبداللہ ابن عباسؓ نے بنو امیہ کے آخری تاجدار مروان ثانی، کو دریائے زاب کے کنارے شکست دی۔ اس شکست نے بنو امیہ کی خلافت کا تختہ پلٹ دیا۔ مروان مصر کی طرف بھاگ گئے، اور عبداللہ نے اُن کا پیچھا کیا، اور آخر وہاں بوصیر کے ایک گرجا میں وہ خود عبداللہ یا اُنکی سپاہ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس کے بعد جہاں تک عبداللہ کو پتہ لگ سکا اُنھوں نے بنو امیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کیا۔ مگر تقدیر عجب چیز ہے، پھر بھی ایک شخص عبدالرحمن ابن معاویہ ابن ہشام ابن عبدالملک ابن مروان ابن الحکم بھاگ نکلے اور ہوتے ہوتے اندلس پہنچ گئے۔ جہاں ۱۳۸ھ میں اُنھوں نے بنو امیہ کی سلطنت کی تجدید کی۔ یہ سلطنت لگاتار ۴۲۲ھ تک قائم رہی۔ اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بنو عباس کا تسلط ہوتے ہی بنو امیہ کی حکومت دنیا سے بالکل اٹھ گئی تھی، کیونکہ افریقیہ میں عبدالرحمن ابن حبیب اور اندلس میں یوسف ابن عبدالرحمن الفہری، اسی خاندان کی طرف سے عامل تھے اور ۱۳۲ھ میں بھی ان دونوں نے بنی امیہ کی بیعت کو نہیں توڑا تھا۔ اس طرح یہ دونوں اقطاع حسب دستور بنی امیہ کے قبضہ میں تھے۔ اگر واقعات کو اس رنگ میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۲۳ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے سے لے کر بنو امیہ مغربی کے آخری خلیفہ المعتمد باللہ کے خاتمہ یعنی ۴۲۲ھ تک، اس خاندان کی حکومت برابر باقی رہی، اور اس کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔

(۲) زمانہ سلطنت

غرض اس طرح ۱۳۸ھ میں عبدالرحمن الداخلؒ ہوئی اندلس کے بلا شرکت غیرے بادشاہ ہو گئے، اور ۳۲ برس نہایت طمطراق سے حکومت کی۔ انھوں نے نہ صرف اندرونی دشمنوں اور

مخالفوں کا قلع قمع کیا، بلکہ جب اندلس کے سرداروں نے شارلیمین سے مدد لے کر عبدالرحمٰن کو بے دخل کرنا چاہا، تو عبدالرحمٰن نے اُس کو شکست دے کر اندلس سے نکال دیا۔ اپنی نئی سلطنت میں عبدالرحمٰن کو اول تو عرب سرداروں سے عہدہ برآ ہونا تھا، جو ذاتی آزادی کے دلدادہ اور ہر قسم کی حکومت اور خصوصاً بادشاہی سے بیزار تھے، دوسری طرف اندلس کے عیسائی تھے، جن کو اب مسلمانوں کے ماتحت رہتے رہتے ذرا ہوش آچلا تھا، اور گم شدہ آزادی کو حاصل کرنے کے لئے پھر ہاتھ پاؤں مارنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن نہ عربوں پر اعتماد کر سکے، اور نہ اندلسیوں پر۔ مجبوراً بیرونی اقوام کے اجیر سپاہیوں پر بھروسہ کیا، خصوصاً بربریوں اور صقالیہ کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ اس طرح شروع ہی سے اندلس کی حکومت اموی میں فوجی زور اور مطلق العنانی کا وہ رنگ آگیا جو بنو عباس کے آخری زمانہ میں بغداد میں تھا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عبدالرحمٰن الداخل کی ہی اختیار کردہ پالیسی تھی جس پر آیندہ کے سلاطین و خلفاء برابر عمل کرتے رہے، اور جس کی وجہ سے ان کی سلطنت برابر قایم رہی۔ عبدالرحمٰن کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ بنو عباس کا خلیفہ، منصور ہمیشہ عبدالرحمٰن کو "قریش کا باز" کہا کرتا تھا، کیونکہ انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے میدانوں کو خالی پاکر بغیر کسی فوج اور معاونت کے ایک نامعلوم ملک میں سلطنت قائم کرلی۔ اور محض اپنی قوت بازو اور صواب رائے کے بھروسہ پر دشمنوں کو شکستیں دیں، باغیوں کا قلع قمع کیا، اپنی سرحدوں کو مستحکم کیا، اور ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ایسے کارنامے شاید کسی اور بادشاہ سے دنیا میں ظاہر ہوئے ہوں۔

(دیکھو ابن العذاری۔ جلد دوم صفحہ ۶۱)

عبدالرحمٰن کی موت کے بعد ان کے بیٹے ہشام ۱۷۲ھ بادشاہ ہوئے، اور آٹھ برس کے بعد ۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ یہ ایک نیک دل خدا پرست اور محنتی شخص تھے۔ انہوں نے اپنی رعایا کے آرام و رفاہ کے لئے بڑے بڑے کام کئے، اور اپنے باپ کی قدم بقدم چلتے رہے۔ الحکم جوان کے بعد بادشاہ ہوئے، اگرچہ عوام الناس کی نظروں میں ہر دل عزیز تھے، لیکن اندلس کے علماء کو خوش نہ رکھ سکے۔ چند روز تک تو خفیہ طور پر ان کے خلاف کام ہوتا رہا، لیکن آخر رمضان ۱۹۰ھ میں

پیٹھان یک بارگی ٹوٹ پڑا۔ اچانک الحکم کو یہ معلوم ہوا کہ شہر کے عوام الناس نے ان کے محل کا محاصرہ کیا ہوا ہے الحکم نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار کئے بغیر ان کو شکست دی اور قتل عام کے بعد ساٹھ ہزار باشندگان قرطبہ کو جلاوطن کر دیا۔ الحکم کی فراست اور دقت نظر کا یہ ثبوت کافی ہے کہ اُن کے جلاوطن کردہ لوگ ایسے مفسد تھے کہ وہ چند ہی روز مصر میں ٹھیرنے کے بعد وہاں سے بھی نکال دیئے گئے۔ آخر یہ لوگ جزیرہ مالٹا کو فتح کر کے وہاں بس گئے لیکن اصل مجرم (یعنی علماء) بلوہ بچ گئے۔ گو ان کی طاقت اس وقت ٹوٹ گئی، لیکن بہت ہی جلد ان کو پُرانا اقتدار پھر حاصل ہو گیا۔ حتے کہ عبدالرحمٰن ثانی (۲۰۶-۲۳۸ھ) کی عہد حکومت میں تو یہ حال ہو گیا کہ وہی یحییٰ ابن یحییٰ جو اس تمام فساد کے بانی تھے، پھر دربار کے ایک رکن اعلیٰ ہو گئے، اور امیر کے مزاج میں اس قدر درخور پیدا کر لیا کہ کوئی قاضی ان کی زہر آلود نگاہ سے محفوظ نہ رہ سکا، بلکہ حقیقت میں وہ محکمہ قضا کے مالک واحد بن گئے۔

اس زمانہ کا سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم واقع عمر ابن حفصون کی بغاوت ہے اس نے ۲۶۷ھ میں محمد کے زمانہ میں علم بغاوت بلند کیا، خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر تک اس بغاوت کو فرو نہ کر سکے۔ یورپ کے مورخ اس بغاوت کو بہت کچھ اہمیت دیتے ہیں ان کے خیال میں اس بغاوت کے نتیجہ میں جو جنگ ہوئی اُس کے ایک فریق اندلسی مسلمان تھے، اور دوسرا فریق عیسائی اور خالص عربی حکومت اور عمر ابن حفصون اول الذکر کا سرغنہ تھا۔ اس خیال کی بنا پر انہوں نے اس بغاوت کا نام "جنگ حریت" رکھا ہے، اور اس لٹیرے، قزاق اور باغی کے "کارناموں" کو بہت کچھ سراہا ہے عرب مورخین بھی اس بغاوت کے حالات تفصیل سے بیان کرتے ہیں، لیکن وہ اس کو یہ اہمیت ہرگز نہیں دیتے۔ وہ عمر ابن حفصون کو "لعین" "ملعون" "ابن خبیث" کہتے ہیں۔ ان ہی الفاظ سے عرب مورخین کی راء اس شخص کی نسبت معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ بغاوت دشوار گذار پہاڑیوں میں شروع کی گئی تھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کے مفسدوں کا مرجع بنی ہوئی تھیں۔ ان ہی مفسدوں کو عمر نے اپنے ساتھ ملایا، اور گرد و نواح کے جتنے اوباش تھے وہ بھی اس کے ساتھ مل گئے محمد نے اس فتنہ کو دبانا چاہا، اور عمر کو چند شکستیں دیں۔ اس کا ابھی پوری طرح قلع قمع نہ ہوا تھا کہ محمد انتقال کر گئے۔

مقتدر نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا؛ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کر سکیں اُنھوں نے بھی وفات پائی۔ اگر زندگی وفا کرتی تو اس کا زیادہ امکان تھا کہ اس باغی کا کام اسی زمانہ میں ختم ہو جاتا، ان کے جانشین عبداللہ کی کمزوری سے بجائے اس کے کہ فتنہ فرو ہوتا، اور آگ پر تیل کا کام کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ان ہی کی کمزوری تھی جس نے اس بغاوت کو اتنا طول کھینچ دیا +

اموّیہ خلفا کے سب سے عظیم الشان بادشاہ عبدالرحمٰن ثالث، الناصر لدین اللہ تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف عبداللہ کے زمانہ کی تمام خرابیوں کو دور کیا، بلکہ سلطنت کو پھر از سر نو مستحکم کر دیا، میں ذیل میں مشہور عالم مورخ دوزی کی رائے ان کے متعلق درج کرتا ہوں، جس سے ان کی عظمت معلوم ہوگی :—

"بنو اُمیہ کے اُن حکمرانوں میں، جنھوں نے اندلس میں حکومت کی، بلا شک و شبہ سب سے پہلا درجہ عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ کو ملنا چاہئے۔ اپنی حکومت (۳۰۰ - ۳۵۰ھ) کے دوران میں جو کارنامے اُنھوں نے دکھلائے، وہ حقیقت میں معجزے تھے، جس وقت وہ بادشاہ ہوئے ہیں، اُس وقت سلطنت اُن کو ایسی حالت میں ملی کہ فتنہ و فساد، جنگ و جدل ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ فرقہ بندی سے ملک میں پراگندگی اور انتشار تھا، ملک نفاق کر مختلف النوع امراء میں منقسم، اور شمالی عیسائیوں کے حملوں کے لئے ہر طرف سے کھلا ہوا تھا، قریب تھا کہ لیون اور افریقہ کے باشندے ملک کو اپنا لقمہ تر بنا لیں؛ لیکن عبدالرحمٰن نے باوجود ہر قسم کے موانع کے، اندلس کو نہ صرف بیرونی دشمنوں، بلکہ اندرونی فتنوں سے پاک کیا، اس میں نئی روح پھونک دی، اس کو گذشتہ زمانہ سے کہیں زیادہ عظیم الشان اور مستحکم کر دیا، اندرون ملک میں امن و صلاح و فلاح پیدا کی اور بیرونی ممالک میں اس کی عزت و وقعت کو دو بالا کر دیا۔ خزانہ عامرہ ان کے بادشاہ ہونے کے وقت تقریباً خالی تھا، ان کے عہد حکومت میں پھر معمور ہو گیا، شاہی محاصل کی سالانہ مقدار ... ۵۴۸ ۴۲ سکہ طلائی تھی۔ اس میں سے ایک تہائی خرچ کیا جاتا، ایک تہائی پس انداز ہوتا، اور

باقی ماندہ رقم اپنی تعمیرات پر خرچ کرتے تھے حساب لگایا گیا ہے کہ ۳۴۰ھ میں ان کے خزانہ میں دو کروڑ سکہ طلائی موجود تھے، چنانچہ ایک سیاح نے جو مالی معاملات سے پورا واقف تھا، دنیا کو بتایا ہے کہ اس وقت ناصر الدولہ ہمدانی والی الجزیرہ اور عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ دنیا کے مالدار ترین بادشاہ تھے خزانہ کی طرح ملک بھی امن کی برکات سے مالا مال تھا۔ کاشتکاری، صنعت و حرفت اور علوم و فنون سب عروج پر تھے..

...... قرطبہ کی آبادی اس وقت پانچ لاکھ نفوس کی تھی، اسمیں تین بڑی مسجدیں، خوبصورت محلات، کئی لاکھ مکان، اور اٹھائیس باغات تھے۔ اگر وہ دنیا کے کسی اور شہر سے کم تھا تو صرف بغداد سے...... عبدالرحمٰن کی طاقت بھی خوب ہی بڑھی ہوئی تھی، ایک عظیم بیڑے کے ذریعے سے وہ بحیرہ روم میں خلفاء فاطمیہ سے لڑنے کیلئے تیار رہتے تھے اور سبتہ پر قبضہ کر کے انہوں نے مراکش کی کنجی اپنے قبضہ میں لے لی تھی ایک عظیم الشان اور تربیت یافتہ فوج کے ذریعے سے جو غالباً اس زمانہ کی بہترین فوج تھی، وہ شمالی عیسائیوں کی پیش دستیوں کو روکے ہوئے تھے۔ دنیا کے معزز ترین بادشاہ ان کی دوستی کے خواہاں تھے اور قسطنطنیہ کے قیصر اور جرمنی، فرانس، اٹلی کے بادشاہوں کے سفیر ان کے دربار میں حاضر رہا کرتے تھے۔

یقیناً یہ کارنامے نہایت شاندار ہیں لیکن اس باشان شکوہ حکومت کو مطالعہ کرنے میں جس چیز سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، وہ یہ کارنامے نہیں بلکہ ان کا انجام دینے والا ہے یہ اس عجیب و غریب شخص ہی کا کام تھا کہ اُس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تھی، ہر امر کی جزئیات تک سے واقف تھے، اسی وجہ سے وہ سلطنت کے عقدہ ہائے لاینحل کو چٹکیوں میں حل کروا لیتے تھے۔ یہ ہوشیار اور قابل ترین شخص، جس نے مرکزیت قائم کی، جس نے قوم و ملک میں اتحاد کا بیج بویا، جس نے دوسری سلطنتوں سے اتحاد کر کے سیاسی توازن قوت قایم کر دیا اور جس نے اپنی رواداری اور مسامحت سے بگڑے مذاہب

کے پیروؤں کو بھی اپنا مشیر بنانے میں دریغ نہ کیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ شخص زمانۂ وسطیٰ کا ایک مطلق العنان خلیفہ نہیں تھا بلکہ زمانہ حاضرہ کا ایک دستوری بادشاہ تھا"

اس خلیفہ کے دوران حکومت میں مشہور باغی عمر ابن حفصون مرا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا مشہور قلعہ خلیفہ نے فتح کر کے اس بغاوت کا قلع قمع کر دیا"

عبدالرحمٰن الناصرلدین اللہ کے وقت تک بنو امیہ کے بادشاہوں نے صرف امیر یا سلطان کے خطاب پر ہی اکتفا کی تھی اور اپنے آپ کو عباسیوں کے علی الرغم خلیفہ نہیں کہلوایا تھا لیکن اب تک زمانہ بہت کچھ پلٹا کھا چکا تھا۔ بنو عباس کمزور بلکہ عضو معطل ہو گئے تھے اس کے برخلاف بنو امیہ مغربی اپنے عروج کے پورے شباب پر تھے۔ اپنے پورے عروج پر تھے۔ ایسی حالت میں کہ خلفائے بغداد حقیقت میں اپنے امرا کے دست نگر ہو گئے ہوں۔ تو بنو امیہ کو کوئی بات اس امر میں مانع نہ آ سکتی تھی کہ وہ خود خلیفہ کا خطاب اختیار نہ کریں چنانچہ ۳۱۷ھ میں عبدالرحمٰن نے خلیفہ کا خطاب اختیار کیا اور امیر المومنین بن کر اپنا لقب الناصرلدین اللہ مقرر کیا۔ یہیں سے خلافت مغربی کا آغاز ہوتا ہے، جو ۴۲۲ھ میں انجام کو پہنچا۔

(۴) دورِ خلافت

امیر المومنین عبدالرحمٰن الناصر نے ۳۵۰ھ میں وفات پائی اور اُن کے بیٹے الحکم ثانی اُن کے جانشین ہوئے۔ اُنہوں نے سولہ برس حکومت کی، اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے باپ کی سیاسی حکمت عملی کو برابر جاری رکھا، سرحدوں پر بدنظمی نہ ہونے دی، اور تمام عیسائی بادشاہوں کو کم و بیش اپنا حلقہ بگوش بنائے رکھا۔ مگر ان کا سب سے عجیب غریب کام وہ نادر الوجود کتب خانہ ہے جو انہوں نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ یہ کتب خانہ نہ صرف اُس زمانہ میں دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا تھا بلکہ آج کل بھی کسی شاہی خاندان میں اس کی نظیر نہیں ملیگی۔ لطف یہ تھا کہ ان سب کتابوں پہ خلیفہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے وہ حواشی تھے جن کو علما ماہرین فن مستند سمجھتے تھے۔

مرتے وقت الحکم نے اپنے خوردسال بیٹے ہشام ثانی کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی ملکہ

صبح کو اس کا سرپرست بنایا۔ الحکم کے زمانہ حکومت ہی میں ایک ایسا شخص ظاہر ہو چکا تھا جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ایک طرف تو اندلس میں اسلامی طاقت کو انتہائے عروج پر پہنچائیگا اور دوسری طرف خلافت کی تباہی کا حقیقی باعث ہوگا۔ یہ شخص ابن ابی عامر المعروف بہ منصور تھا۔ انہوں نے نہایت گمنامی کی حالت سے ترقی کی، اور الحکم کے زمانے ہی میں دربار خلافت میں ایک اعلےٰ عہدہ پر پہنچ گئے۔ خلیفہ کے مرنے کے بعد تو انہوں نے دربار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ملکہ صبح بھی اُن کا دم بھرتی تھیں جو جو شخص ان کی ترقی میں مزاحم ہوا اُسے انہوں نے آہستہ آہستہ تہ تیغ کیا، یہاں تک کہ سلطنت میں ان کا کوئی ہمسر باقی نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ملکہ صبح سے مل کر اپنے اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے خلیفہ ہشام کو حرم سرائے میں نظر بند کر دیا، اور اس کو کسی قسم کی آزادی نہ دی۔ اس پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ یہ روایت کہاں تک صحیح ہے لیکن اس خصوص میں دو باتوں کو ہمیشہ خیال میں رکھنا چاہئے۔ اول تو یہ کہ خلیفہ الحکم اتنے نالائق اور بیوقوف نہ تھے کہ ملکہ کے ساتھ منصور کی ان سازشوں کو دیکھتے اور اُن سے چشم پوشی کرتے۔ دوسرے چند واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہشام کا دماغ کمزور تھا، اور ایسی دماغی کمزوری کو عوام سے پوشیدہ اور خلیفہ کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے ملکہ اور منصور نے یہ مناسب سمجھا کہ خلیفہ بالکل معاملات سے علیحدہ کر دیا جائے اور خلافت کا تمام کام بغیر اُس کے انجام دیا جائے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ المنصور نے اپنے آپ کو مطلق العنان بنا کر اور شاہی خاندان کو پس پشت ڈال کر نہ اپنے خاندان کو کوئی فائدہ پہنچایا اور نہ امویوں کو۔ جب تک وہ زندہ رہے اُن کی فوجی مہموں، فتوحات اور سخاوت و جود نے عامۃ الناس کی نظروں کو خیرہ کئے رکھا۔ مگر اُن کے مرتے ہی اُن کی حکومت کا اثر پورے طور پر ظاہر ہوا۔ اُن کے دو بیٹے مظفر اور عبدالرحمٰن یکے بعد دیگر برسر اقتدار آئے اور سلطنت کو اسی اسلوب پر چلانے کی کوشش کی جو ان کے والد قائم کر گئے تھے مگر اول تو ان میں وہ صلاحیت اور قابلیت نہ تھی اور دوسرے اب لوگ اس بات پر آمادہ نہ [illegible] خلیفہ کو ہمیشہ کے لئے نظر بند رکھا جائے۔ اس لئے چند دنوں کے بعد ہی دونوں [illegible]

سے گر گئے۔ ان کے محلات لوٹ لے گئے، اور بنو منصور کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ بالعموم ایک مطلق العنان اور مرکزی حکومت میں ہوا کرتا ہے، مرکز کا برباد ہو جانا غضب ہو گیا۔ اب نہ کوئی خلیفہ تھا اور نہ کوئی وزیر، جو حکومت میں امن رکھ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدامنی کا دور دورہ ہو گیا، اور آخر اسی بدامنی میں بنو امیہ کا خاتمہ ہوا۔

۳۹۹ھ میں خلیفہ ہشام ایسے غائب ہوئے، کہ اب تک ان کا پتہ نہ چلا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ ۳۹۹ھ سے ۴۲۲ھ تک کم و بیش چودہ خلیفہ یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھائے گئے۔ اگر اور تمام باتوں سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو خلفا کی یہ تعداد ہی اس زمانہ کی بدامنی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی و وافی ہے۔ ان میں سے بعض تو باغی اور غدار فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ آخری خلفاء کی حالت کا اندازہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ ہشام کی حالت سے ہو سکتا ہے، جو ۴۱۸ھ میں خلیفہ بنایا گیا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی ایک سیاسی انقلاب کا شکار ہوا اور رجب ۴۲۲ھ میں امراء کے حکم سے اسے جامع مسجد قرطبہ کے ایک حجرہ میں قید کیا گیا تو بے احتیاطی کی وجہ سے اسے پانی، کھانا، اور روشنی مہیا نہیں کی گئی۔ رات کے وقت گھپ اندھیرے میں خلیفہ اپنی چند خواصوں کے ساتھ اس قید خانہ میں پڑا تھا، اور اپنی چھوٹی بیٹی کو سردی سے بچانے کے لئے سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ کہ چند ارکین سلطنت حجرہ میں داخل ہوئے، اور اسے مجلس مشاورت کا حکم سنانے لگے۔ خلیفہ نے سنے بغیر ہی اس کو منظور کر لیا، اور التجا کی کہ تھوڑی سی روٹی بہم پہنچا دی جائے، تاکہ اس ننھی سی بچی کی جان بچ جائے۔ پھر اس کے بعد ہی ایک قندیل کی استدعا کی کہ اندھیرے کے عذاب سے نجات ہو۔ اندلس کے خلیفہ کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

ہر سیاسی انقلاب سے ان ہولناک واقعات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بربری اور صقالیہ جو اب تک حکومت کی طاقت سے رکے ہوئے تھے کھلم کھلا لوٹ مار کرنے لگے۔ قرطبہ لوٹا گیا، باشندگان شہر قتل ہوئے اور شہر کی عظمت و شان ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ عبد الرحمن الناصر کا وہ عظیم الشان شہر زہرا جس کو انہوں نے اس قدر صرف کثیر اور ذوق و شوق سے تعمیر کیا تھا برباد و تباہ کر دیا گیا۔

خلیفہ کی طاقت کے گم ہو جانے سے ہر شہر اور ہر علاقہ میں بادشاہ اور خود مختار حاکم پیدا ہونے لگے۔ اب طوائف الملوکی کا دور شروع ہو گیا تھا۔

(۵) طوائف الملوکی

خلافت کا ختم ہونا تھا کہ ہر طرف عمال و والی خود مختار ہونا شروع ہو گئے۔ اشبیلیہ اور قرطبہ میں جمہوری حکومتیں قایم ہوئیں، مگر یہ چند روزہ تھیں، اور ان کا زمانہ عروج بھی ہر طرح کے فتنوں سے بھرا ہوا تھا پانچویں صدی ہجری کے شروع ہی میں تمام اندلس چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہو گیا۔ ان میں اشبیلیہ کے بنو عباد، ملاغہ کے بنو حمود، غرناطہ کے بنو زیری، سرقسطہ کے بنو ہود، اور طلیطلہ کے بنو ذوالنون قابل وقعت ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ عروج بنو عباد کو حاصل ہوا۔ ان کے عروج کا قصہ عجیب ہے۔ قاضی ابوالقاسم محمد اشبیلیہ کے قاضی تھے۔ انہوں نے اپنے زمانۂ قضاء میں اس قدر عدل و انصاف سے کام لیا کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور شہر کے تمام کام ان کے سپرد کئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہشام ثانی دنیا سے غائب ہو چکے تھے اور ان کا پتہ نہ چلتا تھا۔ قاضی صاحب نے سلطنت حاصل کرنے کے لئے ایک ہشام ثانی خود بخود گھڑ لیا، یعنی اصلی خلیفہ ہشام ثانی کے غایب ہونے کے بیس برس بعد ایک شخص خلف نامی کو ہشام ثانی ظاہر کیا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص اور اصل ہشام میں اس قدر مشابہت تھی کہ لوگوں کو بھی یقین ہو گیا، اور اسی مبہم شخص کے پس پردہ قاضی ابوالقاسم نے اپنی طاقت و صولت کو مستحکم کر لیا۔ گرد و نواح کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے بادشاہوں نے بھی اس خلیفہ کی طاقت قبول کر لی۔ ابوالقاسم کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے عباد نے خلیفہ کو برطرف کر دیا، اور خود معتضد کے لقب سے بادشاہت کرنے لگا۔ وہ ۴۶۴ھ میں مرا، اور اپنے بیٹے معتمد کو اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ اس کے زمانہ میں وہ زبردست سیاسی انقلاب آیا، جس سے کہ پھر ایک مرتبہ اندلس میں سیاسی اتحاد قائم ہو گیا۔

الفانسو چہارم نے آسٹریاس، لیون اور کسٹائل کی سلطنتوں کو متحد کر کے مضبوط کر لیا تھا اور اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مسلمان اس سے خائف تھے۔ مسلمانوں کے آپس کی نا چاقی اس کا مقابلہ نہ کرنے دیتی تھی، اور تمام مسلمان ایک حد تک الفانسو کے حلقہ بگوش بنے ہوئے تھے۔

اس کی فتوحات کا سلسلہ قادیز تک آ گیا تھا، اور تمام جزیرہ نما کو عبور کر کے وہ بحیرہ روم تک پہنچ چکا تھا۔ آخر جب مسلمان بادشاہوں کو اس امر کا احساس ہؤا کہ الفونسو حقیقت میں تمام اندلس کو فتح کر کے اسلامی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے تو انہوں نے مجبور ہو کر اتحاد کیا۔ مگر پھر بھی رشک و حسد کا یہ حال تھا کہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ان میں سے کون سردار ہو۔ چونکہ اس کا تصفیہ نہ ہو سکا اس لئے لامحالہ باہر سے مدد لینا پڑی، یعنی مرابطین کے یوسف ابن تاشفین کو افریقیہ سے بلایا گیا۔

جن دنوں اندلس یوں آماجگاہ فتنہ و فساد تھا، افریقیہ میں بھی ایک زبردست مذہبی انقلاب آیا، جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ وہاں خاندان مرابطین (جس کو ملثمین بھی کہتے ہیں) کی سلطنت قائم ہو گئی۔ اندلس کی سلطنت کا استحکام صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ افریقیہ کے علاقہ پر قبضہ یا کم از کم اقتدار رکھا جائے۔ اسی بنا پر عبدالرحمٰن الناصر نے سبتہ پر، جو افریقیہ کی حقیقی کنجی تھا، قبضہ کر کے بنو فاطمہ کو، جو اس زمانہ میں افریقیہ پر قابض ہو گئے تھے، مغرب کی طرف بڑھنے سے روکے رکھا تھا۔ اس علاقہ میں انہوں نے اپنے ایسے طرفدار پیدا کر رکھے تھے جو خلافت مغربی کو آڑے وقت میں مدد دینے کے لئے تیار رہتے۔ مگر عبدالرحمٰن کے مرنے سے جہاں اور تمام باتوں کا خاتمہ ہؤا وہاں افریقیہ سے بھی اندلس کا اقتدار اٹھ گیا، اور مرابطین نے جو اسی زمانہ میں عروج پکڑ رہے تھے، الجیریا سے دریائے سینیگال تک کا تمام علاقہ فتح کر لیا تھا۔

غرض یہ ہیں وہ مرابطین جن سے بادشاہان اندلس نے اس نازک وقت میں مدد مانگی۔ ان کے بادشاہ یوسف ابن تاشفین نے اپنی تمام سلطنت سے فوجوں کو سمیٹ کر آبنائے کو عبور کیا، اور ۴۷۹ھ میں زلاقہ کے مقام پر مسلمانوں اور الفانسو کی فوج کے مقابلہ میں عیسائیوں کو ایسی شکست ہوئی کہ الفانسو بمشکل تمام پانچ سو سواروں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ سکا۔ فتح کے بعد معاہدہ کے مطابق یوسف واپس تو چلے گئے، مگر اندلس کا ملک ایسا نہ تھا کہ وہ مرابطین کی زد سے بچ سکتا۔ انہوں نے اس کا اور افریقیہ کا مقابلہ کیا، اور وہ تمام خوبیاں جو اندلس میں موجود تھیں افریقیہ میں مفقود پائیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ یوسف کو اندلس کی چاٹ لگ گئی۔ زلاقہ کے بعد انہوں نے پھر دو دفعہ

۴۸۱ھ و ۴۸۳ھ میں اندلس پر حملہ کیا، اور آخر اُس پر قابض ہوگیا۔ آخری مرتبہ جب یوسف اندلس آئے تو انہوں نے اشبیلیہ کو بھی فتح کر لیا، اور وہاں کے بادشاہ معتمد کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ افریقیہ لے گئے، اور اغمات میں اُسے قید کر دیا۔ یہیں وہ بادشاہ بحالت بےکسی مرگیا، جس کے علم و فضل اور داد و دہش کا تاریخ اندلس میں غلغلہ ہے۔

یوسف ابن تاشفین نے جو سلطنت اندلس میں ۴۸۳ھ میں قائم کی تھی وہ ۵۴۲ھ تک قائم رہی۔ اس عرصہ میں جو بربری یہاں آئے تھے وہ اندلسی تہذیب و تمدن کے اثر سے اپنی فوجی صفات تو کھو بیٹھے لیکن مہذب بھی نہ ہوسکے۔ یوسف ابن تاشفین اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں اندلس کی تہذیب کو نقصان پہنچا۔ ان زاہدان خشک کے عہد میں ہر قسم کی علمی چہل پہل ناممکن ہوگئی، اور بربریوں کی وجہ سے ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار بدستور گرم رہا۔

ان کی حکومت موحدین کی طرف منتقل ہوگئی۔ خاندان موحدین کے بانی محمد ابن تومرت نام ایک شخص تھے، جنہوں نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں تعلیم پائی تھی، اور حضرت امام غزالی کی تعلیمات سے پہلے مستفید ہوئے تھے۔ افریقیہ واپس آکر انہوں نے ایک مذہبی تحریک شروع کی اور آخر ۵۱۵ھ میں مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا۔ ۵۲۴ھ میں ابن تومرت کا انتقال ہوا، اور عبدالمومن اُن کے جانشین ہوئے۔ انہوں نے مرابطین کے خلاف جنگ کا سلسلہ چھیڑا اور جاری رکھا۔ ۵۵۳ھ تک انہوں نے سرحد مصر سے لے کر بحر اوقیانوس اور اندلس کا تمام علاقہ اپنے زیر تصرف کر لیا۔ یہ نیا خاندان، جو اب اندلس کی قسمت کا مالک ہوا، مرابطین کی نسبت کہیں زیادہ شائستہ اور علم کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ عبدالمومن کے بیٹے یوسف کے دربار میں ابن طفیل اور ابن رشد جیسے فلسفی حاضر رہتے تھے۔ ۶۲۸ھ تک موحدین کی حکومت کا بھی اندلس میں خاتمہ ہوگیا، اگرچہ وہ اس کے بعد کم و بیش پچاس برس افریقیہ پر حکومت کرتے رہے۔

موحدین کا اندلس سے نکلنا تھا کہ پھر تمام ملک بدامنی اور فساد کا آماجگاہ ہوگیا، اور آخر تمام اندلس میں صرف ایک مقام ایسا رہ گیا کہ جہاں مسلمان اپنا سر چھپا سکتے تھے۔

۶۳۳ھ میں محمد ابن الاحمر نے غرناطہ میں خاندان نصریہ کی بنیاد ڈالی جو ڈھائی سو برس تک عیسائیوں کا مقابلہ کرتا رہا، اسی کے فنا ہونے سے اندلس کے مسلمان فنا ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی چھوٹی سی ریاست کسی طرح عیسائی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی، لیکن اس کی دشوار گزاری اور عیسائیوں کی نفاق و شقاق نے مسلمانوں کے اس آخری پشت و پناہ کو بچائے رکھا۔ یوں اسی ریاست نے افاقۃ الموت کی طرح ایک مرتبہ پھر عربی تمدن و تہذیب یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا، اور اپنے آپ کو قرطبہ اور اشبیلیہ کی گزشتہ و برباد شدہ عظمت کا نہ صرف پورا جانشین ثابت کیا، بلکہ اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔

۸۹۷ھ میں اندلس کے مسلمانوں کا آخری شہر غرناطہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا نے فتح کر لیا، اور اس اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ فاتحین نے وحشیانہ جنون کا اظہار کیا۔ یہ جنون اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل نفرت ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال و مذہب کی حفاظت کے جو عہد و قول انہوں نے کئے تھے ان سب پر یک لخت پانی پھیر دیا گیا۔ جب ہم مسلمانوں کی مسامحت اور رواداری کا مقابلہ اس حالت سے کرتے ہیں۔ تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ یا تو عیسائی ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ایک گروہ کثیر نے جلاوطنی کو تبدیلِ مذہب پر ترجیح دی اور افریقہ چلے گئے۔ باقی ماندہ ہر طرح کے مصائب و تکالیف برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں ان کو فلپ ثالث کے حکم سے زبردستی اندلس سے نکال دیا گیا۔ ان کی اس جلاوطنی کا جو کچھ اثر اندلس پر ہوا۔ وہ ایسا ظاہر باہر ہے کہ اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے موٹی بات یہ ہے کہ آج یورپ بھر میں اسپین ہی سب سے متنزل سلطنت ہے۔

ب

اسپین میں عیسائیوں کا عروج

سنہ ۹۲ھ کی دریائے گوڈیلیٹ کی لڑائی جس میں طارق نے گاتھ افواج کو شکست دی دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ سات روز کی جنگ نے گاتھوں کی قوت کو جو تین سو برس سے قائم تھی پاش پاش کر کے سپین کو خلیفۂ اسلام کا ایک صوبہ بنا دیا۔ ایک ہی جنگ کے بعد گاتھوں نے ایسی ہمت ہاری کہ وہ پھر کوئی فوج دشمنوں کے مقابلہ میں مجتمع نہ کر سکے۔ دو برس کے عرصہ میں اسلامی افواج قاہرہ دریائے ڈورو بلکہ کوہستان پائرینیس تک پہنچ گئیں۔ اور اس کے ایک یا دو سال کے بعد عبد العزیز ابن موسےٰ ابن نصیر رحمۃ اللہ نے سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تمام ملک اندلس پر نہ صرف تسلط جما دیا بلکہ اس میں اسلامی نظم و نسق بھی قائم کر دیا۔ یہ فتح اور کامیابی اگر مسلمانوں کے لئے اس قابل ہے کہ وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے تو دوسری طرف اہالی اسپین کی کمزوری اور دون ہمتی کا ایک بدیہی ثبوت ہے۔ مسلمانوں نے اپنے آپ کو سپین ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ انہوں نے فرانس میں بھی فتوحات حاصل کیں۔ آخر سنہ ۱۱۲ھ میں چارلس مارٹل سے شکست کھا کر واپس ہوئے۔

گاتھوں کی شکست خوردہ اور بقیۃ السیف فوج نے بھاگ کر اسٹوریاس کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ یہاں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے جو مسلمانوں سے نفور اور "کفار" کی حکومت کے ماتحت رہنے سے محترز رہنا چاہتے تھے۔ اسٹوریاس کی جاء وقوع ایسی دشوار گذار اور ناموزوں ہے کہ فاتحین نے پہلے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ اور اگر کبھی غلطی سے اس میں داخل بھی ہو گئے تو ہمیشہ شکست ہی کھائی۔ ایسی حالت میں یہ کچھ تعجب انگیز بات نہیں کہ مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور ان چند لوگوں کو یہ سمجھ کر ان کی حالت میں چھوڑ دیا کہ خود ہی مرکھپ کر رہ جائیں گے۔

پناہ گزیناں اسٹوریاس نے پلیو نام ایک شخص کو اپنا سردار مقرر کیا اور اس کو گاتھوں کے آئین و قوانین کے مطابق تخت نشین کر دیا۔ اس شخص کے متعلق کچھ زیادہ حالات تو معلوم نہیں مگر یہ یقینی ہے کہ اس نے ۱۰۰ھ میں کواڈونگا کے مقام پر مسلمانوں سے ایک لڑائی لڑی اور اس میں مسلمانوں کو شکست دی تھی۔ اس جنگ و شکست کے نتائج یہ ہوئے کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ سپین والوں میں ابھی جان باقی ہے۔ اہالی سپین میں پھر ہمت پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کے ناقابل تسخیر ہونے کا جو رعب اور دہشت ان میں پیدا ہو گئی تھی وہ ان کے دل سے نکل گئی۔ چونکہ مسلمانوں کا سیلاب فتح رک گیا تھا اس لئے اسٹوریاس کی آزادی برقرار رہ گئی اور اس مقام پر وہ تمام لوگ جو مسلمانوں کی حکومت سے نفور تھے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ یہ مقام عیسائیوں کی سیاسی اور مذہبی جدوجہد کا مرکز قرار پا گیا۔ پلیو کے عہد حکومت کا غالباً یہ سب سے بڑا واقعہ ہے۔ وہ ۱۱۹ھ میں مر گیا اور اس کا بیٹا فلیوا اس کا جانشین ہوا اور اس کے بعد الفانسو اول ۱۲۱-۱۲۲ھ تخت پر بٹھایا گیا۔

یہ پلیو کا داماد تھا۔ اس نے عیسائیوں کی اس چھوٹی سی ریاست میں معتد بہ اضافہ کیا اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ سلطنت کہلائی جا سکے۔ اس نے تقریباً تمام جلیقیہ کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ دریائے ڈورو تک بڑھ آیا اور اپنی حدود سلطنت کو قشتالہ تک وسیع کر لیا۔ مشرق کی طرف بسکے اور نوار تک اس کی حکومت پھیل گئی۔ ان تمام کارناموں کی بنا پر اس کو اہل سپین اپنا ہیرو سمجھتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ الفانسو نے جن جہات میں اپنی سلطنت کو وسیع کیا تھا وہ ایسی تھیں کہ جہاں مسلمانوں نے کبھی اپنے قدم پوری طرح نہ جمائے تھے۔ بلکہ وہاں بجائے مستقل طور پر بس جانے کے انہوں نے صرف اپنی چھاؤنیاں قائم کر دی تھیں جن کو فتح کرنا آسان تھا مگر قائم رکھنا مشکل۔ چنانچہ وہ مقامات جو الفانسو نے مسلمانوں سے اس زمانے میں فتح کئے بعد کے زمانے میں اکثر مسلمانوں کے پاس آ گئے۔

الفانسو کی موت کے بعد عیسائی سلطنت پھر ذرا کمزور ہو گئی۔ اسی کمزوری کے زمانے میں (۱۶۲ھ

میں شارلے مین نے اندلس پر حملہ کیا، اور کوہستان پائرینیز میں گھستا چلا آیا، مگر دیگر فاتحین کی طرح اس کا انجام بھی شکست ہوا۔ تاریخ سپین کی حیثیت سے اس حملہ اور شکست کو یہ اہمیت ہے کہ ملکی حکایات کے مطابق برنرڈ ڈوڈل کارپیو نام ایک ہیرو نے اسلامی اور عیسائی افواج کی سرکردگی کا کام انجام دیا تھا۔ اسی لئے اس شخص کو اہالی سپین اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ ان ہی ملکی افسانوں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سپین میں اتحاد و اتفاق کی ایک لہر پھر شروع ہو گئی تھی، اور پرانی دو دن دشمنی آہستہ آہستہ رخصت ہوتی جاتی تھی۔

درمیانی بادشاہوں سے قطع نظر کر کے ہم الفانسو دوم پر آتے ہیں جس نے ۷۹۱-۸۴۲ء تک حکومت کی۔ اس نے اپنے مستقرِ سلطنت کو اوویڈو میں منتقل کر دیا۔ مگر باوجود پچاس سالہ عہدِ حکومت کے مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگ نہیں کی۔ اس کے پوتے آرڈونو اول ۸۵۰-۸۶۶ء کے عہد میں پھر ذرا ہل چل شروع ہوئی اور اس نے مسلمانوں کے ایک باغی امیر موسیٰ نامی پر البلدۃ کے مقام میں فتح پائی، اور اس کے بیٹے کو، جس نے طلیطلہ پر قبضہ کیا ہوا تھا، مجبور کیا کہ وہ اس کا مطیع ہو جائے۔ یہ فتوحات اسلامی اندلس کی بے چینی کے زمانہ میں ہوئی تھیں، کیونکہ اس وقت محمد ابن عبدالرحمٰن اندلس میں برسرِ حکومت تھا، اور اس کے زمانے میں ہر طرف بغاوت و طغیان کا دور دورہ تھا۔ ان ہی بغاوتوں سے فائدہ اٹھا کر اورڈونو نے فتوحات حاصل کی تھیں۔ بہرحال ۸۶۶ء میں اپنی موت کے وقت اس نے عیسائی سلطنت کو سلمنقا تک وسیع کر لیا تھا۔

الفانسو ثالث کے عہدِ حکومت (۸۶۶-۹۱۰ء) سے تاریخ سپین کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اہل سپین نے ڈیڑھ صدی میں مسلمانوں کی سلطنت کو کم از کم دریائے ڈورو تک، ایک جانب، اور دریائے گواڈیانہ تک، دوسری جانب ہٹا دیا تھا، اور ساحلِ سمندر تک کے تمام کوہستانی علاقے کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہو گئے تھے۔ اسٹوریاس، بسکے، جلیقیہ اور شمالی پرتگال ان کے پاس تھا۔ آئندہ صد سالہ خوشحالی اور ترقی کے لئے عیسائی الفانسو ثالث کے رہین منت ہیں۔ اس کے چالیس سالہ عہدِ حکومت میں مسلمانوں سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس نے

امیر عبداللہ اور اس کے باغی سرداروں کو چند شکستیں دیں جن کی وجہ سے عیسائی افواج کی دھاک بیٹھ گئی، اور عیسائی سلطنت کی بنیاد مضبوط ہو گئی۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زمانہ سلطنت اندلس میں پھر انتشار کا زمانہ تھا۔ امیر عبداللہ قرطبہ میں برسر حکومت تھے لیکن برائے نام۔ حقیقت میں تمام ملک باغیوں کا جولانگاہ بنا ہوا تھا جن میں سے کوئی بھی اتنا طاقتور نہ تھا کہ مستقل سلطنت قائم کر سکتا، لیکن بدامنی کی وجہ سے مرکزی حکومت کی کمزوری کا ضرور باعث ہوا تھا۔ اس کمزوری اور لامرکزیت سے الفانسو ثالث نے فائدہ اٹھایا، اور مسلمانوں کی کئی فوجوں کو شکست دے کر اپنی عزت بڑھائی۔ الفانسو کی موت کے بعد اس کے بیٹے غرشیہ نے اپنے مستقر سلطنت کو اوویڈو سے لیون کو منتقل کر لیا۔ اس وقت عیسائی اپنے پہاڑی قلعوں اور گھاٹیوں کی جائے پناہ سے باہر نکل آئے تھے، اور مسلمانوں کے سامنے مقابلہ پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ غرشیہ اور اس کے بھائی اورڈونو کے عہد حکومت میں مسلمانوں سے جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کا نتیجہ بہت کچھ انقلابات کے بعد یہ ہوا کہ نہ سلطنت لیون کی سرحدیں مضبوط ہو گئیں اور اس کی طاقت بھی ایک حد تک ذرا وسیع ہو گئی لیکن اب عبدالرحمٰن الناصر کا زمانہ تھا اور فتوحات کا حاصل کرنا آسان کام نہ رہ گیا تھا چنانچہ ول ڈی جنکیورا کے مقام پر ۳۲۷ھ میں آرڈونو نے خلیفہ اعظم کی فوج سے سخت شکست کھائی، جس کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا کیونکہ ۳۱۸ھ میں رومیرو دوم نے اپنے تمام عزیز و اقارب کو اندھا کر کے تخت کو غصب کر لیا۔

رومیرو کی بست سالہ عہد حکومت میں قشتالہ سب سے پہلے بروئے کار آیا۔ یہ علاقہ اس وقت تک سلطنت لیون کا باجگزار رہتا تھا، لیکن اب خود مختار ہونے لگا۔ اس کی وجہ سے سلطنت میں پھر بے چینی پھیلی۔ یہاں تک کہ سلطنت کے ایک عہدیدار سینکو نے عبدالرحمٰن کے دربار میں پناہ لی اور اسی کی فوجی مدد سے پھر لیون واپس آ کر دوبارہ سلطنت حاصل کی۔

اس کے بیٹے رومیرو ثالث (۳۵۷-۳۶۲ھ) کے عہد میں بے چینی برابر قائم رہی، اور رہی سہی قوت و طاقت کا خاتمہ منصور کے حملوں نے کر دیا، جنہوں نے عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی گستاخیوں

اور دست درازیوں کو اس طرح روکا کہ اُن کے زمانۂ اقتدار میں وہ تقریباً مٹ گئے۔ یہاں تک کہ المنصور نے شنت یاقو کی فتح سے معلوم ہوتا تھا کہ عیسائی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے لیکن ۳۹۲ھ میں منصور کا مرنا مسلمانوں کے لئے غضب ہو گیا۔ خود اُن کے خاندان کا خاتمہ ہوا اور مسلمانوں کا عروج بھی زوال سے تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد عیسائیوں کو کسی مرکزی اسلامی حکومت کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ محض چھوٹے امراء سے ان کا سابقہ پڑا، جن کو شکست دینا اور زیر کر لینا کچھ بڑا کام نہ تھا۔ اسی وقت خانگی تنازعات کو ختم کرنے کے خیال سے قشتالہ کی ریاست کو خودمختار تسلیم کر لیا گیا، اور وہاں کے حکمران کو بادشاہ کا خطاب دیدیا گیا۔

اب چند سال کے واقعات کو نظر انداز کر کے ہم فرڈی نینڈ اول پر توجہ کرتے ہیں جو ۴۲۹ھ سے ۴۵۸ھ تک برسرِ حکومت رہا۔ یہ لیون اور قشتالہ دونوں کا بادشاہ تھا، یعنی اس کے عہدِ حکومت میں یہ دونوں سلطنتیں متحد ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں سے اس نے پرتگال کا ایک بڑا حصہ چھین لیا، قشتالہ کی حدود دریائے ٹیگس تک وسیع کر دیں۔ وہ طلیطلہ کو بھی فتح کر لیتا، مگر امیر شہر نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور خراج دینا منظور کر لیا۔ اس کے علاوہ اُس نے اشبیلیہ کے امیر کو مجبور کر کے ایک ولی کے تبرکات حاصل کئے۔ انہی کارناموں کے دوران میں وہ بیمار پڑا، اور لیون واپس آکر ۴۵۸ھ میں مر گیا۔ اپنے موت سے پہلے اس نے سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے اس اتحاد کا خاتمہ کر دیا، جو مسلمانوں کے اخراج کے لئے ضروری تھا۔ آخر بہت سے انقلابات کے بعد الفانسو ششم مستقل بادشاہ مانا گیا، اور مسلمانوں کے لئے پھر عیسائیوں کی متحدہ طاقت باعث فکر و خوف ہونے لگی۔

لیکن باوجود اس کے کہ الفانسو ششم لیون اور قشتالہ کا بادشاہ ہو گیا تھا، اگر تمام عمر اس کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ دوسرے دشمنوں کے علاوہ اس کا سب سے بڑا اور خطرناک دشمن سڈ تھا۔

یہ شخص قشتالہ کا ایک امیر تھا، اور الفانسو کے ساتھ اس کو خاص خصوصیت تھی۔ سڈ حقیقت

میں قساوت قلب، شقاوت نفس، بے دینی، مذہبی جنون، بے رحمی، شہامت و شجاعت، قزاقی اور اٹھائی گیری کا ایک عجیب و غریب معجون مرکب ہے۔ گو وہ مسلمان اور عیسائی سلطنتوں کے خلاف لڑا، مگر اس نے عیسائیوں سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ عربی تاریخوں میں اسے طعون اور ابن خبیث کہا گیا ہے مگر اہالئے سپین کا وہ ایک نامور ہیرو ہے۔

بہرحال الفانسو کے عہد حکومت میں اس نے گاتھوں کے قدیم دارالسلطنت طلیطلہ کو فتح کر لیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کو سخت رنج پہنچا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود وسط اندلس میں اسلامی اقتدار اور قوت میں کس قدر ضعف آچکا تھا۔ عین اس وقت جبکہ عیسائی شوکت بڑھ رہی تھی، یوسف ابن تاشفین مسلمانوں کی مدد کو پہنچ گیا، اور زلاقہ کے مقام پر اس نے عیسائیوں کو ایسی شکست دی کہ نصرانی ترقی ایک بارگی رک گئی، اور المرابطین کے خاندان نے پھر ایک مرتبہ اسلامی حکومت میں جان ڈال دی۔ الفانسو نے افریقی فاتح کے خلاف جدوجہد کے لئے فرانس کے شاہی خاندانوں سے روابط پیدا کئے۔ مگر اس کا صحیح نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ۵۰۳ھ میں الفانسو مر گیا اور سلطنت اس کی بیٹی کے حصہ میں آئی جس نے اراگون کے الفانسو اول سے دوبارہ شادی کر لی۔

بارھویں صدی کے نصف آخر میں سپین بے چینی، تفریق اور انتشار کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ تمام ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان ریاستوں میں اتنی قوت تھی کہ مسلمانوں کے خلاف لڑ سکیں اور نہ ان کا یہ مقصد تھا۔ بعینہٖ یہی حالت خلافت اموی کے انتزاع کے بعد اسلامی اندلس کی ہو گئی تھی۔ سینکو ۲۹۹ھ میں ل ڈی جنکیورل کے مقام پر مسلمانوں سے شکست کھا چکا تھا، لیکن پھر بھی اپنی حکومت کے آخری حصہ میں اس نے سرحد پر چند مضبوط قلعے فتح کر لئے تھے، اور دریائے ایبرو کے شمال میں مسلمانوں کے مقبوضات کا بالکل خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بیٹے غرشیہ کے زمانے میں تھوڑی رات کے لئے تمام نصرانی سپین پھر متحد ہو گیا لیکن اس کی موت کے بعد اس میں پھر انتشار پیدا ہوا۔ آخر یہ بد امنی کہیں ۵۲۳ھ میں جا کر ختم ہوئی۔ اس سال تمام متفرق صوبے سلطنت اراگون کے ساتھ متحد ہو گئے اور اس طرح مشرق میں مسلمانوں کی ترقی

کا سدباب ہوگیا، اور عیسائی طاقت اسپین میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ ملک میں دو ہمسر عیسائی سلطنتیں قائم ہوجانے سے مسلمانوں کے اخراج میں زیادہ دیر لگی۔ کیونکہ یہ دونوں حکومتیں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پرخاش رہا کرتی تھیں +

اس واقعہ سے کم وبیش ایک صدی کا وقفہ حذف کرنے کے بعد ہم فرڈی نینڈ دوم پر آتے ہیں۔ یہ قشتالہ اور لیون کی متحدہ سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اس کے زمانہ میں موحدین کی خلافت برباد ہوچکی تھی، اور تمام اسلامی اندلس میں اشبیلیہ، قرطبہ، جیان، غرناطہ اور بلنسیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں باقی رہ گئی تھیں جن کو فتح کرلینا آسان تھا۔ قشتالہ کے حقیقی ہمسر مسلمان نہ تھے، بلکہ اہل ارگون تھے۔ یہ دونوں سلطنتیں برسرپیکار رہتی تھیں۔ آخر اس طرف سے بےفکر ہوکر فرڈی نینڈ دوم نے مسلمانوں کی طرف توجہ کی۔ حالت یہ تھی کہ عیسائیوں کے لئے اندلوشیہ کا راستہ کھلا ہوا تھا، اور قرطبہ تو ان کے قدموں کے نیچے تھا۔ چنانچہ فرڈی نینڈ نے ۶۲۳ھ میں جنوب پر فوج کشی کی تیاری کی۔ اس وقت مسلمانوں میں بنو ہود سب سے زیادہ زبردست تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ اسلامی شان وشکوہ پھر قایم کردیں۔ انہوں نے غرناطہ، مرسیہ، قرطبہ اور اشبیلیہ کو متحد کرلیا، مگر یہ سب کچھ فاقتہ الموت سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ خود مسلمانوں کی ناچاقیوں اور رشک وحسد نے وہ کام کیا جو عیسائی فوجیں ہرگز نہ کرسکتیں۔ فرڈی نینڈ کی فوجیں جنوب میں پہنچیں، اور بہت سا علاقہ، جو مسلمانوں نے گزشتہ دنوں میں اس سے واپس لے لیا تھا، فتح کرلیا۔ ایک فوج نے وادیش کے میدان میں ابن ہود کو شکست دی۔ ۶۳۳ھ میں آخر قرطبہ فتح کرلیا گیا۔ اس وقت جبکہ فرڈی نینڈ فتوحات حاصل کر رہا تھا، ارگون کے بادشاہ نے بلنسیہ فتح کیا۔ (۶۳۶ھ) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا اندلس میں آخری وقت ہے۔ اس کے بعد یہ فاتح بلنسیہ اور مرسیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ریاست اس زمانے میں مسلمانوں کی انتہائی شمالی سرحد تھی۔ بنو نصر اسی وقت غرناطہ میں محمد ابن الاحمر کی سرکردگی میں ایک سلطنت قائم کرچکے تھے، اور کوشش کر رہے تھے کہ غرناطہ کو خلافت اموی کا نعم البدل بنا دیں۔ انہوں نے افریقیہ کی سلطنت سے اتحاد کرکے اس سے مدد چاہی۔ مرسیہ کو ارگون کے بادشاہ نے فتح کرکے اس اسلامی ریاست کا

بھی خاتمہ کر دیا۔ اس عرصہ میں قشتالہ کی ترقیات بھی جاری تھیں۔ فرڈی نینڈ ثالث نے مرسیہ اور جیان کے دور افتادہ اسلامی شہروں پر حملہ کر کے کسی کو فتح کر لیا، اور کسی کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ خود جیان کا، جو محمد ابن الاحمر کی غرناطہ کی سلطنت کا سرحدی شہر تھا، محاصرہ کیا گیا، اور اسلامی فوج کو شکست ہوئی۔ ایسے خطرناک حالت میں محمد نے اپنے آپ کو اس قدر ذلیل کیا کہ فرڈی نینڈ کا باجگزار بن گیا، اور یہ شرط کی کہ جب حکم ہوگا وہ عیسائی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوجایا کریگا۔ اس کی تھوڑی مدت کے بعد فرڈی نینڈ نے اشبیلیہ کے اسلامی شہر کا محاصرہ کیا، اور اپنے باجگزار محمد کو حکم دیا کہ معاہدہ کے مطابق وہ جیش لے کر حاضر ہو جاوے۔ چنانچہ اسلامی فوجوں کے زور سے اشبیلیہ فتح کیا گیا (۶۴۶ھ)۔ اشبیلیہ کی اہمیت یہ تھی کہ اب سب سے پہلی مرتبہ قشتالہ کو ایک ایسا بندرگاہ حاصل ہو گیا جس میں کہ بڑے سے بڑا جہاز آ سکتا تھا۔ ۶۵۰ھ میں فرڈی نینڈ ثالث مر گیا، اور الفانسو دہم اس کا جانشین ہوا، مگر اس کے زمانہ میں کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔

الفانسو دہم کے مرنے کے بعد سینکو ششم کو بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے ۶۹۲ھ میں طریفہ مسلمانوں سے فتح کیا۔ یہ شہر ساحل سمندر پر سپین کے بعید ترین علاقہ میں واقعہ تھا۔ اس کی موت پر اس کا بیٹا الفانسو بادشاہ بنا، مگر اس کی عمر چونکہ صرف چند ماہ کی تھی اس لئے اس کے سرپرست مقرر کئے گئے۔ اس کی نابالغی کے زمانہ میں خانہ جنگی رہی۔ جب اس نے بالغ ہو کر مہام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو جبل الطارق پر حملہ کیا، اور ۷۰۹ھ میں اس کو مسلمانوں سے فتح کر لیا۔ لیکن پھر محمد چہارم شاہ غرناطہ نے اسے واپس لے لیا۔ الفانسو یازدہم نے نئے سرے سے اسے فتح کرنا چاہا۔ گو اس نے مسلمانوں کو ایک شکست بھی دی، لیکن محاصرہ اٹھا لینا، اور نوارد واپس جانا پڑا۔ مسلمانوں نے جنگ کی تیاری کی، جنگ شروع بھی ہوئی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۴۱ھ میں سخت شکست کھائی، اور ان کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد الفانسو الجزیرہ کی طرف متوجہ ہوا اور ۷۴۳ھ میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ دو برس کے محاصرہ کے بعد ۷۴۵ھ میں یہ علاقہ پہلے عیسائی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ ۷۵۱ھ میں جبل طارق کا دوبارہ

محاصرہ جاری تھا کہ الفانسو مر گیا۔

الفانسو کی موت سے قشتالہ کے جنگ جو بادشاہوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد کم و بیش ایک سو برس تک الفانسو کے جانشین، بجائے فتوحات حاصل کرنے کے، یا تو نالائق تھے اور یا اپنے اندرونی معاملات میں اس طرح منہمک رہے کہ انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا لیکن انہوں نے اس مقصد کو فراموش نہیں کیا، بلکہ کبھی کبھی اس کی طرف متوجہ ہو کر وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے دیا کرتے تھے ازابیلا، ملکۂ قشتالہ کی حکومت تک یہ حالات برابر باقی رہی۔ جولائی ۱۴۷۳ھ میں الفانسو شاہ قشتالہ مرا، اور اس کے بعد اس کی بہن ازابیلا اس کی جانشین ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر صرف سولہ برس کی تھی، اور ہر طرف سے اس پر مصائب اور خانہ جنگی کا نرغہ تھا۔ یورپ کے مختلف شہزادے اس سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے، آخر اس نے اراگون کے شہزادہ فرڈی نینڈ کو منتخب کیا، اور ۱۴۶۹ء میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ ۱۴۷۴ء میں مستقل طور پر ازابیلا قشتالہ کی ملکہ ہوئی اور اس کی تھوڑی مدت میں فرڈی نینڈ اراگان کا بادشاہ بن گیا۔ ان دونوں نے اپنی متحدہ سلطنت کا پہلے نظم و نسق درست کیا، اندرونی معاملات میں جو خرابیاں پڑ گئیں تھیں انہیں دور کیا، اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ان لڑائیوں کی چھیڑ چھاڑ مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔

۸۸۱ھ میں ابوالحسن شاہ غرناطہ سے خراج کا مطالبہ کیا گیا، اور اس نے انکار کیا۔ ۸۸۶ھ اس نے قشتالہ کی سرحد کو عبور کیا اور زاہرہ کے مقام پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جواب میں عیسائی افواج الحمہ پر قابض ہو گئیں، اور باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ۸۸۷ھ میں خود فرڈی نینڈ کی سرکردگی میں عیسائی افواج غرناطہ میں داخل ہوئی اور لوجا کا محاصرہ کیا، مگر شکست کھائی۔ اس نازک وقت میں مسلمانوں کی نااتفاقی پھر بروئے کار آئی۔ ابوالحسن کو اس کی ملکہ اور بیٹے ابوعبداللہ نے غرناطہ سے نکال دیا، اور باپ بیٹوں میں خوب لڑائیاں ہوئیں، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوعبداللہ بادشاہ بن گیا۔ چند روز کے بعد اس نے عیسائیوں سے شکست کھائی اور قید ہو گیا۔ اہل غرناطہ نے پھر ابوالحسن کو

بادشاہ بنا لیا، لیکن فرڈی نینڈ نے ابو عبداللہ کو چھوڑ دیا تاکہ وہ پھر غرناطہ میں جا کر فساد مچائے۔ اہل شہر نے دونوں کو ہٹا کر ابوالحسن کے بھائی عبداللہ کو اپنا امیر بنا لیا۔ ایک اور انقلاب کی وجہ سے عبداللہ غرناطہ سے بھاگا اور بازا میں ایک ریاست قائم کی۔ ازابیلا نے اس پر حملہ کیا اور ۸۹۳ھ میں یہ علاقہ فتح کر کے غرناطہ کو بالکل بے دست و پا کر دیا، اور آخر بازا کو فتح کر لیا۔

ابو عبداللہ کو قید سے آزاد کرتے وقت یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر بازا فتح ہو گیا تو وہ غرناطہ عیسائیوں کے حوالہ کر دیگا، چنانچہ اب اس سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے لیت و لعل پر غرناطہ کا ایسا محاصرہ کر لیا گیا کہ ۲ جنوری ۸۹۸ھ کو غرناطہ عیسائیوں کے حوالہ کرنا پڑا۔

آخری منظر مجھ سے نہ بیان کیا جائیگا۔ مختصر یہ ہے کہ ایک طرف سے فرڈی نینڈ شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہو رہا تھا، اور دوسری طرف سپین سے مسلمانوں کی عظمت کا جنازہ نکل رہا تھا

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم همہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

زندہ و پائندہ باد خسرو دکن

محمد جمیل الرحمن
پروفیسر تاریخ اسلامی و فیلو جامعہ کلیہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن
صانہ اللہ عن الشر و الفتن
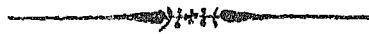
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ مترجم

الحمد للہ الذی لہ فی کل شیٔ اٰیۃ تدل علی الوھیتہ و وحدانیتہ والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد رسولہ الذی فضل علی کافۃ بریتہ وعلی اٰلہ واصحابہ وانصارہ وذریتہ ـ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۔ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اما بعد

مجھے کوئی لمبا چوڑا دیباچہ نہیں لکھنا ہے مسٹر سکاٹ کی یہ تاریخ نہ اخلاق کی کتاب ہے کہ دیباچہ درکار ہو نہ دیوان ہے کہ سر مطلع کی ضرورت ہو نہ قصیدہ ہے کہ تشبیب کے بغیر تشنہ ہے، یہ کتاب اول سے آخر تک ایک مرثیہ ہے کہ دیباچہ سے مستغنی ہے، رونے رُلانے کا سامان ہے کہ جس کے لئے تمہید درکار نہیں۔ نالہ کے لئے نے کو ڈھونڈھنا فریاد کے لئے نے پیدا کرنا اگر ضروری نہیں تو مسٹر سکاٹ کی تاریخ کے واسطے دیباچہ کی ضرورت نہیں۔ چشم تصور کے سامنے ایسی ہستی کو لے آئیے جو مدارج علیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، جس کو آپنے خود اپنی آنکھوں بہزاران ہزار جلال تخت بادشاہی پر جلوہ گر دیکھا ہے، پھر اسی ہستی کو آپ اس صورت میں دیکھئے کہ اُس کو بوسیدہ کفن بھی نصیب نہیں، اُس پر رونے والے ہیں، اور اُف نہیں کرتے، اُس پر ماتم کرنے والے ہیں، اور تاسف نہیں کرتے، پھر ستم پر ستم یہ دیکھئے کہ اُس کا نشان قبر بھی مٹا دیا گیا، بس اسی کو دیباچہ سمجھ لیجئے ؛ مگر خبردار کہیں آپ کی چشم تصور دھوکا نہ کھائے، وہ سکندر و دارا کے کفنوں میں اُلجھ کر

نہ رہ جائے، بلکہ وہ اُس قوم کو تلاش کرے جو "کانوا من آیاتنا عجبا" کی تفسیر ہے۔ جنتان عن یمین و شمال دمشق کی سیر کرتی، افریقیہ کو دیکھتی، آبناء جبل طارق کو عبور کرتی سپین پہنچے، اقدۃ الاسلامین فخر المومنین طارق ابن زیاد اور موسےٰ ابن نصیر (اللّٰھم بَرِّد مضجعہما) کے نیزہ و شمشیر کی چمک کو دیکھے، عبدالرحمٰن الداخل کے مصایب کا ساتھ دیتی ہوئی، اُن کو تخت پر متمکن دیکھے، الناصر لدین اللہ کے پرہیبت درباروں میں شریک ہوتی ہوئی، ابو عبداللہ کی بے سرو سامانی کو دیکھے، مولدین کی مظلومیت کو دیکھتی ہوئے، عامتہ الناس تو ایک طرف اُن بادشاہوں کی قبروں کو تلاش کرتے جن سے اُس زمانہ کے بڑے بڑے سرکش سلاطین ڈرتے تھے، اور اُن کا پتہ و نشان نہ پاکر اگر آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئیں تو ان ہی کو آپ اس کتاب کا خلاصہ سمجھ لیجئے۔

اس میں شک نہیں کہ پیدائش و موت، عروج و زوال کا ایک سلسلہ نامتناہی ہے کہ از آدم تا ایں دم چلا آتا ہے، اور تا بقیام قیامت چلا جائیگا۔ مگر بعض مولود دنیا بھر کے لئے مسعود ہوتی ہے، اور بعض موت تمام عالم کے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ ان ہی میں وہ اعراب ہیں جنھوں نے سپین جیسے ملک مظلم کو فتح کرکے، نہ صرف اُسی ملک کی، بلکہ تمام براعظم یورپ کی کایا پلٹ دی۔ علم و سائنس کے وہ دریا بہائے کہ اُس سے نہ صرف یورپ ہی سیراب ہوا، بلکہ ایشیا کے اکثر حصص نے اپنے دامنوں کو موتیوں سے بھر لیا۔ ان اعراب کی سلطنت اگر ایک طرف آیۂ رحمت الٰہی تھی، تو دوسری طرف نمونۂ ملک گیری و ملک داری۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اُن کو علایا ہی منت پذیر نہ ملی تھی کہ اُن کی قدر کرتی، ورنہ آج یہ دیکھا جاتا کہ رومیوں کی تاریخ کو دہرایا، اُن کے قوانین کو سراہا، اُن کی پالیسی پر عمل کیا جاتا ہے، بلکہ تمام یورپ ان عربوں کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی، اُن کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتی، ان کے قوانین کو مکمل ترین مانتی، اُن کے نظم و نسق و انتظام مملکت کی پیروی کرتی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی بے تعصبی، اُنکی مساحت، اُن کی مساوات کو اپنا ورد زبان بناتی۔ سچ ہے، اس کے کیا ہوا؟ محسن کشی مسیحی جوش دینی نے کز لک تعصب ہاتھ میں لے کر ان محسنوں کا نام و نشان بھی مٹا دیا۔ مجھے رومیوں کی جلالت اور علو شان

سے انکار نہیں، میں اُن کے کارناموں اور اُن کی فتوحات کو بیحد عظمت سے دیکھتا ہوں، مگر جب
بامعان نظر دیکھتا ہوں تو اُن کی ملک گیری کا تمام تر خلاصہ یہ پاتا ہوں کہ "پہلے پھوٹ ڈالو، اور پھر
فتح کر لو"، اُن کی ملک داری کا عطر یہ دیکھتا ہوں کہ "مفتوحین ایک ادنے مخلوق الٰہی ہے، اُس کو
صرف اپنے فایدہ کے لئے زندہ رکھو، اور اس کا خون تک پی جاؤ"۔ کسی شخص کے لئے اُس سے
زیادہ ذلیل پالیسی، اور اس سے بڑھ کر کمینہ حرکت نہیں ہوسکتی، چہ جائے کہ ایک بادشاہ کے واسطے
اب مسلمانان اندلس پر غور کیا جائے تو اُن کی فتوحات ایسی نظر آتی ہیں کہ شجاعت اگر اُن پر ناز
کرے تو بجا ہے، اُن کی ملک داری کا وہ عالم ہے کہ اگر عدل و انصاف، مسامحت و مساوات اُن پر
فخر کریں تو صحیح ہے۔ میرے اس قول کی تفسیر یہ ضخیم کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کو یہ
تاریخ دیکھنا اور اُس سے فایدہ اُٹھانا چاہیئے ۔

مسلمانوں کو تو بالخصوص ان سے گرویدگی ہونا چاہیئے! نہ اس لئے کہ مسلمانانِ اندلس
اُن کے بھائی اور باعث فخر ہیں، بلکہ اس واسطے کہ وہ ہمارے لئے باعث ہزار مباہات ہیں، اور مجسم عبرت
تاریخ، خواہ کسی قوم کی ہو، آیندہ نسلوں کے لئے سبق آموز ہوتی ہے، بشرطیکہ کوئی اُس سے پند حاصل کرے
اسی تاریخ کو لیجئے اور دیکھئے کہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے جو پالیسی مسیحیان یورپ نے آج سے سات
آٹھ سو برس پہلے قائم کی تھی، اُس پر برابر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، اور دشمنوں کو اُس میں کامیابی ہوتی
جارہی ہے۔ اگر آپ اندلس میں اپنے زوال پر غور فرمائیں تو خلاصہ صرف یہ نکلتا ہے کہ ذاتی آزادی
کی دو دلدادہ اقوام یعنی اعراب و برابرہ کا تصادم ہوتا ہے، ایک دوسرے کو تباہ کر ڈالنا چاہتے
ہیں، جس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کی قبریں تک اُس ملک سے اُکھاڑ کر پھینک دی گئیں،
جس میں وہ ایک دوسرے کو محکوم بنا کر رہنا چاہتے تھے۔ میں صرف ان ہی دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں
اُن سبقوں کو کہاں تک بیان کروں جو ذوق سلیم خود اس تاریخ سے اخذ کرسکتا ہے۔ یہ دونوں مثالیں
ایسی اہم ہیں کہ زبان حال سے پکارے گلے کہہ رہی ہیں کہ "من نکردم شما حذر بکنید"
تکلف برطرف بدقسمت ہیں وہ ہستیاں جو تاریخ سے فایدہ نہیں اُٹھاتیں، اور اس کو بجائے صحیفہ

عبرت آدحفظ ما تقدم کے نہیں ملاحظہ کریں، بلکہ ایک افسانہ سمجھتی ہیں۔ اگر مسلمانان ہند اس تاریخ کو محض دل بہلانے کا سامان ہی سمجھ کر ملاحظہ فرمائینگے، تو میں اسی کو بسا غنیمت سمجھونگا۔ وہ انشاء اللہ اس کو بہت ہی دلچسپ پائینگے؛ جس کا ثبوت میں یہ دے سکتا ہوں کہ اس نے مسٹر سکاٹ جیسے آدمی کو ایسا مسحور کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عمر عزیز کے بیس برس اس تاریخ پر خرچ کر دیئے ہیں۔

مسلمانان عالم کو جناب ممدوح کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے وہ کام کیا ہے، جو خود مسلمانوں کو کرنا چاہیئے تھا۔ میں ذاتی طور پر ممدوح کا مرہون احسان ہوں کہ انہوں نے مجھے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس کتاب کے ترجمہ کی اجازت عطا فرمائی۔ میں چاہتا تھا، اور کئی بار اُن سے درخواست بھی کی کہ وہ اپنی سوانح عمری بھیج دیں، مگر انہوں نے منظور نہیں کیا، لیکن میں اب تک اس سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ اگر مجھے آخر وقت تک بھی مل گئی تو میں اپنے قدر افزا ناظرین کے سامنے پیش کرونگا۔ موصوف الشان کے جتنے حالات اس وقت تک مجھے معلوم ہوسکے ہیں وہ یہ ہیں کہ ممدوح (سیموئیل پارسنس سکاٹ) ۱۸۴۶ء میں بمقام ملس برڈاوہیو (امریکہ) پیدا ہوئے، ۱۸۶۶ء میں ایم اے پاس کرکے قانونی امتحانات دیئے، ۱۸۶۸ء میں بیرسٹر ہوئے، اور ۱۸۷۵ء تک وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد ادب و تاریخ کی خدمت میں مصروف ہوئے اور غالباً اس وقت تک یہی شغل ہے۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں شادی کی۔ براعظم یورپ کی سیر کرتے ہوئے اس تاریخ کو مکمل کرنے کے لئے برسوں سپین میں رہے، اور ۱۹۰۴ء میں یہ بے نظیر کتاب شایع کی، جو آپ کے زیر نظر ہے۔ از روئے خیالات سیاسی آپ آزاد جمہوریت کے حامی ہیں۔ مسلمانوں سے آپ کو جو اُنس ہے وہ اس کتاب سے ظاہر ہے۔ میرے نام اُن کے جو عنایت نامجات آئے ہیں اُن کے جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ دیکھینگے کہ میں نے اپنی کتاب بھر میں مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے، اور جو کچھ لکھا ہے بالکل بے رو رعایت۔ جہاں تک مسلمان مستحق ہیں، میں نے ان کی تعریف کرنے میں کمی نہیں کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے اُس مصلح اعظم سے بہت

بڑی گردیدگی رہی ہے، جس کے آپ پیرو ہیں؛ اور میں سچے دل سے اس کا معتقد ہوں کہ آپ پیغمبر خدا تھے۔ (صلے اللہ علیہ وسلم) زمانۂ حال کی سائنس نے عربی فلسفیوں، عالموں اور طبیبوں کے بیحد و حساب احسانات کو نہ پہلے تسلیم کیا، نہ اب تک تسلیم کرتا ہے، حالانکہ ان ہی کی محنت و مشقت نے دنیا میں روشنی پھیلائی۔ اس خصوص میں اُن کی سعی جزیرہ نماء سپین میں اپنے انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ × × × × اس تاریخ کے لکھنے اور مکمل کرنے کے لئے میں نے شمالی افریقیہ کا سفر کیا، کئی برس سپین میں رہ کر جہاں تک ہو سکا مسلمانوں کے آثار کو بچشم خود دیکھا اور وہاں کے کتب خانہاء عام میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں مل سکیں بغور مطالعہ کیا۔ میں نے عربی میں بھی استعداد پیدا کی، مگر مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ مزاولت نہ رہنے کے باعث میں اب اس زبان کو بھول گیا ہوں۔ × × × عربوں نے ہر قسم کے علوم میں، جو بنی نوع انسان کے لئے مفید ہیں، محیر العقول کمال حاصل کیا تھا۔ اس کمال کا میرے قلب پر بہت بڑا اثر ہے۔ میں بچہ ہی تھا۔ اُسی زمانہ سے وہ کتابیں بہت پسند آتی تھیں جن میں عربوں کے کارنامے درج ہوتے تھے، خصوصاً اُن کے کمالات یورپ میں × × × ×"

میں اس کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ مجھے جناب مسٹر سے جو حسن ظن ہے وہ عقیدت تک پہنچ چکا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کوئی بات بغیر پوری تحقیق کئے نہیں لکھتے، ہر چیز پر بہت غائر نظر ڈالتے ہیں، نتایج اخذ کرنے میں جلدی نہیں کرتے، اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں، اُن کی کسی بات سے تعصب کی بو نہیں آتی، اُن کا نکتہ چین قلم اگر مسلمانوں کا لحاظ نہیں کرتا، تو عیسائیوں کی بھی کوئی رعایت کرنا نہیں جانتا؛ بایں ہمہ وہ انصاف سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ یہ اُن کی اُفتاد طبیعت ہے کہ وہ گروہ علماء دین کو خواہ کسی مذہب کے ہوں، ملک کے لئے سخت مخدوش، اور اُن کے اقتدار کو سلطنت کے لئے سخت منحوس سمجھتے ہیں؛ اسی لئے وہ اگر دیندار مسیحی بادشاہوں کے دشمن ہیں تو موحدین کے بھی دوست نہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُن سے لغزشیں ہوئی ہیں، غلط فہمیاں ہوئی ہیں، اُنہوں نے غلطیاں کی

ہیں اور کون ہے جو یہ دعوے کر سکے کہ اُس سے غلطیاں نہیں ہوتیں، لیکن اگر غائر نظر سے دیکھیے تو اُن کی غلطیاں کچھ نادانستہ ہیں، کچھ مسلمانوں کے جذبات نہ معلوم ہونے کے باعث۔ اس معاملہ میں اُن کو معذور نہ سمجھنا بیدردی نہیں بلکہ سخت ظلم ہے۔ بعض جگہ عیسائیوں کی ہمدردی کا ولولہ بھی اُن میں پیدا ہو گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس سے وہ کسی طرح نہ بچ سکتے تھے۔ غور فرمائیے کہ فردوسی، جو مسلمان والدین کی اولاد ہے ایرانیوں کی تباہی کے آثار دیکھتا ہے تو وہ عربوں کو شیر شتر و سوسمار خور کہہ کر اپنے دل کی آگ بجھاتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک عیسائی میں یہی کیفیت نہ پیدا ہو جائے۔ اُن کا طرز تحریر عجیب علوِ شان لئے ہوئے ہے۔ برخلاف زمانۂ حال کے انگریز انشاپردازوں کے اُن کو بہت بڑے بڑے الفاظ لکھنے کا شوق ہے، پیچیدہ فقرے لکھتے ہیں اور بہت لمبے۔ ایک فقرہ سترہ اٹھارہ سطر کا اور ایک پیراگراف تین تین صفحوں کا ہونا کچھ غیر معمولی بات نہیں ہے مگر باوجود اس کے وہ اپنی عبارت میں رنگ نہیں بھرتے بلکہ جذبات دکھلاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اس کتاب کے ترجمہ کو کچھ آسان کام نہیں پایا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مجھے ایک فقرہ کے ترجمہ کرنے میں بعض وقت کئی کئی دن اور بعض مرتبہ کئی کئی گھنٹے لگے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ میری نالیاقتی کی وجہ سے ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے فرض سے کہاں تک سبکدوش ہوا ہوں۔ اس کا انصاف میں ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔ میں خود غلطی کار ہوں اور اپنی ناقابلیت کا معترف۔ اس لئے یہ امید رکھتا ہوں کہ اس خصوص میں میرے زلات سے چشم پوشی فرما کر میرے اصلاح میں کوشش فرمائی جائیگی۔

ترجمہ کرنے میں میں نے حتی الوسع جناب مصنف علام کے ایک ایک لفظ کو عزیز رکھا ہے لیکن جہاں موصوف نے اپنی انشاپردازی دکھلائی ہے اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ اُن کے لفظوں کی پابندی سے میں اپنے زبان کے لطف کو کھوتا ہوں، وہاں میں نے اپنے قلم کو اُن کے الفاظ کے ساتھ پابند نہیں کیا ہے۔

اب میں ایک بہت بڑا فرض ادا کرتا ہوں:۔

سب سے پہلے تو مجھ پر شکر واجب ہے خدا تعالےٰ کا کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے

باوجود میری نالیاقتی، بے سروسامانی اور عدیم الفرصتی (بوجہ کارہائے متعلقہ سرکاری) مجھے اتنی ضخیم کتاب کے ترجمہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اے خدا قربان احسانت شوم۔ اب یہ بھی دعا ہے کہ وہ کریم کارساز و مقلب القلوب میری اس کتاب کو قبولیت عام عطا فرمائے اور وہ ذرہ نواز اس کو میری مغفرت کا باعث کرے۔ آمین

اس کے بعد مجھے شکر ادا کرنا ہے مولوی عنایت اللہ صاحب کا کہ انہوں نے تقریب لکھ کر مجھے حلقہ علمی میں روشناس کرایا۔ سید فضل شاہ صاحب گیلانی ایم اے نے ازراہ کرم مجھے سپین کا نقشہ بنا کر دیا۔ اس کے بعد میں شکر گزار ہوں اپنے فرزندان ارجمند مولوی محمد جمیل الرحمن ایم اے مولوی محمد نعیم الرحمن ایم اے اور ان دونوں سے زیادہ مولوی محمد معتضد ولی الرحمن ایم اے کا کہ انہوں نے مجھے بہت زیادہ وہ مدد دی اگر موخر الاہم کی مدد میرے شامل حال نہ ہوتی اور وہ مجھے نظر ثانی وغیرہ میں مدد نہ دیتے تو اس کتاب کا شیوع قریباً ناممکن ہوتا۔ فرزند سعادتمند مولوی محمد بدل الرحمن ایم اے کہ اس وقت انگریزوں کی ولایت میں ہیں (خدا انہیں بخیریت بانیل مرام واپس لائے) اتنی دور سے بیٹھے ہوئے مجھے مشورے دیتے رہے۔ برخوردار سعادت اطوار مولوی محمد مقتدر کلیم الرحمن بی اے نے اس ترجمہ کا مختصر سا نام اخبار الاندلس رکھا۔ فرزند دلبند محمد معتمر عبید الرحمن نے مجھے مسودوں کے صاف کرنے میں بہت کچھ مدد دی۔ خدا تعالے میرے ان فرزندان عزیز کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے دین پر قایم اور اس کے مددگار رہیں، اور میرے مرنے کے بعد مجھے دعاء خیر سے یاد رکھیں۔

سب سے آخر میں مجھے اپنے ناظرین کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس کتاب کی غرض و غایت یہ ہے کہ آپ اس سے کچھ سبق حاصل کریں، اپنے بھائیوں کی تباہی کے اسباب پر غور کریں، ان کو حتےالمقدور رفع کریں اور کرائیں میں اس کے متعلق زیادہ تفصیل کرنا قرین مصلحت نہیں سمجھتا۔ سب سے ضروری غرض جو مجھے اپنے اس سلسلہ کتب کے نکالنے کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ میرے مقتدر ناظرین میں سے چند ایسے نفوس قدسی نکل آئیں جو اپنے دور افتادہ بھائیوں یعنی مسلمانان اندلس و صقلیہ کے، اور ان کے طفیل میں میرے لئے، دعا مغفرت فرمائیں۔ اگر یہ بات حاصل نہ ہوئی تو میں سمجھونگا کہ میری تمام محنت اکارت گئی۔ وجری علی اللہ۔

انکسار توامان
محمد خلیل الرحمن عفی عنہ

لاہور
۴ دسمبر ۱۹۲۳ء

MUHAMMAD KHALILUR—RAHMAN

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مصنف کے خود نگاشتہ حالات

میں نے اپنے دیباچہ میں عرض کیا ہے کہ میں چاہتا تھا اور کئی مرتبہ اُن (مصنف علام) سے درخواست بھی کی کہ وہ اپنی سوانح عمری بھیج دیں مگر اُنہوں نے منظور نہیں کیا، لیکن میں اب تک اس سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ اگر مجھے آخر وقت تک بھی مل گئی تو میں اپنے قدر افزا ناظرین کے سامنے پیش کر دونگا۔

الحمد للہ کہ میری کوشش ناکامی پر ختم نہیں ہوئی۔ جناب مصنف نے بار بار کے تقاضے سے تنگ آ کر آخر اپنے حالات مجھے بھیج دیئے، جو میں نہایت فخر کے ساتھ ذیل میں من و عن ترجمہ کرتا ہوں۔ سطور ذیل کو اُس عبارت سے ملا کر پڑھنا چاہیئے جو میں دیباچہ میں جزوی طور پر جناب ممدوح کے حالات میں لکھ آیا ہوں۔ امید ہے کہ یہ سطور نہایت دلچسپی سے پڑھی جائینگی۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ ان کی اشاعت بے موقعہ ہو رہی ہے، مگر میں اپنی مجبوری کو شفیع لا کر امیدوار معافی ہوں۔ اصل میں میں نے یہ سوال کیا تھا کہ جناب ممدوح کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال کیوں اور کس طرح پیدا ہوا۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اُسی سوال کا جواب ہے۔

میں بہت ہی تذبذب کے بعد سطور ذیل لکھتا ہوں۔ میری عادت نہیں ہے کہ میں اپنے متعلق کچھ کہتا پھروں لیکن میری اس کتاب کے مترجم نے مجھے مجبور کیا، اور یہ لکھا کہ ترجمہ کے ناظرین میری سوانح عمری کے لئے متقاضی ہیں، اس لئے میں نے اپنی زندگی کے کچھ حالات لکھنے منظور کئے ہیں:۔

میں ایک چھوٹے سے قصبہ ہلس برو واقعہ صوبہ اوہایو (امریکہ) میں پیدا ہوا۔ کچھ حالات ایسے متقاضی ہوئے کہ مجھے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اپنے ہی قصبہ میں گزارنا پڑا۔ میں نے پرائیویٹ سکولوں میں ابتدائی تعلیم پائی، اور انیس ۱۹ برس کی عمر میں میامی یونیورسٹی کا گریجوایٹ ہوا۔ اپنی جماعت میں سب سے کم عمر طالب علم میں ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے قانون پڑھا، اور چند سال لیون ورتھ (کنساس) اور سان فرانسسکو (کیلی فورنیا) میں وکالت کی۔ مجھے والد کی علالت کی خبر ملی تو

وطن آنا پڑا؛ اسی علالت کے سلسلہ میں والد نے انتقال کیا اس لئے مجھے یہیں مقیم ہونا پڑا اور اس وقت سے اب تک وطن ہی میں ہوں۔ میں کئی سال متواتر امریکہ کی بار ایسوسی ایشن کا ممبر اور ۱۹۰۸ء سے قانونی رسایل کا ایڈیٹر رہا ہوں۔

میں نے سپین کے قدیم اہم قوانین اور دیگر قانونی کتب کا ترجمہ کرکے بار ایسوسی ایشن کو دیا ہے۔ اس کی دس ضخیم جلدیں ہیں۔ میں نے حال ہی میں قانون دیوانی کا ترجمہ مکمل کیا ہے۔ اس کی سترہ ضخیم جلدیں ہیں؛ اس میں سینکڑوں حواشی اور حوالجات مختلف زبانوں میں ہیں لیکن یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں؛ کیونکہ آج کل چھپائی میں اتنا خرچ ہوتا ہے کہ کوئی متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں مختلف علمی مجالس کا ممبر منتخب ہو چکا ہوں؛ منجملہ ان کے رایل سوسائٹی آف آرٹس، لنڈن اور رایل مے ٹی ریو لاجیکل سوسائٹی، لنڈن اور لا سوسائٹی اکیڈمے میک ڈی ہسٹوریو نیورسل پیرس ہیں۔

میں بچہ ہی سا تھا کہ مجھے ہر وہ چیز دلچسپ معلوم ہوتی تھی جس کا تعلق مسلمانوں کے قبضۂ جزیرہ نمائے سپین سے ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میری عمر چھ برس سے زیادہ نہ تھی کہ میں واشنگٹن ارونگ کی کتاب "الحمرا"* (جس کو میں نے اس سے پہلے نہ پڑھا تھا) کے مطالعہ میں اتنا منہمک ہوا کہ میری والدہ نے مجھے تین مرتبہ کھانا کھانے کے لئے بلایا، مگر میں نے بلا کسی خیال کے "ہوں" کہہ دیا، اور کتاب کو نہ چھوڑا۔ آخر والدہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھانے کے کمرے میں لے گئیں؛ یوں مجھے وہ کتاب بجبر چھوڑنا پڑی؛ جس سے مجھے اتنا انہماک ہوا تھا۔ عربی اندلس کے ان دلچسپ اور مفتون کر دینے والے افسانوں سے جو خیالات بچپن میں دل گزیں ہوئے۔ اُن کے نقش عمر بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے۔ آخر جب مجھے یورپ جانے کا موقعہ ملا تو میرے قدم خود بخود سب سے پہلے مجھے سپین لے گئے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے جو آثار ہیں وہ میرے لئے سب سے زیادہ دلکش تھے۔ میری سب سے پہلی تصنیف "تھرو سپین"⊗ کو شایع ہوئے برسوں ہو گئے؛ اس کے بہت زیادہ حصے میں میں نے اندلسی عرب کے "آثار الصنادید" کو بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان قدیم عمارات سے افسوسناک غفلت کی گئی ہے؛ اور وہ بوسیدگی سے گری چلی جاتی ہیں؛ لیکن اب بھی وہ ایک ذہین سیاح کی چشم تصویر کے سامنے اپنی اصلی شان و شوکت و عظمت کو نہایت واضح طور سے پیش کر دیتی ہیں۔ چونکہ میرا مقصود اصلی یہ تھا کہ میں اپنے

---

* اس کتاب کی چند کہانیاں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ شاید کتاب بھی مکمل ترجمہ ہو چکی ہو۔ (مترجم)

⊗ مصنف علام نے از راہ کرم مجھے اپنے اس سفرنامہ کے ترجمہ کی اجازت دے دی ہے؛ اور تصاویر بہم پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ میں اپنی کتاب "مولدین" کے شایع کرنے کے بعد انشاء اللہ اس کو چھاپوں گا۔ (مترجم)

سفرنامہ کے لئے مواد جمع کروں، اس لئے مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا کہ اُس عظیم الشان قوم کی افسوسناک، مگر ہیچ، تاریخ لکھوں، جس نے تہذیب و تمدن کو بے حد فایدہ پہنچایا۔ زمانۂ حال کی مہذب اقوام اپنی اکثر آسایش و تکلفات میں گو بہت کچھ اُن ہی کے رہین منت ہیں، مگر اُن کے مساعی جلیلہ کا اعتراف نہیں کرتیں، اور اگر کرتی ہیں تو دھورے دل سے ۔

میں قرطبہ کی جامع مسجد میں روز جایا کرتا تھا؛ ایک روز میں اس کی جلیل القدر محراب کے سامنے کھڑا ہوا تھا کہ میں نے سب سے پہلے مسلمانان یورپ کی تاریخ لکھنے کا قصد مصمم کیا۔ یہ مضمون ایسا نہیں ہے کہ اس سے انہماک نہ پیدا ہو، میری ذات خاص کے لئے تو یہ فریفتہ کر لینے والی چیز تھا کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ اس باعث سے میں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا کہ اس موضوع پر کسی مصنف نے بالخاصہ و بالتفصیل توجہ نہیں کی، اور جنہوں نے تھوڑی بہت توجہ کی ہے وہ اُس وحید و فرید قوم کے جوہر دماغی کو پوری طرح سمجھنے میں ناکام رہے ہیں، جس کے کمالات قرون متوسطہ کے محیر العقول چیزوں میں سے تھے، اور جس کی افراد کی باقی ماندہ شاندار کاموں کو دیکھ کر جہلا یہ کہہ اٹھے ہیں کہ یہ انسان کے نہیں، بلکہ کسی مافوق الفطرت مخلوق کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ خیال ہی میرے نزدیک انصاف سوز ہے کہ غیر مسامحت و تعصب مذہبی افراط غیرت دینیہ کی وجہ سے مسلمانوں کے علوم و فنون و تہذیب و تمدن کے آثار کے ساتھ برا سلوک کیا جائے، اور پھر اس کو مدد دی جائے بے پروائی اور قصور و نقص علم سے، جو زمانۂ حال کا تمغاء امتیاز ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بجد و کد یہ کوشش کی گئی کہ اُن واقعات کو غیر مختتم و دوامی ظلمات نسیان میں پھینک دیا جائے کہ جن کو انصاف پسند طبایع کے فایدہ کی غرض سے ترتیب کے ساتھ بیان کیا جاتا، اور اُس میں سیاسی، قومی، اخلاقی یا دینی تعصبات کو دخل نہ دیا جاتا۔ میں مسلمانوں کی اس مسجد میں کھڑا تھا، جو از روئے تقدس مکہ (شریف) کے کعبہ، اور یروشلم کے قدس سے دوسرے درجہ پر ہے، اور میری نظر اُس کی پاکیزہ و نادر پچی کاری پر جمی ہوئی تھی، جو بلحاظ نقش و نگار اُس زمانہ میں اپنی نفاست و غرابت میں نظیر نہیں رکھتی تھی جب وہ بنائی گئی تھی، اور اس وقت بھی، کہ صدیاں گزر گئی ہیں، ویسی کی ویسی ہی حسن و خوبی کے ساتھ چمک رہی ہے؛ کہ یکایک خود بخود میری چشم تصور کے سامنے اس عظیم الشان دار الخلافہ کے باشندوں کے روزانہ کاروبار اور گفتار و رفتار آ گئے، جو محنت سے تھکنا نہ جانتے تھے، جو صنعت و حرفت، ترفہ و تمول، تہذیب و تمدن، کمالات و تکلفات، لطافت و

نفاست اور حسن اخلاق میں عیش پرست و مغرور و زوال پذیر روم سے بھی بڑھے ہوئے تھے میں دیکھ رہا تھا کہ گویا میرے گرد قبلہ، یعنی مکہ مقدسہ کی طرف رُخ کئے ہوئے ہزاروں مومنین سفید کپڑے پہنے، نہایت ادب کے ساتھ، عابدانہ انداز میں بتعمیل احکام و مراسم اسلام سربسجود تھے۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ جیسے مقصورہ کے اندر، جس کی دیواروں پر سونے کا کام تھا، جو اُن بیشمار قندیلوں کی روشنی سے دمک اُٹھتا تھا جو بظاہر ختم نہ ہونے والی محرابوں کو روشن کرنے کے لئے جلائے جاتے تھے، سرتاج خاندان بنُو امیہ، خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، عبدالرحمن ثالث سجدہ میں ہیں۔ یہ وہ با عظمت و جلال بادشاہ تھے جن کے علم و عَلَم کی شہرت اور دور رس درخشندہ پالیسی نے اُن کی سلطنت کو مستحکم کر دیا تھا، اور جن کا نام دنیا کے دور و دراز ممالک میں عظمت سے لیا جاتا تھا۔ چونکہ اس خلیفہ کے پیش نظر (حضرت) عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کا انجام رہتا تھا، کہ آپ بحالت عبادت شہید ہوئے تھے، اس لئے وہ محافظین تن کو ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ ان سپاہیوں کی مطلا و مذہب وردیاں بہت بھڑکیلی ہوتی تھیں۔ مسجد کے باہر ہر طرف ایک کامل و مکمل ملکی و فوجی نظم و نسق، بے نظیر تعلیمی آسانیاں اور خوبیاں اور متوالی و مسلسل تجارتی تحریکات مجھے نظر آ رہی تھیں۔ یہ منظر میرے سامنے تھا کہ شہر کے دروازوں سے عربی گھوڑوں پر سوار شاہی ڈاک کے ہرکارے سرکاری خطوط و احکام لئے ہوئے بسرعت تمام مختلف صوبوں کے دارالصوبوں کی طرف جا اور آ رہے ہیں۔ شہر کے ہر محلہ میں مجھے متعدد مدارس دکھلائی دے رہے تھے جن میں تعلیم پانا ہر ایک بچے کے لئے لازمی تھا، تاکہ وہ اُس یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے تیار رہیں کہ جس کی شہرت انتہاء ممالک عمرانی بلکہ اقصاء زمین میں پھیلی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی بھی وہ عظیم الشان کہ جس کے پروفیسر اپنی وفور قابلیت میں ممتاز و شہیر تھے، اگرچہ یہاں دینی تعلیم بجد و جہد دی جاتی تھی، لیکن اساتذۂ متشککین بالعموم اس کو تفحیص فلسفی و تحمیص سائنس سے دوسرے درجہ پر رکھتے تھے۔ نہایت مکمل، ساز و سامان سے معمور معامل میرے سامنے تھے کہ طلبہ اُس میں کام کر کے اکتشافات جدید کرتے تھے، اور کیمیاوی طریق سے مختلف اشیاء کی ماہیت معلوم کرتے تھے، چنانچہ آج بھی اُن کے نتائج مساعی ہمارے یہاں اپنے عربی ناموں سے مشہور چلے آ رہے ہیں۔ میری چشم تصور کے سامنے بڑے بڑے ماہرین فن انتہاء شغف کے ساتھ سنگ پارس اور اکسیر کی جستجو میں بذل جہد کر رہے تھے، حالانکہ علماء سابقین ان چیزوں کو محض وہم و خیال بتلا گئے ہیں، مگر کتنے تعجب کی بات ہے کہ زمانۂ حال کے علماء بعد از تفحیص اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، گو تذبذب ہی سہی کہ ایسی

نہیں مل سکتا۔ اس خیال کے آتے ہی میرا عزم راسخ ہوگیا، اور میں فوراً اُس کام کے لئے تیار ہوگیا جس میں میری زندگی
کا بہت زیادہ حصہ صرف ہونے والا تھا۔ جہاں تک میری دسترس تھی میں نے مسلمانوں کے تمام باقیات و آثار تعمیر
زراعتی، پارچہ بافی، کوزہ گری و فوجی کو، جو جزیرہ نمائے سپین میں ہیں، بغور دیکھا۔ میں اسی غرض سے مصر اور ٹونس گیا
مؤخر الذکر ملک میں بہت سی مینار ہیں، جن کی نسبت علماء آثار قدیمہ کی رائے ہے کہ وہ مینار جامع قرطبہ کے مثنٰے ہیں
گو وہ اصل کی بلندی کو نہیں پہنچتے۔ میں نے نہایت مشہور و معروف مسجد قاہرہ کی اندرونی و بیرونی تزئین کو بہت
غور سے دیکھا، اور اُن کی یادداشتیں اور تصویریں لیں۔ جب میں وطن واپس آیا تو میں نے وہ تمام زبانیں اور بولیاں
اچھی طرح پڑھیں اور سیکھیں، جو مجھے میری تصنیف میں مدد دینے والی تھیں۔ اس کے بعد میں نے اسناد جمع کرنا شروع
کیں، حتے کہ میرے ذاتی کتب خانہ میں دس ہزار کتابیں ایسی ہیں، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ، مسلمانان اندلس کے حالات
سے مملو ہیں ٭

مسلمانان اندلس کے متعلق میں نے اپنا سب سے پہلا مضمون ایک موقت الشیوع رسالہ موسومہ "اورلینڈ منتھلی"
میں، جو سان فرانسسکو (کیلیفورنیا) سے شایع ہوتا ہے، چھپوایا۔ اُس کے ستائیس برس کے بعد میں نے اپنی یہ کتاب
"ہسٹری آف مورش ایمپائر ان یورپ" ۱۹۰۴ء میں شایع کی عملی طور پر اتنا تمام طویل زمانہ میں نے اسی تصنیف کی تکمیل
میں گزارا، یہ تمام محنت شاقہ نتیجہ تھی اُس عشق کا جو مجھے اس قوم سے ہے۔ ابتداءً مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کتاب
اتنی ضخیم ہو جائیگی، اور نہ مجھے اتنی محنت کرنا پڑیگی۔ محنت بہت سخت تھی، مگر نہایت دلکش تھی۔ اگر میری یہ محنت کہ
جو اس کتاب کی تکمیل میں میں نے اٹھائی ہے، اس عظیم الشان و جلیل القدر، ہر فن میں کامل، بہادر، عالم و عابد قوم
منصہ شہود پر لے آئے، اور ہر خاص و عام تک اُن لوگوں کے حالات پہنچ جائیں تو میں سمجھونگا کہ مجھے میری محنت
صعب کا پورا معاوضہ مل گیا ٭

خواہ کوئی قانون دنیاوی ہو یا شرع دینی، مسلک سفلی ہو یا مذہب علوی، اُس کی عملی قدر و قیمت کا اندازہ
اور بہترین محک یہ ہے کہ اُس نے بنی نوع انسان کی راحت و آسایش پر کیا اثر ڈالا ہے اور بنو آدم کو کتنا فائدہ
ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے یہ سوال نہیں کرنا چاہیئے کہ اُس کی اصل کیا ہے، اور وہ کہاں پیدا ہوا ہے، بلکہ دیکھنا
یہ ہے کہ کن کن امور میں اور کس حد تک اُس نے ہر حیثیت اور ہر حالت کے انسان کو کیا فائدہ پہنچایا ہے،

دینی کے دست تظلم سے بچے ہیں وہ سب آثار اس امر کے مجسم دلیل ہیں کہ اندلسی عربوں کی کاریگری نے عملی طور پر دنیا کے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔

اللہ اکبر! اگر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اُس کے برحق رسول نہ تھے تو اب تک کوئی رسول دنیا میں آیا ہی نہیں!*

یکم دسمبر ۱۹۲۲ء

س - پ سکاٹ

---

* خود علامہ سکاٹ کے الفاظ ہیں ۔ (مترجم)

S. P. SCOTT

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامینِ جلدِ اوّل

بابِ اوّل

اعرابِ قدیمہ

بابِ دوم

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم

اسلام کا ظہور وترقی اور اُس کے اثرات

دینِ قویم جدیدہ پر تعدی - ہجرت - اسلام کی روز افزوں ترقی و ترفہ - جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے خصایلِ مبارکہ - حضورؐ کی کامیابی کے اسباب - تعددِ ازدواج - قرآن مجید اور اُس کی ترتیب و تنظیم وغیرہ - دیگر مذاہب پر اُس کی احسانات - قبلہ شریف - حج اور اُس کے مناسک - اسلام کی وجہ سے عام اصلاحات - دُنیا میں قوت کی کارفرمائی - دینِ اسلام کی حیرت انگیز کامیابی - محمد الرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم +

جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد کے حالات - شرع شریف - فتوحات جیوشِ اسلامی - شمالی افریقیہ یا ملک مغرب - اُس کی زرخیزی - وہاں کی آبادی - عبد اللہ کی مہم - یونانیوں کی ہزیمت عقبہ کا حملہ - شہر قیروان کی بُنیاد - حسن کا حملہ - قرطاجنہ قدیم - یورپ پر اُس کا اثر - اُس کی محیر العقول تہذیب و تمدن - اُس کی قوتِ بحری - اُس کی بستیاں - اُس کے ذرایع - شہر قرطاجنہ کے اوصاف و حالات - اُس کی تعمیری شان و شوکت - اُس کے بنادر و منا ورد عماراتِ عامہ - زمانہ عروج روم میں قرطاجنہ کی حالت - اُسکے تکلفات و شناعت - اُس کی مسلمانوں کے ہاتھوں بربادی - برابرہ سے جنگ - موسلے ابن نُصیر رحمۃ اللہ علیہ کی سپہ سالاری اُن کے عجیب و غریب حالاتِ زندگی - اُن کے خصایل - اُن کا ملک مغرب پر غلبہ و تسلط - افریقیہ کی مستقل تہذیب کی ناقابلیت +

گاتھوں کی اصلیت اور اُن کے خصایل - جزیرہ نما سپین پر اُن کا حملہ - اہلِ کلیسا کا اقتدار -

باب پنجم
سپین پر حملہ اور اُس کی فتح

باب ششم
زمانۂ امارت

فرانس کے فتح کرنے کی کوشش۔ چارلس مارٹل کے خصایل۔ جنگ پائے ٹیرس۔ امیر عبدالرحمٰن کی رحلت۔ امیر عبدالملک۔ امیر عقبہ۔ اُن کی قابلیت۔ چارلس مارٹل کا پروونس کو تباہ کرنا۔ افریقیہ میں بربریوں کی بغاوت۔ باغیوں کی فتح۔ امیر عبدالملک ابن قطن۔ امیر بلج ابن بشر۔ امیر ثعلبہ۔ امیر ابوالخطّار۔ مغربی یورپ کی حالت۔ امرا کے دورِ حکومت میں ایک طرف بددیانتی کا زور تھا، دوسری طرف سلطنت کو استحکام نہ تھا*

باب ہفتم

بادشاہت اندلس کا قیام

اندلس کے شمالی صوبے۔ اُن کا ویران اور ناقابل زراعت ہونا۔ آب ہوا۔ آبادی۔ مذہب۔ وہاں کے باشندوں کی خصوصیات۔ پیلایو۔ اُس کی پیدایش و خاندانی حالات۔ اُس کا ایک فوج جمع کرنا۔ سلطنت سپین کی گمنامی و جہل۔ اُس کے قیام کی غیر معمولی کیفیّت۔ جنگ کووادونگا۔ عربوں کی شکست۔ طاقت مسیحی کی ترقی۔ قحط و وبا۔ الفانسو اوّل اُس کی بلند نظری اور فتوحات۔ اُس کی پالیسی اور بستیاں بسانا۔ بقا جذبات آزادی۔ مذہب کا غیر محل اور برا استعمال سوسائٹی کی حالت۔ بازیافت کے لئے کشش و کوشش کا شروع*

باب ہشتم

خاندانِ بنو امیہ۔ سلطنت عبدالرحمٰن الداخل

خاندانِ امیہ۔ اُس کی اصلیت۔ اُسکی اور خاندانِ ہاشم کی چشمک۔ شاہانِ شام۔ اُن کا فسق و فجور۔ دمشق کی شان و شوکت۔ شامی دارالخلافہ کے تکلفات۔ بنو عباس کا عروج۔ قبیلہ مفتوح (بنو امیّہ) پر ظلم و ستم۔ عبدالرحمٰن بچ نکلے۔ اُن کے عجیب و غریب حالات۔ اُن کا اندلس پہنچنا۔ اُن کی کامیابیاں۔ یوسف کی شکست و اعتزال۔ بغاوتہا متواترہ۔ خلیفہ بغداد کی بلند نظری۔ اس کا افسوسناک انجام۔ شارلے مین کا حملہ۔ رون سس ویلیے میں قتل عام۔ عبدالرحمٰن الداخل کا انتقال۔ اُن کے خصایل۔ تہذیب و تمدّن کو اُن سے بہت فواید پہنچے۔ جامع مسجد قرطبہ کی بنیاد۔ اہلِ فرانس نے سیپ ٹے مینیا کو پھر فتح کر لیا*

باب نہم

ہشام اوّل۔ حکم اوّل

عبدالرحمٰن الداخل کی وصیّت سے سلاطین کی جانشینی کا قدیم طریقہ ٹوٹ گیا۔ ہشام کی تخت نشینی۔ عبداللہ اور سُلیمان کی بغاوت۔ دونوں کی شکست فاش اور اُن کی فوجوں کا فرار۔ امیر ہشام کا رحم و کرم۔ سیپ ٹے مینیا پر فوج کشی۔ اہالیِ فرانس کی ہزیمت۔ یہ مہم بلا نتیجہ رہی۔ امیر ہشام کے رفاہ عام کے کام۔ علماء دین کی طرف اُن کا رجحان و حمایت۔ قرطُبہ کا جنوبی سواد شہر۔ ہشام کی رحلت۔ حکم سے عام طور پر بے اعتباری۔ سلیمان اور عبداللہ کی بغاوت ثانی۔ خانہ جنگی۔ گاتھک مارچ۔ بارشلونہ کا محاصرہ اور فتح۔ امیر کی بے پروائی۔ فتح کی اہمیت۔ خاندان ادریسی۔ طلیطلُہ کا فساد۔ یوم الخندق۔ شاہی محافظوں۔ فقہا کی بغاوت۔ اس کا نتیجہ۔ ایسٹریاس اور فرانس کے بادشاہوں کی حلافت۔ سینٹ جیمس دی اپاسل کا قصہ۔ حکم کا انتقال۔ اُن کے خصائل ؏

باب دہم

عبدالرحمٰنِ ثانی کی سلطنت۔ محمّد کی سلطنت

عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی۔ عبداللہ کا تمرد۔ گاتھک مارچ پر حملہ۔ شاہنشاہ یونان کی سفارت۔ میریڈا کی بغاوت۔ طلیطلُہ کا فتنہ و فساد۔ نارمنوں کا حملہ۔ عیسائیوں پر جبر و جور۔ عبدالرحمٰن ثانی کا انتقال۔ اُن کا شان و شوکت کا شوق۔ اُن کی خوبیاں۔ اُن کی علوم و فنون کی سرپرستی۔ زریاب۔ اُن کا وفور علم و ہنر۔ طروب کی سازش۔ محمّد کی چال۔ اُن کا تعصب مذہبی۔ طُلیطلُہ کی بار ثانی بغاوت۔ بنو قصی کا عروج۔ ایسٹریاس سے جنگ۔ ابن مروان کی بغاوت۔ سیرانیا ڈی رونڈا۔ ابن حفصون اُن کی اصلیّت اور کارنامے۔ محمّد کا انتقال اور اُن کے خصائل۔ اسلامی طاقت کا زوالِ اولین ؏

باب یازدہم

سلطنتِ المنذر، سلطنتِ عبداللہ

مسلمانوں اور الیسٹرپاس کے دربار شاہی کا مقابلہ۔ الفانسو سوم۔ اُن کی فتوحات۔ المنذر کی چستی و چالاکی۔ بوباسٹرو کا محاصرہ۔ ابن حفصون کی چال۔ امیر کو زہر دے دیا گیا۔ عبداللہ کی تخت نشینی۔ عام فرقوں اور طبقوں کی حالت۔ فاوالویرا کی سرکشی۔ قبایل عرب کی کامیابی۔ اشبیلیہ کا فساد۔ مختلف صوبوں کی نفرت۔ ابن حفصون کی اگیولر میں شکست۔ متواتر فسادوں اور بغاوتوں کا دوامی مہلک اثر۔ عبداللہ کا مرگ مفاجات۔ برسوں کی خانہ جنگی سے ملکی حالات کا تغیر +

باب دوازدہم

سلطنتِ عبدالرحمٰن ثالث

بادشاہِ جدید کی خوبیاں۔ اُن کا استقلال۔ باغی علاقوں کا فوری سکون۔ عیسائیوں کی باہمی مخالفت۔ ابن ابی عبدہ کی ہزیمت۔ ابن حفصون کی موت۔ شرفاء عرب کے اختیارات کا زوال۔ افریقیہ کے بنو فاطمہ سے جنگ۔ جُن کیورا کی ہزیمت۔ عبدالرحمٰن کا خطابِ "خلیفہ" اختیار کرنا۔ اس کی اہمیت۔ قشتالہ پر حملہ۔ الہانڈیگا سے رجعت۔ عیسائیوں کی باہمی خانہ جنگی۔ شاہان لیون اور نوار کی خلیفہ کے حضور میں حاضری۔ خلیفہ عبدالرحمٰن کا ستر برس کی عمر پاکر انتقال کرنا۔ اُن کی قابل توصیف کامیابیاں۔ یونانیوں اور جرمنوں کی سفارت۔ فرانس اور اٹلی میں شرقین (مسلمان) غلام اور اُن کے اقتدارات۔ عبداللہ کی سازش۔ خلیفہ عبدالرحمٰن کے زمانۂ دولت میں ملکی حالت۔ قرطبہ۔ اُس کی دولت و حشمت۔ شاہی بنگلے۔ مدینۃ الزہرا اور اُس کے محلات۔ عبدالرحمٰن ثالث جیسے سب سے بڑے خلیفہ کی حالت زندگی +

بابِ سیزدہم

سلطنتِ حکم ثانی

حکم ثانی کی تخت نشینی پر باشان و شکوہ مراسم۔ اُن کی دانشمندانہ و دُور اندیشانہ تدابیر۔ اردُدنو کی حاضریِ دربارِ خلافت۔ عیسائیوں کے خلاف کامیاب فوج کشی۔ افریقیہ میں فتنہ و فساد۔ خلیفہ کی فوج کو شکست۔ اُمرا بربرہ کو خراب کرکے اُن کی فوج کا موقوف کردینا۔ بحیثیت دینی مرکز ہونیکے قُرطبہ کی اہمیت۔ جامع مسجد کے حالات۔ الحکم ثانی کی رحلت۔ اُن کی علمی قابلیّت۔ علوم کی سرپرستی۔ اُنکا کتبخانہ علوم کے خزاین تعلیم عام۔ رفاہِ عام کی ترقی۔ خلیفہ الحکم اپنے زمانہ کے تہذیب و تمدّن کا مجسم نمونہ تھے۔ سلطنت کا ترفہ +

بابِ چہاردہم

سلطنتِ ہشام ثانی

ابن ابی عامر کی اصلیّت۔ ایک باغ کا نظارہ اور وہاں کا ایک واقعہ۔ نوجوان سیاست دان کی قابلیّت۔ اُن کا یکایک عروُج پانا۔ خواجہ سراؤں کا اقتدار۔ اُن کی ایک سازش کا طشت از بام ہونا۔ ابن ابی عامر کی انتہا درترقی پر پہنچنے کی خواہش۔ اُن کا حاجب مقرر ہونا۔ اپنے رقیبوں کو تباہ کرنا۔ فوجی و مُلکی محکموں کی اصلاحات۔ ہشام ثانی کا بتدریج ذلیل کیا جانا۔ حاجب کا تمام ملک پر حاوی ہونا۔ عیسائیوں سے کامیاب جنگیں۔ افریقیہ میں فتنہ و فساد۔ لیون کی تباہی۔ سینٹیاگو کی تباہی و بربادی۔ المنصور (ابن ابی عامر) کا انتقال۔ اُن کی سلطنت کی خدمات عظیمہ۔ جنگوں میں اُن کی دوامی کامیابی۔ المظفر۔ محمد۔ عبدالرحمٰن۔ سُلیمان۔ ہشام ثانی کا گم ہوجانا۔ سلطنت کا فوری پارہ پارہ ہونا +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ جنابِ مصنّف

راقم کی توجہ اس تصنیف پر بیس برس سے زیادہ تک مصروف رہی ہے۔ اس محنت سے مقصود یہ ہے کہ یہ کوشش کی جائے کہ اس بڑی قوم کی تصویر منصۂ شہود پر آجائے کہ جس نے سائنس، ادب، اور صنعت و حرفت میں وہ کمال حاصل کیا جو زمانۂ حال کی محیر العقول ترقی کی روح و رواں بن گیا۔ جس قوم کے اثر و نفوذ کی جڑیں یورپ اور امریکہ کی حدود تک پھیلی ہوئی ہیں، اس پر نظر ڈالنے کے دوران میں اس کی ضرورت داعی ہوئی کہ اس میں ایسا مواد بھی شامل کیا جائے جو بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتا ہے، مگر جب نفسِ مضمون کی عمومیت کے لحاظ سے اس کو دیکھا جائے تو وہ ان مجلدات میں اجنبی نہیں معلوم ہوگا +

ماخذ کی جو فہرست اس کتاب کے ساتھ ملحق کی گئی ہے اس میں صرف وہی کتابیں شامل ہیں جن کو راقم نے بنظرِ امعان مطالعہ کیا ہے۔ جن کتابوں میں سے بہت تھوڑے سے واقعات لئے گئے ہیں وہ اس فہرست میں داخل نہیں کی گئیں۔ علاوہ عربی اور ہسپانی تاریخوں کے جن کتابوں کو بنظرِ احتیاط و تفحیص مطالعہ کیا گیا، اور ان سے نہایت بیش قیمت مواد حاصل کیا گیا ہے وہ المقری، روُمے[1]، روشیو سینٹ ہلیر[2]، لی بان[3]، سیڈیو[4]، لاٹ اور کسیری[5] ہیں۔ کانڈی[6] ہی نے مسلمانانِ اندلس کی مفصل تاریخ لکھی ہے، مگر وہ سخت غیر معتبر ہے (جیسا کہ سب کو معلوم ہے)

SEDILLOT (۴) LE BON (۳) ROSSEUW ST. HILAIRE (۲) ROMEY (۱)

CONDE (۶) CASIRI (۵)

اس لئے تاوقتیکہ اُن کے اقوال کی اچھی طرح تصدیق نہیں کر لی گئی اُن کو نہیں لیا گیا۔ متوفی آر ڈوزی[1]، پروفیسر یونیورسٹی لائڈن، کی تاریخیں بلحاظ علمیت، صحت اور بے رو و رعایت ہونے اور محک تنقید پر کامل العیار اُترنے کے اس شعبۂ علم ادب میں اپنا نظیر نہیں رکھتیں۔ اس لئے اُن ہی پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔ راقم اس موقعہ پر فاضلِ ممدوح کے احسانات کا اعتراف کرتا ہے۔ جن کی محنت، جوہر ذاتی اور قابلیت کے معترف یورپ بھر کے علما مستشرقین ہیں۔

جس حصۂ زمین کو ارونگ[2] اور پرسکاٹ[3] جیسے آدمی کھوند چکے ہیں اُسی زمین پر گام زن ہونا بے ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے شاید یہ کتاب تحصیل حاصل سمجھی جائے، مگر ایک عظیم الشان سلطنت کے زوال کی آخری داستان کو چھوڑ دینا نامناسب ہے۔ قطع نظر اس کے ان دونوں مشہور و معروف مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں غلطیوں کی بھرمار ہے۔ اُس کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا کہ جس نے پلگار[4] اور برمل ڈیز[5] کی کتابوں کو دیکھا ہوگا۔ یہ دونوں صاحب چشم دید گواہ ہیں، اس لئے اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت معتبر ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ارونگ نے جو اقتباسات کئے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبانِ قشتالہ سے ایسے ناآشنا ہیں کہ جس پر تعجب ہوتا ہے۔

بہترین مورخ وہ شخص ہے جو ناظرین کے سامنے، تماشہ گاہ کی طرح، نہ صرف جنگی اور سیاسی واقعات کو لا کر کھڑا کر دے، بلکہ اُن واقعات کو بھی پیش کر دے جو بعض وقت چنداں اہم نہیں معلوم ہوتے، بلکہ حقیر سمجھے جاتے ہیں، مگر باوجود اس کے وہ اُن واقعات کو ظاہر کر جاتے ہیں جو اور کسی سے واضح نہیں ہوتے، بالخصوص عوام الناس کی حیثیت و حالت اور بادشاہ وقت کی پالیسی کو۔ یہی واقعات رعایا کے خانگی اخلاق کو ظاہر کرتے ہیں، یہی باتیں خانگی امور، حیرت انگیز ایجادات، علمی ترقیات اور صنعت و حرفت کے نشو و نما کو دکھلاتی ہیں، یہی باتیں قومی مذاق کو ظاہر کرتی ہیں، مختصر یہ ہے کہ یہی باتیں تصویر ہوتی ہیں ہر ایک مادی اور دماغی ترقیات کی، جو انسان کے خصایل، بلند نظری اور عیب و صواب پیدا کرنے میں

---

(۱) R. DOZY (۲) IRVING (۳) PRESCOTT (۴) PULGAR

(۵) BERNALDEZ

مدہو تے ہیں۔ یہی امور پیش نظر رکھ کر اوراق مابعد میں اُن ذرایع سے بھی مدد لی گئی ہے جنکو بعض مورخین شاید اپنی حیثیت سے فروتر سمجھیں ۔

راقم کو اہالیِ سپین سے کسی طرح کی دشمنی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس زمانہ کو یاد کر کے بہت خوش ہوتا ہے کہ جو اُن کے ملک میں گزرا ہے۔ وہ سپین کے مردوں کا خودارانہ تپاک، اور سپین کی عورتوں کی عنایات و دلکشی کو کسی طرح نہیں بھول سکتا۔ اُن میں جو کچھ بھی نقص ہیں وہ اُن زبون اثرات کے باعث سے ہیں جو اُن کو وراثۃً پہنچے ہیں، یا ایک مسخ شدہ مذہب کی وجہ سے، جنہوں نے ملک اُن کے اصول کو بدل دیا، اُن کی قوت کو تباہ کر دیا اور اُن کی شان و شوکت پر سیاہی پھیر دی ۔

چونکہ اس کتاب کا زیادہ حصہ ۱۸۹۸ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا اس لئے سپین کی سیاسیات یا اخلاق پر جو نامواقف تنقید کی گئی ہے وہ محض تاریخی اعتبار کو قایم رکھنے کے لئے کی گئی ہے نہ کہ اُس قابلِ نفرت تعصب کی وجہ سے جو بدقسمت "وار آف ہسپینیٹی" کے سبب سے پیدا ہو گیا ہے ۔

فلیڈیلفیا ۱۹۰۳ء

أراكم بقلبي من بلاد بعيدة

تراكم تروني بالقلوب على بعد

فؤادي وطرفي يأسفان عليكم

وعندكم روحي وذكركم عندي

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربِّ یسّر برحمتک

باب اوّل

عربِ قدیم

ملک عرب کے خصوصیات۔ اُس کی تاریخ۔ اُس پر اور اقوام کے اثرات۔ تہذیب و تمدّن قدیم۔ تجارت۔ ثبات رسوم و لسان۔ بادیہ نشینوں کے خصائل۔ اُن کی وارستہ مزاجی۔ اُن کی جبلّت سلب و نہب باہمی تعلّقات و حلافت سے قبائل کی قوت۔ بادیہ میں عموماً جنگ کا دوام۔ اعراب کے فضائل و رذائل۔ جذبات انتقام اور اُس کے مہلک نتائج۔ ذات کا عدم وجود۔ طبقۂ نسوان کی حالت۔ مناکحت دین ستارہ پرستی۔ بُت پرستی۔ انسانی قربانی۔ اہمیّت و طاقت یہود۔ عرب میں عیسائیت۔ مضامین و خصوصیات نظم۔ معلقات۔ عربی شعراء کا اقتدار۔ اُن کی آزادی و جسارت۔ تمدّن و تہذیب عربی کا قرونِ مابعد پر اثر۔

اَحِنُّ شَوقاً الیٰ دیارٍ لقیتُ فیہا جمالَ سلمیٰ

کہ می رساند ازاں نواحی نوید وصلت بجانبِ ما

(جامیؒ) (مترجم)

کرۂ ارض پر بہت کم ایسے ملک ہیں کہ جو سیّاح کی نگاہ کے سامنے ایسا ویران اور ناخوش آئند منظر پیش کرتے ہیں جیسا کہ وہ وسیع اور خشک جزیرہ نما ہے جس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے

اور عرض البلاد کے چوبیس دقیقہ ہیں، حدود صحرا شام سے لیکر بحر ہند تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سطح زمین کی ذرہ غیر متغیر حالت نہیں ہے کہ جس کی عادی سیاح کی چشم تصوّر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس ملک کا بیشتر حصہ اُن طبعی خوبیوں سے خالی ہے جو انسان کی طمع اور بلند نظری کو اپنی طرف بے ساختہ کھینچ لیتی ہے۔ اس کے سواحل نشیب میں ہیں اور اُن کی آب و ہوا مضر صحت، اُسکے بنادر بہت تھوڑے ہیں اور جتنے بھی ہیں وہ غیر محفوظ، اُس کے ذرائع معدنیات کی اس وقت تک تحقیقات نہیں ہوئی، نہ یہ معلوم ہے کہ کچھ ہیں بھی یا نہیں۔ اُس کے صحرا کچھ ایسے دشوار گزار ہیں کہ اُن میں کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ پھر اُن کی حفاظت تند مزاج اور بہترین سپاہیانہ انداز کے باشندے کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے غور و فکر کے بعد حملے کی تیاریاں اور فتح کے ارادے کیے گئے، مگر اِن ہی وجوہ سے اُن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صوبہ یمن ہیں، جس کا بہت موزون نام یمن شاداب رکھا گیا ہے، اُس زمانہ سے کہ جس کی قدامت بھی یاد نہیں ہے، کاشت ہوتی چلی آئی ہے۔ لیکن تقریباً باقی تمام علاقوں میں سعی کاشت لاحاصل اور مشقت کشاورزی بے نتیجہ رہی ہے۔ بعید و نہایت ریگستان جس میں قاتل و مہلک باد سموم چلتی ہے، خشک، بے آب و گیاہ نوکیلے اور آتش فشان پہاڑ کہ جن کے دامنوں پر سبزہ کا نام و نشان تک نہیں، وادیاں کہ جن میں خال خال جھاڑیاں نظر آتی ہیں یا کہیں کہیں نمکین مادہ، اور زمین شور، یہ جزیرہ نمائے عرب کی طبعی خصوصیتیں ہیں کہ زمانہ قدیم سے چلی آتی ہیں اور چلی جاوینگی۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو دریا کا نام دیا جائے اور جو سمندر تک راستہ طے کرنے میں اپنے فیض آبیاری سے اُس خشک اور ناخوش آیند ملک کو سیراب و مرفہ کرے۔ جہاں کہیں کوئی چشمہ ملا وہیں مستقل آبادی کی بنا پڑ گئی، اور بدویوں کے سیاہ خیموں کی جگہ کچی اینٹوں کی کٹیاں بن گئیں۔ قبیلہ کا "شیخ" اب "بادشاہ" کہلانے لگا؛ اور اُس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اوروں کے مقابلہ میں کسی قدر وسیع کٹیا پر قناعت کر لی نخلستان کے نام سے عموماً سایہ دار درختوں کے جھنڈ اور نہر روان کا تصوّر ہوتا ہے، مگر عرب کا نخلستان فی الحقیقت نام ہے ایک پہاڑی ندی کے خشک مجرا کا جسکے کناروں پر مُرجھائی ہوئی جھاڑیاں ہیں جو محنت کش اونٹوں کو چارہ کا کام دیتی ہیں۔ اس "نخلستان" میں پانی کے لئے جانکاہ محنت کے بعد کنوا کھُدتا ہے جو بہت تھوڑا اور کھاری پانی دیتا ہے۔ زمین کی یہ کیفیت، اور آسمان

کی یہ حالت کہ گویا وہ تانبے کا بنا ہوا ہے جس میں ابر کا نام و نشان بھی نہیں۔ آفتاب کی شعاعیں زمین کے بخارات سے منحرف و منعکس ہو کر ہر چیز کو نہایت موزونیت کے ساتھ اس طرح سرخ نیلے اور نافرمانی رنگ میں رنگ دیتی ہیں کہ جن سے قوس قزح شرما جاتی ہے۔ یہ تمام کیفیت تاثرات اشعاع مغالطات عینی اور سراب کی دلفریب صورتوں سے نمو پاتی ہے اور تخیل وہمی کی وجہ سے عموماً سحر کے اثرات سے منسوب ہوتی ہے۔ ریگستان کی خاموشی کامل جس کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا، نیز مسلسل غیر آباد اور سنسان میدان وہ کیفیتیں ہیں جو قلوب انسانی میں ایک قسم کا اضمحلال پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف تو عناصر قدرتی کا خوف رہتا ہے اور دوسری طرف انسانوں کا ڈر جسکو تجربہ سابقہ بھی رفع نہیں کر سکتا۔ یہ خوف کچھ ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ایک قوی ہیکل ساربان جو بچپن سے ان خاموش مناظر سے آشنا ہوتا ہے کانپ کانپ جاتا ہے، اور اپنے ہانپتے ہوئے اونٹ کو ریگ رواں کے ڈھیروں اور پہاڑوں کے پتھروں پر سے ہانکتا ہوا ایک اضطراب کے ساتھ نکال لیجاتا ہے۔ اجنہ و خبایث کا خوف خون خشک کئے دیتا ہے اور قزاقوں کا ڈر الگ روح کو تحلیل کرتا ہے یہ کیفیتیں کچھ اس طرح دل گزین ہوتی ہیں کہ جب کوئی عرب کسی سفر سے بخیر و عافیت واپس آجاتا ہے تو وہ صحیح طور پر قابل مبارکباد سمجھا جاتا ہے۔ اور واقعی یہ واپسی ایک بڑی مہم کے سر کرنے سے کم نہیں ہوتی، چنانچہ ان کے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ "السفر ظفر"۔

زمانۂ حال میں ملک عرب کی تقسیم تین حصوں میں کی جاتی ہے، عرب سنگستانی، عرب ریگستانی اور عرب شاداب، مگر یہ تقسیم خانہ ساز ہے، ورنہ وہ لوگ جن کے ملک کی یہ تقسیم کی گئی ہے، اس سے بالکل ناآشنا ہیں۔ مختلف قبائل ہیں جو مابہ الامتیاز ہے۔ وہ باعتبار طرز تمدن، عادات اور روایات خاندان ہیں نہ بلحاظ اس علاقے کے جہاں انہوں نے بود و باش اختیار کی ہے۔ بہ تبدیل الفاظ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ تقسیم شخصی ہے نہ کہ وطنی۔ یہ امتیاز نتیجہ ہے ایک عجیب و غریب تعصب قومی کا۔ مسکن کی طبعی خصوصیات ختم ہو جائیں، عام سیاسی حالت یا اقتصادی کیفیت میں تبدیلی ہو جائے، یا صدیوں کا زمانہ گذر جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ اس امتیاز خاص میں کوئی معتد بہ تغیر پیدا ہو۔ انعدام کامل کا تو امکان ہی نہیں۔ اسی وجہ سے عربوں کی تقسیم دو گروہ میں ہے، بدوی اور عمرانی یہی تقسیم عام طور پر وہاں مسلّمہ ہے اور ان دونوں کی حد بست بھی صحیح ہے۔

عرب کی اصلی و حقیقی تاریخ قدامت کے اندھیرے میں اسی طرح گم ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کی تاریخ اتنی غیر متیقن نہیں ہے نہ اُن کے حالات کی تحقیقات کے راستہ میں اتنی مشکلات حائل ہیں جتنی کہ بدوؤں کے حالات میں۔ اُن کی ابتدائی تاریخ جتنی ہمیں معلوم ہے اُس میں بلاشبہ زمانۂ مابعد کی بہت سی باتیں ملی ہوئی ہیں اور فرضی قصے شامل ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ (باسعادت) سے صدیوں پیشتر تک یہ لوگ فن تحریر سے بالکل ناآشنا تھے۔ اُن کی روایات ایک سے دوسرے کو زبانی پہنچتی تھیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس طریقہ میں بہت سے عیوب و نقائص ہیں، مبالغہ اور غیر واقعی باتوں کی رنگ آمیزی سے یہ روایات کچھ کا کچھ ہو گئی ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ موخر الذکر دونوں باتیں ایشیائی طبائع کی جزو لاینفک ہیں۔ اس غیر تسلی بخش مواد سے جو خفیف اشارات ملتے ہیں اُن ہی پر بدرجۂ مجبوری تاریخ قبل از اسلام لکھنے میں انحصار کرنا پڑتا ہے۔ مسلمان مورخین نے اس زمانہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کو سخت تنقید کے بعد قبول کرنا چاہئیے۔ انہوں نے بہت سے واقعات کو چھپایا ہے اور اپنے کافر اجداد کی بہت سی عادات و خصائل کو آنکھیں بند کر کے باطل قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اُنکے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول زیادہ تر ان ہی ذرائع سے لئے ہوئے ہیں۔ نیز یہ کہ اگر بت پرستانہ رسوم کو جوں کا توں نہ لے لیا جاتا تو اسلام قائم ہو نہیں سکتا تھا۔ جو نامکمل اور مشکوک مواد ہمارے پاس موجود ہے اُسکو دیکھنے اور ہمسایہ اقوام کی طبعی اور دماغی خصوصیتوں کو آپس میں مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عرب ایک زمانہ بعید سے بنی نوع انسان کا منبع رہا ہے اور یہیں سے لوگ ممالک غیر کو ہجرت کرتے رہے ہیں، بالخصوص وسط ایشیا کی طرف جنوبی اور شرقی علاقے کے فاقہ کش بدوؤں نے سب سے پہلے رودِ نیل کی سرسبز و شاداب وادی کو معلوم کیا۔ یہ علاقے اُسی زمانہ سے آبادی مصر کی کمی کو پورا کر رہے ہیں۔

دوسری طرف ہمسایہ ممالک کا عرب پر بہت اہم اثر پڑا۔ یہ ملک بالخصوص اپنی جغرافی جائے وقوع کے لحاظ سے خوش قسمت رہا ہے، اور اُس کا اندرون ملک اس معاملہ میں اور بھی زیادہ خوش نصیب تھا کہ وہ ممالک ایشیا و یورپ کو بذریعہ بحر ہر قسم کے تکلفات بہم پہنچاتا رہا ہے۔ زمانۂ قدیم میں بلکہ اُس وقت تک کہ مکّہ کے مشکوک فوائد نے اُس کی حیثیت کو خراب نہیں کیا،

رقیم[1] نہایت مشہور جگہ رہی ہے۔ یہ مقام حقیقی معنوں میں پتھر اکھوؤں کے رہنے والوں کا شہر تھا۔ اس میں جتنے گھر کھوؤں میں کھدے ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار نفوس کی آبادی ہوگی۔ شمالی عرب میں صرف رقیم ہی اس قسم کا شہر نہ تھا، اور بہت سے شہر بھی اُتنے ہی بڑے اور اُتنے ہی مرفہ الحال تھے۔ ان سب شہروں کے مندروں کی عمارات بڑی شاندار تھیں، سب کے تجارتی تعلقات دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے، سب جگہ کے باشندے تنعم و تکلفات میں یکساں تھے۔ جب صُورت حالات یہ تھی تو ضروری ہے کہ ان کی تہذیب بھی بڑے پایہ کی ہو۔ مولود مسیح علیہ السلام سے بہت پہلے جب فونیشیا[2] کے اقتدار میں زوال آیا تو ان کی تہذیب بھی مٹ گئی۔ غالباً اُس زمانہ سے کہ جب مصر میں سب سے پہلے خاندان شاہی کی بنیاد پڑی ہے اجنبی لوگوں کی یہاں متواتر و متوالی آمد و رفت رہی ہے۔ ملک حبش اور ہندوستان کے فوائد تجارت کی کشش اُن کو ان شوارع عام پر کھینچ لاتی تھی۔ یہ راستے تمام جزیرہ نماء عرب کے عرض و طول میں پھیلے ہوئے تھے۔ اجانب کے مسلسل سیل جول نیز دور دست ممالک کے اخبار سے جو یہ سُناتے تھے، اُن نامعلوم مذاہب کے عجیب و غریب اصول سے جن پر یہ اجنبی عمل تھے، اُن کے غیر محدود علم و فضل اور اُن کے بڑھے ہوئے اخلاق و آداب سے بادیہ کے وحشی باشندوں کی نظر میں ... نادانستہ وسیع ہوگئیں، اُن کی نقل و حرکت کے لئے ایک نیا میدان پیش نظر ہوگیا، اُنکی دماغی و ذہنی قوا میں نشو و نما ہوگئی اور اُن کا اکھڑ پن کچھ کم ہو گیا۔ یہ تاجر بیشتر فونیشیا کے رہنے والے تھے، یا یہودی، دونوں کی اصلیت ایک ہی تھی۔ جہاں اُن دونوں کی اور بہت سی باتیں ملتی تھیں اُن میں اُن کی زبان میں بھی بہت مماثلت تھی۔ عربوں کو یک لخت دونوں اقوام سے خلا و ملا کا موقعہ ملا۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں سے عربوں کے تجارتی تعلقات کم از کم ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح علیہ السلام قائم ہو چکے تھے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ فونیشیا سے اُن سے تعلقات کا زمانہ ہی اُتنا ہی ہوگا۔

اہالی عرب اور باشندگان مصر باوجودیکہ ایک دوسرے کے ہمسایہ و رشتہ دار ہیں، مگر ان کی طرز معاشرت میں جو فرق ہے اُس کی مثال قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ اور خانہ بدوش

---

[1] ضمیمہ اوّل ملاحظہ فرمائیں۔ (مترجم) [2] ضمیمہ الف دیکھئے۔ (مترجم)

اقوام کی طرح اہالیِ عرب کی حرکات و سکنات بے قاعدہ، غیر متیقن اور متلوّن تھی۔ رہ گئے مصری، تو اُن کی زندگی کا تغیّر و تبدل منحصر تھا اُن کے بڑے دریا کے قدرتی تغیّر و تبدل پر، جس کا اثر اُن کی ملکی، دینی اور تمدّنی زندگی کے ہر قدم پر معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی طغیانی نشان تھی ترفہ و خوشحالی کی۔ اس کا بڑھاؤ وہ چیز تھا جس کی خبر اُن کا سروش غیب (سیریس نامی ستارہ)[1] اعلیٰ سے دیتا تھا۔ رعایا، فراعنہ کے یہاں حنوط کے لئے مختلف قسم کے گوند اور خوشبوئیں بہت بڑی مقدار میں کام آتی تھیں۔ ان کے لئے اُن کو بالکلیہ اہالیِ عرب پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ موجودہ کے مقابلہ میں یہ اشیاء عرب میں بہتات کے ساتھ پیدا ہوتی تھیں اور نہ صرف مصر میں بلکہ فونیشیا اور فلسطین میں بھی پہنچتی تھیں اور ان ممالک سے یورپ میں پہنچکر مراسمِ قربانی اور یونانی شرفاء اور بطارقہ کے جاہ و حشم و تکلفات میں کام آتی تھیں۔

اس جزیرہ نما کے جنوبی ساحل کو اہالیِ روم "عرب سعید" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مگر اہالیِ عرب اُس کو یمن کہتے ہیں۔ یعنی وہ ملک جو داہنے ہاتھ کی طرف ہے (یعنی مکّہ سے) یہ حصّۂ ملک بوجہ برکاتِ بحری و زراعت ترفہ و تہذیب کی اُس حد تک پہنچ گیا تھا کہ خانہ بدوشانِ اندرونِ عرب کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ اس وقت یمن کی ابتدائی تاریخ صحت کے ساتھ نہیں معلوم ہو سکتی۔ اگرچہ یہاں کی سلطنت دو ہزار دو سو برس قائم رہی تاہم غور و فکر یقین کے ساتھ ممالکِ مشرقیہ سے اُن کے تجارتی تعلقات کی تخمینی تاریخ مقرر نہیں کر سکتے۔ من جملہ اور سیر و سیاحت کے شوقین عربی ملاحوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ وہ ایشیا کے انتہا تک پہنچ گئے بلکہ اُن کے جہاز خلیجِ فارس اور سواحلِ افریقیہ کی نہروں تک باقاعدگی کے ساتھ آمد و رفت رکھتے تھے۔ بہ نسبت ہندوستان کے بحری سفروں کے یہ سفر اگرچہ چنداں فائدہ مند نہ تھا تو خطرناک تو ضرور تھا۔ موخر الذکر ملک سے اسبابِ تجارت کے ساتھ عرب و غیر عرب بت پرستانہ مراسم اور مسخ شدہ فلسفہ کے اصول بھی اپنے ساتھ لیکر آئے۔ جو بالآخر جنونِ مذہبِ اسلام ہوکر قلوبِ عوام پر ایک دیرپا قبضہ کرنے والے تھے۔

---

[1] SIRIUS سیریس۔ نجم الشعری الیمانیہ یا ستارۂ الکلب۔ بہت روشن ستارہ زمین سے [illegible] ہزار [illegible] میل کے فاصلہ پر ہے۔ اہالیِ مصر کے نزدیک بہت مسعود تھا اس کا نکلنا اس کی یقینی علامت تھی کہ دریائے مصر میں طغیانی آئیگی۔ اہالیِ روم اسکو نحس سمجھتے تھے۔ اور جب اُن کے ملک میں نظر آتا تھا تو کہتے تھے کہ اس سال وبا پھیلیگی اور سخت گرمی پڑیگی۔ (مترجم)

تمام مورخین زمانہ قدیم اس پر متفق الرائے ہیں کہ جنوب عرب نہایت دولتمند تھا۔ یہ وہی حصہ زمین ہے جو اُس زمانہ میں سبا[1] کہلاتا تھا۔ ہیروڈوٹس، سٹرابو[2] اور پلینی اپنی تحریرات میں اسکو دنیا بھر میں سب سے زیادہ دولتمند ملک لکھتے ہیں۔ اُس کے زراعتی ذرائع اُس کی خوشحالی کا باعث اصلی تھے۔ یہ زراعت موقوف تھی اُن کے وسیع اور پیچیدہ طریقۂ آبپاشی پر جس سے سینکڑوں کوس کی سیر حاصل زمین سیراب ہوتی تھی۔ اُس کی ندیوں کے کناروں پر بہت بڑی مضبوط دیواریں بنا کر بند باندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تالاب کا رقبہ اٹھارہ میل کا تھا اور اُس کا عمق ایک سو بیس [۱۲۰] فیٹ کا۔ اس تالاب کے بند میں نفت اور چونہ گچ سے پتھر جوڑے گئے تھے اور اُن کو لوہے کی سلاخیں لگا کر مضبوط کیا گیا تھا۔ اس تالاب کے علاوہ اور بہت سے کم درجے کے اور چھوٹے تالاب تھے جو پہاڑوں کے پگھلے ہوئے برف کو جمع رکھتے تھے۔ تقسیم آب کی باقاعدگی بذریعہ راج بھون کے قائم رکھی جاتی تھی، اور اُس کے لئے قوانین منضبط تھے۔ ایک طرف تو آبپاشی کے طریقے نہایت مکمل تھے، دوسری طرف زمین نہایت سیر حاصل تھی، اُس پر گرم ملک کی دھوپ۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی زراعت نے بابل کے نخلستان کو مات کر رکھا تھا۔ وہاں کی بے حد و حساب آبادی اس سر سبز سرزمین کے سینکڑوں شہروں اور گانوؤں میں منقسم تھی اور ہر جگہ یکسان کامل ذریعوں سے زراعت ہوتی تھی۔ بادشاہ کے صرف خاص کے خرچ کا اندازہ دو لاکھ چودہ ہزار روپیہ روزانہ کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مارب[3] (جو اس ملک کا دار السلطنت تھا) ایک بہت بڑے سدا بہار علاقے میں واقع تھا۔ اُس علاقہ کی سڑکوں پر دو طرفہ گنجان درخت تھے جن کی شاخیں ایک دوسرے کے مقابل درختوں سے ملی ہوئی تھیں۔ تمام سڑک ان کی وجہ سے ایک مستقل و مسلسل سبز محراب معلوم ہوتی تھی۔ ان کی وسعت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک اسپ سوار دو ماہ کامل اسی کیفیت کے ساتھ شاہان سبا کے ملک میں سفر کر سکتا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کی مداح اور حلیف ملکہ بلقیس اسی شہر اور ملک کی مالکہ تھی۔

---

[1] اسی باب کا ضمیمہ ج ملاحظہ فرمائیے۔ (مترجم)

[2] اسی باب کا ضمیمہ ج ملاحظہ فرمائیے۔ (مترجم)

[3] یمن یا سبا کا دار السلطنت۔ ایک بند کے ٹوٹنے سے تباہ ہوا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ ارض القرآن ملاحظہ کیجئے۔ (مترجم)

جو علاقہ کہ اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے تجارت کے لئے اتنا خوش قسمت واقع ہوا تھا وہ
تجارت اور زراعت میں ایک دوسرے کا طابق النعل بالنعل رہا۔ سبا کے تاجر ہوشیاری،
قابلیت، دولتمندی اور جوکھم میں پڑنے میں اہالی فونیشیا سے کسی طرح سے کم نہ تھے، اور رقم کثیر کے
سودے کرتے تھے۔ بڑے بڑے جہاز چین بھیجتے تھے، ان کے کاروان شام اور افریقہ کے ریگستان
میں سفر کرتے دکھلائی دیتے تھے۔ لاکھوں من لوبان و بخورات ایران بھیجے جاتے تھے۔ وہ یہی نہ
کرتے تھے کہ اشیاء تجارت کی خرید و فروخت کریں، بلکہ وہ آڑہت کا بھی کام کرتے تھے۔ ان کی
منڈیاں سینکڑوں جگہ کی قیمتی اجناس سے بھری رہتی تھیں۔ چاندی کے برتن، تانبے، لوہے،
سیسے وغیرہ کی سلیں، شہد، موم، ریشم، ہاتھی دانت، آبنوس، مرجان، یشب، زباد، مشک، مُر، کافور، نیز
اور قسم کی خوشبودار چیزیں، جن کی قیمتیں ان کے وزن سے کئی گنا سونا ہوتا تھا، ان کے تجارتی اجناس
تھے۔ ان کے انتہائی تکلف کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صندل کی لکڑی اور الائچی جلا کر ان کا
کھانا پکایا جاتا تھا۔ جنوبی عرب میں نباتات کی کمی نہ تھی، اور اس کی وجہ سے اس ملک کو کچھ کم
آمدنی نہ ہوتی تھی۔ قہوہ یہیں کی پیداوار تھا اور ایشیا کے اکثر ممالک میں یہیں سے جاتا تھا۔ یہاں
کی آب و ہوا خشک تھی، اور ہر قسم کے حبوب پیدا ہوتے تھے، اور اناج تیس تیس برس تک
جمع رہ سکتا تھا۔ رُوئی، گنے اور کھوپے سے لوگ بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ مرّ کا بلسم، حلبہ،
صمغ عربی، عصارۂ اقاقیا اور بخور کی بہت سی چیزیں بھی غیر ملکوں میں جاتی تھیں۔ معدنیات کے
لئے یہ ملک مشہور تھا۔ سبا میں نمک کی ایسی کان تھی جو کبھی ختم ہونے والی نہ تھی۔ پہاڑوں میں سونا
بہت ملتا تھا۔ عرب بحر میں کہیں اور لوہا نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سٹرابو نے لکھا ہے کہ ان کے
زمانے میں لوہا قیمتی معدنیات کی برابر قیمت پاتا تھا۔ جزیرہ بحرین کے مقابل میں جو ساحل تھا
وہاں کے موتی خوبصورتی اور قیمت پانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے +

ایک نامعلوم زمانہ تک، جو غالباً کئی صدیاں ہو گی، ملک سبا کے سلاطین کی سلطنت
و ترفہ برابر قائم رہا۔ یکایک اس کا انحطاط شروع ہوا۔ وہاں سے لوگ تعداد کثیر میں نکلکر دوسرے
ممالک میں جانے لگے۔ وہ جگہ جو جنت تھی اب غیر آباد میدان بن گیا۔ اتنی بڑی اور کامل تبدیلی
کا باعث کس سے علاقہ کا علاقہ تباہ ہو گیا اور تمام باشندے نکل بھاگے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ایک رکیک سا قصہ[1] یہ مشہور ہے کہ پانی کے زور سے کسی بڑے تالاب کے بند ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، مگر یہ چنداں قابل التفات نہیں ہے۔ یہ مصیبت جو ملک پر آئی اُس کی غالب وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قافلوں کا راستہ اُس ملک سے ہٹ کر بحر احمر کی طرف ہو گیا۔ ساحل پر جو پڑاؤ تھے وہ بھی اُٹھ گئے۔ لگان و محاصل میں کمی آگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے بسر اوقات کے ذرائع کم ہو گئے۔ غیر ممالک سے لڑائیاں اور خانہ جنگیاں، اس پر وہاں کا بڑھا ہوا تعیش اور اُس کے لازمی نتیجہ کمزوری، نے وہاں کے ذرائع آمدنی کو چوس کر۔ باشندوں کی تعداد کو کم اور اس مصیبت کی رفتار کو سریع کر دیا۔ یہ واقعہ غالباً پہلی صدی مسیحی کا ہے۔

اس زمانہ کے بعد سے عرب کی تاریخ اور بھی مبہم ہوتی چلی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ قبائل عراق عرب میں جا رہے۔ بہت سے مدینہ (جو اُس زمانہ میں یثرب کہلاتا تھا) کے قرب و جوار میں جا بسے اور اُنہوں نے یہودیوں میں شادیاں کر لیں، جو پہلے ہی سے وہاں آباد تھے۔ اس کے بعد ہمیں تاریخ عرب کا پوری طرح علم نہیں۔ یہاں تک کہ آفتاب اسلام طلوع ہوا جس سے تاریخ عالم کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ شیوع سنہ ہجری سے پہلے کسی واقعہ کی تاریخ صحیح نہیں قرار دی جا سکتی، کیونکہ اُن کے یہاں کوئی ایسا طریقہ جاری نہیں تھا جس کو کسی تاریخی واقعہ کی بنا قرار دیجا۔ نہ کوئی سرکاری یا عام تحریر ایسی ہے جس پر اعتماد کُلی کیا جا سکے۔ واقعات سابقہ کے متعلق روایات زبانی ناقابل اعتبار ہیں۔ صحت کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھایا جائے تو وُہ تحریرات ملتی ہیں جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں جانوروں کے شانہ کی ہڈیوں پر لکھ لی جاتی تھیں۔ اُن چیزوں کا وجود ہی نہ تھا جو کاتب کے لئے ضروری ہیں، اور جو کچھ بھی تھا اُس کے استعمال کی قابلیت معدودے چند آدمیوں میں تھی۔ خانہ بدوش بدوؤں میں فی البدیہہ قصاید کا رواج تھا، اس لئے وُہ نوشت و خواند کی قابلیت کو بہت بُری نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انتہا ہے کہ جس زمانہ میں قرآن شریف نازل ہُوا ہے اُن دنوں مکہ جیسے تجارتی شہر میں صرف ایک[2] آدمی ایسا تھا جو لکھ سکتا تھا۔ یہ ادر ہے وجہ تو نہ تھا کہ محمد (الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنہ ہجری سے پہلے زمانہ مظلمہ کو "زمانہ جاہلیت" کا خطاب دیا۔

---

[1] اس کو رکیک کہنا غلط ہے۔ توریت میں بھی اس کا اشارہ ہے، سب سے معتبر کتاب قرآن مجید اسکو تفصیلاً بیان کرتا ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی سلمہ اللہ القوی نے اسکو خوب تحقیق سے لکھا ہے۔ (مترجم)

[2] سبحان اللہ! (مترجم)

دُنیا کے تمام ممالک میں جو شاہان زمانہ قدیم کے نظر طمع و آز سے بچے صرف ایک ملک عرب ایسا ہے کہ جس نے مفتوح ہونے کی ذلت نہیں اُٹھائی۔ سکندر کی فطنت و ذکاوت نے عرب کے فتح کرنے کا نقشہ جما یا تھا لیکن موت نے اُس کے اتنے بڑے اور شاید ناممکن عزم کو پورا نہ ہونے دیا۔ اگسٹس کی وہ فوج جو سب سے بڑے قیصر کے زیر اثر مرتب ہوئی تھی اُس ملک پر فتح و ظفر پانے کے ناقابل ثابت ہوئی جہاں کی مٹی آب و ہوا اور مدافعین کی جرات و بسالت نے بلکہ اُس کو ایسا بنا رکھا تھا کہ اُس پر قابض و متصرف ہونا بنی نوع انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ چھٹی صدی مسیحی میں اہالی ابی سینیا نے حملہ کر کے یمن کا ایک حصہ دبا لیا تھا۔ ایرانیوں نے ان کو نکالا اور بہت ہی قلیل عرصہ اُس پر قابض رہے۔ بہرکیف دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو جزیرہ نما عرب کے کسی بڑے حصہ پر اپنے تفوق کا دعویٰ کر سکے۔ اس امتیاز خاص کی وجہ نہ صرف یہی تھی کہ اُس ملک میں ایسے قدرتی موانع تھے جو کسی حملہ آور فوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے کافی تھے بلکہ کچھ وہمی و فرضی خوف بھی ایسے تھے کہ جن کو ملک عرب کا نام آتے ہی سریع الاعتقادی سامنے لا کھڑا کرتی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا تھا کہ یہ سرزمین عجیب منحوس و مبغوض تھی کہ جس کی سرحدوں کی حفاظت بڑے بڑے دیو کرتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے صحرا اور ریگستان تھے کہ جن میں قدم رکھنا بڑے دل گردہ کے آدمی کا کام تھا۔ ان میں مردم خوار دیو اور ہولناک پرندے رہتے تھے کہ جو اُن خزانوں کے محافظ تھے کہ جن کو ارواح خبیثہ نے کچھ منتر پڑھ کر وہاں دفن کیا ہوا تھا۔ جو قافلہ فونیشیا سے وسط عرب جاتا تھا۔ اُس میں جتنے تاجر کے سوداگر ہوتے تھے وہ اپنے ساتھ ایسی بخورات لے جاتے تھے کہ جن کی بو سے وہ اڑنے والے سانپ جو دفاین کے محافظ تھے بھاگ جاتے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا ایسی زہرناک تھی کہ صرف غلام اور مجرمین ہی وہاں قیمتی صموغ کے جمع کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے؛ اور اُنکی آزادی اسی پر مشروط ہوتی تھی۔ یہ ساری ترکیبیں اگرچہ ملکی اغراض سے کی گئی تھیں مگر جہلا ان پر اعتقاد کامل رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ فونیشیا کے چالاک تاجر جزیرہ نما عرب کی قیمتی اشیاء کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے دلوں پر ان باتوں کا رعب چھایا رہتا تھا، اور بادیہ عرب پر ایسا خوفناک پردہ پڑا رہتا تھا کہ باوجود وہاں کی مشہور دولت و خزائن کی شہرت کے طمع و شرہ کا ہاتھ بھی اُس پردہ کو اُٹھانے کی جرات نہ کر سکتا تھا +

کسی غیر ملک کے ماتحت نہ رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب سے زیادہ کوئی ملک اپنی رسوم اپنی زبان
اور اپنے تشخص کو پوری طرح قایم نہیں رکھ سکا۔ پردہ دنیا پر صرف یہی ملک ایسا ہے کہ جو اب تک وہ اصول
سلطنت قایم رکھے ہوئے ہے کہ جو اُس زمانہ میں جاری تھے کہ جب بطریقی رسوم پر عمل ہوتا تھا اُسکے
اطوار و اخلاق وہی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صدیوں پہلے چلے آتے تھے۔ قرآن (شجیار)
کے مجیر العقول رسیلے اور لوہچ وار تھا وراثت اُس وقت بن چکے تھے کہ جب الیٹ اور توریت و انجیل
کا وجود بھی نہ تھا۔ طبیعت و خصلت انسانی کا یہ عجیب و غریب اضدادی کرشمہ ہے کہ ایک طرف
تو اہل عرب اپنی جھونپڑیوں میں سخت جامد نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ باہر نکل کر ہر نئی چیز کو
اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر نئے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ یونان اور روم کی یہ کیفیت رہی
ہے کہ جہاں کہیں اُن کی تیغ براں پہنچی ہے یا جہاں کہیں اُن کے بلند نظر افراد نے قدم رکھا ہے
وہیں وہ اپنے مذاق اپنی صنعت اور اپنے طریقہ حکومت کے آثار چھوڑ گئے۔ مگر عرب کی ملکی اضافی تاریخ
میں اُن کے نقش قدم کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ دنیاء قدیم میں عرب کی قدرتی دولت و تجارت کے سب
لوگ قایل تھے اور سب کو اس پر حیرت ہوتی تھی۔ مگر وہاں کسی ایسی باشان و شکوہ عمارت کا نشان نہیں
ملا جو یونانی یا رومی صنعت گروں کے ہاتھوں بنی ہو۔ جو بات کہ نہایت تیقن کے ساتھ اس امر کو ثابت
کرتی ہے کہ عرب پر کسی غیر ملک کا اقتدار نہیں رہا وہ یہ ہے کہ اُن خالص عربی آبادیوں کی زبان میں
بھی جن کے گہرے تجارتی تعلقات صدیوں یورپ سے رہے ہیں کوئی اسم ایسا نہیں ملتا جس میں
یونانی یا لاطینی زبان کی جھلک ہو۔

یہ قومی خاصہ جمود مسلمانوں کی اُن سلطنتوں کے انشقاق و انحطاط کے اسباب کی تحقیق میں
بہت کار آمد ہے جو کرہ ارض کے بہت بڑے حصے پر پھیل چکی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے
زمانہ آئندہ پر اپنی خصوصیات کے گہرے نقش بٹھائے ہیں جن کی رسوم قوانین اور زبان ایک مدت
تک اُن کی سلطنت مٹ جانے کے بعد بھی قایم رہی ہیں وہ مماثلت جو اُن کے مذہبی اصول اور
نیز اُس اصول میں تھی جو اُن کے بعد پیدا ہوئے اُن لوگوں کے جذبات مضر تھے یا مفید جو ازروئے
نسب بادشاہ ہوئے یا اتفاق و بخت نے اُن کو بادشاہ بنا دیا اُس قوم کی نشوونما تو ایک جگہ سے دوسری
جگہ اپنی سکونت تبدیل کرتی رہی ہے اُن کا عاجلانہ شباب اُن کی دماغی ترقی کا دائمی اشارہ [illegible]

تدریجی مگر یقینی انحطاط، اس قابل ہیں کہ کوئی فلسفی مورخ ان پر نہایت غور وخوض کے ساتھ تفحص کرے قابل اعتبار مواد کا فقدان اس کو ناممکن بنائے ہوئے ہے کہ اہل عرب کی دو ہزار سالہ دماغی و طبعی خصائص کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ مگر ہمیں معلوم ہے کہ ایشیا کے لوگ سخت قدامت پسند ہیں، وہ اپنی کسی بات میں تغیّر و تبدل نہیں ہونے دیتے، وہ روایات قدیمہ کو اس طرح مضبوط پکڑے ہوئے ہیں کہ کبھی چھوڑنے والے نہیں، اور اپنی خصوصیات پر اس طرح قایم ہیں کہ کبھی بدلنے والے نہیں۔ ان سب باتوں پر لحاظ کرکے یہ صحیح قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ چرواہا جو آج بخد وعمّان کے میدان میں گھوم رہا ہے وہ عمالقہ[1] قدیم کا صحیح خاکہ ہے؛ اور جس عرب کی تصویر خورنق وسدید کی دیواروں پر بنی تھی وہ آج بھی، بلا کسی تبدیلی کے، بادیہ گرو بدو کی شکل میں موجود ہے۔ جس سرزمین کا سب سے بڑا حصہ صدیوں سے بنجر چلا آتا ہو (اس کی وجہ خواہ قدرت کا بخل ہو یا باشندگان ملک کی سستی و کاہلی) اور جسکو سمندر اور ریگستان نے ہمسایہ و ہمعصر متمدن ممالک سے جدا کر رکھا ہو، اس کے باشندوں کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ایسی قوم کی مد مقابل بن گئیں کہ جس میں تغیّر و تبدل پذیر ہونے کا مادہ تھا؛ اور وہ بانڈک زمانہ نشوونما پاکر زراعت ہی کے فن میں قدیم و جدید اقوام سے بڑھ جائیں؛ محیر العقول کلیں ایجاد کرلیں؛ ریاضی کے لاینحل مسایل کو چٹکیوں میں حل کرڈالیں، ایسی مکمل، خوبصورت اور بے نظیر عمارات بناکر کھڑی کردیں جو از روئے نقشہ اپنا ثانی نہ رکھتی ہوں، مکانیت میں فرد ہوں، صنعت میں بے سہیم ہوں اور خوبصورتی اور سجاوٹ میں یکتا؛ شہروں کے محاصرے کو ایک زمانہ بعید تک قایم رکھ سکیں؛ نازک حیلہا، ملکی و جنگی میں کمال حاصل کرلیں، اور جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کرسکیں، سلطنتیں قایم کرلیں اور اُن کا نظام قایم رکھ سکیں۔ مفصلہ بالا فنون میں سے کسی ایک میں بھی درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے ایک قوم کو محنت شاقہ اور زمانہ طویل درکار ہے؛ مگر متلوّن و متقلب عرب نے محض اپنی فہم و بصیرت کی وجہ سے بغیر سیکھے اور بلا تجربہ کے ان سب کو اخذ کرلیا۔ فن ادب میں اُن کے جوہر خوب ہی کھلے۔ اس فن میں صرف نظم ہی وہ چیز تھی کہ جسکی اہالی عرب کے قلوب قدر کرتے تھے۔ اس میں بھی بدیہہ گوئی بالخصوص مستحق تعریف سمجھی جاتی تھی۔ ذہین ترین حلقہ میں بھی کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو تاریخ کا نام دیا جاسکے۔ فن انساب جس پر عربوں کو بڑا غرور تھا

[1] عرب کی ایک نہایت قدیم قوم جو ختم ہو چکی ہے۔ توریت میں اس قوم کا ذکر ہے۔ (مترجم)

کسی خاص مقام یا قبیلہ کے مشہور وحشیوں کی ایک مسلسل فہرست تھی، یا وحشتناک بتوں کا ایک گوشوارہ۔ باوجود اس کے جس ملک میں اُن کا جمِ غفیر پہنچا، اور جس ملک نے اُن کی اطاعت قبول کر لی اُسی کو انہوں نے دماغی ترقی کے منتہا پر پہنچا دیا۔ علاوہ اُن کے نہ بھولنے والے کمال کے انہوں نے اپنی رعایا، وباجگزار لوگوں کے قوائے دماغی کو بے انتہا وسیع و منور کر دیا۔ ہدایتیں دیکر اور خود اپنی مثال دکھلا کر اُن میں مسابقت و منافست کے خیالات پیدا کئے، جن لوگوں نے جہالت کی بیڑیاں توڑنے کی کوشش بلیغ کی اُن کو انعامات سے مالا مال کر دیا۔ یہ بیڑیاں وہ تھیں کہ جو صدیوں سے اُن کے پیروں میں پڑی ہوئی تھیں، اور اُن کو وہمیات و تعصبات نے اپنا غلام بنایا ہوا تھا۔ جو فتوحات انہوں نے دُنیا، ادب میں کیں وہ اُن فتوحات سے کہیں وقیع تھیں جو اُنہوں نے میدان جنگ میں حاصل کیں، یا کسی ملک یا صوبہ کو اپنے تحت تصرّف میں لا کر تسلّط بٹھایا۔ زمانۂ حال کے بہترین ادبی نمونوں میں بھی اُن کے ادب کی ضیا، نظر آتی ہے۔ چنانچہ بوکیک[۱] شی او کے ناولوں میں، سردین[۱] بٹن کے افسانوں میں، والٹیر[۱] کے فلسفہ میں، نیوٹن[۱] کے اصولوں میں، شیکسپیر[۱] کے افسانہائے غم میں، عربوں کے جوہر کا اثر دکھلائی دیتا ہے۔ اُن کے علم ادب کی سرحد آجکل کے تمدن سے ملی ہوئی ہے۔ اور اُن کا جو اثر آج کل کی تہذیب پر پڑ چکا ہے وہ مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

یہ دور رس نتائج نہ ارادی تحریک کا نتیجہ ہیں، نہ اتفاقات ناگہانی کا؛ بلکہ نہایت تیقن کے ساتھ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہیں اُس ترقی کا جس کا سلسلہ ایک زمانہ بعید تک قایم رہا۔ اُس غیر متغیر قانون کو، جو انسانوں کی قسمت کو بناتا اور بگاڑتا ہے، بڑی کڑی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، تب کہیں جا کر وہ افراد و اقوام کی طبعی و دماغی خصوصیات میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ یہ قانون اگر فی المثل ایک زنجیر ہے تو ہر واقعہ اور ہر جذبہ اُس کی کڑی ہے کہ جو ایک دوسری سے نادانستہ طور پر جڑتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح فن تعمیر بتدریج ترقی کرتا ہے اُسی طرح ایک قوم کے ارتقار کی رفتار سست مگر یقینی ہوتی ہے۔ بنیاد اور عمارت کا تعلق نمایاں ہوتا ہے گو سرسری نگاہ بنیاد کو نہ دیکھ سکے۔ زمانۂ قبل از اسلام کے گنوار عربی شیخ، اور طاقتور اور

---

[۱] ضمیمہ د ملاحظہ ہو۔ (مترجم)

مہذب خلفاء بغداد و قرطبہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن خلفاء بنو عباس ہوں یا بنو امیہ دونوں
اپنے آپ کو اُن قزاقان بادیہ کی اولاد بتلاتے ہیں جو ہر سال مکہ کے قافلوں کو لوٹتے تھے۔ زمانہ
قبل از تاریخ کے بیہودہ گھروں اور اُن بے نظیر عمارتوں میں بڑا فرق ہے جن پر اہالی ایتھنز[51] نے
اپنا کمال اور اپنا جوہر دکھلایا ہے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ زمانہ قدیم کی کانوں
سے جو اُن گھڑ اور بدشکل پتھر نکلے تھے، نہ اُن میں نقش و نگار تھے نہ زیب و زینت، مگر وہی پتھر رُوم
و یونان کے خوشنما ستونوں کے باوا آدم تھے۔ اگر اُن ترقیات کا لحاظ کیا جائے جو عربوں
نے خلفاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کی ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اُن کے بُت پرست
اجداد میں دماغی قابلیت بدرجۂ اتم موجود تھی (گو ہمارا یہ قول اُن کی وحشیانہ زندگی سے متغایر و متباین
معلوم ہوتا ہے) صرف یہی نہیں بلکہ اُن میں ملکی انتظام اور اُن اصول کا غیر معمولی مادہ موجود تھا جو
بنی نوع انسان کے کار آمد ہیں۔ اُن کی اہلیت و قابلیت دبی ہوئی و غیر ارادی تھی، اور ایک زمانۂ لامحدود
سے معطل پڑی رہی تھی۔ یہ واقعات ایسے ہیں کہ جن کی مثال زمانۂ گزشتہ و موجودہ کی تواریخ میں
نہیں ملتی، اور وہ باتیں ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہر ایک عالم کو حیران رہ جانا چاہیئے۔

باوجود ظاہری گنوارپن اور وحشت کے اہل عرب دُنیائے قدیم کی مجلس میں اس حیثیت
کے ہیں کہ اُن کو صدر سے کچھ ہی فروتر جگہ ملنی چاہیئے۔ انہوں نے مصر کو فتح کرلیا تھا، اور وہاں کے
خاندان رُعٰی کے بادشاہوں کے ماتحت صدیوں مصر پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں سے ایک
شخص بطور معمولی سپاہی کے بھرتی ہوا اور بہت جلد ترقی کرتے کرتے تخت روم پر متمکن ہوگیا۔ اُن کا
ایک پورا رسالہ تھا کہ جس نے قیاصرہ رُوم کی بڑی خدمت کی اور میدان جنگ میں بڑا نام پایا۔ متعدد
موقعوں پر بدوؤں کی شجاعت و بسالت نے سلطنت ایران کے بادشاہوں کی قسمت کا فیصلہ
کیا۔ زینوبیہ[52] ملکہ پامیریا کی فوج میں زیادہ تعداد اِن ہی کی تھی، اور سسلی[53] اُن سے وہ بے جگر ہو کر لڑی
تو اِن ہی کے بھروسہ پر۔ جس کسی کے بھی علم کے نیچے وہ لڑے انہوں نے اپنی استقامت پر
دھبہ نہیں آنے دیا۔ معہذا یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اُن کی وفاداری و نمک حلالی ہمیشہ مشکوک رہی ہے،

---

[51] دارالسلطنت یونان۔ (مترجم)
[52] ضمیمہ کا ملاحظہ فرمائیے۔ (مترجم)
[53] ضمیمہ کا ملاحظہ فرمائیے۔ (مترجم)

بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ عرب اور غدر و خیانت ہم معنی لفظ سمجھے جاتے رہے ہیں۔

اہل عرب کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت اُن کی بے چین زندگی اور بے قرار طبیعت ہے۔ ابتدا و زمانہ سے اُن کی یہ حالت چلی آرہی ہے۔ اُن کی خصوصیات اسی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اُن میں وُہ قابلیت ودیعت رہی ہے کہ جس نے اُن کو دُنیا میں ممتاز کر دیا۔ تجارت و تہذیب کے درمیان میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک بڑھتی ہے تو دُوسری میں ترقی ہونی لازمی ہے۔ لیکن یہ دونوں ملکر بھی اُن کی خانہ بدوشانہ عادت کو نہ چھُڑا سکیں۔ کششِ آسائش تمدن و ثروت بھی اُن سے اُن کی طبعی میلان اور قدرتی خصوصیت کو چھُڑانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اقوام متمدنہ کا جتنا تکلف تعیش اُنہوں نے دیکھا اُسی قدر وہ ان بندگان عیش سے نفور ہو گئے۔ اُن کی آوارہ گردی نے اُن کو ہر جگہ پہنچا یا۔ وہ بے دھڑک ہو کر صحرا، افریقہ میں جا گھسے ہندوستان کے راجاؤں کی طرف سے لڑنے پر پریٹوریا[۱] کی فوج میں بھرتی ہُوئے اور وہاں سلب و نہب کا جو مادہ اُن میں ودیعت تھا اُس کو دکھلایا۔ اور شاہی تخت و تاج کے فروخت کرنے سے بڑا نفع اُٹھایا۔ بعثت رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زمانہ پیشتر عرب کی اصلی خصوصیت یعنی بے قراری بہت نمایاں ہو گئی تھی۔ جس قوم میں کہ ہرزہ گردی اور قدیم وحشیانہ خصلتیں ہوں اُنکو کسی خاص خطّے سے محبّت نہیں ہوتی۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ بدّو پابند ہو کر کسی جگہ بیٹھ رہنے کو طوق غلامی سمجھتے تھے۔ صدیوں کے بعد اُن کا یہ تعصب رفع ہُوا۔ مگر سکونت کی تبدیلی نے مہذب و متمدن لوگوں کی صحبت نے جدید نظام دولت نے کششِ آسائش و ثروت نے اُن کے اصلی اور نمایاں جوہر شخصی آزادی و منافست باہمی میں کمی نہیں آنے دی۔ ان قومی خصوصیات نے مشرقی و مغربی خلافت کو اُن کے عرُوج کے زمانہ میں بھی بارہا مخدوش کر دیا تھا۔ وُہ دعویداران سلطنت کی رقابت کو اُن کی ان حرکات نے تلخ سے تلخ تر بنایا اور اُنہوں نے اپنی طرفداری سے اُمراء کی خصُومت و معاندت کو بڑھایا۔ یہ بندگان غیظ و غضب پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہُوئے ہر طرف گھُومتے نظر آتے تھے۔ عوام الناس اپنے اصلی خیالات کو بمشکل بھی نہ چھُپا سکتے تھے

---

[۱] پریٹوریا PRETORIA سلطنت رُوم میں تیسرے درجہ کے سپہ سالار کو کہتے تھے۔ اگرچہ یہ عہدہ دار دیوانی و فوجداری مقدمات کے انفصال کیلئے مقرر ہُوا تھا، مگر ضرورت کے وقت اسکو جنگ میں بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ اسکی فوج الگ ہوتی تھی۔ (مترجم)

وہ شخصی کاوشوں، جم غفیر کی عداوتوں، مذہبی رستخیز، بغاوت، بے رحمانہ افعال و حرکات میں ہر موقعہ پر اپنے آپ کو نمایاں رکھتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں جتنی اسلامی سلطنتیں قایم ہوئیں اُن کے تباہ کرنے میں سب سے زیادہ کارگزاری عربوں ہی کی تھی۔ اندلسی عرب اس میں پیش پیش تھے، حالانکہ ان کی سلطنت، گو سخت استبدادی نہ ہو، مگر مہذب ترین تو ضرور تھی۔ عربوں کی جبلّی تند مزاجی، آشفتگی و برافروختگی اور کینہ توزی اگرچہ فتوحات کے لئے نہایت موزوں تھی، مگر اُن میں اُن صفات کی بہت کمی تھی جو کسی شخص کو وسیع النظر، وسیع الخیال سیاست داں اور غیر طرفدارانہ قوت ممیزہ رکھنے والا مبصر بناتی ہیں کسی سلطنت کے قیام و دوام کے لئے ایسے آدمیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کہ بے حد شخصی آزادی حاصل تھی، وہ کوہستان کے باشندے تھے۔ وہ ایسے دشوار گزار مقامات میں رہتے تھے کہ جہاں کوئی دوسرا نہ پہنچ سکتا تھا، وہ تنہائی کے خوگر تھے، تمام مردانہ کاموں میں کامل تھے، تکلفات سے اُن کو کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ اُن کا ایک ایک فرد عابد الوثن اور اسی میں مگن تھا، یہی وہ بدبخت تھے جنہوں نے پیغمبر خدا (صلے اللہ علیہ وسلّم) کی بھی نہیں سُنی، نہ مسلمان ہوئے، نہ مطیع۔ جو لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے اُن میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جو بڑے بڑے شہروں کے قرب و جوار کے رہنے والے نہ تھے۔ عرب جاہلیت ہو یا عرب اسلام دونوں زمانوں میں مذہب و تجارت دوش بدوش چلتے رہے ہیں۔ جس جماعت نے کہ اپنا نظام قایم کر لیا تھا وہ مذہب قدیم کے حامی و ہمدرد تھے۔ کیونکہ وہی اُن کی دولت، اُن کے مشاغل، اُن کے ذاتی اغراض و فوایداور تمدنی امتیاز کا باعث تھی۔ تاجرین اور اُنکے متعلقین اُن الہامات کو سرد مہری سے دیکھتے تھے کہ جن کا مضر اثر اُن کی آمدنیوں پر پڑتا تھا، یا جس سے کسی طرح بھی اُن کی ذاتی اہمیت و حیثیت میں کمی آتی تھی۔ بُت پرستوں کے پروہت جو جزیرہ نما عرب کے معابد و دوماں لوگ ہوتے تھے، نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنے پیشہ کے تمام تبحّر کو خرچ کر کے اس تعصب کو بھڑکاتے رہتے تھے۔ خصوصاً اس لئے کہ اُن کو اس نئے دین سے سخت ترین و حشیانہ نفرت تھی۔ غرض اصول دین جدیدہ کی اشاعت میں تاجرین و مقتدایان مذہبی کا بہت ہی کم حصّہ ہے۔ اب رہ گئے بادیہ نشین جنگابیوں کا جم غفیر، یہی وہ لوگ ہیں جو دُنیا بھر کے فاتح بنے۔

کچھ حمیری[1] کتبے، جو حال ہی میں پڑھے گئے ہیں، ان سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ایک نامعلوم زمانہ میں دو سمتوں سے لوگ آ کر اس ملک میں آباد ہوئے؛ ایک شمال سے اور دوسرے جنوب سے۔ اثنا سفر میں وہ دونوں ایک جگہ آ کر مل گئے؛ اور ایک دوسرے کی صحبت، اور آپس میں شادیاں کر کے چند ہی روز میں مل جل گئے۔ ان کے اس قدر شیر و شکر ہو جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ایک ہی نسل کے تھے۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ جو لوگ شمال سے آئے وہ کنعانی تھے کہ جن کو یوشع کی تلوار نے وطن سے نکال باہر کیا تھا۔

ان کی زندگی اور ہستی کی ابتدائی حالت پر اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آوارہ گردان عرب میں کسی قسم کا نظام یا اتحاد ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کا ملکی انتظام (اگر اس کو اس سے موسوم کر کے مفتخر کیا جا سکے) پرانے زمانہ کا بطریقی نظام تھا۔ وہی شخص امیر یا بادشاہ بنایا جاتا تھا جس میں ذاتی قابلیت ہو، یا کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہو، یا اس کا خاندان زمانۂ قدیم سے معزز چلا آتا ہو۔ ایشیا میں جو قبیلہ پروری کا قاعدہ مستمرہ ہے اس کے موافق امیر کے خواص (جو عموماً اسی کے ہم جد ہوتے تھے) اس کے ذاتی خدمتگذار رہتے تھے۔ اس طریقہ کے موافق ایک قبیلہ کے بہت سے اجزا ایک ہی سلک میں منسلک ہوتے چلے جاتے تھے۔ اب خواہ اس کو قبیلہ پروری کہا جائے یا خوف انعدام کی روک تھام، بہرحال نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ کے افراد کی تعداد، اس واقعی رشتہ داری، یا خیالی تعلقات کی وجہ سے، اپنے ہمسایوں سے بڑھ جاتی تھی۔ اسلامی حکومت قایم ہونے سے پہلے کوئی منضبط طریقہ حکومت نہ تھا؛ نہ قانون تھے، نہ ایسے حکام دیوانی و فوجداری کہ جن کو کسی حاکم اعلیٰ نے یا خود رعایا نے مقرر کیا ہو، یا وہ از خود حاکم بن بیٹھے ہوں۔ ہر ایک قبیلہ آزاد تھا۔ ان میں سے ہر فرد اپنے آپ کو اپنی سوسایٹی کا جوابدہ نہیں سمجھتا تھا۔ اگر کچھ خیال تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کی حفاظت کریں۔ اپنی ہستی کو قایم رکھنے کا قدرتی خیال، عام رائے کا زور اور رقیب قبیلہ کی دست درازی کا

---

[1] حمیر سبا کا ایک حکمران قبیلہ۔ ان کی اور عربوں کی زبان اور طرز تحریر میں بہت کچھ فرق ہے۔ یہ کتبے ابھی تک نکل رہے ہیں، اور علمائے تاریخ و ادب کو ان سے خاص دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ انھی کی بنیاد پر یمن کی نئی تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ تفصیل کے لئے رائل ایشیاٹک سوسایٹی کے رسالوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخ کے شوقین بالخصوص علم الالسنہ کے شایق حظ وافر اٹھائیں گے۔ (مترجم)

خوف اُن چند قبایل میں عارضی اتفاق ہو جانے کا توی محرک تھا کہ جن کے اغراض معرضِ خطر میں ہوتے تھے۔ شیخ قبیلہ کے اختیارات برائے نام ہوتے تھے۔ وُہ صرف مشورہ دے سکتے تھے، حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ صرف ایک اعزازی حیثیت رکھتے تھے، اُن کی ذات نہ مفید تھی نہ مضر۔ شیخ قبیلہ اپنے اختیار یا اثر سے نہ کوئی جنگ شروع کر سکتا تھا، نہ کسی کو اپنا مطیع بنا سکتا تھا، نہ کسی کو اچھے کام پر انعام دے سکتا، نہ بُرے کام پر سزا۔ جس قبیلہ کا وہ شیخ ہوتا تھا اُس کے تمام کام اُسی قبیلہ کے ایسے افراد کرتے تھے جو اپنی عمر، تعزز اور تمول میں ممتاز ہوتے تھے۔ اس مجلس شوریٰ کی تجاویز یا فیصلے اُن صورتوں میں قطعی نہیں سمجھے جاتے تھے کہ جن میں تمام قبیلہ کے اغراض وابستہ نہ ہوں، کیونکہ ایسی صورتوں میں ہر ایک متمول، معزز اور قبیلہ کے سربر آوردہ آدمی سے یکان یکان رائے لی جاتی تھی۔ یہ حکومت مستبد و مطلق، جو ایشیا میں چلی آتی ہے اور جس کو جانشینان رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے انتہا پر پہنچا دیا تھا،[1] اُس کا وجود بھی عرب قدیم میں نہ تھا۔ چونکہ ہر شخص اپنے تلوّن کی وجہ سے آشوب پیدا کرنے میں آزاد تھا، اس لئے یہ متفرق جماعتیں اُن معمولی پابندیٔ قانونی کی چنداں پروا نہیں کرتی تھیں جو عوام کی رائے سے اُن پر ڈالی جاتی تھیں۔ اُن کو قابو میں رکھنا بھی گویا ایک قسم کا آشوب تھا، گو اتنا سخت نہ تھا کہ سوسائٹی کے نظام ہی کو خراب کر ڈالے۔ قدرتی مزاحمتیں، مثلاً پانی کا کم ہونا، زمین کا بنجر اور ناقابل کاشت ہونا، وُہ باتیں تھیں کہ جن سے اُن تعصبات میں اور بھی زیادتی ہوتی تھی جو نسلاً بعد نسلاً چلے آتے تھے، اور وُہ دشمنیاں بڑھتی تھیں جو بزرگوں کی روایت یا اجداد کے زمانہ سے چلی آتی تھیں۔ اس پر رسل و رسایل کے مشکلات ایسے موانع تھے کہ اہل عرب اپنے ملک میں رہ کر نہ ملکی ترقی کر سکتے تھے نہ دماغی۔ باوجود اُس بڑے انقلاب کے جو شیوع اسلام سے اور ملکوں میں پیدا ہُوا، عربوں نے اپنی اصلیت اور اپنے خیالات کو نہیں چھوڑا۔ اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب کا بادیہ کے آسمان کے نیچے رہ کر اپنی طبیعت ثانیہ کو بدل دینا بالکل ناممکن ہے۔

بدوؤں کی تمام عمر مسلسل لڑائیوں میں گزر جاتی تھی۔ اُن کی ہستی کی معمولی حالت ہی جنگ تھی۔ اُن کا مطمح نظر اور مآل زندگی اگر کچھ تھا تو صرف یہ کہ انتقام لیں، شہرت حاصل

---

[1] کیا یہ صحیح ہے؟ (مترجم)

کرلیں اور اپنے ہمسایہ کی ملکیّت کو اپنے قبضہ میں لے آئیں۔ ان جذبات میں منہمک رہنا، بالخصوص لوٹ مار کی ناپاک خواہش کا پورا کرنا اور بے رحمیاں کرنا اُن کی بڑی نمایاں نامعقول خصوصیّت تھی۔ سرقہ بالجبر عربوں کی نگاہ میں جتنا معزز پیشہ تھا، امن و آسایش کی زندگی اتنی ہی ذلیل۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ قزاقی اور تیغ زنی توام ہیں جس قوم یا ملک میں نہ زراعت ہو نہ صنعت ہو نہ تجارت ہو اُس میں اگر جبر ستانی دسلب و نہب ذریعہ شکم پُری نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے صحرا میں اسکی اگر کچھ تدبیر تھی تو صرف یہ کہ دشمنوں کو لوٹیں اور مسافروں کو کھسوٹیں۔ چونکہ نظام حکومت کچھ تھا ہی نہیں اس لئے مال و املاک بے ثبات چیز تھی۔ دولت اتنی ناپایدار کہیں نہ تھی جیسی عرب میں کسی مخالف قبیلہ کا حملہ بڑے سے بڑے مالدار کو ایک ہی رات میں مفلس قلّاش بنا دیتا تھا۔ ایسے ملک میں کہ جہاں قدم قدم پر کمین گاہیں بن سکتی ہوں، اور دم دم پر دشمن کو حملہ کرنے کے موقعے حاصل ہوں، جس سرزمین کا کوئی مالک نہ ہو، اور جہاں کے باشندوں کا مال و منال بھیڑ بکریوں یا اونٹوں کا گلّہ ہو، وہاں آدمی خواہ کتنا ہی محتاط اور ہوشیار ہو مصائب سے نہیں بچ سکتا۔ ایسی جگہ کہ جہاں اپنے اقران و امثال میں کسی شخص کی اہمیت و عزّت اس پر موقوف ہو کہ وہ خطرات کا مقابلہ کرے، اور وارداتِ قتل و غارت میں پکڑا نہ جا سکے وہاں مفلس ہونا سخت بے عزّتی کی بات ہونی ہی چاہئیے۔ آئے دن کے خطرات سے اجنبیوں کا اعتبار جاتا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ تمام قوم کا خاصہ ہی بن گیا ایک دوسرے سے ناآشنا بدوؤں کے دو گروہ اگر بادیہ میں ایک دوسرے سے دوچار ہو جاتے تھے تو وہیں کمزور گروہ کو زور آور گروہ لوٹ لیتا تھا۔ جو شخص کہ ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ کارنمایاں دکھلاتا تھا وہ واجب التعظیم بہادر تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ جس قزاق میں استقلال اور خدعۃ الحرب کا زیادہ مادہ ہوتا تھا، اور جو قتل و غارت سے زیادہ مال جمع کر لیتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ اپنے قبیلے میں پوجا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اہل حجاز کے دلوں میں ایک مشہور ڈاکو کی وہ عزّت و عظمت ہے کہ جو پیغمبر عرب (صلوٰۃ اللہ علیہ) کی عظمت سے کچھ ہی کم ہو تو ہو[1]۔

عرب قدیم کے قلوب کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ایک عجیب مجموعۂ اضداد معلوم

---

[1] کیا یہ صحیح ہے؟ (مترجم)

ہوتا ہے، جس کی جھلک اُن کی اولاد میں ابتک نظر آتی ہے۔ اُن کی بہادری تہوّر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، مگر باوجود اِس کے کسی دشمن کو غافل پاکر قتل کرنے میں بھی اُن کو تامل نہیں ہوتا۔ اُن کو دعویٰ ہے کہ وُہ سِن اور عمر کا بہت لحاظ کرتے ہیں اور اپنے قبیلے کے معمر آدمی کے مشورہ پر عمل ہوتے ہیں، لیکن کسی دعوت کے موقعہ پر بوڑھے اور اپاہج آدمیوں کو نکال دینے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے تھے۔ کسی بڑے قافلے کو لوٹنا بڑی تعریف اور شہرت کا کام تھا، چھوٹی چھوٹی چوری چکاری کرنے والے کو عام طور پر بہت بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وُہ مصیبت زدوں کے مددگار تھے، مگر اکیلے دوکیلے آدمی کو بے تکلّف لوٹ لیتے تھے۔ نہایت فراخ حوصلگی اور خلوص کے ساتھ مہمان نوازی کرتے، مگر جیسے ہی اُنکے گھر سے مہمان قدم باہر نکالتا اُس کا تعاقب کرتے۔ معہٰذا بدوؤں میں بہت سی خوبیاں قابلِ تعریف بھی تھیں۔ اُن کے استقلال اور دلیری میں تو کبھی کلام ہی نہیں ہوا۔ اُن میں خودداری کمال درجہ کی تھی۔ جو شخص اُن کی پناہ لیتا، خواہ وُہ اُن کا دشمن ہی ہوتا، مگر جب تک اُن کے خیمے کے احاطہ میں رہتا ہر خطرے سے محفوظ رہتا۔ اگر کوئی ناواقف آدمی بھی اُن سے پناہ مانگتا تو وہ اُس کی اِس طرح حمایت کرتے کہ گویا وُہ اُن ہی کا عزیز ہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد کسی بدّو کا الاؤ ایک دوستانہ دعوتِ عامہ تھی۔ اس ریت کے سمندر میں رات کے بھولے بھٹکے مُسافروں کو یہ آلاؤ وُہی کام دیتا تھا جو لائٹ ہاؤس جہازوں کے لیئے۔ اگر کوئی اجنبی اُن کی طرف آنکلتا تو مہمان نوازی میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنا چاہتے تھے۔ کسی شخص کی نسبت یہ کہا جاتا کہ وُہ مہمان نواز نہیں ہے سب سے بڑی بدنامی تھی۔ اُن کی شجاعت نے زندگی بے ثبات، اور آئے دن کے خطرات کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس شجاعت کا اظہار عورتوں کی عزّت کرنے کے موقعہ پر ہوتا تھا، اور اِس کی نمائش اس صنفِ نازک کی حمایت کے وقت۔ اُن کے مزاج کی سادگی، اُس پر اُن کی خودداری اور وقار سے اُن کی صورت میں ایک رعب اور ہیبت پیدا ہو جاتی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ درجہ و رتبہ، تعلیم و علم میں اُن سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے وُہ بھی اُن کی عزّت کرتے تھے۔ چونکہ نکبت و مصیبت پر اُن کو صبر کرنے کی عادت ہوتی تھی، اِس لیئے رنج کا ظاہر کرنا اُن کے نزدیک ناقابلِ معافی کمزوری تھی۔ اُن کے تمام طبعی جذبات پر آزادی کی محبت اِس قدر غالب تھی کہ جس کا اندازہ وُہ لوگ نہیں

کر سکتے کہ جو متمدن دُنیا کے مہذب قانون کی جکڑ بند میں کسے ہوئے ہیں۔ چونکہ اہالی عرب کی خصائل و خصوصیات میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں اس لئے اُن کے عیوب اور بھی اُبھرے ہُوئے معلوم ہوتے تھے اُن کی خودداری نے اُن کے بہت سے عیبوں اور نقصوں کو چھپا رکھا تھا۔ اور وحشیوں کی طرح اُن کی طینت میں بہت کچھ بچپن، تلوّن، شوخی اور بدتمیزی تھی؛ وُہ خفیف باتوں سے متاثر ہو جاتے تھے، اُن کی عقل حیوانی ہی اگر اُن کو سیدھا کر دیتی تو کر دیتی، ورنہ دلیل و برہان کے ماں کے تو وُہ تھے نہیں۔ چھوٹی سی بات پر برافروختہ ہو جاتے اور کینہ توزی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ تمام مخلوق آلٰہی میں سب سے بڑا جذبہ بد جذبات اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وُہ عرب تھا۔ اُس کے غرور کی کوئی حد نہیں تھی، اور اُس کی طمع کا پورا ہونا ناممکن۔ اُس کے نزدیک انتقام لینا ایسا فرض عین تھا کہ جس کو تمام اخلاقی اور تمدّنی فرائض سے پہلے ادا ہونا چاہئیے! اُس کی دُشمنی کی یہ کیفیت تھی کہ کسی کے گناہ کو معاف کر دینا گویا اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگوا لینا تھا۔ وُہ چونکہ شیخی باز و لاف زن تھا اس لئے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اپنی شجاعت دکھلانے کیلئے دغا و فریب سے بھی درگزر نہ کرتا تھا۔ اہل عرب مردم خوری بھی کر لیتے تھے، اور باشندگان سکینڈی نیویا کی طرح وُہ اپنے دشمنوں کو ذبح کر کے اُن کھوپریوں میں شراب بھی پی لیتے تھے اس قسم کی بھیانک اور وحشت انگیز دعوتوں میں صرف بہادران تیغ آزما ہی شامل نہ ہوتے تھے، بلکہ عورتیں بھی اُن میں موجود ہوتی تھیں، اور وحشیانہ فخر کے ساتھ مُردہ دشمنوں کے کان، ناک اور ہڈیوں کے ہار اور تعویذ پہنتی تھیں۔

وُہ اکثر اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، اگرچہ بہانہ یہ کرتے تھے کہ کسی کو داماد بنانے میں ہماری بے عزّتی ہے۔ مگر اس کی حقیقی اور واقعی ضرورت اقتصادی تھی، کیونکہ ملک میں امن و امان مفقود تھا اور جنگ و جدل کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک صاحب کی آنکھ سے کبھی آنسو نہیں نکلے تھے، مگر اُس وقت کہ جب وُہ اپنی چھوٹی سی لڑکی کو زندہ دفن کرنے کے لئے قبر کھود رہے تھے، اور لڑکی نے یہ دیکھ کر کہ باپ کی داڑھی گرد آلود ہو گئی ہے دفن ہونے سے پہلے نہایت محبّت کے ساتھ اُس کی داڑھی کو پونچھ دیا۔ اس قسم کی ناقابل بیان بے رحمیوں سے جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ملک والوں کو بچا لیا۔

عرب میں تعدد ازواج اور تعدد بعول کا بھی رواج تھا یعنی مرد ایک مرتبہ میں بہت سی عورتوں سے نکاح کرتے تھے اور عورتیں ایک مرتبہ میں کئی مردوں سے۔ اور یہ رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ کسی دوسری وحشی قوم نے اس کو گوارا نہیں کیا تھا۔ شاید دنیا کی تاریخ نکاح میں وہ عرب کی عورت اپنا ثانی نہیں رکھتی جس نے چالیس مردوں سے اپنی زندگی میں نکاح کیا۔ ایسی صورتوں میں ظاہر ہے کہ ایسی حسد و غیرت کا مادہ پیدا ہی نہیں ہوا کرتا[1]۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب میں بے حد شراب نوشی کا عیب تھا۔ اُن میں سے اکثر اس کا فخر کرتے تھے وہ شراب زیادہ سے زیادہ پی سکتے ہیں۔ بعض حمیری بادشاہ تو ایسے تھے جو شراب پیتے پیتے مر گئے، اور اپنا ایسا نام چھوڑ گئے ہیں جس کی کسی کو خواہش نہ کرنی چاہئیے۔ قمار بازی کا ریگستان عرب میں یہ زور تھا، کہ پرانے زمانہ کے باشندگان جرمنی کی طرح بدوی بھی اپنی آزادی کو داؤں پر لگا دیتے تھے[2]، حالانکہ آزادی اُن کے یہاں ایک بے بہا چیز تھی۔ عبرانی بطارقہ کی طرح وہ اُن عورتوں سے شادیاں کر لیتے تھے جو اتنی قریب رشتہ دار ہوتی تھیں کہ جن سے کسی شریعت نے شادی کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ دھاڑیتی ہونے پر فخر کرتے تھے، اور کسی قافلہ کو گرفتار کر لینا اپنا مآل زندگی سمجھتے تھے یہ بات اُن کے لئے کچھ غیر معمولی نہ تھی کہ کسی شخص کو مار کر اُس کی لاش کو اس طرح مسخ کر دیں کہ زمانۂ حال کے امریکن انڈین بھی اُس کو دیکھ کر شرما جائیں۔ وہ کسی شخص کے بے گناہ یا گنہگار ہونے کو آگ میں ڈال کر یا دریا میں ڈبا کر آزمایا کرتے تھے۔ یہ وہ طریقہ تھا جو انھوں نے اور اُن کے اقارب یہودیوں نے کسی بہت ہی قدیم قوم سے سیکھا تھا۔ وحشیانہ شجاعت کا قاعدہ جزیرہ نمائے عرب میں بہت جاری تھا، اور شعرائے بادیہ ولولہ انگیز قصائد میں اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ اسلام کے سخت قوانین سے عارضی طور پر اس کی بندش ہو گئی تھی، مگر بہت جلد ممالک اندلس اور صقلیہ میں اس طریقہ نے پھر سر اُبھارا، وہاں سے اُس نے شمال کی طرف رُخ کیا اور رفتہ رفتہ شجاعت وغیرہ کا ایک جزو بن کر یورپ کے وحشی مگر پارسا گنواروں میں پھیل گیا[3]۔

غیر معمولی ذہانت اور تخیل، قوت حافظہ، بچوں کی طرح عجائب و غرائب دیکھنے کا شوق، ہر

---

[1] لیکن عربوں کی غیرت تو مشہور ہے۔ نہ معلوم مسٹر سکاٹ کیا فرما رہے ہیں۔ (مترجم)

[2] ؟ (مترجم)

چیز کو حیرت سے دیکھنا، عرب جاہلیت کی وہ خصوصیات تھیں جو اُن کو دیگر بادیہ نشین اقوام افریقیہ
و ایشیا سے ممتاز کیے ہوئے تھیں۔ دو قبائل کے درمیان میں جو دشمنی شروع ہوتی تھی اُس کا
سلسلہ نسلو نسلو پشت چلا جاتا تھا۔ کچھ تو پشتینی جذبۂ انتقام اور کچھ اس خاص نقصان کی تلافی
کا خیال جو ایک دوسرے کو پہنچتی تھی، اُن کی طبعی درشت مزاجی کو بھڑکاتی رہتی تھی، اور جب
اُن کی طبیعت میں اشتعال و ہیجان ہوتا تھا تو رحم کا مادہ اُن میں سے سلب ہو جاتا تھا۔
خونریزی و خونخواری کا میلان تو ان پیدائشی سپاہیوں میں بدرجۂ اتم موجود تھا ہی، اُن کی روزانہ
مراسم زندگی اس مادہ کو اور بھی مستقل کرتی رہتی تھیں۔ جس گھوڑے پر بیٹھ کر وہ میدان جنگ
میں نکلتے تھے، اس کی سوانح عمری یاد رکھی جاتی تھی۔ کسی مشہور سرکردہ فوج کی تلوار کا نام اور
اُس کی تاریخ کبھی نہ بھولی جاتی تھی۔ کسی بڑے اور کامیاب قطاع الطریق کے اقوال ناقل و
دل شگفتہ و رفتہ شاعرانہ نکات کی صورت میں ضرب المثل بن کر اس کی اولاد در اولاد کی زبان
پر چڑھے ہوتے تھے، اور بطریق فخر و مباہات بات بات میں منہ سے نکلتے تھے۔ اُس کے
کارنامے شعرا کے زوردار قصاید میں آ کر غیر فانی ہو جاتے تھے اور ہر رات کو ہر ایک قبیلہ
مجمع میں بیٹھ کر اُس کو دوہراتا تھا۔ جب کسی کے رشتہ دار کو کوئی قتل کر ڈالتا تھا تو اُس کا
سوگ اُس وقت تک ملتوی رکھا جاتا تھا کہ جب تک پورے طور سے اُس کا انتقام نہ لے
لیا جائے۔ انتقام کشی بجائے خود ایک وحشیانہ قانون تھا۔ جہاں کسی خاندانی نقصان کا
انتقام لینا ہوتا تھا وہاں تمام جذبات انسانیت و آدمیت بالائے طاق رکھ دیے جاتے تھے
لیکن اس کا یہ اثر نہ تھا کہ وہ غیر ذالک لوگوں یا خاصکر اُن سے جو اُن کے دشمن نہ ہوتے تھے
اور اُن کے ساتھ سپاہیانہ فنون میں شامل ہوتے تھے وہی وحشیانہ برتاؤ کریں۔ لیکن ان
صورتوں میں جہاں قبیلہ یا خاندان کی عزت و آبرو یا دشمنی و مخالفت کا خیال ہوتا تھا وہاں انتہا
سختی و درشتی کا استعمال کرنا گویا دینی فرض تھا، اور پرانی مہربانیاں اور احسان اور آیندہ کے
فواید کی اُمیدوں کو بالکلیہ نسیاً منسیاً کر دیا جاتا تھا۔ ضابطہ کے موافق تو انتقام پانچویں
پشت سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، مگر وہ میراث بن جاتا تھا، اور کبھی فراموش نہ ہوتا تھا،
نہ کبھی نہ چھوڑا جاتا تھا۔ مقتول کی عمر، رتبہ و درجہ کے موافق قاتل پر ایک جرمانہ مقرر تھا لیکن

وُہ خاندان یا قبیلہ، جو اپنے آپ کو زیادہ معزز اور خود دار سمجھتا تھا، اُن اونٹوں کے لینے سے انکار کر دیتا تھا جو بطور جرمانہ دیئے جاتے تھے، اور جن کی تعداد تیراضی ملکِ قوم زمانۂ قدیم سے مقرر چلی آتی تھی، اور جو نقصان جان کا کافی معاوضہ سمجھے جاتے تھے۔ یہ وحشیانہ رسم جس طرح ہر اُس سپاہی کو حاوی تھی جو میدانِ جنگ میں عزت کے ساتھ جان دیتا تھا، اُسی طرح اُس مظلوم پر بھی حاوی تھی جو کسی قاتل کی شمشیرِ بُرّاں کی نذر ہوتا تھا۔ بعض وقت بڑی بڑی لڑائیاں نسبتاً بغیر خونریزی کے اِس لئے ختم ہو جاتی تھیں کہ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ہر مقتول کے عوض میں نہ معلوم کتنے آدمیوں کی جانیں جائیں۔ غور کیا جائے تو بادیہ میں انسان کی جان کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ ایک آدمی کے مارے جانے کا نتیجہ اکثر یہ ہُوا ہے کہ ایک قبیلہ کا قبیلہ بالکل صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ بہت سے قبایل کے درمیان میں سخت عداوت ہوتی تھی، دشمنی کے نتائج پُشت ہا پُشت تک بھگتنے پڑتے تھے، اور ہر ایک قبیلہ کو ایسے مواقع حاصل ہوتے تھے کہ وُہ خفیف سی بات پر ایک دُوسرے کو معدوم کر دیں، تو ہم اِس بے چُون و چرا نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ گو انتقام نقصانِ جان میں کتنی ہی وحشت نہ دکھلائی جاتی ہو، مگر یہی خیالِ انتقام عرب کی قوم کے بقا کا باعث ہوا ہے ورنہ وُہ کبھی کی تلف ہو جاتی ‌‌۔

اہالیِ عرب ضرورتاً اکل و شرب میں پرہیزگارانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حصُولِ ضروریاتِ زندگی میں اُن کو سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی، اُن کی املاک کا ثبات مشکوک ہوتی تھیں، خوفِ جان و مال ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا، اراضی ناقابلِ کاشت تھیں، دستِ مُزد اُن کے نزدیک بے عزّتی تھی، اس لئے اُن میں وُہ عیوب پیدا نہیں ہو سکتے تھے جو ایک مصنوعی تہذیب و تمدّن کے لوازمات میں سے ہیں۔ جنوبی علاقے کی فصلیں وہاں کی قلیل آبادی کے لئے بھی مکتفی نہ ہوتی تھیں۔ عالمِ نباتات میں سب سے بڑی چیز کھجور تھی، بیشتر اُسی پر بادیہ نشینوں کی گزر اوقات تھی۔ اس قیمتی چیز کی قریباً سَو قسمیں تو مدینہ ہی کے قرب و جوار میں ہیں۔ چونکہ کھجور میں غذائیت زیادہ ہے اس کا رکھ رکھاؤ بہت آسان ہے اور اس کو دُور دراز مسافت پر لیجا سکتے ہیں۔

لہ مجھے اس میں شک ہے۔ (مترجم)

کچھ دقّت نہیں، اس لئے ایک گرم و خشک ناقابلِ زراعت ملک کے لوگوں کے تغذیہ کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اگر اس ملک میں کھجور نہ ہوتی تو یہ ملک بھی غیر آباد ہوتا۔ اسکی گٹھلیاں بھی اشیائے تجارت میں سے تھیں، اور گھوڑوں اور اونٹوں کو کھلائی جاتی تھیں۔ اور بادیہ نشین اقوام کی طرح اہلِ عرب ترکاریاں صرف سخت ضرورت کی حالت میں کھاتے تھے ضیافتوں میں میزبان کی حیثیت اور مہمان کی تواضع کا اندازہ گوشت کی کمی زیادتی سے کیا جاتا تھا۔ جس دیگ میں پوری بھیڑ پک جائے وہ تو معمولی سمجھی جاتی تھی، بہت سی دیگیں ایسی بھی ہوتی تھیں کہ ایک اسپ سوار گھوڑے سے اترے بغیر ان میں سے لیکر آسانی سے کھا سکتا تھا۔ ان دیگوں میں جو کھانا پکتا تھا وہ ان ہی دیگوں کے قد و قامت کے موافق ہوتا تھا۔ اور مہمان کی خوراک اور ہاضمہ کے موافق اس کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ وحشیوں میں عام طور پر یہ اعتقاد تھا کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کی تمام خصوصیات کھانے والے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اہلِ عرب کا بھی یہی خیال تھا۔ ان کی مرغوب غذا اونٹ کا گوشت تھا۔ اس لئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مغلوب الغضب ہونا اور بہت جلد غصہ میں آجانا اسی کے اثر سے ہے جس ملک میں کہ زمین کے بنجر ہونے سے کاشتکاروں وغیرہ کو محنت و مشقت کی عادت نہ ہو وہاں ہر وہ چیز جو غذا بن سکے آدمیوں کے دست برد سے نہیں بچ سکتی۔ انتہا ہے کہ حشرات الارض کو بھی خراج ادا کرنا پڑتا ہے۔ سوکھی ہوئی ٹڈیاں نمک لگا کر عرب کے غربا بڑے مزے سے کھاتے تھے۔ اور قریباً ہر ایک خیمہ میں اس کے مزے لئے جاتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بطور مالِ تجارت تمام جزیرہ نما میں بھیجی جاتی تھیں ؎

ان مغرور بادیہ گردوں کے یہاں ذات پات کا اختلاف و تعصب نہ تھا، جو ترقی کا سنگِ راہ ہوتا ہے، بلکہ ذاتی صفات باعثِ عزّت و آبرو تھیں۔ شیخ کے اقتدار کی بنیاد وہ حیثیت ہوتی تھی جو اس نے اپنے قبیلہ میں پیدا کی ہوتی تھی، نہ کہ شرفِ نسب و حسب یا قدامتِ خاندان۔ شیخ بننے کے لئے کبیر السن ہونا لازمی شرط ہوتی تھی، کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ازدیادِ عقل و تجربہ لازم و ملزوم ہیں۔ بدوؤں میں اقتدار حاصل کرنے کی ہوس نہ

ہوتی تھی۔ یہی وُہ چیز ہے جو بڑی متمدن اقوام کے امن و امان میں خلل ڈالتی ہے[1] اور مہذب ممالک کے جذبات کو فتنہ و فساد پر مائل کرتی ہے۔ شیخ کی حکومت اُس کے ذاتی اوصاف نیز اس وجہ سے مانی جاتی تھی کہ وُہ اپنے قبیلہ میں از روئے رشتہ سب کا بزرگ ہوتا تھا۔ عربوں میں عمر اور پدرانہ شفقت کو سب سے زیادہ تفضیلت و تفوق حاصل تھا۔ وُہ اپنے اجداد کو ایک عجیب حرمت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ قبرستانوں کی عزّت و عظمت، قبایل کا نظام اور خاندانی روایات اسی بزرگ پرستی کی وجہ سے تھیں۔ تمام باشندگان ایشیا کی طرح عرب میں بھی خاندان کے افراد کا زیادہ تعداد میں ہونا سب سے بڑی عزّت کی بات تھی؛ دس بچّوں کے باپ کو ایک اعزازی خطاب دیا جاتا تھا۔ کسی قوم میں جوّلیت کا مادہ اتنا زیادہ نہ تھا جتنا کہ اہل عرب میں۔ اُن کا جو سلوک عورتوں کے ساتھ ایام جاہلیّت میں تھا بہت سی صُورتوں میں بعد از زمانۂ اسلام وُہ نہیں رہا۔ بہرکیف دونوں صُورتوں میں یہ کہنا بجا ہے کہ عورتیں لونڈیاں ہوتی تھیں۔ اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ عورتوں کو اقتدار حاصل ہو گیا ہے؛ بلکہ بعض جگہ تو وُہ تخت نشین بھی ہوئی ہیں؛ اہم امُور سلطنت میں اُن کی رائیں لی جاتی تھیں؛ علوم علوی و سفلی میں اُن کو اپنے دا اہم پرست معتقدین کے ساتھ بُرائی یا بھلائی کرنے کے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ عورتوں میں اکثر جوہر شاعری ہوتا تھا۔ اور وُہ بیشتر مشاعروں میں مردوں سے مقابلہ کرتی تھیں اور اکثر اُن پر تفوق حاصل کرتی تھیں۔ اُن بے باک اور جانباز عورتوں کے نام اب بھی محفوظ ہیں جو اپنے شوہروں اور بھائیوں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں لڑیں اور نام پیدا کیا۔ اکثر ایسا ہُوا ہے کہ اُن ہی کی جانبازی اور استقلال کی وجہ سے لڑائی کی صُورت نمایاں طور سے بدل گئی ہے؛ اور نتیجہ مشکوک نے فتح کی صُورت اختیار کر لی ہے۔ قبل از بعثت ہو یا بعد از بعثت عورتوں کا حالت کنیز کی سے ترقی کر نا عربوں نے کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ زمانۂ جہالت میں عورتوں کو "حبالتہ الشیطان" کا ناخوش آیند خطاب دیا جاتا تھا تعلقات رشتہ داری نیز اس وجہ سے کہ شادی ہونے کے بعد بھی عورتوں کے تعلقات

---

[1] اپدایا برا؛ (مترجم)

اپنے آبا و اجداد سے نہیں ٹوٹتے تھے، اور اُن کی عزّت و آبرو سے وُہ فائدہ اُٹھا سکتی تھیں، اپنے اعزا و اقربا سے استمداد کر سکتی تھیں، اُن میں جا کر پناہ لے سکتی تھیں، اور بصُورت نقصان یا تکلیف وُہ اپنے میکے والوں کی شجاعت و بسالت سے مدد لے سکتی تھیں، ان وجوہ سے اُن کو برادری میں بڑی اہمیت حاصل رہتی تھی۔ یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ اُس ملک میں ہر جگہ ایک عورت کا کئی مردوں سے نکاح کرنے کا رواج جاری تھا، جو نتیجہ تھا عورتوں کی کمی کا۔ جب کوئی سوسایٹی بننے لگتی ہے تو اُس وقت ہر ملک میں ایسا موقعہ ضرور آتا ہے۔ اس رسم کے آثار اب بھی جزیرہ نماء عرب کے انتہائی علاقوں میں نظر آتے ہیں کہ قریبی رشتہ داروں میں مناکحت ہوتی ہے، مستند روایات بھی اس قسم کی موجود ہیں کہ ننھالی رشتوں کی اُس ملک میں قدر تھی، ایسے نکاحوں سے جو بچّہ پیدا ہوتا تھا اُس کا مالک ننھالی قبیلہ ہوتا تھا اور اُسی کی عادات وغیرہ سیکھتا تھا۔ بدوؤں میں عورتوں کے حاصل کرنے کے صرف دو ہی طریقے تھے، قید یا خرید۔ پہلی صُورت تو حالت جنگ کا نتیجہ تھی، جو قوم کا جزو لاینفک، اور بطش و بسالت کا نتیجہ بن کر سب سے زیادہ قدر و منزلت کی علامت تھی، دُوسری صُورت گویا معاوضہ تھی مردوں کی جانوں کا جو زندہ رہتے تو اپنے ننھالی قبیلہ کے سپاہی ہوتے بہرصُورت دونوں طرح کی بیویوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا، خواہ وُہ بجبر روتی دھوتی اُسکے والدین کے خیمہ سے اُٹھالائی گئی ہو، یا وُہ جس کے حسن کو سو اونٹوں کے عوض میں بخندہ پیشانی خرید لیا گیا ہو۔ دونوں قسم کی عورتیں مال منقولہ ہوتی تھیں، جو اور چیزوں کی طرح بطور میراث منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آبادی بڑھ گئی اور اشیاء خورد و نوش کے حصول میں مشکلات پیش آنے لگیں تو لڑکیوں کی پیدائش ایک مصیبت معلوم ہونے لگی اُن کا قتل عام ہو گیا۔ کسی دنی اور طمّاع بدّو کے قاتل ہاتھ سے اگر کوئی لڑکی بچ سکتی تھی تو اس طمع پر کہ شاید کسی موقعہ پر اس کے بدلہ میں کہیں سے کچھ اونٹ ہاتھ آجائیں ۔

انتہا، تہذیب، اور اُس کے تمام مفسد الاخلاق نتائج اُن کی اصلی و جبلّی سلیم الطبعی، مروت، خودداری، تواضع و مہمانداری اور خوش اخلاقی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی یہی باتیں مہذب و متمدن عرب اور غیر تعلیم یافتہ قبایل بادیہ کے درمیان میں مابہ الامتیاز نہیں جاگیر و جایداد کے تکلیف دہ قوانین یا درجہ و رتبہ کی تنگ چشمی نا آشنا سے تھے اُن کی آزاد خیالی پر ذرا سا بھی اثر بد

نہیں ڈالا۔ اُن کو طبایع انسانی کا کسبی نہیں بلکہ وہبی علم تھا؛ اُن کو ہر اُس چیز کا احساس تھا، جو قلوب انسانی کی نشو و نما اور ترقی میں مددگار ہو سکتی ہے؛ اُن میں سیاست کے متعلق تمام عقدہائے مشکل کے حل کرنے کی قابلیت تھی؛ وُہ تمام دہشتناک خطرات کا بخندہ پیشانی مقابلہ کر سکتے تھے؛ یہی وجوہ تھیں کہ دُور دُور از ممالک، سخت ترین مشکلات، اور دلشکن تکالیف میں بھی کامیابی اُن کے ہمرکاب رہتی تھی۔ اگرچہ وُہ اپنے مخالفین و معاندین کے علوم فائقہ سے مستفید ہونے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے، مگر ہر حالت میں اپنے آپ کو افضل و اعلیٰ سمجھتے تھے؛ اور جو لوگ غیر قوم کے ہوتے تھے، یا جن کے اخلاق و عادات و دین و مذہب اُن کے جیسا نہ ہوتا تھا، اُن کو وُہ ہمیشہ بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ اُن کا بے انتہا فخر خاندانی اپنی آیندہ نسلوں کو متحیر کرنے کے لئے اپنے اجداد کی کئی کئی پشتوں کو یاد رکھاتا تھا۔ مولود رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کیفیت تھی کہ بہت سے گمنام اور افلاس زدہ لوگوں کو بوجہ اپنی پُرانی رسم اور نسلی روایات کے، اپنے چھ سو برس پیشتر کے اجداد کے نام یاد تھے۔ اُن کی زبان اگرچہ عجیب پیچیدہ ہے مگر اُس میں عجیب و غریب لوچ ہے؛ اس لئے وُہ اپنی وسعت، اور کبھی ختم نہ ہونے والے ضایع و بدایع کی وجہ سے، شاعر و خطیب کے لئے بہت کار آمد اور نعمت عظمےٰ ہے۔ خیالات اس میں خوب ادا ہوتے ہیں، دلوں کو خوب گرما سکتی ہے، طبیعتوں پر وہ پُورا اثر ڈال سکتی ہے، فصاحت و بلاغت کے دریا بہا سکتی ہے؛ باوجود اس کے اس قدر آسان ہے کہ بچے بھی اُس کو بآسانی اور بے تکان اس طرح بول سکتے ہیں کہ صرف نحو کا ناخن اعتراض اُس کو چھُو بھی نہیں سکتا۔ اُن کا یہ دعویٰ اور فخر بالکل بجا تھا کہ اُن کی جیسی مکمل زبان کا اختراع کرنا بنی نوع انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اہل عرب اپنے آپ کو بنی آدم کا اُستاذ الکل سمجھتے تھے۔ اُن کے تکبّر کو کسی اور قوم میں (جن کو وُہ بہر حال اپنی ذات خاص سے کمتر درجہ کا سمجھتے تھے) تعلق مناکحت کرتے ہُوئے ایک صدمہ ہوتا تھا۔ جو تفوق اہل عرب اپنی ذات اور اپنی ملک کی ملکیّت خاصہ جانتے تھے، اُس کی نسبت اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے صرف اُن ہی کے لئے یہ فرمایا ہے کہ "اُن کے عمّامے اُن کے تاج ہیں، اُن کے خیمے اُن کے قلعے، اُن کی تلوار اُن کے مورچے؛ اور اُن کے اشعار اُن کے قوانین ہیں۔"

شیوع اسلام سے پہلے عربوں کا مذہب محض ایک ذلیل قسم کی بُت پرستی تھی کہ انسان

کی قربانیاں چڑھاکر اُس کو اور بھی ناپاک کر دیا جاتا تھا۔ یہ بُت پرستی، تدریجاً سنگ پرستی سے لیکر ستارہ پرستی تک پہنچتی تھی۔ ایک طرف اگر بت پرستی کی انتہا ذلت تھی، تو دوسری طرف ستارہ پرستی کا عروج اس میں یکسانیت نہ تھی، بلکہ تقریباً تمام قبائل کے معبود الگ الگ تھے، اور طریقۂ عبادت جُدا جُدا۔ کسی میں، تو ہستی ذات الٰہی کا خیال تک نہ تھا، کوئی اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے اُن گھڑ پتھروں کو سجدے کرتے تھے، کوئی درختوں اور چشموں کو پُوجتے تھے۔ (حقیقت یہ ہے کہ ایک جلی ہوئی اور پیاسی زمین میں یہ دونوں چیزیں عطیات الٰہی تھے) کچھ ایسے لوگ تھے جو آفتاب کے سامنے سر جھکاتے تھے، خاصکر طلوع کے وقت کہ اُس کی شعاعیں زمین کے ارغوانی شب دُود کو منور کرتی تھیں۔ کچھ وہ لوگ تھے کہ رات کے درخشندہ ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔ بعض قبیلوں کے لوگ مادہ پرست تھے۔ قائلین تناسخ کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ بہت سے لوگ بودھ مذہب کے فلسفہ سے بھی واقف تھے، جس کے موافق موت تمام روحانی تحریکات، کا ایسا انجام تھی جو بمشکل حاصل ہوتی ہے؛ اور تمام راحتہا رکاملہ کی آغاز تھی کہ مرتے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ عربوں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جو اپنے بتوں کو انسان اور ذات آلٰہی کے درمیان میں ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ اُن کے نام پر مندر بناتے تھے، اپنے بچّوں کے نام اُن بتوں کے ناموں پر رکھتے تھے، وہاں تیرتھ جاترا کو جاتے تھے، اور اُن پر قیمتی چڑھاوے چڑھاکر اُن سے طلب شفاعت کرتے تھے۔ اجسام فلکی کی بھی یہی حیثیت تھی۔ اُن سے بذریعہ دُعا ذات آلٰہی سے تشفّع و توسّط کیا جاتا تھا، حیات انسانی کی چھوٹی اور بڑی باتوں کو اُن کے بالواسطہ اعتبارات پر محمول کیا جاتا تھا، مصیبت اُن ہی کے ڈالے پڑتی تھی، دن اُن ہی کے پھیرسے پھرتے تھے، عجیب و غریب مناظر قدرت اُن ہی کے ظاہر کئے ہوتے تھے۔ یہ وہمیات گویا بنو آدم کے ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے کہ اس دُنیا میں ایسی مخلوقات بھی ہیں کہ جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں، اور اجرام فلکی کے اثرات سے آدمی کو خوش بختی اور بدقسمتی ملتی ہے۔ آفتاب، جو نور کا حاصل مصدر، گرمی کا منبع، صحت کا محافظ ہے، اپنے ساتھ چوپایوں کے گلّے لاتا ہے، پھُول کھلاتا ہے، اناج پکاتا ہے، نضارت و نظارت کے نظّارے اُسی کی وجہ سے ہوتے

ہیں اجسام آلیہ میں تمام دلکش اور مفید چیزوں کا اصل الاصول یہی ہے، انسان کے ابتدائی زمانۂ سادہ لوحی میں اس کے احسانات اور اس کی عظمت و جلالت نے اس کی پرستش کرائی ہے۔ چنانچہ جہلاء عرب بھی نہایت خوش اعتقادی کے ساتھ اس کو اپنا معبود سمجھتے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ مورخین زمانۂ قدیم نے تیقن کے ساتھ یہ قرار دیا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ تمام جزیرہ نماء عرب میں آفتاب پرستی ہی ہوتی تھی۔ اس مظہر انوار الٰہی کے لئے ایک بڑا بت خانہ تھا جو "نور اللہ" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے اقتدار کو ہر جگہ اولیت حاصل تھی، کہیں اسی کے نام سے عبادت ہوتی تھی، کہیں اسی کی مظہر آگ پجتی تھی، کہیں اس کی قوت و طاقت کی کسی آیت و علامت کی عبادت ہوتی تھی۔ اہالی عرب ہی پر منحصر نہیں، دنیا بھر کی تمام اقوام، خواہ وہ ایک دوسری سے کتنی ہی دور رہتی ہوں، خواہ ان کی عادتوں میں کتنا ہی تفاوت ہو، اسی خبط میں گرفتار تھیں، اور اسی ایک چیز یا اس کے مظہرات کی عبادت کرتی تھیں۔ آفتاب کے بت خانہ کے علاوہ، ماہتاب، نجم الشعریٰ، سہیل، دبران، عطارد اور مشتری کے بت خانے الگ تھے۔ لیکن تمام ستاروں میں زحل سے زیادہ نہ کسی کی عظمت تھی، نہ اس سے زیادہ کوئی ستارہ پوجا جاتا تھا۔ لیکن متعبدین زحل اس کی خصوصیات مریخ اور آفتاب کی خصوصیات سے ملا جلا دیتے تھے۔ علامہ ڈوزی نے تنقیحات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اصل میں کعبہ بھی زحل ہی کا بت خانہ تھا۔ یہی زحل یہودیوں کا بعل تھا، وہ اس کو نائب مناب خدا سمجھتے تھے۔ اہالی فونیشیا بھی اسی کو خدا جانتے تھے۔ یہودی اس اعتقاد کو اپنے زمانۂ پریشانی میں اپنے ساتھ لیکر فونیشیا پہنچے، اور انہوں نے اس کو اپنا معبود بنا کر تا بیر اور سدونہ میں اس کے نام کے مندر بنائے اور اس کو پوجنا شروع کر دیا۔ ایشیا میں اس ستارے کی پرستش کی وجہ یہ تھی کہ گرم ممالک میں یہ اپنی پوری درخشندگی دکھاتا ہے، یہی ستارہ تمام مادی برکات عطا فرمانے والا تھا، دنیا کی تمام چیزوں کا وہی خالق اور وہی حافظ تھا، وہی گستاخیوں اور بے ادبیوں کا منتقم تھا، وہی گناہوں کی سزا دیتا تھا۔ مختلف لوگوں اور مختلف قبایل میں وہ اپنی ہر ایک صفت کے ساتھ علیحدہ علیحدہ پوجا جاتا تھا۔ مشہور و معروف لفظ "اسرائیل" بھی زحل ہی کا مرادف ہے۔ یہودیوں کے مقتدایان مذہبی میں یہ سبتائی

کے نام سے موسوم تھا۔ اسی سے لفظ "سبت" مشتق ہے۔ ارض المیعاد اور مصر میں ہفتہ کا پہلا دن
اسی ستارے کے نام پر رکھا گیا تھا، اور یہ دن اُسی کے نذر تھا۔ عرب میں یہ معبود الکل ستارہ
ہُبل کہلاتا تھا۔ جو بلا شبہ عبرانی سے نکلا ہے۔ عرب کے "ہمہ اوست" ملک میں اس کو سب سے
بڑی عظمت حاصل تھی۔ اگرچہ اس کے بُت میں تمام صفات انسانی دکھلائے ہوئے تھے،
مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مظہر توحید تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کے ہُبل کا نام اور ہُبل کی عبادت
یہودیوں کی تقلید محض تھی۔ علمائے تاریخ قدیمہ کی تنقیح و تفحیص نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہُبل
(یا زُحل) بحر شام کے مشرقی کنارہ سے نکلکر حجاز پہنچا ہے۔ اور توریت کی بعض مبہم آیتوں
کی تفسیر میں اسی ہُبل کی طرف اشارہ ہے، اس کے بُت خانہ، اس کی عبادت اور اس کے متعلق
تہواروں کا ذکر ہے۔ عربوں کے جہاں اور ہزاروں خدا تھے منجملہ اُن کے ایک یہودیوں کا
یہوا بھی تھا۔ اس کا بت بکرے کی شکل کا تھا اور اس کی، نیز زہرہ کی تصویر سونے سے
بنی ہوئی تھی۔ موخر الذکر کو اہالی بابل "ملیطہ" کہتے تھے اور اہالی فونیشیا "اسطارت"۔ جہاں
تین سو ساٹھ اور بُت خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے اُن میں مریم عذرا اور اُن کے بچے
کی تصویر بھی تھی، کیونکہ دُنیائے مسیحی کے یہ بھی معبود تھے۔ عربوں کے مذاہب مختلفہ میں
وہ خرافات اُلوہیت نہیں تھے، جو عام طور پر دُنیا بھر کے اصنام پرستی کا جزو اعظم و لاینفک
ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کا مذہب اتنا جلد مغلوب و معدوم ہو گیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ
عربوں کے خداؤں کی تعداد لامحدود تھی مگر اُن میں ایک ایسی اعلیٰ و اولےٰ ہستی کا خیال ضرور
تھا، جس کی ہستی کسی جگہ محدود و مقید نہ تھی، جس کے لئے کوئی بت خانہ یا قربانگاہ معین
نہیں تھی، جس کی ذات اتنی مہیب تھی کہ بلا واسطہ اس سے دُعا نہیں کی جا سکتی تھی، اُس
تک پہنچنے کا اگر کوئی ذریعہ تھا تو صرف بتوسل اجرام فلکی کے۔ یہی "اللہ" تھا، جو یہودیوں
میں "ایل" اور "الوہیم" کہلاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اُس کی ذات ویسی ہی عظیم و جلیل تھی جیسی کہ
بعد از شیوع اسلام۔ بنی نوع انسان میں جو قومیں سب سے زیادہ وہمی اور اس کے
ساتھ ہی نہایت متمدن و مہذب ہیں اُن کا نہ کوئی دیر ہے نہ اس کی اُن کو ضرورت ہے۔
عرب کا تمام ریگستان خدائے عظیم و قدیر کا دیر تھا۔

قدر تہاء ایزدی کے عالی درجہ خیالات کے ساتھ وُہ وہمیات بھی موجود تھے جو سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں عام طور پر پائے جایا کرتے ہیں۔ قدرت آلٰہی نے توالد و تناسل کی جو طاقتیں ہر چیز میں ودیعت رکھی ہیں، اُن کی عرب میں بڑی تنظیم کی جاتی تھی نشانہا، رجولیت و انوثیت مختلف نشانات کی صورت میں پُوجے جاتے تھے، گو زمانۂ حال کے غلط کار جو اس اس کو بیہودہ سمجھا کریں۔ تمام جزیرہ نماء میں ان ہی کے نشانات، بہت سی پتھر کی لاٹوں کی صورت میں اِدھر اُدھر نظر آتی تھیں، جن کی تعظیم و تکریم متقی مسلمان بھی اب تک کرتے ہیں۔ سیاحان عمّان و نجد نے جو دور اور لمبے لمبے ان گھڑ پتھروں کا ذکر اپنے سفرناموں میں کیا ہے وہ بظاہر اُسی قسم کے ہیں جو کارنک[1] اور سٹون ہنج[2] میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کی شکل و صورت جو بیان کی گئی ہے اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ قد و قامت میں کچھ کم نہ تھے اور قدامت میں بہت بڑھے ہُوئے تھے۔ یہ نہایت عجیب بات ہے کہ بہت بڑی بڑی عمارتیں ایک دوسرے سے اس طرح مماثل ہیں کہ گویا ایک ہی قوم نے ایک ہی غرض سے بنائی ہیں، حالانکہ یہ عمارات اگر ایک طرف عرب متوسطہ میں پائی جاتی ہیں تو دوسری طرف مغربی یورپ میں۔ ان کی طبعی حالت، آب و ہوا، باشندگان کے عادات و اخلاق، دینی روایات، زبان اور تاریخ میں جو کچھ فرق ہے، وُہ محتاج بیان نہیں۔

زمانۂ قدیمہ کی اور اقوام کی طرح اہل عرب بھی بعض درختوں کو متبرک و مقدس مانتے تھے۔ یہ نشان تھا دیرپا اثراتِ مغالطات کا۔ اس قسم کی عبادت کے اصلی اصول مدت ہوئی کہ جزیرہ نماء عرب میں بھول بسر چکے ہیں، مگر اس کے آثار ایک بے شرمانہ اور بداخلاقانہ صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ عرب جاہلیت میں وہمیات کی کوئی رسم ایسی نہ تھی کہ جس کے متعبدین نہ پائے جاتے ہوں۔ آگ کی پرستش کے لئے الگ قربانگاہیں تھیں، گھڑیال

---

[1] کارنک CARNAC فرانس میں ایک جگہ ہے جہاں سیلٹک CELTIC کھنڈرات یا یادگاریں بہت ہیں، جو گڑے ہُوئے پتھر ہیں۔ دس سے بارہ ہزار تک اس قسم کے پتھر گیارہ متوازی قطاروں میں مشرق سے مغرب تک چلے گئے ہیں۔ (مترجم)

[2] سٹون ہنج STONEHENGE لنڈن میں ایک بہت پرانی جگہ ہے جہاں قوم برطانیہ کی عبادتگاہیں تھیں۔ یہ صرف گڑے ہُوئے پتھر ہیں جو دور دور ہو کر پھیلے ہوئے ہیں۔ آخری دور کے اندر اُن کی خاص عبادتگاہ تھی۔ (مترجم)

اور سانپ میں وُہ خارق العادت قدرتیں بتلاتے تھے - ہر ایک خیمہ میں ایک نہ ایک بُت ضرور ہوتا
تھا - کچّی اینٹوں کی بنی ہوئی ہر جھونپڑی میں کوئی نہ کوئی خدا ضرور رہتا تھا، جو اُس میں رہنے والوں
کی حفاظت کرتا تھا - بے شکل و صُورت پتھروں کا ایک ڈھیر، جو روایات قدیمہ کے موافق کسی
بڑے واقعہ کی یادگار ہوتے تھے، یا اُن میں کوئی یزدانی قوت بتلائی جاتی تھی، اُسی تعظیم و تکریم کے
مستحق تھے اور اُسی طرح پُوجے جاتے تھے، جیسے کہ نہایت قیمتی دھات کے خوبصُورت بنے
ہُوئے بُت - ان پتھروں کی وہی صُورت ہوتی تھی جو افریقہ کے فتیش[1] کے بتوں کی ہوتی ہے -
ان میں سے سنگ مُوسا کے بُت سورج کے لئے مخصُوص ہوتے تھے، اور سنگ مرمر کے
چاند کے واسطے - بُت پرست دُنیا میں ان ان گھڑ پتھروں میں سے دو بہت مشہُور تھے، ایک پر
حمص واقعہ ملک شام میں بہت بڑا بت خانہ بنایا گیا تھا، اسی بت خانہ سے بدنام رومی بادشاہ
ہیلیوگرسے بلس[2] منسوب تھا؛ اور دُوسرا کعبہ کی دیوار میں نصب تھا - زمانۂ قدیم سے سب سے زیادہ
قابل ذکر و التفات پتھر مُوخر الذکر چلا آرہا ہے - یہ سنگ موسا کی قسم کا ایک پتھر، سات انچ قطر کا ہے
بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب و نواح ہی کے کسی پہاڑ کا پتھر ہے - اہل عرب کی نگاہ میں اسکو
وُہ تقدس حاصل ہے جو کسی بُت کو حاصل نہیں تھا - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً یہ کسی بُت کا کوئی
ٹکڑا ہے، جو بنا ر کعبہ سے پہلے (یعنی بنا ر ہیکل سُلیمان علیہ السلام سے چار سو برس پیشتر) شہر
مکّہ کے کسی چوک میں رکھا ہُوا تھا - بہر کیف ایک زمانہ بعید سے یہ پتھر مقدس چلا آتا ہے اور اس
میں مافوق العادت اثرات بتلائے جاتے ہیں، اور اس نے کروڑوں کافروں اور مُسلمانوں سے اپنی
تعظیم کرائی ہے - حملے ہوئے، نقصانات ہُوئے، بُت شکنی ہوئی، آگ لگائی گئی، غرض سب ہی
کچھ ہوا، مگر یہ اب تک باقی ہے - اس کے ٹکڑے چاندی کے حلقے یا بندوں سے جکڑے ہوئے
ہیں - اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بہت سے حادثات گزرے ہیں اور سخت اُفتادیں پڑی

---

[1] فتیش FETICH حبشیان افریقہ کے وُہ پتھر جنکو وُہ جادو کرنے کے کام میں لاتے ہیں - ان کو وُہ اپنا خدا مانتے ہیں
اور اُن کو پُوجتے ہیں - یہ پتھر ہی کے نہ ہوتے تھے بلکہ درختوں کے تنوں وغیرہ کے بھی - (مترجم) +

[2] ہیلیوگرسے بلس HELIOGRABALU روم کا ایک بادشاہ ۲۰۴ء میں پیدا ہوا -
اور ۲۲۲ء میں اپنی ہی رعایا کے ہاتھ سے مارا گیا، کیونکہ وُہ اس کے عیش و عشرت سے تنگ آگئے تھے - صرف ۳ سال
اور ۹ ماہ سلطنت کی - سُورج کے خدا موسومہ ELEGABAL کا بہت معتقد اور اس کو
دن رات پُوجتا تھا - اسی سے اس کا نام پڑ گیا - (مترجم) +

ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ایسے اثرات ہیں کہ بیمار اس سے شفا پا جاتے ہیں، اس لئے بیرون عرب کے بہت سے مریض اور اپاہج اس کی طرف کھچے چلے آتے تھے، چہ جائیکہ خود عرب کے مناسک حج اور دیگر مذہبی رسوم یہیں سے شروع ہوتی تھیں۔ کعبہ کی تقدیس اگر ہے تو اسی کی وجہ سے، اور کعبہ ہی تمام جزیرہ نمائے عرب میں وہ مقام ہے کہ جہاں آ کر تمام پشتینی لڑائیاں اور خیال انتقام معطل ہو جاتا تھا، ظلم و جبر ختم ہو جاتا تھا، ترش روئی تواضع سے بدل جاتی تھی، ہر شخص کی آزادی عارضی طور پر چھن جاتی تھی، اور قومی عداوتیں بطوع و طیب خاطر بھول جاتی تھیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ملک کے خیالات یکساں ہیں، اور تمام قوم متحدہ متفق ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی حجر اسود اور کعبہ کو بنظر استحسان ملاحظہ فرمایا، اور عوام سے اُن کی تعظیم کرائی؛ حالانکہ حضور کا دین بُت پرستی کا سخت دشمن تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہالی عرب کی نگاہ میں ان دونوں کی کیا قدر و منزلت تھی۔ باوجودیکہ وہاں متعدد مندر تھے، ہزاروں معبود تھے، قسم قسم کی طرق عبادت تھے، سینکڑوں طرح کی فریب و مکاری تھی، لیکن پھر بھی اہالی عرب دیندار قوم نہیں تھے۔ علم مابعد الطبیعیات سے اُن کو سخت مخالفت تھی۔ اُن کی آزادی و آزاد خیالی اس کی کب اجازت دیتی تھی کہ وہ بالکل اندھے بن کر کسی مقتدائے مذہبی کی تقلید کریں، اور اُس کا جبر اُٹھائیں۔ اُن کی مخصوص ذہانت اُن کو ہر چیز سے مشکوک رکھتی تھی۔ اُن کی آوارہ گردانہ عادت اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ کوئی مستقل گروہ مقتدایان مذہبی کا قایم کرتے۔ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے بہت سے معبودوں کے وجود کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام الناس کے اعتقادات ضعیف و متزلزل تھے۔ ہر قوم کے طبعی تدین اور اُس کے معبودوں کی تعداد میں معکوس تناسب ہوتا ہے!

ابتدائی عربوں میں سحر و کہانت کا رواج تھا، فال و طیرہ لیا جاتا تھا، ساحر و کاہن الگ ہوتے تھے۔ یہ اُن شعبدہ بازوں کا فرقہ تھا جن کی کامیابی زیادہ طور پر منوّم و مخدّر دواؤں پر منحصر تھی جن کا وہ اکثر استعمال کر کے یہ ظاہر کرتے تھے کہ اُن کو عالم ارواح سے تعلق ہے۔ نظر بد سے بچنے کے لئے عام طور پر تعویذ پہنے جاتے تھے۔ فال، سحر، طیرہ، تعویذ، گنڈوں کے ساتھ ہی ساتھ یہ اصول، کہ معدنیات پر ستاروں کا اثر ہوتا ہے، نیز یہ کہ انسانوں کی قسمت پر یہ ستارے مؤثر ہوتے ہیں، اُن میں دائر و سائر تھا۔ یہ وہ نظریئے تھے جو شدہ شدہ ترقی پا کر جوتسی اور نجوم بن گئے۔

یہ بُنیاد تھی اُس سائینس کی جو بڑے مشاہدات اور بڑی آزمائیشوں کے بعد کچھ کا کچھ ہوگیا قرآن شریف میں گو اِن کیلئے سخت وعیدیں ہیں، مگر ان پر عمل کرنا اُس زمانۂ قدیم میں ہر شخص کے دل میں جاگزین تھا، اور عبادت کا ایک جزو بنا ہُوا تھا۔ عربی میں قربانگاہ اور طلسم گویا مرادف الفاظ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں کہانت، سحر اور دین کے آپس میں کس قدر قریبی تعلق تھا۔

انسان کی قربانی، جو اتقا و انصاف کی اس قدر منافی ہے، سامی اقوام میں عام تھی؛ اور رسُول اکرم و اقدس صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہ قربانیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ ان قربانیوں میں انسان جلائے جاتے تھے تاکہ دُنیوی ناپاکی بالکل جاتی رہی۔ یہ قیمتی قربانی جب کبھی ہوتی تھی تو کسی بڑے مہتم بالشان موقعوں پر یا اُس وقت کہ جب کوئی نذر پوری کرنی ہو قسم ادتار نی ہو، قومی خوشی کا موقعہ ہو، یا کوئی مُصیبت رفع ہُوئی ہو۔ بنو اسرائیل، جو از روئے نسب و مذہب عربوں سے قریبی رشتہ رکھتے تھے، اس بے رحمانہ اور کریہہ رسم کے پابند تھے۔ جو لوگ کہ توریت کو پڑھ چکے ہیں وُہ اچھی طرح جانتے ہونگے اس کی وہاں کتنی مثالیں ملتی ہیں۔

بنو اسرائیل کا اثر اہالیِ عرب کے عام معتقدات، مذہبی خیالات اور اندرونی و بیرونی تمدّن پر ہمیشہ سے رہا ہے؛ ان دونوں کی زبان میں تو ایک دُوسرے سے بہت بڑا تقارب ہے ہی۔ زمانۂ قبل از تاریخ میں ملک عرب میں عبرانی ابجد کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ بہت سے ایشیائی علماء کا یہ خیال ہے کہ خاندان بنو اسرائیل کا بانی اسرائیل نہیں تھا؛ نیز یہ کہ بنو اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا ایک خاص باطنی تعلق ہے، خواہ وُہ بارہ سیّاروں سے منسوب ہوں یا سال کے بارہ مہینوں سے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ "قطورہ" کے معنی ہی بخورات کے ہیں۔ اب تو اس میں کچھ بھی شک نہیں رہا کہ یہودی اور عرب ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ دو ہزار سال قبل از ہجرت یہودی یمن میں آکر آباد ہُوئے۔ اُس سلطنت کی تمام تجارت، اور اُس کی تمام شاخیں اُن ہی کے ہاتھ میں تھیں۔ انکو وہاں ایسا اقتدار حاصل تھا کہ اکثر مہام سلطنت اُن کے قبضہ میں تھے اور بادشاہ بالکلیہ اُن کے ہاتھ میں۔

بدّو اگر بُت پرست تھے تو وُہ بھی تھے (چونکہ دونوں ایک ہی دادا کی اولاد تھے اس لئے توریت میں اُن پر لعنت آئی ہے) مگر عبرانیوں کا طریق عبادت شان شوکت میں عربوں سے بڑھا ہُوا تھا، اور اُن کے معتقدایان مذہبی کو زیادہ عظمت حاصل تھی جس سے عربوں پر تفسانی عام تھا

وہاں عیسائی جلاوطنوں کے ساتھ خوب ہی خوب ظلم ہوتے تھے؛ حالانکہ یہ وہ بدنصیب تھے کہ جن پر قزاقِ عرب کو رحم آتا تھا۔ مغربی و شمالی حصۂ عرب ہر صورت و حالت میں گویا یہودیوں کے قبضے میں تھا، اور اُن ہی کی وہاں آبادی تھی۔ حجاز کی بنجر اور مخدوش سرزمین میں یہودیوں نے مکّہ و مدینہ کے شہر آباد کئے تھے۔ جہاں کی آب و ہوا ایک دوسرے سے مماثل ہو وہاں اشیاء کو چک کے وہمیات بہت آسانی سے قبولیت پا سکتے تھے۔ فونیشیا کے معبودوں میں سے سب سے مشہور معبود بعل کی پرستش یہاں ان یہودیوں ہی کے طفیل میں پھیلی؛ ختنہ کی رسم بھی ان ہی نے یہاں جاری کی؛ عرب میں ان سے پہلے اس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اپنی تمام بت پرستانہ رسوم اُنہوں نے اُس ملک کے باشندوں میں جاری کیں جنہوں نے اُن کو پناہ دی تھی۔ یہاں کے بڑے شہر کا نام اُن ہی نے رکھا۔ کیونکہ مکّہ یا بکّہ کے معنی "بڑے میدانِ جنگ" کے ہیں۔ حجاز میں جو بت پرستانہ رسوم تھیں اُن کی اصل فلسطین تک پہنچتی ہے۔ کعبہ فی الاصل "بیت ایل" یعنی بیت اللہ کہلاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تیرتھوں سے تجارتی منافع خوب حاصل کئے جا سکتے ہیں؛ اس لئے اُنہوں نے اس شہر کو تمام قوم و ملک کا مرکزی زیارت گاہ قرار دیا؛ اور یورپ، ایشیا، کوچک، حبش اور ہندوستان کو مالِ تجارت کھینچنے کے لئے صدر مقام بنا دیا۔ اگرچہ مکّہ کا جا و وقوع تجارت کے لحاظ سے نہایت اچھا تھا، کیونکہ وہ بحیرۂ احمر کے قریب واقع تھا، شام اور یمن کے قافلے اسی راہ سے جاتے تھے؛ مگر بنجر کی بے رخی سے آب و ہوا کی جو خرابی وہاں تھی اس کا معاوضہ کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔ شہر کے مکانات دو میل لمبی اور صرف نو سو فیٹ چوڑی تنگنائے میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے گنجان تھے۔ آفتاب کی شعاعیں عموداً بے رخی کے ساتھ بے آب و گیاہ میدان پر پڑتی تھیں؛ بادیہ کی بے بہا نعمتِ الٰہی یانی کمیاب اور بدمزہ تھا؛ قرب و جوار کی تمام زمین پر شور پھیلا ہوا تھا؛ موسم بے قاعدہ ہوتے تھے؛ آندھیاں سخت آتی تھیں؛ منجملہ اور بدنام سواحل کے ساحلِ حجاز تمام دُنیا [illegible] مشہور تھا۔ شہر کی ضروریاتِ زندگی کا انحصار تجارتی قافلوں پر تھا، اگر کسی قافلہ کے آ[illegible] میں دیر ہو جاتی تھی تو شہر میں قحط کا اندیشہ ہو جاتا تھا۔ باوجود ان تمام نقائص کے مکّہ کی تجارت ایسی بڑھی کہ جس کی اُمید نہ تھی۔ اس کے تنگ بازاروں میں سے دو ہزار اونٹوں کا قافلہ گزرنا کچھ غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہر ایک اونٹ کی پیٹھ پر پانچ من کمیاب و قیمتی اجناس

لدی ہوتی تھیں، مثلاً ریشمی کپڑے، گرم مصالحہ، ہاتھی دانت، سونا اور خوشبوئیں۔ زمانۂ جاہلیت کے شباب میں یہاں کی سالانہ برآمد قریباً چار کروڑ روپیہ کی تھی، جس میں سے نصف رقم خالص منافع کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ باشندگان مکّہ کے حصّہ میں وہ نذور خالصاً آتی تھیں جو تاجر اور زائر یہاں کے بُت خانہ پر چڑھاتے تھے۔ فرسنگوں تک وہاں کی زمین مقدس و متبرک سمجھی جاتی تھی۔ جو لوگ وہاں پہنچ جاتے تھے وُہ وہاں محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ اس رقبۂ اراضی میں کسی انسان یا حیوان کا خون بہانا جائز نہ تھا۔ اگر اتفاقاً کسی سے خون ریزی ہو جاتی تو یہ بے ادبی سمجھی جاتی تھی، اور اس کی سزا موت تھی۔ کسی مسافر کو خواہ کسی ملک کا ہو کعبہ میں رکھے ہوئے بے تعداد معبودوں میں کوئی نہ کوئی اپنا شناسا معبود ضرور مل جاتا تھا، جس کے سامنے وُہ سر جھکا اور اپنی احسانمندی ظاہر کر سکتا تھا۔ جو بے انتہا فوائد کہ تجارت و نذور سے اہل مکّہ کو حاصل ہوتے تھے، اُن میں عبرانیوں کا حصّہ غالب ہوتا تھا۔ اُن کے آدمی ہر روز کعبہ میں مالیہ اور دینیات کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ فلسطین کے بت پرستانہ قصص و حکایات ایک نئے طریقہ سے جلوہ گر ہوئے۔ صائبین کی نجوم پرستی میں یہ خیالات شیر و شکر ہو گئے، اور بادیہ نشینوں کے موحدانہ اعتقادات میں یکجان۔ بنو اسرائیل کی توحید کو فرقہ سیمیٹ نے نہیں مانا، جو تحریر توریت سے بہت پہلے وطن سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ خیالات کچھ اس طرح ممزوج و مخلوط ہو گئے تھے کہ اگر موقعہ موافق ہوتا تو امتدادِ زمانہ سے ان میں ترمیم تو ہو سکتی تھی، مگر بالکلیہ معدوم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسلام کی اصلیت کو دیکھا جائے تو اُس کا بڑا حصّہ یہودیت سے ماخوذ ہے، گو اُس کے بہت سے مراسم عرب جاہلیت سے لئے ہوئے ہیں۔ جب حجاز آباد ہو چکا تو یہودی وہاں سے نکلے اور دُور دراز مقامات میں گھومتے گھامتے پھر اپنے مہد اصلی کی طرف عود کر آئے +

مذہبی طہارت کے جابرانہ قواعد، حرم کے قریب خون ریزی کی ممانعت، بعض جانوروں کا حرام قرار دیا جانا، (حرام کے معنی مترجموں نے ناپاک غلطی سے قرار دیئے ہیں) اکثر جرائم کی سزائیں، فونیشیا کے بعض معبودوں کی عبادت، نسب و حسب میں خاص ناموں کا امتیاز، اکثر محاورات کا ہم معنی ہونا، عربوں اور یہودیوں میں متحد و متفق ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اقوام

وہاں عیسائی جلاوطنوں کے ساتھ خوب ہی خوب ظلم ہوتے تھے؛ حالانکہ یہ وہ بدنصیب تھے کہ جن پر
قزاق عرب کو رحم آتا تھا۔ مغربی و شمالی حصۂ عرب بہر صورت و حالت میں گویا یہودیوں کے قبضے
میں تھا، اور اُن ہی کی وہاں آبادی تھی۔ حجاز کی بنجر اور مخدوش سرزمین میں یہودیوں نے مکّہ و مدینہ کے
شہر آباد کئے تھے۔ جہاں کی آب و ہوا ایک دوسرے سے مماثل ہو وہاں ایشیاء کوچک کے
رسمیات بہت آسانی سے قبولیت پا سکتے تھے۔ فونیشیا کے معبودوں میں سے سب سے مشہور
معبود بعل کی پرستش یہاں ان یہودیوں ہی کے طفیل میں پھیلی؛ ختنہ کی رسم بھی ان ہی نے یہاں
جاری کی، عرب میں ان سے پہلے اس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اپنی تمام بت پرستانہ رسوم
انہوں نے اس ملک کے باشندوں میں جاری کیں جنہوں نے اُن کو پناہ دی تھی۔ یہاں کے بڑے
شہر کا نام اُن ہی نے رکھا۔ کیونکہ مکّہ یا بکّہ کے معنی "بڑے میدان جنگ" کے ہیں۔ حجاز میں جو بت پرستانہ
رسوم تھیں اُن کی اصل فلسطین تک پہنچتی ہے۔ کعبہ فی الاصل "بیت ایل" یعنی بیت اللہ کہلاتا تھا۔
وہ جانتے تھے کہ تیرتھوں سے تجارتی منافع خوب حاصل کئے جا سکتے ہیں؛ اس لئے انہوں نے اس
شہر کو تمام قوم و ملک کا مرکزی زیارت گاہ قرار دیا؛ اور یورپ، ایشیا، کوچک، حبش اور ہندوستان
کو مال تجارت بھیجنے کے لئے صدر مقام بنا دیا۔ اگرچہ مکّہ کا جائے وقوع تجارت کے لحاظ سے
نہایت اچھا تھا، کیونکہ وہ بحیرہ احمر کے قریب واقع تھا، شام اور یمن کے قافلے اسی راہ سے جاتے
تھے، مگر پتھر کی بے رخی سے آب و ہوا کی جو خرابی وہاں تھی اُس کا معاوضہ کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔
شہر کے مکانات دو میل لمبی اور صرف نو سو فیٹ چوڑی تنگنائے میں ایک دوسرے سے ملے
ہوئے گنجان تھے۔ آفتاب کی شعاعیں عموداً بے رحمی کے ساتھ بے آب و گیاہ میدان پر
پڑتی تھیں؛ بادیہ کی بے بہا نعمت الٰہی، پانی کمیاب اور بد مزہ تھا؛ قرب و جوار کی تمام زمین پر شور
پھیلا ہوا تھا؛ موسم بے قاعدہ ہوتے تھے؛ آندھیاں سخت آتی تھیں؛ منجملہ اور بدنام سواحل
کے ساحل حجاز تمام دُنیا میں مشہور تھا۔ شہر کی ضروریات زندگی کا انحصار تجارتی قافلوں
پر تھا، اگر کسی قافلہ کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو شہر میں قحط کا اندیشہ ہو جاتا تھا۔ باوجود ان تمام
نقائص کے مکّہ کی تجارت ایسی بڑھی کہ جس کی اُمید نہ تھی۔ اس کے تنگ بازاروں میں سے دو ہزار
اونٹوں کا قافلہ گزرنا کچھ غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہر ایک اونٹ کی پیٹھ پر پانچ من کمیاب و قیمتی اجناس

لدی ہوتی تھیں، مثلاً ریشمی کپڑے، گرم مصالحہ، ہاتھی دانت، سونا اور خوشبوئیں۔ زمانۂ جاہلیت کے شباب میں یہاں کی سالانہ برآمد قریباً چار کروڑ روپیہ کی تھی، جس میں سے نصف رقم خالص منافع کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ باشندگان مکہ کے حصہ میں وہ نذور خالصاً آتی تھیں جو تاجر اور زائر وہاں کے بت خانہ پر چڑھاتے تھے۔ فرسنگوں تک وہاں کی زمین مقدس و متبرک سمجھی جاتی تھی۔ جو لوگ وہاں پہنچ جاتے تھے وہ وہاں محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ اس رقبۂ اراضی میں کسی انسان یا حیوان کا خون بہانا جائز نہ تھا۔ اگر اتفاقاً کسی سے خون ریزی ہو جاتی تو یہ بے ادبی سمجھی جاتی تھی، اور اس کی سزا موت تھی۔ کسی مسافر کو خواہ کسی ملک کا ہو کعبہ میں رکھے ہوئے بے تعداد معبودوں میں کوئی نہ کوئی اپنا شناسا معبود ضرور مل جاتا تھا، جس کے سامنے وہ سر جھکا کر اپنی احسانمندی ظاہر کر سکتا تھا۔ جو بے انتہا فوائد کہ تجارت و نذور سے اہل مکہ کو حاصل ہوتے تھے، ان میں عبرانیوں کا حصہ غالب ہوتا تھا۔ ان کے آدمی ہر روز کعبہ میں مالیہ اور دینیات کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ فلسطین کے بت پرستانہ قصص و حکایات ایک نئے طریقہ سے جلوہ گر ہوئے۔ صابئین کی نجوم پرستی میں یہ خیالات شیر و شکر ہو گئے، اور بادیہ نشینوں کے موحدانہ اعتقادات میں یکجان۔ بنو اسرائیل کی توحید کو قریش نے نہیں مانا، جو تحریر توریت سے بہت پہلے وطن سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ خیالات کچھ اس طرح ممزوج و مخلوط ہو گئے تھے کہ اگر موقعہ موافق ہوتا تو امتدادِ زمانہ سے ان میں ترمیم تو ہو سکتی تھی، مگر بالکلیہ معدوم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اسلام کی اصلیت کو دیکھا جائے تو اس کا بڑا حصہ یہودیت سے ماخوذ ہے، گو اس کے بہت سے مراسم عرب جاہلیت سے لئے ہوئے ہیں۔ جب حجاز آباد ہو چکا تو یہودی وہاں سے نکلے اور دور دراز مقامات میں گھومتے گھامتے پھر اپنے محمد اصلی کی طرف عود کر آئے۔

مذہبی طہارت کے حیا براہ نحواہم، حرم کے قریب خون ریزی کی ممانعت، بعض جانوروں کا حرام قرار دیا جانا، (حرام کے معنی مترجموں نے "ناپاک" غلطی سے قرار دیئے ہیں) اکثر جرائم کی سزائیں، فونیشیا کے بعض معبودوں کی عبادت، نسب و حسب میں خاص ناموں کا امتیاز، اکثر محاورات کا ہم معنی ہونا، عربوں اور یہودیوں میں متحد و متفق ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اقوام

ہیں نہایت قریبی تعلق ہے۔ اس کو امور متذکرہ بالا جس تیقن کے ساتھ ثابت کرتے ہیں اُس طرح روایات
قومی اور تعلقات ہمسائیگی نہیں ثابت کر سکتے۔ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان میں جو منافرت
و معاندت تھی وہ ان کے اور عرب زمانۂ قدیم کے درمیان میں نہ تھی۔ چنانچہ خالد ابن ولید اور عمرو
ابن العاص (رضی اللہ عنہما) کے علم کے نیچے یہودیوں نے کارہائے نمایاں دکھلائے تھے مگر زمانۂ مابعد
میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان دشمنی بڑھ گئی، گو وہ اس درجہ کی نہ تھی کہ یہودی اُن لوگوں کو
بالکل تباہ کر دیتے جن کو وہ اپنا رشتہ دار سمجھتے تھے۔ جس طرح اس نئے مذہب کی بُنیاد اُن ہی کے
اساطیر پر رکھی گئی تھی، اُسی طرح اُن کی بلند نظری اور امداد نے ایک بڑی شاندار سلطنت کے قائم
کرنے میں کچھ کم معاونت نہیں کی۔ مسلمانوں کے نہایت مشہور بادشاہوں کی زمام سلطنت ان کے
ہاتھ میں رہی ہے۔ اگر وہ اپنے اصول مذہب مسلمانوں کو بہم نہ پہنچاتے تو اسلام کی تاریخ کبھی نہ لکھی
جاتی، اگر وہ بطیب خاطر مسلمانوں کو مشورے اور مسلمانوں کو خزانوں سے مدد نہ دیتے تو اندلس کی فتح کبھی
نصیب نہ ہوتی۔ بہت ہی کم عربوں کے بہت ہی کم بہترین مصنف ایسے ہوئے ہیں کہ جنہوں نے
اپنی قوم پر اُس بدقسمت قوم کے احسانات نہیں گنائے ہوں جو کئی صدیوں سے برابر دنیا بھر کی مبغوض رہی ہے۔

مذہب مسیحی نے عرب میں اُس وقت تک ترقی نہیں کی کہ جب تک وہ قسطنطین کی سیاسی سرپرستی
میں نہیں آ گیا۔ اس کے بعد تو اسکی اشاعت میں دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب
طبائع باشندگانِ ایشیا کے مناسب حال نہیں ہے، نہ اس مذہب نے سامی اقوام کے عقلیات پر اثر ڈالا، نہ ان
میں جوش پیدا کیا۔ یہ مذہب متعدد معبودوں کے پوجنے والے آزاد خیال اور متسامح آوارہ گردانِ بادیۂ عرب کے سامنے
کوئی ایسی چیز پیش نہ کرتا تھا جو اُنکے متحد الخیال ہو، بلکہ برعکس اسکے ایسے خیالات پیش کرتا تھا جو اُنکے نزدیک
مکروہ و مبغوض تھے۔ جناب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت چار سو برس ہو چکے تھے
کہ یہ مذہب جزیرہ نمائے عرب میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ مگر باوجود اسکے مذاق اُڑانے والے عرب اپنے ہزاروں
خداؤں کے سامنے سر جھکاتے نظر آتے تھے۔ ایبی اونایٹ[1] فرقہ کے حصول عرب میں پھیلے

---

[1] ایبی اونایٹ EBIONITE یہ فرقہ اُن مذہب یہودیوں سے مشتمل تھا جو عیسائی ہو گئے
اُنہوں نے عجیب طرح شریعت موسوی اور اصول مسیحی کو ملا جلا کر ایک معجون مرکب مذہب بنا لیا تھا۔

(مترجم)

ہوئے تھے۔ مگر بجا اس کے کہ مضحکہ اڑانے والے عرب اس کی طرف ایک حیرت کے ساتھ مایل ہوں یا اس کی عظمت ان کے دل میں بیٹھے وہ اس پر مذاق اڑاتے تھے۔ مذہب انجیل کی عالی و رفیع صداقت، اس کے مقتدایان مذہبی کی فصاحت و بلاغت، اس کے اولیاء اللہ کا زہد و ورع، اس کے مراسم کی شان و شوکت، اس کے الہامات کے وعدہ و وعید کا ناعاقبت اندیش قزاقوں پر مطلقاً اثر نہیں ہوا۔ وہ لوگ لذات و شہوات کے بندے تھے، تہور و بسالت کے ہاتھ بکے ہوئے تھے، لطفہا و مشاعرہ کے غلام تھے، اور فنون سپاہیانہ کے دلباختہ۔ عیسائیوں کی طرف جو کچھ بھی ان کی نظر عنایت ہوئی وہ صرف اتنی تھی کہ ذلیل یہودیوں کے ساتھ ان کو بھی اہل کتاب کا خطاب مل گیا، اور[۱] یہ کوشش کی گئی کہ اس مذہب (مسیحی) کو ہر شخص کی دنیوی و روحانی ضروریات کا کفیل بنایا جائے، مگر اس میں یہ قابلیت نہ پیدا ہوئی کہ وہ اس دین میں جذب ہو جاتا کہ جس نے آخر اس کو عرب سے معدوم کر دیا۔ ایک طرف تو مسخ شدہ عیسائیت کے وہ ناقابل فہم اصول تھے کہ جن پر ایمان لائے بغیر چارہ نہ تھا، دوسری طرف اسلام کے وہ سیدھے سادے مسایل تھے کہ جن کو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جزیرہ نما عرب میں نسبتہً چند ہی آدمی عیسائی ہوئے۔ عرب کے کسی بڑے حصے پر کسی وقت بھی یہ مذہب نہیں پھیلا۔ البتہ اہل حبش کے قبضہ عرب اور بعثت رسول اللہ صلعم کے درمیان میں جو تھوڑا سا عرصہ گذرا تھا اس میں اس کو کسی قدر بیش از بیش کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔

بہت سے مراسم جو حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہ السلام) نے اختیار کئے، یا آپ کے متبعین ان پر عامل رہے، اور جن کی نسبت عام طور پر یہ خیال ہے کہ وہ اسلام کے خاص مخترعہ ہیں، نزول قرآن مجید سے صدیوں پہلے سے چلے آتے ہیں۔ مسلمانوں کی عبادت کا طور و طریق وہی ہے کہ جو فراعنہ کی ہمیشہ باقی رہنے والی یادگاروں پر کندہ ہے۔ بت

---

[۱] افسوس ہے کہ ناشکرے عیسائی اس کو بھی غنیمت نہیں سمجھتے۔ کیا "مذہب انجیل" اور مسیحی تعلیمات میں کوئی ایسی دلکشی ہے کہ کوئی معقول پسند اس کی طرف خود بخود کھچا چلا جائے۔ آخر عربوں کے پہلو میں دل اور سر میں دماغ تھا یا نہیں؟

(مترجم)

پرستان عرب تبرکاً کو جاتے ہوئے احرام باندھا کرتے تھے، سات مرتبہ کعبہ کا طواف
کرتے تھے، حجر اسود کو چومتے، صفا و مروہ کے میدان میں سعی کرتے تھے، منیٰ کے مقام
پر رمی الجمرات کرتے تھے، قدیم زمانہ کی طرح قربانیاں کرتے تھے، طامع اور ہنسی اُڑانے
والے مکی لوگ زیارات کرانے کے بہانہ سے باقاعدہ طور پر حاجیوں کو لوٹتے تھے۔ نیک
مسلمان زائرین بھی آج وہی کرتے ہیں، اور اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا ہے۔ ابتدائی
زمانہ کے عرب وضو سے جسمانی طہارت میں غلو کرتے تھے۔ وہ اپنا سر منڈاتے تھے اور نورہ
کے ذریعہ بغل وغیرہ کے بال اُتارتے تھے۔ مصریوں کی طرح وہ ہاتھ پیروں میں مہندی اور
آنکھوں میں سُرمہ لگاتے تھے۔ جب وہ حرم میں پہنچتے تھے تو موسیٰ علیہ السلام کی طرح
اپنے جوتے اُتار لیتے تھے۔ وہ بعض قسم کے کھانے نہ کھاتے تھے، اور اس معاملہ میں سخت
احتیاط کرتے تھے۔ اُن کے اعمال و افعال کے لئے ایک قانون بنا ہوا تھا جو مسلمانوں
اور یہودیوں میں قریباً متحد ہے۔

عربوں میں اُس جوہر کے جو قرون مابعد میں علم ادب و سائنس میں اتنا انقلاب پیدا
کرنے والا تھا، چھٹی صدی عیسوی تک کوئی آثار ایسے نہ تھے کہ جن سے یہ معلوم ہوتا کہ اس جوہر
مخفی سے وہ یہ کچھ کر کے دکھلائیں گے۔ جن لوگوں کی بسر اوقات ہی جبر ستانی اور غارتگری پر
تھی اُن لوگوں کی طرز معاشرت سے یہ کسی طرح پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اُن میں دماغی ترقیات
کی قابلیت بھی ہے یا نہیں۔ اُس زمانہ کے عربوں میں کوئی تحریر نہیں تھی، سوا چند حمیری
زبان کے غیر مفہوم کتبات کے۔ یہ کتبات زمانۂ حال کے علماء کی محنت سے اب پڑھے
گئے ہیں اور زیادہ تر قبر کے کتبے ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ روایات
قدیمہ تھیں جو اتنے زمانہ کے اباطیل اور تعصبات سے مل کر مسخ ہو چکی تھیں۔ اُن کے حافظہ
کی طاقت، جس کے ذریعہ سے وہ اُن روایات کو یاد رکھتے، اور دوسرے تک پہنچاتے تھے
ایسا معجزہ تھا کہ جس پر اعتبار آنا مشکل ہے۔

اگرچہ اُن کے پاس کوئی مستند تاریخ نہ تھی اور وہ ایسے فنون بھی نہ جانتے تھے کہ جن
سے کسی قوم کو شہرت دوام حاصل ہو، مگر عرب علم ادب میں بہت ہی بڑھے ہوئے تھے۔

یہ فن وُہ تھا کہ جس میں وحشی اقوام نے انتہائی کمال دکھلایا ہے۔ شاعری ایسی چیز ہے کہ وُہ اکثر ایسی صورتوں میں انتہائی عروج پاتی ہے کہ جب تہذیب کے عملی خیالات اور اُس کے درخشندہ عیوب سے کسی کو سروکار نہ رہا ہو۔ بادیہ نشینانِ عرب اس کو کمالاتِ انسانی کا نہایت عالی منزلت جوہر سمجھتے تھے۔ اُن کے مزاج و طبیعت، اُن کی حالت و عادات، اور اُنکے اشغال نے اُن کو خاصتاً فکر و غور کا عادی اور دلدادہ بنا رکھا تھا۔ اُن کے مزاج میں حدّت و شدّت تھی، اُن کی قابلیت اختراع کبھی ختم نہ ہونے والی تھی، اُن کے تخیلات بے قید و آزاد تھے؛ اور اُن کے جوش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خدائے تعالےٰ نے اُن کا نظام عصبی ایسا بنایا تھا کہ جو بہت ہی جلد متاثر ہوتا تھا۔ اس لئے ایسے موقعوں پر کہ جہاں اُن کو ایسا پُر جوش کام کرنا پڑے، کہ جس سے دماغ میں ہیجان پیدا ہو، تو اُن میں ایک قسم کا دیوانہ پن پیدا ہو جاتا تھا۔ بڑے بڑے مشہور شاعروں کا قول ہے کہ بغیر اس کیفیت کے پیدا ہوئے شاعری میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا۔ صحرائے لق و دق کے مناظر، اُس کا مؤثر سکوت کامل، سراب کی سحر کار نظر فریبیاں، افلاک منطقہ حارّہ کے درخشندہ اور شاندار ستارے، سراپا مخدوش زندگی، حسن و عشق کے بہادرانہ کارنامے، شبخون و حملۂ سحری، اندہاش کرو فر، امداد و تخلیص، یہ تمام باتیں اہلِ عرب کی قوت متخیلہ میں ہیجان پیدا کرتی تھیں اور اُن میں اس جوہر کے پیدا کرنیکا شوق پیدا کرتی تھیں جو نسلہا آئندہ کو وُہ وُہ کارنامے دکھلانے پر مائل کرے کہ جن کو شہرتِ دوام حاصل ہو اور پسماندوں میں اُن کا ذکر خیر ہمیشہ کے لئے باقی رہے۔ اُن میں سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ عزت اُن ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اسی فکر میں وُہ اپنا لیل و نہار گزارتے تھے، اور اسی میں وُہ اپنے قبیلے کی عزّت و آبرو سمجھتے تھے۔ جو ذرایع شعراء کو حاصل تھے وُہ تمامتر اُن کے مفید مطلب تھے۔ عربی زبان کی شیرینی، اُس کی حیات بخش قوت، اُس کے رسیلا پن، اُس کے استعارات کی بہتات اور بو قلمونی نے اُس کو شاعری کے واسطے اتنا موزون بنایا ہُوا ہے کہ جو دُنیا کی کسی اور زبان کو بہت کم حاصل ہے وُہ شاعر کے سامنے تخیلات کا ایک بڑا میدان پیش کرتی ہے۔ کوئی لفظ، کوئی محاورہ ایسا نہیں ہے کہ جو نہایت خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ قافیہ و ردیف میں موزون نہ ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اُس کی اکثر نثروں میں نظموں کا مزہ آتا ہے؛ اور عروض تو ایک طرف رہی اوزان

موسیقی پر بھی کامل العیار ترقی ہیں۔ زمانۂ حال کے علم الالسنہ نے یورپ پر یہ ہویدا کر دیا ہے کہ زبانِ عربی کی صرف و نحو پیچیدہ اور نہایت مکمل ہے؛ اس کے لغات کی فہرست نہایت وسیع ہے؛ اور تخیل کے لئے اس زبان میں بڑا وسیع میدان ہے۔ اس پرانے مسلمان فلسفی محمد الدمیری نے اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت اور وسعت و فصوحت کو دیکھ کر بہت صحیح کہا ہے کہ "خدا تعالیٰ کی رحمت واسعہ تین چیزوں پر نازل ہوئی ہے۔ فرنگیوں کے دماغ پر، چینیوں کے ہاتھ پر اور عربوں کی زبان پر"۔

عربوں کی شاعری کی اصلیت، بہ نسبت اُن کی ابتدائی تاریخ کے، اور بھی زیادہ مبہم ہے۔ کوئی لٹریچر، خواہ وہ کتنا ہی اچھا ہو، اپنی واقعی ہستی کو ایک نسل بھی قایم نہیں رکھ سکتا تا وقتیکہ وہ معرضِ تحریر میں نہ آجائے۔ اُن کی قوتِ حافظہ، جو فی نفسہا قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب نمونہ تھی، صرف چند روز کے لئے نامکمل طور پر اُن کی زبان آوری کو ایک قسم کا مستند استقلال عطا کر سکتی ہے۔ اُن میں یہ قوت کچھ ایسی عام تھی کہ کسی شخص کو دوسرے کے حافظہ کو دیکھ کر تعجب نہ ہوتا تھا؛ اور چونکہ تقریباً ہر روز وہ اپنے قصاید پڑھ جاتے تھے اس لئے وہ محفوظ رہتے تھے۔ عربی نظموں کے مضامین اسی واسطے اکثر بدل لیتے ہیں؛ مگر از روئے فنِ عروض اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اُن کی نظموں کی صورت عام طور پر ایک بادیہ کے ایک ڈرامہ کی سی ہوتی تھی۔ بعض وقت مرثیہ ہوتے تھے، کہ جن میں متوفی کی خوبیاں گنائی جاتی تھیں؛ اور کبھی کبھی ان ہی میں اُس کے قبیلے کے کارنامے بھی دکھلائے جاتے تھے۔ شعراء قبل الاسلام کے جوہر نے قصص و سیر الابطال کی طرف کبھی توجہ نہیں کی؛ حالانکہ شاعری کا یہ شعبہ ایسا ہے کہ جس کو فرضی افسانوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانوں سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اگرچہ عرب کی آب و ہوا اور گرد و پیش ایسا تھا کہ اس شعبہ میں وہ خوب ترقی کر سکتے، مگر انہوں نے اس کی طرف کبھی پوری طور پر اعتنا ہی نہیں کیا۔ اُن کے قصاید اور نشیدوں کے شجاعانہ کارنامے سنا کر سامعین کو مبہوت بنا دیتے تھے۔ اُن کے غرور نے اُن کو یہ سکھلا دیا تھا کہ شجاعت و بسالت ہی دنیا بھر میں اعلیٰ درجے کی چیز ہے؛ یہی انسان کی قدر و منزلت کو بڑھاتا ہے؛ بالخصوص معطل و بکر و تہذیب و تمدن کے مقابلہ میں۔ قوم عرب میں جو خلقی قوت و استعداد شاعرانہ تھی وہ اسی قوم سے مخصوص تھی۔

چھوٹا ہو یا بڑا، ہر شخص میں یہ مادہ موجود تھا۔ قواعدِ علمِ عروض، بلکہ اوزانِ شعر کے قوانین بھی اُن کو معلوم نہ تھے، مگر اُن کے دماغ اوزانِ شعر کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ایسے موزون تھے کہ کوئی شخص غلطی نہ کر سکتا تھا۔ مفلس ترین شاعر کے قصاید کے لطایف و علوِ تخیل کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ یہی وہ چیز تھی جو جوش و خروش میں، ہیجانِ تخیل میں بلندی، جذبات میں التہاب پیدا کرتی تھی۔ بادیۂ عرب کی تمام نظموں میں یہ ساری باتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بہت سے قصاید سلیمان علیہ السلام کے زیور سے مماثل ہیں، بہت سے ہزار و اہرا میں مشہور ہیں، بہت سی نظموں میں اقوال و دل حکمتیں ہیں، بہت سی نظمیں لطایف و ظرایف اور نکات میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ وہ سات نظمیں جو "معلقات" کے نام سے موسوم ہیں (جہاں تک کہ لفظ "معلّق" کا تعلق ان نظموں سے ہے اس لفظ کے معنی ابھی تک مبہم ہیں) ہمیشہ سے اہلِ عرب کی صنعتِ انیقہ اور چوٹی کی نظمیں سمجھی جاتی ہیں۔ ہمارے پاس وُہی ایک ذریعہ ہے کہ جس سے ہم اُن کی شاعری کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مادۂ سرعتِ تصدیق نے یہ فرض کرایا ہے کہ یہ قصاید اس لئے معلقات کہلاتے ہیں کہ وہ کعبہ کی دیوار پر لٹکائے گئے تھے۔ یہ اس امر کی شہادت ہوتی تھی کہ مشاعرہ میں جتنے شعرا کی نظمیں تھیں سب پر اُس خاص نظم کو فوقیت تھی۔ لیکن محققین کی یہ رائے ہے کہ معلقات کے معنی ہیں "وہ مرصع زیور جو گلے میں لٹکایا جائے"۔ قصیدہ معلقہ بھی گویا ایک زیور ہے کہ اس کا ہر شعر ایک گوہر ہے۔ ایشیا کے باشندے علمِ ادب کی کتابوں کو ایسے ہی نام دیتے ہیں، بالخصوص شعرا اور مورخین۔ تمام روایات کا ذخیرہ اور تمام واقعات، جو ہر ملک و ملت کے لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کے متعلق جمع کئے ہیں، وہاں کے باشندوں کی خانگی و بیرونی زندگی، اُن کے خیالات و جذبات، اُن کے عادات و خصایل اور رسم و رواج کو اس تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کر سکے ہیں کہ جتنے قصاید معلقات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ ہم میں ایک حد تک یہ قابلیت پیدا کرتے ہیں کہ ہم ابتدائی عربوں کے سیاسی اور دینی طور و طریق کی حالت کو از سر نو منظم کر سکیں، اور اُن سے مقابلہ کر کے اُن مقامات میں اُن کا وجود ثابت کر سکیں کہ جہاں جہاں اسلام کی تلوار نے بت پرستی کا قلع و قمع نہیں کر دیا۔ وہ نہایت مؤثر طریقہ کے ساتھ بادیہ کی خاموشی و یکسوئی، وہاں کے چندھیا دینے والے آسمان، وہاں کے رقصندہ بخارات، وہاں کے کبھی

ختم نہ ہونے والے ریت اکو آنکھوں کے سامنے لا بٹھاتے ہیں۔ وُہ اُس بادیہ نشینانہ زندگی کا مرقع پیش کرتے ہیں کہ جس میں اگر کچھ اختلال پیدا ہوتا ہے تو کسی شبخون یا کسی بڑی سازش کی وجہ سے؛ وُہ غزوات کے پرجوش مناظر کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں؛ وہ تغزل کے وارستہ رنگ میں بدوی حسینوں کی تصویر کھینچتے ہیں؛ وُہ اُن کنیزکوں کی حالت کو بیان کرتے ہیں جن کی بند و قید اکثر کسی سازش کا نتیجہ ہوتی تھی؛ یا تجارت کی طرح؛ وُہ تاروں بھرے آسمان (یا ایشیا کی رنگین زبان میں مرصع بجواہر آسمانی ریشمی دوپٹہ) کے نیچے شبینہ سفر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ قصاید معلقات کی خوبی و لطف کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے وُہ اکثر باتوں کے شارح ہیں۔ سلب و نہب کا فخر و ناز زمانہ شجاعت کا مایۂ امتیاز ہوتا ہے، مگر شعرائِ عرب اس کو اور بھی اُبھارتے رہے ہیں۔ مسرفانہ مہمان نوازی کا مقدس فریضہ کسی عزیز گھوڑے یا اونٹ کی خوبیاں، منہمک کر دینے والے عاشقانہ جذبات، اُس کے مصائب اور اُس کے حقیقی لطف، انتہادرجہ کے خطرناک مردانہ کھیل، وہ مضامین تھے کہ جو عربی شاعروں کو نہایت عزیز تھے۔ ان ہی میدانوں میں وُہ اپنی جولانیاں دکھلایا کرتے تھے۔ اُن کی نظمیں اخلاقی مقولوں اور فلسفی اصولوں سے بھری پڑی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائِ عرب فطرتِ انسانی کو خوب سمجھتے تھے، اور ایسے ایسے سبق دیتے تھے کہ اُن پر عمل کرنے سے انسان کامیابی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکے۔ اُن کی زبان اور طرزِ بیان ایسا ہے کہ جیسا امثال سلیمان (علیہ السلام) اور سورۂ قرآن (شریف) کا۔ علاوہ اُن اخلاقی اصُول کے، جو موتیوں کی طرح اُن کی نظموں میں بکھرے ہوئے ہیں، بہت سی مکروہ اور وحشت ناک چیزیں بھی ہیں۔ قصاید معلّقات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وُہ عیش و عشرت کی تعلیم دیتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ عربِ جاہلیت کے تمام شعراء کا یہی مقصد تھا۔ حسینوں کی صحبت، مے کشی کا لطف، اور ایسی دعوتوں کے مزے کہ جس میں شراب پی پی کر آدمی بدمست ہو جائے، نہایت آزادی کے ساتھ ہر نظم میں بیان کیے جاتے ہیں۔ سازشوں کے مناظر، اور کسی کے یہاں رات کو چھپ کر پہنچنے کے حیلے اور اُس کی وجہ سے اپنی جان پر بن جانے کے خطرے، اپنے مخالف قبیلے میں عشّاق کا پوشیدہ طور پر جانا، اُسی لطف کیفیت سے بیان کیا جاتا ہے کہ جس طرح گھمسان لڑائیوں کے قصّے اور کسی بہادر کے کارنامے۔ عاشق اپنے معشوقہ کی اس طرح

بیہودہ خوشامد کرتا ہے کہ گویا وہ اُس کو اپنا معبود سمجھے ہوئے ہے۔ اپنی محبوبہ کا جو سراپا اور اُس کی تفصیل یہ شعرا بیان کرتے ہیں اُس کو زمانۂ حال کی مرزا منشی اور نازک دماغی گوارا نہیں کر سکتی۔ ترجموں میں اصل کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی، اور جتنے ترجمے موجود ہیں وہ صحیح ترجمے بھی نہیں کہلا سکتے، کیونکہ وہ ترجمے نہیں تفسیر ہیں، مگر شاعر کے اصلی و حقیقی جذبات و تخیل تو جادو کی طرح اصل الفاظ میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں ✦

عربی نظموں میں مشاکلت و مجانست اور اعادہ و تکرار زیادہ ہے۔ مانا کہ اُن کا دارومدار بالکلیہ حافظہ پر تھا، باوجود اس کے مشو و زوائد، تعریض و ابدال بمشکل تمام اس کی متحمل ہو سکتی ہے؟ بدوؤں کی تاخت و تاراج ایک تنگ احاطہ میں محدود تھی۔ بادیہ ہی اُن کی دُنیا تھی۔ وہاں کی تمام چیزیں اور مقامات ہر وقت نظر کے نیچے رہتی تھیں، اُن میں کسی قسم کی تبدیلی بھی نہ ہوتی تھی۔ جو کارنامے وہ ایک شخص کے بیان کرتے تھے وہی دوسروں پر بھی منطبق ہوتے تھے، آیندہ کی توقعات بھی ایک ہی طرح کی ہوتی تھیں، اجداد کی یادگار اور اُن کے کارنامے بھی یکساں ہوتے تھے، یہی چیزیں اُن کے قصاید کے لئے مواد بہم پہنچاتی تھیں۔ تکرار اُن کی نہایت کریہہ خصوصیّت تھی۔ یہی مستقل طور پر کسی سے مواخات یا دوسرے قوم یا قبیلہ میں تعلقات مصاہرت نہ پیدا ہونے دیتا تھا اور اسی نے اُن میں ایک یہ خصوصیّت پیدا کر دی تھی کہ ہزاروں برس گزر چکے ہیں، مگر اس وقت تک اور سب سے الگ تھلگ ہیں۔ نہ معلوم کتنی صدیاں گزر گئی ہیں، مگر اُن کے خیالات، اُن کے توقعات، اُن کی خوشی، اُن کی غمی، جو گرد و پیش کی چیزوں سے متاثر ہوتی تھی، بلا کسی تبدیل کے جوں کی توں چلی آتی ہے۔ اگرچہ اُن کا مذہب بُت پرستی و ستارہ پرستی وغیرہ سے مرکب تھا، مگر اُن کی شاعری میں کسی چیز کا میل نہیں ہے۔ وہ ایسی صاف ہے جیسے میشہ کا پانی۔ اس میں تصنع کا نام نہیں، بالکل فطرتی ہے۔ اُن کی زندگی کی ادنٰے ادنٰے باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض شاعری ہی کے لئے خلق کئے گئے ہیں۔ معمولی سوال کے جواب میں اُن کے مُنہ سے موزوں مصرع نکلتا تھا۔ کوئی مقرر اگر کسی تاریخی واقعہ کا حوالہ دیتا تھا تو اُس سے اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اُس کے استناد میں اپنی اچھوتی نظم پڑھے، یا کسی اور ہمعصر شاعر کے قصیدے سے سند لائے، وہی سب سے بڑی تاریخی سند سمجھی جاتی تھی۔ اہلِ عرب

کے سرعتِ ادراک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر کسی کا مقابل ایک مصرعہ کہہ کر یکایک خاموش ہو جاتا تو یہ شخص فی الفور دوسرا مصرعہ کہہ کر شعر پورا کر دیتا تھا، نہ موزونیت میں فرق آتا تھا نہ مضمون بدلتا تھا۔ تمام قصاید کچھ اس طرح ایک دوسرے سے مماثل ہیں کہ کسی خاص قصیدے کو دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ یہ فلاں زمانے کا کہا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذاق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تین سو سال قبل از ہجرت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے قصیدوں پر زمانۂ حال کے عربِ متوسط کے کوہستانی اسی طرح وجد میں آجائیں گے جیسے کہ اس زمانہ کے لوگ کہ جب وہ قصیدہ کہا گیا تھا+

تمام عربی قصاید، بالخصوص معلّقات، کی تشبیب میں فقدانِ تشخّص ہے، اور ان سب میں ایسی مماثلت ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام قصیدے ایک ہی شاعر کے ہیں۔ معلّقات کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی چیز ان کا اچھوتا پن ہے، جس کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسائلِ صرف و نحو کے لئے ان سے بڑھ کر کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ جب کبھی کسی خاص لفظ، یا کسی جملہ کی صحت و عدمِ صحت کی نسبت بحث ہوتی ہے، تو ان ہی قصایدِ معلقات سے سند لائی جاتی ہے، حتیٰ کہ مسلمان بھی اب تک ان ایامِ جاہلیّت کے قصاید کو مستند سمجھتے ہیں، اور باوجود اس کے کہ قرآن مجید کے علوِ تخیل اور فصاحت و بلاغت کو وہ الہامی مانتے ہیں، مگر زمانۂ کفر کی یہ نظمیں اب تک اُن کے یہاں قابلِ استناد و احترام ہیں+

قصایدِ معلّقات کے بقا و دوام کا احسان ہمارے اوپر ایک ایسے شخص کا ہے جو خود ساختہ نقاد ہے۔ اُس نے اپنے وجیہ و نفیس وجدان کے موافق اُن کو اُن بہت سے قصاید میں سے انتخاب کیا، کہ جو اُس کے سامنے تھے۔ اس انتخاب میں جو سلیقہ العانی اس شخص نے دکھلائی ہے، اُس کی وجہ سے یہ موقعہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا، کہ ہم اُن قصاید کی نسبت اپنی راء قایم کر سکیں جن کو اُس نے ایسا کمتر درجہ کا سمجھا کہ اُن کو انتخاب ہی نہیں کیا۔ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس شخص میں انتخاب کی قابلیت بھی تھی یا نہیں۔ انتہا ہے کہ ہمکو اس شخص کا نام بھی معلوم نہیں[1]۔ قصاید مستردہ کے کچھ ٹکڑے جو کہیں کہیں باقی ہیں ان

---

[1] قصاید سبعہ معلقات کے جامع حمّاد الراویہ تھے جو آخری تاجداران بنو امیہ کے زمانہ کے بزرگ ہیں ان کی قابلیت ہر طرح مسلّم ہے [illegible] (یا [illegible]) مسیحی میں بزمانہ مہدی عباسی اُن کا انتقال ہوا+ (مترجم)

سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ کم از کم اُن میں بہت سے قصاید ایسے ہیں کہ جو اُسی طرح قایم و باقی رہنے کے قابل تھے کہ جیسے یہ ساتوں خوش قسمت قصاید کہ جو ہم تک پہنچے ہیں +

یہ امر قابل توجہ ہے کہ عربی کی کوئی نظم ایسی نہیں ہے کہ جس میں یونانیوں، یا توریت، یا تالمود کے اثرات کا ذرا سا بھی شایبہ ہو۔ یہودیوں کی دولت، اُن کی سیاسی طاقت، اُن کے صحرا نشینان عرب سے گہرے تعلقات و اتحاد، اُن کی روایات و مراسم و زبان کی اہل عرب سے مماثلت، نے عرب کے زمانہ قبل از مسیح کے لٹریچر پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ یہودی باشندگان کے شعرا الگ تھے، اُن کے اور عربی شعرا کے تخیل اور طرز ادا میں بہت مماثلت ہے، ان کے خیالات بھی بلند اور قابل تعریف ہیں، اُن کی زبان نہایت شستہ و رفتہ ہے، گو قصاید معلقات کے مقابلہ میں اُن کا درجہ کم ہو، مگر وہ ایسے نہیں ہیں کہ اُن سے اعتنا ہی نہ کیا جائے۔ صحیفۂ ایوب (علیہ السلام) کو اگر دیکھا جائے تو اُس کو دیگر اسفار انبیا (علیہم السلام) سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ بعض نہایت قابل ناقدین کی یہ رائے ہے کہ وہ کسی عربی نظم کا ترجمہ ہے +

بدیہہ گوئی ایسا وصف ہے کہ جو اُن ہی لوگوں میں ہو سکتا ہے کہ جن میں غیر معمولی سرعت ادراک، رفعتِ تخیل، اور زبان پر قدرت کامل ہو۔ عرب کے تمام شعرا کو اس فن میں پوری دستگاہ تھی۔ کوئی شخص اگر کسی واقعہ سے متاثر ہو کر فوراً ہی کوئی شعر پڑھ دیتا تھا تو وہ سامعین سے بہ نسبت اس کے بہت داد پاتا تھا کہ کوئی شاعر کئی کئی روز محنت کر کے کوئی قصیدہ یا بہترین نظم پیش کرے۔ صنعتِ ارتجال کے پوری طرح پر نشو و نما پانے کے یہ معنی تھے کہ مرتجل کے قواء ذہنی غیر معمولی طور پر مکمل ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں نے اس فن کو یورپ میں پہنچایا، مطربان شرقی ایک مدت مدید تک یورپ کو اس سے متحیر کر چکے ہیں۔ اس کا کچھ پتا یا اگر اب یورپ میں دیکھنا ہو تو صرف دہاقین اٹلی میں دکھلائی دیگا۔ زمانہ حال میں یہ قرار دینا کہ کون کون سے قصاید مستند ہیں، نہایت مشکل کام ہے۔ ان میں سے کوئی قصیدہ بھی ایسا نہیں ہے جو دو سو سال قبل از ہجرت (علیٰ صاحبہا التسلیم) سے پہلے کا ہو۔ محض حافظہ کی بنا پر کسی روایت کو زبانی بیان کرنا غیر معتبر ہے، بولیوں میں اختلاف ہوتا ہے، نئے نئے محاورات پرانے محاورات کی جگہ پیدا ہو جاتے ہیں، استناد پر اعتبار نہیں کیا جاتا، حشو و زواید بڑھ جاتے ہیں، بے احتیاط شارحین

غلطیاں بڑھا دیتے ہیں، مختلف تعصبات کی وجہ سے کچھ مسخ کر دیا جاتا ہے، اور اکثر حصہ بالکل نکال ڈالا جاتا ہے۔ ان ہی تمام اسباب نے ملکر رفتہ رفتہ عربی شاعری کی لطافت اور جدّت کو خراب کر ڈالا۔

اس وقت ممکن نہیں کہ ہم یہ بتلا سکیں کہ اُن لوگوں نے جو فنِ شعر میں کمال حاصل کر چکے تھے اپنے پُر جوش ہم ملکوں پر کیا اثر ڈالا۔ عربی بھاٹ بلا استثنا اپنے قبیلہ کا اہم آدمی ہوتا تھا۔ دولت، رتبہ و درجہ، حُسن، ذاتی عزّت و ہر دلعزیزی، جنگی کارنامے سب ہی تو اُس کو خراج ادا کرتے تھے۔ وُہ اپنے جوہر شاعری و بدیہہ گوئی کے ساتھ اکثر سیاست دان، مبارز اور حملہ آور باسل ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے وُہ اپنے قبیلے میں ایک نمونہ بنا رہتا تھا، عورتیں گویا اُس کی پرستش کرتی تھیں، اور دشمن اُس سے ڈرتے تھے، کیونکہ اُن کو اس کی تیز تلوار کا اتنا ڈر نہ ہوتا تھا جتنا کہ اُس کی زہر میں بجھی ہوئی ہجو کا۔ ان نہایت ممتاز شخصوں میں سے ایک عنترہ (ابن شداد العبسی) تھا۔ سبعہ معلّقات میں ایک قصیدہ اس شخص کا بھی ہے۔ اس کی زندگی اور اس کے کارنامے فسانہ بن گئے ہیں۔ اُس کا قصیدہ بہادرانہ کارناموں کا ایک نمونہ ہے جو عربی زبان میں کم دکھلائی دیتے ہیں۔ اُس کی رگوں میں عربی خون صرف اُس کے باپ کی طرف سے آیا، کیونکہ اُس کی ماں ایک حبشیہ لونڈی تھی۔ لیکن از رُوئے خصایل و جبلّت و تعلیم وُہ بالکل بدوی تھا۔ ملک عرب کی رسم کے موافق اُس وقت تک اُس کی ماں کی حیثیت کنیزکوں کی سی رہی کہ جب تک اُس کے بیٹے عنترہ نے میدانِ جنگ میں اپنے کارنامے دکھلا کر اپنے باپ سے اُسے آزاد نہ کرا لیا۔ اُس کے تہوّر، غرامی اور دشمن کے مقابلہ میں اُس کی دلاورانہ بلند نظریوں نے اُس کو آتش مزاج عربی جوانوں میں ایک محبوبہ بنا دیا تھا۔ (جناب) رسول خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) اکثر افسوس کیا کرتے تھے کہ حضور نے بادیۂ عرب کے اس شجیع و باسل شخص کو نہیں دیکھا، جو کسی خطرہ کو خاطر میں نہ لاتا تھا، عورتوں کی حمایت کرتا تھا، مالِ مغروقہ اصل مالک کو واپس دلوا دیتا تھا، اور جس کا اصُول یہ تھا کہ "کسی سے کینہ نہ رکھو، کیونکہ کینہ سے کبھی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔"

عربی شعراء کی شستہ تر بیتے تمہاری وہاں کی قومی خصایل کی ایک عجیب شرح ہے۔

؎۱ ایام العرب ملاحظہ فرمائیے۔ بہت کچھ معلوم ہو جائیگا۔ (مترجم)

نہایت بلند پایہ آدمی، مقدس معبود، غرور دولت وحشمت، صنف نازک کا لحاظ وادب، غرض کوئی چیز بھی اُس کے نیش اور اُس کے ہجو سے محفوظ نہ تھی۔ وُہ نہایت سختی کے ساتھ شیخ قبیلہ کی بیوی اور بیٹی کی کمزوریوں اور غلطیوں کو طشت از بام کردیتا تھا، وُہ کسی عورت کے ساتھ اپنی آشنائی کی ایسی بے شرمی کے ساتھ شیخیاں مارتا تھا، اور اس طرح لاف وگزاف ہانکتا تھا کہ اگر زمانۂ حال میں ویسے ہی کیا جائے تو قتل ہی اُس کا کفارہ ہو، اور خون کی ندیاں بہ جائیں۔ جو آزادی اُسکو حاصل تھی وُہ شاعر ہی کا خاص حق سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی آزادی کا باعث ایک قسم کی تقدیس تھی، کیونکہ عوام کا یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے، اور اسی جن کے فیضان سے وُہ اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ اُس کے اشعار ہیجان تہوّر وبسالت تو ہوتے تھے، مگر دین ومذہب سے اُن کو کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، حالانکہ یہی وُہ چیز ہے جس کے سامنے آدمی کا سر جھک جاتا ہے۔ اُن کے یہاں یونانیوں کی طرح خرافات بُت پرستی تھے ہی نہیں، کہ تشبیہات واستعارات میں اُن سے مدد ملتی۔ فرقۂ لذتیین کے اصول اُن کے تخیل پر پورا احاطہ کئے ہُوئے تھے، اور اُن کی زندگی ان ہی کے لئے وقف تھی۔ شاعری کا جو اثر قلوب عرب پر تھا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعثتِ رسُول (صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ) کے متصل زمانہ میں قریش نے ایک شاعر کو رشوت دے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کہلانی چاہی، مگر اُس نے کسی طرح نہ مانا۔ آخر اُنہوں نے بصد مشکل سَو اُونٹ دے کر اُس کی زبان بندی کی کہ نہ مدح کہے نہ ذم۔ خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہجو گوؤں سے نفور تھے، چنانچہ جب مکہ فتح ہُوا ہے اور امن عامہ کا اعلان فرمایا گیا ہے، تو اُن آدمیوں میں سے، جن کا خون مُباح کیا گیا تھا، ایک گمنام شاعر ابن اسود بھی تھا جس نے شانِ رسالت میں ایک ہجو کہی تھی۔ عربی بھاٹوں کے ساتھ کچھ مطرب بھی رہتے تھے جو اُن کی نظموں کو سازوں پر گاتے تھے، جس طرح کہ زمانہ مابعد میں اُن کی اولادِ معنوی، مطربان سوقی، کیا کرتے تھے۔ یہ کام عمُوماً غلاموں سے لیا جاتا تھا، کیونکہ اس کام سے مغرور بدوی کی توہین ہوتی تھی۔

اسلام نے ترقیِ قوا، دماغی وذہنی کی رُوح عربوں میں پھُونک دی تھی، لیکن شاعری پر اس کا مُہلک اثر پڑا، اور اس جوہر کو سخت نقصان پہنچ گیا۔ مجاہدین کے جوشِ دینی نے اس

آگ پر ایسا پانی ڈالا کہ اُس کو سرد ہی کر دیا۔ کفّار کے قتل و غارت، سلطنتوں کی فتح، اور اشاعت دین سے اُن کو فرصت ہی کہاں تھی کہ وُہ شعر و شاعری کی طرف توجہ کرتے۔

اب تو یہ مسلّمہ عام ہے کہ عُکاظ میں ہر سال ایک مشاعرہ ہونا، اور بہترین قصیدہ کا کعبہ پر لٹکانا ایک مشکوک بات ہے۔ وُہ آوارہ گرد لٹیرے جو سال کے دس مہینے اپنے ہمسایوں کو لُوٹنے مارنے میں گزارتے تھے، اس کو کب گوارا کر سکتے تھے کہ دو ماہ کامل ایک پُر امن مگر دشمنوں کے مجمع میں آکر گزاریں، اور اپنے اپنے قصاید سُنا کر سب سے تحسین و آفرین لیں۔ ایسے عظیم الشان دماغی قابلیت پر داد دینے اور ایسے قضیوں کا فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام النّاس میں تنقید کا مادّہ پیدا ہو چکا ہو، اور قابلیت انتہا کو پہنچ چکی ہو، ہزار کچھ ہو، مگر یقیناً اُس زمانہ کا عرب اس درجہ تک نہیں پہنچا تھا۔ کچھ شُبہ نہیں کہ اس بے سر و پا قصّہ میں یونانیوں کے اولمپین[۵۱] کھیلوں اور میلوں کا دخل ہے[۵۲]، اور شاید کسی بکواسی اور جھُوٹے یونانی نے یہ قصّہ گھڑ دیا ہو[۵۳]۔ معہذا اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ عرب کے ہر مجمع اور میلے میں شاعر اور افسانہ گو کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی (ممالک ایشیا میں مؤخر الذکر ہی سوسائٹی کا لازمہ ہوتا تھا) جو بڑا بھلا مجمع ایسے میلوں میں ہوتا تھا اُس کی وجہ کچھ تو خود غرضی ہوتی تھی، کچھ دینی۔ جب کوئی فرصت کا وقت ملتا تھا تو شعرا کی نظمیں سُنتے تھے، جس سے اُن کے دل بڑھتے تھے، داد پانے کی امید پر یا ہر طرف کی لعنت و ملامت، اور عوام کے سامنے شرمندہ ہونے کے ڈر سے، اپنے قبیلے کے خیال اور خوف سے اپنی خشونت کو وُہ بتکلف چھُپا لیتے تھے۔

---

۵۱ اولمپیا OLYMPIA ملک یُونان میں ایک نہایت دلکش وادی ہے۔ یہاں ہر پانچویں سال مشہور میلہ لگتا تھا جس میں مردانہ کھیلوں کی نمایش ہوتی۔ اسی سے منسُوب ہو کر یہ اولمپین کھیل کہلاتے تھے۔ یہ میلہ زمانہ قبل از تاریخ سے چلا آتا ہے اور اب تک اس کا کچھ بقیّہ موجود ہے۔ یورُوپین علم ادب میں اس کا حوالہ اور تلمیح بہت آتی ہے۔ مگر ہمیں اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

۵۲ مانا کہ اس وقت یہ امر زیر بحث ہے کہ آیا ہر سال ایک میلہ ہُوا کرتا تھا یا نہیں۔ لیکن ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ عربوں اور خاص کر اُن کی شاعری پر کوئی بیرونی اثر نہیں تھا۔ میرے نزدیک تو جس طرح آگرہ کے تاج محل کا نقشہ کسی یُوروپین نے بنایا تھا اُسی طرح یہاں اولمپین کھیلوں کا دخل ہے۔ (مترجم)

۵۳ زمانہ قدیم میں بھی یُورپ کا ہر جگہ جلوہ اور یورپ کا احسان مسلّم۔ مگر یہ امر تسلیم کرنے کی لائق نہیں کہ عرب قدیم میں شعراء کو اتنی قابلیت نہ تھی کہ وُہ شعر کی تنقید کر سکیں، یا کم از کم اچھے بُرے کو پہچان سکیں، عکاظ کے مشاعرہ کے تردید کیلئے یقیناً کوئی اور دلایل تلاش کرنے چاہئیں۔ (مترجم)

زمانۂ مابعد کی تاریخ عرب، ایشیا کی معمولی شان و شوکت سے گویا مرصع ہے۔ قصہ و افسانہ کی دلآویزی اس کو اور بھی دولہن بنائے ہوئے ہے۔ اُن واقعات کے ساتھ، جو کسی قوم کی تدریجی ترقی کے لئے لازمی ہیں، حقیقی اور صحیح حالات بھی یک جان ہو کر ملے ہوئے ہیں۔ لیکن جب کوئی اُن کو سرسری نظر سے دیکھتا ہے تو اُن کی تصدیق نہیں کرتا۔ اُن کو زمانۂ شجاعت کے دُور از کار اور پُر از مبالغہ قصے سمجھتا ہے، اور شہرزاد کے قصّوں سے زیادہ اُن کو وقعت نہیں دیتا۔ بعثت جناب سرور انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے عربوں کی طرز زندگی کو اگر دیکھا جائے تو اُس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُن میں کوئی غیر معمولی مادۂ ترقی ہے۔ ایک زمانۂ بعید سے اُن کے تجارتی تعلقات مختلف قوموں سے چلے آتے تھے، اس سے اُن کا تجربہ بڑھ گیا تھا، اُن کے قوائے ذہنی میں وسعت پیدا ہو گئی تھی، اور اُن کی نظریں بہت بلند پڑنے لگی تھیں۔ وُہ خاموش قافلے جو ریگ کے ٹیلوں پر سے گزرتے تھے (ان ہی قافلوں کی بدولت رفتہ رفتہ ایشیاء کوچک، مصر، اندلس اور ہندوستان کی اشیاء تجارت کا تبادلہ ہونے لگا تھا) سائیں تہذیب و تمدّن کے بڑے ذریعہ تھے۔ ان ہی قافلوں نے اُن کے علم جغرافیہ و تاریخ میں اضافہ کیا؛ ان ہی قافلوں نے دُنیا کی مہذب ترین اقوام کے قانون، رسم و رواج، طرز تمدّن، صنعت و حرفت اور اختراع و اقتراح سے بایع اور مشتری دونوں کو روشناس کرایا؛ اسی مشارکت و موانست نے اُن میں وُہ مہتم بالشان قوت عمل پیدا کی جو شدہ شدہ عربوں کا علم و ہنر بن گئی اور آخر میں وُہ دوامی طور پر بنی نوع انسان کے لئے باعث رحمت و برکت ہو گئی۔ قوم عرب جو اِس قدر جلد ترقی کر کے بالغ النظر بن گئی، وُہ خود ایک عجوبہ اور قدرت الٰہی کا ایک نمونہ ہے۔ اگر کچھ سابقہ تجربہ نہ ہوتا تو اِس قدر جلد ترقی کرنا ناممکن تھا۔ اِس ترقی کا بڑا باعث اُن کی دوامی جنگیں اور ہر وقت کا ہیجان تھا۔ اُن کی آوارہ گردی و صحرا نوردی اور بادیہ کی جاہلیت میں، اور بنو اُمیہ و بنو عباس کے ثبات و استقلال اور دماغی ترقی میں ایک سو بیس برس سے بھی کم کا فاصلہ ہے۔ اُن کی ترقی کی رفتار اِس قدر سریع تھی کہ اُن کا مستقل رہنا ذرا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چار ہی نسلوں میں اُنھوں نے اِس قدر ترقی کی کہ کوئی اور قوم بیس نسلوں میں بھی نہ کر سکتی۔ اُن کی شان و شوکت نے ایسا چند روزہ (؟) ابھار رکھا تھا کہ اُن کا انحطاط نظر ہی نہ آیا، ورنہ حقیقت یہ ہے

کہ اُن کے انتہا عروج ہی کی تاریخ سے اُن کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ جو اسباب کہ اُن کی سلطنت اور اُن کی تہذیب کے قایم ہونے اور ترقی کرنے کے تھے، وہی اسباب اُن کے زمانۂ زوال میں بھی کام کرتے رہے، اور آخر وُہی اُن کی تباہی کا باعث ہو گئے۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ تاجر و تجارت کا بہت بڑا اثر انسان کے قوائے دماغی پر پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا یہ کہنا تناقض وہمی سمجھا جائیگا کہ منطقہ حارہ یا اُس کے قریب رہنے والوں کی تہذیب و تمدّن کی کامل نشوونما کے لئے تھوڑی ہی بہت خلوت و عزلت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ جزیرہ نماؤں کے باشندے عمُوماً بہت جلد انتہا عروج پر پہنچ جاتے ہیں، جس طرح زمانہ حال میں میکسیکو اور پیرو کے لوگ عزلت پسند تھے، اُسی طرح زمانہ قدیم میں مصر اور چین کے باشندے سخت خلوت دوست تھے کہ بیرونی دُنیا سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اُنکے ذرایع ایسے تھے کہ اُن کو کسی اور ملک کا محتاج نہ ہونا پڑتا تھا۔ ہندوستان، جاپان اور سپین میں بیشتر تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جو اپنے ملک کے حدُود سے باہر کے لوگوں کے ساتھ بہت ہی کم تعلق رکھتے تھے، اور اُن کے محافظ متلاطم اور عجیب سمندر تھے۔ سوائے اٹلی اور یُونان کے کوئی ملک ایسا نہ تھا کہ جہاں انسان کے دماغ نے ہر قسم کی ایسی عظمت و جلالت، ہر قسم کی ایسی خوبصورتی، اور ہر قسم کی ایسی صنعت گری پیدا کی ہو کہ جو انسان کے لئے مفید، اُن کے ارتقار کے لئے ضروری، اور اُن کے دُنیوی معاملات کے لئے لازمی تھی۔ رہ گیا عرب، اگرچہ دست قدرت نے اُس کو اچھی زمین اور اچھی آب و ہوا سے محرُوم رکھا ہے، جس سے خوش نصیب ممالک مستفیض ہوتے ہیں، لیکن اُس کو وُہ چیزیں عطا فرمائی تھیں جو اُس کو آیندہ زمانہ میں اپنے مدمقابل ملکوں سے سر برآوردہ و سرفراز کرنے والی تھیں، یعنی بے خوف و خطر جفاکش و شجاع جنگجو، معتدلانہ زندگی کے عادی، بیرونی دُنیا سے بے تعلق، پُرخطر معاملات میں بے جگر ہو کر کوُد پڑنے والے۔ اُن کے تجربے نے یہ بتلا دیا تھا کہ گرد و پیش کی اقوام حیز اور مخنّث ہیں، اور سخت کمزور۔ اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کی دولت پر کس طرح قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک پُرجوش سپہ سالار کی سرکردگی میں، ایک موزون و مناسب موقعہ پر ایک آزاد جم غفیر طوفان کی طرح اپنے گھروں سے نکلا اور اپنے لغو ہمسایوں پر آپڑا، اور اپنی بہادری

اور فتحمندی کے شہرہ سے تمام دُنیا کو معمور کر دیا۔ اگرچہ اُنھوں نے میدان جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھلائے، جس سے اُن کے پیغمبر (علیہ السّلام) کے قدم جم گئے۔ لیکن وُہ جانتے تھے کہ جو سلطنت محض تلوار کے زور سے قایم کی جاتی ہے اُس کو استقلال نہیں ہوتا، اِس لئے اُنھوں نے سخت مشقت کے ساتھ اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کیں، اور اُس کی عظمت وجلالت کا سکہ بٹھا دیا۔ وُہی جوش جس نے فتح وظفر کو اُن کا غلام بنائے رکھا، وہی جوش جس نے کفار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا ارادہ کیا تھا، وہی جوش آسانی، مگر اُسی زور کے ساتھ، مبدل ہو کر زمانۂ امن وامان کا باعث افتخار بنا؛ اور اُن نیم برہنہ لوگوں کی اولاد کو جو جناب رحمۃٌ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے علم مبارک کے نیچے جمع ہوئے تھے اس قابل بنا دیا کہ اُنھوں نے وُہ وُہ کام کئے جو خاص قسم کا جوہر رکھنے والے بلند پایہ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اُن کو علم وعمل کے میدان میں انتہا، عروج پر پہنچا دیا؛ اور ادب وسائنس میں اُنھوں نے وُہ قابلیّت کے جوہر دکھلائے کہ وُہ ایشیا و یورپ کی نہایت متمدّن مہذب اقوام کے برابر ہو گئے ۔

این زمینے است کہ سر منزلِ جاناں بوداست

مطرحِ نورِ رُخِ آن مہ تاباں بوداست

این زمینے است کہ ہر شیب وفرازے کہ دراست

جاء آمد شدِ آن سروِ خراماں بوداست

این زمینے است کہ ہر جا خس وخارے بینی

پیش ازین رستہ بجایش گل وریحاں بوداست

می دہد خاک رہش خاصیّتِ آن آب کہ تو

گو نصیبِ خضر از چشمۂ حیواں بوداست

تعلیقات

ضمیمۂ اوّل

رقیم عربی۔ سلاع عبرانی۔ پیٹرا یونانی +

زمانۂ قدیم میں نبطیوں کے دو مرکزِ حکومت تھے، ایک یہی رقیم اور دوسرا حجر۔ یہاں کے باشندوں نے پہاڑوں کو کھود کر اپنے مکان بنا کر یہ شہر بسایا تھا۔ یہ مقام بادیہ ادوم، واقع شمالی عرب میں، عقبہ سے ۷۰ میل جانب شمال و مشرق، خلیج عقبہ کے اوپر تھا۔ قرآن مجید میں "اصحاب الحجر" کا جہاں ذکر فرمایا گیا ہے اُن میں اصحاب الرقیم کو شامل سمجھنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ثمود بھی ان ہی میں شامل ہوں۔ یہاں کے باشندوں پر عذاب آلٰہی (اللھم احفظنا) نازل ہُوا تھا۔ جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم جب تبوک کو تشریف لے جاتے ہُوئے اس مقام (یا حجر؟) سے گزرے تھے تو صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم سے متوجہ ہو کر فرمایا تھا کہ "ان اپنی جان پر ظلم کرنے والوں کے گھروں سے روتے ہُوئے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ جو مُصیبت اُن پر آئی ہے تم پر بھی آ جائے"۔

یہ شہر (یا کھوئیں) ایک تنگ سی گھاٹی میں واقع ہے۔ اس کے گرد پہاڑ ہیں۔ منجملہ ان پہاڑوں کے جبل ہُور سب سے اُونچا اور سب سے زیادہ مشہور ہے؛ یہیں حضرت ہارون علیہ السّلام نے انتقال فرمایا تھا۔ اسی علاقہ میں بنو اسرائیل چالیس برس تک پریشان پھرتے رہے۔ یہاں کے اصلی باشندے ہورم (کھوؤں کے رہنے والے) کہلاتے تھے۔ اس علاقے کو ادوم نے فتح کیا، مگر اُنہوں نے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت نہیں بنایا۔ تیسری یا چوتھی صدی قبل از مسیحؑ میں یہ شہر نبطیوں کے ہاتھ آیا۔ دُنیا کے ممالک شرقیہ و غربیہ کا مالِ تجارت یہاں سے ہو کر گزرتا تھا۔ ۱۰۵ء میں اس شہر کو رُومیوں نے فتح کیا۔

اِس کے کھنڈرات نصف میل مُربع میں پھیلے ہُوئے ہیں۔ اس کے درمیان سے ایک نالہ گزرتا ہے۔ کھوؤں تک پہنچنے کا راستہ ایک بہت بڑی کھوہ میں سے ہو کر جاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مکان چار گز مُربع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوارعِ عام میں کھرنجہ تھا، کیونکہ اب تک اُس کے نشانات باقی ہیں۔ ان کھنڈرات میں ایک مقام "خزنیہ" کہلاتا ہے۔ وہاں کے باشندوں کے نزدیک اس جگہ فرعون مصر کا خزانہ مدفون ہے۔ ایک عمارت کو فرعون کا محل بھی کہا جاتا ہے + (مترجم)

ضمیمہ الف باب اوّل

یونانی۔ فونیک۔ رومی۔ فونیشیاPHOENESIA۔ عربی۔ فینیقیہ

اس ملک کی وجہ تسمیہ غالباً فوئنوس سے ہے، جس کے معنی ہیں ارغوان، یا فونیکس سے ہے، جس کے معنی ہیں "درخت خرما"۔ کیونکہ کھجور یہاں بہت پیدا ہوتی ہے۔

یہودی اسی علاقہ کو کنعان کہتے ہیں۔ کنعان کے لفظی معنی ہیں "زمین نشیب"۔ یہ اس علاقہ کی طبعی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ ملک عرض البلد کے ۳۴ اور ۳۶ درجہ شمالی کے درمیان میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں بحر روم، شمال و مشرق میں ملک شام اور جنوب میں جودی ہے۔ بحر روم تو ہمیشہ اس کی قدرتی حد رہی ہے، لیکن شمالی جنوبی اور مشرقی حدود سلطنت فونیشیا کے عروج و زوال کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ اس کا طول دو سو میل تک پہنچ چکا تھا، لیکن عرض کبھی بیس میل سے زیادہ نہیں ہوا۔ بحیثیت مجموعی اس کا رقبہ چار ہزار مربع میل ہے۔

اس ملک کی عظمت و شان کی اصل و بنیاد اس کی پیداوار ہے۔ چنانچہ اس کے بلند مقامات پر آبنوس، چیڑ، صنوبر، سرو، خرما، انجیر، زیتون، اقاقیا وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ نشیبی حصہ میں گیہوں، رائی اور جو بکثرت پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہی مختلف میوہ جات، مثلاً خوبانی، شفتالو، انار، بادام، چکوترا، لیموں، نارنگی، گنا، انگور، کیلا وغیرہ۔ ان سب میووں کے خودرو جنگل کے جنگل تھے۔ وہاں ریشم، روئی، نیل اور تمباکو بھی بکثرت ہوتا ہے۔ علاقہ شور کے رہنے والے اب بھی اپنے اجداد کی طرح کوہ لبنان کی پیداوار، چوب عمارتی و سوختنی اور کوئلہ بیرون ملک بھیج کر بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بھیڑ اور بکریوں کے گلّے اور شہد کی مکھیوں کے چھتّے ملک کے لئے اب بھی شہد اور دودھ کی ندیاں ملک میں بہائے رکھتے ہیں۔ سمندر سے ڈھیروں مچھلیاں ملتی تھیں، منوں ایسا مسالا پیدا ہوتا تھا کہ جس سے اعلیٰ ٹائر ارغوانی رنگ بناتے اور غیر ممالک میں بھیجتے تھے۔ کوئی بڑی قیمتی معدنیات وہاں تھیں نہیں، لیکن لوہا بکثرت پایا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے زمانہ سے کوہ لبنان سے عمارتی پتھر اور سلیں نکل رہی ہیں۔

یہ عقدہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا کہ یہاں کے باشندوں کی اصل و نسل کیا ہے۔ ان لوگوں کے آباؤ اجداد اپنے آپ کو ماوراء بحر اِتھرے ری ذان کے رہنے والے بتلاتے تھے۔ خلیج فارس میں دو جزیرے ٹائیروس اور ارادوس ہیں۔ وہاں کے مندروں اور یہاں کے مندروں کی وضع قطع بالکل یکساں ہے۔ اس سے ان کا یہ قول ممکن ہے

کہ صحیح ہو۔ کیونکہ بحر اتھے ری ان کی حدود سواحل مصر سے لیکر سواحل ہند تک سمجھی جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اولاد سام سے تھے نہ کہ حام سے۔ یہ لوگ جہاں کے رہنے والے بھی ہوں قیاس غالب یہ ہے کہ وُہ اس حصۂ زمین پر مختلف اوقات میں مختلف راستوں سے آئے تھے۔

زمانۂ قبل از تاریخ سے پہلے ہی یہ لوگ اپنا ملک اور اپنی سلطنت قایم کر چکے تھے۔ جو لوگ کہ پہلے یہاں رہتے تھے، یا سواحل بحر پر آباد تھے، وُہ بھی ان ہی کے ساتھ مل گئے تھے۔ ان ہی میں وُہ تھے جو سدون سے غزہ تک اور سدونیہ کے شمالی شہروں میں بستے تھے۔ ان سب نے الگ الگ اپنی بستیاں اور ریاستیں قایم کر لی تھیں۔ ان میں سے سب سے بڑی ریاست سدونیہ والوں کی تھی، اور دُوسرے درجہ پر تایر کی جو ۲۷۵۰ سال قبل از مسیح قایم ہو چکی تھیں۔ تیسری ریاست ارودس کی تھی۔ مگر تینوں ریاستیں ملکر سدونیوں کی سلطنت کہلاتی تھی۔ توریت میں اور بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نام آتے ہیں، مگر اُن کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔

اس ملک کی طرز حکومت کی تفصیل تو نہیں معلوم ہوتی، مگر اتنا ضرور پتہ لگتا ہے کہ وہاں کے بادشاہ گو نسلاً بعد نسل ہوتے تھے، مگر انتخاب کے وقت رعایا سے ضرور رائے لی جاتی تھی۔ بادشاہ کے دربار میں بڑے بڑے اُمراء کے خاندانوں کے لوگ موجود رہتے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد مختلف زمانوں میں کم و بیش ہوتی رہتی تھی۔ بعض وقت بادشاہ ہی دینی مقتدئی ہوتا تھا۔ جہاں تک قیاس کام کرتا ہے اُن کی سلطنت جمہُوری اصُول پر مبنی تھی۔ رعایا میں سے جو لوگ آمادۂ شرارت ہوتے تھے اُن کا سر کچل دیا جاتا تھا، یا حسب حیثیت بڑے بڑے عہدے دیکر اُن کا مُنہ بند کر دیا جاتا تھا۔ دو مرتبہ سخت بغاوت ہُوئی جس میں ایسی خونریزی ہُوئی کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اُمرا کے خاندان میں سے ایک بھی نہیں بچا۔

چونکہ رفتہ رفتہ تمام دُنیا کی دولت فونیشیا کے بندروں پر جمع ہو گئی تھی اس لئے وہاں والوں میں بے انتہا تکلفات اور عیش و عشرت بڑھ گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کو یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ وُہ بامن و امان اپنے اندوختہ سے لطف اندوز ہوں، اس لئے اُنہوں نے اپنے ملک کی حفاظت بحری قزاقوں کے سپُرد کر دی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ اُن میں سے سپاہیانہ جوہر نکل گیا تھا، کیونکہ بعد میں اسیریا، بابل اور یونان کی فوجوں کا اُنہوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔

فونیشیا کے تاریخی ذرایع ایسے مبہم ہیں کہ اُن سے صحیح نتایج اخذ نہیں کئے جا سکتے۔ کچھ سرکاری کاغذات وغیرہ کسی طرح رہ گئے تھے اُن سے ۱۲۵۶ سال قبل از مسیح تک کے حالات تحریر میں آ گئے تھے۔ توریت،

بالخصوص حضرت حزقیل کے صحیفہ سے بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ بعض مورخین قدیم بھی کچھ حالات لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فونیشیا پر چار زمانے گزرے ہیں۔ پہلا زمانہ تو اُس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ ابتدا میں اس ملک میں آئے تھے اور اُس زمانہ تک ختم ہوتا ہے کہ جب سدون تدریجاً ترقی پاکر سربرآوردہ ہو گیا تھا یعنی ۱۵۰۰ سال قبل از مسیح۔ دوسرا زمانہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب یہودیوں نے فلسطین کو فتح کیا۔ اُس زمانہ میں سدون بقول کتاب پیدائش "کنعان کا پہلوٹا بیٹا" بن چکا تھا۔ تجارت اور حرفت کی وجہ سے وہاں ترقی خوب بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ وہاں کے طلائی برتنوں کا تاریخ میں ذکر آتا ہے۔

تیسرا زمانہ وُہ ہے کہ جب ٹایر رفتہ رفتہ ترقی کر کے برروئے کار آگیا تھا۔ اُس کے جہاز تمام دُنیا کے سمندروں میں گھومتے تھے۔ یہاں والوں کی بستیاں دُور و نزدیک قایم ہو چکی تھیں۔ ٹایر کا ایک بڑا کارنامہ تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ اُس نے گیڈس کی ۱۱۰۰ سال قبل از مسیح میں بنیاد رکھی۔ ٹایر کے عرُوج کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ اُسی بسر کردگی شاہ عسقلون ۱۲۰۹ سال قبل از مسیح سدون کو شکست دی اور سدون والے یہیں منتقل ہو آئے۔ حضرت سموئیل کے صحیفے (یعنی گیارھویں صدی قبل از مسیح) میں سدون کا نام نہیں آتا بلکہ ٹایر ہی کو فونیشیا کا دارالمملکت کہا گیا ہے۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام کے سلطنت اور حکومت فونیشیا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور ایک دُوسرے کے مایحتاج ان ہی ممالک سے پُورے ہو جاتے تھے اس لئے ان کے اتحاد اور تعلقات اور بھی مضبُوط ہوتے چلے گئے۔ تجارت میں ایک دُوسرے کے شریک حال رہے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے جہازوں پہ فونیشیا کے ملاح وغیرہ کام کرتے اور خرید و فروخت میں شریک رہتے تھے۔

اس زمانہ میں فونیشیا والوں کی بستیاں بھی انتہائی عرُوج پہ پہنچ گئی تھیں۔ تین صدیوں (۱۳۰۰–۱۰۰۰ ق م) کے عرصہ میں بحر رُوم کے تمام سواحل اور جزایر اہالی فونیشیا کے قبضہ میں تھے۔ ان سب مقامات پر اُن ہی کے قلعے تھے، اُن ہی کے کارخانے اور اُن ہی کے شہر بسے ہُوئے تھے، اُن کے جہازات ہر طرف تجارتی مال لے جاتے تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ہی بندروں پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ قبرس بھی چونکہ ان ہی کی ایک بستی تھی اس لئے لیوانٹ سے لیکر سواحل شام اور سلیشیا تک اُن کے قبضے میں تھا۔ اس علاقے کے بڑے بڑے شہر کی تھی اُن اماتھس، کرپاسیا، پیفوس (جہاں اُن کا بڑا شاندار مندر تھا) کریبے نیا اور لپکھوس تھے۔ شمال کی جانب ساحل سلیشیا پر اُنہوں نے میریاندروس، ٹرسوس اور سولوئی جیسے بڑے بڑے شہر آباد کئے تھے۔ مغرب کی طرف اُنہوں نے روڈس، کریٹ، سلیمس، شیرا، ایلیا، روسس اور ساحل تھراکیا پے

قبضے میں کر لیا تھا۔ ایے جی اُن کے مشرق میں ایے ری تھرا اُن کے پاس تھا۔ سیموتھریس، لیمنوس،
تھاسوس اُن کے قبضہ میں تھا، تھاسوس اور اُس کی مشہورِ عالم سونے کی کانوں کے وُہ مالک تھے۔ بحر ایے جی
اُن اور اُس کے تمام جزایر چونکہ اُن ہی کے ہاتھ میں تھے اس لئے وُہ وہاں سے مغرب میں سسلی (صقلیہ)
تک پہنچتے تھے، یہاں تک کہ اُنھوں نے وہاں موٹائے میں جو انتہا مغرب میں واقع ہے اپنی بستی
بسالی تھی۔ اوسی میل کرٹ جنوب میں بسایا تھا۔ شمال میں میکانٹ اور اُس سے آگے بڑھ کر مالٹا اور
گولوس ان ہی لوگوں کے بسائے ہوئے ہیں۔ سارڈینیا میں کرالس، مینورکہ، ریوی زا اور ابلیبا ان ہی
کے قبضے میں تھے۔ اس کے عین مقابل ساحل افریقیہ پر ہیپو، یوٹیکا، ہیڈرومے ٹم، لیپٹس اور چھوٹے چھوٹے
جزیروں میں یہی لوگ آباد تھے۔ سارڈینیا اور منورکہ سے ان کے کبھی نہ تھکنے والے ملاح مغرب کی طرف
اور بھی آگے بڑھ کر آبنائے جبل طارق سے نکل کر سپین پہنچے اور یہاں اُنھوں نے قادیز بسایا، اور جنوب
میں کارٹیجا، ملاکہ اور ابدرشس کی بنیاد رکھی۔ جب تقریباً تمام سواحل سپین پر اپنی بستیاں قایم کر چکے
تو شمال کی طرف رُخ کیا اور سسلی کے تمام جزایر اور برطانیہ میں اپنی بستیاں بسائیں۔ ادھر تو وُہ بحر
اطلانطک کے چپہ چپہ کو کھوند رہے تھے، اُدھر عبرانیوں سے دوستی ہونے کے باعث اُنھوں نے
براہ بحر احمر ہندوستان کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔

چونکہ اُن کا حلقۂ تجارت اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ دُنیا کی کسی قوم میں اُن کا نظیر نہیں تھا، اسلئے
اُن کی صنعت و حرفت نے بھی وُہ ترقی کی تھی کہ کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اصل کام تو
اُن کا صرف یہ تھا کہ وُہ دنیا کے مال تجارت کو اِدھر سے اُدھر پہنچا دیں، پھر وُہ خود تاجر ہو گئے اور اس کے بعد
اُنھوں نے خود وُہ اشیاء بنانی شروع کیں جو اُن کے ہاتھ میں آتی تھیں۔ یُوں اُنھوں نے دُنیا بھر کو اپنی
تجارت و صنعت کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ جہاں تک اُن کی تجارت کو یُونان سے تعلق تھا، ایک عجیب
بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کے نام اُن ہی کی زبان یعنی سامی کے ہیں۔ حتیٰ کہ توریت میں وہی
نام جوں کے توں باقی ہیں۔ چاندی، لوہا، رانگ اور سیسہ ٹرٹیسس کی کانوں میں اتنی بہتات سے
پیدا ہوتا تھا کہ اُن کے جہازوں کے لنگر چاندی کے ہوتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ کو بھی
دخل ہو، لیکن چونکہ شروع شروع میں اُن کو اس کی چنداں قدر نہیں تھی اس لئے اس کا امکان ہے کہ وُہ
چاندی کو یُوں صرف کرتے ہوں۔ وہاں کی کانوں کی وسعت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب

یہ ملک رومیوں کے قبضے میں آیا ہے تو چالیس ہزار مزدور روزانہ ان میں کام کرتے تھے اور سلطنت کو بیس ہزار پانچ سو درم روزانہ کی خالص آمدنی ہوتی تھی۔ آبنائے ہرکلیس سے آگے بڑھ کر ایک مدت کی جدوجہد کے بعد جب انہوں نے وہ جزائر معلوم کر لئے کہ جن کو انہوں نے "خوش قسمت جزائر" کا نام دیا، جو ساحل افریقیہ پر ماریٹانیا سے آگے واقع ہیں تو ان کو وہ مچھلیاں مل گئیں جن سے انہوں نے رنگ بنانے کے کارخانوں میں بہت مدد دی۔ جہازوں اور کاروانوں کے ذریعہ سے جو تجارت وہ کرتے تھے اسی ضمن میں وہ شام اور فلسطین کے انتہا پر پہنچ کر اپنی خانہ ساز اور غیر ممالک کی اشیاء فروخت کرتے تھے۔

اگرچہ ممالک مغربیہ کے رہنے والے یہ سمجھتے تھے کہ اہالی فونیشیا جو جو مال فروخت کرتے ہیں وہ سب اُن ہی کے یہاں کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ مگر یہ پوری طرح پر صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو مال اُن کے ہاتھوں فروخت ہوتا تھا وہ اُن ہی کے یہاں کے مصنوعات کا سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا۔ ممالک غیر میں سب سے زیادہ قدر اُن کے ارغوانی رنگ کی ہوتی تھی، جو مچھلیوں سے بناتے تھے۔ یہ رنگ اُن ہی کی ایجاد تھا۔ اہالی ٹائر سے بہتر یہ رنگ کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ زمانہ قدیم میں ارغوانی رنگ بہت بڑا تکلف سمجھا جاتا تھا، اور بغیر اس کے کوئی کام نہیں ہوتا تھا، خاص کر ایشیا کا۔ مندروں میں دیوتاؤں کے اور محلوں میں اُمراء و سلاطین کے کپڑے، پردے وغیرہ ارغوانی ہی رنگ کے ہوتے تھے۔

سدون میں شیشہ بہت بنتا تھا کہتے ہیں کہ اتفاقاً ہی اُن کو شیشہ کی ایجاد معلوم ہو گئی تھی، اور اس میں اُنہوں نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اہالی مصر اُن سے بھی پہلے شیشہ کو معلوم کر چکے تھے اور اُس کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس میں کلام نہیں ہے کہ سدون کا شیشہ مصر کے شیشہ سے کہیں بہتر ہوتا تھا، اور شیشہ آلات میں بھی ان دونوں ملکوں کے بہت بڑا فرق تھا۔ دھات کی چیزیں بنانے میں بھی اُن کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔ لبنان اور قبرس میں اُنہوں نے تانبا نکالا، اور تھاسوس میں تو اُنہوں نے سونے کی تلاش میں ایک پہاڑ کو اُکھاڑ پھینکا تھا۔ آئبیریا میں اُن کو چاندی کا بے انتہا ذخیرہ ملا، وہاں کانیں کھودنے میں بھی اُن کو چنداں زحمت نہیں اُٹھانی پڑی۔ صحیفہ ایوب علیہ السلام (باب ۲۸ - آ ۱۱) میں کان کنی کی جو تفصیل درج ہے وہ غالباً اہالی فونیشیا ہی کی تصویر ہے۔

اس کے ظروف وغیرہ بنانے میں وُہ اپنے اقران سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے پیتل بنانا اور اُس کا استعمال بھی معلوم کر لیا تھا۔ چنانچہ ہیکل سلیمانؑ کے لئے یہاں کے بادشاہ ہرام بیف نے بہت مقدار میں پیتل دیا تھا۔ اس کا ذکر صحائف مقدسہ میں ہے۔ مصنوعی جواہرات بنانے اور شیشے کو مختلف رنگ دینے میں بھی اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ سونے چاندی کے نقش و نگار اور رنگ کے کاموں میں بھی سیدون والوں نے ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ حضرت سُلیمان علیہ السلام نے اپنی ہیکل میں ان ہی سے کام بنوایا تھا۔ ان ہی لوگوں نے وہاں جا کر سونے، چاندی، پیتل اور لوہے کا سارا کام بنایا تھا، ان ہی نے ارغوانی رنگ میں اپنا کمال دکھلایا تھا۔ نیلے رنگ سے بھی ان ہی نے وہاں کام لیا۔ سنگ تراشی اور لکڑی پر کھدائی کا کام بھی ان ہی کا تھا۔ باریک ململ ان ہی نے بنائی اور قیمتی پتھروں پر جڑکری وغیرہ بھی یہی کرتے تھے۔ اُن کا طرزِ عمارت کچھ مُدوّر شکل کا تھا۔ پہلے تو اُن کے "جہاز" ایک سیدھی سادھی لکڑی کے ہوتے تھے، مگر بتدریج اُس میں بھی اُنہوں نے ترقی کی۔ لبنان کا پہاڑ اُن کے لئے لکڑی کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ کبھی اُس کے ختم ہونے کا اندیشہ تھا ہی نہیں، اسی لکڑی سے اُنہوں نے چھوٹے جہازوں سے لیکر جنگی جہاز تک بنا لئے۔ کوئی جہاز گول تھا تو کوئی مستطیل، کسی میں پچاس پچاس چپو تک لگتے تھے، کسی میں چھوٹے سفر کے لئے بادبان تھے، کوئی سیر کرنے کی گول کشتیاں تھیں۔ جہازوں کا اندرونی انتظام نشست وغیرہ بھی نہایت اچھا اور مکمل تھا۔ اُن کے جہازوں کو دیکھ کر اہالی یونان حیران رہ گئے تھے، اور اُنہوں نے فوراً ہی سواری کرایہ اور جنگ کے واسطے اُن ہی کے جہازوں کی ساخت کو اپنے یہاں لے لیا۔ اہالی فونیشیا نے اپنے بادشاہ نیکو ثانی کی سرکردگی میں جو سفر تین سال کا کیا تھا، اور بحرِ احمر سے نکل کر افریقہ کے گرد چکر لگا کر بہت سے معلومات اور انکشافات کئے تھے وُہ تو اب تک تاریخ کو یاد ہیں۔ وُہ سفر بھی اُن کے کچھ کم اہم نہیں تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے اُن کو اکثر کرنے پڑتے ہیں۔ اُن کے یہ تمام سفر اپنے ہی بنائے ہوئے جہازوں میں اُنہوں نے کئے تھے۔

انتہائی عروج میں اُن کی آبادیاں نہایت شاد و آباد تھیں، صنعت و حرفت میں کوئی بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اور تجارت میں کوئی بھی اُن کا ہمسر نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کمال کو عروج کے زوال کے ساتھ زوال آ گیا۔ موخر الاسم ملک کو جو مناسبت حضرت سُلیمان علیہ السلام سے تھی وُہ ہی

مناسبت فونیشیا کو اُس کے بادشاہ ہیرام کے ساتھ رہی - جو امن و شادمانی ان دونوں بادشاہوں کے زمانہ میں ان دونوں ملکوں میں تھی وُہ دونوں کے ختم ہونے سے ختم ہو گئی۔ جس شان و شوکت، دولت و حشمت پر ان دونوں بادشاہوں نے اپنی سلطنتوں کو پہنچا دیا تھا وُہ پھر نصیب نہ ہوئی - ایک قدیمی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرام کے بعد اُن کا بیٹا بلیا ستر توس ۹۴۷ ق م میں تخت پر بیٹھا اور اُس نے صرف سات برس حکومت کی - اس کے زمانہ میں نہ صرف بیرونی دشمنوں ہی نے حملے کئے بلکہ اندرونی خرابیوں اور خانہ جنگیوں نے بھی چین نہ لینے دیا - ہیرام کا آخری بیٹا، فیلیتوس ۸۹۵ ق م میں تخت پر بیٹھا، مگر اُس کو اتوبعل نامی ایک مقتدائے مذہبی نے گرفتار کر لیا - اس واقع کے بعد اتوبعل کے خاندان میں سلطنت منتقل ہو گئی - اسی اتوبعل کا ذکر کتب مقدسہ میں ہے - یہی جزبیل کا باپ اور اہاب کا خسر ہے - توریت میں جو تین برس کے ایک قحط کا ذکر ہے، جو جودے میں پڑا، اور حضرت الیاس علیہ السلام کی دعا سے رفع ہوا، وہ اسی اتوبعل کے زمانہ کا واقعہ ہے - اسی شخص نے، باوجود اس کے کہ یہ ولی کامل بنا ہوا تھا، جودے سے قحط میں استمداد کی تھی - یہی وُہ بڑا زمانہ تھا کہ مشہور و معروف ایلیا، جو بعد میں ملکہ ڈیڈو کے نام سے موسوم ہوئی، سدون کے بڑے بڑے امرا کو لیکر لیبیا کی طرف منہ چھپا کر بھاگی اور وہاں اُس نے شہر کرتاجا را نا رہ = کار تحیج = قرطاجنہ) ۸۱۴ ق م میں اُس مقام پر آباد کیا جہاں اہالی سدون کی بستی تھی +

چوتھا اور آخری زمانہ فونیشیا کی تاریخ کا وُہ ہے کہ جب آٹھویں صدی ق م میں شل مینسر بادشاہ اسیریا نے اس ملک پر حملہ کیا، اور پانچ برس تک تایر کا محاصرہ کئے رہا تھا، گو یہ حملہ اور محاصرہ کچھ نتیجہ خیز نہیں تھا - یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ جنگ کے بعد جو صلح ہوئی وُہ اہالی تایر کے حق میں بہت مفید تھی - اس واقعہ کے چند ہی روز کے بعد فونیشیا کو اُس جنگ میں شامل ہونا پڑا جو کالدیا اور مصر کے درمیان میں چھڑی تھی، اور جس میں مصر نے کالدیا کو نیچا دکھلا کر اپنا تفوق قایم کر لیا تھا - فونیشیا پر ایک اور سخت مصیبت یہ پڑی کہ فرعون اپیرسیس کو یہ خبر لگی کہ بنوکدنصر مصر پر حملہ کرنے، اور فونیشیا اُس کا ساتھ دینے والا ہے - اس لئے اُس نے پہلے ہی فونیشیا کے بیڑے کو تباہ کر کے اس ملک پر حملہ کیا اور اُس کو خوب ہی لوٹا کھسوٹا - ان بیرونی مصائب نے اندرونی خرابیاں پیدا کر دیں، جن کا یہ نتیجہ ہوا کہ حکومت اور طرز حکومت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں - اسی لئے یکے بعد دیگرے بہت سے بادشاہوں کا نام اس زمانہ میں تاریخ فونیشیا میں آتا ہے جنہوں نے تھوڑے تھوڑے عرصہ حکومتیں کیں - یہی زوال کا پیش خیمہ ہوا - نوبت یہاں تک پہنچی کہ تایر اور سدون کی تاریخ گویا اس زوال پذیر سلطنت کی تاریخ ہو گئی - آخر جنگ اپسس نے فونیشیا کی آزادی کا بھی خاتمہ کر دیا، اور یہ ملک سکندر کی مفتوحات کا

ایک حصہ بن گیا۔ ۳۵ ق م میں یہ رُومیوں کی سلطنت میں شامل ہوگیا، اور اس کے بعد اُس کی قسمت شام، تایر، سدون اور قرطاجنہ کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اتنی بڑی سلطنت اور اُس کی شوکت و صولت کا نام ہی مٹ گیا۔ انتہا ہے کہ اسکی تاریخ سے بھی چنداں اعتنا نہیں کیا جاتا۔

باستثناء اولاد ابراہیم علیہ السّلام کے باقی ملک بت پرست تھا۔ عبرانیوں پر بھی اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ان کا علم ادب بھی بہت وسیع اور دلچسپ تھا۔

اس سے زیادہ تفصیل کی چونکہ ہمیں ضرورت نہیں ہے اس لئے اُس خوش نصیب کیلئے محفوظ رکھتا ہوں کہ جو یہاں کی تاریخ لکھنے کا قصد رکھتا ہو۔ ساتھ ہی میں یقین دلاتا ہوں کہ فونیشیا کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ جو سلطنت کہ دو ہزار برس تک قایم رہی ہو اور جو ہر قسم کی ترقیات میں اپنے ہمعصر ممالک میں کوس لمن الملکی بجا چکی ہو وہ لازمی طور پر دلچسپ ہو گی۔ (مترجم)

ضمیمہ (ب) باب اوّل

یمن۔ سَبَا۔ مآرب

یمن عرب کا جنوبی حصہ۔ لغوی معنی "داہنی طرف والا" (مکہ شریف سے) ٹالمی اور دیگر مورخین قدیم نے غلطی سے اسے عرب کو چک کہا ہے، اور اس میں تمام عرب اور صحرا عرب کو باستثناء صحرا شامل کیا ہے۔ یعنی حجاز، نجد اور جنوبی عرب۔ مگر اہلی عرب کی حدود دوسری ہیں۔ وہ نجد و حجاز کو یمن میں شامل نہیں کرتے۔ یہ تحدید کچھ مسلمانوں ہی کی نہیں ہے، بلکہ شعراء جاہلیۃ کے کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شمالی حدود میں بہت اختلاف ہے۔ یہ حصۂ ملک نہایت سیرحاصل ہے اس میں کئی پہاڑ ہیں اور کئی دریا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اسکو یمن نہیں کہتے تھے۔

یمن کے اصلی باشندے سَبَا (ہر سہ حرف متحرک) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ قبیلہ قحطان کے سب سے بڑی شاخ سے منسوب ہیں۔ توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید میں ان کا ذکر آتا ہے۔ توریت کتاب پیدائش باب دہم آیت ۲۶ تا ۲۹ میں یقطان کے بیٹوں کا نام ہے۔ یقیناً یہ سب یمن کی روایات پر مبنی ہوگا، کیونکہ ان میں سے اکثر نام کتبوں میں ملے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبوں میں اور مشہور لوگوں کے نام نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو زمانۂ مابعد میں شہرت نصیب

ہوئی۔کتاب متذکرۂ صدر کے اُسی باب کی اٹھائیسویں آیت میں سبا کو چنداں نمود نہیں دی گئی۔ ممکن ہے کہ یہ نام ایسا ہی ہو جیسا کہ آجکل تجارتی کمپنیوں کا نام ہوتا ہے۔ جنوبی عرب کی تجارت برآمدان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی کتبات میں عموماً سبا کا مادہ "تجارتی سفر" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت اور خرید و فروخت، اور اُس کے لئے سفر، کے معنی میں مستعمل ہے۔ سبا چونکہ تاجر قوم تھی اس لئے اسی لقب سے موسوم ہوئی۔ باب پیدائش میں ایک اور مقام پر بھی سبا کا ذکر ہے اور وہیں اُن کے شہروں، منزلوں کارخانوں وغیرہ کا تذکرہ ہے، جو براہ صحرا مالِ تجارت لے جانے کے لئے اُنہوں نے بنائے تھے۔ ایک کتبہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمالی عرب میں منعان کے مقام پر بھی اُنہوں نے آبادی قائم کی تھی۔ اس طرف اُنھوں نے اور بھی بستیاں بسائی تھیں، جو بعد میں اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں میں مِل جُل گئیں۔ افریقیہ میں جو اِن کی بستیاں تھیں وُہ اہالی افریقیہ سے مِلکر اُسی میں شامل ہوگئیں +

توریت میں سبا کی عظمت و جلال کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اُس کی تصدیق اسیریا کے کتبات سے بھی ہوتی ہے۔ مؤخرالذکر ملک نے اُنہیں سونا، چاندی اور بڑی مقدار میں بخورات بطور خراج بھیجے تھے۔ ایک اور جگہ سونے چاندی کے علاوہ گھوڑوں کا بھی خراج میں دیا جانا ثابت ہوتا ہے۔ مگر صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سبا کا زمانہ عروج کب سے شروع ہوا۔ تمام مورخین اور اہل نسب نے عبد شمس سبا کو قحطان کا پوتا لکھا ہے، اور اُن کی حکومت کا زمانہ ۴۸۴ برس بتلاتے ہیں۔ اس کے بعد اُس کا جانشین حمیر بتلایا جاتا ہے۔ بہرحال سبا اور حضرت سُلیمان علیہ السّلام (۹۵۰ ق م) کی معاصرت قرآن شریف اور اسفار یہود سے ایک ہزار برس کے بعد بھی ثابت ہے +

اِس میں کسی طرح کا کلام نہیں کہ ایک زمانہ میں یمن کی سلطنت بڑے زوروں پر تھی اور تہذیب بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی شہادت وُہ کتبات دیتے ہیں جو اُن کی عمارتوں کے نکل رہے ہیں۔ بند آب بنانے میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ یہی بند اُن کی تباہی کا باعث ہوا۔ اُن کا دارالسلطنت مآرب اسی بند کے ٹوٹنے سے ویران ہوا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید بہت صحیح طور پر اُن کے گناہوں اور ناشکری کا بدلہ قرار دیتا ہے +

اِس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات کہ یمن کی تاریخ اور ملکہ بلقیس کا قصہ کسی قدر تفصیل سے معلوم کرنا چاہیں وُہ مولانا سید سُلیمان ندوی سلمہ اللہ تعالےٰ کی کتاب ارض القرآن کی طرف توجہ فرمائیں۔ مُسلمانوں کو اِس کتاب نے اور کتابوں سے مُستغنی کر دیا ہے؛ اور اِس وقت یہ کتاب

اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ باقی رہی مفصل تاریخ۔ وُہ اُس خوش نصیب کے لئے محفوظ ہے جو اِدھر توجہ فرمائے۔ (مترجم)

ضمیمہ (ج) باب اوّل

ہیروڈوٹس HERODOTUS یُونان کا سب سے پہلا مورخ ہے۔ اور "ابو التاریخ" کہلاتا ہے ۴۸۴ ق م میں پیدا ہُوا۔ اس نے ایک بہت بڑا سلسلہ تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور اسی غرض سے ایشیاء کوچک، اُس کے ساحلی جزائر، اور مصر کا اپنے زمانۂ شباب میں سفر کیا۔ پھر فلسطین، فونیشیا، بابل اور سوسہ کا سفر کیا۔ ہیلس پانٹ سے ہوتا ہُوا بحر اسود کو عبور کر کے اُس کے ساحلی شہروں کو بھی دیکھا۔ آخر ۴۲۸ ق م میں مر گیا۔

سٹرابو STRABO پُرانے زمانہ کا جغرافیہ دان ہے۔ پہلی صدی مسیحی کے درمیان میں پیدا ہُوا۔ ماں کی طرف سے یُونانی ہے۔ باپ نہ معلوم کہاں کا تھا اور کس خاندان کا تھا۔ بہت سے لایق اُستادوں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ مغرب میں آرمینیا سے لے کر سارڈینیا تک، جنوب میں یوکشا سے لے کر حبشہ تک کو دیکھا۔ اس کا جغرافیہ نہایت مستند سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب سے پہلے ۱۵۱۶ء میں بمقام وینس ۱۷ جلدوں میں شایع ہوا۔ آخری جلدوں میں افریقیہ کے حالات ہیں۔ اکیسویں صدی کے آخر میں اس نے وفات پائی۔

پلینی PLINY سنہ ۶۱ عیسوی میں پیدا ہُوا۔ اس کی تاریخ وفات کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ بہت بڑا اور مستند مورخ ہے۔ اس کے خطوط بہت مشہور ہیں، جو دس جلدوں میں ہیں۔ ان میں جو کچھ اس نے لکھا ہے بہت معتبر ہے۔

ضمیمہ (د) باب اوّل

بوکیک شی او BOCCACCIO مشہور قابل قدر شاعر ہے۔ لاطینی اور اطالی زبان کا شاعر

بھی ہے اگر نثر بے نظیر لکھتا تھا۔ اس نے ۱۵ جلدوں میں رومی دیوتاؤں کا نسب نامہ لکھا ہے۔ اس کی تحریر میں عربی رنگ ہے۔ ۱۳۱۳ء میں پیدا ہوا، اور ۱۳۷۵ء میں مرا +

سروینٹیس CERVENTES سپین کا رہنے والا ہے۔ اس کی نہایت مشہور کتاب "ڈان کوئگزوٹ" مقامات حریری کے رنگ میں ہے۔ اس سے سپین کی سوسائٹی پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ایک زمانہ میں پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار نے "خدائی فوجدار" نام رکھ کر اس کا ملخصانہ ترجمہ کیا تھا۔ ۹ راکتوبر ۱۵۴۷ء کو پیدا ہوا اور ۲۳ راپریل ۱۶۱۶ء کو مر گیا +

والٹیر VOLTERE مشہور و معروف فرانسیسی مصنّف اور فلسفی ہے۔ اس کی تحریرات میں بھی عربیت ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا اور مرا +

نیوٹن NEWTON معروف ریاضی و ہیئت دان ہے۔ اتنا مشہور ہے کہ زیادہ محتاج تعارف نہیں۔ انگریز تھا۔ ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۲۷ء میں انتقال کیا +

شیکسپیئر SHAKESPERE انگریزوں کا مایۂ ناز ڈرامانگار ہے۔ جذبات انسانی کی تصویر کھینچنے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا +

ضمیمہ (ھ) باب اوّل

زینوبیہ = ZENOBIA پامیریا کی ملکہ ۲۶۷ء میں اپنے شوہر کی جگہ تخت پر بیٹھی۔ سلطنت روم کا قریباً تمام مشرقی حصّہ اُس کے زیر نگین تھا۔ اورے لی اَن نے تخت پر بیٹھ کر اُس پر بڑی فوج سے حملہ کیا۔ ملکہ نے کئی لڑائیوں میں شکستیں کھائیں۔ آخر عربوں نے اُس کو مدد دے کر کئی جگہ اس کو فتح دلوائی۔ ایرانیوں کی امداد پر اُس کو بڑا بھروسہ تھا، مگر وُہ عین وقت تک نہ پہنچ سکے۔ ایک مقام سے اُس نے اپنی عرب فوج کی حفاظت میں بھاگنا چاہا۔ مگر اوری لے اَن کی فوج نے گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ (اوری لے اَن) کے سامنے پیش ہُوئی تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے اس جنگ کی ساری ذمہ داری اپنے مشیروں پر ڈال دی، چنانچہ ایک مشیر اسی جرم میں قتل کرا دیا گیا۔ اورے لی اَن اس کو قید میں لے کر بڑے شان و شکوہ سے روم میں داخل ہُوا۔ اُس وقت ملکہ زرو جواہر سے ہر ہفت تھی، ساتھ ہی سونے کے طوق و زنجیر کے بوجھ سے مری جاتی تھی۔ آخر فاتح بادشاہ نے ایک بہت بڑا علاقہ اُس کو عطا کیا، یہیں اُس نے اپنے

دونوں بیٹوں کی محبت میں اپنی بقیہ زندگی گونہ شان و شوکت سے گزار دی - بڑی حوصلہ مند اور جوان ہمت عورت تھی - مسحور کر دینے والا حسن رکھتی تھی، مگر نہایت پارسا، عقیلہ، آزاد خیال اور دُور رس - لاطینی اور یونانی بے تکلف بولتی تھی، اور ایشیائی زبانوں پر بھی قدرت کامل رکھتی تھی - عام خیال ہے کہ وُہ یہودیہ تھی - اس کے متعلق ناول بن گئے ہیں - ہندوستان میں بھی طبع آزمائی ہوئی ہے +

اورے لی اَن ORELEON مذکورۂ بالا شاہنشاہ رُوم تھا، مگر نیچ ذات کا - ۲۱۲ء میں پیدا ہُوا اور ایرانیوں سے لڑتا ہُوا مارا گیا - مصریوں سے بھی لڑا تھا - ایسا لایق تھا کہ اہالی رُوم نے اُس کو "سلطنت روم کا ناجی" خطاب دیا + (مترجم)

باب دویم

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

۶۱۴ء سے ۶۳۲ء تک

مذاہب مختلفہ کی تطبیق اور اس پر غور وخوض کی دل آویزی۔ برکات اسلام۔ جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے مولود مسعود کے وقت ملک عرب کی حالت۔ اُس وقت مسیحی دُنیا و سلطنت بیزنطینی کی حالت۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق عام خیال۔ حضور کے آباء اجداد حضور کی اوایل عمر کے حالات۔ وحی اوّل۔ دین قویم جدیدہ پر تعدی۔ ہجرت۔ اسلام کی روز افزوں ترقی وترقّی۔ جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے خصایل مبارکہ۔ حضور کی کامیابی کے اسباب۔ تعدد ازدواج۔ قرآن مجید اور اُس کی ترتیب وتنظیم وغیرہ۔ دیگر مذاہب پر اُس کے احسانات۔ قبلہ شریف۔ حج اور اُس کے مناسک۔ اسلام کی وجہ سے عام اصلاحات۔ دُنیا میں قوت کی کارفرمائی۔ دین اسلام کی حیرت انگیز کامیابی۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم +

یا من بدا جمالک فی کل ما بدا
بادا ہزار جان مقدس ترا فدا

مشاغل انسانی میں تطبیق ادیان وملل، اور اُس کا مطالعہ نہایت دل آویز مگر ساتھ ہی نہایت غیر تسلی بخش مشغلہ ہے۔ تفحص تاریخی، حل مسایل ریاضی، تحلیل وتجزیہ کیمیاوی، تحقیق مناظر قدرتی میں آدمی یقینی یا تخمینی حد تک پہنچ سکتا ہے، لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جو معاملہ انسان کے عقاب وثواب دایمی پر متاثر ہوتا ہے اُس میں تیقن یا تخمین تک پہنچنا ناممکن محض ہے۔ کون

کہہ سکتا ہے کہ وُہ مختلف ادیان وملل ومذاہب کو اپنے سامنے رکھ کر اُن کا ایک دُوسرے سے تناسب، اور اُس تناسب کے موافق اُن کی قدر وقیمت کا اندازہ لگا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ تمام ادیان ایک دُوسرے سے متناقض ہیں۔ اکثروں میں ایک دُوسرے سے توافق نہیں ہوسکتا۔ باوجود اس کے ہر مذہب وملّت کو دعوٰی ہے کہ اُس کا منبع قدس اور سرچشمۂ انوار ایک ذاتِ الٰہی جل شانہٗ ہے۔ کون ایسا ہے جو اُن لوگوں کے اوصاف کا مناصفہ کرسکے، جن کو یہ دعوٰی ہے کہ وُہ اپنے اپنے مذہب کے غوامض کو سمجھے ہُوئے ہیں؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ جوش مذہبی میں آکر بعض اصُول کو قبُول کر لیا جائے اور بعض کو رد کر دیا جائے؟ خصُوصاً ایسی صورت میں کہ ردو قبُول ایسے لوگوں کا فعل ہو کہ جن میں حُسن عقیدت تو ہو، مگر مادّہ تنقید نہ ہو۔ یہ ادعائی الہام والقا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوجاتا ہے؟ مختصر یہ ہے کہ حقانیت کا محک ومعیار کیا ہے؟

کئی قرنوں کے تجربے اور تمام اقوام کی تاریخیں اس افسوسناک واقعہ کی شاہد ہیں، اور یہ ثابت کرتی ہیں، کہ جس طرح انسان کے قایم کردہ آئین ودستور العمل بوجہ معمولی حوادث کے فنا پزیر ہیں، وہی کیفیّت ادیان وملل کی ہے۔ اُن پر بھی ایک زمانہ شباب کا آتا ہے، جس میں اُن کے قواء مضبُوط ہوتے ہیں اور اُن میں جوش وہمّت ہوتی ہے، پھر وُہ وقت آتا ہے کہ اُن میں ایک قسم کا جمود پیدا ہوجاتا ہے، اور اُن کے اصُول میں قوت قبض وبسط نہیں رہتی، اس کے بعد اُن کا زمانۂ انحطاط وانحلال شروع ہوجاتا ہے۔ اور مخلوق چیزوں کی طرح اُن کی عمر طبعی موقوف ہوتی ہے اُن کی قوت حیات پر۔ یہ قوت حیات بقدر اُن کے اصُول کے اصلی وذاتی قابلیّت، اور بقدر طبایع انسانی کی مناسبت، کے کام کرتی ہے۔ یعنی اگر کسی مذہب کے اصُول ایسے ہیں کہ اُن میں انجذاب کی قابلیت زیادہ ہے یا وُہ آدمی کی صلاح وفلاح کی استعداد رکھتے ہیں تو اُن کی عمر طبعی زیادہ ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔ چونکہ مذہب کو علم مطلق نہیں دیا جاتا اس لئے الہام کی قدر وقیمت کا تخمینہ جو کچھ لگایا جاتا ہے وُہ محض نظری وظنی ہوتا ہے۔ اور اکثر وبیشتر دماغی قابلیّت یا اُن بوقلموں اثرات کا تابع ہوتا ہے کہ جس میں ملہم کی نشوونما ہوتی ہے۔ دُوسری طرف بڑے بڑے علماء علم مابعد الطبیعہ نے، نہایت قابلیت کے ساتھ، یہ بحثیں

کی ہیں کہ ایمان و ایقان اتفاقی چیز نہیں ہے؛ نہ وہ حوادث اور گرد و پیش کے اسباب سے پیدا ہوتا ہے؛ بلکہ ایسی لابدی چیز ہے کہ جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس معاملہ میں ارادہ و اختیار کو بالکلیہ کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بوجہ اس کے کہ آدمی کی رگ و پے میں اُس کے آبا و اجداد کے وقت سے تعصب جاری و ساری رہتا ہے۔ اس لئے ہر مذہب کے سچے پیرو اور معتقد کو دوسرے دین و مذہب کے اصول جھوٹے، لایعنی اور ملحدانہ نظر آتے ہیں۔ جتنے ادیان و ملل ہیں اُن میں سے کسی کو جہالت و بے انصافی سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ دین اسلام کو۔ تیرہ صدیاں گذر گئیں کہ اس دین کے بانی (صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ) کا نام مرادف ہے ...٭ کا۔ حضور کی مقاصد کو کذب پر مبنی بتلایا جاتا ہے، اور حضور کی حقیقی صدق نیت سے انکار کیا جاتا ہے؛ تمام عیوب، جو انسان کو ذلیل کر دیتے ہیں، حضور کی ذات (مقدس و مطہر) میں بتلائے جاتے ہیں؛ سب سے زیادہ لغویت اور سب سے بڑھی خلاف انسانیت باتیں حضور کی تعلیمات میں کہی جاتی ہیں۔ کلیسا اور اہالی کلیسا نے اپنا تمام تر بغض و خباثت حضور کے بدنام کرنے میں صرف کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے زمانہ میں بھی معدودے چند آدمیوں کو اُن اصول کا سطحی و بیرونی علم ہے جو ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں تمام عمرانی دُنیا کے بہت بڑے حصّہ کے دینی و دُنیاوی اصول پر قابض ہو بیٹھے تھے۔

٭ ناظرین مجھے معاف فرمائیں خدا کرے کہ زبان و قلم جل جائے اگر وہ بے ادبانہ و گستاخانہ کلمات جو یورپین مصنّفین حضور اقدس و اطہر صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے تکلف بک جاتے ہیں میں اپنی زبان و قلم سے نکالوں۔ اس لئے میں ہر جگہ اُن کو حقارت کے ساتھ حذف کر دوں گا۔ اور جہاں کہیں حضور کا اسم مطہر و معظم آئے گا میں کمال تعظیم کے ساتھ لکھوں گا۔ اس تمام ترجمہ میں میں نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔ اس ادب و تعظیم کو ناظرین مسٹر سکاٹ پر محمول نہ فرمائیں معہذا میں اور تمام مسلمان جناب مصنّف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کہیں حضور اقدس کی شان میں زبان درازی نہیں کی؛ اور اگر کہیں کی ہے تو اُس کو اقتضاء مسیحیت سمجھ کر انہیں معذور رکھنا چاہیئے۔ حضور کی شان اس سے اعلیٰ و اولیٰ ہے کہ اس پر چنداں اعتنا کیا جائے۔ مہ فشاند نور و سگ عو عو کند۔ وصلے اللہ علیٰ خیر خلقہ وسلم۔
٭ بہت خوب کہا ہے حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے:۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملّت بشست

صلے اللہ علیہ وسلم۔ (مترجم)

بہت صحیح قول ہے کہ کل جدید لذیذ۔ ہر نئی چیز کی طرف آدمی کو دلکشی ہوتی ہے۔ مگر اس کا ظہور سب سے زیادہ اُس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی ملہم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جو نیا دین و مذہب نکلتا ہے اُس کو متبعین و مقلدین کی کمی نہیں رہتی؛ چاہے مذہب جدید کے اصُول کیسے ہی مبہم ہوں، اور اُس کے متاوّلین کیسے ہی جاہل ہوں، تاہم تخیل، اعتقاد، بیم، رجا، مصالح مل جُل کر انسان کو اُس کے اختیار کرنے پر مایل کر ہی دیتے ہیں۔ اور اگر اُس کے شیوع کے وقت حالات مساعد ہوں تو یقیناً اُس کو کامیابی ہوتی ہے ۔

بعض لوگ نئے مذہب کو محض اُس کی جدت کی وجہ سے قبُول کر لیتے ہیں، بعض واقعی ایقان سے، اور بعض خود مطلبی سے۔ اُس کی قوت و طاقت بقدر اُس کی ہیبت بیم و رجا کے ہوتی ہے۔ جو اُس کے معتقدین میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ لوگ فوجی شان و شوکت کے بالعموم گرویدہ ہوتے ہیں، اس لئے اُس مذہب کا رعب زیادہ پڑتا ہے جس کے پیرو فتوحات کی وجہ سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف زمانۂ جاہلیت کے بہادروں اور بادشاہوں میں تالیہ* نہایت نمود و ناموری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ جن لوگوں کے جوہر ذاتی نے نسلِ بنو آدم پر زیادہ احسانات کئے ہوتے ہیں اُن کو عامۃ الناس کے مادہ شکر گزاری نے معبودوں کی فہرست میں داخل کر دیا ہے۔ سیزر سے لے کر کانسٹینٹن تک، جتنے روم کے بادشاہ ہُوئے ہیں، وُہ سب ہی تو دیوتا بنا دیئے گئے تھے۔ بہادران قوم کے نقوش قدم اور اُن کے علامات و نشانات مقدس بن گئے۔ جنگہائے صلیبی میں صلیب اور تبرکات فوج کے آگے آگے رکھے جاتے تھے۔ اس طرح دین اور جنگ کم و بیش ایک دُوسرے میں مل جُل گئے۔ بسا اوقات جنگ نے دین کے نشر میں مدد دی ہے۔ بہت کم ایسا ہُوا ہے کہ مقتدایان مذہبی نے ایک سپاہی کے جرم لامذہبی سے چشم پوشی نہ کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ادیان کا قیام و دوام محض بنوکِ شمشیر رہا ہے۔ جاہلیت و بت پرستی کو پردۂ دُنیا سے محو کرنا، بیت المقدس کو فتح کرنے کی متواتر کوششیں، سپین کی بازیافت، محکمہ احتساب، وُہ بے رحمیاں

* کسی ذات یا پیشے کو اِس درجہ اہمیت دینی کہ وُہ درجۂ الوہیت تک پہنچ جائے۔ (مترجم) ۔

جو نئی دُنیا کے لینے میں کی گئیں، پروونیس اور لینگیوڈاک کی تباہی اور بربادی کامل، سولھویں اور سترھویں صدی کی مقدس جنگیں، اگر ہم پیش نظر رکھیں تو یقیناً ہم کو جناب سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مہمات و رتق وفتق پر مجال نکتہ چینی نہ رہے۔ اگر حضور اکرم صلوٰۃ اللہ علیہ کی سیاسی تاریخ کو ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ کے دامن مبارک پر ایذا رسانی خلق اللہ کا ذرا سا بھی دھبّہ نہیں ہے۔ آپ کے تفوق میں نوکِ شمشیر کو بہت تھوڑا سا دخل ضرور ہے۔

جس دین کے قوانین و شرائع کا کروڑوں آدمی بلا چون وچرا احترام کرتے ہوں؛ جس کے اصُول کو ہزاروں اقوام کے متورعین و متعبدین الہامی جانتے ہوں، وُہ مذہب جو اسلحۂ براہین و دلائل سے مسلح ہو، یا ناقابلِ مقابلہ طاقتِ جوشِ مذہبی رکھتا ہو؛ جس نے اور مذاہب کی قوت کو تہ و بالا کر دیا ہو؛ اور اُن ادیان کے بڑے بڑے اصُول کو جذب کر لیا ہو، جن کی روایات نے دُنیا بھر کو اپنا حلقہ بگوش بنا رکھا تھا، اور جو باوجود اپنے انحطاط، اپنے اندرونی اختلافات کے، جنھوں نے ایک کو دُوسرے کا دشمنِ جانی بنا رکھا ہے، اور باوصف اُن مصائب کے جو صدیوں سے اُس پر پڑ رہے ہیں، اور جس کا لازمی نتیجہ حوادثِ جنگ، ایذائیں اور غداری ہوا ہے، اُس مذہب میں اب بھی حیرت انگیز اور غیر فانی قوت حیات موجود ہو، ایسے دین کی تفحیص و تنقید کرنا بہت بڑا اور نہایت نازک کام ہے۔ جس اسلام کے اثر سے مشرق و مغرب کے رہنے والے، جو ایک دوسرے سے دست و گلو رہتے تھے، رشتۂ مواخات و اتحاد میں منسلک ہو گئے، اور اُنھوں نے ایسا مسلک اختیار کیا کہ جو منجر بہ شوکت و فارغ البالی ہوا، اُس دین کی تاریخ دُور از کار فتوحات کے خواب کی صحیح تعبیر ہے، اور تاریخ بنی نوعِ انسان میں اپنا ثانی و نظیر نہیں رکھتی۔ اخلاقی و مادی دُنیا میں نہایت مکمل اور دیرپا سالک کی رفتار ایسی سُست اور نامعلوم ہوتی ہے کہ جس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اسی چال سے وُہ درجۂ تکمیل پر پہنچتے ہیں۔ مگر اس کلیہ سے اسلام بالکل مستثنٰے ہے۔ جتنے عرصہ میں عام طور پر ایک قوم اپنی ابتدائی حالت سے بمدارج ترقی کر کے دماغی قوت و طاقت حاصل کرتی ہے، اُس کی بہ نسبت بہت ہی کم عرصہ میں مُسلمان انتہا عروج پر پہنچ گئے، اور اہل عرب اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ ممتاز و سرفراز ہو گئے۔

اسلام نے اہلِ روم کے دلپسند اصُول کو مسترد کر دیا۔ ممالک بیرونی کے متعلق رومیوں کی پالیسی یہ تھی کہ رعایا کے باہمی نفاق و شقاق کو ترقی دیتے تھے، پھر اپنے دشمنوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے؛ اور آخر چار طرف سے اُن کو گھیر کر دفعۃً اُن پر حملہ کر دیتے تھے، اور متواتر فتوحات حاصل کرتے چلے جاتے تھے۔ مشہور ترین قیاصرہ روم کی بڑی بڑی کامیابیوں کا راز اسی میں مضمر تھا۔ جناب سرورِ انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کے اجداد کی روایات کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بہت سی باتیں معنے※ ہیں، اور بہت سی افسانے۔ یہ لوگ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو اپنا جد اکبر بتلاتے ہیں جن کو اُن کی بدقسمت والدہ کے ساتھ اُن کے والد حضرت ابراہیم علیہ السّلام (جو برگزیدگانِ آلہی کے جدِ اعلیٰ ہیں) سخت بے رحمی کے ساتھ فاقہ کرنے کے لئے بادیۂ عرب میں چھوڑ گئے تھے حضور اقدس و اطہر صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے درمیان میں اکہتر نسلوں کا فرق ہے۔ صرف اتنے عرصہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دُو رقیب اولادوں میں سے ایک بیٹے (حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام) کے خاندان میں دفعۃً ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد، جس سے ارضِ مقدس کی توریت کا وعدہ کیا گیا تھا، اب غلام بنائے جاتے ہیں، یا جلاوطن کر دئیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ وُہ اپنی بدعہدی میں ضرب المثل ہو چکے تھے، اس لئے لوگ اُن کو مطعون کرتے، اور ملعون سمجھتے تھے۔ برعکس ان کے، بے خانمان اسمٰعیل (علیہ السّلام) جن کو اُن کے والد نے چھوڑ دیا تھا، جن سے بھائیوں نے تعلق نہ رکھا تھا، اُن کی اولاد سے ایک نہایت ممتاز، شجاع اور مہمان نواز قوم پیدا ہوئی۔ اس قوم کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ وُہ تہذیب کو دُنیا میں پھیلائے گی، اور بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد ڈالے گی۔ نیز یہ کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ ممالک مشرقی کی سیر حاصل زمینیں اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہونگی؛ اور وُہ اپنے مطرود بھائیوں (یہودیوں) کو، بشرط ادائے جزیہ، وہاں رہنے دینگے؛ اُن کو بطور نشانِ ذلت ایک خاص علامت رکھنی پڑے گی، اور خاص قسم کا لباس رکھنا پڑے گا؛ اُن کو مجبور کیا جائے گا کہ جب وُہ کسی مسجد کے پاس سے گزریں تو از رُوئے ادب جوتے اُتار لیں، اور غیور اور مغرور

※ ! (مترجم)

اولاد اسمٰعیل علیہ السّلام کو قریشی سلام کریں۔ اُدھر وُہ دارالسلطنت، جہاں سے وُہ جلاوطن کئے گئے ہیں، اور جو اُن کے دینی روایات سے مملو ہے، اُس کے پشتینی دشمنوں کے ہاتھ میں ہو، اور اُن کے بنائے ہوئے ہیکل پر، (جس کو وُہ مقدس سمجھتے تھے، اور اُن کے دین کے موافق واقعی مقدس تھا بھی) ایک اور سُنہرا گنبد بنایا جائے۔ قدرتی قانون معاوضہ کی، جو انسانی قسمت کے مدوجذر کا نگران ہے، تعمیل ہو گئی۔ انتقام میں گو دیر لگی، مگر جب وقت آیا تو وہ سختی کے ساتھ لیا گیا۔

جو فوائد کہ مسلمانوں نے پہنچائے ہیں، بالخصوص قرون وسطےٰ میں، اُن سے گزشتہ صدی کے آخر تک ہمارے مورخین دانستہ چشم پوشی کرتے رہے ہیں، یا اُن کو کم کر کے دکھلاتے رہے ہیں۔ اسکی وجہ کمتر تو یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اس کا علم ہی نہیں تھا؛ مگر اکثر و بیشتر یہ ہے کہ اسلام کی عجیب و غریب سرعت ترقی کا اگر دوسرے مذاہب کی سُست رفتار سے مقابلہ کیا جائے تو ایک قسم کی رقابت و تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں کہ ہر شخص تشنۂ علم ہے، اور ہر شخص کو اُس کے حصُول کے ذرایع حاصل ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ اہالی کلیسا کی غیر مسامحت اسلامی سائینس کی شاندار ترقیات کے نور کو مکدر کر سکے۔ وُہ دن اب بہت دُور چلے گئے کہ جب ابن یونس جیسے ہیئت دان، المقری جیسے مورخ، ابن رشد جیسے فلسفی، ابن سینا جیسے طبیب اور ابن البیطار جیسے عالمِ علمِ نباتات کی محنتوں کو اس لئے مطعون کیا جائے کہ اُن کو مسیحی دینی کونسل نے منظور نہیں کیا، یا یہ کہ (جناب) تقدس مآب (حضرت) پوپ کی منظوری پہلے سے حاصل نہیں کی گئی۔

اگر کوئی شخص کسی دین کی تاریخ لکھے، یا کسی مذہب کی تفسیر کرے، تو اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک خاص شخص، یا خاص قوم، کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ پیغمبر اور شارع کی صفات اگر ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہو جائیں تو اُس کی شخصیت کا اثر اُس کی قوم کے رفتار و گفتار وغیرہ پر زیادہ پڑتا ہے۔ عبرانیوں کی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو وُہ کتابِ مقدس اور موسوی شریعت سے اس طرح شیر و شکر ہے کہ ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ ایران کا نام آتے ہی ژندواوستا اور زرتشت کے احکام چشمِ تخیل کے سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن مجید عملی طور پر جناب رحمۃ للعالمینؐ کی سیرت مُبارک ہے۔

حضورؐ کے رنج والم، حضورؐ کی بلند نظری، حضورؐ کی ناکامیوں، اور حضورؐ کی کامیابیوں کے اُس میں قصے ہیں۔ ملکِ عرب اس باشان وشکوہ امتیاز سے بڑھ کر کس چیز پر فخر کر سکتا ہے کہ وُہ ایک پیغمبر کا وطن، اور اُس دین کا گہوارہ ہے کہ جو صدیوں تک مذہبی مساحت، شاہانہ صولت وشوکت، علمی وسائنٹفک تحقیقات، ادبی قابلیت میں کوس لمن الملکی بجاچکا ہے، اور یہ تمام چیزیں اُس کی جزو لاینفک بنی ہُوئی ہیں، اور ان تمام چیزوں نے خوش بختی وشور بختی میں اُس کی اولاد کا ساتھ دیا ہے۔ ان لوگوں نے ابتدا ہی سے اپنے آپ کو شیوع تہذیب کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی فوج کے ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے کاریگروں کو آباد کیا، اُنہوں نے صنعت وحرفت کو ترقی دی، تجارت کا شوق دلایا، صنعت کے ہر شعبہ وہر صیغہ میں یہ کوشش کی کہ کلوں سے کام لیا جائے، اُنہوں نے علم ہیئت کی نشو ونما کی، وہی علم کیمیا و دواسازی کے موجد ہیں۔ اگر ایک طرف علما، علم نباتات دوائوں کی تلاش میں جنگلوں جنگلوں مارے پھرتے تھے، تو دوسری طرف علما، ریاضیات اپنی خلوت کدوں میں بیٹھے ہوئے الجبرا کے سائنس کو بڑھا، اور مکمل کر رہے تھے۔ جب کبھی کوئی نیا ملک اُنکے قبضے میں آتا تھا تو فوراً تمام میووں، تمام پودوں اور تمام جڑی بوٹیوں کی، جو تحقیقات سے غذا اور دوا کے کام کی معلوم ہوتی تھیں، ایک فہرست تیار کر لی جاتی تھی، اور اُن کا فاتحین کے ملک میں بطور خراج بھیجنا، اور اُن کا تقسیم کرنا لازمی قرار دیا جاتا تھا۔ اُن کے نزدیک سستی وکاہلی سخت ترین عیب اور محنت ومشقت نہایت تعریف کا کام تھا، یہاں تک کہ بادشاہ بھی اس سُنّت رسُول مقبُول صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے تھے کہ حضورؐ انور نے مدینہ شریف کی مسجد (جو دُنیا اسلام کا سب سے پہلا عبادتخانہ تھا) بنانے میں خود بنفس نفیس مدد فرمائی تھی۔ اُنہوں نے یونانی ورومی علما، کی تصانیف کا ترجمہ کیا، اور اُن کو فنا ہونے سے بچا لیا، اُنہوں نے شجر علم کی آبیاری کی، بعض اصُول وتمثیلات سے تحقیقات علمی کی ترغیب دی، حتےٰ کہ یہ جزو ایمان ہوگیا کہ قوار دماغی کی نشو ونما ویسا ہی فرض ہے جیسا کہ اوامر احکام دینی کی تعمیل +

زمانۂ قدیم میں یہ قاعدہ تھا کہ جتنے مفید کام تھے اُن کو جزو عبادت ومذہب بنا دیا جاتا تھا

تاکہ لوگ اُن کاموں کو فرض سمجھ کر کریں۔ اس طرح چونکہ وُہ حکم الٰہی سمجھ لیا جاتا ہے، اُس میں وُہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جو احکام انسانی نہیں پیدا کر سکتے۔ ایسی باتیں بادشاہ یا شارع کی دُور اندیشی اور قوت دماغی پر دلالت کرتی ہیں۔ یہودیوں میں رسم ختنہ، اہالی بابل و نینوا میں کشت کاری، مصر میں آبپاشی، کا فرض ہونا اسی بنا پر مبنی تھا۔ موخر الذکر ملک میں تو دریا نیل معبُود، اور فصلوں کا خالق اور قوم بھر کے رزق کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ جناب رحمۃ للعالمین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی نظر مُبارک سے ایسی باتیں اوجھل نہیں ہو سکتی تھیں، چنانچہ حضوُر نے بھی بہت سی ایسی باتیں قوم پر فرض کر دیں جن پر عمل کرنے سے صحت پر بہترین اثر پڑے اور دَیسے بھی ہر طرح نافع ہوں۔ حضوُر کے جانشینوں اور غلاموں پر اس کا اہم اثر پڑا۔

جب کسی قوم کے معتقدات اور اُس کے دینی میلان کو فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ بغور و خوض دیکھنا ہو تو یہ نہ بھُولنا چاہیئے کہ وہمیات کا تعدیہ، مناظر قدرتی کی شان و شکوہ کا اثر، اور آئے دن کے عجیب و غریب مظاہر قدرت کی وہشت اُس پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مصر سے عرب کے تعلقات ایک زمانہ بعید سے بہت ہی گہرے چلے آتے ہیں۔ ان کا اثر اہالی عرب پر اتنا پڑا ہے کہ وُہ کبھی اُن میں سے نہیں نکل سکتا۔ مقدم الذکر ملک کے دین کے موافق ایک ہستی تو اعلیٰ و اولےٰ تھی، باقی جتنے دیوتا یا دیویاں تھیں وُہ اُسی ہستی کے جبروت اور قدرت کاملہ کے مظہر تھے، جو مختلف ناموں کے پردے میں چھپے ہُوئے تھے۔ اُسی کی ذات سے ایک عجیب بوقلموں تثلیث نکلی ہے۔ دریا نیل کو تجسیم اُسی سے ملی؛ اُسی سے وُہ بے تعداد دیوتا پیدا ہُوئے جن سے دن، مہینہ، اور رات بنا ہے کہ زمین کی تمام قسم کی پیداواریں، مقدس مانی جانے لگیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے دیوتا ایک مشترک رُوحِ مجرد سے نکلے ہیں، اور آخر اُسی سے جا ملینگے رُوحِ انسانی کا بھی مختلف تناسخ کے درجات طے کرنے کے بعد یہی حشر ہوگا۔ یہ ایک ایسا راز تھا کہ مصری مقتدایان مذہبی اس کو نہایت سختی کے ساتھ چھپائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہی راز وہاں کے مشہور رازوں میں سب سے بڑا تھا۔ صابئین یمن، بوجہہ

تعلقاتِ تجارت، باشندگانِ وادیٔ نیل کے شاگرد ہو چکے تھے۔ وُہ ایک زمانۂ بعید سے خدا کے وجود، اور اُس کی قدرت مجسم، دیوتاؤں کے قایل تھے۔ یہ اصُول ممالکِ جنوبیہ کی طرف سے آیا تھا۔ بعثتِ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت مکہ بت پرستی کا مرکز بنا ہُوا تھا۔ وہاں کے بُت پرستوں میں یہی اصُول درپردہ کام کر رہا تھا، اور یہیں سے تمام جزیرہ نماءِ عرب میں پھیلا۔ جو عرب کہ زیادہ فہیم تھے وُہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کے پیرو بتلاتے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دین کی حقیقت تک سے ناآشنا تھے۔ اگر کچھ جانتے تھے تو صرف اتنا کہ وُہ موحد ہیں، اور ہر قسم کی بت پرستی سے نفور۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حنیف کہلاتے تھے۔ مانی کے مذہب میں ایک ظلماتی ہستی، بلقب اہرمن، ہے (یعنی ابلیس یا شیطان) جس کے بغیر موجودہ زمانہ کا کوئی مذہب مکمل نہیں ہو سکتا، عرب قدیم کے باشندوں میں اس ہستی کا خیال تک نہ تھا۔ یہ خیال غیر ممالک سے یہاں پہنچا۔ سامی اقوام کی کسی شاخ کو اس کا علم نہ تھا۔ غالباً یہ خیال کیم بی سس[1] کے ساتھ یہاں پہنچا۔ کیونکہ اُس نے بادیۂ عرب کی راہ سے حملہ کیا تھا۔ اگرچہ لفظ "ابلیس"، جو عرب میں مستعمل ہے یورو پین ہے؛ کیونکہ یہ یونانی لفظ DIABONOS کا بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انسان کے اخلاقی خیالات اور میلانِ افکار کی ساخت میں ہمسایہ ملک و قوم کا اثر تو ہوتا ہی ہے، مگر سب سے زیادہ اثر جس کا پڑتا ہے، وُہ اس سرزمین کی جغرافی حالت ہوتی ہے، جو انسان کا مرز و بوم ہوتا ہے۔ آدمی کی طبیعت اور شکل و صُورت میں مؤخر الذکر ہی اُس

[1] کیم بی سس CAMBYSIS میڈیا اور ایران کا بادشاہ تھا۔ یونانی اس کو کیم بی سس کہتے تھے اور ایرانی کمبوجیہ۔ ۵۲۹ ق م میں اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا، اور ۵۲۵ ق م میں مصر پر حملہ کر کے سے مے نی ٹس CEMENITUS بادشاہ مصر کو شکست دی، اور چھ ماہ کے اندر تمام ملک پر قبضہ کر بیٹھا۔ اپنی فتوحات کو اور آگے بڑھانا چاہتا تھا مگر اہالی ٹایر (دیکھو فونیشیا) نے اُس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ بحری مدد ان ہی سے پہنچتی تھی اس لئے یہ حسرت اُس کے دل ہی میں رہ گئی۔ ایک اور موقع پر اُس کی توجہ کو ناکامی ہُوئی۔ اس رنج میں اُس نے منشیات کا بے حد استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نشہ کی حالت میں اُس نے بے انتہا ظلم اہل مصر پر کئے۔ اسی اثناء میں ایران میں ایک اور شخص دعویدار سلطنت پیدا ہو گیا۔ اُس سے لڑنے کے لئے مصر سے چلا تھا کہ راستہ ہی میں ۵۲۱ ق م میں مر گیا۔ (مترجم)

اثر کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جو آب و ہوا اور وطن کی خضارت ولادت ڈالتی ہے۔ مولد و منشا کی جغرافی حالت جتنی اچھی ہوگی اتنا ہی آدمی کے جذبات میں تہیج، اور خیالات میں علو، پیدا ہوگا۔ ایشیا کو خدا تعالٰے نے اپنے محیر العقول مظاہر کا گہوارہ بنایا ہُوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کے دماغوں نے وُہ باتیں نکالی ہیں کہ جنہوں نے تمام دُنیا کے دل و دماغ کو اپنی مُٹھی میں لے لیا۔

حضور رحمۃ للعالمین، صلے اللہ علیہ وسلم، کی مولود مسعود سے ایک صدی پیشتر سخت ترین افسوسناک جہالت نے دنیا مسیحی کے منہ کو کالا کر رکھا تھا۔ جناب مسیح علےٰ نبینا و علیہ السلام کے دین کی حسن و خوبی و نرمی تشریف لے جا چکی تھی، اور اُس کی جگہ نہایت خوفناک جنون و تعصب دینی نے لے لی تھی۔ اُس کی قربان گاہیں زمانۂ کفر کی قربانیوں سے ناپاک، اور بت پرستی سے پلید ہو رہی تھیں۔ اُس کے مقتدایان مذہبی اتنے بداخلاق اور فاسق و فاجر ہو گئے تھے، کہ جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر دین و ملت یوں خراب ہوتے ہیں کہ اُن کے مقتدایان مذہبی حُبِّ جاہ و مال و دُنیا طلبی میں اپنے مکر و فریب سے بے تعداد فرقے بناتے ہیں؛ پھر ایک آفت و مصیبت برپا کر دیتے ہیں؛ شرمناک حرکتیں کرتے ہیں؛ اپنے مقابل کو سخت بے رحمانہ ایذائیں پہنچاتے ہیں۔ اگر اُن کے سامنے کوئی ایسی تدابیر پیش کی جائیں کہ فرقہ بندیوں میں کمی ہو، یا صلح و اسلوب کی کوئی راہ نکلے، تو اُس پر کان نہیں دھرتے۔ ہر ایک فرقہ کا ایک سرگروہ ہوتا ہے، جس کی نسبت اُس کے معتقدین کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وُہ رموز الٰہی کا کم و بیش عالم، اور اُس کا دل مہبط الہام ہے۔ بعض مباحث اپنی بیہودگی اور لغویت کے سبب سے اس قابل ہوتے ہیں کہ اُن کا جواب دینا ہی فضول ہے؛ تاہم یہ مباحث اکثر قتل عام سے طے کئے جاتے ہیں۔ اصُولِ انصاف اور قوانینِ اخلاق کو حقارت سے رد کیا جاتا ہے، اور اُن پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بجائے اس کے کہ یہ فرقہ مقتدایان مذہبی اپنے اتقا اور اپنے رفق و اعتدال کا نمونہ اپنے مقلدین کے سامنے پیش کریں، وُہ ہر روز اپنے سلب و نہب، شہوت رانی و قتل ناحق کی نمایش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا کہ کلیسا اپنی اصلی سادگی اور پاکیزگی کو چھوڑ

چکا تھا۔ مُنجی (حضرت مسیح علےٰ نبینا وعلیہ السّلام) کے صرف ایک سو برس بعد تک دین مسیحی ہر قسم کے بدعات سے پاک رہا۔ اپنی نسبتاً گمنامی، اور مسلمہ کمزوری کی وجہ سے، وہ جوشیلے نو عیسائیوں، یا پادریوں کی سیاسی تدابیر اور خود مطلبانہ تراکیب کے لئے کوئی بات بھی باعث تشویق نہ رکھتا تھا شروع شروع میں یہ لوگ گو مختلف جمہوری ریاستوں میں منقسم تھے، مگر بوجہ اغراض مشترکہ وُہ باہم وابستہ وپیوستہ تھے۔ اُن پر اُن ہی کے قانون کے موافق حکومت ہوتی تھی؛ اپنے ہی ذرایع آمدنی سے بسر اوقات کرتے تھے؛ اُن ہی کے پیشوایان مذہبی اُن کی دینی ضروریات کے کفیل تھے؛ اُن کو اپنے انتظام پر فخر تھا، ان ہی وجوہ سے اُن کا تمرّد ناقابل برداشت ہو گیا تھا، اور اُن کو اپنے تقدس پر گھمنڈ تھا۔ ان سب باتوں سے بت پرستوں کو اُن سے سخت نفرت پیدا ہوئی۔ اکثر بادشاہ بھی ان لوگوں سے ناراض رہے، اور اُنہوں نے ان کے معاملات میں دست اندازی کی۔ کہاں تو اہالی کلیسا نرم مزاج، حلیم الطبع اور تارک اللذات تھے، اور کہاں اُن میں فرقہ بندی ہو گئی، اور وُہ باہم دست وگریبان رہنے لگے، اور دغا وفریب کی آلودگیوں میں پھنس گئے؛ اُن کی مجالس دینی میں فریق مخالف کا خون بہنے لگا۔ اُن کی دینی کونسلوں میں پادریوں کے تنازعات سے وُہ شور و شغب مچتا تھا کہ کان بند کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ یہ تنازعات احقاق حق کے لئے نہ ہوتے تھے بلکہ محض حب جاہ ومال کے جھگڑے تھے۔ تثلیث کی بحث نے تعصبات کی وُہ آفت برپا کی کہ جسکا استیصال صدیوں کے امن وامان سے بھی نہ ہو سکا۔ جو لوگ کہ متعدد معبودوں کے ماننے والے تھے اُن کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ معاملات دینی میں ایذائیں دینا جایز ہو سکتا ہے۔ اُن کے مذہب کا اصل اصُول مساحمت عامہ تھا، اور وُہ اس کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے کہ عیسائی اپنے دین کے پھیلانے میں جبر وتشدّد سے کام لیں؛ اور یہاں ابتدا ہی سے یہ بات پیدا ہو گئی تھی۔ رہبانیت کے دُوسرے معنی ہیں جہالت، غیر مساحمت، شدّت۔ یہ لوگ تمام ملک اور تمام قوموں کے نہایت ذلیل آدمیوں کے عقاید وجذبات کے گویا مظہر ہوتے تھے۔ اسکندریہ اور نیسیّا[1] میں

---

[1] نیسیّا NICIA ایشیا کوچک کا ایک قدیم شہر ہے ۱۳۳۰ ق م میں پُرانے شہر کے کھنڈرات پر نہایت خوشنما شہر آباد کیا گیا۔ اسکی شہرت دو دینی کونسلوں کی وجہ سے ہوئی جو یہاں منعقد کی گئی تھیں۔ ان دونوں کونسلوں میں جن مضامین پر بحث ہوئی وُہ زمانہ حال میں سخت مضحکہ خیز ہیں ﴿ مترجم

ان ہی لوگوں نے اپنی زیادتی تعداد، اظہار شرارت وقساوت، اور جبر و تشدد سے لوگوں کو مذہب مسیحی کے بعض اہم مسایل واصُول کے ماننے پر مجبُور کیا۔ جتنے کلیسائی مفسدے ہوئے اُن میں راہبوں نے مکاری اور تعصب مذہبی ہی کو بڑھایا، اور اُسی کی تائید کی۔ چھٹی صدی کے راہب میں دو متضاد باتیں جمع تھیں؛ وُہ مقتدائے مذہبی بھی تھا، اور دنیوی حاکم سیاست دان بھی، وہ ولی بھی تھا، اور شیطان بھی؛ وُہ اگر خلوتکدۂ بادیہ میں جا نکلتا تھا تو ہزاروں تائبین کا گروہ اُس کی برکات کے طالب ہو کر اُس کو گھیرے رہتا تھا؛ مانا کہ یہ برکات مشکوک تھیں، مگر ہر شخص اُس کا متمنی معلوم ہوتا تھا۔ وُہ اپنے رفقاء کو (جو کلھاڑیوں اور پتھروں سے مسلح رہتے تھے) لئے ہوئے دارالسلطنتوں کی گلیوں میں بدامنی پھیلاتا پھرتا تھا؛ گو اُس نے دُنیا کو ترک کر دیا تھا بطوع خاطر اس دُنیا کی حماقتوں کو چھوڑ دیا تھا، مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وُہ اقتدار دُنیوی سے دست بردار ہو گیا تھا۔ کلیسا کی زمام، اور اُس کی پالیسی اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ اجتہادی معاملات میں جتنی ابحاث ہوتی تھیں اُن میں وُہی حکم قرار پاتا تھا۔ نظام کلیسائی کے قوانین وُہی بناتا تھا۔ اپنے فرقہ کے دعاوی کی پیروی میں اُس کو نہ سازش سے گریز تھا، نہ رشوت دینے سے نہ کسی اور شرمناک جرم کرنے سے۔ وُہ اکثر اسقفیہ میں کسی بڑے درجہ ورتبہ کا طالب ہوتا تھا، اور حاصل کر لیتا تھا۔ اپنی زیادتی تعداد، اپنے کٹاپن، اور اپنے فرقہ بھر کے اتحاد واتفاق سے وُہ تمام کلیسا پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ اُس کے اقتدار کا کم ہونا ناممکن تھا۔ جب تک کہ پوپ نے شاہی صولت اختیار نہیں کی تھی اُس وقت تک راہب ہی دُنیائے مسیحی کا قانون ساز اور مدبر اعظم تھا +

یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ اُس وقت کوئی مسلّمہ مرکزی کلیسائی حکومت نہ تھی۔ مگر ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک اس محکمہ کے لئے حکام شاہی الگ تھے۔ یہی حاکم دینی کلمات کفر کا مواخذہ کرتے، اور اُس کے موافق سزائیں تجویز کرتے تھے۔ ضبطی جائداد، جلاوطنی، مختلف قسم کی ایذائیں اور موت اُن لوگوں کی سزائیں تھیں جو اُن اصول دینی کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے، جو ہر بادشاہ کے وقت میں بدل جاتے تھے، اور وُہی اصول موقّتاً معیار دینداری ہوتے تھے۔ کسی دینی مسئلہ کے

حق اور صحیح ہونے کی شناخت یہ تھی کہ وہ سمجھ میں نہ آئے۔ اُس زمانہ میں، اور اب بھی، فلسفی دین کی دشمنی میں انگشت نما تھے۔ تمام سلطنت معاملات دین میں ڈر کے مارے کانپتی رہتی تھی۔ علماء مشکوک رہتے تھے، اور اُن سے لوگوں کو نفرت تھی۔ ہمسایہ اُن کی صحبت سے بھاگتے تھے۔ پادری بر سر منبر اُن پر لعنتیں بھیجتے تھے۔ مخبر سایہ کی طرح اُن کے ساتھ رہتے تھے، اور اُنہیں اپنے گھروں میں بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ کسی تدبیر سے شرارت کر کے اُن علماء سے کچھ کہلا لیا جاتا تھا، یا اُن پر یہ جرم لگا کر کہ وہ معاملات مذہبی میں سُستی کرتا ہے، ان غریبوں کو قید کرا دیا جاتا تھا۔ اُن کے کتب خانے کی کسی کتاب میں اگر ایک بھی فقرہ خلاف دین نکل آتا، تو اُن کا سزا موت سے بچنا ناممکن تھا۔ یہ صُورتیں ظاہر ہے کہ شیوع علم کو روکنے والی تھیں، اس لئے اس کے نتائج بہت ہی خوفناک نکلے۔ اشغال علمی جرم قرار دیا جاتا تھا۔ اس خوف سے کہ مبادا اُن پر مقدمہ قایم ہو جائے، بیش قیمت کتابیں خود اُن کے مالک جلا ڈالا کرتے تھے۔ ایسی آفات کی موجودگی میں کس کی مجال تھی کہ لب کشائی کرے۔ سوا پادریوں کے تقریر کرنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ فصاحت و بلاغت دکھلانے کی اگر کوئی جگہ تھی تو گرجا کا منبر۔ عوام الناس کے دلوں میں پادریوں نے تعصب کو اس طرح کوٹ کوٹ کر بھرا تھا کہ وہ معمولی سا مکتب قایم کرنے کے بھی مخالف تھے۔ تمام لوگوں کا فرض عین یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بالکل اندھے بنکر کلیسا کا احترام کئے جائیں، وہاں سے جو احکام صادر ہوں اُن کی تعمیل میں اگر ذرا سا بھی اہمال کریں تو دنیوی بے رحم فوج کے ہاتھ سزا پائیں، ان حکام دینی کا تقرر کچھ ایسے منحوس وقت ہوا تھا کہ آخر ایک ایسی شتر بے مہار، خود مختار اور مستبد حکومت دینی الگ قایم ہو گئی کہ جس کا مرافعہ کہیں نہیں ہو سکتا تھا۔

پوپ روم کا پنجۂ فولاد قدیم دار السلطنت میں اتنا ہمہ گیر نہ ہوا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا دیتا۔ اگرچہ یہ نئی حکومت ایسی تھی کہ اُس سے پہلے دُنیا بھر کی کسی حکومت کو یہ اختیارات کبھی حاصل نہ ہوئے تھے، جو اُس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے، اور جس نے انسانی عقل و دماغ کو اس بُری طرح مقید بزنجیر کیا ہوا تھا، یا انسانی خیالات کی آزادی کو اس بُری طرح شکنجہ

تھا جیسا کہ جناب پوپ نے۔ مگر ابھی تک اُن کے اختیارات اتنے وسیع نہ ہوئے تھے کہ وُہ اپنے احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرا سکیں۔ امورِ متنازع فیہ پر کونسلہا دینی نے ابھی اپنے فیصلہا آخر صادر نہیں کئے تھے۔ بطریق قسطنطنیہ اگرچہ بہت بڑا درجہ وُرتبہ رکھتا تھا، تاہم بطارقہ انطاکیہ اسکندریہ و کارتھیج، شان وشوکت اور رعب وداب میں اُس کے مدِمقابل تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ (بطریق قسطنطنیہ) بمشکل تمام اپنی حیثیت قایم رکھ سکتا تھا اور مذاق اُڑانے والے لوگوں سے اپنی تعظیم کراتا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ نہ ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کے سامنے یا بادشاہی دربار میں اپنی حیثیت قایم رکھ سکے۔ کیونکہ بعض وقت بادشاہ معاملاتِ دینی میں مذبذب ہوتے تھے، اور بعض وقت ظالم۔ اگرچہ ابھی تک نظام دینی نہایت سختی کے ساتھ ملکی محکمہ کے ماتحت سمجھا جاتا تھا، مگر خود اس محکمہ کی حالت بھی نہایت زدہ تھی۔ بیچارے بادشاہ کو اُسی کے محل میں کوئی نہ پُوچھتا تھا۔ اُس کے احکام سے دیدہ ودانستہ سرتابی کی جاتی تھی۔ سینٹ صوفیہ کا بڑا گرجا غدّارانہ سازشوں، نمک حرامانہ بے ایمانیوں اور شہوت رانیوں کا اکھاڑہ بنا ہُوا تھا۔ وہاں ہر قسم اور ہر قوم کے لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔ یہاں اگر کوئی حکومت تھی تو صرف راہبوں، خواجہ سراؤں اور بدکار عورتوں کی۔ آداب شاہی تکلیف دِہ تھے۔ اور ہر بات میں شان وشوکت کا اظہار تھا۔ دربار شاہی کپڑوں کی نمایش اور خفیف الحرکاتی میں تماشا گاہ معلوم ہوتا تھا۔ مسخروں، بازیگروں اور مفت خوروں سے دربار خالی نہ رہ سکتا تھا۔ بزدل، دوُرخی چالیں چلنے والے، زنخے اور بدمعاش اُن لوگوں کے قایم مقام تھے جن کو قومی عزّت وحرمت کا خیال تھا، اپنی قدر ومنزلت کا لحاظ تھا، اپنی مردانگی اور سپاہیانہ انداز پر ناز تھا۔ ابتدا میں یہی لوگ تھے کہ جنہوں نے سلطنت روم کو اس عروُج پر پہنچا دیا تھا۔ جہازوں کا شاہی بیڑہ چونکہ قزاقوں کی روک تھام نہ کر سکتا تھا؛ اور اُن کے حملے روز بروز بڑھتے چلے جاتے تھے، اس لئے بحری تجارت ہی جاتی رہی تھی۔

وحشی سپاہی نظام فوجی کے نام سے جلتے تھے، اُن کی خلاف ورزی قانون اور آئے دن

کے تقاضا بدیہی نے خزانۂ ملکی کے خالی کرنے میں کچھ کم مدد دی تھی۔ اس پر اندرونی فسادات نے زراعت کو غیر محفوظ اور غیر مفید بنا دیا تھا۔ کاشتکاری اگر کہیں ہوتی تھی تو صرف بڑے بڑے شہروں کے قرب و جوار میں، باقی تمام اراضی اُفتادہ پڑی رہتی تھیں۔ تمام صُوبجات، جو عروج سلطنت رومہ میں باغ بنے ہُوئے تھے، اس وقت ویران اور بنجر تھے، اگر کہیں سبزی تھی تو جھاڑ اور جھنکار، اور وہی کیفیت تھی جو ابتدا ئے خلقت میں ہوگی۔ سلطنت کے ہر صُوبہ میں وحشیانہ لڑائی کے نشانات ہر جگہ نمایاں تھے۔ سینکڑوں برس کی تہذیب کے آثار بالکل ناپید ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وُہ صورتیں بھی جاتی رہی تھیں جن سے وُہ ترقیات رونما ہوئی تھیں۔ سیاسی خرابی اور اخلاقی ذلت و خواری نے اُس سے زیادہ بربادی تباہی میں مدد دی تھی جتنی کہ جنگ نے دی۔ ایک زمانہ تھا کہ رومی رعایا ہونا ایسے فخر کی بات تھی کہ ممالک غیر کے شاہزادے اس کی تمنائیں کرتے تھے، تا بعوام چہ رسد، مگر اس وقت ان سب کا نام اُس فہرست میں سے کٹ چکا تھا، جس میں نام رہنا ہی تمام اقوام کی نگاہ میں باعث عزت تھا۔ سوسائٹی میں وُہ کشش باقی نہ رہی تھی جو تیاصرہ کے پُر تکلف زمانہ میں تھی۔ ارکین سلطنت و شرفاء شہر کے پاس نہ جاگیر رہی تھی، نہ جائیداد، نہ آزادی؛ مگر اُن کو بادل ناخواستہ شاہی وحشیانہ حذم و حشم کے ساتھ، اُس شہر میں سے گزرنا پڑتا تھا، جس نے اُن کی فضولخرچی، اُن کے ظلم اور اُن کے عیوب کا تماشا دیکھا ہوا تھا۔ جو غلام کہ بھاگ کر الارک※ یا اے ٹی لا#کی فوج میں پناہ گزین ہُوا تھا وُہ اُس محل میں بر سر حکومت تھا، جس نے اُس کی ذلت کا تماشا دیکھا تھا؛ اور اُس کی خدمت پر اُن لوگوں کی اولاد مقرر تھی، جنہوں نے چند ماہ پیشتر اس غلام کو اپنی بیرحمی و طمع کا تختۂ مشق بنایا تھا۔

※ الارک ALARIC اس نام کے دو بادشاہ الارک اوّل و دوئم گزرے ہیں۔ یہ دونوں خاندان ویزیگاتھ سے سپین کے حکمران تھے۔ دونوں بڑے بہادر اور فاتح تھے۔ پانچویں صدی مسیحی میں ہو گزرے ہیں۔ (مترجم)

اے ٹی لا ATTILA قوم ہنس HUNS کا نہایت مشہور اور ظالم بادشاہ تھا۔ پانچویں صدی میں ہو گزرا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہنس بھی تاتاریوں کی نسل میں تھے۔ (مترجم)

چونکہ تمام ملک رحم ناآشنا وحشیوں کا بار بار لگد کوب ہو چکا تھا۔ اِس لئے وُہ تباہی کامل کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہاں قوم گاتھ* اور لومبارڈ** کے ہر ہر نقشِ قدم پر انسانوں کی سفید ہڈیاں، منہدمہ شہر، تباہ شدہ کھیت اور آتش زدہ جھونپڑیاں ہی نظر آتی تھیں۔ زمانۂ قدیم کے خوبصورت مندر، جو بت پرستوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں سے بچ رہے تھے، یا تو خراب کر دیئے گئے یا مسخ۔ پُرانی صنعت کی وُہ یادگاریں، جو یونانی سنگ تراشوں کی مایۂ فخر و ناز تھیں، ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی گئیں، وہ گلدان، جو اپنی نفاست و نزاکت کی تعریف ہر گزید و روند سے کرا لیتے تھے، چاندی اور کانسی کے لالچ سے توڑ ڈالے گئے۔ وُہ باغات، جن پر دار السلطنت بجا طور پر فخر کرتا تھا، گاتھک رسالوں کے قدموں کے نیچے روند ڈالے گئے۔ اِدھر اُدھر کہیں کہیں شکستہ دیواریں اور ٹوٹے پھوٹے ستون زہرہ اور اپولو کے مندر کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ عوام الناس کے قوائے عقلی و دماغی اور جذبات بلند نظری کو دبائے رکھنا سلطنت کا ایک قاعدہ مستمرہ بنا ہُوا تھا۔ تعلیم کا کوئی انتظام سلطنت کی طرف سے نہ تھا۔ مزدور اور محنتی لوگوں کی ہر طرح ہمت شکنی کی جاتی تھی۔ کئی نسلوں سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ لوگوں کی خوراک اور سامانِ تفریح کا انتظام سلطنت کے ذمہ تھا، انسان کی جسمانی اور عمرانی حالت درست ہونے کا کوئی فکر نہ تھا، بلکہ اس کا سدِ راہ کیا ہوا تھا۔ چونکہ زندگی کی معمولی آسائشیں بآسانی بہم پہنچ جاتی تھیں اس لئے محنت و مشقت کی ضرورت ہی باقی نہ رہ گئی تھی۔ بادشاہِ وقت کی پدرانہ کفالت اور سخاوت کی وجہ سے کار و بارِ دُنیاوی کی دیکھ بھال، یا اُس پر غور و فکر بے ضرورت، ناگوار، ناشکر گزاری اور مخدوش فعل سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ ترقی کا کوئی نعم البدل ملنے کی امید نہ تھی۔

---

* ضمیمہ الف ملاحظہ فرمائیے۔ (مترجم)

** لومبارڈ LOMBARD اس علاقہ کو کہتے تھے جو آج کل اٹلی کہلاتا ہے۔ لومبارڈی میں سیوائے اور وینس شامل نہ تھا۔ ایک زمانہ میں یہ مستقل سلطنت رہی ہے۔ بعد میں فرانس وغیرہ نے اس پر سخت حملے کئے۔ یہاں کے لوگ بھی خوب لڑے مگر آخر ظلم و ستم کے شکار ہو گئے۔ یورپ میں اس چھوٹے سے ملک کی تاریخ بھی بہت دلچسپ سمجھی جاتی ہے۔ (مترجم)

اس لئے سوسایٹی اپنی ہستی کی نظام اساسی کی بندش میں آکر بہت تیز رفتاری کے ساتھ وحشت کی طرف بڑھی چلی جاتی تھی۔ تمام آبادی الگ الگ ذاتوں میں تقسیم تھی، مثلاً شرفا، عامی، سوداگر، سپاہی اور پادری۔ اُن کی تباہی میں اس تقسیم نے بھی کچھ کم مدد نہ دی تھی۔ دینداری کے فریب نفس اور آسایش و آرام کی اُمید پر تندرست و توانا آدمی گروہ در گروہ کاروبار دُنیاوی کو چھوڑ کر خانقاہوں میں داخل ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہاں سے وُہ یا تو اُس وقت نکلتے تھے کہ جب بُت پرستوں کے کسی مندر کو منہدم کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، یا جب کبھی پادریوں کے مجمع کا رعب ڈالنا مقصود ہوتا تھا، یا جب کبھی اہالی کلیسا کو کسی ایسے نیک فلسفی کو بیرحمانہ سزا دینی منظور ہوتی تھی کہ جو اپنے علم کی بنا پر کسی مرموز دینی مسئلہ کے سمجھنے سے عاجز ہوتا تھا۔ وُہ جری سپہ سالار جو سلطنت برطانیہ میں ایک معمولی افسر تھا، اور اب تخت شاہی کو سنبھال بیٹھا تھا؛ اور جس نے سیاسی پالیسی کی بنا پر ایک ایسے مذہب کا اتباع لازمی قرار دیا تھا کہ جس کی بنا ہی اوباشی اور عیاشی پر تھی، اس نے اُس کی زندگی کو گو تباہ کردیا، مگر اُس نے کم ازکم اپنی سپاہگری کو نہیں چھوڑا۔ اُس کی اولاد بالکل زنانی ہوگئی۔ وُہ جاہل تھے اور اُن کی توجہ نہ سپاہگری کی طرف مایل تھی نہ انتظام سلطنت کی طرف۔ کوئی عیب ایسا نہ تھا کہ اُن میں نہ ہو۔ اُنہوں نے زمام سلطنت خاین اور راشی غلاموں کے ہاتھ میں چھوڑ دی تھی۔ بادشاہوں کی نا قابلیت، پادریوں کی کبھی پُوری نہ ہونے والی طمع و آز، اور اجیر سپاہیوں کی آزادی سے تمام رعایا کی (جس میں کاریگر اور کاشتکاروں کا جزو زیادہ تھا) جایز خواہشات ترقی کی پروا نہ کی جاتی تھی اور اُن کو اُن کی قسمت کے حوالہ کردیا گیا تھا۔ چند ہی نسلوں کے بعد ذات پات کی قیوُد نے وُہ قیامت ڈھائی کہ فہیم و ذکی لوگوں کا وجود ہی اُڑ گیا؛ حالانکہ قومی صلاح و فلاح کے لئے اُن کی ہستی اشد ضروری ہے۔ جیسے جیسے لوگ بڑے رتبوں پر پہنچتے جاتے تھے، یہ قیوُد اور بھی بڑھی چلی جاتی تھیں؛ اور اس کا یہ انجام ہوا کہ نہایت اشراف و نبیل خاندان کے افراد جہالت میں انگشت نما ہوگئے۔ محل شاہی کی یہ کیفیّت تھی کہ کلیسا کے تعصب مذہبی نے

ہر قسم کے مفید اور بیش قیمت علم کو وہاں سے خارج کردیا تھا۔ شاہزادوں کی تعلیم اتاؤں اور خانگی خدمتگاروں کے سپرد کردی گئی تھی۔ ان کے زبون اثر سے اُن میں بہت ہی جلد توہمات، خوف اور غرور پیدا ہوگیا۔ یہی شاہزادے سلطنت رومہ کے آیندہ مالک ہونے والے تھے۔ مختلف اقوام کے میل جول سے ایک عجیب قسم کی دوغلی نسل پیدا ہوگئی، جن میں اپنے اپنے آباواجداد کے تمام عیوب موجود تھے۔ وحشیوں سے شیروشکر رہنے نے ایک اور بُری صورت یہ پیدا کی کہ ہومر* اور افلاطون کی شُستہ زبان گنواری بولی سے بدل گئی۔ ڈینیوب کے حلقی اصوات نے وادی نیل در رہون کے ناموزون آوازوں سے مل کر یونانی شاعروں اور مورخوں کی زبان میں ایک کافرماجرائی پیدا کردی۔ ایک غیر مسامح فرقہ دینی کے تعصبات اور متواتر کمزور بادشاہوں کی نامردی نے زمانہ قدیم کے فلسفہ وعلوم کے انداز کو بالکل کھودیا۔

سینٹ صوفیہ کے گرجا کی عمارت بیزنطینی فن تعمیر کا آخری نمونہ تھا۔ یہ فن بھی بوجہ عدم ممارست جاتا رہا۔ جو قدیم عمارات کہ ملک میں موجود تھیں اُن کی اینٹیں اور پتھر نکال کر دولتمند امرا اور باتکلف بطارقہ نے اپنے محلسرا بنا لئے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں صرف یہی خرابیاں نہیں تھیں، کہ جن کا رونا رویا جائے، علم کے برخلاف ایک باقاعدہ سازش ہورہی تھی۔ اس کا اثر اُن مقامات پر زیادہ تھا کہ جہاں تعلیم کی سخت ضرورت تھی، خواہ ناکمل اور ناقص ہی سہی۔ اگر تعلیم ہوتی تو لوگ کم از کم آثار قدیمہ کی قدروقیمت کو تو سمجھتے، اور اُن کو باقی رکھنے کا تو فکر کرتے جھلّی کا کاغذ بنانے کا فن، اور اُس کے علاوہ اور بہت سے مفید فن بالکل مفقود ہوگئے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریر کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم ملنے لگیں، اور جو ملتی تھیں وہ سخت گراں تھیں۔ راہب اس قدر سست تھے کہ کسی چیز کی اختراع کی طرف خیال کرنا اُن کے لئے مشکل تھا۔ البتہ اُن کا تباہ کن ہاتھ ہر جگہ اور ہر چیز پر پہنچتا

*ایک یونانی شاعر۔ (مترجم)

تھا۔ اُنھوں نے کاغذ کی کمی کو پورا کیا، اور بڑی خوبصورتی سے کیا، یعنی کتب خانہائے عام پر حملہ کیا اور اُن تمام قلمی کتابوں کو جمع کیا، جن میں زمانۂ قدیم کے علماء کے گوہر دل و دماغ جڑے ہوئے تھے، (ان ہی راہبوں کی عنایت سے اب اُن کتابوں کے نام اگر کہیں نظر آجاتے ہیں تو کتابوں میں) اُن کتابوں کے صفحات کو اُنھوں نے چھیل ڈالا اور اُس پر اپنے اولیاء اللہ کے خود ساختہ بیہودہ افسانے اور مشتبہ شہداء کے قصّے لکھ ڈالے۔ یہ امر کچھ خلافِ خیالِ غالب نہیں ہے کہ عہد نامۂ جدید (انجیل) کے اصل نسخے اس منحوس زمانہ میں ان جاہل راہبوں کے ہاتھ میں پڑ گئے ہوں، اور چونکہ یہ یونانی زبان نہ جانتے تھے اس لئے ان اصل نسخوں کا بھی وہی حشر ہوا ہو جو اور کتابوں کا ہوا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ بقول علماء دین مسیحی انجیل اور اسفار رسل کی تیس ہزار مختلف قراتیں کیوں ہیں۔ تہذیبِ روم کے سینکڑوں کبیر الشان آثار مثلاً اُن کے محلات، اُن کے مندر، اُن کے تماشا گاہ، اُن کے پل، اُن کی یادگارِ فتح محرابیں، اُن کے شاندار فورم*، اور اُن میں سنگ مرمر کے ستون، جن کے اوپر زمانۂ قدیم کے شجاعوں، فلسفیوں اور قانون سازوں کے صحیح بُت بنے ہوئے تھے، اُن کی فوجی سڑکیں، اُن کے محیر العقول تعمیری کام اور نہریں، اُن کی صنعت و حرفت کی یادگاریں، اُن کا کبھی فنا نہ ہونے والا علم ادب، اُن کے اصنام پرستی کے دور از قیاس قصّے، جنکو اُن کے بُت تراشوں نے زندۂ جاوید کر دیا ہے، اور اس وقت وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے اُن کے فصحاء و بلغاء کے وہ الفاظ جو اس وقت بیس صدیوں کے بعد بھی خون میں جوش پیدا کر دیتے ہیں، اُن کے فتوحات کا رعب و داب، اُن کے انتظامات ملکی، جو عام طور پر اُن کی روشن دماغی پر دال اور بیشتر اُن بنیادوں پر مبنی ہیں جو اب ہمیشہ نہایت کامیاب رہے ہیں، ان ذلیل و خوار بیہودہ نطیبوں کی نگاہ میں نہایت حقیر تھے۔ خصوصاً بلحاظ اُس اصلی صلیب کے

---

* فورم روم میں بازار یا عدالت کو کہتے تھے۔ یہ عمارتیں نہایت وسیع اور عمدہ اور خوبصورت ہوتی تھیں۔ (مترجم)

ٹکڑوں یا اُن مواعظ کے جو کسی ناپاک اور کٹّر راہب کی زبان سے تثلیث کے متعلق علم مابعد الطبیعہ سے مدد لے کر نکلے ہوں، یا جن میں اصوات کی دینی برکات بتلائی گئی ہوں۔

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں کلیسا اور سلطنت بیزنطینی کی یہ کیفیت تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ حبشیوں کی غارتگری، عمرانی خرابی اور مذہبی مباحث نے کلیسا اور سلطنت کی جڑوں کو بُری طرح کھوکھلا کر کے اُن میں بارود بھری ہوئی تھی۔ باوجود اس انحطاط کے سلطنت میں اب بھی روشن دماغی اور سیاسی انتظام کے آثار موجود تھے، جو حبشیوں کی فوج اور خلفاء متواترہ کی ملکی بدانتظامی کے دست برد سے کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے۔ تعجب ہوگا کہ یہ کیفیت اب بھی اُس ملک کی باقی تھی کہ جہاں بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے اور بعد اُن کی رفتار و گفتار رشوت و نجاست پر جذبات شہوت رانی چھائے ہوئے ہوں، اور اُس میں دنیا کے بدترین اشرار اور بدنام لوگوں کے تمام عیوب آ گئے ہوں۔ یورپ کو اگر دیکھا جائے تو وہاں کے معاملات اور حالات اور بھی افسوسناک تھے۔ قوم گاتھ* تمام یورپ اعظم کی مالک بنی ہوئی تھی۔ قوم ونڈال نے جزیرہ نمائے اندلس سے گزر کر اپنا قبضہ عظیم افریقہ کے سواحل پر گاڑ دیا تھا۔ اور سخت بے رحمیاں کر کے اپنا نام بدنام کر لیا تھا اور ہنی بال اور ہملکار کی اولاد کو سمندر اور ریگستان میں دھکیل دیا تھا۔ ایتھنز کا وہ مدرسہ، جو دنیا میں ایک ہی جگہ رہ گئی تھی کہ جہاں مسائل فلسفی پر بحث ہوتی تھی، اور طلباء آزادی کے ساتھ تحقیق و تدقیق میں مصروف رہتے تھے، ڈیڑھ سو برس پہلے ہی جسٹنین نے قفل لگوا کر بند کرا دیا تھا۔ قیاصرہ کی اولاد، جو اپنے شاندار ورثہ سے محروم کی جا چکی تھی، اور اتنی خوار ہو گئی تھی کہ اُن کی حالت بالکل باجگزاروں کی سی ہو گئی تھی، اُن وحشیوں کے سامنے [illegible] جاتے تھے جو چمڑے کے کپڑے پہنتے تھے، اور جرمنی کے جنگلوں اور بالٹک کے سواحل پر اتنی تعداد میں

---

* ضمیمہ ملاحظہ فرمایئے (مترجم)۔ ** ضمیمہ ملاحظہ ہو (مترجم)۔

آ گئے تھے کہ جس کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دیوتاؤں کے وُہ بت، جو زمانۂ اعظس کی بہترین صنعت کے نمونے
تھے، چبوتروں سے نیچے پھینک دیئے گئے تھے۔ جو طریقۂ بت پرستی وحشی اپنے ساتھ لے کر
آئے تھے اُس کی جگہ ایسی ذلیل جعلی مذہب مسیحی نے لے لی کہ جو اُتنا ہی قابل ملامت اور ویسا ہی
بت پرستانہ تھا جیسا کہ وحشیوں کا مذہب۔ روم دو مرتبہ لوٹا گیا۔ میلاؔن* میں گویا گدھوں کے ہل
چلا دیئے گئے۔ نہایت دولتمند بندر بالکل برباد ہو گئے تھے۔ اٹلی کے بہترین باغات اور کھیت
بنجر پڑے ہوئے تھے۔ اُن کی تمام شاہراہوں پر سوائے گھاس کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پُل تمام
ٹوٹ گئے تھے۔ اُن کا کیمپینیا#، جو کبھی دارالسلطنت کے قریب فردوس کا نمونہ تھا، اب زہرناک
دلدل بنا ہوا تھا۔ جس کے بخارات میں بیماری اور موت کا پیش خیمہ تھے۔ بدنصیب، فاقہ کش
اور اُس پر شریر رعایا، شہر اکثر بلوہ و غدر کرتی رہتی تھی۔ لیکن مغرور وحشی بادشاہ اُس کی اُس
وقت تک پروا نہ کرتے تھے کہ جب تک خود اُن کی جان، یا اُن کے تخت و تاج پر نہ بن آئے۔
جو تباہی کہ وحشیوں کی فتح سے شروع ہوئی تھی وُہ خانہ جنگی سے پُوری ہو گئی؛ جو ظلم و تشدد میں کسی
طرح کم نہ تھیں۔ فوج میں غدار بھرے پڑے تھے اور اُن کی وجہ سے سلطنت کو کسی طرح استقلال
نصیب نہ ہونے والا تھا۔ جو سلطنت کہ بسرِ تنزل ہوتی ہے اُس میں مخبر بمنزلہ وبا کے پھیل جاتے
ہیں۔ بیزنطینی دارالسلطنت کو ان ہی نے گھیرا ہوا تھا۔ ٹیکس سخت تھے۔ اور اُن کے وصول
کرنے میں سخت تشدد کیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جتنے دولتمند تھے وُہ سب مفلس ہوئے چلے
جاتے تھے۔ خفیف ترین بہانوں پر، بلا تمیز، قتل عام ہوتے رہتے تھے، جس سے غربا کو
بلا وجہ اشتعال ہوتا تھا۔ نہ وہاں نمک حلالی تھی، نہ قومی عزت؛ نہ بادشاہ رعایا کا محافظ تھا، نہ رعایا

---

* میلان MILAN لومبارڈی کا صدر مقام بڑی قدیم جگہ ہے۔ باوجود اس کے وہاں زمانۂ قدیم کے کوئی کھنڈرات نہیں رہے۔ حالانکہ اس کا دور آٹھ میل سے کم نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر پر فاتحین نے سخت آفات ڈھائیں۔ اس وقت یہ شہر مرفہ الحال ہے۔ یہاں ایک نہایت خوبصورت گرجا بنا ہوا ہے۔ (مترجم)

کیمپینا CAMPAGNA نواح روم میں ایک سو تیس میل مربع کے قریب ایک علاقہ ہے۔ کسی زمانہ میں نہایت خوشنما جگہ تھی۔ اب تباہ شدہ ہے۔ سوا دلدل کے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں کی آب و ہوا گویا پیغام موت سمجھی جاتی ہے (مترجم)

بادشاہ کی شکر گزار - جذبات سپاہگری، جو رومۂ قدیم کی خصوصیات میں داخل تھے، بالکل اُن میں سے جاتے رہے تھے - کسی زمانہ میں اُن کا نظام فوجی ضرب المثل تھا - مگر اس وقت بجاے اُسکے آزادی اور فتنہ انگیزی اُن کی خصوصیات میں داخل ہو گئی تھی - ممالک غیر کے حملوں کو روکنے کے لئے بیش قرار رشوت اور بیش قیمت تحفے دینے پڑتے تھے، مگر باوجود ان ہجوم مصائب کے، جس کا نتیجہ اُسی سوسایٹی کی تباہی کامل ہونے والا تھا جو پہلے ہی نیم جان ہو رہی تھی، ہر فرقہ و طبقہ میں کچھ مظلوم، لٹے کھسٹے، گمنام لوگ موجود تھے کہ جن کو کوئی غائر نظر شخص بمشکل پہچان سکتا تھا - ان لوگوں کے دلوں میں انقلاب کا ایک تلاطم تھا - جو مصایب کہ پے در پے پڑتے رہے تھے اُن سے عوام الناس بت پرستی اور مسیحی مذہب، دونوں، سے بد اعتقاد ہو چکے تھے - جو لوگ کہ انجیل سے واقف تھے، اور جن لوگوں کے نزدیک انجیل اور بُت پرستوں کی کتاب کی ایک حیثیت تھی، ایک مصلح کی آمد کے منتظر تھے، جس کو "فارقلیط"، یعنی "تسلی دہندہ"، کہتے تھے - اس مصلح کا انجیل میں بار بار وعدہ کیا گیا ہے؛ اور اس کا اصل کام یہ بتلایا گیا تھا کہ وُہ انسان کو پاک کر دے گا، اور اُن میں وُہ حقیقی حقانیت پیدا کر دے گا جو جناب مسیح علیٰ نبینا و علیہ السّلام کی اصل تعلیم تھی - اس پیشینگوئی کے پورا ہونے سے جن مادّی فواید کی اُمید تھی اُن کا ہر ایک فرقہ اُمیدوار تھا - ان منتظرین میں فرقہ ادریہ، سیرنتھی ان*، مان ٹے نسٹ** اور مالوسی تھے - ہر ایک کا یہ اعتقاد تھا کہ وُہ ہی پیغمبر موعود ہو گا - اور باقی تمام لوگ مکار - ایک معقول مستند روایت کے موافق کہا جاتا ہے کہ اصلی نسخہ انجیل برنباس میں لفظ Περικλυτός یعنی "شاندار" یا "جلیل" تھا نہ کہ Παράκλητος یعنی "تسلی دہندہ" - یہ تحریف زمانہ مابعد میں اس لئے کی گئی تھی کہ باطل دعویداران پیغمبری کی تعداد کو کم کر دیا جائے، کیونکہ ان مدعیوں کی وجہ سے طرح طرح کے خدشات پیدا ہو جاتے تھے،

---

* سیرنتھی ان CERINTHEAN عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے جسکو سیرنتھس نے قایم کیا تھا - اس شخص کو یہودی بتلایا جاتا ہے - عیسائی اسکو سخت مبغوض سمجھتے ہیں - ابتدا شیوع مسیحی میں پیدا ہوا - سکندریہ کے مدرسہ میں اس نے فلسفہ پڑھا تھا (مترجم)

** مان ٹے نسٹ MONTANIST یہ بھی عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے - اسکے مسایل عام مسیحیوں سے بہت مختلف ہیں (مترجم)

اور باعث تکلیف ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی فطانت و ذکاوت نے اس پیشینگوئی سے فایدہ اُٹھایا اور اُنہوں نے بروئے لغات اس کے یہ معنی بتلائے کہ شاندار یا جلیل کے سچے اور صحیح مصداق محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ کیونکہ اصل یونانی لفظ کا صحیح و صریح ہم معنی لفظ عربی میں موجود تھا۔ نہایت قدیم روایات کے موافق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ایک پیغمبر، موسومہ احمد یا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا انتظار ملک عرب میں ہو رہا تھا۔ انجیل کی اچھی طرح اشاعت ہو چکی تھی۔ ان وجوہ سے یہ ممکن ہے کہ ایک لفظ، جو ایسی نامعلوم زبان میں لکھا جاتا ہو جو کہ سے ہزارہا میل کے فاصلہ پر بولی جاتی ہو، نسل انسانی کے بہت بڑے حصّہ کی سیاسی اور دینی قسمت پر متاثر ہونے والا ہو۔

تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید عوام الناس کے سامنے ایسے عقاید کے پیش کرنے کا اس سے موزون تر موقعہ نہیں ہو سکتا تھا، کہ جن کے رو سے یہ دعوے کیا جائے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اصلاح ہے؛ اور اُس طریقہ عبادت کو ناپاکیوں سے پاک کرنا ہے جو ہزاروں برس سے مروّج چلا آتا ہے۔ عام طبایع انسانی پر یہ امر زیادہ آسان تھا، بہ نسبت اس کے کہ ایک بالکل نیا مذہب جاری کیا جائے جو سب چیزوں کو بدل دے؛ اس سے بحث نہیں کہ اُس سے نفع پہنچے یا نقصان۔ انسان کسی نئی وحی کے لئے گوش بر آواز تو رہتے ہیں، لیکن یہ نہیں چاہتے کہ موجودہ رسوم و قواعد و عقاید میں، جو مدتوں سے چلے آتے ہوں، تبدیلیاں کی جائیں۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اگرچہ عرب میں بے تعداد بت خانے، اور ڈھیر کے ڈھیر بُت تھے، مگر فی الحقیقت اُن کے کوئی بھی مذہبی عقاید ایسے نہ تھے کہ جو اُن کے دل میں گھر کئے ہوئے ہوں۔ اہالی عرب موجودہ مذہب، یا طریق عبادت، پر محض اس لئے عامل تھے کہ وہ ایک زمانہ بعید سے اُن کے ملک میں پھیلا ہوا تھا، نہ اس لئے کہ وہ اُس کو حق سمجھتے تھے، یا وہ معقول یا مفید تھا۔ اعزا کے حقوق، قیام حرمت قبیلہ اور انتقام لینے کے فرائض وہ باتیں تھیں کہ جن کا بدوؤں کو زیادہ لحاظ تھا، بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی، یا اپنے

بے تعداد دیوتاؤں کا ادب واحترام کریں۔ اُن دیوتاؤں کے اثر و خواص، اور کارخانۂ قدرت پر اُن کے موثر ہونے کے عقیدہ کو وُہ ایک زمانۂ بعید سے لغو سمجھتے تھے۔ وُہ اپنے دیوتاؤں کو ایک طرح کا کھلونا سمجھتے تھے کہ اُن کے سامنے نذریں پیش کر کے اُن کو خوش کیا جا سکتا تھا، اور اگر وُہ اُن کا کوئی کام نہ کر کے دیں، یا اُن کو مدد نہ پہنچائیں، تو اُن کو سزا بھی دی جا سکتی تھی۔ چونکہ ان بتوں سے وُہ ایک زمانۂ بعید سے خلا وملا رکھتے تھے اس لئے اُن کو ان سے وُہ خوف باقی نہ رہ گیا تھا، یا کم از کم اُن سے اُتنا نہ ڈرتے تھے کہ جتنا شروع شروع میں ڈرتے ہونگے۔ جیسے جیسے دُنیا ترقی کرتی چلی جاتی تھی اور عقل انسانی بڑھتی جاتی تھی، اُن کے عقاید دُھندلکے میں پڑتے چلے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ اگر اُن کی پابندی کی جاتی ہوگی تو صرف بادیہ نشین وہمی لوگوں میں۔ عام طور پر خاموشی سے، مگر نہایت سختی کے ساتھ، لوگ متعدد خداؤں کے خلاف تھے۔ جزیرہ نمار عرب کی تاریخ میں موجودہ وقت سے زیادہ کوئی وقت کبھی ایسا نہیں آیا کہ لوگ عام طور پر اتحاد و اتفاق پر مایل ہوں۔ عرب کے لئے بالخصوص، اور تمام ایشیا کے لئے بالعموم یہ وقت نہایت موزوں تھا کہ کوئی نیا دین پھیلایا جائے۔

یہ عجیب بات ہے کہ رسول عرب صلوٰۃ اللہ علیہ وسلام کے موہبت عظمےٰ، خصوصیات اور اخلاق وآداب سے، جو دنیا بھر میں شائع ہیں، لوگ عام طور پر بالکل جہل مرکب میں گرفتار ہیں، بالخصوص گروہ علما، اور وُہ لوگ کہ جن کی قابلیت عوام الناس سے بڑھی ہوئی ہے، حالانکہ لطف یہ ہے کہ ان امور کے معلوم کرنے کے لئے اتنی آسانیاں زمانۂ حال نے بہم پہنچائی ہیں کہ پہلے حاصل نہ تھیں۔ تاریخ عالم میں کوئی نام ایسا نہیں ملتا کہ جس پر ایسے سخت حملے دیندار متعصبوں، اور ادعائے عالم علوم دینی، نے کئے ہوں جتنے کہ جناب سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی پر۔ حضور اطہر واقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ حضور...... اور...... اور...... اور...... اور...... اور...... اور...... اور...... تھے۔ حضورؐ نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام قرآن ہے، جو از سرتا پا عیش ونشاط

کی تصویر ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ بہشت وُہ جگہ ہے کہ جہاں شہوت رانی کے تمام سامان بدرجہ اتم موجود ہیں (ونعوذ باللہ من ہذہ الہفوات ۔ مترجم) پہلے زمانہ میں عام لوگوں کی سادہ لوحی اور بھی کئی قدم آگے بڑھی ۔ گیارھویں صدی، بلکہ اس سے بھی بعد کے، عیسائی مصنّفین کی عادت تھی کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم جیسے سب سے بڑے بت شکن کو "جھوٹا دیوتا" بتلاتے تھے۔ حالانکہ آپ نے فاتحین کے رحم سے آتش پرستوں اور بت پرستوں کو مستثنےٰ نہیں فرمایا تھا۔ پھر وُہ زمانہ آیا کہ حضوُر کو کفریات پھیلانے والا کہا گیا۔ اور یہ بتلایا گیا کہ اس جرم میں آپکو سزا ہوئی۔ ڈانٹے نے اپنی غیر فانی تصنیف میں لکھا ہے کہ

× × × × × × اس کے بعد تو جہالت کی بیہُودگی انتہا پر پہنچ گئی ۔ یعنی حضوُر کی ذات اقدس و اعلےٰ کو اونٹوں کا چرانے والا، اور مرتد پادری بتلایا گیا، جو پوپ نہ ہو سکا، اس لئے آپ نے اپنا عناد یوں نکالا کہ خود ساختہ اصوُل کی اشاعت کی! کلیسائی رشک وحسد اور مذہبی غیر مساحت اس کا باعث ہوئی کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی کسی کو اطلاع نہ ہونے دی جائے، اور اُس میں جو صداقتیں ہیں اُن کا بطلان کیا جائے۔ بمشکل دس ہزار آدمیوں میں سے ایک نے بھی قرآن مجید کا ترجمہ نہ پڑھا ہوگا؛ بلکہ لوگوں کو اس کے دیکھنے سے یہ کہہ کر منع کیا گیا کہ اس کتاب کی نشر اور ترتیب ایسی ہے کہ اُس کا پڑھنا ناممکن ہے۔ غیر ملکیوں میں سے لاکھوں آدمیوں میں ایک آدمی نے بھی اصل نسخہ نہ دیکھا ہوگا ۔ اس کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اُس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں صحیح طور سے ہو ہی نہیں سکتا ۔ جناب سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے گیارہ سو برس بعد تک اس مشہور و معروف کتاب کا مکمل ترجمہ کسی زندہ زبان میں نہیں کیا گیا۔ آج بھی اگر دیکھا جائے تو کُل بارہ زبانوں سے زیادہ میں اس کا ترجمہ نہ ہوگا ۔ ماسوا اسکے یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، جس کے مستثنیات بہت ہی کم ہونگی، اور اگر ہونگی تو زمانہ حال کی، کہ قرآن شریف کے ترجمے، تفاسیر اور خلاصے کفار نے کیئے ہیں، جن کی غرض و غایت صرف

یہ ہے کہ جناب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے غلاموں سے انتقام لیا جائے یا بدنام کیا جائے۔ ایسے ناموافق حالات میں غیر طرفدار ہو کر اصول اسلام پر منصفانہ غور و خوض کرنا ناممکن ہے، خاص کر ایسی حالت میں کہ آدمی عربی نہ جانتا ہو اور اُس کے دل پر وہ مضامین منقوش ہوں جن کو اُس نے گرجا کے منبروں پر، پادریوں کی زبان سے سُنا ہو۔ ایسا آدمی تو اُن باتوں کو ماننے کا ہی نہیں جو اُن باتوں سے مختلف ہوں جو اُس کے دل میں بٹھائی جا چکی ہیں۔ جو دین کہ حضور اقدس واعلےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے قایم کیا ہے اُس کے اصول، محاسن و نقایص کا کسی قدر تصور پیدا کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے واسطے حضور جیسے عجیب و غریب آدمی کی رفتار و گفتار اور حالات پر نظر ڈالنا نفع بخش ہو گا۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ حضور اپنے ملک کے نہایت ممتاز آدمی تھے، اور اپنی قوم کے نہایت مشہور و معروف شخص۔

عرب کے قدیم قبایل میں سے قبیلۂ قریش نہایت عالی مرتبت، شاعروں اور سپاہیوں کے نزدیک اپنی ذہانت اور ہمت و استقلال میں والا منزلت، مہمان نوازی میں مشہور دور و نزدیک تھا۔ یہی قبیلہ مکہ کے بُت خانہ کا متولی تھا؛ اور اپنے باشان و شکوہ آبا و اجداد پر اُن کو ناز اور اپنے عظیم الشان منصب تولیت پر جو بادشاہی سے کچھ کم نہ تھا، اُن کو فخر تھا۔ ایسے ملک کے تمام مشاغل میں یہ منصب بہت جلیل القدر ہونا بھی چاہئیے کہ جس کے افراد اپنی غیرت آزادی میں کسی بادشاہ کی صولت کو نہ مانتے تھے۔ قریش کا اثر و اقتدار اپنے اہالی ملک پر بالکلیہ مطلق العنان تھا۔ سالانہ حج بیت اللہ اہل عرب کے واسطے تمام سال کا خلاصہ اور ایسا اہم موقعہ ہوتا تھا کہ جب عناد و فساد معطل ہو جاتے تھے؛ زہاد اور تجار، شاعر اور قزاق، بت خانۂ کعبہ کے احاطہ میں مساویانہ ملتے تھے۔ یہ وہ موقعہ ہوتا تھا کہ جب جزیرہ نمائے عرب کے درخشندہ ترین قلوب یہاں جمع ہوتے تھے، اور ادبی انعام و شہرت کے لئے ایک دوسرے سے دوستانہ منافسہ و مقابلہ کرتے تھے۔ یہ موقعہ قبیلۂ قریش کی دولت و عظمت

واقتدار کے لئے باعث استحکام ودوام ہوتا تھا۔ بعض قبایل کو، بلاشراکت غیری، یہ حق حاصل تھا کہ وُہ حجاج کے زمانۂ قیام میں اُن کو سامان خورد و نوش بہم پہنچائیں۔ فی الاصل ابتدا میں تو یہ خدمت بلامعاوضہ کی جاتی تھی، مگر بعد میں یہ نفع بخش اجارہ ہو گیا تھا۔ دوسرے کے تحت تصرف میں اس بُت خانہ کی عمارات تھیں۔ کوئی اُس عَلَم کا محافظ تھا، جو کعبہ کے میلہ کے موقعہ پر، یا اُس وقت، نکالا جاتا تھا کہ جب جنگ یا کسی نمک حرامی کی وجہ سے مکہ معرض خطر میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ قبیلہ قریش، چھوٹے پیمانہ پر، حق بادشاہی کی ہوا بھی اپنے سر میں رکھتا تھا۔ وُہ ہمسایہ قبایل میں سفارتیں بھیجتے تھے، معاہدے کرتے تھے، اُن قافلوں کی آمد و رفت، کوچ و مقام کے ضوابط مقرر کرتے تھے، جو گرد و پیش کی اقوام سے منظم و نفع رساں تجارت کیا کرتے تھے، تمام جزیرہ نما عرب پر معاملات دیوانی و فوجداری و مذہبی میں برا، تام اختیارات حکومت رکھتے تھے۔ اپنی کامیابیوں اور اُس عظمت و اقتدار پر غرہ ہو کر، جو عام طور پر اُن کی کی جاتی تھی، وُہ دلیرانہ بہت سی قدیم مراسم عبادت کو موقوف کر دیتے تھے اور اُن کی جگہ وُہ طریقے رکھ دیتے تھے جن سے اُن کو مالی فواید پہنچیں، یا اُن کی سیاسی بلند نظری کو پُورا کریں۔ ان میں سے بعض ضوابط بالکل غیر منصفانہ ہوتے تھے؛ اور جیسا کہ بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے، وُہ لوگ اُن کو بادلِ ناخواستہ قبول کرتے تھے جو نئی باتوں کے مخالف اور کسی قسم کی پابندی کے معاند تھے۔ یہ امر کہ ان جدید باتوں کو لوگوں نے بغیر کسی فتنہ و فساد کے تسلیم کر لیا، اس بات کی دلیل محکم ہے کہ عربوں کو اپنے بتوں سے وُہ وابستگی نہ تھی کہ اُس رعب سے اُس کا تناسب لگایا جا سکے جو بظاہر اُن کے با اختیار محافظین کو اُن پر تھا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ متضاد خیالات کی رقابت سے باہمی بے اعتباری اور عداوت شروع ہو گئی، مخالفتیں روز بروز بڑھتی چلی گئیں، اور قریش کا قومی اثر، جو اُن کے معابد کے دلی اتفاق سے قایم رہ سکتا تھا، بہت زیادہ نقصان پذیر ہونے لگا+

اس ممتاز قبیلہ کی نہایت مشہور شاخ بنو ہاشم میں سنہ ۵۷۰ مسیحی میں محمد (بابی و امیّ) پیدا ہوئے، جن کو کفار جھوٹا پیغمبر کہتے ہیں اور مسلمان رسول اللہ۔ ایک عجیب سرگزشت، جو غیر متیقن روایات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ کسی قدر واقعیت پر موقوف ہے، آپ کے خاندان کے متعلق بیان کی جاتی ہے، جس کا اثر حضورؐ کے مولود مسعود سے پہلے اور بعد میں پڑتا ہے۔ آپ کے دادا عبد المطلب کے گھرانے میں کئی لڑکیاں تھیں۔ مگر لڑکا ایک ہی تھا*۔ عرب جیسے ملک میں جہاں ایک قبیلہ کے سردار کی سرداری اولاد نرینہ پر منحصر ہو، جہاں عورتوں کا شمار گھوڑوں، اونٹوں اور گھر کے برتنوں کے ساتھ ہو اور جہاں اکثر لڑکیوں سے نجات پانے کے لئے اُنہیں زندہ گاڑ دیا جاتا ہو، وہاں یہ صورت موجب ذلت اور بدقسمتی سمجھی جاتی تھی۔ عالم یاس میں شیخ کعبہ گئے، اور اپنی قوم کے سب سے بڑے بت ہُبل سے استمداد کی۔ اُنہوں نے دعاؤں کے بعد یہ نذر کی کہ اگر اُن کے یہاں دس لڑکے پیدا ہو جائیں گے تو اُن میں سے ایک کو وہ اُس بت پر بھینٹ چڑھاوینگے*۔ دُعا قبول ہو گئی، اور وہ وقت آ گیا کہ بے رحم فرض مذہبی کے ادا کرنے کے لئے اُنہیں اپنی نذر پوری کرنی پڑی۔ چنانچہ عبد المطلب اپنے بیٹوں کو پھر ہُبل کے سامنے لے گئے، اور جو قرعہ مقرر تھا وہ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بت مذکور نے عبد اللہ کی بھینٹ مانگی۔ یہی عبد اللہ بعد میں جناب سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کے والد بننے والے تھے۔ عبد اللہ والدین کے عزیز بیٹے، اور اپنے اعزا و اقارب کے چہیتے تھے؛ اُن کی باتیں ایسی تھیں کہ ہر شخص اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا؛ فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی میں وہ اپنے قبیلہ کے نہایت قابل لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے؛ اُن کے ہموطن اُن کے حسن مردانہ کی مبالغہ کے ساتھ تعریفیں کرتے تھے۔ عبد المطلب اپنے عزیز ترین بیٹے کی جان سے

---

* نہ معلوم مسٹر سکاٹ کو یہ قصہ کہاں سے مل گیا۔ غالباً اُنہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس معاملہ میں بیٹوں کا کہیں ذکر نہیں ہے بلکہ اعراب قدیم میں یہ دستور تھا کہ وہ دسویں بیٹے کو بت پر قربان کر دیتے تھے۔ اتفاق سے حضور رحمۃ للعالمین کے والد ماجد حضرت عبد اللہؓ اپنے باپ حضرت عبد المطلب کے دسویں بیٹے تھے اس لئے اُن کو بھینٹ چڑھانے کا ارادہ کیا گیا، نہ اس لئے کہ حضرت عبد المطلب نے یہ نذر کی تھی۔

(مترجم)

صبر کرنے کے خیال سے کانپ اُٹھے۔ ایک کاہنہ کی عقلمندی سے اُن کی ان مشکلات میں مدد کی۔ قاعدۂ مقررہ یہ تھا کہ قتلِ عمد کی دیت میں خاندان مقتول کو دس اُونٹ دیئے جاتے تھے۔ کاہنہ نے یہ رائے دی کہ عبدالمطلب پھر ہُبل سے مشورہ کریں، اُمید ہے کہ وہ مساعدت کرے، اور کم قیمت بلدان لے کر خوش ہوجائے۔ فال کے تیر پھر چلائے گئے، مگر دوسری مرتبہ پھر عبداللہ ہی پر قرعہ پڑا۔ باپ نے اُونٹوں کی تعداد دوگنی کردی، مگر وہی نتیجہ ہوا۔ لیکن عبدالمطلب بے دل نہیں ہوئے وُہ برابر اسی دُھن میں لگے رہے یہاں تک کہ دسویں بار دیوتا نے یہ قیمتی فدیہ قبول فرمایا۔ یوں صرف ایک قرعہ پر قوم عرب نے نیا جنم لیا؛ اُس ہی ایک قرعہ پر سلطنت بیزنطین و ایران کی فتح اور پامالی، زمانۂ حال کی سائنٹفک تحقیق و تفحیص کی بنیاد، اور دُنیائے اسلام کی آئندہ اُمیدوں کا انحصار تھا!

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد پیدا ہُوئے۔ آپ کے والد نے اثنائے راہِ مدینہ میں انتقال فرمایا تھا، اور اپنی بیوہ کے لئے بجز اپنی نیک خانگی زندگی کی یاد، اور مردانہ ہمت، اور بے عیب راست معاملگی کی شہرت کے، اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ جیسا کہ مکہ والوں کا دستور تھا حضوؐر کا بچپن بادیہ کے ایک قبیلہ میں گزرا۔ یہاں کی موٹی جھوٹی خوراک، اور بدوؤں کی طرح ہر وقت کے چلتے پھرتے رہنے سے آپؐ کے جسم مُبارک نے نشوونما اور تقویت پائی، جو قدرتاً صحیح و تندرست اور مضبُوط تھا۔ پانچ برس کی عمر میں آپؐ اپنی والدۂ ماجدہ کے گھر پھر واپس رونق افروز ہوئے؛ اور چند ماہ کے بعد آپؐ بالکل یتیم رہ گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپؐ کے دادا عبدالمطلب آپؐ کے کفیل ہوئے۔ مگر دو برس کے بعد اُنہوں نے بھی داغ مفارقت دیا۔ اس کے بعد حضوؐر اپنے چچا ابوطالب کے خاندان میں تشریف لے گئے۔ اعزا کی متواتر و مسلسل اموات نے آئندہ مبعوث ہونے والے پیغمبر کے خصوصیات بننے میں کچھ کم اثر نہیں کیا۔ آپؐ کی طبیعت پہلے ہی بہت غور و فکر کرنے والی واقع ہوئی تھی۔ آپ الگ تھلگ تو رہتے ہی تھے؛ اب یہ عادت مستقل ہو گئی، اور اس میں

ایک طرح کی اُداسی کا سا رنگ پیدا ہو گیا۔ جب آپؐ اور بڑے ہوئے تو آپ کے چچا نے آپ کو چرواہے کے کام پر لگا دیا۔ اہل عرب اس پیشہ کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور اس کے لئے صرف غلاموں اور عورتوں ہی کو موزون سمجھتے تھے۔ آپؐ کو چھبیسواں[۲۶] سال تھا کہ آپؐ کے قوت و صحت جسمانی، اور جمال دلفریب، اور آپؐ کی شہرت دیانت نے، (جس کی وجہ سے آپؐ "امین" کہلاتے تھے) خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی توجہ کو اپنی طرف مایل کیا۔ ممدوحہ ایک دولتمند بیوہ تھیں اور حضورؐ سے بہت دور کا رشتہ رکھتی تھیں۔ اُنہوں نے آپ سے نکاح کرنا چاہا اور آپ نے منظور فرما لیا۔ حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضورؐ کے نکاح میں آپ پچیس برس زندہ رہیں۔ اس عرصہ میں یقیناً اُن میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی ہو گی؛ مگر اس عرصۂ بعید میں حضور اقدس و اعلیٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے وہ فرائض پوری طرح انجام دیئے جو ایک نیکدل اور محبّت کرنے والے شوہر پر ناگزیر پڑتے ہیں۔ حضرت خدیجہ سے حضورؐ کی چھ اولادیں ہوئیں۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے؛ مگر چار لڑکیاں ہی بچیں۔ جب حضورؐ کی عمر شریف چالیس برس کی ہوئی تو آپؐ کی ذات مبارک میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی، اور سب سے پہلے آپؐ نے اپنے ملک کی موجودہ بت پرستی سے سخت نفرت کا اظہار فرمایا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپؐ کی والدہ ماجدہ کی طبیعت بہت جلد برافروختہ ہو جانے والی تھی؛ والدہ کی طرف سے یہ صفت آپ میں آئی۔ اس سے آپ کے اعصاب پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ آپ پر ام الصبیان کا دورہ ہونے لگا۔ جو اکثر مردوں کو ہو جایا کرتا ہے۔* (نعوذ باللہ من ہذہ الہفوات الواہیہ) چونکہ حضورؐ نے ایک مدت مدید سے کمال اتقاء اور تدبر و فکر میں بسر کی تھی، اس لئے آپؐ کو تخلیہ کی عادت پڑ گئی تھی اور اسی تخلیہ میں آپ اپنی اور اپنے ہموطنوں کی حالت پر غور فرمایا کرتے تھے۔ جب عمر شریف اور بڑھی، اور حضرتؓ خدیجہ

---

* محض لغویت اور پادریوں کے اقوال ہیں + (مترجم)

+ غلط ہے۔ نبوت تو حضرت خدیجہؓ کی زندگی ہی مل چکی تھی + (مترجم)

کے انتقال کے بعد آپؐ کو محنت و مشقت کی ضرورت نہ رہی، اور ضروریات زندگی سے
گونہ فراغت ہوئی تو آپ کو خواب آنے لگے۔ آپؐ اکثر کوہ حرا پر تشریف لیجایا کرتے
تھے، جو پہلے بھی آپ کا خلوت کدہ رہ چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دفعتاً کئی کئی روز
تک بے خواب و خور، بچشم پرنم، سخت کرب و اضطراب کی حالت میں، معمائے حق کی کشود
کاری اپنے ناخن حکمت سے کرنے کی کوشش فرماتے تھے مسلسل روزوں، جوش دلی،
تخلیہ اور غور و فکر کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے تصورات کا ذوبہ*۔ بہت جلد یہ ہوا کہ حضورؐ کو خیال
پیدا ہو گیا کہ میرے پاس ایک فرشتہ خدا تعالےٰ کا پیغام لیکر آتا ہے۔ ان عجیب و غریب
خوابوں کی اصلیت سے ابتداءً آپ مشتبہ تھے۔ محنت و افکار شاقہ سے آپ دُبلے ہو رہے
تھے، اس لئے آپ ڈر گئے اور آپ نے یہ سمجھا کہ مجھ پر جن سوار ہے؛ حتےٰ کہ آپ خودکشی
پر آمادہ ہو گئے۔ آخر آپؐ نے بجبر اپنے حواس کو درست کیا اور مکہ تشریف لے آئے۔
اُس وقت جبرئیل کی آمد و رفت آپ کے پاس زیادہ ہو گئی۔ وحی اوّل میں حضورؐ بخطاب
"رسول اللہ" مخاطب کئے گئے۔ اور یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے غلط کار اور گمراہ ہموطنوں
کو توحید کی تعلیم و تلقین کریں۔ آپ کے دست مبارک پر ابتداء میں بہت ہی کم لوگوں
نے اسلام قبول کیا۔ جو لوگ مسلمان ہوئے اُن میں آپؐ کے رشتہ دار ہی تھے۔ آپؐ
کی حرم محترم، حضرت خدیجہؓ، سب سے پہلی مسلمان تھیں۔ نئے دین کی ترقی کی رفتار
نہایت سُست تھی؛ سخت اندیشہ یہ تھا کہ سلاطین ہمسایہ کہیں اُن کے معاملات میں
دست اندازی نہ کریں۔ اس لئے وہ دروازے مقفل کر کرکے، اپنے گھروں کے تخلیہ
کے کمروں میں کلام الٰہی کی تلاوت کرتے تھے۔ چار برس گزرنے کے بعد مسلمانوں کی حقیر
تعداد اُنتالیس پر پہنچی۔ اس عرصہ میں حضورؐ بھی کچھ بیباک ہو گئے تھے، اور کعبہ کے
سامنے وعظ و تلقین فرماتے تھے، صاف طور پر بت شکنی کی تعلیم دیتے تھے، مشرکین

---

* لاحول ولا قوة الا باللہ (مترجم)

عرب کو جہنم کا امیدوار بناتے تھے۔ جناب مصلح اعظم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے خطبات، اور فصاحت و بلاغت نے پہلے تو چنداں اثر نہیں کیا، کیونکہ حضور کے سامعین یہ کہتے اور سمجھتے تھے کہ آپ کے اوپر کسی جن کا اثر ہے، بعض آپ پر پھبتیاں کستے تھے، بعض بدنام کرتے تھے، مگر آپ کے خاندان کی عظمت وحرمت اور انتقام کشی کے ڈر سے آپ پر کسی نے دست درازی نہیں کی۔ آپ نے نہایت فصاحت کے ساتھ جنت کے سرور اور لطف، اور جہنم کے عذابوں، کی تصویریں کھینچیں، مگر عرب جیسے شکی لوگوں پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُن کا مذہب ہی ایسا تھا کہ پشت ہا پشت سے چلا آتا تھا اور بطور رسم اُن میں مروج تھا۔ اور سامی اقوام کی طرح اُن سب کا یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں، جزا و سزا کوئی چیز نہیں۔ آخر آپ کی تہدیدیں اتنی بڑھ گئیں کہ قریش کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اُن کے سیاسی تفوق کو نقصان پہنچ رہا ہے، اور بلحاظ تولیت کعبہ جو فوائد اُن کو حاصل ہوتے تھے وہ معرض خطر میں ہیں۔ مختلف قبایل کے بڑے بڑے تابعین جمع ہو کر شیخ قریش، ابوطالب، کے پاس پہنچے، اور اُن سے یہ درخواست کی اپنے برگشتہ مزاج بھتیجے کو بدلہ لینے کے لئے اُن کے ہاتھ میں دیدیں۔ ابو طالب گو خود بت پرست تھے، مگر انہوں نے بے تامل اس سے انکار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام خاندان بنو ہاشم سے تعلقات قطع کر لئے گئے، نہ کوئی شخص اُن کے ساتھ بیع وشرا کرتا تھا، نہ اُن سے ملتا جلتا تھا۔ دو برس تک وہ شہر کے ایک حصہ میں گویا مقید رہے، اور بہت ہی سختیاں برداشت کیں۔ اہل عرب کی اپنے خاندان کے ساتھ وابستگی اور انتہا خودداری کا بین ثبوت اس ایثار سے زیادہ نہیں ہو سکتا، جو اس وقت انہوں نے دکھلایا، کیونکہ یہ نہ بھول جانا چاہئیے کہ جن لوگوں نے اس وقت تکلیفیں برداشت کیں اُن میں سے بہت سے لوگ وہ تھے کہ جو جناب سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر اعتبار نہ رکھتے تھے بلکہ بدستور بت پرست تھے، اور اپنے قدیمی وحشیانہ مذہب پر قایم تھے +

مقاصد اسلام کو سخت صدمہ پہنچا۔ مخالفین دھمکیاں دیتے تھے اور مسلح ہو کر مقابلہ کے لئے تیار تھے۔ یہ صورتیں نئے دین کے لئے سخت مضر تھیں۔ غیر قریش مسلمانوں نے عیسائی بادشاہ ابی سینیا کے پاس جا کر پناہ لی۔ مکہ سے ایک سفارت وہاں پہنچی۔ مگر بادشاہ مذکور نے مسلمانوں کو اُن کے حوالہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ آخرکار سخت شرمندگی کے بعد جو قیود کہ بنو ہاشم پر لگائی گئی تھیں وُہ اٹھالی گئیں، اور گروہ مقیدین ایک مرتبہ پھر باہر نکلے اور شہر والوں سے پھر ملنے جلنے لگے۔ جو لوگ کہ جلا وطن ہو گئے تھے اُن کو بھی واپس آجانے کی اجازت دیدی گئی۔ اس ایذا رسانی کا یہ نتیجہ نہیں ہوا کہ جناب سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ ڈر جاتے؛ بلکہ حضور نے اور بھی سختی کے ساتھ بت پرستی کے خلاف وعظ فرمانا شروع کیا۔ اُدھر گروہ مشرکین کی سختی اور عداوت بھی بڑھتی چلی گئی۔ اس عرصہ میں چونکہ آپؐ کے چچا، اور مربی، ابوطالب، کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے آپ کی حالت روز بروز اور بھی نازک ہوتی چلی جاتی تھی۔ یکایک خوش بختی نے مساعدت کی، اور بہت ہی جلد بھاگ نکلنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ چند سال پیشتر مدینہ کے معدودے چند آمیوں نے خفیہ طور پر حضورؐ کے اصول دین کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور اُنہوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر بطور روحانی بادشاہ کے بیعت کر لی تھی، اب ان لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ان ہی پرجوش غلاموں کی دعوت پر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں کے زغہ سے نکل کر مدینہ کے محفوظ مقام میں تشریف لے جانے کا ارادہ فرما لیا۔ مدینہ کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ اہالی مکہ اُن کو بہت ہی بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک تمام پیشے، سوا جنگ، سلب و نہب، اور زائرین کو دھوکا دینے کے، باشندگان عرب کے لئے معیوب تھے۔ اہالی مدینہ کے اسلام قبول کر لینے میں اُس رقابت کو بھی بہت بڑا دخل ہے جو حجاز کے ان دونوں شہروں میں اس طرح چلی آتی تھی کہ کبھی ختم ہونے والی نہ تھی۔ مدینہ میں بہت سے یہودی رہتے تھے؛ اُن کے مذہب نے وہاں بہت کچھ اثر ڈالا تھا۔ اُن کی پیشینگوئی

تھی کہ ایک مسیحا بہت جلد آنے والا ہے؛ نیز یہ کہ اُس کے آنے پر بت پرستوں کے تمام مال و منال اُن کو مل جائینگے۔ اُن کے اس قول سے اہلِ مدینہ کو اس طرف خیال پیدا ہو گیا تھا، اور وہاں کے بت پرست اپنے ہموطن یہودیوں سے ڈرے ہُوئے تھے۔ اس لئے جب اُن کو مکہ میں ایک پیغمبر کے مبعوث ہونے کی خبر ملی تو اُن لوگوں نے فطرتاً یہ خیال کیا کہ یہ وہی مسیحا ہے جس کے یہودی منتظر ہیں۔ انھوں نے یہودیوں سے پیش قدمی کر کے حضورؐ کو اپنے یہاں لے آنے کا تہیہ کر لیا، تاکہ حضورؐ کے مراحم سے مستفیض ہوں۔ یہ وجوہ تھیں کہ جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے۔ فریقین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے نتایج کیسے اہم نکلنے والے ہیں، جن کو صدیہا آیندہ کے مہتم بالشان واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس سے بہتر تدبیر ہو ہی نہ سکتی تھی۔ جب اس کی خبر قریش کو پہنچی تو انھوں نے ایک فیصلہ کن کارروائی کا قصد کیا۔ ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، اور اُس میں یہ طے پایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے۔ بظاہر یہ کوشش نہیں کی گئی تھی کہ اس مجلس کی کارروائی کو پوشیدہ رکھا جائے۔ حضورؐ کو وقت پر اسکی اطلاع ہو گئی، اور آپ اپنے دوست ابوبکر (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کو ساتھ لے کر رات کے وقت مکہ سے نکلے اور پہاڑ کی ایک کھوہ میں چھپ رہے۔ چند روز کے بعد مدینہ پہنچنے کے اسباب مہیّا ہو گئے۔ حضورؐ کے دشمنوں نے بہت کوشش کی، مگر نہ اُن کو پتہ لگا، نہ روک تھام کر سکے۔ یہ واقعہ سنہ ۶۲۲ عیسوی کا ہے۔ اسی واقعہ سے سنہ ہجری شروع ہوا۔ مسلمانوں کی تاریخیں اسی سنہ سے لی جاتی ہیں۔ تین سو برس تک یہ سنہ استعمال ہوتا رہا اور مفید پایا گیا، مگر اس کو قانونی حیثیت دسویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام تعمیر مسجد کا کیا، تاکہ شعائر اسلام ادا کئے جا سکیں۔ دُوسرا کام یہ کیا کہ دو مخالف گروہ عرب میں صلح کرائی جن کے شور و شغب سے شہر میں ایک آفت بپا رہتی تھی۔ تیسرا کام یہ تھا کہ یہودیوں کو مسلمان کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بمقابلہ اپنے ہموطنوں کے اس وقت تک حضورؐ اقدس و اطہر نے

زیادہ عورتوں کی طرف توجہ نہ فرمائی تھی لیکن مدینہ منورہ میں پہنچتے ہی آپ نے کئی نکاح کئے۔ حتیٰ کہ ازواجِ مطہرات کی تعداد بیس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تبدیلیاں دینی اور سیاسی قسم کی کی گئیں۔ کہاں تو واعظ کا سا صبر و حلم تھا، اور کہاں اب شاہانہ بلند نظری اور اولوالعزمی پیدا ہو گئی٭ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومیں کی قومیں مسلمان ہوتی چلی گئیں، اور ممالکِ غیر کی فتح کا نشہ سروں میں سما گیا۔ مکہ میں جبر و تشدد کا خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن وہاں کی برسوں کی ایذائیں، ذلتیں اور شرارتیں یہاں آکر بارور ہوئیں، جن کے ثمرات مشرکین عرب نے یہاں سے چکھے اور اُنکو سخت کڑوا پایا۔ مدینہ منورہ میں سب سے پہلی وحی آئی کہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلایا جائے۔ پہلے تو قافلوں پر چھوٹے چھوٹے حملے ہوئے، اُن کے بعد جنگ بدر ہوئی، جس میں تین سو مومنین نے ایک ہزار مشرکین کو شکست فاش دی۔ پھر جنگ اُحد ہوئی جس میں حضور والا صلے اللہ علیہ وسلم کو چشم زخم پہنچا، اور مسلمانوں نے سخت ہزیمت اُٹھائی۔ تین برس کے بعد صنادید مکہ نے مدینہ کے محاصرہ کی تیاری کی، مگر اس میں اُنہوں نے سخت منہ کی کھائی، کیونکہ آتش مزاج عرب اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ وہ انتظار کی زحمت اُٹھائیں، اور محاصرہ کے لئے سُست بیٹھے رہیں۔ اس کے بعد یہودیوں کو شہر سے نکالا گیا۔ اس میں ناانصافی بھی ہوئی اور جبر بھی، لیکن ضروریات سیاسی اسی کی مقتضی تھیں۔ اب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا رعب و اقتدار دن دگنا رات چوگنا بڑھ رہا تھا، قبیلے کے قبیلے حضور کے علم کے نیچے جمع ہوتے چلے جا رہے تھے، دُور دُور کے بادشاہ آپؐ کی خدمت سراپا برکت میں قیمتی تحائف بھیجتے تھے، اور اپنی طرف سے حلیف بننے کی درخواستیں کرتے تھے۔ ۶۳۰ء (۸ ہجری) میں حرم پر قبضہ پانے اور مکہ کو فتح کرنے کی تیاریاں کی گئیں۔ ابھی کل ہی کی بات تھی کہ حضور اقدس و اعلیٰ صلے اللہ علیہ وسلم دو جان نثاروں کو ساتھ لے کر اس مقدس شہر سے بھاگے تھے، سرِ اقدس کے لئے مشرکین عرب کی طرف سے سو اُونٹ اور پاؤ بھر سونے کا انعام مقرر تھا۔ آج حضورؐ بتزک شاہانہ دس ہزار جانباز بہادروں

٭ ان خیالات کے اظہار میں مسٹر سکاٹ معذور سمجھے جانے چاہئیں۔ (مترجم)

کو ہمراہ لئے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ یہ دس ہزار آدمی وُہ تھے کہ جو حضورؐ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں حضورؐ پر نثار کرنے کو تیار تھے، اور حضورؐ کو سچا رسول خدا مانتے تھے (صلے اللہ علیہ وسلم) اتنی بڑی فوج کا، جو جوش مذہبی سے سرشار تھی، مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے یا حرم میں پناہ لی، اور حملہ آور فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ شہر والوں کے حقوق اور جایداد کا احترام کیا گیا، نہ قتل عام ہوا نہ لُوٹ کھسُوٹ، نہ کسی پر جبر و تشدد کیا گیا، سوا اسکے کہ کعبہ کے بتوں پر دست درازی ہوئی؛ اِدھر شہر پر قبضہ ہوا اور اُدھر کعبہ کے بت توڑے گئے۔ اس فعل سے کوئی شخص مانع نہیں ہوا، نہ کسی نے مخالفت کی۔ بت پرست اپنے بتوں کے ٹوٹنے پھُوٹنے، تباہ و برباد ہونے کا تماشا بچشم خود دیکھ رہے تھے؛ کیونکہ وُہ لوگ دیکھ چکے تھے کہ جن چیزوں کو وُہ پشتہا پشت سے اپنا محافظ سمجھتے آرہے ہیں، جن کو وُہ صدیوں سے پُوج رہے تھے وُہ آج بالکل ناکارہ نکلے اور اُن کو بچا نہ سکے۔ یہ عالی حوصلگی تھی کہ اعلان عام کر دیا گیا کہ ہر شخص کی تقصیرات معاف ہیں۔ صرف چار آدمیوں نے سزا موت پائی، کیونکہ اُن کے جرم ہی ناقابل معافی تھے صدیوں کی کافرانہ مراسم سے کعبہ ناپاک ہو رہا تھا، اُس کو پاک کیا گیا؛ کیونکہ اب وُہ مسلمانوں کے دین کا جزو اعظم بننے والا تھا۔ مکہ معظمہ کے قرب و جوار میں جتنی قربانگاہیں بتوں کی بنی ہوئی تھیں سب صاف ہو چکیں تو حضورؐ نے اُن قبایل کو زیر کرنے کی طرف توجہ فرمائی جو اب تک حضورؐ کے مخالف چلے آتے تھے۔ اس کے لئے صرف ایک جنگ کی ضرورت تھی۔ طایف ہی ایک ایسا اہم مقام رہ گیا تھا کہ جو مخالف چلا آتا تھا۔ اُس کا ناکام محاصرہ کیا گیا؛ مگر اُس نے از خود اطاعت قبُول کر لی اس کے بعد تمام جزیرہ نما عرب پر حضورؐ کا اقتدار قایم ہو گیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضورؐ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب وقت اخیر نزدیک ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے تین ماہ بعد حضور اطہرؐ نے ایک جم غفیر کو لیکر حج کیا، جو حضورؐ کی تعلیمات کے موافق حضورؐ کے ہر غلام پر فرض ہے۔ اس مرتبہ مکہ معظمہ کو آخری مرتبہ چھوڑ کر حضورؐ نہضت فرما مقام ہجرت ہوئے۔ یہاں کے لوگ حضورؐ کے اعزا و اقربا سے زیادہ فیاض تھے۔ مکہ کے لوگوں کے ہاتھوں سے تنگ آکر جب حضورؐ نے اُن کی طرف رُخ کیا ہے تو اُنہوں نے نہایت

ناپاک سے حضورؐ کو لیا، اور ہر قسم کی محافظت وخدمت کی۔ باوجود اسکے کہ حضورؐ کا لطف وکرم ان پر مبذول تھا، مگر یہ لوگ جب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو اسی ادب وانکسار کے ساتھ جو ایک پیغمبر اور خارق العادت انسان کے شایان شان ہوتا تھا۔ ہر قسم کی پرہیزگاری اور سادہ خوراک سے گو حضورؐ کے قویٰ بہت مضبوط تھے، مگر چند سال سے ضعف کے آثار معلوم ہونے لگے تھے۔ کیونکہ آپؐ کی صحت اس زہر سے متاثر ہو چکی تھی جو ایک یہودن نے حضورؐ کو دیا تھا، مگر حضورؐ کی رحمت عامہ نے اس کو سزا نہیں دینے دی تھی۔ غرض چند روز کی علالت کے بعد جون ۶۳۲ء میں حضورؐ نے اپنی حرم محترم عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں وصال فرمایا۔

اس تماشاگاہ عالم پر عظیم الشان آدمیوں میں سے بہت ہی کم ایسے ہو گئے جن کے واقعات زندگی اتنی تفصیل کے ساتھ لوگوں نے محفوظ رکھے ہوں جیسے کہ جناب سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ اگرچہ کسی ملکی ہمعصر نے ان حالات کو قلمبند نہیں کیا، مگر حضورؐ کی حیات طیبہ کے متعلق بے حد تفصیل موجود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ کوئی شخص آپؐ جیسا نہ ہوگا کہ جس کے جوہر ذاتی نے دنیا کو انتہا عروج پر پہنچا دیا ہو، مگر حضورؐ کے کارناموں اور سیرت حسنہ کے متعلق عیسائی ناظرین کتب پوری طرح ظلمات جہالت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو حضورؐ کی نسبت صرف اتنا علم ہے کہ حضورؐ ایک کامیاب .... تھے*، بہت سے ایسے ہیں جو اب تک حضورؐ کو بت پرست سمجھتے آرہے ہیں، قریباً تمام عیسائی حضورؐ کی ذات اقدس واعلیٰ کو ان معایب سے متہم کرتے ہیں جو انسان کو قعر ذلت میں گرا دیتے ہیں مثلاً بے رحمی، طمع وآز، بداخلاقی وغیرہ۔ انتہا ہے کہ وہ وائسرا (نائبین سلطنت) بھی جو مدتوں اسلامی ملک میں رہ چکے ہیں مصلحین عالم میں آپؐ جیسے جلیل القدر مصلح اور قانون ساز کے اصول اور سیر سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ حضورؐ کے حلیہ شریفہ، حضورؐ کے مذاق، اور اس سے بڑھ کر مسلمان مورخین کی دیانت وامانت اور صدق نیت کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ کی

---

* خاک شاں بدہن (مترجم)

کمزوریوں کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لوگوں نے مذاہب نکلتے ہیں اُن کی اصلیت گمنامی کو نہیں چھوڑا۔ جو اقوال و آرا کہ حضور کی طرف سے منسوب ہیں وُہ زور، غلامی، یا خدمتگاری پیشہ ہیں ہیں۔ دیندار مسلمان آیات قرآنی کے بعد اُن ہی کا درجہ سمجھتے اور اُن کا ادب کرتے رہے ہیں عرب کی حیرت انگیز تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی، مگر مشکوک روایات کی بنار پر شارحین نے سخت محنت و مشقت کرکے اُن کو کاٹ چھانٹ کر چار ہزار ایسی احادیث قرار دیں جو قابل اعتبار اور اصلی ہیں۔ لیکن بہ نسبت غیر متیقن اور مشکوک شہادت سُنّہ کے اگر قرآن مجید کا مطالعہ بغور کیا جائے تو اُس سے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ طیبہ اور سیرۃ حسنہ کا اچھی طرح پتہ چل سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس میں مصنّف* کے وُہ صحیح اعتقادات، بلند ہمتی، سیاسی تجربات، خانگی تکالیف اور امید و بیم منعکس ہوتے ہیں جن کی وجہ سے باوجود امتحان شاقہ اور تکالیف شدیدہ کے حضوؐر کے دل پر وُہ اثر پڑا، اور حضوؐر اُس راستہ پر چل پڑے، کہ مکہ کے ایک معمُولی باشندہ کی حیثیت سے گزر کر آپ عربستان کے، بلا مشارکت غیرے، بادشاہ ہو گئے۔ احادیث وُہ چیزیں ہیں کہ حضوؐر کے اُن ابتدائی فیض صحبت یافتہ لوگوں کی زبانی منقول ہیں، جو حضوؐر کو اچھی طرح جانتے تھے، اور حضوؐر کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست کو اُس وقت سے دیکھتے تھے کہ جب آپؐ معمُولی گمنام آدمی تھے۔ ان احادیث سے جو تخمینہ حضور اکرم کی ذات عالی صفات کی نسبت لگ سکتا ہے وہ اُن رائوں سے بہت زیادہ قابل اعتبار ہے جو ایک صدی بعد علمار نے، خواہ وُہ کتنے ہی عالم ہوں، بلا امداد ان احادیث کے حضور کی نسبت قایم کی ہیں۔ لیکن کتنی بدقسمتی ہے کہ بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ شارحین مابعد نے احادیث میں ایسی افسانہ نما باتیں داخل کر دی ہیں کہ تاریخی اعتبار سے اُن کی قدر و قیمت بہت کچھ گھٹ گئی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا جوہر استقلال تھا۔ جس وقت سے کہ

*** قرآن شریف کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں (مترجم)

تپاک سے حضورؐ کو لیا، اور ہر قسم کی محافظت ... خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا تھا کہ آپؐ کو خدا، مگر یہ لوگ جب حضورؐ کی [illegible] ہے؛ اور سالہا سال حضورؐ کا مذاق اُڑایا گیا، حضورؐ کو اذیتیں دی گئیں، [illegible] سازشیں کی گئیں، حضورؐ کو جلاوطن ہونا پڑا؛ اس سے بھی زیادہ امتحان کا وقت وہ آیا کہ حضورؐ کو ترقّی حاصل ہوا اور سلطنت پائی۔ غرض ان تمام کیفیات سے لے کر حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے آخری صدمۂ جان گزا تک، حضورؐ نے اپنا یہ نصب العین اپنے سامنے رکھا، اور کسی وقت اور کسی حالت میں اُس کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ بُت پرستی کا بیخ و بُنیاد سے قلع قمع ہو جائے، آپؐ کے ہموطن ترقی کر کے انتہاء عرُوج پر پہنچ جائیں، اور توحید جیسا رفیع المکان اور فلسفیانہ اصُول پھیل جائے۔ باوجود اُن مشکلات اور مصایب کے کہ اگر کسی معمُولی دل و دماغ کے فانی انسان کو پیش آتے تو وُہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ رہتا، حضورؐ کے قابل الذکر تدابیر اور کامیابی کا اگر کوئی عقلی جواب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ حضورؐ کی ذات والا میں کُھلی کُھلی صداقت و دیانت تھی۔ حضورؐ کی حقانیت، اعتماد ذات اور زہد و ریاضت کی اس سے زیادہ قابل اعتبار شہادت نہیں مل سکتی کہ حضورؐ کے سب سے پہلے معتقدین ذی رُتبہ اور صاحب عقل و تمیز اصحاب تھے؛ اور اُنہوں نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضورؐ کی تعلیمات کو قبوُل کیا۔ اور جتنے مذاہب تاریخ میں مذکور ہیں اُن میں جتنے لوگ پہلے ہی پہلے ایمان لائے ہیں وُہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ تھے؛ اُن کے پاس نہ مال و منال تھا، نہ وُہ اپنے خاندان پر فخر کر سکتے تھے، نہ اس قابل تھے کہ عوام الناس اُن کو بنگاہِ ادب دیکھتے۔ وُہ وعظ و پند کرتے تھے تو ایسی زبان میں جو محاورہ کے خلاف اور قواعد صرف و نحو سے خالی ہوتی تھی؛ اس لئے لوگ اُن پر مذاق اُڑاتے تھے۔ اُن کی سادہ لوحی پر فلسفی اور مذاہب غیر کے معتقد اُن پر ہنستے تھے۔ ابتداء میں جو لوگ حضرت مسیح (علیٰ نبینا وعلیہ السّلام) پر ایمان لائے اُن پر بھی یوں ہی پھبتیاں اُڑتی تھیں (گو یہ بات پورے طور پر ثابت نہیں ہوئی)۔ جو لوگ کہ ایمان لائے ہیں اُن میں سے زیادہ تعداد ملاح

عہدیوں اور بھکاریوں کی ہوتی ہے۔ زمانۂ حال میں جو مذاہب نکلتے ہیں اُن کی اصلیت گمنامی کے دھندلکے میں ہے، اور اُن کے معتقدین چھوٹے درجہ، اور غلامی، یا خدمتگاری پیشہ ہیں۔ لیکن ابتدائی غلامان رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت نہ تھی؛ وہ سب صنادید عرب، اور مغرور خاندانوں کے ارکان تھے؛ اُن کی نسل چھ سو برس تک مسلسل سب کو معلوم تھیں؛ وہ چونکہ پشتہا پشت سے بت خانۂ کعبہ سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے تھے، اس لئے اُن کو جزیرہ نمائے عرب میں ایک رعب و اقتدار حاصل تھا۔ قومی طریقۂ عبادت کو برقرار رکھنے، اور اُس میں کسی نئی بات کو داخل نہ ہونے دینے میں اُن کو اس لئے اور بھی تعصب تھا کہ کہیں اُن کے اختیارات اور آمدنی میں کمی نہ آجائے۔ اُن کے پاس دولت بھی اُن کے خاندان، اُن کے سیاسی اقتدار، اور مذہبی رعب و داب سے کچھ کم نہ تھی۔ ان میں سے بعض تو مکہ کے نہایت دولتمند آدمی تھے۔ جتنے یہودی مسلمان ہوئے تھے وہ ذہانت اور جزورسی میں اپنی قوم کی خصوصیات رکھتے تھے۔ یہودیوں کی آبادی میں اُن کی سب سے زیادہ قدر تھی۔ اسلام کی کامیابی نے بلاشک و شبہ اس امر کو ثابت کر دیا کہ جو لوگ ابتدائً ایمان لائے وہ فنون سیاسی میں اُتنے ہی ممتاز تھے، جتنے کہ جنگ کے سائنس میں۔ اسلام کے قیام میں کامیاب رہنے کے لئے عقل و ہنر کی بہت ضرورت تھی؛ اور اس سے زیادہ اُن صدمات کو روکنے میں جو اُس کے دوام کے خلاف کئے گئے۔ اِن نو مسلمانوں کے بے انتہا نیک خصایل اس امر کے کافی ثبوت ہیں کہ اُن کے اغراض نہایت پاکیزہ، اور اُن کے اعتقادات بے حد مخلصانہ تھے۔ اگر کوئی ایسا آدمی، جو لوگوں سے ہر وقت اختلاط رکھتا ہو، وحی و الہام کا دعوےٰ کرے، تو اُس کے گہرے اور گاڑھے دوست اُس کو ماننے کے لئے بمشکل تیار ہوتے ہیں۔ کسی مذہبی معلم و مقنن کو اس صورت میں زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے کہ وہ دور رہتا ہو، اور اُس کی تعلیمات میں کچھ خفیہ اور

مرموز باتیں ہوں۔ نہ اس طرح کہ اُس کا اپنے معتقدین کے ساتھ ہر وقت خلا ملا ہو اور اُن لوگوں کو روز اُس کو آزمانے اور دیکھنے کا موقعہ ملتا ہو۔ یہ مقولہ غلط العام ہے کہ اسلام بجبر اور بزور شمشیر پھیلا ہے، گو اس میں شک نہیں کہ اسلام کے قیام میں فوجی کامیابی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ عرب میں تلوار کی بہت بڑی قدر تھی۔ اس ملک میں لوہا پیدا نہیں ہوتا، اس لئے جس لوہے سے تلواریں بنائی جاتی تھیں وُہ بڑا قیمتی ہوتا تھا۔ اس ہتھیار کے جو ہزاروں نام ہیں ان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ عربوں کی نگاہ میں بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا؛ اور جو لوگ کہ اُس کو استعمال کرتے تھے اُن کے نزدیک وُہ بڑی قدر و قیمت رکھتا تھا۔ اہلِ عرب کے سپاہیانہ جذبات کا اگر مجسم ہونا ممکن ہو تو اُن سے تلوار کی صُورت پیدا ہو جائے۔ تلوار اُن کی مآل زندگی تھی؛ تلوار اُن کے قزاقانہ جذبات کی محرک تھی؛ تلوار اُن کے باعث فخر و مباہات روایات کی شان کو دوبالا کرتی تھی؛ تلوار کو اُن کے یہاں ایک عجیب روحانی اہمیت حاصل تھی۔ شدہ شدہ اس نے مذہبی صُورت اختیار کر لی، اور اعتقادِ عامہ کے موافق اُن کے حاضر و ناظر، مگر نظروں سے غایب، دیوتاؤں کو اس کا استعمال کرنا بہت ہی پسند تھا۔ یہ خیالات مُسلمانوں تک پہنچے، اور اُنہوں نے ایک حد تک اُن کے جوش اور اُن کے حمیت و غیرت اور عزم و ثبات میں ہیجان پیدا کر دیا۔ لیکن بہر حال جبر و تشدد اور زور شمشیر وُہ چیزیں نہیں ہیں کہ جو ایک پُر آشوب اور وحشی قوم کے جم غفیر میں، جو مل کر کسی کام کرنے کے عادی نہ تھے، اور جو نظام فوجی کی پابندی کرنے والے نہ تھے، یہ کامیابی پیدا کر دے کہ وُہ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں تین عظیم الشان اور جلیل القدر سلطنت کو پامال کر ڈالیں۔ ابتداءً تو اسلام کی پالیسی بہ نسبت سختی کے صلح کل کی طرف زیادہ مایل تھی۔ وُہ اپنے اصُول کو دلایل و براہین سے شایع کرنا چاہتا تھا، نہ کہ سب و شتم اور جبر و تشدد سے۔ اُس نے اس دعوے سے انکار کیا کہ وُہ کوئی نئے اصُول لے کر آیا ہے؛ بلکہ یہ کوشش کی کہ اپنے عقاید کو اپنے پیش رو اَدیان سے خلط ملط کر دے۔ کسی کو بالکراہ مسلمان کرنے سے روکا۔ جن عقیدوں کو کہ بالکل اُڑا نہ سکا، یا اُن میں ترمیم نہ کر سکا، اُن کو

خود اختیار کر لیا؛ جو باتیں اُس کو پسند نہ آئیں اُن کو اُس نے مٹا دیا۔ زمانۂ قدیم کی قومی کمزوریاں؛ عام مسخ شدہ دینی عقاید؛ ادعائی پیشینگوئیوں میں انہماک؛ مخالف مذاہب کے لوگوں کی عداوت سے خوف زدہ مومنین؛ ہجوم اصولِ مروجہ، اور تلاطم تراجم اناجیل کی وجہ سے اُس کی صحت کی تمیز کا غیر امکان؛ وحشیانہ غرور و تفوق کی وجہ سے سیاسی آشوب؛ ذات پات کے امتیاز کا انعدام؛ ایک غیر معلوم ہستی کی طرف عجیب طور سے کشش؛ دولت، شہرت اور سلطنت کی امیدیں، جو بلند نظر لوگوں کو پیدا ہو جاتی ہیں؛ آزادی خیال؛ اور تعذیب سے نجات کلّی؛ غرض اسی قبیل کی اور باتیں لے کر اہل دنیا جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے علَم کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ وحی اوّل کے وقت تک آپؐ کی زندگی ایسی رہی ہے کہ آپؐ کے اخلاق کے دامن پر ذرا سا بھی دھبّہ نہ تھا۔ جوانی ہی میں حضورؐ کو "الامین"، کا نہایت ممتاز لقب مل گیا تھا۔ حضرت خدیجۃ الکبرےٰ کے انتقال تک حضورؐ کے تعلقات زوجی ایسے قابل تعریف رہے ہیں کہ حضورؐ کے بدترین دشمن ڈھونڈھتے ہیں اور کوئی نقص نہیں پاتے۔ عرب وُہ قوم تھی کہ جس کے دل پر زرتشت اور مسیح علیہ السّلام کی تعلیمات نے کوئی دیرپا اثر نہ ڈالا تھا حضور سرور انبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کو فطرت انسانی کا علم تھا؛ اپنے ملک کی روحانی ضروریات کو آپؐ خوب سمجھتے تھے؛ ان ہی وجوہ سے آپؐ نے ایک ایسا طریق رایج کیا جو از روئے تجربہ اہالی ایشیا کے مذاق، طبیعت، توہمات و تخیلات کے موافق تھا۔ تاوقتیکہ خود حضورؐ کو اپنے دین کے اصلی و صحیح ہونے کا یقین نہ ہوتا، حضورؐ کی تعلیمات ہاجی و بطی الاعتقاد عربوں کے دل پر کسی طرح اثر نہیں کر سکتی تھیں؛ نہ حضورؐ کے اعزا و اقربا حضورؐ پر ایمان لانے والے تھے۔ چونکہ اُن کو ہر وقت حضورؐ سے خلا ملا رہتا تھا، اس لئے اُن پر بہت جلد یہ ظاہر ہو سکتا تھا کہ جو خیالات اور عقاید حضورؐ ظاہر فرماتے ہیں، وُہ حضورؐ کے ادعاء وحی کے برعکس ہیں۔ لیکن باوجود اپنے خلوص و صدق کے حضورؐ اپنے آپ پر پُورا بھروسہ نہ فرماتے تھے۔ آپؐ نے بار بار اس کا اظہار فرمایا کہ آپؐ محض ایک آدمی، رسول اور مصلح ہیں؛ آپؐ کا کام یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان میں راحت و آسایش اور ترقی و بیداری

کے سامان پیدا فرمادیں۔ باوصف اس کے کہ حضورؐ نے جنّت وجہنم کی حقیقت ظاہر فرمادی پھر بھی یہ فرمایا کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مرنے کے بعد رُوح پر کیا حادثات و واقعات گزریں گے*
جس قوت ارادی نے کہ اُن سیکڑوں آوارہ گرد قبایل کو متحد کردیا، جن کی آنکھیں صدیوں کے جذبات انتقام کشی سے اندھی تھیں، جن کے کان صلح و آشتی، امن وامان کی افہام و تفہیم سے بھرے تھے؛ جو اپنی ذاتی و شخصی آزادی کے معاملہ میں اتنے غیور تھے کہ وُہ اپنے شیوخ کے حلیم و رحیم اور بطریقی حکومت کو بھی یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ وُہ اتنی طاقتور ہو جائے کہ سب کو احاطہ کر بیٹھے؛ جس قوت ارادی نے کہ زمانۂ موجودہ کے مذاہب کی واضح سخافت و بطلان کو دکھلا کر اُس کے بدلے میں ایسے معبود کو پیش کیا، جس کی ہستی کا خیال نہایت سادہ، مگر اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ کوئی شخص، خواہ وُہ کتنا ہی متعصب اور کٹا کیوں نہ ہو، اُس ہستی سے انکار نہیں کرسکتا؛ جس قوت ارادی نے کہ مختلف اقوام کے متضاد اغراض و مقاصد کو ایک مذہب کے قالب میں ڈھال کر متحد و متفق کردیا، اور اپنی مسامحت کے ضوابط سے اُن فرقوں کو رام کرلیا، جو اُس (قوت ارادی) کے اصول کو نہ مانتے تھے، اور اُس کے مراسم کی تعمیل سے قطعاً منکر تھے؛ جس قوت ارادی نے کہ بتحفظ اُس پالیسی کے، جو اُس زمانہ کی پالیسیوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھی، بادشاہی اور مقتدا رِ دینی کی حیثیات کو اس خوبصورتی سے خلط ملط کردیا کہ دونوں صفات میں سے ایک کو بھی ناواجب نمود نہ ہونے دیا؛ جس قوت ارادی نے کہ ایسے دین کی بُنیاد رکھی کہ جو تیرہ صدیوں سے علی حالہ چلا آتا ہے، اور جو کروڑوں آدمیوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائے ہوئے ہے؛ ایسی قوت ارادی کی نسبت یہ کہنا کسی طرح موزون و مناسب نہیں ہے کہ وُہ خلاف عقل، خود مطلبی، دیوانگی اور مکر و فریب پر مبنی ہے۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ یہ نتایج ایسی قوت ارادی سے مترتب ہوئے ہیں کہ جس میں انتہا درجہ بلند پروازی اور اولوالعزمی تھی؛ اور جو اصلاحیں ہوئیں وُہ ایسے دل سے نکلی تھیں جس میں سیاسی عقدہائے لاینحل کے انحلال کی طاقت تھی؛ اور جس میں وُہ سیاسی عقل تھی،

---

* بالکل غلط ہے۔ حضورؐ نے سب کچھ بتلادیا۔ عیسائی ہدایت نہ پائیں تو اُن کی بدنصیبی۔ (مترجم)

جو اُن معدودے چند آدمیوں میں بھی نظر نہیں آتی کہ جنکو تاریخ کے حضور سے بانیان قوم کا قابل فخر و ناز خطاب ملا ہے۔

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے بعض اوقات جو جسمانی کمزوری بے قاعدہ موقعوں پر ظاہر ہوتی تھی اُس کے متعلق ایسے لوگوں نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے کہ جن کا مقصود یہہ ہے کہ جو اہم مواد اُن کو ملے اُس کو اپنے مطلب کے موافق استعمال کریں، اور جن کو اس خاص معاملہ کا بہت ہی محدود علم ہے، اور جتنا بھی ہے اُس سے وہ غیر طرفدارانہ کام نہیں لیتے یا نہیں لینا چاہتے۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ ایک قسم کا اعصابی صرع* تھا۔ یہ مرض کمزور اور سریع التأثر آدمیوں کو ہوتا ہے، اور اس کا دورہ ایسی صورت میں پڑتا ہے کہ آدمی کو یکایک سخت جوش پیدا ہو۔ یہ بیماری اُسی طرح کی ہے جیسے کہ بحالت خواب چلنا پھرنا یا وا لجمود جس کے اثرات عارضی ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کے علامات بالکل صرع ہی جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ خصوصیّت ہے کہ مریض بیہوش نہیں ہوتا۔ اس مرض کے اسباب یا اُس کے قایم رہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی کے قوار عقلی پر اُس کا دیرپا اثر رہے۔ علماء طب کی تحقیقات کامل کے مقابلہ میں وہ عام رائیں جو جہالت اور تعصبات مذہبی کی گود میں پلی ہوں، یقیناً غلط قرار دینے کی قابل ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ تاریخ کی تنقید نے اس افترا کو بلاشک و شبہ بیہودہ ثابت کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بیز نطینی لوگوں نے جہاں اور بہتان ذات اقدس و اطہر کی نسبت جوڑے ہیں وہاں صرع کا قصہ بھی اُن ہی کا من گھڑت افسانہ ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ بیز نطینی لوگ دُنیا بھر میں جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حُلیہ شریفہ کو اگر دیکھا جائے تو آپ شرفاء عرب سے کچھ مختلف نہ تھے۔ سر اقدس بڑا تھا، سینہ مبارک خوب نشو و نما پائے ہوئے تھا، اعضاء مطہر

---

* جناب مصنف نے اس کو MUSCLAR HYSTERIA لکھا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ "اعصابی صرع" کیا ہے۔ مگر عبارت مابعد سے یہ ترجمہ پوری طرح صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جو علامات آگے بیان ہوئی ہیں "اختناق الرحم" کی سی ہیں۔
(مترجم)

نازک مگر قوی تھے ؛ بالجملہ تمام جسم اطہر ایسا تھا کہ ہر قسم کی محنت برداشت کر سکتا تھا، اور سخت تنومند تھا۔ ریش مبارک خوب بھری ہوئی تھی، اور آدھے سینہ تک پہنچتی تھی، اور سیاہ کاکل کسی قدر گھنگر یالے کندھے پر پڑے رہتے تھے حضور کے خط وخال سامی اقوام کا نقشہ تھے سیاہ چمکدار شرمگین آنکھیں، جن میں ایک طرح کی درخشندگی معلوم ہوتی تھی، پتلی نیچے کو جھکی ہوئی ناک، گوری رنگت، اور نہایت شفاف دانت۔ آپؐ کے قیافہ سے جہاں بے انتہا دماغی قوت مترشح ہوتی تھی، وہاں جیسے کہ ایک غیر معمولی دل ودماغ رکھنے والے آدمی کا خاصہ ہے، قوت مردانگی بھی بہت ٹپکتی تھی ؛ اور اس کے ساتھ ہی بے انتہا قوت مدرکہ و ذہانت ظاہر ہوتی تھی۔ آپؐ کی رفتار سریع تھی، اور حرکات وسکنات سے شدید العزمی معلوم ہوتی تھی۔ آپؐ میں متانت تھی، مگر اخلاق شریف ایسے تھے کہ ہر شخص آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ گفتگو میں شیرینی ہوتی تھی۔ جہاں آپؐ تشریف رکھتے تھے وہاں سب پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آپؐ کی باتوں میں وہ لطف ہوتا تھا کہ ہر شخص مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس پر آپؐ کی متانت وہ چیز تھی کہ آپؐ کے فصیح وبلیغ خطبات و تقریریں دلنشین ہوتی چلی جاتی تھیں۔ گو حضورؐ عادتاً بھاری بھر کم، صاحب تمکنت اور خاموش آدمی تھے، مگر ذلیل ترین لوگوں تک سے بکشادہ پیشانی ملتے تھے۔ آپؐ کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ جب آپؐ کسی سے مصافحہ کرتے تھے تو اپنا دست مبارک اُس وقت تک نہیں کھینچتے تھے کہ وہ شخص خود ہی نہ چھوڑ دیتا۔ آپؐ کی سخاوت وفیاضی کی کوئی حد ونہایت نہ تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان فیاضیوں کی بدولت آپؐ کے متعلقین کو سخت تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی۔ حضورؐ کی عادات کریمہ اس سے ظاہر ہوتی ہیں کہ آپؐ کو بچوں سے بہت ہی محبت تھی۔ قرآن مجید میں جانوروں پر بیرحمی کرنے کی جتنی ممانعتیں آئی ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ میں جذبات رحم کتنے تھے انسان کو ذلیل کرنے والے جذبات طمع وآز کا آپؐ کی فطرت صالحہ میں کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ باوجودیکہ حضورؐ کے ہاتھ میں دنیاوی خزاین تھے، مگر آپؐ کے اتنے بھی خدمتگار نہ تھے جتنے کہ

آپ کے معمولی معتقدین کے۔ آپ کی جو کچھ بھی آمدنی تھی سب غربا میں تقسیم فرما دیتے تھے، خود اپنا گزارہ بمشکل تمام کرتے تھے۔ آپ کا ماندوبود نہایت سادہ تھا۔ جب حضورؐ کو شاہی حیثیت حاصل ہو گئی ہے تب بھی حضورؐ نے یہ سادگی اور بطریقی زندگی نہیں چھوڑی۔ آپ کا مکان ایک جھونپڑی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھی، اور اُس کی چھت کھجور کے پتوں کی تھی۔ ایک چمڑے کا پردہ دروازہ کا کام دیتا تھا۔ جو باتیں کہ آپ کی شانِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں اُن میں حضورؐ کی وہ مسکنت اور فروتنی تھی کہ آپ اپنے نعلین شریفین کی خود مرمت کر لیتے تھے، اپنی بکریوں اور اونٹوں کی خود خبر گیری فرماتے تھے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ازواجِ مطہرات کی خانگی کاموں میں مدد فرماتے تھے۔ آپ کی دوستی نہایت محکم تھی، جس سے ابتداءِ عمر میں دوستی ہوئی اُس کو انتقال کے وقت تک نباہ دیا۔ جو لوگ کہ حضورؐ کے گرویدہ اور حاشیہ نشین تھے، بلا امتیاز اس امر کے کہ وہ آپ کی برابر تھے یا کمتر، حضورؐ کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں اور شفیقانہ تھا۔ حضورؐ کو اپنی ذات والا پر وہ اختیار حاصل تھا، اور اپنے جذبات کو حضورؐ اس طرح قابو میں رکھتے تھے، کہ سوا جنگ کے آپ نے کبھی اپنے دشمن پر ہاتھ نہیں اُٹھایا؛ کسی خدمتگار کو نہیں دھمکایا؛ کسی غلام کو سزا نہیں دی۔ بجائے اس کے کہ حضورؐ اپنی ذات ستودہ صفات میں کسی خارق العادت قوت کا دعوےٰ فرماتے حضورؐ ہمیشہ اسکا قطعی انکار فرماتے رہے۔ کسی دینی واعظ میں یہ خودداری، یہ خود فراموشی، یہ عزم بالجزم ظاہر نہیں ہوتا۔ بحیثیت ایک بادشاہ اور سیاست دان ہونے کے آپ جو کچھ تدابیر کرتے تھے وہ بہت کچھ غور و خوض کے بعد۔ بحیثیت ایک سپہ سالار کے آپ میدان جنگ میں اپنی سپاہیانہ قابلیت دکھلاتے تھے۔ یہ مشہور بات ہے، اور مورخین کو اس میں کوئی کلام نہیں ہے، کہ ابتداءً جو آپ کے لشکر کو ہزیمت ہوئی اُس کی وجہ ہی یہ تھی کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی۔ آپ کو پوری طرح معلوم تھا کہ عدل و انصاف کے معاملات میں انسان پر کتنی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ غریب سے غریب آدمی کا مقدمہ، خواہ وہ کتنی ہی حقیر رقم کا ہوتا، حضورؐ خود سماعت فرماتے تھے۔ جو لوگ کہ اداءِ قرضہ میں غفلت کرتے تھے اُن کو حضورؐ سخت سزا کی دھمکیاں دیتے تھے۔ جہاں نیک کام کرنے کی آپ ہدایت

فرماتے تھے، وہاں یہ بھی سخت تاکید فرماتے کہ اُن کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ریا اور مداہنت سے منع فرماتے تھے، اور یہ نہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص نیک کام کرے، یا نیکی کرے اور اس کا اظہار کرتا پھرے، اپنے آپ کو دیندار اور متقی ظاہر کرے۔ اگرچہ اہل عرب کی نگاہ میں یہ فعل بزدلانہ تھا، مگر حضورؐ کو اگر کوئی نقصان پہنچاتا، یا تکلیف دیتا تو اُس کا بدلہ لینے میں حضورؐ بہت دیر کرتے، اور مجرم کو معاف کرنے میں بہت جلدی کرتے تھے۔ اگر کوئی مخالف عین وقت پر اطاعت قبول کر لیتا، اور حضورؐ کی رحم و فیاضی کا خواہاں ہوتا تو فوراً لڑائی بند کر دی جاتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی دشمنی کی عمر ہی بہت کم ہوتی تھی۔ جو شخص کہ آپؐ کا آج سخت جانی دشمن ہوتا، وہ کل کو آپؐ کا وفادار غلام بن جاتا تھا، اور آپ کی طرف ہو کر لڑتا تھا۔ حضورؐ کی فیاضی، اور قلوبِ انسانی کا علم، جس نے آپؐ کو نوع انسان کا حکمران بنا دیا، آپؐ کی کریم النفسی اُن شاہانہ مراحم سے ظاہر ہوئی کہ جب آپ نے فتح مکہ کے بعد قریش کے قصور معاف فرما دیئے۔ مختصر یہ ہے کہ حضورؐ کے خصایل مبارک کے روشن پہلو کی توصیف اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی جو حضورؐ نے نیکی کی تعریف کرنے میں ظاہر فرمائی ہے، اور جس پر حضورؐ خود ہمیشہ عامل رہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "ہر ایک اچھا کام نیکی ہے۔ اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرانا، بھولے ہوئے کو راستہ بتلانا، پیاسے کو پانی پلانا، کسی کو نیک کام کرنے کو کہنا، نیکی ہے۔ انسان کی سچّی دولت عاقبت میں وہ نیکیاں ہیں کہ جو اس دُنیا میں آدمی کسی دُوسرے کے ساتھ کر جائے۔ جب کوئی شخص مرتا ہے تو لوگ پُوچھتے ہیں کہ اُس نے کیا مال اور جائیداد چھوڑی ہے، مگر فرشتے یہ پُوچھتے ہیں کہ اُس نے کتنی نیکیاں اپنے آنے سے پہلے دُوسری دُنیا میں پہنچائی ہیں۔"

باوجود اس تمام عظمت و جلال کے کچھ تھوڑی بہت کمزوری بھی آپؐ کے خصایل میں ملی ہوئی تھی، جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ اس کمزوری کے بہت بڑے حصّہ کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ اُمّی تھے۔ اور آپؐ کے زمانہ میں توہمات کا زور تھا۔ آپؐ اندھیرے سے بہت گھبراتے تھے، اور بغیر روشنی کے تنہا رہنے سے ڈرتے تھے۔ ذرا سی جسمانی تکلیف

میں آپؐ بچوّں کی مانند چیخ اُٹھتے[۵۰] تھے۔ طاق اعداد کو آپؐ نیک شگون سمجھتے تھے، اور جادو سے ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے۔ اپنے اور جاہل ہموطنوں کی طرح نظر بد کے اثرات کے قایل تھے، اور اُس سے بہت ڈرتے تھے۔ آپؐ کی اکثر باتیں خواب اور شگون[۵۱] پر منحصر ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض شگون تو ویسی ہی بچّوں کی سی بات تھی جیسی کہ کہانت، جس کو حضورؐ نے سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے۔ معاملات محبت میں آپؐ سے کچھ کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں، جن کی توقع ایک جوہر قابل اور اتنی بڑی حیثیت کے آدمی سے نہیں ہوسکتی[۵۲]۔ آپ اپنی ریش مُبارک میں خضاب اور ہاتھوں میں مہندی لگاتے[۵۳] تھے۔ اور عورتوں کے سامنے اپنے آپ کو کچھ بڑھا کر دکھلاتے[۵۴] تھے۔ عورتوں کے معاملہ میں آپ سخت غیوُر تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وجوہ تھے۔ اسی غیرت کا نتیجہ نقاب، برقعہ، پردہ، خواجہ سرا، وغیرہ[۵۵] ہے۔ آپؐ کے تعدد ازدواج پر یوُرپ کے پادریوں اور عیسائی دینداروں نے بہت کچھ سب وشتم کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجوہ سیاسی تھے۔ کیونکہ ان تعلقات صہریت کی وجہ سے آپؐ کے اقتدار کو استحکام ہوگیا، اور قوت میں توسیع۔ اس کا انکار کرنا بیکار ہے کہ حضوُرؐ کے دل اقدس میں محبّت بھری ہوئی تھی، کیونکہ ہمارے پاس خود حضوُر ہی کا قول موجود ہے کہ "تمام چیزوں میں مجھے عورتیں اور خوشبوئیں پسند ہیں" مگر یہ نہ بھوُل جانا چاہئیے کہ حضوُرؐ نے اپنے جذبات کو متوسط عمر کے بعد تک روکے رکھا۔ یہ بھی کچھ کم قابل ذکر بات نہیں ہے کہ آپ جتنی حرم چاہتے رکھ سکتے تھے، مگر اس میں آپؐ نے اپنے آپ کو بالکلیہ آزاد نہیں کیا تھا، علاوہ ازیں تعدد ازدواج کی اخلاقی صوُرت بہت کچھ ملک اور آب وہوا پر منحصر ہے، اور اُس کے بعد صرف

---

[۵۰] صریح غلط۔ (مترجم)
[۵۱] بلکہ شگون لینے کو منع فرمایا ہے۔ (مترجم)
[۵۲] عیسائیت کہلوا رہی ہے۔ (مترجم)
[۵۴] محض غلط۔ (مترجم)
[۵۵] اور عیسائی مردوں کی بے غیرتی، عیسائی عورتوں کی بے باکی، بے حجابی وغیرہ وغیرہ کس کا نتیجہ ہے؟ (مترجم)

سوال تعدادِ ازواج کا رہ جاتا ہے۔ منطقہ حارہ کی جھلسا دینے والی گرمی مرد کی طاقت و ہمت اور محنت و مشقت پر اثر کرتی ہے؛ لیکن عورتیں چھوٹی سی عمر ہی میں بالغ ہو جاتی ہیں اور مرد ابھی جوان ہی ہوتا ہے کہ وُہ بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور اُن کے جھرّیاں پڑ جاتی ہیں۔ نیز یہ امر بھی سب جانتے ہیں کہ اہالی ایشیا کے جذبات بہ نسبت اقوام یورپ کے زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اُن میں وہی نسبت ہے جو ایک گرم خون دودھ پلانے والے جانور، اور سرد خون مچھلیوں میں ہے۔ زمانۂ قدیم کے مصنفین نے اہلِ عرب کی شہوانی قوتوں کا اکثر ذکر کیا ہے۔ گرم ممالک میں قدرت کاملہ کی فیاضیاں اتنی عام ہوتی ہیں کہ جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی؛ ہاں البتہ اگر اس انعام عام سے محروم رہ جاتے ہیں تو وُہ بے خانماں لوگ جن کو پیٹ بھر کر روٹی بھی میسّر نہیں آتی۔ ازمنۂ قدیمہ میں اہالی ایشیا کے تمدن کا خمیر تعددِ ازواج سے ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اُن میں یہ رسم اُس وقت سے رائج ہے کہ جس کی قدامت بھی یاد نہیں۔ باشندۂ ایشیا اور صرف ایک ہی عورت پر قانع ہو! دو متضاد باتیں اور بے معنی الفاظ ہیں۔ اگرچہ بڑے بڑے عالمانِ علمِ بنی نوعِ انسان نے یہ امر نہایت قابلیّت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ابتدائی تمدن کی بنیاد اس پر ہے کہ ایک عورت کا کئی مردوں سے تعلق جایز ہوتا تھا، مگر اُن کے نتایج محض قیاسی ہی ہیں؛ کیونکہ تاریخ ایسے واقعات تو بہت ہی شاذ یاد دلاتی ہے۔ یہ بظاہر بیہودہ رسم، اگر اس وقت کہیں نظر آتی ہے تو شاید تبت اور ہندوستان میں۔ دُنیا میں جتنے بھی مذاہب اس وقت موجود ہیں، مثلاً بودھ، یہودیت، مسیحیت اور اسلام، سب کی اصل ایشیا سے ہے۔ ان سب مذاہب کی کتبِ مقدسہ میں تعددِ ازدواج کی منظوری موجود ہے یا اور اگر نہیں ہے تو کم از کم صاف طور پر ممانعت بھی نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ چین اور ہندوستان میں اس کا عام رواج ہے؛ ژند اوستا میں اس کی منظوری ہے؛ عالمانِ تاریخ اور ماہرانِ افسانہ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ رسم جاری و ساری تھی۔ شرعِ اسلام، بپابندی چند عاقلانہ و عادلانہ قیود کے، اس کی اجازت

دیتی ہے۔ انجیل میں اوّل سے آخر تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس سے تعدد ازدواج گناہ قرار دیا جا سکے۔ بلکہ بطریقوں، رسولوں اور حواریوں کے وقت میں تو اُن ممالک میں جہاں اس کا رواج تھا، حقیقتاً کسی طرح کی ممانعت نہیں ہوئی۔ اگرچہ ہم اپنے تمدن، خیالات اور خانگی راحت کے لحاظ سے اس رسم کو جایز نہیں رکھتے، کیونکہ ہمارے ملک کی سخت آب وہوا اس کو بے ضرورت اور ایک حد تک گھناؤنا بنا دیتی ہے، لیکن ہم کو یہ کوشش نہ کرنی چاہیئے کہ غیر ملک کی رہنے والی، اور غیر آب وہوا میں پلی ہوئی، اقوام کو ہم اپنے خود ساختہ پیمانہ سے تولیں اور اپنی جنتری میں اُن کو نکالنے کی کوشش کریں، اور اُسی بات کو صحیح سمجھیں جو ڈیڑھ سو نسلوں سے ہم میں رائج چلی آتی ہے، اور جس کو پرانے زمانہ کی منظوری نے پاک بنا یا ہوا ہے۔ نہ انصافاً ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دینی وسیاسی اصُولِ اخلاق ومراسم کا اطلاق اُن لوگوں پر کریں جو اُن پڑھ تھے جنہوں نے نیم وحشی اقوام میں نشو ونما پائی، اور جو تیرہ سو برس ہوئے کہ دُنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اگرچہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہموطنوں کے ساتھ عورتوں کی خصایل کے متعلق خیالات میں متفق تھے، مگر آپ ہی تنہا و یکتا شارع ہیں کہ جنہوں نے از روئے وحی، تعدد ازدواج کو محدُود کر کے عورتوں کی عظمت بڑھا دی ہے، اور ایسے قواعد وضوابط وضع کر دیئے ہیں کہ جن سے گریز نہیں ہو سکتا، اور اُن کی خلاف ورزی اس کی مستوجب ہوتی ہے کہ بہت سے حقوق قانونی کو چھین لیا جائے۔ ان احکام کے یہ مفید اثرات کہ طلاق پر سخت موانع لگا دیئے گئے، بیوہ عورتیں فاقہ کشی کی مُصیبت سے بچ گئیں، بے گناہ لڑکیاں زندہ درگور یا قتل ہونے سے رہ گئیں، فی حد ذاتہ وُہ چیزیں ہیں کہ حضورؐ کے نام مُبارک کی جتنی عظمت کی جائے تھوڑی ہے۔ گرو اہم پرستانہ کمزوری، معیُوب خیالاتِ باطل، عورتوں کی طرف میلان، اور اسی قسم کے اور نقایص کے علاوہ اور بہت سے بہتان ذات اطہر واعلیٰ پر لگائے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جان بازا خفیہ طور پر قتل کرنے والے لوگوں کو اگر متعین نہیں کیا، تو کم از کم اُن سے ساز باز رکھا اور اُن کو انعام دیا۔ یہ بھی ایک دھبہ حضور پر رکھا جاتا ہے۔ اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی شہادتیں ضرور موجود ہیں، مگر ان باتوں سے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اعیان و اقران سے بہت بڑھے ہُوئے تھے لیکن مادۂ انتقام کشی، جو عرب میں بہت ہی ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا، باوجود تعبد، خیرات و مبرات وغیرہ کے آپ کے دل سے نہیں نکلا تھا۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان تو اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضورؐ نے اپنے ملک والوں کی سیاسی و اخلاقی ضروریات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اور اُن کو ایسا راستہ دکھلا دیا تھا کہ جس پر چل کر انہوں نے وُہ ترقی کی کہ جو کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کو مادی و رُوحانی ترقی کی وُہ راہیں بتلائیں کہ جن کا اثر ایسی قوموں پر پڑا جو نہ عربی نسل سے تھیں، نہ اُن کی زبان جانتی تھیں۔ یہ ایسا احسان تھا کہ جو قیامت تک نہیں بھُولا جا سکتا۔ آپؐ نے بہت سی بے رحمی اور ذلیل کن مراسم کو دُنیا سے اُڑا دیا۔ جس جس آدمی یا قوم نے آپؐ کی تعلیمات کو قبول کیا اُن میں نہ صرف خودداری پیدا کر دی، بلکہ اُس کو چار چاند لگا دیئے، اور انتہا عرُوج پر پہنچا دیا۔ جن لوگوں کو آپؐ نے بُت پرست، اور بہت سے معبُودوں کی عبادت کرنے والا پایا تھا، اُن کو خدائے واحد کا پرستار بنا کر چھوڑا؛ اور جس نے آپؐ کا اتباع کیا وُہ بھی ایک ہی خدا کو ماننے لگا۔

× × × × × × × × × × × × × × ×[1]

× × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × ×

کسی مذہب کی عملی قدر و قیمت اور اُس کی اہمیّت اس امر پر منحصر نہیں ہوتی کہ اُس کا بانی کون تھا، اور جس وقت اُس کی بنا پڑی اُس زمانہ کے حالات کیا تھے؛ بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُس نے انسان کی آسائش و راحت اور خوشی خُرّمی کے لئے کیا کیا، اور ان چیزوں کا قیام و دوام کتنے عرصہ تک

---

[1] یہاں سے جناب مُصنّف علام کے بارہ۱۲ صفحے میں حذف کرتا ہوں ۔ ان میں قرآن مجید، کعبہ شریف وغیرہ، کی نسبت اتنی بے سرو پا باتیں ہیں کہ اُن کا ترجمہ لاحاصل، اُن پر حاشیہ لکھنے لاطایل؛ مُسلمانوں کے لئے وُہ نقل مجلس ضرور ہو سکتے ہیں اگر محض ہنسنے ہنسانے کے لئے محنت ترجمہ محض ضایع + (مترجم)

خدا، قادر و قیوم کی جلیل الشان ہستی کے تخیل نے کچھ ایسا جوش پیدا کیا کہ اسلام نے بُت پرستی کی جڑیں اس طرح اُکھاڑ کر پھینکیں کہ اُس کے شیوع کی دُوسری ہی نسل میں لوگ اپنے آباؤ اجداد کے جھوٹے خداؤں کا نام لینے سے ڈرنے لگے؛ مردم خواری حرام قرار دی گئی؛ انسان کی قربانی بالکل اُڑا دی گئی، جس پر اہل عرب حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام، سے بہت پہلے سے عامل تھے۔ اسلام نے جنگ کی بے رحمیوں کو بہت کچھ ہلکا کر دیا۔ بشرطِ اسلام مفتوحین کو اُس نے فوری آزادی دی، اور شہرت و ناموری کی اُمیدیں دلائیں۔ اسلام نے بدقسمت قیدیوں کو سختی سے بچایا، اور مقتولین کی لاشوں کو مسخ کرنے کی ممانعت کی۔ اسلام نے نظام الاقطاعی انتظام کی مخالفت کر کے ہر قسم کے پیشہ وروں کو آزاد، اور اُن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اسلام نے عورتوں کی حیثیت کو بڑھا دیا، زمانۂ جاہلیت میں جو شرمناک شہوت پرستی تھی اُس کو دبا دیا۔ عربوں میں طلاق اپنی مرضی پر منحصر تھا؛ اُس کے لئے عادلانہ قانون مقرر کیا؛ اور بیویوں کو شوہروں کی بے رحمی، ناانصافی اور طمع و آز کا شکار ہونے سے بچایا۔ اسلام نے فوراً اور قیامت تک کے لئے لڑکیوں کے قتل کو دُنیا سے مٹا دیا۔ اسلام نے نہ صرف مے نوشی کی زیادتی ہی کو ممنوع قرار دیا، ہر قسم کے نشوں کو حرام قرار دیا، بلکہ نشّئی چیزوں سے ذرا بھی تعلق رکھنے کو منع کر دیا۔ اسلام نے کہانت اور ہر قسم کی بازی لگانے کو ایسا فعلِ شیطانی بنا دیا کہ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی جنّت کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائے گا۔ اگرچہ اسلام نے غلامی کو جائز رکھا، مگر غلاموں کی حالت میں بہت کچھ اصلاح کی؛ ان کو زمانۂ قدیم کے ایشیائی مراسم کے موافق آقاؤں کا ہمسر کر دیا، اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کرنے کی ہدایت کی جو والدین کو اولاد کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ غلاموں کے آزاد کرنے کو سب سے زیادہ ثواب کا کام، اور سب سے بڑا کفارہ بتلایا؛ اُن کے حقوق اور اُن کا زرِ فدیہ مقرر کیا؛ اُن کی سزاؤں کی تحدید کی، اور یہ عادلانہ اور رحیمانہ حکم دیا کہ جب کوئی کنیز فروخت کی جائے تو وہ اپنے بچوں سے کسی حالت میں جُدا نہ کی جائے۔ اسلام نے مومنین پر یہ فرض کیا کہ وہ فروتنی اور قناعت و توکل اختیار کریں، اور

جہاں تک ہو سکے نیکوکار رہیں، تمام بنی نوعِ انسان میں مساوات قایم کر کے، اور فیاضی اور عفو کی تلقین و تعلیم دے کر آہستہ آہستہ جذباتِ انتقام کو کمزور کیا، اور آخر بالکل ہی لوگوں کے دلوں سے نکال دیا، حالانکہ عرب کے بادیہ نشین وہ لوگ تھے کہ جو خون کے بدلے میں خون کرنا نہایت عزیز رکھتے تھے، اور اُس کو ایسا حق سمجھتے تھے کہ عام خیالات کے موافق اسی پر اُس کے قبیلہ کی عزّت منحصر، اور اسی پر خود اُس کی مردانگی کی شہرت موقوف تھی۔ اسلام نے لوگوں کی جایدادوں کو چھوٹے چھوٹے سرداروں کی دست برد سے محفوظ کر دیا، جو مالکان جایداد پر سخت محاصل لگا کر تجارت تک کو نقصان پہنچاتے تھے۔ گو کہنے کو صرف ایک ہی ٹیکس، یعنی عشر، تھا جس کو سب جانتے، اور اُس کے ادا کرنے پر سب راضی تھے۔ سُود در سُود لینے کی بد رسم کی بے رحمانہ سزا مقرر کر کے روکا۔ نہایت سخت قانون بنا کر ایسے علاقوں میں مسافروں کو محفوظ کر دیا جہاں قزاقی بڑے نمود کا کام سمجھا جاتا تھا؛ اور جس شخص کے دست و بازو میں زیادہ قوت ہوتی تھی، اور جو ہتھیاروں کو اچھی طرح استعمال کرنا جانتا تھا وہ بغیر کسی بازپرس کے اپنا یہ حق سمجھتا تھا کہ جس کے حقوق پر چاہے دست اندازی کرے۔ اسلام نے جسمانی صفائی کی عادت کو بڑی اہمیت دی، اور روزانہ وضو وغیرہ کی تاکید کی۔ اس غرض سے کہ کوئی بہانہ نہ مل سکے، جن علاقوں میں کہ پانی کا دستیاب ہونا مشکل ہے وہاں اُس کی جگہ ریت کا استعمال کرایا۔ اسلام نے اپنے شعایر میں عاقلانہ رسم ختنہ کو لازمی قرار دیا جو اُس زمانہ میں رائج تھی۔ یہ رسم محض بر بنائے قواعد صحت تھی، جس کی خوبی اور اہمیت سے کوئی جرّاح انکار نہیں کر سکتا۔ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جس میں اوّل سے آخر تک نیکی ہی نیکی ہے۔ مُسلم کو بار بار یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اُس کے نیک اعمال اور نیکیاں پکارنے لگیں اُس کی شفاعت کرینگے؛ گو اُس کے ہونٹھ قبر کی خاموشی کے ساتھ ہی ہلنے بند ہو چکے ہونگے۔ اسلام میں کوئی منظم گروہ (پادریوں کی طرح) مقتدایانِ مذہبی کا نہیں ہے، جن کی طمع و حرص اور ریاکاری مشہور ہے، جو اپنے فوایدِ پیٹ میں مٹے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس کی پروا

نہیں کرتے کہ آیا وہ جایز ذریعوں سے حاصل کرتے ہیں، یا ناجایز وسیلوں سے۔ اسلام میں
سادگی اور صفائی اتنی ہے کہ اُس کو کسی تنخواہ دار مقتدا ر مذہبی کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ
کہ قرآن مجید پڑھتے، یا اُس کا وعظ کرتے ہیں، اُن کو سخت ممانعت ہے کہ اپنی خدمات کی عوض
میں کسی بہانہ سے بھی اُجرت لیں۔ مقتدایان مذہبی کا گھناونا مقابلہ اور بلند نظری، بیہودہ ریاضتہاء
شاقہ اور رہبانیت، ضرر رسان جذبات رہبان اور تعصبات دیر، نہایت دُور اندیشی و دُور بینی
سے بانی اسلام نے اپنے مذہب میں داخل ہی نہیں ہونے دیئے۔ اسلام نے ایک معتدل سا محصُول
اُن لوگوں پر لگایا جو اُس کی سلطنت میں رہتے ہیں، مگر اپنے آبا و اجداد کا دین نہیں چھوڑتے۔
اس طریقہ سے یہ ہوا کہ غیر مذاہب کے مقتدایان مذہبی، جو اُس کی رعایا تھے، اپنی جماعت کے
لوگوں سے بغیر اُن کی مرضی کے کچھ وصُول نہیں کر سکے۔ اسلام نے ہر درجہ و رُتبہ کے نوجوانوں
پر یہ لازمی قرار دیا کہ وُہ مودب، مہذب اور سلیم الطبع رہیں، اور والدین کا ادب و حرمت ملحوظ
رکھیں۔ اسلام نے صداقت کے ہر متلاشی کو یہ قابل قدر اجازت و رعایت دی کہ وُہ اپنے طور پر
تاویلات کرے اور اپنی ذاتی رائے قایم کرے۔ یہ انسان کا ایسا حق ہے کہ جو مذہب مسیحی نے بھی
لوتھر کے وقت تک نہیں دیا۔ اور چونکہ اُس (لوتھر) نے یہ بدعت ایجاد کی اس لئے اُس کو
عیسائیوں نے یہ کہہ کر بدنام کیا کہ وُہ مسلمان ہے۔ سترھویں صدی تک اس قدرتی حق انسانی کا
استعمال یُورپ میں نہیں ہو سکا۔ اگر کسی نے (اناجیل کی تاویل وغیرہ) کی بھی تو چھپ کر، اور پھر بھی
اُن کو زندہ جلائے جانے کا اندیشہ رہا۔ اور مذاہب کی طرح اسلام نے یہ نہیں کہا کہ جو لوگ اُس کے
اصُول کو نہیں مانتے اُن کے لئے نجات کا دروازہ ہی بند کر دیا ہو۔ باوجود حرم کی تمام ترغیبات کے
اسلام نے پرہیزگاری کو مسلمانوں کا جوہر قرار دیا۔ راہبانہ زندگی کی بندشوں سے جو عیُوب
اور خرابیاں پڑتی ہیں اُن کو دیکھ کر ترک دنیا و ترک لذات کی ممانعت کی گئی۔ رسول اکرم
صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد دو صدیوں تک فقیروں اور درویشوں کا پتہ نشان بھی
نہ تھا۔ اسلام نے ایک حد تک زمانۂ قدیم کے ابتدائی مراسم کو اپنے ساتھ اس خوبصُورتی سے ضم کیا

کہ اُن کے معایب کو چھوڑ دیا اور حسنات کو لے لیا۔ اُس نے مذہبی جذبات اور قومی غرور پر اثر ڈالا۔ عہود و مواثیق کی پابندی فرض قرار دی۔ مہمان نوازی کی تاکید کی۔ بت پرستی کی ہر صورت کو ناجایز قرار دے کر ہر مومن کے دل میں یہ بات ڈالی کہ رحم کرنا، عدل و انصاف کو قایم رکھنا اور خدا تعالےٰ کے عظمت و جلال کی اشاعت سب سے بڑا نیکی کا کام ہے۔

اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے مراسم میں زنانہ عنصر کو دخل نہیں ہے! اب اس نکبت و ادبار کے زمانہ میں بھی عورتوں کا شمار ولیوں میں نہیں ہے؛ حالانکہ ادیان سابقہ و موجودہ میں عورتیں مقتدایان مذہبی ہوتی رہی ہیں، اور عورتیں دیوتا بنتی اور پجتی چلی آئی ہیں۔ دینی کونسل باسیل* نے اگرچہ ۱۲۰۰ سال قبل از نزول قرآن مریم عذرا کا حمل بلا دنس قرار دیا تھا، مگر عذرا از قرآنی ہر طرح پر ایک معمولی فانی انسان ہیں؛ اور اُن کو وُہ حیثیت اور اہمیت حاصل نہیں ہے جو مشہور و معروف آئے سس کو جو ایک دلکش دیوی تھی کہ جس نے سواحل دریاء نیل سے نکل کر علو شان حاصل کی؛ اور جو ستاروں کا تاج پہن کر شان شاہی اور بے مثل حسن و جمال کے ساتھ نہایت جاہ و جلال سے کیتھولک روم کے تخت پر جلوہ گر ہو گئی۔

سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم میں بھی عورتوں کی طرف سے وہی تعصبات تھے جو آپ کے ہم وطنوں کے دلوں میں متمکن+ تھے۔ وہ جذبات شجاعت اور ادب و احترام جو اقوام ممالک مغربی عورتوں کا کرتے ہیں اُس کا شمہ بھی شُتّی اور غیور باشندگان ایشیا میں نہیں# ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ شب معراج میں آپ نے دوزخ میں زیادہ تعداد عورتوں کی دیکھی تھی۔ لیکن اگر اسلام کی قسمت پر عورتوں کی قوت کا براہ راست اثر نہیں پڑنے دیا گیا تو

---

* باسیل یا BASLE ایک مقام ہے جہاں ایک دینی کونسل ہوئی تھی۔ (مترجم)

ضمیمہ د باب ہذا مطالعہ فرمایئے۔ (مترجم)

+ کیا باوجود اُن حقوق کے جو اُن کو دیئے گئے، اور باوجود اُن اصلاحات کے جو اُن کے حال میں کی گئیں اور جن کا شمہ مصنف علام اُوپر بیان کر چکے ہیں؟ (مترجم)

تاریخ کی ورق گردانی کیجیئے، اور پھر بتلایئے کہ مغربیوں میں یہ جذبات اگر مسلمانوں کی ریس سے نہیں پیدا ہوئے تو کہاں سے آئے؟ (مترجم)

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُس کا بہت بڑا اثر بالواسطہ پڑا۔ فاتحین اسلام کے یہاں تعدد ازواج کی رسم تو تھی ہی، ان کی حرموں میں مفتوحہ ممالک کی نہایت حسین اور عالی خاندان خواتین بھر گئیں، ان کی اولادیں بلا استثنا مسلمان ہو گئیں، ایک ہی نسل کے بعد اُن میں جو تھوڑا بہت اثر اپنی ماں کے عقاید کا رہ گیا تھا وُہ بھی بالکل نکل گیا۔ صرف از سرِ نو فتح کر لینے، یا نئے آباد کاروں کے آجانے، یا کسی اور آفت ارضی وسماوی کے پڑنے سے ہی وُہ علاقہ جو مسلمانوں نے فتح کیا تھا اپنی اصلی حالت پر آ سکتا تھا۔

معاملات مذہبی وسیاسی میں عام طور پر حقانیت کا معیار کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ عوام الناس میں سے بہت ہی کم آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو دقیق مسایل مذہبی پر غور و فکر کرنے کی فرصت ہوتی ہے، یا اُن کا میلان اس طرف ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال اُن ہی چند آدمیوں کا اثر سب پر یقیناً پڑتا ہے، اور بہت زیادہ پڑتا ہے۔ دُوسروں کو دیکھ کر سریع الاعتقاد سے سریع الاعتقاد بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی کامیابیاں اور اُس کی درخشندہ فتوحات وا ہمہ پرست مخالفین ومفتوحین کی نگاہ میں اُس کی صداقت وحقانیت و للّٰہیت کی مسکت دلیل ہوتی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اصول جبر و اکراہ مسلمانوں کے عقاید کا جزو نہیں ہے بلکہ بعد میں داخل ہوا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت تک تلوار اُٹھانے کی رار نہیں دی کہ جب تک تفہیم وترغیب کی تمام تدابیر ختم نہیں ہو گئیں۔ اور اُس وقت بھی صرف دوران جنگ میں۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات کے بعد اُس کو جو اخلاقی تحریک ملی وہ عجیب وغریب اور قابل دید ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ صُورت قوت وصولت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی ہے۔ یہ ایسی حس ہے کہ انسان کے دل سے کبھی نہیں نکلتی، خواہ وُہ تہذیب کے انتہا رعروج پر ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ روم کی عظیم الشان سلطنت بھی اسی اصول پر قایم ہوئی تھی۔ زمانۂ مابعد میں تو یہ اصول عملی طور پر اُس کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ اور یہ سلطنت اُس کا نمونہ ہی بن گئی تھی۔ قیاصرہ کے جانشین خلفاء اچھی طرح جانتے تھے کہ قوت وصولت کا اثر عوام الناس

کی طبیعتوں پر بہت بڑا پڑتا ہے - اِس لئے اُنہوں نے اس کو قیام و دوام دے دیا؛ اور تلوار اور قرآن نے ملکر ہرقلیس اور مریخ کی جگہ لے لی - ان خیالات کا (جو آدمی ہی کے ساتھ پیدا ہوئے تھے) بقیہ اب تک اُن مراسم میں نظر آتا ہے جو وحشی اقوام میں بجبر عورتوں سے نکاح کرنے میں ادا ہوتی ہیں - یہ ایک مثل مشہور ہے کہ "عورتیں بہادر سپاہیوں کو پسند کرتی ہیں، اگرچہ وُہ خود اُس کو نہ سمجھتی ہوں"، مگر یہ بھی ان ہی جذبات کی ایک صورت ہے - اکھاڑوں وغیرہ میں پہلوانوں کی جو قدر منزلت کی جاتی ہے یہ بھی اسی کی نشانی ہے +

حجاز کا کوہی علاقہ، اور فلسطین کی پہاڑی اور بنجر وادی، اگرچہ وسیع ہیں، اور اُن میں قدرتی ذرائع نہیں ہیں، نہ کوئی سیاسی اہمیت اُن کو حاصل ہے، مگر فاتحین و حاکمین اقوام کی نگاہ میں وُہ بے حقیقت سی چیزیں ہیں - جو کچھ بھی ہوا اسی محدود اور چھوٹے سے علاقے سے تین بڑے بڑے دین اُٹھے جن کے ہاتھ میں دُنیا کی ایک دُوسرے سے دُور افتادہ اقوام کی عنان رہی ہے؛ اور اُن پر اُن ادیان کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوا ہے کہ اُن اقوام کی ہستیاں ہی جاتی رہیں، یا بالکل بدل گئیں - حضرت موسٰے، علی نبینا وعلیہ السّلام، کے قایم کردہ اصُول کے موافق عبرانئین نہ کسی دُوسرے کو اپنے مذہب میں داخل کر سکتے تھے، نہ کسی سے خود اختلاط پیدا کر سکتے تھے - بلکہ اُن کی خصوصیّت ہی یہ تھی کہ کسی کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں - مگر باوجود اس کے اُن کے جوہر ذاتی کی قوت سے ہر ملک جہاں جہاں یہ مبغوض قوم پہنچی متاثر ہو گیا؛ اور ہر جگہ یہ قوم، جس سے نفرت کی جاتی تھی، اپنا گھر بنا کر بیٹھ رہی - مذہب مسیحی اور اسلام نے مہذب دُنیا کی سلطنتوں پر تلوار اُٹھائی - خلفاء، جو اسلام کے رُوحانی مقتداء تھے، ایک زمانۂ بعید سے دماغی قابلیّت کے پھیلانے والے، یورپ اور ایشیا کے بہترین علاقوں کے مالک، علوم و فنون کے سب سے بڑے مربی ہوتے چلے آئے ہیں - مشہور ترین قیاصرہ، زمانۂ حال کے بڑے بڑے بادشاہ، دونوں عوام الناس کی نگاہ میں از رُو درجہ و رتبہ پوپ کے مقابلہ میں حقیر تھے، جس نے اس تخت کو سنبھال رکھا ہے جو روم کی

شان و شوکت کی یادگار ہے، اور جس کے اقتدار کو اُن لوگوں کے نزدیک خود خدا رقادر نے تسلیم کر لیا ہے۔ کوئی دُنیوی بادشاہت جس کا ذکر تاریخ میں آیا ہو، ایسے سنگلاخ اور بے رحم علاقے میں قایم نہیں ہوئی، جیسی وُہ سلطنت کہ جس نے نہایت قوی اور عملی صُورت اُس بے مثالِ مذہب کی پیدا کر دی کہ جس نے بنی نوع انسان کو انتہاء عرُوج پر پہنچا دیا۔ جو جو تبدیلیاں ان مذاہب کے مقلدین میں اپنے اپنے وقت پر ہوئیں، وُہ اس کی کافی شہادت ہیں کہ مذاہب میں بھی مادۂ فنا موجود ہوتا ہے۔ یہُودیوں کو بادشاہ بابل گرفتار کر کے لے آیا تھا۔ اُس کا اثر عہد نامۂ عتیق اور کئی اناجیل جدیدہ سے برابر ظاہر ہو رہا ہے۔ ہم صحیح طور پر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اُس مذہب مسیحی میں جو ٹائی بیریس* کے زمانہ میں تھا، اور جو قسطنطین کے زمانہ میں رہا، بڑا فرق ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے قوانین اور مراسم میں گریگوری اعظم اور لوتھر نے بہت بڑی تبدیلیاں کیں۔ اناجیل کے اصل اور قدیم نسخے، (جن کے ضایع کرنے کی وجوہ محض شرارت اور بے ایمانی پر مبنی ہیں) کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس سے یہ قیاس لگایا جا سکتا کہ فی الحقیقت اُن میں کیا لکھا تھا۔ مگر کم از کم یہ نتیجہ اخذ کرنے کی وجوہ ہیں کہ اصل نسخہائے اناجیل میں وُہ کثیف تحریریں اور وحشیانہ و جاہلانہ محاورات نہ تھے کہ جنہوں نے موجودہ اناجیل کو بدنما کر رکھا ہے۔ اسلام کبھی اپنے پیش رووں کی قسمت کا ساتھی بنا‡، جو نتیجہ ہے انقلابِ زمانہ کا، تعصبات اور کمزوریوں کا اور اُس کے متبعین کے بلند نظرانہ خیالات کا۔ اُس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اُس نے مافوق الطبیعت قوتوں کا قطعی انکار کیا ہے۔ مگر باوجُود اس کے رسولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلم کے معجزات علوم اسلامی کے بہت بڑے حصّے بنے ہُوئے ہیں۔ حدیث کی ضخیم کتابوں میں جو خلاف قیاس قصّے اور کہانیاں صدیوں سے محفوظ چلی آ رہی ہیں اُن کی وجہ

---

* ٹائی بیریس TIBERIUS روم کا نہایت بدنام بادشاہ تھا۔ سنہ ۴۲ ق م میں پیدا ہوا اور سنہ ۳۷ عیسوی میں مرا۔ (مترجم)

‡ غلط۔ (مترجم)

سے بھی اسلام پر حملہ ہو سکتا اور اُس کی تردید کی جاسکتی ہے* - اس مذہب کی سادگی ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں فرقہ بندی نہیں ہو سکتی - مگر باوجود اس کے تہتر (۷۳) فرقے اس میں موجود ہیں، جو ایک دوسرے پر الزام لگا اور مخالفتیں کر کر کے دق کرنے کا کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے - رسُول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بُت پرستی کی بیخ کنی کی اور کہانت کو دُنیا سے مٹایا، تبرّع و تنفّل کے اثرات سے انکار فرمایا - لیکن اِس وقت کی یہ کیفیّت ہے کہ تبرّکات مساجد میں لٹکائے جاتے ہیں، قرآن مجید میں فالیں دیکھی جاتی ہیں، اولیاء اللہ سے استمداد کی جاتی ہے، ایرانی مُسلمان اماموں کو پُوجتے ہیں، عُمّان کے مُسلمان کعبہ کو نہیں مانتے اور بجائے اُس کے وُہ اپنے ستارہ پرست اجداد کے قبلہ، یعنی قطب ستارے کو اپنا قبلہ بنائے ہُوئے ہیں -

اخلاق عامہ کی دُرستی کی کوشش میں حضوُرؐ نے خاص کر مکہ معظمہ کی طرف توجہ فرمائی، جو اسلام کا مرکز ہے، جس کی طرف مُسلمان اپنی عبادت میں جھکتے ہیں، اور جب وُہ مر کر قبر میں دفن کئے جاتے ہیں تو اُس کی بے نظر آنکھیں اُسی کی طرف کر دی جاتی ہیں - لیکن آپؐ کی کوششیں اس خصُوص میں چنداں بارور نہیں ہوئیں - جیسے ہی مکہ والوں پر سے پابندیاں اُٹھیں اُنہوں نے پھر وُہی زیادتیاں کرنی شروع کر دیں جن کی وجہ سے یہ مقام مقدس ایسا بدنام ہو رہا تھا کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بھی اُس کو انگشت نما کرتے تھے - یہ ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہے؛ جو سچ پوچھو تو گنہگاروں کے لئے ایک طرح کا غلاف بنا ہُوا ہے، کہ جو مقامات کہ مقدس ہیں، اور جن کی نسبت عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ اُس پر خاص طور پر سایۂ یزدانی ہے، وہیں کے باشندے سب سے زیادہ کلمات کفر بکنے والے ذلیل اور غیر مہذب ہوتے ہیں - دُنیا بھر کے مُسلمانوں میں بدترین مُسلمان حجاز کے عرب ہیں - بعینہٖ اُسی طرح جیسے باشندگان اٹلی ہمیشہ سے پوپ کی معصومیّت کو ہدف طعن بناتے

* کیونکر؟ (مترجم)

رہے ہیں، اور نایب خدا کے بدترین دشمن ہیں۔ دُنیا میں تین شہر یعنی یروشلم، مکہ اور روم ایسے ہیں کہ جن کے باشندوں نے شروع ہی سے بدکاری اور بدچلنی میں وُہ شہرت حاصل کی تھی کہ خدا کسی دُوسرے کو نصیب نہ کرے٭

برخلاف دُنیا کے اور مذاہب کے، کہ جن کے سامنے ابتداء آفرینش سے لوگ سر تسلیم خم کرتے چلے آئے ہیں، صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ جس کی اصل و بنیاد میں کوئی مرموز بات نہیں ہے۔ اُس کے پاکیزہ اور سادہ اصول میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اُس کے بے تعداد مورخین نے نہایت قابلیّت کے ساتھ اُس کی تاریخ کو برقرار رکھا ہے۔ اُس کے پیغمبر اور بانی (علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم) کی سیرت مُبارک، اور خصُوصیات و خصایل کے جزئیات تک شوقین طالب علموں کو مل سکتے ہیں٭

کسی مذہب کی کڑوی کسیلی خصوصیّت یہ ہُوا کرتی ہے کہ شروع شروع میں وُہ سختی کے ساتھ اپنے مراسم کو ادا کرایا کرتا ہے، اور ذرا ذرا سی باتوں پر زور دیا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُس کو دُنیوی وجاہت، بادشاہی صولت، حاصل ہوتی ہے تو اُس میں سُستی اور اہمال پیدا ہو جاتی ہے۔ زمانۂ حال کے ایک سب سے بڑے مُصنّف نے بہت خوب کہا ہے کہ "جو مذہب کہ غالب رہنے والا ہوتا ہے اُس میں ترک دُنیا یا ترک لذات کی تعلیم نہیں ہوا کرتی"۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلام اس خصُوص میں، جس طرح کہ اور امور میں، عام قانون انسانیت کے موافق چلا آتا ہے۔ گو اس وقت کی حالت یہ ہے کہ اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی رعایا موجُودہ مسلمانوں کے عقاید اور مراسم کو دیکھیں تو اُن کو سخت حیرت ہو، مگر وُہ رسوم مذہبی کے ادا کرنے میں ویسے ہی ہیں جیسے کہ ابتدائی مُسلمان تھے، اور سب باتوں کو قایم و محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ خاصکر حیرت اس وجہ سے ہے کہ اسلام میں مقتدایان مذہبی کا کوئی منظم طریقہ نہیں ہے۔ اس پر بھی وُہ اپنے میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ فقدان فرقۂ مقتدایان مذہبی کا جو سلطنت

٭ مکہ شریف کے متعلق یہ کہنا نہ معلوم کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ (مترجم)

کی پالیسی بناتے، اُس پر عمل کراتے، اور کسی جوشیلے آدمی کو سامنے کرکے اُمرا و عمایدکے غرور کو خاک میں ملاتے رہتے ہیں) یہ نتیجہ ہوا کہ سائینٹفک تحقیق و تفحیص کے لئے کوئی شخص یا اشخاص خارِ راہ نہ بنے، اور سب سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ قرون متوسطہ کے ظلمات سے مُسلمان بالکل بچے رہے۔ جناب سرورِ کائینات علیہ افضل الصلوٰۃ و التسلیم نے اصُولِ مسامحت قرار دے کر اُس گلا گھونٹنے والے طریقے کی جڑیں کاٹ دیں کہ جس نے اُن معلّمان فلسفہ کو، جنہوں نے علی رؤس الاشہاد اُس کی تعلیم دینی چاہی، ہر ممکن ذریعہ سے اذیتیں دیں اور نہایت خوفناک مادی و جسمانی تاوان لگا کر فلسفہ کو سرہی نہ اُٹھانے دیا۔ یہ مسامحت بیسویں صدی کی تہذیب کے مآل کے لئے سب سے بڑی خوش قسمتی کا باعث ہوا۔ اس کا نفع اُن نمازوں سے زیادہ ہوا جن میں دن بھر میں پانچ مرتبہ معبد مکہ (یعنی نئے دین کا گہوارہ، جہاں سے کہ وُہ لوز ظاہر ہوا کہ جس نے یورپ جیسے ذلیل ملک کو منور کردیا) کی طرف مومنین کا سر نہایت ادب سے جھک جاتا ہے، اور کروڑوں آدمی تنبجیر سے پیکن تک، اور حدود سائیبیریا سے لیکر خط استوا تک، اُس کی طرف سجدے میں گر جاتے ہیں۔

ہم کو چاہیئے کہ اس غیر معمولی مذہب کی سرعت ترقی، اور اُس کے دوامی اثرات کی قدر کریں کہ جو ہر جگہ امن و امان، دولت و حشمت، فرح و سرور اپنے ساتھ لے کر گیا؛ جس نے کعبہ کے بتوں کو توڑ کر تین صدیوں کی روایات کو مٹا دیا؛ جس نے اُن بُت پرستانہ رسموں کو اختیار کر لیا کہ جن کو وُہ موقوف نہ کرسکا؛ جس نے مولد مذہب مسیحی کو فتح کرکے اپنے قبضہ میں لے لیا؛ جس نے یہودیوں کی دینی حکومت، اور روم کے شرائع دینی کو دُور و دراز ممالک میں پراگندہ کردیا؛ جس نے مجوسیوں کو ایران کے منور آتش کدوں سے نکال باہر کیا؛ جس نے کلیسا بیزنطینی کو تخت دنیاوی اور عصاء دینی سے محروم کردیا؛ جس نے صحراء افریقیہ کے بتوں کو نیست و نابود کردیا؛ جس نے اسے سٹی* رس۔ اوسی رس اور ہورس

*یہ سب مصر کے دیوتاؤں اور دیویوں کے نام ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ یہ خرافات الاصنام (دیکھو صفحہ ۱۱۶)

کے رموز دینی کو ردند ڈالا، اور حیرت زدہ مصریوں کے سامنے خدار واحد جل وعلٰے شانہ کو پیش کیا؛ جس نے مذہب کیتھولک کی دینی کونسلوں پر حملہ کیا، اور اُن کو اُن کے اصل اور صحیح عقاید کی طرف راہ نمائی کی؛ جس نے عیسائیوں کے نہایت مشہور گرجاؤں میں خوبصورت محرابیں بنانے کی ترکیب بتلائی؛ جس نے کرۂ ارض کی پیمایش کر کے اُس پر اپنی مُہر لگادی؛ جس نے آسمان کے درخشندہ ستاروں پر اپنے نورانی دستخط کر دیئے؛ جس نے یورپ کی زبانوں پر نہایت نمایاں اثر ڈالا؛ جس کی فیاضیوں اور مہربانیوں کا ثبوت ہم کو ہر وقت ہمارے اُس لباس سے ملتا ہے جو ہم پہنتے ہیں، اُن غلّوں سے ملتا ہے جو ہمارے کھیتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اُن میووں سے ملتا ہے جو ہمارے باغوں سے حاصل ہوتے ہیں، اُن پھولوں سے ملتا ہے جن سے ہم لطف اُٹھاتے ہیں؛ جس نے یکے بعد دیگرے بادشاہوں کے وہ خاندان پیدا کئے جن کا اصل نصب العین یہ تھا کہ اپنی رعایا کو انتہا، عروج پر پہنچادیں، آئندہ آنے والی نسلوں کو علوم و فنون کا لازوال خزانہ دیں، اور انسان کے دماغی قوا رکی ایسی سلطنت قایم کردیں جو کبھی حوادث سے نہ مٹے۔ یہ عجیب و غریب اور بے مثال نتایج عرب کے ایک بکریاں چرانے والے ربابی وامی انت یارسول اللہ صلے اللہ علیک وسلم) کے غیر متزلزل استقلال، عظیم الشان جوہر ذاتی اور سیاسی دُوراندیشی سے پیدا ہوئے؛ جس نے اُن وحشیوں میں پرورش پائی تھی کہ جو ایسے مختلف قبایل میں منقسم تھے، کہ جن کی آتش عناد سینکڑوں برس سے بھڑکتی ہی چلی جاتی تھی؛ جن کا کوئی منظم طریقۂ سلطنت نہ تھا؛ جو کلوں سے کام لینے کو عار سمجھتے تھے، اور تجارت کو اپنی بے حرمتی؛

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) نہایت دلچسپ ہیں۔ ان کا ایک نمونہ ضمیمہ د میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے مگر میری ضرورت کے لئے تفصیل ضروری نہیں۔ کیونکہ جاء الحق وزھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا۔ مصر اور یونان کے خرافات الاصنام نہایت دلچسپ ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس کو جمع کرلیں تو اُردو والوں کے لیئے ہنسنے ہنسانے کا اچھا مواد ہے میری نگاہ بار بار عزیز ارجمند سید امتیاز علی تاج (مولوی سید ممتاز علی صاحب کے صاحبزادہ بلند اقبال) کی طرف جاتی ہے۔ امید ہے کہ وہی میری اس تمنا کو پورا کرینگے۔ (مترجم)

جو سوا جبر و تشدد کے کسی قانون کو خاطر میں نہ لاتے تھے؛ سوا چند ان گھڑ بدصورت بتوں کے کسی خدا کو نہ مانتے تھے؛ قزاقی اُن کا پیشہ تھا اور قتل اُن کی دل لگی؛ اُن کا کوئی دوست بجز اِس کے اُس سے اُن کا خون ملا ہوا ہو، اُن کے خیمہ کے باہر محفوظ نہ تھا؛ جو دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے میدان جنگ میں قتل کرتے تھے اور اُنکا گوشت کھا جاتے تھے۔ دغا فریب اُن کے یہاں لا باس بہ تھا؛ بے رحمی اُن کی نہایت نمایاں قومی خصوصیّت تھی؛ اُن کا مکروہ تجنتر، کبھی نہ مٹنے والی دشمنی، اور اپنے مقصود کے حاصل کرنے میں ضد؛ اُن کی جاہلیّت اور وحشت، فال لینے اور مدتہار مدید کے افسانوں سے اور بھی مستقل ہو گئی تھی۔

جب تمدّنی و سیاسی حالت یہ ہو تو اصلاح کا بیڑا اُٹھانا سخت خوفناک اور بظاہر ایسا مشکل کام تھا کہ جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اِس اصلاح کا اتمام و انصرام یہ نہ ظاہر کرے کہ اُس میں امداد ایزدی شامل تھی، گر وہ جلیل القدر وقایع و سوانح، جن سے تاریخ اسلامی مزیّن ہے، بالکلیہ طور پر انسان کی شجاعت صلاحیت، ذہانت اور جوہر ذاتی کا نتیجہ تو ضرور ہو سکتے ہیں اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو ان کارناموں کے سہرے کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے کہ جس نے اس اصلاح کا نقشہ جمایا، اور وہ قواعد منضبط کئے کہ جو اس کی کامیابی کے ضامن ہوئے۔ بہر کیف اگر مذہب کی غرض و غایت تہذیب اخلاق، انعدام ذمایم، رفعت سعادات انسانی اور شیوع ترقی دماغی ہو؛ اگر اعمال صالح اُس عظیم الشان یوم الحساب میں کام آنے والے ہیں، تو یہ مان لینا نہ کسی کی گستاخی ہے نہ بلا وجہ موجہ کہ محمد بے شبہ رسول خدا تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم

حقّا کہ آنانے کہ عمرے در ہوایت بودہ اند
وین زماں در ساحتِ قربِ تو خوش آسودہ اند
حقّا کہ آنانے کہ راہے را کہ خود پیمودہ اند
پائے از سر ساختہ ایشاں ہماں پیمودہ اند
حقّا کہ آنانے کہ از راہِ ضلالت خلق را
جز بصورت شارعِ شرعِ تو رہ ننمودہ اند
از سحابِ فیضِ لطفِ عامِ خود رشحے بریز
بر دل و جانم کہ از لوثِ گنہ آلودہ اند

تعلیقات

ضمیمہ الف باب دوم

گاتھ GOTH عربی قوط ۔ زمانۂ قدیم کی ایک نہایت طاقتور قوم، جرمن نسل کی تھی۔ اُن کے بعض مورخین اپنے آپ کو سکینڈے نیویا کے رہنے والے بتلاتے ہیں۔ لیکن زمانۂ حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وُہ جرمن ہی ہیں۔ ان کو سب سے پہلے نمود اُن کے ایک سیّاح کی وجہ سے ہوئی جس کی کتاب کے حصّے اب تک باقی ہیں۔ یہ شخص سکندر سے پہلے گزرا ہے۔ تیسری صدی مسیحی میں ان کا بحر اسود پر آکر آباد ہونا تواریخ میں درج ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے اپنے وطن اصلی کو کیوں چھوڑا۔ ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ اُن کے یہاں آنے کی وجہ وَبا تھی یا قحط، فتح یا شکست، کسی دیوتا کی طرف سے الہام تھا یا کسی سپہ سالار کی افہام و تفہیم کہ جس نے گاتھوں کو یہاں منتقل ہونے پر مائل کیا۔ یہ ملک اُنھیں کچھ ایسا راس آیا کہ اُن کی تعداد اور قوت میں خوب زیادتی ہوئی۔ یہاں تک کہ شاہ الگزنڈر سیویرس کے زمانہ میں (۲۲۲ء سے ۲۳۵ء تک) اُنھوں نے روم کے صوبہ موسُومہ ڈیشیا پر سخت تاخت و تاراج کی۔ ۲۴۴ء اور ۲۴۹ء کے درمیان میں اُنھوں نے اس صوبہ کو تباہ کر ڈالا اور مرشیا نوپولس کا محاصرہ کر لیا۔ محصُورین نے بہت ساز رومال دے کر محاصرہ اُٹھوایا۔ بعد میں پھر ستّر ہزار فوج لے کر حملہ کیا۔ لیکن جب اُنھوں نے سُنا کہ اُن کے مقابلہ کے لئے رومیوں کی ایک فوج آ رہی ہے تو وہاں سے تھریس کی طرف بھاگ گئے۔ مگر رُومی اُن کی تعاقب میں چلے تو پھر گاتھوں نے پلٹ کر اُن پر ایسا حملہ کیا کہ رُومیوں نے شکست فاش کھائی۔ یہاں فتح پا کر وُہ فلپو پولس پہنچے، اور وہاں قتل عام کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایک لاکھ بے گناہوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ یہ واقعہ ۲۵۰ء کا ہے۔ دُوسرے ہی سال اُنھوں نے رومیوں کو پھر سخت شکست دی، اور قتل عام کیا، جس میں رومیوں کا بادشاہ ڈےشی اس اور اُس کا بیٹا مارا گیا۔ جو بادشاہ اُس کی جگہ تخت پر بیٹھا اُس نے بہت کچھ دے دلا کر، اور آیندہ سالانہ خراج ادا کرتے رہنے کے وعدہ پر اپنی جان بچائی۔ ۲۵۳ء میں گاتھوں نے جہازوں کا ایک بیڑا حاصل کر لیا، اور یونان کے ایک شہر پہ

جا حملہ کیا۔ ۲۵۸ء میں اُنہوں نے ترابزون کا محاصرہ کیا؛ اس محاصرہ میں ایک اور بہت بڑا بیڑا اُن کے ہاتھ لگ گیا۔ ان جہازوں میں اُنہوں نے شہر کی تمام دولت جمع کی، اور وہاں کے جوان آدمیوں کو جہازوں پر ہی باندھ دیا۔ اُن کی قوت روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ اُن کے بیڑے میں پانچ سو جہاز ہو گئے۔ اس اثنا میں نہ وُہ ایک دن بھی چین سے بیٹھے نہ کسی کو بیٹھنے دیا۔ ۲۶۲ء میں اُنہوں نے ایتھنز پر حملہ کر کے اُس کو تباہ کیا اور قرب و نواح میں جو مقامات تھے اُن کو یا تو تباہ کر ڈالا یا لوٹ لیا۔ اٹلی کی طرف بھی اُن کی نظر عنایت ہوئی؛ مگر وہاں کا بادشاہ اپنی غفلت سے چونک اُٹھا اور اُس نے ان سے مقابلہ کی تیاری کی۔ اس مرتبہ گاتھوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ ۲۶۹ء میں وُہ پھر بحری مہم کے لئے اور بھی زیادہ جمعیّت لے کر چلے۔ یورپ اور ایشیا کے سواحل کو برباد کرتے ہُوئے تھیسے لونیکا کے سامنے لنگر انداز ہُوئے۔ یہاں اُن کے مقابلہ کے لئے ایک بہت ہی لایق سپہ سالار مل گیا جس نے اُن کی فوج کو، جس کی تعداد تین لاکھ بیس ہزار تھی بُہت بُری طرح شکست دی۔ ان کا بیڑہ تباہ کر دیا گیا، اور اُن کا قتل عام کر دیا گیا۔ بقیۃ السیف بھاگے مگر پہاڑوں میں پھنس کر بھُوکے مر گئے۔ گاتھوں کی گویہ پہلی ہی شکست تھی۔ مگر وُہ بہت جلد سنبھل گئے اور ۲۷۲ء میں بادشاہ اٹلی نے مجبُور ہو کر ایک بہت بڑا علاقہ اُن کے حوالہ کیا۔ اس کے بعد قریباً پچاس برس تک گاتھوں اور رُومیوں میں صُلح رہی۔ جب قسطنطین تخت پر بیٹھا تو گاتھوں کے بادشاہ الارک نے چھیڑ نکالی، لیکن رُومیوں سے دب کر صلح کرنی پڑی۔ چند روز کے بعد یہ رُومیوں پر چڑھ دَوڑے اور تین برس متواتر لڑتے رہے۔ اسی موقعہ پر گاتھوں کو دو قسموں میں منقسم کیا گیا؛ ایک آسٹرو گاتھ (مشرقی گاتھ) اور دُوسرے وزیگاتھ (مغربی گاتھ) کہلانے لگے، کیونکہ پہلے بحر اسود کے رہنے والے تھے اور دوسرے سواحل ڈینیوب کے۔ جب ہنس HUNS اپنی وحشت اور تباہی کو لئے ہُوئے گھر سے نکلے تو گاتھوں نے اُن سے ڈر کر شاہ ویلنس VALENS کی پناہ لے لی۔ دو لاکھ گاتھ تو اِدھر اُدھر چلے گئے اور بہت سوں نے رومیوں کی فوج میں نوکری کر لی۔ لیکن بہت ہی جلد یہ ویلنس سے ۳۷۸ء میں لڑ پڑے، اور ایڈریانوپل میں اُن دونوں کی فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ اسی میں ویلنس مارا گیا۔ اب گاتھوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، مگر اُس پر قبضہ نہ کر سکے۔ اس واقعہ کے بعد گونہ امن رہا۔

اب وزیگاتھ اور آسٹروگاتھ نے دو راستے اختیار کر لئے اور اُن کی تاریخ بھی یہاں سے الگ الگ ہو گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ ان دونوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ چوتھی صدی کے وسط میں گاتھوں کا بڑا حصّہ عیسائی ہو گیا۔ اب ان دونوں کی مختصر تاریخ ملاحظہ فرمایئے۔

وزیگاتھ۔ جب ۳۹۵ء میں تھیوڈوسی اس اعظم مر گیا اور ملک ہانوری اس اور ارکیڈی اس کے درمیان میں تقسیم ہو گیا، توالارک، بادشاہ وزیگاتھ نے چاہا کہ مشرقی سلطنت اُس کو اپنا سپہ سالار مان لے۔ جب اس سے انکار ہوا تو اُس نے اپنے آدمیوں کو لے کر یونان پر حملہ کر دیا۔ پھر ۴۱۰ء میں اُس نے اٹلی پر حملہ کر کے روم کو لُوٹ لیا؛ صقلیہ اور افریقیہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ موت نے آدبایا۔ اس کے بعد اتھولف تخت پر بیٹھا۔ اس نے ہانوری اس کی بہن سے شادی کر لی اور اٹلی کو چھوڑ کر ۴۱۲ء میں جنوبی گال کے راستہ پائرے نیز سے گزرتا ہوا اسپین میں پہنچ گیا۔ یہاں بارشلونہ میں اُس کو کسی نے قتل کر دیا۔ جو شخص اس کی جگہ بادشاہ ہوا وُہ سال بھر کے اندر ہی مر گیا، تو گاتھوں نے والیا کو (۴۱۵ء سے ۴۱۸ء تک) تخت پر بٹھایا۔ اُس نے جنوبی گال اور سپین پر قبضہ کر لیا اور ٹولوس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ گاتھوں نے اپنے اس بادشاہ کے ماتحت رُومیوں کو بہت کچھ مدد دی اور وینڈال اور الانی کے ساتھ رومیوں سے متحد ہو کر لڑے۔ والیا کے بعد تھیوڈورک و لدالارک (۴۱۸ء سے ۴۵۱ء تک) بادشاہ ہوا۔ وُہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اُس کے بعد تھورس منڈ بادشاہ ہُوا (۴۵۱ء سے ۴۵۲ء تک) اس کو اس کے بھائی تھیوڈورک دویم نے مار ڈالا۔ یہ ۴۵۲ء سے ۴۶۶ء تک حکمران رہا۔ اس کو بھی اس کے بھائی یورک نے مار ڈالا۔ یہ شخص ۴۶۶ء سے ۴۸۳ء تک بادشاہ رہا۔ اس کا زمانہ بڑا کامیاب زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے وزیگاتھ کی سلطنت کو فرانس کے بڑے حصّے اور سپین تک پھیلا دیا۔ اپنی رعایا میں تہذیب و تمدّن بڑھائی، ایک قانون نافذ کیا، جس میں عدل و انصاف کے بہت سے نکات رکھے۔ اس کے جانشین الارک دویم (۴۸۳ء سے ۵۰۶ء تک) اور امالارک (۵۰۶ء سے ۵۳۱ء تک) وزیگاتھوں کو فرانس نے سخت نقصان پہنچایا۔ پھر تھیوڈوس تخت پر بیٹھا تو اُس کے پاس سوائے سپین کے کچھ نہ رہا تھا۔ یہ بھی ۵۴۸ء میں بارشلونہ میں قتل کیا گیا۔ یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ ہر ایک بادشاہ کا جو سپین پر حکمران رہے یکان یکان

حال بیان کیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ اسی خاندان کا آخری بادشاہ راڈرک تھا جس سے مسلمانوں نے ملک سپین فتح کر لیا +

آسٹروگاتھ کی تاریخ بیان کرنا ہمارے مقصد کے لئے ضروری نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت روم کو تباہ کیا اور بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ مگر ۵۵۲ء میں اُن پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ تاریخ میں ان کا نام بھی نہیں رہا + (مترجم)

ضمیمہ (ب) باب دوم

وینڈال VANDAL یورپ کی ایک بڑی مشہور وحشی قوم۔ بعضوں کے نزدیک اُسی نسل کے ہیں جس کے جرمن کے لوگ۔ بعض ان کو گاتھوں کا ہم جد کہتے ہیں۔ سواحل بحر ازاف کے رہنے والے تھے، مگر وہاں سے نکل کر شمال و مغرب کی طرف پھیلے اور جنوبی بالٹک میں آبسے۔ اُن کا نام تاریخ میں دوسری صدی مسیحی میں آتا ہے۔ اُس ہی زمانہ میں اُنہوں نے پانونیا کو لوٹا اور شاہ مارکس اوری لی اُس سے لڑے۔ تیسری صدی عیسوی کے نصف آخر میں وُہ گاتھوں کے ساتھ رومی صوبہ ڈیشیا میں نظر آتے ہیں۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ گاتھوں کے ایک بادشاہ نے اُن کو دریائے ماروس پر تباہ کیا۔ بقیۃ السیف کو قسطنطین نے پانونیا میں آباد کیا۔ یہاں یہ ساٹھ برس تک نچلے بیٹھے رہے۔ پانچویں صدی کے شروع میں وُہ جرمنی کی تین قوموں کو اپنے ساتھ لے کر اپنے بادشاہ کی سرکردگی میں نکل کر گال میں بلا کی طرح پہنچے اور تین برس تک بے طرح اُس کو لُوٹتے رہے۔ یہاں جب سب کچھ تباہ کر چکے تو پائرے نیس سے اُتر کر سپین پہنچے اور یہاں بھی وُہی مصیبت ڈھائی۔ آخر میں وُہ اپنے جرمنی ہمراہیوں سے لڑ پڑے، اور اُن کو مار کر نکال دیا۔ اس کے بعد وُہ بے ٹی کا کے ایک حصّہ میں آباد ہوئے، اور اُن کی وجہ سے اس حصّۂ ملک کا نام وینڈالیشیا پڑ گیا، جو شدہ شدہ انڈلوشیا بن گیا۔ ۴۲۹ء میں وُہ گورنر افریقیہ کے بُلانے پر آبنائے جبل طارق سے گزرے۔ اس وقت

ان کی تعداد پچاس ہزار سے لیکر اسّی ہزار تک بتلائی جاتی ہے۔ راستہ میں اُنہوں نے سواحل بحر اطلانٹک سے لے کر سائے رین تک بالکل خاک سیاہ کر دیا۔ افریقیہ کے کچھ لوگ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان دونوں نے ملکر عیسائیوں کو بدترین بے رحمیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ جس گورنر نے ان کو اپنی مدد کے لئے بُلایا تھا اُس کو اب اپنی حماقت معلوم ہوئی۔ اور اپنی فوج لے کر ان کو نکالنے کے لئے نکلا اور ۱۴ مہینہ تک ان کو مقابلہ کرتا رہا۔ سلطنت بیزنطینی نے بھی اس کی فوج سے بسرکردگی ایسپار مدد کی مگر دُوسری ہی شکست میں افریقیہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ۴۳۵ء میں قرطاجنہ پر اُنہوں نے قبضہ کر لیا۔ ایک نیا صلح نامہ ہوا جس کے موافق ونڈالوں کا اقتدار شمالی افریقیہ پر اطلانٹک سے لیکر سائرین تک اور جزائر بلیارک، سارڈینیا، کارسیکا اور صقلیہ کے ایک حصّہ پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۴۵۵ء میں ونڈالوں نے اٹلی پر حملہ کیا اور ۱۴ روز متواتر روم کو لُوٹتے رہے۔ جس طرح اُنہوں نے رُومیوں کی صنعت گری کے بہترین نمونوں کو تباہ کیا اُس پر اب تک تاریخ خون کے آنسوؤں سے روتی ہے۔ اسی سے "ونڈالزم" وحشت کا مرادف ایک محاورہ بن گیا ہے۔ ۴۷۷ء میں ونڈالوں کے ایک بادشاہ نے رومن کیتھولکوں کو بہت ہی بے رحمی سے ستایا؛ شمالی افریقیہ میں پہنچ کر مسلمانوں سے لڑے، اور بحر شام میں قزاقیاں کرتے پھرے۔ ۵۲۳ء میں جو ان کا بادشاہ تھراسامنڈ نامی تھا وُہ نسبتاً نرم دل تھا اور علم ادب کا بھی جزوی شوقین تھا۔ افریقیہ کی آب وہوا اور تکلفات وعیش نے اُن پر اثر ڈالا، اور یہ کیفیت ہو گئی لوگوں نے اُن سے ڈرنا چھوڑ دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تھراسامنڈ جب مسلمانان طرابلس سے لڑنے گیا تو اُس نے اپنے بہنوئی سے مدد مانگی۔ اس شخص کے بعد اُس کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو یہ رومن کیتھولکوں کا بڑا حامی ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی رعایا اُس سے ناراض ہو گئی۔ چنانچہ اُس کے چچا نے اُس کو ۵۳۰ء میں تخت سے اُتار دیا۔ شاہ قسطنطنیہ نے، جو خود کیتھولک تھا، بھتیجے کی مدد کی اور چچا کو گرفتار کر لیا۔ اُس کے ساتھ جتنے آدمی گرفتار ہوئے اُن کو اپنی فوج میں رکھ لیا، جو ایران کی لڑائی میں مارے گئے۔ جتنے ونڈال افریقیہ میں رہ گئے تھے وُہ وہاں کے باشندوں میں مل جل گئے۔ یوں ایک نہایت وحشی اور تباہ کُن قوم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ (مترجم)

ضمیمہ (ج) باب دوم

ہے مل کار HAMILCAR المعروف بہ "برق" بہت ہی تھوڑی عمر کا تھا کہ ۲۴۷ء ق م میں سلطنت قرطاجنہ کی طرف سے صقلیہ کی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ اُس زمانہ میں رومی اُس تمام جزیرہ پر حکومت کر رہے تھے۔ ہیملکار نے پہلے اپنی فوج کو سدھایا اور پھر ایک پہاڑ پر بیٹھ کر رومیوں پر حملے کرنے شروع کئے۔ اُنہوں نے بھی اس کا مقابلہ کیا، مگر ہیملکار تین برس کے بعد اُس نے اس مقام کو چھوڑ دیا، اور دُوسرے پہاڑ پر سے اپنے حملوں کو جاری رکھا۔ ۲۴۱ء ق م میں قرطاجنہ کے امیر البحر کو شکست ہوئی۔ اس سے ہیملکار کو بھی ضعف پہنچا۔ مگر اُس نے اپنی فوج کو بڑے بڑے وعدے دیکر صقلیہ پر قبضہ کر لینے پر آمادہ کیا۔ لیکن اتفاق سے وُہ اپنے وعدوں کا ایفانہ کر سکا۔ اس لئے اُس کی فوج نے بغاوت کر دی۔ ہیملکار نے نہ صرف اس بغاوت کو فرو کر کے سرغنوں کو سزا دی، بلکہ تمام جزیرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ہیملکار کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد وُہ قرطاجنہ کی افواج کا سپہ سالا بنادیا گیا، اور ہمسایہ اقوام سے لڑتا رہا۔ وُہ یہ چاہتا تھا کہ سپین میں ایک نئی سلطنت قایم کر دے اور وہاں سے رُومیوں پر حملے کرے۔ مگر یہ آرزو پُوری نہ ہوئی۔ نو برس وُہ وہاں رہا بھی مگر آخر رُومیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

ہے نی بال HANNIBAL (لفظی معنی بعل کا بخشا ہوا) ہیملکار مذکورہ بالا کا بیٹا تھا اور باپ سے بھی زیادہ مشہور سپہ سالار تھا۔ ۲۴۷ء ق م میں پیدا ہوا۔ نو ہی برس کا تھا کہ اپنے باپ کے ساتھ سپین کی مہم میں رہا۔ وہاں جانے سے پہلے قسم کھا کر گیا تھا کہ تا مرگ رومیوں کا دشمن رہونگا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی مہمیں اپنی سرکردگی میں کیں۔ اس سے اس کی شہرت بہت بڑھ گئی اور تمام سپاہ اُس کی گرویدہ ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی جلد سپہ سالار ہو گیا۔ قرطاجنہ سے بھی اس کی منظوری آگئی۔ کسی بڑی مہم پر جانے سے پہلے اُس نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے سپین پر قبضہ کر لیا جائے۔ اسی غرض سے وُہ اُن اقوام سے دو برس تک لڑتا رہا جو اب تک قرطاجنہ کے زیر حکومت

نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد اُس نے رُومیوں کے شہروں پر حملے کرنے شروع کئے۔ مختلف جنگوں میں اُس نے فتوحات کیں، لاکھوں رومیوں کو گرفتار کیا، سیکڑوں شہروں کو اپنے قبضہ میں لایا۔ اور وُہ بہادری دکھلائی کہ آج تک اُس کا نام یورپ میں آفتاب نصف النہار کی طرح چمک رہا ہے اور یہ ہینی بال جرات و بسالت کا مرادف ہے۔

ایک لڑائی میں رومیوں نے اُس کو شکست دی۔ یہ دُوسرے بادشاہ کے پاس بھاگ گیا۔ رُومیوں نے اُس کو مانگا، پہلے تو اس نے اُس کو نہ دیا لیکن آخر مجبُور ہو کر راضی ہو گیا۔ ہینی بال نے یہ سُن کر زہر کھا لیا۔ اتنے بڑے بہادر کا یہ افسوسناک انجام ہے۔ (مترجم)

ضمیمہ (د) باب دوم

آئی سس ISIS مصر قدیم کے خرافات الاصنام میں ایک دیوی کا نام ہے۔ ہمارے لئے اس کی تفصیل کی ضرُورت نہ تھی، مگر چونکہ اس کا حال دلچسپی سے خالی نہیں ہے اِس لئے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ذیل میں درج ہے۔

آئی سس کو اوسی رس کی بہن اور بیوی بتلایا جاتا ہے۔ اس کو ہیس بھی کہا جاتا تھا سیب کی بیٹی تھی۔ جب اوسی رس کو تائی فون نے مار کر دریا نیل میں بہا دیا تو آئی سس کو اس کی اطلاع دی گئی، وُہ فوراً سوگ میں بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے بچّوں سے یہ معلوم کیا کہ اُس کے شوہر کو دریائے نیل میں کسی جگہ ڈالا گیا ہے تو وُہ انوبس کو لے کر وہاں پہنچی اور اُس کا صندوق وہاں سے نکال لیا، اور ایک چشمہ پر اُسے لے کر بیٹھ گئی، مگر اُس کے بالوں کی خوشبُو کی لپٹیں جب پھیلیں تو ملکہ استارطہ نے اُس کو اپنے محل شاہی میں بُلا کر اپنے بچّوں کی انّاگری پر لگا دیا۔ ان میں سے ایک کو اُس نے اپنی اُنگلی منہ میں دے کر پال لیا، اور یوں اُس کو غیر فانی بنا دیا؛ اور خود ابابیل بن کر اپنے شوہر کے صندوق کے گرد اُڑتی اور اپنی قسمت پر روتی پھری۔ وُہ ایسی پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ ملکہ کا چھوٹا بچّہ ڈر کے مارے مر گیا۔ پھر وُہ

آسی رس کی لاش کا صندوق اُٹھا کر اور ملکہ کے بڑے بیٹے کو لیکر مصر کی طرف چلی۔ راستہ میں اُس نے ایک دریا کو خشک کر دیا اور اُس بڑے بیٹے کو اپنی ایک نگاہ گرم سے مار ڈالا؛ کیونکہ وُہ اُس کے رنج و غم کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے صندوق کو ایک محفوظ جگہ خفیہ طور سے رکھ دیا۔ تائیفون نے کسی طرح یہ جگہ معلوم کر لی اور اوسی رس کی لاش کو نکال اُس کے ۲۶ یا ۱۴ ٹکڑے کئے اور اُن کو ملک بھر میں ادھر اُدھر پھینک دیا۔ آئی سس نے بمشکل تمام پھر تمام ٹکڑے جمع کئے؛ مگر ایک نہیں ملا کیونکہ اُس کو مچھلیاں کھا گئی تھیں۔ جمع شدہ ٹکڑوں کو اُس نے ایک دیوتا کے بُت میں بھر دیا، اور مصر کے بڑے بڑے شہروں میں تقسیم کر دیا۔ اسی واسطے ہر شہر کو یہ دعویٰ ہے کہ آسی رس وہیں پیدا ہوا تھا جب ہورس اور تائیفون کی لڑائی ہوئی تو آئی سس نے موخرالاسم کو آزاد کرا دیا؛ اور اُس کے سر کا تاج توڑ پھوڑ کر اُس کی جگہ ایک اور تاج بنا دیا جو گائے کی شکل کا تھا۔

دیوتا ر . ر و مُیرس ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ آئی سس اُس کی ماں بن چکی تھی۔ دیوتا ہارپوکریٹس کی ماں بھی وُہ اُس کے پیدا ہونے اور آسی رس کے مرنے کے بعد بنی۔ آخر اُس نے آسی رس کو فلائے میں دفن کیا۔ فرعون رہیمپ سی ٹی ٹس نے اُس کے ساتھ نرد میں کھیلیں۔ اُس کی رُوح اُس ستارے میں چلی گئی جو نجم الشعری الیمانیہ کہلاتا ہے۔ تمام مصر میں وُہ پوجی جاتی تھی؛ فلائے میں تو اُس کے نام کا میلہ ہوتا تھا۔ اُس کے آنسو ہی ہیں جو دریائے نیل میں طغیانی پیدا کرتے ہیں +

جو کتابے وغیرہ اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں اُن میں آئی سس کو دیوتاؤں کی ماں، بہشت کی ملکہ، آسی رس کی بہن اور بیوی، ہورس کی انّا، بھائی پر رونے والی، آفتاب کی آنکھ اور دیوتاؤں کی سرپرست" لکھا ہے بحیثیت دُنیوی وسفلی دیوی ہونے کے اُس کے سر پر تخت شاہی ہے (جو اُس کے نام کا مرادف ہے) بحیثیت سماوی و علوی دیوی کے اُس کے سر کے تاج میں ایک قرص ہے اور دو سینگ، یا لمبے لمبے پروں کی کلغی۔ اُس کی تصویر اکثر اس طرح کھینچی گئی ہے کہ وُہ ہورس کو دُودھ پلا رہی ہے؛ کہیں کہیں اُس کی صُورت گائے کی سی ہے۔ یعنی اتھور دیوتا کی گائے، جس سے کہ آفتاب پیدا ہوا تھا۔

روم میں بھی آئی سس کی پُوجا ہونے لگی۔ ۸۶ سنہ ق م میں ایک شخص سُلّا نامی نے اُس کو یہاں پھیلایا۔ یہاں بھی یہ خوب پوجی گئی +

زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں + (مترجم)

باب سویم

فتح ملک المغرب

سنہ ۶۴۷ء سے سنہ ۷۰۷ء تک

جناب رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد کے حالات۔ شرع شریف۔ فتوحاتِ جیوشِ اسلامی۔ شمالی افریقیہ یا ملک مغرب۔ اُس کی زرخیزی۔ وہاں کی آبادی۔ عبداللہ کی مہم۔ یونانیوں کی ہزیمت۔ عقبہ کا حملہ۔ شہر قیروان کی بُنیاد۔ حسن کا حملہ۔ قرطاجنۂ قدیم۔ یورپ پر اُس کا اثر۔ اُس کی محیر العقول تہذیب و تمدّن۔ اُس کی قوت بحری۔ اُس کی بستیاں۔ اُس کے ذرایع۔ شہر قرطاجنہ کے اوصاف و حالات۔ اُس کی تعمیری شان و شوکت۔ اُس کے بنا در و منا ور و عمارتہا عامّہ۔ زمانۂ عروجِ روم میں قرطاجنہ کی حالت۔ اُس کے تکلفات و شناعت۔ اُس کی مسلمانوں کے ہاتھوں بربادی۔ برابرہ سے جنگ۔ موسےٰ ابن نصیر رحمۃ اللہ علیہ کی سپہ سالاری۔ اُن کے عجیب و غریب حالات زندگی۔ اُن کے خصایل۔ اُن کا ملک مغرب پر غلبہ و تسلّط۔ افریقیہ کی مستقل تہذیب کی ناقابلیّت۔

جناب سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد ہی درشت خو معاشر عرب کی طبیعت ثانیہ، یعنی جنگجوئی، جس نے اُن کو کبھی کسی کا باج گزار نہ بننے دیا، اور جس کو حضور

اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے تعجب خیز رعب نے بمشکل روک رکھا تھا، نہایت تیزی اور سختی کے ساتھ پھر رنگ لائی۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے نہ صرف دنیا، اسلام کے اندرونی نظام کو معرض خطر میں ڈال دیا، بلکہ اس نوزائیدہ دین کی آئندہ زندگی کے لئے باعث خدشہ ہوگئی۔ باستثناء چند قبایل کے، جن کے آپس میں عزیزداریاں تھیں، یا جن کو حرمین شریفین کے لوگوں سے بوجہ تعلقات تجارت اپنے ذاتی مفاد کا لحاظ تھا، تمام ملکِ عرب بکف شمشیر ہوگیا۔ چھوٹے چھوٹے رؤسا، کچھ تو اس نوخیز سلطنت کی رشک کی وجہ سے، کچھ اپنی قابلیت قانون سازی کے خیالِ باطل کے بھروسہ پر، اپنے آپ کو ملہم سمجھنے اور وہ خطابات اپنے لئے تجویز کرنے لگے، جو انبیا ہی کے لئے وضع ہوئے ہیں۔ جن عوام الناس نے کہ بظاہر احکام قرآنی کو نہایت خلوص، مگر بہ باطن منافقت کے ساتھ قبول کیا تھا، اور فی الحقیقت اب تک بت پرست و کافر تھے، جدید ملہموں اور لذیذ الہاموں کا اس لئے خیر مقدم کیا کہ اُن کے ذریعہ سے جنگ و نا اتفاقی کی وہ آگ نہایت آسانی سے مشتعل ہوسکتی تھی کہ جو صدہا سال سے اُن کے آباواجداد کے دلوں کو گرماتی رہی تھی۔

حالت اس درجہ نازک ہوگئی تھی کہ کسی بڑے تجربہ کار مدبر کے ہوش و حواس کو مختل کرنے کے لئے کافی ہوتی؛ لیکن خلیفۂ اوّل (رضی اللہ عنہ) نے، باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک تجارت پیشہ آدمی تھے، مگر اپنے منصب عالی کے نازک فرایض ادا کرنے کی پوری قابلیت رکھتے تھے، اس خرابی کا پورے طور پر انسداد کردیا۔ باغی فوج بالکل تباہ کردی گئی، انبیاء کاذبین قتل یا جلاوطن کردیئے گئے، یا اگر یہ نہ ہوا تو اپنے دعاویٔ باطلہ سے تایب ہونے پر مجبور کئے گئے۔ باغی قبایل غارت ہوگئے، اور اُن کی جایداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہوکر مال مغروقہ سمجھی گئی۔ صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) نے اہل عرب کی طبایع کا اندازہ کرکے اُن کی آتش مزاجی اور آشفتگی طبع کو اشاعت اسلام، اور غیر متیقن و غیر متعین حدود ممالک مسلمین کی ترقی کے کام میں لگا دیا۔ تدابیر ملک داری و ملک گیری آپ کے مدبرانہ نظام نے قایم کردی

دی تھیں، خلیفہ دویم، یعنی فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ)، کی قابلیّت سپاہیانہ و عزم و استقلال نے اس پایۂ تکمیل پر پہنچا دیا۔ موخر الذکر خلیفہ نے یہ دیکھ کر کہ اُن کی قوم نے ملک گیری و ملک داری کا وُہ جوہر دکھلایا ہے کہ وُہ تمام ماسبق اقوام فاتح سے اس خصوص میں ہر طرح بڑھ گئے ہیں، اور دُنیا کے دیگر ممالک سے گو، سبقت لے گئے ہیں، اپنی دُور اندیشی سے یہ ضروری سمجھا کہ ایسی قوم میں اتفاق قایم رکھنا، اور اس کی عزّت و شکوہ کو بڑھانا، بہترین تدبیر ہے۔ اسی بنا پر ثمرۂ فتوحات، یعنی مفتوحہ اقوام کے تحایف، ایشیا کوچک و عراق کے محاصل زمین، دریا نیل کی پیداوار اراضی، وُہ تحایف فاخرہ جو دُور افتادہ سلاطین اہل عرب کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہنے کے لئے بھیجتے تھے، غرض تمام قسم کے فتوحات بیت المال میں داخل کئے گئے۔ جس سے عرب کے بچّہ بچّہ کو حسب حیثیّت وظایف دیئے جاتے تھے۔ اور عمر و منصب و قابلیّتِ سپاہیانہ کے لحاظ سے ترقی پاتے تھے۔ ہر شخص کو، خواہ وُہ کیسا ہی کم حیثیّت کیوں نہ ہوتا، یہ حق حاصل تھا کہ وُہ اپنا نام فہرست وظیفہ خواران میں داخل کرا لیتا، حتیٰ کہ غلام، عورتیں اور دُودھ پیتے بچّے بھی، بڑے بڑے جنگ آزمُودہ سپاہیوں کے ساتھ تنخواہ پاتے تھے۔ قواعد مخترعۂ خلیفہ دویم کے موافق مختلف ممالک، جو اہل عرب کی قوت بازو سے فتح ہُوئے تھے، ناقابل انتقال اور جمہُور کا غیر منفک حِصّہ قرار پائے۔ اُن پر فاتحین کو حق قابضانہ نہیں دیا گیا، بلکہ تمام اراضی پہلے مالکوں اور کاشتکاروں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں۔ ان ہی قواعد کے موافق اہلِ عرب کی سکونت دوامی ملکِ عرب ہی میں قرار پائی؛ باشندۂ عرب، خواہ کسی درجہ و رتبہ کا ہو، بیرون وطن جہاں کہیں تھا غیر مستقل ساکن سمجھا جاتا تھا؛ اور بلا اس کے کہ اُس کو پہلے سے کوئی اطلاع دی جائے ہر وقت و ہر آن، میدان جنگ میں کفار کے مقابلہ کے لئے طلب کیا جا سکتا تھا۔ نایب خلیفہ بھی، اُن شہروں میں جہاں، باوجود اختیارات کلّی رکھنے کے مطلق العنان نہیں ہوتا تھا، ایک گز زمین اپنے لئے نہیں خرید سکتا تھا۔ عورتیں جو قید ہو کر آتی تھیں بلا کسی روک ٹوک کے، ہر شخص لے سکتا تھا۔ مسلمانوں کو خاص طور پر ہدایت تھی کہ وُہ اپنے تعلقات مناکحت صرف اہل عرب تک ہی محدُود رکھیں۔ اُن کے بچّوں کو، بلا کسی استثنا کے، ابتدا عمر ہی

سے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ، از روئے حق پیدائش، اپنے آپ کو سب سے فائق سمجھے، اور غیر عرب کو، خواہ وہ کیسا ہی عالی خاندان، متمول، بہادر سپاہی، یا عالم و فاضل، ہو اپنے آپ سے حقیر سمجھے۔

(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا ہمہ گیر اور سخت قانون نہ صرف قانون دیوانی و فوجداری ہی پر حاوی تھا، بلکہ خزانہ، صف بندی فوج، تنازعات حد بندی، انتظام مانند و بود، اور مذہب، سب کو منسلک کئے ہوئے تھا، اور اسلام کی آیندہ عظمت و شان کا گویا بنیادی پتھر تھا[1]۔ اُن ہی کے حکم سے ہجری سال قرار دیا گیا۔ اُن کی طبعی انصاف پسندی نے شراب کے انسداد کے لئے سزا، تازیانہ مقرر کی، جس سے نہ امیر بچ سکتا تھا نہ غریب، جو قانون اُن کی طرف منسوب ہے، اُس زمانہ جوش میں بھی سخت حیرت انگیز سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ مسلمانوں نے صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے رواج و مراسم ادا کرنے میں آزاد کر رکھا تھا، لیکن باوجود اس کے فی الحقیقت اس قانون نے اُن کی آزادی پر بھی روک تھام کر رکھی تھی۔

قبل اس کے کہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) اپنے ارادوں کو قوہ سے فعل میں لا سکتے، جوانی ہی میں شہید کر دیئے گئے۔ یہ شہادت گویا انتقام، سازش، اور خانہ جنگی کے لئے ایک بہانہ ہو گیا، جو مدتوں سے رشک و حسد، یا کسی آرزو کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے، لوگوں کے دلوں میں پوشیدہ تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد ہی وہ کلکش شروع ہو گئی جس کو اُن کے جانشین فرو نہ کر سکے۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی نرم مزاجی نے گو معاملہ کو بگاڑنے میں مدد دی، لیکن مسلمانوں کا نظام مذہب ایسی قابلیت رکھتا تھا کہ وہ مدتوں اس خرابی کا مقابلہ کرتا رہا۔ سیلاب فتوحات، جو متواتر برسوں جاری رہا، آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر شہر اور گاؤں میں ذلیل دشمنوں کے چھینے جھپٹے نشان موجود تھے، ہر مسجد میں اس فتح کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے، مختلف ممالک کے قیدی حرم سراؤں اور کوچہ و بازار کی زینت تھے، خزانہ عامرہ کا دخل و خرچ

---

[1] مصنف علام غلطی کر رہے ہیں یہ تمام قواعد و ضوابط خود خدائے تعالےٰ نے بذریعہ جناب رحمۃ للعالمین بنی نوع انسان کے صلاح و فلاح کے لئے مقرر فرمائے تھے۔ فہل من مدکر۔ (مترجم)

مفتوح کفار کی دولتمندی و کمزوری اور فاتح مُسلمانوں کی پدرانہ شفقت و ہمدردی کی زندہ تصویر تھی۔ سلطنتِ ایران نے قیاصرۂ روم، اُس کے منظم سپاہ اور اُس کے تمام ذرایع جنگی کا تو نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر لیا، مگر مُسلمانوں کی شدید زور آزمائی کی تاب نہ لاسکی، اور دو ہی بڑی جنگوں میں ایسی گری کہ پھر نہ اُٹھ سکی۔ متبرک سرزمین فلسطین، جس کا چپہ چپہ عیسائیوں کے لئے تبرک تھا، جو دین مسیحی کے بہُت سے معجزات، عجائبات، مصائب و عرُوج کو اپنے گود میں لئے ہُوئے تھی، مُسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔ ان کے پیر گتسیمنی[x] اور گال گاتھا[*] کے متبرک مقامات کو پامال کر رہے تھے؛ اور ان کی اذان کی آواز اُس مسجد سے اُٹھتی تھی جو (حضرت سُلیمان (علیہ السّلام) کے ہیکل کے کھنڈر پر تعمیر ہوئی تھی۔ یونانی بادشاہ، جو غیر معمُولی کیفیت کے ساتھ مرحوم رومۃ الکبریٰ کی یادگار اور اُس کی عظمت و شان کو قایم رکھنے والا تھا، بہت ہی جلد، یکے بعد دیگرے، اپنے بہترین علاقجاتِ ملک کو فاتحین پر قربان کر کے، دریا باسفرس اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے درمیان گویا ایک اچھا خاصہ قیدی بنا ہُوا تھا۔ وُہ روایات قدیمہ کا معدن، اور آثار سالفہ کا مخزن، یعنی ملک مصر، تھوڑی دیر کے لئے جم کر لڑا، مگر پھر دیگر اقوام کی قسمت کا ساتھی بن کر فاتحین اسلام کا قدمبوس ہو گیا، اور اسکندریہ اور ممفس کے بُرجوں پر مُسلمانوں کا پرچم لہرانے لگا۔ درشت مزاج اور اَن گھڑ عرب نے اس عجیب و غریب، اور بزعم خود، جادُو بھرے ملک کے آثار قدیمہ کو حیرت اور خوف بھری

---

x گیتھ سی مانی:۔ GETHSEMANI فصیل یروشلم سے آدھے میل کے فاصلہ پر، کوہ زیتون کے دامن میں، ایک کھیت تھا جہاں حضرت مسیح علی نبینا و علیہ السّلام اور آپ کے حواری آرام فرمایا کرتے تھے۔ اسی میں ایک چھوٹا سا باغ جناب ممدوح کی آرامگاہ تھا آج کل یہ جگہ پچاس فیٹ مُربع رقبہ میں چند پتھروں سے گھری ہوئی ہے۔ بہت سے زیتون کے پُرانے درخت ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے زمانہ کے ہیں۔ (مترجم)

* گال گاتھا GOLGATHA لغوی معنی کھوپری۔ لوقا وغیرہ کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت عیلئے کو یہاں صلیب دیا گیا تھا۔ یہ جگہ یروشلم کے مشرقی دروازہ کے باہر واقع ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ آپ کو وہیں صلیب چڑھایا گیا، جہاں عوام الناس کو یہ سزا دی جاتی تھی۔ اس لئے یہ جگہ مشرقی دروازہ کے پاس ہونی چاہیئے۔ چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین نے ایک گرجا بنوا کر کنیسۃ القیامۃ اُس کا نام رکھا تھا۔ مصنّف لغات الاناجیل کہتے ہیں کہ مسیح کے مصلب پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مسجد بنی ہُوئی ہے۔ غرض جہاں حضرت عیلئے کا وجُود ہی آج کل علماءِ یورپ کے نزدیک معرض نزاع میں ہے وہاں مصلب بھی ہے اور ہونا بھی چاہیئے (العلم عجاب الاکبر) (مترجم)

† ضمیمہ الف ملاحظہ کیجئے۔ (مترجم) ؂ ضمیمہ ب ملاحظہ ہو۔ (مترجم)

نگاہ سے دیکھا، عجیب و غریب مناظر اُن کے پیش نظر تھے۔ مثلاً صحرا کے کنارے پر یہ پُرشوکت اہرام؛ باشان و شکوہ مندر؛ وہ تصاویر دیوار، جن کے رنگ پچاس صدیاں گزر جانے پر بھی آب و تاب تھے؛ وہ ڈراونا ابوالہول، جو باوجود صورت بگڑ جانے کے بھی دلکش تھا؛ وہ جیتے جاگتے بُت، جو مشرق کی طرف مُنہ کئے ہُوئے طلوع فجر کو سلام کرنے کے منتظر کھڑے تھے؛ وہ لاٹیں جو بڑے بڑے چبوتروں پر نصب تھیں، اور اُن پر نہایت قدیم فنا شدہ اقوام کے کارنامے کندہ تھے؛ وہ بڑے بڑے بُت خانے جو زمین کھود کر بنائے گئے تھے، جن کے تعویذ قبر خود بمنزلہ ایک لاٹ کے تھے؛ وہ زمانۂ قدیم کے مصری بادشاہوں کے بُت جو شوکت و حشمت و طاقت کے مجسم تصویر تھے، اور اپنے ہاتھوں میں تلوار کی جگہ وہ شاہی چھڑی لئے ہُوئے تھے، جو کسی جادُوگر کی لکڑی سے زیادہ لاکھوں آدمیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تھی، اور شدہ شدہ یونانیوں اور رُومیوں کے مقتدایان مذہبی کی نشانی، اور آخر میں مذہب رومن کیتھولک کے قسیس اعظم کی چھڑی بن گئی؛ وہ عجیب دریا جو اپنے گدلے پانی کا خراج لے کر عرب کی پابوسی کے لئے دُور سے چلا آرہا تھا، جس کی طغیانی پر اُس متبرک سرزمین کی تمام تہذیب موقوف تھی، اسی کے مدوجزر نے علم ہیئت کی طرف اہل مصر کو مایل کیا تھا، اس کے چڑھاؤ نے آبپاشی کے فن کو تکمیل پر پہنچایا تھا، اور اُس پیچیدہ قانون کی بنیاد رکھی تھی جس کے رُو سے اُس کا رُوح پرور پانی تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے اُتار نے علم مساحت و ہندسہ کا حصول اُن کے لئے لازمی بنا دیا تھا، اُن مضر بخارات نے جو اُس کے رُکے ہُوئے پانی سے نکلتے تھے اہل مصر کو ہوا صاف رکھنے کی غرض سے حیوانی نعشوں کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لئے مصالحہ لگانے کے فن کی طرف مایل کیا، اور شدہ شدہ اس ترکیب نے مراسم میں شامل ہو کر مسئلہ مذہبی کی صُورت اختیار کر لی، مقتدایان مذہبی کا تقرر، نہایت احتیاط سے قایم شدہ اصُول سحر، بے شمار دیوتاؤں کا وجود، غرض ہر چیز کا تعلق دریائے نیل کے پانی سے وابستہ تھا، اُس کے مدوجزر ہی سے مصری فصلوں، موسموں اور سال کا حساب لگایا جاتا تھا۔ سادہ لوح عرب کی آیندہ ترقیات پر ان عجائبات کا جو کچھ اثر پڑا وہ ناقابل بیان ہے۔ اُن کی

آنکھوں نے اب تک صحرا کے ریگ رواں اور بخارات راجفہ ہی کو دیکھا تھا؛ اُن کے ہاتھوں نے اب تک مٹی کے بدنما برتنوں پر بھدّے نقش ہی بنائے تھے، اتنی بڑی بڑی موزوں و خوش نما عمارات تو اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھیں جیسا کہ عام قاعدہ ہے ہر نئی تہذیب پُرانی تہذیب کے اصُول و مراسم کو کم و بیش اپنے ساتھ ضم کر لیتی ہے، اُس سے اہل عرب بھی مستثنےٰ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اُن کی خوبصورت تعمیرات گو زیادہ تر قدرتی پھول بُوٹی، بیل، پتّی اور اصُول علم ہندسہ کی شرمندۂ احسان ہے، اور اس خصوُص میں اُن کو تمغاء اولیت حاصل ہے، لیکن با ایں ہمہ ایک مشّاق آنکھ اُن کی عمدہ ترین عمارات کے فرش کو دیکھ کر فوراً بول اُٹھتی ہے کہ صناع کے قلب و دماغ پر بیرونی اثر ضرور ہے۔ ایران، مصر، قرطاجنہ*، بیزنطین** عمارات کی خصوصیات ان کی مضبوط دیواروں سے ظاہر ہوتی ہے؛ محرابوں کی خوبصورت خمیدگی، دلکش پچّی کاری، جس کو کارکنان قضا و قدر نے عربی کاریگروں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا، اور جو تمام دلکشیوں کا مورث ہے، صاف طور پر مُسلمانوں کے مختلف دُور افتادہ ممالک کے طرزِ عمارت کا پتہ دیتی ہے۔

غرض سب سے پہلے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ خلافت میں مُسلمانوں کی توجہ افریقیہ کے شمالی ساحل کی طرف مبذول ہُوئی۔ ان دنوں اسلامی سلطنت دریائے نیل سے لے کر بحیرہ اوقیانوس تک، ایک ہزار میل طول میں، اور پانچ سو میل عرض میں، پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملک کے راستے، جو جلتی ریت پر سے گزرتے تھے، مناظر صحرائے اعظم کے نمُونہ تھے۔ اس کا بیشتر رقبہ قابل زراعت تھا، اور اُس کے مسلسل باغات اور مستقل سبزہ، کسی زمانہ کے عظیم الشان، اور موجُودہ زمانہ کے بڑے شہروں کا پتہ دیتے تھے، جو اپنے عرُوج کے دنوں میں دولت قرطاجنہ کے حلقہ بگوش و زیر حمایت تھے۔ یہاں کے کاشتکار بہت تھوڑی سی محنت میں بہت بڑی

---

* قرطاجنہ کے لئے ضمیمہ ج ملاحظہ کیجئے (مترجم)

** بیزنطین مشرقی رُوم ہے، جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ رہا ہے، اس سلطنت کی طرز حکومت، طرز عمارت وغیرہ سب الگ ہیں۔ میں اس سلطنت کے متعلق کچھ تفصیل نہ کرونگا۔ (مترجم)

فصل اور نہایت خوش ذائقہ میوے پیدا کر لیا کرتے تھے۔ مینو سواد چراگاہیں، جن کو نزہت افزا نالے، اور نظارت بخش چشمے سیراب کرتے تھے، ہزارہا چوپایہ جانوروں کے لئے خوان نعمت بنے ہوئے تھے۔ اتنے انواع کی کھجوریں یہاں پیدا ہوتی تھیں کہ اُن کی صورتوں اور گٹھلیوں ہی سے اُن کے اقسام قرار دیئے جاتے تھے۔ چونکہ زیتون کے لئے وہاں کی زمین نہایت موزوں تھی، اس لئے روغن زیتون تجارت کی بہت بڑی چیز تھا۔ "ارض موعودہ" فی الحقیقت یہی تھی، جو تاریخ میں مشہور ہے، اور خرافات اصنام اور مختلف افسانوں میں نہایت معروف؛ یہی سرزمین کتاب مقدس کی اوفر[ا] ہے؛ میرنیس[۲]، ریگولس[۳] اور کیٹو[۴] نے یہیں مصایب برداشت کئے؛ یہی زمین زمانۂ قدیم کے خرافات اصنام کے دلکش قصوں کی منظر تھی؛ ڈیڈیاس[۵]، این شی اٹس[۶] اور ایٹلس[۷] کا یہی وطن تھا؛ تہذیب تایر کا صدیوں یہی گہوارہ رہا ہے؛ شوکت پیونک[۸]، تکلفات رومی، شتر بے مہاری ونڈال اور پیدائش مذہبی مسیحی کا تماشا اسی قطعہ ارض نے دیکھا ہے؛ یہیں کے دارالسلطنت نے ہیملکار کو صقلیہ کی فتح کے لئے تیار کیا تھا، جو اُس زمانہ میں بحر روم کا مالک واحد بنا بیٹھا تھا؛ اسی جگہ بیٹھ کر ہینی بال نے اُس مہم کا نقشہ جمایا تھا جس نے "شہر غیر فانی" یعنی روم کے غرور کو خاک میں ملا دیا؛ یہی وُہ زمین ہے جس میں فلسطین اور عرب کے اُن آفت زدہ لوگوں نے پناہ لی تھی، جو ایک شاندار سلطنت کے مددگار اور بانی بنے؛ سینٹ[۹] آگسٹن کی خانقاہ یہیں قایم ہوئی؛ وُہ باغ مسحور یہیں تھا جس میں ایرس[۱۰] اور نایٹ[۱۱] کی دلربا بیٹیاں رہا کرتی تھیں؛ یہیں وُہ دروازہ تھا کہ جس کے اُوپر دو مشہور مینارین تھیں، جو فونیشیا کے ملاحوں کو کیسی ٹے رائڈس[۱۲] کی طرف راہنمائی کرتی تھیں؛ تاجران قرطاجنہ اپنے یہاں کے مصنوعات کا برطانیہ کے رانگ اور شام کے تکلفات سے تبادلہ کرتے تھے؛ رومیوں کے زمانہ میں چار سو برس تک اسی زمین کی پیداوار نے اٹلی کی آبادی کو بالکل سست بنا دیا تھا +

اس سرزمین کی انتہا پر وُہ حصۂ ملک واقع تھا، جس کو ایشیائی مزاج لوگوں نے

[ا] تا [۱۲] کے لئے ضمیمہ دیکھئے (مترجم)

"المغرب" کا خطاب دیا ہے اگرچہ یہ ملک زیادہ سرسبز اور زرخیز تھا! لیکن اُس کا طوفان پروردہ ساحل تجارت مشرقی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا۔ جو مقامات اب تونس اور طرابلس کہلاتے ہیں۔ وُہ اُس زمانہ میں افریقیہ سے تعبیر کئے جاتے تھے۔ دربار قسطنطنیہ کا ایک نایب السلطنت ان آبادیوں پر اپنے بادشاہ کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ لیکن اُس کے اختیارات ایک چھوٹے سے قطعہ تک محدُود تھے۔ اُس سے آگے خونخوار وجفاکش وحشیوں کا گروہ گھومتا رہتا تھا، جو خانہ بدوش تھے اور کہیں مستقل سکونت نہ رکھتے تھے، مگر اُن کی زیادہ تعداد کوہ اٹلس کی ترائی اور نشیب میں رہتی تھی اور بہت تھوڑی سی کاشت کر کے اور اپنے کسی قدر مہذب ہمسایوں کے ساتھ تھوڑی بہت تجارت کر کے اپنا پیٹ پال لیتے تھے۔ اس علاقہ پر چونکہ ہمیشہ بیرونی حملے ہوتے رہے، یہاں کے لوگ زیادہ باہر نکل گئے تھے؛ نیز مناکحت میں بھی انھوں نے احتیاط نہیں کی تھی، اس لئے مختلف نسلیں وہاں رہتی تھیں۔ ساحل کے کنارے پر زیادہ آبادی یونانی صُورت لوگوں کی تھی، جن کے چہرے مُہرے میں رُومیوں کے میل سے تبدیلی آ کر شان سپاہ گری پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں موخر الذکر لوگوں کی فوج محافظ رہتی تھی، اور اٹلی اور قسطنطنیہ سے لوگ آ آ کر یہاں آباد ہوتے تھے۔ اندرونی علاقہ میں اور بڑھیں تو وہاں ایسے آدمی ملتے تھے جن کے رنگ سانولے، آنکھیں نیلی اور گندمی رنگ کے بال تھے۔ یہ لوگ وینڈال اور مارٹی ٹینیا* کی دوغلی نسل سے تھے۔ ان کے ہی ہموطن وُہ لوگ تھے، کہ جن کے شامی اور یہُودی نسل سے ہونے میں کوئی شُبہ نہ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ آبادی ایک اور قوم کی تھی، جو میدان جنگ میں نہایت جری، اور حالت امن میں نہایت غدّار تھے، یعنی بربر۔ روایات قدیمہ اُن کی اصل ونسل کے متعلق مختلف الخیال ہے؛ کوئی اُن کو یورپ کی، کوئی اشوریا کی، کوئی عرب کی، کوئی حبش کی اور کوئی فلسطین کی بتلاتی تھی۔ اُن کا وطن اصلی جہاں کہیں بھی ہو، اُن کے

---

* مارٹی ٹینیا MARITANIA زمانہ قدیم میں افریقیہ کے اُس علاقے کو کہتے تھے جس میں آج کل مراکش کی سلطنت اور تنجیر کا علاقہ ہے۔ (مترجم)

سامی ہونے میں شک نہیں ہے۔ اُن کو اہل عرب سے بہت ہی نمایاں اور قابل ذکر مناسبت تھی۔ فیاض، شجاع، صابر، محنت کش، انتہا درجہ کے مہمان نواز، کبیرالسن لوگوں کا ادب کرنے والے، اعزّا و اقارب کے مددگار، پابندی سے گھبرانے والے، بے رحمی کے ساتھ انتقام لینے والے، غرض وُہ ایک عجیب معجون مرکب تھے۔ ان میں جو خوبیاں تھیں وُہ غیر موزون، جو عیوب تھے وُہ قابل نفرت، اور وحشت تھی تو لایق ملامت۔ اُن کے رہنے سہنے کے مقامات دشوار گزار تھے؛ اُس پر افلاس اور سب پر مستزاد یہ کہ جنگ جوئی اُن کی خصوصیات میں سے تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وُہ کبھی کسی کے مفتوح ہو کر نہیں رہے۔ سیاسی انقلاب سے بھی یہ نہ ہو سکا کہ اُن کی قومی خصایص و خصایل کو مٹا دیتے۔ ایذاؤں کے دباؤ میں آکر تو وُہ بظاہر مذہب عام کے پابند معلوم ہوتے تھے، مگر فی الحقیقت دل سے بُت پرست ہی رہتے تھے۔ فونیشیا، رومی، بیزنطینی اور ٹیوٹن اقتدار وہاں غالب رہا تھا؛ مگر اس نے اُن کی زبان پر مطلقاً اثر نہیں ڈالا۔ البتہ عربی زبان نے یہ کمال کیا کہ اُن کی زبان کے ایک ثلث حلقی الفاظ کو نکال پھینکا، اور باقی دو ثلث پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اُن کا انتظام ملکی، جیسا کچھ بھی تھا، اُس میں جمہوریت کی سی شان تھی۔ ہر دیہ آزاد تھا، اور اُس پر وہاں کا سردار حکومت کرتا تھا۔ اس سردار کو باشندگان دیہ انتخاب کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ تیس چالیس ہزار فوج اُنھوں نے بادشاہ کے مقابلہ کے لیے تیار کر لی ہے لیکن پہلے ہی شکست میں اُن کا شیرازہ بکھر گیا۔ باہم رقیب، واپس آئے تو نہایت شوق کے ساتھ اپنے ہی حلیفوں اور دوستوں کو لُوٹنا اور مارنا شروع کر دیا۔ اُن کی غدّاری کو دیکھ دیکھ کر وُہ قومیں حیران ہوتی تھیں جو ایک مدت دراز سے دو رُخی چالیں چلنے کی عادی تھیں۔ رُومی ہی چالیں جگرتھا* کے ساتھ لڑائی میں چلے اور سخت مُنہ کی کھا کر آئے۔ قرطاجنہ میں تو برابرہ غداری میں ضرب المثل

---

*جگرتھا JUGURTA نومیڈیا کا بادشاہ تھا۔ اپنے چچیرے بھائیوں کو قتل کرا کر خود رُوم بھاگ گیا، اور وہاں رشوتیں دے دلا کر اپنے آپ کو اُس جرم سے بری کرا لیا اور رشدہ شدہ وہاں کا بادشاہ ہو گیا۔ لیکن آخر وہاں سے بھاگ کر ماری ٹینیا کے بادشاہ کے پاس گیا۔ اس نے اُسے پھر رُومیوں کے حوالہ کر دیا۔ اُنھوں نے اس کو قید کر دیا۔ اور بھوکا مار ڈالا۔ (مترجم)

ہو گئے تھے۔ حقیقتاً وُہ بت پرست تھے۔ اُن کو سحر اور جادُو پر بڑا اعتقاد تھا۔ سُورج اور آگ کو پُوجتے تھے۔ اپنے ہمسایوں کے ساتھ اُن کا تعلق بے قاعدہ اور عارضی تھا، مگر باوجود اس کے اُن کے معتقدات پر اِن ہمسایوں نے بڑا اثر ڈال دیا تھا۔ مسیحی منادوں نے اپنے دین کے اصُول کو اُن میں پھیلا دیا تھا، گو اس میں کوئی بڑی کامیابی اُن کو نہیں ہوئی۔ توریت اور تالمود کو اُنہوں نے بطوع سُنا۔ اگرچہ اُس کے ساتھ اُنہوں نے خرافات اضام کو ملا لیا، لیکن بہرحال تمام قوم بر ابرہ نے اس کو قبُول کر لیا۔ قوم یہُود دوسری جگہ جا کر، بوجہ تعلقات تجارت، آب وہوا، حالت ارضی اور باتباع اُس قدرتی قانون کے، جو اقوام کے مدوجزر پر حاوی ہے، شمالی افریقیہ میں پھیل گئی تھی، اور یہاں تو گھر ہی بنا کر بیٹھ رہی۔ وُہ لوگ جو ٹی ٹس[x] اور ہیڈرئین[*] کے ظلموں سے تنگ آ کر یہاں بحالت جلا وطنی پہنچے تھے، مستقل آباد ہو گئے، اور خوب ہی پھلے پھُولے۔ اگرچہ ان لوگوں کی نسبت مشہور تھا کہ یہ الگ تھلگ رہنے والی قوم ہے، مگر یہاں آ کر تو اُنہوں نے اس عادت کو چھوڑ دیا۔ چونکہ اُن کا آبائی پیشہ تجارت تھا اس لئے یہاں بھی وُہ اسی پر مایل ہو گئے، اور اُس کے ساتھ ہی لوگوں کو اپنے دین میں شامل کرنا شروع کر دیا، حالانکہ یہ اُن کے یہاں جایز نہ تھا۔ باشندگان ساحل اور اندرونی ملک، اسِرٹِس[ص] کلاں سے لیکر مینار ہارقیلس تک ہر نے کم وبیش اُن کا اتباع کیا۔ اُن کے تعلقات اور اُن کی واقفیت نہ صرف انتہا ایشیا تک تھی، بلکہ نیم وحشی بادشاہان یوُرپ سے بھی اُن کا تعارف تھا۔ اُن کو اپنے سامی قوم کے بھائیوں سے ہمدردی تو تھی ہی، بربریوں کے خیالات، عادات اور رسوم ماندہ یہُود نے اس میں اور بھی مدد کی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہی سب باتیں مل کر مغربی سلطنت اسلامی کا مقدمۃ الجیش ہو گئیں۔

---

x و * ٹی ٹس TITUS اور ہیڈری ان HADRIAN دونوں روم کے بادشاہ تھے۔ دونوں نے یہُودیوں کو بہت ستایا تھا۔ اُن ہی کے ستائے ہُوئے یہُودی افریقیہ وغیرہ میں منتشر ہو گئے تھے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

ص سرٹس کلاں وخورد SYRTIS بحر شام پر افریقیہ میں دو خلیجوں کا قدیمی نام ہے۔ مقدم الذکر (آج کل خلیج سدرہ کہلاتی ہے) راس میسوراٹا، واقع طرابلس، اور برکہ کے سطح مرتفع کے درمیان میں واقع ہے، اور بحر شام کے انتہا میں ہے۔ موخر الاسم (آج کل خلیج کیبس کہلاتی ہے) ٹیونس اور طرابلس کے مغرب شمال میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ریگ رواں کی وجہ سے بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ (مترجم)

۶۴۷ء عیسوی میں حکام مدینہ کی للچائی ہوئی نظریں المغرب کے شاداب میدانوں اور آباد و شاد رعایا پر پڑنے لگیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ تاخت و تاراج جو ایک زمانہ بعید سے اس ملک کی سرحد پر ہوتی رہی ہیں، باقاعدہ جنگ اور عزم فتح سے مبدل ہو گئی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کچھ کمزور طبیعت کے آدمی تھے، اُن کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اپنے خاندان کی حمایت کریں اور اُن کو ترقیات دیں، چنانچہ اسی بنا پر اُنہوں نے مشہور و معروف عمرو ابن العاص (رضی اللہ عنہ) کو حکومت مصر سے معزول کر کے عبداللہ ابن سعد، اپنے رضاعی بھائی کو، وہاں مقرر کر دیا۔ یہ بڑے جنگ آزمودہ، مستقل مزاج اور اپنی قوم بھر میں بہت بڑے شہسوار تھے۔ مگر ان کی تمام خوبیوں پر اس وجہ سے پانی پھر گیا تھا کہ وُہ پابندی دین کی چنداں پروا نہ کرتے تھے، بلکہ تعلیمات حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم پر بسا اوقات مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

عبداللہ ابن سعد نے اپنے زیر حکومت ملک کی تمام ذرائع اور فوج کو، جو بقدر ایک لاکھ بیس ہزار کے تھی، جمع کر کے افریقیہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اس فوج میں بڑی تعداد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی تھی، جو اشراف عرب میں سے تھے۔ چند چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد ایک چھوٹی سی، مگر خون ریز لڑائی ہوئی، جس میں یونانیوں کا ایک دستہ فوج وہیں کھیت رہا۔ افواج عرب طرابلس کی طرف بڑھیں، اور اُس کا محاصرہ کر کے کچھ اور پیش قدمی کی۔ اس محاصرہ میں اُنہوں نے ایسا کمال دکھایا کہ جس کی اُن لوگوں سے توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ جن کی عمریں معمولی چھاپے مارنے، یا آپس ہی میں لڑنے میں گزری ہو۔ بیزنطینی سلطنت میں، بجائے زمانہ قدیم کے نائب السلطنت کے، حاکم صوبہ مقرر کیے گئے۔ اس کے سپرد صرف انتظام دیوانی و فوجداری ہی نہ تھا، بلکہ کلیسا بھی اُسی کے ماتحت کر دیا گیا، وہی اُس کی صلاح و فلاح کا نگران تھا۔ وہی پادریوں کو مقرر کرتا تھا، وہی کلیسا کے انتظامات اور اُس کے ضوابط کی تعمیل کراتا تھا۔ اس وقت حاکم صوبہ گریگوری تھا۔ اس شخص کے عقل و فہم کی آزمایش بربریوں کی مختلف لڑائیوں میں ہو چکی تھی۔ گریگوری ایک لاکھ بیس ہزار غیر قواعد دان اشرار کا ایک گروہ لیکر طرابلس کا محاصرہ توڑنے کے لئے روانہ ہوا۔ مسلمان محاصرہ چھوڑ کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ کئی لڑائیاں ہوئیں، جن کا نتیجہ کسی فریق کے موافق نہ ہوا۔ گریگوری کی فوج اگرچہ بہت زیادہ تھی، مگر چونکہ عرب جان

توڑ کر لڑتے تھے، اِس لئے وُہ بہت ہی جلد تنگ آ گئے۔ مجبور ہو کر گریگوری نے اعلان کر دیا کہ جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار کا سر لائے گا اُس سے وُہ اپنی بیٹی کی شادی کر دیں گے، اور ایک لاکھ اشرفیاں انعام دیں گے۔ گریگوری کی یہ بیٹی ہتھیار لگا کر ہر روز فوج کے مقدمۃ الجیش میں نمایاں طور پر کھڑی ہوتی اور لڑتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ نے اپنی عمر میں موت کو سینکڑوں صورتوں میں دیکھا ہوگا، مگر اس وقت گریگوری کے اعلان سے ایسے مرعوب ہوئے کہ اُن کو اپنے لالچی مدمقابل کے سامنے ہونے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ وُہ کچھ ایسے پست ہوئے کہ اپنے خیمہ سے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا، اور فوجی انتظام وغیرہ سب اپنے ماتحتوں پر چھوڑ دیا۔ اس اثنا میں ابن زبیرؓ کچھ کمک لے کر وہاں پہنچ گئے۔ یہ بھی بڑے نمود کے سپاہی تھے۔ اُنہوں نے یہاں آکر سپہ سالار کی بزدلی کا حال نہایت افسوس کے ساتھ سُنا، اور اُن سے مل کر سخت ملامت کی، اور یہ مشورہ دیا کہ وُہ اپنی طرف سے یہ اعلان کر دیں کہ جو شخص گریگوری کا سر اُن کے قدموں میں لا ڈالے گا اُس کو ایک لاکھ اشرفی کے علاوہ اُس کی دلربا بیٹی بطور کنیزک کے دی جائے گی۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کر کے تمام فوج میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اس انعام کی لالچ میں جوانانِ عرب پہلے سے بھی زیادہ جان لڑانے لگے۔ عبداللہ کو بھی اپنی حرکت پر بہت شرم آئی، اور وُہ بھی پھر مقدمۃ الجیش میں آکر لڑنے لگے۔ لیکن ایک تو یونانیوں کی تعداد زیادہ تھی، دُوسرے وہ دستہا، فوج اُن کے دل بڑھا رہے تھے جن میں ابھی تک رُومیوں کا استقلال اور نظام موجود تھا، تیسرے نومیڈیا[1] کا رسالہ اُن کی پشت پر تھا؛ جس کی بہادری کی جگر تھا کے زمانہ سے دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر لڑائی میں عربوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہ کیفیّت دیکھ کر ابن زبیرؓ سے پھر مشورہ لیا گیا۔ صبح ہوتے ہی حسبِ معمول پھر جنگ شروع ہوئی۔ شام کو جب طرفین کی فوج تھک گئی تو دونوں فوجیں آرام کرنے

---

[1] نومیڈیا NUMIDIA رومی علاقے کو کہتے تھے جس میں آج کل الجیریا کا بڑا علاقہ شامل ہے۔ اس میں دو بڑے بڑے دریا ہیں۔ نومیڈیا کے باشندے ماری ٹینیا کی طرح اُسی نسل کے ہیں جس کے بربری۔ یہ لوگ بڑے سپاہی ہوتے تھے۔ شہسواری میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اور حبشیوں کی طرح سخت غدار قوم تھی۔ چنانچہ اہالی قرطاجنہ اور رُوم کی جو لڑائی ہوئی اُس میں یہ لوگ پہلے قرطاجنہ والوں کی طرف تھے پھر روم والوں سے جا ملے۔ اُن کے بادشاہوں میں جگر تھا اور جوبہ بہت مشہور ہو گزرے ہیں۔ ۴۶ق م میں یہ علاقہ روم والوں نے اپنے ساتھ ضم کر لیا۔ لیکن بعد میں کچھ علاقہ دریا وادی الکبیر کے کنارے کا اُن کو دے کر مستقل بادشاہ کر دیا تھا۔ (مترجم)

کے لئے اپنے خیموں میں چلی گئیں۔ لیکن آج مسلمان اپنی تمام فوج میدان جنگ میں نہیں لائے تھے۔ اس وقت باقی تازہ دم فوج کو ابن زبیر لے کر رعد و برق کی طرح دشمنوں کے خیموں پر جا پڑے۔

چونکہ تمام فوج دن بھر کی سخت محنت کے بعد آرام کر رہی تھی، اُن کو خیال بھی نہ تھا کہ شب خون پڑے گا، اس لئے سخت گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ بڑی بھلی صفیں، جو یہ لوگ باندھ سکے تھے، وہ بھی ٹوٹ گئیں۔ گریگوری مارے گئے، اور مسلمانوں نے اپنی فوج کو لوٹ معاف کر دی۔ فتح کے صلہ میں مسلمانوں کو بڑی لوٹ اور بے تعداد غلام ہاتھ آئے۔ گریگوری کی مہوش بیٹی ابن زبیرؓ کے ہاتھ لگی۔ شہر سوفے ٹیلا پر قبضہ ہو جانے کے بعد تمام علاقہ خلیفۂ اسلام کا تابع فرمان ہو گیا۔ مگر ایک طرف تو بیماری نے تہر ڈالا، دوسری طرف مینوں کی متواتر لڑائیوں اور کمک نہ پہنچنے سے عبداللہ نہ فوج محافظ شہر میں چھوڑ سکے، نہ اندرون ملک کی بیچین اور شریر رعایا کو اپنے قابو میں رکھ سکے، اسی لئے انہوں نے پچیس لاکھ دینار لے کر پیش قدمی بند کر دی۔ تمام مال مفروضہ مدینہ بھیج دیا گیا۔ اس میں سے خمس عبداللہ کو دیا گیا، اور باقی مروان نے کچھ کم قیمت دے کر خرید لیا۔

آئندہ قریباً پچیس برس دعویداران خلافت کے درمیان میں خانہ جنگی اور سیاسی اقتدار کے جھگڑے رہے۔ جس سے یونانیوں کو اپنے مغربی مقبوضات کے متعلق آرام مل گیا۔ دربار بیزنطین کو جب یہ معلوم ہوا کہ باشندگان افریقیہ نے اتنی بیش قرار رقم دے کر فاتحین عرب سے اپنے ملک کو چھڑایا ہے تو اُن کو سخت تعجب ہوا۔ یہ خیال کر کے کہ جو ملک نسلاً بعد نسلٍ سے شاہی محصلین کے ہاتھوں لٹتا چلا آتا ہو پھر بھی اُس کے ذرائع اتنے ہوں کہ وہ اتنی بیش قرار رقم ادا کر سکیں، اُن کی طمع کی آگ بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ جو رقم خراج اب تک اُن کے ذمہ واجب الادا ہے، اُس کے عوض وہ اتنا ہی روپیہ داخل خزانہ کریں، جتنا کہ مسلمانوں کو دے چکے ہیں۔ اس روپیہ کی ادائیگی کے لئے نہایت سختی کی گئی، اور جو رعایا کہ پہلے ہی مفلس تھی اُس کی تباہی میں کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ جب وہ یہ سختیاں برداشت نہ کر سکے تو انہوں نے ایک سفارت اپنے بطریق کی سرکردگی میں امیر معاویہؓ کی خدمت میں دمشق بھیجی، اور دربار امارت میں اپنی تمام تکالیف بیان کر کے مبالغہ کے ساتھ اپنے ملک کی دولت و حشمت کی تعریفیں کیں،

اور یہ بتلایا کہ اگر اُن کے ملک پر مسلمان قبضہ کرلیں تو اُس سے بے انتہا فایدہ اُٹھا سکیں گے۔ حضرت امیر معاویہؓ پر اس تقریر کا بہت بڑا اثر ہوا، اور اُنہوں نے فوراً ابن حجیج حاکم مصر کو اس ملک کی فتح پر متعین کیا۔ مگر اس مہم میں مسلمانوں نے وہ سرگرمی نہیں دکھلائی جو اُن کی عادت میں داخل تھی، بلکہ صرف ساحل اور چند شہروں پر، جن کی چنداں اہمیت نہ تھی، قبضہ کر لینے پر اکتفا کیا۔ لیکن بہرحال مستقل قبضۂ افریقیہ کا سلسلہ اسی مہم سے شروع ہوا۔ اگرچہ سرزمین برابرہ پر پہلے بھی اسلامی علم لہرا چکا تھا، مگر اس مرتبہ وہ وہاں کی خاک میں اس طرح گاڑا گیا کہ اب تک نہیں اُکھڑا، اور مسلمانوں کے قدم برابر آگے ہی بڑھتے گئے، یہاں تک کہ وہ مغربی سمندر کے ساحل تک پہنچ گئے۔ جس سپہ سالار کے قدم کامیابی چومتی رہی، اور جس نے المغرب کے شجاع اور شریر لوگوں پر اپنا دیرپا اثر ڈالا، وہ باستثنا موسےٰ ابن نصیر کے عقبہ ابن نافع ہیں۔ پہلے سپہ سالار کے بعد ان ہی کو اس عہدہ پر مقرر کیا گیا تھا۔ دشمنوں کے ملک میں پہنچ کر اُنہوں نے اُسی سختی کے ساتھ جنگ شروع کی، اور اُن کی تلوار ویسی ہی بے پناہ رہی، جیسی کہ عمرو ابن العاص اور سیف اللہ، خالد ابن ولیدؓ کی تھی۔ جن عیسائیوں نے کہ اطاعت قبول نہیں کی، یا اسلام کی حقانیت کو تسلیم نہیں کیا، وہ بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیئے گئے۔ لیکن چونکہ خلیفۂ وقت کا تاکیدی حکم تھا کہ بحری لڑائی نہ لڑی جائے، اس لئے یونانی بیڑہ اور یونانی سواحل چند روز کے لئے بچ گئے، ورنہ اُن کا جو انجام ہونے والا تھا اُس میں کسی کو بھی کلام نہ تھا۔ برابرہ اپنے دشمنوں کو سخت تحیّر سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ فتح و ظفر اُن کی رکاب چومتی ہے، کوہ و صحرا میں قسمت اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتی، بربریوں کے نہایت بہادر اور جنگ آزمودہ لوگوں کو وہ شکستوں پر شکستیں دیئے چلے جاتے ہیں، عوائق و موانع کو وہ خاطر میں نہیں لاتے، اُن کے روک تھام کی جو تدابیر کی جاتی ہیں وہ اُن کے سامنے تارِ عنکبوت ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر وہ اس کے قایل ہو گئے تھے کہ امداد الٰہی اُن کے ساتھ ہے، اور اُن کا بادشاہ واقعی ظل اللہ ہے، اس لئے اُنہوں نے اپنی بُت پرستی کو خیرباد کہا، اور بصدق کلمۂ توحید پڑھا۔

عقبہ کے ہر ہر قدم فتح نثار ہوتی چلی جاتی تھی، کسی کو اُن کے مقابلہ کی تاب کہاں تھی۔ اُنہوں نے اُس علاقہ کو، جس میں مردم خوار وحشی رہتے تھے، اس سرے سے اُس سرے تک روند ڈالا، یہانتک

کہ وُہ بحر اوقیانوس تک پہنچ گئے۔ اس پر بھی صبر نہ ہو سکا، وُہ گھوڑے کو سمندر کے پانی ڈال کر، تلوار کھینچ کے کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند کہا "اللہ اکبر! اللہ اکبر! خدایا! اگر مجھے یہ سمندر نہ روک لیتا، تو مغرب کی طرف اُس ملک میں بڑھا چلا جاتا، جہاں نہ معلوم کون بادشاہت کرتا ہے۔ تیرے پاک نام کی کبریائی کی شان کو وہاں ظاہر کرتا، اور اُن لوگوں کو تیری طرف راستہ دکھلاتا جو تیرے سوا، دُوسروں کو پُوجتے ہیں"۔

عقبہ کی اس مہم کا (جس نے شمالی افریقیہ کی اقوام کو اسلامی اصُول سے روشناس کرایا) اثر، بہ نسبت اُس مالِ مغرونہ کے، زیادہ ہوا جو فاتحین کے ہاتھ لگا؛ گو یہ بھی فی نفسہ کچھ کم نہ تھا۔ بربری چونکہ صنعت و حرفت جانتے ہی نہ تھے، نہ تکلفات اُنہوں نے کہیں دیکھے تھے، اس لئے اُن کی تمام دولت جو کچھ بھی تھی وُہ بھیڑ بکریوں کے گلّے تھے۔ لیکن بربری عورتوں کی خوبصورتی اور دلربائی کو دیکھ کر فاتحین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چند روز کے بعد بہت سی عورتیں اسکندریہ اور دمشق کے بازاروں میں پہنچ کر ہزارہا مثقال سونے کے عوض میں فروخت ہوئیں۔ مارے ٹینیا اور اٹلس کے قبائل کی متلون طبیعتیں اگر کسی چیز کے روکے رُک سکتی تھیں تو وُہ فوجی طاقت اور دباؤ تھا۔ ان لوگوں کے لئے اپنا مذہب بدل دینا ایک دفع الوقتی کی بات تھی، اور عارضی۔ عقبہ نہایت عاقبت اندیش اور دُور بین شخص تھے۔ ان لوگوں کی یہ کیفیت دیکھ کر یہ ضروری سمجھا کہ ان چالاک اور صعب دشمنوں کی سرحد پر قلعے بنا دیں۔ پھر قسطنطنیہ کے جنگی جہازات سے بچنے کے لئے اُنہوں نے ساحل پر قلعہ بنایا۔ باوجود اس کے کہ زمین ناقابل کاشت اور بنجر تھی، پانی کی قلت تھی اور گرمی سخت، مگر اُنہوں نے ایک شہر کی بُنیاد ڈال دی اور "قیروان" اُس کا نام رکھا، اور اسی کو دارالسلطنت بنایا۔ یہ شہر زمانہ مابعد میں تاریخ افریقیہ میں بہت بڑا اہم بننے والا تھا۔ اس کی فصیل شہر اینٹوں کی تھی، جگہ جگہ بُرج بنائے گئے تھے، اور اُس کا دَور چھ میل تھا۔ ساتھ ہی ایک عالی شان مسجد کی بُنیاد رکھی گئی؛ جس کا طول دوسو بیس[۲۲۰] ہاتھ، اور عرض ڈیڑھ سو ہاتھ تھا؛ اُس کی ستّرہ محرابیں تھیں؛ جو عمارات یوٹیکا* اور

---

* یوٹیکا UTICA افریقیہ کا ایک قدیم علاقہ (مترجم)

قرطاجنہ کا سنگ مرمر لاکر بنائی گئی تھیں؛ میناریں نہایت خوبصورت اور شاندار تھیں؛ اُس کی دیواروں پر جو منبت کاری ہے وُہ دنیا اسلامی میں اس وقت تک ضرب المثل ہے۔ شہر کے بازار تین میل لمبے تھے۔ اُس کے مدرسوں میں اطراف و اکناف کے علماء آکر جمع ہو گئے تھے۔ اختلافی مسایل میں وہاں کے مفتیوں کے فتووں پر تمام علماء کے سر تسلیم خم ہو جاتے تھے۔ چونکہ قیروان افریقیہ کے نایب خلیفہ کا دارالامارت تھا، اس لئے اس شہر کو مدتوں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔

برابرہ ایک مغلوب الغضب اور غدار قوم تھی؛ ان سے بھلا کسی معاہدہ کی پابندی کب ہوئی۔ اُن کے خصایص و خصایل آخر کہاں تک رُکتے؛ اُنہوں نے اِدھر اُدھر فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا۔ مُسلمانوں کی فوجیں چونکہ پھیلی ہوئی تھیں، اس لئے بربریوں کی شرارتوں کا انسداد نہ ہو سکا۔ جہاں جہاں پراگندہ آبادیاں تھیں وہیں وہ حملہ کرتے تھے، بھیڑ بکریاں لے جاتے تھے، اور گھروں میں آگ لگا جاتے تھے۔ شدہ شدہ یہ کیفیت ہوئی کہ قیروان کی جدید آبادی کی امن میں بھی خلل پڑنے لگا۔ اپنی کامیابی کے غرّہ پر تمام شیوخِ بربر نے اتفاق کر کے مسلمانوں کا اپنے ملک سے نام مٹا دینا چاہا۔ قُصیلہ نامی ایک شخص سرداران برابرہ میں سے سب سے زیادہ مقتدر تھا۔ اس کے ساتھ عقبہ نے بُرا سلوک کیا تھا اور سخت نقصان پہنچایا تھا، اور اس وقت اُن ہی کی فوج میں قیدِ سخت تھا۔ یہی شخص اس تمام سازش کی رُوح و رواں تھا۔ عقبہ کو دشمن کی چالیں بہت دیر کے بعد معلوم ہوئیں۔ مجبوُری اُن کو اپنی فوج کو اور بھی کمزور کر دینا پڑا۔ ایک دستۂ فوج قیروان کی کمک کے لئے جا رہا تھا، کہ یکایک اُن پر مقام تہودا میں وحشیوں کی بڑی فوج نے حملہ کیا۔ مُسلمانوں کی تعداد کل چار سو تھی۔ اُنہوں نے مقابلہ کو بیکار سمجھ کر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کیا؛ تلواروں کے میان توڑ کر پھینک دیئے، اور ایک ایک شمشیر بکف شہید ہو گیا۔ ان شہدا کے مقبرے مقام زاب میں اب تک زیارت گاہ عام ہیں۔ لوگ دُور دُور سے وہاں آتے ہیں، اور یہ جگہ بہت اچھی تجارت گاہ ہے۔ جیسے برابرہ متلون مزاج تھے وہی ڈھنگ عیسائیوں نے بھی اختیار کر لیا؛ وُہ بھی قصیلہ کے علم کے نیچے آگئے۔ یہ شخص خود آزاد بادشاہ بن بیٹھا، اور پانچ برس تک تمام افریقیہ پر حکومت کرتا رہا۔ مگر اس کے بعد

عربوں کی ایک نئی فوج، بسرکردگی زُہیر، یہاں پہنچی، جس نے آکر ایک فیصلہ کُن لڑائی میں برابرہ کو سخت شکست دی۔ قصیلہ مارا گیا، اور نایب خلیفہ نے ازسرِنو اپنا تسلّط جما لیا۔ چند روز کے بعد زُہیر نے ان حبشیوں کی مکاری کی وجہ سے اپنی جان کھوئی۔ خلیفہ عبدالملک کو جب اس کی خبر پہنچی تو نایب السلطنت مصر کو ملک مغرب میں بھیجا، کہ جو کام اُن کے کئی پیش رو نہ کرسکے اُس کو یہ پُورا کردیں۔ کسی نایب السلطنت کے پاس اتنی فوج نہ تھی، نہ اتنے ذرایع جنگ، جتنے کہ حسن کے پاس۔ چونکہ وُہ مصر کے حاکم بھی تھے، اِس لئے اُن کے پاس اُس زرخیز ملک کی تمام دولت بھی تھی۔ وُہ چالیس ہزار جنگ آزمُودہ فوج، اور تمام سامان جنگ، لے کر اسکندریہ سے روانہ ہُوئے۔ اُن کے ساتھ قلعہ شکن توپیں، اور فصیلوں پر چڑھنے کی سیڑھیاں بھی تھیں۔ مشرق میں مُسلمانوں کو جو کامیابیاں ہو چکی تھیں اُن سے اُن کے دل بڑھے ہُوئے تھے؛ قلعوں پر حملے کرنے اور فتح کرنے کے اُن کو پُورے تجربے تھے؛ وُہ زمانہ اب نہیں رہا تھا کہ وُہ اس خصُوص میں بالکل ناتجربہ کار تھے۔ حسن نے یہ ارادہ کیا کہ پہلے اُن قلعوں کو لے لیا جائے جو ساحل بحر پر تھے، اور اب بھی یونانیوں کے قبضے چلے آتے تھے۔ چنانچہ اُن مقامات کو روندتے ہوئے جن کو ایک مرتبہ تباہ ہو چکنے کے بعد مُسلمانوں کے سپہ سالاروں نے پھر ازسرِنو آباد کیا تھا، وُہ فوراً قرطاجنہ کے سر پر جا پہنچے۔ اس مشہور و معروف شہر پر وہ وہ آفات پڑ چکی تھیں کہ جن کی نظیر کسی اور جگہ کم ملے گی۔ مگر باوجود اس کے وُہ اپنی سابقہ شان و شوکت اور رعب و روایات کو باقی رکھے ہوئے تھا، اور اب بھی افریقیہ کا دارالسلطنت سمجھا جاتا تھا۔ فُونیشیا کی وُہ قوت و صولت، جو زمانۂ قدیم کی بحری دُنیا میں ہر جگہ نمایاں تھی، اور جس کی بنیاد بے انتہا دولت و حشمت، آباد دُنیا کے کونے کونے، اور آدمی آدمی سے واقفیّت، رموز سائینس، مختلف مُبالغہ آمیز رموز، اور بلا مداخلت غیرے حکومت بحری پر تھی، قرطاجنہ کی طرف منتقل ہوئی، جو اُس (فونیشیا) کا نہایت اہم اور عزیز شہر تھا۔ اس شہر کی مختصر و مجمل تاریخ اُن صاحبوں کے زیر نظر ہو گی جو مُسلمانوں کے فتوحات افریقیہ و اندلس سے واقف ہیں، اور وُہ یہ بھی جانتے ہونگے کہ اس شہر کو یورپ قدیم و جدید کی تمام اقوام کے ساتھ کتنا قریبی تعلق ہے۔ اسی شہر کی مثال کو سامنے رکھ کر مُسلمانوں کا سب سے پہلا بیڑا اُسی کے بندر سے ممالک

مغربیہ کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے پہلے سارڈینیا[1] کو تباہ کیا، سلطنت یونان کو دھمکایا، اور جزایر
بلیارک[2] پر قبضہ کر لیا۔ عام طور پر غلطی سے قطب نما کے موجد ملاحان املفی[3] بتلائے جاتے ہیں، مگر قیاس
یہ ہے، اور غالباً صحیح ہے کہ قطب نما فی الحقیقت ٹایر والوں نے بطور وراثت قرطاجنہ والوں کو دیا تھا۔
یہ یقینی بات ہے کہ سنگ ہرقلیس میں جو مقناطیسی کشش کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی اُس سے اُن شہروں
کے ملاح واقف تھے، اور وہ ہر ساحل بحر پر کے مندروں میں اُس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اندلسی عربوں
کی سیدھی تلوار، ایشیائی خمدار تلوار سے کس قدر مختلف ہے۔ یہ تلوار حقیقت میں قرطاجنہ والوں کی ہے،
جو آئے بیریا[4] کے ذریعے سے روم پہنچی۔ اسی تلوار نے دُنیا بھر کو فتح کر لیا، یہاں تک کہ افریقیہ کو بھی اس
سے پناہ نہ ملی، حالانکہ وُہ اُن ہی کا ہتھیار تھا۔ قوم باسک[5] کی ٹوپی بیونک یا فرائی جی[6] ان کی ترمیم شدہ چیز
ہے۔ ٹونس کی یہودنیں اب بھی یہی ٹوپی پہنتی ہیں؛ اور زمانۂ حال میں یہی ٹوپی نشان آزادی سمجھی جانے لگی ہے۔
رومیوں کے چغہ اور عربوں کے جُبّہ کی اصل بھی اگر ڈھونڈھی جائے گی تو قرطاجنہ ہی میں ملے گی۔ قرطاجنہ والوں
نے ان کو فونیشیا سے لیا، اور اُنہوں نے لاڈیا[7] سے۔ سپین حال کے ناموں، رسموں، روایتوں اور رواجوں کو

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ ۷ (مترجم)

[2] جزایر بلیارک BALEARIC ISLANDS پانچ جزیروں، یعنی میجورکا، مینورکا، ایویزا، فورمینٹیرا اور کبریرا، کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ سلطنت میجورقہ کا حصہ تھی۔ ۱۲۸۹ء میں ارغون کے ساتھ ضم کر دیئے گئے۔ اب یہ سپین کا ایک صوبہ ہے۔ ان سب کا رقبہ ۱۷۵۳ مربع میل ہے۔ انگور، زیتون اور دیگر میوے بہت پیدا ہوتے ہیں، مگر غلہ باہر سے لانا پڑتا ہے۔ اہالی فونیشیا ان جزایر میں بہت زمانہ ہوا کہ پہنچ چکے تھے۔ اُنکے بعد یونانی آئے۔ پھر قرطاجنہ والوں نے ان کو لیا۔ کچھ روز یہ جزایر آزاد بھی رہے۔ اُس زمانہ میں یہاں والوں نے بحری قزاقی کی۔ پھر رومیوں نے ان کو لیا۔ پھر مسلمانوں نے۔ پھر عیسائیوں نے۔ (مترجم)

[3] املفی AMALEI خلیج سلرنو پر ایک بندرگاہ ہے۔ چار پانچ ہزار کی آبادی ہے۔ کہتے ہیں کہ قسطنطین نے آباد کیا تھا۔ گیارھویں صدی میں نارمنوں کے ہاتھ میں پڑا۔ فلاوی لوگیوجا، موجد قطب نما یہیں پیدا ہوا تھا۔ (مترجم)

[4] آئے بیریا IBERIA سپین کا قدیمی نام ہے۔ گو حدود اربعہ میں فرق آگیا ہے۔ (مترجم)

[5] باسک BASQUE سپین کا ایک صوبہ ہے۔ یہاں کے باشندے سادہ طبیعت اور بڑے بہادر ہیں۔ مر جائیں گے مگر اپنا ملک اپنے ہاتھ سے نہ نکلنے دیں گے۔ یہ لوگ اپنے آپ پر بہت نازاں ہیں۔ سلطنت سپین نے بھی ان کو بہت سی رعایتیں دی ہوئی ہیں۔ ان کی زبان بھی بالکل الگ ہے۔ (مترجم)

[6] فرائی جیا PHRYGIA ایشیائے کوچک کا ایک علاقہ ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

[7] لاڈیا LYDIA زمانہ قدیم میں ایشیائے کوچک کے ایک علاقہ کو کہتے تھے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

اگر کوئی غایر نظر شخص دیکھے تو وُہ صاف کہہ اُٹھے کہ اُن پر اس ملکۂ بحر شام کا ایسا گہرا نقش بیٹھا ہوا ہے کہ وہ کبھی اُن پر سے مٹنے والا نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ قرطاجنہ مٹ گیا، مگر اُس کے کھنڈرات اب تک سائنس، اور بنی نوع انسان، کی ترقی میں مدد دے رہے ہیں۔ پیزا[1] کا بڑا گرجا، جس کے ایک برج کے نیچے بیٹھ کر گلیلیو اپنے تجربے کیا کرتے تھے، اور آخر اُنہوں نے رقاص الساعہ سے چلنے والے گھنٹے ایجاد کئے، اسی شہر کے سنگ مرمر سے بنا تھا۔ قرطبہ کی بے نظیر مسجد میں، جو قرون وسطےٰ میں علم کا مرکز تھی، جس کی گود میں اُس زمانہ کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا، اب بھی سینکڑوں ستون ایسے ہیں کہ جن کے گرد وُہ پھول لپیٹے جاتے تھے جو قرطاجنہ کی مندروں کی قربان گاہوں پر چڑھائے جاتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر وُہ اثر تھا جو عرب حملہ آوروں پر اس برباد شدہ شہر کے مسوخ اور شکستہ شاندار یادگاروں کو دیکھ کر پڑا۔ باوجود اس کے کہ رومیوں نے اپنی نفرت اور انتقام کے تمام جذبات اس شہر پر ختم کر دیئے تھے؛ باوصف اس کے جنسیرک[2] قوت اس کی تباہی میں تمام صرف ہوگئی؛ باوجود اس کے کہ سلاطین بیزنطین نے اُس کو کس مپرسی کی حالت میں ڈال رکھا، جو فی نفسہ نہایت شرمناک بات تھی، مگر قرطاجنہ پھر بھی بہت بڑا اور خوبصورت شہر رہا؛ اُس کی بڑی بڑی عمارتیں اب بھی قایم تھیں؛ اُس کے سر بفلک کشیدہ قدیم منادر

---

[1] اٹلی کا ایک بہت ہی قدیم اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کا ایک گرجا مشہور ہے۔ اس کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ مگر ہمیں اُس کی ضرورت نہیں + (مترجم)

[2] جینسیرک GENSERIC وینڈال کے ایک بادشاہ کا ولد الحرام تھا۔ اپنے بھائی کے بعد تخت پر بیٹھا ۴۲۹ء میں افریقیہ پر حملہ کیا۔ قرطاجنہ کے مغرب میں تمام افریقیہ پر قبضہ کیا۔ پھر قرطاجنہ کو لے کر اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ سسلی، سارڈینیا اور کارسیکا کے کچھ حصّے بھی فتح کر لئے۔ ۴۵۱ء میں اٹیلا کو ترغیب دے کر گال پر حملہ کرایا، اور اُس کو تباہ کرا ڈالا۔ ۴۵۵ء میں روم پر حملہ کیا، اور اُس کو برباد کیا؛ چلتے ہوئے وہاں کی ملکہ اور اُس کی دو بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ روم نے دو مرتبہ اُس سے انتقام لینے کی کوشش کی، مگر دونوں دفعہ منہ کی کھائی۔ ۴۷۷ء میں نہایت اقبال مندی کی حالت میں مرگیا۔ مجسم غضب الٰہی تھا۔ ایک مرتبہ جہاز میں سوار ہونے لگا تو ملاحوں نے پوچھا کہ "کدھر چلیں"؛ اُس نے جواب دیا کہ "جن جن کے سر پر غضب الٰہی آیا ہو اُس طرف چلو۔ میرا قدم تمام زمین کے لئے غضب الٰہی ہے"۔ کیتھولک عیسائیوں کو خوب ہی ہدف ظلم و ستم بنایا +

(مترجم)

بھولے بھٹکے ملاحوں کی گھبرائی ہوئی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے؛ اُس کے نوادر قطار در قطار اب تک جوں کے توں باقی تھے۔ یہی وُہ چیزیں تھیں جو زمانۂ قدیم کے اُس مشہور دولت مند ترین دارالسلطنت کی گم گشتہ تہذیب، اور مذاق کی نشانیاں تھیں، جن کو اہلِ عرب نے غیر معمولی تحیّر و تعجب کی نظروں سے دیکھا۔ اہلِ فونیشیا چونکہ اسیریا اور مصر کی نہایت مہذب و متمدن اقوام کے ہمسایہ تھے، اور اُن سے باقاعدہ ربط و ضبط رکھتے تھے، اُنہوں نے علم کا بے حد ذخیرہ یہاں لا کر جمع کر دیا تھا، اور اپنے اور شہروں میں علوم سیاست، فلسفہ اور سائینس کو خوب ہی رواج دیا تھا۔ جب کبھی یہ لوگ فرات اور نیل کے سفر کو جاتے تھے تو وہاں کے چشمہار علوم سے سیراب ہو کر آتے تھے، اور اُن سے اپنے اہلِ وطن کو تشنہ نہ رہنے دیتے تھے۔ جیسا کہ کیڈمس[۱] کے متعلق خرافاتِ اصنام میں صاف طور پہ کہا جاتا ہے کہ علوم و حرفت ایشیا کو چک سے پھیلے، اور نشو ونما پاتے پاتے اُنہوں نے یونانی علما، اور یونانی سنگ تراش پیدا کئے، جو اپنے فن میں بے مثل تھے؛ اُسی طرح شمالی سواحلِ افریقہ سے وُہ آفتاب طلوع ہوا جس کی ضو نے بادیہ کے اکھڑ اور جنگ جو اقوام کے دلوں میں تہذیب و تمدن کا خیال ڈال دیا، اور اُن کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وحشی قبایل کو زیر کرنے سے بہتر کوئی اور کام کرنا چاہیئے، سپاہیانہ جوہر دکھلانے، اور میدانِ جنگ میں کام کرنے سے بڑھ کر کوئی ایسا کام کرنا چاہیئے جس کا اثر دائم رہے۔

قریباً تیرہ سو سال قبل از مسیح یہ شہر آباد ہو چکا تھا۔ شہر تایر سے (جس کو قرطاجنہ کی ماں کہنا چاہیئے) اس نے تجارت کی راہ سیکھ کر دُنیا بھر کی تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت شہر روم کی بنیاد پڑ رہی ہے تو قرطاجنہ ساحل بحرِ روم کے تمام بڑے شہروں میں سب سے زیادہ دولت مند، اور سب سے زیادہ مہذب جگہ تھی۔ یہاں کے باشندے اُن پیشوں میں مصروف رہتے تھے جو امن کے مشغلے ہیں؛ یا عیش کے لطف اُٹھاتے تھے۔ ایسی ہی صورت میں دولت کی فراوانی ہوتی ہے، نہ کہ فوجی خیموں میں رہنے، چھاؤنیوں کی تکلیف اُٹھانے، اور فتح ممالک کے لئے اچھے سپاہیوں کے تلاش کرنے میں۔ قرطاجنہ اپنے شباب پر تھا تو اُس کی فوجیں، جو لیبیا[۲] اور حبش جیسے دشوار گذار

---

[۱] کیڈمس CADMUS یونان کے خرافاتِ اصنام میں سے ایک کا قصہ ہے۔ (مترجم)

[۲] لیبیا LIBIA زمانۂ قدیم میں تمام افریقہ کو کہتے تھے۔ مگر فی الحقیقت وُہ علاقہ جس میں صحرا و افریقہ کا بیشتر حصہ شامل ہے (مترجم)

ریگستان کو عبور کر چکی تھیں، جنہوں نے صقلیہ پر اپنی زور آزمائی کی تھی، اور بیے ٹس[1] کے میدانوں کو روند ڈالا تھا، انہوں نے افریقیہ ہی کے تین سو شہروں کو فتح کر لیا تھا، جن میں سے کئی ایک بہت بڑے بڑے تھے۔ وہ قیمتی دھاتیں جزیرہ نما سپین سے ہی لیتے تھے، اسی لئے وہاں کی چاندی کی کانوں پر ان کے پچاس ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ فن زراعت کی طرف خاص طور پر توجہ کی جاتی تھی۔ وہاں کی زمین نہایت زرریز تھی، اس پر خوشگوار آب وہوا اور سائنٹفک طریقۂ آب پاشی اور بھی سونے پر سہاگہ تھی۔ اس دارالسلطنت کا محکمۂ تعمیرات نہایت اچھا تھا؛ اس کے شاہد ان کے پل وغیرہ کے خرابے ہیں، جو دو ہزار برس سے طوفانوں، طغیانیوں اور سیاسی انقلابوں کا برابر مقابلہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کو چھوڑ کر جس فن میں باشندگان قرطاجنہ اپنے تمام ہمعصر شہروں سے فوقیت لے گئے تھے، وہ فن تجارت تھا۔ وہاں کے تاجر دنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔ ان کو وہ ترکیبیں یاد تھیں جن سے آج کل مہذب و متمدن اقوام کام لے رہے ہیں، اور جن سے تجارت میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر وہ چیزیں ہیں جنکو لاطینی مصنفین و مورخین نے بیان کیا ہے؛ یعنی ایک قسم کا چمڑا ہوتا تھا کہ اس کو خاص طریقہ پر تہ کر کے اس پر مہر لگا دیتے تھے تاکہ جعل سے محفوظ رہے؛ یہ چیز بطور سکہ کے رائج تھی۔ یقیناً یہی چیز ہمارے زمانہ کے نوٹ اور بل آف ایکسچینج کی باوا آدم ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ تجارت کے ان تمام آئین وضوابط سے واقف تھے جو آج کل مروج ہیں، اور ممالک غیر سے تجارت کرنے کی تمام آسانیاں انہوں نے پیدا کر لی تھیں، مثلاً بینک، بیمہ اور درآمد کے محصولات وغیرہ وغیرہ۔

دوسری پیونک وار کے ختم ہونے تک روم نے صنعت وحرفت میں کچھ قابل اعتنا ترقی نہیں کی تھی۔ قرطاجنہ کی بربادی کامل، اور بہت سے موقعوں کی طرح، دشمن کے لئے اتنی مفید ہوئی کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ شہر کے مال مفروقہ کی فہرست میں، علاوہ تصاویر اور مجسموں، چاندی سونے کے برتنوں کے، جس پر نہایت محیر العقول کام کیا ہوا تھا، جو قیمتی جھتہ کہ فاتحین نے

[1] بیے ٹس BAETIS افریقیہ کا ایک بیحد سرسبز گیاہ میدان ہے۔ (مترجم)

بطور یادگار اپنے پاس رکھا تھا، اُس کی قیمت کا تخمینہ ڈھائی کروڑ روپیہ لگایا جاتا ہے۔ لوٹ کے مال میں نہایت قیمتی اشیا منبّت کار تھیں، اتنے جواہرات تھے کہ جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگ سکتا، وُہ تکلف کی چیزیں تھیں، کہ جن کی اہالی قرطاجنہ بڑی قدر کرتے تھے، اور جن پر نقش و نگار اور مرصع کرنے کا کام، سوا اُن کے کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ عجیب و غریب نمونے، جن کو بے تعداد نسلوں کی محنت و مشقت، اور ذہانت و ذکاوت نے تکمیل کو پہنچایا تھا، وہ چیزیں تھیں کہ اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے کہ رومی کاریگروں کے عقل و دماغ نے اُن سے نئی روشنی پائی، اور آیندہ ترقیات کا مادہ اور خیال پیدا کر دیا۔ ہم کہ ایپئی[1] ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر قرطاجنہ میں بہت سے کتب خانہ تھے، اُن ہی میں مصنفین اپنی تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے تھے فی نفسہ یہی بات کچھ کم قابل ناز نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ان کی مشقت کے نتائج محفوظ نہیں رہے، صرف ایک مصنف ٹیرنینس[2] نامی کی شہرت آیندہ نسلوں تک پہنچی ہے، جو آزاد شدہ غلام تھا۔ پچیس ہی برس کی عمر میں وُہ رومی تماشا گاہوں میں، جہاں فنون مردانہ کے نکتہ چینیوں کا مجمع ہوتا تھا، اپنے اچھوتے جوہر دماغی کی سیر دکھلا کر لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا اندازہ قرطاجنہ کی بری اور بحری فوجی طاقت کا اس سے لگ سکتا ہے کہ صقلیہ کی لڑائی میں، جو چوبیس برس کامل جاری رہی، صرف ایک لڑائی میں قرطاجنہ کے پانچ سو بہت بڑے جہاز، اور ڈیڑھ لاکھ فوج غارت گئی۔ باوجود اتنے بڑے نقصان کے نہ اُن کے ذرایع جنگ پر کوئی سخت اثر پڑا نہ فتوحات میں اُن کا قدم پیچھے پڑا۔ اگر یہی صدمہ کسی اور ہمعصر سلطنت پر پڑتا تو وُہ بالکل مٹ جاتی۔ قرطاجنہ کے فوجی افسروں اور سپہ سالاروں کے اسلحہ پر نہایت قیمتی کام ہوتا تھا وُہ میدان جنگ میں جاتے تھے تو ایسے زرہ بکتر پہن کر جاتے تھے کہ جن پر اُن کے مالکوں کی تصویریں سونے کی بنی ہوئی لگی ہوتی تھیں۔ یہ تصویریں بمنزلہ اُن کے مجسموں کے ہوتی تھیں۔

قرطاجنہ چونکہ جنوبی بحر روم کے وسط میں واقع تھا، اور ہر بندر سے، جہاں تاجروں کو جانا ہوتا تھا

---

[1] و [2] دونوں مورخ ہیں۔ پہلا غیر معتبر اور دوسرا معتبر۔ (مترجم)

پہنچنے کے لیئے اس جگہ سے ضرور ہی گزرنا ہوتا تھا، اس لئے وہ ان جغرافی فوایدسے پورے طور پر مستفید ہوا، اور ان ہی نے اُس کے بحری و سیاسی عروج پر پہنچنے کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اُس کے بائیں طرف ہرقلیس کے مینار تھے؛ اسی راستہ سے سپین اور برطانیہ کا مال تجارت گزرتا تھا۔ اُس کے داہنی طرف مصر تھا، جس کو اُس کے اناج کی کھتی کہنا چاہیئے۔ اُس کے سامنے اٹلی اور یونان کی کانیں اور غلاموں کی منڈیاں تھیں۔ اُس کے پشت پر لابیبا کا سونا اور جواہرات تھے۔ شہر قرطاجنہ گویا ایک جزیرہ نما میں واقع تھا، جس کی خاکنا پر تین تین فصیلیں تھیں۔ شہر کا رقبہ تیئیس میل کا تھا، اور اس میں قریباً دس لاکھ آدمی آباد تھے۔ قلعوں کے اندر مشرق کی طرف کوتھون تھا، جہاں دوہرا بندر تھا؛ یعنی اُس میں دو مدوّر کھاڑیاں بنی ہوئی تھیں جو ساٹھ فٹ چوڑی نہر کے ساتھ ملا دی گئی تھیں؛ دونوں میں حفاظت کے لئے بہت بڑی اور نہایت مضبوط زنجیر پڑی رہتی تھی۔ باہر کی طرف جو بڑی کھاڑی تھی اُس کا رقبہ چھ ہزار فیٹ تھا۔ یہ تجارتی جہازوں کے واسطے مخصوص تھی؛ اور اندر کی طرف جو کھاڑی تھی وہ جنگی جہازوں کے لئے۔ دونوں کے گرد مال وغیرہ اُتارنے چڑھانے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھیں؛ یہیں اسباب رکھنے کے لئے مکان تھے، یہیں ملاحوں کے رہنے کے لئے گھر بنے ہوئے تھے، یہیں اسلحہ خانہ تھے۔ ان تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تھا اُس میں آیونک[1] وضع کی ڈیوڑھیاں اور سنگ مرمر کے ستون وغیرہ تھے۔ اندر والے بندر کے درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ چھوڑ دیا گیا تھا؛ اس میں دو سو جہازوں کے لئے رصیف بنائے گئے تھے؛ یہیں جہاز لنگر ڈالے رہتے تھے۔ جزیرہ کے وسط میں امیر البحر کا قلعہ تھا، جو فوجی بگل کی آواز پر قواعد وغیرہ کرایا کرتا تھا۔ عین کوتھون کے اوپر، ایک بلندی پر، مشہور بائرسا، یا قلعہ تھا؛ جس کی فصیل ساٹھ[۶۵] فیٹ بلند تھی، اور اس میں جابجا متعدد برج تھے۔ اس سے ملا ہوا چار ہزار گھوڑوں اور تین سو ہاتھیوں کے رہنے کے لئے اصطبل، اور سپاہیوں کی بارکیں تھیں، جن میں چوبیس ہزار سپاہی رہ

---

[1] آیونک IONIC ایشیا کوچک کے ایک قدیم شہر آیون ION کی طرف منسوب۔ فن تعمیر میں یہاں کی محرابیں خاص وقعت رکھتی تھیں۔ (مترجم)

سکتے تھے۔ اٹھارہ حوض اور تھے، جن میں سے سات اب تک باقی ہیں۔ ہر ایک حوض نوّے فیٹ طویل، بیس[۱] فیٹ عریض اور اٹھائیس فیٹ عمیق تھا۔ ان کے اُوپر پل تھے اور دوسری طرف تالاب تھا۔ یہی تمام شہر کے ذریعہ آب رسانی تھے۔ بایرسا کی انتہا بلندی پر ایس کولیپ پیس کا مندر تھا، جو شہر کا محافظ دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مندر ایسا تھا کہ اُس پر کسی کا قبضہ کرنا قریباً ناممکن تھا، مگر کامل الفن انجینئروں نے اُس کو کچھ اس طرح بنایا تھا کہ وُہ چنداں مضبُوط نہ معلوم ہوتا تھا۔ بہت سی سیڑھیاں چڑھکر اُس تک پہنچ سکتے تھے۔ اُس کی صورت بالکل اُن معلقہ باغات کی سی تھی جو اسیریا میں بنے ہُوئے تھے، سیڑھیاں قیمتی سنگ مرمر کی تھیں، جگہ جگہ خوبصُورت مجسمے، اور اور خوبصُورتی اور زینت کی چیزیں لگی ہُوئی تھیں؛ اُس کی دیواروں میں سنگ سماق اور سنگ بصری کی سلیں لگی ہوئی تھیں؛ اُس کے رواقوں کے فرش پر منبت کاری ہو رہی تھی۔ مندر کے علاوہ اور بہت سے منادر اُسی شان وشوکت کے اس دارالسلطنت افریقیہ میں تھے۔ اہالی قرطاجنہ کا اصلی مذہب تو ستارہ پرستی تھا، مگر صدیوں سے اُنھوں نے ستارہ پرستی کو چھوڑ کر نہایت ذلیل قسم کی بت پرستی اختیار کر لی تھی۔ شہر کے مختلف محلّوں کے نام اُن بتوں کے نام پر تھے جن کے بُت اُس محلہ میں لگے ہوئے تھے۔ کوٹھون کے مغرب میں اپولو کا مندر تھا؛ اور اُس سے ملا ہوا ہی میل کارتیھ[۲]، یا ہرقلیس کا مندر تھا۔ اس کے اندر کوئی عورت نہیں جاسکتی تھی۔ یہاں کے پروہت عہد کئے ہوئے تھے کہ وُہ شادی نہ کریں گے۔ یہ لوگ ننگے پیر اور اپنا سر مُنڈائے رہتے تھے۔ ان دونوں مندروں میں جو باغ تھے وُہ ہمیشہ پھُولوں سے مہکتے رہتے تھے۔ ان باغوں میں جگہ جگہ درختوں کے جھُنڈ تھے۔ فونیشیا کے مذہبی رسوم میں کچھ شہوت رانی کے موقعہ زیادہ ہوتے تھے، اور یہ جھنڈ اسی کام میں آتے تھے۔ سمندر کے پاس افریقی بعل کا مندر تھا۔ جس کو یہُودی "ملوخ" کہتے تھے۔ اس میں مارپیچ بنے ہُوئے تھے، اور تین ہم مرکز برُج

---

[۱] ایس کولیپ پیس AESCULAPIUS یونان کا ایک دیوتا جو حافظ جسم وجان ہے۔ یونانی خرافات الاصنام میں اس کا قصّہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ (مترجم)

[۲] میلکارتیھ MELCARETH ایک یُونانی دیوتا۔ (مترجم)

تھے، جو اُوپر سے کُھلے ہُوئے تھے تاکہ دوپہر کو دُھوپ بُتوں کے اُوپر پڑتی رہے +

قرطاجنہ کی اور عمارتیں بھی خوبصُورتی اور شان میں ویسے ہی تھیں جیسے کہ وہاں کے مندر۔ چونکہ اُس کے تجارتی تعلقات نہایت وسیع تھے؛ اِس لئے زمانۂ قدیم کی ہر چیزیں وہاں کے لوگوں کے یہاں موجود رہتی تھیں۔ عمارتوں کی زینت میں اہالی قرطاجنہ نہ روپیہ کا بچاؤ کرتے تھے، نہ محنت ومزدوری کا، وہاں کا تماشا گاہ بہت ہی بلند اور شاندار تھا۔ اُس کی سات منزلیں تھیں، جو محرابوں کی قطاروں پر قائم تھیں۔ اس عمارت کی روکار پر جانوروں، بڑے بڑے صناعوں اور سپہ سالاروں کی تصویریں، اور بعض عناصر مثلاً ہوا اور موسموں کی علامتیں کھُدی ہوئی تھیں۔ وہاں کا سرکس روم کے سرکس سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ اس میں اتنے بڑے بڑے ستون تھے کہ اُس کے نچلے حِصّہ پر بارہ آدمی بآرام بیٹھ سکتے تھے۔ ان کا طول سو فیٹ کا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے چوک کے وسط میں ایک تالاب تھا، جس پر بہت سے ستون اور محراب بنا کر جھروکے نکالے گئے تھے۔ یہ تمام عمارتیں نہایت شفاف سنگ مرمر کی تھیں، جب ان پر جنوبی ملک کے آفتاب کی شعاعیں پڑتی تھیں تو بلّور کا لطف دے جاتی تھیں۔ ان میں صناعوں نے جو اپنی خوش مذاقی دکھلائی تھی وُہ تین ہزار برس کی تہذیب کا نتیجہ تھا۔ زمانۂ قدیم کی ہر قوم نے اُن عمارت کی خوبصُورتی، موزونیت، شان اور قیمت بڑھانے میں اہالی قرطاجنہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ جو مصالحہ ان میں خرچ کیا گیا تھا اُس کی لطافت کو ہزار گونہ اُن کی صنعت سنگ تراشی اور زیبائش نے بڑھا دیا تھا +

مضافات قرطاجنہ میں ایک جگہ موسومہ میگارا تھی۔ یہیں اُمرا کے بیرونِ شہر بنگلے تھے۔ بعض مکانات بالکل وینس کی قطع کے وسط سمندر میں، محرابوں پر بنائے ہوئے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا رمنہ تھا، اُس میں جگہ جگہ نہریں جاری تھیں، جو ساٹھ میل کے فاصلے سے پہاڑوں پر سے اُتاری گئی تھیں۔ میگارا کا تالاب اتنا بڑا تھا کہ اس وقت اُس کے رقبہ میں عربوں کا ایک پُورا گاؤں آباد ہے۔ یہ بھی اُتنا ہی مضبُوط تھا جیسا کہ بائیرسا کے حوض۔ اس تالاب کے ایک کنارے پر ایک طرف خیمہ تھا کہ اُس میں بے تعداد طاقیں لاشیں رکھ دینے کے لئے بنی ہوئی تھیں +

اس دولت مند اور مضبوط شہر کے کھنڈروں پر ایک اور شہر آباد ہوا، جو بلحاظ تجارت اور عمارات کے پہلے شہر کا مقابلہ کرتا تھا۔ موخر الذکر شہر سیپیو کی فتح کے ایک سو ایک برس بعد آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ رعب اور تکلفات میں اگر یہ کسی سے دبتا تھا تو صرف دارالسلطنتہا ئے اٹلی و مصر سے۔ رومیوں کے آباد کردہ شہروں میں سب سے بڑا مایۂ فخر و ناز یہی تھا۔ اگر اس کے جاہ و فروغ، زراعت اور اٹلی کے بہت سے رؤسا کے مسکن، اور زمانۂ قدیم کی شان و شوکت پر لحاظ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ یہ نیا دارالسلطنت پرانے شہر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جو رؤسائے اٹلی یہاں تھے وُہ بادشاہ وقت کے ظلموں اور وحشیانہ تشددوں سے اپنی جان چھپا کر یہاں آبسے تھے۔ یہاں کی عمارات روم کی بہترین عمارات کا مقابلہ کرتی تھیں۔ اس شہر کے باشندوں کی دولت، ذکاوت و ذہانت، اخلاق و آداب اور بے حد آزادی تمام دُنیائے قدیم میں ضرب المثل ہو رہی تھی۔ ساتویں صدی مسیحی میں تجارت بحرِ روم کا بہت بڑا حصہ اس شہر نے اسکندریہ سے چھین لیا تھا۔ اگر یہاں کی آبادی اور اُس کی طاقت کو دیکھا جائے تو وُہ سکندریہ سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ چونکہ یہ مقام افریقیہ بھر کی ملکی حکومت کا مستقر تھا، اور سب سے بڑی چھاؤنی بھی یہیں تھی، اس لئے مغربی دُنیا کی خوش مذاقی، روشن دماغی، علم، فلسفہ اور اصُول قانون کا تقریباً یہی مالک واحد بنا ہوا تھا۔ اسی شہر کی فصیل کے اندر یونیورسٹیاں تھیں، جن میں کامل الفن اُستاد آزادی سے تعلیم دیتے تھے یہیں وُہ دارالعلوم خوب پھل پھول رہے تھے، جو ہر زبان، اور ہر ایک سائنس پڑھاتے تھے۔ وہاں کے سرکس اور تماشا گاہ روز حسینانِ شہر اور ذکی و ذہین لوگوں سے بھرے رہتے تھے۔ یہاں کی سوسائٹی چونکہ عیش پسند تھی، اس لئے اُس کی اس درجہ خراب حالت تھی کہ قابل بیان نہیں۔ زمانۂ یبونک نے اُن کی خرابیوں اور خلاف وضع فطری حرکتوں کو بہت مدد دی تھی۔ اس کے اصلی باعث وُہ پناہ گزین شرفاء اور جلاوطن انفار تھے جو اُجڑے ہوئے روم سے منتقل ہو کر یہاں آ رہے تھے۔ اپنی عادات بد، بے شرمانہ خصایل، عہد شکنی، غداری، عزت فروشی، اور عصمت و عفت کی طرف سے انتہا درجے بے پروائی کی وجہ سے ممالک مشرقیہ و مغربیہ کی بدترین و بدمعاش سوسائٹی بھی قرطاجنہ والوں کو اپنی صحبت سے کے

قابل نہ سمجھے تھے اور اُن کو سخت بدنام کرتے تھے۔ وینڈال نے وہاں کے خزانوں کو لوٹا اور وہاں کے رہنے والوں کو غلام بنا لیا، مگر اُن کی بڑی بڑی عمارتوں کو چھوڑ دیا، اور اُن کی فصیلوں کو منہدم نہ کیا، حالانکہ ان وحشیوں نے جس شہر کو فتح کیا اُس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ غرض یہ تھا وہ شہر جو مسلمانوں کا خار راہ بنا ہوا تھا، اور اُن کی کامیابیوں کے راستے میں حائل تھا، جس کے اقتدار فایق نے آنے والی نسلوں کے عادات، مذہب اور خیالات پر اپنا سکہ بٹھا یا ہوا تھا۔ زمانۂ قدیم کی تجارت کا نشو و نما اسی شہر کے طفیل میں ہوا، جس کے اکثر اصُول کو زمانۂ حال کے معتقدات نے اپنا بنالیا ہے۔ ان ہی میں سینٹ آگسٹن کے عقاید، اور مذہب مسیحی کے علم الٰہیات کے درخشندہ جوہر ہیں، جو اس وقت تک کلیسائی کونسلوں پر حاوی ہیں، اور نظام دین مسیحی میں ان کا دخل ہے۔

غرض، مسلمانوں کے سپہ سالار کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو وُہ اپنی شاندار اور جوشیلی فوج کو لے کر آگے بڑھے، اور کامیابی کا بالکل یقین کر کے فوراً ہی حملہ کرنے پر تیار ہو گئے، اور سیڑھیاں لگا دیں۔ باوجود اس کے کہ منجنیق سے آگ برستی رہی، مگر بیزنطینی فوج نے غیر معمُولی طور پر اپنی شجاعت کے جوہر دکھلائے، مگر آخر شہر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اس عرصہ میں باسفرس تک یہ خبر پہنچ گئی کہ مملکت افریقیہ خدشہ میں ہے۔ دربار شاہی خواب غفلت سے کچھ چونکا، اور ایک بہت بڑا بیڑا تیار کیا۔ مسلمان ابھی آرام بھی نہ کرنے پائے تھے کہ تازہ دم دشمن کی آمد اُن کو معلوم ہوئی۔ اس کو سُنتے ہی وُہ وہاں سے ہٹ گئے، لیکن چند ماہ کے بعد جب حسن کے پاس اور کمک پہنچ گئی تو اُنہوں نے پھر قرطاجنہ کو آگھیرا۔ یونانی اپنی حماقت سے عربوں کے ساتھ کھُلے میدان میں لڑے، اور فیصلہ کن شکست کھائی۔ شہر کو خوب لوٹا گیا اور پھر اُس میں آگ لگا دی گئی، اور اُس کی عنان حکومت ابدالآباد تک کے واسطے ذلیل و خوار اور نامرد بادشاہانِ روم مشرقی کے ہاتھ سے نکل گئی۔

دارالسلطنت کا تباہ کرنا محض اس غرض سے تھا کہ رعب و اقتدار قایم ہو جائے۔ اگرچہ یونانیوں کی باقی آبادیوں پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا، مگر بربریوں نے ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ اُن کی فوج اُن تمام علاقوں پر قابض رہی جو سرحد کے اُس طرف تھے۔ ایک عورت، ضبّہ نامی، شاہی خاندان کی ایک

مکّارہ تھی! عربی مورخوں نے اس کو محض "کاہنہ" کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس عورت نے اپنے عجیب و غریب علم سے اپنے ہم ملکوں پر بہت ہی بڑا اثر ڈالا، اور اُن میں ایک قسم کی حب الوطنی پیدا کر دی؛ اُن کی باہمی دشمنی کو کم کر دیا، اور اٹیلس کے تمام بادیہ گرد لوگوں کو ایک دُوسرے کا حلیف بنا کر، انہیں بڑی طاقتور قوم بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنی تعلیمات سے بربریوں میں ایک نئی رُوح پھُونک دی تھی؛ اُن کو بہت بڑی لُوٹ کا لالچ دیا تھا۔ اسی غرّہ پر بربریوں نے حسن کی فوج پر ہلّہ کر دیا۔ عربوں کو سخت نقصان اُٹھا کر برکہ میں جا کر اپنا سر چھُپانا پڑا؛ یہاں پانچ سال کامل تک وُہ بیکار پڑے رہے۔ کہتے ہیں کہ جیسے ہی دشمن نے سرحد چھوڑی، اس کاہنہ کے حکم سے ساحل کے تمام سرسبز و شاداب علاقہ میں آگ لگا دی گئی؛ جو اپنے عرُوج کے زمانہ میں تمام ملک محروسہ کے لئے ذریعہ آذوقہ رہا تھا۔ اس کی خوبصورتی کی سیاحوں نے تعریفیں کی ہیں۔ یہ تباہی محض اس لئے کی گئی کہ بربریوں کا ملک دشمنوں کے آیندہ حملوں سے بالکل محفوظ ہو جائے۔ کھیت بنجر اور قصبات بے چراغ ہو گئے، فصلوں کو جلا ڈالا، باغات کو کاٹ دیا، نخلستان کو جنگل بیابان کر دیا۔ اس احمقانہ زیادتی سے تمام زمیندار اور ملک کے متمدّن ناراض ہو گئے؛ اور وقتاً فوقتاً اُنہوں نے اپنے ایلچی اس وعدہ سے نایب السلطنت افریقیہ کے پاس بھیجے کہ اگر وُہ اس معاملہ میں دخل دیں گے تو یہ تمام لوگ اُن کو مدد دیں گے، اور آیندہ اُن کے حلیف رہیں گے۔ آخر حسن کو پیش قدمی کرنے کا دمشق سے حکم ملا۔ چنانچہ اس مرتبہ وُہ اتنی فوج لے کر افریقیہ کی طرف بڑھے کہ اُس سے پہلے کبھی اتنی فوج وہاں نہ آئی تھی۔ کوہ اوراس کے پاس عربوں، اور اُس کاہنہ، اور اُس کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ کاہنہ ماری گئی۔ بربریوں نے سخت ترین شکست کھائی۔ اور تمام متمرد علاقہ نے اپنے آپ کو فاتحین کے رحم کے حوالہ کر دیا۔ مگر وہی مصیبت، جو اوّل سے آخر تک مسلمانوں کے گورنروں پر پڑتی رہی ہے، حسن پر بھی پڑی؛ حسن کی قسمت نے بہت بُرا پلٹا کھایا۔ خلیفۂ وقت کے بھائی، عبدالعزیز، مصر کے نائیب السلطنت کر کے بھیجے گئے، افریقیہ بھی ان ہی کے تحت حکومت کیا گیا۔ حسن کے خلاف ظلم و ستم کی بہت سی درخواستیں گزریں۔ ان کی جوابدہی کے لئے وُہ دمشق میں طلب کر لئے گئے۔ مگر جیسے ہی اُنہوں نے بربریوں کا

مال مغروقہ، اور وہاں کی نہایت حسین عورتیں پیش کیں، اور اس کے ساتھ ہی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے جوابات، اور اپنی کامیابیوں کے حالات، بیان کئے تو خلیفہ خوش ہو گئے حسن بحال کر دیئے گئے، بلکہ اُن کو کچھ زاید اختیارات دے کر افریقیہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جب وُہ واپسی کے وقت مصر سے گزر رہے تھے تو عبدالعزیز نے بحیثیت نایب السلطنت ملک مصر و افریقیہ، اُن کو حکم دیا کہ اپنے تقرر کا حکم شاہی اُن کے حوالہ کر دیں! اُنہوں نے انکار کیا تو عبدالعزیز نے بجبر وُہ حکم چھین کر پھاڑ ڈالا، اور علی الرغم خلیفۂ وقت حسن کو اپنے حکم سے معزول کر کے اُن کی جگہ موسلے ابن نصیر سپہ سالار افواج ملک مغرب کو افریقیہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ (رحمۃ اللہ علیہ)+

اس سپاہی کے حالات کے ساتھ کچھ ایسے واقعات ملے ہُوئے ہیں جن میں افسانہ کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ واقعات کچھ ایسے ہیں کہ ایشیائی افسانہ پسند طبیعتیں بھی اُن کو صحیح تسلیم کرنے میں تامل کریں گی۔ اصطخر (واقع ایران) کے عین مغرب میں سو میل کے فاصلہ پر ایک مقام عین تمر ہے اس وقت اس مقام پر ایک نخلستان ہے اور یہاں اِدھر اُدھر کے راہزن جمع رہتے ہیں۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں یہ مقام خوب آباد تھا، شام اور ایران کی تجارت سے اس کو بہت کچھ فائدہ پہنچتا تھا۔ یہاں نسطوری عیسائیوں کا ایک کلیسا، اور راہبوں کی خانقاہ تھی۔ مُسلمانوں نے یہاں کی دولتمندی کا شہرہ سُنا تو حضرت خالد ابن ولیدؓ ریگستانوں کو طے، اور تکلیفیں برداشت، کرتے ہُوئے اپنی فوج سمیت یہاں پہنچے، اور حملہ کر دیا۔ اس خانقاہ کے گوشوں میں بہت سے نوجوان، شریف و نبیل خاندانوں کے، بظاہر تو طالب علمی میں مصروف نظر آتے تھے، مگر فی الحقیقت وُہ سب ایشیاء کوچک کے عالی خاندان یرغمال تھے۔ مُسلمانوں نے، حسب معمول، اُن سے کہا کہ یا تو وُہ غلامی کو پسند کریں، یا مُسلمان ہو جائیں۔ زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جنہوں نے مُسلمان ہونا منظور کیا۔ اُن میں سے دو آدمی موسومہ سیرین اور نُصیر ایسے بیٹوں کے باپ ہُوئے جنہوں نے مُسلمانوں کی قسمت پر بہت ہی بڑا اثر ڈالا۔ سیرین کی اولاد سے محمدؒ تھے جو بصرہ کے بہت ہی بڑے عالم، اور اسلامی علم ادب کے نہایت مستند فاضل ہُوئے۔ اور نُصیر باپ تھے موسلے فاتح سپین و افریقیہ کے (اللّٰھم ارحمھا)

مسلمانوں کی رسم کے موافق گرفتار شدہ شخص گرفتار کنندہ کے خاندان کا فرد بن جاتا ہے؛ اس بناء پر نصیر خلیفہ عبدالملک سے تعلق رکھتے تھے، اور اُن کے بیٹے موسلے کو خلیفہ کے بھائی عبدالعزیز سے ویسا ہی تعلق تھا۔ وُہ موسلے پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان میں ایسا دوستانہ تعلق تھا کہ شاہی خاندان میں ایسا بہت کم ہُوا کرتا ہے۔ موسلے نے شام کے اُن بہترین مدارس میں تعلیم پائی تھی، جن کو بجا طور پر بڑی شہرت حاصل تھی۔ اُن کی ذہانت اور معاملہ فہمی شروع ہی سے معلوم ہونے لگی تھی؛ اسی وجہ سے وہ اہم ترین سیاسی عہدوں پر مقرر کئے گئے۔ دَورانِ خلافتِ عبدالملک میں وُہ گورنر بصرہ کے وزیر مقرر کئے گئے، مگر اُن کی کوئی ایسی بددیانتی معلوم ہوئی، کہ وُہ سخت سزا پاتے، لیکن اپنے مربی، عبدالعزیز، کی سعی و سفارش سے بچ گئے۔ ان ہی نے موسلے کی طرف سے ایک سو دینار جرمانہ ادا کیا (یہ جرمانہ مالِ مسروقہ سے بقدر پچاس گونہ زیادہ تھا) جو خلیفۂ وقت نے اُن پر اپنے سخت غصّہ کی حالت میں کیا تھا۔ اس کے بعد یہ مصر میں آ گئے، اور گورنر مصر کے نہایت معتمد مشیر ہو گئے۔ تاریخ نہیں بتلاتی کہ انھوں نے فوجی مشق کہاں کی جسکی وجہ سے اُن کا نام اتنا روشن ہے، اور تا قیامت روشن رہیگا موسلی کے قوٰے بہت مضبوط تھے؛ سختیاں جھیلنے کی اُن کو خوب عادت تھی؛ لباس سادہ پہنتے تھے جزورس تھے؛ پرہیزگار تھے؛ باوجود اسکے کہ شباب گزر چکا تھا مگر وہ صحت و تندرستی کے مجسم نمونہ تھے اگرچہ بہت سے بال سفید ہو چکے تھے لیکن جوانی کی خصوصیات پوری باقی تھیں؛ بلند نظری اُن کے چہرہ سے ٹپکتی تھی؛ عالی حوصلگی اُنکی آنکھوں سے معلوم ہوتی تھی؛ اور تکلیف اُٹھانیکی ہمّت اور سیر و سیاحت کا مادّہ صاف صاف نظر آتا تھا۔ مجالس شورٰی میں اُن کی ذہانت اور تیز فہمی کے جوہر کھلتے تھے؛ کسی کام کے کرنے میں بہت جلدی کرتے تھے؛ جنگ میں خوف و ہراس اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے؛ انتقام لینے میں سخت سنگ دل تھے۔ اُنکے دامن پر اگر کوئی دھبّہ ہے تو یہ کہ وہ سخت بے رحمی کر جاتے تھے۔ مزاج میں تنک زیادہ تھا؛ اور احسان فراموش تھے؛ اُنکو طمع اتنی تھی کہ اسکے پورا کرنے میں وہ عہدہ اور اختیارات کے چھن جانیکی بھی پروا نہ کرتے تھے؛ یہ خصلت اُن کے اَور تمام خصائل پر پوری حاوی تھی؛ فہم و فراست میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے

طبائع انسانی کی خصوصیات کو خوب سمجھتے تھے، لوگوں کو اسطرح ترغیب دیتے، اور اسطرح تحریص کرتے تھے کہ دشمن بھی اُنکے پھندے میں آپھنستا تھا۔ اگرچہ فرائض دینی کے ادا کرنے میں نہایت شدید تھے، مگر بعض وقت اُن سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی تھیں کہ خلافِ اتقا ہوتی تھیں۔ تاہم اُنکی عام شہرت یہ تھی کہ وہ نہایت دیندار اور متقی آدمی تھے۔ مہماتِ فوجی کے موقعوں پر اُنکے اصلی سپاہیانہ جوہر کھلتے تھے، ان ہی موقعوں پر وہ نہایت تجربہ کار اور محتاط سپہ سالار ثابت ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ تخمینہ اور اندازہ لگاتے تھے وہ اکثر صحیح ہوتا تھا، اور اسی سے اُنکی ہوشیاری اور دوربینی معلوم ہوتی تھی۔ اپنی مہم کو کامیاب بنانیکے لیئے وہ پہلے اپنے مخالفوں کو نیست و نابود کر لیتے تھے یا قید کر لیتے تھے۔ پیشقدمی نہایت سرعت کے ساتھ کرتے تھے، اور حملہ دفعتہً، جسکا نتیجہ یقینی کامیابی ہوتا تھا۔ یہ تھے اُس شخص کے خصائص و خصائل جسکے ہاتھ میں ملک مغرب کی اسلامی فوج کی عنان دیدی گئی تھی۔

جو سپاہی کہ قرطاجنہ پر سیڑھی لگا کر چڑھ گئے تھے، اور جنہوں نے بربری کاہنہ کی فوج کو شکست فاش دی تھی، وہ اپنے نئے سپہ سالار کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ موسیٰ نے تمام فوج کو جمع کر کے اُنکی بقیہ تنخواہ کا ۱/۳ حصہ گنا روپیہ ہر ایک کو عطا کیا۔ اسکے بعد اُنہوں نے ایک تقریر کی جس میں ایک خطیب کی فصاحت و بلاغت، ایک درویش کی بےنفسی، ایک واعظ کی ترغیب و ترہیب، سب کچھ تھے۔ دوران تقریر میں اُنہوں نے کہا کہ " میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں، میں اگر کوئی اچھا کام کروں تو اُسکی تعریف کرو، اور میرا دل بڑھاؤ، اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو یا میں بُرا کام کروں تو مجھے ملامت اور سرزنش کرو کیونکہ ہم میں سے کوئی شخص بھی انسانی کمزوری اور غلطی سے بری نہیں ہے"۔ سپاہی اپنے افسر کی سیاسی جودوسخا کو دیکھکر بہت خوش ہوئے، بالخصوص اُنکے انکسار کا سپاہیوں پر بہت بڑا اثر ہوا، اور اُنھوں نے خوشی کے نعرے مارے۔ اِس واقعہ کے بعد موسیٰ تمام فوج کے محبوب ہو گئے۔

غرض بلا غیر ضروری توقف کیئے اپنی عادت کے موافق تشدد کے ساتھ اُنہوں نے حملہ کی تیاری کر دی۔ شروع ہی میں ایک ایسا واقعہ گزرا کہ جس سے تمام سپاہ اُنکی ممنون ہو گئی، اور اُس زمانہ میں کہ وہمیات کا زور تھا سب کو یہ یقین ہو گیا کہ اُنکے سپہ سالار میں کچھ روحانی طاقت بھی ہے۔ اُس علاقہ میں ایک مدت سے پانی

نہیں برسا تھا، تمام چشمے اور کنوئیں سوکھ گئے تھے، فوج اُسوقت ریگستان میں دُور نکل گئی تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ سب لوگ پیاسے مرجائینگے۔ موسیٰ نے وہیں اُترکر نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعا مانگنی شروع کی۔ روایت ہے کہ اُنکی دعا قبول ہوئی اور فوراً بارش ہونی شروع ہوگئی۔ اس واقعہ کے نوسو برس کے بعد بھی ایک مرتبہ سخت قحط پڑا تھا، مسلمانوں نے دُعا مانگی اور خدا تعالیٰ نے اُسیوقت بارش بھیجدی۔

غرض، بربریوں کو تو اپنی پچھلی کامیابیوں پر بڑا ناز تھا، اُنہی کے بھروسہ پر اُنہوں نے ایک میدان میں عربوں کا مقابلہ کیا اور بہت بُری طرح شکست کھائی جس میں ہزاروں آدمی تہ تیغ ہوئے۔ جن بقیۃ السیف لوگوں نے پہاڑوں میں یہ سمجھکر پناہ لی تھی کہ اُنکے راستے دشوار گزار ہیں اور وہاں تک دشمنوں کا پہونچنا محال ہے، اُن لوگوں کا عربوں نے محاصرہ کرلیا۔ اسپر اُنہوں نے مجبوراً اپنے آپکو اپنے دشمنوں کے حوالہ کردیا۔

موسیٰ کی پالیسی حسن کی پالیسی سے مختلف تھی۔ انکے مزاج میں بہت بیجا شدت تھی۔ اگر کوئی قوم یا قبیلہ اُنکا مقابلہ کرتا تھا تو وہ اُن سب کو غلام بنالیتے تھے، جائیداد تمام ضبط کرلیتے تھے اور اُنکے گاؤنکو جلادیتے تھے۔ برعکس اسکے اگر کوئی اُن سے مقابلہ نہ کرتا اور برفق پیش آتا تو وہ اُنسے محافظت اور مرحمت خسروانہ کا وعدہ کرتے اور اُسکو پورا کرتے۔ مضبوط آدمیوں کو وہ اپنی فوج میں داخل کرلیا کرتے تھے۔ پہلے بارہ دفعہ بربرہ مسلمان ہوکر مرتد ہوچکے تھے۔ موسیٰ اُنکی مذبذب طبیعت کو سمجھ گئے تھے، اسلئے اُنہوں نے اپنی فوج میں علماء اور حفاظ کو مقرر کیا وہ بربریوں کو روز بلاناغہ دینی تعلیم دیتے تھے۔ یہ نئی صحبتیں، علماء پر اعتقاد، اپنے اعزّا و اقارب سے دوری، شہرت کامیابی اور مالِ مخزونہ کا لالچ اِن سب باتوں نے ملکر بربرہ کے اُس گروہ کو جو کسیطرح قابو میں آنیوالا نہ تھا، ایسا کارآمد سپاہی بنادیا کہ اُنکی وجہ سے بڑی بڑی مہمیں سر ہوئیں۔

گھوڑے اور اَور جانور اور بھیڑ بکریاں ہی بربریوں کا مال ومنال تھا۔ یہی چیزیں فاتحین کے لئے اُس لوٹ کا نعم البدل ہوگئیں جو اُنکو شام اور مصر کی لڑائیوں میں حاصل ہوتی تھی۔ ان جانوروں کے علاوہ بہت سے غلام اسوجہ سے اُنکے ہاتھ لگے کہ تمام علاقہ تباہ کردیا گیا تھا۔ اُنکو دمشق اور اسکندریہ کے بازاروں میں فروخت کرکے فاتحین نے بہت بڑا فائدہ اُٹھایا۔ خلیفۂ وقت کے ایک خمس کی تعداد ساٹھ لاکھ غلام تھے۔ یہ تعداد ایسی ہے کہ جسکا اعتبار آنا مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب خلیفہ نے اپنے غلاموں کے بھیجے جانیکی خبر سُنی

تو انکو اعتبار نہ آیا۔ مگر جب یہ جرم عفو ہوگیا تو وہ بہت ہی خوش ہوئے اور جتنا جرمانہ وہ خیانت کے جرم میں موسیٰ پر کر چکے تھے وہ واپس کر دیا۔ اسکے علاوہ اُنکی فوج کے بہت سے سپاہیوں کو اُنکی خدمت کے صلہ میں بیش قرار وظیفہ عطا کیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے کے بہانہ سے شامیوں نے مدینہ منورہ میں ایک فتنہ پھیلا رکھا تھا۔ اس وجہ سے ہزارہا شرفاء عرب وطن چھوڑکر افریقیہ میں منتقل ہوئے تھے اِن لوگوں سے موسیٰ کی مہمات میں بہت بڑی مدد ملی۔ یہ لوگ المغرب اور آئبیریا کی فوج میں داخل ہوگئے۔ مؤخرالاسم ملک کی قسمت پر اسکا بڑا اثر پڑا اور بالواسطہ خاندان بنو اُمیہ کو اس سے بہت بڑی مدد ملی۔ ان مہمات میں موسیٰ کے چار بیٹے اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے اُنمیں سے دو بڑے بیٹوں کو جنوب اور مغرب کیطرف بھیجدیا۔ کیونکہ ابتک اُن علاقوں کے چند بربری قبائل اپنے آپ کو آزاد سمجھتے چلے آتے تھے۔ اِن دونوں نے بھی اپنے باپ کی پیروی کی۔ جن قبائل نے ذرا سا بھی مقابلہ کیا اُنکو تباہ کر دیا۔ چند ماہ کے بعد وہ قیروان واپس چلے آئے، جہاں اس وقت موسیٰ بہت سا مال مغرونہ اور غلام لیکر آرام لینے کے لئے چلے آئے تھے۔ یہیں کے قیام میں اُنہوں نے بحری مہم کی سخت ضرورت محسوس کی۔ اُن کے ہموطن دریا سے بہت ڈرتے تھے، اس خوف کو انہوں نے لغو سمجھکر حکم دیا کہ قرطاجنہ کے بندر وغیرہ درست کرنے چاہئیں۔ یہ سب پہلے ہی ایسے مضبوط بنے ہوئے تھے کہ اُس شہر پر اتنی مصیبتیں پڑیں مگر اُنکو کوئی بہت بڑا نقصان نہیں پہونچا۔ تا سو جہاز فوراً بناکر دریا میں ڈال دیئے گئے اور اُنکے لئے فوج الگ کر دی۔ عبداللہ امیرالبحر مقرر کئے گئے۔ یہ سب انتظام ہوچکا تو اس بیڑہ نے بحر روم میں پیشقدمی کی صقلیہ سے آگے بڑھ کر شہر لینوسے کو فتح کیا اور بیس ہزار دینار لے کر واپس آگئے۔ اسکے چار برس کے بعد عبداللہ نے جزائر بیلیارک اور میجورکا پر حملہ کیا اور اُنکو فتح کر کے خلافت دمشق سے ضم کر دیا۔

بربریوں کا دورخہ پن اور بے چین طبیعت اُنہیں کب آرام سے بیٹھنے دیتی تھی۔ اندرون ملک کے چند قبائل نے یہ دیکھکر کہ مسلمانوں کی فوج ملک میں کم ہے بغاوت کر دی۔ موسیٰ فوراً

چیدہ فوج لیکر پہونچے اور بہت خفیف مشکل کے بعد تنجیر کو فتح کرلیا۔ یونانیوں کے پاس بلک مغرب میں بہی ایک قلعہ رہگیا تھا، وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ موسیٰ نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے بیٹے مروان کو پانچہزار سوار دے کر سوس العسکہ پر بھیجدیا کیونکہ باغیوں نے اس مقام کو اپنا مامن بنایا ہوا تھا۔ چندہی روز میں موسیٰ کو اطلاع مل گئی کہ بغاوت بالکل فرو کردیگئی۔ بربریوں کو ایسی سخت سزا دیگئی کہ جسکی مثال افریقیہ کی لڑائیوں میں کم ملتی ہے۔ سبتہ کے لینے کی دومرتبہ کوشش کیگئی۔ یہ مقام اُس آبنار کی کنجی تھا جو افریقیہ کو یورپ سے جدا کرتی ہے۔ مگران دونوں حملوں کو کونٹ جولین گورنر سبتہ کی شجاعت نے بیکار کردیا۔ موسیٰ نے طارق ابن زیاد کو تنجیر کا گورنر کیا اور خود قیروان واپس چلے آئے۔ یہ طارق بربری الاصل نومسلم موسیٰ کے غلام تھے مگر اس وقت اُنکے سب سے بڑے معتمد اور بہترین فوجی افسر تھے (رحمۃ اللہ علیہ جزاہ اللہ عنا خیر الجزا)

تنجیر کے مسلمانوں کے ہاتھ میں پہونچ جانے سے بیزنطین سلطنت کا افریقیہ سے بالکل خاتمہ ہوگیا۔ ساٹھ برس کی متواتر لڑائیاں، بیڑے کے بیڑوں کی تباہیاں، فوجوں کی بربادیاں، علاقوں کے علاقوں کی ویرانی، اور قبیلوں کے قبیلوں کی غلامی درکار ہوئی تب جاکر کہیں یہ نتیجہ حاصل ہوا۔ دربارشاہی کے جھگڑے جھمیلوں، اور دعویداران خلافت کے خروج میں بھی مسلمان ایک لمحہ کے لئے اس علاقہ کو نہیں بھولے تھے۔ بربریوں کی غیر معمولی غداری اور سپاہیانہ جوہر نے اُنکو معمولی دشمنوں کی دستبرد سے بچائے رکھا، خواہ اُنکو کتنی ہی شکستیں ہوئیں مگر اُنکا دل نہیں ٹوٹا۔ عہدناموں کی کبھی اُنھوں نے پرواہی نہیں کی۔ اسیواسطے سوا اسکے کوئی تدبیر باقی نہ رہگئی تھی کہ اُنکو بالکل تباہ کردیا جائے، اور اُنکے وطن کو ویران۔ مسلمانوں نے افریقیہ میں جتنے غلام بنائے اُس سے اُنکے برادران دینی باشندگان مشرق کو سخت حیرت ہوئی۔ بعض کامیاب مہم میں تو دو دو لاکھ آدمی گرفتار ہوئے۔ سلطنت روم میں بھی اتنے غلاموں کی مثال نہیں ملتی۔ سبتہ کے علاوہ جتنے قلعے اُس علاقہ میں تھے وہ سب مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ یہ سارا علاقہ برائے نام سپین بادشاہان وزی گاتھ کا تھا، اگرچہ اُنکا گورنر وہاں کمزور تھا، اور اُنکی

سلطنت کچھ غیر متیقن۔

بربری خلیفہ کو خراج دیتے تھے یا اپنے ہی افسروں کی ماتحتی میں مسلمانوں کی فوج میں سپاہی تھے۔ صرف دو ہی نسلوں کے بعد مسلمانوں کی راہ و رسم و قوانین نے بربریوں پر اپنا پورا اثر ڈال دیا۔ اودہر تعدد ازدواج نے اُن میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کی کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ کافر کنیزکوں سے تمام مسلمانوں کے گھر بھر گئے تھے۔ اُنکی اولاد کو قرآن اور اُصول قرآن کی تعلیم دیگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرستی بالکل جاتی رہی، اگر کہیں رہ گئی ہو تو شاید کہ اٹلس کی ترائیوں میں، وہاں ممکن ہے کہ نیم وحشی اپنے بتوں کے سامنے سر جھکاتے ہوں یا کسی ان گھڑ پتھر کی مدح و ثنا کرتے ہوں۔ عیسائیوں کے پادریوں نے بھی بادل ناخواستہ اسکو تسلیم کیا ہے کہ اسلام حبشیوں کے حق میں رحمت الٰہی ہے، وہ اُن کی حالت میں بہت ترقی کرتا ہے اُنکی خصوصیات کو بدل دیتا ہے۔ اُن میں خودداری پیدا کر دیتا ہے۔ اپنی عزت کرنی سکھلاتا ہے۔ کوئی اور دین ایسا نہیں ہے کہ حبشیوں کو اسطرح بدل دے۔ بربریوں پر بھی اسلام نے یہی اثر کیا اور وہ پکے مسلمان ہوگئے۔ عربوں کیطرح یہ لوگ بھی بہت تنگی اور اپنے اپنے قبیلہ کے حامی تھے۔ ایام جاہلیت میں جتنے اُن میں عیوب تھے اُتنی ہی خوبیاں اُن میں مسلمان ہوکر پیدا ہوگئیں، اُن میں بلند نظری، اور حُبّ الوطنی بہت ہی زیادہ پیدا ہوگئی۔ وہ اپنی تخلیہ پسندی، اور باہمی عداوت سے یہ سمجھتے تھے کہ اُنکی حالت درست رہتی ہے۔ یہی شدہ شدہ اُنکے اتحاد و اتفاق سے مبدل ہوگئی بت پرستوں کے بت خانوں اور عیسائیوں کے کلیساؤں سے موذنوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان میں جتنی زیب و زینت تھی وہ خدا پرستان گاتھ و ونڈال کے خرچ سے کی گئی تھی۔ رومی عروج کے زمانہ میں یہ کلیسا اُنکی بہترین یادگار تھے لیکن باوجود اسکے کہ ان میں نسلی مماثلت تھی، مذہبی عقاید ایک دوسرے سے ملتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ افریقیہ کی آب و ہوا ہی بنی نوع انسان کی بالاستقلال ترقی کی دشمن ہے۔ دوسرے ممالک میں جتنے عرصہ میں آدمی انتہائے عروج پر پہونچنے والے ہوتے ہیں افریقی اقوام میں اس حالت تک پہونچتے پہونچتے از سرِ نو تنزل و انحطاط شروع ہوجاتا ہے۔

اس براعظم کے اگر حصّے کئے جاسکتے ہیں تو بلحاظ آب وہوا اور دیگر طبعی کیفیت ارضی کے لیکن کہیں
چلے جاؤ حالت ایک ہی سی ہے۔ وہاں کی ہوا ہی اسکی مقتضی ہے کہ وہاں یقیناً ابدالآباد تک
وحشت ہی رہے۔ یورپ کو دیکھا جائے تو اس نے اپنے مصائب تک سے فائدہ اُٹھایا اور علم
حرفت میں دوسروں کی مثالیں لے کر وہ ترقی کی کہ اپنے خاص دشمنوں کو زیر کرلیا۔ مگر کسی مہذّب
و متمدّن قوم کے اختلاط نے اہالی افریقیہ کے اوپر ایسا اثر نہیں ڈالا کہ اُسکے نشانات کچھ عرصہ بعد بھی
باقی رہ سکتے۔ اذہان و عقول عرب نے اسقدر جلد ترقی کی کہ انہوں نے دنیا بھر کو غرقِ لجّۂ حیرت
کر دیا۔ (یہ امر قرون وسطی کا ایک عجیب نمونۂ قدرت الٰہی تھا) مگر اُنکا اثر بھی افریقیوں پر چند روزہ
رہا۔ یہی کیفیت قرطاجنہ کی تہذیب اور جزورسی کے اثر کی ہوئی ہے۔ اتنا ہی اثر روم کے شان و شکوہ
اور استقلال کا ہوا۔ افریقیہ بعض بعض باتوں میں ایشیا سے ملتا ہے۔ ایشیا کی عیش پسندا
سُستی کا لازمی نتیجہ اُنکا اخلاقی اور طبعی تنزّل ہوتا ہے۔ افریقیہ باوجود اپنے معدنی ذرائع،
تجارت کی آسانیوں اور اسباب زراعت کی لازوال دولت کے اپنے یہاں کے رہنے والوں کے
کچھ بھی کام نہیں آیا، نہ ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھانا جانا، نہ اُن سے خود با فائدہ نفع اُٹھایا،
نہ بنی نوع انسان کو فائدہ اُٹھانے دیا۔ مگر اس کلّیہ سے ملک مصر کو مستثنیٰ کرنا چاہئے کیونکہ
وہ ایک طرف پڑا ہوا ہے اور عملی طور پر افریقیہ کے لئے گویا غیر ملک ہے ؎

(الف)

تعلیقات

ضمیمہ الف باب سوم

میمفس = MEMPHIS - مصری مے نے فر - عبرانی موف - عربی **میمف** لفظی معنی
اچھی قیامگاہ - مصر قدیم کا مشہور دارالسلطنت - پہلے خاندان شاہی کے پہلے فرعون مینس نے آباد کیا تھا - اس شہر کو
دریا کے نقصان سے بچانے کے لیئے اس فرعون نے دریائے نیل کا رخ بدل دیا اور بڑا پختہ بند بنا دیا تھا جسکے آثار اب تک
باقی ہیں - اسی فرعون نے یہاں مندر کی بنیاد رکھی جس میں اے پس اوساسے پافس دیوتا کی پوجا ہوتی تھی شہر کے
دو حصے تھے ایک اینٹوں کا تھا دوسرا پتھر کا - اس میں جو محل شاہی ہے وہ مے نس ہی کا بنایا ہوا ہے بعد میں
اسکے بیٹے اتوتس نے اسکو بڑھایا - اس میں بادشاہ رہتا تھا یا نائب السلطنت - جب چھٹا خاندان شاہی حکمران ہوا
تو اس شہر پر بھی زوال آگیا - جب اٹھارھواں خاندان برسر حکومت ہوا تو یہاں ایک نائب السلطنت رہنے لگا
سنہ ۱۶۰۰ (قبل مسیح) میں پھر اسکو عروج ہوا - اسکے مندر بڑے شاندار تھے - اے سس دیوی کا مندر فرعون
امانسس دوم نے بنایا تھا - ایپس کا مندر بھی بہت بڑا تھا - اسی کے جنوب میں مقدس سانڈ رکھا جاتا تھا - ایک اور
بڑا مندر ابھی پچاس برس ہوئے کہ نکلا ہے - انکے علاوہ اور بہت سے بڑے بڑے مندر تھے جنکا ذکر موجب طول ہے -
اسی شہر کے رقبہ میں اہرام ہیں - حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے اسکو فتح کیا - اسی کے پتھروں وغیرہ سے
فسطاط اور قاہرہ بسائے گئے ہیں - (مترجم)

ضمیمہ (ب) باب سوم

سفنکس = SPHINX - عربی **ابوالہول** - دوسری اہرام سے تین سو فیٹ کے فاصلہ پر
پوری چٹان سے کاٹ کر اور پتھروں کو جوڑ کر ۱۷۲ فیٹ ۶ انچہ لمبا اور ۵۶ فیٹ اونچا ایک عجیب جانور کا بت ہے
جسکا منہ انسان کا سا اور باقی جسم شیر کا سا ہے - اسکے سینہ کے عین مقابلہ پر تین کتبے مصر کی مقدس تحریر میں کندہ ملے ہیں

جنسے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون تھوتمس سوم اور ریمیسس دوم نے ابوالہول کو مقدس قرار دیا ہے۔ وہ اسکا نام ہرماخو
دیوتا بتلاتے ہیں۔ اسکے معنے ہیں "آفتاب فضا"۔ یہ کتبہ ایک چھوٹے سے مندر کی تین دیواریں تھیں۔
چوتھی دیوار میں ایک دروازہ تھا جسکے ادہر ادہر دو بیٹھے ہوئے شیروں کے بت تھے۔ ایک شیر وہیں پایا بھی گیا
تھا جسکے پاؤں کے سامنے ایک قربانگاہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کے زمانہ میں اسی قربانگاہ پر قربانیاں
چڑہائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حال کی تحقیقات سے ابوالہول کے گرد ایک بڑے مندر کی بنیادیں پائی گئی ہیں۔
مگر ان سب کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ شوقین حضرات اُن کتابوں کیطرف توجہ فرمائیں جو اس کے متعلق
لکھی گئی ہیں۔

اہرام مصری مستغنی عن الصفات ہیں۔ دنیا کے عجائبات میں سمجھی جاتی ہیں۔ علم ہیئت و ہندسہ کی کونسی
صنعت ہے جو ان میں نہیں دکھلائی گئی۔ انکے متعلق ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اگر شوق ہو تو انکا مطالعہ فرمائیے۔
میں یقین دلاتا ہوں کہ قابل دید حالات اُن میں ملینگے اور آپ کی محنت ضائع نہ جائیگی۔

یہ بتلا دینا بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ زمانۂ حال میں ایجپٹالوجی ایک فن ہی الگ بنگیا ہے۔ جو نہایت
دلچسپ ہے۔ (مترجم)

ضمیمہ (ج) باب سوم

اصل لفظ **کرث ہدثہ** ہے جسکے لغوی معنے ہیں شہر جدید۔ عربی **قرطاجنہ**۔ رومی **کارتھاجو**۔
یونانی **کارچے ڈون**۔ شمالی ساحل افریقیہ پر سب سے پرانا شہر ہے۔ یہ بحر روم کے ایک جزیرہ نما میں آباد تھا۔
اسکا رقبہ آجکل ٹیونس کی ریاست میں ہے۔ ایک روایت قدیم کے موافق فونیشیا کی ملکہ دیدو نے اسکو آباد
کیا تھا۔ یہ ملکہ نوسو برس قبل از مسیح اپنے شوہر کے قتل کئے جانیکے بعد یہاں بھاگ کر آئی تھی۔ مگر بظاہر صحیح یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اہل فینیقیہ کی یہاں تجارتی کوٹھی اور کارخانے تھے ترقی ہوتے ہوتے یہ اتنا بڑا شہر ہوگیا۔
اسکی مثال ہندوستان میں کلکتہ اور مدراس ہیں۔ یہ کوٹھیاں بظاہر دارالسلطنت ٹائر کے تاجروں نے یہاں قائم
کی تھیں کیونکہ یہ جگہ تجارت کے لئے نہایت موزون تھی۔ اسکی ترقی اور اسباب ترقی کے حالات بہت ہی کم معلوم ہیں۔

اسکے حالات صرف اُس وقت سے معلوم ہیں کہ جب یہ شہر تجارت میں فروغ پاکر دنیا کے بہت بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا۔ یہ بھی جتنے کچھ ہیں غیر تسلّی بخش اور ایک طرفہ۔ یہ جب تباہ ہوا ہے تو اسکی آبادی سات لاکھ تھی۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر فونیشیا اور رکنز لیبیا والے تھے۔ اہالی قرطاجنہ نے اقوام لیبیا کو زیر کیا اور فونیشیا کی اور اقوام کے علاقوں کو اپنے ساتھ ضم کیا۔ پہلے یہ اقوام انکی حلیف تھیں مگر بعد میں ان ہی کو انہوں نے صاف کیا۔ یہ لوگ یُوٹیکا، ہیڈرومیٹم، ٹونس، ہپّو، لیپٹ وغیرہ کے تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں اہالی قرطاجنہ مشرق کی طرف سرٹس کی سمت بڑھے اور مغرب میں نومیا کی جانب۔ چونکہ انکی بحری طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی اسلئے انہوں نے بحر روم کے سواحل پر فتوحات کیں اور بستیاں بسائیں۔ چھٹی صدی (ق م) میں سارڈینیا پر قابض ہو گئے۔ اور سسلی کو فتح کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہنیو نے مغربی سواحل افریقیہ پر آبنائے جبل طارق اور ہملکو سواحل سپین اور گال تک پہونچے۔ یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ قرطاجنہ کے تعلقات دوسرے ممالک سے کیسے تھے۔ رومیوں سے سب سے پہلا عہدنامہ انہوں نے سنہ ۵۰۹ (ق م) میں کیا، دوسرا سنہ ۳۴۸ (ق م) میں اور تیسرا سنہ ۳۰۶ (ق م) میں۔ قرطاجنہ کی مسلسل تاریخ پانچویں صدی (ق م) سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب یہ یونانیوں سے سسلی (صقلیہ) میں لڑ رہے تھے۔ قرطاجنہ کی جو فوج ہملکار لے کر گیا تھا وہ سنہ ۴۸۰ (ق م) میں ہمیرا پر گیلون نے بالکل تباہ کر دی تھی۔ بہرحال سنہ ۴۱۰ (ق م) میں اہالی قرطاجنہ نے صقلیہ کے بعض حصّے فتح کر لیئے۔ ڈایونی سس ثانی کے زمانہ میں صقلیہ کے یونانیوں نے انکو شکستیں دیں۔ سنہ ۳۱۰-۱۱ (ق م) میں صقلیہ کے ایک بادشاہ نے بڑھ کر قرطاجنہ پر حملہ کیا جب جنوبی اٹلی کو رومیوں نے فتح کیا ہے تو پھر اہالی قرطاجنہ اور صقلیہ نبرد آزما ہوئے۔ پہلی جنگ پیونک سنہ ۲۶۴ (ق م) میں شروع ہوئی۔ رومیوں نے سنہ ۲۴۱ میں بحری جنگ میں فتح پائی اور اہالی قرطاجنہ کو صقلیہ، سارڈینیا اور کورسیکا چھوڑنا پڑا، اور رومیوں کو بہت سا روپیہ دینا پڑا۔ اسکے چند روز کے بعد غدر ہو گیا جس سے یہ امید تھی کہ تمام شہر تباہ ہو جائیگا مگر ہملکار نے اسکو فرو کیا، اور اپنے ساتھ اُن ہی کو لے کر سپین پر حملہ کیا۔ اسکے بعد ہیڈروبال نے بھی یہی کیا اور دونوں نے وہاں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ مؤخر الاسم بادشاہ کے بعد سنہ ۲۲۱ (ق م) میں ہنی بال نے اس واسطے شہر کو آگ لگا دی کہ اپنا انتقام لے لے۔ اسی بنا پر سنہ ۲۱۹ (ق م) میں دوسری پیونک وار شروع ہوئی

اس میں ہینی بال نے اپنی فتوحات کو سپین سے (گال ہوتے ہوئے) ایلپس تک پہونچا دیا اور رومیونکو کئی جنگوں میں کئی خونریز شکستیں دیں، یہانتک کہ یہ امید ہوگئی کہ روم بالکل تباہ ہو جائیگا لیکن پھر بھی اہالی قرطاجنہ ہی کو شکست ہوئی اور سپین اُنکے ہاتھ سے گویا نکل گیا۔ زاما واقعہ افریقیہ میں ۲۰۲ء (ق م) میں آخری فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ اس میں ہینی بال نے سخت شکست کھائی۔ اسکے بعد جو عہد نامہ ہوا اُسکے رُو سے اہالی قرطاجنہ کی سلطنت اُنکے افریقی مقبوضات تک محدود رہگئی۔ اُنکے جنگی جہاز، جنگی ہاتھی اور بہت سا روپیہ بطور تاوانِ جنگ اُن سے لے لیا گیا، اور اُن سے یہ اقرار کرالیا کہ وہ رومیوں کی اجازت کے بغیر کسی سے نہ لڑیں۔ مے سی نی سا، بادشاہ نومیڈیا نے بڑی چالاکی کرکے قرطاجنہ کی اُس مصیبت سے فائدہ اُٹھانا چاہا جو وہاں کے امرا اور رعایا کے اختلافات سے پیدا ہوگئی تھی۔ ۱۵۱ء (ق م) میں ان سب نے اس بادشاہ کی مخالفت کی اور اُسکے آدمیوں کو شہر سے نکال باہر کردیا۔ اب رومیوں کو موقعہ ملگیا۔ اُنہوں نے ۱۴۹ء (قبل مسیح) میں اس بناپر اعلانِ جنگ کردیا کہ اہالی قرطاجنہ نے معاہدہ کو توڑ دیا ہے۔ دو برس کے محاصرہ کے بعد قرطاجنہ فتح کرلیا گیا۔ چھ روز تک تو شہر کی گلیوں تک میں لڑائی ہوتی رہی اور سترہ روز کامل شہر کو پھونکا جاتا رہا۔ قرطاجنہ تو بالکل تباہ ہوگیا، مگر رومیونکی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ رومی بادشاہ نے چھ ہزار آدمی بھیجے کہ اُسی کے کھنڈروں پر نئی بستی بسالیں۔ اس نئے شہر کا نام جولونیا قرار دیا گیا، مگر یہ اچھی طرح بس بھی نہ سکا آخر آگسٹس نے پھر اصلی شہر قرطاجنہ ہی کو از سرِ نو درست کرایا جس سے دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں یہ شہر رومی شہروں میں بہترین مقام بنگیا۔ ۴۳۹ء میں جینسرس نے قرطاجنہ کو سلطنت وینڈال کا دارالسلطنت بنایا۔ ۵۳۳ء میں بے لی ساریس نے اُسے فتح کیا اور اسکا نام جسٹی نیانا رکھا۔ ۶۹۷ء میں حسن نے اسکو تباہ کر ڈالا۔ اب اتنے بڑے شہر کے آثار اگر کچھ ہیں تو چند جھونپڑیاں ہیں اور ہزاروں کھنڈرات!

شہر کی تاریخ تو ختم ہوگئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس سلطنت کا یہ دارالسلطنت تھا اُس کے بھی کچھ مختصر حالات یہاں لکھدئے جائیں، تاکہ آئندہ کے لئے بصیرت رہے۔

اہالی قرطاجنہ کی طرزِ حکومت وغیرہ کے متعلق کوئی تسلّی بخش حالات تو ہیں نہیں، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ انکی حکومت جمہوری نہیں تھی بلکہ اعیان و ارکان سلطنت کا بہت زیادہ دخل تھا، اُن ہی کے ہاتھوں میں

عنانِ سلطنت تھی، ان ہی میں سے تین سو ارکین منتخب ہوتے تھے۔ یہ تین سو ارکین بعض وقت زیادہ سے زیادہ تیس اور کم از کم دس آدمیوں کی ایک مجلسِ شوریٰ بنا دیتے تھے؛ اسکا ایک صدر ہوتا تھا۔ یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے تعلقات (ماتحتی یا ہمسری وغیرہ) ایک دوسری مجالس سے کیسے تھے، یا یہ کہ ان کے اختیارات میں کیا فرق تھا۔ کچھ تھوڑے بہت جو حالات ملتے ہیں اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعیان و ارکان ایک طرف تو عوام الناس کو ذلیل سمجھتے تھے، دوسری طرف انکے آپس میں بھی مخالفتیں رہتی تھیں۔ بد دیانتی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ حالت یہ تھی کہ اُنکی سلطنت اگر مطلق العنان و مستبد بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تو اس سے بہتر تھا کہ نہایت ظالم اور مغرور اُمرا کے ہاتھ میں رہتی۔

اہالی قرطاجنہ کی فوج مشتمل تھی لیبیا کے مفتوحین، نومیڈیا کے سپاہیوں اور غلاموں سے۔ شاہ اگاتوکلس کے زمانہ میں قرطاجنہ نے چالیس ہزار مسلح پیادہ سپاہی، ایک ہزار سوار، دو ہزار جنگی گاڑیاں بہم پہونچائی تھیں۔ یوں معمولی طور پر ایک لاکھ فوج بھی شہر بہم پہونچا سکتا تھا۔ یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ اس فوج کا خرچ وہ کس طرح اور کہاں سے بہم پہونچاتے تھے۔ یقیناً نومیڈیا اور لیبیا کے خراج، سپین کی کانوں کی آمدنی، اور محصول اشیاء درآمدہ سے، جسکی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، یہ خرچ پورا کیا جاتا ہوگا۔ قرطاجنہ کے تجارتی جہاز بحرِ شام کے تمام سواحل پر پہونچتے تھے، بلکہ برطانیہ، بالٹک وغیرہ تک جاتے تھے۔ خشکی میں اُسکے تجارتی قافلے صحرا سے ہوتے ہوئے نائیجر کے سونا دینے والے علاقے میں، اور صحرا لیبیا سے ہوتے ہوئے دریائے نیل کے تمام کناروں کے شہروں تک کھوندتے رہتے تھے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنکا مذہب وہی تھا جو فونیشیا والوں کا تھا، یعنی ستارہ و آتش پرستی۔ مولوک اُنکا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ اُسی پر وہ اپنے قیدیوں اور بچّوں کی قربانی چڑھایا کرتے تھے۔ اس دیوتا کا سب سے بڑا مظہر آفتاب سمجھا جاتا تھا۔ مولوک کے علاوہ یہ لوگ تایر کے ہرکولیس، اسطارطے عناصر کی دیوی، الیس مون، محراب آسمان کی دیوی، موت، اور بہت سے بہادر مردوں اور عورتوں، مثلاً ہملکا، ملکہ ڈیڈو، فلانی کے بھائیوں وغیرہ وغیرہ کو پوجتے تھے۔ یونانیوں کے چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کا حال اُنہیں سنفلیہ میں جاکر معلوم ہوا تھا، یہ بھی وہاں پُجنے لگے تھے۔ یہ پتہ نہیں لگتا کہ آیا اُنکے یہاں پروہت وغیرہ بھی ہوتے تھے یا نہیں۔ غالباً مراسم مذہبی ارکان سلطنت ہی ادا کرتے ہونگے۔ بہرحال یہ سب کچھ مشتبہ ہے۔ (مترجم)

ضمیمہ د باب سوم

اوفر - OPHIR - کوئی علاقہ ہے جسکا نام توریت وغیرہ میں آتا ہے۔ یہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز کا بیڑہ بہت سا سونا، قیمتی پتھر اور صندل کی لکڑی بیت المقدس بنانیکے لئے لائے تھے۔ اسکی جائے وقوع صحیح طور پر نہیں معلوم ہوتی۔ بیشتر علماء اسکو افریقیہ میں بتلاتے ہیں۔ یوں کہنے کو ہندوستان اور جزیرہ ملاکا بھی بتلایا جاتا ہے۔ (مترجم)

میریس - MARIUS - رومیوں کا ایک نہایت مشہور سپہ سالار، جو روم کیطرف سے جان بازانہ لڑا۔ اس نے سلطنت کو مٹتے مٹتے بچا لیا، حتیٰ کہ روم والوں نے اسکا خطاب آخر روم کا ناجی رکھا۔ مگر ایک شخص سلا نامی کا وہ محسود بنگیا۔ اس نے اسکو اتنا ستایا کہ اسے افریقیہ کیطرف بھاگنا پڑا۔ یہاں اس نے سخت مصائب برداشت کئے۔ آخر پھر روم میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اور یہاں آکر پانچ چھ روز تک قتل عام کرایا۔ ۸۶ق م) میں مرگیا۔ (مترجم)

ریگولس - REGULUS - روم کا ایک مشہور سپہ سالار، جس نے بڑی فتوحات کیں۔ لیکن ایک لڑائی میں قرطاجنہ والوں نے اس کو شکست دی، اسکی تیس ہزار فوج ماری گئی اور یہ قید ہوا۔ پانچ برس تک قید کی سختیاں جھیل کر چند روز کے لئے اس وعدہ پر رہا کیا گیا کہ وہ پھر واپس آئیگا۔ چنانچہ واپس آیا اور یہاں اسکے جسم میں میخیں ٹھوک ٹھوک کر سخت عذاب سے مارا گیا۔ اس شخص کے متعلق بڑے دلچسپ فسانے بنگئے ہیں جو قابل دید ہیں (ناول نگار حضرات ادھر توجہ فرمائیں) مگر وہ سب آخر فسانے ہیں۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ بڑا بہادر سپہ سالار تھا۔ قرطاجنہ سے شکست کھائی۔ روم میں آیا اور اپنی موت سے مرا۔ (ناظرین مجھے معاف فرمائیں اور پیرے بوڑھے داستان "گم شد بازیافت" کا ہدف نہ بنائیں)۔ (مترجم)

کیٹو - CATO - روم کے ایک غریب خاندان کا بیٹا جو بعد میں بہت بڑا قانون دان اور مصلح ہوا۔ بادشاہوں کی سخت نکتہ چینی کرتا تھا۔ ہر محکمہ میں اصلاحیں کیں۔ قرطاجنہ میں روم کی طرف سے سفیر بنکر گیا وہاں سخت تکالیف اٹھائیں۔ واپس آیا تو مرتے دم تک قرطاجنہ کا دشمن رہا۔ (مترجم)

ڈینیاس - DANAUS - ایک فرضی شخص ہے۔ اسکا افسانہ مختصراً یہ ہے کہ وہ لیبیا کا بادشاہ تھا

اُسکے پچاس بھتیجے تھے اور پچاس ہی بیٹیاں۔ اُسکو یہ اندیشہ ہوا کہ اُسکے بھتیجے اُسے مار ڈالیں گے۔ اس لئے وہ اپنی بیٹیوں کو لے کر وہاں سے بھاگ آیا۔ اُسکے پیچھے پیچھے اُسکے بھتیجے پہونچے۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو اُن سے بیاہ دیا۔ مگر سب کو ایک ایک خنجر دے کر کہدیا کہ اپنے اپنے شوہروں کو اُس سے قتل کردیں سب نے سوا ایک کے یہی کیا۔ وغیرہ وغیرہ من الھفوات۔ (مترجم)

این ٹی اس- ANTAEUS - لیبیا کا ایک فرضی دیو ہے جو ہرکولیس سے لڑا اور شکست کھائی۔ ہرکولیس اسکو اتنا بھینچا کہ اس کی جان نکل گئی۔ (مترجم)

اٹلس - ATLAS - ایک فرضی شخص جسکی پرسی اس نے پناہ لی۔ مگر اس نے اُسکو پناہ دینے سے انکار کیا۔ اس پر پرسی اس نے اُسکو اطلس پہاڑ کی شکل میں مسخ کردیا۔ (مترجم)

پیونک - PUNIC - فونیشیا سے مشتق ہے۔ رومی قرطاجنہ والوں کو اس نام سے منسوب کرتے تھے۔ جسکے معنے یہ لئے جاتے ہیں "وہ ناقابلِ اعتبار تھے"۔ (مترجم)

سینٹ آگسٹن ST. AUQUSTINE - ایک مسیحی واعظ تھا جسکو پوپ گریگوری نے ۵۹۷ء میں انگلستان بھیجا۔ اس نے بادشاہ اتھل برٹ اور اُنکو بھی عیسائی بنالیا۔ یہ کنٹربری کا پہلا اسقفِ اعظم بنایا گیا۔ ۶۰۴ء میں مرگیا۔ (مترجم)

اے رے بس- ARE BUS - نائٹ - MIGHT - خرافات اصنام میں سے ہے مگر بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

کیسی ٹیرایڈس CASSITERIDES - صقلیہ کا ایک شہر ہے۔ (مترجم)

ضمیمہ باب سوم

سارڈی نیا- SARDINIA - بحرِ شام کے جزائر میں سے سب سے بڑا جزیرہ سسلی (صقلیہ) ہے اور دوسرے درجہ پر سارڈی نیا۔ کارسی کا کے عین جنوب میں واقع ہے۔ اِن دونوں کے درمیان میں صرف سات میل چوڑا دریا ہے۔ وسط اٹلی اور افریقیہ اور جنوب اٹلی اور سپین کے درمیان میں واقع ہے۔ ۱۶۶ میل لمبا ۹۰ میل چوڑا ہے۔ رقبہ ۹۲۰۵ مربع میل ہے۔ یہاں بیشتر پہاڑ ہیں۔ ان میں سے بعض کی چوٹی ۶۰۰۰ فیٹ بلند ہے۔ سواحل بیشتر گہرے اور کادا کے جیسے ہیں۔ پہاڑوں کے درمیان میں بہت سی وادیاں

نہایت خوبصورت ہیں۔ کئی جگہ ریگ اور پتھر بہت ہیں۔ آب ہوا بہت خوشگوار ہے۔ مگر جو علاقے کہ پستی میں واقع ہیں وہ بخار کا گھر ہیں۔ یہاں گیہوں، جو، مکی، نارنگی اور اور میوے بہت خوش ذائقہ پیدا ہوتے ہیں۔ انگور بہت بوئے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ اُنکی غور و پرداخت نہیں ہوتی اسلئے اچھے نہیں ہوتے۔ زیتون بھی یہاں اچھا ہوتا ہے۔ تمباکو ادنے درجہ کا ہوتا ہے۔ روئی، السی، سن، زعفران وغیرہ بھی پیدا ہوتی ہے۔ بیل سے کاشتکاری کا کام لیا جاتا ہے۔ گھوڑے اور ٹٹو بھی اسی کام میں آتے ہیں۔ اس جنگل کے ٹٹو بالخصوص رومی بہت پسند کرتے تھے بھیڑیاں معمولی قسم کی ہوتی ہیں۔ سؤر تو یورپ بھر میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ ہرن وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں صنعت کچھ نہیں۔ کئی دھاتوں کی کانیں ہیں۔ مگر اُن سے کچھ نکالا نہیں جاتا۔ چاندی، پارہ، سنگ مرمر، سنگ سماق وغیرہ بہت ملتا ہے۔ سیسہ، لوہا، تانبا، بھی بہت ہے۔ سونا، سرمہ، وغیرہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندگو خط وخال یونانیوں سے بہت ملتے ہیں۔ عجیب مخلوط زبان بولتے ہیں، جس میں سپینی، عربی، اور اطالوی زبانیں ملی ہوئی ہیں۔ جاہل اور سخت متعصب ہیں۔ جب سے رومیوں سے یہ الگ ہوئے سنہ ۱۳۲۶ء تک اُن پر سخت ظلم و ستم ہوتے رہے۔ نہایت کم عقل لوگ ہیں۔ ابتک بھیڑوں کی کھالیں پہنے جاتے ہیں۔ انتقام لینے میں بہت تیز ہیں۔

سنہ ۴۸۰ (ق م) اس جزیرہ کو قرطاجنہ والوں نے فتح کیا۔ جب تک وہ حکمران رہے یہاں اناج خوب پیدا ہوتا رہا۔ سنہ ۲۳۸ (ق م) میں اہالی قرطاجنہ کو یہ جزیرہ رومیوں کو دینا پڑا۔ اگرچہ اُنہوں نے یہاں کی رعایا پر پورا قابو پالیا تھا۔ مگر پھر بھی تین دفعہ بغاوتیں ہوئیں، جسکی وجہ سے یہاں بڑی فوج رکھنی پڑی۔ چونکہ یہ سلطنت روم کو اناج بہت دیتا تھا اسلئے اِسکی بہت حفاظت کی جاتی تھی۔ وینڈال اور وحشی اقوام کے قبضہ میں بھی یہ جزیرہ مدتوں رہا ہے۔ سنہ ۵۳۴ء میں یہ مشرقی سلطنت یورپ کے ماتحت آیا۔ آخر رومیوں سے مسلمانوں نے فتح کیا۔ اُنکو سپانیوں نے نکالا مختصر یہ ہے کہ سنہ ۱۷۰۸ء تک سپین کے پاس رہا۔ پھر انگریزوں نے لیا، آخر آسٹریا کو دے دیا گیا۔ اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

باب چہارم

سلاطین وزیگاتھ

۵۰۰ء سے ۷۱۲ء تک

گاتھوں کی اصلیت اور اُن کے خصائل۔ جزیرہ نما رسپین پر اُنکا حملہ۔ اہالی کلیسیا کا اقتدار۔ کلیسیائی کونسلیں۔ یہود۔ قانون وزیگاتھ۔ اُس قانون کی خوبیاں۔ خیانت و ظلم کی بندش۔ سخت سزائیں۔ قانونی تعریفات۔ زمانۂ گاتھ کے فنون میکانیکی۔ فنِ تعمیر۔ بیزنطینی اثرات صنعت و حرفت۔ نذر چڑھائے ہوئے تاج۔ زراعت علم ادب۔ طب۔ غلاموں کی مشقت۔ رومی خصوصیات کی تقلید۔ گاتھوں اور عربوں کے خصائل و خصائل کا مقابلہ۔ دونوں کے خیالات و عادات کی یکجہتی۔ قوم گاتھ کے قومی انحطاط کے اسباب۔ گاتھوں کے طرز حکومت کا دوامی اثر۔

...

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں جن بے تعداد وحشی گروہوں نے سلطنتِ روم مغربی کو روند ڈالا، اور بادشاہِ رومِ مشرقی کی ہتک کی، اُن میں کوئی گروہ اپنی شجاعت، وفاداری، فیاضی اور نیک چلنی کی وجہ سے اِتنا نمایاں نہیں رہا جتنا کہ گروہِ گاتھ تیسری صدی سے لیکر جب روم کے تکلفات پورا کرنے کے لیئے وہاں کے سوداگر کہربا کی تلاش میں سواحلِ بالٹک تک پہونچ گئے تھے، پانچویں صدی تک کہ جب تھیوڈورک نے اٹلی میں ایک آزاد سلطنت قائم کرلی، قوم گاتھ کا نام یورپ کے بچّے بچّے کی زبان پر تھا۔ کبھی تو اس حیثیت سے کہ گویا وہ حصار متزلزل دولتِ بیزنطین تھے، اور کبھی اس حیثیت سے کہ وہ قتل و غارت و تباہی کے عَلَم بردار تھے۔ یہ نہایت قوی دست و بازو اور خونخوارانہ چہرہ و مہرہ کے لوگ تھے۔ ان کے قد و قامت ویسے ہی تھے جیسے کہ زمانۂ بُت پرستی میں لوگ اپنے دیوتاؤں اور شجاعوں کی عظمت و جلالت بڑھانے کے لیئے اُنکی تصویر کھینچا کرتے تھے۔ وہ کسی گھنے جنگل کے درمیان یا کسی گہرے اور تیز رفتار دریا کے کنارے اپنے گھر بناتے تھے، یا کسی ایسے مقام میں جو دلدلوں سے گھرا ہوا ہو۔

ان دلدلوں پر وہ ایک موڑ پیچ کے ساتھ آنے جانے کے لئے بٹیاں بنا لیتے تھے جنکے انجام پر کوئی مکان بطور قلعے کے ہوتا تھا ؟ ان اقوام کی طرح جنکے قوا ذہنی و عقلی کی نشوونما ابھی اچھی طرح شروع بھی نہیں ہوتی وہ شگون فال علامات اور خواب کے معتقد تھے۔ اُن کے خیالات مذہبی مبہم اور معتقدات دینی غیر مصرح تھے۔ تاریخ یا روایات عامہ کسی چیز سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس چیز کو پوجتے تھے۔ اُنکے معبودوں میں سے ایک بت کا بھی نام محفوظ نہیں۔ اُنکی دعوتیں مُسکرات کے استعمال سے دوکان خمار بجاتی تھیں؛ اور اکثر لڑائی جھگڑوں اور قتل و خون پر ختم ہوتی تھیں؛ اور ان بیہودہ گیت گائے جاتے تھے یا قوم کے مشہور سپاہیوں اور شجاعوں کی مدح سرائی ہوتی تھی۔ اُنکا نام ہی گویا علو کا مترادف تھا؛ کیونکہ جس طرف اُنہوں نے رُخ کیا اُدھر سے بغیر کامیابی کے واپس نہیں آئے۔ ویسے بھی لفظ "گاتھ" کے لغوی معنے "اولادِ نبیل" تھے۔ اُنکے یہاں علم ادب کے نام سے انجیل کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ تھا؛ سلطنت و حکومت کے نام سے اُن میں سے کوئی بڑا آدمی جو طماع اور طالب نمود ہوتا تھا بادشاہ بن بیٹھتا تھا؛ اور چند روز کے لئے عارضی طور سے لطف حکومت اُٹھا لیتا تھا؛ اُنکی طبیعتوں میں ایسی بے چینی تھی کہ کسی بات پر قرار نہ تھا؛ بے جگر ہوکر قمار بازی کرتے تھے؛ سخت بے رحم فاتح تھے؛ تباہی و بربادی اُنکی خصلت میں داخل تھی اور جنگ اُنکی تفریح کا مشغلہ اور وحشیوں کیطرح (جن میں ناواقفیت اور خوف نے گاتھ کو بھی شامل کردیا ہے) وہ چاہتے تھے کہ ہمکو ذاتی خودداری اور شخصی آزادی بے انتہا حاصل رہے۔ قوم گاتھ کو بوجہ عارضی بود و باش کے وضعی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ آسٹرو (مشرقی) گاتھ اور وزی (مغربی) گاتھ۔ ان میں سے ایک دریا بارس تھی نیس کے مغربی کنارے کے رہنے والے تھے، اور دوسرے مشرقی کنارے کے شمال کی طرف ایک دباؤ پڑا جسکی وجہ سے جرمنی اور بینو نیا کے جنگلات کے باشندے سلطنت روم کے یوروپی علاقوں میں آکر آباد ہوگئے۔ ضرورت داعی ہوئی یا اُنہوں نے خود اسکو اپنے رہنے کے لئے انتخاب کیا کہ وزی گاتھ گال[۲] میں آکر آباد ہوگئے۔ اس حصہ ملک میں وینڈال[۳] سولے وی[۴]۔ الانی[۴] اور اور گمنام مگر طاقتور وحشی اقوام بھی رہتی تھی۔ پانچویں صدی کے پہلے سال میں کہ ارکیڈلیس[۵] اور

آنوریس[6] کے درمیان میں ابھی پوری طرح سلطنت تقسیم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نمک حرامی، یا درتاکوہ پائرسے نیس (برطات) کی محافظ فوج کی غفلت کہ سپین پر بہت سی خونخوار اقوام نے ایک طوفان وتلاطم برپا کردیا۔

اُس خوبصورت، دولتمند اور سرسبز وآباد جزیرہ نمانے چارسو برس تک برکاتِ امن وامان کے خوب ہی لطف اُٹھائے۔ پوپئیے کے بیٹوں کی ہزیمت اور موت سے خانہ جنگی اور اندرونی مصائب کے آخری نشانات اُس مُلک کی سرحد پر سے بالکل مٹ گئے تھے۔ زراعت نہایت تن دہی اور محنت سے ہونے لگی ؛ اُسکے بنادر بحر روم کے جہازوں اور مالِ تجارت سے بھرے رہنے لگے ؛ اُسکے شہروں میں مختلف قسم کی صنعت وحرفت کا چرچا ہوگیا جو سب کی سب اہم تھیں۔ یہاں کے باشندوں نے روم اور قرطاجنہ سے عیش وعشرت ورثہ میں پائی تھی جو اُنکی مایۂ ناز بھی تھی، اور اُنکی باعثِ بزدلی بھی۔ شہوت رانی اُنکے خمیر میں تھی۔ اور وہ مآلِ زندگی ہی اُسکو سمجھتے تھے۔ انتہا دولت اور قومی فلاح جتنے بھی تکلفات بہم پہونچا سکتے تھے اُنکو وہ چھوڑ نہ سکتے تھے۔ باشان وشکوہ شہروں، پر تکلف بنگلوں، رومی عظمت وشان کے آثار، شجاعانِ مُلک کے کارناموں اور بحری سفروں کی کامیابیوں نے اس مُلک کو فردوس بنا رکھا تھا۔ ہینی بال نے اپنے لڑکپن میں یہیں شہرت پائی، قیصر نے یہیں سکندر کا بُت دیکھکر تمام دُنیا کو فتح کرنیکا تہیہ کیا۔ اس مُلک پر اب شمالی لاپچی وحشیوں نے نرغہ کیا۔ جب اُن زیادتیوں کو دیکھا جائے جو اِن لوگوں نے ملک کے اَور قطعات میں کیں، تو آپ بہر پا کے تشددات کے مقابلہ میں بہت ہی خفیف معلوم ہوتی ہیں۔ نہ سیاسی مصلحت دیکھی، نہ جذبات رحم بروئے کار آئے کہ آلنس[8]۔ آئے بیریس[9] اور بے لش تو کچھ تو مصائب سے بچ جاتے۔ جن خوش نصیب لوگوں کو کسی محفوظ مقام کی پناہ ملگئی اُنکی جان تو بچگئی، مگر اس عارضی سلامتی کا خمیازہ اُنہیں قحط کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ لہلہاتی ہوئی کھیتی آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر کردیگئی۔ جہاں یہ امید تھی کہ پیداوار سے گھر بھر جائینگے وہاں خاک بھی ہاتھ نہ آئی۔ تباہی اور بربادی کی بڑی نشانی دھوئیں کی ایک چادر ہوتی ہے، یہی چادر سنگ مرمر کے بنگلوں اور سرسبز باره دریوں کی پردہ پوش ہوگئی۔ جہاں ہر قسم کے تکلفات اور عیش وعشرت کے لطف تھے وہاں بھوبھل کا ڈھیر اور سلگتا ہوا الاؤ تھا، اور کچھ نہ تھا۔ لاشوں کے ڈھیر تھے کہ جن کو گز بھر زمین بھی دفن کرنیکے لئے نصیب نہیں ہوئی ؛ ان ہی سے زمین

پٹی پڑی تھی؛ بھیڑیئے اور گدھ اُن پر منڈلاتے تھے، مُردوں کو اِدھر اُدھر گھسیٹے پھرتے تھے اور شکم سیر ہوکر کھاتے تھے۔ جو لوگ کہ باقی رہ گئے تھے وہ ڈر کے مارے نیم جان ہوئے جاتے تھے۔ جذباتِ انسانیت اور طبعی خیالاتِ آدمیت یا تو معطّل ہوگئے تھے، یا بالکل ہی جاتے رہے تھے۔ مردوں نے پہلے اپنے خاندان کو قتل کیا، اور پھر خودکشی کرلی؛ عورتیں اپنے بچوں کو کھاگئیں؛ کھلے میدان میں پڑے رہنے، تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ ہونے، دیگر احتیاج، مصیبت اور افکار نے اپنے لازمی نتائج ظاہر کردئے۔ نکبت و آفت اور وبا نے ہزاروں آدمیوں کو قبروں میں پہونچادیا۔ مُلک کے موجودہ خونخوار مالک، جنکے ہاتھ اور دامن ابتک بے گناہوں کے خون سے آلودہ تھے، اب آپس میں لڑنے لگے۔ اُن کے درمیان میں جو فسادات ہوئے اُن میں شروع ہی میں قوم گاتھ نے اپنے سپاہیانہ جوہر اور فوجی نظام دکھلاکر اَوروں پر اپنا تفوّق ثابت کردیا۔ یہی تفوّق اس مُلک میں بڑھکر اُنکی سلطنت کا سنگِ بنیاد ہوگیا۔ پانچویں صدی کے شروع ہی میں کچھ استیصال، کچھ جلاوطنی، اور کچھ اَور اقوام کے ساتھ مناکحت کے باعث دوسری جگہ جذب ہوجانے، اور وینڈال کی قوم کے افریقیہ میں اُٹھ جانے سے، تمام ملک (باستثناء چند بندروں کے جو قسطنطنیہ کے باجگزار تھے) قوم گاتھ کے لئے خالی ہوگیا۔ انتظامِ ملکی، نسق اسماء، اصول قانون قرار دینے اور اسپر عمل کرنے، انتخابِ حکام، مجرمین کی سزا، مشاغلِ تفریح میں وہ اپنی تمام روایات اور رسمِ وطن یعنی وسچولا اور بالٹک[۱۰] پر عمل پیرا رہے۔ اُنکا تبدیلِ مذہب کرنا اتفاقی تھا؛ بیشتر حصّہ قوم نے اُسکو بے اعتنائی کی نگاہ سے دیکھا، اور گو یہ تبدیلِ مذہب بھی ایک پالیسی تھی، مگر اسوقت تو وہ اوسی کافر ہی بنے ہوئے تھے۔ گاتھک کلیسیا اپنے آپ کو کلیسیاء روم سے آزاد رکھتا تھا۔ مگر یہ بھی نہ تھا کہ وہ پوپ کا ادب ملحوظ نہ رکھتا ہو۔ بلکہ ایک حدتک وہ اُسکے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا۔ یہ خلافِ قیاس کیفیت دنیاء مسیحی میں صرف گاتھک کلیسیا ہی کو حاصل تھی۔ جو شخص کہ اپنے فہم و فراست یا شجاعت و بسالت کی وجہ سے بادشاہ تسلیم کیاجاتا تھا، اس نے ابتک بیرونی شان و شوکتِ شاہانہ اختیار نہیں کی تھی، گو قانوناً وہ اپنی رعایا کی جان و مال کا ذمہ دار ہوتا تھا، مگر معاملاتِ کلیسیا میں وہ مطلق العنان ہوتا تھا، اور اُسکے احکام میں کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا قومی کونسل منعقد کرلیتا تھا، اور اُسکا صدر خود بنتا تھا۔ ان کونسلوں کے ارکان صرف

پادری ہوتے تھے، مگر احکام بادشاہ ہی کی طرف سے جاری ہوتے تھے؛ اُسکو اختیار حاصل تھا
کہ ان کونسلوں کے احکام کو نافذ کرتے، یا ان پر عمل ہونے سے پہلے ترمیم کر دے۔ اُسکی مغرور
رعایا اپنے بادشاہ کی خواہشات اور مشوروں کو ایسے ادب و احترام کی نظر دیکھتے تھے کہ کوئی دوسرا
نہ دیکھتا ہوگا۔ فی الحقیقت پادری بالکل بادشاہ کے دست نگر تھے؛ اُنکی آزادی بادشاہ کی رائے
اور خیال پر منحصر تھی۔ زمانہ مابعد میں تو اُنہوں نے اپنے آپ کو بوجہ اپنے عہدہ کے تقدس کے
ٹیکس کے ادا کرنے سے معاف کرا لیا تھا، مگر اُسوقت تو اُنکو بھی ویسے ہی ٹیکس ادا کرنا پڑتا
تھا جیسے کہ اور رعایا کو۔ خلاف ورزی قانون میں اُنکو اسیطرح سزا دیجا سکتی تھی جیسی کہ عوام
الناس کو۔ اُن پر صرف یہی پابندیاں نہ تھیں بلکہ رعایا کے دنیوی حقوق کا بہت ہی لحاظ رکھا جاتا
تھا، اور اسکی خاص طور پر نگرانی کی جاتی تھی کہ اہالی کلیسیا اُنکے کسی حق پر دست اندازی نہ کریں۔
حکام دنیوی کو خاص طور پر ہدایت تھی کہ وہ پادریوں کے چال چلن پر اپنی نظر رکھیں۔ ایسی مثالیں
بھی ملتی ہیں کہ اپنے مقلدین پر ظلم و بے انصافی کے بدلے میں پادریوں کو سزا جرمانہ دیگئی ہے۔
ہر پادری اور اسقف کے حکم کا مرافعہ بادشاہ کے سامنے ہو سکتا تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی
یہ آزادی حاصل تھی۔ ہر حکم مذہبی پر قبل از نفاذ بادشاہ کی منظوری کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی
صوابدید اور مرضی سے بڑے سے مذہبی پیشوا کو کسی اسقفیہ کے لئے نامزد کر سکتا تھا، اور
ایک اسقفیہ سے دوسرے اسقفیہ میں تبدیل کر سکتا تھا۔ اپنے ہی اختیارات سے اُنکو
بحال و برطرف کر سکتا تھا۔ انتظامی معاملات مذہبی میں جو احکام پادری جاری کرتے تھے اُنکو
منسوخ یا ترمیم کر سکتا تھا۔ مگر قاعدہ ہے کہ ایسا فرقہ جو علم کا مالک واحد بنا ہوا ہو، قوم بھر کی
دنیوی فہم و فراست کا اپنے آپ کو اجارہ دار سمجھتا ہو اور بلند نظری کی وجہ سے وہ اپنا دماغی
تفوق دیکھ رہا ہو، وہ اپنے آپ کو کسیکا ماتحت یا دست نگر نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ سپین کی
مذہبی کونسلوں نے بھی ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے۔ اُنہوں نے بالکل نامعلوم طور پر
آہستہ آہستہ اپنے آپ کو بادشاہ کے فولادی پنجہ سے نکالنا شروع کیا۔ کچھ تو بادشاہ ہی
کمزور تھے اور کچھ اس دباؤ کی وجہ سے کہ کوئی بادشاہ بغیر اُنکی منظوری کے تخت نہیں پا سکتا
تھا، پادریوں نے اپنی مطلق العنانی کا ڈنکا بجایا۔ اب اُنہوں نے "تدہین" کی ایک رسم نکالی۔

جس سے بادشاہ کو ایک قسم کی تقدیس حاصل ہو جاتی تھی؛ اس سے بادشاہ کی تاجپوشی مشروط طور پر اُنکے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ رسم سب سے پہلے سپین ہی میں شروع ہوئی، مگر فرانس والوں نے اسکو آٹھویں صدی، یعنی زمانہ سلطنت پےپن[11] تک اختیار نہیں کیا۔ پھر اُنہوں نے ایسے قوانین بنائے جو اُن ہی کے مفید مطلب تھے، لیکن بالواسطہ اُنکا نام اُنہوں نے "قوانین صلاح و فلاح عامۃ الناس" رکھا۔ بادشاہ کا انتخاب جمہوری رائے پر قرار دیا؛ اور آخر میں تمام قوم کو صحیح مذہب مسیحی کا پابند کرنیکا بہانہ کیا۔ غرض اِن ترکیبوں سے گاتھک پادریوں نے اپنے سیاسی تفوّق کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔

طلیطلہ کی تیسری مذہبی کونسل وہ پہلی کونسل تھی جسمیں گاتھک بادشاہوں کی صفات اور طریقۂ انتخاب پر بحث ہوکر ایک خاص صورت قرار دیگئی۔ اسوقت سے لیکر آٹھویں کونسل تک جو ۶۵۳ء میں ہوئی، ان مجالس میں امراء بلا اہلی[12] نے ان کونسلوں میں دخل نہیں دیا۔ جنکی صورت اب کچھ واضعانِ قوانین کی سی ہوگئی تھی۔ اور ان ہی سے اہالی کلیسیا کی نیت معلوم ہوگئی۔ انہوں نے اپنے فرقہ کی بہت کچھ رعایت کی، اور بہت سی معافیاں دلوادیں۔ ساتویں صدی کے وسط کے بعد اگرچہ امراء کو ان قومی مجالس کا کارکن بنالیا گیا، اور وہ بحث و مباحثہ میں دخل بھی دیتے رہے، مگر پادریوں کا اقتدار بڑھتا رہا؛ اور امراء کا صرف یہ کام رہگیا کہ وہ خاموشی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملادیں، اور اُنکے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، اور بس۔ ایک جداگانہ عدالت مقرر کی گئی، جسکا کام یہ تھا کہ اثنائے مقدمہ میں معاملات کلیسیا کے متعلق جو اصولی امور متنازعہ فیہ پیدا ہو جائیں اُنکا تصفیہ کیا کرے۔ پادریوں کو اجازت نہ تھی کہ وہ تجارت کریں؛ حالانکہ زمانہ ماقبل میں کلیسیا کے افلاس کی وجہ سے اسکی اشد ضرورت تھی۔ یہ رواج پڑگیا تھا کہ معاہدات طے کرنے کے لئے، نیز فوجی سفارت پر کوئی اُسقف مقرر کیا جاتا تھا اور اُسکو امن و جنگ کے اہم اختیارات دیدئے جاتے تھے۔ کونسلیں بعض وقت دنیوی معاملات اور مقدمات میں بھی اپنے اختیارات استعمال کرتی تھیں۔ یہ امر محض خود اختیاری تھا؛ اسکی وجہ خواہ یہ سمجھی جائے کہ بادشاہ اس طرف کچھ اعتنا نہ کرتا تھا، یا یہ کہ وہ معاملات مذہبی میں نہایت متعصب ہوتا تھا۔ مذہبی قوانین مجریہ کے موافق معاملات کفر میں مساہمت قطعاً روا نہ رکھی جاتی تھی؛ اور ایذارسانی

کی طرف زیادہ میلان تھا۔ جو محکمۂ احتساب و محتسب زمانہ آیندہ میں قائم ہونیوالا تھا اُسکا بنیادی پتھر یہی قوانین تھے۔

لیکن باوجود اسکے کہ اُنہوں نے مذہب کیتھولک اختیار کرکے آزادیٔ کامل کیطرف قدم بڑھالیا، مگر اس پر بھی بہت سے موانع کلیسیا کے راستہ میں حائل تھے۔ اُسقف، پادری اور راہب عوام الناس کی طرح ملکی فوج اور ملکی عدالتوں کے تحت میں تھے؛ عدالتیں انکو طلب کرسکتی تھیں، اُنکی یہ مجال نہ تھی کہ وہ احکام عدالت کی خلاف ورزی کریں، معافیٔ حاضریٔ عدالت کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر کوئی جرم اُن سے سرزد ہوجاتا تھا تو اُن پر سخت جرمانہ ہوتے تھے، اور طویل مدت کے لئے قید بھی کئے جاتے تھے، فرق اتنا تھا کہ عمائدتک کو ادنی لوگوں کی طرح سزا ازتازیانہ اور داغ دینے کی سزا دیجاتی تھی، مگر یہ اس سے بری تھے؛ بالخصوص ان کو داغ دینا تو نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ مابعد میں پادری غیر مصافی لوگوں میں شامل کردئے گئے تھے مگر بانیانِ خاندانِ گانھ کے قانون کے موافق یہ بات نہ تھی۔ جب کسی شہر کا محاصرہ کیا جاتا، یا کسی ملک پر حملہ کی تیاری ہوتی، تو رعایا کا ہر فرد خواہ وہ کوئی پیشہ کرتا ہو، فوج میں کام کرنے پر مجبور تھا۔ کوئی پادری اپنے پیشہ کے تقدس کا بہانہ نہیں کرسکتا تھا؛ اگر ذرا سا تساہل بھی اُنکیطرف سے ہوتا تو ضبطیٔ جائداد اور جلاوطنی کی سزا پاتے تھے۔ زمانۂ امن میں پادریوں کی ٹوپی اوڑھ لینے سے ایک خاص قسم کی تقدیس پیدا ہوجاتی تھی۔ جو شخص ایک مرتبہ سر مُنڈا لیتا یا پادریوں کا لباس پہننے لگتا تو اُسکو تمام فوجی خدمت اور ملکی ملازمت معاف کردی جاتی تھی۔ یہ ایسا قانون تھا کہ اگر ناواقفیت یا دھوکے سے اسکی خلاف ورزی کی جاتی تو اسکے بڑے اہم نتائج پیدا ہوتے۔ بعض وقت تو یہانتک ہوا ہے کہ اسکی وجہ سے تخت نشینی میں خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ بہر حال اُس زمانہ میں کہ ہر طرف ظلمت چھائی ہوئی تھی اور عقل و دماغ نہایت بُری حالت میں تھے، کلیسیا کا اقتدار فی الجملہ مفید ثابت ہوا۔ چونکہ اُس زمانہ میں علم کے اجارہ دار اہالی کلیسیا ہی بنے ہوئے تھے، اسلئے مظلوموں کی حمایت کے لیے یہی مقرر کئے جاتے تھے، مصیبت زدوں کی امداد کیلئے یہی بھیجے جاتے تھے، ظلموں کے رفع کرنے پر یہی تعینات ہوتے تھے، مُردوں کی آخری مراسم

اِن ہی سے ادا کرائی جاتی تھیں، پسماندوں کو تلقینِ صبر ہی کرتے تھے، کسی بے یار و مددگار گنوار پر اگر کوئی حاکم وقت ظلم کرتا تھا تو پادری ہی جا کر اُسکی مدد کرتے تھے، بادشاہ اگر کسیکو صریحًا نقصان پہونچانا چاہتا تھا تو اُسقف ہی اُسکی سفارش کرتا تھا، اُسکو حکمًا یہ کرنا پڑتا تھا، یہ نہیں تھا کہ اُسقف ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہو۔ اس اسقف کے سرکاری کاروبار کی نگرانی کی جاتی تھی، اور بصورتِ غفلت مجسٹریٹ اُسکی سرزنش کرتا تھا۔ اہالی کلیسیا کی بلند نظری اور سیاسی تفوق کی ہوس کے ساتھ جب ملک گیری کی کسی طرح نہ پوری ہونیوالی طمع بھی شامل ہوگئی، تو اسکا لازمی نتیجہ یعنی مذہبی عدم مسامحت ظاہر ہونے لگا جیسے جیسے وہ ملکی معاملات میں دخیل ہوتے گئے دولت زیادہ جمع کرتے گئے، اور بذریعہ ہبہ، استحصال بالجبر وصیت اور بیع کے جائداد بڑہاتے گئے۔ اسپر بھی اُنکی طمع بڑہتی ہی چلی گئی۔ اسکا نتیجہ وہی ہونیوالا تھا جو اوپر بیان ہو چکا۔ آیرین کلیسیا سپین نے اپنے آئین و قوانین کو محض اختلاف رائے کی بنیاد پر ایذا رسانی جائز رکھکر ناپاک نہیں کیا، لیکن جب اُنھوں نے چھٹی صدی میں مذہب کیتھولک اختیار کرلیا تو اُنکی مذہبی کونسلوں میں بھی وہی کینہ توزی آگئی جو اس مذہب کی روحِ رواں تھی، اور جس پر زمانۂ عروج میں اُنکا دار و مدار تھا۔ ان ہی کونسلوں کے ذریعہ سے یہ وبا عدالتوں میں بھی پہونچ گئی تخت نشینی کے وقت بادشاہ جو حلف اُٹھاتا تھا اُس میں یہ بھی شامل تھا کہ جو شخص غیر مذہب، یا لامذہب، ہوگا اُسکو، بلالحاظ اُسکے مولد، رتبہ اور خدمات کے ملک بدر کر دیا جائیگا۔ چنانچہ یہودی، جو بڑے بڑے عہدوں پر مقرر تھے، اور سلطنت بھر کی دولت کے حصہ دار غالب تھے، جلاوطن یا قید کر دئے گئے، یا اُنکو لوٹ لیا گیا، یا زندہ جلا دئے گئے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس قوم کے خلاف جو قوانین وضع ہوئے تھے وہ ایک مدت پہلے سے منسوخ کر دئے گئے تھے مگر اُن سے جو مقصود تھا وہ اُنکے ایک حصہ کے نافذ رہنے سے بھی حاصل ہوگیا، اور اُنکی وجہ سے یہودیوں پر سخت ترین ظلم ہوا۔ پادریوں کو جب اسکا یقین ہوگیا کہ اب اُنکو بہت سے اختیارات ملگئے ہیں، اور وہ چھن نہیں سکتے، تو اب اُنکو شان و شوکت کی سوجھی، ممنوعات پر جسارت ہوئی، اور شہوت رانی کی طرف مائل ہوئے؛ حالانکہ اُنکو قسم کھانی پڑتی تھی کہ ہم بحالت افلاس زندگی گزارینگے اور نہایت پرہیزگاری سے بسر کرینگے۔ اُنکے یہ افعال اس قسم کے توڑنے والے تو تھے ہی۔ ان سے

کلیسا کے نظام میں بھی بڑے سقم واقع ہوتے تھے۔ جو آئین کہ وقتاً فوقتاً مذہبی کونسلوں نے اس غرض سے وضع کئے تھے کہ کسی طرح پادریوں کی بد افعالیوں کا سدِ باب ہو جائے، وہ آئین بہ نسبت صفحات تاریخ کے اس امر کے معتبر شاہد ہیں کہ اُس زمانہ میں بد اخلاقیاں زوروں پر تھیں، اور دین کی طرف سے سخت بے اعتنائی ہوتی تھی۔ سخت ترین قواعد منضبط ہوئے کہ کسی طرح مذہبی سزاؤں سے بچنے کے لئے رشوت ستانی نہ ہوا کرے؛ خاصکر یہودیوں سے۔ یہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ مفلس پادریوں کے پر جوش مذہبی دلائل کی یہودیوں کے روپیہ کے بدیہی برہان کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ پادریوں اور راہبوں کو جو سرزنش ان قواعد کے موافق ان جرائم میں کی جاتی تھیں کہ وہ اپنے حلف کو توڑتے ہیں، اور نہایت شرمناک افعال سے فطرتی وقدرتی طور وطریق کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بد اخلاقی اور بدچلنی عام ہو رہی تھی۔ کلیسا کی تقدیس کی بے حرمتی ہوتی تھی، اور پادریوں کی ذات سے جو فوائد مدِ نظر تھے وہ کسی طرح حاصل نہ ہوتے تھے۔ طلیطلہ میں جو اٹھارہویں کونسل ہوئی اُسمیں شاہ وٹیزا (غیطشہ) کے اشارے سے ایک قانون وضع ہوا جسکے موافق پادری شادیاں کرسکتے تھے، بلکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے تھے اور انکے علاوہ کنیزیں بھی جتنی چاہیں رکھ سکتے تھے۔ وٹیزا خاندان گاتھ کا بادشاہ تھا کہ جسکی رندمشربی دین کے لئے سخت شرم کا باعث تھی۔ تمام دُنیائے مسیحی اُسکی بدچلنی سے کانپتی تھی، اور پوپ اُنکو ملعون قرار دے چکے تھے۔[۱۴] جب پیشوایانِ مذہبی کی یہ خراب حالت رسم ورواج اور قانون کے موافق جائز قرار پاگئی تو کلیسا کا اقتدار لازمی طور سے ہر جگہ سے کم ہو ہی جاتا۔ موجودہ مذہب کے لوگوں کے عقائد متزلزل ہوگئے۔ عوام الناس کے قلوب نادانستہ کسی ایسے نئے الہام کے قبول کرنے کی طرف مائل ہوگئے جو سخت ترین انسانی جذبات پر اثر ڈالے، جس میں معقولات کی نظیروں کی ضرورت نہ پڑے، ایسے اخلاقی اصول قرار دے جسکو سخت مشکوک اور آزاد مزاج آدمی اختیار کرسکے، اور سلطنت گاتھ کے پادریوں سے دبے ہوئے لوگوں کو آزاد کراسکے۔ بادشاہ اور کلیسا کے حدود واختیارات کی کوئی تصریح تو تھی ہی نہیں؛ یہ دونوں پہلے تو ایک دوسرے کی مدد کے محتاج بنے رہے، آخر اسی غیر صراحت کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے فوائد واغراض میں تصادم ہونے لگا، اور ان دونوں میں کشاکشی شروع ہوگئی اگرچہ

اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی سخت مزاج اور سخت گیر بادشاہ تخت پر بیٹھ جاتا تو اہالی کلیسا کو دبا لیتا؛ مگر انجام یہی ہوتا تھا کہ کلیسا ہی کو فتح ہوتی۔ اس نصب العین سے کبھی چشم پوشی نہ کیجاتی تھی کہ بادشاہ کو ہمیشہ کلیسا کا محتاج اور دست نگر رکھا جائے؛ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا تھا کہ بادشاہ کو یہ نہ یاد دلا دیا جاتا ہو کہ اُسکو پادریوں کی عنایت ہی سے تخت حاصل ہوا ہے اور وہ جب چاہیں آسانی کے ساتھ اُسکا تاج چھین سکتے ہیں۔ یہ رسم کہ تاوقتیکہ پادری متبرک روغن سے بادشاہ کی تدہین نہ کردیں اُسکو وہ تقدیس حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ تخت پر قدم رکھ سکے اُس زنجیر کی ایک کڑی تھی کہ جس سے بادشاہ کے ہاتھ پیر کلیسا نے باندھ رکھے تھے۔ اگر کوئی بادشاہ اس جرم میں ملعون قرار دیدیا جاتا کہ اُس نے غیر مذہب والوں کے ساتھ قانون نافذ الوقت کے موافق عمل نہیں کیا تو یہ ایسا گرانبار طوق ہوتا تھا کہ جسکی تاب کوئی شخص نہ لاسکتا تھا۔ کبھی تو بادشاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں پادریوں کے مزعومہ فوائد رد کردئے جاتے تھے اور کبھی اختیارات شاہی پر حملہ کیا جاتا تھا؛ اُسکے احکام سے سرتابی کی جاتی تھی؛ اور کبھی جولیس ثانی اور گریگوری اعظم جیسے پوپ وہ سرکشی دکھلاتے تھے جو اُن ہی کی شان کے شایان تھی۔ عوام الناس اپنی جہالت، تعصب یا عادت کی وجہ سے آنکھیں بند کئے ہوئے پادریوں کے ساتھ ہوتے تھے، وہ اپنے دیوصفت پیشواؤں کے ایک اشارے پر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس شتر بے مہار فوج کے مقابلہ کی کسی بڑے سے بڑے مغرور بادشاہ کو بھی ہمت نہ ہوسکتی تھی۔ بادشاہ کو رؤسا و عمائد اپنے ہی گروہ میں سے انتخاب کرتے تھے۔ یہ گروہ جاہل اور فتنہ پرداز ہوتا ہی تھا، انتخاب کے وقت اُنکی راؤں کے ساتھ ہی اسقفوں کی رائیں بھی لی جاتی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امراء بلاطی کی رائے تو محض دلدہی کے لیے حاصل کی جاتی تھی۔ رہگئے عمائد و رؤسا، اُنکی رائے بھی صرف قانون گانٹھک کی خانہ پُری تھی؛ ورنہ حقیقی اختیارات کا تو اُن میں شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ کونسل جس چیز سے عبارت ہے وہ تمام قوم کے روشن دماغ اور علما کا مجمع ہوتا تھا۔ اُسکے بیشتر آئین و قوانین اصول عدل و انصاف پر مبنی ہوتے تھے۔ ان کونسلوں میں جو مباحثے اور قراردادیں ہوتی تھیں وہ بعض بالکل ایسی ہوتی تھیں کہ اُنمیں کسیکی حمایت یا طرفداری کا

شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ بہیئت مجموعی اُنپر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو نسلوں کے افراد جاہل نہ ہوتے تھے بلکہ اُن میں وہ صفات ہوتی تھیں جو روشن دماغ سیاست والوں میں ہونی چاہئیں۔ ان لوگوں کی محنتوں کی قدر گانھک قوانین کے دیکھنے سے ہوتی ہے، یہ مجموعہ قوانین بہت سی وجوہ سے قابل اعتنا ہیں۔ خصوصًا ایسی صورت میں کہ جب یہ خیال کیا جائے کہ اُس زمانہ میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ یہ قوانین وہ ہیں کہ جن پر یورپ اور امریکہ کے موجودہ قوانین مبنی ہونے والے تھے۔ ان میں جزئیات تک کی تفصیل ہے۔ انسان کی معمولی زندگی کے ہر کاروبار پر یہ حاوی ہیں۔ جس بادشاہ کے دوران سلطنت میں یہ وضع ہوتے تھے اُس زمانہ کی تمام ضروریات پر یہ احاطہ کیئے ہوئے تھے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ زمانہ حال کے قانون دانوں کو انکا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اُن قوموں کے ساتھ اختلاط کہ جو ایک مدت سے برکاتِ امن سے مستفیض ہو رہی تھیں، اور بوجہ انکی طول و طویل مہمات میں بہت کچھ تجربات اُنہوں نے حاصل کیئے، اُنکے قوار دماغی کا نشو و نما ہو چکا تھا، اُنکے قوانین میں بالکل نا معلوم طریقہ سے خود بخود ترمیم ہوتی چلی گئی اُنکے تمام قوانین کا اصل اصول یہ تھا کہ ہر شخص ذاتی طور پر آزاد ہے اور اُس آزادی کو قایم رکھنا ضروری ہے۔ سلطنت روم کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ جہانتک اُنکے اغراض پر اثر نہ پڑے، اور اُنکے اختیارات شاہی کا مانع نہ آئے، وہ کسی مذہب و ملت کے معتقدات سے تعرض نہ کرتے تھے، نہ اپنی رعایا کی رسم و رواج میں دخل دیتے تھے۔ اسی بنا پر اُنہوں نے آئے پیریا والوں کو اپنے ہی قوانین کے پابند رہنے میں کوئی اعتراض نہیں کیا۔ صرف وہی لوگ شاہی حکام کے سامنے پیش کئے جاتے تھے کہ جنہوں نے وہاں توطن اختیار کر لیا ہو۔ وحشیوں کے آئے دن کے حملوں نے ہر طرح کی قیود کو توڑ دیا تھا، اور جزیرہ نما اسپین کے امن و امان کو حالتِ بدامنی سے مبدل کر دیا تھا۔ ہر گروہ کے سپہ سالار کی زبان ہی قانون تھی، باقی تمام قوانین معطل تھے۔ یہ سپہ سالار بجائے اسکے کہ اپنی فوج کی سختیوں اور ظلموں کو روکتے، اُنکی اور بھی تشویق کرتا تھا، تمام دفاتر سرکاری اور دستاویزات غائب تھیں، حدبستی و حدہ کے نشان بھی نہ رہے تھے، اراضی کے متعلق

حقوق کا فیصلہ دعویداران کی تعداد پر منحصر تھا۔ جب کسی علاقہ میں رہنے کو جگہ نہ رہجاتی تھی تو لوگوں کی بے صبری اور لالچ انکو کسی ایسے علاقہ میں لیجاتا، جسکی سرسبزی و شادابی انکو اپنی طرف کھینچ لیتی۔ وہ یہ دیکھ لیتے تھے کہ وہاں اتنی کافی فوج نہیں ہے کہ وہاں کے باشندے ان نئے آنیوالوں کو روک سکیں، کیونکہ خود انہی کا قبضہ وہاں غیر مستقل سا ہوتا تھا۔ جب کوئی علاقہ فتح ہو چکتا تھا تو فاتحین اسکو لوٹ لیتے تھے جس سے بیچارے مفتوحین رہے سہے اور بھی قلاش ہو جاتے تھے۔ کوئی عہدنامہ قابل نفاذ نہ ہوتا تھا؛ کوئی شخص اسکا ذمہ وار نہ ہوتا تھا، اور کوئی ایسی زبردست طاقت نہ ہوتی تھی کہ جو ثالث بنکر اسپر عمل کرائے۔ ہر قسم کے جور و ظلم دھڑلے سے ہوتے تھے؛ پرانی دشمنیاں نکالی جاتی تھیں اور اسمیں آزادی کے ساتھ ہر قسم کی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ سپہ سالار کی زبان قانون ہوتی تھی، انکو پرانے نظائر کا خیال رکھنا ہی نہ آتا تھا، ہر تنازعہ کا تلوار فیصلہ کرتی تھی، ہر معاملہ میں تلوار ہی منصف ہوتی تھی۔

سنہ ۹۷ء میں بزمانہ سلطنت یورک[۱۳] گاتھک قانون کی سب سے پہلی کتاب قانون کی صورت میں شائع کی گئی، یہی اس پیچیدہ اصول قانون کی بیخ و بنیاد تھی کہ جسکا حجم بڑہتا چلا گیا۔ ہر آئندہ بادشاہ کے زمانہ میں اسکی قدر و منزلت بڑہتی ہی چلی جاتی تھی۔ اس کتاب کا نام "فوری جیوڈی کم" (کتاب القضاۃ) تھا۔ یہ ہر قسم کے رسم و رواج اور سزاؤں کا ایک مجموعہ تھی، جسکو تجربہ اور اقتضاء وقت کی گویا منظوری حاصل تھی اور رعایا و قوم گاتھک کے بھی مناسب حال تھی۔ اس میں قانون رومی کے بعض اصول بھی تھے جو اس قوم کے اختلاط اور عدالتوں کے رجحان کی وجہ سے اس میں آ گئے تھے۔ قوم گاتھ نے چھٹی صدی کے نصف آخر میں آرتھوڈاکس مذہب مسیحی اختیار کر لیا۔ اس سے نئے حقوق و فرائض پیدا ہو گئے۔ واسطے انکو اپنے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنا اور موجودہ قانون کو زیادہ مفصل اور زیادہ وسیع کرنا پڑا۔ اس قانون کے موافق آئے بیریا کے کلیسا کی ایک حیثیت قائم ہو گئی تھی، اور انکا اقتدار دنیوی معاملات میں بھی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ صورت بہت ہی قابل لحاظ ہے۔ اسکے اثرات بدا ہائی سپین کے قوانین عقلی نیز

دولت و حشمت پر ایسے بُرے پڑے کہ جو آجتک نمایاں ہیں۔ اس قانون کی تاریخ نفاذ و شیوع ہی سے تمام باشندگانِ جزیرہ نما بلا کسی استثناء کے کلیسا کے ماتحت ہو گئے۔ اسی تاریخ سے جزیرہ نما بھر میں کلیسا کا وہ اقتدار قائم ہوا کہ اجتک کم نہیں ہوا ہے۔ کلیسا نے تمام رعایا کو اسطرح اپنے شکنجہ میں کسا کہ آجتک وہ اُسی میں دبے ہوئے ہیں۔ اس اقتدار کے جو خوفناک نتائج تمام طبقہ و فرقہ رعایا کو بھگتنے پڑے وہ تاریخ دانوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

شاہی اختیارات کی جو تحدید قانون وزیگاتھ میں کیگئی تھی، اُس سے اُس آزادی کا صاف پتہ لگتا ہے جو جرمنی سپاہیوں میں اجتک بہت نمایاں ہے؛ اور انہوں نے انتخاب بادشاہ کے متعلق اسکو اجتک نہایت احتیاط اور سختی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ بادشاہ کو پہلے ہی اُسکی رعایا سرزنش کر سکتی اور عدالت میں کھینچ بلا سکتی تھی۔ اب اُسکو صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ اُسکی صولتِ شاہی صرف اس شرط پر قائم رہ سکتی ہے کہ وہ قانون کی پابندی کرے معاملات قانونی میں وہ سب کے ساتھ مساوات کا سلوک کرے اور اپنی تمام رعایا کو اپنی برابر سمجھے۔ جاہل اور شریر عمائد اپنے اقتدار کے زعم میں جسکو چاہتے تھے بے عزت کر دیتے تھے مگر اب کلیسا نے آہستہ آہستہ اُنکے زور کو کم کر دیا، اور آخر قومی کونسلیں اُنکو بالکل اپنے قابو میں لے آئیں۔ پادریوں کی حیثیت بہت ہی بڑھ گئی تھی۔ اُس زمانۂ جہالت کامل میں اُنکا فرقہ مہذب ترین تھا، اور اُنکو دعوٰی تھا کہ وہ ایسے آزاد کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں کہ اُن کے مجریہ قوانین میں خود پوپ بھی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ آخر میں تو انہوں نے قوانین وزیگاتھ کے رو سے اپنی وہ بدترین خصوصیت قرار دلوالی جو ایک آزاد اور غیر مساہم عمائد و اراکین کی ہوتی ہے۔

"کتاب القضاۃ" بارہ جلدوں میں تھی۔ اس میں نہ صرف سوسائٹی کے مختلف فرقوں کے حقوق ہی کی تفصیل تھی، بلکہ نہایت توضیح کے ساتھ ہر ایک عدالت کی کارروائی کا طریقہ اور ضابطہ درج تھا۔ جہانتک عقل انسانی کام دے سکتی ہے تمام حکام ملکی و کلیسائی کی ایمانداری، دیانتداری اور غیر طرفداری کی تدابیر ان قوانین میں کی گئی تھی۔ ہر ایک حاکم کا فرض تھا کہ وہ اساقفہ اور پادریوں کے فیصلوں پر نظر رکھیں، اور اگر ضرورت دیکھیں

تو انکی بے ضابطگی کی بادشاہ کو اطلاع دیں۔ دوسری طرف یہ قاعدہ تھا کہ حکامِ کلیسا بعض شرائط کے ساتھ اُن مقدمات کی خود سماعت کر سکتے' اور فیصلے صادر کر سکتے تھے' جنکے فیصلہ سے حکام دیوانی و فوجداری پہلوتہی کرتے ہوں' اور جس سے کسی فریق کی حق تلفی کا اندیشہ ہو۔ عدالتیں طلوعِ آفتاب سے لیکر غروب تک کھلی رہتی تھیں۔ تعطیلات اور عملہ کے آرام کے اوقات بروئے قانون مقرر تھے' اور اُنپر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ سماعتِ مقدمات میں بلا وجہ موجہہ دیر نہیں کی جاتی تھی۔ یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ مقدمات بہت جلد فیصل کئے جائیں۔ کوئی حاکم اگر تصفیہ مقدمات میں تاخیر' یا بے انصافی' یا بددیانتی کرتا تو اُسکو فریق مقدمہ کے نقصان سے دوگنا جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اگر واقعات سے یہ معلوم ہوتا کہ کسی حاکم کے جرم کی نوعیت بہت سخت ہے' تو اُسکی جائداد ضبط کر لی جاتی تھی' اور اُسکو غلام بنا کر فروخت کر دیا جاتا تھا۔ کوئی شخص' خواہ وہ کیسا ہی غریب کیوں نہ ہو' محض مفلسی کی وجہ سے' عدل و انصاف سے محروم نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہر قریہ و قصبہ میں مفلس اہل مقدمہ کے لئے کچھ روپیہ جمع رہتا تھا' جو سقف کی اجازت سے اُنکو مقدمہ کی پیروی کے لئے دیا جاتا تھا۔ عدالت ماتحت کے احکام کا مرافعہ عدالت بالادست میں کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل تھا۔ اگر ذرا سا بھی یہ شبہہ ہو جائے کہ بادشاہ وقت ان عدالتوں کے فیصلوں میں دست اندازی کرنا چاہتا ہے' تو تمام کارروائی کالعدم سمجھی جاتی تھی۔ کارروائی عدالت میں سادگی کو بہت کچھ ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ وکلا کی تقریریں ہمیشہ لاطائل باتوں سے پاک رہتی تھیں۔ از روئے قانون افسرانِ شاہی کا رعب و داب قائم رکھا جاتا تھا' اور سختی کے ساتھ اسکی تعمیل کرائی جاتی تھی۔ عام رائے یہ تھی کہ جہانتک ہو سکے مقدمہ بازی سے احتراز کیا جائے! عدالت تک معاملہ صرف اُسی صورت میں پہونچایا جاتا تھا کہ جب کوئی چارہ کار نہ رہجاتا تھا۔ قانون و موازنۂ شہادت میں ٹیوٹانک نسل کی وحشت کے آثار بہت کچھ پائے جاتے تھے۔ مدعی یا مدعا علیہ کے سچ بولنے کا معیار اکثر یہ قرار دیا جاتا تھا کہ اگر وہ اپنے قول میں سچا ہے تو آگ میں نہ جلیگا' یا پانی میں نہ ڈوبیگا۔ فریقین کے ہاتھ میں تلواریں دے دیجاتی تھیں' اُن میں جو ہار جاتا یا قتل ہو جاتا' وہ سخت رسوا ہوتا تھا' بعض وقت کوئی بدنام شخص اپنی بدنامی دور کرنے کے لئے قسمیں کھاتا تھا'[15]

اور عورات کی عصمت دری کے جُرم کا دھبہ دور کرنے کے لئے سخت قسم کی قسمیں کھلائی جاتی تھیں۔ شہادت کے متعلق ایذا دینی جائز تھی؛ لیکن اس میں زیادتی کرنا منع تھا۔ اگر اس میں کسی شخص کو ضرب شدید آئے، یا وہ مرجائے، تو وہ حاکم نہ صرف اپنی جائداد ہی سے محروم کردیا جاتا تھا، بلکہ اُسکی آزادی بھی چھین لی جاتی تھی۔ کسی غریب آدمی کی شہادت اسلئے قبول نہیں کی جاتی تھی کہ بوجہ افلاس کے اُسپر رشوت لے لینے کا احتمال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل سخت ظلم پر مبنی تھا، اور ایسا گمان ناقابل معافی۔ بیچارے یہودی بھی خواہ اپنے دین کے پیرو ہوں، یا عیسائی ہوچکے ہوں، شہادت دینے کے قابل نہ تھے۔ اُنکی اولاد اور غلاموں کی شہادت بھی قبول نہیں کی جاتی تھی۔ دروغ بیانی اور دروغ حلفی نہایت بُری نگاہ سے دیکھی جاتی تھی؛ بلکہ لوگ اس سے کانپ اُٹھتے تھے۔ اسکی پاداش میں سخت ترین سزا دیجاتی تھی۔ جو شخص جھوٹی گواہی دیتا تھا، اُسپر ہر طرف سے لعنت و ملامت کی جاتی تھی، اور اُسکو عمر بھر کے لئے قید کردیا جاتا تھا۔ بہر کیف وزیگاتھ کے قانون فوجداری میں یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ اُسکے موافق امن عامہ کی خلل اندازی میں مجرمین کو بڑی سزائیں دیجاتی تھیں۔ سزا موت بہت کم دیجاتی تھی؛ اور اگر دی بھی جاتی تھی تو صرف بغاوت، زنا بالجبر اور قتل عمد کے جرائم میں۔ چھوٹے چھوٹے جرائم کی فہرست، اور اُنکی سزائیں، قانون میں شامل تھیں۔ ان جرموں پر سزا کا دار و مدار مجرم کے درجہ و رتبہ، اور سیاسی اہمیّت پر منحصر تھا۔ جھوٹا مقدمہ چلانے، حکام کو رشوت دینے، اور بادشاہ کے برخلاف ہتھیار اُٹھانے کی پاداش میں ملزم کو اُس شخص کا غلام بنادیا جاتا تھا جسکو اُسکی ذات سے نقصان پہونچا ہو؛ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُس غلام سے ایسا کام نہ لیا جائے کہ اُسکی جان پر بن جائے۔ بغاوت کی سزا جلاوطنی تھی۔ بچہ کُشی کی سزا اندھا کردینا، اور سکہ قلب اور جعل بنانے کی سزا، داہنا ہاتھ کاٹ ڈالنا۔ اگر کسی سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جو اخلاق عامہ کے خلاف ہو، اور جرم بھی نہایت شدید ہو، تو اُسکی سزا میں مجرم کا سر مونڈکر اُسکو داغ دیا جاتا تھا تاکہ عمر بھر تک وہ نمایاں رہے، اور اُسکے اہل وطن اُس سے نفور رہیں۔ اکثر جرائم میں سزا بید دیجاتی تھی۔ اس سے کوئی آزاد شخص بھی خواہ وہ کسی درجہ و رتبہ کا ہو، محفوظ نہیں رہ سکتا تھا اگر کچھ بچنے کی تدبیر تھی تو یہ کہ وہ جرمانہ ادا کردے، جسکی تعداد ہر ضرب بید کے اوپر موقوف تھی۔ ظالم رؤسا کے ظلم سے بچنے کے لئے کسی اور کے یہاں پناہ لینا اُنکے یہاں جائز تھا۔ یہ ایسی صورت تھی

کہ جسکی قدر آجکل نہیں ہوسکتی' اور کوئی اسکا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اُس زمانہ میں رؤسار اپنی رعایا پر اس درجہ ظلم و ستم کرتے تھے کہ انکو اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگنا پڑتا تھا۔ جو شخص کسی کلیسا میں آکر پناہ لیتا تھا' وہ بغیر منظوری اساقفہ زبردستی گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے کر بلیکسٹون کی شرح قانون دیکھی ہے انکو معلوم ہوگا کہ کتاب القضاۃ کا کتنا اثر قانونِ انگلستان پر ابتک باقی ہے۔ وزیگاتھ کے قانون وراثت میں مختلف رشتوں اور حقوق وراثت کی پوری پوری تشریح و توضیح تھی۔ نابالغوں کے متعلق جو احکام ہیں اُن سے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک باپ اپنی اولاد کی زندگی کا فکر رکھتا ہے' اور اُسکے لئے انتظام کرتا ہے۔ والدین اپنی اولاد کو محروم الارث نہیں کر سکتے تھے؛ البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اولاد نے اُن پر جبر و تشدد کیا ہے تو مضائقہ نہ تھا۔ معاملاتِ توریث میں مردوں کو عورتوں پر کوئی فضیلت نہیں دیجاتی تھی' بلکہ دونوں ایک ہی سطح پر رہتے تھے۔ دس برس کی عمر کا لڑکا یا لڑکی بلا کسی روک ٹوک کے اپنی جائداد' بذریعہ وصیت نامہ' منتقل کر سکتے تھے۔ نابالغوں کی جائداد کے انتظام کے لئے عدالتیں سربراہ کار مقرر کرتی تھیں' اور اُن سے حساب و کتاب جائداد' عدالت میں داخل کراتی تھیں۔ جب کوئی نابالغ کسی مقدمہ میں فریق ہوتا تھا تو اُسکی طرف سے پیروی کرنیکے لئے عدالتیں سربراہ مقرر کر دیتی تھیں۔ قانون روما کے موافق باپ کو اپنی اولاد پر اختیار کامل حاصل تھا؛ مگر قوم وزیگاتھ اُسکو بہت ہی بُری نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اُنکا قانون والدین کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری توضیح کرتا تھا۔ جو بیٹا اپنے باپ کے ساتھ رہتا ہو وہ باپ کی دو ثلث آمدنی کا حقدار تھا۔ عدالتیں نابالغ اور یتیم کی جائداد کی سختی کے ساتھ نگرانی کرتی تھیں۔ زمانہ قدیم میں یہ رسم تھی کہ اگر کوئی شخص کنیزک خرید لیتا تھا تو وہ اُسکی بیوی سمجھی جاتی تھی۔ اُسکی صرف یہ نشانی قوم گاتھ میں باقی رہگئی تھی کہ دولہا اپنی دولہن کے والدین کو کچھ روپیہ بطور قیمت ادا کرتا تھا۔ جو نکاح خفیہ طور پر کئے جاتے وہ جائز نہیں سمجھے جاتے تھے۔ عورتیں بلا شمول اپنے شوہروں کے' مدعیہ یا مدعا علیہا ہو سکتی تھی۔ ان میں سے ایک دوسرے کے افعال کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ نسل کے صحیح اور صاف رکھنے کا اہتمام سختی کے ساتھ قانون کرتا تھا۔ اگر کوئی عورت زنا کی مجرمہ ہوتی تھی تو وہ اپنے شوہر کے سپرد

کردیجاتی تھی کہ اُسکو جو اور جیسی سزا چاہے دے۔ اس جرم کو درشت مزاج وحشیانِ بالٹک کی اولاد ہزار برُی نگاہ سے دیکھیں، مگر اس قسم کے مقدمات کو عدالتہائے کلیسا کے سپرد کردیا جاتا تھا، اور یہ عدالتیں اس فعل بد کو بجائے اسکے کہ جرم سمجھیں انسانی کمزوری پر محمول کرکے معاف کردیتی تھیں۔ اس رعایت کی وجہ کچھ تو قانون کا نقص تھی جو عورتوں سے دردمندانہ برتاؤ کرتا تھا، اور کچھ قربانگاہ کے سامنے "اقبالِ گناہ" کرانے والے پادری کی ہمدردی ہوتی تھی۔ اسکی عنایت سے ملزمہ کو چند روز کے لئے کسی آرام وہ خانقاہ میں داخل کردیا جاتا تھا، وہ وہاں پر کچھ مذہبی مشقتیں کرکے پادریوں سے معافیِ گناہ کرالیتی تھی۔

یورپ میں بالعموم، اور جرمنی میں بالخصوص، مزارع غیر موروثی، اور رعیّت کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں، انکا انتظاماتِ وزیگاتھ میں نام نہ تھا۔ انتظام نظام الاقطاعی معہ اُسکے حقوق وزوائد کے جیسا کہ زمانہ مابعد میں یورپ میں جاری ہوگیا تھا، وہ فی الحقیقت اُن کے یہاں نہ تھا۔ جاگیردار اور مزارع غیر موروثی کے جو تعلقات ہیں وہ ایک حد تک رومی ضوابط سے مستعار تھے۔ قانون کا جو حصّہ غلاموں کے متعلق تھا وہ بہت مفصل تھا، اور اس میں جزئیات تک کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ آقا کو اپنے غلام کی جان پر اختیارات کامل حاصل تھے۔ جو شخص کسیکو غلام کو بھگا دینے میں مددگار ہوتا تھا اُس سے غلام کی قیمت وصول کرلی جاتی تھی۔ چونکہ غلاموں اور کنیزکوں کے درمیان میں تعلقات ناجائز ہوجانے میں جتنی کچھ آسانیاں تھیں، اتنی ہی دقتیں اثباتِ جرم میں تھیں، اسلئے مرد کی صرف یہ سزا مقرر تھی کہ وہ زندہ جلادیا جائے۔ اگرچہ بردہ آزاد کرنے کی بہت کچھ تشویق کی جاتی تھی، مگر پھر بھی غلاموں کی تعداد روزبروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، کیونکہ بہت سے آدمی جنگ میں قید ہوکر آتے تھے، بہت سے عائد وحکامِ سلطنت غلامی کی سزا پاتے تھے، بہت سے قرضدار اپنے قرضخواہ کے غلام بنادئے جاتے تھے اور بہت سے مجرموں کو غلامی کی سزا ملتی تھی۔ غلاموں کے الگ الگ فرقے تھے۔ ہر ایک غلام کسی نہ کسی گروہ میں شامل کردیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم بلحاظ اُنکے جرائم یا باعثِ غلامی کے ہوتی تھی، یا بلحاظ اُسکی صنعت وحرفت یا آقا کی حیثیت کے۔ اسپر بھی غور کیا جاتا تھا کہ وہ معمولی مزدور ہے یا کاریگر، نیز یہ کہ آیا وہ بادشاہ کی ملکیت ہے، یا کلیسائی یا کسی معمولی شخص کی

وزیگانہ کے اقتدار نے غلاموں کے بوجھ کو بہت کچھ ہلکا کردیا تھا شمشیرزنی کے خون فشاں اکھاڑوں کے منظر اُس قوم کو پسند نہیں آسکتے جس پہ بزدلی اور بے رحمی نے ابھی اپنا اثر نہ ڈالا ہو۔ بعض علاقوں میں تو غلامی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ لوگوں کو صرف یہ یاد تھا کہ فلاں غلاموں کی اولاد ہیں۔ اگر کوئی غلام اپنے آقا کے ظلموں سے تنگ آکر کسی گرجا میں پناہ لے لیتا تھا، تو اُسکا آقا مجبور کیا جاتا تھا کہ اُسکو کسی رحم دل، ذی مروّت آدمی کے ہاتھ فروخت کردے۔

"کتاب القضاۃ" کے موافق ضمانت، جانوروں کو لاوارث چھوڑ دینے، مداخلت بیجا کرنے، شارع عام کو روکنے، شرارت کرنے، کسیکو نقصان پہونچانے، دستاویزات کی تقلید کرنے، وغیرہ کی وہی قوانین اور سزائیں تھیں جو آجکل مروّج ہیں۔ قانون میعاد اُنکے یہاں بھی نافذ تھا۔ میعاد تیس برس سے لیکر پچاس برس تک تھی۔ اسکے بعد کوئی ملزم فوجداری بھی ماخوذ نہیں ہوسکتا تھا۔ زراعت، آبپاشی اور حدبست کے متعلق جو قانون تھا وہ خاص کر مکمّل اور مفصّل تھا۔ ضمانت تحریری ہوتی تھی یا نقدی۔ سربراہ کاران نابالغان کی جانچ ہوتی تھی۔ دشنام دہی کی سزا نہ صرف ادائے ہرجانہ ہی ہوتی تھی، بلکہ بعض صورتوں میں جسمانی سزا بھی دیجاتی تھی؛ مثلاً اگر ایک شخص دوسرے کو مسلمان کہدیتا، یا کنایۃً ظاہر کرتا کہ وہ مختون ہے تو اگر اُسکو پچاس ضرب بید سے کم سزا ملتی تو وہ خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔

سوسائٹی کی عام حالت، اُس قوم کی کیفیت، جسکا نصب العین یہ رہا ہو کہ جہاں کہیں امن وامان ہو اُسکا خاتمہ کیا جائے، اُسکے مصنفین کو اپنی قابلیت دکھانے کا موقعہ نہ ملا ہو، اُن کی راہ میں تعلیم کی آسانیاں نہ ہوں، ایسی صورتوں میں قوانین وزیگانہ غیرمعمولی طور پر دلچسپ اور قابل قدر ہیں۔ اُنکا اصول قانون ازروئے فہم وفراست، دوربینی اور طبائع انسانی کے اتنا موافق تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قوانین کسی آدمی کے بنائے ہوئے نہیں، بلکہ الہامی ہیں۔ انکا سب سے پہلا قانون اُسوقت وضع ہوا تھا جبکہ جسٹینین نے مشرقی روما کے تمام فہیم وزیرک لوگوں کو جمع کرکے اپنا قانون مکمّل کرایا تھا۔ وزیگانہ نے بڑی بونیٹی[16] اور اُنکے اور ستر رفیق قانون دانوں سے بہت کم بدلی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان دونوں قوانین کی بنیاد اُن

اصل اصول عدل و انصاف پر قائم ہوئی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہیں، اور ہمیشہ باقی رہینگے لیکن اُنکی وضع اور طریق استعمال میں، باوجود یکساں حالات ہونے کے بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن فی الجملہ اگر دیکھا جائے تو میلان ہمیشہ ادعائے وحشت ہی کی طرف رہا ہے۔ باستثنا اُن مواقع کے جہاں کلیسا کی طمع و بلند نظری، اور راہبوں کے تعصبات کا دخل ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قوانین وزیگاتھ کا موضوع یہ ہے کہ اُن سے ضعفا و غربا کی حفاظت، مظلوموں کی دادرسی اور تمام سوسائٹی کی صلاح و فلاح ہو سکے جس طرح کہ زمانہ قریب کے مہذب اقوام کے قوانین کی کیفیت ہے، وزیگاتھ کے قوانین میں یہ بات مدنظر رکھی گئی ہے کہ سزا کا اثر صرف ملزم کی ذات تک محدود رہے؛ اسلئے انکے موافق ایسی سزائیں بہت کم دی جا سکتی تھیں جنکا اثر ملزم کے بے گناہ وارثوں پر پڑے، مثلاً ضبطی و قبضۂ جائداد وغیرہ۔ اُنکا قانون بادشاہ کے ظلموں کا مانع تھا، وہ مختصراً نہایت صحت کے ساتھ حقوق رعایا کی تعریف و توضیح کرتا تھا؛ وہ بیواؤں اور یتیموں کو بہت بڑی رعایتیں دیتا تھا؛ وہ بدنصیب اور بے یار و مددگار غلاموں کی حمایت کرتا تھا؛ وہ کسیکی شخصی آزادی پر دست اندازی کرنے کو روکتا تھا؛ وہ کسی آزاد آدمی کو فروخت کر دینا ویسا ہی جرم قرار دیتا تھا جیسا کہ قتل عمد کو؛ جہانتک کہ اہالی کلیسا کے دعاوی کے خلاف نہ پڑے، وہ ہر مظلوم کی آواز کو سنتا تھا، اُنپر رحم کرتا تھا؛ ہر وقت کی دہمکیوں، ہر لمحہ کے تنزل کی تخویف، ضبطی جائداد اور غلامی کے اندیشہ سے حکام دیوانی و فوجداری و مالی کی دیانت کو برقرار رکھتا تھا؛ وہ قانون (۱۷) سیلک کے اصول پر عمل ہو کر غایت فہم و فراست سے کسی عورت کو تخت شاہی پر نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ قوانین وزیگاتھ کے موافق عمائد و روسا کا اقتدار ہر جگہ بڑھا ہوا تھا؛ اسکو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطلق العنان تھے؛ اُنکا ہر جگہ اقتدار تھا، اور ہر شخص پر رعب تھا، اور وہ بالکل ہی مستبد فرقہ تھا۔ یہی گروہ ہر ایک مجمع و مجلس کی کارروائی میں دخیل تھا۔ وہ بادشاہ کے کان میں قابل اعتراض اخلاق کی باتیں پھونکتے تھے۔ جب اپنے ناپاک ارادوں میں ناکامیاب رہتے تھے تو اسطرح انتقام لیتے تھے کہ جسکے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسوقت تک ملعون قرار دینے، اور خارج از مذہب کر دینے کی چھری تیز نہیں ہوئی تھی جیسا کہ زمانہ مابعد میں ہوا، لیکن پھر بھی وہ

کچھ ایسے ہمہ گیر ہو رہے تھے کہ لوگوں کے گھروں، اور تخلیوں تک میں دست اندازی کرتے تھے؛ تجارت جیسے نازک کاموں میں دخل دیتے تھے؛ حقوق اراضی و جائداد پر ہاتھ صاف کرتے تھے؛ قبرستان جیسی پاک جگہ کو بھی اپنی شرارت سے ناپاک کر دیتے تھے۔ اہالی کلیسا کی غیر مساحت اپنی ضرورت کے موافق بعد از وقوع حادثہ قانون وضع کرا کر رہتی تھی۔ اس قسم کے قانون سے جو ظلم ہو سکتے تھے وہ کسی غیر متعصب آدمی سے پوشیدہ نہوں گے۔ عبرانیوں کی قوم کو ایک عالم مجبوری ولاچاری میں ڈالے رکھنے، اور اُنکے ستانے کے لئے قانون بنا لینے سے صاف طور پر یہ قانون محکمہا احتساب و محنہ کے ہاتھ میں ظلم و ستم کا ایک آلہ دیدیا تھا۔ سحر اور جادو سے وہ لوگ ہمیشہ سے ڈرتے چلے آئے ہیں جنکے دل و دماغ نے ابھی کافی نشو و نما نہیں پایا ہے۔ اہالی کلیسا تو اس سے بہت ہی گھبراتے تھے، کیونکہ وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ سوائے اُنکے فرقہ کے کوئی اور شخص عجوبہ کار و شعبدہ باز ہو۔ ساحروں اور جادوگروں کو وزیگانہ نہایت مکروہ فرقہ سمجھتے تھے، اور اُنکو سخت سزا دیتے تھے۔ پادریوں کا فرقہ جب معمولی طور پر بحث و مباحثہ سے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوتے تھے تو وہ ایسے ذرائع اختیار کرتے تھے جو قرون وسطیٰ میں یورپ کے سازش کنندہ حاشیہ نشینان شاہی ہی کو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو نہایت احتیاط کے ساتھ پیش کرتے تھے؛ نہایت ہوشیاری سے اُس پر بحث کرتے تھے؛ اُسکے موافق دلائل کو وہ پادریانہ انداز سے پیش کرتے تھے؛ اور نہایت جوش دہی کے ساتھ اُسکو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ وزیگانہ کے قوانین دُنیا کے قانونی حلقوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، کیونکہ اُنکو ایک قابل تعظیم قدامت حاصل ہے، اور وہ انسان کو ارفع و اعلیٰ اصول اخلاق سکھلاتے ہیں۔ ہر ایک قوم جس نے اُن سے فائدہ اُٹھایا ہے وہ اُنکے قوانین کی ممنون ہے۔ اُن میں وکلاء کی معمولی لیت و لعل نہیں ہے۔ جہاں جہاں یہ مروّج رہے وہیں حکام وقت ایک تیقن و عجلت کے ساتھ کام کر سکتے تھے۔ ان حکام کے فیصلے محض ان قوانین کی وجہ سے غیر طرفدارانہ ہوتے اور عوام الناس کو اُنپر اطمینان و اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ قانون پیشہ لوگوں کو تو ان قوانین کا احسانمند ہونا ہی چاہیئے، اسلیئے وہ اُنکی جتنی قدر و تعظیم کریں بجا ہے

نمایاں ہے کہ اُسکا ایک ایک قدم گنا جاسکتا ہے۔ اہالی کلیسا کا عروج آسلئے قدم کا مضبوط ہونا اختیارات شاہی کی تحدید، گستاخ عمائد سلطنت کے مزعومہ حقوق کا زوال، وہاقین کو باربرداری کے جانوروں کی سی حالت سے نکالکر ایک خوددار انسان بنادینا (گو وہ جاہل ہی رہے لیکن عدالتوں کی اپنی دادرسی تو یقینی معلوم ہوتی تھی) یہ سب باتیں پوری صحت اور تفصیل کے ساتھ ان میں لکھی ہوئی ہیں؛ اور وہ اس معاملہ میں صحیح تاریخ کا کام دیتے ہیں۔ اُن ہی میں وہ ذرائع ہیں جنہوں نے سلطنت سپین کی ڈوبتی ہوئی امیدوں کی کشتی کو کنارے لگا دیا، اور ان میں جوش و حمیت پیدا کردی۔ کہاں تو قوم کی یہ حیثیت تھی کہ وہ حدود ایسٹریاس میں محدود اور کہاں اُس نے المانون جیسی قوم کے مقابلہ میں اپنی زندگی قائم رکھ لی اور اتنا عروج حاصل کیا کہ تمام یورپ کی زمام اُسکے ہاتھ میں آگئی؛ اور دنیائے مسیحی کی گتھی سلجھانے والے بن گئے۔ یہ ہیں عام خصوصیات اُس بےنظیر اصول قانون کی جسکی پر شکوہ کیفیت وہیں کے باشندوں کے اس ناقل دول قول سے ظاہر ہوتی ہے کہ "قانون دنیاوی فی الحقیقت قانون کلیسائی کا رقیب ہے، وہ عدل و انصاف اور دنیاوی زندگی کا رہبر ہے؛ وہ ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، تمام فرقہائے رعایا پر حاوی، اور انکا محافظ ہے؛ اب اس میں مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا، عقیل و فہیم ہو یا جاہل و کندۂ ناتراش، شہری ہو یا دیہاتی، امیر ہو یا غریب، وہ اسواسطے نہیں وضع کیا جاتا کہ ایک شخص واحد کو فائدہ پہونچائے، بلکہ اُسکا مقصد اصلی یہ ہے کہ عامۃ الناس کے اغراض و فوائد کو ملحوظ رکھے اور اُنکی حفاظت کرے؛ اُسکا یہ کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو مکان و زمان کے سانچے میں ڈالتا ہے، حالات و معاملات و رسمیات موجودہ کے موافق اپنا چولا بدلتا رہے، اپنے آپ کو عدل و انصاف سے باہر نہ جانے دے اور رعایا کے پکڑنے کیلئے جال نہ بنے۔"

فتوحات کی رست دخیز میں وزیگاتھ کی کتاب القضاۃ گم ہوگئی تھی مگر مسلمانوں نے اُسے ڈھونڈ ھ نکالا اور آئندہ نسلوں کے واسطے۔۔۔ جب دارالخلافۂ اسلامی پر فرڈی نینڈ نے قبضہ کیا تو عیسائیوں کے ہاتھ لگی اور بعد میں قشتالی زبان میں اُس کا ترجمہ کرلیا گیا۔

ایرین سلاطین تخت پر رہے اُن کے مذہبی خیالات کی کسی نے پرسش نہ کی، اور اُن کے طریق عبادت میں کسی نے دخل نہیں دیا۔ مگر جیسے ہی قوم ایرین نے اپنا مذہب چھوڑا، مقتدایان مذہبی نے اُنکو ستانا شروع کر دیا۔ ۶۱۲ء میں طلیطلہ کی جو کونسل ہوئی وہ محض اب کے لئے منعقد کی گئی تھی کہ ایسی تدابیر سوچی جائیں کہ "یہودیوں کی تعداد کم ہو جائے"؛ کیونکہ اُنکی خوشحالی اور سیاسی اختیارات سے فرقہ پادریان کو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت سے لے کر راڈرک کے ۷۰۹ء میں تخت نشین ہونے تک مذہبی کونسلوں کے قوانین متعلقہ قوم یہود میں وحشیانہ سختی، اور اُنکے متعلق عیسائیوں کی دست اندازی بڑھتی ہی چلی گئی۔ ان تمام دستور العملوں سے بدترین قسم کی ناانصافی اور کینہ توزی ظاہر و ثابت ہوتی ہے۔ مقتدایان مذہب کیتھولک یہ چاہتے تھے کہ یہودی فوراً بلاچون و چرا، کے بجبر و تشدد عیسائی بنا لئے جائیں۔ یہودیوں کو حقوق نہ دینے اور الگ تھلگ رکھنے کو اگر فی المثل مبدا سمجھ لیا جائے تو اُسکی خبر بہت جلد توہین، ایذا رسانی، غلامی اور موت کی صورت میں نکل آئی۔ اس سختی کے ساتھ اُن پر تشدد کئے گئے، اور اسطرح ایذائیں دیگئیں کہ بعض وقت اُنکو دیکھ کے اُس زمانہ کے نیم وحشی اور متعصب آدمی بھی گھبرا اُٹھتے تھے۔ مگر باوجود اسکے کہ ایک باقاعدہ اور مسلسل ایذا جاری رہی، پھر بھی یہ منحوس اور پامال قوم پھلتی پھولتی چلی گئی۔ بادشاہ اور کلیسا کی آتش قہر و غضب کو انھوں نے بیش قرار رشوت کے پانی سے ٹھنڈا کیا، اور درندگان خانقاہ کے منہ کو بڑے بڑے چندے دے کر بند کیا۔ عیسائیوں کے ٹھنڈا ہو جانے کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ اُن کو اس سے چارہ نہ تھا کہ اتنی بڑی سیاست دان اور امور مالی کے ماہروں کو اپنے یہاں باقی رہنے دیں۔ اگرچہ اُن پر ستم توڑنے والے عیسائیوں کی تعداد اُن سے اضعافاً مضاعفہ تھی؛ مگر اُن میں لکھے پڑھے آدمی خال ہی خال تھے، اور یہودیوں میں ہر آدمی دست و قلم تھا۔ یہودیوں کے تفوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اُن میں سے کسی کی آزادی چھین کر بازار میں بیچا جاتا تھا تو اُنکی زیادہ سے زیادہ قیمت پڑتی تھی؛ اور اقوام کے غلاموں کی قیمت قریباً وہی تھی جو ایک گھوڑے یا بیل کی ہو سکتی ہے؛ لیکن کوئی یہودی تین ہزار روپیہ سے کم میں

نہیں آتا تھا۔ قوم وزیگاتھ کے تمام جاگیردار اور رئیس جاہل ہوتے تھے اُس لئے وہ اپنی جائداد کا
انتظام نہ کرسکتے تھے۔ مجبور ہوکر انہیں اپنا داروغہ اور منتظم یہودی ہی رکھنا پڑتا تھا۔ بادشاہ
کو اُن پر خاص طور پر اعتماد ہوتا تھا۔ خزانۂ شاہی بالکل اُنکے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہ
نہایت قابلیت اور اکثر نہایت دیانتداری سے کام کرتے تھے۔ سلطنت اور قوم کے
اہم امور میں خوش کرکے اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ معاملاتِ سیاست میں اُنکی طبیعت حیلہ جو
تو ہوتی ہی تھی، اس لئے وہ غیر ملک کے بڑے سے بڑے سیاست دان سفیر سے اچھی طرح
مقابلہ کرسکتے تھے۔ اُن کی دولت وحشمت اُن کا سیاسی اور تمدنی اقتدار جس کو انہوں نے
اہالی کلیسا کی دشمنی اور قانونی ناقابلیت پر بھی قائم رکھا؛ اُن کا علم وفضل اور بمقابلہ پر خشونت
ٹیوٹن کے اُنکی تہذیب اور اخلاق وآداب امرار کو اپنی طرف نہ صرف مائل ہی کرلیتے تھے بلکہ
اُن کی مزاج میں درخور حاصل کرلیتے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا کہ
برابر کے دوست سے کرتے ہیں نہ کہ اس طرح جیسے کہ اپنے سے کمتر درجہ و رتبہ والے سے۔

سیاسی انتظامات میں درخور کے علاوہ جو قانونی مراعات یہودیوں کو وزیگاتھ
کے ابتدائی زمانہ میں حاصل تھیں اُن سے اُن کی اہمیت بڑھ گئی، اُن کی دولت میں فراوانی ہوگئی
تو وہ اوروں سے کچھ الگ الگ رہنے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ قرون وسطی میں
خود عیسائی یہودیوں سے اختلاط پیدا کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ سلطنت وزیگاتھ میں
ایک عرصۂ بعید تک یہ دستور رہا تھا کہ یہودیوں کو ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک خاص جگہ آباد
کیا جاتا تھا؛ اُن کا حاکم اُن ہی میں سے ایک شخص بنایا جاتا تھا جس کو دیوانی اور فوجداری
اختیارات حاصل ہوتے تھے سوائے اسکے کہ کوئی قوم بھر کا مذہبی مسئلہ ہو یا جہاں اُنکی ذات
سے کسی عیسائی کو نقصان پہونچا ہو وہ ہر طرح آزاد تھے۔ ہر صوبہ کا حاکم سختی کے ساتھ مرکزی نفیسہ کا
انتخاب کیا جاتا تھا۔ قریہ یا قصبہ کے حدود سے باہر کا علاقہ (جو اکثر یہودیوں سے مختص ہوتا تھا)
ایک حاکم اعلیٰ کی زیر نگرانی رہتا تھا، اور یہ عہدہ دار براہِ راست بادشاہ کا جوابدہ ہوتا تھا۔
بہر زمانہ تو ایسا گزرا ہے کہ تمام سلطنت کی اراضی کا سیاہ وسفید بالکلیہ یہودیوں ہی کے
ہاتھ میں تھا۔ چونکہ یہودیوں کا روپیہ مالِ غنیمت سمجھا جاتا تھا اس لئے مہاجنانِ یہود نے سود در سود

تعمیری خوبی اور لطافت بتلائینگے۔ رومیوں کے جوہر دماغی کی یادگار عمارتیں
جو زمانہ قدیم کے وحشیوں کے تباہ کن ہاتھ سے بچ رہی تھیں گنوار فاتحین کو مرعوب کرنیکو
کافی تھیں۔ جزیرہ نمائے سپین میں ان وسیع اور عالیشان عمارات کی کمی نہ تھی۔ وہ دیواریں
جن کے اندر نائب السلطنت بیٹھتے تھے وہ معابد جن میں سے اُن کے معبودوں کے
سامنے سلگائی ہوئی بخورات کی خوشبوئیں اُڑتی تھیں وہ ستون جو اُنکے مکانوں کے
باعث زینت تھے وہ پل جو قابل دید بلند تھے اور وہ تعمیری مشکلات جن کو اُنھوں نے
چٹکیوں میں حل کر لیا ایسے ہیں کہ سوائے رومیوں کے دُنیا بھر کے معمار و مہندس اُن کو
دیکھ کر متحیر رہ جائیں؛ وہ فی الحقیقت ایسے تھے کہ ایک نہایت سرسبز و شاداب صوبہ کی
باعث زینت ہوں۔ معماران وزیگاتھ کے سامنے یہ نمونے تھے۔ گو اُن کو کبھی کہیں
عمارت بنانیکا تجربہ نہ ہوا تھا، لیکن اُن چیزوں کی نقل اُتارنے کا شوق اُن میں پیدا
ہوگیا، جن کو دیکھکر وہ حیران رہ گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے محل شاہی اور گرجا کی بنا
ڈال ہی دی۔ سپین ہمیشہ سے اپنے باشندوں کو دولت و مال سے مالا مال کرتا رہا ہے یہی دولت
اُن کا شوق پورا کرنے کا ذریعہ بنگئی؛ اور جذبات مذہبی کی آگ ہر شخص کے دل میں بھڑک
رہی تھی، اس سے ان کو تشویق ہوئی اور اُنھوں نے عمارات خاص و عام میں اپنی
کاریگری دکھلانیکا قصد کر لیا۔ غلام اور ملازمین بے تعداد موجود ہی تھے اور اُن کی خدمات
حاصل کرنے میں اُن کو ایک لمحہ کی بھی دیر لگنے والی نہ تھی، اس لئے اُنھوں نے باسرع
زمان بڑی بڑی عمارتیں بنا کھڑی کردیں؛ اساقفہ اور رؤسا و پیر نے بڑے بڑے گرجا
تیار کر کے رکھدئے جنکا بیرونی منظر بہت پرہیبت تھا اور اندرون گنوارپن کے ساتھ
بھدی زیب و زینت سے مزین۔ اس میں بہت کچھ عامۃ الناس کا دخل تھا جن کے جذبات
دینداری نے بہت سا مال خرچ کر ڈالا۔ ان گرجاؤں کی قربانگاہوں پر بہت سے گلدان
صندوق ذخائر قندیلیں اور صلیبیں نہایت قیمتی چیزوں کی چڑھائی گئیں جن پر خوبصورت
اور نازک کام کیا ہوا تھا۔ بادشاہان گاتھ کے مذہبی جوش کے ساتھ شاید دنیاوی نمائش
بھی مل گئی تھی کہ اُنھوں نے ایک دوسرے سے منافست کی؛ اور اپنی خواہشات کو

اس طرح پورا کیا کہ ہر ایک نے اپنے پیش رو سے بڑھ جانے کی کوشش کی، اور جس طرح ہو سکا گرجاؤں پر اپنی تمامتر فیاضی کو خرچ کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر بادشاہ کے زمانہ میں نہایت قیمتی تحائف وندور سے گرجا بھر گئے۔ گرجاؤں کی میزیں خالص سونے کی بنی ہوئی مرصع بہ لعل و گوہر و زمرد، جن کی حیرت انگیز خوبصورتی کے حالات مشرقیین کے ذریعہ سے ہم تک پہونچے ہیں، قربانگاہ کے مجمر مرصع بجواہر دبیند ار بادشاہوں نے نذریں چڑھائے۔ بیز نطینیوں کی صنعت وحرفت اور مذاق یہاں تجارتی تعلقات کی وجہ سے، اور بیشتر بادشاہوں کے تحائف، اور دربار ہا قسطنطنیہ اور طلیطلہ کے میل جول سے یہاں پہونچا۔ یہ مذاق اور یہ خوبصورتی زیادہ تر سپین کے گرجاؤں کی زینت، اور گرجاؤں کے برتنوں سے ظاہر ہوتی ہے، اور اس سے کم عامۃ الناس کے مکانوں، برتنوں اور چھوٹی موٹی اور چیزوں سے۔ ہندسی صورتیں اور پھول پتیاں جن کو مسلمانوں نے بہت کچھ فروغ دیا، یقیناً بیشتر یہیں سے لیا تھا) گا تھک سناروں اور معماروں نے اپنا معمول بہ کر لیا۔ انگور، اسکے پتے کلیاں اور پھول، ان کی ہر سجاوٹ میں موجود ہیں۔ ان ہی کو انھوں نے نہایت صنعت سے جوڑا ہے، اور عجیب دلکش حسن پیدا کر دیا ہے۔ گرجاؤں میں روشنی پہونچانے کے لئے انہوں نے یہ انتظام کیا کہ سنگ مرمر کی سلوں کو لیکر ان کو بڑی خوبصورتی سے کھودا، اور پھولوں کے ساتھ ہر جگہ جلیبیں بنائیں۔ اس سے انہوں نے اندرون عمارت کا رعب بھی بڑھا لیا، اور ایک طرح کی دینی شوکت بھی پیدا کر لی۔ یہ ترکیب ایسی تھی کہ جو آجتک ایک طرف تو الیسٹر یاس کے گرجاؤں میں موجود ہے، اور دوسری طرف بعد المشرقین پر قرطبہ کی مسجد میں دکھلائی دیتی ہے۔ اپنے مقابل دشمنوں پر غصہ اور نفرت کے جذبات جیسے ہی کم ہوئے، ویسے ہی فاتحین اپنے رومی مفتوحین کے تجربات سے فائدہ اٹھانے پر مائل ہو گئے، حالانکہ بحالت غصہ انہوں نے اپنا تمامتر انتقام ان لوگوں کی عمارات سے لیا تھا۔ نئی نئی مضبوط، مگر سادہ عمارات، ان لوگوں نے شہر بشہر کھڑی کر دیں۔ جتنی قدیمی عمارات باقی رہ گئی تھیں انکی حفاظت کی؛ چنانچہ رومی عمارات جتنی اس وقت جزیرہ نما اندلس میں ملتی ہیں، وہ قوم وزیگاتھ کی روشن دماغی کی مجسم

وبیّن وبیل ہیں۔

سفید صنعت وحرفت کی تشویق میں وزیگاتھ نے جو کچھ سعی واہتمام کیا اس میں وہ اپنے ٹیوٹن بھائیوں سے بہت ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ پارچہ بافی، شیشہ سازی، ہتھیار بنانا، دھاگا نکالنا اور زیورات تیار کرنا ان کو بخوبی آتا تھا۔ لیکن اُن کے صناعوں نے اپنی کاریگری گرجاؤں کی نذور، مثلاً کپڑے اور برتنوں میں صرف کر دی؛ یہی چیزیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں صوبۂ وتّازار میں طلیطلہ سے چند میل کے فاصلہ پر گذشتہ صدی کے وسط میں اتفاق سے بہت سی چیزیں زمین میں گڑی ہوئی ملی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شنرفیئین حملہ آوروں کو دیکھکر پادریوں نے ان چیزوں کو حفاظت کے خیال سے یہاں دبا دیا ہے اور پھر وہ نکال نہ سکے۔ ان میں بہت سے تاج تھے جو بطور نذر گرجاؤں پر چڑھائے گئے تھے (ان میں سے چند ایسے ہیں جن پر نذر چڑھانے والے کا نام کھدا ہوا ہے) ان کے علاوہ تلواریں، مجمر، صلیب، چراغ دان، چراغ، زنجیر، وغیرہ بھی تھیں۔ یہ تمام چیزیں سونے کی تھیں، اور مرصع بجواہر۔ جن گاؤں والوں کو یہ چیزیں ملی تھیں اُنکی جہالت، خوف اور طمع کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس دفینہ کا نہایت قیمتی حصہ ضائع ہو گیا، لیکن تاج رہ گئے، جو اس وقت فرانس کے ہوٹل ڈی کلونی اور مڈریڈ کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھکر ہم اوائل آٹھویں صدی کے لوگوں کی صنعت وحرفت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب تک یہ چیزیں نہیں نکلی تھیں اُس وقت تک اُن عیسائی اور مسلمان مورخین پر مذاق اُڑایا جاتا تھا، جنہوں نے بادشاہان وزیگاتھ کی دولت اور کثیر التعداد لوٹ کا، جو مسلمانوں کو ملی تھی، حال لکھا ہے۔ ناقدین تاریخ اس کو اُن مورخین کا مبالغہ کہتے تھے؛ کیونکہ فاتح ومفتوح دونوں کی یکساں حالت تھی۔ ان چیزوں کو، جو دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتیں، اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بزنطینی اثر ہے؛ یہ اثر جزیرہ نما اندلس کے کاریگروں پر بہت ہی غالب تھا۔ یہ نہیں ہوا کہ گاتھک قوم کے ختم ہونے سے اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا؛ بلکہ مسلمانوں کی ایجادات پر بھی یہی رنگ چڑھا رہا۔ یہ تاج بد نما ہیں، مگر مضبوط؛ معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر نے اسکا خیال رکھا ہے کہ یہیں

قیمتی چیز لگائی گئی ہے اسی لئے اُن پر بہت کچھ محنت کرنی چاہیئے۔ اُن پر جو کام کیا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے صنّاع مینا کاری بھی جانتے تھے، اُن میں سفالی کا کام بھی ہے جس کو جلا دی گئی ہے، اور بغیر کٹے ہیرے لگائے گئے ہیں۔ غالباً یہ دونوں چیزیں ایک ہی جگہ اس لئے لگائی گئی ہیں تاکہ ایک دوسرے کا مقابلہ ہو سکے۔ ان چیزوں سے جو پھول بنائے گئے ہیں، ان میں پوری احتیاط کی گئی ہے کہ ہر جگہ یکساں فاصلہ پر ہوں۔ ہر ایک کی نوکیں نہایت خوبصورتی سے ملائی گئی ہیں، جس سے اُنکی مشتاقی، اور غیر معمولی کاریگری معلوم ہوتی ہے۔ اسی دفینہ میں ایک اور چیز ملی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن ترصیع اور منبت کاری میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ وہ بڑے بڑے سخت پتھروں کو کھود ڈالتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیگاتھ جواہرات کو بھی خوب پہچانتے تھے، اور اُن پر ایسا کام کرتے تھے کہ جو آجکل کے اٹلی کے کام سے ٹکر کھاتا ہے۔

گاتھک سپین کی صنعت و حرفت اگر غلاموں کی کاریگری اور محنت پر منحصر تھی، تو اُسکی تجارت بالکلیہ غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی۔ وحشیوں کا جوہر دماغی، خشکی میں سختیاں برداشت کرنے میں خوف و ہراس کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا، معاملات تجارت میں بہت ہی سست تھا، طول و طویل دریائی سفر اور اُسکی تکالیف سے ڈرتا تھا۔ زراعت میں البتہ اُس نے بڑی ترقی کی تھی۔ اُن میں بدویت کی جگہ کاشتکاری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اراضی کے متعلق جو قانون تھا اُسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زیادہ اہمیت دیگئی ہے، اور قبضۂ زمین وغیرہ کے متعلق وضعان قوانین کو زیادہ توجہ کرنی پڑی ہے۔ علم ادب میں وزیگاتھ چند ہی کتابوں پر ناز کر سکتے ہیں۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ اُنکے یہاں بالکل ناپید تھا۔ صرف ایک شخص یعنی سان آئی سی ڈورو، باشندۂ اشبیلیہ کا نام ادبی گمنامی سے برو، کار آتا ہے۔ یہی شخص زمانۂ وزیگاتھ کا مایۂ ناز تھا۔ یہ شخص عجیب معجون مرکب تھا، مورخ، مناظر، شارح، عالم علم الٰہیات، اور ولی کامل سب ہی کچھ سمجھا جاتا تھا؛ اُس زمانہ میں وہ بہت ہی بڑا فاضل تھا، کلیسائی کونسلوں میں بڑا حکیم و علامہ سمجھا جاتا تھا؛ اُس کی تصانیف کی ضخامت غالباً تمام سپین کے مصنفین سے زیادہ ہے، متنازعہ فیہ مسائل میں کیتھولک دینداراب تک

اُسی کو مستند سمجھتے" اور اُسی کے فتوے پر عمل کرتے ہیں۔

فنِ طب اول تو پادریوں کے دخل و معقولات سے خراب ہو رہا تھا؛ کیونکہ یہ لوگ بہت سی کرامات دکھلا کر اور تبرکات کے اثرات کا دعوے کر کے اپنا اُلو سیدھا کرتے اور خوب کما لیتے تھے؛ اس پر غضب یہ ہوا کہ جاہلوں کو اس فن سے نفرت تھی اور قانون سازانِ کلیسا نے" محض از راہِ تعصب و حسد اس پر بہت سی قیدیں بھی لگا دی تھیں۔ خواہ کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہوتی کوئی طبیب اُس وقت تک آزاد عورت کو نہ دیکھ سکتا تھا کہ جب تک اُس کا مرد رشتہ دار وہاں موجود نہ ہوتا۔ اگر دورانِ علاج میں مریض کا ضعف بڑھ جاتا تو طبیب پر سخت جرمانہ کیا جاتا؛ اور اگر مریض مرجاتا تو حکیم کو تیمارداروں کے حوالہ کر دیا جاتا کہ جو کچھ چاہیں اُس کے ساتھ سلوک کریں۔ مگر قانون اُس کی تکالیف کے عوض میں طبیب کی اتنی رعایت کرتا تھا کہ وہ قید نہ ہو سکتا تھا؛ البتہ اگر قتلِ عمد کا ثبوت مل جاتا تو پھر معمولی سلوک قانونی ہوتا ہی تھا۔ اُن کو بہت ہی محدود علمِ تشریح ہوتا تھا۔ جراحی کے مبادیات سے بھی اُن کو واقفیت تھی۔ موتیابند کا علاج وہ کامیابی کے ساتھ کر لیتے تھے اُن کی اُجرتِ علاج بروئے قانون مقرر تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ اُن کے تیمارداروں کے درمیان معاہدہ ہو جائے وہ بھی اُن کا حق تھا۔ لیکن اگر مریض اچھا نہ ہوتا تو طبیب اپنی اُجرت پانے کا مستحق نہ تھا۔ اگر وہ علاج میں دانستہ کوتاہی کرتا، یا نقصان پہونچاتا تو اُس پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔

انتہائی عروج میں وزیگاتھ کی سلطنت دادیہار، لائر[23] اور گیرون[24] سے بحر متاثر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں سے جب کچھ علاقہ کلوویس[25] کو دے دیا گیا تو فرانس اور سپین کی قدرتی حدِ فاصل کوہ پائرینیز قائم ہو گئی۔ قوم ٹیوٹانک کا مذاق اور اُن کی روایات قدیمہ یہ تھیں کہ وہ کسی جگہ سکونت اختیار کرنے سے گھبراتے تھے۔ ہر قسم کی محنت، خصوصاً کاشتکاری کو ایک آزاد آدمی اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کے پیشے سابقہ رعایا روم کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے۔ کئی صدیاں گذرنے پر جب کاشتکاری کے فوائد اُن کو نظر آئے تو یہ تعصب آہستہ آہستہ کم ہوا۔ سلطنت وزیگاتھ میں ہر حالت میں ہر قسم کا محنت و مشقت کا کام

بالکلیہ غلاموں ہی سے لیا جاتا تھا۔ کاریگروں کا مدرسہ قائم کرنے کی رسم ان وحشی فاتحین نے زمانہ قدیم کی نہایت متمدّن قوموں سے لی تھی۔ اس مدرسہ کے طلاب بیشتر غلام ہی ہوا کرتے تھے۔ باپ اپنی صنعت و حرفت اپنے بیٹے کو بتلاتا چلا آتا تھا، اس لئے لامحالہ یہ فرقہ بڑا قیمتی مال سمجھا جاتا تھا۔ ان کاریگروں کی زیادہ تعداد بادشاہ اور کلیسا کی ملکیت ہوتی تھی۔ یہ لوگ بالترتیب خزانچیٔ شاہی اور اسقف کے تحت حکومت ہوتے تھے۔ سناروں کی جس کاریگری کے نمونے وارّ ازار سے نکلے ہیں وہ اُن ہی بدقسمتوں کے ہاتھوں کے ہیں ان ہی چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے صنعت و حرفت میں کتنا بڑا کمال پیدا کر لیا تھا۔

قوم وزیگاتھ میں بے انتہا تکلّف آگیا تھا اور وہ بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے خاندان ذیل سے کہ اب تک اُن کو وحشی کہے چلی جاتی ہے۔ اُن کے محلات سنگ مرمر کے ہوتے تھے۔ اُن کے کمروں کا اثاثہ البیت اور سامان زیب و زینت نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ اُمراء کے کپڑے [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] کا کام ہوتا تھا۔ خواتین شاہی اپنے غسل وغیرہ کے لئے چاندی کے برتن استعمال کرتی تھیں اور نہایت نفیس آئینوں میں جن میں [illegible] جڑے ہوتے تھے اپنے حُسن کا نظارہ کرتی تھیں۔ بادشاہ کے خاصہ گھوڑوں کے چارجامے وغیرہ میں جواہرات ٹنکے ہوتے تھے۔ بادشاہ کے ساتھ سو گاڑیاں رہتی تھیں جن میں نہایت قیمتی سامان لدا رہتا تھا۔ متوسط الحال اور غرباء کی فضول خرچی کی کیفیت تھی کہ اس کی ضرورت واقع ہوئی تھی کہ بذریعہ قانون یہ تحدید کی گئی تھی کہ دولہن کو دولہا کی جائداد سے صرف دسواں حصہ جہیز دیا جائے۔

صرف یہی نہیں تھا کہ وزیگاتھ اپنی عمارات ہی رومیوں کی وضع پر بناتے ہوں بلکہ اُن کی ہر تراش خراش پر مفتوحین کا اثر بہت ہی زیادہ نظر آتا تھا۔ مختلف فوجوں کا تمام و کمال انتظام رومیوں کا سا تھا۔ اُن کے تمام اشغال تفریح اور کھیل کود باستثنائے شمشیر زنی کے کرتبوں کے وہی تھے جن کو دیکھ کر روم اور قسطنطنیہ کے لوگ خوش ہوتے تھے۔ رعایا کا لباس اور فوجوں کے اسلحہ رومی تھے۔ خواتین کے زیورات، بادشاہوں کے طغرے اور گرجاؤں کی

زبان اُنش بیزنطینی تھی۔ عام لوگوں کی زبان مسخ شدہ گنواری لاطینی تھی۔ مخالف و متناقض اقوام کا بے میل جول، فاتح و مفتوح کا اختلاط آج کل ایسے مسائل ہیں کہ جنہوں نے بڑے بڑے جلیل القدر روشن دماغوں کو پریشان کر رکھا ہے مگر وزیگا تھ بادشاہوں کے فہم و فراست نے اس کو بڑی خوبصورتی سے حل کر لیا تھا ایک عام وردی، اور ایک خاص قانون نے یہ معاملہ نہایت آسانی کے ساتھ طے کر دیا۔ خالص مذہب عیسائی کو قومی و شاہی مذہب بنا لینے، مختلف اقوام باشندگان جزیرہ نما کے آپس کی شادیوں کو قانوناً جائز قرار دیدینے، ذات پات کے بیہودہ حدّ فاصل کو توڑ دینے کے میلان نے مختلف اقوام اور مختلف عناصر کے اتحاد کو مکمل کرنے میں بہت بڑی مدد دی۔ آئبیریا میں باسک قوم کے لوگ بہت زیادہ تھے؛ چونکہ ان لوگوں نے دربار طلیطلہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی اس لیئے انہوں نے اپنی قومیت کو قائم رکھا، اور اپنی ان خصوصیات [illegible] نہ ہونے دیا، جن پر صدیوں سے عالمان نسل [illegible] بعض [illegible] تو ایسی ہیں کہ جن [illegible] چلتے ہیں، اور بعض میں تناقض ہے؛ اگر ایک آرین [illegible] نسل کے۔ تاریخ عالم میں یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ یورپ [illegible] یہ دونوں قومیں تلواریں کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ ان دونوں میں ہمیشہ سے ایسا تخالف چلا آتا ہے کہ کسی طرح نہ مٹ سکا، دونوں کسی وقت بھی ایک دوسرے سے گلے نہ ملے۔ دنیا کے جس حصہ پر ایک نے عروج پایا، دوسرے نے یا تو صرف اپنا امتیاز ہی قائم رکھا، یا رفتہ رفتہ فنا ہو گئے۔ سیاسی ضروریات کا خیال، الہام کا دعوے، تجارتی فوائد، یہ امید کہ انجام کار دونوں میں قومی اتحاد اور تمدنی مساوات ہو جائے گی اتنے کافی نہ تھے کہ باہمی دشمنی کے اثرات کو مٹا دیتے، جیسا کہ زمانۂ قدیم کی تمام قوموں میں ہوا۔ صحرانشین اقوام کی رسموں کی نسبت تو مشہور ہے کہ وہ کبھی نہیں بدلتیں؛ بعض وقت اگر وہ کوئی پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تو اُن کو اپنی سکونت بدلنی پڑتی ہے۔ یہاں ان کو نئی چیزیں ملتی ہیں، نئے اثرات پڑتے ہیں، اور نئے تمدن سے واسطہ ہوتا ہے۔ گاتھ اور عرب

دونوں اپنی بھیڑ بکریوں کے گلّے ہی کے ہو رہے تھے، مگر انہوں نے چرواہے کی لاٹھی چھوڑ کر قزاقی کا نیزہ ہاتھ میں لے لینے سے کبھی تامّل نہیں کیا۔ دونوں میں جنگ جوئی اور خونخواری کا مادہ اُن کے تمام جذبات پر غالب تھا۔ لیری او بہادری دونوں کو محبوب تھی۔ دونوں اس کو بہت بڑی صفت سمجھتے تھے۔ دونوں کے نزدیک شخصی آزادی، ذاتی عزت اور قبائلی مہمان نوازی نہایت عظیم الشان خوبیاں تھیں۔ دونوں میں سستی عادت ثانیہ تھی۔ دونوں کی ہستی بے قرار و بے ثبات تھی۔ دونوں اپنی قوّتِ بازو پر اتنے مغرور تھے کہ کسی بادشاہ کے مطیع ہو کر نہ رہنا چاہتے تھے۔ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ صنعت و حرفت کا پیشہ مردانگی کے خلاف ہے۔ دونوں کے مذہبوں میں بہت ہی بری طرح کی قابلِ نفرت بُت پرستی ملی ہوئی تھی۔ دونوں پتھروں کو پوجتے تھے، خاص خاص بتوں کو سجدے کرتے تھے [illegible] کی قربانیاں چڑھاتے تھے۔ دونوں سخت شراب خوار تھے، اور بے جگر قمار باز [illegible] پر لگا دیتے تھے۔ دونوں کی بستیوں میں گالی گلوچ [illegible] سے ہوتا تھا۔ دونوں کسی اراضی پر قبضہ [illegible] او منقولہ بھی بہت ہی کم رکھتے تھے، صنعت و حرفت [illegible] پڑھنے سے بے بہرہ۔ دونوں وحشیوں کی طرح بیماری اور دیوانگی کو بھوت پریت کے سایہ یا دیو کے حلول کے باعث سے سمجھتے تھے۔ دونوں شاعری پر جان دیتے تھے اور نظم اُن کی طبیعت ثانیہ تھی۔ دونوں بھاٹوں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ گویا پیغمبر ہیں۔ یہ تو وہ خصوصیات تھیں جو دونوں میں متحد تھیں، حالانکہ دونوں کے وطنوں میں اٹھارہ سو میل کا فصل تھا، ایک کو دوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا، اور دونوں کے وطنوں کی آب و ہوا میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ بالٹک کی آب و ہوا اگر بارد و مرطوب تھی تو عرب کی اتنی گرم اور خشک کہ ناقابلِ برداشت۔ مشرقی یورپ میں گھنے جنگل ہی جنگل تھے جن میں دریا بہتے تھے اور جا بجا دلدلیں۔ صحرائے عرب میں کوئی چیز ایسی نایاب نہ تھی جیسی کہ درخت اور پانی گا نتھ اور عربوں کی جسمانی ساخت میں بھی اپنی اپنی آب و ہوا اور گرد و پیش کی چیزوں کا اثر تھا۔ یہی کیفیت دونوں کے دماغوں کی تھی۔ متقدم الذکر بڑے تند آور اور دیوتن ہوتے تھے۔

اور اُن کی رنگت بھی گوری تھی۔ مؤخر الذکر دُبلے تھے اور ناتواں اور رنگت کے کالے۔
گاتھوں میں عورتوں کی عفت و عصمت کا بے انتہا خیال رکھا جاتا تھا، عربوں میں اُن پر
مذاق اڑایا جاتا تھا، آوازے کسے جاتے تھے اور ہجویں کہی جاتی تھیں۔ گاتھ ایک ہی
شادی کرتے تھے، اور دلاوری دکھلانی اُن کی تفریح تھی۔ عرب کئی کئی شادیاں کرتے تھے
اور عورتوں سے مشغول رہنے میں اُن کو وہی لطف آتا تھا جو لڑائی کے جوش میں۔ گاتھ
نے سب سے پہلے دین مسیحی قبول کیا، اور بڑے دیندار عیسائی بنے۔ عرب مسیح (علیٰ نبینا وعلیہ السلام)
کی الوہیت سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، نہ اُنھوں نے کبھی انجیل کی اولیت و فضیلت کو مانا۔
وہ شجاعت جس پر کبھی کوئی غالب نہیں آسکا، اُس کو سہارا ملا افلاس اور سادہ
زندگی کا، یورپ کے جنگلوں میں اُسی نمود اور اُسی کامیابی کے ساتھ ظاہر ہوئی جیسی کہ افریقہ کے
میدان میں۔ یہی وہ زبردست ہتھیار تھا جس سے ان دونوں عظیم الشان قوموں نے اپنے
دشمنوں پر تفوق حاصل کیا۔ جو کچھ اُنھوں نے اس ذریعہ سے حاصل کیا تھا وہ باہمی تنازعات
قبائل کی عصبیت اور تمدنی خرابی و بدو باتی کے راہ رفتہ رفتہ کھو دیا۔ لیکن یہ تنزل رفتہ
تک نہیں ہوا کہ جب تک اُنھوں نے اپنی اخلاقی اور طبعی فضیلت کا سکہ اپنے ہمعصروں پر
اتنا نہ بٹھا لیا کہ اُنھوں نے اور اُن کی آئندہ نسلوں نے اُن کا تتبع نہ کیا۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیگاتھ کے جذبات ابتدا ہی سے ایسے تھے کہ وہ ترقی
کرنے والے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا ترقی کی طرف میلان اور تہذیب و تمدن کی برکات سے
مستفیض ہونے کے خیال نے تجارتی تحریک اُن میں پیدا کر دی اور صنعت و حرفت کا ایک
نیا میدان اُن کے پیش نظر کر دیا۔ اُن میں سائنس کو ترقی دینے، عدل و انصاف کرنے
اور خونخواری اور جرائم کو چھوڑ دینے کا شوق پیدا ہو گیا۔ گاتھک انتظامات کی خوبی، اور
اُن کے قوانین کی انصاف پسندی ایسی قوم کی بہت ہی اچھی اور قابل تقلید مثال ہے
کہ جو بغیر کسی کی امداد کے عروج پر پہونچ گئی ہو۔ یہ قوم وہ تھی کہ (قطع نظر اس کے کہ اُن کی
پرانی تاریخ ایک پُر لطف آپ بیتی کہانی ہے) بنی نوع انسان اُس کو شکر گذاری کے ساتھ
یاد کرے۔ کیونکہ اُس نے یورپ کے تمدن اور سیاست پر نہایت مفید اثر ڈالا ہے۔

اور اس نے ایسے دستورالعمل بنائے ہیں کہ جن کی خوبیوں اور جن کے اصول کا صدیوں کے تجربہ کے بعد بھی آج تک مہذب دنیا کے لوگ تتبع کرتے ہیں ؛

تعلیقات

باب چہارم

(۱) **تھیوڈورک** = THEODORIC۔ اعظم مشرقی گاتھک سلطنت کا بانی ہوا ہے۔ اٹلی، سسلی، جنوبی مشرقی گال، رھیشیا، نوریکم، پینونیا اور ڈلیماشیا اس کے زیرنگین تھے۔ ۴۵۵ء میں پیدا ہوا۔ مدتوں مشرقی روم میں بطور یرغمال رہا۔ یہاں اس نے مردانہ کھیلوں اور ہتھیاروں کے استعمال میں کمال حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی وحشی اور جنگ جو اقوام کا بادشاہ بننے کے قابل ہوگیا۔ ۴۷۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس سے پہلے گاتھوں نے کچھ اور علاقے فتح کرلئے تھے۔ اس نے تھسلی اور مقدونیہ کو بھی فتح کیا اور دوسرے سال دارالسلطنت پر فوج کشی کی۔ اس کے کارنامے سننے کے قابل ہیں۔ اپنے ملک میں امن وامان قائم رکھا۔ زراعت و تجارت وصنعت کو ترقی دی۔ خود لاولد مرا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی تخت پر بیٹھی۔ (مترجم)

(۲) **گال** = GAUL۔ فرانس کے ایک بڑے علاقہ کا نام ہے۔ اس کے حدود اربعہ کی تفصیل کرنی ہمارے مقصود سے خارج ہے۔ اس علاقہ کے باشندوں کو بھی گال ہی کہتے تھے۔ یہ لوگ سیلٹک CELTIC قوم سے تعلق رکھتے تھے، جو آرین نسل سے تھے۔ اس قوم کی تاریخ گویا گال کی تاریخ ہے۔ ابتداءً ان کی تاریخ راہبوں نے لکھی تھی، جو افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اصل یہ ہے کہ فرانس کے اصلی باشندے گال ہی تھے۔ اس کے کئی حصے تھے۔ ان میں سے ایک پر اہالی رومہ قابض ہوگئے تھے۔ گال کی بہت سی اقوام لومبارڈی میں جاکر آباد ہوگئی تھیں۔ ان میں سے کچھ سپین پہنچ گئے، اور وہاں وہ آیبیریا کے باشندوں میں ضم ہوکر گم ہوگئے۔ کچھ لوگ جنوبی جرمنی پر قابض ہوگئے۔ پھر بوہیمیا کو لیتے ہوئے ڈینیوب کے کنارے کنارے تھریس اور یونان پر حملہ آور ہوئے۔ یہ واقعہ ۲۷۸ ق م کا ہے۔ جب وہاں سے نکالے گئے تو ایشیاء کوچک میں جاکر آباد ہوگئے۔ رومیوں کا جب ان لوگوں نے مقابلہ کیا تو وہ یہ مان گئے کہ یہ قوم سخت ترین دشمن ہے چنانچہ ۳۸۹ ق م میں انہوں نے روم کو آگ لگادی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ رومیوں نے ان کو فتح کرلیا۔ ایشیاء کوچک میں جو لوگ جاکر آباد ہوگئے تھے وہ اپنے ہمسایوں کو بہت ستاتے تھے۔ رومیوں نے انہیں بھی فتح کرلیا؛ اور آخر ۲۵ ق م میں ان کے وطن کو رومیوں نے اپنا ایک صوبہ بنالیا۔ اس کے بعد ان کی تاریخ گویا فرانس

کی تاریخ ہے۔

سیلٹک بت پرست تھے۔ ان کے تین بڑے دیوتا تھے۔ تینوں کی پوجا میں آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے دیوتا اور دیویاں بہت تھیں۔ ان کے خرافات الاصنام بھی نہایت دلچسپ ہیں۔

سیلٹک اقوام کا علم ادب الگ تھا۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

(۳) سوے وی = SUEVI۔ جرمنی اقوام میں سے کئی ایک کو اس نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان کا بھی وحشیوں میں شمار ہے۔ ان ہی نے مغربی و شمالی حدود سلطنت رومہ کو تباہ کیا۔ وہاں سے نکل کر برابر بڑھتے ہوئے ۴۰۹ء میں سپین پہونچکر وینڈال کے ساتھ مل کے سپین کو خاک سیاہ کیا۔ جو لوگ وطن میں رہ گئے وہ سوٹزرلینڈ تک پھیلے۔ (مترجم)

(۴) الانی = ALANI۔ حدود ملک روس کی رہنے والی ایک نیم وحشی قوم جس میں چھبیس مختلف بولیاں بولی جاتی تھیں۔ (مترجم)

(۵) ارکیڈیس = ARCADIUS۔ ولد تھیوڈوسی اس بادشاہ روم۔ اسی کے زمانہ میں سلطنت روم کے دو ٹکڑے ہو کر روم مشرقی و مغربی دو سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ شخص روم مشرقی یعنی قسطنطنیہ کا بادشاہ (۳۹۵ سے ۴۰۸ تک) ہوا۔ ۳۸۳ء میں سپین میں پیدا ہوا۔ اس کی سلطنت بحر اڈریاٹک سے لے کر دجلہ تک رہی۔ اصل بادشاہ تو دو آدمی تھے، یہ برائے نام بادشاہ مگر عیش و عشرت کا بندہ تھا۔ پھر اُس کی بیوی سلطنت پر حاوی ہو گئی۔ اس کی سلطنت پر وحشیوں نے حملے کئے، زلزلے آئے اور قحط پڑا۔ مگر بادشاہ اپنی عیش ہی میں منہمک رہا۔ (مترجم)

(۶) الونریس = HONORIUS۔ ارکیڈیس مذکورۂ بالا کا بھائی ہے۔ جب سلطنت روم تقسیم ہوئی تو یہ مغربی روم کا بادشاہ ہوا۔ باپ کے مرتے اور تخت پر بیٹھنے کے وقت اُس کی عمر دس برس کی تھی۔ اس لئے ایک شخص اس کا سربراہ مقرر ہوا۔ الونریس نے اسی کی بیٹی سے شادی کی۔ اور آخر میں اس کو قتل کر ڈالا حالانکہ اُس وقت اس کے ملک پر وحشیوں کی ایک قوم حملہ آور تھی۔ الارک نے تین مرتبہ روم کا محاصرہ کیا۔ آخر اس سے اپنی بہن بیاہ کر اور ملک کا کچھ حصہ دے کر خلاصی پائی۔ الونریس کمزور اور بیوقوف تھا۔ خوف یا غصہ میں بے رحمی کر گزرتا تھا۔ ۳۸۴ء میں پیدا ہوا اور ۴۲۳ء میں مر گیا۔ (مترجم)

(۷) **پامپے اعظم** = POMPEY THE GREAT - روم کا ایک نہایت ممتاز اور مشہور سپہ سالار تھا۔ ۱۰۶ ق م میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی مملکت کو بہت فائدے پہونچائے بہت سے ملک فتح کر کے دیئے۔ شام، ایشیائے کوچک وغیرہ کو فتح کیا۔ فلسطین کو فتح کر کے یہودیوں کو بہت تنگ کیا۔ تین مرتبہ نہایت شان و شوکت سے روم میں داخل ہوا۔ آخر اس کا ستارہ بھی غروب ہونا شروع ہوا۔ گو ایک مرتبہ پھر تھوڑا سا عروج پایا مگر دربار شاہی کے حاسدوں کا شکار ہو ہی گیا۔ مصر میں بے طرح قتل ہوا۔ (مترجم)

(۸ و ۹) **النس - آسے بیبرس** - مجھے ان کے حالات کہیں نہیں ملے۔ نہ معلوم مصنف علام کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (مترجم)

(۱۰) **وسچولا** = VISTULA - آسٹریا، پولینڈ اور پروشیا کا ایک دریا ہے۔ اس کی لمبائی ۶۱۶ میل ہے۔ ایک جگہ اتنا گہرا ہے کہ چھوٹے موٹے جہاز چل سکتے ہیں۔ (مترجم)

(۱۱) **پے پن** = PEPIN - فرانس کا ایک اقبالمند اور عقیل بادشاہ تھا۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ۷۶۸ء میں مرا۔ (مترجم)

(۱۲) **امراء بلاطی** = PALATINES - اُن امراء کو کہتے ہیں جن کی جاگیر کسی ملک کی سرحد پر ہوتی ہے۔ اور اُن کو انتہائی دیوانی و فوجداری اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ انگلستان میں ان کی مثال لنکاشائر، چیسٹر اور ڈرہم تھے۔ یہ جاگیردار اپنی طرف سے حکام مقرر کرتے تھے۔ (مترجم)

(۱۳) ملعون قرار دینے کے مراسم اور اس کے اثرات جلد سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ نہایت دلچسپ ہیں۔ (مترجم)

(۱۴) **یورک** = EURIC - گاتھوں کا ایک بادشاہ جو پانچویں صدی میں گزرا۔ عقیل اور لائق بادشاہ تھا۔ (مترجم)

(۱۵) **ٹیوٹانک** = TEUTONIC - آریہ نسل کی ایک مجموعہ قوم کو کہتے ہیں۔ اُن کی زبان کا بھی یہی نام ہے۔ ان لوگوں کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو سکینڈی نیویا کی قوم کہلاتی ہے اور جس میں ڈینمارک، سویڈن، ناروے اور آئس لینڈ کے رہنے والے ہیں، دوسرے وہ جو جرمن زبان بولتے ہیں، نیز سوئٹزرلینڈ، ہیدرلینڈ، بیلجیم میں رہتے ہیں۔ انگلستان والوں میں بھی ان کا خون ہے۔ اصلی

ٹیوٹن کا شمار وحشیوں میں ہے، انہوں نے ۱۱۳ ق م میں رومیوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ ۱۰۲ ق م میں شکست کھائی اور قریباً دو لاکھ آدمی میدان میں چھوڑ کر آئے۔ نہایت بہادر قوم تھی۔ (مترجم)

(۱۶) ٹری بون ین = TRIBONIAN۔ چھٹی صدی کا نہایت مشہور قانون ساز تھا اس کے والدین مقدونیہ کے رہنے والے تھے۔ رومی سلطنت میں گو بڑے معزز عہدوں پر ممتاز رہ چکا تھا، مگر اس کی سب سے بڑی شہرت اس کے مخترعہ قوانین کی وجہ سے ہے جو بہت مکمل ہیں۔ ۵۴۵ء میں مرا۔ (مترجم)

(۱۷) سیلک قوانین = SALIC LAWS کئی قوانین کا مجموعہ ہے جو فرانس کے ایک حصہ میں رائج تھا۔ پانچویں صدی میں گنواری لاطینی زبان میں لکھا گیا۔ اس وقت تک لوگ عیسائی نہ ہوئے تھے۔ زیادہ حصہ جرائم کی سزا اور معاوضوں پر مشتمل ہے۔ ایک باب میں وراثت کے قاعدے ہیں اس کے موافق کوئی عورت کسی کے ترکہ میں حصہ نہیں پا سکتی نہ کسی کی وارث بن سکتی ہے۔ چودھویں صدی تک تو اس پر عمل ہوتا رہا۔ بعد میں کسی نے اسکی پروا نہیں کی۔ (مترجم)

(۱۸) اڈولفس = ADOLPHUS۔ سپین کا ایک بادشاہ جو زمانۂ وحشت میں حکمران رہا تھا۔ (مترجم)

(۱۹) بائی ٹی کا = BAETICA۔ سپین کا وہ علاقہ جس میں دریا روادی الکبیر بہتا ہے۔ یہاں کی اُون مشہور تھی۔ (مترجم)

(۲۰) نائی سین مسلک = NICENE CREED۔ مذہب عیسوی کے اصول کا خلاصہ جس کو کونسل آف نائس نے منضبط کر کے ۳۲۵ء میں شائع کیا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ برعکس ایرین کے جو مسیح کو خدا نہیں سمجھتا تھا، مسیح کی اُلوہیت کو قائم کیا جائے۔ (مترجم)

(۲۱) وارّا زر = GUARRAZAR۔ سپین کا ایک قصبہ ہے۔ (مترجم)

(۲۲) سان آئی سی ڈورو = SAN ISIDORO۔ مصنف علام نے خود ان کی تعریف کر دی ہے۔ (مترجم)

باب پنجم

سپین پر حملہ اور فتح

۷۱۰ء سے ۷۱۳ء تک

جزیرہ نمائے سپین کی عام حالت اور اُس کی طبعی کیفیات۔ وہاں کی رعایا کے مختلف طبقے کلیسا کا اقتدار۔ پادشاہانِ وزیگاتھ کے ظلم و ستم۔ وٹیزا کی مہلک پالیسی۔ راڈرک کی تخت نشینی۔ کاونٹ جولین۔ طارق (رحمۃ اللہ علیہ) کا حملہ۔ جنگ وادیٔش۔ اُس کے اہم نتائج۔ مسلمانوں کی ترقیٔ فتوحات۔ موسیٰ ابن نُصیرؒ کی تشریف آوری۔ اُنکی کامیابی۔ فاتحین کو بے انتہا مالِ غنیمت کا ملنا۔ طارق اور موسیٰ (رحمہما اللہ) کا مناقشہ۔ خلیفۂ وقت کی مداخلت۔ گاتھوں کا مطیع ہونا۔ موسیٰ ابن نُصیرؒ کی فتوحاتِ واسعہ کی تدابیر۔ دونوں سپہ سالاروں (موسیٰؒ و طارقؒ) کی دمشق میں طلبی۔ موسیٰؒ کا افریقیہ میں سے فاتحانہ جلوس نکلنا۔ موسیٰؒ کا انجام۔ مسلمانوں کے سپین پر قابض ہونے کے اسباب و نتائج۔

⁂

اسلام میں پیش قدمی کا مادّہ تو تھا ہی؛ اس پر طمع، بلند نظری اور جوشِ مذہبی سے اُسکو ملی مدد؛ وہ بڑا عظموں میں جو اُس کو کامیابی ہوئی، اور اُن پر قبضہ کر بیٹھا، تو اس پر وہ کب قناعت کرنے والا تھا؛ اب اُس نے دنیا بھر کو فتح کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ افریقیہ تو تمام و کمال مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ جنوبی ساحلِ بحرِ شام سے بیزنطینی سلطنت کا ہمیشہ کے واسطے خاتمہ ہو گیا۔ موسیٰ ابن نُصیر کی ترکیبوں اور سپاہیانہ جوہر سے اُن کی فوج اُن پر گرویدہ ہو گئی اور اُنکی تعظیم کرنے لگی۔ یہ فوج بھی وہ تھی کہ جو اب تک مکار و عیار جنگجو سرکش افراد بربر سے مشتمل تھی۔ ان میں سے بہت زیادہ مسلمان ہو چکے تھے؛ مگر اُن سے بھی زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی، جو صحبت کے اثر یا آزادانہ عقاید' یا بلحاظ پالیسی شریعت موسوی کے دلدادہ تھے،

اور سپین کے رہنے والے مظلوم بھائیوں سے رسل و رسائل رکھتے تھے۔ مؤخر الذکر خاموشی
کے ساتھ بیٹھے ہوئے اُن ظلموں پر غور کیا کرتے تھے جو صدیوں سے اُن پر ہو رہے تھے، اور
قناعت کے پردہ میں مصائب کو سہے چلے جاتے تھے، اور اُس کو سلطنت وزیگاتھ کے
دنیاوی اور کلیسائی ظالموں کے حق میں بدشگونی سمجھتے تھے۔ عربی سپہ سالار کی بے چین
للچائی ہوئی نظریں زمانہ قدیم کے بےٹیکا کے شاندار اور دولتمند شہروں پر پڑتی تھیں، اور
اُن کا دل وہاں کی لوٹ کے لئے لوٹا جاتا تھا۔ وہاں کی معمور کانیں، وہاں کی چراگاہیں
جو چوپایوں سے ہر وقت بھری رہتی تھیں، وہاں کے میدان مسطح جس میں نہریں اور دریا رواں
تھے، جہاں ایک نامکمل طریقۂ زراعت سے بھی اتنی پیداوار ہو جاتی تھی کہ مشہور وادی
دریا فرات و نیل کی زرخیزی یاد آجاتی تھی، یہ سب چیزیں ہر وقت اُن کو اپنی طرف کشش
کرتی رہتی تھیں۔ صرف ایک چھوٹی سی آبنائے جو آٹھ میل سے بھی کم مسافت رکھتی تھی، اُن
کی پیشقدمی کی طبعی مانع تھی۔ افریقیہ کی طرف اس کا محافظ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کا گورنر
شاہان وزیگاتھ کا باج گزار تھا۔ اس شخص کی بہادری نے مسلمانوں کے اُن دلیر افسرانِ
فوج کے دانت کھٹے کر رکھے تھے جنہوں نے سبتہ کی اہمیت اور اُس کی مضبوطی کو دیکھکر
کئی مرتبہ سختی کے ساتھ اُس کے لے لینے کی کوشش کی تھی۔ اس چھوٹے سے نوکیلے
قطع آب کو اہالی فونیشیا ایک زمانہ بعید سے جانتے تھے۔ جہلا یہ سمجھتے تھے کہ اسی پر
آباد دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ ٹائر کے باشندے اسکی حفاظت کے متعلق طرح طرح کے افسانے
بنائے ہوئے تھے۔ ساحل سپین پر عین اُس کے مقابل ہرقلیس کا مندر تھا، جس کا برج تانبے
کے پتروں سے جڑا ہوا سونے کی طرح چمکتا تھا، جس کے ملمع شدہ ستون سر بفلک تھے،
اور اس میں صنعت و حرفت، ہمہ و افلاس کی قربانگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ برخلاف اور
بت پرستوں کے معبدوں کے اس میں کوئی مرئی معبود نہ تھا۔ فونیشیا کے ملاح جب
اُس تک پہونچتے تھے تو اُس کو نہایت ادب اور شکرانہ کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ زمانہ
قدیم کی قوموں میں اہالی فونیشیا سب سے زیادہ بحری اقتدار رکھتے تھے، اس مندر کو بھی
اس اقتدار سے قریبی تعلق تھا۔ اُن کی روزافزوں دولت، اُن کی مسلسل صلاح اُن سے

ممالک کے دریافت سے جو اُن کے ہمعصر اور رقیبوں سے اب تک چھپے ہوئے تھے، اُن کے رموز علوم سے، جن کو اُنہوں نے بدقّتِ نظر حاصل کیا، اور چھپائے رکھا تھا، اُس سمندر کو ایک عجیب وابستگی تھی۔ اس خیال سے کہ مجسس اور باہمّت تاجروں سے اس کا جائے وقوع چھپا رہے، اور وہ اُس پر حملہ نہ کرسکیں، اُنہوں نے عجیب عجیب دہمیات پھیلائے اور دہشت انگیز افسانے تراشے ہوئے تھے۔ بظاہر قدرتِ الٰہی نے بھی اُنکی اس ترکیب میں بہت کچھ مدد کی تھی۔ زمانہ قدیم کے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چھوٹا سا قطعِ آب، جو دو سمندروں کو ملاتا ہے، اتنا گہرا ہے کہ جس کی تھاہ نہیں۔ باوجود تلاطمِ امواج اُس کے دونوں طرف کے کنارے یکساں رہتے تھے، نہ گہرے ہوتے تھے نہ اونچے۔ مدّوجزر کی حالت میں بھی موجوں کا زیادہ زور مشرق ہی کی طرف رہتا تھا۔ یہ زور بھی یکساں، اکثر اور ضرور ہوتا تھا۔ چاند کا طلوع و غروب، اور طوفانہائے شدید اُس کی باقاعدہ حرکت پر کوئی اثر نہ ڈالتے تھے۔ اُس زمانہ میں واہمہ پرست لوگ جو یہ کہتے تھے کہ قانونِ اعتدال یہاں کام کرتا ہے، اور قدرتی زور یہاں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، محض اُس مندر اور اُن دیوتاؤں کی برکت سے ہے جن سے وہ منسوب ہے، تو چنداں بلا وجہ نہ کہتے تھے۔ علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس سمندر کے اندر ایک تبرک تھا، یعنی کچھ مقناطیس کا ایک ڈھیر، جو نہ معلوم کس زمانہ میں وہاں لگا یا گیا تھا۔ تاڑی ملاح اُس کو بہت بڑا طلسم سمجھتے تھے۔ (غالباً یہی زمانۂ حال کے قطب نما کا باوا آدم تھا) اسی طلسم نے اُن (اہالی ٹائیر) کا رخ برطانیہ جیسے دور دراز جزیرہ کی طرف کر رکھا تھا اور اُن کو بلا مداخلت غیرے بحری سلطنت عطا کر دی تھی۔ اعتقادِ عام یہ تھا کہ اسی آبشار سے ہو کر خاویہ ازل کو راستہ گیا ہے۔ اس نا معلوم اور دہشتناک خطرہ میں پڑنے کے لئے اگر میلکارث کے بھگت اجازت دیدیتے تھے تو البتہ کوئی اس کا قصد کرسکتا تھا ورنہ مذہباً ممانعت تھی۔ زمانۂ مابعد میں جب رازداری کا پردہ کچھ باریک ہو گیا تو اس علاقہ کے چند باقیات رومیوں کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ اور اہلِ عرب بھی اس کے تفحّص کی طرف مائل ہوئے؛ خاص کر اُس وقت کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ دودھ جیسی سفید لہریں چاندی کی طرح چمکتی ہوئی آتی ہیں اور دو بڑے عظموں کو ملاتی ہوئی نکل جاتی ہیں؛

گویا ایک ہیرے کا نگینہ ہے کہ دو طرف کے سونے کو ملائے ہوئے ہے۔ ایک ایشیائی مورّخ نے بڑی خوبصورتی سے استعارہ و تشبیہ میں اس کو یوں کہا ہے کہ "گویا زمرّد اور نیلم کے بیچ میں ہیرا لگا ہوا ہے کہ جس پر سلطنت کی مُہر کھُدی ہوئی ہے۔"

آٹھویں صدی کے شروع میں سلطنت وزیگاتھ بظاہر زوروں پر تھی اور نہایت مرفہ الحال؛ مگر اُس کی اصلی اور واقعی کمزوری، اعالی کلیسا کی شان و شوکت، اور دربارِ شاہی کے تکلفات اور رعب میں چھپی ہوئی تھی۔ ان ہی نے اس سلطنت کے معائب اور زبونیوں پر بے بودسا نقاب ڈال رکھا تھا۔ خواہشات نفسانی کے غلام، بادشاہانِ وزیگاتھ میں سے اپنے اجداد کی خوبیاں بالکل ختم ہو چکی تھیں، جن کے شجاعت و تہوّر نے اپنی قوم کو سیکڑوں لڑائیوں میں کامگار رکھا، اور بالٹک سے لیکر بحیرہ روم تک اپنے علم کی عزت و شہرت میں کمی نہ آنے دی۔ ریکارڈ اور ویمبا کے جانشین ایسے کمزور مگر ظالم تھے کہ اُن پر لفظ "بادشاہ" کا اطلاق تنازعہ فیہ امر ہے۔ ان کی نفسانیت نے نہ رسوم مہماں نوازی کو قائم رکھا، نہ حقوقِ دوستی کو ملحوظ؛ نہ اپنے رتبہ کو برقرار رکھ سکے؛ نہ اپنی خواہشات نفسانی کے پورا کرنے میں اُنھوں نے سن و سال کی پروا کی۔

ایک سرکش اور مغرور رؤسا و عمائد کا گروہ تھا کہ آئے دن کی خانہ جنگیوں میں، جو ترکۂ پدری کے باعث ہوتی تھیں، لڑتے مرتے چلے جاتے تھے۔ اُن کی الگ الگ فریق بندی ہو رہی تھی۔ ان فریقوں میں اتنی عداوت اور نفرت تھی کہ دشمنوں سے بھی اگر ہوتی تو اتنی ہی ہوتی۔ نہ اُن میں میدانِ جنگ میں آنے کا تجربہ تھا، نہ اتنی تاب و توانائی تھی؛ نہ عزت تھی نہ ایمان؛ نمک حرامی کو جوشِ وفاداری کے پردہ میں چھپائے ہوئے تھے، بہادری کی شیخیاں مارتے تھے۔ وحشیانہ شان و شوکت دکھاتے تھے، اور اپنے آپ کو تخت کے جاں نثار بتلاتے تھے۔ کہاں تو جنگ جویانہ خصائل، اور شمشیر زنی کی عادات تھیں، کہ جنھوں نے کئی صدیوں تک رومی نام و نمود کو قائم رکھا تھا، اور کہاں اُسکی جگہ راہبوں کا مذہبی جوش اور طمع آ گئی۔ جو دغا و فریب اور ظلم و تشدد سے کلیسا کی ناواجب ترقی کو تھامے ہوئے تھی۔ یہ وہ سرکش فرقہ تھا کہ جو اس زمانہ کے علم کا ٹھیکہ دار بنا ہوا تھا؛ اندھے کے

ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی کہ جس نے تلواروں کو بھی کُند کیا ہوا تھا۔ ملک کے تمام سیاسی معاملات اور تدابیر کو اگر ڈھونڈھا جاتا تو محل شاہی میں نہ ملتیں، بلکہ دیروں میں بازیچۂ اطفال بنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ وہ موافق عقل، مسامح اور مطابق زمانہ پالیسی، جو ابتداءً اہالی کلیسا میں تھی، جو مذہبی کو نسلوں کی روح و روان تھی، جس نے قوم کی وحشت کو کم کر کے ایک قسم کی روشن دماغی پیدا کر دی تھی اور جس نے ایسے مبنی بر عدل و انصاف قوانین وضع کئے تھے کہ آئندہ نسلوں نے اُس کا اتباع کیا، ایسے گڑھے میں جا پڑی تھی کہ جہاں سے بیٹھ کر پادری مزعومہ ملحدوں کا شکار کیا کرتے تھے، اور اُن کو لوٹ لوٹ کر بیش قرار فوائد اٹھاتے تھے۔ مغرور اور خود سر کلیسائیانِ وزیگاتھ پوپ کے اقتدار کو نہ مانتے تھے، نہ اُسکے احکام کی حرمت کرتے تھے۔ اول تو پوپ اُنکے دینی معاملات میں کبھی شاذ و نادر ہی دخل دیتا تھا، اور دیتا بھی تھا تو اُسکی صورت ثالث بالخیر یا ناصحًا یا نیاً منذر ہوتی تھی، نہ کہ ایسے بادشاہ کی سی کہ جسکے ہاتھ میں تمام مسیحی دُنیا کی روحانی سلطنت کی عنان حکومت تھی، یا نائب مناب خدا تھا۔ اُسقفِ سپین نے پوپ کے خطاب اور اُسکے اختیارات کو بھی غصب کر رکھا تھا۔ اُسکے بریٔ عن الخطا ہونے پر نہ صرف بڑے بڑے ذی رُتبہ پادری بھی شک کرتے تھے، جنکے مواعیظ پوپ کی برابر سمجھے جاتے تھے، بلکہ بادشاہ اور اراکین سلطنت بھی اُس پر مذاق اُڑاتے تھے اور اُسکے اقتدار کو لغو سمجھتے تھے۔ بادشاہ کو منہمکِ منہیات دیکھ کر چھوٹے بڑے تمام پادری اُن ہی خرابیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اسقف کے محل میں ہر روز فساد و عناد کے تماشے نظر آتے تھے اور ہر رات کو شور و شغب کی آوازیں ہاں سے بلند ہوتی تھیں۔ عوام الناس پہلے ہی کہاں کے معصوم تھے، اس کیفیت کو دیکھ کر اور بھی خراب ہوتے چلے جاتے تھے۔ پادریوں اور مقتدایانِ مذہبی کے گھروں کی شرابیں ضرب المثل تھیں۔ اُنکے مکان نہ تھے پری خانہ تھے کہ حسن و جمال اگر کہیں ملتا تھا تو وہیں۔ اس پردہ بیجا طور سے بدنام کئے جاتے تھے اور اُن پر مذاق اُڑایا

جاتا تھا۔ کلیسا اور سلطنت کی حیثیت و حالت یوں منقلب ہوگئی تھی کہ مقدم الذکر نے وضع قانون کے اختیارات موخرالذکر سے بالکل چھین لئے تھے۔ پادری از روء لباس و وضع پادری ضرور تھے، انکا اصلی فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپکو ایک رحم اور برکت مجسم ہستی (علیہ السلام) کے نائب ہوکر فیاضی اور ایثار نفسی دکھلائیں، مگر وہ اتنے گرے تھے کہ سازش کنندہ اور معاملات سیاست میں دخل دینے والا فرقہ بن گئے تھے۔ امراو ارکین سلطنت نے مُردہ بدست زندہ بن کر اپنے آپ کو اُنکے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ اور تمام نظم و نسق سلطنت اُنکے سپرد کر دیا تھا، اور خود، بطریق مداہنت، عابدوں کا نمونہ بن گئے تھے۔ اگر اُنکی اصلی و خانگی زندگی کو دیکھا جاتا تو کیا پادری، اور کیا اُمرا، عیوب اور گناہوں کے ڈھیر تھے کہ جس پر ظاہری ادائگیِ مراسم مذہبی کا نہایت باریک پردہ پڑا ہوا تھا ؛

جب سے کہ علم تاریخ کی تدوین ہوئی ہے، یورپ کے کسی ملک کی طرف شجاع و بلند نظر فاتحین کو اتنی کشش نہیں ہوئی، جتنی کہ سپین کی طرف۔ باشندگان ایشیا و یورپ اسی کے سواحل پر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ ہر قسم کے مادی فوائد، جو انسان کو اپنی طرف مائل کریں، بلند نظری کو بڑھائیں، دولت میں ترقی دیں، آرام و آسائش کی امید دلائیں، ضروریات کی کفیل ہوں، عیش و نشاط کا موجب ہوں، سپین میں موجود تھے۔ اُسکے جنوبی صوبوں میں بحر اطلانطک اور بحر شام کی خوشگوار اور صحت بخش ہوائیں چلتی رہتی تھیں، کوہستان و صحرا میں دریاؤں اور ندیوں کا جال بچھا ہوا تھا، اور سبزہ سے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ وہاں کے قدرتی سدا بہار باغوں میں انواع و اقسام میووں کا کبھی ختم نہ ہونے والا ذخیرہ تھا۔ سپین کی کانیں اقوام فونیشیا، قرطاجنہ، روم، وینڈال اور گاتھ کو مالا مال کر چکی تھیں۔ اُسکے چاندی اور سونے نے بابل کے تخت کو جگمگایا، تایر کے مندروں کو آراستہ کیا، ممفس کے محلوں کو سجایا اور یروشلم کے معبد کو زینت دی، اُسکے

ساحل چونکہ ہرطرف سے ہموار تھے اسلئے وہاں نہایت آسانی کے ساتھ محفوظ بندر بن
سکتے تھے۔ قوم گاتھ اپنے وحشیانہ پن سے گو محنت ومشقت کو عار سمجھتے تھے، مگر زراعت
کی اہمیت کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ جو علاقے تخت گاہ کے قریب تھے وہ جاگیرداروں کے
قبضہ میں تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار ایک خاص رقم مقررہ اپنے مزارعین سے بطور
لگان وصول کرلیتے تھے۔ شاذونادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اگر کسی آفت ارضی وسماوی
سے فصلیں پیدا نہ ہوتیں، یا کسی شاہی، یا خانگی مصیبت کی وجہ سے پیداوار کم ہوتی تو
یہ لگان معاف یا کم کردیا جاتا تھا۔ غریب مزارعین کی مثال بالکل چوب مسجد کی سی تھی،
وہ تمام عمر، بلکہ اُنکی اولاد در اولاد ایک ہی جاگیردار کے ہو رہتے تھے، اور کہیں اور
منتقل نہ ہوسکتے تھے۔ اُنکی حالت بالکل غلاموں کی سی ہوتی تھی، گو ازروءِ قانونِ
گاتھ اُنکو اُن بدقسمتوں سے تو بہتر ہونا چاہیئے تھا جو بازاروں میں عام جانوروں کی
طرح فروخت ہوسکتے تھے۔ ان ہی دونوں بدنصیب فرقوں سے، جو پہلے ہی محنت و
مشقت اور آئے دن کے ظلموں سے بے دم ہوئے ہوتے تھے، فوج مرتب ہوتی
تھی، اور اُن سے یہ امید رکھی جاتی تھی کہ وہ اپنے ظالم آقاؤں کی سلطنت کو بحال،
اور اپنی ذلت وغلامی کو قائم رکھیں گے۔ آخر زمانہ گاتھ میں جو قوانین وضع ہوئے تھے
اُنکے موافق غلاموں کی حالت اُس سے بھی بدتر ہوگئی جو رومیوں کے زمانہ میں تھی۔
موخرالذکر کے قانون کے رُو سے یہ تو نہ تھا کہ حفاظت جان ومال کے بدلے میں لوگوں کو
جسمانی محنت کرنی پڑتی ہو، مگر ٹیوٹانک مراسم کے موافق یہ بوجھ پڑنا لازمی تھا۔ جرمنی
اصول قانون کے موافق تو یہ مصیبت لازمی تھی، مگر آخر آخر کے بادشاہان گاتھ نے کچھ
نرمی کردی تھی۔ لیکن بہرکیف یہ خدمت جبریہ تھی اور نسلاً بعد نسلٍ بھی اس سے رہائی نہ ہوسکتی
تھی۔ اس سے لوگوں کی حالت اور بھی نازک ہوئی چلی جاتی تھی۔ شادی بیاہ کے متعلق
قیود تھیں، اہل وعیال کو الگ رکھنا پڑتا تھا، چھوٹے چھوٹے جرائم پر سخت سزائیں دی

جاتی تھیں، ان سب سے اُنکی ذلتیں اور بھی بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ایریٔن مصایب تو موجود تھے ہی مگر غلامی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا، اور انکی حالت میں کچھ نہ کچھ ترقی ہو گئی تھی۔ اساقفہ، براہ فیاضی و مراحم دینی، اتنا ضرور کرتے تھے کہ وہ اُن بدنصیبوں پر ہر قسم کی مہربانیاں دکھلاتے تھے، اُنکی مشقتوں کو کم کرا دیتے تھے، اُنکی نمک حلالی اور وفاداری پر انعامات دیتے تھے، بیماروں کی تیمارداری کرتے تھے، مصیبت زدوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ غلام بیچارے اس دھوکے میں پھنسے رہتے تھے کہ اُن سے رعایت کیجاتی اور اُن پر مہربانیاں ہوتی ہیں، اور اب کوئی دن جاتا ہے کہ وہ آزاد ہو جائینگے، اور مہلکات سے نجات پائینگے۔ پادری اُنکی امیدوں پر اور بھی گندہ پردہ ڈالتے تھے، اور گرجاؤں کے ممبروں پر کھڑے ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ "غلامی ازروۓ احکام انجیل ناجائز ہے"۔ مگر ان بدنصیبوں کی یہ امید کبھی بھی بر نہ آئی۔ جب کلیسائیوں کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ وہ بادشاہ کو منتخب کرنے لگے، اور سلطنت کے تمام معاملات سیاست اُن کے ہاتھ میں آ گئے، تو ان دینی مقتداؤں اور سیاست دانوں کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کے ان تمام اصول مراحم، اور اُن تمام وعدہ و وعید کو بھول جائیں، جو پہلے دکھلاتے اور کرتے رہے تھے۔ جب انہوں نے اصلی دین مسیحی کو قبول کر لیا تو مشقت کی مصیبت اتنی بڑھ گئی کہ جسکی مثال نہیں ملتی۔ علوۓ مرتبہ، تقدیس اور کلیسا کی عملی طور پر خود مختاری نے ظلم اور لالچ کا ایک اور راستہ کھول دیا۔ اساقفہ کے ماتحتین جاہ و جلال کے ساتھ نکلتے تھے اور گرجاؤں میں جا کر مراسم مذہبی ادا کرتے تھے۔ اُن کے جلو میں جو لوگ ہوتے تھے۔ اُنکی وردیاں ریشمین ہوتی تھیں اور اُن پر سنہرا کام بنا ہوتا تھا۔ اُن کے مکانوں کی شان و شوکت اور انکا جلوس بادشاہوں سے بھی بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ سلطنت بھر میں اُن کی جاگیریں وسیع اور ایسی سیر حاصل ہوتی تھیں کہ شاہی صرف خاص کی جاگیریں بھی ایسی نہ تھیں۔ ان جاگیروں پر ہزار ہا غلام تعینات تھے، نہ صرف اسلیئے کہ زراعت کریں، بلکہ اسواسطے کہ بہترین اشیاء پیدا کریں

جو اُس زمانہ میں مل سکتی، اور ان دینی جاگیرداروں کی عیش و عشرت اور تکلفات کو بڑھا سکتی تھیں۔ ان بد قسمت مزدوروں کی مشقت روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، اور آزادی کی امیدیں، جس کا انتظار وہ نسلوں سے کرتے چلے آتے تھے، گھٹتی چلی جاتی تھیں۔ بلکہ اب تو بالکل باقی ہی نہ رہ گئی تھیں، اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ جو ناقابل برداشت بوجھ اُن پر ڈالا جا چکا وہ قیامت تک ہلکا ہونے والا نہیں ہے۔ مزارعین اور غلاموں کے علاوہ ایک اور فرقہ تھا، جسکی تعداد دونوں سے کم تھی، لیکن از روئے اصل و نسل و بروئے قانون وہ دوامی غلام تھے۔ اتنی بات اُن میں زیادہ تھی کہ وہ دونوں سے زیادہ عقیل و فہیم تھے اور ہوشیاری و چالاکی میں دونوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ فرقہ یہودیوں کا تھا۔ تیرھویں دینی کونسل کے ایک ناطق حکم کے موافق اُن کی تمام جایدادیں ضبط کر لی گئی تھیں، اور اُنکو با مشقت غلامی کی سزا دی گئی تھی۔ اس فرقہ کے ایک لاکھ نفوس جنکے سینوں میں سخت نفرت کی آگ سلگ رہی تھی، جنکی زندگی ہی کئی نسلوں سے مصیبت میں کٹ رہی تھی، اور جن پر بے طرح شکنجہ میں کسے جانے کی وہ آفت تھی کہ جو ہر طرح سیاسی مصلحت کے اقتضاء کے خلاف تھی۔ یہ ایک لاکھ آدمی رعایا کا ایسا عنصر تھا کہ جو اُس غیر قانع اور مصیبت زدہ آبادی سے بھی زیادہ مخدوش و مدہش تھا، کہ جس سے وزیگاتھ سلطنت کا تار و پود تھا۔ تفوق قومی کے خیالات، جو تین ہزار برس سے وہ لگائے بیٹھے تھے، اور اب خود مختار سلطنت اور مغرور پادریوں کی آفت کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئے تھے، یہودیوں میں اور بھی ترقی پذیر تھے۔ اُس زمانہ کی تاریخیں کچھ ایسی ناقص ہیں کہ ہم اُن سے یہ استنباط نہیں کر سکتے کہ یہودیوں کے خلاف جو قانون بنائے گئے تھے، وہ کتنے سخت تھے۔ غالب خیال یہ ہے کہ شہروں میں، جہاں عقیل و فہیم لوگ زیادہ رہتے ہیں، اور جہاں انصاف کی زیادہ توقع کیجا سکتی ہے، ان قوانین پر سختی کے ساتھ عمل ہوتا ہوگا، لیکن قصبوں اور گاؤں میں پادریوں کے جوش مذہبی اور حسد و عناد نے یہودیوں پر ہر طرح کی سختیاں ڈال

رکھی تھیں، اور اُن کی سخت بے عزتی ہوتی تھی۔ یہ ضرور ہوتا ہوگا کہ امرا کے حاشیہ نشین اور مشیر جو اُن کے ساتھ ہی محلوں میں رہ کر اپنے آقاؤں کی سستی، نالیاقتی اور ناتجربہ کاری کا بدل ماتحمل کرتے رہتے تھے، ان مصیبت زدوں کی طرف اُنکو متوجہ کرتے تھے، مگر سنتا کون تھا۔ عام جہلا کے نزدیک کسی غیر قوم کا دولت جمع کرنا اور سیاسی معاملات میں دخل دینا ہمیشہ ناقابل معافی جرم تھا۔ ہر موقعہ پر پادری اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے آپس کے نفاق وشقاق کو بڑھاتے رہتے تھے اور اسکو دینی ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ اُن سے جس طرح ممکن ہوتا تھا وہ آریہ اور سامی نسلوں کو ہمیشہ برسر فساد وعناد دیکھنا چاہتے تھے۔ (۴) وجہ تھی کہ وہ یہودیوں سے تعصب کرتے اور اُن کو مصیبت میں پھنسائے رہتے تھے۔ ان خیالات میں اس وجہ سے اور بھی ترقی ہوئی کہ سپین میں یہ روایت مشہور تھی۔ کہ یہودھی گلڈ کے زمانہ میں یہودیوں نے علے الاعلان بے ایمان پادریوں کے ہاتھ سے رومن کیتھولک مذہب والوں کو تنگ کرایا تھا۔ ان وجوہ سے مسلمانوں کے قبضۂ سپین میں یہودیوں نے جو کام کیا ہے۔ اُسکو کچھ بڑی اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی، اور تھے بھی بلند نظر، ریاکاری میں اُنکو کمال حاصل تھا، صدیوں کے مظالم سے یہ ناراض بھی تھے، وزیگاتھ کی سلطنت نے اُن کے دلوں میں اور بھی آگ لگا رکھی تھی، بغیر ان لوگوں کے خبریں دیئے عرب حملہ کرنے کا کبھی ارادہ نہ کر سکتے تھے۔ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اگر وہ مدد نہ کرتے، اور ان کے ساتھ نہ مل جاتے، تو یہ ممکن نہ تھا کہ چند ماہ کے عرصہ میں صرف مٹھی بھر آدمی، جو فنون جنگ سے بھی ناواقف تھے، ساٹھ لاکھ آدمیوں کو زیر کر لیتے ؛

کسی قوم نے مذہبی مقتداؤں کے ماتحت رہ کر صلاح وفلاح نہیں پائی۔ رعایا کی حفاظت اور خوشحالی کے لئے سب سے ضروری اور لازمی بات یہ ہے کہ مقتدایان مذہبی کی طاقت اور اختیارات کو اتنا نہ بڑھایا جائے کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہو جائیں۔ اہالی کلیسا

کی تنگ چشمانہ پالیسی اور اُنکے اختیارات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم برباد اور بے حرمت ہوجاتی ہے۔یہیں کی مثال لیجئے سپین کے لوگوں کو بہترین اور سرسبز ترین جائداد اور وراثت سے آٹھ سو برس تک ان حضرات نے محروم رکھا۔خاندان الیسٹریاس کے بادشاہوں میں یہ قابلیت نہ تھی کہ وہ اپنے پیشرو بادشاہوں سے فائدہ اُٹھائیں اُنہوں نے تنبیہات تاریخ کی طرف سے بالکل اپنے کان بند کر رکھے تھے۔اُنہوں نے بھی ایسی ہی بے احتیاطیاں اور حماقتیں دکھلا کر تاج وتخت سپین کو سیاسی تفوق نہ حاصل ہونے دیا۔

اواخر صدی ہفتم اور اوائل صدی ہشتم کی تاریخ سپین غیر معمولی طور پر ظلمات کے دھندلکے میں پھنسی ہوئی ہے۔یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں سیاسی اور تمدنی مصائب ملک بھر پر پڑے ہوئے تھے۔ نمک حرامی اور بادشاہ کشی سے اب تک قوم گاتھ بالکل محفوظ رہی تھی، لیکن اس زمانہ میں یہ کیفیت تھی کہ ہر بلند نظر رئیس، جو خود تخت پر بیٹھنا چاہتا تھا، اسکو قابل معافی سمجھتا تھا۔یہ نمک حرام بہت کچھ پادریوں کی امداد پر بھروسہ کرتے تھے، مگر اُن کو جو کچھ امداد مل سکتی تھی وہ بقدر اُس اعانت کے ہوتی تھی جو وہ خزانہ کلیسا میں جمع کر سکتے تھے۔جب یہ روپیہ پادریوں کی مرضی کے موافق جمع ہو چکتا تھا تو پھر کوئی جرم، خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہوتا، جرم نہیں گنا جاتا تھا۔سب سے پہلے تمام پادریوں کی رائیں اس غدار کے حق میں حاصل کر لی جاتی تھیں، اسکے بعد اُن لوگوں پر جو بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک نہ ہوتے، مقدس کونسل کی طرف سے پے در پے لعنتوں کا نزول ہونے لگتا تھا۔اگر کوئی تخت شاہی کا خواہشمند قتل وغارت کے منظر دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا ہو تو ہر قسم کے دغا وفریب قابل معافی ہوجاتے تھے۔ اگر اس میں کامیابی ہوجاتی تو کلیسا اپنا حق رکھوا لیتا تھا۔غرض ٹیوٹانک نسل کے نمک حلال، بہادر اور فیاض لوگ ذلت کے اتنے گہرے

گڑھے میں پڑے ہوئے تھے!

سلطنت وزیگاتھ کی عظمت ویمبا* کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ اس قوم کا سب سے بڑا بادشاہ وہی تھا، اور اُسی میں ہر قسم کی ظاہری و باطنی خوبیاں موجود تھیں جس ترکیب سے ویمبا کا تخت چھینا گیا اُس سے غاصب جانشین کی دیانت و امانت کی بجاءِ اُس کی ذکاوت و ذہانت زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ اُس کو یہ سزا دی گئی کہ وہ اپنی آخری عمر دیر میں گزارے۔ نئے بادشاہ اروی جی* اس نے اپنے داماد اسے⊗جی زا کو تخت دیا۔ مقدم الاسم کے زمانہ میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ موخرالاسم بادشاہ میں اگرچہ ہمت و استقلال کی مردانہ صفات موجود تھیں، مگر اُس نے اتنے ظلم کیئے کہ اُس کا زمانہ نہایت بدنام ہوگیا۔ دولت حاصل کرنے میں وہ اپنی دُھن کا پکا تھا، مگر اُس کے حصول میں وہ سخت بداحتیاط تھا۔ اُس نے سزاءِ جسمانی کو جرمانہ میں تبدیل کر دیا، اور اسکو حسبِ حیثیت ملزم قرار دیا، اس میں جرم کی نوعیت کا لحاظ نہ تھا چھوٹے چھوٹے بہانوں پر وہ ملزم کو جلا وطن کر دیتے اور اسکی جائداد ضبط کر لیتے تھے ٹیکس بہت بڑھا دیئے۔ اپنے اختیارات کے زعم میں اُنہوں نے جعل بنانے میں بھی تامل نہ کیا، چنانچہ جعلی تحریرات کی بنا پر اُن دولتمندوں کو وہ مجرم گردان لیتے تھے جو اب تک کسی طرح اُن کے قابو میں نہ آتے تھے۔ ان پر ہمیشہ تخت و تاج کے برخلاف مقدمے بنلائے جاتے تھے سب سے زیادہ خرابی یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی بہانے سے کلیسا کے خزانے پر بھی ہاتھ صاف کرتے تھے۔ بے اصول اور ظالم پادری اسکو تو گوارا کر لیتے تھے کہ عوام الناس لوٹے جائیں، مگر کلیسا کے خزانے کا خالی کرنا تو دوسرا جرم تھا، یعنی بے ادبی اور ظلم۔ اس کو وہ کسی طرح نہ دیکھ سکتے تھے۔ پہلے تو انہوں نے بادشاہ کو بہت کچھ افہام و تفہیم کی، مگر جب اُس کا کچھ نتیجہ نہ دیکھا، اور وہ خزانۂ کلیسا کے لوٹنے سے باز نہ آئے،

EGIZA ⊗ EVIGIUS * WAMBA ×

تو ۶۹۴ئہ میں سیسٹے برٹ* اسقف اعظم طلیطلہ نے اس غرض سے ایک سازش کی کہ بادشاہ اور اُس کے تمام خاندان کو قتل کردیا جائے۔ اس سازش میں اکثر بڑے بڑے امرا و عمائد شامل تھے، مگر اسکے اصل بانیِ کار دار السلطنت کے معزز کلیسائی ہی تھے عین وقت پر اسکی اطلاع بادشاہ کو بھی ہوگئی، اور انہوں نے اس کے خلاف سخت کوششیں کرلیں۔ اسقف اعظم گرفتار کرکے برطرف کردیے گئے، بہت سے سازش کنندہ قتل کئے گئے اور بہت سے جلاوطن۔ یہ سازش ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اُس سے بھی زیادہ سخت ایک اور سازش کا پتہ لگا۔ یہودیوں کی حالت اس بادشاہ، نیز اسکے پیشرو کے زمانہ میں، برسوں سے کسی قدر اچھی ہوگئی تھی، لیکن وہ اس نرمی سے کچھ ممنون نہ ہوئے، اور اپنی پچھلی بے عزتیوں کو یاد کرکے انہوں نے اپنی قوم بھر کو ایک سازش پر متفق کرلیا، بربریوں سے سازوباز کرکے مدد کا وعدہ لے لیا، اور یکایک غدر کرنے کی ٹھان لی، اور یہ قصد کرلیا کہ سپین کے تمام نظامات کو بدل کر اُسکو سلطنت یہودیہ بنا لیا جائے۔ یہ سازش بھی کھل گئی، مگر ایسے موقعہ پر کہ غدر ہونے ہی والا تھا۔ حکام نے اپنی حفاظت کا نہایت سختی کے ساتھ انتظام کرلیا۔ فوراً ایک کونسل منعقد کی گئی، اور اُس کے حکم کے موافق تمام یہودیوں کو جلاوطن، اُن کی جائیدادیں ضبط، اُن کو غلام اور اُن کی اولاد کو چھین لیا گیا۔ مگر ان بے رحمیوں کا ردعمل ہوتے دیکھ کر فوراً ہی اس حکم کی تعمیل کو روک دیا گیا۔ مگر غیر قانع یہودیوں کو کہاں چین تھی۔ ایک تو پرانے ظلم ہر وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتے تھے، دوسرے اس وقت اُن کی سازش کے بار ور نہ ہونے سے بھی اُن کو رنج تھا، بیرونی امداد کی اب تک امید تھی، چنانچہ وہ اپنے افریقی بھائیوں کو سپین کے ہر بدنظمی اور اختلال کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ایجیزا کا زمانہ اندرونی متواتر سیاسی آفات کا قومی مجمع

SISEBERT *

رہا ہی تھا؛ اب یہ غضب ہوا کہ بیرونی حملہ کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ یکایک شرقیئن کا ایک بیڑہ، بہت معقول فوج اور سامان لئے ہوئے سپین کے غیر محفوظ ساحل پر آدھمکا، اور زراعت کو تباہ اور گانووں کو لوٹ کر بہت سے قیدیوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اس خدشہ کے انسداد کے لئے سپین نے بھی ایک بیڑہ، بسرکردگی تھیوڈمیر (تدمیر) روانہ کیا یہ شخص بڑا تجربہ کار اور امرا میں معزز ترین تھا۔ تھیوڈمیر نے بہت ہی جلد شرقیئن کے بیڑے کو جا پکڑا سخت مقابلہ ہوا۔ دشمن کے دو سو جہاز تباہ ہوگئے، یا گرفتار کر لئے گئے؛ اور مسلمانوں کے سب سے پہلے بیڑے سے سمندر پاک صاف کر لیا گیا۔ دوسرے ہی سال فرانس سے لڑائی ہوئی، جس کا باعث معلوم نہیں ہے۔ یہ لڑائی کئی مہینے جاری رہی۔ مگر غیر منظم لڑائی کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے وہی ہوا، یعنی غیر نتیجہ رہی۔ ایجیزا کی عمر اب بہت ہو گئی تھی۔ یہ سمجھ کر کہ اب وہ بار سلطنت اُٹھانے کے ناقابل ہیں، انہوں نے یہ قصد کیا کہ اپنے بیٹے وی ٹی زا (غیطشہ) کو مہام سلطنت میں دخیل کریں، اور ایسی تدابیر عمل میں لائیں کہ اُن کے مرنے کے بعد وہی تخت نشین ہوں۔ چنانچہ اسی غرض سے ایک کونسل منعقد کی گئی؛ اور جب اُنہوں نے اپنا قصد ظاہر کیا تو سب لوگوں نے اُسکو تسلیم کر لیا، اور وٹیزا کو فی الجملہ شاہی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دوسرے ہی سال بوڑھے بادشاہ مر گئے، اور اپنے ناتجربہ کار جانشین کے ہاتھ میں نہ صرف سلطنت کی ذمہ واریاں، بلکہ ایسے مشکلات اور مصایب سے گئے کہ اُس سے پہلے بادشاہوں کو اُن سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ یہ مشکلات ایسی تھیں کہ ان کی وجہ سے نہ صرف سلطنت و زیگاتھ بلکہ مذہب مسیحی معرض خطر میں تھا۔ مگر بہرکیف، رعایا کو یہ امید تھی کہ وٹیزا کی تخت نشینی سے ملک کو جو ایک مدت سے مصائب میں گرفتار تھا، بہت فائدہ پہنچیگا، اور بہت کچھ صلاح و فلاح ہو جائیگی۔ عالم جوانی میں ان کی بہت سی خوبیاں ظاہر ہو چکی تھیں۔ وہ پرہیزگار تھے، فیاض تھے، انصاف پسند تھے، اور والدین کے خدمت گزار۔ جیسے ہی

اختیارات کامل اُن کے ہاتھ میں آئے، اُنھوں نے وہ کام کرنے شروع کئے جس سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جائیں۔ جو مالی نقصانات لوگوں کو اُن کے باپ نے پہنچائے تھے اُن کی تلافی کی؛ جو ظالمانہ قوانینِ استحصالِ بالجبر کے لئے بنائے گئے تھے وہ منسوخ کر دیئے؛ عام معافی کا اعلان کر دیا؛ اور جعلی تحریریں، جن کی بناء پر دولتمندوں کو لوٹا گیا تھا، ضائع کرادیں؛ سواءِ اُس ٹیکس کے، جو سلطنت کے بقا کے لئے ضروری تھے، سب معاف کر دیئے؛ بہت سے جلاوطن لوگوں کو واپس بُلا لیا، اور اُن کی جائیدادیں اُن کو دیدیں۔ یہودیوں کے ساتھ ایک حد تک مراعات کیں۔ مگر چونکہ عوام الناس کے خیالات اُن کی نسبت تلخ تھے، اور سب لوگوں کو اُن سے تعصب تھا، اس لئے کچھ ظاہری سختیاں اُن پر قائم رکھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چند روز کے بعد وہ بھی ہٹا دیجائینگی ڈیٹزا کی سلطنت ان خوبیوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ اُن کی فیاضی، کشادہ دلی، تدابیر اور اخلاق شاہانہ سے سب لوگ بہت خوش ہو گئے، اور انھوں نے اپنی رعایا کے دل اپنے ہاتھ میں لے لئے؛ تمام آدمی اپنے نوجوان بادشاہ کی نرم مزاجی اور نیکی کے گرویدہ ہو گئے لیکن اس سے آئندہ کی عظمت کا جو اندازہ لگایا جاتا تھا وہ بے بنیاد دھوکا تھا؛ کیونکہ ڈیٹزا بہت جلد ایسی خرابیوں میں پڑ گئے کہ رعایا گھبرا اُٹھی۔ اہالی کلیسا کی طرف سے اُن کو ملامت ہوئی۔ پادری اس قسم کے گناہوں سے خود چشم پوشی کر لیا کرتے تھے، لیکن اگر اُن کے اقتدار اور اُن کی آمدنی پر اُس کا اثر پڑتا ہو تو پھر گناہ گناہ بن جاتا تھا۔ تمام دربار شاہی گویا ایک ہی حمام میں تھے۔ عیش و نشاط اور شہوت رانی کا زور تھا۔ کلیسا کی نہایت مقدس روایات کی خلاف ورزی تو ہوتی ہی تھی، غضب یہ ہے کہ تعدد ازدواج اور کنیزکوں کا رکھنا بھی جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ مقدس ہادیانِ دین نے سب سے پہلے ان غیر سیاسی افعال اور قوانین کی طرف توجہ کی۔ دیندار لوگ ان عیش کے بندوں کی زیادتیوں سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے۔ نہ ان خرابیوں سے گرجاؤں کی قربانگاہیں

محفوظ تھیں نہ اقبال گناہ کے مبنر۔ ان تمام افعال بد سے لوگ اتنے ناراض نہ تھے، جتنے کہ یہودیوں کو مراعات ملنے سے۔ ہر ایک پادری، بالخصوص یہ سمجھتا تھا کہ اس لکد کوب زمانہ قوم کو رعایت ملنے کے یہ معنی ہیں کہ گویا کلیسائیوں کی توہین کی جاتی ہے۔ یہ جرم گرجا کو ناپاک کر دینے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ وٹیزا چونکہ پادریوں کی افہام و تفہیم کی پرواہ نہ کرتے تھے، اس لئے انہوں نے موجودہ شورش کو بڑھانے میں ہر طرح کی مدد کی، اور مقتدایان دینی کی مدد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے خفیہ طور پر کچھ ایلچی روم بھیج دیئے۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر پوپ کو سخت غصہ آیا۔ گو سپین کا کلیسا ان کے اقتدار کو تسلیم نہ کرتا تھا، مگر پھر بھی اس سے ایسے معاملہ میں مدد مانگی گئی تھی کہ جس کا اثر تمام دنیاء مسیحی پر پڑنے والا تھا۔ ادھر پوپ کو یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید اسی ذریعہ سے کلیساء سپین میں انکا رسوخ بڑھ جائے۔ چنانچہ پوپ کانس ٹین ٹن نے اپنی طرف سے وٹیزا کو سفیر بھیج کر یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ان ناجائز قوانین کو منسوخ نہ کرینگے اور یہودیوں کو نہ ستائینگے تو وہ تخت سے اتار دیئے جائینگے۔ وٹیزا نے ان دھمکیوں کا نہایت حقارت سے یہ جواب کہلا بھیجا "کہ اگر پوپ دخل در معقولات سے باز نہ آئینگے تو میں ان کو پایہ تخت پاپائی سے نکال باہر کرونگا" اور ساتھ ہی سپین میں یہ اعلان کر دیا کہ پوپ روم کے احکام کی ہرگز تعمیل نہ کیجائے! نیز یہ کہ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کریگا وہ سزاء موت پائیگا۔ ان کارروائیوں سے پادری اور عوام الناس دونوں سخت ناراض ہو گئے، اور یہ ناراضی اس حد تک بڑھی کہ وٹیزا کو اپنے تخت اور اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ خوف کے مارے ایسے گھبرائے کہ نمک حراموں کو اپنا کام پورا نہ کرنے دینے کی تدابیر سوچنے لگے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے تمام بڑے بڑے قلعوں اور شہروں کی فصیلیں منہدم کرا دیں۔ صرف طلیطلہ استورگا اور لیوگو کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ ایسی حماقت تھی کہ جس غرض سے یہ

کیا گیا تھا وہ حاصل نہ ہوئی اور اس نے اُن کے انتزاع سلطنت میں مدد دی اس کے علاوہ انہوں نے یہودیوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے، اور ایسے کام سپرد کئے جن سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ یہ لوگ اس عزت و آبرو اور اعتماد سے خوش تو کیا ہوتے، ان کی خصوصیات دغابازی اور ناشکری پھر بروءکار آئی، اور انہوں نے اپنے حاصل شدہ اختیارات کو اپنے مزبی بادشاہ کو تباہ کرنے میں صرف کر دیا۔ اُن کی سازش سے ایک نئی آفت برپا ہوگئی۔ پادریوں کی جماعت کثیر، اور بہت سے عمایدو رؤسا غداروں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ایک اور بادشاہ انتخاب کر لیا گیا اور تھوڑے سے فتنہ و فساد کے بعد وٹیزا کو تخت سے اُتار کر غالباً قتل کر دیا گیا۔ تاریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اُن کا آخر انجام کیا ہوا ؟

اس نئے بادشاہ کا نام راڈرک۔ (الزریق یا رازرق) تھا۔ اگرچہ اُس کی عمر بیاسی برس کی ہوگئی تھی لیکن اُس کے قواء ایسے مضبوط تھے کہ جوان معلوم ہوتا تھا، اور جوانوں ہی کی طرح چست و چالاک تھا۔ اور ناتھک جوانوں کی طرح اُس کی عمر کا بیشتر حصہ مردانہ اشغال میں گزرا تھا۔ کوہستان گیلے شیا (جلیقیہ) اور بسکے کے خلاف مہمات میں وہ شامل ہوا تھا، اور استقلال اور فوجی معاملات میں اُس نے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ وہ خاندان شاہی سے نہ تھا، مگر عطیات قدرت سے اُس میں خودداری تھی، اور ظاہری و مصنوعی زہد و اتقا اور نرم مزاجی دکھلایا کرتا تھا، جس سے ہر شخص اُس کا ادب کرتا تھا۔ اپنے محل کے تکلفات، شاہانہ جاہ و جلال کی شان و شوکت میں وہ اپنے پیش رو بادشاہوں سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور نہایت کامیابی کے ساتھ اُس نے وہ شان پیدا کر دی تھی جو بادشاہ روم کی انحطاط کے زمانہ میں تھی ؟

جس ملک میں کہ بادشاہ بذریعۂ انتخاب تاج و تخت پاتا ہو وہاں رعایا میں سازش کا مادہ پیدا ہو جایا کرتا ہے لیکن سپین ایسی جگہ تھی کہ جہاں واقعی یا ظاہری اخلاق و تہذیب بعض

وقت شاہی خاندان کے آدمی کو بھی بادشاہ بنا لیا کرتی تھی۔ قوم وزیگاتھ نے ایک یہ رسم ڈال لی تھی کہ معزز خاندانوں اور با اختیار لوگوں کی اولاد کو وہ دارالسلطنت میں تخت کے پاس ہی رکھتے تھے۔ ظاہر تو یہ کیا جاتا تھا کہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ اُن کو تعلیم دی جائے اور تربیت کیا جائے مگر فی الحقیقت مقصود یہ تھا کہ وہ یرغمال رہیں تاکہ اُن کے اعزا و اقربا وفادار رہیں، کیونکہ ان ہی لوگوں کو سرحد کی حفاظت پر مقرر کیا جاتا تھا، اور یہی لوگ اہم موقعوں پر سپہ سالار مقرر کئے جاتے تھے۔ سن بلوغ تک یہ لڑکے بادشاہ کے غلام یا خدمتگزار کا کام کرتے تھے، اور اُن کو فوجی مشق اور مردانہ کاموں کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ کی خدمت گزاران ہی معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہوتی تھیں جو محل شاہی میں رہتی تھیں اُنکی تعلیم ایسی ہوتی تھی کہ وہ بالغ و خود مختار ہو کر معزز خواتین بن سکیں۔ ان ہی میں کاونٹ جولین کی لڑکی تھی، جو راڈرک کے محل میں رہتی تھی۔ یہ کاونٹ پہلے سلطنت بیزنطینی کا باجگزار تھا، اور قلعہ سبتہ کا قلعہ دار جب مسلمانوں کی اُٹھتی جوانی نے افریقیہ کے تمام یونانی مقبوضات کو لے لیا، اور کاونٹ جولین تنہا رہ گیا، تو اُس نے قریب ترین مسیحی سلطنت کی حمایت میں آنا چاہا۔ کچھ سیاسی حالت اور ضرورت بھی اسی کی داعی ہوئی کہ اُس نے اپنے قلعہ اور اپنی ذات کو دربار طلیطلہ کے سپرد کر دیا۔ اُس کی یہ لڑکی بہت ہی حسین تھی۔ راڈرک اُس پر بے طرح مائل ہو گیا۔ اور جب وہ خوشامد درآمد سے راضی نہ ہوئی تو اُس نے بجبر و تشدد اُس پر قابو پایا۔[۵۱] کاونٹ جولین کو اپنے خاندان کی اس رسوائی کی خبر ہوئی تو اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سخت سردی کی آندھیوں، اور بارش کی پروا نہ کر کے وہ فوراً دارالسلطنت پہنچا۔ یونانیوں کا مکر و فریب مشہور ہے، کاونٹ جولین نے اُسی سے کام لیا اور بغیر اسکے کہ وہ اپنے رنج کو ظاہر کرے اُس نے یہ ظاہر کیا کہ اُس کی بیوی سخت بیمار ہے، اس لئے اُس نے اپنی

---

[۵۱] آجکل کے یوروپین مورخ اس واقعہ سے قطعی انکار کر رہے ہیں؛ اور کیوں نہ کریں۔ مگر اس انکار کے جتنے دلائل دیتے ہیں وہ سب پوچ و لچر ہیں (مترجم)۔

بیٹی کو ماں کے بستر مرگ پر لیجانے کی درخواست کی۔ بہانہ ایسا تھا کہ انکار بھی نہ ہو سکتا تھا؛ راڈرک کو کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوا، اور اُس نے اس لڑکی کو لیجانے کی اجازت دیدی۔ کاونٹ جولین نے حسب معمول پوری وفاداری دکھلائی اور آداب شاہی بجالاکر فوراً واپس چلا آیا۔ اپنے مستقر پر پہنچتے ہی اُنہوں نے راڈرک سے انتقام لینے کی وہ تدبیر شروع کر دیں جنکو وہ پہلے ہی اپنے ذہن میں قرار دے چکے تھے۔ قلعہ سبتہ یورپ کی کنجی تھا، اور اتنا مضبوط کہ اُس پر نہ کوئی کامیابی کے ساتھ حملہ کر سکتا تھا، نہ منجنیق وغیرہ کا اُس پر کوئی اثر ہو سکتا تھا۔ اب تک بارود کا کسی کو علم نہ تھا کہ دشمن اُس سے ہی کامیاب ہو سکتا۔ وزیگاتھ کی غفلت، کہ اُن کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہی قلعہ بیرونی حملوں کے روکنے میں سد سکندری کا کام دیتا ہے۔ ملک سپین پر صدیوں سے کوئی حملہ نہ ہوا تھا؛ وحشیوں سے تمام ملک کو نفرت تھی؛ اسلام کی لاثانی طاقت سے یہ لوگ بالکل ناواقف تھے۔ وہ اپنے ملک کی آب و ہوا ہی کو غیر ملک کے باشندوں کے ناموافق سمجھ کر مطمئن تھے، مگر فی الحقیقت عیش و عشرت میں اتنے منہمک تھے کہ دربار طلیطلہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سپین بالکل محفوظ ہے، اور اُس کی سلطنت ابدالآباد تک قائم رہنے والی ہے۔ جیسا کہ اوراق ماسبق میں بیان کیا جا چکا ہے، یہ مغرور اور بددیانت قوم آئے دن کی خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھی؛ مختلف فرقے ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔ سپین کے بادشاہ اپنی تمامتر طاقت اور عقل و تدبیر اس پر خرچ کئے ڈالتے تھے کہ کسی طرح اُن سیاسیانہ تدابیر کے بنے بنائے قصر کو منہدم کر دیں جو اُن کے اجداد نے سخت محنت اور بڑے تجربہ کے بعد تعمیر کیا تھا۔ رؤساء ملک اور مقتدایان مذہبی ایک دوسرے کی دشمنی میں مرے چلے جاتے تھے۔ ایک طرف اُن کو اپنے حمایتی فرقہ پر ناز تھا، دوسری طرف اُن سے ڈرتے تھے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان میں تفوق دنیاوی کے لئے روز روز کا مقاتلہ ہوتا اور فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ یہودی تھے کہ دونوں فریق کے ہاتھ

سے تنگ تھے۔ کونسی سختی اور تشدد تھا کہ اُن پر نہ کیا جاتا ہو۔ وہ ہر وقت پریشانی، بلکہ مصیبت میں گرفتار رہتے تھے۔ بظاہر تمام مذہبی قیود جو فی نفسہٖ مفید تھیں اُٹھا دی گئی تھیں۔ ہر سیاسی اختیارات کے حاصل کرنے کے لئے کلیسا سے زیادہ کوئی کارگر سلاح نہ تھا۔ تمام پادری ہر قسم کے عیوب میں غرقاب تھے، اور عوام الناس مادر پدر آزاد تھے غلاموں کا ایک جم غفیر تھا کہ باوجود اپنے آقاؤں کے چابکوں کے ابھی تک زمانۂ آزادی کی روایات کو نہیں بھولے تھے، اور ایک ذراسی تحریک پر بلوہ کرنے کو تیار رہتے تھے اور اُس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ جس روز اُن کو آزادی کامل حاصل ہو۔ مُوے پر سو دُرّے اس موقعہ پر ایک تباہ کُن قحط پڑا، اور اُس کے طابق النعل بالنعل، حسب دستور مستمرہ، وبا آئی۔ غیر مزروعہ اراضی اور غیر آباد جھونپڑیاں ان دونوں بلاؤں کا ثبوت کافی تھا۔ بہر حال اس سے اور بھی مصیبت اور شورش برپا تھی۔ اہالی فرانس کے حملوں کی روک تھام تو قدرتی قلعہ کوہ پائرینیز کرتا تھا؛ دوسری طرف بحر شام بہت بڑا مانع تھا۔ باشندگان جزیرہ نمائے سپین نہایت صحت بخش اور سرسبز ملک میں بستے تھے، اور اس خواب خرگوش میں تھے کہ اُن پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے انہوں نے ہتھیار اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیئے تھے، کیونکہ اُن کا بار اُن سے نہ اُٹھ سکتا تھا۔ تلوار ہی صرف اُن کی محافظت کر سکتی تھی، اور اسی کی مشق اُنہوں نے عیب سمجھ کر چھوڑ دی تھی۔

کاونٹ جولین پر کچھ ایسا جنون سوار ہوا کہ نہ اُس نے یہ سوچا کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کا کیا انجام اور نتیجہ ہو گا، اور جو ذریعہ وہ اختیار کرتا ہے اُس میں کامیابی بھی ہو گی یا نہیں، وہ بخط مستقیم موسےٰ بن نُصَیر کے پاس پہنچا۔ قیروان افریقیہ کا دارالامارۃ بن چکا تھا، اور موسےٰ اس وقت وہیں تھے۔ اس عربی قائد اعظم کو اپنے بے چین مہمان کے آنے کی وجہ معلوم نہ تھی موسےٰ نے تمام عربی فوج کو، جو اُن کے ماتحت تھی، لے کر دو مرتبہ سبتہ پر فوج کشی کی تھی، اور دونوں مرتبہ اسی بہادر یونانی سے ہزیمت کھا کر واپس آئے تھے۔ بہر کیف

انہوں نے جولین کو نہایت عزت و حرمت سے اپنے یہاں مہمان رکھا۔ جولین نے اپنے مطلب کا اظہار کیا، اور بہت ہی طول و طویل تقریر میں سلطنت گاتھ کی دولت و حشمت کی تعریف کی، اور اُن پر فتح پانے کو بہت ہی آسان بتلایا۔ اُنہوں نے وہاں کے لوگوں کی خانہ جنگیاں، باہمی رقابت و عناد، مذہبی تشددات اور ایذا، ضبطی جائیداد موروثی، معززین کی بے عزتیوں وغیرہ کا تمام حال بیان کیا۔ اُنہوں نے اسکی تفصیل کی کہ شاہی خاندان کے آدمی بادشاہ نہیں بنائے جاتے جس سے اُنکے دلوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس وقت ایسے خاندان کا آدمی تخت پر متمکن ہے کہ جو از روۓ نسل، غیر ملکی، اور کم درجہ کا آدمی ہے۔ لوگ اُس کو غاصب سمجھتے اور بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُنہوں نے نہایت شاندار الفاظ میں ملک سپین کی لطافتوں اور کششوں، اُس کی سر سبز وادیوں، اُس کے درخشندہ دریاؤں، کی تصویر کھینچی اور بیان کیا کہ وہاں کی جڑی بوٹیاں جو دوا کے استعمال ہوتی ہیں، جادو کا کام دیتی ہیں، وہاں کی کانیں، وہاں کی شکارگاہیں قابل دید ہیں، وہاں کی لوٹ حملہ آوروں کا انتظار کر رہی ہیں، وہاں عورتیں نہیں ہیں بلکہ حوریں اور پریاں ہیں، وہاں کے آدمیوں کو انہوں نے زنانہ بتلایا اور یہ بیان کیا کہ سستی نے اُن کو کسی کام کا نہیں رکھا ہے، عیش و عشرت اور شہوت رانی سے وہ کہیں کے نہیں رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سی باتوں کو تو موسٰے خود جانتے تھے لیکن سبتہ کا قلعہ، جس کا قلعہ دار اُن کا موجودہ مہمان کاونٹ جولین تھا، ایک ایسی سد سکندری تھی کہ جو اس اسلامی سپہ سالار کے توڑے ٹوٹنے والی نہ تھی لیکن یہ بھی تو ممکن نہ تھا کہ مسلمان "جزیرۃ الاندلس" یا جزیرہ نماء وینڈال کے متعلق جتنی خبریں تھیں اُن کی تصدیق کر لیتے۔

موسٰے اسکو تو تسلیم کرتے تھے کہ جو فوائد کاونٹ جولین بیان کرتے ہیں وہ صحیح ہیں مگر ساتھ ہی اُن کو قوم گاتھ کی ایمانداری پر اطمینان نہ تھا۔ بہر حال کاونٹ کو جواب دینے سے پہلے اُنہوں نے خلیفہ وقت کی منظوری لینی چاہی۔ چنانچہ اُنہوں نے

مفصل حالات لکھکر دمشق کو قاصد دوڑائے۔ ولید بن عبدالملک اُس وقت امیرالمومنین تھے، انہوں نے فوراً منظوری دیدی؛ اسکے ساتھ ہی اُنہوں نے سخت تاکید کی کہ پوری احتیاط کیجائے، حالانکہ موسٰے جیسے چالاک اور ہوشیار شخص کے لئے اسکی ضرورت نہ تھی؛ کیونکہ وہ خود بہت ہی محتاط تھے اور کسی پر مشکل سے اعتبار کرتے تھے۔ موسٰے نے جولین سے بلا کر کہا کہ ہم تمہاری دیانت کا یوں امتحان کرنا چاہتے ہیں کہ تم کچھ فوج لے کر دشمنوں کے ملک پر حملہ کرو۔ جولین نے اس شرط کو بہت ہی خوشی کے ساتھ منظور کیا؛ اور اپنی تھوڑی سی فوج لے کر آبناء کو عبور کر گئے' مدینہ سڈونیہ (سدونہ) کے قرب وجوار میں ساحل کو خوب لوٹا، بہت سے گرجاؤں کو جلا دیا، کھڑی ہوئی فصلوں کو تباہ کر دیا، اور سالم وغانم واپس آگئے۔ موسٰے نے یہ دیکھ لیا کہ اُن کے حلیف سے اب ایسے افعال سرزد ہوگئے ہیں کہ اُس کا بادشاہ اُسکے قصور معاف نہیں کریگا؛ نیز انہوں نے اس چھوٹے سے مقابلہ سے یہ دیکھ لیا کہ اگر پوری تیاری کر کے حملہ کیا جائیگا تو اُس میں یقیناً کامیابی ہوگی۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد اب انہوں نے جولین سے معاہدہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اُس معاہدہ کے شرائط، جسکے موافق یورپ کے سب سے زیادہ مرفہ الحال ملک کا سودا کیا گیا، تاریخ کو بھی معلوم نہیں ہیں، لیکن یہ یقین کرنے کے وجوہ ہیں کہ راڈرک سے انتقام لئے جانے کے علاوہ جولین کو بہت کچھ زر نقد معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا؛ نیز یہ کہ وٹیزا کی اولاد کو اُن کی قدیمی جائداد دیدی جائیگی۔ وٹیزا کی اولاد بھی اس جلسہ میں موجود تھی۔ ان میں اوپاس نہ صرف اس سازش ہی میں شریک تھا۔ بلکہ اس مجلس شوریٰ کا عنصر غالب یہی شخص تھا۔ سیوٹہ (سبتہ) کی کنجی موسٰے کے حوالہ کر دی گئی؛ اور جب کاونٹ جولین نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفاداری کا حلف اُٹھا لیا تو اُس کو فوج کا افسر مقرر کر دیا گیا۔

کار آزمودہ و گرگ باراں دیدہ موسٰے کو اب بھی تسکین نہیں ہوئی، اور انہوں نے

OPPAS ×

ایک اور مہم اپنے ہی افسر کی سرکردگی میں ساحل سپین کے تجسس کے لئے بھیجنے کا قصد کیا۔ اُس کے لئے انہوں نے اپنے ایک معتبر آزاد کردہ غلام طریف کو انتخاب کیا چنانچہ وہ جولائی ۷۱۰ء میں ایک سو سوار اور تین سو پیادہ لے کر جزیرۃ الخضراء پر (جواب الجزیرہ کہلاتا ہے) جا اُترے۔ اگرچہ جولین اور طریف کی مہموں میں بڑا فرق رہا، یعنی جو کامیابی پہلے کو ہوئی دوسرے کو نہ ہوئی، لیکن یہ امر تو بلا شبہ ثابت ہو گیا کہ سلطنت وزیگاتھ بالکل غیر محفوظ حالت میں ہے۔ اب بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاریاں کی گئیں، لیکن اس پر بھی یہ تیاریاں ایسی نہ تھیں کہ اتنی بڑی سلطنت اتنے تھوڑے عرصہ میں تباہ ہو جائے۔ جو کچھ تھا اُس کی صورت بالکل ایک چھاپہ کی سی تھی۔ طارق ابن زیاد (رحمتہ اللہ علیہ) نامی ایک بربری، اس مہم کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ان کے لال بال اور کھلا ہوا رنگ اس امر کی کافی شہادت تھا کہ وہ وینڈال کی اولاد سے تھے۔ یہ دونوں افسر، یعنی طریف اور طارق، موسےٰ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان دونوں کے ناموں میں کچھ ایسی مماثلت ہے کہ اس سے یورپین مورخین کو بہت دھوکا ہوا ہے، اور ایک کو دوسرے سے ملا جلا دیا گیا ہے، جس سے مورخین قدیم و زمانۂ حال نے ایک دوسرے کے کارناموں کو مخلوط کر دیا ہے۔ طارق نہایت تجربہ کار، غیر معمولی بلند نظر اور بے انتہا مستقل مزاج و باہمت سپاہی تھے۔ جو فوج اُن کو دی گئی تھی اُس میں مختلف اقوام کے لوگ تھے؛ شاید ایسی بے میل سپاہ اسلامی علم کے نیچے کبھی جمع نہ ہوئی ہو گی۔ اُن کی تعداد مقابلتہً نہایت حقیر تھی، یعنی صرف سات ہزار، جس میں سے سوار بہت ہی کم تھے۔ بیشتر سپاہی بربری تھے، یعنی کوہستان اطلس کے نہایت خوفناک وحشی، جنکو موسےٰ کی پالیسی اور تقریروں اور وعظ و پند نے بت پرستی چھڑوا کر مسلمان کیا تھا۔ یہ لوگ قبائل غمرہ، مسمودا اور زناتہ کے تھے۔ یہ قبائل وہ ہیں کہ جن کی شرارتیں اور بے رحمیاں آخری زمانہ اندلس کی تاریخ کو اب تک یاد ہیں۔ ان کے علاوہ تمام اُن اقوام کے لوگ بھی اس فوج میں موجود تھے جن کو اتفاق

وسخت، مصیبت وشوق غارتگری یا محض لطف اندوزی سیر و سیاحت نے افریقیہ پہنچا دیا تھا۔ وینڈال اور گاتھ کی اولاد، حجاز کے بدو، ایشیائی ممالک کے جلاوطن، شام کے سازش کنندہ، مرتدین بربر لطین، جنہوں نے شاہ قسطنطنیہ کی نمک حرامی کی تھی، یہودیوں کی بہت سی تعداد، جن کو اُن کے مسیحی بھائیوں نے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کے حامی بن گئے تھے، طارق کی فوج میں شامل تھے۔ اگر از روئے مذہب دیکھا جائے تو اس فوج میں آتش پرست، ستارہ پرست، اولمپس کے دیوتاؤں کے پوجنے والے، اور مسیحی سب ہی لوگ تھے۔ ہر قوم کا علم الگ الگ تھا اور اُس قوم پر اُسی کے افسر مقرر تھے، مثلاً مفرور یونانی کاونٹ جولین، بربری طارق، اگا تھک مغیث الرومی اور یہودی قولہ۔ کاونٹ جولین نے جہازوں کی بہم رسانی اپنے ذمہ لی، اور انہوں نے اُن تمام سوداگری کے جہازوں پر قبضہ کر لیا جو ساحل پر لنگر کئے ہوئے پڑے تھے۔ سوا اسکے اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا لیکن ان کی تعداد اتنی ناکافی تھی کہ فوج کو عبور کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ غرض مسلمانوں کی یہ فوج اُس مقام پر اُتری جو زمانۂ قدیم میں کیلپے[×] کہلاتا تھا، مگر عربوں نے اُس کا نام جبل طارق رکھا، جو اس وقت تک قریباً بلا تغیر جبرالٹر کہلاتا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن پر گاتھ کے ایک افسر تھیوڈومر[⁂] (تدمیر) نے حملہ کیا۔ یہ وہی شخص ہے کہ جس نے شاہ ایجیزا کے زمانہ میں بحری لڑائی میں کامیابی حاصل کی تھی، اسی وجہ سے شاہ راڈرک نے اسکو اُسی کی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا تھا۔ گاتھک سپہ سالار کی غیر قواعد دان اور غیر مرتب فوج نے دم کے دم میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ شہسواران بادیہ کے حملہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ تھیوڈومر مجبوراً پس پا ہوا اور اُس نے فوراً اس حملہ کی خبر اپنے بادشاہ کو ایسے الفاظ میں دی کہ جن سے سخت گھبراہٹ اور پریشانی معلوم ہوتی تھی، اور جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دشمن کے خوف سے کانپ رہا ہے، چنانچہ اُس نے لکھا کہ "ہمارے ملک پر

THEODOMIR ⁂ CALPE ×

ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ میں اُن کا نام جانتا ہوں، نہ وطن، نہ اصلیت۔ میں یہ بھی نہیں بتلا سکتا کہ وہ کہاں سے آگئے ہیں، آیا آسمان سے گرے ہیں، یا زمین میں سے نکل آئے ہیں"۔ یہ منحوس خبر راڈرک کو اس وقت پہنچی کہ وہ پمپلونہ (بنبلونہ) کی بغاوت فرو کرنے کے لئے اُس کی فصیل کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ اس بادشاہ میں چاہے کتنے ہی عیب ہوں، مگر ہمت و استقلال اور عزم و ثبات کی اُس میں کمی نہ تھی۔ اُنھوں نے فوراً پمپلونہ کا محاصرہ اُٹھا لیا، اور سیدھے قُرطبہ پہنچے اور اپنی تمام تر توجہ بہت بڑی فوج جمع کرنے پر صرف کر دی، "تاکہ ملک کی حفاظت اور دشمنوں کی مدافعت کیجائے۔ اس کے لئے ہر قسم کے ذرائع اختیار کئے گئے؛ معافی کے وعدے دیئے گئے، دھمکایا گیا، مدد و معاش کا انتظام کیا گیا، جبری فوجی خدمت کا قاعدہ بنایا گیا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لاکھ فوج بادشاہ کے علم کے نیچے جمع ہو گئی لیکن یہ لشکر دیکھنے ہی بھر کو تھا؛ نہ اس فوج میں کوئی نظام تھا، نہ سپاہی قواعد دان تھے، نہ تکالیف جنگ برداشت کئے ہوئے تھے۔ اُنکے جتنے اسلحہ تھے وہ کشاورزی ہی کے کام آسکتے تھے۔ سپاہی سے لے کر افسر تک ایک اوباشوں کا گروہ تھا؛ غلام تھے اور کرایہ کے مزدور۔ جزیرہ نماء سپین میں گھوڑے بہت ہی کم تھے اور بہت قیمتی ہوتے تھے، اسلئے صرف رؤسا و امراء ہی کے پاس گھوڑے تھے، باقی ساری فوج پیادہ تھی۔ عربی مورخوں نے اپنے دشمنوں کی شکستوں کا بہت بڑا باعث سواروں کا فقدان بتلایا ہے۔ گاتھک فوج کی بدنظمی میں بہت بڑا حصہ نمک حرامی کا تھا؛ ہزاروں آدمی جو اس غرض سے مقرر کئے گئے تھے کہ راڈرک کے تخت کو بچائیں، اُن کا مقصود اصلی یہ تھا کہ کسی طرح اُن کا تاج اُٹھا کر دشمن کے سر پر رکھ دیں۔ جو لوگ معزز تھے اُنھوں نے اپنے خدمات اسلئے پیش کی تھیں کہ اس آشوب عام میں اُن کو سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے اور اپنی طمع بلند نظری میں کامیاب ہو جائیں۔ ضرورت ہی ایسی سخت تھی کہ ایسے فریق کے آدمی بھی فوج میں لے لئے گئے کہ جن کو اتنا ستایا اور تنگ کیا

گیا تھا کہ اُس کی کسی طرح تلافی نہ ہوسکتی تھی۔ اُن پر کسی طرح کا اعتبار کرنا، یا اُن کو اور ناراض کرنا بہت مخدوش تھا۔ اس فوج کے سرکردہ وٹیزا کے بھائی اور بیٹے تھے۔ راڈرک نے اس سے پہلے اُن کو رضامند کرنے کی کوشش کی، مگر کارگر نہ ہوئی؛ مگر اس وقت انہوں نے بطیب خاطر فوج کی افسری کرلی؛ تاکہ وہ اپنا انتقام لے سکیں۔ بیسیوں اُمرا، پادری اور یہودی نفرت اور انتقام کی آگ میں بھُنے جاتے تھے، اور دشمنوں کے صدر مقام سے ان کی برابر خط و کتابت چلی جاتی تھی۔ ایک دوسرے کے رقیب افسران فوج نے عیسائی فوج کے نظام کو اور بھی خراب کر رکھا تھا۔ ان کی باہمی دشمنیاں اُن کے دشمنوں کو بھی معلوم تھیں، اور اس بنا پر اُن کو اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر طارق نے کارٹیجا کے قدیم شہر پر قبضہ کرلیا؛ اور اُس کو خود اپنے طور پر مضبوط کرکے قرب و جوار میں دور دور تک رسد جمع کرنے کے لئے فوج بھیجتے رہے، جس کو بلا استثنا ہر موقعہ پر کامیابی ہوتی رہی۔ جدھر کا رُخ کرتے تھے رسد لے کر آتے تھے۔ عربی سواروں کی سرعت، اُن کی ظاہری خوفناک صورت و شکل اور اُن کی لوٹ مار سے ایک طرف تو اہل سپین سہمے جاتے تھے، دوسری طرف اُس فوج کے دل بڑھتے چلے جاتے تھے۔ جو حملہ کرنے کے لئے اب تک محفوظ رکھی گئی تھی، اور جبل طارق کے پیچھے آرام کر رہی تھی۔ طارق کے جاسوس، اور خفیہ حلیف، راڈرک کے دارالسلطنت اور چھاؤنی میں پھیلے ہوئے تھے، اور اُن کے مقابلہ کے لئے جو تیاریاں کیجاتی تھیں اُن کی خبریں متواتر پہنچاتے رہتے تھے۔ ان کو سن سن کر وہ گھبرا اُٹھے، اور فوراً اپنے آقا موسےٰ سے کمک طلب کی۔ وہاں سے پانچ ہزار بربری سوار اور پہنچ گئے۔ اُن کے آنے سے سپین میں مسلمانوں کی بارہ ہزار آزمودہ کار فوج جمع ہوگئی۔ اگرچہ گاتھک فوج کے مقابلہ میں اب بھی اُن کی فوج کی تعداد مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھی؛ لیکن اُن میں سے ایک ایک فرد صعوبت میدان جنگ برداشت کئے ہوئے تھا؛ اُن کو فتح پانے کی گویا عادت ہی تھی، دینی جوش اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا؛ اور سب کے سب

اپنے سپہ سالار کے فدائی تھے۔

جولائی ۷۱۱ء کی سہانی صبح تھی کہ تاریخ سپین کا ورق الٹا، اور ایک نیا باب شروع ہوا، یعنی مدینۂ سدونہ کے میدان میں، لاجنڈا کی جھیل کے کنارے، دونوں دشمن فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں مسلمان اپنی کامیابیوں پر نازاں و فرحاں تھے؛ اُن کو اپنی بہادری کی بہ نسبت دشمنوں کی نااتفاقی پر زیادہ اطمینان تھا، وہ لڑائی کے لئے بے صبر ہو رہے تھے اُن کے سروں پر سفید عمامے بندھے تھے، چمکدار زرہ و بکتر پہنے، تلوار حمائل کئے، اور نیزہ ہاتھ میں لئے ہوئے میدان جنگ میں آئے۔ اُن کے کندھوں پر کمانیں تھیں، اور ترکشوں میں وہ تیر، جو پس پائی کے موقعہ پر پارتھی ان کی طرح زہرہ شگاف جان گداز تھے مسلمانوں کے سپہ لار نے پہلے نماز پڑھی، اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ خدا تعالےٰ کے حضور میں دعا مانگی، اور پھر اپنی فوج کی طرف متوجہ ہو کر چند جوش دلانے والے فقرے کہے، جن میں نہایت خوش فہمی سے اُنہوں نے انسانی جذبات پر اثر ڈالا۔ طمع، فوجی ناموری، حُسن زنانہ اور آخرت کا ثواب، غرض سب کچھ یاد دلایا۔ انہوں نے جناب سرور انبیا صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب بیان کیا جس میں یہ بشارت تھی کہ مسلمانوں کو فتح ہوگی اور کفار کی تذلیل۔ اُنہوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ اُن کی حالت نہایت نازک ہے، بصورت شکست وہ صفحہ ہستی سے مٹ جانے والے ہیں؛ اگر اُن کو کچھ امید ہے تو فتح میں؛ اُنہوں نے فہمائش کی کہ خبردار خوف کو پاس نہ پھٹکنے دینا اور اُس تہوّر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا جو اُنہوں نے سینکڑوں میدان جنگ میں دکھلایا ہے؛ وہ آزمودہ کار ہیں اور ہر جگہ ہمت و استقلال دکھلاتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے نہایت بلاغت کے ساتھ ملک سپین کی لطافتیں بیان کیں اور اُن حوروں کا ذکر کیا جو بادشاہان گاتھ کے محلوں کو بہشت بنائے ہوئے ہیں۔ اُنہوں قرآن مجید کی وہ آیات سنائیں جن میں شہداء کی فضیلتیں بتلائی گئی ہیں، اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ میدان جنگ میں گرتے ہی اپنی کشش و کوشش کا انعام بارگاہ ایزدی سے پا لیتے ہیں اور نعما بہشت

سے مسرور کئے جاتے ہیں ٭۔

مسلمانوں کی یہ حالت تھی، اور عیسائیوں کی یہ کیفیت کہ راڈرک رشوتیں دے کر، خوشامدیں کر کے، اور دھمکا کر جتنی بھی فوج میدان جنگ میں لا سکتے تھے لے آئے تھے۔ بادشاہ تمام اُمراء و رؤساء کے جھرمٹ میں، اپنے تمام جاہ و حشم کو اردلی میں لئے ہوئے، ایشیائی شان و شوکت کے ساتھ، خراماں خراماں، میدان جنگ میں پہنچے۔ وہ خود نہایت پر تکلف ہاتھی دانت کی گاڑی میں سوار تھے، جس میں جگہ جگہ چاندی کا کام تھا۔ اس میں سفید رنگ کے خچر جُتے ہوئے تھے، اور مختلف رنگوں کے ریشمین کپڑوں کا چتر شاہی سایہ فگن تھا۔ اُن کے کندھوں پر ارغوانی رنگ کی عبا پڑی ہوئی تھی، اور سر پر تاج شاہی نظر کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ اُن کے اور کپڑوں پر سنہرا کام تھا، اور اُس میں جا بجا جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ امراء و رؤساء کی فوجیں اپنے اپنے خاص ممتاز علموں کے نیچے تھیں سب سے آخر میں کئی ہزار بار برداری کے جانور تھے، جن پر صرف رسّے لدے ہوئے تھے، تاکہ دشمن قیدیوں کو باندھنے کے کام آئیں۔ یہ جنگ وہ تھی کہ جس سے تاریخ یورپ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، اور جس نے مغربی یورپ کی قسمت کو بدل دیا؛ مگر باوجود اس کے اس کی تفصیل بہت ہی کم ملتی ہے۔ مانا کہ اُس زمانہ میں نوشت و خواند کا رواج بہت ہی کم تھا، لیکن جتنا بھی تھا اُس کے مقابلہ میں بھی تفصیل جو ملتی ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ روز کامل متواتر گلچنیں رہیں، جو سب بے نتیجہ تھیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ فوجوں نے بیس میل کی مسافت طے کی موجودہ شہر جیریز ڈی لا فرنٹیرا کے قرب و جوار میں پہنچ گئیں۔ اب نہ معلوم جہالت تھی، کہ جو حیرت انگیز ہے، یا مبادیات قواعد صف آرائی کی لاعلمی تھی کہ انہوں نے اس طرح پڑے جمائے کہ دریاء واڈلیٹ (وادی لکتہ) اُن کے پس پشت رہا۔ جب عربوں نے پہلا حملہ کیا ہے تو وٹیزا کے حامیوں کی نمک حرامی

٭ یہ تقریر اب تک محفوظ ہے۔ اس کے چند فقرات تعلیقات کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے (مترجم)۔

صاف ظاہر ہوگئی! بہت سے اُمرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ الگ ہوگئے! سراسیمگی پھیل گئی؛
اور صفوں کی صفوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان تکبیریں پڑھتے ہوئے آگے بڑھے جس
سے بھگوڑوں کے دل اور بھی مرعوب ہوگئے۔ مسلمان تھے کہ برابر بڑھتے چلے جاتے تھے
یہانتک کہ تمام گاتھک فوج کو انہوں نے متلاطم واڈلیٹ میں دھکیل دیا۔ طارق کے آدمی
کئی روز کی لڑائی سے تنگ آئے ہوئے تھے، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر دشمن باقی رہ
گئے تو خود اُن کی جانیں معرض خطر میں ہیں! اس لئے انہوں نے جہاں تک ہو سکا اُن کو
پناہ نہ دی۔ تمام زمین لاشوں سے پٹ گئی۔ سطح دریاء واڈلیٹ پر مُردے نظر آتے
تھے، یا ڈوبتے اور جان توڑتے آدمی، اور گھوڑے، یا لڑائی کے رتھ اور ڈیرے خیمے،
اور بیش قیمت چیزیں، جو بجاءِ خود ایک خزانہ تھے، جن کے بچانے کی مفرورین کوشش کر
رہے تھے۔ حملہ آوروں کے تین ہزار آدمی کام آئے۔ مفتوحین کے نقصان کا اندازہ نہیں
لگایا گیا۔ بقیۃ السیف لوگوں کا عربوں نے شہروں کے دروازوں تک پیچھا کیا، بہت سے
محفوظ جگہ تک پہنچتے پہنچتے مار ڈالے گئے۔ اب جو فاتحین دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ اُن
کے ہاتھ اتنے قیدی لگے ہیں کہ وہ رسّے بھی کافی نہیں جو خود اُن کے باندھنے کے لئے
عیسائی لے کر آئے تھے۔ راڈرک کا گھوڑا، معہ اُسکے بے بہا سازو یراق کے، فاتحین کے
ہاتھ پڑا، مگر بادشاہ کا پتہ نہ ملا۔ اُس کا ایک جوتہ جو جواہرات سے مغرق تھا، دریا کے کنارے
پر پایا گیا، جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ ڈوب کر مر گئے، لیکن اُن کی لاش کہیں
نہ ملی؛ اسی لئے اُن کی موت ایک عقدہ لاینحل رہی۔ اگرچہ سپین کے افسانوں، اور لوگوں
کی خوش اعتقادی، نے اُن کی غیبوبیت کو انواع و اقسام کے رنگوں سے رنگا ہے، اور
اہالی کلیسا کی شہادتوں نے اُس پر طرح طرح سے روغنِ قاز ملا ہے؛ مگر حقیقت یہی ہے
کہ راڈرک کی آخری قسمت کا کسی کو علم نہیں۔ مسلمانوں کو اتنی لُوٹ ہاتھ آئی کہ اُس کی
قیمت کا اندازہ نہیں لگ سکتا! منجملہ اُن کے گھوڑے اتنے تھے کہ تمام فوج کو گھوڑے

مل گئے، اس نے مسلمانوں کی فوج کو اور بھی قوی اور مکمل کر دیا۔ ان گھوڑوں کا ساز و یراق نہایت قیمتی تھا، یہی قوم گاتھ کی دولت و ریاست کی بڑی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بہت سے عمدہ عمدہ گھوڑوں کے نعل سونے یا چاندی کے ہوتے تھے رؤسا گاتھ وسعت و لطافت دسترخوان، اور اپنی شان و شوکت، پر ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے، نہ کہ شجاعت و تجربہ جنگ میں۔ یہ لوگ اپنے یہاں کے بہترین برتن وغیرہ، اور جواہرات و زیورات اپنے ساتھ میدان جنگ میں بھی لے کر آئے تھے۔ اپنی خودنمائی اور تفاخر کی وجہ سے وہ غلاموں کا ایک جم غفیر اپنے گرد جمع رکھتے تھے، جو آپس میں دن بھر لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اور اُن کے شور و شغب سے تمام چھاؤنی میں کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ اُن کی دشمنوں کے ساتھ خفیہ ساز و باز تھی، جس کا نتیجہ عین جنگ میں بہت ہی بُرا نکلا۔ متذکرہ بالا تمام دولت، جاہ و حشم، زیورات و جواہرات، شاہی غلام وغیرہ، فاتحین کے ہاتھ لگے۔ پہلے ایک خمس خلیفۂ وقت کا حصہ نکال لیا گیا؛ باقی تمام مال مفروقہ وہیں میدان جنگ میں سپاہیوں کو تقسیم کر دیا گیا، جس سے ان خوش نصیبوں نے ایسے نعرہائے خوشی لگائے کہ تمام میدان گونج اُٹھا۔

جنگ واڈ لیٹ، نہایت صحیح طور پر دُنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دونوں فوجوں کی تعداد، جنگ میں جتنا وقت لگا، اور اُس کے اہم نتائج پر غور کیا جائے تو اس لڑائی کی نظیر تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ خود غرض لوگوں کی سازش کو بھی عرب کی کامیابی میں بہت بڑا دخل ہے، مگر اس سے بھی چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے کہ عربوں کی تعداد کا تناسب اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھا۔ ان کو ایک یہ بھی خسارہ تھا کہ وہ اپنے ملک سے نکل کر پردیس میں دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ باقی رہے سپاہ سالاری کے جوہر، وہ دونوں فریق کو دکھلانے کا موقعہ نہیں ملا۔ مسلمانوں کی حالت قزاقوں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ افسران فوج جتنے تھے وہ سب یا تو وحشی تھے، یا دوسرے

ممالک کے نمک حرام، جن کو اگر کچھ تجربہ تھا تو صحراء افریقیہ میں مار دھاڑ کرنے کا۔ گاتھ سُست زنانہ منش نازک اندام، بُزدل، بدچلن، اور جنگ سے قطعاً نابلد تھے؛ اُن کی شیخی کی کچھ انتہا نہ تھی؛ اور اپنے دشمن کو نہایت حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔ وٹیزا کے ظلم زیادتی اور خودسری سے اُس کی اولاد تاج و تخت سے محروم کردی گئی تھی۔ ان کے حمایتی اپنے ملک اور اپنے مذہب کو اس پر قربان کرنے پر تیار تھے کہ غاصب کو نکال دیا جائے اور اُن کا انتقام اُس سے لے لیا جائے۔

غرض اس طرح کمزور اور متزلزل سلطنت گاتھ کی عمارت گری، اور ایسی گری کہ پھر نہ کھڑی ہوئی۔ اُس کی شان و شوکت اور رعب داب مدتوں قائم رہ چکا تھا۔ بانیانِ سلطنتِ گاتھ کے سخت سیاسی اصول جا مد علاقہاء بالٹک کے لئے تو بہت موزوں تھے، مگر اُس جسمانی اور اخلاقی حالت کے بالکل منافی تھے جو بائےٹک اور لوسی ٹینیا کے اختلاط نے پیدا کردی تھی۔ ایک سُرنگ تھی کہ مدتوں پہلے لگ چکی تھی، اشرار پادریوں کی طمع اور بلند نظری، امراء اور رؤسا کے عیوب، یہودیوں کی کورنکی، اور سُست و کاہل رعایا کی بے پروائی نے اس میں بارود بھردی؛ ایک مستقل مزاج اور ذی ہمت دشمنوں کا وہاں پہنچنا ایک سنجک تھی کہ جس نے بھک سے اس سلطنت کو اس طرح اُڑا دیا کہ صفحۂ دُنیا سے اُس کا نام و نشان بھی مٹادیا۔ اُس کی جگہ اجنبی اور عجیب و غریب قوم کی سلطنت قائم ہوئی کہ جو گم گشتہ لوگوں سے نہ لباس میں مماثل تھے، نہ قانون میں، نہ رسم و رواج میں، نہ اصول سلطنت میں، نہ دین میں۔ ان مغایرتوں سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو جزیرہ نماء اندلس کی (جو قریباً منطقہ حارہ میں واقع تھا) آب و ہوا ایسی تھی کہ اس نے بہت سی اقوام کی عادات و اخلاق، پالیسی اور قسمتوں کو نامعلوم طور پر بدل دیا تھا، اور اپنے نئے مالکوں کے قواء دماغی کی نشو و نما میں بہت ہی مدد دی۔ اُن کے عقیل و فہیم و ذکی بادشاہوں نے وہ تہذیب و تمدن پھیلایا کہ جس کی شعاعوں نے اُس کے مرکز، یعنی قُرطُبہ، سے نکل کر قرونِ وسطےٰ کی اندھیری دُنیا کو منور کردیا۔ اُن کے

ارباب سیاست کی جوہر دماغی، اُن کے سپہ سالاروں کی قابلیت اور اُن کی فوجوں کی ہمت وشجاعت نے وہ دھاک بٹھائی تھی کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھا کانپ رہا تھا، اور ہر ملک اور سلطنت اپنے ہی دارالسلطنت میں اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ وہ ایسے دیو تھے کہ اُن کا سایہ ہر جگہ نظر آتا تھا۔ مستقر سینٹ پیٹر، یعنی روم صدیوں اپنی تباہی کے ڈر سے کانپتا رہا۔ صدیوں وہ مذہب (مسیحیت) اپنی بربادی سے ہراساں رہا کہ جو بت پرستی اور وہم پرستی کے کھنڈروں پر قائم ہوا تھا۔

دریاء واڈلیٹ سے قوم گاتھ کے قدم اوکھڑنے کے بعد جو پریشانی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی ہے وہ آناً فاناً تمام ملک میں پھیل گئی۔ اس قوم نے قمارخانۂ جنگ میں تمام ذرائع ملک وسلطنت کی بازی لگائی، اور ہار گئی۔ بادشاہ اس طرح غائب ہوا کہ آج تک ڈھونڈھا جارہا ہے اور نہیں ملتا۔ میدان جنگ کی خونریزی اور مقاتلہ اور اس سے بھی سخت تر مصیبت فرار نے امراء و رؤساء کی یہ حالت کردی کہ دعویداران سلطنت میں سے ایک بھی نہ بچا! اور اگر کوئی بچا بھی ہو تو اُس کا نام ونشان ہی کھو گیا۔ مقدس پیشہ وروں، یعنی پادریوں نے خود میدان جنگ میں آکر سپاہیوں کو ابھارا اور سخت زیادتیوں پر مائل کیا، مگر باوجود اس کے وہ ان کو مسلمانوں کی نوک شمشیر سے نہ بچا سکے۔ حملہ آوروں کو اُن کے خلاف اتنا جوش اور اتنی نفرت تھی کہ وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کلیسائی لباس، اور کلیسا کی نشانیاں، دیکھ کر اُن کو غصہ آتا تھا۔ اسی میں مقدس ترین پادری تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ غیور مسلمانوں سے پادریوں کو کہیں پناہ نہ تھی جن لوگوں نے کہ غلامان سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو ابدی لعنتی قرار دیا تھا، اُن سے وہ غلامی کا ذلیل ترین کام بھی لینا گوارا نہ کرتے تھے وہ خزاینِ دولت جو کئی نسلوں سے برابر جمع ہو رہے تھے، اور جس کا اظہار وہ لوگ خلوت و جلوت، دربار اور میدان جنگ میں کرتے رہے تھے از اول تا آخر فاتحین کے ہاتھ میں آگئے۔ جو لوگ کہ خوش قسمتی سے کسی قریب ہی کے شہر میں پناہ لے چکے تھے اُن کے پیچھے ہی

پیچھے وہاں وہ دہقین بھی پہنچ گئے جو اپنے جھونپڑوں اور اپنے کھیتوں کے جلنے کا تماشہ دیکھ چکے تھے۔ ایک ہی وہلہ اور ایک ہی دن میں یورپ کا ایک نہایت آباد و شاد، مرفہ الحال و دولتمند ملک ایک نامعلوم دشمن کا شکار ہو گیا۔ حالانکہ یہ وہ ملک تھا کہ جو متواتر دو صدیوں تک، باوجود ناموافق حالات کے، نہایت کامیابی کے ساتھ رومی رعب داب و ذرائع کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ پھر اس پر تین سو برس ایسے آئے کہ قوم وزیگاتھ نے اپنے اجداد کی روایات قدیمہ اور فوجی نام و نمود پر بھروسہ کر کے، بمشکل تمام، اس ملک کو قیاصرہ کے کمزور ہاتھوں سے چھینا تھا، اور ہالی فرانس کے حملوں کو روکا اور ان کو ماوراء پائے رینیز تک دھکیلا تھا۔

مگر جہاں اس ملک پر پے در پے مصایب پڑے وہاں مجہول اور خوفزدہ رعایاء ملک تباہ بھی ہو گئی۔ غضب یہ تھا کہ پادری سب کو دھمکاتے تھے، اور اپنے مخصوص غرور جہالت سے بیرونی حملہ کی دھمکیاں دیا کرتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے، کہ تم جیسے گنہگاروں کی اگر خدا کی طرف سے کوئی سزا ہو سکتی ہے تو یہی کہ تم کو کوئی دشمن آکر پیس ڈالے وہ گناہ کیا تھے؟ وہی تھے کہ جن میں وہ خود آغشتہ، اور نہایت بے شرمی کے ساتھ خود آلودہ تھے؛ اور اس زمانہ میں بھی کہ جو، بے ایمانی اور بے حیائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، سخت بدنام تھے۔

بلند نظر طارق کی سرکردگی میں مسلمان بڑھتے چلے جاتے تھے، اور برکات فتح سے برومند ہو رہے تھے۔ جب اس قاید اعظم نے اپنے وہ کارنامے دکھلائے اور وہ قابلیت ظاہر کی تھی کہ جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، تو ایسے خداداد موقعہ سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ ان کی فوج بھی وہ نہیں رہی تھی کہ اس میں پیادوں ہی کی تعداد زیادہ ہو، بلکہ اب دشمنوں کی عنایت سے ان کو اتنے گھوڑے مل گئے تھے کہ ساری فوج سوار تھی؛ اور با سرعت زمان جہاں چاہتی حملہ کر سکتی تھی۔ ہر جگہ اس کے دستے بھیج دیئے

جانتے تھے، کہ دشمن جو ادھر اُدھر آوارہ پھر رہے تھے، اُن کو گرفتار، یا قتل کرتے رہیں، اور جتنی رسد شہروں کو جاتی دیکھیں اُس کو پکڑ لیں۔ یہ شہر وہ تھے کہ جو پناہ گزینوں کی وجہ سے اُمڈے پڑے تھے، اور فاقوں کی مصیبت سے لرزاں تھے۔

میدان جیریز کی فتح کی خبر افریقیہ کے گاؤں گاؤں میں پھیل گئی۔ لوٹ اور ناموری کی طمع میں ہزاروں مسلمان اپنا خانمان چھوڑ کر طارق کے علم کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ طارق نے ان لوگوں کی نئی فوج مرتب کی، اور کارآزمودہ، معتبر افسروں کی ماتحتی میں اُن کو دے کر شذونہ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد کارمُونہ (قرمونہ) جیسے مضبوط شہر پر توجہ کی۔ چونکہ اس کو بذریعہ محاصرہ فتح کرنا مشکل تھا اور اس میں وقت بھی زیادہ لگتا، اس لئے اُنہوں نے اُس پر خدعۂ حربیہ سے قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کاونٹ جولین کی فوج کا ایک دستہ اُسی نیک بخت کی سرکردگی میں، رات کے وقت اس طرح وہاں پہنچا کہ گویا مسلمانوں کے خوف سے بھاگا ہوا آیا ہے، اہل شہر نے اُن کو پناہ دینے کے لئے اندر بلا لیا، رات کا وقت تھا ہی، انہوں نے اندر پہنچتے ہی محافظین کو قتل کر ڈالا اور شہر کے دروازے کھول دیئے یہاں سے طارق اے سی جا کی طرف بڑھے، جہاں وریاء و اڈلیٹ کے بقیۃ السیف آدمیوں نے پناہ لی تھی۔ گاتھ نے اس شہر کے قلعہ و بروج پر اطمینان نہیں کیا۔ مایوسی اُن کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہاتھ پیر نہ ہلائے تو وہی نتیجہ ہیں، بھوکوں مرنا، یا غلام ہو جانا! اس لئے اُنہوں نے باہر نکل کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چونکہ یہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے، خوب بے جگر ہو کر لڑے۔ اگرچہ اس لڑائی میں مسلمانوں کا اتنا نقصان ہوا کہ اب تک اس جزیرہ نما کی کسی لڑائی میں نہ ہوا تھا، مگر آخر پالا ان ہی کے ہاتھ رہا؛ گاتھوں نے شکست کھائی، اور مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں راہب اور راہبات بہت سی جمع تھیں، موخر الذکر کے حُسن کا شہرہ ملک بھر میں پھیلا ہوا تھا؛ وہ ڈر رہی تھیں کہ ہم کفار کے محلوں کی زینت بننے والی ہیں! اس لئے انہوں

نے وہ دلیری دکھلائی جو مردوں سے ہونی مشکل تھی، یعنی اپنے چہروں پر زخم لگا کر اپنی خوبصورتی کو خراب کر لیا، تا کہ اُن کی عصمت اور جان محفوظ رہ جائے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ان قزاقوں، یعنی مسلمانوں کا دل اُن کے ایثار کو دیکھ کر پسیج جاتا، اور اُن کو رحم آجاتا، لیکن اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلا ہوا دیکھ کر اُن کو بہت ہی غصہ آیا؛ جہاں کہیں وہ کسی کو راہب یا راہبہ کا لباس پہنے ہوئے دیکھتے غیض و غضب میں بھر جاتے، پہلے اُن کی عصمت دری کرتے اور پھر اُن کو قتل کر ڈالتے۔ یوں کئی سو اچھوتیاں جو مسیح کے نام پر بیٹھی تھیں، اور جنہوں نے اپنے حسن کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑا تھا تہ تیغ ہو کر شہداء میں داخل و شامل ہو گئیں۔

یہاں تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر موسےٰ نے ان فتوحات کی خبر دمشق کو بھیجی۔ مگر چونکہ رشک و حسد اُن کی طبیعت میں تھا اس لئے انہوں نے دیدہ و دانستہ اُس سپہ سالار کا نام نہ لکھا جس نے یہ فتوحات حاصل کی تھیں۔ اُدھر اُنہوں نے یہ قصد مصمم کیا کہ خود اندلس جائیں اور اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ اُنہوں نے فوراً طارق کو لکھا کہ جب تک وہ وہاں نہ پہنچیں وہ پیش قدمی نہ کریں۔ لیکن فاتح واڈلیٹ اِس کو اچھی طرح جانتے تھے کہ دشمنوں کو آرام کرنے، اور اپنی حالت کو درست کر لینے کا، موقعہ دینا سخت مضر ہے۔ کاونٹ جولین نے بھی یہ مشورہ دیا کہ خلیفۂ وقت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس وقت پیش قدمی نہ روکی جائے، اور فوراً طلیطلہ پر حملہ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موسےٰ کے حکم کی تعمیل نہ کرنے ہی میں اُن سب کی خیریت تھی۔ اِن سب امور پر غور و خوض کرنے کے بعد طارق نے تمام فوج کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ صرف اُن لوگوں سے لڑیں جو ہتھیار باندھے ہوئے ہیں، غیر مصافی لوگوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں، اور رعایائے اندلس کے مذہبی و دینی خیالات کا احترام کریں۔ اس کے بعد وہ ایک بڑی فوج لیکر قُرطبہ کی طرف بڑھے۔ یہ شہر خوب مضبوط تھا، اور اس کو عیسائیوں نے اچھی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔ نو روز تک تو طارق اُسکا محاصرہ کئے رہے، مگر یہ دیکھ کر کہ اُسکی فتح میں

دیر لگیگی اُنھوں نے مغیث الرومی کو وہاں کا سپہ سالار قرار دیا اور بہت سی فوج اُن کی سرکردگی میں چھوڑ کر خود فوراً طلیطلہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حاکم قرطبہ شاہی خاندان وزیگا تھ سے تھا، اور بڑا بہادر، مستقل مزاج و ذی ہمت۔ طارق کے چلے جانے کی خبر سے اُس کے دل کو بہت ہی ڈھارس ہوئی، اور اُس نے یہ سوچا کہ جو فوج تعداد میں اُس کی فوج سے زیادہ نہیں ہے، اُس کو مار لینا کتنا بڑا کام ہے، لیکن خوش قسمتی، جو اب تک مسلمانوں کا ساتھ دیتی چلی آرہی تھی، اُس نے اب تک اُن کو نہیں چھوڑا۔ مغیث الرومی کو بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ قلعہ قرطبہ میں ایک ایسی کمزور جگہ ہے کہ جہاں سے وہ فوج لے کر اندر پہنچ سکتے ہیں۔ اُن دنوں اندھیری راتیں تھیں، مغیث الرومی کی خوش قسمتی کہ جس روز اُن کو یہ معلوم ہوا اُسی رات کو سخت طوفان باد و باراں و ژالہ باری آیا؛ اُس کو اُنھوں نے امداد غیبی سمجھا، اور ایک چرواہے کی راہبری سے اپنی فوج کو دریا سے عبور کرا کر اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ بآسانی شہر کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ وہاں ایک انجیر کا درخت تھا۔ ایک چست و چالاک سپاہی اُس پر چڑھ کر فصیل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے اُس نے اپنا عمامہ نیچے لٹکا کر بہت سے سپاہیوں کو اوپر کھینچ لیا۔ اُنھوں نے بغیر کسی قسم کے تعرض کے تمام مورچوں پر قبضہ کر لیا؛ کیونکہ طوفان سے بچنے کے لئے تمام چوکیدار کسی محفوظ مقام میں چلے گئے تھے؛ مغیث کے یہ سپاہی، دبے پیر، بہت جلد بازاروں میں سے ہوتے ہوئے شہر کے دروازے پر پہنچ گئے، اور تمام چوکیداروں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیا۔ فوج اندر آگئی، صبح ہوتے ہوتے شہر قرطبہ مسلمانوں کے قبضہ میں* تھا۔ گورنر شہر چار سو سپاہیوں کو لے کر سینٹ جارج کے گرجا میں جا چھپا، جو مغربی فصیل کے برابر واقع تھا۔ اُس کے گرد ایک خندق تھی؛ قریب ہی کے پہاڑ کے چشمہ سے یہاں نیچے ہی نیچے ہو کر پانی پہنچتا تھا۔ گرجا کی صورت بالکل قلعے کی سی تھی، مورچے وغیرہ

---

* حضرات ناظرین حیران ہونگے کہ جس آسانی سے قرطبہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اُسی آسانی سے اُن کے ہاتھ سے نکل بھی گیا۔ (مترجم)

بنے ہوئے تھے، پانی کی کمی تھی ہی نہیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایسی فوج کا مقابلہ کر سکتے تھے جس کے پاس فوجی کلیں نہ ہوں، اور فن محاصرہ سے نابلد ہو کچھ روز تو گاتھ مغیث الرومی کا مقابلہ کرتے رہے، آخر موخرالذکر نے اُس چشمہ کے پانی کا راستہ ڈھونڈھ نکالا جو گرجا میں پانی پہنچاتا تھا۔ نل بند کر دیئے گئے اور جب گرجا والے پیاس سے مرنے لگے تو انہوں نے بمجبوری اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کر دیا۔ بہت سے سپاہیوں کو تو آزاد کر دیا گیا، کہ وہ اپنے شمالی علاقہ کے دوستوں سے جا ملیں، مگر افسران فوج، بالخصوص گورنر، ایسا آدمی تھا کہ اُس کو رہا کر دیا جاتا۔ چنانچہ یہ وہیں فاتح کی چھاؤنی میں قید رکھے گئے۔

ایسیجا سے چلتے وقت طارق نے اپنے ایک افسر زید ابن کسادہ کو اس غرض سے آگے بھیج دیا تھا کہ وہ جنوبی علاقہ کو روند ڈالیں جیسا کہ اور جگہ ہوا، اس علاقہ میں بھی عربوں کا ہول اُن کے آنے سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ باجہ، این ٹے کیورا، ایلویرا اور اُن کے گرد و نواح کے علاقے تو بغیر کسی مقابلہ کے فتح ہو گئے، لیکن غرناطہ نے اپنی مضبوطی کے گھمنڈ میں اطاعت قبول نہیں کی، نہ اُن شرائط کو مانا جو حملہ آوروں نے پیش کیں۔ مجبوراً اُس کو عنوتاً فتح کرنا پڑا۔ چونکہ مسلمانوں کے پاس فوج بہت کم تھی اس لئے وہ مفتوح شہروں میں محافظت کے لئے دستے نہ چھوڑ سکے، البتہ اتنا کیا کہ بڑے بڑے شہروں میں عرب گورنر مقرر کر دیئے۔ یہودیوں کو چونکہ مذہبی اذیتوں سے فراغت ہو گئی تھی، اس لئے وہ مسلمانوں کی مدد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ غرناطہ میں یہودیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ شہر ہی گویا یہودیوں کا تھا۔ ان ہی لوگوں کی مدد سے ایک چھوٹا سا دستہ فوج کا ایک لاکھ آدمیوں کو قابو میں رکھنے کیلئے کافی تھا۔ زید اپنی مہم کو بکامیابی ختم کر کے، بہت ہی تھوڑے سے نقصان سے، نہایت بیش قیمت لوٹ اور بے تعداد غلاموں اور کنیزکوں کو ساتھ لئے ہوئے طارق سے طلیطلہ میں جا ملے۔ راستے میں انہوں نے لگے ہاتھوں جین کو بھی فتح کر لیا۔

واڈلیٹ کی لڑائی کے آٹھ مہینہ بعد مسلمانوں کی فوج دارالسلطنت وزیگاتھ کے سامنے

پہنچی۔ یہ شہر بہت بلندی پر واقع تھا۔ دریا ٹیگس عملی طور پر اس کو گھیرے ہوئے تھا اس کی دھار نہایت تیزی کے ساتھ ایک گہری جھیل میں گرتی تھی، جو ایک چٹان کو کھود کر بنائی گئی تھی۔ قدرت الٰہی کے ساتھ ہی ساتھ انسانی صنعت نے بھی اس کو بالکل ایسا بنا دیا تھا کہ اس کا فتح کرنا سخت محال تھا اُسکی فصیل اتنے بڑے بڑے پتھروں کی بنی ہوئی تھی کہ گویا چٹانیں لاکر رکھ دی ہیں۔ دریا کی طرف یہ فصیل بہت ہی بلند تھی۔ اُس طرف ایک کھڈ بھی اتنا بڑا تھا کہ اُدھر سے سیڑھی لگا کر چڑھنا قریباً ناممکن تھا۔ شمال کی طرف جو راستہ تھا اُس میں لوہے کے کانٹے لگائے ہوئے تھے اور باہر کی طرف اُس کو دوہرا دوہرا مضبوط کیا ہوا تھا۔ حفاظت کی یہ تمام تدابیر ومبا کی کی ہوئی تھیں۔ قوم گاتھ کا یہ آخری تاجدار تھا، جس میں کچھ جنگی جوہر تھا، اسی نے اس قوم کی قدیمی پُرشان وشکوہ اور روایات کو تازہ کر دیا، جس کو مدتوں سے وہ لوگ بھولے ہوئے تھے اس دار السلطنت نے، جو خود بمنزلہ ایک قلعہ کے تھا، اور جس کے مضبوط کرنے میں اُس زمانہ کے تمام جنگی ذرائع ختم کر دیئے گئے تھے، دربار شاہی کو پوری طور پر محفوظ کیا ہوا تھا، مگر اب چند ہزار آوارہ گرد حبشیوں کو دیکھ کر کانپ رہا تھا۔ ان نامعلوم دشمنوں کا خوف تو ہر جگہ چھایا ہوا تھا ہی، اُن کی سُرعت رفتار اور سُرعت پھرت سے اُن کا اتنا رعب بڑھ گیا تھا کہ اندلس کی تمام واہمہ پرست لوگ اُن کو ہر جگہ حاضر وناظر سمجھنے لگے تھے اس قلعہ کی مدافعت کے لئے کافی فوج کی ضرورت تھی، مگر یہاں جذبات حب الوطنی نمک حلالی اور ہمت واستقلال کی سخت ضرورت تھی کہ رعایا اپنے بادشاہ کی اطاعت و انقیاد کے ساتھ منظم بھی رہے، مگر اسی کا وجود یہاں عنقا ہو چکا تھا جب دشمنوں کی آمد آمد سُنی تو بجاء اسکے کہ لوگ متفق ومتحد ہو کر مقابلہ کی کوشش کرتے، ہر شخص کو اپنی ذاتی حفاظت کا فکر پڑ گیا۔ شہر کے زیادہ تر آدمی اپنا گھر بار چھوڑ چھاڑ کر گے لی شیا (جلیقیہ) یا الیسٹریاس (استوریہ) کو بھاگ گئے۔ فوج محافظ کے شتر بے مہار سپاہیوں نے گھروں کو خالی دیکھ کر خوب ہی لوٹا، اور نہتے جلاوطن پناہ گزینوں کو خوب ہی کھسوٹا۔ اہالی کلیسا نے اس خطرہ

حاضرہ کو عارضی سمجھ کر گرجاؤں کے خزانوں کو اُن ہی کے تہ خانوں میں چھپا دیا۔ یہ دفینے اب تک لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ وہاں موجود ہیں۔ رئیس الاساقفہ اپنے مقلدین کے ساتھ گرجاؤں کی نہایت قیمتی اشیاء کو لے کر روم کی طرف سر پر پاؤں رکھ کر اس طرح بھاگا کہ جب تک بحفاظت تمام روم میں نہ پہنچ گیا اُس نے پھر کر اندلس کی طرف نہ دیکھا؛ اور اپنے پیچھے اپنے ماتحت افسروں کو چھوڑ گیا کہ کفار کے ہاتھ سے انعام شہادت حاصل کریں۔ پادریوں اور راہبوں کا ایک بیہودہ گروہ خواہ اپنے اعتقاد کی بنیاد پر یا اپنی حماقت اور کسل کی وجہ سے وہیں پڑا رہ گیا؛ اور روزے رکھ کر دعائیں مانگ کر اندروں و بیروں شہر کی زیارتگاہوں میں جا جا کر اس آئی مصیبت کو ٹالنے کا فکر کرنے لگے۔ اُن کی شامت اعمال کہ ان تدبیروں سے بھی امداد غیبی اُن کو نہ ملی عربوں کی لہلہاتی ہوئی بیرقیں اور چمکتے ہوئے نیزے دور سے نظر آئے۔ اُن کے سبک رو گھوڑوں نے ایک مرتبہ تمام فصیل شہر کا آناً فاناً میں چکر لگایا؛ تمام کھیت تباہ کر ڈالے گئے؛ تمام خانقاہیں اور بنگلے جو شہر کے گرد تھے یا تو منہدم کر دیئے گئے یا جلا ڈالے۔ جتنے آدمی ادھر اُدھر چلتے پھرتے ملے اُن کو تلوار کے زور سے اپنا مذہب چھوڑنے مسلمان ہونے یا غلامی قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جس شہر سے کہ ساری فوج محافظ بھاگ چکی ہو آدھے آدمی شہر چھوڑ چکے ہوں صرف غیر مصافی لوگ یا یہودی رہ گئے ہوں جو پہلے ہی دشمنوں سے ملے ہوئے تھے ایسا شہر مقابلہ کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی معمولی شرائط اُن کے سامنے پیش کیں اور اُنہوں نے بلا پس و پیش مان لیں۔ جن لوگوں نے واپس جانا چاہا اُن کو اجازت دیدی گئی اور اُن سے یہ کہہ دیا گیا کہ اگر وہ اپنے گھروں کو چھوڑ دینگے تو اُن کی تمام مقبوضہ چیزیں ضبط کر لی جائینگی۔ جن لوگوں نے شہر ہی میں رہنے کا ارادہ کیا۔ اُن کی حفاظت کامل کا بشرط ادائے ٹیکس (جو خفیف تھا) وعدہ کر لیا گیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے اپنے مذہبی فرائض و مراسم ادا کرنے کی کامل آزادی

دے دی گئی، لیکن شہر کے آدھے گرجا بحق مسلمانان ضبط کرلئے گئے؛ اور بلا اجازت کسی نئے کلیسا کے بنانے کی ممانعت کردی گئی۔ ذمیوں کو اجازت دی گئی کہ جہاں تک اُن کے قوانین فاتحین کی پالیسی سے متضاد نہ ہوں وہ اُن پر عمل کرتے رہیں مسلمان ہونے کے لئے ہر قسم کی آسانیاں دی گئیں۔ اگر عیسائی مسلمان ہونا چاہے اور کوئی شخص اس کا مانع آئے، یا اُس کی تہتک کرے یا اُس پر جبر کرے تو وہ سخت سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔ فاتحین کی فیاضانہ پالیسی نے یہ اور اسی قسم کے نرم دستور العمل تمام باشندگان جزیرہ نمائے اندلس کے لئے قرار دیئے۔ وحشیوں کی سختیوں، قرطاجنہ والوں کی دوزخی چالوں، اور رومیوں کی طمع اور خود غرضی کے مقابلہ میں فاتحان جدید کی شرائط ایسی نرم اور معقول تھیں کہ سب لوگوں نے اُن کو بخوشی منظور کر لیا۔

باوجود اسکے کہ مفرورین بہت سا مال و دولت اپنے ساتھ لے گئے تھے، پھر بھی جو لوٹ مسلمانوں کے ہاتھ آئی وہ بے تعداد تھی۔ ان کی زیادہ طلبی معمولی طور پر تو ایسی تھی کہ وہ کسی طرح بس کرنے والے نہ تھے، لیکن اس وقت جو کچھ اُن کو ملا اُس پر وہ قانع معلوم ہوتے تھے۔ انواع و اقسام کی بے تعداد چیزیں فاتح سپاہ کے سامنے اتنی پڑی تھیں کہ وہ گھبرائی اور للچاتی ہوئی نظروں سے اُنہیں دیکھتے تھے۔ کوہستان اطلس کے وحشی اور ندیدہ آدمی اکثر یہ کرتے تھے کہ کلیسا کی قیمتی اور مرصع بجواہر چیزوں کو دیکھتے تھے، اور جب کوئی اُس سے بھی بڑی اور قیمتی چیز اُن کے نظر پڑتی تھی تو پہلی کو اُٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے نہایت معتبر مورخین نے لکھا ہے کہ دو بربریوں کو ایک نہایت قیمتی کپڑا ملا جو فرش بانگاہ پر ڈالا جاتا تھا۔ اُسکے حاشیہ پر سنہرا کام تھا، اور اُس میں نیلم اور زمرد ٹنکے ہوئے تھے؛ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ اُن کے اُٹھائے نہیں اُٹھ سکتا، اس لئے وہ حصہ، جس میں جواہرات تھے، اُنہوں نے کاٹ لیا۔ باقی سب کو اُٹھا کر پھینک دیا۔ ایک اور شخص کو ایک سونے کا برتن ملا، جس میں موتی بھرے ہوئے تھے، اُس نے

برتن رکھ لیا، اور موتیوں کی قدر و قیمت سے چونکہ واقف نہ تھا، اس لئے سب کو وہیں پھینک دیا۔ کلیساؤں میں بہت سے تاج تھے، جو بادشاہوں نے نذر دیئے تھے، اور اُن کے نام اُن پر کُھدے ہوئے تھے۔ بھاگنے کے وقت جو گھبراہٹ آدمی کو ہوتی ہے، اُسی میں ہر قسم کی قیمتی اشیاء معبدوں میں چھوڑ کر لوگ بھاگ گئے تھے۔ یہ چیزیں، جو نہایت بیش قیمت تھیں، فاتحین کے ہاتھ لگیں۔ جس محل میں کہ طارق ٹھہرے تھے اُس میں ایک کمرہ اُن خزاین اور تمغات شاہی سے بھرا ہوا تھا، جو اُن مختلف خاندانوں کے بادشاہوں نے جمع کر رکھے تھے کہ جنہوں نے سلطنت وزیگاتھ کو عروج پر پہنچایا تھا۔ ان میں سے زنجیریں، جواہرات، خالص سونے کی چیزیں، بغیر کٹے ہوئے ہیرے، مرصع تلواریں، بہت سے مرصع ہتھیار، قیمتی زرہ و بکتر، سنہرے کپڑے تو مورخین نے گنائے ہیں۔ عیسائی مورخین نہایت شرم اور رنج کے ساتھ ان کا تذکرہ اپنی تصانیف میں کرتے ہیں، اور مسلمان مورخین نہایت فخر و مباہات کے ساتھ، جو فاتحین کو زیبا ہے۔

جب دارالسلطنت اُن کے ہاتھ میں آگیا تو طارق نے اپنے حلیفوں یعنی یہودیوں کو شہر سپرد کیا، اور خود شمالی علاقے کی طرف گاتھ کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر یہ ہوتا رہا ہے کہ جہاں قوم گاتھ نے عمامہ باندھے ہوئے سواروں کا طوفان آتے دیکھا، اور یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پہاڑوں کو بھاگے۔ طلیطلہ سے وہ کچھ ہی فاصلے پر گئے ہونگے کہ اُن کو چند مفرورین ملے۔ طارق نے اُن کو گرفتار کیا۔ اُن کے پاس ایک میز یا رحل تھی، جس پر کتاب مقدس رکھی جاتی تھی، اور کسی گرجا کی ملکیت تھی۔ اُس زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ یہ میز (یا رحل) حضرت سلیمان (علےٰ نبینا و علیہ السلام) کی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یروشلم کی لوٹ میں یہ ٹی ٹس[۸] کے ہاتھ لگی تھی، لیکن معتبر بات یہ ہے کہ وہ وزیگاتھ کے کاریگروں کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ ساری میز خالص سونے کی تھی، اُس کے گرد یکے بعد دیگرے نیلم، یاقوت، موتی اور زمرد کے حاشیہ تھے۔ یہ رسم رہی ہے کہ ہر ایک بادشاہ جو تخت پر

بیٹھتا تھا اُس کی ترصیع میں مدد دیتا تھا، اور ایک دوسرے سے سبقت لیجانا چاہتا تھا اُس کی تقدیس کی وجہ سے یہ اور بھی بے بہا ہوتی چلی جاتی تھی۔ واہمہ پرست لوگ بہ نسبت اُس کے جواہرات اور سونے کے اُس کو زیادہ مقدس سمجھتے تھے۔ اُس کے چار پایے تھے، جو سرتاپا زمرد میں مغرق تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک ایک نیلم کے ٹکڑے سے بنے ہوئے تھے۔ اُس کی قیمت پانچ لاکھ اشرفی آنکی جاتی ہے، بلکہ اس میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مورخ محققین کو اُس کے وجود ہی کا شبہ ہوتا ہے۔ بہرحال طارق نے اس کو خلیفۂ وقت کے خُمس میں شامل کرنے کے لئے علحدہ کر لیا۔

فتح طُلَیْطلہ اس بربری سپہ سالار کا (اللہم ارحمہُ وجزاہ اللہ عنا) سب سے بڑا آخری کارنامہ تھا۔ مگر یہ بھی اُس گناہ نافرمانی کا کفارہ نہ ہو سکی جو اُنہوں نے اپنے آقا کا کیا۔ کچھ اور بھی چھوٹے چھوٹے شہر اُنہوں نے لئے، اور بہت سے بڑے شہروں کو تباہ کیا یہ ہو ہی رہا تھا کہ یکایک موسےٰ ابن نُصیر کے آنے کی خبر ملی۔ اس خوف سے وہ سخت غیظ و غضب میں ہونگے، طارق کو، باوجود اپنی تمام شان وشوکت اور فتح ونصرت کے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

طارق کی شہرت اور ہر دلعزیزی اور دولت جمع کرنے کا شہرہ سُن سُن کر موسےٰ کو بے انتہا حسد پیدا ہوا، اور بے حد غصہ آیا۔ تمام آوارہ گرد مصائی آدمی تو پہلے ہی افریقیہ سے آکر طارق کے علم کے نیچے جمع ہو چکے تھے، جس سے وہاں کی فوج کی تعداد کم ہو گئی تھی اصلی مہم کی روانگی سے چودہ مہینہ کے بعد موسےٰ اتنی فوج جمع کر سکے کہ خود اندلس کی طرف بڑھیں آبنائے کو اُنہوں نے بڑی فوج کے ساتھ عبور کیا، اور جزیرۃ الخضرا میں لنگر انداز ہوئے۔ اُن کے ساتھ معزز ترین خاندان عرب کے آدمی تھے (جن میں بہت سے صحابی بھی تھے) اور افریقیہ کے چیدہ چیدہ جوان۔ طارق کی کامیابیوں پر تو اُن کو حسد تھا ہی، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس بربری نے کوئی شہر یا کوئی گاؤں، ایسا نہ چھوڑا ہو گا کہ جس کو نہ لوٹا ہو۔ اس لئے وہ طُلَیْطلہ کی

طرف اُس راستے سے بڑھے جو طارق نے اختیار نہ کیا تھا۔ جب اُنھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو اُن کے بدرقوں نے اُن کو ایسے راستہ سے لیجانے کا وعدہ کیا جس پر ایسے شہر پڑتے ہیں کہ جو اُن شہروں سے زیادہ وسیع اور زیادہ دولتمند تھے کہ جو اُن کے نافرمان سپہ سالار کے ہاتھ میں پڑ چکے تھے۔ پہلے وہ اُن کو کارمونہ (قرمونہ) لے گئے، جو اندلس کے اور شہروں کی طرح، طارق کے آگے بڑھتے ہی مسلمانوں کے رلقۂ اطاعت سے باہر ہو گیا تھا۔ یہ قلعہ بند شہر باوجود اپنی مضبوطی کے، فوراً ہی اس نئے حملہ آور کا مطیع ہو گیا۔ اُس کے بعد اشبیلیہ نے اُن کی اطاعت قبول کی، جو اُس وقت بھی ویسا ہی دولتمند اور خوبصورت شہر تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ البتہ اس کے فتح کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا، گو اس کے لئے اُن کو کئی خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، جس میں مسلمانوں کا خاصہ نقصان ہوا۔ شہر میں فوج محافظ چھوڑ کر موسیٰ میرِیڈا[9] (ماردہ) کی طرف بڑھے۔ یہ مقام رومیوں ہی کے زمانہ سے بوجہ اُس کی مضبوطی، امورِ رفاہ عامہ، شان و شوکت عمارات اور بت خانوں کی دولت مندی کے مشہور چلا آتا تھا۔ اُس کے بانی آگسٹس کے فوجی تجربہ کار افسر تھے اور اُس کو اُسی کے انتساب کی عزت حاصل تھی۔ اس میں آٹھویں صدی تک اصلی بانیوں کے زمانہ کی عمارات باقی تھیں؛ یہ وہی عمارات تھیں جن کو دیکھ کر تین سو برس پیشتر جرمنی کے وحشی حیران رہ گئے تھے؛ اس وقت سادہ لوح اور وہم پرست افریقی اور عربی سپاہیوں پر بھی اس نے وہی اثر ڈالا۔ بادشاہان روم کو بھی ایک طرح کی کد آپڑی تھی کہ انھوں نے صوبہ کے اس صدر مقام کے باشندوں کو اتنا روپیہ دیا کہ وہ ایسی عمارات بنا سکے جو خود روم کی عمارات کی ٹکر کی تھیں۔ ان لوگوں نے ایسے بڑے بڑے اور سخت مضبوط پُل بنائے کہ زمانۂ حال کی سائنس، باایں ہمہ ترقی، اُن کو منہدم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ پل دریاءِ وادیانہ پر بنے ہوئے ہیں۔ مختلف مقامات پر اور پل بھی ہیں کہ نہایت بلند اور خوبصورت محرابوں پر قائم ہیں۔ اگر وادیانہ کا بڑا پل ریت پر قائم کیا گیا ہے تو یہ

پُل اراضی مزروعہ پر۔ ہیڈرین(۱) اور ٹراجن(۲) کے زمانہ کے آثار تھے کہ ہر گلی اور ہر تفرج گاہ میں دکھلائی دیتے تھے۔ مضافات شہر میں تماشا گاہ اور فوجی کرتبوں کے اکھاڑے تھے۔ یہ عمارات ایسی تھیں کہ از روءِ مذاقِ عمارت و شان و شوکت کسی بڑے دار السلطنت کی زیب و زینت ہونے کی قابلیت رکھتی تھیں۔ یہاں کے رہنے والے تمام مملکت اندلس میں سب سے زیادہ امیر اور دولتمند تھے۔ یہاں کا بطریقِ بطریقیہ طلیطلہ کے بطریقیہ سے کہیں زیادہ باعظمت تھا۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بطریق کے غلام رجن کی تعداد کسی طرح ایک ہزار سے کم نہ ہوتی تھی۔ کسی کلیسائی جلوس کے موقعہ پر ایسی زرق برق و مرصع بجواہر وردیاں پہنے ہوئے اُن کے جلو میں نکلتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں چوندھیا جاتی تھیں۔ ایسی نمائشیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، تاکہ بطریقیہ کی عظمت، اور اُس کے ذرایع آمدنی کا اثر لوگوں پر پڑتا رہے صوبہ لوسی ٹانیا کے اس صدر مقام کی عمارات، اور تاریخی مقامات، کو دیکھ کر بادیہ نشینانِ عرب نقش حیرت بن کر نہ رہ جاتے تو تعجب تھا۔ ایک طرف تو وہ اُن کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے، اور اُن کو جنوں کا کام بتلایا، دوسری طرف اُن کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ شہر نہایت دولتمند ہے، اُن کے دہانِ آز میں پانی بھر آیا، اور اُنہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ایسے بڑے اور اہم شہر کو لوٹ کر کچھ تو اپنے ہاتھ رنگ لئے جائیں۔ لیکن یہاں کے باشندے بھی ایسے نہ تھے کہ اپنے آبا و اجداد کی عظمت پر پانی پھیر چکے ہوں، یا اُن کے جوہر نہ رکھتے ہوں۔ ایک نامعلوم اور قوی دشمن کو یکایک فصیل شہر کے نیچے دیکھ کر یہ نہیں ہوا کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے۔ اُنہوں نے بے تامل ان سے لڑنے کا قصد کر لیا۔ کئی لڑائیوں میں محصورین ہی بالا رہے۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف، کفن سر سے باندھے ہوئے، دشمن تھے اور دوسری طرف مسلمان، جو محاصرہ کی تدابیر سے بالکل ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ثانی الذکر ڈگمگانے لگے۔ لیکن اُن کے گرگ باراں دیدہ سپہ سالار کو اپنی عقل اور ہنر پر پورا بھروسہ تھا، اُس نے اپنے اُسی تجربہ سے فائدہ اُٹھایا، جو کئی مرتبہ افریقیہ میں بار آور ہو چکا تھا، اور جسکے موافق اُس نے ملک شام کی کئی لڑائیاں سر کی تھیں۔ اُنہوں نے

شہر کو ہر طرف سے اچھی طرح گھیر لیا۔ جو طلایہ شہر سے نکلتا اُس کو وہ گرفتار کرکے ایک ایک آدمی قتل کر ڈالتے۔ اُنہوں نے اپنے شجاع، مگر غافل دشمن کے مقابلہ میں بربری جنگ کا نقشہ جمایا۔ جو فوج اُن کے مقابلہ کے لئے نکلتی تھی اُسی کو وہ گھیر لیتے اور ٹکڑے ٹکڑے اوڑا دیتے ایسی فوجی کلیں بنالی گئیں جو اس زمانہ کے موافقِ حال تھیں لیکن وزیگاتھ کی چستی و چالاکی اور ہمت و استقلال بھی ایسی تھی کہ جہاں کہیں قلعہ کی دیوار ٹوٹ جاتی تو اندروں شہر میں کوئی گھبراہٹ کسی قسم کی پیدا نہیں ہوتی تھی، اور وہیں وہ لوگ اپنی پوری قوت سے آموجود ہوتے تھے (اسی وجہ سے وہاں کے اکثر برجوں کا نام بُرج شہدا ہوگیا ہے) اور ایک ایک کرکے اپنی جان دیدیتے تھے۔ ادھر آفتاب طلوع ہوتا اُدھر لڑائی شروع ہوجاتی۔ موسے برابر دیکھتے جاتے تھے کہ اُن کے نہایت تجربہ کار اور معتبر افسران فوج مرے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مورچے سر ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر اس موقعہ پر عربی سپہ سالار کے بیٹے عبدالعزیز سات ہزار سوار اور پانچ ہزار کمان دارلے کر اُن کی کمک پر نہ پہنچ جاتے، تو مسلمانوں کو بمجبوری محاصرہ چھوڑ دینا پڑتا۔ اہالی میریڈا کی قسمت کا یہ پاسہ کچھ ایسا اُلٹا پڑا کہ اُن کے دل ٹوٹ گئے اُدھر اجناس کا قحط ہوگیا؛ لاچار ہو کر اُنہوں نے اطاعت قبول کر لینے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ یہ ایلچی اپنی غرض لے کر عرض و معروض کرنے کے لئے موسے کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، مگر اُن کی حرکات کچھ ایسی گستاخانہ تھیں کہ موسے اُن سے ناراض ہوگئے اُنکو کئی مرتبہ دوڑنا پڑا تب جا کر کہیں اہالی میریڈا شرائط صلح پیش کرنے کے قابل ہوئے جب تمام مراتب طے ہوگئے اور وہاں کے یرغمال عربی فوج میں پہنچ گئے تو مسلمانوں نے جا کر شہر پر قبضہ کیا۔ خاطف و طماع موسے کے ہاتھ بہت دولت لگی۔ اُنہوں نے اسے جی لونا بیوۂ شاہ راڈرک، پر بھی بطور ایک سریہ کے قبضہ کیا۔ بعد میں اس ملکہ کی شادی عبدالعزیز سے ہوئی۔ یہی شادی اُن کے خاندان اور اُن کے قبیلہ کے مصائب کا باعث بن گئی میریڈا نے اپنے بچانے میں جو شجاعت و ہمت دکھلائی اُس کا حال جب اُن

عیسائیوں کو بھی معلوم ہوا جو ابھی ابھی مسلمانوں کے ربقۂ اطاعت میں آئے تھے، اور پوری طرح اُن پر تسلط نہ جما تھا، تو اُن کو بھی اہالی میرِیڈا کی تقلید کا خبط پیدا ہوا، چنانچہ اشبیلیہ، ملاغہ، غرناطہ اور جیّن[1] نے ایک ساتھ ہی بغاوت کر دی۔ موسیٰ نے پہلے اشبیلیہ کی طرف توجہ کی، کیونکہ اس علاقہ پر اُنہوں نے حال ہی میں قبضہ کیا تھا، اور یہ مقام تھا بھی بہت دولتمند۔ اس شہر کے باغیوں نے مسلمانوں کی فوج محافظ کے تیس آدمیوں کو قتل کر دیا، اور باقی سب کو نکال باہر کیا۔ یہودی، چونکہ کئی نسلوں سے غداری اور غلامی کے خوگر ہو رہے تھے، اُنہوں نے نہ صرف اپنے نئے حلیفوں کو مدد دینے سے انکار کیا، بلکہ اپنے پُرانے حریفوں سے پھر صلح کر لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس طغیان و تمرّد کی اُن کو اشد سزا دی گئی۔ عبد العزیز آندھی کی طرح وہاں پہنچے، اور شہر میں جتنے عیسائی اور یہودی مرد ملے سب کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ مسلمانوں کو اب تجربہ نے یہ سکھلا دیا تھا کہ اندلس میں آبادیاں قائم کر لینے کی اشد ضرورت ہے؛ اور چونکہ اب اُن کے پاس آدمی بھی اتنے تھے کہ وہ بلاخوف و خطر عربوں کو جگہ جگہ تقسیم کر سکتے تھے، اس لئے انہوں نے بہت بڑی فوج محافظ اشبیلیہ میں چھوڑ دی؛ اور جتنی جائداد ضبط کی تھی وہ سب اُن عربوں میں تقسیم کر دی جو اس فاتح فوج کے ساتھ تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے تاجران و رؤساء گاتھ کی نہایت پُرتکلف املاک پر قبضہ کر لیا۔ یہ پہلی مثال تھی کہ مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ ملک میں کسی خاص فرقہ یا قوم کو آباد کیا؛ اس کے بعد تو مسلمانوں نے اس کو اپنا عام رویّہ بنا لیا۔ مسلمانوں کی یہ ادنےٰ سی پالیسی تھی کہ جس کے اثرات اندلس کے مختلف علاقوں کی روایات، زبان، رسم و رواج اور خیالات سے آج تک ظاہر ہیں۔ عبد العزیز نے بہت آسانی کے ساتھ باقی غدار علاقوں کو مطیع کر لیا وہاں بھی اشبیلیہ کی طرح عربوں کو آباد کر دیا۔ اس کے بعد اِن علاقوں نے کبھی سر نہیں اُٹھایا۔ مرسیہ کے ایک حصہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور ری ہیولا اریولہ[2] نے اطاعت قبول کی تو وہاں کے عیسائیوں کو بھی تھیوڈمیر، سابق گاتھک سپہ سالار کی سفارش پر بہت سی

غیر معمولی رعایات دی گئیں۔ اس شخص کو راڈرک کے مرنے کے بعد قوم گاتھ کے ایک فرقہ نے اپنا حاکم اعلےٰ تسلیم کر لیا تھا۔

مختلف معتبر تواریخ میں کچھ ایسا تضاد ہے کہ وثوق کے ساتھ یہ کہنا ناممکن ہے کہ طُلَیطُلہ پر قبضہ کر لینے کے بعد طارق دشمن کے کتنے مُلک پر قابض ہوئے۔ غالب یہ ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ محض غزوات تھے، جنکی تاریخ میں کوئی بڑی وقعت نہیں ہے یہ ضرور ہوا کہ قوم گاتھ کی ہمت ساقط ہو گئی، اُن کی فوج تتر بتر کر دی گئی، سرکردہ لوگ یا قتل کر دیئے گئے، یا غلام بنا لئے گئے، اور اُن کے دار السلطنت اور دار الامارتوں پر عربوں نے قبضہ کر لیا۔ غور سے دیکھا جائے تو جزیرہ نماء اندلس کے تذلیل و اطاعت کامل ہو گئی تھی۔ اب اس کامیاب سالار کے لئے کوئی کام باقی تھا تو صرف یہ کہ اپنے فتوحات سے فائدہ اُٹھائے اور اپنے آقا کے قہر و غضب سے بچنے کی تدابیر سوچے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے اپنے حاکم اعلےٰ کے احکام کی دیدہ و دانستہ خلاف ورزی کی ہے، جس کی سزا فوجی قانون کے مطابق، سواء موت کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

یہ دونوں صاحب یعنی غلام و آقا، یا دونوں سپہ سالار، ٹلاویرا[۴۲] کے مقام پر ایک دوسرے سے ملاقی ہوئے۔ طارق اپنی فکر و پریشانی، اپنے تمام افسران ماتحت، اپنے تمام ذخایر کو جو دار السلطنت وزیگاتھ کے عطر و جواہر تھے لئے ہوئے یہاں آ گئے تھے۔ حاسد موسے کا غصہ بھلا کہیں ان تحفہ و تحائف سے ٹھنڈا ہو سکتا تھا، اُن کو تو الٹا ان کے دیکھنے ہی سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اُن کے غلام کو اس سے بھی زیادہ قیمتی لوٹ ہاتھ آئی ہو گی، جو میرے ہاتھ سے نکل گئی اُنہوں نے اپنے نافرمان غلام کو دیکھتے ہی بہت ہی سخت سست الفاظ میں ملامت کی۔ اُس وقت وہ یہ بالکل بھول گئے کہ اسی غلام نے کیسی بیش قیمت خدمت کی ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تمام فوج کی موجودگی میں اُنہوں نے طارق کو مارا، اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ اُن کے غلام ہیں، اور اب تک اسی کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ان کو قید کر کے، اپنے

ساتھ طلیطلہ لے گئے، اور وہاں جا کر حکم دیا کہ تمام مالِ مغروقہ جمع کر کے اُن کے سامنے پیش کریں جو اس دار السلطنت سے اُن کو حاصل ہوا تھا۔ منجملہ اس کے وہ میز، یا رحل، بھی تھی جو حضرت سلیمان (علیٰ انبینا وعلیہ السلام) کی طرف منسوب کیجاتی تھی، اور اُس کی قیمت کا شہرہ موسیٰ کے گوش زد ہو چکا تھا۔ طارق اپنے آقا کی وناءت و رذالت وبے انصافی کو اچھی طرح جانتے تھے، اُن کو معلوم تھا کہ وہ تغلب کر کے اس میز، یا رحل، کو اپنا مال مغروقہ بتلائینگے۔ اس لئے وہ بھی اپنی بربری چالاکی پر اُتر آئے۔ اُنہوں نے اُس کا ایک مرصع پایہ چھپا لیا، اور باقی موسیٰ کے حوالہ کر دی۔ موسیٰ کو جب یہ تحقق ہو گیا کہ یہ میز اسی غیر مکمل حالت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی، تو ایک پایہ سونے کا بنوا کر اُس کو مکمل کر دیا؛ اُنہوں نے تمام گاتھک خزانہ ڈھونڈ ڈھا مارا۔ مگر اتنے بڑے اور ویسے عمدہ جواہرات نہ مل سکے کہ وہ اُس پایہ کو اصلی پایوں کے برابر بنوا لیتے۔ جب یہ چیز اُن کو مل گئی تو انہوں نے طارق کو سپہ سالاری سے معزول کر کے قید کر دیا۔ یہ بربری اپنے فہم و ذکا سے جانتے تھے کہ اس قید کے معنی قتل کے ہیں، مگر انہوں نے اس مصیبت، اور اس لقین، کے بعد بھی اپنے حواس مجتمع رکھے۔ اپنے دوستوں کی معرفت اُنہوں نے اُس ایلچی کو رشوت دی، جس کو موسیٰ نے دمشق بھیجا تھا۔ وہاں سے ایک خاص آدمی یہ حکم لے کر پہنچا کہ اس نامور سپہ سالار کو رہا کر کے اُس کے عہدہ پر بحال کر دیا جائے۔ موسیٰ نے نہایت کراہت کے ساتھ خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی؛ طارق کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں، اور فوج کے نعرہائے خوشی کے درمیان اُن کو پھر بحال کر دیا گیا۔ ایک عارضی اور ظاہری صفائی ان دونوں صاحبوں کے درمیان میں ہو گئی؛ دونوں ایک دوسرے سے نہایت تپاک سے پیش آنے لگے؛ مگر دونوں کے دلوں میں نفرت کی وہ آگ سلگتی رہی جو کسی طرح بجھائے نہ بجھتی تھی۔ ایک طرف ناقابل معافی ظلم و ستم تھا، اور دوسری طرف کبھی نہ مٹنے والی دشمنی۔ غرض دونوں نے متفق ہو کر طمعِ شہرت و ناموری سے اراگون[14] (ارغون) پر حملہ کیا ہر ایک سوار کو ایک چھوٹا سا تانبے کا برتن، ایک چمڑے کا تھیلہ، خورد و نوش کی چیزیں رکھنے

کے لئے، اور پانی کی ایک چھاگل دی گئی؛ پیادوں کے پاس سوائے ان کے ہتھیاروں کے اور کچھ نہ تھا۔ خیمہ وخرگاہ سب خچروں پر لادے گئے؛ فوجی اور سیاسی ضرورت سے سخت نظام قائم کیا؛ غیر مصافی لوگوں سے بالکل سروکار نہیں رکھا گیا؛ لوٹ مار کی ممانعت کر دی گئی، اور صاف کہہ دیا گیا کہ جو کوئی اس کا مجرم ہوگا اُس کو سزاء موت دیجائیگی۔ البتہ دورانِ جنگ یا کسی شہر پر قبضہ کرتے وقت اُسکی عام اجازت تھی۔ رعایا کے مذہبی احساسات کا احترام کرنے کی تاکید کی گئی، اور یہ حکم دیا گیا کہ سواء اس صورت کے کہ مقابلہ کیا جائے، یا تشدد ہو کسی کی جایداد کو ذرا سا بھی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ تمام صوبہ کو روندڈالا گیا، اور اُسکے دارالامارت، سارا گوسا[15] (سرقسطہ) پر قبضہ کر کے اُس میں قسمت آزما افریقیوں کو آباد کر دیا گیا۔ اس شہر کے رہنے والوں پر موسٰے نے اپنی فوج کے داخل کرنے سے پہلے، ایک جرمانہ، بنام نہاد خون بہا، وصول کر لیا۔ یہ ایسی بدعت تھی کہ اس سے پہلے مسلمانوں میں نہ ہوئی تھی۔ فوج کو یہ حکم دے دیا کہ شہر میں جا کر کسی قسم کا فتنہ وفساد نہ کریں، نہ رعایا میں سے کسی شخص کو ستائیں۔ وادی ومرغزارِ ایبرو کو نئے آبادکاروں نے بہت پسند کیا؛ ان لوگوں نے وہاں کی عورتوں سے نکاح کر لیا۔ وہاں کے گورنر، حنش ابن عبداللہ نے اپنی گورنری کی نشانی ایک خوبصورت مسجد بنائی، جس کے آثار اب تک وہاں باقی ہیں۔ اس کے بعد قتلونہ اور بلنسیہ کا بھی وہی حشر ہوا جو اور علاقوں کا ہوا تھا۔ یہاں سے ان دونوں سپہ سالاروں نے اپنا راستہ بدلا، اور مغربی علاقہ کی طرف رُخ کیا، جو غیر آباد پڑا ہوا تھا، اور گے لی شیا (جلیقیہ) اور الیسٹریاس[16] میں پہنچے، جو قوم وزیگاتھ کے باقیات میں سے تھا۔ یہاں پادریوں کی حکومت تھی، اور کچھ رؤسا اپنے آپ کو وہاں کا مالک سمجھتے تھے۔ رعایا اپنے تبرکات، اور اپنے خانگی خداؤں کو دبائے بیٹھی تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا کہ کوئی اور ہوتا تو گھبرا کر واپس چلا آتا، مگر عربوں نے وہیں ایک بڑی باشان وشکوہ سلطنت کی بنیاد رکھی جو آخر میں ایسی طاقتور ہونے والی تھی کہ جس کے سامنے دنیا بھر کے سر جھک گئے اور دنیا بھر نے اُس کو بنگاہ

استعجاب دیکھا۔

موسیٰ نے امیرالمومنین کو جو اطلاعیں یہاں کے متعلق دی تھیں، اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اُن کے رفقا اس نو مفتوحہ ملک کو بہت ہی پسند کرتے تھے، اور اُس کو اہم سمجھتے تھے۔ یہ تجربہ کار اور جنگ آزمودہ سپہ سالار ایشیا سے بھی اُسی طرح واقف تھا جیسا کہ افریقیہ سے۔ وہ بارگاہ خلافت میں عرض کرتے ہیں کہ "یہاں (اندلس) کا علاقہ بلحاظ مناظر قدرت کے شام کے مماثل ہے، جیسے آسمان وہاں صاف رہتا ہے یہاں بھی بادل نہیں ہوتے، آب و ہوا میں یمن بھی اس ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یہاں انواع و اقسام کے پھول پیدا ہوتے ہیں، جن کی بھینی بھینی خوشبو ہر جگہ پھیلی رہتی ہے، اس لحاظ سے یہ ملک ہندوستان کا ہم پلہ ہے، شادابی و سیر حاصلی میں یہ ملک مصر ہے، اور اس میں مختلف قسم کی دھاتوں کی اتنی کانیں ہیں کہ ملک چین اسکی گرد کو نہیں پہنچتا۔" مسلمانوں کے ہاتھ اتنے غلام آئے تھے کہ اُنکی تعداد کو دیکھ کر یہ پرانے سپہ سالار بھی حیران رہ گئے اور بے اختیار کہہ اٹھے کہ "یہ تو میدان حشر معلوم ہوتا ہے، کہ دُنیا بھر کے لوگ یہاں موجود ہیں" حالانکہ اُن کو ابھی یہ نہ بھولا ہوگا کہ ماری نے بنیا سے اتنے قیدی وہ دے گئے تھے کہ اُن کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ قیروان کے بازار میں ایک تندرست و توانا آدمی ایک مٹھی بھر مرچوں کے عوض میں مل جاتا تھا۔ ایک عورت، جو بساطی کا سودا اور عطریات بیچا کرتی تھی، جب فتح طلیطلہ کے بعد اپنے وطن گئی ہے تو پانچ سو غلام اپنے ساتھ لے گئی تھی تیس ہزار نہایت حسین عیسائی خواتین ممالک مشرقیہ کے بازاروں میں فروخت کرنے کے لئے الگ انتخاب کر لی گئی تھیں۔ یہودیوں نے اپنے سابق ظالم آقاؤں کی مصیبت اور ذلت سے بہت بڑا نفع اُٹھایا۔ افریقی سپاہی کچھ ایسے جاہل تھے کہ وہ کسی چیز کی قدر و قیمت تو جانتے نہ تھے، یہودیوں نے ان ہی سے قربانگاہوں کے متبرک برتن اور وہ زیورات، جو خاندان شاہی کی خواتین کے حسن کو دوبالا کرتے تھے، نیز اور بہت سی پر تکلف اور قیمتی چیزیں برائے نام قیمت پر خرید لیں۔ شرفیتی کی اس فتح سے اُن کے ہاتھ اتنی دولت

آئی کہ انہوں نے اسی کی وجہ سے زمانہ مابعد میں یورپ کے سیاسی اور مالی معاملات میں بڑا اقتدار حاصل کرلیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ سلطنت وزیگاتھ کے وہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جو ایک جا مجتمع ہو کر بہت بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالنے والے تھے، اس وقت بھی کہ جب اس میں کوئی شک شبہ باقی نہ رہ گیا تھا کہ تمام جزیرہ نماء اندلس مسلمان ہو جانے والا ہے، اپنی عجیب و غریب طاقت دکھلائے بغیر نہ رہے۔ طارق اسٹورگا پہنچ گئے تھے، اور موسٰے لیوگو میں مقیم تھے کہ یکایک امیرالمومنین ولید کا پروانہ آتا ہے کہ دونوں سپہ لار فوراً دمشق میں حاضر ہوں۔ یہ حکم اس لئے نہیں دیا گیا تھا کہ دونوں افسروں کے درمیان میں دشمنی تھی، جو دونوں کے عرائض سے دربارِ خلافت کو معلوم ہوتی رہتی تھی، اور جس سے مسلمانوں کے رعب داب، اور مسلمانوں کے فتوحات کے اقتدار میں کمی آتی تھی، بلکہ اس لئے کہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں موسٰے اس نومفتوح ملک کو دبا کر خود سر بادشاہ نہ بن بیٹھیں، یہ بھی مناسب معلوم ہوا کہ طارق کو جزیرہ نماء اندلس کا گورنر مقرر کیا جائے کیونکہ وہ اپنے آقا سے بھی زیادہ وہاں ہردلعزیز ہو چکے تھے۔ یہ ملک دارالسلطنت سے اتنی دور تھا کہ اگر کوئی شخص وہاں آزاد بادشاہ بن بیٹھتا تو اس کی روک تھام اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور ہو جاتی۔ موسٰے جیسے آزمودہ کار گرگ باراں دیدہ کی بلند نظری نے بہت بڑے پیمانہ پر فتوحات کی تدابیر سوچی تھیں اور تیاریاں کی تھیں کہ جو بادی النظر میں لغو اور ناقابل عمل معلوم ہوتی تھیں، لیکن اگر غور کیا جاتا تو ایسی نہ تھیں کہ وہ پوری نہ ہو سکتیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ یہیں بال کے قدم بقدم چل کر تمام یورپ کو روند ڈالیں اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے اتنی فوج پہنچائیں کہ اس شہر کا محاصرہ اور بیز لطینی سلطنت کا خاتمہ ہو سکے۔ اگر کہیں وہ اپنے ارادوں اور تدبیروں میں کامیاب ہو جاتے تو خلافتِ دمشق کی حدودِ سلطنت رومیوں سے کہیں بڑھ جاتی۔ وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ سلطنت وزیگاتھ باوجود اپنی دولتمندی اور تین سو برس کی فوجی روایات کے ایک ہی دن میں اُن کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔ اس وقت جس آسانی کے ساتھ

مسلمانوں کے دستِ بازو کو کامیابی ہوئی تھی اُس کی مثال نظر نہیں آتی تھی۔ سپاہیوں کے دل ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ اُن میں کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ وہ خداء تعالےٰ کا برگزیدہ بندہ ہے، علاوہ بریں تمام دُنیا اس کو جانتی تھی کہ اس قابل ترین سپہ سالار نے صحراء لائے[۱۸] بیا کو کچل ڈالا، اور اُس کے تمام باشندوں کو مسلمان بنا لیا؛ کوہستان اطلس کو تہ و بالا کر دیا؛ جزیرہ نماء اندلس کے میدان مسطح کو روند ڈالا؛ وہ پچاس برس تک لڑتا رہا۔ مگر کہیں ناکام نہیں رہا، نہ کسی سے اُس نے شکست کھائی۔ کیفیت یہ تھی کہ جہاد کے نام سے مسلمانوں میں ایک جوش انبساط پھیل جاتا تھا۔ مسلمانوں کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ خواہ کتنی ہی بڑی مہم کی وہ تیاریاں کرتے اُس کو وہ کفایت کرتا۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو یہ لوگ اُس کے عادی تھے ہی کہ مالِ مغروتہ سے اپنا گزارہ کریں، اور دشمنوں کا آذوقہ چھین کر اپنا پیٹ پالیں۔ فرانس کی وحشی سلطنت، جو اندرونی اختلافات کی وجہ سے ہمیشہ بُری حالت میں رہتی تھی، اس قابل نہ تھی کہ مقابل ہو سکتی۔ وہ اتنی بھی نہ تھی کہ واڈلیٹ (وادیش) کی جیسی لڑائی بھی جھیل جاتی اس صورت میں کیا موسےٰ کے یہ خیالی پلاؤ ہی سمجھے جا سکتے ہیں کہ اپنے جوہر فوجی، اور تجربہ کار فوجی افسروں کی مدد سے وہ خلافتِ حقّہ کے وارثوں کے قدموں میں یورپ کے بہترین ملک کو لا ڈالیں، جناب پوپ اعظم کے مستقر میں گرجاؤں کی بنیادوں سے کلمہ توحید کی آواز بلند ہو، اور وہاں سے مشرق کی طرف رخ کر کے عین بیزنطینی دارالسلطنت میں شام کی فوج سے معانقہ کریں، اور اتنی بڑی فتوحات کی ایک دوسرے کو باسفرس کے کنارے پر مبارکباد دیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ فتوحات کی یہ تدابیر قرطاجنہ کے سپہ سالار کے حملہ سے موسےٰ کے ذہن میں آئی تھی، مگر اس کے نتائج بہت اہم نکلنے والے تھے چونکہ اُن صوبجات کی حالت بہت ہی منظم تھی، جو کسی زمانہ میں سلطنت رومہ میں شامل تھے، اور نیز اس وجہ سے کہ اتنی بڑی جوکھم کا کام ایک سپہ سالار کو سپرد کر دیا جائے اُسکی خلیفہ کب منظور کر سکتا تھا۔ خاص کر اس صورت میں کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر یہ تدابیر قوۃ سے فعل

میں آگئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک رقیب سلطنت قائم ہوجائیگی جس سے ہر وقت خدشہ لگا رہیگا۔ بہرکیف موسےٰ اس حکم کو دیکھ کر بہت ہی سست پاچہ ہوئے اور ان کو سخت رنج ہوا، مگر حکم کے بندے کو سوا تعمیل کے اور چارۂ کار کیا ہوسکتا ہے۔ ان کو اس امید نے ذرا ڈھارس بندھائی کہ اگر میں زبانی عرض معروض کروں تو شاید کچھ شنوائی ہوجائے، جو کام تحریر سے نہیں بنا وہ شاید تقریر سے بنجائے۔ انھوں نے فوراً چلنے کی تیاری شروع کردی۔ اپنے خواب و خیال کو ایک واقعی صورت دینے، اور نیز کچھ شیخی دکھلانے کے خیال سے انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ دربار و رعایاء دمشق کے سامنے افریقیہ اور سپین کے مال و جان مغروقہ کی نمائش کی جائے، تاکہ یہ جاہ و جلال اور فتح کی اہمیت ہی ان کی ممد و معاون ہوجائے۔

اشبیلیہ کو پہلے تو ایک مستقر قرار دیا گیا تھا، مگر اب اسی کو تمام ممالک مفتوحہ کا دارالسلطنت بنانے کی تجویز قرار پائی، کیونکہ یہ علاقہ سمندر کے قریب تھا اور افریقیہ کے مسلمانوں کو اپنے ملک میں آنے جانے کی آسانی تھی۔ یہیں محلات شاہی کی لوٹ گرجاؤں کا مال مغروقہ، بہت سے میدانہاء جنگ کا مال مسلوبہ، اچھے اچھے گھرانوں کے قیدی، بدنصیب مفتوح بادشاہ کے تمام حشم جمع کر لئے گئے۔ بہت بڑی بڑی گاڑیاں اس خزانہ کو بار کرنے کے لئے تیار کرائی گئیں، جس کی قیمت کا اندازہ ایشیا کے مبالغہ کرنے والے لوگ بھی نہ لگا سکے۔ جب سب تیاریاں ہوچکیں تو موسےٰ نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اپنی غیر حاضری میں نائب السلطنت مقرر کیا، اور سبتہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اپنی روانگی سے پہلے انھوں نے احکام جاری کر دیئے تھے کہ راستہ بھر میں جو شہر ملے وہ اپنی کچھ نہ کچھ فوج ان کے ساتھ کردے، جس سے یہ مقصود تھا کہ ان کی شان و شوکت اور بھی دوبالا ہوتی چلی جائے۔ ماریٹین یا کے خونخوار سرداران قبائل اس فاتح کی جلو میں بحیثیت محافظ تن، باجگزار، اردلی یا غلام کے ہمرکاب تھے۔ قطار در قطار اونٹوں پر صحرا کا مال غنیمت لدا ہوا تھا، مثلاً بھدے سے ہتھیار، زرہ بکتر، پہننے کے کپڑے، زیورات اور زینت کی چیزیں، جن پر وحشیوں نے اپنی تمام صنعت

خرچ کردی تھی، سینکڑوں خوبصورت عورتیں، جو محض اپنی قبول صورتی کی وجہ سے انتخاب کی گئی تھیں، اور اس وقت سونے کی زنجیریں پہنے ہوئے، مصیبت زدوں کی طرح گھسٹی چلی جا رہی تھیں، تاکہ جتنے الوسع بہت جلد شام پہنچ جائیں، خاندان گاتھک کے چار سو وہ الادو دمان لوگ تھے، کہ جن کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا، وہ لمبے چوڑے چغے پہنے ہوئے تھے، اور اُن کے گلوں میں سنہرے گلوبند یا طوق بندگی پڑے ہوئے تھے، یہ لوگ آئے بیریا کے لٹے ہوئے خاندانوں کی یادگار اور نوحہ خواں تھے۔ تیس گاڑیوں پر بمشکل تمام جواہرات، سونا اور چاندی لد سکا۔ یہ چیزیں عام لوگوں کی خود نمائی، خاص لوگوں کے تکلفات اور جسمانی تفاخر کے سامان تھے۔ ذبیحۃ القدس اور قربان گاہ کے مرصع بجواہر برتن تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی چیزیں تھیں کہ جن کا شمار نہیں ہو سکتا، اور وہ سب ایسی تھیں کہ وزیگاتھ کی دولتمندی، اور بیزنطین کی صنعت، کا بہترین نمونہ کہلانے قابل۔ ان کے علاوہ اعیان قریش کی اولاد نہایت پُرتکلف لباس پہنے ہوئے، اور مسلمانوں کے نہایت نامور افسران فوج، موسے کے جلو میں تھے۔ اس قافلہ کے سب سے پیچھے قریباً ایک لاکھ معمولی حیثیت کے غلام تھے جو افریقیہ اور سپین سے گرفتار کئے گئے تھے ؛

غرض اس شان و شوکت سے موسے قیروان پہنچے، اور مملکت افریقیہ کو اپنے تین بیٹوں عبداللہ، عبدالملک، اور عبدالاعلے میں تقسیم کیا، تاکہ دولت حکمرانی اُن کے خاندان میں باقی رہے، گو خود اُن کو اپنی نسبت شبہ تھا کہ اُن کی عظمت و عزت باقی رہتی ہے یا نہیں ؛

موسے کی آمد کی خبر ہر جگہ اُن سے پہلے پہنچ جاتی تھی، جسکو سُن کر خانہ بدوشانِ صحرا، اور باشندگان سواحل جوق در جوق اُن کے استقبال کے لئے موجود رہتے تھے۔ یہ وہ عجیب و غریب اور یاد رکھنے کی قابل تماشا تھا کہ اُس وقت نظر آیا کرتا تھا کہ جب رومیوں کے سپہ سالار تماشا دیکھنے والے لوگوں کی تحسین و آفرین سنتے اور اپنی فتوحات کی نشانیاں ساتھ لئے ہوئے مشتری کے مندر پر چڑھاوا چڑھانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جہاں جہاں سے

موسیٰ کا یہ جلوس گزرتا تھا وہیں سے کچھ اور لوگ شامل ہوتے چلے جاتے جب قاہرہ پہنچے ہیں تو کوئی انتہا نہیں رہی تھی سواحل دریائے نیل کے لوگوں نے آکر تو یہ کیفیت پیدا کی کہ راستہ بند کا بند رہ گیا۔ دوران سفر میں موسیٰ کی جو خوشامدیں ہوئیں اُن سے وہ اور بھی پھولے چلے جا رہے تھے، اور کچھ ایسے مغرور ہوئے کہ دست درازی پر کمر باندھ لی؛ مگر اس سے اُن کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ سے نہ جائے کہ اُن کی اہمیت اور عظمت کے لوگ قایل ہوتے چلے جائیں، اس میں خواہ دوسرے شخص کے نام پر کتنا ہی دھبہ کیوں نہ آجائے، بلکہ دوسرے کی جان ہی پر کیوں نہ بن جائے چنانچہ اس موقعہ پر بھی اُنھوں نے یہ چاہا کہ مغیث الرومی کو جو قرطبہ کے گرفتار شدہ گورنر اور شاہی خاندان کا تھک سے تھے، بطور غلام کے خلیفہ کے سامنے پیش کریں جب اُنھوں نے انکار کیا تو موسیٰ نے حکم دیا کہ اُن کو فوراً قتل کر دیا جائے اس ظلم و تشدد کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کو طارق سے تو ہمدردی تھی ہی اور وہ دونوں ایک ساتھ دشمنوں سے لڑتے ہی رہے تھے اب وہ موسیٰ کے جانی دشمن ہو گئے ؛

موسیٰ ابھی شام کی سرحد میں داخل ہی ہوئے تھے کہ اُن کو ولیعہد خلافت، سلیمان، کا ایک خفیہ خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ان کے بھائی امیرالمومنین ولید ایسے علیل ہیں کہ اُن کے بچنے کی اُمید نہیں۔ اس لئے موسیٰ کو یہ فہمائش کی گئی کہ جب تک اُن کی موت کی خبر نہ مل جائے وہ آگے بڑھنے کا قصد نہ کریں سلیمان کا اس سے یہ مقصود تھا اُن کی تخت نشینی کے وقت اگر افریقیہ اور سپین کا جلوس اور مال مغروقہ پہنچا تو اور زیادہ رونق اور خوشی ہوگی، نیز یہ اگر یہ تحفہ و تحالیف اور خمس ولید کی زندگی میں پہنچا تو وہ اُن کی اور اُن کے اولاد کی ملک ہو جائیگا اور بصورت دیگر خود اُن کے ملک ہوگا۔ مگر کچھ تقاضاء وقت، اور کچھ پاپوسیوں کے ہجوم سے موسیٰ کی ذاتی خاصیت بدل گئی تھی؛ اُنھوں نے سلیمان کے حکم کی کچھ پرواہ نہیں کی، اور فوراً دمشق کی طرف چل پڑے، اور وہاں جمعہ کے روز داخل ہوئے، اور سیدھے جامع مسجد پہنچ گئے،

جہاں ولید نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ موسےٰ اپنے ساتھ قیدیوں کو لئے ہوئے تھے' جن میں بڑے بڑے سرداران قوم وملک شامل تھے۔ یہ سب اپنے اپنے ملکی لباس' اور اپنے اپنے رتبہ ودرجہ کے نشانات اور تمغے لگائے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد امیر المؤمنین اُن سے بغلگیر ہوئے' اور اپنا ملبوس خاص' اور پچاس ہزار دینار اُن کو عطا فرمایا' اور اُن کے بیٹوں کو وہ وظیفہ دیئے جو اپنے با اختصاص لوگوں کو دیتے تھے۔ کمتر درجہ کے قیدی اور شاہی خمس بخشی الممالک کے سپرد کردیا گیا۔ جیسا کہ طارق کا خیال تھا' موسےٰ نے یہ دعوے کیا کہ وہ عجیب و غریب میز' جس کا اوپر ذکر آچکا ہے' اُنہوں نے حاصل کی ہے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ اس کا چوتھا پایہ خالص سونے کا کیوں ہے مرصع کیوں نہیں؟ تو موسےٰ نے کہا کہ یہ اسی حالت میں ملی تھی۔ طارق اُس وقت وہیں موجود تھے' اُنہوں نے یہ سُن کر چوتھا پایہ نکال کر پیش کیا' اور تمام حالات بیان کئے' کہ وہ کس طرح ملی تھی' اور یہ دعوے کیا کہ یہ فی الحقیقت مجھے ملی تھی' اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ پایہ میرے پاس ہے۔ اُن کے آقا اور رقیب سخت غصہ میں اُن کی باتیں سنتے رہے۔ ولید نے اُس کی قیمت کا اندازہ صرف جواہرات کی قیمت سے لگایا جو اُس میں لگے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے تمام جواہرات اُتروا لئے' اور تختہ مکہ شریف بھیج دیا +

موسےٰ کو دمشق میں آئے ہوئے صرف چالیس ہی روز گزرے تھے کہ ولید کا انتقال ہوگیا' اور سلیمان تخت نشین ہوئے۔ یہ اپنی سخت مزاجی' درشت خوئی' لغویت اور زیادہ خوری میں مشہور تھے۔ اُنہوں نے تخت پر بیٹھتے ہی موسےٰ پر اپنا سارا غصہ نکالا؛ اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ موسےٰ پر' اُن کی حالت ضعیفی میں' کہ اُنکی عمر اسّی برس سے متجاوز ہو چکی تھی' مقدمہ قائم کیا۔ اُن کی بددیانتی' جبر ستانی اور ظلموں کی اتنی شہادت تھی' کہ وہ جواب دہی اگر کرسکتے تھے تو نہایت ضعیف۔ جب اُن پر اثبات جرم ہوچکا' تو اُنہیں ضبطی جائداد اور دو لاکھ دینار جرمانہ کی سزا دی گئی۔ علاوہ اس سزا کے ایک سختی اُن پر یہ کی گئی کہ

اُن کو دھوپ میں ایک ستون سے پابزنجیر رکھا گیا۔ یہ سزا اس جُرم کی تھی کہ انہوں نے علی رؤس الاشہاد بادشاہ پر ناشکری کا الزام لگایا تھا۔ کئی گھنٹہ کی اذیت اُٹھانے کے بعد بعض دوستوں کی سفارش سے اُن کی زنجیریں کھول دی گئیں، اور اُن کو حکم دیا گیا کہ وہ بارگاہِ خلافت میں نہ آئیں، اور صرف ایک وفادار غلام دے کر انہیں اُن کے گھر بھیج دیا گیا۔ بقیہ عمر اُنہوں نے سخت افلاس میں کاٹی۔ بدوؤں سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے تھے، اور جو کچھ روپیہ کسی طرح بچا لیتے تھے وہ جرمانہ میں دیتے تھے۔ غرض یوں اُن کی زندگی وادی القراء میں ختم ہو گئی جو ایک بے نام و نشان جگہ ہے۔

یہ بد انجام تھا اُس (فقید النظیر وحید العصر فرید الدہر) سپہ سالارِ اعظم کا جس کا ثانی اسلام پیدا نہ کر سکا۔ اُن کی ہمت و استقلال بے نظیر تھی، موت اور تکالیف سے ڈرنا جانتے ہی نہ تھے، اُن کی فراست اور دور اندیشی ایسی تھی کہ جس پر الہام کا دھوکا ہوتا تھا؛ اُن کے ذرائع ایسے تھے کہ کبھی ختم ہونے والے نہ تھے، اُن کا جوش دینی دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا؛ وہ ہمیشہ اور ہر وقت رحمت الٰہی پر بھروسہ اور توکل رکھتے تھے؛ وہ اپنے جوہر ہاء ذاتی کی وجہ سے اپنی فوج کو اپنا گرویدہ رکھتے تھے؛ اُن کی تقریر ایسی جوش دلانے والی، اور فصیح و بلیغ، ہوتی تھی کہ اُس زمانہ کے بڑے بڑے خطیب اور واعظ اُن کے مقابلہ میں گرد تھے؛ وہ اپنے فرائض مذہبی کے سخت پابند تھے؛ اُن کے صوم و صلوٰۃ میں بے انتہا خشوع و خضوع ہوتا تھا؛ اُن کی ہوشمندی اور عاقبت اندیشی ضرب المثل تھی؛ اُن کا تخمینہ و اندازہ ہر امر میں بے خطا ہوتا تھا۔ مدت العمر میں جب کبھی مہام جنگ اُن کے ہاتھ میں آئے انہوں نے کبھی شکست نہیں کھائی؛ کبھی کسی دشمن نے اُن پر غلبہ نہیں پایا؛ اُن کے مزاج میں شک زیادہ تھا؛ اُن میں ایک بڑا خلقی جوہر یہ تھا کہ وہ آدمی کو دیکھ کر اُن کا صحیح اندازہ لگا لیتے تھے؛ اسی لئے وہ سیاست دان لوگ بھی اُس سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے جن کی عمریں دربار شاہی میں گزری تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے مشتبہ طریقوں

نے بہت کچھ دولت جمع کی، اور اپنے رفقا کو اُس سے محروم رکھا، اور اُن کا کچھ نہ بننے دیا۔ اُن ہی کے خورد بُرد سے شاہی خزانہ کو بھی نقصان پہنچا! یہ ایک ایسا جرم تھا کہ اسی نے اُن کو تباہ کیا۔ غرض، اس طرح باوجود اپنی عقل وفہم وجوہرِ ذاتی کے، اُن کی طمع نے اُن کو برباد کر دیا! طمع بھی وہ کہ جس کے پورا کرنے میں اُن کو نہ دوستی کا لحاظ تھا، نہ نمک حلالی کا پاس، نہ دین کا خیال تھا نہ سزا کا خوف۔ اسی طمع کی بدولت وہ سپہ سالار، جس کے سامنے بڑے بڑے سلاطین سرنگوں ہوئے، جس نے اتنی دولت جمع کی کہ بادشاہوں کے محسود ہوئے! بیکس اور مفلس قلاش ہو کر مرے۔ اتنے بڑے آدمی کو ایسی جگہ موت آئی جو بالکل بنجر بیابان تھی، جہاں اُن کا کوئی شناسا نہ تھا۔ جس ملک میں اُنکو شہرت ہوئی، جس زمین نے اُن کے کارنامے دیکھے اُس سے اور اُن کے مدفن سے بُعد المشرقین تھا۔ اُن کا حال سُن کر اگر کوئی حیران ہونے والا تھا تو جنگل کے چرواہے؛ اُن پر رحم کرنے والے تھے تو بیابان کے گڈریئے۔ تواریخ نہیں بتلاتی کہ موسےٰ کے قصۂ قضایا کے ختم ہونے کے بعد طارق کا کیا حشر ہوا۔ اگر اُن پر کوئی مصیبت پڑتی، یا تعزز نصیب ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی نہ کوئی عربی مورخ اُس کا حال نہ لکھتا۔ غالب خیال یہ ہے کہ اُن کو اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ آسائش کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیں؛ گو بہت ممکن ہے کہ اُن کی دولت نے اتنی اجازت نہ دی ہو کہ وہ پرتکلف حالت میں رہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اُن کو پھر کوئی بڑا عہدہ نہیں ملا؛ کیونکہ حاسدین دربار دمشق ایسے بلند نظر اور قابل آدمی کو پھر سپہ سالار بناتے ہوئے ڈرتے تھے؛ جس نے ایک مرتبہ اپنی ناموری کے ساتھ فتوحات کر دکھلائیں۔ یوں صفحۂ دُنیا سے وہ آدمی بھی محو ہو گیا کہ ہر صورت وحالت میں اپنے آقا و افسر سے دوسر درجہ پر تھا، اور جس نے امیر المؤمنین کو آئے بیریا جیسا ملک فتح کر کے دیدیا۔ باقی رہ گیا ان میں سے تیسرا آدمی، یعنی کاونٹ جولین، راہبین، بوجہ اپنے تعصب کے ان سے اتنے ناراض ہیں کہ وہ کچھ پس و پیش نہیں دیکھتے۔ سپین کے اہالی کلیسا اور عوام الناس کو اُن سے

وہ دشمنی ہے کہ کسی طرح ختم نہیں ہوتی، اور اُن کی اُمیدوں کے ٹوٹنے اور غرور کی شکست سے اور بھی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ انتہا ہے کہ کامل چھتیس[۳۱] پشتوں تک اُن کا نام بے ایمان، غدار رہا۔ ان کے متعلق جستہ جستہ حالات ملتے ہیں، مگر قابل اطمینان نہیں ہیں۔ اُن کی قومیت، اُنکے سابقہ حالات، اُن کی گاتھ سے رشتہ داری، اُن کے گورنر ستبہ ہونے کی وجہ، اُن کے اختیارات، اُن کی دربار طلیطلہ سے تعلقات کے متعلق محض قیاسات سے کام لیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اُن کی بیٹی کی بے عصمتی ہونے کا قصہ، جو اُن کے انحراف کا اصلی باعث ہے، گو قریباً ہر ایک عربی مورخ نے لکھا ہے، مگر ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ وہ شاہان وزیگاتھ کے باجگزار تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو بطوع خاطر بطور ضمانت نمک حلالی، یا یرغمال کے خاندان شاہی میں بھیج دیا تھا۔ ان وجوہ سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی طاعت و انقیاد چنداں مضبوط نہ تھی، اور اُن کا فعل چنداں قبیح و شنیع نہ تھا، بجاء اسکے کہ ایسا ہی فعل کسی ایسے شخص سے سرزد ہوا جو پشتہا پشت سے نمک خوار چلا آتا ہو خاص کر جب یہ یاد کیا جائے کہ کاونٹ جولین کی طرف سے اس معاملہ میں ابتدا نہیں ہوئی۔ اُن کو جو اس درجہ مطعون کیا جاتا ہے اور نفرت کیجاتی ہے، اگر اسکی اصلیت تلاش کی جائے تو حضرات کلیسا کے مصنفین میں ملیگی جنہوں نے کوئی دقیقہ اُن کی بدنامی کا نہیں چھوڑا؛ اور اُن کو آیندہ نسلوں کے لئے سیاسی مجرم، دشمن دین اور مرتد ثابت کر دیا ؛

فتح اندلس کے بعد کاونٹ جولین ستبہ میں چلے گئے۔ یہ شہر اور اُس کے مضافات کی ایک الگ ریاست قائم کرکے اُن کی خدمات کی عوض میں بطور انعام دیدی گئی۔ باوجود اسکے کہ اُن کے تعلقات اور صحبت مسلمانوں سے رہی، مگر وہ اور اُن کی صلبی اولاد مذہب مسیحی پر سختی کے ساتھ قائم رہی ۔ اسلام کا اثر و اقتدار جو کہیں رُکنے والا نہیں ہے دوسری نسل میں جاکر ظاہر ہوا۔ کاونٹ جولین کے پرپوتے، موسومہ ابو سلیمان ایوب، دسویں صدی میں اصول فقہ کے نہایت فاضل اور ذکی و ذہین عالم تھے۔ طارق کی اولاد اندلس میں

کئی صدیاں نہایت محترم و موقر رہی، مگر جب الموحدین کی سلطنت میں خانہ جنگیاں ہوئیں، اور اُن میں قیود و پابندیاں عاید کی گئیں تو سب لوگ اُن کو بھول بسر گئے۔

مسلمانوں نے اپنے حلیفوں کے ساتھ جو وعدے کئے تھے اُس کا اُنھوں نے نہایت ایمانداری سے ایفا کیا۔ اوپّس کو بطور انعام طُلَیْطُلہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ شاہ راڈرک کے صرفِ خاص کا علاقہ، جو تین ہزار قطعات پر مشتمل تھا، خاندان وٹیزا کو دیدیا گیا۔ عرب کی فتوحات سے عوام الناس کو بہت ہی فوائد پہنچے۔ غلاموں کو بالخصوص بہت بڑا فائدہ ہوا اور اُنکی حالت بہت بدل گئی۔ ہر قسم کے محاصل کے لئے قانون وضع کر دیئے گئے۔ طماع محصلین کو یہ موقعہ ہی باقی نہ رہا کہ وہ اپنی مرضی کے موافق جتنا چاہیں وصول کر کے خورد و برد کر جائیں۔ لیکن اُن کی مقدار البتہ زیادہ تھی۔ کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کا ⅕ حصہ زمیندار کو دینا پڑتا تھا۔ جو لوگ کہ سرکاری زمین کو (جس کا رقبہ ملک مفتوحہ کا پانچواں حصہ تھا) کاشت کرتے تھے، اُن کو ایک ثلث سرکار کو دینا پڑتا تھا۔ زمیندار بیس فی صدی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ عیسائی ذمیوں کو بارہ سے اڑتالیس درہم تک دینے پڑتے تھے، جو چالیس روپیہ سے ایک سو ساٹھ روپیہ تک ہوتا ہے۔ جو معاہدات کہ طارق نے موسیٰ کے آنے سے پہلے رؤساء کا تھ سے کئے تھے، اور جن میں آقا و غلام، اور بادشاہ و رعایا کے حقوق و فرائض کی تفصیل تھی، اُن سب کی تصدیق بارگاہ خلافت سے بلا چون و چرا کر دی گئی۔ اِن ہی معاہدات پر وہ قوانین مبنی تھے جو جزیرہ نماء اندلس کے ذمیوں کے متعلق وضع کئے گئے تھے، اور جب تک مسلمانوں کی سلطنت وہاں قائم رہی اُس وقت تک وہی معاہدات تمام قوانین کی بیخ و بنیاد بنے رہے۔

چودہ مہینوں کے اندر اندر تمام قلمرو وزیگاتھ کو مسلمانوں نے اس طرح فتح کیا کہ اُس کے بازیافت کی کوئی اُمید باقی نہ رہ گئی۔ دو برس کے اندر اندر بحر شام سے لے کر کوہ پارینیس (برطات) تک مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔ جس سرعت کے ساتھ اندلس پر مسلمانوں نے

قبضہ کامل کیا، اور صدیوں اپنے ہاتھ میں رکھا، تاریخ عالم اُس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ سیاسی اختلافات، تمدنی تحلیل و تفریق، سلطنت کی ناپائداری، رؤسا کی نافرمانیاں، پادریوں کی دست درازیاں، غلاموں کی مایوسیاں، مسلمانوں کی فتوحات میں بہت ہی ممد و معاون ہوئیں۔ جو لوگ کہ خاص طور پر مستحق رعایت نہیں سمجھے گئے، اُن کی بلند پروازیوں کو قوم و ذات کی قیود نے بالکل تباہ کر دیا۔ متوسط الحال لوگوں کی محنت و مشقت پر ہی لازمی طور پر سلطنت کی صلاح و فلاح کا دار و مدار ہوتا ہے؛ یہی فرقہ غلاموں میں مل جُل کر گم ہو گیا، اِن ہی کی محنت نے سلطنت کی دولت بڑھائی، اور اِن ہی لوگوں کی وجہ سے بطریق اور پادریوں کے جلوس کی رونق ہو جاتی تھی۔ ملک کی بعینہ وہی حالت تھی جو تین سو برس پیشتر سلطنت رومہ کی حالت ہو گئی تھی۔ جبر و تشدد ہر جگہ جاری و ساری تھا، شخصی آزادی کے خیالات و جذبات، جو ٹیوٹانک نظام کا خاصہ تھا، بالکل مفقود ہو گئے تھے۔ حقوق شاہی رؤساء کے طوفانِ و عداوت میں ضم ہو گئے تھے، اور رؤساء باوجود اپنی حرکت مذبوحی کے، پادریوں کے شکار بنے ہوئے تھے۔ امید ہائے صلاح و فلاح و آسودگی و فراغت، لطف اختیارات و صولت لذت عیش و عشرت اگر کسی کو حاصل کرنی ہوتی تھی تو اُس کا آسان ذریعہ اہالی کلیسا تھے۔ ملک میں مدتہائے مدید تک امن و عافیت رہی، جسکی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ یہ جزیرہ نما دنیا سے الگ پڑا ہوا تھا۔ مگر جو وجہ بھی ہو، نتیجہ یہ تھا کہ فنون سپاہ گری کی ضرورت نہیں رہی تھی، اور فوجی مشق کی احتیاج نہ تھی۔ باوجود ظاہری اختلال اور بدنظمی کے تمام اختیارات ایک آدمی کے ہاتھ میں تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استبداد کی عادت پڑ گئی، اور یہی اصول سلطنت قرار پا گئے۔ قومی انحطاط کے یہ سب اسباب مسلّم، مگر یہ سب باتیں مل کر بھی ایسی قوی نہیں ہیں کہ اتنی بڑی سلطنت کی عمارت کو اتنے ذرا سے صدمہ سے گرا دیتیں۔ لوگوں کے عروج حاصل کرنے کی خواہشوں کا بر نہ آنا، منظم نمک حرامی، تمام قوم یہود کی غداری نے اتنا سخت اثر ڈالا کہ چند ہی دنوں میں انتزاع سلطنت ہو گیا، حُبّ الوطنی کے جو معنی ہیں

کہ فرداً فرداً ہر شخص اپنے ملک کا جان نثار رہے، یہ اتنی بڑی صفت ہے کہ اسی سے ملک و ملت قائم رہتا ہے۔ وزیگاتھ میں اسی حب الوطنی کا نام و نشان تک نہ رہا تھا خیر خواہیِ عوام کی جگہ نفسی نفسی نے لے لی تھی۔ اپنے اپنے قدح کی خیر منانے میں تمام اصولِ اخلاق و تمدن کو بالاءطاق رکھ دیا گیا تھا۔ جس آسانی کے ساتھ کہ یہ جزیرہ نما فتح کر لیا گیا اگر اُس کا مقابلہ اُن مشکلات سے کیا جائے جو اس کے بازیافت میں اُٹھانی پڑیں، تو عجیب طرح کا تماشا معلوم ہوتا ہے۔ وزیگاتھ کے اقتدار و تسلط کا خاتمہ صرف ایک ہفتہ میں ہو گیا۔ دو برس کے بعد اتنی بڑی باشان و شکوہ سلطنت کی اگر کچھ نشانی باقی رہ گئی تھی تو صرف اُن کی ذلیل غلامی۔ فاتحین کو بھی آخر اسی کا مُنہ دیکھنا پڑا، مگر کئی صدیوں کے بعد۔ ملک میں شروع ہی سے اتنے مختلف الخیال فرقے جمع تھے کہ اُن کو متحد کرنا قریباً ناممکن تھا۔ یہی وہ نظامی خرابی تھی جو فاتحین کی تباہی کی فال بد تھی۔ یہ فرقہ بندی اُس سرنگ سے بھی زیادہ خطرناک تھی جس نے آخر گاتھک سلطنت کی بنیاد کو اُڑا دیا۔ مگر بہرحال نتیجہ یہ ہُوا کہ ان سبک ہتھیار والے سواروں کو مغربی یورپ سے نکالنے میں کئی صدیوں کی سخت محنت و مشقت درکار ہوئی۔ حالانکہ اِن ہی لوگوں نے بلے ٹی کا سے لیکر پروونیس تک، اور کوہستان سے لیکر سمندر تک، قبضہ کرنے میں چند ہی روز لگائے تھے[ف] ؎

غرض اس طرح وہ ملک، جو مدتوں تاپر اور قرطاجنہ کے تحت حکومت رہ چکا تھا، سامی قوم کی ایک اور شاخ کے زیر نگیں آ گیا۔ اُس کی کششوں نے مدتوں شاعروں سے اپنا گیت گوایا؛ اُس کی دولت مندی نے مدتوں ہر ایک فاتح کو بےچین رکھا؛ باوجود آئے دن کی تبدیلی حکومت، حملوں، سازشوں اور انقلابوں کے قوم باسک نے اپنی آزادی

[ف] مسٹر سکاٹ کو ناحق کی کاوش ہے۔ اس فقید النظیر کامیابی کا اصلی باعث ہے۔ سچے اسلام کی سچی پیروی اور کچھ بھی نہیں (مترجم) ؎

اور اپنی قومی خصوصیات کو قائم رکھا، یہی وہ چیز ہے جس نے اُن کو یورپ کی تمام اقوام سے ممیز رکھا ہے؛ اسی جزیرہ نما کے میدانوں میں رومیوں نے فنونِ جنگ کا سبق لیا تھا؛ قوم ٹیوٹانک نے اسی کے شہروں میں رہ کر انتہاء تہذیب حاصل کی تھی؛ اسی کے واضعانِ قوانین نے وہ قانون بنایا جس کی نظیر اُس وقت تک دنیا میں نہ تھی؛ دینی کونسلوں نے یہیں اپنی آزادی کو قائم رکھا، اور سپین کے کلیسا نے بہت زور سے پوپ روم کے مقابلہ میں اپنے اقتدار کو باقی رکھا لیکن جتنی اجنبی قوموں نے اُس کے حدود پر کبھی قبضہ کیا تھا اُن میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جیسی کہ وہ قوم کہ جس نے تمام ملک کو، باستثناء ایک ذرا سے حصّہ کے، فتح کر لیا تھا۔ وہ اسباب جو اس ملک کی مصائب کا باعث ہوئے، اور وہ نتائج جو اس سے برآمد ہوئے نظامِ ملکی اور نشو و نماء دماغی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ ہے۔ یہ امر کہ ایک اجنبی قوم دور دراز ملک سے آئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے، تین سو برس کی بنی ہوئی سلطنت کو تباہ کر کے بیٹھ جائے، نہایت حیرت انگیز بات ہے۔ مگر اس سے زیادہ محیر العقول یہ ہے کہ وہ قوم جسکی کوئی بات کوئی ادا قوم مفتوح سے نہ ملتی ہو، جسکو صنعت و حرفت سے کبھی علاقہ نہ رہا ہو، جو تہذیب و تمدن سے بالکلیہ نابلد ہو، چند ہی سال کے اندر ایسی سلطنت قائم کر دے کہ جسکے باشندے ہر فن میں اُستادِ زمانہ اور اتنے نامور اور طاقتور ہو جائیں کہ اپنے زمانہ کے مہذبین کے پیش رو تسلیم کر لئے جائیں۔ ایک زمانۂ بعید تک جزیرہ نماء سپین کے معاملات کچھ ایسے بگڑے رہے کہ ہر وقت رعایا کے شمشیر کف ہو کر مقابل ہو جانے کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ رعایاء کے دلوں میں اس روایتِ قدیمہ کی عزت و عظمت باقی نہیں رہی تھی کہ اُن کا بادشاہ بذریعہ انتخاب تختنشین ہوتا ہے اور اب براءِ نام بلحاظ توریث لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں تاج و تخت کی ہمیشہ بیع و شرا ہوتی تھی، یا قتل و سازش سے حاصل ہوتا تھا۔ پادریوں میں اتقاء و تقدس کی جگہ دینی اقتدار کا لالچ اتنا آگیا تھا کہ اُن کو کسی عنوان قناعت نہ ہوتی تھی۔ ہر سیاستی معاملہ اور ہر سیاسی تدابیر کو اہالی کلیسا بے دینی سمجھتے تھے، اور اُسکو دشمنی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

قومی تعصبات، فریق بندی اور مختلف تمدنی معاملات ہر وقت بر سر کار رہتے تھے۔ سپاہیانہ جذبات اُن میں سے بالکل نکل چکے تھے۔ حکام ملکی کے احکام کی کوئی پروا بھی نہ کرتا تھا۔ سزائیں مجرم کی حیثیت اور اقتدار کے موافق دی جاتی تھیں، نہ کہ نوعیت جرم کے مطابق تاج و تخت کے دو رقیب دعویدار، متنفی اور سازش کنندوں کی خدمات حاصل کرنے میں بھی شرم نہ کرتے تھے۔ چوروں اور قزاقوں کے باقاعدہ گروہ غیر محفوظ لوگوں کو اپنا شیرِ مادر سمجھتے تھے۔ اُن کے سرگروہ بھیس بدلنے کی ضرورت نہ دیکھتے تھے، اور بے باکی کے ساتھ شہروں میں اکڑتے پھرتے تھے۔ بے انتہا عیش و عشرت اور بدنظمی سلطنت اپنے ساتھ بہت بڑی بددیانتی کو لے کر آئی، جو اُن زیادتیوں سے بھی کہیں زیادہ تھیں جو قیاصرہ کے زمانہ میں ہوئیں۔ کاشتکاروں کی دو مسلسل فصلوں کی محنت بالکل بیکار جاتی تھی۔ نہایت خوفناک فاقہ کشی اور بیماری قوم بھر میں آفت مچائے رہتی تھی۔ اِن دونوں نے بھی قوم کو برباد کرنے میں کچھ کم مدد نہیں دی۔ ہر ایک فریق اور گروہ، خواہ وہ خیالات میں متفق ہوں، یا مختلف، خونخوار قوانین کے ماتحت اپنی عقل و ہنر، دولت و حشمت اور سیاسی قابلیت سے یک جان دل ہو کر اپنے دشمنوں کی ذلت اور اپنی آزادی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا رہا کہ مسلمانوں کا یہ حملہ محض قزاقانہ ہے۔ کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ دشمن اس ملک کو اپنا گھر بنا کر بیٹھ رہینگے۔ جب مسلمانوں نے آبادیاں قائم کرلیں، بنادر کو ممالک مشرقیہ کی تجارت کے واسطے کھول دیا، اراضی کو تقسیم کر دیا اور مسجدیں بنالیں تو وزیگاتھ کو اپنی مصیبت کا پورا اندازہ ہوا۔ لیکن فاتحین کے حسن سلوک سے اُن کو مفتوح ہونے کی تلخی چنداں ناگوار نہیں گزری۔ اُن پر خلاف ورزی یا تعمیل احکام قانونی کے معاوضہ میں محصول وغیرہ کی ذمہ داریاں پڑنے لگیں، تو ادنے سے ادنے آدمی کو بھی یہ اطمینان ہو گیا کہ اُن کے حقوق کی حفاظت کیجائیگی، اور عدل و انصاف کا برتاؤ ہوگا۔ کٹے سے کٹا دیندار اپنی مراسم مذہبی نہایت آزادی کے ساتھ ادا کر سکتا تھا، کوئی شخص اُس میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ بے دین سے بے دین آدمی بھی نہایت اطمینان سے اپنی اغراض

پیش کر سکتا تھا۔ اُس کو یہ خوف نہ تھا کہ محکمۂ دینی کی طرف سے کوئی دراندازی ہوگی عہدہ داران کلیسا نہایت طمانیت کے ساتھ اپنے پیشہ کا کام کرتے تھے۔ راہب مورخین نے اپنی کتابوں میں نہایت سخت و سست الفاظ سے اپنے آقاؤں پر لعنت کی ہے کہ اُن کے سینکڑوں ماذنہ سے اذاں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں؛ رومن کیتھولک مذہب والوں نے شرفیشن پر یہ الزام لگائے ہیں کہ انہوں نے سخت ظلم و ستم کئے ہیں، مگر یہ سب صاف و صریح جھوٹ ہے اور مبالغہ۔ لیکن بہر حال اس میں شک و شبہ نہیں ہے کہ جنگ کے مصائب و صدمات سے لوگوں کو سخت ترین تکالیف پہنچیں۔ بہت سے راہبوں نے شور و غل مچا کر اور گستاخیاں اور بے ادبیاں کر کے مسلمانوں کو اپنے آپ سے ناخوش کر لیا اور اسی کی پاداش میں "شہید" ہو گئے۔ کئی سو راہبات نے حرم سرا کی عیش و عشرت کے بدلے میں قانون مذہبی کی خلاف ورزی کر کے بطریقوں کی رفاقت چھوڑ دی۔ اناج کے کھیت کھڑے کے کھڑے جلا ڈالے گئے۔ نہایت شاندار بنگلے زمین کی برابر کر دیئے گئے۔ دولت کی لالچ میں قربانگاہیں توڑ دی گئیں، اور مقدس چیزیں پیروں میں روندی گئیں۔ لیکن ذمیوں کی حفاظت کا جو وعدہ کر لیا گیا تھا اُس کا ایفا کیا گیا! ذات، جایداد اور مذہبی آزادی کا جو عہد کر لیا گیا تھا وہ بہرحال پورا کیا گیا۔ مگر یہ سب مشروط تھا اس پر کہ لوگوں نے عین موقعہ پر اطاعت قبول کر لی اور اپنے آقاؤں کو تنگ نہیں کیا۔ عوام الناس تو اس سے بہت ہی خوش ہوئے! اگر ناراض تھے تو صرف وہ مذہبی دیوانے جنہوں نے ایسے فیاض اور سخاوت شعار دشمنوں کو گالیاں دیں، حالانکہ اُنکی مراعات سے وہ فایدہ اُٹھاتے تھے اور اُن ہی کا نمک کھاتے تھے۔

فاتحین نے پُرانے زمانہ کے قوانین کا احترام قائم رکھا؛ فرق صرف اتنا ہوا کہ اُس کے دستور العمل اپنے قوانین کے تابع کر دیئے۔ مفتوحین پر وہی قانون قابل نفاذ تھا؛ مگر اُسی حد تک کہ شرع اسلام کے خلاف نہ پڑے۔ اپنے عدل و انصاف، مسامحت اور مرحمت خسروانہ سے

اس نئی سلطنت نے بہت ہی جلد دلوں میں گھر کر لیا۔ یہودی مرفہ الحال ہوگئے، عیسائی اپنے تعصبات مذہبی بھول گئے، غلاموں نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس سے کہ اُن کا داغ غلامی ہمیشہ کے لئے مٹ گیا، اور وہ بادشاہوں کے مساوی ہو گئے۔

مگر دیرون کے تنگ تاریک حجروں میں، بلا اُس کے کہ بیرونی دنیا کو اس کی کچھ اطلاع ہو سکے، بغیر اس کے کہ اُن لوگوں کا شکریہ ادا کریں، جن کے رحم و کرم سے اُن کی جانیں بچی ہوئی تھیں، بلا اس کے کہ بڑھتی ہوئی تہذیب و تمدن کی برکات کی قدر کیجائے، ضدی اور تلخ مزاج راہب تھے کہ محض اپنی معاندت اور جہالت سے دشمنی کی آگ کو پائے اور بالوں کے کپڑے پہنے ہوئے مجاہدات مذہبی کئے چلے جاتے تھے۔ موذن کی آواز سنتے تھے تو نہایت لغویت کے ساتھ اس آوازۂ توحید کو تثلیث شکن سمجھتے تھے، اور اس سے کلیسا کے لئے بُری فال لیتے تھے۔ حالانکہ یہ وہ چیز تھی کہ جو ہر وقت مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھی، خواہ اُن کی مسجدوں کے سنگ مرمر میں کھدی ہوئی ہو، یا اُن کے پرچموں پر سنہری حرفوں میں کڑھی ہوئی، سفر ہو یا حضر، مگر یہ ہر وقت اُن کی نظر کے سامنے رہتا تھا کہ:۔

"لا الہ الا اللہ ہو الحی القیوم۔ لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد"

الف

تعلیقات باب پنجم

(۱) میلکارث۔ اہالی فونیشیا کا ایک دیوتا۔ تعلیقات میں فونیشیا کی مختصر تاریخ ملاحظہ ہو۔ (مترجم)

(۲) ایرین۔ ARIAN ایک عیسائیوں کا فرقہ ہے جو ایک شخص ایریس ARIUS کی طرف منسوب اور عیسائیوں میں سخت مبغوض رہا ہے، کیونکہ یہ الوہیت مسیح کا قایل نہ تھا۔ تیسری صدی مسیحی میں لیبیا (افریقیہ) میں پیدا ہوا۔ اُن دنوں سکندریہ میں مذہب عیسوی کے متعلق سخت گلچپ ہو رہی تھی، اسی میں ایریس نے بھی دخل دیا۔ شدہ شدہ یہ شخص ایسے کلیسائی عہدہ پر سرافراز ہوا جس کا کام یہ تھا کہ اناجیل کے معنی اور تاویل کرے۔ ایریس نہایت قابل آدمی تھا، اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس کی تاویلات اور اسکے مواعیظ کو لوگوں نے عام طور پر مان لیا۔ ایک روز الکزینڈر، سکندریہ کے بشپ، نے دوران تقریر میں پادریوں سے کہا کہ اقانیم ثلاثہ یا تثلیث میں ایک چیز اصل الاصول اور ناقابل تقسیم ہے۔ ایریس نے فوراً کہا کہ یہ اصول ہرگز موافق عقل نہیں ہے اور بشپ الکزینڈر پر یہ الزام لگایا کہ وہ یہ اصول قائم کرکے "تشخص" کو بگاڑ رہا ہے۔ اس پر بحث چلی، جس نے تلخ صورت اختیار کر لی۔ آخر یہ معاملہ ایک بڑے جلسہ میں پیش کیا گیا؛ اس جلسہ میں کچھ طے نہیں ہوا، بلکہ معاملہ میں اور بُری صورت پیدا ہو گئی۔ ایریس نے یہ اصول قائم کیا کہ بیٹا باپ کا شریک ازلیت، یا اُس کا مساوی نہیں ہے، بلکہ وہ صرف محدود موجودات میں سب سے اوّل اور اعلےٰ ہے۔ وہ خدا کی مرضی سے نیست سے ہست ہوا، نیز اُس کو باپ کا ہم رتبہ قرار نہیں دینا چاہئے۔ غرض یہ اصول تھا کہ جس نے ایریس کو بدنام کیا۔ بشپ الکزینڈر ایسا مخالف ہوا کہ بالکل دشمن ہی بنگیا، اور اُس کو کلیسا سے نکال دیا۔ مگر ایریس کو مصر، شام اور ایشیاء کوچک میں بہت کامیابی ہوئی، اور اس کے لاکھوں مقلد ہو گئے، جو سب کے سب عیسائیوں کے مبغوض ہیں۔ ایریس کو اسی اصول کی وجہ سے سخت تکالیف دی گئیں۔ وہ نہایت خوبصورت آدمی تھا، مگر ان ہی مصائب نے اُس کی صورت تک کو بگاڑ دیا۔

ب

اب اس کے مقلدین دنیا میں بہت ہی کم باقی ہیں، کیونکہ اس کے اصول بانک تبدیلی فرقۂ یونی ٹیرین نے اختیار کر لئے ہیں۔ (مترجم)

(۳) جلیقیہ = GALICIA = گے لی شیا۔ سپین کا ایک مغربی و شمالی صوبہ، جس کا رقبہ ۱۱۱۹۰ مربع میل، و آبادی ۲۰ لاکھ سے زیادہ تھی ۱۸۳۳ء میں اس کے اضلاع اور چھوٹے چھوٹے صوبوں کو دیئے گئے۔ یہ کوہی علاقہ ہے۔ استوریہ میں جو پہاڑوں کا سلسلہ ہے اُسی کی ایک شاخ یہاں بھی ہے۔ سب سے اونچی چوٹی چھ ہزار فیٹ ہے۔ اس کی دو جھیلیں بحر اطلانطک سے متصل ہیں۔ دو دریا اس میں بہتے ہیں۔ بڑے دریا کو منہو کہتے ہیں۔ ساحل بحر کے قریب اس میں جہاز رانی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ صوبہ یورپ کے اُن علاقوں میں سے ہے جہاں میوے زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے بالخصوص اس میں بہت ترقی کی۔ اس کی آب و ہوا معتدل اور صحت افزا ہے۔ بڑی بڑی چراگاہیں اور جنگل ہیں۔ اراضی نہایت اچھی ہیں۔ بہ نسبت غلہ کے میووں کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے۔ مسلمانوں نے یہیں کی زمینوں سے گویا سونا اوگلوا لیا تھا۔ یہاں کے باشندے بہت مضبوط، تندرست و توانا اور محنتی ہیں۔ ملک کے اکثر حصوں میں یہی مزدوری کرتے ہیں، خاص کر میڈرڈ میں، یہاں سقوں اور مزدوروں کا کام یہی کرتے ہیں۔ اپنے ملک میں مچھیاروں اور ملاحوں کا کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے نکلنے کے بعد اس کی حالت بہت خراب ہو گئی، اور برابر خراب ہوتی جاتی ہے۔ (مترجم)

(۴) بسکے BISCAY بحر اطلانطک کی خلیج مشہور ہے۔ اس کا ایک حصہ سپین سے ملحق ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

(۵) پارتھی ان = پارتھیا PARTHIAN کے رہنے والے۔ مغربی ایشیا کے اُس علاقہ کو کہتے تھے جو بحیرہ خزر کا مشرقی جنوبی حصہ ہے۔ اب خراسان کا شمالی علاقہ ہے۔ البرز کا سلسلۂ کوہ اسی علاقہ میں ہے۔ یہاں کے باشندے بڑے بہادر تھے، اُن کا مشغلہ ہی لڑائی تھا۔ تیر اندازی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کا ہتھیار ہی کمان ہوتی تھی۔ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، اور تیروں سے ایسا سخت حملہ کرتے تھے کہ کوئی اُن کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ کمان ہمیشہ شانہ پر رکھتے تھے اور پس پشت تیر چلاتے تھے دس پانچ تیروں کے بعد اس طرح بھاگتے تھے کہ گویا شکست کھائے ہوئے ہیں۔ دشمن خوش ہو کر ان کا

تعاقب کرتا تھا، اور یہ پھر اُن پر تیروں سے حملہ کرتے تھے۔ دوران جنگ میں کئی کئی مرتبہ بھاگ اُٹھنے کا بہانہ کرتے تھے اور دشمن کو دھوکا دے دے کر کسی دشوار گزار مقام میں پھنسا کر سب کو وہیں کھیت رکھتے تھے۔ یا ترکشوں کے خالی ہوجانے پر خود ایک ایک کرکے مرجاتے تھے ۔

اس علاقہ کی اور تفصیل کرنی یا تاریخ لکھنی ہماری ضرورت سے خارج ہے ۔ (مترجم)

(۶) لوسی ٹین یا = LUSITANIA زمانہ قدیم میں سپین کے ایک حصہ کو کہتے تھے، جس کی حدود وغیرہ کا صحیح پتہ نہیں لگتا۔ بظاہر دریاء ٹیگس سے لے کر بحر کنٹا بریا تک کا علاقہ تھا۔ غالباً یہی علاقہ ہے جس کو آج کل پُرتگال کہتے ہیں۔ یہاں رہنے والے بڑے جنگجو تھے۔ رومیوں نے بمشکل تمام ۹۹ سنہ ق م میں اس کو فتح کیا تھا۔ یہ لوٹ مار پر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ بہت ہی ان گھڑ اور بدتہذیب لوگ تھے۔ جب اُن کے یہاں کوئی بیمار ہوجاتا تھا۔ تو کسی راہ گزر پر اُس کو لٹا دیتے تھے اور آیندو روند سے دوائیں پوچھتے تھے۔ کھانا ایک ہی قسم کا اور بہت تھوڑا کھاتے تھے۔ سردی سے بچنے کے لئے پتھر گرم کرکے اُن ہی سے سینکتے تھے ۔ (مترجم)

(۷) کارمونا = قرمونہ۔ اشبیلیہ سے شمال و مغرب میں واقع ہے۔ مسلمانوں کا بنایا ہُوا قلعہ اور فصیل اب تک باقی ہے جس نے اُس کو بہت ہی خوبصورت بنادیا ہے۔ اس کا باب القرطبہ ایسی عمارت ہے کہ جس کو انجنیر بہت حیرت سے دیکھتے ہیں۔ گاتھوں کا بنایا ہُوا ایک گرجا بھی یہاں ہے۔ آج کل اونی کپڑے، ٹوپیاں اور چمڑے کا کام بہت ہوتا ہے۔ یہ بھی مسلمانوں ہی کے باقیات الصالحات میں سے ہے ۔ (مترجم)

(۸) ٹی ٹس = TITUS روم کا ایک نہایت لایق بادشاہ سنہ ۴۰ء میں پیدا ہُوا۔ عالم ولیعہدی میں یہودیوں پر حملہ کیا، اور شہر یروشلم کو فتح کرکے بہت ہر دلعزیز ہُوا۔ وہاں سے بے انتہا لوٹ کا مال لے کر روم میں آیا۔ اسی صلہ میں باپ نے اپنی ہی زندگی میں اُس کو شریک سلطنت کرلیا۔ اس کے بعد یہ عیش و عشرت میں پھنس گیا، اور بہت سے آدمیوں کو بےقصور مروا ڈالا۔ بادشاہ ہوکر اس نے روم کی عمارات قدیمہ کی مرمت کرائی۔ اسی کے زمانہ میں کوہ وسے سووی اس پھٹا۔ پھر روم میں آگ لگی مصیبت زدوں کی اس نے بہت خبرگیری کی جس سے تمام رعایا اُس کی گرویدہ ہوگئی سنہ ۸۱ء میں مرگیا ۔ (مترجم)

(۹) میرپڑا۔ ماردہ۔ سپین کا ایک شہر ہے ۲۳ء ق م میں دریاء وادیانہ پر آباد کیا گیا۔ رومیوں کے زمانہ کے یہاں دو پل قابل دید بنے ہوئے ہیں مسلمانوں کے زمانہ کا نہایت مضبوط قصر ہے جسکی طرز عمارت رومی اسلامی ہے مسلمانوں کے زمانہ میں بہت عروج پر تھا۔ ۱۲۲۹ء میں عیسائیوں کے قبضہ میں آیا۔ تب سے اس کی حالت بگڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس وقت اس کی آبادی پانچ ہزار نفوس سے بھی کم ہے + (مترجم)

(۱۰) ہیڈرین۔ HADRIAN ۱۱۷-۱۳۸ء میں روم کا بادشاہ تھا ۷۶ء میں پیدا ہوا۔ ٹراجن اس کا سرپرست تھا۔ جب یہ تخت پر بیٹھا ہے۔ تو روم کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے از سر نو اس کو ترقی دی۔ علم کا بہت شوقین تھا۔ بہت سی عمارات، بہت سے پل بنوائے، کئی نئے شہر آباد کئے، جن میں سے ایک ایڈریانوپل ہے۔ اس کی عمارتوں کے آثار اب بھی باقی ہیں + (مترجم)

(۱۱) جین۔ JAEN سپین کا ایک شہر ہے، جو اسی نام کے صوبہ کا دارالامارت، اور بعد میں دارالسلطنت رہا ہے۔ ایک نہایت خوبصورت کوہی علاقہ میں واقع ہے۔ یہ شہر ایک پہاڑی کے دامن میں دریاء وادی الکبیر کے ایک معاون پر آباد ہے۔ غرناطہ سے پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے گرد مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہایت مضبوط فصیل ہے جس میں بے تعداد برج بنے ہوئے ہیں مسلمانوں کے زمانہ میں زراعت اور باغات کی وجہ سے جنت معلوم ہوتا تھا۔ زمین بہت زرخیز ہے مگر آج کل خاک اڑتی ہے مسلمانوں کے زمانہ میں یہاں اتنا ریشمی کپڑا بنتا تھا کہ یہ شہر ہی "جین الحریر" کہلاتا تھا۔ اب تو شاید یہاں ریشم ڈھونڈھنے سے ملیگا۔ دس ہزار کے قریب آبادی رہ گئی ہے، جو کم ہوتی جاتی ہے + (مترجم)

(۱۲) اوری ہیولا۔ ORIHUELA اریولہ۔ سپین کا بڑا پرانا شہر۔ اس وقت صوبہ القنطہ (الکنٹے) میں ہے پرانا شہر اس سے جنوب مغرب میں تھا۔ ایک چھوٹے سے دریا پر آباد ہے مضافات بہت خوشنما ہے اور زمین بہت ہی سیر حاصل یہاں کی عمارتیں اب تک مسلمانوں کی قطع کی ہیں کھجوروں کے درخت بہت ہیں۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کی آبادی ہے۔ ایک بڑا گرجا اور کئی چھوٹے چھوٹے گرجا ہیں مسلمانوں کے زمانہ میں تو یہاں بہت سے کارخانے تھے، اب بھی تیل نکالا جاتا ہے، چمڑا بنایا جاتا ہے اور ٹوپیاں باہر جاتی ہیں۔ زیتون بہت پیدا ہوتا ہے مسلمانوں کے زمانہ میں تو بہت عروج

پر تھا۔ اب تو ایک قصبہ رہ گیا ہے۔ اس نے اہالی قرطاجنہ، روم اور مسلمانوں کی سلطنتیں دیکھی ہیں اور اب سپین والوں کے زیر مشق ہے ۔ (مترجم)

(۱۳) ٹلاویرا۔ TALAVERA سپین کا پرانا شہر۔ آج کل صوبۂ طلیطلہ میں واقع ہے میڈرڈ سے ۷۵ میل کے فاصلہ پر دریاءِ ٹیگس پر آباد ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں اس نے بھی بہت عروج پایا۔ ریشم کے کارخانے یہاں بھی بہت تھے۔ اب بھی کچھ ریشمی کپڑا بنتا ہے۔ نہایت گندہ اور کھنڈر مقام ہے مسلمانوں کی عمارتوں اور فصیل شہر کی یادگاریں اب بھی اپنے بانیوں کو رو رہی ہیں ۔ (مترجم)

(۱۴) اراگون = ARAGON = ارغون۔ شمال مشرقی سپین کا ایک صوبہ۔ طول میں ۱۹۰ میل اور عرض میں ۱۳۰ میل ہے۔ رقبہ ۱۰۷۴۱ مربع میل۔ اس کے شمال میں پایرینیس اس کو فرانس سے جدا کرتا ہے؛ مغرب میں نوارا اور کسٹائیل قدیم وجدید ہیں؛ جنوب میں بلنسیہ اور کسٹائیل جدید کا کچھ حصہ؛ مغرب میں قتلونیہ اور بلنسیہ کا کچھ حصہ۔ دریاءِ ایبرو اس کے وسط میں بہتا ہے اور چھوٹے چھوٹے دریا اور پایرینیس کی ندیاں بھی آ کر شامل ہو جاتی ہیں۔ صوبہ کے قدرتی طور پر دو حصے ہیں، ایک مسطح ہے دوسرا مرتفع۔ درمیانی حصہ ناقابل زراعت اور بے آب وگیاہ ہے بمشکل تمام کچھ مکئی، زیتون اور تھوڑے سے انگور پیدا ہوتے ہیں۔ جدھر دریاءِ ایبرو کا پانی مل سکتا ہے اُدھر چاول اور دیگر غلے خوب پیدا ہوتے ہیں سطح مرتفع پر بھی اچھی زراعت ہوتی ہے۔ آب وہوا مختلف ہے۔ پہاڑوں کی سرد اور میدان مسطح کی گرم۔ پہاڑوں پر زیتون وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تانبا، سیسہ، لوہا، نمک، پھٹکری، کوئلہ وغیرہ پیدا ہوتا ہے مصنوعات قابل اعتنا نہیں۔ یہاں کے باشندے بڑے بہادر، چست چالاک، تکلیفیں برداشت کرنے والے اور بات کے دھنی ہیں۔ اسی لئے یہاں بڑی خونریز لڑائیاں ہوئی ہیں پہلے یہ صوبہ رومیوں کے تحت میں تھا۔ جب وہ تباہ ہوئے تو مغربی گاتھوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اُن سے مسلمانوں نے لیا۔ آخر اراگون والوں نے اس کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ ازابیلا یہیں کے تخت کی وارث تھی۔ اس کی جب فرڈی نینڈ، شاہ کسٹائیل، سے شادی ہوئی تو دونوں سلطنتیں گویا ایک ہو گئیں۔ یہی شادی مسلمانوں کے لئے پیغام اجل تھی۔ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ملکہ ازابیلا اسی علاقہ کی ملکہ تھی۔

یہ قصۂ درد مفصل آگے پڑھئے ۔ (مترجم)

(۱۵) ساراگوسا SARAGOSA = سرقسطہ سپین کا بہت پرانا شہر ہے مسلمانوں کے زمانہ میں بہت عروج پر تھا۔ بڑے بڑے امراء رہتے تھے۔ بڑے بڑے قصر تھے لیکن اب تو نہایت ذلیل قصبہ ہے کہ جس میں گنوار رہتے ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں ہیں۔ مکانات گوانیٹوں کے ہیں مگر بہت ہی گندے۔ اگر مسلمانوں کے زمانہ سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے سپین میں سب سے پہلے یہی شہر عیسائی ہوا۔ اس کے بعد تو اس میں تبرکات کا زور بلکہ بدہضمی ہوئی۔ منجملہ ان کے ایک گرجا کا مینار ہے کہ جس پر ۴۰ء میں مریم عذرا آسمان سے نازل ہوئی تھیں۔ ایک اسقف نے اس واقعہ کو اپنا چشم دید بیان کیا۔ اس کو اس میں اتنا اصرار تھا کہ اس نے اعلان کرا دیا تھا کہ جو شخص اس میں شبہ کریگا وہ مذہب سے خارج کر دیا جائیگا۔ ایک اور لطف یہ ہے کہ اس گرجا میں حضرت مریم کی ایک مورت ہے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان سے اڑتے ہوئے اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ہزاروں آدمی اس کو پوجنے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کئی گرجا ہیں۔ فرانس والوں نے ۱۹۰۸ء میں اس قصبہ پر حملہ کرکے اس کو بہت نقصان پہنچایا تھا ۔ (مترجم)

(۱۶) الیسٹریاس ASTURIAS = استوریا سپین کا شمالی صوبہ ۔ اس کے مشرق میں سان ٹنڈر ہے، جنوب میں لیون، مغرب میں جلیقیہ اور شمال میں خلیج بسکے۔ لیون اور کرسٹائل قدیم میں جو سلسلۂ کوہ شروع ہوا ہے اس کی سب سے اونچی چوٹی گیارہ ہزار فیٹ بلند اسی صوبہ میں ہے سپین کا یہ علاقہ بہت ہی ہیبت ناک مگر از روء مناظر خوبصورت ہے۔ ماہ اگست تک پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف رہتا ہے۔ سنگ مرمر نکلتا ہے اور ساگوان وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ جہاں پہاڑ نہیں ہیں وہاں گیہوں، جوار، مکئی، انجیر، زیتون، انگور اور نارنگی پیدا ہوتی ہے۔ تانبا، لوہا، سیسہ، سرمہ، سنکھیا، وغیرہ نکلتا ہے۔ چوپایوں کے لئے اچھی چراگاہیں ہیں ۔

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا یہ علاقہ پوری طرح کبھی مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آیا بلکہ عیسائی یہیں پناہ لیا کرتے تھے۔ یہیں وہ آگ سلگائی گئی جس نے مسلمانوں کی سلطنت کو خاک سیاہ کرکے رکھ دیا

یہاں کے آدمی بڑے بہادر اور سادہ زندگی بسر کرنے والے ہیں محنتی نہیں ہیں۔ لوگ سپین کے اور حصوں میں جا کر کمائی کر لاتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ یہ صوبہ گو برائے نام سپین کے ماتحت ہے مگر عملاً آزاد ہی ہے۔ بادشاہِ وقت کا سب سے بڑا بیٹا شاہ ایسٹریاس کہلاتا ہے جس طرح شاہ انگلستان کا سب سے بڑا بیٹا پرنس آف ویلز ۔ (مترجم)

(۱۷) ماری ٹینیا = MAURITANIA افریقیہ کے انتہائی مغربی شمالی حصہ کا قدیم نام اس کی وہی حدود تھیں جو آج کل سلطنت مراکش اور الجیریا کے مغربی حصہ کی ہیں ۔ (مترجم)

(۱۸) لائی بیا = LIBIA زمانۂ قدیم کے جغرافیہ دان افریقیہ کو کہتے تھے۔ اس میں مصر شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر ہیروڈوٹس تمام براعظم افریقیہ کو لائی بیا کہتے ہیں ۔ (مترجم)

طارق رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر جو انہوں نے سپین میں پہنچ کر حملے سے پہلے کی

حمد و ثنا کے بعد کہا کہ " ایہا النّاس! این المفر! البحر من ورائکم والعدو امامکم ولیس لکم واللہ الا الصدق والصبر۔ واعلموا انکم فی ھٰذہ الجزیرۃ اضیع من الایتام فی مادبۃ اللئام۔ وقد استقبلکم عدوکم بجیشہ واسلحتہ واقواتہ موفورۃ۔ وانتم لا وزر لکم الا سیوفکم ولا اقوات الا ما تستخلصونہ من ایدی عدوکم۔ وان امتدت بکم الایام علی افتقارکم ولم تنجزوا لکم امرا ذھب

لے یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ طارق رحمۃ اللہ علیہ نے جبل طارق پر اترتے ہی حکم دیدیا تھا کہ تمام جہاز جن میں وہ اور ان کی فوج سوار ہو کر آئی تھی جلا دیئے جائیں۔ تعجب ہے کہ مصنف علام نے اس واقعہ کو قلم انداز کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ کیا دنیا میں ایسا دور اندیش اور عاقبت اندیش سپہ سالار طارق کے سوا کوئی اور پیدا ہوا ہے۔ اللھم اغفرہ ۔ (مترجم)

ریحکم، وتعوضت القلوب من رعبها عنکم الجراۃ علیکم۔ فادفعوا عن انفسکم خذلان ھٰذہ العاقبۃ من امرکم بمناجزۃ ھٰذا الطاغیۃ۔ فقد القت بہ الیکم مدینتہ الحصینۃ۔ وان انتہاز الفرصۃ فیہ لممکن ان سمحتم لانفسکم بالموت وانی لم احذرکم امرا انا عنہ بنجوۃ؛ ولا حملتکم علی خطۃ ارخص متاع فیہا النفوس ابدء بنفسی۔ واعلموا انکم ان صبرتم علی الاشق قلیلاً استمتعتم بالارفہ الالذ طویلاً۔ فلا ترغبوا بانفسکم عن نفسی؛ فما حظکم فیہ باوفر من حظی۔ و قد بلغکم ما انشأت ھٰذہ الجزیرۃ من الخیرات العمیمۃ۔ وقد انتخبکم الولید بن عبد الملک امیر المؤمنین من الابطال عربانا، ورضیکم لملوک ھٰذہ الجزیرۃ اصہارا واختانا ثقۃ منہ بارتیاحکم للطعان واستماحکم بمجالدۃ الابطال والفرسان؛ لیکون حظہ (اے امیر المومنین) منکم ثواب اللہ علی اعلاء کلمتہ، واظہار دینہ بھٰذہ الجزیرۃ، ولیکون مغنمہا خالصۃ لکم من دونہ ومن دون المؤمنین سواکم۔ واللہ تعالیٰ ولی انجاذکم علی ما یکون لکم ذکراً فی الدارین۔ واعلموا انی اول مجیب الی ما دعوتکم الیہ؛ وانی عند ملتقی الجمعین حامل بنفسی علی طاغیۃ القوم لذریق؛ فقاتلہ ان شاء اللہ تعالیٰ فاحملوا معی۔ فان ہلکت بعدہ فقد کفیتم امرہ ولم یعوزکم بطل عاقل تسندون امورکم الیہ۔ وان ہلکت قبل وصولی الیہ فاخلفونی فی عزیمتی ھٰذہ واحملوا بانفسکم علیہ واکتفوا الہم من فتح ھٰذہ الجزیرۃ بقتلہ۔

(مترجم)

باب ششم

زمانۂ امارت

۷۱۳ء سے ۷۵۵ء تک

امیر عبدالعزیز۔ اُن کا دانشمندانہ طریقۂ حکومت۔ بارگاہِ خلافت سے اُن کے قتل کا حکم امیر ایوب ابن حبیب۔ اُن کے اصلاحات۔ امیر حر۔ امیر سمح۔ اُن کا فرانس پر حملہ۔ اُن کی شکست اور رحلت امیر عبدالرحمٰن قبیلۂ قحطان و معد کی عداوت۔ اس کے مہلک نتائج امیر عنبسہ۔ اُن کی قابلیت۔ وہ رہون تک پہنچے مگر شہید ہوئے۔ امیر یحییٰ ابن سلمہ۔ امیر عثمان۔ امیر حذیفہ۔ امیر ہیثم امیر محمد۔ امیر عبدالرحمٰن۔ اُن کی ہر دلعزیزی۔ وہ جہاد کا اعلان کرتے ہیں عثمان کی غداری۔ فرانس کے فتح کرنے کی کوشش۔ چارلس مارٹل کے خصائل۔ جنگ پائے ٹیرس۔ امیر عبدالرحمٰن کی رحلت۔ امیر عبدالملک۔ امیر عقبہ۔ اُن کی قابلیت۔ چارلس مارٹل کا پرووینس کو تباہ کرنا۔ افریقیہ میں بربریوں کی بغاوت۔ باغیوں کی فتح۔ امیر عبدالملک ابن قشم۔ امیر بلج ابن بشر۔ امیر ثعلبہ۔ امیر ابوالخطار مغربی یورپ کی حالت۔ امرکے دورِ حکومت میں ایک طرف بددیانتی کا زور تھا دوسری طرف سلطنت کو استحکام نہ تھا۔

سلاطین کے متعلق توریث کے اصول کا جناب رحمۃ للعالمین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے نظامِ سلطنت میں کوئی ذکر نہیں یعنی یہ قرار نہیں دیا گیا کہ باپ کی جگہ بیٹا تخت پر بٹھایا جائے، قرآن مجید نے بھی اس کی نفی کی ہے، زمانۂ قدیم کے عرب بھی اس کو تسلیم

نہ کرتے تھے، مگر جب سے بنو امیہ کا تسلط علی وجہ الکمال ہُوا تو اہلِ عرب نے اُس کو بادل ناخواستہ مان لیا۔ صحیح المذہب قویم الاعتقاد مسلمان تو اب تک سلطان و سلطنت کی نسبت صرف اُسی انتخابی طریقہ کو صحیح و جائز سمجھتے ہیں جو شیوخ قبیلہ کے متعلق عرب قدیم میں رائج تھا۔ مگر ایران کے شیعہ کئی نسلوں سے یہ سمجھتے ہیں کہ اولادِ علی (کرم اللہ وجہہ) ہی صحیح طور پر وارث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہوسکتی ہے، ان ہی کو حقوق سلطنت حاصل ہیں اور یہی تمامتر تقدیس کے وارث جائز ہیں۔ سلاطین دمشق اکثر اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے اپنے بیٹوں کو تخت پر بٹھاتے رہے ہیں۔ اس کے لئے جو ذرائع انہوں نے اختیار کئے وہ اکثر قابل پرس وجو رہے ہیں۔ اگر اس معاملہ میں عمایدِ سلطنت، رؤساء ملک اور رعایا کے انقیاد سے کام نہ نکلا تو ان بادشاہوں نے رشوتیں دینے، دھمکانے بلکہ قتل کرڈالنے میں بھی تامل نہیں کیا؛ مگر اپنے خاندان میں تاج و تخت کو قائم رکھا۔ یہ قدرتی اصول بادشاہ سے سلطنت کے بڑے بڑے عمایدین میں پہنچا اور اُن سے گزر کر صوبوں کے گورنروں تک۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو یہ بھی ایک قسم کی بزرگ پرستی ہے، جو قریباً تمام دُنیا میں جاری و ساری ہے۔ انتہا ہے کہ زمانۂ حال کے جمہوریہ وری پبلک سلطنتوں میں بھی اُس کا رجحان اور اُس کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے موسےٰ کا اپنے تین بیٹوں کو مشرق و مغرب، یعنی افریقیہ و اندلس، میں گورنر مقرر کردینا اُن ملکوں کے مسلمانوں اور فوج نے منظور و قبول کرلیا؛ اور چونکہ اس کو موسےٰ کے "حق" میں داخل و شامل سمجھا، اس لئے امیر المومنین کی منظوری کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ باوجود اس کے کہ امیر المؤمنین سلیمان نہایت درشت مزاج تھے، اور انہوں نے موسےٰ پر وہ مصیبتیں ڈالی تھیں جو کبھی اور کسی حال میں قابلِ معافی نہیں، مگر اُنہوں نے ایک عرصہ تک فاتح المغرب و اندلس کے بیٹوں کو برسرِ کار رکھا، اور مختلف امارتوں کا کام کرتے رہنے دیا۔ عبدالعزیز پر سب سے مشکل کام یہ آ پڑا کہ اُن کو تمام جزیرہ نماء کا سیاسی انتظام از سر نو کرنا پڑا۔

یہ کام ظاہر ہے کہ کچھ آسان نہ تھا۔ ایک سلطنت کے کھنڈرات پر ایک ایسا نیا انتظام کرنا تھا کہ جس کو پہلے انتظام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ اُس سے بالکلیہ برعکس و خلاف تھا۔ بہرحال اُنہوں نے اپنا کام نہایت ہوشمندانہ کیا، اور اپنی انتہاء فہم و فراست اور سپاہیانہ اور سیاسیانہ جوہر دکھلائے۔ بعض شہر ایسے تھے کہ جن پر فاتحین کا براہِ راست اثر نہ تھا؛ اس لئے اُنہوں نے بیعت ہی کو توڑ ڈالا تھا، بلکہ معمولی خراج ادا کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اُن کو بہت جلد مطیع کیا گیا۔ موسٰے نے جو معاہدے تھیوڈومیر (گاتھک حاکم مرسیہ) سے کئے تھے اُن کی نہایت ایمانداری کے ساتھ تصدیق و تجدید کی گئی۔ مختلف افسروں کی سرکردگی میں بہت سے دستہاء فوج ضوبہاء شمال و مغرب میں بھیجے گئے؛ جنہوں نے مسلمانوں کی سلطنت کو لیوسی ٹانیا کے سواحل اور کوہستان بسکے اور نوار تک پہنچا دیا۔ سرحد کی حفاظت کے لئے قلعہ بنائے گئے، اور بڑے بڑے شہروں میں معتبر و کار آزمودہ افسروں کی ماتحتی میں فوج محافظ رکھی گئی۔ ایک دیوان (کونسل) مقرر کی گئی؛ محاصل اور ٹیکسوں کے محصلین مقرر کئے گئے؛ اور دیوانی و فوجداری مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے حکام مامور کئے گئے۔ چونکہ عیسائیوں پر اُن ہی کے قانون کے موافق عمل ہونے والا تھا، اور وہ اپنے آبائی مذہب پر رہنے میں آزاد قرار دیئے گئے تھے، اس لئے اُن کی گردنوں پر مسلمانوں کا جُوا رکھا جانا چنداں گراں نہیں معلوم ہوا۔ اُن پر جو کچھ پابندی عائد کی گئی تھی وہ صرف اتنی تھی کہ اپنے آقاؤں کے مختلف نظامات کا ظاہری احترام کریں اور جزیہ باقاعدہ طور پر ادا کرتے رہیں۔ اگر کسی پر تشدد یا ظلم ہوتا تھا تو مجرم کو سزا دی جاتی تھی؛ جس سے عوام الناس کو اپنے نئے بادشاہوں پر پورا اعتماد ہو گیا۔ کاشتکاروں نے ازسرِنو اپنی جھونپڑیاں بنالیں، اور اپنا کام پھر شروع کر دیا، جو جنگ اور غیر ملکی دشمنوں کی وجہ سے رُک گیا تھا؛ شہروں کے جن شوارع عام پر گھاس اُگ آئی تھی اُن میں

پھر آمد و رفت اور تجارت کی چہل پہل شروع ہوگئی، اور کئی سال کی جنگ اور بربادی کے آثار تمام جزیرہ نما میں سے مٹنے لگے ۔

عبدالعزیز کا ملکی انتظام خواہ کیسا ہی منصفانہ ہو، مگر اس کے مفید اثرات مسلمانوں اور عیسائیوں، دونوں کی نگاہ میں ہیچ تھے؛ کیونکہ ان کی خانگی زندگی کے تشددات نہ رکھے جا سکتے تھے نہ اٹھائے جا سکتے تھے۔ ان کے جذبات کچھ ایسے شدید تھے کہ اہالی ایشیا میں بھی ان سے کم ہی ہوتے ہونگے۔ ان کا چال چلن معمولی ظالم کے ظلم سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ قوم گاتھ کی حسین ترین لڑکیاں اور عورتیں ان کے حرم سرا میں داخل تھیں؛ انتہا ہے کہ معززین عرب کے گھر بھی ان کے خواجہ سراؤں سے محفوظ نہ تھے۔ ملکۂ ایجیلونا، راڈرک کی بیوی، ان کے ہاتھ پڑیں تو امیر عبدالعزیز نے پہلے تو ان کو بطور جاریہ رکھا، مگر بعد میں ان سے نکاح کر لیا، اور ساتھ ہی ان کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مذہب کی پابند رہیں۔ یہ ایسی رعایت تھی کہ ان کی حیثیت کی آدمی کے لئے بالکل غیر معمولی تھی۔ وہ چونکہ بہت جلد اپنے شوہر کے مزاج پر حاوی ہوگئی تھیں، اس لئے انہوں نے اپنے ہموطنوں کی تکالیف کم کرنے میں بہت کچھ مدد دی۔ ان کے حسن، ان کی دولت (جسکو انہوں نے عین وقت پر جزیہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کرنے سے بچا لیا تھا) اور ان کی عقل و فہم نے ایک مرتبہ پھر ان میں یہ بلند نظری پیدا کی کہ انہوں نے تخت پر بیٹھنا چاہا۔ ان کے اثرات بہت جلد امور سلطنت میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ امارت اندلس کے سیاسی معاملات میں ان کا درخور ہو گیا؛ جس سے ارکین دیوان اور افسرانِ فوج سخت پریشان ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنی حماقت سے قوم گاتھ کے مراسم دربار میں جاری کرنے چاہے، جس کے یہ معنی تھے کہ جو شخص کہ بادشاہ کے تخت تک پہنچے وہ سجدہ کرے۔ اس رسم کو مسلمان نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ یہ مساوات اور آزادی

دونوں کے خلاف تھا اور از روۓ احکام قرانی ممنوع۔ اُن ہی کے مشورہ سے تھیوڈمیر کیساتھ
ایک معاہدہ ہوا جسکے روسے اُس کو حین حیات تک مرسیہ جیسے سیر حاصل صوبہ کا
مطلق العنان بادشاہ بنادیا گیا۔ ایک کافرہ کے ہاتھ میں اتنے وسیع اختیارات دے
دینے سے مسلمان سخت ناراض تھے اور اس کو اپنی سلطنت کے لئے بدشگونی سمجھتے
تھے۔ ایک مرتبہ یہ خبر اُڑی کہ عبدالعزیز اس ساحرہ کے پھندے میں پھنس کر عیسائی ہونا
اور خود آزاد بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ چونکہ عام طور پر یہ خبر مشہور تھی سب کو اس کا یقین
ہوتا چلا جاتا تھا؛ ساتھ ہی وہ ہر دل عزیز بھی تھے۔ بلند نظری اُن میں تھی ہی؛ یہ ظاہر
ہی تھا کہ اُن کے باپ پر ظلم وستم ہوئے تھے لہٰذا اس کا امکان تھا کہ وہ انتقام لینے
پر مائل ہوں جب ان سب باتوں کی خبر امیرالمومنین کے گوش زد ہوئی تو اُنہوں نے
موسےٰ کے بیٹے کے خدشہ کو رفع کرنے کا عزم مصمم کر لیا؛ چنانچہ پانچ افسرانِ فوج اندلس
کے نام حکم پہنچے کہ عبدالعزیز کو قتل کر دیا جائے۔ جس شخص کو سب سے پہلے یہ حکم
ملا وہ حبیب ابن عبیدہ تھے جو خاندان موسےٰ کے بہت ہی پُرانے اور معزز خیر خواہ
تھے۔ اُن کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی اُس کا اندازہ ہوسکتا ہے؛ مگر جو حکم پہنچا تھا
وہ ناطق وقطعی تھا۔ جب کسی مسلمان کو ظل اللہ فی الارض کا حکم پہنچ جائے تو وہ تعلقات
دوستی واختلاط واحسان کی پروا نہیں کیا کرتا۔ چونکہ عبدالعزیز ایک ایک سپاہی کو عزیز تھے
اس لئے یہ پانچوں صاحب فوجوں کے شمشیر بکف ہوجانے سے بہت ڈرتے تھے۔
ان سب نے مل کر مشورہ کیا؛ اور یہ راۓ قرار پائی کہ اُن کو عین نماز میں قتل کیا جائے۔
امیر کی یہ عادت تھی کہ وہ گرمی کے موسم میں اشبیلیہ چلے جاتے تھے؛ اور وہیں اپنے
بنگلے میں رہتے تھے۔ اسی بنگلہ کے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ یہیں وہ صبح کی
نماز پڑھ رہے تھے کہ بحالت سجدہ قتل کر دئے گئے۔ اُن کا جسم اسی بنگلہ کے صحن
میں دفن کر دیا گیا اور سر ایک صندوق میں بند کر کے اور اُس میں کافور بھر کر امیرالمومنین

سلیمان کی خدمت میں دمشق بھیج دیا گیا؛ کیونکہ اس سے بڑھ کر ان کے قتل کر دیئے جانے کا اور کوئی قطعی ثبوت نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض اس طرح ایک فرد فرید جو فنون جنگ میں اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ مشہور آدمی تھے، جن کی فہم و فراست لیاقت و قابلیت سے یہ امید تھی کہ وہ ان سیاستی گتھیوں کو سلجھا لینگے جو جدید شاہ اندلس کو پیش آرہی تھیں، ختم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مفتوحین سے جو لینت کی اس کا نتیجہ ان کا قتل ہونا ہی تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ ان کا نشو و نما وحشیوں میں ہوا، بجاء اسکے کہ ان کے خونخوارانہ اخلاق ان میں آتے ان میں ملایمت پیدا ہوتی چلی گئی۔ چند ہی ہفتوں کے بعد ان کے بھائیوں کا بھی وہی حشر ہوا جو خود ان کا ہوا۔ یہ کچھ معلوم نہ ہوا کہ ان کی بیوی ایجیلونا کا کیا انجام ہوا۔ شاہ راڈرک ان کے فاتح طارق، ان کے حلیف کاونٹ جولین، اور ان کے رفیق، فرزندان وٹیزا کے ساتھ ہی ساتھ بیچاری ایجیلونا کا حال پردۂ خفا میں ہے؛ حالانکہ ان میں سے ایک ایک تاریخ اندلس کے درخشندہ گوہر ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مورخین نے اتنے نمود کے آدمیوں کو ایک ایک کر کے بلاوجہ بھلا دیا، اور ان کو بساط تاریخ سے بالکل علیحدہ کر کے رکھ دیا۔

امیر المومنین کو موسے کے خاندان کے تباہ کرنے میں ایسا انہماک اور اتنی عجلت تھی کہ وہ عبد العزیز کا جانشین تجویز کرنا ہی بھول گئے؛ چنانچہ تھوڑے عرصہ کے لئے اندلس بغیر کسی امیر کے رہا۔ ایک اجنبی ملک میں مختلف النوع رعایا کے درمیان کرسی امارت کے خالی رہنے سے مسلمانوں کو اندیشہ پیدا ہوا۔ بڑے بڑے معزز اور مقتدر لوگوں نے مجلس شورے مرتب کی، اور بادیۂ عرب کی قدیم رسم کے موافق انہوں نے ایوب بن حبیب کو مشروط امیر مقرر کیا۔ ایوب ایک مسن اور تجربہ کار فوجی افسر تھے، اور عبد العزیز کے چچیرے بھائی۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ انہوں نے

دارالامارت کو اشبیلیہ سے قرطبہ میں منتقل کر لیا؛ کیونکہ وہ مقام ہر طرح پر زیادہ مفید تھا یہ مقدر ہو چکا تھا کہ جب تک یہ فاتحین سرزمین اندلس پر رہیں، اس مقام کو یورپ میں وہی عظمت حاصل رہے جو مکہ (معظمہ) کو ایشیا میں ہے؛ یہ جگہ اخلاق و تہذیب کا مدرسہ ہو اور سائنس اور صنعت کا مسکن، تمام دُنیا کے مسلمان اس کو حیرت کی نظر اور جلالت کی نگاہ سے دیکھیں، دُنیا بھر کے عالم، بلا لحاظ ملک و ملت، اسکو اپنا قبلہ حاجات سمجھ کر محبت و عظمت کی نظر سے دیکھیں، اور مغربی یورپ کے وحشی اشرار اس سے لرزہ براندام رہیں تحصیل وصول کے آسانیوں، اور ملکی لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ملک کو کئی ضلعوں میں تقسیم کر کے، ہر ایک ضلع میں ایک ایک والی مقرر کر دیا گیا، جو براہ راست امیر کے ماتحت اور امیر کو جوابدہ تھا۔ ان حکام کی زندگی انقلاب پسند لوگوں کو دبائے رکھنے، کفار کے شہروں کے برباد کرنے اور ان کے قتل کرنے میں گزرتی تھی وہ اس قابل نہ تھے کہ حالت امن میں کسی قوم کی زمام حکومت ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ یہ چھوٹے چھوٹے حکام چونکہ دارالسلطنت سے دور پڑے ہوئے تھے اس لئے سخت بے رحمیاں اور جبر ستانیاں کرتے تھے جس سے لوگ سخت تنگ آ گئے تھے۔ ایوب نے ان حکام و عمال کے اعمال کی تحقیقات کر کے کسی کو معزول کیا اور کسی کو اور سزائیں دیں۔ اس نئے امیر نے تمام ملک محروسہ کا دورہ کر کے بہت سی خرابیوں کا سدباب کیا؛ بہت سی باتوں میں اصلاحیں کیں؛ قلعے بنوائے؛ شہروں کی فصیلوں کی مرمت کرائی؛ جو کاشتکار کہ کشاورزی چھوڑ بیٹھے تھے اُن کی دل دہی کی، اور ان کو پھر اپنے پیشہ کی طرف مائل کیا؛ بلا لحاظ مذہب و قومیت مظلوموں کی حق رسی و داد رسی کی؛ اور اپنی ممنون رعایا کی صلاح و فلاح کی ہر ممکن تدبیر کی۔ جو علاقے کہ غیر آباد ہو چکے تھے اُن کو افریقیہ اور ممالک مشرقیہ کے آبادکاروں اور نصیب آزما لوگوں سے آباد کیا۔ جن جن علاقوں میں کہ عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی اُن میں مسلمانوں اور یہودیوں کو بسایا، تاکہ ان کی موجودگی سے اُن کا جوش نہ بڑھے، اور وہ اپنی

زیادتی تعداد کے بھروسہ پر دست درازی نہ کریں۔ وہ حفاظتی بروج جو کوہ پا یرنیس پر طاؔ
کی چوٹیوں پر بنے ہوئے تھے، اور درہاء ناربونیزگال کی حفاظت کرتے تھے، مضبوط
کئے گئے، اور اُس میں حفاظتی فوج کے ایسے دستے رکھے گئے، جن کی چستی و چالاکی
بہت سے مخدوش اور تکلیف دہ موقعوں پر آزمائی جا چکی تھی۔ ناربونیزگال وہی پراسرار
علاقہ ہے جس کو نامکمل جغرافیۂ عرب میں "ارض اعظم" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا
ہے کہ وہاں جن اور پری، اور بڑے بڑے فرضی خونخوار جانور رہتے ہیں۔ ایوب ابھی اپنا
انتظام جدید بشکل مکمل کرچکے تھے کہ امیر المومنین کی جارحانہ پالیسی برروئے کار آئی
اور انہوں نے اُن کو معزول کردیا۔ محمد ابن یزید امیر افریقیہ کو حکم دیا گیا کہ وہ قبیلہ لخم
کے تمام افراد کو معزز عہدوں سے علیحدہ کردیں، کیونکہ موسٰے اسی قبیلہ کے آدمی تھے؛
اور حُر بن عبدالرحمٰن کو جزیرہ نماء اندلس کے نازک عہدۂ نیابتِ سلطنت پر مقرر کردیں
صنادید عرب کے چار سو آدمی، جن کا جوش دینی، شوق سیر و سیاحت، یا امید شہرت و ناموری،
سواحل افریقیہ پر لے آئی تھی، محمد ابن یزید کے ساتھ اندلس پہنچے تھے۔ یہ وہی سپاہی
ہیں جن کی اولاد ملکی اور فوجی عہدوں پر ممتاز، بلکہ تخت شاہی پر متمکن، اور عمائد سلطنت
اندلس ہونے والی تھی۔

شروع ہی سے جدید امیر کے مستبدانہ افعال سے ہر شہر اور گاؤں میں ایک آفت
برپا ہوگئی، اور سب کو سخت فکر لاحق حال ہوگیا۔ اُن کے تشددات کی کوئی انتہا نہیں
رہی۔ انہوں نے ایک یہ بہانہ بنا لیا کہ محاصل سرکاری میں سخت دغل و فصل ہوتا ہے
اس لئے محصلین کو قید کردیا، اور اُن کو اذیتیں دی گئیں۔ اس سزا دینے میں دین و ملت
کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ عیسائی اور مسلمان دونوں اُن کے دست تظلم سے نالاں
تھے؛ یہاں تک کہ سب سے پُرانے اور سب سے نامور افسرانِ فوج، جو شام اور افریقیہ میں
لڑ چکے تھے، اور طارق اور موسٰے جیسے مشہور و ممتاز سپہ سالاروں کی معیت میں رہ چکے

تھے اُن کی طمع کے شکار ہونے سے نہ بچے۔ اُن کے ظلم و ستم اس حد تک پہنچ گئے کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اُن سے خود نفسِ اسلام کو نقصان پہنچیگا۔ عیسائیوں نے مسلمان ہونا چھوڑ دیا؛ کوئی افسر، خواہ وہ کسی درجہ و رتبہ کا تھا، اس سے مطمئن نہ تھا کہ اُس کی آزادی، جایداد اور جان محفوظ رہیگی؛ بدقسمت یہودیوں اور عیسائیوں کو ہر طرح کی آفات، اور سخت ترین بے رحمیوں سے سابقہ پڑا۔ مظلوم رعایاء اندلس نے امیر افریقیہ سے درخواست کی کہ حُر کو معزول کر دیا جائے، مگر اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ لاچار لوگ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں پہنچے، جو اُس وقت تخت پر بیٹھ چکے تھے۔ اُنہوں نے فوراً اس ظالم گورنر کو موقوف کر کے اُس کی جگہ سمح کو مقرر کر دیا، جو افواج متعینہ سرحد شمالی کے سپہ سالار تھے۔ اس افسر نے آکر یہ ثابت کر دیا کہ امیر المومنین اُن سے بہتر انتخاب نہ کر سکتے تھے؛ کیونکہ یہ نہایت عاقل و عادل شخص نکلے۔ اُن کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ نظام مالی میں جو کچھ سقم ہیں اُن کو رفع کر دیں۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ شہروں سے، جہاں کہ لازمی طور پر ملک محروسہ کی دولت جمع رہتی ہے، اور قابلِ محصول جائیدادوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، آمدنی کا ایک عشر وصول کیا جاتا تھا، اور گاؤں اور اراضی کاشت شدہ سے ایک خمس۔ اصل میں اس غیر مساوات کی وجہ یہودیوں کی رعایت تھی؛ کیونکہ یہ لوگ تجارت کے شوق میں زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں آباد تھے۔ چونکہ تجارت کو فروغ دینا مقصود تھا، اس لئے اُن کو روپیہ جمع کرنے اور تجارت میں لگانے کی تشویق کیجاتی تھی۔ جدید امیر نے اسکی اصلاح کی۔ بَرابرہ کی قدیمی عادت بادیہ نشینی، جو پشتہا پشت سے چلی آتی تھی، اُن کو ایک جگہ نہ ٹھیرنے دیتی تھی۔ کئی مرتبہ یہ کوشش کی جا چکی تھی کہ وہ کہیں آباد ہو جائیں، مگر وہ کوشش بارور نہیں ہوئی۔ امیر سمح نے اُن سب کو جمع کر کے غیر آباد علاقوں میں بسایا، اور ہر قسم کی رعایات و مراعات سے ان خونخوار فطرتی سپاہیوں کے یہ ذہن نشین کیا کہ مدنیت میں وہ خوبیاں ہیں جو بدویت میں نہیں۔ اُنہوں نے

تمام جزیرہ نمائے اندلس کی مردم شماری کرائی، اور دربار خلافت میں مختلف جداول سے اس کے نتائج ظاہر کیے۔ ان جداول میں نہایت تفصیل اور استناد کے ساتھ مختلف شہروں کے حالات، سواحل کے شہروں اور مکانوں کی کیفیت، پیداوار کی تفصیل، تجارت اور تجارتی اشیاء کے نام، بنادر، دولت ملکی، کانوں اور زراعت کی تفصیل دکھلائی گئی تھی۔ انہوں نے قرطبہ کے اس پل کو، جو آگسٹس کے زمانہ کا بنا ہوا تھا، از سر نو بنوایا، جو اس وقت تک ان کی قابلیت اور حسن نیت کی زندہ مثال ہے، اور اس کی وجہ سے ان کی شہرت لازوال ہو گئی۔ انہوں نے اپنی توجہ کو ایک ہی طرف مصروف نہ رکھا، اور صرف وہی کام نہیں کیے جو زمانہ امن کے لئے نہایت ضروری ہیں؛ وہ طارق کے دوست اور رفیق تھے، ان کی معیت میں بڑے بڑے میدانہائے جنگ دیکھے تھے، اور گھمسان کی لڑائیاں لڑی تھیں۔ اب کہ ان کا محروسہ نہایت امن و عافیت کی حالت میں تھا، انہوں نے نہایت ذوق و شوق، اور سچے مسلمان کی سچی خوشی کے ساتھ، امیر المومنین کا یہ حکم پایا کہ وہ ماوراءِ کوہ پائرینیس پر جہاد کی تیاریاں کریں۔

ناربونیز گال کا علاقہ ایک زمانہ میں وزیگاتھ کی سلطنت کا ایک حصہ تھا، اور ایک خوفناک ہمسایوں کی دست برد سے اس لئے محفوظ تھا کہ اس کے جنوب کی جانب نہایت بلند اور ناہموار پہاڑ تھے۔ وہ اب تک برابر اپنے بزرگوں کی روایات اور مراسم پر عمل کرتے چلے آئے تھے۔ اس میں اس علاقہ کا بہت بڑا حصہ شامل تھا، جو آج کل لینگیڈوک کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا اور دریائے رہون[۳] اور گیرون[۴] اور ان کے معاون، اس کو سیراب کرتے تھے۔ اسی سیر حاصل ہونے اور اعتدال آب و ہوا کی وجہ سے ابتداء ہی میں لوگوں کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی تھی، اور یونان اور اطالیہ سے آ آکر لوگ یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہ علاقہ تہذیب میں بہت بڑھا ہوا تھا، صنعت و حرفت میں اس نے بڑی ترقی کی تھی؛ چنانچہ اس کے آثار ان عمارات سے ظاہر ہیں جو اس کے شہروں کی اب تک زینت ہیں۔ ان عمارات کے نقشے نہایت شاندار اور

مہیب ہیں، یہاں تک کہ اس خصوص میں روم بھی اُن کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ کسی ملک کی کوئی عمارت وہاں کے صناعانِ زمانۂ قدیم کے جوہر دماغی اور خوش مذاقی کی برابری نہیں کرسکتی جو اورینج محراب[۵] پانٹ ڈو گارڈ[۶]۔ مناور، و تماشا گاہ نیمس[۷] سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے لطیف و ظریف تناسب اور حیرت انگیز مضبوطی سے، سیاح نقشِ حیرت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندوں نے باوجود مصائب اور سینکڑوں برس کی لڑائیوں کے اپنے آباؤ اجداد کی اصلیت، رنگ روپ اور صورت و شکل کو نہیں چھوڑا تھا۔ علاقہ پرووینس[۸] اور اُس کے ہمسایہ علاقۂ گیس[۹] کون کا غرورِ باطل، رومیوں کی تقلید میں نہایت متکبرانہ تھا۔ آرلیس[۱۰] کی عورتیں اپنے تناسب اعضا، بے عیب صورت و شکل، اور مستانہ چال میں زمانہ پیری کلس[۱۱] کی عورتوں کے حسن کو یاد دلاتی تھیں۔

وزیگاتھ اس علاقہ کو سپ ٹی مین یا کہتے تھے، جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سات شہر موسومہ نار بون[۱۲]، نیمس، ایگدی[۱۳]، لوڈیو[۱۴]، بیگ بولون[۱۵]، ہیٹر برس[۱۶] اور کارکسون[۱۷] اس علاقہ میں تھے۔ اس وقت بھی وہاں گاتھ ہی کا اصول قانون رائج تھا، جیسا کہ تمام جزیرہ نماء میں۔ اگرچہ وہ علاقہ کئی چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم تھا، ہر ایک حصہ کا الگ رئیس تھا، جو اِدھر اُدھر مار دھاڑ کرتا رہتا تھا، کیونکہ کسی بڑی طاقت کا اُن کو خوف نہ تھا؛ اس لئے برسوں سے بلا خطر وہ اپنا پُرانا کام کرتے آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود اتفاق نہ ہونے کے وہ اپنی حیثیت قائم رکھے ہوئے تھے۔ شمال کی طرف میرووِن[۱۸] جی ان خاندان کا استبداد اور بدنظمی، اور آئے دن کی لڑائیاں، قائم رہتی تھیں۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے کہ ابھی پے پن اور شارلی مین کی سلطنتوں کی بنیاد نہیں پڑی تھی، اور اُن کی طرف سے ابھی خوف و خطر شروع ہی نہ ہوا تھا۔ واڈلیٹ (وادیانہ) کی لڑائی کے بعد رؤسا گاتھ کی نظریں بڑی گھبراہٹ اور فکر کے ساتھ کوہ پائرینیس کی چوٹیوں سے اُس طرف جاتی تھیں۔ اندلس کے بے تعداد آدمی اپنے رشتہ داروں یعنی گال کے باشندوں کے پاس حفاظت کے لئے

پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے فاتحین کی زیادتیوں کے جو قصے وہاں بیان کئے اُس سے ان جلاوطن پناہ گزینوں کو کوئی مدد نہیں ملی۔ وہ اتنے کمزور تھے کہ اُن کو یہ امید کسی طرح تھی ہی نہیں کہ وہ مقابلہ کر کے کامیاب ہو جائیں، اس لئے اُنہوں نے لگا تھ ہونے اپنی پشتینی لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ دیا اور اپنی تباہی کامل سے بچنے کے لئے اُنہوں نے یوڈیس ڈیوک آف ایکیوٹین جیسے طاقتور آدمی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

امیر سمح جب پوری طرح تیار ہو گئے تو وہ بہت بڑی فوج لیکر دوڑا ہ کوہ کے اُس طرف پہنچ گئے ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد ناربون دارالسلطنت سپٹی مینیا نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی وہاں کے گرجاؤں اور خانقاہوں سے بہت کچھ دولت فاتحین کے ہاتھ آئی۔ اس کا بیشتر حصہ سپین کے جلاوطنوں نے ان معبدوں کو محفوظ سمجھ کر جمع کیا تھا۔ بیثیرز، میگولون، اور کارکسوں کے قلعے قریباً بلا مزاحمت مسلمانوں کو مل گئے، کیونکہ وہاں کے باشندوں نے بطیب خاطر ذمی ہونے کی شرائط کو مان لیا، جو بجاء خود نہایت فیاضانہ تھیں۔ خوشنما وادی گیرون میں عربی رسالوں کے آدمیوں نے ایک آفت برپا کر دی، اور تباہی پھیلا دی۔ اس ملک کی کشمکشات اور بدنظمی کچھ ایسی تھی کہ امیر سمح کو اپنی فوج کے جمع کرنے میں سخت دقت اُٹھانی پڑی، کیونکہ لوگ لوٹ مار کے لئے دور دور نکل گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی پیش قدمی کو جاری رکھا اور آخر ٹولوس[۲] جیسے بڑے شہر کو، جو ایکیوٹین کا دارالسلطنت تھا، جا دبایا محاصرہ میں بہت سختی کی گئی۔ وہاں کے باشندے جب انتہاء مصیبت اُٹھا چکے تو اطاعت قبول کرنے ہی والے تھے کہ ڈیوک آف ایکیوٹین مسلمانوں کی فوج سے زیادہ کمک لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اتنی فوج کو دیکھ کر مسلمان گھبرا گئے، اور رجعت کرنے کو تیار ہی تھے کہ شجاعان اسلام کی طرح امیر نے اپنی ایک پُرجوش تقریر سے فوج کے دل بڑھا دیئے۔ اس تقریر میں اُنہوں نے نہایت ہوشیاری سے فتح کے انعامات اور عاقبت کے وعدہ و وعید مسلمانوں کو یاد دلائے۔ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو بادریوں

نے اسفنج کے ٹکڑے فوج میں تقسیم کئے، جو پوپ نے برکت دے کر بھیجے تھے۔ یہ ایسے تعویذ تھے کہ جو نہایت مضبوط زرہ بکتر سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ کیونکہ خوش اعتقاد عیسائی صادقین نے ہمکو یہ یقین دلایا ہے کہ جس جس کے پاس یہ اسفنج کا ٹکڑہ تھا۔ وہ اس لڑائی میں نہیں مارا گیا۔ مقابلہ بہت دیر تک قائم رہا؛ اور لڑائی گھمسان کی ہوئی مسلمانوں نے بے انتہا بہادری دکھلائی؛ مگر اس وقت کی مایوسی نے اُن کے دلوں سے وہ جوش مذہبی کم کر دیا تھا، کہ جس نے اُن کو ہر میدان میں کامیاب رکھا تھا۔ جو کچھ لوٹ مار سے وہ جمع کر سکے تھے، اُس کی حفاظت کے دھیان میں لگ گئے؛ تیغ زنی، فتح اور شیوع اسلام کا چنداں خیال نہ رکھا۔ اس پر بھی نتیجۂ جنگ بہت دیر تک مشتبہ رہا؛ لیکن ستم یہ ہوا کہ امیر سمح نے، بلا خیالِ پس و پیش، اپنے آپ کو اتنا خطرہ میں ڈال دیا تھا کہ وہ نہ بچ سکے، اور کسی کے نیزہ سے اُن کی جان گئی۔ بس پھر کیا تھا؛ اُن کی تمام فوج کے پیر اُکھڑ گئے، اور وہ میدان جنگ سے بے طرح پسپا ہوئی۔ اس جنگ میں اُن کے دو تہائی آدمی کام آئے لوگوں نے عارضی طور پر عبدالرحمٰن الغافقی کو اپنا امیر بنا لیا، جو فوج میں بڑے رتبہ اور تجربہ کے نامور آدمی تھے۔ اُنہوں نے ایک مرتبہ پھر مسلمانان ناربون کو جمع کیا۔ اِدھر کی تو یہ کیفیت ہوئی، اُدھر اہالی فرانس اپنے دشمنوں کو لوٹنے میں لگ گئے؛ کیونکہ اُنکی چھاؤنی میں بہت زیادہ مال ایسا تھا کہ جسکو وہ بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے تھے؛ اس وجہ سے مسلمانوں کو اپنے عارضی غلبہ سے چنداں نفع اُٹھانا نہ ملا۔ مسلمانوں کو اپنی پسپائی میں ذرا دقّت اُٹھانا پڑی؛ کیونکہ اُن کی شکست کی خبر سن کر اِدھر اُدھر سے گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے تھے، اور اُن کا راستہ روکنا چاہتے تھے لیکن یہ اِن مشکلات کو بہت خوبصورتی سے رفع کرتے رہے۔ البتہ اُن کی عقبی فوج کو کچھ نقصان پہنچتا رہا، گو مقابلہ میں یہ ہمیشہ کامیاب رہے ؛

یہ پہلی شکست تھی کہ اُس ملک میں آ کر مسلمانوں کو اُٹھانی پڑی؛ ورنہ اس سے پہلے

فتح و نصرت اُن کی رکاب کو چومتی رہی تھی۔ ہوا کا رُخ کچھ بدل چلا تھا؛ وہ کبھی نہ مٹنے والی دشمنی، جو عرب کے دو دشمن قبایل میں تھی؛ اور جس کو نہ اُن کے دین کے اصول، نہ فوجی کامیابیاں، نہ مسلسل و متواتر فتوحات، نہ بے انتہا دولت، نہ دنیاء تمدن کے بہترین علاقہ کا قبضہ مٹا سکا اب پھر دُنیا کے سامنے آئی، جس نے جانشینانِ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کمزوری کو ظاہر کر دیا۔ اس وحشیانہ کینہ توزی اور انتقام کوشی کی اصلیت اور ترقی پر ایک نگاہ ڈالنی نہایت ضروری ہے۔ یہ دشمنی وہ تھی کہ باوجود اس کے کہ لوگ مسلمان ہو گئے، اور ہوتے چلے جاتے تھے، مگر عمریں گزر گئی تھیں کہ اس کی آگ بھڑکتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کا الاؤ ایشیا کے ایک دور دراز مقام پر سلگ رہا تھا، مگر یہ مقدر ہو چکا تھا کہ اس کی حدت سے اراگون اور اندلس کے میدانوں میں بھی آگ لگ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مغربی سلطنت کے انتزاع کا اصلی باعث یہی دشمنی ہے۔

جیسا کہ اوراق ماقبل سے ضمناً معلوم ہو چکا ہے، باشندگانِ شمالی عرب اور جنوبی عرب میں اتنے عرصہ سے معاندت چلی آتی تھی کہ جس کا اندازہ لگنا مشکل ہے۔ عداوت کی وہ کیفیت تھی کہ اتنا زمانہ گذرنے پر بھی اُس میں کمی آنے کی کوئی علامات نہ تھیں۔ بوجہ اختلاف نسل، اور غالباً اس سبب سے کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں ایک نے دوسرے پر فوج کشی کی تھی، وہی تعصب پیدا ہوا، جس نے بڑھتے بڑھتے منافرت بھر معاندت کی صورت اختیار کر لی اہالی یمن و حجاز کے پیشوں کی بدولت اس میں اور بھی زیادتی ہوئی، کیونکہ اگر پہلے امن عافیت کے خواہاں، تجارت پیشہ لوگ تھے، تو دوسرے قتل و غارت کے جویاں، خانہ بدوش قزاق تھے۔ اولاد معد، جو مکہ کے مالک تھے، از روء پیشہ چرواہے اور قزاق تھے۔ اُن کو یہ فخر تھا کہ ہم شرفاء عرب سے ہیں۔ جز ورس اور صنعاءانِ جنوب اولاد قحطان سے تھے، جن کے نزدیک کاشتکاری کچھ معیوب نہ تھی، نہ کھجور کے درختوں کی رکھوالی میں کچھ شرم تھی، نہ تجارت سے نفع اُٹھانے میں بے عزتی۔ وہ اپنی دولت اور تہذیب و تمدن کے بھروسہ پر اپنے ہمسایوں کی حقارت کو

بطیب خاطر قبول کرتے تھے، جن کا گزارہ ہی اس پر تھا کہ کعبہ میں جو جاتری جائیں اُن سے بحیلہ و فریب روپیہ وصول کریں، اور قبایل کو لوٹ کر آپس میں تقسیم کرلیں۔ اہالی مدینہ کچھ تو یہودیوں کی اولاد سے تھے، جو تمدن تھے، اور کچھ اُن کے تعلقات یمن کے تاجروں سے تھے، اس لئے اولاد معد اُن کو قحطانیوں میں شامل سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی دشمنی سے دین اسلام کو بڑی مدد ملی اور اُسی کی وجہ سے اُس کو وہ طاقت و قوت حاصل ہوئی کہ اُس نے اپنے مخالفوں کو تہ و بالا کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ یہی دشمنی تھی کہ جس نے، قبل اس کے کہ اسلامی سلطنت کو استقلال و استحکام ہو، اُس کو ختم کر دیا۔ اسی نے ہر ملک اور صوبہ کو، جو اس کے وسیع دامنِ حمایت میں آیا، آئے دن کی لڑائی اور خون ریزی کا تماشا گاہ بنائے رکھا؛ اسی نے نہایت مقدس معابد کو بے ادبی اور قتل و غارت سے ناپاک کرا دیا؛ اسی دشمنی نے خاندانوں کے خاندانوں کو جلادوں کے ہاتھوں سے بے چراغ کرا دیا؛ اسی دشمنی نے چارلس مارٹل جیسے فولادی پنجہ، اور اہالی فرانس کی بسالت نے، ایک ہی تلوار کے وار میں اسلام کے ہاتھ سے تمام یورپ کو نکلوا دیا؛ اسی دشمنی کا انجام حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا قتل، اور حرمین کی بے حرمتی ہوا؛ اسی دشمنی کا نتیجہ وہ سازش اور مناقشت ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت میں ہوئی؛ اسی دشمنی سے حضرت امام حسین رضؓ شہید ہوئے؛ اسی دشمنی سے متعصب مصلحین ایران کا عروج ہوا؛ اسی دشمنی سے بنو امیہ کا انتزاع ہوا؛ اسی دشمنی کا نتیجہ وہ بدنظمی ہوئی جس نے کہ امارت افریقیہ کا قلع قمع کر دیا۔ اندلس میں مدینہ اور شام کے جلا وطن اور پناہ گزین لوگ آکر آباد ہو گئے تھے، اس لئے یہاں بھی وہ قومی عداوت کی آگ، جو دبی ہوئی تھی تعصب اور تخالف مذہبی کی ہوا سے سلگ اُٹھی۔ قومیت، دین اور عزیز داری کے مقدس رشتے بھی اتنے کافی نہ ثابت ہوئے کہ اس نفرت و عداوت کی بیخ کنی کر دیتے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دشمنی ان دونوں عربی فریق کی جبلّت میں داخل ہو گئی ہے۔ جب اُن کو فریق مخالف کو ذلیل کرنے

یا انتقام لینے کا خیال آجاتا تھا تو پھر حب الوطنی، فخر قومی، غرور فتح، امید بیش قرار منافع تجارت، شہرت علم وادب، وسعت مملکت وسلطنت کے جیسے عزیز وکریم جذبات بھی بالأطاق رکھ دیئے جاتے تھے۔ طبع انسانی کے عجیب حیرت انگیز کرشمے ہیں کہ اکثر موقعوں پر اولاد معد بخوشی خاطر بادشاہان یمن وحِرا کے رعایا بن گئے تھے۔ نہایت قدیم زمانے میں حمیری زبان کی جگہ، جو جنوب میں بولی جاتی تھی، حجاز کی شیریں محاورات نے لے لی تھی۔

جو دشمنی ایک زمانۂ بعید سے سختی کے ساتھ اولاد معد اور باشندگان یمن کے درمیان میں تھی، اُس کا اندازہ باشندگان قفقاز نہیں لگا سکتے؛ بلکہ اس کی نظیر تمام ایشیا بھر میں نہیں ملتی اس نے اقوام کی سیاست پر اثر ڈالا، اس نے سلطنتوں کو تہ وبالا کر دیا، اس نے پرانے قائم شدہ اصول دین کو متزلزل کر دیا، اس نے جب کسی خاندان پر حملہ کیا تو باپ بیٹے میں عداوت ڈلوادی، اور خانگی زندگی کو تلخ کر دیا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے بہانوں پر کہ جن سے شاید ایک خاندان کے دو آدمیوں میں شکر رنجی بھی نہ ہو، دو قوموں میں خانہ جنگی کی مصیبت پیدا ہو جاتی تھی۔ کسی مسئلہ مذہبی کی تحقیق میں ذرا سا بھی اختلاف راے ہوا، اور طرفین کے جوشیلے آدمیوں نے جمع ہو کر خون کی ندیاں بہادیں، اور کسی صوبہ بھر کو تباہ کر دیا۔ کسی نے ایک ذرا سی بھی خطا کی (مثلاً کہیں انگور کا پتہ توڑ لیا، یا کوئی خربوزہ کھا لیا) اور مجرم کے قبیلہ کی شامت آئی۔ اولاد معد میں بدویوں کی مغرورانہ خاصیت بہت زیادہ تھی۔ اگر اُن کے آباواجداد کی رگوں میں ایک قطرہ بھی قحطانیوں کے خون کا ہوتا تھا تو اُن کو بھی وہ ذلیل سمجھنے لگتے تھے۔ اُدھر اگر کسی قحطانی کی ماں اولاد معد سے نکل آتی تھی، تو اُس کی اولاد محض اس جرم میں کہ وہ حبشیوں اور غلاموں میں سے ہے، اُس کے لئے دعاء مغفرت کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ یہی لوگ، باوجود اس تمام تخالف کے ایک ہی قسم کا مذاق اور ایک ہی طرح کے مراسم رکھتے تھے، ایک ہی طرح کا لباس پہنتے تھے، ایک ہی خیالات رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی معبد میں عبادت کرتے تھے، ایک ہی علم کے نیچے لڑتے تھے، اکثر آپس میں

شادیاں کرتے تھے، ایک ہی طرح کی بلند نظری رکھتے تھے، ایک ہی چیز کو نصب العین بناتے تھے اور اُس کے حاصل کرنے میں اپنا جوش صرف کر دیتے تھے۔ یہ خلافِ قیاس کیفیت علم بنی نوع انسان کا ایک قابل دید مسئلہ، اور لزوجت عصبیت کا ایک عجیب کرشمہ ہے۔ قلب انسانی عجیب طاقتور چیز ہے اور اس کے تحرکات کچھ ایسے قومی واقع ہوئے ہیں کہ ایک خاص جذبہ دو ہزار پانچ برس تک قائم رہ سکتا ہے۔ اگر اس مسئلہ پر تحقیقات کی جائے، اور اُس کی تحلیل و تجزیہ کیا جائے، تو تاریخ بنی نوع انسان کا ایک نہایت دلچسپ عقدہ معلوم ہوگا، جو ابھی تک لانیحل چلا آتا ہے۔

موسےٰ ابن نُصیر کے ہمرکاب سینکڑوں سابق باشندگان مدینہ تھے، جن کے دلوں میں اب تک اپنے تباہ شدہ گھروں، اور مقتول عزیزوں، کی یاد تازہ تھی۔ ان جوشیلے عابدین اور خُدام مدفن نبوی (علے صاحبہا التحیۃ والسلام) اور حفاظِ احادیثِ مصطفوی (صلے اللہ علیہ وسلم)، کا جو نقش وحشی قبائل افریقیہ پر پڑا تھا وہ اتنا گہرا اور دیرپا تھا کہ موسےٰ کی نوک شمشیر نے بھی اتنا اثر نہ ڈالا تھا۔ بہ نسبت مغرور اولاد قریش کے ان کی ہر حرکت سے مروت ٹپکتی تھی۔ مفتوحین کے ساتھ ان کا سلوک نہایت نرم تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لوگوں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ مگر جہاں جور و ستم کی یاد ان کے دل سے نہ مٹی تھی، وہاں انتقام کا خیال بھی اُن کے دل سے نہ نکلا تھا۔ مومنین حجاز کے کانوں میں جب لفظ "شامی" کی آواز آتی تھی تو اُس کے ساتھ یہ تصورات بھی مجسم ہو کر اُن کے سامنے آجاتے تھے کہ اہالی شام نمک حرام، بے ادب، طماع اور سفاک ہیں۔ ان لوگوں کی روح کانپ اُٹھتی تھی جب یہ دیکھتے تھے کہ وہ دربار دمشق، جو اس وقت روشن دماغی اور عیش و عشرت کی تصویر بنا ہوا ہے، اسی کے افراد نے وہ بے ادبیاں اور گستاخیاں کی ہیں جو دین کے متضاد اور انسانیت سے متباین ہیں؛ وہ دعوتیں جن میں شور و شغب ہوتا تھا، وہ رقص و سرود جو محرک شہوت ہوتے تھے، وہ ریشمین کپڑے جنکا پہننا ممنوع تھا، وہ صحبتہاء

نیم شبی، جو لہو و لعب سے مفرط تھیں، ان سب پرستش اور وہ ہجو گو شعراء کے کلام، جو سرتا پا کفر میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے، جب یہ شب زندہ دار عابدین پاک باز دیکھتے اور سنتے تھے، تو کانپ اُٹھتے تھے۔ عمائد اور رؤساء بنو امیہ کو وہ کفار سے بھی بدتر سمجھتے تھے، اور بت پرست، عیسائی اور یہودی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار جانتے تھے اور شہوت پرست متکبر معززین مکہ کی اولاد کے خیالات اپنے مخالفین کی نسبت کچھ کم تلخ نہ تھے۔ اُن کو یاد تھا کہ بعض صحابہ ایام جاہلیت میں گمنام خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور اُن کا پیشہ بھی نہایت معمولی تھا جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالے عنہ جیسے نیک اور مرنجان ومرنج شخص کی شہادت کے واقعات اُن کو یاد آتے تھے تو اُن کے غیظ وغضب میں ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ اُن کا خون میں سنا ہوا لباس (جو کئی مہینہ جامع دمشق میں ٹنگا رہا) اُن کی مظلومیت کو زبان حال سے پکار پکار کر ظاہر کرتا تھا۔ معاویہ کی جان لینے کے لئے جو حملے کئے گئے۔ اُن کو وہ نہایت نفرت سے یاد کرتے تھے، اور اُن کو پیاسا مارنے کے لئے جو تدابیر کی گئیں اُس کا سخت حقارت سے ذکر کرتے تھے[1]۔ باستثناء چند، اندلس کے تمام امیر خاندان، بنو امیہ کے مدد معاون تھے، اور وہ مدینوں اور اُن کی اولاد کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ موخر الذکر اس کا جواب خفیہ سازشوں، اور علانیہ بغاوتوں سے دیتے تھے، اور اُن کی اُن پالیسیوں کو نہ چلنے دیتے تھے، جن کا نفاذ ابھی پردۂ خفا ہی میں ہوتا تھا، وہ کوہستان الیسٹریاس کے آدمیوں کو بھڑکا دیتے تھے۔ قبایل کی اس کینہ توزی کا اظہار سب سے پہلے یوں ہُوا کہ دشمن سامنے موجود تھا، مگر طارق اور موسےٰ کے درمیان نا چاقی کرا کر اُس میں

[1] غالباً مسٹر سکاٹ نے بجائے "حسینؓ" کے سہواً "معاویہ" لکھا ہے جو قابل معافی ہے بنو امیہ کے تبرا کرنے میں قابل مصنف اس سے چشم پوشی کئے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد اگر کسی کا ممنون ہونا چاہئے تو وہ بنو امیہ ہیں اُن ہی کے فتوحات نے آج تک اسلام کا نام قائم رکھا ہُوا ہے۔ وہ عربی خصوصیات و جذبات کو ساتھ لے کر مٹے اور اسی کے مٹنے سے مسلمانوں کا انحطاط شروع ہو گیا ۔ (مترجم)

مدد کی گئی، عربی سپہ سالار اعظم کی تدبیر اور عزم کو ناکام رکھا، جس کے موافق وہ تمام یورپ کو فتح، اور اس کو مسلمان کرنے کا تہیہ کر چکے تھے؛ اسی دشمنی نے عین صحن مسجد میں جلاد کے ہاتھ میں وہ تلوار پکڑائی جس کے ایک ہی وار سے عبدالعزیز جیسے بیدار مغز اور لایق امیر کا سر جسم سے الگ ہوگیا؛ اسی نے عبدالرحمن کی پیش قدمی کو روکا، اور ان کی فوج میں ایسا انتشار اور ایسی بدنظمی پیدا کی کہ چارلس مارٹل اپنے وحشی جرمنی اور گال کے آدمیوں کو لے کر ان کے کلہ پر پہنچ گئے۔ مشرقی اور مغربی اندلس میں زیادہ تعداد اہالی یمن کی تھی، جن کو ان کے معاونین نے بمصلحت وہاں آباد کیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اپنی تعداد کے زعم، اور اپنی سیاسی اہمیت کے بھروسے پر انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ان پر ایسا امیر مقرر کیا جائے جو ان کا ہمدرد ہو۔ یہ مطالبہ چنداں خلاف انصاف بھی نہ تھا۔ ادھر دربار دمشق یہ اچھی طرح جانتا تھا، کہ اس دور افتادہ اور دولتمند نو مفتوح مملکت میں ابھی تسلط کامل نہیں جما ہے۔ اس میں وہ لوگ جا بسے ہیں جنہوں نے خاندان بنو امیہ کی دشمنی کو معمولی پیشوں، ظاہری وفاداری اور کبھی کبھی باجگزاری کی باریک چادر کے پردہ میں چھپا رکھا ہے۔ دربار خلافت بھی ان کو سانپ کی طرح کھلاتا رہتا تھا اور کمال بالغ خردی سے اندلس کی امارت پر اس شخص کو مقرر کرتا تھا۔ جو اسی کا آدمی ہو۔ چنانچہ چالیس برس کے عرصہ میں بیس امیروں میں صرف تین آدمی وہ تھے جو اپنے آپ کو اولاد معد سے کہتے تھے۔ سیاسی حالت نے جزیرہ نماء اندلس کے تین نہایت سیر حاصل صوبوں کو اپنے قابو میں رکھا؛ یہاں تک کہ قیام خلافت مغربی سے پہلے جو خانہ جنگیاں ہوئیں انہوں نے اہالی یمن کو بہت ہی کمزور کر دیا۔ اس خلافت کی وجہ سے آپس میں بہت ہی فساد رہے جس سے اسلامی سلطنت کے رعب کو نقصان پہنچا، اور نیم جان عیسائی قوموں میں جان آجانے کی پھر کچھ امیدیں پیدا ہو گئیں۔

شاید کسی ملک کی تاریخ میں ایسے کینہ توزی کی مثال نہیں ملیگی، جیسی کہ ان دو

عربی فریق میں تھی، کہ اُس کی شروعات نہایت حقیر سی بات سے ہوئی۔ جو کیفیتیں اُس کے بعد گزریں وہ عجیب متضاد سی ہیں، اور اُس کے جو نتائج نکلے اُن کا اثر دور تک پہنچا۔ ہزار توضیح و تشریح ایک طرف، اور یہ صاف مثال ایک طرف، جو سرسری نگاہ سے یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ یہ قوم کی قوم اپنی ضد پر قائم رہتی ہے۔ یہی حالت بدوؤں میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے لطف و آرام و فائدہ اور اپنی عاقبت کی اُمیدوں کو ایک پشتینی دشمن کے تباہ کر دینے کی کوشش میں قربان کر دیتے تھے۔ دُنیا بھر سے الگ تھلگ ایک ملک تھا کہ جس کی زمین بنجر پڑی ہوئی تھی، اُس میں ایک ایسی وحشی قوم آباد تھی۔ جو نہ صنعت و حرفت سے آشنا تھی، نہ جن کو عیش و آرام کی ضرورت تھی، جو مغرور، بے باک اور آزاد منش تھی، جو صدیوں سے ایک دوسرے کا تعاقب کرتی چلی آ رہی تھی۔ جب ان میں ایک پیغمبر نبی وحی لے کر مبعوث ہوئے، تو وہ تمام قوی اثرات، جو ایک انسان کی علوِ شان پر ممد ہو سکتے ہیں، تمام قوم میں جاری و ساری ہو گئے۔ تمام قوم اپنا وطن چھوڑتی ہے، شدہ شدہ مفتوحوں کے ساتھ اختلاط پیدا کرتی ہے، تہذیب و تمدن کے منافع و فوائد کی قدر کرتی ہے، سائنس، علم ادب، ملک گیری و ملک داری میں دُنیا بھر سے فوق لیجاتی ہے، اور امن و صلح کے فوائد سے دوسروں کو مستفید کرتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام ترفہ و شان کے وہ پشتینی عداوت، جو بادیہ عرب میں پیدا ہوئی تھی، کم نہیں ہوئی۔ قرآن مجید کے وعدہ و وعید بھی اگر اُن کی خونخوار دشمنی کو کم کر سکے تو صرف چند روز کے لئے۔ اسلام میں چند ہی نسلوں کے بعد خوفناک بدعتیں پیدا ہو گئیں، جن کی فرقہ بندی، نہ کہ کسی اصول کی پابندی، خلافت کے لئے مخدوش ہو گئی۔ شاہان دمشق اُن لوگوں کی اولاد تھے جنہوں نے جناب سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو ستایا تھا۔ اب ان کی بے ادبیوں نے نخوت، خود مطلبی اور دشمنیِ ملک کی صورت اختیار کر لی۔ مدینہ کے لوگوں کی امداد کے بغیر اسلام کا نام باقی رہنا مشکل تھا۔ یہی لوگ اب برابر مصیبت میں رہنے لگے۔ یہاں یہ نہ بھول جانا چاہئے کہ

اہل مدینہ نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی اگر مدد کی تو محض اس لئے کہ اولاد معد و قحطان کے درمیان میں عداوت تھی۔ اُن کا شہر جس نے کہ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو آڑے وقت میں پناہ دی، اور جس نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی دعائیں لیں، تباہ کر دیا گیا جس مقدس مسجد سے حضوؐر کا جسم اطہر مس ہوا تھا وہاں شامیوں نے اپنے گھوڑے باندھے۔ یہ بدقسمت جلاوطن، ظالمان شام کے مکر و فریب اور ظلم و ستم کے مارے ہوئے، ملک در ملک پھرتے رہے۔ اُنہوں نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ بیعت توڑ دیں، مگر آخر اطاعت قبول کر لی۔ اُس طویل سلسلۂ شاہانِ خاندانِ انصار کی، جو سعد ابن عبادہ، سردار مدینہ سے شروع ہو کر اُن کی اولاد، نامرد ابو عبداللہ (آخری مسلمان تاجدار اندلس) پر ختم ہوتا ہے، حالت ایسی رہی ہے کہ وہ ہمیشہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے رہے ہیں، ترکیبیں چلنی اور تدابیر کرنی انہیں آتی ہی نہ تھیں، قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے، اور بے وقت خرطج کر کے ہمیشہ مُنہ کی کھاتے تھے۔ باستثناء غیر فانی شہر ایتھنز (دار السلطنت یونان) کے تاریخ عالم مدینہ کے سواء کوئی اور ایسا شہر پیش نہیں کر سکتی، جس نے کسی قوم کی تہذیب پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہو۔ اگرچہ اُس کا اثر اکثر منفی قسم کا رہا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ اُس وقت کہ اسلام نہایت ضعیف تھا مدینہ نے اُس کی مدد کی۔ لیکن جب وہ قوی ہو گیا، تو وہی شہر انصار کی مصیبت کا تماشا گاہ بنا۔ جو فوائد اس شہر نے معد و کے چند نو مسلموں کو پہنچائے اس پر اُنہوں نے یوں پانی پھیر دیا کہ عراق، شام، افریقیہ اور اندلس کے شاہی درباروں اور فوجی چھاؤنیوں میں فتنہ و فساد ڈلوا دیا ×

امیر مسلم نے جو مردم شماری کرائی تھی اُس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ ملک میں عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے، اور وہ اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم ہیں۔ خلیفہ یزید[۹][ا] اپنی سلطنت

[ا] یہاں مسٹر سکاٹ کو پھر سہو ہوا ہے خلیفہ یزید تو اپنی پر فضیحت زندگی ایک زمانہ پہلے ختم کر چکا تھا۔ یہ یزید بن ابو مسلم عامل افریقیہ تھے۔ اور یہ سب سیاسی چالیں بھی اُن ہی کی سوچی ہوئی تھیں۔ اس خصوص میں جہاں کہیں آپ دمشق کا نام دیکھیں اسکو قیروان پڑھیں × (مترجم)

میں اتنے مخالفین دین کی تعداد دیکھ کر گھبرا گئے۔ اس نقص کو دور کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُس ملک میں اسلام دایم و قایم ہونے کے لئے آیا ہے، انہوں نے وہ تدبیر کی جو بجاء خود اُن کی فہم و فراست اور سیاسی دور بینی پر دال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں کوئی سلطنت اس خصوص میں اُن کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ عیسائی اندلس اور سپٹے مینا سے بدر کرکے افریقیہ اور شام میں بسائے جائیں، اور اُن کی جگہ وہاں مسلمان آباد کر دیئے جائیں۔ اس ترکیب سے تمام اندلس گویا مسلمان ہوجاتا۔ گال میں جو فوج محافظ رکھی جاتی اُس کو وہاقین سے مدد دلوائی جاتی، اور یہ مسلمانوں کی شمالی و مشرقی یورپ کے فتوحات کا ایک پیش خیمہ ہوتا۔ اس سیاسی تدبیر کا یہی سب سے بڑا فائدہ نہ ہوتا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ یزید (؟) کی دوربین نظروں نے باشندگان کوہستان ایسٹریاس کے مخدوش خصوصیات کو بھی تاڑ لیا تھا، جنہوں نے سلاطین گاتھ کی روایات اور شجاعت کو قائم رکھا ہوا تھا۔ اس خطرناک قوم کو یہاں سے نکال دینے کے یہ معنی تھے کہ گویا اُن کی ہستی کو بالکل مٹا دیا، اور مسلمانوں کی اندلسی سلطنت کو ایک غیر معین زمانہ تک کے لئے مستحکم و استوار کر لیا گیا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو صوبہ سپٹے مینیا ایک ہی قوم کی نہایت طاقتور فوج کی کمک سے اہالی فرانس کے حملوں کو آسانی سے روک سکتا۔ جلاوطن لوگ جب دور دراز ملکوں میں پھیل جاتے تو وہ بجبر یا بطمع دنیوی اپنے آقاؤں میں مل جُل کر اپنی ہستی کھو بیٹھتے، اور جن لوگوں کے ہاتھ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ کی زمام قسمت تھی اُن کی اولاد کا نام لیوا بھی دُنیا میں کوئی باقی نہ رہتا۔ یہ تدبیر کچھ تو جوش دینی پر مبنی تھی اور زیادہ تر سیاسی چال تھی، لوگوں پر بہت ہی شاق گذرتی؛ لیکن اس کا اثر اسلام پر اتنا ہوتا کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ امیر سمح کا دماغ اتنا نہ تھا کہ وہ اس تدبیر کے فوائد کو سمجھ سکتے۔ انہوں نے اپنے اور ہم وطنوں کی طرح مفتوحین کی ہمت و استقلال کا اندازہ بہت ہی حقیر لگا کر خلیفہ

وقت کی تدبیر کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا، اور بارگاہ خلافت میں یہ عرض کیا کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ خود بخود جوق در جوق مسلمان ہوئے چلے جارہے ہیں بالکل ایسی ہی پالیسی کا تجربہ کرامویل نے نو سو برس کے بعد آئرلینڈ میں کیا۔ وہاں کے غدار باشندوں کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کے بے وقت مرجانے سے یہ تدبیر بار ور نہ ہوئی مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ دمشق کی یہ غایت دور بینی اور انتہاء عاقبت اندیشی تھی کہ اُنہوں نے ایسی تدبیر سوچی تھی کہ جس سے زمانۂ حال کے لوگ بہت فائدہ اُٹھاتے مگر اس کی طرف مسلمانان اندلس کے مورخین نے چنداں التفات نہیں کیا۔ سمح جب اپنی اُس مہم پر روانہ ہوئے ہیں، جو اُن کے حق میں نہایت زبون ثابت ہوئی، تو وہ جزیرہ نماء اندلس میں اپنے نہایت معتبر افسر عنبسہ ابن سحیم الکلبی، کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ اُنہوں نے جب ٹولوس کی شکست کا حال سُنا تو فوراً بہت بڑی فوج شمال کی طرف روانہ کر دی، تاکہ اس ہزیمت خوردہ فوج کو حالت پس پائی میں مدد دے۔ لیکن وہاں لوگوں نے عبدالرحمن (ابن عبداللہ الغافقی) جیسے آدمی کو اپنا امیر اور سپہ سالار بنا لیا تھا۔ اُن کی خوش تدبیری کی وجہ سے اس کمکی فوج کی ضرورت نہ ہوئی۔ یہ انتخاب کچھ ایسا اچھا ہوا تھا کہ افریقیہ کے نائب السلطنت نے بھی اسکو منظور کر لیا۔ گاتھک گال اور الیسٹریاس کے عیسائی اپنے دشمنوں کو ہزیمت دے کر بہت ہی پھول گئے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو پہلے سے بھی زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ عبدالرحمن کو اپنی تمامتر توجہ اُن کی دفعیہ کی طرف مبذول کرنی پڑی، باوراء پائے نیس کی فوجوں کا اجتماع مسلمانوں کے لئے مخدوش ہوتا جاتا تھا۔ لیکن وہ ابھی کافی قوی نہ ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اس کو روند ڈالا۔ کوہستانی پھر اپنے پہاڑوں کی طرف دھکیل دیئے گئے، جو خراج اُنہوں نے روک رکھا تھا وہ وصول کر لیا گیا، اور جو قبائل کہ اس جنگ میں پیش پیش تھے اُن پر ایک زائد ٹیکس لگا دیا گیا، تاکہ وہ دبے رہیں۔

اگرچہ اہالی فوج عبدالرحمٰن کے بہت ہی گرویدہ تھے، مگر ملکی حکام اُن سے خوش نہ تھے
یہ لوگ اُن کی فہم وفراست کے عاشق، اور اُن کی تدابیر وعاقبت اندیشی کے تو قائل تھے
مگر اس وجہ سے ناراض تھے کہ وہ فوج کو انعام واکرام سے مالامال کئے چلے جاتے تھے
عبدالرحمٰن نے اپنا یہ دستور کر لیا تھا کہ شاہی خمس نکال کر باقی تمام مال مغروتہ فوج میں
تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ ایسی غیر معمولی بات تھی کہ اُن کے دوست بھی اس سے مانع آئے،
مگر سپاہی تھے کہ دن بدن اُن کے احسانمند اور گرویدہ ہوتے چلے جاتے تھے آخر نتیجہ
یہ ہُوا کہ اُن کے بعض مخالفین نے بشر ابن حنظلہ، عامل افریقیہ کو درخواست دی کہ عبدالرحمٰن
کی داد ودہش کا یہ نتیجہ ہے کہ افواج میں تکلفات شروع ہو گئے ہیں، اور سپاہی تکلف و
تعیش میں پڑے چلے جاتے ہیں، جس سے اسلام کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے
اس لئے اُن کو معزول کر دیا جائے۔ یہ الزام ثابت کر دیا گیا، عبدالرحمٰن کے مخالفین
کامیاب ہو گئے، اور عنبسہ ابن سحیم امیر اندلس ہو گئے۔ مگر چونکہ عبدالرحمٰن پر اُن کے
مخالفین تک کو اعتماد تھا اس لئے وہ پھر اپنے اصلی عہدۂ گورنری مشرقی اندلس پر واپس
بھیج دیئے گئے، جہاں وہ جنگ ٹولوس سے پہلے متعین تھے۔ جیسا کہ ایک سچے مسلمان
کا قاعدہ ہے، عبدالرحمٰن نے عنبسہ کو امارت کی مبارک باد دی، اور اُن کے وفادار رہنے
کا حلف اُٹھایا، اور بغیر ایک لفظ مُنہ سے نکالے وہ اُس ملک سے جہاں مطلق العنان
حکومت کر چکے تھے، ایک ماتحت عہدہ پر چلے گئے۔ عنبسہ نے اپنی خوش انتظامی اور
خوش تدبیری سے بہت جلد یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عہدۂ امارت کے اہل ہیں، عبدالرحمٰن
کی نرم مزاجی اور داد ودہش سے فی الجملہ بدنظمی پیدا ہو گئی تھی، عنبسہ نے اس کو رفع کر کے سب سے
پہلے مالیانہ کی طرف توجہ کی، اور اس محکمہ میں بہت سی اصلاحیں کیں اور محاصل کے متعلق
ایک نیا انتظام کیا۔ اُنھوں نے اس کی بہت بڑی احتیاط کی کہ عیسائی ذمیوں کے ساتھ
کسی طرح کی بے انصافی نہ ہونے پائے۔ افریقیہ اور ممالک مشرقیہ کے لوگ اس وقت

اندلس میں بہت آ گئے تھے۔ اُس افتادہ اراضی کو جس میں اس وقت خانہ بدوش بربر نے
اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے، اور عادت قدیمہ کے موافق کسی جگہ گھر بنا کر نہیں رہتے تھے
تقسیم کر دیا گیا۔ وفادار اور حکم بردار لوگوں پر وہ بہت ہی عنایت کرتے تھے اور سرکش
لوگوں کو ایسی سزائیں دیتے تھے کہ جو خونخواری کی حد تک پہنچتی ہے۔ صوبہ ٹارگونہ (طرکونہ) کے[(۲۱)]
چند اضلاع نے بعض واقعی اور کچھ خیالی تکالیف کی وجہ سے غدر کر دیا، امیر نے اُن کے
تمام قلعوں کو کھدوا پھکوایا، اور سرکردگان سازش کو سولی دے دی وہاں کے باشندوں
پر بطور سزاء و تہدید ٹیکس دوگنا کر دیا۔ مسلمانوں کے نام کی عزت قائم رکھنے کے لئے
وہ مختلف اوقات پر گال میں مہیں بھیجتے رہے۔ اگرچہ یہ فوج کشی ایک محدود پیمانہ پر
رہی، تاہم اس سے وہاں کے لوگوں کی جایدادیں ضبط ہوتی اور قیدی پکڑے جاتے رہے۔

جزیرہ نماء اندلس کے یہودیوں پر سے قانون گاتھ کی مصیبت ٹلی تو انھوں نے
غیر ملکی بادشاہ کے طفیل میں دولت اور تعداد میں بہت کچھ ترقی کی۔ مسلمانوں کی حکومت
کی برکت تھی کہ اُن کی سیاسی و تمدنی حالت بہت اچھی ہوگئی۔ عربوں نے اُن کا خاص
طور پر خیال رکھا، کیونکہ ان کو ان ہی یہودیوں کی وجہ سے یہاں کامیابی ہوئی تھی۔ اس
قوم میں نسل در نسل جزرسی کی عادت تو تھی ہی، اس وقت وہ اتنے دولتمند ہوگئے کہ پہلے کبھی
نہ تھے، وہ اب بھی اپنے اُسی دین پر قائم چلے آتے تھے جسکو وہ ایک زمانۂ بعید سے عزیز
رکھتے تھے، اُن کو اب بھی یہ ہوس چلی آ رہی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ وہ
دینی و دنیاوی بادشاہ ہو جائینگے۔ یکایک اُن میں دھوم مچی کہ ممالک مشرقیہ میں وہ مسیحا
پیدا ہو گیا ہے جس کے وہ منتظر تھے۔ اہلِ ایشیا نے ایک عجیب خلّاق دماغ پایا ہے،
اُس حصۂ زمین میں مذہبی دعادی اور ترقیات کی اتنی گنجائش ہے کہ کسی اور ملک میں
نہیں۔ بہت سے جوشیلے چالاک لوگ وہاں پیدا ہوئے، سب نے پیشینگوئیاں کرنے
اور قوتِ خرقِ عادت رکھنے کا دعوے کیا۔ ہر ایک کو اُس زمانہ میں کہ جب مکاری کی قدر ہوتی

تھی، بہت سے متبعین مل ہی جاتے تھے۔ اس موقعہ پر جو مسیحا پیدا ہُوا تھا اُس کا نام زنیرہ تھا اور اُس نے اپنا توطن شام میں اختیار کیا تھا۔ یہیں اندلس کے یہودی سیل درسیل پہنچ گئے۔ اُنہوں نے یہ نہ پوچھا کہ جو خبر ہم کو ملی ہے وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، نہ یہ سوچا کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر چل پڑنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ گھر چھوڑا، بار چھوڑا، اثاث البیت سر پر رکھ کر، اور بیش قیمت چیزیں بغل میں دبا کر چل ہی پڑے۔ جیسے ہی یہ لوگ ہناء سے اُدھر پہنچے چالاک امیر نے اُن کی تمام جائیداد لاوارثی میں ضبط کر لی۔ اس میں اُن کے بہت سے خوبصورت بنگلے اور جزیرہ نماء اندلس کی نہایت سیر حاصل زمینیں تھیں۔ اس جوش مذہبی کا تعدیہ گال تک پہنچا، اور وہاں کے یہودی بھی اپنے اُن اندلسی بھائیوں کے ساتھ جا کر شامل ہو گئے، جو اپنی حماقت سے ایک احمق کی زیارت کے لئے جا رہے تھے۔ جب پانی سر سے گزر چکا، اور تمام جائیداد سے محروم ہو چکے تو اُن کو ہوش آیا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم دیکھا۔ یوں گئی اور روحانی فوائد بھی ہاتھ نہ آئے۔

جب امیر نے ملکی معاملات کو اپنی تشفی کے موافق ہموار کر لیا تو اب اُنہوں نے شمال کی طرف توجہ کی، کیونکہ اُس طرف فرانس جیسا ملک اُن کو نظر آرہا تھا جس سے بڑھ کر کوئی معاوضہ، بلکہ انعام، اُن کی تکالیف کا نہیں ہو سکتا۔ موسلے سے لے کر ہر ایک امیر اُس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ ٹولوس کی ہزیمت سے مسلمانوں کے رعب کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ پہلے ہی مقابلہ میں مسلمانوں پر کچھ ایسا رعب طاری ہُوا کہ خوف نے جنوبی لوگوں کو اُن کی نگاہ میں دیو بنا کر دکھلایا، اور یہ معلوم ہُوا کہ اُن سے کسی طرح وہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کہاں تو سپٹی مینیا کے بڑے بڑے مضبوط قلعے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے، اور یہ امید تھی کہ یہاں مسلمان دوامی طور پر رہینگے، اور کہاں اب اُن کے پاس صرف ناربون رہ گیا۔ اُس کی مضبوط فصیل نے بآسانی ایک وحشی دشمن کو کامیاب نہ ہونے دیا، کیونکہ نہ اُن کے پاس فوجی کلیں تھیں، نہ اُن کو محاصرہ کرنا آتا تھا۔

اس پر ایک دقت یہ تھی کہ سمندر قریب تھا، جس کی وجہ سے محاصرہ قائم رکھنا مشکل تھا اس طرح قدرتی مفاد ایسے تھے کہ محض فوج محافظ ہی کی مدد سے ناربون دشمن کے نرغہ میں اُن ہی دشمنوں کو ناقابل تسخیر معلوم ہوتا تھا۔ درّہء کوہ سے امیر آسانی کے ساتھ گذر گئے، اور بلا کسی دقت کے اُنھوں نے کارکسون لے لیا۔ یہ شہر اب تک مسلمانوں کے قبضے میں نہ آیا تھا۔ اس جرأت و بہادری کو دیکھ کر وہاں کے باشندوں کو بہت ہی رنج ہُوا، اور اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام سیپٹی مینیا فوراً ہی، بغیر کسی جبر کے خلیفہء دمشق کا مطیع ہو گیا۔ ان لوگوں کی غداری کے عوض میں اُن کو کوئی سزا نہیں دی گئی؛ کیونکہ عنبسہ جانتے تھے کہ ایسے نازک ملک کی، جو ہر وقت تلوار اُٹھانے پر تیار رہتا تھا، قدر نہ کرنا نہایت غیر سیاسیانہ فعل تھا۔ اُن کو معاملۂ مذہب میں تو مختار کر دیا گیا، لیکن جزیہ جو اُنھوں نے نہیں ادا کیا تھا، سختی کے ساتھ وصول کر لیا گیا۔ اسکے علاوہ قوم گاتھ کے معززین میں سے چند لوگ بطور یرغمال کے لے لئے گئے۔

مسلمانوں کی فوج، جو اب تک رہون کے کنارے کنارے جا رہی تھی، یکایک اپنا رُخ پلٹتی ہے، اور اندرون ملک میں پہنچ جاتی ہے؛ اور وہاں سے دریا کی وادی[۲۲] میں پہنچ کر، کہیں تلوار سے اور کہیں آگ سے اُس علاقہ کو تباہ کر دیتی ہے۔ پھر لیانس[۲۳] طرف بڑھتی ہے اور اُس کو فتح کر لیتی ہے۔ یہاں سے پھر اُس نے راستہ بدلا اور برگنڈی[۲۳] پہنچ گئی اور شہر اوٹن[۲۴] کو تباہ کر ڈالا۔ اب تک اُن کا مقابلہ کسی فوج ضابطہ نے نہیں کیا تھا۔ اب عیسائیوں نے جلدی جلدی کچھ فوج جمع کر لی، اور اُنکی عقبی فوج پر حملے کرنے شروع کئے۔ اس سے مسلمان بہت دق ہوئے، کیونکہ وہ مال مغروقہ سے بہت بوجھل ہو رہے تھے۔ ایک لڑائی میں تو دہقانیوں نے اپنی پوری شجاعت صرف کر دی۔ امیر عنبسہ نے ایسی بے احتیاطی کی کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا؛ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُنھوں نے ایسا زخم کھایا کہ جان بر نہ ہو سکے۔ امیر نے مرتے ہوئے عروہ

ابن عبداللہ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ مگر ان سے اہالی دیوان خوش نہ تھے؛ چنانچہ اُن ہی کی خواہش کے مطابق عامل افریقیہ نے یحییٰ ابن سلمہ کو امیر اندلس مقرر کیا۔ اس امیر کی سخت مزاجی، ہٹ، عدل و انصاف میں بے انتہا احتیاط، اور فوج میں سختی کے ساتھ نظام قائم رکھنے کی وجہ سے ہر جگہ کے لوگ اُن سے ناراض ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عامل افریقیہ سے داد و فریاد کی گئی۔ یہ ایسے نرم مزاج واقع ہوئے تھے کہ اُنہوں نے نہ صرف یحییٰ ابن سلمہ ہی کو معزول کیا۔ بلکہ دو[1] ماہ کے اندر دو امیر یعنی عثمان بن ابی نسعتہ اللخمی اور خذیفہ بن الاحوص القیسی کو مقرر و معزول کیا۔ آخر کار امیر المومنین نے خود اپنے حکم سے ہیثم بن عبید الکلابی کو امیر بنا کر بھیجا۔ یہ از روئے اصل و نسل شامی تھے، اور ان میں بنو امیہ کے تمام تعصبات، تکبر اور سرکشی موجود تھی، مزاج میں بے رحمی اور خونخواری تھی، اس لئے اُن کی دست درازی سے کوئی مسلمان بچا، نہ عیسائی۔ اُن کی دشمنی کے اصلی مورد اولاد صحابہ اور اُن کے مسلمان کئے ہوئے، اُن کے تابع فرمان بربرہ تھے۔ اب جو لوگوں نے ان کے خلاف عامل افریقیہ کو شکائتیں کیں تو مسموع نہ ہوئیں، کیونکہ وہ خود امیر المومنین کے مقرر کئے ہوئے تھے۔ مجبور ہو کر مظلومانِ دستِ ظلمِ ہیثم دمشق پہنچے، اور امیر المومنین ہشام پر اُن کی مطلق العنانی ثابت کردی۔ اس پر اُنہوں نے اپنے نہایت معتبر آدمی محمد[2] ابن عبداللہ الاشجعی کو ہیثم کے متعلق تحقیقات کرنے، اور بشرط اثبات جرم اُن کو معزول کرنے اور سزا دینے کے لئے بھیجا؛ مگر اس شرط سے کہ اسلام کو اُن کی ذات سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور عدل و انصاف اس کا متقاضی ہو۔ امیر المومنین کے یہ معتبر وکیل بھیس بدل کر قرطبہ پہنچے اور اُنہوں نے بغیر کسی دقت کے بہت جلد ہیثم کے خلاف اثبات جرم کے لئے شہادتیں حاصل کرلیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے اپنے اور ہیثم کے متعلق

---

[1] ابن خلدون نے پانچ ماہ کا عرصہ لکھا ہے، نیز اُنہوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ پہلے خذیفہ آئے یا عثمان (مترجم)

[2] ابن خلدون نے ان کا تقرر بھی عامل افریقیہ کی طرف سے ہی بتلایا ہے۔ (مترجم)

فرمان شاہی ظاہر کیا، اور علیٰ رؤس الاشہاد اُن کو معزول کر دیا، اور اُن کا سر منڈوا اور گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا۔ جن لوگوں پر کہ انہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے اُن پر خوب پھبتیاں اُڑائیں اور بے عزتی کی۔ اُن کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی؛ اور جہاں تک محمدؒ سے ہو سکا انہوں نے مظلوموں اور اُن کی اولاد کو اس روپیہ سے معاوضہ دیا جو ہیثم نے ازراہ ظلم وستم ان لوگوں سے جمع کیا تھا۔ پھر انہوں نے ہیثم کو پابجولاں، چند لوگوں کی حفاظت میں افریقیہ بھیج دیا۔ ادھر دو ماہ کے اندر اندر محمدؒ نے لوگوں کی اُن شکایات کو رفع کیا، جن کا انجام یہ ہونے والا تھا کہ شاید غدر ہو جائے۔ جو لوگ کہ لوٹے گئے تھے اُن کو معاوضہ دلوایا، قیدیوں کو رہا کیا، جن کو اذیتیں دی گئی تھیں اُن کی تلافی کی، ظالم کے آدمی جن جن محلوں پر قابض ہو بیٹھے تھے، اُن کو نکالا۔ عام طور پر لوگ محمدؒ سے خوش ہو گئے اور اُن کو بہت دعائیں دیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اُن کے پشتینی دشمن تھے۔ یہ سب کچھ کر کے محمدؒ شام کو چلے گئے اور اپنے پیچھے عبدالرحمٰن کو امیر اندلس بنا گئے۔ یوں یہ نامور شخص ایک مرتبہ پھر امارت سلطنت مغربی پر ممتاز کئے گئے۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ الغافقی معزز خاندان، اور بڑے شہیر لوگوں میں سے تھے اُن میں بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت کامیاب ملکی حاکم بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ اُن میں وہ خودداری تھی جو اہل عرب کا خاصہ ہے۔ امیرالمومنین کے ایک بیٹے سے اُن کی بڑی گہری دوستی تھی۔ اُن ہی سے انہوں نے مغازی وسیرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا درس لیا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ اُن میں اپنے علو شان کا خیال پیدا ہو گیا اسی کے ساتھ اُن میں یہ نقص تھا کہ وہ نومسلموں کو بنظر حقارت دیکھتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اگر مسلمان ہوئے ہیں تو دنیاوی مفاد کے لئے، نہ کہ جوش دینی سے۔ اُن کی جود وسخا سے تمام فوج اُن پر جان دیتی تھی، مگر چونکہ انصاف پر اُن کی نظر بہت رہتی تھی اس لئے

اہل دیوان اُن سے بہت ناراض تھے؛ کیونکہ یہ لوگ مدتوں سے بالائی آمدنیوں کے خوگر ہو رہے تھے، اور یہاں اب اس کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ شامی تھے، اسی لئے اپنے ہموطنوں کی اکثر حمایت کرتے تھے۔ ان رعایات کو دیکھ کر اُن اشرار میں ایک طرح کی شورش پیدا ہو گئی جو افریقیہ اور ایشیا کے مخلوط النسل تھے۔ ہونے کو تو وہ امیر کی رعایا تھے؛ مگر نہ اُن میں وفاداری تھی، نہ دین، نہ کوئی اصول، نہ مادۂ احسانمندی۔ عربوں کو وہ اپنا قدرتی دشمن سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ اور مختلف اقوام کے لوگ بھی شامل تھے، جن میں بربری زیادہ تھے؛ مگر اقتدار یمنیوں کا زیادہ تھا، وہی ان سب لوگوں کے مذہبی مقتدے بنے ہوئے تھے۔

امیر عبدالرحمن الغافقی نے اُن صوبجات کا دورہ کیا جو اُن کے ملک محروسہ میں تھے۔ محمدؐ ابن عبداللہ، وکیل شاہی، نے جو کچھ کیا تھا اُس کی اُنہوں نے تصدیق کی، اور بہت سی اُن باتوں کی اصلاحیں کیں جو محمدؐ کی نظر سے رہ گئی تھیں۔ بعض مقامات میں والئی صوبجات نے عیسائیوں سے اُن کے معبد چھین لئے تھے؛ حالانکہ جو معاہدہ اُن سے ہوا تھا اُس کے موافق اُن کو اپنی مراسم مذہبی ادا کرنے میں آزادی کامل حاصل تھی۔ بعض صوبوں میں عیسائیوں نے زبردستی نئے گرجا بنا لئے تھے، جو نہ صرف معاہدہ کے خلاف تھا بلکہ احکام شرع کے بھی۔ چند سال ہاء ماقبل سے یہ خرابیاں ایسی عام ہو گئی تھیں کہ جزیرہ نماء اندلس کا کوئی فرقہ بھی اُس سے بری نہ تھا۔ امیر کے انصاف اور استقلال کی وجہ سے تمام منضبطہ گرجا بحال کر دیئے گئے، اور نئے گرجا گروا دیئے گئے۔ والیوں نے جو رشوتیں لی تھیں وہ اُن سے بجبر واپس لے کر داخل خزانۂ سرکار کر دی گئیں، اور اُن کو دُرّوں اور قید کی سزائیں دی گئیں۔

جب اُنہوں نے اپنی اصلاحوں کو مکمل کر لیا جس سے اُن کی رعایا بھی اُن کی گرویدہ ہو گئی، تو ادھر سے مطمئن ہو کر اب اُنہوں نے اپنی توجہ ایک اور طرف منعطف

کی۔ حالانکہ پہلے کئی مرتبہ مسلمانوں کو شکستیں ہو چکی تھیں، اور آیندہ کے لئے بہت سے خطرات کا اندیشہ تھا، مگر امیر کے دل میں ہر وقت اُسی طرف کی لو لگی رہتی تھی۔ اب آخر اُنہوں نے فرانس کی فتح کا تہیہ کر لیا۔ چونکہ وہ امیرالمومنین کے نائب تھے، اس لئے دینی و دنیاوی دونوں اقتدار اُن کو حاصل تھے۔ جہاں جہاں گئے وہاں کی مسجدوں کے منبروں سے اُنہوں نے یہ اعلان کرایا کہ مسلمانوں کا اولیں فرض یہ ہے کہ پچھلی جنگوں کے شہدا کا انتقام لیں، اور یورپ کے سرسبز ملک کو ربقۂ اسلام میں لے آئیں۔

وہ جانتے تھے کہ اس مہم میں سخت مشکلات پیش آئینگی۔ اس لئے اُنہوں نے ہر قسم کا انتظام کیا، تاکہ کسی طرح کی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اور عجلت کی وجہ سے جو نقص رہ سکتے ہیں اُن کا انسداد ہو جائے۔ افواج کافی ساتھ لینے کا اُنہوں نے یہ بندوبست کیا کہ تمام ممالک محروسہ امیرالمومنین میں اُنہوں نے جہاد کا اعلان کر کے روپیہ اور جانباز مومنین سے استمداد کی۔ اس صدا کے جواب میں ہر طرف سے آواز لبیک آئی۔ ممالک مشرقیہ و مغربیہ کی دولت قُرطُبہ کے خزانہ میں اُمنڈ آئی۔ دولتمند تاجروں نے اپنا سونا، اور دیندار عورتوں نے اپنا زیور بھیجدیا۔ انتہا ہے کہ بھیک مانگنے والے لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ اس ثواب سے محروم نہ رہیں، اور نصرت دین اور خذلت کفار میں، جہاں تک اُن سے ہو سکے، مدد دیں۔ علاقہائے متصل، اور دور دراز ممالک اسلامی سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ شامی، مصری، عراقی، فلسطینی، مغربی اور ایرانی قسمت آزما لوگ، اور متلاشیِ روزگار سپاہی، سخت جوشیلے مجاہدین، ماری ٹینیا کے نیم برہنہ وحشی، خون آشام بدوی، سیل در سیل پہنچ رہے تھے، جن کو دیکھ کر اندلس کے شہری باشندے حیران ہوتے تھے۔ اُن کی صورتیں عجیب تھیں، بولیاں سمجھ میں نہ آتی تھیں، حرکات ایسی جوشیلی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عربی اندلسی فوج خانہ جنگیوں اور غیر ملکی دشمنوں سے لڑنے میں تجربہ کار ہو چکی تھی؛ اس لئے پہلے اُسی کی صف بندی کی گئی۔ ارادہ یہ تھا کہ نہ صرف شہروں پر قبضہ کر، اور وہاں کے باشندوں کو غلام ہی بنا لیا

جائے، بلکہ اُس ملک پر دوامی قبضہ کیا جائے جو کوہ پا یرے نیس سے لے کر حدودِ جرمنی تک اور رہے ٹی ان ایلپس[۲۵] سے لے کر ساحل بحر تک پھیلا ہوا تھا۔

تمام والیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر ایک مقررہ مقام پر، جو شہر جلیہ جزیرہ نماء پر واقع تھا، پہنچ جائیں۔ اُن دنوں وہ تمام ضلع جس میں ورّاہاء کوہ اور اُن کے قلعے شامل تھے، ایک شخص عثمان ابن ابونسعہ باشندۂ افریقیہ کے تحتِ حکومت میں تھا۔ یہ چند ہی ماہ سے یہاں کے والی مقرر ہوئے تھے؛ مگر کچھ ایسے سرکش واقع ہوئے تھے کہ امیر اندلس کے احکام کی چنداں پروا نہ کرتے تھے۔ یہ بھی امیر عبدالرحمٰن کی نیک دلی تھی۔ کہ اُس کو اُنھوں نے یہاں قائم رکھا تھا۔ ایک مرتبہ اُن کو معزول بھی کر دیا گیا، مگر پھر از سرِ نو بحال کر دیا گیا۔ عثمان اگرچہ نہایت غصہ ور اور بے اصول سے آدمی تھے، مگر اُن میں وہ خوبیاں تھیں جو ایک سپاہی کی شہرت کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ کچھ نمود کے خاندان سے نہ تھے نہ اُن کی صحبتیں بڑے آدمیوں سے تھیں، مگر محض اپنی قابلیت اور ہمت سے اُنھوں نے عامل افریقیہ کے مزاج میں دخل و درخور پیدا کر لیا تھا۔ اسی باعث سے وہ امیر اندلس بنا دیئے گئے تھے۔ اگرچہ معرضِ تحریر میں نہیں آیا تھا، مگر ایک قاعدہ تھا کہ اُن کی قومیت کا آدمی امیر نہ بنایا جائے۔ اُن کو اس کا سخت رنج تھا کہ تقرر کے بعد اُن کو معزول کر دیا گیا! ابھی لطف حکومت بھی نہ اُٹھانے پائے تھے کہ علیحدہ کر دیئے گئے۔ غضب یہ تھا کہ اب بھی اُن کو چین نہ لینے دی جاتی تھی، اور اُن کے مخالفین اُن کو ستائے جاتے تھے۔ اس کا بدلہ اُنھوں نے یوں لینا چاہا کہ وہ خود اپنی حکومت قائم کر کے مستقل بادشاہ بن بیٹھیں۔ اُن کا اقتدار دریاء ایبرو تک بڑھا ہوا تھا؛ اُس کے شمال اور مشرق میں بربری پھیلے ہوئے تھے، اور وہ سب اُن پر فدا تھے۔ اُن دنوں یوڈس ڈیوک آف ایکیوٹین، بہت زوروں پر تھے، اور ادھر اُدھر مار دھاڑ کرتے پھر رہے تھے۔ وہ ایک مدت سے اہالی فرانس سے لڑ رہے تھے، مگر ان لڑائیوں کا نتیجہ مشتبہ ہی رہتا چلا آ رہا تھا۔ چونکہ فرانس

کی قوت بہت بڑھی ہوئی تھی اس لئے یہ نظر آرہا تھا کہ اُن کو اہالی فرانس کا مطیع ہونا پڑیگا جنوب کی طرف سے حملہ آور عرب اُن کو دبائے چلے آتے تھے، اور اُن کی مہموں سے اُن کی حکومت میں ہر وقت فتنہ وفساد برپا رہتا تھا۔ اس طرح ڈیوک دشمنوں کے نرغہ میں تھے۔ عثمان نے جو اِن سے سازوباز کرنا چاہا تو وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ عثمان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ دوستی کو پختہ کرنے کے لئے یہ گا تھک نواب اپنی بیٹی کا نکاح اُن سے کر دے۔ چنانچہ ڈیوک نے یہ بھی منظور کر لیا۔ معاہدہ تحریری ہوا اور طرفین نے اُس پر دستخط کر دیئے۔ نواب زادی (جو از روءِ معاہدہ اپنے ہی مذہب پر قائم رہنے والی تھی) اپنے باپ کے نئے حلیف کے محل میں پہنچ گئی۔ عثمان مراسم شادی ادا کر کے اپنے دارالحکومت میں آ گئے، اور یہیں بیٹھ کر اپنے آقا کی تدابیر کو اپنی ترکیبوں سے ناکام کرنا چاہا۔ اُنہوں نے یہ عزم مصمم کر لیا تھا کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو اپنی کوہستانی فوج کو امیر کے مقابل کر دیں ادھر امیر عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کو لے کر حاضر ہوں۔ اُنہوں نے یہ عذر کر بھیجا کہ میں نے جو معاہدات اپنے ہمسایہ سے کر رکھے ہیں۔ اُن کے ایفا کے لئے فوج کا اُن کے پاس رہنا ضروری ہے۔ امیر نے بار بار تاکیدی احکام بھیجے، مگر جب اُنہوں نے ایک نہ سُنی، اور امیر نے یہ دیکھا کہ جو فوج اُن کے پاس ہے وہ لڑائی کے لئے بیچین ہو رہی ہے، تو اُنہوں نے ایک افریقی افسر، ابن زیان، کو ایک دستۂ فوج لے کر خفیہ طور پر روانہ کیا کہ نافرمان والی کو زندہ گرفتار کر لیں یا اُن کو لے آئیں۔ عثمان اُن دنوں کیسٹرم[۲۶] لیویا میں آئے ہوئے تھے۔ ابن زیان اس طرح یلغار پہنچے کہ عثمان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اُن کو صرف اتنا موقعہ ملا کہ چند معتبر آدمیوں کے ساتھ اپنی نئی دلہن کو لے کر وہ ایک دشوار گزار پہاڑی مقام کی طرف چلے گئے۔ ابن زیان یہ معلوم کر کے شہر میں نہ ٹھیرے اور اپنے دستۂ فوج کو لئے ہوئے اُن کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ عثمان کا چھوٹا سا قافلہ تھک کر ایک چشمے پر سستانے کے لئے اُتر پڑا تھا، کہ دشمن پہنچ گئے۔

باغیوں کو منتشر کر دیا گیا، کچھ لوگ مارے گئے۔ گاتھک خاتون گرفتار کر لی گئی، اور عثمان کے خون سے اُن کی نمک حرامی کا دھبہ دھویا گیا۔ ابن زیان نے اُن کا سر امیر عبدالرحمٰن کے قدموں میں جا ڈالا۔ نواب زادی، جن کے حسن و جمال کو دیکھ کر تمام لوگ حیران رہ گئے تھے، محل شاہی کی زیب و زینت بننے کے لئے دمشق بھیج دی گئیں۔

اب پایری نیس کا دروازہ بالکل کھلا ہوا تھا مسلمانوں کی فوج اس طرح فرانس کے سرسبز میدانوں میں پہنچی کہ جیسے کسی بلند پہاڑ پر سے دریا گرتا ہے۔ اس وقت کوئی ایسا معتبر ذریعہ موجود نہیں ہے، جس سے ہم یہ بتلا سکیں کہ مسلمانوں کی صحیح تعداد کتنی تھی۔ جہاں تک ہم کو عیسائیوں کی تحریرات سے پتہ چلتا ہے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اندلسی فوج اور اُس جمعیت کی جو افریقہ و مصر وغیرہ سے آئی، اُس کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن ان میں ایک تو نظام نہ تھا، دوسرے صف بندی کے انتظام کو یہ لوگ مانتے نہ تھے، ایک سے دوسرے کو کینہ تھا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ مغرور تھا۔ ان وجوہ سے، بجائے اسکے کہ یہ فوج مفید ہو، اس نے اور بھی مشکلات میں ڈال دیا۔ ہر ایک قوم اور قبیلہ کے لوگ اپنے ہی سرکردہ کے علم کے نیچے جمع تھے، اور اُس سرکردہ کو اپنی حالت و حیثیت پر اطمینان نہ تھا۔ باقی رہے نایب امیرالمومنین یعنی امیر اندلس، کی وفاداری، اُس کا لحاظ اُن کو اُسی وقت تک تھا کہ اُن کے فواید و اغراض کو نقصان نہ پہنچے اور اُن کے قومی تعصبات پر کوئی بات موثر نہ ہو۔

یہاں کی تو یہ کیفیت تھی، اُدھر عیسائیوں میں اس فوج کی آمد کی خبر اور اُس کے تباہی انگیز نتائج کی اطلاعیں، بے انتہا مبالغہ کے ساتھ پھیلائی گئیں، جس سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ لرزنے لگا۔ اس سے اُن لوگوں کو وہ واقعات یاد آ گئے کہ جب گاتھ اور ہنس[۲۷] نے سلطنت روم کے بہترین علاقے پر حملہ کیا تھا، اور یہاں قتل و غارت

سے وہ تباہی ڈالی تھی کہ جس سے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ تمام ملکِ محروسۂ امیرالمومنین میں مسلمان، نہایت شوق اور تیقن کے ساتھ، اپنے بھائیوں کی کامیابی سننے کے منتظر تھے۔ ان ہی کی نہیں، بلکہ تمام دُنیا کی آنکھیں اُس سرزمین کی طرف لگی ہوئی تھیں، جہاں شمال اور جنوب کے لوگوں کی قوت آزمائی ہونے والی تھی۔ قوت آزمائی بھی وہ کہ جو یورپ کے مستقبل اور مذہب مسیحی کی قسمت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دینے والی تھی۔ ایک تباہ کن طوفان تھا کہ بڑھا چلا آتا تھا۔ کس کی مزاحمت اور کہاں کا رحم۔ ڈیوک آف ایکیوٹین نے نہایت تہور کے ساتھ پہاڑ کے نشیب پر مقابلہ کیا؛ مگر وہ آندھی کو کیونکر روک سکتے تھے۔ جو شہر راستے میں پڑے وہ راکھ کا ڈھیر تھے، جو آدمی سامنے آیا وہ غلام تھا۔ چراگاہوں میں جانوروں کا نام نہیں رہا۔ دامن کوہ میں کہاں تو پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور کہاں خاک اُڑنے لگی۔ گیرن کی سرسبز وادی نہ تھی ویرانہ تھا۔ بورڈیو[۲۸] نے جو ایکیوٹین کے اجناس کا ذخیرہ، اور نہایت آباد مقام تھا، ذرا ہی سا مقابلہ کیا تھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اُس کے تمام خزاین لوٹ لئے گئے، شہریوں کا قتل عام کر دیا گیا، اور جو کچھ نام نشان باقی رہا اُس کو بھی مٹانے کے لئے آگ لگا دی گئی۔ مسلمانوں کی فوج نے، جو پورے صوبہ کے مال مغروقہ اور ہزاروں قیدیوں کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہی تھی، گیرون کو بمشکل تمام عبور کیا، اور نہایت سست رفتار کے ساتھ اندرون ملک کی طرف بڑھی۔ دریاءِ ڈارڈون کے کنارے پر یوڈس نے اپنی فوج کو دشمنوں کے روکنے کے لئے پھیلا دیا۔ سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ عیسائی تعداد میں کم تھے ہی، اُنکو مسلمانوں نے گھیر لیا اور سب کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ خونریزی اتنی ہوئی کہ اُس زمانہ کے اُن درشت مزاج مورخوں کو بھی رحم آگیا کہ جو ایسی تباہی اور خونریزی کو دیکھ کر خوش ہُوا کرتے تھے۔ ایکیوٹین کو فتح کر لینے کے بعد امیر پائی ٹی اَرس[۲۹] کی طرف بڑھے اور اُس کے مضافات کو لوٹا۔ یہیں سینٹ ہلاری[۳۰] کا مشہور گرجا تھا، اسکو بالکل تباہ کر کے بنو امیہ کا جھنڈا شہر کی

دیوار پر نصب کر دیا۔ اُس ملک میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا تھا، مگر اس وقت شارلے مین کی کوششوں اور تدبیروں کی وجہ سے سب میں اتفاق و اتحاد ہو گیا تھا جس ملک کو آج ہم فرانس کہتے ہیں وہ ساتویں صدی میں آشوب بدعملی کا اکھاڑہ تھا۔ جنوب کی جانب سپٹی مینیا جیسا اہم صوبہ تھا، جو ایک زمانہ میں وزیگاتھ کے تحت حکومت رہ چکا تھا، اور اُن کے لُٹ جانے کے بعد برائے نام آزاد تھا۔ ایکیوٹین مختلف نوابوں کے ماتحت تھا، جو شمالی بڑھتی ہوئی طاقت، اور مسلمانوں کی کبھی ختم نہ ہونے والی طمع و بلند نظری سے غیر مساویانہ مقابلہ جاری رکھتا تھا مشرق کی طرف آسٹریشیا کے برائے نام بادشاہ ہمیشہ اپنے شریر ہمسایوں یعنی نیوسٹریا اور برگنڈی کے خلاف سازشیں کرنے اور لڑنے بھڑنے میں مصروف رہتے تھے ۶۳۸ء میں مشہور و معروف ڈیگو برٹ (۳۱) (جس کی سلطنت ڈینیوب تک پھیلی ہوئی تھی) کے مرنے پر میرو ونجین خاندان کے بادشاہوں اور اُس ملک کی آزادی کا بھی نام و نشان مٹ گیا تھا۔ اس کے بعد شاہی اختیارات اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو قلعہ شاہی پر قابض تھے، یہی زیر تھے یہی بادشاہ گر۔ یہ بڑے جری اور نہایت قابل لوگ تھے۔ خواہ اس کو بے پروائی کہا جائے یا جبر کہ برائے نام شاہ شطرنج اسی میں مست تھے کہ بادشاہ کہلاتے تھے، اور بادشاہی جاہ و جلال رکھتے تھے۔ پادریوں نے اپنی تمام تر قابلیت اپنے گرجاؤں اور دیروں کو دولتمند بنانے میں صرف کر دی۔ اُن کے مقلدین اُن کی طمع و آز کے پورا کرنے میں اپنا تمام جوش دینداری خرچ کرتے تھے۔ گرجا اور خانقاہ سب بہترین دولت کے دفینہ و خزینہ بنے ہوئے تھے، جن کو دیکھ کر امیر عبدالرحمٰن کے ہمراہی قزاقوں کی آنکھیں چوندھیا گئیں، اور منہ میں پانی بھر آیا۔ ملک یورپ کا کوئی ملک اتنا دولتمند ہونے کا دعوے نہ کر سکتا تھا، جتنی دولت جاتریوں کی سخاوت اور کفارہ دہندوں کے خوف نے سینٹ ہلاری کے گرجا واقع پائیٹیرس اور سینٹ مارٹن کے گرجا واقع

ٹورس(۳۲) میں لاکر جمع کردی تھی۔ پادری، عادتاً، اپنے آپ کو آسمانی باپ کے خزینہ دار اور اولیاء اللہ تک پہنچنے کے لئے برگزیدہ وسیلہ کہا کرتے تھے۔ نہایت قیمتی تحفہ و تحایف بھی اُن کی گاوخرد عاؤں اور غیر معتبر تبرکات کے مقابلہ میں، ہیچ سمجھے جاتے تھے۔ مگر غریب معتقدین جو پادریوں کی طمع، اور راہبوں کی مکاری، کے شکار ہوتے تھے اتنی بیش قیمت چیزیں پیش کرتے ہی رہتے تھے، اور ان محقر نذور کے قبول ہونے پر خوشی خوشی اپنی راہ لیتے تھے۔

اہالی فرانس نے مردانہ قوت اپنے وحشی بزرگوں سے ورثہ میں پائی تھی، فوجی مشقوں سے اس کا اور بھی نشوونما ہو گیا تھا۔ یوں یہ تمام قوم کی قوم شجاع و باسل ہو گئی تھی۔ اُن کے لمبے چوڑے قد تھے، اور جب وہ زرہ بکتر پہن کر سامنے آتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر کوئی ہتھیار کارگر نہ ہوگا۔ جو لوگ کہ قد و قامت میں اُن سے کم تھے اُن پر اُن کا رعب پڑ جانا لازمی بات تھی۔ یہ لوگ بلغمی مزاج تھے۔ اپنے بادشاہوں کے ایسے جان نثار کہ انہوں نے کبھی یہ پوچھا ہی نہیں کہ جو حکم اُن کو دیا جاتا ہے وہ جائز ہے یا ناجائز۔ وہ میدان جنگ میں پہاڑ کی طرح جمتے تھے، اور دیووں کی طرح لڑتے تھے۔ ایک تو اُن کی صورت ہی خونخوار تھی، اُس پر وہ بہت اونچا خود پہن کر بالکل ہی جن بن جاتے تھے۔ اُن کے چوڑے چکلے کندھوں پر شیر یا چیتے وغیرہ کی کھال ہوتی تھی، جس سے اُن کی صورت خوفناک ہو جاتی تھی۔ اُن کے ہتھیار اتنے لمبے چوڑے اور مضبوط ہوتے تھے کہ جن کو اُس زمانہ کے دیوجن ہی اُٹھا سکتے ہوں تو اُٹھا سکتے ہوں۔ یہ تھے وہ جنگ جو جوان، جن کی مٹھی میں اس وقت عیسائیانِ عالم کی قسمت اور ہستی تھی۔ اُس وقت فرانس کے تخت پر تھیئری چہارم تھے، جو اُس خاندان کے نام لیوا تھے جو ایک زمانہ بعید سے اُس تخت کی زینت چلا آتا تھا۔ اُن کو ایک وزیر، بادشاہ گر، چارلس نامی نے، (جو پیپن ڈی ہیرسٹال ڈیوک آف ایسٹریاس کا ولد الحرام تھا)

براء نام شیر قالین بنا کر تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ یہ بادشاہ گر نہایت قابل لوگ تھے اور محض اپنی قابلیت ہی کی وجہ سے وہ نمود اور گرفت حاصل کرتے تھے کہ تمام سلطنت، مہام سلطنت اور اختیارات سلطنت کو دبوچ بیٹھتے تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ کسی ایسے شخص کو تخت پر بٹھائیں۔ جو ہر قسم کے عیوب کا مجموعہ ہو، جس میں اخلاق کریمہ اول تو ہوں ہی نہیں، اور اگر ہوں بھی، تو وہ اخلاق ذمیمہ سے اتنے دبے ہوئے ہوں کہ اُن کا نشان بھی باقی رہا ہو، جن میں جذبات حب الوطنی کو تعیش اور زنانہ تکلف نے اتنا دبا یا ہو کہ اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اُن کی رندیت اور شہوت پرستی ہی کا یہ اثر تھا کہ اُن کی عمریں کم ہوتی تھیں، چنانچہ ہر ایک کا زمانہ سلطنت بہت ہی کم رہا ہے، اور تخت فرانس پر یکے بعد دیگرے بہت جلد جلد بادشاہ تخت پر بیٹھتے رہے ہیں ❊

آٹھویں اور نویں صدی کے لغو گو مورخ، شہدا اور اولیاء کے حالات، اور تبرکات کی برکات کے حالات تو بہت کچھ لکھتے ہیں، مگر یہ نہیں بتلاتے کہ اُن کے زمانہ میں سب سے بڑے نمود کا کون آدمی تھا، اور اُس کے کیا کارنامے ہیں۔ غالباً اس نفرت آمیز خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے گرجاؤں کی جائداد کو ضبط کر لیا تھا۔ مانا کہ جائداد منضبط کو مذہب مسیحی کی صلاح و فلاح و ترقی ہی پر لگایا گیا، مگر اتنی سی بات اس قدر دشمنی کو کافی تھی کہ اُن کا نام و نشان تک ان حضرات نے نہیں لکھا۔ اُس زمانہ کی بداخلاقی سے پیپن ڈی ہیرسٹال نے فائدہ اٹھا کر چارلس کی ماں، اسپایڈے، کو بطور مدخولہ عورت کے رکھا ہوا تھا۔ اسی کے بطن سے یہ بادشاہ گر تھا۔ اس عورت کی اخلاقی حالت اس قدر گری ہوئی تھی کہ اُس سے شادی کرنا غیر موزوں تھا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ وہ پیپن کی دوسری بیوی کہلاتی رہی تھی۔ ایک تندمزاج پادری، لیمبرٹ نامی، مس ٹرکٹ کا بطریق تھا! آٹھویں صدی کے پادریوں میں جو خشونت اور خشکی ہوتی تھی وہ اس میں بدرجہ اتم تھی۔ اُس نے

ایک بھرے مجمع میں پیپن کو اس آشنائی کے جرم پر لعنت وملامت کی، اور اس کی دعوت کو نہایت حقارت کے ساتھ نامنظور کر دیا۔ خاتون مذکورہ کے بھائی کو اس سے بہت ہی غصہ آیا۔ اس نے اس بطریق کو مرواڈالا۔ یہ شخص اسی روز سے مردود قرار دیا گیا۔ اس وقت سے لیکر اب تک اس شخص کا نام رومن کیتھولک کی فہرست ملعونین میں چلا آتا ہے۔ اصلی قاتلوں نے نہ کلیسا کی لعنت کی پرواکی، نہ قانونی سزا کا لحاظ، مگر وہ سزا سے بچ رہے البتہ لیشیر چونکہ اس بطریق کا بہت بڑا اثر تھا، اور وہاں اس نڈر پادری کے معتقدین بھی بہت تھے اس لئے وہاں والوں نے اسکی یادگار میں ایک گرجا بنا دیا۔ بہرحال یہ واقعہ قرون متوسط کی بداخلاقی، قانون سے بے پروائی اور خانگی زندگی کی شرح کرتا ہے، اور فرانس کی کیفیت صحیحہ دکھلاتا ہے۔

روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارلس نے اپنے بھائی گرموالڈ کو اس لئے مروا ڈالا تھا کہ وہ اُن کی آبائی جائداد میں حصہ دار تھے۔ اس کے سواء اور کوئی وجہ تحریک اس قتل کی نہیں ہو سکتی۔ چارلس کے والد پیپن اُن سے اتنے ناخوش تھے کہ ایک مرتبہ اُن کو قید کر چکے تھے۔ مورخین اس معاملہ میں غالباً اس وجہ سے بالکل خاموش ہیں کہ وہ اس بادشاہ گر سے ڈرتے تھے۔ لامحالہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جائداد ہی کے لالچ سے اُنھوں نے اپنے بھائی کی جان لی۔ اگرچہ چارلس کے باپ نے اُن کو عاق اور محروم الارث کر دیا تھا، مگر لوگوں کو اُن سے ایسی گرویدگی تھی کہ اُن کے باپ کے مرتے ہی اُن کو قیدخانہ سے نکال کر ڈیوک بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جو واقعات ہوئے اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارلس واقعی لایق شخص تھے، اور اُن کی تدابیر نہایت کارگر ہوتی تھیں؛ اُن کے رویہ و رعب سے اہالی فرانس نے آپس کی عداوت سے ہاتھ اُٹھا لیا؛ اُن کے تہور و مردانگی اور فوجی جوہر سے اہالی جرمنی کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ اُن کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُن کی ذات سے

مسیحیت کو بہت فائدے پہنچے ہیں، مگر اس میں بھی شک وشبہ کو گنجائش نہیں ہے کہ وہ بُت پرست تھے۔ خود اُن کا خطاب "مارٹل" اس کو ثابت کرتا ہے۔ علماء زمانۂ قدیم سخت کندو کادی اور تحقیق و تفحیص سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مارٹل ثور (۲۴) نامی سیکنڈی نیویا کے بُت کا ہتھوڑا تھا۔ وہ نہ کلیسا کا ادب کرتے تھے، نہ اُس کے اصول کے معتقد تھے، نہ اُس کے جاگیر وجائداد کو محترم سمجھتے تھے، نہ اُن کو پادریوں کی پرواہ تھی۔ اُنہوں نے ذخایر قدیسین، اور مقدس برتنوں کی، جو عبادت الٰہی کے کام آتے تھے، ضبط کرکے اُن سے روپیہ بنوا ڈالا اور وہی اپنے سپاہیوں کی تنخواہ میں صرف کیا؛ ایک پادری کی اراضی ضبط کرکے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردی، بہت سے بطریقوں کو معزول کرکے اُن کی جگہ اپنے فوجی افسروں کو بطریق بنا دیا، تاکہ اُن کی جائدادوں پر قبضہ ہوسکے۔ اس قسم کی بے ادبیوں سے اگرچہ پادری ناراض ہوئے مگر سپاہی تو خوش ہوگئے، کیونکہ چارلس مارٹل جو کچھ کلیسا سے چھینتے تھے وہ فوج میں تقسیم کردیتے تھے۔ باوجود اس کے کہ اُنہوں نے کلیسا کی بھی بہت خدمت کی مگر پادری ہی کسی طرح خوش نہ ہوئے۔ پوپوں اور مذہبی کونسلوں نے اُن کو ملعون قرار دے رکھا تھا؛ اسی بناء پر راہبوں کی خوش اعتقادی اور نفرت وعداوت نے اُن سے بحلف یہ لکھوادیا ہے کہ بڑے متبرک اور مقدس لوگوں نے کئی مرتبہ یہ دیکھا ہے کہ قعر جہنم میں چارلس مارٹل کی روح کو فرشتگان عذاب گھیرے ہوئے ہیں۔

چارلس مارٹل کی عادت وخصلت اور خانگی زندگی کے متعلق ہمیں مطلقاً کچھ علم نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی نہیں بتلایا جاتا کہ اُن کی دارالسلطنت کے قانون کیا تھے، نظام مملکت کیا تھا، قواعد فوج کیا تھے، اصول حکومت کیا تھے اور اُن کے امراء ووزراء کے کیا نام تھے۔ اہل کلیسا اُن سے اس درجہ ناراض ونالاں ہیں کہ اُن کا نام سُن کر لعنت کرتے ہیں، اس پر بھی اُن کی شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مگر تاریخ بھی عجیب

منصف ہے، وہ ان کی مہمات کی تعریف کرتے کرتے تھکی جاتی ہے، حالانکہ ہمعصر اس کو
چنداں وقعت نہیں دیتے۔ یہ تاریخ ہی ہے کہ جس نے اُن کو دنیا کے نہایت ناموراور
ممتاز سپہ سالاروں کے صف میں جگہ دی ہے بچپن ہی سے اُن کا مشغلہ تیغ و تبر
رہا ہے۔ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ فوج ہی میں رہتے گزرا۔ اُنہوں نے نیوسٹریا کو فتح کیا،
برگنڈی کو تنگ کیا، وحشیان رہاین کے خلاف بہت سی کامیاب مہمیں کیں، اپنی خونریزی
کے نشانات دریاء ایلب اور ڈینیوب تک چھوڑ گئے، ایکیوٹین کو اپنے شاہ شطرنج
کا باجگزار بنایا۔ یوڈس کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ ان کی دھمکیوں سے اتنا ڈرتا تھا کہ اُتنا
مسلمانوں کے حملوں سے بھی نہ ڈرتا ہوگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خانماں برباد ڈیوک آف
ایکیوٹین اپنے قدیمی دشمن کے سامنے حاضر ہوا تو کورنش بجا لایا، اور اُس سے استمداد کی۔
چارلس کی بالغ نظری اور فراست نے یہ تاڑ لیا تھا کہ معاملہ بہت نازک ہوگیا ہے، اور خوف دن
بدن بڑھتا چلا جاتا ہے؛ اسی لئے اُنہوں نے فوراً ہی اُس کا علاج کرنا چاہا۔ اُن کے سپاہی
ہمیشہ خیموں ہی میں رہتے تھے؛ ہر وقت ہتھیار لگائے ہوئے چلنے کے حکم کے منتظر رہتے
تھے۔ بہت جلد فوج کی بڑی جمعیت جمع ہوگئی، سپاہیوں کا شور و غل آسمان تک پہنچا۔
فرانس کے سپہ سالار اپنی فوج اور اُس کے نظام سے نہایت مطمئن تھے، وہ نہایت طمانیت قلب
سے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ اہالی پائے ٹیرس کو بورڈیو کی نظیر ایسی ملی
تھی کہ وہ بالکل بے جگر ہوگئے تھے اور اُنہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ ایسی شجاعت کے
ساتھ کیا تھا کہ ان کی ہمتیں ساقط ہوگئی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس اثنا میں محاصرہ
اُٹھا لیا، اور وہ ٹورس کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ اُن کے لئے اس طرف کشش
کی اصل وجہ سینٹ مارٹن کے کلیسا اور وہاں کے دیر کی دولتمندی کی شہرت تھی۔ یہاں
بہت ہی بڑا میدان تھا؛ اسی میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے مقابلہ میں صف آرا
ہوئیں۔ یہ مقام ناف فرانس میں واقع تھا، اور وہی جگہ تھی کہ جہاں صدیوں پیشتر گاتھ اور

اہالی برگنڈی کے درمیان بسر کر دگی ایشیا اس وہ مشہور لڑائی ہوئی تھی جن میں ایٹلا کے وحشیوں سے یورپ کو ستانے کا انتقام لیا گیا تھا۔ باشندگان شمال اس میدان کو اپنے لئے نہایت مبارک سمجھتے تھے۔ آج پھر اتنی صدیوں کے بعد وہی میدان وحشیان ایشیا کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے کام آتا ہے؛ اس وقت جو دو قومیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں اُن میں کوئی تناسب نہ تھا۔ اُن کی نسلوں، زبان، شکل و شباہت، مذہب، نظام فوجی اور ہتھیاروں کی صورت شکل میں زمین و آسمان کا فرق تھا؛ دونوں فریق کو جنگ کے نتائج کا خوف لگا ہوا تھا؛ دونوں اپنی اپنی ہٹ پر قائم تھے؛ دونوں وہاں سے نہ ٹلنا چاہتے تھے۔ سات روز تک طرفین کی فوجیں بیکار پڑی رہیں، لیکن صفوں کو نہ توڑا۔ آخر عربوں کا جوش روکے نہ رکا، اور امیر عبدالرحمٰن نے، مجبور ہو کر حملہ کا حکم دیدیا۔ مسلمانوں کا رسالہ پیدل فوج کو ساتھ لے کر تکبیریں پڑھتا ہوا آگے بڑھا اور فرانس کے دیو نژاد، لوہے میں غرق سپاہ پر حملہ کر دیا، مگر یہ لوگ اپنی جگہ سے نہ ہلے؛ گویا ایک پہاڑ تھا کہ ہلنے کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ اُن کے زرہ و بکتر و خود و چار آئینہ پر عربوں کے تیر کچھ بھی اثر نہ کرتے تھے، اور چارلس کے آدمیوں کی بوجھل تلواریں اور بھاری نیزے نیم برہنہ عربوں میں آفت مچائے ہوئے تھے۔ رات نے آکر دونوں فوجوں کو الگ کر دیا۔ اہالی فرانس نے گو بہت بڑا استقلال دکھلایا، مگر تھک کر چور ہو گئے تھے۔ اپنے اولیاء اللہ سے مدد مانگتے ہوئے، اور دوسرے روز کے نتائج سے سخت مخدوش، ہتھیار لگائے ہوئے سو گئے۔ صبح ہوتے ہی جنگ اُسی کیفیت اور حالت سے شروع ہو گئی اور سہ پہر تک کسی فریق کو کامیابی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یکایک ڈیوک آف ایکوٹین نے ایک طرف سے حملہ کیا، اور دشمن کی فوج میں ایک آفت برپا کر دی۔ جب اس مصیبت کی خبر مسلمانوں میں پھیلی تو بہت سے لوگوں نے اپنے علم کے نیچے سے بھاگ کر اپنے اپنے مال مفروقہ کو

جا سنبھالا! کیونکہ اُن کی نظروں میں وہ چیز اپنی جان کی حفاظت اور اپنی کامیابی سے بھی زیادہ عزیز تھی سخت سراسیمگی پھیل گئی، اور تمام فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر فرانس والوں نے اور بھی سختی کی۔ عبدالرحمٰن نے چاہا کہ بڑھ کر اپنی فوج کا دل بڑھائیں۔ اسی کوشش میں اُنھوں نے سینکڑوں زخم کھائے، آخر انکی جان بھی گئی۔ اتنے میں پھر رات آگئی۔ مسلمانوں نے اس کو غنیمت سمجھا، اور راتوں رات اپنے خیمے اور بوجھل چیزیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چارلس ایک تو اس سے ڈر گئے کہ کہیں یہ لوگ کمینگاہوں میں نہ چھپے ہوئے ہوں، دوسرے اُن کو اپنے دشمنوں کی شجاعت ایسی پسند آئی کہ اُنھوں نے تعاقب کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور مسلمانوں کا متروکہ مال لے کر اپنے دارالسلطنت کو لوٹ گئے ؛

عرب نے کوئی تفصیل نہیں چھوڑی جس سے یہ معلوم ہوا کہ اُن کے کتنے آدمی اس لڑائی میں کام آئے۔ اُن دنوں عیسائیوں میں سوا راہبوں کے اور کوئی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، اس لئے اُس زمانہ کے تمام واقعات کو قلمبند کرنے کا کام بھی ان ہی کذابوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان حضرات نے مسلمان مقتولین کی تعداد تین لاکھ پچھتر ہزار لکھی ہے۔ یقیناً یہ تعداد اُن کی اصلی تعداد سے بقدر تین گُنے کے زیادہ تھی فرانس والوں کا نقصان اتنا خفیف بتلایا گیا ہے کہ اُس کے ذکر کرنے ہی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ باوجود اس کے کہ دشمن اپنے مال مغروقہ سے بوجھل ہو رہے تھے اُن کا سپہ سالار مارا جا چکا تھا، اور وہ ہزیمت خوردہ و دل شکستہ تھے، لیکن پھر بھی فرانس والوں کو یہ ہمت نہ پڑی کہ اُن کا تعاقب کرتے۔ خود یہ واقعہ اس امر کا شاہد ہے کہ چارلس مارٹل کی فوج کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ ہر مورّخ اس کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ لڑائی نہایت اہم تھی۔ اس کے حالات جو کچھ بھی ملتے ہیں وہ اہالی کلیسا کے لکھے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے یقیناً عیسائیوں کی حمایت میں مبالغہ کیا ہے۔ راہب مصنفین نے اپنا تمام تخیل یہ

بیان کرنے میں صرف کر دیا ہے کہ اولیاء اللہ نے پرستاران صلیب کی پوری مدد کی، اور اسی وجہ سے مسیحیت قایم رہ گئی۔ لیکن مصنفین عرب نے، جو اکثراً عموماً جزئیات تک اپنی تصنیفات میں درج کر دیتے ہیں، خواہ وہ واقعات اُن کی مصیبت ہی کے کیوں نہ ہوں، اتنے بڑے واقعہ سے چنداں اعتنا نہیں کیا۔ حالانکہ یہ وہ واقعہ ہے کہ جس نے اُن کی آئندہ قسمت پر بہت بڑا اثر کیا ہے۔ بہت سے مورخین نے تو اس کا ذکر ہی نہیں کیا؛ بعضوں نے چند ہی الفاظ کہہ کر چھوڑ دیئے ہیں؛ بعض اس کا ذکر کرتے ہیں، مگر نہ اس طرح کہ وہ کوئی گھمسان کی لڑائی تھی، بلکہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ آدمی اتنے تھے کہ اُن کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، نیز اُن میں فریق بندی اور جوش بیحد تھا اس لئے نظام قائم نہیں رہ سکا، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ شکست ہوئی۔ ایسے ہی کمزور واقعات اور متضاد باتوں سے آدمی کو اتنی مہتم بالشان[۵] لڑائی پر ذہن آزمائی کرنی پڑتی ہے۔

پاٹیرس کی شکست فاش کی خبر جب عامل افریقیہ کو پہنچی تو اُنہوں نے

---

[۵] یورپ کے فدائیان مذہب مسیحی اس لڑائی کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور باوجود ان تباہ کاریوں کے جو مصنف علام نے اوپر شمار کی ہیں چارلس مارٹل کو ناجی ثانی مانے ہوئے ہیں۔ اُنکے نزدیک مسلمانوں کی "یہ شکست" اس قابل ہے کہ اُس پر آج بیسویں صدی تک شادیانے بجائے جائیں۔ چارلس مارٹل تو اب تک عیسائیوں کے دیوتا مانے جاتے ہیں۔ اس لڑائی کے متعلق یورپ میں مستقل کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور اس کو نہایت فخر کے ساتھ دُنیا کی اُن فیصلہ کن لڑائیوں میں سے سمجھا جاتا ہے جنہوں نے اقوام کی قسمت کا ہمیشہ کیلئے فیصلہ کر دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا فی الحقیقت "یہ شکست" شکست کہلانی کی مستحق بھی ہے۔ مورخین عرب تو اس کو اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اُس سے اعتنا بھی کیا جائے۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں نے فرانس پر اسی سرگرمی کے ساتھ کیوں پیش قدمی نہیں کی۔ اس کا جواب کہیں اور ڈھونڈھنا چاہئے۔ (مترجم)

عبدالملک بن قطن الفہری کو، جو فوج کے ایک افسر تھے، امیر اندلس بنا کر بھیجا؛ اور حکم تقرر دیتے ہوئے اُن سے یہ تاکید کر دی کہ مسلمانوں کو جو ہزیمت ہوئی ہے۔ اُس کا انتقام لیں۔ عبدالملک اگرچہ اپنی عمر کے نوّے منازل طے کر چکے تھے، مگر اُن کے پھرتیلا پن اور تہوّر میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ، یہ سُن کر کہ اُن کو بت پرستان شمال سے لڑنے کا موقعہ ملیگا، بہت ہی خوش ہوئے۔ قرطبہ میں چونکہ تمام محکموں میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے چند روز اُن کو یہاں ٹھیرنا پڑا۔ پھر یہاں کی بقیۃ السیف، اور افریقیہ کی فوج کو، جو اپنے ساتھ لائے تھے، لے کر پائرینس کے مخدوش درّون کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جو وقت اُنہوں نے حملہ کے لئے انتخاب کیا تھا وہ بہت ہی بُرا تھا؛ کیونکہ برسات کا موسم سر پر تھا۔ ایک طرف تو مسلمانو کو پہاڑی ندیوں نے آگے نہ بڑھنے دیا، دوسری طرف سے وہ دشمنوں کے ہدف بن گئے۔ فوجی کوچ نہ تھا، بلکہ قدم قدم پر لڑائی تھی۔ امیر نے سخت مشکلوں کے ساتھ اپنی فوج کو اس جال سے نکالا۔ اس مہم کو یوں خراب ہوتے دیکھ کر عبیداللہ، عامل افریقیہ نے عبدالملک کو معزول کر دیا؛ کیونکہ اُن سے بہت کچھ امیدیں تھیں، اور اُن ہی نے کچھ کر کے نہیں دکھلایا۔ ان کی جگہ عقبہ بن الحجاج السلولی کو مقرر کیا۔ یہ سخت ضابط اور جابر آدمی تھے، اور قانون و قواعد کی سخت پابندی کراتے تھے اسی وجہ سے اُن کا انصاف اور پیش بینی بہت مشہور ہے۔ جتنے بددیانت اور ظالم عمال و حکام تھے وہ اُن کے نام ہی سے کانپنے لگے۔ ان میں سے ایک ایک کو اُنہوں نے چُن چُن کر نکال دیا۔ راشی اور امیرالمومنین کی گستاخی کرنے والوں کے تو وہ جانی دشمن تھے۔ شوارع کی حفاظت کے لئے اُنہوں نے ایک محکمہ ہی پولیس کا الگ قائم کر دیا تھا جس میں صرف سوار رکھے گئے تھے؛ جو "کاشف" کہلاتے تھے۔ یقیناً یہیں سے پندرھویں صدی کے ہرمین ڈاڈ، زمانہ حال کے جندرمہ، اور سول گارڈ، جو آج کل فرانس اور

سپین میں ہوتے ہیں، ان ہی سواروں کی نظیر سے قائم ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نظام فوجی کی بناء بھی ان ہی سواروں سے پڑی ہے، جو تمام ملک محروسہ میں پھیلے ہوئے تھے یہی لوگ کیلٹراوا، القنطرہ اور سنٹیاگو رسنت یاقوہ کے نوابوں کے پیش رو تھے۔ جنہوں نے جنگہاء بازیافت میں بہت بڑا کام کرکے دکھلایا تھا۔ عقبہ نے ہر گاؤں میں ایک عدالت قائم کردی، تاکہ رعایا کو عدل و انصاف حاصل کرنے کے لئے زحمت سفر نہ برداشت کرنی پڑے۔ اُن کی رعایا پروری نے ہر ایک فرقہ کے لئے الگ الگ مدارس قائم کردیئے تھے، اور اُن کے خرچ کے لئے ایک علیحدہ ٹیکس لگا دیا تھا۔ وہ چونکہ سخت دیندار اور متقی آدمی تھے اس لئے انہوں نے اپنا یہ طرزِ عمل رکھا تھا کہ جہاں کہیں ضرورت دیکھتے تھے مسجد بنوادیتے تھے، اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہبی تعلیم نہایت مفید چیز ہے، اس لئے ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ضرور رکھتے تھے، تاکہ جہلا وہاں قرآن مجید کی تعلیم پاکر نیک مسلمان بن سکیں۔ انہوں نے نہایت تشدد کے ساتھ آوارہ گرد خونخوار بربریوں کی روک تھام کی۔ اُن کے رشتہ دار افریقیہ کی بہت سی لڑائیوں میں امیر کے ہاتھ لگ ہی چکے تھے، اس لئے وہ پہلے ہی مرعوب تھے۔ انہوں نے محاصل کو ہر جگہ برابر کردیا، جس سے اضلاع کے وہ لوگ بہت ہی ممنون ہوئے کہ جو بڑے بڑے محاصل ادا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ہی محصلین اُن کو بہت تنگ کرتے تھے۔ زمانۂ حکومت امراہیں اتنی اصلاحیں اور اتنا عدل و انصاف کبھی نہیں ہوا، جیسا کہ امیر عقبہ کے دوران حکومت میں۔

بربرہ افریقیہ میں آئے دن بلوہ کرتے رہتے تھے، اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے عبیداللہ عامل افریقیہ اُن کو قابو میں نہ لاسکے۔ تو انہوں نے عقبہ کو اندلس سے بلا بھیجا یہ ایک رسالہ اپنے ساتھ لے کر آئے، اور انہوں نے آتے ہی مار دھاڑ کرنی شروع کی اور بربریوں کو وہ سبق دیا کہ چند مدت وہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ اس پر بھی عامل افریقیہ

کو ان کی خدمات کی اتنی ضرورت رہی کہ انہوں نے ان کو اپنے پاس سے علیحدہ نہیں کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ چار برس تک وہاں ان کے مشیر خاص رہے، مگر امیر اندلس ہی کہلاتے رہے۔ ان کی غیبت میں اندلس میں بے انتہا بدنظمی اور ابتری پھیل گئی۔ جو مفید اصلاحیں انہوں نے، غور و فکر کے ساتھ کی تھیں، اور جنہوں نے ان کی قابلیت کا اظہار کیا تھا، بالکل ختم ہوگئیں اور وہی پرانی خرابیاں شروع ہوگئیں۔ ہر صوبہ میں وہی پرانی کینہ کشی، خونریزی، غربا پر ظلم، زراعت کی طرف سے غفلت، رشوت ستانی اور قتل و غارت اسی پہلی کیفیت کے ساتھ ہونے لگا۔

چارلس مارٹل اور بے رحم وحشیوں کا خوف و خطر تمام سرحد جنوبی فرانس میں پھیلا ہوا تھا۔ ان کی زیادتیوں کا اگر مسلمانوں کے انصاف اور مسامحت سے مقابلہ کیا جائے، جو انہوں نے سپٹی مینیا میں روا رکھی تھیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک قہر الٰہی نازل تھا۔ اہالی پروونس کی آرام طلبی ان کو فوج کی تکالیف اٹھانے سے باز رکھتی تھی۔ ان کے مذہبی خیالات میں وہ کٹا پن نہ تھا جو اوروں میں تھا؛ وہ اسلام میں کوئی بات قابل نفرت نہ دیکھتے تھے۔ انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنے جنوبی ہمسایہ سیاہ رنگ کے آدمیوں سے مدد لیں۔ چارلس مارٹل نے مورون شی اس ڈیوک آف مارسیلیس[35]، کی تمام ریاست کو لوٹ لیا تھا؛ اگر سیکسن[36] غدر نہ کر دیتے تو یقیناً مورون شی اس کی خبر نہ تھی۔ اس شخص کی حدود ریاست تمام پروونس کو احاطہ کئے ہوئے تھی، اور گو وہ اس قابل نہ تھا کہ چارلس کا مقابلہ کر سکتا، تاہم وہ کچھ کمزور آدمی بھی نہ تھا۔ اس خوف سے کہ مبادا چارلس مارٹل پھر واپس آئے، مورون شی اس نے یوسف ابن عبدالرحمٰن والی ناربون، سے سازو باز اور استمداد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معاہدہ تحریر ہوا جس کے موافق پروونس نے مسلمانوں کا باجگزار ہونا منظور کر لیا اور بہت سے شہر ان کو تفویض کر دیئے تمام رؤسا ریاست نے مسلمانوں کے والی کو نذریں پیش کیں۔ ادھر یوسف نے اپنی نئی

رعایا کی حفاظت کے لئے بہت سی فوج شمالی سرحد پر پھیلادی۔ ملک کی یہ حالت تھی کہ یکایک عقبہ کو بربریوں کے عذر و بلوہ کے رفع کرنے کے لئے افریقیہ بلا لیا گیا؛ حالانکہ اس وقت وہ یہ چاہ رہے تھے کہ کسی طرح بہت بڑی فوج لیجا کر اپنے ملک کی حدود کو اور وسعت دیدیں۔

اوایل ۷۳۶ء میں چارلس مارٹل نے سیکسن کی طرف سے گونہ اطمینان کرکے پرووینس پر فوج کشی کرنے کا تہیہ کرلیا۔ عربوں کو لیانس سے نکال کردہ شہر اے وِگ نان کیطرف بڑھے۔ یہ مقام ایسی جگہ واقع تھا کہ اہلی فرانس و عرب یہ سمجھتے تھے کہ یہ شہروادی رہون کی کنجی، اور کچھ غیر معمولی طور پر مضبوط ہے۔ کچھ تجربہ اور کچھ زیادہ مہذب ہمسایہ اٹلی کی وجہ سے فرانس والوں نے محاصرہ کی کلوں کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ اگرچہ عربوں نے بامداد رعایا سخت مقابلہ کیا، مگر وہ ایوگنان کو اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے، اور چارلس مارٹل نے اس کو عنوتاً لے لیا۔ چارلس مارٹل نے وہاں کے تمام باشندوں کو ذبح کرڈالا، اور پھر اپنا جی ٹھنڈا کرنے کے لئے اس طرح شہر کو جلا ڈالا کہ اس کا اگر کچھ نشان باقی رہ گیا تھا تو صرف ایک راکھ کا ڈھیر۔

ایوگنان کے سخت مقابلہ سے چارلس مارٹل کو یہاں دیر لگ گئی؛ ورنہ ان کے سپاہیوں نے سپٹی مینیا پہنچنے کے لئے سخت شوروشغب مچا رکھا تھا کیونکہ وہ وہاں کی دولت کے بھوکے تھے، اور کسی طرح چین نہ لینے دیتے تھے۔ آخر انہوں نے پیش قدمی شروع کی؛ اور آرلیس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سیدھے ناربون پہنچ گئے۔ عربوں کو اپنے اس فرانسیسی دارالسلطنت کی اہمیت معلوم تھی، اور وہ اس کی بہت قدر کرتے تھے اسی لئے انہوں نے زرخطیر خرچ کرکے سخت محنت سے اس مقام کو نہایت محفوظ اور مضبوط کرلیا تھا۔ شہر کا محاصرہ بہت ہی سختی سے کیا گیا؛ لیکن کچھ پیش نہ گئی۔ مسلمانوں کی کمک کیلئے براہ دریاء آڈ فوج بھیجی گئی۔ مگر چارلس کی پیش بینی سے وہ وہیں دریا میں روک دی گئی دشمنوں کے کمانداروں سے ان کو سخت نقصان پہنچا، اور بہت سے آدمی ڈوب گئے؛

یہاں تک کہ آدھی فوج بھی باقی نہ رہی۔ جتنے رہ گئے تھے وہ کسی نہ کسی طرح شہر میں پہنچ گئے۔ عربوں کی ہمت و استقلال کا فرانس والے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ چارلس اپنی غیر منظم فوج کو کسی طرح نہ روک سکے اس لئے مجبوری انہوں نے محاصرہ اُٹھا لیا؛ اور اپنے غصہ کو مضافات شہر کے باشندوں پر اوتارا اور اس زمانہ کی تمام وحشت کو صرف کر کے بے انتہا بے رحمیاں اور ظلم کئے۔ پروونس اور لینگیوڈاک کے خوبصورت میدان، جن میں وہ عمارتیں تھیں جو ایتھنز اور روم کے زمانۂ عروج کو یاد دلاتی تھیں، جہاں کے باشندے مغربی یورپ کے مہذب ترین آدمی تھے، سب ہی کو ایلپس اور رہائین کی وحشی فوج نے غارت کر دیا۔ ایگڈے میگیولان[۲۹] اور بیٹریرس[۳۰] جیسے شہر لوٹ لے گئے، شہر نیمس میں زمانۂ قدیم کے وہ بے نظیر تبرکات تھے، جن کے باقیات اب بھی علماء زمانۂ قدیم کو حیران کر دیتے ہیں، اس شہر کی ان ہی یادگاروں کی وجہ سے شامت آئی، اور وہاں کے باشندوں کی روشنی طبع ان کی بلاء جان ہو گئی۔ اس کی فصیل گرا دی گئی، اس کے گرجاؤں کو لوٹ لیا گیا، اس کے معزز آدمی بطور یرغمال کے گرفتار کر لئے گئے، اور اس کی نہایت شاندار عمارت کو آگ لگا دی گئی۔ اہالی روم کا بنایا ہوا تماشا گاہ اس قدر مضبوط تھا کہ یہ وحشی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے مگر اس کے دھوئیں سے رنگے ہوئے کالے کالے پتھر اب بھی ان کی آتش زنی کے شاہد ہیں یہ سنگی عمارت گویا ایک محضر ہے کہ جس پر چارلس مارٹل کی حماقت وجہالت و کمزوری اور وحشت کی آٹھویں صدی سے مہر لگی ہوئی ہے۔

اس حملہ میں عرب آبادکاروں کو بہ نسبت وہاں کے خاص باشندوں کے بہت کم نقصان پہنچا؛ کیونکہ اہالی فرانس موخرالذکر کے پہلے ہی دشمن تھے۔ ان بت پرستوں نے اہالی کلیسا کا بہت ہی کم احترام کیا۔ چارلس مارٹل کو نہ ملعون قرار دیئے جانے کا ڈر تھا، نہ خارج از کلیسا ہونے کا خوف، اس لئے اُن کا جہاں تک بس چلتا تھا۔ وہ گرجاؤں

کی جائیدادوں پر ضرور ہی ہاتھ مارا کرتے تھے۔ جب اہالی فرانس امیرالمومنین کے حلیفوں کو اپنے حسب دلخواہ نقصان پہنچا چکے، اور اپنے امکانی ظلم کر چکے تو مال مغروقہ اور ہزاروں قیدی لے کر بڑے شان و شوکت کے ساتھ اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔

پروونیس پر اہالی فرانس کا قبضہ بہت ہی عارضی رہا۔ جو فوج محافظ وہ وہاں چھوڑ گئے تھے وہ اتنی نہ تھی کہ ان لوگوں کو قابو میں رکھ سکتی جنکو اُن کے ظلموں سے سخت غصہ آیا ہوا تھا۔ ڈیوک آف مارسیلیس نے والی آرلیس کی مدد سے بہت آسانی کے ساتھ ایوگناں کے قرب و جوار پر از سر نو قبضہ کر لیا۔ لیکن دوسرے ہی سال چارلس اپنے حلیف لیوٹ پرانڈ شاہ لومبارڈس[۴۱] اور بہت بڑی فوج کو لے کر پھر پہنچ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے نہ صرف اپنے کھوئے ہوئے علاقہ ہی کو پھر لے لیا، بلکہ آرلیس پر بھی قبضہ کیا، جو اب تک محفوظ تھا، اور شہر قینئین کو دریائے رہون کے پار نکال دیا، جو آیندہ اُن کے سلطنت کی مغربی سرحد بن گیا۔ اس کے بعد اُن کو پھر اُس کے پار اُترنا نصیب نہ ہوا۔

غداری کا مادہ تو جزیرہ نمائے اندلس میں ہمیشہ سے تھا ہی، امیر عقبہ کی غیر حاضری میں کھلی کھلی بغاوت ہو گئی۔ ابھی وہ آنے بھی نہ پائے تھے کہ وہاں کے سازش کنندوں نے اُن کا ایک رقیب پیدا کر دیا۔ عبدالملک ابن قطن، جو پہلے امیر رہ چکے تھے، انہوں نے اُن کے عہدہ کو غصب کرنا چاہا۔ اس کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی تو عبدالملک کو اپنے مد مقابل کے کارکسوں میں مر جانے سے اور بھی تقویت ہو گئی۔

اب ہم ساحل افریقیہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جس کا اثر اول سے آخر تک اسلامی سلطنت یورپ پر نہایت غیر معمولی اور سخت زبون پڑتا رہا ہے۔ نافرمانی بربریوں کی طبیعت ثانیہ تھی۔ نہ وہ قانون کی پابندی کر سکتے تھے نہ متمدن بن کر کہیں بسنا چاہتے تھے۔ بڑے بڑے جابر سپہ سالار اور بڑے بڑے عقیل مدبر تھک گئے مگر وہ ہی کسی طرح

قابو میں نہ آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے عنصر نے جو بہت ہی غالب تھا، برابرہ کو منہ نہیں لگایا، اور ان وحشیوں کو کسی طرح اپنے ساتھ نہ ملایا؛ کیونکہ وہ سواء جبر و تشدد کے کسی کا رعب نہ مانتے تھے۔ عربوں نے ان پر سخت ٹیکس لگائے، جس کی وجہ کچھ تو طمع نفسانی تھی، اور کچھ منافرت قومی۔ برابرہ کہنے کو تو افریقیہ میں سر اٹھاتے تھے، مگر اس کا اثر، بوجہ آمد و شد اور تعلقات رشتہ داری کے، اندلس پر جا کر پڑتا تھا۔ یہاں چونکہ اصول سلطنت میں سختی داخل نہ تھی، اس لئے ان کو سرکشی کا اچھا موقعہ ملتا تھا، اور وہ محفوظ بھی رہتے۔ ساتھ ہی ان کی جمعیت بھی اچھی ہو جاتی تھی۔

موجودہ عامل افریقیہ، عبید اللہ، کو بہ نسبت اپنے اور ہم وطنوں کے، بربریوں سے اور بھی زیادہ نفرت تھی۔ عبید اللہ عربوں کے صحیح نمونہ تھے، ملک شام کے بہترین مدارس میں انہوں نے تعلیم پائی تھی، نہایت ہوشیار تھے، اور معاملات دینی میں سخت متعصب۔ وہ ان قبایل افریقیہ کے غیر متمدن قوموں کو غلاموں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ جب وہ مصر میں محکمۂ محاصل کے حاکم اعلےٰ تھے تو قبطیوں پر اس لئے محصول بڑھایا تھا کہ وہ کافر ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انہوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ان کے زمانۂ حکومت میں بربریوں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی تھی۔ ان کی سب سے بڑی دولت ان کی بھیڑ بکریاں تھیں، وہی پکڑ کر ذبح کر ڈالی گئیں، اور ان کا اون امراء دمشق کی پر تکلف توشکوں کے لئے بھیج دیا گیا۔ ان کی عورتوں کو پکڑ کر قاہرہ اور انطاکیہ کے بازاروں میں بھیج دیا گیا۔ ان پر ٹیکس دوگنا کر دیا گیا۔ اس گورنر کی نگاہ میں کفار کی زندگی جنگلی جانور سے بھی زیادہ ذلیل تھی۔ ان کے نزدیک وہ اگر زندہ رہتے تو ذلیل ہو کر، ورنہ ان کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ان کی جان حکام کے ہاتھ میں تھی۔ بربریوں کی شکایات روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھیں، اور ان پر جو سختیاں ہو رہی تھیں وہ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھیں۔ جیسے جیسے ان پر

سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ اُن میں آزادی اور انتقام کا خیال بڑھتا چلا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو قبایل بربر بظاہر مسلمان تھے، مگر فی الحقیقت دل سے بت پرست اور جادوگروں اور شعبدہ بازوں کے ہاتھ کا کھلونا۔ تمام قوم پروہتوں یعنی سپیرو فال ربّالیوں، شعبدہ بازوں اور جادوگروں کی گرفت میں تھی۔ ان میں سے جو مکّار مرجاتا تھا اُس میں اتنی قدرت پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ ہر مصیبت کو ٹال سکتا تھا اور اُس ذات واحد سے بھی زیادہ سمجھا جاتا تھا جو قادرِ مطلق ہے۔ رفتہ رفتہ مدینہ کے جلاوطن اور ایرانیوں کے جوش مذہبی سے اس بدترین بت پرستی کی جگہ اسلام کی سادہ تعلیم پھیل گئی۔ اور بربریوں میں وہ جوشِ مذہبی پیدا ہو گیا جو صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین) میں تھا۔ وہ طعنہ زن اور مہذب عرب جو شام میں رہتے تھے (جن میں سے ایک عامل افریقیہ بھی تھے) از روءِ نسب خود کافر تھے، اور اُن کے معتقدات بھی اُن ہی سے ملتے جُلتے تھے۔ بربری اُن کو نیکیوں کے دشمن، بدیوں کے حامی اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے بدنام کرنے والے سمجھتے تھے، اور اُن کو تباہ کر دینا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ یہ انقلابی خیالات افریقیہ میں پھیلے، اور بہت پسند کئے گئے۔ یہاں سے اندلس کے آبادکاروں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اس ملک میں ان کا اثر ملک کے ہر نظام پر بہت بڑا پڑنے والا تھا، اور پڑا۔ چنانچہ اس نے بہت جلد اہم سیاسی نتائج پیدا کر دیئے۔ بربریوں میں وہ غیظ و غضب پیدا ہو گیا جو کسی طرح ٹھنڈا ہونے والا نہ تھا۔ اُن کو صرف ایک موزوں موقعہ کا انتظار تھا کہ اتنی بڑی بغاوت کریں کہ اُس وقت تک افریقیہ کی اسلامی حکومت میں نہ ہوئی ہوگی۔ ۷۴۰ء میں باشندگان تنجیر سے کچھ زیادہ ٹیکس طلب کیا گیا۔ ان کے تعلقات چونکہ کوہستان کے وحشیوں سے چلے آتے تھے اس لئے یہ اب تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ فوج کی ایک بڑی جمعیت اُس وقت صقلیہ میں بھیجی جا چکی تھی۔ بربری اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ہر جگہ اپنے ظالم آقاؤں کے مقابلہ میں

شمشیر بکف اُٹھ کھڑے ہوئے اور تنجیر پر ٹوٹ پڑے۔ سواحل بحر پر جتنے شہر تھے، سب سے محافظ فوج کو نکال باہر کیا، اپنا ایک بادشاہ انتخاب کر لیا، اور جتنی فوجیں اُن کے مقابلہ کے لئے آتی گئیں اُن کو پے در پے شکستیں دیتے گئے۔ امیر المومنین کا غرور تاج و تخت بھلا اس کو کب گوارا کر سکتا تھا! اُنہوں نے ان باغیوں کے خلاف ایک بہت ہی بڑی جمعیت بھیجی۔ اس کی تعداد ستر ہزار تھی، بلج ابن بشر جیسے نامور شامی سپہ لار تھے اُن کو یہ حکم تھا کہ جو شخص اُن کے ہاتھ آجائے اُس کو زندہ نہ چھوڑیں، اور فوج کو ہر طرح کی لوٹ مار کی اجازت دیدیں۔ اُنہوں نے مغرب کی طرف رُخ کیا اور بلویہ کے میدان میں بربریوں سے مقابلہ پڑا۔ امیر المومنین کی فوج نے ان نیم برہنہ لوگوں، اور ان کے بھونڈ ہتھیاروں کو دیکھ کر ان کو نظر حقارت سے دیکھا، اور یہ سمجھا کہ ان لوگوں کو زیر کر لینا نہایت آسان بات ہے مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اُن وحشیوں کی ہمت و استقلال اور نظام فوجی ہتھیار کا کام دیتی ہے؛ چنانچہ شامیوں کو شکست فاش ہوئی اور اُن کے دو تہائی آدمی وہیں کھیت رہے۔ بلج کے دس ہزار کے قریب سوار کسی نہ کسی طرح دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل گئے اور سبتہ میں جا پہنچے۔ بربری یہ جانتے تھے کہ اس مقام کو فتح کرنا ناممکن ہے، اس لئے اُنہوں نے گردو نواح میں میلوں تک تباہی پھیلادی، اور ہر طرف سے سبتہ کا محاصرہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ شامی وہاں سے نکل سکتے تھے اور نہ اُن کو رسد پہنچ سکتی تھی۔ سوا اسکے چارہ نہ تھا کہ وہ بھوکوں کے مارے سسک سسک کر جان دیں۔

عبدالملک، امیر اندلس، مدینہ کے رہنے والے تھے۔ پچاس برس پہلے وہ جنگ حرّہ میں بہت کچھ نام پیدا کر چکے تھے۔ اس لڑائی کی غرض و غایت یہ تھی کہ مدینہ شریف پر قبضہ کر لیا جائے اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنا لیا جائے یا جلا وطن کر دیا جائے ان سے شامی سپہ لار نے ہزار چاہا کہ آبنا سے عبور کرنے کے لئے جہازوں کا انتظام

کو دیں، مگر یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ عبد الملک کا بدن اُن زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا جو جنگ حرّہ میں لگے تھے۔ اُنہوں نے اپنے خاندان اور اپنے ہمسایوں کو اپنی آنکھ سے ذبح ہوتے دیکھا تھا! اُن کو بیٹھے بٹھائے شامیوں سے انتقام لینے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا۔ اُنہوں نے نہ صرف جہازوں ہی کا انتظام نہ کیا بلکہ سخت احکام جاری کر دیئے کہ بدقسمت شامیوں کے ہاتھ کوئی جنس فروخت نہ کیجائے۔ قرطبہ کے ایک دولتمند آدمی زیاد بن عمروؔ نے جو شامیوں کی مصیبت کا حال سُنا تو اُن کو بہت ہی رحم آیا، اور اُنہوں نے دو جہاز رسد کے اُن کے لئے بھیجنے کو تیار کئے۔ اس کی خبر امیر کو پہنچی تو اُنہوں نے پہلے زیاد کو گرفتار کیا، پھر اُن کی آنکھیں نکلوا ڈالیں، اور آخر خلاف ورزی احکام کی سزا میں ایک کتّے کے ساتھ اُن کو سولی پر چڑھا دیا۔ یہ ایسی ذلیل سزا تھی جو بدترین مجرموں کو دی جایا کرتی تھی +

بربریوں کی شاہی فوج پر فتح کی خبر اُن کے ہم قوموں نے بڑے فخر سے سنی، اور تمام اندلس کے بربری بہت ہی خوش ہوئے۔ واعظین کی کوششوں، اور نو مسلموں کے جوش دینی، نے باشندگان شمال میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ان میں زیادہ تعداد افریقیوں کی تھی۔ اُن میں وہ جوش پیدا ہُوا کہ جس کے سیلاب کے سامنے کوئی چیز ٹھیرنے والی نہ تھی۔ اراغون، جلیقیہ اور الیسٹریمیڈورا کے بربری یک لخت تلواریں لے لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی جمعیت کو ایک ہی جگہ فراہم کیا اور اپنے ہی افسر مقرر کر لئے۔ اپنی تمام فوج کو تین حصوں میں منقسم کر کے وہ امیر اندلس کی دار الامارت ہی میں اُن سے پوچھنے لگے کہ "آپ کو یہاں رہنے کا کیا حق ہے" ایک حصۂ فوج قرطبہ کو روانہ ہُوا، دوسرے نے طلیطلہ کی طرف کوچ کیا، تیسرے نے الجزیرہ کی طرف رُخ کیا، تاکہ وہ جہازوں پر قبضہ کر سکیں، اور اُن میں بیٹھ کر شامیوں کا ستبہ میں جا کر قتل عام کریں، اور پھر اتنی کافی جمعیت بہم پہنچائیں کہ اندلس کے متکبر عرب رؤساء کو تباہ کر دیں، اور بربریوں کی

سلطنت جداگانہ قائم کرلیں، جس کا مذہب اگرچہ اسلام ہو مگر نئی قسم کا اور سخت متعصب
اب پھر وہی عجیب غریب تضاد اور قومی تخالف بر روۓکار آتا ہے جو ہمیشہ ہر ایک
کے لئے جانی دشمن ثابت ہو چکا ہے۔ عبد الملک کی حالت جب بہت ہی نازک ہوگئی تو
اُنہوں نے اپنے دشمن شامیوں سے مدد مانگی، جن سے ان کو اپنی باغی رعایا سے بھی
زیادہ نفرت تھی۔ شامی بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی نسبت عبد الملک کے کیا
خیالات ہیں، اور ان کو کیا شدید ضرورتیں اس استمداد کی داعی ہوئی ہیں۔ فوراً ایک معاہدہ
ہوا، جسکے موافق شامیوں کو اندلس میں آنے کی اجازت دی گئی، اور ان کا یہ فرض قرار
دیا گیا کہ وہ اس بغاوت کو بجبر فرو کریں، اور اس کے بعد وہ افریقیہ کے اُن مقامات
کو لوٹ جائیں جو امیر المومنین کی ربقۂ اطاعت میں تھے۔ چند نیم جان افسران فوج
بطور یرغمال پیش کئے گئے۔ امیر اندلس کی پالیسی اور لوگوں کی ہمدردی سے اُنہوں نے
یہاں آکر پیٹ بھر کھانا کھایا، کپڑے اور ہتھیار پائے، تب کہیں اُن کی جان میں
جان آئی۔ اِن ہی تجربہ کار آزمودہ افسران فوج کی طفیل میں عبد الملک کی فوج
نے بہت آسانی کے ساتھ بربریوں کے تینوں فوجی گروہوں کو شکستیں دیں جو کچھ اُنہوں
نے لوٹا تھا وہ اہالی اندلس کے پھر ہاتھ آگیا، اور اُسکے ساتھ ہی ان کا بہت سا علاقہ۔
عبد الملک کو جب بربریوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب اُن کو یہ فکر لگا کہ کسی طرح ان
نئے حلیفوں کو ملک بدر کرنا چاہیئے، کیونکہ شامیوں کو جو کامیابیاں ہوئیں تھیں اُس سے
وہ اور بھی طاقتور ہو گئے تھے۔ مگر اندلس کی کششات اور دولت ایسی نہ تھی کہ شامی بخوشی خاطر
وہاں سے چلے جاتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اُنہوں نے اتنی دولت جمع کی تھی، اور یہی وہ سرزمین
تھی جہاں اُن کی کشش و کوشش نے اُن کو اتنا نامور کیا تھا۔ امیر اندلس اور اُن کے درمیان
جو معاہدہ ہوا تھا اُسکے معانی و مطلب پر دونوں فریق میں تنازع ہو پڑا۔ شامی سپہ سالار کو
اپنی طاقت پر غرّہ تھا، اُنہوں نے عبد الملک سے اس طرح گفتگو کی کہ اُن کو غصہ آگیا، اور

اُنہوں نے موقعہ و محل دیکھ کر عبدالملک کو دارالامارت سے نکال باہر کیا۔ بلج اُجن کو ان ہی نے عامل کرایا تھا، فوراً وہاں سے روانہ ہوئے، اور اپنے نئے فتوحات کی خبر پہنچائی۔ الجزیرہ کے قریب جو لوگ گویا مقید تھے وہ رہا کر دیئے گئے۔ اُنہوں نے جو اپنے ساتھ بدسلوکیوں کی خبر اوروں کو سنائیں تو اُن کو بہت ہی غصہ آیا۔ اِدھر اُنہوں نے اپنا قصہ سنایا کہ جب سبتہ میں گھرے ہوئے تھے تو عبدالملک نے اُن کے ساتھ وہ سلوک کیا جو انسان کو انسان کے ساتھ کرنا چاہیئے تھا۔ سب نے متفق اللفظ بلند آواز سے امیر کو قتل کروا لینے کا مطالبہ کیا۔ شامی افسروں نے ہزار چاہا کہ اپنے آدمیوں کے جوش کو روکیں، مگر ان کے بنائے کچھ نہ بنا؛ ایک جمِ غفیر محل میں گھس گیا، امیر کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا، اور شہر کے باہر قرطبہ کے پل پر ایک کتے اور ایک سور کے درمیان میں اُن کو سولی دیدی۔ غرض اس خواری کے ساتھ وہ آزمودہ کار سپاہی اس جہان فانی سے اُٹھ گیا، جو بجا طور پر یہ ناز کر سکتا تھا کہ اُس کی رگوں میں قریش کا خالص خون ہے، جس نے تین نسلوں کے عجیب و غریب انقلابات دیکھے تھے، جس نے اسلامی علم کے نیچے عرب، مصر، المغرب، فرانس اور اندلس میں کارہاء نمایاں کئے تھے؛ جس نے مدینہ میں جناب رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مضجع مبارک کی حفاظت میں زخم کھائے تھے؛ چارلس مارٹل کی مغرق باآہن فوج کا کنارہ رہون پر مقابلہ کیا تھا؛ جس کے ہاتھ میں جزیرہ نماء اندلس کی حکومت دو مرتبہ رہی تھی؛ اور جو ایسی عمر کو پہنچ گیا تھا کہ جب لوگ آرام کے لئے خلوت گزیں ہو جاتے ہیں، مگر اس نامور سپاہی کے قواءاب بھی ایسے مضبوط، اور حواس ایسے درست تھے کہ وہ اتنے بڑے ملک کا انتظام کر رہا تھا، اور اب اپنی ہی حماقت سے باہمی دشمنی کا شکار ہو گیا (برد اللہ مضجعہ) اپنے غیظ و غضب میں شامیوں نے نہ امیر کے درجہ و رتبہ کا خیال کیا، نہ اُن کی اور اُن کے رفقاء کی قومیت و قبیلہ کا لحاظ کیا، نہ یہ دیکھا کہ اُن کا جرم کتنا ہے۔ اُن کا یہ فعل، اگر اخلاق سے قطع نظر کر لی جائے تو نہایت

بیہودہ اور انقلاب پسندوں کے لئے بہت ہی مضر تھا۔ شامی اندلس میں بالکل بے یار و مددگار تھے۔ عبد الملک کے بیٹوں نے، جو شمالی علاقہ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھے، بہت بڑی فوج جمع کر لی؛ والی ماربون نے اُن کو مدد دی، اور بے اصول بربری بہت زیادہ تعداد میں، اپنے پُرانے دشمنوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

قُرطبہ کے قریب، ایک چھوٹے سے گاؤں میں، عرب اور بربری متفقہ فوج نے ان غیر ملکیوں پر حملہ کیا، جو اپنی معاونت کے لئے بہت سے جرائم پیشہ اور اشتہاری مجرموں کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ اگرچہ اس لڑائی میں شامیوں ہی کو فتح ہوئی، لیکن اس میں بلج کام آئے جو گورنر ناربون کے ہاتھ سے زخمی ہوئے تھے۔ شامیوں نے ثعلبہ ابن سلامتہ الجذامی کو امیر اندلس مقرر کر لیا۔ دربار دمشق سے بھی بہت جلد منظوری آ گئی۔ یہ شخص گویا ایک درندہ تھا؛ اُن کا دامن ہمیشہ مظلوموں کے خون سے رنگین رہا ہے! اُن کے تمام افعال انسانیت کے خلاف تھے؛ اُن کے سپاہیوں سے کسی کو کہیں پناہ نہ تھی۔ حالانکہ ہر ظالم و جابر شخص خواتین اور معصومین کی حرمت کا خیال رکھتے ہیں، مگر انہوں نے اپنے مخالفین کی بیوی بچوں تک کو غلام بنا ڈالا۔ اس سے پہلے جو لوگ پکڑے گئے تھے اُن پر بے رحمیوں کی مشق کی گئی، اور سخت ذلیل کر کے قُرطبہ کے دروازے پر نیلام کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ نمود کے آدمی مدینہ کے رہنے والے رؤساء تھے۔ جب یہ لوگ نیلام ہونے لگے تو ثعلبہ نے اُن کو ذلیل کرنے کی یہ ترکیب کی کہ اُن کو اُن لوگوں کے ہاتھ فروخت کیا جنہوں نے سب سے کم قیمت کی بولی دی۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ناپاک ترین جانوروں کے مقابلہ میں اُن کو فروخت کیا۔ اس کی اُنہوں نے کچھ پرواہ نہیں کی کہ یہ لوگ مہاجرین و انصار کی اولاد ہیں اور رؤساء عرب ہیں۔ کرنے کو تو وہ یہ کر گئے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کا تو کیا ذکر ہے خود ان ہی کے آدمی ان سے ناخوش ہو گئے۔ اُن بیچاروں کو ایسے آدمی سے کوئی اُمید بہبود تھی ہی نہیں جسکو نہ قانون جنگ کا لحاظ تھا،

نہ معاہدات کی پروا۔ لوگوں نے ثعلبہ کی شکایت عامل افریقیہ سے کی تو اُنہوں نے ابوالخطار حسام ابن ضرار الکلبی کو امیر اندلس مقرر کر کے بھیجا۔ وہ ایسے وقت پہنچے کہ بدقسمت بربریوں کو اُنہوں نے ثعلبہ کے پنجہ سے بچا لیا۔ ان میں بہت سے مسلمان تھے اور ان سب کے قتل کرنے کے لئے ایک صف باندھی جا چکی تھی۔ اُنہوں نے بہت جلد اپنے اختیارات کو دکھلانا شروع کر دیا۔ باغیوں کے سرکردوں کو جلا وطن کرایا، عوام الناس میں معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ جو علاقے کہ اب تک غیر آباد تھے اُن کو آباد کرایا، جو اجنبی لوگ وہاں آ گئے تھے اُن کو بیت المال سے امداد دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں امن و امان ہوگیا اس سے پہلے ایک یہ پالیسی قرار دی گئی تھی کہ مختلف آباد کار اُن اضلاع میں آباد کئے جائیں جو از روئے آب ہوا وغیرہ اُن کے وطن اصلی سے مماثل ہوں۔ اس ترکیب سے ایک یہ بھی فائدہ تھا کہ شریر النفس لوگ ایک دوسرے سے جدا رہیں، اُن کو اختلاط کا موقعہ نہ ملے اور وہ ایک دوسرے سے کسی خاص معاملہ میں مل نہ بیٹھیں اسی سے سلطنت کو استحکام کی اُمید ہو سکتی تھی۔

ابوالخطار نے امارت کا جایزہ لینے کے ایک ماہ بعد تک تو نہایت فیاضی اور استقلال دکھلایا، جو موجودہ صورت میں قریباً ناممکن تھا۔ لیکن آخر اُن کے رفقا اور ہمدردوں کو اپنا انتقام لینا تھا۔ امیر میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے اعزا کے بیہودہ مطالبوں کو رد کر سکیں۔ ایک مقدمہ میں عدالت نے ناانصافی کی جس سے لوگ ناراض ہوئے اور حاکم عدالت کی ہتک کی گئی۔ اس کا نتیجہ خون ریزی ہوا۔ اولاد معد شمشیر بکف ہوگئی۔ اندلس پھر اسی حالت پر آگیا جو اس کی معمولی حالت ہوگئی تھی۔ صمیل* اور ثعلبہ دو افسران فوجی بڑے نمود کے آدمی تھے۔ اس وقت ان ہی کا وہاں اقتدار ہوگیا تھا۔ امیر کو قید کر دیا گیا، مگر لوگوں نے اُن کو رہا کرا دیا۔ کئی مرتبہ اُنہوں نے

---

* صمیل بن حاتم بن شمر بن ذی الجوشن۔ (مترجم)

اپنی امارت حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے، اور آخر قتل کر دئیے گئے۔ اولادِ معاویہ نے جب اپنے مخالف امیر کو زیر کر لیا تو انہوں نے اپنا خوب ہی انتقام لیا اور دل کھول کر ظلم و ستم کئے۔ انجام یہ ہُوا کہ حالت اتنی زبون ہو گئی کہ جس کو رعایا گوارا نہ کر سکی۔ دمشق سے بھی کسی کے تقرر کی اُمید نہ تھی، کیونکہ وہاں کی یہ کیفیت تھی کہ دو فریق تختِ خلافت کے لئے زور آزمائیاں کر رہے تھے۔ آخر ایک مجلس شوریٰ مقرر کی گئی۔ اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ یوسف ابن عبدالرحمٰن الفہری کو امیر بنا لیا جائے۔

اس امیر نے کئی سال متواتر، فرانس میں نہایت اچھی خدمات کی تھیں، اُن کے فیصلے ہمیشہ بے رو و رعایت ہُوا کرتے تھے، اُن کی شجاعت مشہور ہو چکی تھی، اُن کے جتنے ہمعصر تھے وہ اُن کا بہت ادب کرتے تھے، از روئے حسب و نسب وہ بہت معزز تھے، اُن کی صورت شکل بھی دلکش تھی، اُن کے اخلاق نہایت وسیع اور خود دارانہ تھے، چارلس مارٹل کے حملوں سے اُن ہی نے ناربون کو بچایا تھا، وہی اُس مقام پر مقابل ہوئے تھے۔ چارلس مارٹل نے اُن کو ہزار ترکیبوں سے اپنے ساتھ ملانا چاہا، مگر وہ اتنے دیانتدار تھے کہ اُس کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ لیکن اس وقت جو وہ اس عہدہ پر مقرر ہوئے ہیں، تو اس میں نہ ان کی پچھلی خدمات کا لحاظ کیا گیا تھا، نہ اُن کی ذاتی قابلیت کو دیکھا گیا تھا بلکہ سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی گئی تھی کہ جب اندلس میں اس مرتبہ ابتری پھیلی ہے تو وہ وہاں نہ تھے، نہ کسی فریق کا انہوں نے ساتھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص نے اُن کو اپنا ناجی اور امن و امان کا علم بردار سمجھا۔ یہ ایسی اچھی پالیسی تھی کہ ہر شخص خوش ہو گیا، اور دمشق اور مدینہ کے لوگوں میں جو فرقہ بندی تھی وہ بھی تھوڑے عرصہ کے لئے ختم ہو گئی۔ بربریوں کی شرارت بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔ جس سے وہاں امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی اور لوگوں میں وہ ترفہ پیدا ہونے لگا جس کی دھندلی سی یاد باقی رہ گئی تھی۔ اگرچہ یہ انتخاب بلا استصواب دارالخلافہ دمشق کیا گیا تھا، مگر امیر المومنین نے منظوری دیدی۔ انہوں نے

نہایت عقلمندی کی کہ لوگوں کے اس فعل کو، جو آزادی اور مطلق العنانی سے کم نہ تھی، یوں چھپا لیا۔

موجودہ اصول و حالت سلطنت کے موافق جزیرہ نماء اندلس کی کیفیت لاعلاج سی ہو گئی تھی۔ یوسف نے اپنی تمام عقل اور اپنا تمام تجربہ اس پر ختم کر دیا کہ کسی طرح سرحدی قصۂ و قضایا کو طے کر دیں، اور اُس خیال انتقام کو لوگوں کے دلوں سے نکال دیں جو پشتہا پشت کی نفرت و عداوت سے اُن کی طبیعت ثانیہ ہو گیا تھا۔ یکایک سپٹی مینیا میں بغاوت ہو گئی۔ یہ وہ صوبہ تھا جو اب تک ان آفات سے محفوظ تھا۔ اس بغاوت کے سرگروہ ایک شخص احمد ابن عمرو نامی، والی اشبیلیہ، تھے۔ یوسف نے اُن کو امیر البحری سے تبدیل کر کے والی بنا دیا تھا۔ یہ قریشی النسل تھے، اور ان کی اتنی جائداد تھی کہ خود امیر اُن کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خود امیر بننا چاہتے تھے۔ اُن کے خاندان کو شروع اسلام سے اس وسیع حقبہ کے ساتھ تعلق رہا ہے، کیونکہ یہ اُن صحابی کے پرپوتے تھے جو جنگ بدر میں حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے علم بردار تھے۔ اُن میں غیر معمولی قابلیت تھی، اُس پر اُن کی دولتمندی اور طاقت نے اور بھی چار چاند لگا رکھے تھے۔ اُنہوں نے یہ ظاہر کیا کہ بنو عباس نے اُن کو اندلس کا امیر مقرر کیا ہے۔ اہالی ایسٹریاس اپنے دشمنوں کے آپس میں عناد و فساد دیکھ کر اپنے پہاڑوں کی کھوؤں سے نکل آئے، اور صوبجات جنوبی میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ تمام ملک میں نائرۂ جنگ مشتعل ہو گیا۔ تمام قسم کے پیشہ وروں نے اپنے اپنے کام چھوڑ کر تلواریں اُٹھا لیں۔ چرواہوں سے بھیڑ بکریاں چھین لی گئیں۔ لہلہاتے ہوئے کھیت بنجر ہو گئے۔ ہر طرف احتیاج کی پکار تھی، اور مصیبت کا شور و بکا محل سے لیکر جھونپڑے تک سے یا آہوں کی آوازیں آتی تھیں یا مرنے والوں کی حرکت نزع ہی دکھلائی دیتی تھی۔ حملہ آوروں اور قزاقوں کی وجہ سے ایک شہر سے دوسرے تک پہنچنے کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ اس وقت

کون امیر ہے اور کون نہیں۔ عیسائیوں کو اسی میں دقت پڑ رہی تھی کہ کس کو جزیہ ادا کریں اور کسکو نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان غریبوں سے دوبارہ بلکہ سہ بارہ جزیہ وصول کر لیا جاتا تھا۔ جب سے کہ گاتھ نے سپین پر حملہ کیا ہے اُس وقت سے لے کر اب تک یہ بدنظمی، یہ اختلال اور یہ تمدنی خرابیاں کبھی یہاں نہیں پھیلیں، جیسی کہ اس وقت کی کیفیت تھی۔ آخر چند شامی سرداران قوم نے اس پریشانی کا یوں سدباب کیا کہ ایک نیا امیر مقرر کر دیا، اور اس خاندان، یعنی بنو امیہ کو بر روئے کار لے آئے کہ جو اسلام کے سفید دامن پر دھبہ اور بدنام کنندۂ نکو نامے چند تھے۔

تاریخ اندلس، زیر حکومت امرا، ایک افسوسناک غم آلود منظر پیش کرتی ہے۔ امراء "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" دیکھے ہیں آید و دیگر ہمی رود" کے مصداق تھے۔ امراء نہ تھے مصیبت و آلام کا نقشہ تھے جو نسلی دشمنی، سیاسی بلند نظری، جوش دینی اور خانگی عداوت کھینچتی رہی ہے۔ ایک عجیب قسم کی بدنظمی، تذبذب، تزلزل، بے اعتمادی اور طمع و آزان کے زمانہ میں پھیلی رہی۔ وہ انقلابات جو خلافت دمشق میں ہوتے رہے ہیں اُن کا بھی قیروان اور قرطبہ پر بہت بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ خلفاء بنو امیہ کو ہمیشہ اپنی جان کا خوف رہتا تھا۔ جن طریقوں اور تدبیروں سے انہوں نے عروج پایا۔ اُن ہی سے بعض اُن کے تنزل کا باعث ہو گئیں۔ جو آج قاتل تھا۔ وہی کل کو مقتول بنا۔ اُن کی ذات سے ہر قسم کی جرائم ہمہ قسم کے عیوب سرزد ہوئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رعایا کی نظروں میں ان کی قدر و منزلت جاتی رہی۔ ظل اللہ و خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے جو اقتدار اُن کا تھا اُسکو بھی سخت نقصان پہنچا۔ حکام و عمال ماتحت کو بھی ناچار وہی بدنامی بھگتنی پڑی جو اُن کے بادشاہ کے نصیب میں لکھی جا چکی تھی۔ امراء اندلس کو دو طرح کی مصیبت تھی وہ عامل افریقیہ کے ماتحت تھے اور ان کا تقرر براہ راست دربار دمشق سے ہوتا تھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ امیر اندلس دو آدمیوں کو جواب دہ تھا، اور دو افسروں کا حکم بردا

اس سے نہ حکومت میں اصلاح ہو سکتی تھی، نہ تمدن میں خوبیاں پیدا ہو سکتی تھیں، نہ اطمینان و آسایش خانگی میسر ہو سکتا تھا۔ باشندگان جزیرہ نما دو عملی کے شکار تھے۔ اُن سے یہ امید ہی رکھنی فضول تھی کہ وہ اُس علاے طاقت کا ادب و احترام کرینگے جو اُن سے تیرہ سو میل کے فاصلہ پر بیٹھی ہوئی اپنا کام کر رہی ہے جو نیا آدمی سر حکومت آتا تھا اُس کے ساتھ نئی قسم کی تکالیف اور چیرہ دستانی آتی تھی۔ یہ لوگ ایسی ایسی چالیں چلتے، اور ایسی ایسی ترکیبیں نکالتے، کہ جو رومی حکام کے فرشتوں کو بھی نہ سوجھتی تھیں۔ جن تدابیر سے کہ وہ اپنی حکومت کو قائم رکھنا چاہتے تھے وہ قابل نفرت ہوتی تھیں۔ جب سیاسی حالات یہ ہوں تو ظاہر ہے کہ وفاداری، اتفاق، اتحاد اور ترقی تجارت ناممکنات سے تھی۔ پُرانی طرز حکومت، جو تین سو برس سے چلی آتی تھی، اُس میں بے طرح دست اندازی ہو چکی تھی۔ اگر حالات مساعد ہوتے تب بھی نئی حکومت کا قائم کرنا، اور نیا نظام بنانا، نئی قسم کا تمدن قائم کرنا، سخت دقت کا کام اور خطرناک ہوتا۔ اس میں کلام نہیں کہ وزیگاتھ کی سلطنت جاتی رہی تھی، مگر اُن کے قومی جذبات، اُن کا مذہب اور اُن کی روایات، ابھی تک باقی تھیں۔ امراء مملکت اگر بدلتے تھے تو یکایک، اور بہت جلد۔ اگر بحساب اوسط دیکھا جائے تو ہر ایک امیر ٹھیک ستائیس برس بر سر حکومت رہا۔ غیر ملکیوں پر جو مصائب پڑے اُس کی اگر کوئی غیر ملکی بھی اصلاح کرنا چاہتا تو ایک بہت ہی بڑے سیاست دان اور عقیل و فہیم کی ضرورت ہوتی، اور وہ بھی اس کو آسانی نہیں، بلکہ انتہا سے زیادہ مشکلوں کے ساتھ کر سکتا۔ مگر یہاں تو اسی پر بس نہ تھا مختلف الخیال و مختلف الاوضاع لوگوں کے متضاد اغراض میں کسی طرح اسلوب پیدا کرنا تھا۔ ان وحشیوں کے مطالبات کو بلطایف الحیل ٹالنا، یا منظور کرنا تھا، جو اپنی مرضی کے برخلاف کسی بات کو سننے یا ماننے کے عادی نہ تھے۔ اہم امور سیاسی، اور مختلف ملل و مذاہب کے مقتداؤں کے تنازعات باہمی کا فیصلہ کرنا تھا، اصل و نسل کے لحاظ سے مدارج، فوجی خدمات کے خیال سے مراتب، اور تمدنی

حیثیت کے موافق حقوق و فرائض قائم کرتے تھے۔ عربوں کی منجمد طبیعت اُن کا فرضی تفوق، قبیلہ قبیلہ کی کسی طرح نہ فرو ہونے والی آتش عناد و عداوت، اُن حقوق و فرائض کی نگہداشت کہ جو بروئے معاہدہ و مواثیق مابین فاتح و مفتوح ہوئے تھے یہ اور اسی قسم کی ہزاروں مشکلات تھیں جو بادشاہ یا حاکم کے راستہ میں حائل تھیں۔ لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہر وقت اور ہر آن، ملک میں فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ امیر المومنین کی صولت و حکومت کا اثر یہاں برائے نام تھا اُن کی طرف اگر کبھی کسی کا خیال جاتا تھا۔ تو اُس وقت کہ جب کوئی بغاوت ہو جاتی تھی یا جب کوئی گروہ امیر کی حکومت سے نالاں ہوتا تھا لیکن باوصف ان تمام فتنوں کے جن میں سے ایک ایک بجاء خود ایک پہاڑ تھا، عربوں کا جو ہر دماغی کچھ ایسا قوی واقع ہُوا تھا کہ وہ شوارع تہذیب و تمدن پر تیزی کے ساتھ گام زن تھے۔ برعکس ان کے جامد و سست وحشی باشندگانِ شمال، جو بظاہر اسباب عربوں سے کچھ کم جاہل نہ تھے اپنے اُسی خواب خرگوش میں تھے، اور جہاں تھے وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہ ہلے تھے اندلس زیر حکومت اسلامی پچاس سال کے اندر اندر تہذیب کے اُس نقطہ پر پہنچ گیا کہ جہاں تک اٹلی کو زیر حکومت پوپ پہنچنے میں ایک ہزار برس لگے تھے۔ کسی چیز کو ضبط کرنے صحیح استعمال کرنے اختراع کرنے اُس میں نشو و نما کرنے اور ترمیم کرنے میں عربوں کا دماغ ایسا تھا کہ جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ خلفاء دمشق کی رعایا اتنے مختلف اور مخالف عناصر پر مشتمل تھی، اور ان کی حکومت اتنے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی، کہ سلطنت رومتہ الکبرےٰ کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ جو رشتۂ اتحاد و اخوت قرآن شریف نے دنیا بھر میں قائم کیا تھا، جو تعلقات کہ ضروریات تجارت نے اُن کے درمیان میں قائم کئے تھے، جو اختلاط و محبت کہ حج حرمین شریفین نے بڑھائی تھی۔ اُن سے مسلمانان ایشیا، افریقیہ اور یورپ کی آنکھیں کھل گئی تھیں، اور اُن کے دلوں کی عجیب طرح نشو و نما ہو گئی تھی۔ ان سب سے بڑھ کر جس چیز کا بہترین اثر اُن پر پڑا وہ اُن کا جہاد تھا کہ جس کا سلسلہ قریباً ہر وقت

اور ہر زمانہ میں قائم رہا۔ جنگ ایسی چیز ہے کہ اُس کے حالات و واقعات و مناظر آناً فاناً بدلتے رہتے ہیں۔ اُس کی دلچسپیاں اُس میں انہماک اُس کا جوش اُس کے خوف و خطرات اُس کی فتوحات اُس کے ہزایم اور اُسکی کامیابیاں لازمی طور پر فواءد دماغی میں ترقیات پیدا کرتی ہیں؛ مقاصد و اسباب صداقت میں مددگار ہوتی ہیں؛ اور ہر قسم کے مفید علوم کو بڑھاتی ہیں جب مسلمان سپین میں آئے ہیں تو اُن فوائد سے مستفید ہو کر آئے تھے جو سفر اسبق تجربات سابقہ اور فتوحات سے پہنچ سکتے ہیں۔ زمانۂ حکومت امارت میں ان کا اثر خونخوار اور وحشی بربریوں کی وجہ سے اکثر معطل ہو جاتا تھا۔ یہ لوگ اس بات کو کبھی نہ بھولتے تھے کہ اُن ہی نے سپین کو فتح کیا ہے؛ اُن ہی کے کہیں نہ رکنے والے سوار تھے جنہوں نے واڈلیٹ (وادلیش) میں وزیگاتھ کی صفوں کو توڑا تھا؛ اُن کے پھرتیلا پن اور اُن کے حملہ کی شدت نے چند ہی ماہ کے عرصہ میں اہالی سپین کو مرعوب اور اتنی بڑی سلطنت کو مغلوب کر لیا تھا۔ فتح کے لطفوں کا مزہ وہ اُٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ اُن کی قوم کے جانی دشمنوں کی طمع نے اُن کے ہاتھ سے اُن کی شجاعت کا ثمر بجبر چھین لیا۔ وہ سپہ سالار جو اُن ہی کا ہموطن اور ہم قوم تھا، قید کیا گیا اور اُسکی بےعزتی کی گئی؛ جو مال مغروقہ انہوں نے حاصل کیا تھا وہ ضبط کر لیا گیا؛ اُن کے جو آدمی متمدن ہو کر با آسائش زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اُن کو سنگلاخ و شورہ بوم لامنکا، اراگون اور جلیقیہ میں پھینکا گیا۔ برخلاف اسکے اعرابِ شام و حجاز کو جنوب کے اُن مشہور علاقوں میں جگہ دی گئی جو زمانہ قدیم میں بہشت کہلاتے تھے۔ اُن لوگوں کے تکبر نے اپنے بربری غلاموں پر وہ ظلم روا رکھے کہ جن سے بڑھ کر بغض و عناد نہیں سمجھا سکتے۔ صرف اتنا معلوم ہو جانا کافی تھا کہ فلاں شخص میں افریقی خون ہے؛ پھر وہ خواہ کیسا ہی قابل سیاست دان اور لائق سپاہی ہو دربار خلافت سے کسی بڑے ذمہ داری کے عہدہ پر مقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ صرف المغرب میں بلکہ اندلس میں بھی حسین نوخیز لڑکیاں والدین سے چھین کر حرم سراء شاہی میں پہنچا دی جاتی تھیں[1]

---

[1] اللہ اکبر! امریکہ کا باشندہ اور یہ شکایت! (مترجم)

نظر بایں حالات، یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ ایک مغرور اور آزاد قوم کے ذکی حاسہ کو ہر نئی توہین سے زخم پر زخم پہنچتے ہوں، اور وہ لوگ قومی عداوت و نفرت کو تازہ کرکے نئی سلطنت کو بیخ و بن سے ہلا دیتے ہوں، اور اپنے اس تبر سے دین تک کو نہ چھوڑتے ہوں۔ اُن کے ہاتھ میں یہ ایسا منحوس ہتھیار تھا کہ جس سے نہ شہروں کے محل محفوظ تھے، نہ جنگل بیابان کے جھونپڑے۔ اسکی دھمکیاں زیرطناب امیر المومنین بھی وہی اثر رکھتی تھیں جو ایک مفلس قلاش کے سامنے ٭

مغربی دنیا کی بہت سی اخلاقی و سیاسی حالت اُس زمانہ کے سپین کے حالات سے مماثل تھی کہ جب یہ ملک تحوّل و تقلّب کی کیفیت میں تھا، یعنی قرطبہ میں خلافت قائم ہونے سے چند روز پیشتر تمام سلطنتیں اور ریاستیں، جو رومی سلطنت کے وسیع تار و پود سے پیوست تھیں کوئی بھی تو ایسی نہ تھی کہ جو اپنے ہمسایہ سے برسر پیکار نہ ہو اور اُن مصایب سے بچی ہو جو مذہبی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں کے بکھیڑوں سے پیدا ہوتی ہیں صنعت اور علم، جو وحشیوں کے دست تظلم سے تھوڑا بہت بچ رہا تھا، اُس نے قسطنطنیہ میں جاکر پناہ لی، جو اس وقت یورپ بھر کا دماغی مرکز بن رہا تھا۔ پرانے زمانہ کے صنعت و حرفت کے نمونے حقارت کے ساتھ اُٹھا کر پھینک دیئے گئے کیونکہ مقتدایان مذہبی کے مواعظ بتوں کے برکات، روزانہ عبادات، آئے دن کی بغاوت اور گاڑیوں کی دوڑیں، نادار اور نامرد بیہر نطینی کو اپنی طرف مشغول رکھتی تھیں۔ ان لوگوں کا چال چلن اتنے عیوب سے پُر تھا کہ ان کو "رومی" کہنا ہی روم کو بدنام کرنا تھا۔ اس شہر کی فتنہ انگیز رعایا وہ تھی کہ جو اپنی مرضی کے موافق بادشاہ سے حکم صادر کرالیتی تھی، فصیل شہر اتنی مضبوط تھی کہ وہ وہاں بے فکری سے زندگی بسر کرتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے مضافات کے باشندوں کو لٹتا ہوا، اور اپنے بادشاہ کی بیحرمتی ایرانیوں، گاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھ سے دیکھی اور خاموش ہو گئے۔ باقی سلطنت میں جو جوہر اور قابلیت تھی اُس کی جگہ وہمیات

اور بے رحمیوں نے لی۔ مگر اسکی تمام عیوب کو چند روز کے لئے لیوڈی ایسورین کی سیاسی خوبیوں نے چھپا لیا۔

اٹلی ہیں عایا کا نقض امن بت شکنوں کے کلمات کفر اور بد امنی نے کیا، جو جمہوری سلطنت قائم ہونے تک باقی رہی۔ اسی فساد کی وجہ سے قوم لمبورڈ کو دخل دینا اور آخر اُن وحشیوں سے احمقانہ تعلقات پیدا کرنے پڑے۔ گریگوری[۴۲] اعظم جیسے پر خشونت پوپ نے اپنا کلیسا کچھ ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا تھا کہ دشمنوں نے ہزار کوشش کی مگر اسکو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا، اور آج تک باقی چلا آ رہا ہے۔ اس مشہور بطریق اعظم نے اپنی دوربینی اور عاقبت اندیشی سے اُس پالیسی کی تائید کی جو گویا الہامی تھی اور از روء خرق عادت زمانۂ قدیم کے علماء کے اقوال کے موافق قائم ہوئی تھی، اور جسکو شہدا اور اولیاء اپنے احکام کے موافق منظور فرما چکے تھے۔

آٹھویں صدی میں یورپ کا کوئی ملک حشت و جہالت کی ایسی صحیح تصویر نہ پیش کر سکتا تھا جیسا کہ برطانیہ۔ رومی، باہمہ عظمت و جلالت، صرف اتنا کر سکے کہ اُس جزیرہ میں عارضی طور پر اپنی بعض مجالس قائم کر دیں۔ حکام روم بمشکل تمام اُن لوگوں کو اپنے قابو میں رکھ سکے جو نہ جبر و جور کو مانتے تھے نہ کسی قسم کی تشویق اُن کو متمدن ہونے کی طرف راغب کر سکتی تھی۔ اگرچہ وہ بے رحمانہ مراسم جو ڈرو ڈ[۴۳] کی پوجا میں ادا کی جاتی تھیں مفقود ہو گئی تھیں، لیکن اٹلی کے شاندار خرافات الاضام نے یہاں کے ذلیل جنگلیوں کے دلوں پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ البتہ اُنہوں نے نہایت خوشی کے ساتھ بکشادہ پیشانی اُن وحشیانہ مراسم کو قبول کر لیا جو سکینڈی نیویا کے ووڈن[۴۴] کی پوجا میں ادا ہوتی تھیں۔ اس بنجر زمین پر رومیوں کی تہذیب افزا جو ہر نے اپنے کوئی مستقل نشانات یا صنعت و حرفت کے نمونہ نہیں چھوڑے۔ رومی بادشاہان عالم نے جو اپنے نقش قدم وہاں چھوڑے تھے وہ اُن مصایب میں مٹ گئے جو برطانیہ پر پانچویں صدی میں پڑے تھے۔ برطانوی سرداران قوم کے بدلے حکومت کے

خرخشہ کی مصیبت میں کون پڑتا؛ اُنہوں نے اپنے جزیرہ کو بدامنی کے حوالہ کیا، اور وہاں سے نکل بھاگے۔ فرقہ بندی اور عناد نے جرمنی کے قزاقان بحری کو اپنی مدد کے لئے بلاکر گویا اپنی شامت کو مدعو کیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ ان قزاقوں نے وہاں دوست دشمن سب کو تباہ کرڈالا۔ اس زمانہ کے متعلق برطانیہ کی تاریخ پر بہت ہی گندہ پردہ پڑا ہؤا ہے لوگوں نے قصہ اور کہانی کو تاریخی واقعات مان لیا ہے۔ مغربی یورپ کے مورخین نے سیکسن لوگوں کی قومی خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ہم کو یہ معلوم ہے کہ برطانیہ کے جنگلیوں کی رسمیں اور سلطنت کے قواعین دونوں موقوف کردی گئی تھیں، سوا نہایت ذلیل بت پرستی کے کوئی طریقہ عبادت نہیں رہ گیا تھا؛ رومیوں نے جو کچھ آثار چھوڑے تھے وہ بالکل مٹ گئے تھے؛ جس مذہب کے اصول اگسٹن نے نہایت فصاحت وبلاغت سے بیان کئے تھے اُن کا نام ونشان بھی مٹ گیا تھا؛ جس فریق نے وحشیوں کا یہ طوفان ملک میں بلایا تھا اُن کا گلا سیکسن کی سلطنت نے ایسا دبایا کہ اُن کی آواز تک نہ نکلنے دی۔ جس جزیرہ کا نام آجکل بنی نوع انسان کے بچے بچے کی زبان پر ہے وہ اُس زمانہ میں زمانۂ قدیم سے بھی زیادہ ایک سربمہر لفافہ بنا ہؤا تھا۔ وہ ملک جسکے اصول حکومت آجکل آزادی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اُن دنوں غلاموں کے خرید کا نہایت مفید بازار بنا ہوا تھا۔ قسطنطنیہ کی مہذب سوسائٹی کے علماء میں مشہور تھا کہ برطانیہ وبائی خوفناک سرزمین ہے۔ وہاں فرانس کے عمر قیدیوں کو مچھیارے اپنی کشتیوں میں بٹھا کر چھوڑ آیا کرتے تھے اس خدمت کے عوض میں اُن کو ٹیکس بہت کم ادا کرنا پڑتا تھا، اور خاص حقوق بھی حاصل تھے۔ گال کے عیش پسند مقتدایان مذہبی اُن غلاموں کو بہت پسند کرتے تھے جو برطانیہ سے آتے تھے کیونکہ وہ ارزاں بھی ملتے تھے اور خدمتگزار بھی ہوتے تھے۔ پادری ہوں، یا راہب اُن کے تقدس میں اس وجہ سے کسی طرح کی کمی آتی تھی کہ اُن کے یہاں غلام رہتے ہیں، یا وہ ان بدقسمتوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں

ان برگشتہ نصیب لوگوں کے یہ منہ بولے والدین انسانیت و آدمیت کے خیالات اور رفق و ملائمت کے جذبات اپنے ذلیل ترین جذبۂ طمع و آز پر قربان کر دیتے تھے۔

سرزمین گال کی اگر عام حالت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکو اس وقت کے سپین سے بہت بڑی مشابہت تھی کہ جب قوم وزیگانھ کا وہاں انتزاع ہو رہا تھا۔ ایک بات میں البتہ تفاوت تھا، وہ بھی ظاہری نہ کہ حقیقی یعنی وہاں کسی بادشاہ کو رعایا نے اپنی وفاداری کے دھوکے میں نہیں رکھا ہوا تھا؛ یہ بات نہ تھی کہ زبان سے وفادار تھے اور دل سے تاج و تخت کے جانی دشمن۔ ایک خاندان کے بادشاہ کٹھ پتلی بنے ہوئے ایک محدود علاقہ پر حکمران تھے، عیش و عشرت کے مزے لوٹ رہے تھے اور شاہی شان و شوکت کو قائم رکھے ہوئے۔ قوم بھر بڑی سخت سپاہی تھی اور خوب سیاست دان گو پڑھے لکھے نہ تھے مگر تیغ زنی بہت اچھی جانتے تھے۔ اپنی قوت بازو، جوش حب الوطنی اور قابلیت سیاسی سے فرانس کی قسمت کو اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھے تھے۔ بجز پادریوں کے، کہ اُن کی تعلیم یوں ہی واجبی سی سطحی ہوتی تھی، تمام ملک تھا کہ انتہاء جہالت کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ شمالی اور مشرقی علاقوں میں بت پرستانِ جرمنی اور سکینڈی نیویا نے دین مسیحی کا بہت کم عمل دخل ہونے دیا۔ باقی مقامات میں ایک عجیب قسم کا بیہودہ مذہب پھیلا ہوا تھا، جس میں بہت سے دیوتاؤں کی پوجا، ذلیل قسم کے توہمات، قوم سیکسن کے لغو مراسم اور ایرین کے کفریات گڈ مڈ تھے۔ مذہب کے یہ بدنما اور بھدے جذبات، جو نہ بت پرستانہ مسامحت کو روا رکھتے تھے، نہ اناجیل کی نیکوکاری کو، اُس وحشی قوم کی روحانیت کے کفیل تھے۔ ایک صوبہ میں تو کھلی کھلی بت پرستی ہوتی ہی تھی، دوسرے میں مسیحیت کا رنگ چڑھتا چلا آتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دونوں قسم کے طریق عباد[ت] پہلو بہ پہلو چلتے تھے۔ جہاں تک گرجا کے گھنٹے کی آواز جاتی تھی، اُسکے اندر ہی اندر ان مصا[حبوں] دیوتاؤں کے قربانگاہوں کا دھواں اُٹھتا رہتا تھا۔ ساحر و جادوگر اپنے مرموز مراسم ادا

کرتے رہتے تھے کسی قربانی کے گرم خون سے کچھ لکھ لکھ کر پیشینگوئیاں کیا کرتے تھے اور لوگوں کی قسمتوں کا حال بتلایا کرتے تھے۔

جب کبھی اور جب کہیں پوپ روم کا بس چل جاتا تھا تو سوسائیٹی میں راہبانہ تقشفانہ میلان پیدا ہو جاتا تھا۔ نہایت معزز و متمول خاندان کی دوشیزہ لڑکیاں اور نہایت نام و نمود کے سپاہی دیروں میں جا رہتے تھے تو اُن کے عزیز رشتہ داروں کو مبارکبادیں دیتے اور اُنکے رفیق اُن کی تعریفیں کرتے تھے۔ جب دُنیاوی کشش کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا اور ہوش و حواس قائم ہوتے اور وہ عقل سے کام لینے پر مائل ہوتے تھے تو خانقاہوں سے نکل پڑتے۔ بڑے بڑے آدمی اپنے فدیہ میں خانۂ خدا میں اپنے غلام بھیج دیتے یا نئے غلام اور زرِ فدیہ بھیج کر راہبوں کو شاہانہ زندگی گزارنے کے قابل بنا دیتے۔ فرانس میں گرجا بنانے میں لوگ ایک دوسرے پر مسابقت کرتے تھے ہر شخص دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ یہ کیفیت اُن ممالک کی بھی نہ تھی کہ جنکی گردنیں پوپ کے طوقِ غلامی سے سختی کیساتھ جکڑی ہوئی تھیں جس شخص کے گرجا یا خانقاہ میں جتنے زیادہ راہب آجاتے تھے اتنی ہی اُسکی زیادہ شہرت ہوتی تھی اور وہ اُتنا ہی زیادہ نام پاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ فرانس کی آبادی کا بڑا حصہ راہبوں کی صورت میں بیکار ہو رہا تھا۔ ایک ایک دیر کو اگر پڑتالا جاتا تو اُسکی مردم شماری کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بعض بعض خانقاہ میں تو آٹھ آٹھ سو راہب موجود رہتے تھے۔ بانیانِ دیر کی سخاوت اور دینداری کا انعام لازمی طور پر یہ تھا کہ پوپ کے یہاں سے تعریفی پروانہ مل جاتا تھا۔ اوایل آٹھویں صدی کے گاؤں کے کلیساؤں کے کاغذات کو اگر دیکھا جائے تو اُن میں اتنے اولیاء اللہ کے نام ملینگے کہ لاطینی مسیحی دُنیا اُسکے بعد سے اب تک پیش نہ کر سکیگی۔ ان امکنۂ مقدسہ پر اپنی تمام تر فیاضی کو کام میں لانا نہ صرف بے انتہا نیکی کا کام تھا، بلکہ دینداری کا یقینی ثبوت۔ ان کے بروج میں اتنی دولت بھری ہوئی تھی کہ پادریوں کی مبالغہ آمیزی اور عوام کی خوش اعتقادی

اُس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ ان گرجاؤں اور خانقاہوں کی دولت کی شہرت بنا بریں وسیاحین کی یاوہ گوئی سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جسکو سُن سُن کر اہالی عرب کے مُنہ میں پانی بھر بھر آتا تھا؛ یہی دولت تھی جسکو سُن سُن کر اُن کا شوق جہاد و سرفروشی بڑھتا تھا؛ اور اُس ملک میں آباد ہونے کی اُن میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ جہاں دولت کے یہ انبار لگے ہوئے ہیں۔ اسی شہرت دولت نے فرانس کے سیاسی اور تمدنی حالت پر ایک انقلابی اثر ڈالا؛ اور فرانس کے ذریعہ سے بالواسطہ تمام یورپ پر۔

گنوارپن، خشونت اور وحشیانہ شہوت پرستی، نیکیوں پر چھائی ہوئی تھی۔ وحشیانہ شان و شکوہ سوسائٹی کے خصائص میں داخل ہو گئی تھی۔ یہ سوسائٹی کیا تھی؟ ایک براء نام بادشاہ، اُس کا دربار، محل دارِ شاہی، اُسکے اردلی اور سست اور ناکارہ پادریوں کا مجموعہ میروونِ جی ان رؤساء کے ملک محروسہ کو ان ہی پادریوں کا گروہ گھیرے ہوئے تھا۔ ملک میں جو کوئی بڑا آدمی ہوتا تھا اُسی کی زبان مُلکی قانون تھا۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں کے خوف، آپس کی عداوت اور بڑے بڑے زمینداروں کی بیہودہ بلند نظری سے بیچارے کاشتکار ہر وقت ترسان و لرزان رہتے تھے، اور کسی طرح اپنا پیشہ نہ کر سکتے تھے۔ جاہل لوگ اس طرح خواب غفلت میں تھے کہ اگر اُن کے سر پر آرے چل جاتے تو اُن کو خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنی جہالت میں اس طرح گرفتار تھے کہ محض جانورانہ زندگی بسر کرنے میں مگن تھے۔ پادریوں کو صرف اپنا عُشر جمع کرنے کی دُھن تھی اور بس۔ بھلا اُن سے یہ کب ممکن تھا کہ جب قوم پر کوئی مصیبت پڑے تو وہ اپنے دولت و مال سے مدد کریں، خواہ اُن کی جان خطر میں پڑ جاتی مگر وہ اپنا پیسہ نہیں ہلا سکتے تھے۔ جرائم خلاف وضع فطری، حرامی بچوں کا قتل، زنا، اور اسی قسم کے اور بدترین اخلاقی جرائم پھیلے ہوئے تھے۔ جو لوگ ذرا دولتمند تھے اُن کے یہاں عورتوں کے گروہ کے گروہ رہتے تھے۔ جہاں اس قسم کے حرکات ہوتے ہوں وہاں خانگی زندگی کی پاکیزگی کہاں۔ یہ حرکات ہی معاشرت و معیشت کے لئے زہر ہلاہل ہیں۔ ان میں

پادریوں کو خاص تفوق اور نمود حاصل تھا۔ دیر کے خلوت خانے اور خانقاہ کے حجرے، بظاہر نوزہد و عبادت کے لئے مخصوص تھے مگر وہاں کھلے بندوں وہ جرایم ہوتے تھے کہ جن کو سن کر کان بند کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان اساتذۂ روحانی کی ذلیل حالت علاج کی حد سے گزر چکی تھی ؛

صوبہاء جنوبی، جو پہلے وزیگاتھ کے زیر حکومت تھے، وہاں ذہانت اب تک باقی تھی، اور رفتار و گفتار میں تہذیب موجود تھی۔ فی الحقیقت یہ رومی تکلفات اور یونانی تہذیب کا بقیہ تھا، جو ان لوگوں کو وراثت میں ملا تھا۔ یہاں بحر روم کے ساحل اور دریاء رہون کی وادی پر قدرت کی فیاضی نے ایسے ذرائع پیدا کر دیئے تھے جو صنعت و حرفت کے بہت کچھ مدد و معاون ہو سکتے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا لوگوں کی ترقی دماغی کے لئے خاص کر موزوں و مناسب تھی۔ ٹیوٹن اور فرانس والے ہر مجمع میں مساوات کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مگر یہاں رؤساء اور اُمراء نے سب سے پہلے اپنے تکبیر کی عزت کرانی چاہی۔ یہ علاقہ جغرافی اعتبار اور تجارتی تعلقات کے لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھا۔ اسکو فلسفیانہ خیالات اور علم ادب سے خاص دلچسپی تھی، اسی لئے وہ سب سے زیادہ مسلمانان اندلس کا گرویدہ تھا۔ مقدر ہو چکا تھا کہ یہیں کی اشعۂ شجاعت و علمیت الٰہی جن شی[۴۵] ان تاجداروں کے درباروں منور کر دیں ؛

آٹھویں صدی کے ناقص مورخوں نے کچھ ایسے غیر تسلی بخش حالات چھوڑے ہیں کہ زمانہ حال کا مورخ اگر ان سے کوئی صحیح واقعات اخذ کرنا چاہے تو اُس کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ اوّل تو کسی واقعہ کی تفصیل کا نہ ہونا سخت افسوسناک ہے، اُس پر مصیبت یہ ہے کہ فلسفیانہ تحقیق کا نام نہیں۔ لیکن اسکی کہاں تک شکایت کیجائے، کیونکہ ان جاہل مورخین کی خصوصیات ہی یہ ہیں۔ قومی خصوصیات کو بتدریج ظاہر کرنے اور یہ بتلانے میں کہ اُس زمانہ کے ان گھڑ سیاست دانوں کو ملکی پالیسی بدلنے کی وجہ

تحریک کیا تھی، اور یہ ظاہر کرنے میں کہ بڑے بڑے انقلابات محض قانون قدرت کے موافق ہوئے تھے، یا اُس میں کچھ رعایا کا دخل، یا سہل انکاری بھی شامل تھی؛ جو کچھ ان مورخین نے کہا ہے وہ نہ کہنے کے برابر ہے۔ باوجود ان تمام باتوں کے اگر ہر ایک زمانہ کے بڑے بڑے واقعات کو دیکھا جائے تو ان میں ایسی رنگ آمیزی ہے کہ نظر خیرہ ہوئی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم یا حال میں اتنی کامل کامیابی، اس قدر عجلت کے ساتھ کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی جیسی کہ مسلمانان اندلس کو؛ نہ اتنی جلد کسی قوم نے انسانی دل و دماغ پر اثر ڈالا، جتنا کہ اعراب جزیرہ نمائے اندلس نے بت پرست چارلس مارٹل نے شارلیمین کی وسیع سلطنت اور مطلق العنانی کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ اُس کے کٹے دیندار جانشین کے جوش مذہبی نے پوپ کی بنیاد کو بہت کچھ مضبوط کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی جہاد میں کامیابی یا ناکامی پر پوپ کی قسمت معلق، اور دُنیا بھر کے مذاہب کی قسمت وابستہ تھی جیسا کہ عام خیال ہے، پائے ٹیرس کی لڑائی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان میں نہ تھی؛ کیونکہ فرانس کی فوج میں زیادہ تر بت پرست تھے اور حملہ آوروں (مسلمانوں) کی فوج بربریوں، یہودیوں اور کافروں سے بھری پڑی تھی؛ ایسے جان فروش مسلمان، جنہوں نے جناب رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تکلیفیں اُٹھائی تھیں، جنہوں نے حضور اقدس صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ کے علم کو جنگ اُحد میں برپا رکھا تھا، جنہوں نے دمشق اور یروشلم کو فتح کیا تھا، اُن انواع و اقسام کے لوگوں میں خال خال ہی نظر آتے تھے جو قسمت آزمائی کے لئے اندلس میں آ گئے تھے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کے بھیس میں محض لوٹ مار کی غرض سے اس ملک میں آ بھرے تھے۔ اصلی مسلمانوں کا جوش و خروش، اور نہ رُکنے والے جذبات، تشریف لے جا چکے تھے؛ اگر اُس جوش دینی اور جان فروشی کا ایک عشر عشیر بھی اُن میں باقی ہوتا، جس سے اُن کے ابتدائی دشمن مرعوب ہو گئے تھے، تو جنگ پائے ٹیرس کا معاملہ بالکل دگرگوں ہوتا۔

برخلاف اسکے اہالی فرانس میں اپنے دینی اصول اور دین کو قائم رکھنے کا جوش نہ تھا؛

وہ زان باک[۴۶] اور وڈوں جیسے بتوں کے سامنے سر جھکاتے تھے، جرمنی کے جنگلی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، یا اُن مقتدایان مذہبی کی آستانہ بوسی کرتے تھے، جو پیشینگوئیاں کرتے اور برطانیہ کے میدانوں میں بتے تھے۔ احتیاجوں کی مجبوری، لوٹ مار اور نام و نمود کے شوق میں سینکڑوں اقوام کے لوگ، ڈینیوب کے کناروں سے لے کر سکینڈی نیویا کے میدانوں تک سے کھنچ آئے تھے۔ یہ لوگ کسی طرح عیسائی کہلانے کے قابل نہ تھے، کیونکہ اُن سے اب تک اہالی کلیسا ناراض تھے، اُن کے سروں پر پوپ کی لعنتوں کے انبار تھے، اس لئے کہ وہ کلیسا کے مال و اموال کو خورد برد کر چکے تھے۔ مگر باوجود اسکے بھی لوگ دین مسیحی کو مٹنے سے بچانے کے لئے یہاں بھیج دیئے گئے تھے لیکن اگر دونوں متنازعین کے یہاں آنے کی وجہ تحریک سے قطع نظر کر لی جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ جنگ پائے ٹیرس کے نتائج نہایت اہم بلکہ فیصلہ کن تھے۔ یہ اُن بڑی بڑی لڑائیوں میں سے ایک تھی جس کے نقش قدم اب تک نظر آ رہے ہیں اور جس نے دو قوموں کی قسمتوں کا آخری فیصلہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات کے سیلاب سے تمام یورپ کانپ رہا تھا، پوپ اپنے محل میں بیٹھا لرز رہا تھا، ہر ایک عیسائی دیندار اپنے اپنے اولیاء کی بت یا تصویر کے سامنے سجدہ میں پڑا ہوا اس مصیبت کے ٹالنے کی دعائیں کرتا تھا، جس کا خوف ہر لحظہ لگا ہوا تھا، اور اسکے لئے کسی بڑی ریاضت کا عہد کرتا تھا۔ تخیلات اور خوف اسکی آنکھوں کے سامنے ایک مشرقی آدمی کی ایسی تصویر پیش کئے رکھتا تھا کہ گویا وہ شیطان مجسم ہے، اور اُن ہنس سے بھی زیادہ خوفناک مخلوق ہے جن کو چار سو سال پیشتر اے ٹی اس[۴۷] نے چیلون[۴۸] کے میدان میں شکست فاش دی تھی۔ بارہ صدیاں گذر گئیں مگر اب تک وہ تخیلات و وہمیات بدستور باقی تھے جنہوں نے شرقیین کو ڈراؤنی شکل میں دکھلایا تھا۔ وسط فرانس میں اس وقت تک ان مردم خواروں کے قصے بچوں کو ڈرانے کو سنائے جاتے اور بڑوں کو دھمکانے کے لئے گائے جاتے تھے۔

زمانۂ امارتِ اندلس بھی اسلامی تاریخ کا ایک مظلم زمانہ تھا۔ اُن دنوں کے واقعات زیادہ تر محض روایات زبانی کی وجہ سے باقی رہ گئے ہیں۔ اُن کی تاریخ عجیب مختل، ناقص اور متضاد ہے۔ اُن کے متعلق وہ تاریخیں بھی مبہم ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات گزرے، اوقات میں اختلاف مقامات میں اختلاف لوگوں کے ناموں میں اختلاف ایک ایک نام کے کئی کئی آدمی پھر اُن کے کارناموں میں اختلاف مورخ کی محبت وعداوت کو بہت کچھ دخل، مختلف لوگ خود اپنے زمانہ میں اُن واقعات کا گزرنا بیان کرتے ہیں، اس لئے اُن کے بیانات مشکوک اور ناقابل اعتبار، جب یہ کیفیت ہو تو صحیح واقعات کا اقتباس و انتخاذ، ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ آج کل جو مورخ اُس زمانہ کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو اُسکی پریشانی اور فشار سے صرف اتنی امید رکھنی چاہئے کہ وہ محض قیاس غالب سے کام لیگا۔ صحیح حالات لکھنے کا کسی صورت سے دعوےٰ نہیں کرسکتا۔

ٹھیک ایک سو دس برس گزرے کہ حضور سرورِ کونین صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے ستائے ہوئے، مجرموں کی طرح چھپ کر اپنے وطن مبارک سے نکلے ہیں حضورؐ کے دشمنوں نے سراقدس و اطہر کے لئے ایک ہزار دینار کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ اسلام چند نفوس کے اختلال حواس کا نتیجہ سمجھا جا رہا ہے، جو شبے مانند شب دیگر نمی ماند کا مصداق ہے، مگر آج اُسی رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے فدائی ہندوستان سے لے کر بحر اطلانطک تک موجود ہیں حضورؐ کے نام مبارک کے سامنے آدھی دُنیا کے سر جھکتے ہیں، اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے۔ نئے دین پر قربان ہونے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو کر کروڑوں پر پہنچ رہی ہے۔ اُسکی تلوار جہاں پہنچتی ہے فتح وظفر کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ اُسکی ہمت و استقلال کسی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتی عیسائیوں کے تمام مقامات مقدسہ اور اُس مذہب کے مہد، مثلاً انطاکیہ، اسکندریہ کارتھیج اور یروشلم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں، یہ وہ جگہیں ہیں کہ عیسائیوں کے نجات دہندہ کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو بے انتہا

عزیز ہیں۔ یہیں حضرت مسیح علی نبینا وعلیہ السلام نے معجزات دکھلائے؛ یہیں کی روایات
عیسائیوں کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ روم اور قسطنطنیہ دو اور شہر رہ گئے ہیں جو مسیحیت کے
مرکز بنے ہوئے ہیں (یہ مقدر ہو چکا تھا کہ پہلے کو مسلمانان صقلیہ حملہ کرکے روند ڈالیں اور دوسرے
کو اندلس کے مسلمان دھمکیاں دیں) یہ دونوں ہی شہر اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے ٹیرینین
کے بیڑے مشرقی بحر شام میں تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا جھنڈا مکہ سے چھتیس ۳۶
سو میل کے فاصلہ سے آکر لایر کے قلعہ پر نصب ہو گیا۔ جس ملک میں اسلام کا قدم مسعود پہنچا
وہیں اسکو اپنے حلیف اور متبع مل گئے۔ مذہب کی طرف سے بے پروائی، ظلم عام، زیر دستوں
پر بار ستم اور غلامی کے عیوب نے ہر جگہ اسکے لئے راستہ صاف کر رکھا تھا؛ یہودیوں نے
شہروں کے دروازے کھول دیئے؛ قوم مظلوم کے سرکردوں نے زر نقد اور ہتھیار دے کر
اپنے ہی ملک کی تباہی کے اسباب مسلمانوں کے ہاتھ میں پکڑا دیئے؛ ہزاروں کی تعداد میں
لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ سب سے بڑی منحوس بات یہ تھی کہ خوش اعتقاد عوام الناس غلبہ کو
حقانیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور یہ مسلمانوں کا ساتھ دیئے ہوئے تھا۔ ان صورتوں میں یہ
کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ مسیحی یورپ مسلمانوں کی پیش قدمی کی خبروں ہی سے سخت
پریشان ہوتے جاتے تھے۔ اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ آیا رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے دین کو برفانی علاقۂ شمالی میں کامیابی ہو سکتی تھی یا نہیں۔ مذاہب کی جغرافیائی تقسیم
بیشتر آب و ہوا پر موقوف ہے۔ اسلام لازمی طور پر ایک اجنبی اور پردیسی دین ہے منطقہ حارہ
کے باہر اس دین کے نشانات رہ گئے ہیں اگر پھلا پھولا نہیں۔ ایک فاضل مورخ نے
بڑے مزہ کا اصول قائم کیا ہے کہ اسلام اس ملک میں نہیں رہ سکتا کہ جہاں زیتون نہ پیدا ہو
یہ بات تجربہ سے بھی صحیح ثابت ہوتی ہے اور تاریخ نے بھی اسکو صحیح کر دکھلایا ہے نہ یہ بہت
ہی خلاف قیاس بات ہے کہ ایشیا کے اصول و مراسم ہالینڈ اور جرمنی کے ابر آلود آسمان

---

[1] الاسلام غریب! (مترجم)

کے نیچے، اور برفانی ہوا کے اندر نشو و نما پا سکیں؛ اگر پا سکتے ہیں تو اہم ترمیمیں کرنے کے بعد اور ترمیموں کے ساتھ دینی و تمدنی انقلابات کا ہونا لازمی۔ قوم ٹیوٹن کی مستقل مزاجی اور فہم و فراست نے یورپ کو اندلسی عربوں کی پامالی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مصئون کر دیا تھا۔ جو بے قاعدہ اور غیر منضبط حملے زمانہ مابعد میں دیر دیر کے بعد کئے گئے وہ بہت آسانی کے ساتھ رد کر دیئے گئے۔ سوال یہ ہے کہ آیا چارلس مارٹل کی فتح سے فائدہ پہنچا یا نقصان؟ اس کا جواب مسلمانوں کی تہذیب اور شیوع تہذیب زبان حال سے دے رہی ہے؛ اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس پر قیاسات دوڑانے لاحاصل ہیں کہ اگر اس لڑائی میں شرقیین کو غلبہ و فتح حاصل ہو جاتی تو اُس کا وہاں کے باشندوں کے راہ و رسم و عادات پر کیا اثر ہوتا۔ اسکے جواب میں ایک نہایت قابل آدمی کے الفاظ درج کرنے کافی ہیں:—

"ہمارا کم سے کم عیب یہ ہوتا کہ ہم عمامے باندھتے؛ بجاء داڑھیاں منڈانے کے ہم داڑھیوں میں کنگھی کرتے؛ مگر اپنے ملک میں اُن سے بھی زیادہ شاندار اور خوبصورت عمارتیں دیکھتے، جو یونانیوں نے بنائی تھیں؛ اور ہمارے دل قرطبہ کی اسلامی یونیورسٹی کے علوم و فنون سے منور ہوتے۔"

(الف)

تعلیقات

(۱) نوار = NAVARRE پہلے سپین میں ایک مستقل سلطنت تھی اب اُس کا صوبہ ہے اس کے شمال میں فرانس، جنوب اور مشرق میں ارغون اور مغرب میں بسکے ہے۔ رقبہ چار ہزار مربع میل۔ یہ مُلک پہاڑی ہے، کوہ پایرینیس کا سلسلہ شمال اور مشرق میں پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقہ میں تین دریا بہتے ہیں۔ ان کے کناروں پر غلہ پیدا ہوتا ہے، شراب کھینچتی ہے اور تیل نکلتا ہے۔ پہاڑ کی وادیوں میں بھی کاشت ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقہ میں زراعت نہیں ہو سکتی، یہاں کے لوگ شوقیہ نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے شکار کرتے رہتے ہیں۔ نوار کے باشندے سپاہی پیشہ ہیں، مگر زیادہ تر چوری چکاری پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ اس کے جنگلوں میں ریچھ، بھیڑیئے، جنگلی بلیاں، بکریاں، ہرن اور ان کے علاوہ اور بھی شکار ملتے ہیں۔ لوہا اور نمک پیدا ہوتا ہے اور باہر بھیجا جاتا ہے۔ نوار کے رہنے والے محنت کش، بہادر اور مہمان نواز ہیں۔ اپنے بادشاہ کے بڑے وفادار ہوتے ہیں۔ اگر اُن کی چوری چکاری سے قطع نظر کر لی جائے تو دیانتدار اور نیک چلن ہوتے ہیں۔ بہت صابر ہیں اور کسی کا اعتبار نہیں کرتے۔ غصہ میں جلد آجاتے ہیں، انتقام لینے میں بہت تیز ہیں۔ گو صنعت و حرفت کی اس علاقہ میں بہت کمی ہے تاہم شیشہ، صابن، چمڑے کی دباغت وغیرہ یہاں خاصی ہوتی ہے۔ سارے وو مذہب رومن کیتھولک ہیں۔ اپنے آپس ہی میں شادیاں کرتے ہیں، اس لئے خالص باسک ہیں۔ باسک زبان کوہستان میں بولی جاتی ہے، باقی علاقہ میں قتالی اور سپینش کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا صدر مقام پمپلونا ہے۔

اس علاقہ کو گاتھوں نے پانچویں صدی مسیحی میں فتح کیا۔ آٹھویں صدی تک لڑ بھڑ کر اپنی آزادی کو قائم رکھے رہے، مگر پھر عربوں نے ان کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس کی تاریخ وہی ہے جو اندلس اور سپین کی ہے۔ (مترجم)

(۲) ناربونیز گال = NARBONESE GAUL فرانس کا ایک علاقہ ہے۔ جو سپین کا ہم سرحد ہے۔ کسی زمانہ میں گاتھوں کی سلطنت میں تھا۔ (مترجم)

(۳) لینگیوڈاک = LANGUEDOC قرونِ وسطےٰ سے لے کر انقلاب فرانس کے زمانہ تک وہ علاقہ ہے جو فرانس کے جنوب میں واقع ہے۔ اس وقت یہ علاقہ کئی اضلاع میں منقسم ہے۔ (مترجم)

(۴) رہون = RHONE اور گیرون GARRONNE فرانس کے دو مشہور دریا ہیں۔ (مترجم)

(۵) اورینج = ORANGE فرانس کا ایک شہر ہے جو نہایت بدنما اور گندہ ہے۔ رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ایک نہایت خوشنما علاقہ میں دریا کے کنارے آباد تھا۔ ریوگنان سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ریشمی اور سوتی کپڑا یہاں اب بھی بنتا ہے۔ تیل بھی نکلتا ہے اور دباغت بھی ہوتی ہے۔ شراب، زعفران، شہد وغیرہ باہر جاتے ہیں۔ گیارھویں صدی سے سولھویں صدی تک ایک آزاد سلطنت کا دارالسلطنت رہا ہے۔ سب سے آخری بادشاہ، فلی برٹ ڈی چیلونس ۱۵۳۱ء میں لاولد مر گیا۔ اس نے صرف ایک بہن چھوڑی تھی جو ایک ڈیوک سے بیاہی گئی۔ یوں یہ خاندان گم ہو گیا۔

اس شہر کے قریب جوار میں رومیوں کے اکثر آثار پائے جاتے ہیں۔ ایک محراب ساٹھ فیٹ بلند کسی فتح کی یادگار میں بنی تھی۔ یہ نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی عمارتیں قابل دید ہیں۔ (مترجم)

(۶) پانٹ ڈو گارڈ PONT DO GARD فرانس میں ہے۔ یہاں بھی رومیوں کی تعمیرات ہیں جو اپنی خوبی میں بہت مشہور ہیں۔ (مترجم)

(۷) نیمس = NIMES فرانس میں ایک شہر ہے۔ آج کل پانٹ ڈو گارڈ کے ضلع میں واقع ہے نہایت سیر حاصل علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں انگور بہت پیدا ہوتے ہیں۔ مانٹ پلیرس سے تیس ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ آج کل تو بہت ہی گندہ شہر ہے۔ اس کے قریب رومیوں کے زمانہ کا ایک مشہور پل ہے۔ ریشمی اور سوتی کپڑا یہاں سے بن کر نکلتا ہے۔ (مترجم)

(۸) پرووینس PROVENCE کسی زمانہ میں فرانس کا بندرگاہ تھا، جو ملک فرانس کے انتہاء جنوب مشرق میں واقع ہے۔ آج کل کئی ضلعوں میں منقسم ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں گال کا کچھ علاقہ

اس میں شامل تھا۔ لینگیوڈاک اور پروونس ایک زمانہ میں نہایت مہذب سلطنت ہو گئی تھی، جسکو پوپ اور پادریوں کی نظر عنایت نے بالکل تباہ کر ڈالا۔ اس کے عروج و زوال کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ تیسری جلد ملاحظہ فرمایئے۔ بہت حظ اٹھایئنگے ۔ (مترجم)

(۹) گیس کون = GASCON گیسکنی کے رہنے والے۔ یہ علاقہ جنوب مغربی فرانس میں خلیج بسکے اور گیرون کے درمیان واقع ہے۔ یہ گاتھوں کی عملداری میں تھا۔ ان کو قوم واسک نے نکالا اور ۷۶۸ء میں اہالی فرانس نے ان کو یہاں سے ملک بدر کیا اور ڈیوک آف ایکیوٹانیا نے قبضہ کیا۔ اس خاندان کو پہلے شاہ پے پن نے خراب کیا اور پھر شارلے مین نے تباہ کیا۔ اس کے بعد اس کی تاریخ ایکیوٹانیا سے وابستہ ہے۔ یہاں کے باشندے غرور اور یاوہ گوئی میں ایسے ضرب المثل ہیں کہ فرنیچ میں ان کے اقوال بطور لطائف و ظرائف کے بیان کئے جاتے ہیں ۔ (مترجم)

(۱۰) آرلیس = ARLES فرانس کے بہت ہی پرانے شہروں میں سے ہے۔ یہاں ریشمی کپڑا، ٹوپیاں، تمباکو اور شراب بنتی ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں یہاں حاکم صوبہ رہتا تھا۔ ان کے بہت سے آثار تماشاگاہ وغیرہ کی صورت میں اب تک باقی ہیں۔ یہاں کی عورتیں اپنے حسن میں مشہور ہیں ۔ (مترجم)

(۱۱) پیرے کلس = PERICLES یونان کے خرافات الاصنام میں وہاں کا ایک علاقہ ہے کہا جاتا ہے کہ وہاں کی عورتیں حسن میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں ۔ (مترجم)

(۱۲) ناربون = NARBONNE جنوب فرانس کا بہت ہی پرانا شہر۔ پانچ سو سال قبل از مسیح تک تو اس کا ذکر تواریخ میں آتا ہے ۱۱۸ ق م میں رومیوں نے اس میں آباد کار بسائے۔ ساحل بحر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ایک زمانہ بعید میں بڑا تجارتی شہر تھا۔ رومی اس کو سپین کی کنجی سمجھتے تھے ۷۱۹ء میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ انہوں نے یہاں ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔ بارھویں صدی میں پھر عیسائیوں نے لیا۔ اس روز سے اس کی تباہی شروع ہوئی۔ اب تو بہت ہی برا حال ہے، اور بہت ہی گندہ قصبہ رہ گیا ہے ۔ (مترجم)

(۱۳) ایگڈے = AGDE فرانس کا ایک پرانا شہر جسکو یونانیوں نے بسایا تھا بحر روم سے

پندرہ بیس میل پر واقع تھا۔ اٹلی، سپین اور افریقیہ سے تجارت ہوتی ہے۔ بہت بدنما جگہ ہے۔ (مترجم)

(۱۴) لوڈیو = LODEVE جنوبی فرانس میں ایک پرانا شہر، مانٹ پیلیرس سے مغرب شمال میں ۳۲ میل کے فاصلہ پر بہت خوبصورت وادی میں آباد ہے۔ (مترجم)

(۱۵) میگیولون = MAGUE LONNE جنوبی فرانس کا ایک پرانا شہر ہے۔ مگر خراب ہو رہا ہے۔ (مترجم)

(۱۶) بیزیرس = BAZIERS فرانس کا بہت ہی پرانا شہر۔ یہاں گاتھوں کے زمانہ کا ایک بہت بڑا گرجا ہے، اور رومیوں کے بھی بہت آثار ہیں۔ سائمن ڈی مان فورٹ کے جوش مذہبی میں یہاں البےجنس کا قتل عام کرایا تھا۔ (مترجم)

(۱۷) کارکسون = CARCASSONE فرانس کا ایک شہر، ٹولوس سے جنوب مشرق میں ۵۰ میل کے فاصلہ پر خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ وزیگاتھ نے بسایا تھا۔ سائمن ڈی مانٹ فورٹ ایک متعصب شخص تھا اس نے یہاں قتل عام کرایا اور چار سو البےجنس کو زندہ جلوا ڈالا۔ (مترجم)

(۱۸) میرووِن جی ان = MEROVINGIAN بادشاہان گال کے فرانسیسی خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ جو پانچویں صدی عیسوی میں برسر حکومت تھا۔ اس کے پوتے نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر بڑا عروج حاصل کر لیا۔ جب یہ مرا تو سلطنت چار بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے ۵۵۸ء میں پھر تمام ملک کو یکجا مجتمع کر لیا۔ جب ۵۶۱ء میں یہ مرا تو سلطنت پھر چار حصوں میں منقسم ہوئی، یعنی ایکیوٹین، برگنڈی، نیوسٹریا اور اسٹریشیا۔ یہ پھر متحد ہوئے لیکن ۶۲۸ء میں دو سلطنتیں، یعنی نیوسٹریا اور آسٹریشیا پھر متحد ہوئے۔ مگر میرووِن جی ان بادشاہوں کی برائے نام حکومت تھی، حقیقت میں زمام سلطنت محل کے داروغہ کے ہاتھ میں تھی۔ ۷۵۲ء میں اس خاندان کا نام و نشان بھی مٹ گیا، اور خاندان کارلووِن جی ان میں سلطنت منتقل ہو گئی۔ (مترجم)

(۱۹) ایکیوٹین = AQUITAIN زبان لاطینی میں اُس علاقہ کو کہتے تھے جو پایرے نیس اور گیرون کے درمیان واقع ہے۔ اس میں آئے بیریا کے آئے ہوئے لوگوں کی اولاد آباد تھی۔ پہلے یہ

رومیوں کے پاس رہا، پھر مغربی گاتھوں کے ہاتھ میں آیا، اس کے بعد فرانس والوں کے۔ میرووِن جی ان خاندان کے زمانہ میں ایک آزاد ریاست ہوگیا۔ پھر شارلے مین نے اس کو زیر کرلیا۔ مگر جب یہاں کے بادشاہ کمزور ہوئے تو کارلووِن جی ان نے اس ریاست اور اپنی آزادی کا دعوے کیا۔ ۱۱۵۲ء میں لوئی ہفتم نے وہاں کی رئیسہ سے شادی کی تو یہ ریاست بھی فرانس میں ضم ہوگئی۔ لوئی نے اس کو طلاق دیدی، اس پر بڑے جھگڑے پڑے اور فرانس اور انگلستان میں بدمزگی ہوئی۔ آخر چارلس ہفتم نے ۱۴۵۱ء میں اس کو ہضم کر کے فرانس کا ایک حصہ بنالیا۔ (مترجم)

(۲۰) ٹولوس = TOULOUSE قیاصرۂ روم کے زمانہ میں بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے گرد اینٹ کی فصیل تھی ۴۱۲ء میں وزیگاتھ نے اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ یہاں کے علماء کسی زمانہ میں بہت مشہور تھے۔ (مترجم)

(۲۱) ٹاراگونا = TARRAGONA (طرکونہ) سپین کا ایک بندر، اسی نام کے صوبہ کا صدر مقام، بحر شام پر، برشلونہ سے ساٹھ میل پر واقع ہے۔ شہر کے دو حصّے ہیں، ایک نیا دوسرا پرانا۔ پرانا شہر اہالی فونیشیا نے بسایا تھا۔ رومیوں کے زمانہ میں بھی دارالصوبہ رہا تھا۔ رومیوں کے زمانہ کی عمارات کے آثار خاص کر ایک پل اب تک باقی ہے۔ جون ۱۸۱۳ء میں جب اہالی فرانس نے اس شہر کو لیا ہے تو وہاں قتل عام کرایا تھا۔ (مترجم)

(۲۲) لائنس = LYONS فرانس کا مشہور شہر ہے از روئے آبادی فرانس بھر میں تیسرے درجہ کا ہے۔ یہاں بہت سی خوشنما عمارات، ایک بڑا کتب خانہ ہے ۴۳ ق م میں رومیوں نے آباد کیا۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

(۲۳) برگنڈی = BURGUNDY فرانس کا ایک قدیمی صوبہ۔ یہاں کے باشندے جرمن قوم کے تھے۔ جب مسیحیت پھیلی تو یہاں کے رہنے والے آٹھ دن کے اندر عیسائی ہوگئے ان لوگوں نے ایریس کا مذہب قبول کیا۔ جب یہ صوبہ ایک سلطنت بن گیا۔ تو کئی دفعہ کئی حصوں میں منقسم ہوا۔ ۵۳۴ء میں اہالی فرانس کے قبضہ میں آیا۔ پھر نکل گیا۔ اور بہت سے انقلابات کے بعد

آپ فرانس میں ضم ہو گیا۔ (مترجم)

(۲۴) اوٹن = AU TUN فرانس میں ایک قدیمی شہر ہے۔ یہاں رومیوں کے زمانہ کی بہت سی تعمیری یادگاریں ہیں۔ (مترجم)

(۲۵) ریٹی ان ایلپس = RHETIAN ALPS کوہ ایلپس کا وہ حصہ جو رہون کی طرف ہے تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ (مترجم)

(۲۶) کیسٹرم لیویا = CASTRUM LIVIAE سپین میں کوئی قدیم شہر ہے۔ (مترجم)

(۲۷) ہن = HUN یورپ میں زمانۂ قدیم کی ایک بے انتہا وحشی مگر بہادر قوم تھی۔ اس نے ایک زمانہ میں تمام یورپ اور اکثر حصۂ ایشیا کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ رومیوں کی سلطنت کو اٹیلا کی سرکردگی میں ان ہی وحشیوں نے تباہ کیا۔ ان کی تعداد لاکھوں کی تھی۔ ان کی وحشت کو دیکھ کر اہل یورپ نے ان کی اصل و نسل کے عجیب و غریب قصے گھڑے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ تاتاری الاصل تھے۔ اس قوم کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ زمانۂ حال کے اہالی جرمنی ان ہی کی اولاد کہے جاتے ہیں (گو تحقیق نہیں کہا جا سکتا) گذشتہ جنگ عظیم میں جرمنوں نے جو کچھ کیا ہے وہ قوم ہنس کی وحشت کا ادنےٰ نمونہ ہے۔ (مترجم)

(۲۸) بورڈیو = BORDEAUX فرانس کا مشہور بندرگاہ ہے۔ (مترجم)

(۲۹) پائے ٹی یرس = POITIERS فرانس کا ایک بہت ہی پرانا شہر ٹورس سے ۶۳ میل پر ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے یہاں بہت سی مذہبی عمارات تھیں جو تباہ کر دی گئیں پہلے یہاں ایک یونیورسٹی بھی تھی، اب نہیں رہی، بجائے اس کے ایک کتب خانہ ہے۔ (مترجم)

(۳۰) سینٹ ہلاری = ST HILARY پائی ٹیرس کا اسقف اعظم تھا۔ اس کے والدین غیر عیسائی تھے، یہ خود بڑی عمر میں عیسائی ہوا۔ ایریس کی مخالفت میں اس نے بہت سی کتابیں لکھیں، الوہیت مسیح پر اس نے بہت زور دیا۔ ایک مرتبہ قید بھی ہوا، مگر پھر بحال کر دیا گیا۔ اپنے بادشاہ وقت کے نام ایک نہایت تند و ترش خط لکھا۔ رومن کیتھولک ایسے آدمی کو ولی کیوں نہ مان

باب ہفتم

سپین میں عیسائیوں کی سلطنت کا قیام

۷۱۸ء سے ۷۵۷ء تک

اندلس کے شمالی صوبے۔ اُن کا ویران اور ناقابل زراعت ہونا۔ آب و ہوا۔ آبادی۔ مذہب۔ وہاں قین الیسٹریاس اُن کی خصوصیات۔ پیلایوس۔ اُس کی پیدائش و خاندانی حالات۔ اُس کا ایک فوج جمع کرنا۔ سلطنت سپین کی گمنامی و خمول۔ اُس کے قیام کی غیر معمولی کیفیت جنگ کواڈونگا۔ عربوں کی شکست۔ طاقت مسیحی کی ترقی۔ فے ویلا۔ الفانسو اول اُس کی بلند نظری اور فتوحات۔ اُس کی پالیسی اور بستیاں بسانا۔ بقاء جذبات آزادی۔ مذہب کا غیر محل اور بُرا استعمال۔ سوسائٹی کی حالت۔ بازیافت کیلئے کشش و کوشش کا شروع۔

اندلس کی جغرافی حالت کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کی زمین بتدریج، مگر تسلسل، مرتفع ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ارتفاع اندلس کے میدان، واقع منطقہ حارّہ سے شروع ہوتا ہے، اور اس سلسلۂ کوہ پر جا کر ختم ہوتا ہے جو فرانس کی حدود سے لے کر خلیج بسکے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا وا اک سلسلۂ کوہ کی بعض چوٹیاں قریباً دس ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔ ان سے چھوٹی چھوٹی بے شمار پہاڑیاں نکل کر شمال اور جنوب کی طرف پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان میں بڑے بڑے ناقابل گزر کھڈ اور گھاٹیاں ہیں بعض بعض جگہ کچھ وادیاں آگئی ہیں جو گو بہت وسیع نہیں ہیں، مگر نہایت سرسبز و شاداب اور زرخیز ہیں۔ یہ ملک سمندر کے قریب واقع ہے۔ اس سے جو بخارات اُٹھتے

ہیں وہ وادیوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر بہت ہی جلد چھن جاتے ہیں۔ اس سے تمام ملک مرطوب ہو گیا ہے۔ لیکن رطوبت ایسی نہیں ہے کہ جو مضر صحت ہو یا انسان کی عمر کو کم کر دے۔ بعض علاقوں میں تو تقریباً ہمیشہ مینہ برستا رہتا ہے۔ پہاڑوں کی بعض گھاٹیاں تو اس قدر تنگ و تاریک ہیں کہ اُن میں کبھی دھوپ کا گذر نہیں ہوتا۔ سد رمق کے لئے وہاں سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کاشتکاروں کی سخت مشقت کے ساتھ چرواہوں کی مدد بھی شامل رہتی تھی، کیونکہ بھیڑوں کا پشم ان ہی لوگوں کی ملکیت ہوتا ہے۔ اسی سے کپڑا بنتا تھا جو مردوں کے کام آتا تھا، اور یہ نسبت سخت و کرخت اونی کپڑے کے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ ساحل پر جو لوگ رہتے ہیں اُن کا آذوقہ مچھلیوں پر منحصر ہے۔ ان لوگوں کو چونکہ دنیاءِ متمدن سے میل جول کے زیادہ موقعے تھے اس لئے ان کی عادات و خصائل میں بہت کچھ ترمیم ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کے یہ معنی نہ تھے کہ ان لوگوں میں اُن مردانہ صفات کی کمی تھی جو کوہستان کے رہنے والوں میں ہوتی ہیں، اُن کے جیسا گنوارپن بھی نہ ہوتا تھا، اور اندرونِ ملک کے رہنے والوں سے یہ لوگ زیادہ ذہین ہوتے تھے۔ کوہستانی مختلف ناموں سے موسوم تھے، باسکس، اسٹورین، کنٹابرین[1] اور گلیشین، یعنی جن جن علاقوں میں یہ رہتے تھے اُن ہی سے منسوب تھے۔ ان کے رسم و رواج میں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی بہت ہی کم فرق پڑا تھا۔ اُن کی ممتاز صفات یہ تھیں کہ وہ ہمیشہ سے سادہ طبیعت، بڑے دیانت دار، بے غرض، مہمان نواز اور آزاد مزاج تھے۔ مسلمانوں کے فتوحات کے سیلاب میں بھی اُن کی یہ صفات ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ قوم باسک کی اصل و نسل کی نسبت عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ اُن کی عجیب زبان اور لطیف روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ نماء اندلس کے اصلی باشندوں کے یہ رشتہ دار ہیں۔ اُن ہی نے اس سنسان میدان میں یورپ کی جنگلی اقوام کی یاد کو تازہ رکھا ہوا تھا۔ جس علاقہ کو آج کل بسکے کہا جاتا ہے اُس کے مغرب کی طرف جو ضلع ہے اور جس میں نشیب و فراز بہت زیادہ ہے

وہی قوم باسک کا اصلی وطن ہے۔ پہلے وہاں آئبیرین رہتے تھے، جو سیلٹ کی ایک شاخ تھی۔ کچھ ضروریات، کچھ حوادث پیش آئے کہ ان لوگوں کو اپنی ہستی قائم رہنے کا ڈر پیدا ہوا، اسی واسطے یہ لوگ جنوبی لوگوں کے ساتھ ایسے مختلط ہوئے کہ انہوں نے اپنی اصلی صورت شکل ہی چھوڑ دی۔ اس سنگلاخ دشوار گذار علاقہ کے حفاظت کرنے والوں کی بہادری اور اس کے بنجر ہونے کی وجہ سے کسی بادشاہ کو اُدھر نہ جرات ہوتی تھی، نہ کشش نہ طمع؛ اُسکی کاداک زمین میں ہمیشہ سخت آندھیاں چلتی رہتی ہیں؛ اُس کے پہاڑ ہمیشہ بادلوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں کسی کو اُس کی فتح کا خیال کیونکر پیدا ہوتا؛ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ حملہ سے محفوظ رہا۔ قرطاجنہ والوں نے کبھی اُن کی سرحد سے عبور نہیں کیا۔ آگسٹس کی سرکردگی میں رومیوں نے سخت مصایب اُٹھا کر اُن کے ملک میں عارضی طور سے رعب قائم کر لیا تھا۔ لیکن لبسا اوقات وہاں سخت بلوے ہوتے رہے۔ اس علاقہ کے لوگ، بادل ناخواستہ، شاہان وزیگاتھ کے تابع فرمان ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں قومیں وارستہ مزاجی، بھدے مذاق، وحشیانہ مراسم اور آزادی میں وحشیانِ آئے بیریا سے زیادہ ملتے تھے اور یونان اور لاطینی تہذیب و تکلف سے بالکل مختلف تھے۔

جس زمانہ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب وہاں پہنچا ہے تو وہ بنجر اور دشوار گزار علاقہ الگ تھلگ پڑا ہوا تھا؛ آج کل یہ علاقہ الیسٹریاس کہلاتا ہے۔ پہاڑوں کی بڑی بڑی اونچی چوٹیاں ایسی ہیں کہ سیاح کی نگاہ اُنہیں میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ حملہ آوروں کا راستہ یہی چوٹیاں روکے ہوئے تھیں۔ اگر فی المثل ان پہاڑوں کو دیوار فرض کر لیا جائے تو اُن کے اُس طرف اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور سرسبز وادیاں ہیں۔ اُن میں کہیں کہیں کوئی گاؤں آباد تھا، جن کی جھونپڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی کسی پہاڑی کی چوٹی پر نظر آتی تھیں، یا کسی تنگ گھاٹی میں، قطار در قطار پھیلی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان ہی سے

CELT ×

یہ قیاس ہوتا تھا کہ یہاں چرواہے یا کاشتکار رہتے ہونگے۔ ان جھونپڑیوں کے کچھ نمونے اب بھی الیسٹریاس اور جلیقیہ کے جنگلی علاقوں میں نظر آجاتے ہیں۔ یہ جھونپڑیاں کیا تھیں، جانوروں کے رہنے کے بھٹ تھے، جو پتھروں اور ان گھڑ لکڑیوں سے بنائی جاتی تھیں، اُن کے اوپر چھپر ہوتا تھا اور اس میں دھواں نکلنے کے لئے ایک دھالا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ان کی دیواریں دھوئیں اور چکنائی سے کالی ہوجاتی تھیں۔ کونے کونے میں کوڑا کرکٹ اتنی مدت جمع رہتا تھا کہ کیڑے پڑ جاتے تھے۔ ان جھونپڑیوں کے رہنے والے صورت سے تو ذہین معلوم ہوتے تھے مگر حقیقت میں اُن میں اور وحشیوں میں بہت ہی کم تفاوت تھا۔ اُن کا لباس بھیڑوں، یا کسی اور صحرائی جانوروں کا چمڑہ ہوتا تھا، جو کبھی نہ بدلا جاتا تھا، اور ایک خاندان نسلاً بعد نسلٍ اُسی کو پہنتا چلا آتا تھا۔ منہ ہاتھ دھونے یا غسل کرنے کی مفید عادت سے وہ واقف ہی نہ تھے۔ اُن کا لباس کبھی نہ دھلتا تھا نہ صاف کیا جاتا تھا، اور اُس وقت تک بدن پر رہتا تھا کہ جب تک وہ خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بدن پر سے نہ گر جائے۔ کسی درخت کی جڑوں، ساگ پات، یا شکار سے وہ اپنا پیٹ پال لیتے تھے۔ اگر کبھی منہ کا مزہ بدلنے کو جی چاہتا تھا تو ایسی چیزوں کا ساگ توڑ لاتے تھے جن کے بیج وہ علاقہاء جنوبی سے لاکر بوتے رہتے تھے۔ روٹی کھاتے تھے تو بلوط وغیرہ کی۔ نہ ان میں اخلاق تھے، نہ آداب، پردہ یا حجاب یا شرم کوئی چیز نہ تھی، ایک بھائی دوسرے کی جھونپڑی میں بے تکلف و بے اذن گھس جاتا تھا۔ ایک آزاد قسم کا سیاسی انتظام ان میں سے ہر ایک برادری میں مروج تھا چونکہ ایک گاؤں دوسرے سے فاصلہ پر تھا، مفلسی اُن میں انتہا درجہ کی تھی، اُن کی خصلتیں وحشیوں کی سی تھیں، اس لئے سلطنت و نظام سلطنت کا کیا ذکر، اور اُسکے خرچ برداشت کرنے کی کس کو پڑا۔ وہ اقوام کہ جو انسانیت کی ابتدائی منزل میں ہوتی ہیں سن و سال کا احترام کرتی ہیں، وہی کیفیت ان لوگوں کی تھی۔ بوڑھوں کو کم عمروں پر کچھ اختیارات حاصل رہتے تھے، اور

لیتے۔ آخر اس کی قبر پر ایک گرجا بنا دیا گیا۔ (مترجم)

(۳۱) ڈاگوبرٹ = DAGOBERT زمانۂ قدیم کا کوئی مشہور بادشاہ ہے۔ مجھے اس کا کہیں حال نہیں ملا۔ (مترجم)

(۳۲) ٹورس = TOURS فرانس میں ایک پرانا شہر ہے۔ کسی زمانہ میں صوبۂ ٹورین کا صدر مقام تھا۔ اب ضلع کا صدر ہے۔ ایک سیر حاصل مسطح وادی میں آباد ہے۔ دو تین بڑے بڑے گرجا ہیں۔ سینٹ مارٹن کا گرجا چوتھی صدی مسیحی کا بنا ہوا ہے۔ اس مقام کی سب سے زیادہ شہرت امیر عبدالرحمن اور چارلس مارٹل کی لڑائی کی وجہ سے ہے جس نے مذہب مسیحی کو یورپ میں باقی رکھ لیا۔ (مترجم)

(۳۳) لیئژ = LIEGE بیلجیم کا ایک بڑا خوبصورت شہر ہے۔ اس میں بہت سے گرجا اور اچھی اچھی عمارتیں ہیں۔ قابل دید شہر تھا، مگر پچھلی جنگ میں جرمنوں نے اسکو بیطرح تباہ کیا۔ (مترجم)

(۳۴) ثور = THOR رعد کا دیوتا، اوڈن اور زمین کا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سِف ہے جو دوستی و آشنائی اور عشق کی دیوی کہی جاتی ہے۔ اس کا محل ۵۴۰ ستونوں پر قائم ہے یہیں اس کے سامنے وہ جنگجو پیش ہوتے ہیں جو کسی لڑائی میں کام آتے ہیں۔ اسکے رتھ میں بکرے لگے ہوئے ہیں جب وہ اس رتھ کو کھینچتے ہیں تو رعد کی آواز نکلتی ہے۔ جوان آدمی ہے، سرخ داڑھی ہے، انس و جن سب سے زیادہ طاقتور ہے اور دیوتاؤں پر جب مصیبت پڑتی ہے تو اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ دیو تو بالخصوص اس کے نام سے ڈرتے ہیں کیونکہ ثور ہمیشہ انہیں اپنے ہتھوڑے سے مارتا رہتا ہے۔ یہ ہتھوڑا وہ پھینک کر مارتا ہے، مگر وہ پھر اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اس ہتھوڑے کا نام مارٹل ہے۔ جو متبرکانہ حیثیت عیسائیوں کے یہاں صلیب کی ہے وہی حیثیت قوم ٹیوٹن میں مارٹل (ثور کے ہتھوڑے) کی تھی۔ ایک دفعہ زنڈ گارڈ کے سانپ کو اس نے مارا تو اس کا زہر اس کا چڑھ گیا اور وہ مر گیا۔ اس کی صفات کہاں تک بیان کی جائیں، مختصر یہ ہے کہ یورپ کی وحشی اقوام میں سے شائد ہی کوئی قوم ایسی ہے جو اسے نہ پوجتی ہو اور مارٹل کو متبرک نہ سمجھتی ہو۔ (مترجم)

(۳۵) مارسیلیس = MARSEILLES بحر روم پر فرانس کا سب سے پہلا بندر مشہور و معروف ہے ۔ ۶۰۰ ق م میں یونانیوں نے بسایا تھا ۔ یہاں والوں کا رومیوں سے اتحاد رہا ۔ مگر آخر اس پر جولیس سیزر نے قبضہ کر لیا ۔ آٹھویں صدی میں عربوں نے اس کو تباہ کر ڈالا ۔ پھر پروونیس میں شامل ہوا ۔ موروں سی اس اُن ہی کا ایک نواب اور اس پر حکمران تھا ۔ آخر چارلس ہشتم بادشاہ فرانس نے اس پر قبضہ کیا ۔ الجیریا کی فتح سے اس کے ترقہ میں بہت ترقی ہوئی ۔

(۳۶) سیکسن = SAXON اصل میں جرمن نسل کی ایک مشہور قوم ہے ۔ انہوں نے رومیوں پر بھی حملہ کیا تھا اور جگہ بھی تباہیاں لائے تھے ۔ آخر انگلستان میں اپنا گھر بنا کر بیٹھ رہے ۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے ۔ (مترجم)

(۳۷) اسے وگنان = AVIGNON پروونیس کا ایک شہر ہے جو جنوب فرانس میں واقع ہے ۔ اس کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ ایک زمانہ میں پوپ یہاں بیٹھے رہے ہیں اور یہاں بہت سے گرجا اور دیر وغیرہ ہیں ۔ لطف یہ ہے کہ جب پوپ یہاں سے منتقل ہوئے تو دو آدمی ایسے بھی یہاں رہے ہیں جو پوپوں کے جانی دشمن اور اُن کے اصول کے سخت معاند تھے ۔ یہاں دو مذہبی کونسلیں بھی منعقد ہوئی تھیں ۔ (مترجم)

(۳۸) میگیولان ۔ مجھے اس کا حال نہیں ملا ۔ (مترجم)

(۳۹) لیوٹ برانڈ ۔ بشرح صدر (مترجم)

(۴۰) لومبارڈس = LOMBARDS باشندگان جرمن کے نسل سے ہیں ۔ چونکہ لمبی داڑھیاں رکھتے تھے اس لئے اس نام سے موسوم ہوئے ۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی مگر بڑے بہادر تھے تیسری صدی میں انہوں نے یورپ میں اپنے بڑے کارنامے دکھلائے ۔ ڈینیوب تک مار دھاڑ کرتے ہوئے پہنچ گئے ۔ عیسائی ہو کر ایرین کا مذہب اختیار کیا ۔ چھٹی صدی مسیحی میں ان کو بہت عروج حاصل ہوا اور نویں صدی کے شروع میں زوال آ گیا ۔ ان کی تاریخ بھی دلچسپ ہے ۔ مگر یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے ۔ (مترجم)

(۴۱) گریگوری اعظم GREGORY THE GREAT معمولی خاندان کا آدمی تھا مگر اپنے جوش مذہبی اور خدمات دینی سے ۵۹۰ء میں پوپ بنایا گیا۔ دین مسیحی کی اشاعت میں اس نے بڑی کوشش کی اور اس کو خوب بڑھایا۔ چنانچہ انگلستان کو اسی نے عیسائی کیا۔ لومبارڈوں نے جب سپین پر حملہ کیا تو موخر الاسم کو اسی نے مدد دی۔ اپنے تعصب میں زمانۂ قبل از مسیح کی بنی ہوئی بہترین عمارات کو اس نے تباہ کیا۔ فلسطین کے کتب خانہ کو یہودیوں کے علم ادب اور یہودیوں کے مذہب کا ممد کہہ کر جلوایا مگر جیسی کہ ایک اقبالمند قوم سے امید کی جا سکتی ہے آج ان دونوں باتوں سے انکار کیا جاتا ہے بلکہ بجاء اس کے یہ کہا جاتا ہے کہ غیر عیسائیوں اور یہودیوں پر وہ بہت مہربان تھا ۔ (مترجم)

(۴۲) ڈروڈ = DRUID یورپ میں ایک عجیب فرقہ تھا، جو اس کا قایل تھا کہ روح کو کبھی فنا نہیں۔ وہ تناسخ کو مانتا تھا اور اسی بنا پر یہ تعلیم دیتا تھا کہ لڑائی اور اس میں مرنے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ یوں اس فرقہ کی تعلیمات سخت خوفناک تھیں۔ تمام قضایا ان کے سامنے پیش ہوتے تھے اور ان کا فیصلہ یہی لوگ کرتے اور سزائیں اور انعام دیتے تھے۔ ان کے نزدیک شاہ بلوط کا درخت بہت متبرک تھا۔ اور بھی چیزوں کو پوجتے تھے۔ جادو کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کے حالات بہت دلچسپ ہیں ۔ (مترجم)

(۴۳) ووڈن = WODEN یا اوڈن = ODEN باشندگان سیکنڈی نیویا (سویڈن اور ناروے) کا سب سے بڑا دیوتا۔ کہا جاتا ہے کہ دو بھائیوں نے یمر کو مار ڈالا اور اس کے جسم سے دنیا کو پیدا کیا۔ اس کے گوشت سے خشک زمین بنائی؛ خون سے سمندر؛ ہڈیوں سے پہاڑ؛ کھوپری سے آسمان کو محراب کی شکل کا؛ بھووں سے زمین کا وہ درمیانی حصہ جہاں انسان رہتے ہیں۔ اوڈن ہی زمین اور آسمان کا حاکم ہے، وہی عالم الغیب ہے۔ آسمان کے بادشاہ کی حیثیت سے وہ ولسک جاف میں رہتا ہے اور وہاں سے اپنے دو کالے کووں کو بھیجتا ہے کہ وہ یہ خبر لائیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بحیثیت جنگ کے دیوتا کے اس کا اجلاس ولہلا میں ہوتا ہے۔ جتنے آدمی جنگ میں مارے جاتے ہیں وہ سب یہیں اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اوڈن کے مختلف نام ہیں۔ ایک خاص تالاب کا پانی پی کر

وہ سب سے زیادہ عقلمند ہو گیا ہے مگر اس کے لئے ایک آنکھ کھونی پڑی۔ اگرچہ اس کے پجاری سکینڈی نیویا میں بھی کم نہ تھے مگر ڈنمارک میں اُس کے پوجنے والے بہت ہیں۔ یہاں اب بھی وہ ایک شکاری کی صورت میں جنگلوں میں پھرتا رہتا ہے۔ اس کے پوجنے کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ہے مگر کہاں تک بیان کیا جائے۔ (مترجم)

(۴۴) البی جن شی ان = ALBEGENSIN تیرھویں صدی کے شروع میں جتنے آدمی پردوینس اور لینگیوڈاک میں رہتے تھے حقارتاً اسی نام سے موسوم تھے کیونکہ وہ پوپ کو نہ مانتے تھے، اور غیر عیسائی، بالخصوص مسلمانوں سے بہت خلا ملا رکھتے تھے انکو پناہ دیتے اور ان کی قدر کرتے تھے آخر پوپ انوسینٹ سوم کی ان پر نظر عنایت ہوئی اور اُن کو تباہ کر ڈالا۔ انتہا ہے کہ ایک ہی دن میں بیس ہزار (بقول بعض چالیس ہزار) بے گناہوں کو قتل کرا ڈالا۔ ایک شخص نے یہ کہا بھی کہ ان میں بہت سے کیتھولک ہیں تو یہ حکم لگایا گیا کہ "سب کو قتل کر دو۔ جو خدا کے خاص بندے (کیتھولک) ہیں۔ اُن کو وہ عاقبت میں بڑے درجے دیگا" مفصل قصہ تیسری جلد میں پڑھئے۔ نہایت دلچسپ ہے (مترجم)

(۴۵) زرن باک = ZERN BOCK یہ بھی سکینڈی نیویا کا دیوتا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

(۴۶) لسے شی اس = AETIUS مجھے اس کا حال کہیں نہیں ملا۔ (مترجم)

(۴۷) چے لون = CHALON فرانس میں ایک میدان ہے۔ یہاں کئی لڑائیاں ہو چکی ہیں (مترجم)

(۴۸) لائر = LOIR جنوب فرانس میں ہے۔ (مترجم)

اگر مُسن آدمیوں میں سے کوئی شکار کرنے میں اپنی ہوشیاری یا دشمن کے مقابلہ میں شجاعت دکھلاتا تو وہ ضرور یہی سرگروہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ اس زمانہ سے صدیوں پیشتر عیسائی واعظین ان کھنڈروں میں پہنچ اور اصول اناجیل کو اس ظلمت کدہ تک پہنچا چکے تھے؛ گرجا اور کلیسا بھی بنا دیئے تھے مگر یہاں رومن کیتھولک مراسم کے ساتھ وحشیان قدیم کے معبود بت بھی پوجے جاتے تھے اور واہمہ پرستی ہوتی تھی، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مذہب بھی صدیوں سے چلا آتا تھا، اور وہ اُن کو عزیز تھا۔ اہالی آئبیریا کے بہت سے رسم و رواج اور عادات، گو محققین زمانہ قدیم کی توجہ کے لائق ہوں، مگر وہ ایسے تھے کہ ناگفتہ بہ۔ ایسی سرزمین پر جہاں اس قسم کی رکاوٹیں اور خرابیاں تھیں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جانے والی تھی جس کے قبضۂ قدرت میں دو بر اعظموں کے نہایت دولتمند اور سرسبز علاقے آنے والے تھے؛ اس سلطنت کو اپنی زبان، اپنے خیالات، اپنی پالیسی، اپنے مذہب اپنے اقتدار کو اس سرزمین پر شائع کرنا تھا جو دنیا کے انتہائی کونے میں پڑی تھی کہ اُس کا اب تک کسی کو علم بھی نہ تھا؛ اس سلطنت کو مشہور ترین بادشاہان یورپ کے غرور اور عظمت کو خاک میں ملانا تھا؛ اس سلطنت کو آزادی خیال اور آزادیٔ فرات کو روکنے کے لئے ایسی کلیں ایجاد کرنی تھیں کہ اب تک مدنیت اور ناپاک واہمہ پرستی کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھیں؛ اس سلطنت کو تہذیب و تمدن میں وہ لطافتیں پیدا کرنی تھیں جنکا ذکر قصہ کہانیوں بھی نہ آتا تھا؛ اس سلطنت کو اپنی توجہ اُن اقوام کو نابود کرنے کی طرف مائل کرنی تھی جن کا اگر کوئی قصور تھا تو صرف اتنا کہ اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کے خدا کا نام بھی سُنا تھا اور اُن کی تہذیب اس بادشاہ کی تہذیب و تمدن سے بدرجہا زوہ حالت میں تھی۔[*]

---

[*] مصنف علام کا اشارہ سپین کے اُس عارضی عروج کی طرف ہے کہ جو اُس کو مسلمانوں کے قتل و غارت کے وقت حاصل ہو گئی تھی۔ یہی زمانہ تھا کہ کولمبس نے مسلمانوں کے زر فرڈی ننینڈ، اور مسلم خوار ازابیلا کے سامنے امریکہ کو پیش کیا تھا۔ اہالی سپین مسلمانوں کا خون پی کر موٹے ہو رہے تھے؛ (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۴۰ پر ملاحظہ ہو)

شرقیئین نے جب اس ملک میں آکر واڈلیٹ (وادیٔش) کی لڑائی کو سر کیا تو ان کی دہشت اتنی پھیلی کہ لوگوں نے جوق در جوق آکر شمال میں پناہ لی۔ جو لوگ کہ فرار کی مصیبت یا متغلبین کی تلوار سے زندہ بچے انہوں نے ایسٹریاس کے دشوار گزار اور نامعلوم پہاڑوں میں آکر پناہ لی۔ بھاگتے ہوئے جتنی چیزیں وہ اپنے سروں پر اٹھا سکے غیر عیسائیوں کی بے ادبی سے بچانے کے لئے اپنے ساتھ لیتے آئے، ان ہی میں ان کے خانگی بت، اولیاء اللہ کے تبرکات، قربانگاہوں کے اثاث البیت وغیرہ تھے۔ ان پناہ گزینوں پر جو مصیبت پڑی تو وہ اپنے خود ساختہ درجہ و رتبہ اور قومی عصبیت کو بھی بھول گئے، گاتھ، رومن، آئے بیرین اور باسک، آقا و غلام، سب دوستانہ ایک دوسرے سے مل جل گئے۔ کوہستانیوں نے نہایت کشادہ پیشانی اور مہمان نوازی کے ساتھ ان پناہ گزینوں کو اپنے یہاں مار دی، ان کی ہمدردی میں اس لئے اور بھی اضافہ ہوا کہ دونوں ایک ہی مذہب کے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بد قسمت جلاوطن پناہ گزین اس زندگی کے خوگر ہو گئے جو گو ان کو عمرانی دنیا سے الگ کئے ہوئے تھی، مگر غنیمت ہے کہ وہ یہاں کفار کی دست درازی سے تو محفوظ تھے۔ شدہ شدہ انہوں نے اپنے محسنوں سے بے انتہا اختلاط پیدا کر لیا، اور ان ہی میں اپنی شادیاں کر لیں، اس سے ایک نئی قوم پیدا ہو گئی مخلوط خون اور نئی آب ہوا نے اپنا لازمی اثر پیدا کیا، جس میں آئے بیریا کا اثر زیادہ نمایاں تھا، اور لاطینی و گاتھی جذبات بہت دبے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے جزیرہ نماء اندلس کے حصص مسلمانوں کے

بقیہ (بقیہ نوٹ پچھلے صفحہ کا) انہوں نے اسی زمانہ میں پوپ کو بھی ذلیل کیا، بڑے بڑے بادشاہان یورپ سے جنگ چھیڑی، خون تو منہ کو لگا ہوا ہی تھا امریکہ میں پہنچ کر وہاں کے باشندوں کو تباہ کیا۔ محکمۂ احتساب نکالا۔ مگر یہ سب کچھ سراب تھا اور ہانڈی کا ابال کہ چند ہی روز میں ختم ہو گیا۔ آخر انگلستان نے ان کے بیڑے کو ایسا غرق کیا کہ وہ اس حال کو پہنچ گئے جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ سلطنت مسیحی نہ ہوتی تو اب تک یورپ کے کام وہاں کی تواضع میں صرف ہو چکی ہوتی۔ (مترجم)

قبضہ میں آتے گئے اس علاقہ کی آبادی بڑھتی چلی گئی۔ خانہ جنگیوں میں جو تشددات ہوئے اُن سے بچنے کے لئے یہاں آدھی زیادہ پہنچتے گئے مخروج پادری، تباہ شدہ کاریگر اور مصیبت زدہ غلاموں نے اُن ہی لوگوں کی صحبت اور مدد ڈھونڈھی اور یہیں چلے آئے۔ بہت سے لوگ آیندہ کے خوف سے از خود اپنی جائدادیں چھوڑ کر بھاگ آئے نتیجہ یہ ہوا کہ الیسٹریاس اُن لوگوں کا عام مامن بن گیا جو ذرا سی بھی تکلیف میں پھنسے یا جنکو تکلیف میں پھنسنے کا ڈر ہوا۔ اُن ہی میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو دوسری جگہ کسی کے دست نگر نہ رہنا چاہتے تھے اور دینی اور سیاسی آزادی کو ڈھونڈھتے تھے۔ آزادی کے فواید کے ساتھ یہ بھی لطف تھا کہ اُن کو متبرک صحبتیں بھی میسر آگئی تھیں۔ ملک کے جتنے متبرک اور شاندار گرجا تھے، اور جن میں تبرکات کا بہت بڑا ذخیرہ رہتا تھا اُن میں سے اکثر کو حملہ آوروں نے ناپاک کر دیا تھا؛ بہت سے گرجا منہدم کر دیئے گئے تھے؛ اور بہت سے گرجاؤں کو انہوں نے مسجدیں بنا لیا تھا۔ پادریوں نے اپنی عزت یوں رکھ لی کہ روحانیت کے وہ قیمتی آثار، جنکے اثرات بے تعداد کرامتوں سے ثابت ہو چکے تھے، اور جن کی بڑے بڑے پادریوں نے تصدیق کی تھی، نہایت حفاظت کے ساتھ، پاک ہاتھوں نے اُن مقامات میں جا کر چھپا دیں جہاں حضرت مسیح کے دشمن نہ پہنچ سکیں۔ ان دینداروں کو اس سے بہتر کونسی عافیت اور اطمینان کی جگہ مل سکتی تھی کہ جہاں وہ تبرکات جمع تھے کہ جن کے سامنے نسل در نسل لوگ سر جھکاتے چلے آتے تھے۔ باوجود ہزار برس کی جنگوں اور انقلابوں کے شہدا کے ان تبرکات سے لوگوں کے اعتقاد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب یہ تبرکات بلور اور سونے کے نفیس اور بیش قیمت صندوقوں میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ اوویڈو[۱] کے گرجا میں زیارت کے لئے بند ہیں۔

چونکہ ابتدائی امراء اندلس اپنے دین کی اشاعت اور نئی سلطنت کی انتظامات میں مصروف رہے اس لئے اُن کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوئی کہ جزیرہ نماء

اندلس کے مغربی و شمالی حصہ میں ایک نئی قوم بن رہی ہے۔ اُن کے جاسوسوں کے گروہ نے، جو ایک زمانہ میں ایسٹریاس کی حد تک ہو آئے تھے آکر یہ کہہ دیا تھا کہ وہاں کی آب و ہوا نہایت ہی سرد اور خراب ہے، اور وہاں کی اراضی بھی قابل کاشت نہیں؛ نہ وہاں سے سوا بھیڑ بکریوں یا گرجاؤں کے مقدس برتنوں کے کوئی اور لوٹ ملنے کی امید۔ مسلمان جنوبی علاقے میں آباد ہو گئے؛ کیونکہ وہاں کی آب و ہوا اُن کے موافق تھی، اور وہاں کے قدرتی فوائد ہمیشہ اُن کو پُر تکلف ایشیا کی لطافتوں کو یاد دلاتے رہتے تھے۔ یہ لوگ ایسے علاقہ میں جانا ہی نہ چاہتے تھے کہ جہاں لرزا دینے والی ہوائیں، اور اندھا کر دینے والی آندھیاں چلتی تھیں۔ اُن کو خونخوار لوگوں اور گنواروں سے خلا ملا کرنے سے اتنا عار نہ تھا، جتنا کہ وہاں کی آب و ہوا سے ڈر تھا۔ موسےٰ (رحمہ اللہ) کو جب خلیفۂ دمشق نے دفعتاً طلب کیا ہے تو وہ اپنی فاتح فوج کو لئے ہوئے جلیقیہ تک پہنچ چکے تھے۔ اُن کے رسد رسانی کے سوار مختلف موقعوں پر قوم باسک کے علاقوں کو روند آئے تھے لیکن اس وقت تک مسلمانوں کا جھنڈا اُن تنگ راستوں میں نہیں لہلہایا تھا جو ایسٹریاس کے سنسان مقامات کو جاتے تھے؛ نہ اُن کی طبل جنگ کی آواز اُن سر بفلک دیواروں سے ٹکرائی تھی جو بقیۃ السیف وزیگا تھ کو محفوظ کئے ہوئے تھیں، اور اس وقت مذہب مسیحی آئے بیریا کی آزاد سلطنت کی آخری امیدگاہ بنی ہوئی تھی۔

بہت ہی پرانے زمانہ میں کہ جبکی کوئی تاریخ، ان واقعات کے موافق جو ہم تک پہنچے ہیں، نہیں قرار دی جا سکتی، ساحلی علاقے شرقیین کے ہاتھ میں پڑ چکے تھے۔ انہوں نے شہر گجون کو قلعہ بند کر لیا تھا، اور اس جگہ کو ایسا بنا لیا تھا کہ وہ بجا طور پر دار السلطنت کہلانے کا مستحق تھا۔ اس شہر کی حکومت عثمان ابن ابونسعہ جیسے آدمی کے ہاتھ میں تھی؛ جو نامور فوجی افسر تھے، اور طارق (رحمہ اللہ) کی فوج میں کار نمایاں کر چکے تھے، اور بعد میں امیر اندلس بھی ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انہوں نے ڈیوک آف ایکیوٹین سے سازباز کر لیا تھا، اور اسی علت میں اُن کو امیر عبدالرحمٰن نے فرانس پر حملہ کرنے سے پہلے مروا ڈالا تھا۔

اِدھر تو اہالی ایسٹریاس کو ساحل پر پہنچنے کے لئے راستہ نہیں رہا تھا؛ اُدھر وہ یہاں کی قید میں رہتے رہتے اُکتا گئے تھے، اس لئے اُنہوں نے اپنی حدود کو جنوب کی طرف پہاڑوں کے نشیب میں بڑھانے کی کوشش کی۔ باشندگان کوہ کے سپاہیانہ و متہورانہ جذبات نے اس تدبیر کو بہت ہی پسند کیا، اور سب کے سب اُس طرف مایل ہو گئے؛ خصوصاً اس لئے کہ اس سے اُن کو شہرت و نمود حاصل ہونے والی تھی۔ ان میں زیادہ تعداد اُن پناہ گزینوں کی تھی جو وزیگاتھ کی فوج میں کام کر چکے تھے؛ بہت سے آدمی ایسے بھی تھے جو شرقیین کے طریقۂ جنگ اور نظام فوج سے واقف تھے۔ ان میں سب سے مشہور پیلایوس (۳) نامی ایک شخص تھا جس کا نام تاریخ قیام سلطنت سپین میں بہت مشہور ہے۔ زمانۂ مابعد کے کلیسائی مورخین نے اپنے تخیل کا تمام زور اس پر ختم کر دیا ہے کہ اس شخص کو وہ عرش پر بٹھا دیں، اور اُس کے کارناموں کو اتنا بڑھایا ہے کہ اُس کو ایک نامور شجاع بنا دیں۔ اس معاملہ میں مورخین عرب زیادہ قابل وثوق ہیں۔ اگر اُنہوں نے اس شخص کے متعلق تفصیل سے کام نہیں لیا تو اسکی بیجا تعریف بھی نہیں کی؛ کیونکہ لاطایل قصے بنانے اُسکی کرامات ظاہر کرنے اور نہ ہی رنگ دینے سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بہترین اسناد سے جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں، اور ہم معترف ہیں کہ وہ چنداں قابل وثوق نہیں ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیلایوس لاطینی و گاتھ کے مخلوط النسل شخص تھے عرب اُن کو عام طور پر "رومی" کہتے ہیں۔ اُن کی اصطلاح میں رومی صرف وہی کہلا سکتا تھا جو خالصتاً نسل گاتھ سے ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ اکابر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے شاہ راڈرک کی فوج میں معزز عہدہ پر ممتاز تھے؛ جتنے شجاع و باسل آزمودہ کار تھے اُتنے ہی مسلمانوں سے نفور تھے؛ اس امر میں وہ خاص طور پر مشہور تھے کہ اسم کلیسا اور اہالی کلیسا کا جہاں تک تعلق ہے وہ ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے پناہ گزین اور اصلی باشندگان ایسٹریاس نے متفق اللفظ اُن کو اپنا سرکردہ بنا کر اُن کو اس مخدوش اور مشتبہ کام پر متعین کیا کہ وہ شرقیین کو نیچا دکھلائیں۔ ایک آزمودہ کار آدمی کی طرح نہایت

احتیاط، اور ایک حامی دین جیسے جوش سے انہوں نے اپنی فوج جمع کرنی شروع کی۔ ان کی آواز پر دیہاتیوں نے اس لیئے نہایت شوق سے لبیک کہا کہ ان کو فوجی مہمات بہت ہی عزیز تھیں، اور پناہ گزینوں نے اس واسطے کہ ان کو اپنی موجودہ مصیبت میں اپنی پہلی مرفہ الحالی، مالی نقصان، اعزا و اقربا کی موت اور تمام قوم کی تباہی کی تلافی کی امید تھی۔ جو فوج کہ اس سپہ سالار کے پاس تھی اسکی تعداد غالباً دو ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تعداد ان سپاہیوں کی تھی جو جانوروں کی کھالیں پہنے ہوئے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جن کے زرہ بکتر زیب تن تھے۔ اگرچہ یہ سب چیزیں اس زمانہ سے زنگ خوردہ ہو چکی تھیں کہ جب ؁ مبا برتخت تھا، اور عیش و عشرت کی گرم بازاری تھی، یا اس لیئے کہ جنگ میر پڑا اور رواڈلیٹ کے بعد ان کے پہننے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ آے بیر یا کے نیزے اور فلاخن اور کپن ٹابریا کے چھوٹے، مگر بھاری، چھرے ان کے ہتھیار تھے۔ اس فوج کے فیصدی دس آدمیوں نے بھی جنگ، یا میدان جنگ، نہ دیکھا تھا۔ ان میں سے فی صدی ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا کہ جس میں استقلال و ہمت ہوتی یا فرماں برداری کا نام بھی جانتا ہو جو سپاہی کا فرض اولین ہے لیکن باوجود اسکے ان میں مغرورانہ بلند نظری، تکبر، حب الوطنی اور خداء تعالےٰ کی حفاظت کا اعتقاد ہر ایک وحشی پہاڑی کے دل میں جوش زن تھا؛ یہی وہ باتیں ہیں کہ دنیا بھر کو فتح کر ڈالنے کے لیئے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی استقامت میں کوئی شبہ تھا ہی نہیں۔ ان میں تکلیف برداشت کرنے کی ہمت، اس پر سادہ خوراک، محنت کی عادت اور اس ملک کی سختی کی خوگری وہ صفات تھیں کہ جو ان کے دشمنوں میں نہ تھیں۔ اس لڑائی کو مذہبی رنگ دینے اور سپاہیوں کو انتہاء جوش دلانے، کے لیئے بہت سے پادری اپنے مجمر، تبرکات اور صلیبیں لیئے ہوئے ان کے ساتھ تھے۔ غرض یہ کیفیت تھی اس سپاہ کی جسکی باقیات کی سپہ سالاری گنزالو،[۵] کورٹس اور ایلوا[۶] جیسے ناموروں نے کی، اور جسکے موجودہ قلاش اور پناہ گزین سپہ سالار کی اولاد میں بہت سے نامور بادشاہ ہونے والے تھے ؛

پلایوس کی اصلی مملکت، یا ریاست، کچھ ایسی نہیں تھی کہ جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا کہ یہ وسعت پذیر ہوگی۔ اسکی حکومت پانچ میل لمبے اور تین میل چوڑے قطعۂ زمین پر محدود تھی، اور اسکی آبادی ڈیڑھ ہزار آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، ان میں سے مصافی آدمی پانچ سو سے زیادہ نہ ہونگے۔ فوج میں زیادہ تعداد قوم باسک اور اہالی جلیقیہ کی تھی، جو لوٹ کی امید پر آگئے تھے، اور اس وقت محض خطرۂ جان کی وجہ سے مجتمع، مگر پابندیوں سے گھبرائے ہوئے تھے۔ اُن کی کیفیت یہ تھی۔ کہ وہ اپنے ہی آدمیوں کی حکومت کے مطیع نہ تھے، شکست کے موقعہ پر سخت بُزدل اور خود مطلب تھے، اور فتح کے موقعہ پر بڑے خونخوار۔ نہ اُن میں کوئی نظام فوجی تھا، نہ افسر تھے، نہ اچھے ہتھیار، نہ رسد کا پورا انتظام، فنون جنگ سے وہ اتنے بھی واقف نہ تھے جتنے کہ نیم وحشی ہوتے ہیں۔ تدابیر جنگ بھی اُن کو وہی آتی تھیں جو وحشیوں کو معلوم ہیں، یعنی شبخون، بے خبری میں حملہ اور کمین گاہ کی لڑائی۔

اس نوزائیدہ سلطنت کے انتظام ملکی نے بھی کچھ ترقی نہیں کی تھی۔ پناہ گزین رعایاء راڈرک، ایک حد تک، سلطنت کے اصول اور روایات کو قائم رکھے ہوئے تھی، مگر جن لوگوں میں کہ ان کی قسمت نے ان کو لا ڈالا تھا، اور جنکی تعداد ان سے بہت بڑھی ہوئی تھی، وہ نہ قانون وزیگاتھ کو جانتے تھے، نہ اُس کو مانتے تھے۔ کنٹابریا کا تعلقہ، جس سے وہ برائے نام تعلق رکھتے تھے، سلطنت طُلیطُلہ کا برائے نام باجگزار تھا، جس قانون کے وہ پابند سمجھے جاتے تھے وہ بہت ہی پُرانے زمانہ سے چلا آتا تھا۔ چونکہ وہ ایک زمانۂ بعید سے مطلق العنان چلے آتے تھے اس لئے اُن میں غرور آگیا تھا، اور اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھنے لگے تھے، بعض وقت تو اسی وجہ سے وہ مضحک حرکات کر بیٹھتے تھے۔ سپین کے آئندہ نظام سلطنت میں ان جذبات کا کچھ کم دخل نہیں تھا۔

غرض یوں ایک ویران اور بنجر زمین میں، بہت ہی حقیر تعداد کے ساتھ، بغیر ذرائع، بغیر واقفیت فنون تہذیب و تمدن، بغیر فوجی نظام یا ملکی انتظام، بلا دار السلطنت، بلا مجالس

شورے دربار کے محض جوش مذہبی اور پرانی خواہش آزادی و مطلق العنانی سے ایک مٹھی بھر وحشیوں نے اُس مشہور سلطنت کی بناڈالی جو سپین سے نکل کر امریکہ تک پہنچ گئی ٭
پلایوس کی فوجی تیاریاں کچھ ایسے شور و غوغا سے شروع ہوئیں کہ دربار قرطبہ کی توجہ بہت جلد ادھر مبذول ہوگئی عنبسہ ابن صحیم امیر اندلس کو اسکی اطلاع دی گئی کہ پناہ گزیناں گاتھ اور قیدیان ایسٹریاس نے اتحاد کر لیا ہے اور رو بر انہاء شمال میں فوجی مہمات کی تیاریاں ہو رہی ہیں امیر اپنے دشمنوں کو حقیر سمجھتے تھے اس لئے اُن کو اُن لوگوں کے ملک سے واقفیت نہ تھی لہذا اُنہوں نے اُن مشکلات کے اندازہ کرنے میں غلطی کی جو اُن کے خلاف مہم میں پیش آنے والی تھیں، اسی بنا پر اُنہوں نے اس مہم کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ وہ بنفس نفیس ہاں جائیں۔ اُنہوں نے یہ خیال کر لیا کہ اُن معدودے چند پناہ گزینوں کی بے قاعدہ سی جھڑپوں کا کیا ڈر ہوسکتا ہے جو اپنی جان بچائے ہوئے ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں، جن کی ہمت کا یہ حال ہے کہ مسلمانوں کی آمد ہی سُن کر پہاڑ کی کھوؤں میں جا گھسے؛ اور اب اُن کے مددگار ہیں تو صرف چند چرواہے، یا وحشی شکاری، نہ اُن کو لڑنا آتا ہے نہ اُن میں کوئی نظام ہے اُنہوں نے اپنے دشمنوں کو حقیر سمجھنے میں اپنی آنکھوں پر اس طرح پٹی باندھی کہ نہ اُن کی شجاعت کو خاطر میں لائے، نہ اور بہت سی باتوں کا خیال کیا، جو مسلمانوں کی سلطنت پر آیندہ موثر ہونے والی تھیں۔ حالانکہ اُن کی تھوڑی تعداد بھی ایسے ملک میں بہت زیادہ تھی کہ جس ملک کو اب تک مسلمانوں نے دیکھا بھی نہ تھا؛ اور جسکے عمیق کھڈوں اور پیچ در پیچ راستوں نے حملہ آور کے مقابلہ کرنے میں ایسی آسانیاں پیدا کر رکھی تھیں کہ اگر بیس آدمی بھی کہیں چھپ بیٹھیں تو بہت ہی تھوڑا ہاتھ پیر ہلا کر ہزاروں کو وہیں کھیت رکھیں۔ امیر نے اس کا خیال ہی نہ کیا کہ اُس علاقہ میں اتنا کُہر رہتا ہے کہ تھوڑی سی دور کی چیز نہیں سُجھائی دیتی؛ وہاں اتنا گھنا جنگل ہے کہ کمین گاہ کا کام دیتا ہے؛ وہاں کی پہاڑی ندیاں یکایک چڑھ جاتی ہیں، وہاں کی مٹی ایسی خراب ہے کہ کھڑے کھڑے پیروں کے نیچے سے نکل جاتی اور عمیق گڑھا بنا

لیتی ہے۔ نہ اُنھوں نے اس کا لحاظ کیا کہ عیسائیوں کی اس وقت یہ حالت ہے کہ وہ اپنی
آزادی کی طمع میں جان کی پروا کرنے والے نہیں ہیں، اور اپنی آخری پناہ گاہ میں بھرے
ہوئے ہیں۔ البتہ اگر وہ پہاڑوں سے نکل آئیں تو اُن کے لئے موت رکھی ہے یا غلامی۔
چونکہ عربوں کا ایک دستۂ فوج سپٹی مینیا میں جا پہنچا تھا، اس لئے یہ لوگ فرانس کی طرف
نہیں جا سکتے تھے۔ اُن کے جتنے بھائی جزیرہ نماء اندلس میں تھے وہ چونکہ خلیفہ دمشق کا
طوق غلامی پہن چکے تھے، اس لئے اُن سے اُن کو کوئی مدد ملنے کی امید نہ تھی۔ اُن کی
حب الوطنی کی حرارت، امید آزادی اور بیم فضیحت غلامی سے بھڑک اُٹھی، اُن کا جوش
مذہبی اس خیال سے مشتعل ہو گیا کہ اُن کے آباد اجداد کا دین تباہ کر دیا گیا۔ اُن کے
رفیقوں میں اُن لوگوں کی یادگاریں تھیں۔ جن کے بادشاہوں نے روم جیسی سلطنت کو
نیچا دکھلایا تھا۔ اُن کے گرد ہر طرف وہ مقدس تبرکات تھے کہ جن کی زیارت کے لئے
دُور دور سے لوگ آتے تھے، جنکی برکت شفا بخشی کا ذرا سا بھی انکار دل میں لانا کفر تھا، جن کی
کرامت سے نہ صرف یہی ہوا ہے کہ تکلیفوں میں کمی آ گئی ہے بلکہ سکرات موت میں آسانی اور
نجات عقبٰے ہو گئی ہے خداوند تعالے نے اُن کو ان مقدس چیزوں کا امین مقرر کیا ہے، جن کو
وہ اُس کی بے حرمت شدہ قربانگاہوں سے لے کر آئے ہیں، ممکن نہیں کہ اس خدمت کے
عوض میں وہ اس مصیبت کے وقت اُن کی دستگیری نہ کریں ہر اُس تدبیر سے جو پادریوں کا خاص
حصہ ہے یعنی فصاحت و بلاغت سے، زبان زوری سے، ہر قسم کے وعدہ و وعید سے، آیندہ
تکالیف و مصایب کی دھمکیوں سے، انہوں نے اپنے مخاطبین کے جوش کو اُبھارا۔ حقیقت
یہ ہے کہ پادریوں کے سواء اور کوئی اُس وقت کی نزاکت حالت کا اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا۔
اگرچہ اُن کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ کسی زمانہ آئندہ میں اس دینی فرقہ کو وہ اقتدار حاصل ہو جائیگا
کہ جزیرہ نماء کے تمام کاروبار دنیاوی اُن کے ہاتھ میں آ جائینگے، مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ
موجودہ کشمکش کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یا تو کلیسا کو اقتدار کامل حاصل ہو گیا، یا خود اُن ہی کا نام و نشان

مٹ گیا۔ یوں سپین کی سلطنت قائم ہوتے ہی کلیسائی اُس پر چھا گئے۔ لطف یہ ہے کہ اس سلطنت کے زوال اور اسباب کے ساتھ سب سے بڑا سبب پادریوں کا اقتدار ہی ہوا۔ غرض ان تمام باتوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ الیسٹریاس کی فتح کے لئے بہت بڑی فوج اور ایسے تجربہ کار سپہ سالار کی ضرورت تھی جس کی نسبت یہ سمجھ لیا جاتا کہ خواہ وہ کتنا ہی قابل اور کار آزمودہ ہو مگر ایک ہی حملہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن امیر اس وقت فرانس کے حملہ کے لئے تیار۔ تھے ایک خانماں برباد مٹھی بھر آدمیوں کو سزا دینے کے لئے وہ اپنی اس بڑی مہم میں ہرج کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی فوج کا ایک چھوٹا سا حصہ علقمہ کو دے کر البسٹریاس کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ اُس علاقہ کو فتح کر کے وہاں کے باشندوں سے جزیہ وصول کر لائیں ۔

سوا اُن تکالیف اور مشکلات کے جو یورپ کے اس کاواک ملک میں لازماً پیش آنے والی تھیں علقمہ کو کسی طرح کی دقت پیش نہیں آئی اور وہ بڑھتے چلے گئے۔ جو جھونپڑیاں کہ اب تک آباد تھیں اُن میں آدمی نظر نہ آتا تھا۔ دامن کوہ میں بھیڑ بکریاں دکھلائی نہ دیتی تھیں کھیتوں کا نشان تک نہ تھا اور ہر وہ چیز کہ دشمن کے آذوقہ کے کام آسکتی تھی ضائع کر دی گئی تھی۔ تمام اراضی کی یہ کیفیت تھی کہ گویا وہ ازل ہی سے ویران پڑی ہوئی ہے اس خرابہ و بنجر میں سے بغیر کسی مقابلہ کے اور بلا کسی انسان کی صورت نظر پڑے علقمہ بے تکلف قلب البسٹریاس میں پہنچ گئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ان پہاڑوں نے ان کو جال میں پھانس کر وہاں پہنچا دیا کہ جہاں فوج کی زیادتی اُن کے لئے وبال جان ہو گئی اور جہاں سے رجعت سخت مشکل تھی ۔

اس خرابہ کے مشرقی حصہ میں پہاڑیوں جنگلوں گھاٹیوں اور چشموں کے بیچ میں اونٹے باکی اونچی چوٹی تھی۔ اس پہاڑ کے شمال کی جانب ایک بہت ہی بڑا کھڈ تھا اور

چونکہ وہ پہاڑ بالکل سیدھا تھا اس لئے اُس پر چڑھنا وہاں کے باشندوں ہی کا کام تھا جو
اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کردہ راستہ طے کر لیتے تھے اور بڑی بات یہ تھی کہ اُن کو عادت
بھی تھی۔ اس چوٹی میں ایک کھوہ ہے جسکے اندر تین سو آدمی بآسانی آسکتے ہیں اس کے نیچے
ہی ایک بڑی تیز ندی بہتی ہے جو آگے بڑھ کر دریاء ڈیوا بن جاتی ہے۔ یہاں ایک پہاڑی
راستہ نکلتا ہے جسکے دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں یہی راستہ متذکرہ بالا کھوہ کو جاتا ہے
زمانہ قدیم میں یہ صرف اس کام آتی تھی کہ اگر چرواہوں کو اسی کے قریب شام ہو جائے تو وہ
اپنا سر چھپا بیٹھیں۔ یہ مقام ہی ایسا ہے کہ گویا خداء تعالے نے اسی واسطے بنایا ہے کہ کوہستانی
یہاں بآسانی حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ پلایوس نے بھی اسکو اسی غرض کے لئے
انتخاب کیا۔ تمام غیر مصافی لوگ جنگل میں چھپا دیئے گئے۔ بہت سے آدمی اُس راستہ پر
کمینگاہیں بٹھا دیئے گئے جو ادھر آنے کے لئے ایک ہی تھا۔ ایک کھوہ موسومہ کوواڈونگا*
میں خود پلایوس اپنی فوج کے اُن منتخب آدمیوں کو لے کر بیٹھے جنکی نسبت وہ سمجھتے تھے کہ وہ
بڑے شمشیرزن اور ذی ہمت ہیں۔ اہالی ایسٹریاس آج تک اس کھوہ کی بڑی حرمت کرتے
ہیں مسلمانوں کو دیکھ کر مبارزین اس لئے باہر نکل آئے کہ اُن کو اپنے پیچھے لگالے جائیں۔
مسلمان اپنی پہلی کامیابیوں پر اتنے نازاں تھے کہ وہ بھی بلا پس و پیش ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے
نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُس وادی میں پہنچ گئے جو گویا اُن کا مدفن بننے والی تھی۔ جیسے ہی علقمہ کی
فوج کھوہ سے تیر کی زد پر پہنچی کوہستانی کمینگاہ سے نکل آئے۔ تمام پہاڑ میں ان کی آوازیں
گونج اُٹھیں اُنہوں نے اس طرح شور مچایا کہ گویا ان کو فتح ہو گئی ہے۔ ہر ایک عیسائی کے
ہاتھ سے پتھر اور تیر منجنیق مسلمانوں کے سروں پر پڑنے لگے جب فلاخنوں کے پتھر اور تیر کشوں
کے تیر ختم ہو گئے تو وہ غیر مصافی آدمی جو جنگل میں چھپے ہوئے تھے اب پہاڑ کی چوٹیوں
پر آ بیٹھے اور انہوں نے بڑے بڑے پتھر اور بڑے بڑے کٹے ہوئے درخت لڑھکانے

---

* COVADONGA

شروع کئے۔ ایک ایک پتھر اور درخت سے بیسیوں مسلمان دب مرے، کچھ حیرت، کچھ اپنی مصیبت، کچھ ایسے مقام پر حملہ کہ جہاں سے بچ نکلنے کی امید ہی نہ تھی، مسلمان ایسی گھبراہٹ میں پڑے کہ اپنے ہتھیاروں سے کام نہ لے سکے۔ اُن کے تیر چلتے تھے تو صرف پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر بغیر دشمن کو آسیب پہنچائے ضائع ہوتے تھے۔ عیسائیوں کی ستر پھرت، اور وہاں کی زمین کی کیفیت سے دست بدست لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی، عیسائیوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ دست بدست لڑائی سے بچتے ہی رہے۔ تیروں اور پتھروں کے طوفان سے مسلمانوں کی تعداد برابر کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے پس پائی کی کوشش کی، عیسائیوں کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا انہوں نے اور بھی سختی کے ساتھ حملہ کیا۔ اب تک پلایوں اپنی فوج کو لئے ہوئے موقعہ کے منتظر بیٹھے تھے، دشمنوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھ کر اُن پر عقب سے حملہ آور ہوئے مسلمان ہر طرف سے گھر گئے۔ اُن کی یہ کیفیت تھی کہ "نہ راہ رفتن نہ پاء ماندن"، مجبوراً انہوں نے اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دیا۔ اب تک تو لڑائی تھی، مگر اب اُس نے قتل عام کی صورت اختیار کر لی۔ مُوے پر سوُ درے غضب یہ ہوا کہ اُسی وقت باد و باراں کا سخت طوفان آگیا۔ مرطوب ملک کا خاصہ ہے کہ وہاں یہ صورت آناً فاناً پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ لمحے کے لمحہ ہی میں وہ ندی جس میں ذرا سا پانی نظر آتا تھا ایسی متلاطم ہوئی کہ سمندر کا مقابلہ کرنے لگی۔ ایک پہاڑی میں ان پہاڑیوں نے پہلے ہی سرنگ لگا رکھی تھی دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسلمانوں کے سر پر ٹوٹ پڑا، اپنے ساتھ ہزاروں کو دہیں دبا دیا، اور بہت سوں کو اُس ندی میں بہا لے جا ڈالا۔ بہت ہی تھوڑے آدمی آندھی اور اندھیرے کی پناہ میں کسی طرح کوہستانیوں کی نظر بچا کر بچ نکلے، کہیں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو وہیں کھیت رہے، جس میں افسر بھی شامل تھے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے نقصان کے تخمینہ میں اختلاف ہے، مسلمانوں نے کم اور عیسائیوں نے زیادہ ظاہر کیا ہے۔ بہرحال تین ہزار سے کم اور ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ جانیں نہیں ضائع ہوئیں۔ ابن واقعہ

نیز ادن واقعات میں جہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کی تفاصیل میں اختلاف ہو وہاں مسلمانوں ہی کے بیان کو زیادہ قابل وثوق سمجھنا چاہئے۔ کوواڈونگا کی وادی جہاں یہ لڑائی ہوئی تھی ایسی تنگ ہے کہ وہاں بیس ہزار سے زیادہ آدمی کھڑے بھی نہیں ہو سکتے چہ جائے کہ وہاں ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی جماعت لڑے۔ شمالی اندلس کے لافن لوگ اپنے گاسکانی بھائیوں سے کچھ کم متفاخر نہ تھے۔ انہوں نے اس جنگ کے حالات کو سخت مبالغہ اور رنگ آمیزی سے بیان کیا ہے حالانکہ اتنے سے واقعہ کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی۔ ان شیخی بازوں کے مبالغہ پر قرون مظلمہ کے کلیسائی مورخوں نے خوب ہی خوب دور از کار ایزادیاں کی ہیں۔ ان حضرات (موخر الذکر) میں کذب بہتان روزمرہ تھا اور حق وصحت اتفاقی۔ اپنے پیشہ کے تعصبات سے وہ مجبور تھے ہر اس قصہ و فسانہ میں وہ رنگ آمیزی کرتے تھے جس کو وہ دیکھ لیتے تھے کہ اُن کے اغراض و مقاصد کو فائدہ پہنچائیگا اس میں وہ ان شہادتوں کو نہایت احتیاط سے چھپا لیتے تھے جو اس کے منافی ہوں۔ راہب مورخ جتنے سادہ لوح تھے اُتنے ہی عجائب پسند واقع ہوئے تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ کلیسا کی شان وشوکت کا معیار غیر عیسائی لوگوں کے مقتولین کی تعداد سے ہے جو کلیسائیوں کے ہاتھ قتل ہوئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی ہر فتح میں وہ اپنے دشمنوں کے نقصانات کے متعلق نہایت بیہودہ بیانات کرتے ہیں۔ اُن کی یہ زبون عادت اس لئے اور بھی مستقل ہو گئی تھی کہ اُن کو یہ یقین تھا کہ ان کی دروغ بیانی کبھی ظاہر نہیں ہوگی کیونکہ اُس زمانہ میں تمام دنیاء مسیحی میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ پُرانے مورخین کا اس خصوص میں اور بالعموم ہر ایک واقعہ میں جس کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ اُنکے پیشہ پر پڑتا ہو قطعی غیر معتبر ہونا ثابت شدہ امر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُنکی ہر ایک تحریر خواہ کسی واقعہ کے متعلق ہو پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ نہایت اہم واقعات کے متعلق ان کی اختصار پسندی اور مختل و مشوش تحریرات حرکات انسانی کے پوشیدہ وجوہ تحریک سے

اُن کی جہالت اُن کے وہ اہمہ پرستانہ تعصبات تنقید تاریخی کے اصول سے اُن کی ناواقفیت
بلکہ اصول تاریخ کے سمجھنے سے اُن کی ناقابلیت کو جب اُن کی دروغ بافیوں پر اِزاد کیا جائے
تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اُس بدبخت پر کتنی مصیبت پڑتی ہوگی جو اس ادبی تودۂ طوفان سے
صحیح واقعات اخذ کرنا چاہتا ہو۔ عرب مورخین پر البتہ اعتبار کلی کر لینا چاہئے۔ وہ کبھی اس کی
کوشش نہیں کرتے کہ اپنی شکستوں کو چھپائیں یا دشمنوں کی کامیابی پر پردہ ڈالیں یا کم
کر کے دکھلائیں کسی ایسے شخص کی تاریخ ہم تک نہیں پہنچی جو خود کواڈونگا کی لڑائی میں شامل ہوا
ہو یا اُس زمانہ میں زندہ ہو۔ اس جنگ کی اہمیت سو برس کے بعد تسلیم کی گئی۔ اُس زمانۂ
اختلال میں پادریوں کی توجہ کلیسا کی طرف لگی ہوئی تھی جس کی حالت کچھ مشتبہ سی ہو رہی تھی
اور یکے بعد دیگرے بادشاہوں کے تخت پر بیٹھنے سے کلیسا کی آمدنی میں کمی آگئی تھی سلطنت
اسلامی کے معاملات بھی نہایت خراب ہو رہے تھے۔ مشرق میں مختلف دعویداروں کے
گروہ تخت خلافت کے لئے ایک دوسرے سے دست وگلو تھے۔ افریقیہ میں بربریوں
کی شر انگیز عادت ہر وقت بغاوت کو قائم اور باقی رکھتی تھی۔ جب خانہ جنگی سے کچھ امن ہوتا
تھا تو امراء اندلس اپنے بلند نظرانہ خواب دیکھنے لگتے تھے یعنی اشاعت اسلام نئے علاقوں
کی فتح کفار کی غلامی اور توسیع سلطنت۔ امیر اندلس کی نظر جب اُٹھتی تھی تو الیسٹریاس کی
سنگلاخ زمین سے ٹھوکریں کھاتی جنوبی فرانس کے سرسبز علاقہ سے ادھر نہیں ٹھہرتی تھی۔
جس مہم اور فتوحات کا نقشہ کہ موسےٰ ابن نصیر (رحمہ اللہ) نے اپنی خوش تدبیری کے بھروسہ
پر کھینچا تھا۔ وہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا تھا مگر وہ یا تو اس کو جانتے ہی نہ تھے یا اس سے
چشم پوشی کرتے تھے کہ ایک مٹھی بھر دیہاتی ایسے بھی بیٹھے ہیں کہ جن کی شجاعت اور استقلال
پر جزیرہ نماء اندلس کی اسلامی سلطنت کی ہستی یا نیستی کا اب بھی بہت کچھ انحصار ہے۔

کوواڈونگا کی جنگ کے جو نہایت مجمل حالات عربوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں اُن
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کو یہ شکست فاش کچھ بڑی اہم نہیں معلوم ہوئی۔ اس کا جو اثر

موجودہ عیسائیوں اور مسلمانوں کی اولاد پر ہونے والا تھا اُس کا اُنہیں خواب وخیال بھی نہ تھا۔ مگر بہرحال اس واقعہ کی تاریخ ہی سے عملی طور پر مسلمانوں کے انتزاع سلطنت کی بنیاد پڑ گئی تھی، حالانکہ اُس کو ابھی پوری طرح استحکام بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اُسی وقت سے کوہستانیوں کی طاقت بڑھنے لگی، جسکے بعد ہی بڑے بڑے علاقوں اور مملکتوں کا اتحاد والحاق ایک ہی سلطنت سپین کے علم کے نیچے ہونے لگا؛ اُسی وقت سے اُن کو باہمی امداد و اتفاق کی اُن لوگوں کے مقابلہ میں قدر ہوئی جو ہر وقت ایک دوسرے کی جان کے خواہاں رہتے تھے؛ اسی وقت سے اُن میں تخم آزادی بویا گیا اور اُن کو یہ جرأت ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے اسی آزادی کے طلبگار ہوئے، اور اراگون کے قانون میں وہ وہ قواعد وضوابط درج کرائے جن سے بادشاہ کی مطلق العنانی کم ہوئی؛ اُسی زمانہ میں مختلف النسل لوگوں کے اختلاط سے ایک ایسی زبان پیدا ہوگئی کہ جو اپنی حلاوت و لطافت سادگی و اختصار اور علوئے تخیل کی صفات میں کئی زبانوں سے بڑھ گئی؛ وہی وقت تھا کہ سب سے پہلے اس سلطنت نے یہ آثار دکھلائے کہ اُس کے افراد میں وہ جوہر سیر و سیاحت موجود ہیں کہ جو ایک نہ ایک دن سپین کا جھنڈا دریا مسّی سی پی× اینڈیس✻ اور بحر الکاہل پر نصب کرا کر رہیگی؛ اُسی وقت سے کلیسا کی پالیسی کی ایک خاص بنیاد رکھی گئی، جسکی تکمیل قابل اور بلند نظر پادریوں کے ہاتھ سے ہوئی؛ اور بطریقیہ طلیطلہ کے ہاتھ میں یورپ کے سب سے بڑے بادشاہ کا عزل و نصب آگیا؛ اُسی وقت سے وہ خونخوارانہ اور مستقل جذبات مقابلہ پیدا ہوگئے۔ جسکی ابتدا حفاظت خود اختیاری، توسط لوٹ مار اور انتہا بازیافت سلطنت تھی، اور جسکی طرف ایک ہزار سال کامل تک دنیا بھر کی توجہ رہی ؛

پلایوس کو کوواڈونگا کی فتح سے جو شہرت نصیب ہوئی تو وہ سپہ سالار سے دفعتاً بادشاہ بنالئے گئے۔ اُن کے انتخاب کے وقت قدیم گاتھک روایات و قانون پر پورا پورا عمل

× MISSISSIPPI ✻ ANDES یہ دونوں دریا امریکہ میں ہیں ؛

کیا گیا۔ ہر ملک کے کوہستانوں میں آزادی کا خیال بہت زیادہ ہوتا ہے؛ یہ لوگ کسی طرح اسکو گوارا نہیں کرتے کہ سلطنت نسلاً بعد نسل ایک ہی خاندان میں رہے یا یہ کہ بادشاہ مطلق العنان ہو جن جاہلانہ مراسم کے ساتھ سے اس مرش کو ہی کو اختیارات شاہی دیئے گئے، اُن سے کسی شخص کے ظن وگمان میں بھی یہ نہ آسکتا تھا کہ اسی شخص کے نام لیوا، چارلس پنجم وفلپ دوئم کی تخت نشینی کی مراسم میں انتہاء تکلف دکھلایا جائیگا، اور اُن کو مطلق العنان ومستبد بادشاہ تسلیم کیا جائیگا۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ پلایوس کے احکام بسا اوقات اُن کے نیم وحشی اردلیوں نے نہیں مانا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا اُن تمام اقوام میں، جو خاندان ایسٹریاس سے تعلق رکھتی تھیں، کہیں بھی ایسے آدمی مل سکینگے کہ جو اُن کی برابر مصیبت کے وقت میں وفادار اور خطرہ کی حالت میں بے باک ثابت ہونگے، جیسی کہ یہ مختصر سی جماعت عیسائیوں کو جو ایک طرح کی معافی عام شاہان قرطبہ نے فتح کے بعد دیدی تھی وہ گویا بنظر حقارت تھی نہ براہ خوف جو اُن کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ اس فتح کا اثر اگرچہ عربوں نے محسوس نہیں کیا، مگر اس سے اُن لوگوں کے لئے تین نتائج مترتب ہوئے جو ایسٹریاس کے حدود پر رہتے تھے۔ ساحل کے مچھیاروں نے اپنا طور وطریق کچھ ایسا گستاخانہ بنالیا کہ عثمان ابن ابونسعہ حاکم گیجون کو اپنا علاقہ چھوڑکر بیلغار بھاگ کر اپنے ہموطنوں کے پاس ماورائے کوہستان جانا پڑا۔ جذبات وخیالات جنگ بہت جلد کنٹابریا سے ہوتے ہوئے جلیقیہ تک جا پہنچے؛ بلکہ اسکے اثرات اُس علاقہ میں بھی ظاہر ہونے لگے جو آج کل لیون اور کسٹائل کہلاتا ہے؛ جو شرقیئین کہ سب سے زیادہ زرخیز مقامات میں جاکر آباد ہوگئے تھے وہ وہاں سے نکال دیئے گئے؛ چونکہ اس گلخپ کی دینی صورت کے ساتھ امداد ایزدی بھی شامل معلوم ہونے لگی تھی، اس لئے ہزاروں پناہ گزین ان کھوؤں میں پناہ لینے اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کی حمایت وحفاظت میں آزادی کا لطف اُٹھانے کے لئے آنے لگے۔

پلایوس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ جسکے بعد وہ بادشاہ بنادیئے گئے۔ اسکے سولہ

تاریخ یا روایات کوئی اور بڑا واقعہ اُن سے منسوب نہیں کرتے بقیہ زندگی اُنہوں نے اپنی چھوٹی سی سلطنت کے گوشہ میں کاٹ دی۔ جو عافیت اُن کو اس وجہ سے میسر ہوئی کہ اُن کے دشمن، مسلمان، اُن کو حقیر سمجھتے تھے اُسکو اُنہوں نے غنیمت سمجھ کر اپنے مملکت کے صلاح و فلاح و مضبوطی میں گذارا۔ حکومت کے قواعد و ضوابط مقرر کیئے، گرجا، دیر اور خانقاہیں بنوائیں اور اپنی رعایا کو کاشتکاری کی ترغیب دی۔ کلیسا کے فواید و اغراض کے لئے جو کام اُنہوں نے کیئے اُن سے پادری اُنہیں اب تک نہایت شکریہ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ کوواڈونگا کی لڑائی میں جو چھوٹی سی صلیب اُنہوں نے بطور علم استعمال کی تھی وہ آج تک اُویڈو میں محفوظ ہے۔ وہاں کے لوگ اُس کا بہت بڑا ادب کرتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خود ذات باری کے دست قدرت سے اُس میں وہ اثرات پیدا ہو گئے تھے جو کرامات سے کچھ کم نہیں ہیں رومن کیتھولک پادریوں نے رومی عقاب کو چھوڑ کر اسی کو اپنے مذہب کی نشانی قرار دی ہے جزیرہ نماء اندلس کے بادشاہوں نے جو فتوحات دور دراز ممالک میں کی ہیں یا نئے ممالک معلوم کئے ہیں وہ اسی صلیب کی برکت سے سمجھے جاتے ہیں۔

پلایوس کی حکومت کُل تیرہ برس رہی۔ اُن کی فیاضی سے پادریوں کو بہت فوائد پہنچے اور اُن کا عدل و انصاف عام رہا۔ اسکے معاوضہ میں جذبات شکر گذاری اور نمک حلالی نے صدیوں کی روایات کو بھلا دیا، اور یہ تعصب کہ باپ کی جگہ بیٹا تخت نشین نہ ہو فراموش ہو گیا، چنانچہ لوگوں نے اُن کے بیٹے فاویلا* کو تخت نشین کر دیا اور ضمناً تاج و تخت کے متعلق توریث کو تسلیم کر لیا۔

فاویلا کے حالات سواء اسکے کچھ معلوم نہیں کہ اُنہوں نے اپنی زندگی نہایت امن و عافیت کے ساتھ بسر کر دی۔ اُن کو نہ اپنی سلطنت کی وسعت کا خیال آیا، نہ فوجی ناموری کا، بلکہ خطرناک مگر مشتبہ خدشات و عزت جنگ پر گنواروں کی صحبت اور لطف سیر شکار کو ترجیح دی تخت پر بیٹھنے کے دو برس کے بعد ایک روز اُنہوں نے شکار میں ایک جنگلی سور کا پیچھا کیا، اور اُس میں

---

* FAVILA

کچھ ایسے مشغول ہوئے کہ پس و پیش کچھ نہ دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شکار نے خود اُن کو شکار کر لیا۔ وہ اپنے باپ کے برابر کلیسائے کنگاس ڈی اونس میں دفن ہوئے۔ یہ مقام ایک چھوٹا سا گاؤں کوواڈونگا کے پاس تھا۔ اس وقت اس گمنام مقام کو وہ عزت حاصل تھی کہ وہ ایسٹریاس کا دارالسلطنت کہلاتا تھا۔ یہاں کا گرجا سالہا سال تک اس سلطنت کے بادشاہوں کا زیارتگاہ رہا ہے۔

فاویلا نے جتنے بیٹے چھوڑے اُن کی عمریں ایسی نہ تھیں کہ اُن کے ہاتھ میں زمام سلطنت دی جا سکتی۔ ضرورت وقت اس کی داعی تھی کہ جو بادشاہ تخت پر ہو وہ صاحب فہم و فراست و تجربہ ہو۔ ناچار پھر وہی پرانا ضابطۂ انتخاب عمل میں لانا، توریث کے خیال کو چھوڑنا اور جوہر ذاتی کو تلاش کرنا پڑا۔ الفانسو اول پسر ڈیوک آف کنٹابریا اور داماد پلایوس کو نوزائیدہ سلطنت کے تمام عمایدین کے اتفاق راء سے تخت پر بٹھایا گیا۔ نیا بادشاہ مشہور سپاہی تھا، جو پلایوس کا رفیق جنگ رہ چکا تھا۔ اُن کے سپاہیانہ مذاق اور ہمت و استقلال سے اگر کوئی چیز بڑھی ہوئی تھی تو وہ اُن کا جوش مذہبی تھا۔ اسی وجہ سے وہ خطاب "کیتھولک" سے مخاطب کئے گئے اس پر اُن کی اولاد کو مدتوں فخر رہا، اور اس وقت بھی بادشاہ سپین کے خطابات کا یہ سب سے بڑا قابل احترام جزو ہے۔ کنٹابریا کی ریاست کا بڑا حصہ کچھ تو مسلمانوں کی چھین جھپٹ کے نذر ہو چکا تھا، اور کچھ پلایوس دبا بیٹھے تھے؛ اب وہ تمام ممالک ایسٹریاس کا حصہ بن گئی۔

الفانسو کے سینہ میں صلیبی لڑائی اور فتوحات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ اُن کی حدت مزاج روکے نہ رک سکی اور اُنہوں نے کفار کے خلاف مسلسل جنگ کا اعلان کر دیا۔ جو علاقے اُن کے پاس تھے اُس میں پلایوس کی تخت نشینی کے وقت سے جس کو بیس برس گذر گئے تھے بہت بڑی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ وہاں کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی، جس کی وجہ کچھ تو قدرتی اسباب تھے، اور کچھ یہ کہ لوگ آزادی کی تلاش میں فاتحین کی سختیوں سے تنگ آ کر

ALFONSO I * CANGAS de ONIS ×

یہاں آبسے تھے اور آزادی کی ہوا کھا رہے تھے۔ پرانے زمانہ کے غلیظ جھونپڑوں کی جگہ اب اُس دلکش وادی میں آرام دہ اور خوبصورت مکانات بن گئے تھے۔ دامن کوہ میں گرجا اور خانقاہیں نظر آنے لگی تھیں۔ رعایا کے مقدمات و معاملات طے کرنے کے لئے دستور العمل بن گئے تھے، گو وہ بھدّے تھے، مگر سب وزیگاتھ کے قوانین پر مبنی تھے۔ اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ جہاں یہ دستور العمل شاہی اختیارات کو محدود نہ کریں وہاں عوام الناس کو برکات آزادی سے بھی محروم نہ ہونے دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک بادشاہ براءِ نام ہی اختیارات رکھتا تھا، جو کچھ بھی تھے وہ خود رعایا کے عطیہ تھے، اور اس شرط سے مشروط کہ بادشاہ قانون کا نگران رہیگا اور امن کو قائم رکھیگا۔ اس وقت ایسٹریاس کے بادشاہ کی حیثیت جرمنی کے موجودہ باجگزار رئیسوں سے کسی طرح زیادہ نہ تھی، فرانس کے مے ار آف دی پلیس× کے اختیارات سے تو اُن کے اختیارات بدرجہا کم تھے۔

الفانسو کو اپنے ارادوں کے پورا کرنے کا اس وقت سے بہتر موقعہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ عقبہ، امیر اندلس، چند روز کے لئے افریقیہ گئے ہوئے تھے، اس لئے امارت خالی تھی۔ تمام جزیرہ نماء اندلس میں ایک آشوب برپا تھا، اور اسکے ساتھ وہ تمام خرابیاں، جو ایسے موقعہ پر ہُوا کرتی ہیں، زوروں پر تھیں۔ جو علاقے کہ مسلمانوں نے فرانس میں لے کر اپنے نام کے ساتھ چار چاند لگائے تھے، اور جنکو مسلمانوں نے اپنی فتوحات یورپ کا بنیادی پتھر سمجھا تھا، وہ اہالی فرانس کی بہادری، امراء اندلس کی نالیاقتی، اور باہمی بغض و عناد سے باستثناء ناربون، سب ہی تو چھن گئے۔ شرقیئین کے متعلق عام طور سے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ اُن کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے، مگر مختلف پس پائیوں، اور خاص کر پائے ٹیرس کی مصیبت سے وہ رعب خاک میں مل گیا۔ صوبہاء جلیقیہ و باسک کو دہقین ہی نے دشمنوں سے خالی کرا لیا تھا، اُن کو اپنے ہمسایہ باشندگان ایسٹریاس اور اُن کی بلند نظری سے بہت بڑی ہمدردی

× MAYOR OF THE PALACE

تھی؛ گو انہوں نے نہ اُن کے بادشاہ کو تسلیم کیا نہ اُن کی سیاسی گرفت میں اپنے آپ کو آنے دیا۔ الفانسو نے ہر ایک مہم میں ایسی چستی و چالاکی اور قوت فیصلہ کا اظہار کیا جس کی تجربہ کار سپہ سالار ہی سے امید ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جلیقیہ سے گذر کر یکایک لیوگو کو جا گھیرا جو موسے کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں چلا آتا تھا؛ اور اسکے بعد بہت ہی جلد بڑے مضبوط اور قلعہ بند شہر ٹوئی (۹) کو فتح کیا اور دریاء منہو (۱۰) کے تمام شمالی علاقہ پر فاتحانہ قبضہ کر لیا۔ یہاں سے وہ لوسی ٹینیا میں جا گھسے اور اسکے بعض بڑے بڑے شہروں کو لیتے ہوئے، مشرق کی طرف گئے، اور اس تمام علاقہ کو دبا بیٹھے جو سلسلہ کوہ کے شمال کی طرف واقع ہے اور سیرا واڈراما کہلاتا ہے۔

جن مورخین نے کہ الفانسو اول کی مہموں کا ذکر کیا ہے انہوں نے یہ غفلت کی ہے کہ واقعات کو تاریخوار یکے بعد دیگرے نہیں بیان کیا؛ اور اُن کی رفتار کو اتنا سریع بنلایا ہے کہ جو خارج از قیاس ہے حقیقت یہ ہے کہ "یہ فتوحات" جن پر اتنی شیخیاں بگھاری گئی ہیں بالکل معمولی غزوات تھے۔ ان "مفتوحہ" علاقوں پر وہ دائمی قبضہ نہ رکھ سکے۔ اول تو یہ علاقے کچھ زرخیز نہ تھے، پھر ان پر پڑے متواتر و مسلسل مصایب؛ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ گئے۔ جن معدودے چند سرسبز مقامات کو مسلمانوں کی محنت و مشقت نے دلکش باغ بنا دیا تھا، اُن کو الفانسو کے وحشی سپاہیوں کی آتش تباہی اور قتل و غارت نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ جو شہر یا قصبے اُن کے راستے میں پڑے اُن کو تباہ کر ڈالا اور مسلمانوں کو غلام بنا لیا۔ رہ گئے عیسائی؛ انہوں نے ہر امخالفت کی، مگر اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے گھروں کو چھوڑ کر حملہ آوروں کے ساتھ چلیں؛ پہاڑوں کی کھوؤں میں چل کر بسیں، اور وہیں سے بادشاہ کا حلف وفاداری اٹھائیں کسی مقام کی آبادی کو یوں بجبر بڑھانے کی پالیسی واقعی نئی تھی؛ اور انجام کار یہ کامیاب بھی بہت ثابت ہوئی۔ ان غریب ناخواستہ آبادکاروں کے شہر غیر آباد، اور اُن کی اراضی تباہ ہو ہی گئی تھی؛ کوہستان میں پہنچ کر پھر

اُن کو وہاں سے نکلنے بھی نہ دیا گیا؛ حالانکہ اس چھوٹے سے پہاڑی علاقہ میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ ان کے آذوقہ کا کفیل ہو سکتا۔ اگرچہ ان کو خانہ برباد کیا گیا؛ مگر بجاء اسکے کہ یہ لوگ اپنے ظالموں کے شاکی ہوتے تعلقات نسلی اور مذہبی کا ان پر کچھ ایسا زبردست اثر پڑا کہ اُنہوں نے ان کو اپنا دشمن نہیں سمجھا۔ دانشمندانہ طریق سے اُن کو ایسے مقامات میں آباد کر دیا گیا جو پوری طور سے آباد نہ تھے؛ اگرچہ ان میں سے بہت سے مقامات ایسے ناقابل کاشت نہ تھے جیسے کہ وہ چھوڑ کر آئے تھے، مگر اس نئی رعایاء الفانسو نے اپنی حالت پر صبر کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ اس بڑھنے والی سلطنت کی آبادی کو ان کی وجہ سے خوب فروغ ہوا۔ اُن کی "روایات قدیمہ" تعصبات اور بلند نظریاں بھی بالکل ویسی ہی تھیں جیسی کہ باشندگان الیسٹریاس کی۔ اس لئے اُن کو یہ معلوم ہوا کہ وہ غیر وطن میں ہیں۔ تعلقات تجارت اور برادرواری کی وجہ سے خانمان بربادی کا بار بھی اُن کو کچھ سخت نہیں معلوم ہوا، اور جب اُنہوں نے وہاں سلسلہ مناکحت بھی جاری کر لیا تو بس پھر تو وہ اُن ہی میں ضم ہو کر رہ گئے ۔

الفانسو کے کارناموں کو بیشتر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نہ اُن میں سلسلہ واقعات صحیح ہے نہ مقاموں کے نام درست ہیں۔ اگرچہ اُن دنوں کی تاریخ نگاری کا بھی انداز تھا، مگر الفانسو کے مورخ اتفاق سے اور بھی بدتر نکلے۔ اُن کے کارناموں کو تعصب مذہبی اور عجائب پرستی نے اور بھی بڑھا چڑھا کر دکھلایا ہے۔ مگر جو کچھ اور جیسی کچھ اُنکی تاریخ ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی "فتوحات" میں قتل عمد، لوٹ مار اور آتش زنی کا ایسا سلسلہ قائم رہا ہے کہ جو اُن کی زندگی بھر نہیں ٹوٹا۔ پہاڑوں پر چونکہ ہر گھاٹی کمینگاہ کا کام دے سکتی ہے اس لئے وہاں تو یہ پہاڑی شیر تھے؛ لیکن جب سطح میدان میں اُترتے تھے تو باوجود المضاعف فوج رکھنے کے بھی وہ مسلمانوں کے سواروں سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے، اور بھیگی بلی سے بدتر ہو جاتے تھے۔ بلکہ حالت کچھ اس قسم کی تھی کہ

وہ ایسٹریاس کے بادشاہوں کا ہمیشہ پامال رہتا آیا تھا' اس لئے الفانسو کو اپنی سلطنت کی حدود پر محافظت کے لئے قلعے بنانے کی ضرورت پیش آئی؛ چنانچہ اُنہوں نے سیرا کے جنوبی نشیب میں قلعوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے موجودہ نئے اور پُرانے کسٹائل کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ اُس زمانہ میں اس تمام علاقہ کا متحدہ نام بارڈولیا× تھا۔ ان ہی قلعوں کے سلسلہ کی وجہ سے دونوں صوبوں کا الگ الگ نام پڑ گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام زمانۂ سلطنتِ الفانسو برکات امن و عافیت سے محروم رہا' اُن کی مہمات متواتر جاری رہیں اور اُن کے نتائج ہمیشہ کامیاب رہے۔ اگر راہبوں کے حسنِ ظن سے قطع نظر کر لی جائے جنہوں نے الفانسو کو آسمان پر چڑھا رکھا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ضرور اُن سے دبتے تھے۔ یہ لوگ تھے بھی نہایت منصف مزاج اور سپاہیوں کے قدردان' غالباً اسی وجہ سے مسلمان مورخین نے اُن کو "ابن السیف" کا معزز اور بامعنی خطاب دیا تھا۔ اپنے مرتے وقت تک اُنہوں نے اپنی حدودِ سلطنت کو اتنا بڑھا لیا تھا۔ کہ وہ قریباً ایک ربع جزیرہ نماء اندلس کے مالک تھے۔ اُن کے مقبوضات اراگون سے اطلانطک تک اور سیرا واڈراما سے خلیج بسکے تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی حدود سلطنت کے جنوب میں جتنا علاقہ تھا اُسکے بڑے حصہ کو تو خود اُن ہی کے حملوں نے روند ڈالا تھا؛ وہ اُن کے خوف اور رعب سے ایک مدت مدید تک یوں ہی غیر آباد پڑا رہا۔ یہ علاقہ' جو کسی کی ملکیت نہ تھا' وہ خود آباد نہ کر سکے' کیونکہ اُن کے پاس اتنے ذرائع نہ تھے؛ اور شرقیئین نے اُس پر اس لئے قبضہ نہ کیا کہ اُس پر عیسائیوں کے حملہ کا ہر وقت وغدغہ لگا رہتا تھا۔ ادھر ۷۵۷ء میں الفانسو مرے' اُدھر اُسی سال میں مشہور و معروف خاندان بنو امیہ کا پہلا تاجدار اس سرزمین پر رونق افروز ہوا' جس کی دانشمندی اور جوہر دماغی نے الفانسو کے بیدار کردہ جذبات حب الوطنی کو اپنے فولادی ہاتھ سے روکے رکھا' جن کی وجہ سے پچاس برس تک مغرور

× BARDULIA

امراءِ اندلس کی غفلت اور فرقہ بندی نے ملک میں بدنظمی پیدا کر دی تھی اور کسی نے اس بڑھتی ہوئی طاقت کی طرف اپنے غرور کی وجہ سے توجہ نہ کی اس پالیسی یا غفلت نے بڑے تباہ کن نتائج پیدا کئے۔ ان کی طرف اُس وقت توجہ کی گئی کہ جب یہ مرض لاعلاج ہو چکا تھا یہ تاجدار بنو امیہ کی بہت بڑی قابلیت کی دلیل ہے کہ اُس نے سب سے پہلے اس خرابی کی طرف توجہ کی اور اُسکے انسداد کا فکر کیا۔

غرض یوں چند سال کے اندر خوف زدہ، بے خانمان پناہ گزینوں کے معدودے چند آدمی بڑھتے بڑھتے ایسی قوم بن گئی کہ جس نے اتنی مضبوط سلطنت قائم کر لی۔ جو مجلس شوریٰ کہ کسی بادشاہ کے انتخاب کے لئے قائم ہوتی تھی اُس نے ابتدا ہی سے وہ آزاد خیالی ظاہر کی کہ اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمانۂ مابعد میں قانوناً وہ آزادی مل جائیگی جس نے زمانۂ مابعد میں اتنی اہمیت حاصل کر لی، اور جس نے تاریخ سپین پر اپنا دائمی اثر ڈالا۔ برعکس اسکے اہلِ کلیسا کے لئے جو ضابطہ بنایا گیا اُسکے موافق اُن کو روم کا غلامانہ تابع فرمان ہونا پڑتا۔ اُس میں اُس خودداری و تشخص کا پتہ بھی نہ تھا جو وزیگاتھ کے قدیمی پادریوں کی خصوصیات تھیں۔ کلیسا پر ایسے مسلسل مصائب پڑے کہ انھوں نے اُس کے غرور کا خاتمہ کر دیا۔ کبھی اُن کے تبرکات کی بے ادبی کی گئی، کبھی اُن کی قربانگاہیں لوٹی گئیں، کبھی اُن کے خزانے ضبط کئے گئے، کبھی اُن کے پادریوں کی بے عزتی کی گئی، جس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اُن پر غضب الٰہی نازل ہوا ہے پادریوں کی دولت کے ساتھ اُن کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اُن کے جتنے مقلد تھے سب اِدھر اُدھر چل دیئے۔ اگر دیندار لوگوں کا افلاس اس حد تک پہنچ جاتا کہ اُن کے لئے چندہ کی ضرورت پڑ جاتی تو گرجاؤں میں نمازیں بند کر دی جاتی تھیں جن علاقوں میں کہ فاتحین نے اتنی مسامحت روا رکھی تھی کہ عیسائیوں کو اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کی اجازت تھی وہاں کسی کو عیسائی ہونے میں سخت دقتیں تھیں۔ نئے گرجا بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کسی مسلمان کو عیسائی کر لینے سے بڑا کوئی جرم

نہ تھا۔ جو شخص کسی کو عیسائی ہونے کی ترغیب دیتا تھا' اور جو کوئی عیسائی ہوتا تھا دونوں مستوجب سزا ہوتے تھے۔ اتنے مصایب اُٹھانے کے بعد قدرتی بات تھی کہ پادری اپنی امیدیں اس پوپ کے تخت سے وابستہ کریں کہ جسکے احکام کو وہ نہ سننے' بلکہ حقارت کے ساتھ رد کرنے کے عادی تھے تا ایں ہمہ جاہل اور واہمہ پرست دہقانیوں کے گروہ میں کلیسائیت کا وہ رعب اقتدار جو ایک زمانہ بعید سے چلا آتا تھا وہ اب اور بھی بڑھ گیا' اور پادریوں کو غیر معمولی عظمت حاصل ہوگئی۔ اُن ہی کا کام تھا کہ یہ نوزائیدہ سلطنت قائم ہوگئی' یہی اس کی پالیسی پر قابض تھے' اُن ہی نے اسکو ترقی دی' یہی اُسکی کامیابی سے مستفیض ہوئے یہی مصیبت کے وقت اُسکے باعث تسلی ہوئے' یہی اُسکی ترقیات سے خوش ہوئے۔ شروع میں بھی اُن ہی کا غلبہ رہا اور آخر تک اُن کی گرفت نرم نہیں ہوئی۔ بعض وقت تو یہ لوگ دانشمندانہ مشورہ دیتے تھے' مگر بیشتر اپنے تعصب اور جہالت کی وجہ سے ایسی رائیں دیتے تھے کہ جو ہر چیز پر سیاہی پھیر دیتی تھیں۔ یہی وجوہ تھیں کہ سپین کے مختلف خاندان شاہی کے دینی اور دنیوی نظام میں فرق نظر آتا ہے ٭

ایسٹریاس میں بہت سی قومیں مخلوط ہوگئیں' اس کا سب سے بڑا اثر نسل پر پڑا اس میں شک نہیں کہ اس سے قوی بازو آدمی پیدا ہوئے' مگر جہاں یہ جسمانی اور دماغی خوبیاں اس کا نتیجہ تھیں' وہاں افسوسناک عیوب بھی آئے' یعنی بے رحمانہ دشمنی' واہمہ پرستی' سریع الاعتقادی' سپاہیانہ نافرمانی اور شرمناک اخلاق۔ کفار (یعنی مسلمانوں) کا بے رحمی سے قتل کرنا وہ بڑے ثواب کا کام سمجھتے تھے' اور یہ کہتے تھے کہ اُن کے حملہ کرنے اور فتح پانے کا انتقام یوں ہی لیا جانا چاہیئے۔ جب تک کہ جنگ جاری رہتی افسران فوج اپنے سپاہیوں کو ہر قسم کے لوٹ مار' زیادتی اور تشدد سے نہیں روکتے تھے' اور جیسا کہ اس قماش کے سپاہیوں سے امید کیجا سکتی ہے' امن کی حالت میں بھی یہ لوگ فوجی نظام اور قواعد وضوابط کی کبھی پروا نہ کرتے تھے۔ بسا اوقات بادشاہ کے احکام نہ چلنے دیتے تھے بادشاہ اپنے اختیارات کو

(الف)

تعلیقات باب ہفتم

(۱) کوہستان کنٹابریا۔ CANTABRIAN MOUNTAINS کوہستان کنٹابریا

حدود سپین کے ایک کوہی علاقہ کا نام ہے جو شمالی ساحل سپین سے لے کر جنوب میں پائے رینیس تک چلا گیا ہے، اور ساحلی اضلاع کو کسٹائیل کے سطح مرتفع سے جدا کرتا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں کی بعض چوٹیاں اتنی بلند ہیں کہ وہاں برف پڑتا ہے۔ جنوب کی طرف نشیب ایسا تدریجی ہے کہ اس سے ایک مرتفع سطح بنتی چلی گئی ہے مگر شمال کی طرف جو گھاٹیاں ہیں وہ عمیق ہیں۔ ان ہی میں سے کئی دریا نکلتے ہیں، جو سمندر تک پہنچ جاتے ہیں اس سلسلہ کوہ کے بعض پہاڑی علاقوں کے نام علیحدہ علیحدہ ہیں، مثلاً سیرا ڈی ارالار، سیلواٹا، النگان، سیجوس، ایلبس، الٹونہ۔ یہ تمام علاقہ کم و بیش جنگل ہے، لیکن سیر حاصل اور تجارت کے لئے نہایت موزوں۔

یہاں کے رہنے والے اصل باشندگان آئے بیریا کی اولاد ہیں۔ ان کا وطن وہ ضلع ہے جو آج کل برگوس کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بڑے جفاکش اور سپاہیانہ خصائل کے ہیں۔ زمین پر سوتے ہیں اور بغیر شکایت کے شدائد برداشت کر لیتے ہیں اور بہت سی وحشی اقوام کی طرح کشتکاری ان کی عورتیں کرتی ہیں یہ مزے میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ان کی بہادری ان لڑائیوں میں معلوم ہوئی جو انہوں نے رومیوں کے مقابل اُس جنگ میں دکھلائی جو مسلسل چھ برس تک جاری رہی +

بعض علماء کا خیال ہے کہ باسک ان ہی کی اولاد ہیں + (مترجم)

(۲) اُویڈو۔ OVIEDO سپین میں اسی نام کے صوبہ کا دارالصوبہ ہے۔ بہت صاف اور صحت بخش مقام سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ شہر البٹریا اس کا حصہ تھا۔ دریاء نیرون اور تونزا کے درمیان میں آباد ہے۔ لیون سے شمال مغرب میں ۱۰ میل اور گیجون سے جنوب مغرب میں ۲۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وسط شہر میں بہت خوبصورت چوک ہے اور اس سے ہر چہار سمت بازار جاتے ہیں۔ ان بازاروں سے بہت سے کوچے نکلتے ہیں۔ سب جگہ صفائی کا اچھا انتظام ہے۔ پینے کے پانی کے لئے مسلمانوں کے زمانہ کا انتظام چلا آتا ہے۔ یہ پانی نلوں کے ذریعہ سے تمام شہر میں بہم پہنچایا جاتا

ہے۔ ایک بڑا گرجا صلیبی شکل کا ٹھیک طرز کا اس شہر میں ہے جیسی اس کی عمارت عالیشان ہے ویسی ہی خوبصورت اس کی تزئین کی گئی ہے۔ اسی میں مریم عذرا کے نام کا ایک محراب ہے۔ قدیم بادشاہان و شہزادگان ایسٹریاس کی اکثر نشانیاں اس گرجا میں ہیں۔ ایک پرانا کتب خانہ بھی اس کے متعلق ہے۔ ایک اور گرجا سان نگیول کے نام کا ہے، جو مسلمانوں کی فتوحات کے بعد کا بنا ہوا ہے اس میں بہت سے تبرکات رکھے ہوئے ہیں، گو ذی ہوش لوگ ان کو مشکوک سمجھتے اور کہتے ہیں، مگر سپین کے لوگ ایسے خوش اعتقاد یا جاہل ہیں کہ انہیں پوجے چلے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے گرجا بھی ہیں ۱۲۱۵ء میں یہاں ایک خانقاہ سان ونسنٹ کی بنی تھی۔ اب وہاں سرکاری دفاتر ہیں۔ سوتی اور اونی کپڑا اور ٹوپیاں، کچھ اسلحہ یہاں بنتے ہیں جن پادریوں کی جائیدادیں مسلمانوں نے کسی قصور میں ضبط کرلی تھیں وہ یہیں آکر توطن اختیار کرتے تھے۔ آج کل یہ مقام ایک اسقفیہ کا صدر ہے۔ "جنگ آزادی" میں عیسائیوں ہی نے دو مرتبہ اس شہر کو خاص کر پادریوں کو لوٹا ہے اس وقت اس کی آبادی قریباً پندرہ ہزار ہے۔ (مترجم)

(۳) گجون = GIJON سپین کے صوبہ اُویڈو کا ایک قلعہ بند بندر خلیج بسکے پر واقع ہے۔ اب بھی یہاں باقاعدہ جہازوں کی آمد و رفت ہے۔ صوبہ اُویڈو کا بہترین شہر ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ کی فصیل اور قلعہ اب بھی اس کا محافظ ہے۔ پتھر کے برتن، ٹوپیاں، ململ بنتی ہیں ۱۸۱۰ء میں مسلمانوں نے یہاں شکست کھائی، اسی میں یہ شہر اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ آبادی قریباً چھ ہزار۔ (مترجم)

(۴) پیلایوس = PELAYUS اس کو پیلایو بھی کہتے ہیں۔ اس کے متعلق جو کلیسائی بلند پروازی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص مسلمانوں کی فتوحات کے بعد سپین کا سب سے پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ شاہی خاندان وزیگاتھ کا نامور آدمی تھا۔ جب مسلمانوں کا سیلاب فتوحات سپین کو بہالے گیا تو پیلایوس اپنی جان لے کر کوہستان ایسٹریاس میں چلا گیا۔ اس کے خلاف مسلمانوں نے کئی مرتبہ مہمیں بھیجیں، مگر ہر مرتبہ اُس نے اُنہیں شکستہائے فاش دیں، اور ہزاروں مسلمانوں کو کاٹ پھینکا۔ سب سے بڑا کارنمایاں یہ تھا کہ اُس نے طارق کی ایک بہت بڑی فوج کو کیگاس ڈی اونیس کے پاس

بدترین شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ گردونواح کے بادشاہوں نے اُس کی حیثیت شاہی کو تسلیم کر لیا، اور تمام جزیرہ نماء سپین کے عیسائی اُس کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ اسی میں اُس سے بہت سی کرامات بھی ظاہر ہوئیں۔ باوجودیکہ وہ مسلمانوں سے زندگی بھر برسر پیکار رہا، مگر اُس نے تجارت و زراعت کو بہت ترقی دی، بہت سے گرجا بنوائے اور ملکی انتظام بھی مکمل کر لیا۔ اس میں بھی بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں ۱۲۳۷ء میں مرگیا۔ (مترجم)

(۵) گنزالوو = GONZALVO اس کا پورا نام گنزالوو ہرنینڈیز ڈی آگیولر اور خطاب گنزالوو آف کارڈووا ہے۔ سپین کا نہایت مشہور سپاہی، قرطبہ کے قریب قصبہ مان ٹیلا میں ۱۴۵۳ء میں پیدا ہُوا۔ پہلے مسلمانان غرناطہ کے خلاف لڑنے میں اور پھر پرتگال کی مہموں میں بہت نام پایا۔ غرناطہ کی آخری لڑائی میں، جس نے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، اس نے ابوعبداللہ آخری بادشاہ غرناطہ سے بڑی خوبصورتی (!) سے نامہ و پیام کیا۔ اس سے خوش ہو کر فرڈی نینڈ اور ازابلا نے اُس کو بیش قرار وظیفہ اور جاگیر دی۔ اس کے بعد اُس کو بادشاہ نیپلس کی مدد کو فرانس کے خلاف بھیجا گیا۔ ایک سال کے اندر اُس نے اس ملک کو فتح کر کے "ال گرین کے پی ٹانو" (القاید الاعظم) کا خطاب پایا۔ بادشاہ نیپلس کے ساتھ ملکر اُس نے اہالی فرانس کو اٹلی سے نکال باہر کیا۔ اگست ۱۴۹۸ء میں سپین واپس آیا اور البروزی میں اور جاگیر انعام پائی، اور ڈیوک آف سان اینجلو خطاب ملا۔ ۱۱ر نومبر ۱۵۰۰ء میں جو معاہدہ غرناطہ میں ہُوا۔ اُس کے موافق جب نیپلس کی تقسیم ہونے لگی تو گنزالوو پھر اٹلی بھیجا گیا اور وہاں سے واپس آتے ہوئے زینٹے اور سفالونیا ترکوں سے چھین کر وینس کو دیدیئے۔ وہاں سے سسلی پہنچا، اور نیپلس پر قبضہ کر کے اہالی فرانس سے معاہدہ کے موافق دو مقامات مانگے جب اس سے انکار ہُوا تو لڑائی ہوئی۔ اس میں کئی شہر اس نے فتح کئے؛ مگر جب فرانس والوں کی بہت بڑی فوج پہنچی تو گنزالوو وہاں سے بھاگا؛ مگر پھر واپس آیا اور ۲۹ر دسمبر ۱۵۰۳ء میں فتح کامل حاصل کی، اور فرانس کی فوج کو بالکل تباہ کر دیا۔ اس مہم میں بھی اُسے جاگیر اور خطاب ملا۔ یہ انتہاء عروج تھا جس نے اُس کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے

نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے اب اُس کی بات بھی نہ پوچھی لیکن ضرورت پڑی تو ایک مرتبہ پھر اُس کو سپہ سالار بنایا۔ افکار نے اُس کی صحت کو خراب کر دیا۔ آخر ۲؍ دسمبر ۱۵۱۵ء میں وہ غرناطہ میں مرگیا۔ (مترجم)

(۶) کورٹس = CORTES اس کا پورا نام ہرنان کورٹس ہے ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۷ء میں مرگیا۔ میکسیکو وغیرہ فتح کر کے اسی نے سپین کو دیئے۔ سپین کا بڑا نامور سپہ سالار تھا۔ (مترجم)

(۷) ایلوا = ALVA پورا نام پیڈرو ڈی ایلوا روڈ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا۔ اور ۱۵۴۱ء میں گھوڑے سے گر کر مرگیا۔ اس کا تمام خاندان ایک دیوار کے گرنے سے یک لخت مرگیا۔ امریکہ کی فتوحات میں کورٹس کے ساتھ شامل رہا اور خوب نام پایا۔ چونکہ ان دونوں کو سپین سے چنداں تعلق نہیں رہا اس واسطے ان کے متعلق تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (مترجم)

(۸) لیوگو = LUGO مغربی و شمالی حصّہ سپین کا ایک شہر، اسی نام کے صوبہ کا دارالصوبہ ہے۔ دریاء منہو کے کنارے پر آباد ہے سینٹ یاگو (سنت یاقوہ) سے پچاس میل ہے۔ یہاں ایک بشپ رہتا ہے۔ بارھویں صدی کا ایک بڑا گرجا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے گرجا ہیں ریشم اور چمڑے کی صنعت ہوتی ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں اس کی شہرت بوجہ گندھک کے گرم چشموں کے تھی۔ آبادی تقریباً دس ہزار۔ (مترجم)

(۹) ٹوئی = TUY مجھے اس کے حالات نہیں مل سکے۔ (مترجم)

(۱۰) منہو = MINHO سپین اور پرتگال کا دریا۔ جلیقیہ کے شمال مشرق سے نکلتا ہے جنوب مغرب کی طرف بہتا ہوا صوبہ لیوگو اور رینس کو قطع کرتا ہوا پرتگال کی شمالی سرحد پر جا نکلتا ہے اور بحر اطلانطک میں جا گرتا ہے۔ اس کا طول (بخط مستقیم) ۱۳۰ میل ہے اپنے دہانہ سے ۲۳ میل بڑھ کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جہاز چل سکیں۔ (مترجم)

ایسا نازک اور اپنے آپ کو اتنا معذور پاتا تھا کہ بجاء اسکے کہ سپاہیوں کو سزا دے معاف کردینے میں اپنی خیریت دیکھتا تھا۔ وزیگاتھ کے زمانہ کے عیش دوست اور شہوت پرست پادریوں اور عمائد سلطنت کی روایات شان وشوکت اور حکایات دولتمندی اُن ہی کے ساتھ اُس علاقہ میں پہنچیں تو اُس وقت تک نیم وحشی اور معایب سے پاک تھا۔ آب وہوا کی خرابی اپنے اپنے پیشہ کے کاموں میں سخت محنت کے ساتھ مشغولیت اور روزی کی کمی نے اسوقت تک ان پہاڑیوں کو بداخلاقی اور بدچلنی سے محفوظ رکھا ہؤا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہایت ذلیل تھے، سخت سفاک تھے مگر یہ عیوب ان میں اب تک نہ تھے۔ پلایوس کے زمانہ میں بڑے بڑے آدمی ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر کم وبیش خفیہ طور پر۔ الفانسو کے تخت پر بیٹھنے سے وہ کھُل کھیلے اور یہ عیب عیب ہی نہ رہا۔ مختلف مہموں میں اتنے قیدی پکڑے ہوئے آئے کہ عمائد سلطنت اور پادریوں کو اپنے حرم سراؤں کو بھرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ جس طرح کہ ڈیٹزا اور راڈرک کے زمانہ میں یہ مقدس پادری زنانہ حُسن اور زنانہ دلکشی کے مبصر تھے۔ اُسی طرح یہاں الیسٹریاس میں بھی مبصر وماہر بن گئے۔ اگر کسی کے ہاتھ کوئی حسین کنیزک لگ جاتی، اور وہ اُس کی اتنی قیمت مانگتا کہ کوئی دولتمند شخص بھی نہ دے سکتا تو وہ کنیزک کسی بطریق کی ملک ہوجاتی تھی کسی پادری کے محل میں اگر بہت سی حسین عورتیں نہ ہوتیں تو وہ ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی عورتیں ایسی شکیلہ وجمیلہ ہوتی تھیں کہ پادری اُنکی صورت کو دیکھکر اپنے جذبات کو اپنے تقدس پر فوراً قربان کردیتے تھے۔ اس شہوت رانی کے علاوہ وہاں انتقام لینے کا مادہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ گاتھک اور رومن قوم کی دوشیزہ لڑکیاں رقتے دھوئے والدین سے سلئے چھین لی جاتی تھیں کہ قرطبہ، قاہرہ اور دمشق کے شاہی حرم سراؤں کی رونق بن سکیں۔ الفانسو اوّل جن کا خطاب "کیتھولک" کلیسا کی مدح اور بھٹئی سے اور بھی مستقل ہوگیا تھا تعددازدواج میں اپنے عمائد سلطنت سے کچھ کم نہ تھے۔ کسی مسلمان عورت سے جو ان لوگوں کی اولاد ہوتی تھی اُسکو مورسے گاٹو کہتے

MAUREGATO ×

تھے، ان لوگوں نے جنگہاء بازیافت میں عیسائیوں کی بڑی خدمت کی۔ اُن کے طرز معاشرت میں وزیگاتھ کا اثر بہت بڑا تھا، اس نے بڑے مستقل اور اہم نتائج پیدا کئے آشوب بدنظمی کے بعد سیاسی انتظام ہوا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت ہی نامکمل تھا، مگر اسکے اصول ایسے تھے کہ جب سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو وہی بتغیر وتبدل قائم رہنے دیئے گئے۔ لوگوں کی جسمانی حالت بدل گئی، اُن کی قوت، جواب تک آپس میں لڑنے میں صرف ہوتی تھی، اب دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ ہونے لگی۔ نئے خیالات اور نئے طرز تمدن نے ایسٹریاس کی اُس بولی میں عمل دخل کیا، جو یوس کیرین[x] اور باسک کی زبانوں نکلی تھی۔ سوسائٹی کے مختلف افراد کے اختلاط کی وجہ سے اخلاق وتہذیب کا برتاؤ ہونے لگا۔ پہلے اگر جبریہ حکومت ہوتی تھی تو اب قانون کی پابندی ہونے لگی۔ مذہب نے پھر ہاتھ پیر نکالے اور اُسکے فوائد ظاہر ہونے لگے۔ دربار وزیگاتھ کی مراسم (جو وحشیوں کی جہالت، رومی شوکت اور بیزنطینی صولت کا مجموعہ تھیں) پھر زندہ ہو گئیں اور عظمتِ زمانۂ قدیم کی ایک دھندلی سی تصویر امراء سلطنت کی شان وشوکت سے سامنے آ گئی۔ یہ امراء پہلے زمانہ کے عروج سے واقف تھے، اور آیندہ کی امیدوں پر شادان تھے، اس لئے اب بہادری کے ساتھ تخت پر فداء ہونے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

جیساکہ پہاڑیوں کے وہمیات اور خوش اعتقادی سے توقع تھی، ایسٹریاس میں بزرگ پرستی بہت زوروں پر تھی۔ ابتدائی بادشاہوں کے ہر ایک فعل کو رموز اور مبالغوں کے پردہ میں چھپایا گیا تھا۔ زمانۂ قدیم کے خرافات الاصنام کا تمام راز اس اصل الاصول میں مخفی ہے کہ از روئے روایت جس شخص کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ وہ بنی نوع انسان کا محسن ومنعم ہے، تہذیب تمدن کے پھیلانے میں مددگار رہا ہے، یا جس کی وجہ سے لطف زندگی بڑھ گیا ہے، وہ شخص اگر خدا بننے کے قابل قرار نہیں دیا گیا تو کم از کم دیوتا تو ضرور

EUSKARIAN x

بنادیا گیا ہے؛ زمانہ کفر و جہالت کے یہ خیالات اُس زمانہ کے بتوں کے پروہتوں سے پادریوں میں آئے اور ان غلامان پوپ نے ان کو خوب فروغ دیا۔ جب کسی کے مرنے کے بعد اُسکی تقدیس کو سیاست کے خلاف سمجھا جاتا تھا تو اُسکے حالات زندگی کو قصہ کہانی کی عجوبہ میں لپیٹ دیا جاتا تھا۔ بعض مورخین نے تو پلایوس کا نام بھی نہیں لیا۔ چند دیگر مورخین نے یہ دیکھ کر کہ اُن کے مستند حالات کہیں نہیں ملتے، اُن کی ذات اور کارناموں کو منجملہ خرافات الاصنام کے بتلایا ہے۔ کوواڈونگا کی کھوہ میں جناب مریم عذرا علیہا السلام کے ظاہر ہونے کا معجزہ ہوا! اُنہوں نے عیسائیوں کو بہت کچھ ڈھارس اور فتح کی بشارت دی؛ فرشتوں نے آسمان سے اتر کر حمد کے گیت گائے جو الفانسو کے مرتے وقت باعث تسلی ہوئے۔ جو لوگ وہاں موجود تھے اُنہوں نے بھی ان فرشتوں کی آوازوں کو سنا؛ یہ اور اس قسم کی کہانیاں جو پادریوں کے مکر و فریب نے گھڑیں اور جاہل لوگوں کی خوش اعتقادی نے پھیلائیں، قوم کی نشو و نما میں کچھ کم مددگار نہیں ہوئیں +

غرض یوں جزیرہ نماء اندلس کے ایک دور افتادہ کونے میں کچھ لوگ پڑے تھے جن کو دوستوں نے چھوڑ دیا تھا، جن سے دشمن نفور تھے؛ وہ ایک ایسی سلطنت کے بانی بن گئے کہ جن کی ریاستوں کو طلوع اور غروب ہوتا ہوا آفتاب منور کرتا تھا*، وہ باوجود گمنامی اور مصائب کے نامور ہو گئے' اور ایک کمزور نارو پودے سے اُنہوں نے سیاسی مضبوطی حاصل کر لی۔ جب اُنہوں نے ہاتھ پیر ہلانے شروع کئے ہیں تو اُن کو قطعی مایوسی تھی، مگر اسی یاس سے آس پیدا ہو گیا اور جان توڑ کوشش کر کے وہ قوی بازو ہو گئے۔ خداء تعالےٰ نے جو موانع دوسروں کے لئے پیدا کئے تھے وہ ان کے مددگار ہوئے۔ جو جان پر بنا دینے والے قصہ وقضایا امیر اندلس کی رعایا میں رہتے تھے اُن سے اِن پہاڑیوں کو بہت مدد ملی۔ اُن کو خداء تعالےٰ کی مدد پر بہت بڑا بھروسہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ پچیس ہی برس کے عرصہ میں

---

* یورپ اور امریکہ سے مراد ہے + (مترجم)

یہ لوگ خوب ہی پھلے پھولے، جن لوگوں کی ہستی ناقابل اعتنا سمجھی گئی تھی اُنھوں نے وہ سر اُٹھایا کہ دربار قرطبہ اُس سے چونک اُٹھا۔ مگر کس وقت؟ جب وقت بہت کچھ گذر چکا تھا۔ ایسٹریاس کے رہنے والے آزادی کے اُتنے ہی خواستگار تھے جیسے کہ قوم باسک مسامحت ان میں بہت ہی کم تھی اُنھوں نے عوام الناس کے کانوں میں آزادی کی وہ ہوا بھردی جو زمانہ مابعد میں شمالی علاقۂ سپین میں شخصی آزادی کا قانون بنوا کر رہی۔ اب بھی کہ خود مختاری اور استبداد پر سینکڑوں برس گذر گئے ہیں، یہ جذبات بالکلیہ اُس ملک کے قوانین سے خارج نہیں ہو سکے ہیں۔ علم سیاست کا یہ عجیب عقدۂ لاینحل ہے کہ جہاں آزادی کا یہ زور و شور ہو۔ وہیں محکمہ احتساب قائم ہو جائے۔ باشندگان ایسٹریاس کا نامعلوم مگر دیرپا اثر ایسا نہ تھا کہ وہاں کے فرماں رواؤں کے خاندان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہو۔ جو مذہب کہ ان کے قومی پادریوں نے قائم کیا تھا، اور جسکی اشاعت بنوک شمشیر کی گئی، اب تک بہت سے ممالک کے دینداروں کے لئے باعث تسلی ہے۔ وحشی لوگوں کے اختلاط سے جو زبان شہد سے میٹھی اور ارغنون باجے سے سریلی بن گئی تھی وہ اس وقت عمرانات کے چھٹے حصہ میں اب تک رائج ہے ٭

باب ہشتم
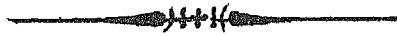
خاندان بنو امیہ سلطنت عبدالرحمٰن اوّل

۷۵۶ء سے ۷۸۸ء تک

خاندانِ امیہ۔ اُس کی اصلیت۔ اُس کی اور خاندانِ ہاشم کی چشمک۔ شاہانِ شام۔ اُن کا فسق وفجور۔ دمشق کی شان وشوکت۔ شاہی دارالخلافہ کے تکلفات۔ بنو عباس کا عروج۔ قبیلہ مفتوح (بنو امیہ) پر ظلم وستم۔ عبدالرحمٰن کا بچ نکلنا۔ اُن کے عجیب وغریب حالات۔ اُن کا اندلس پہنچنا۔ اُن کی کامیابیاں۔ یوسف کی شکست و اعتزال۔ بغاوتہاء متواترہ۔ خلیفہ بغداد کی بلند نظری۔ اس کا افسوسناک انجام۔ شارلیمین کا حملہ۔ رونسس ویلیس میں قتل عام۔ عبدالرحمٰن الداخل کا انتقال۔ اُن کے خصائل۔ تہذیب و تمدن کو اُن سے بہت فواید پہنچے۔ جامع مسجد قرطبہ کی بنیاد۔ اہالی فرانس کا سیپٹمینیا کو پھر فتح کرلینا۔

اب میں اُس درخشندہ زمانہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ جس میں خاندان بنو امیہ کی شوکت پوری طرح ظاہر ہوئی۔ یہ وہ زمانۂ دولت ہے کہ جس میں سائنس اور عملی فلسفہ نے عروج پایا اگر ترقی دماغی اور اُن مفید علوم کی نشو ونما کی تاریخ لکھی جائے جو ہر ایک انسان کی (خواہ وہ کسی درجہ اور کسی پیشہ کا ہو) محنت کو کم کرتے اور آسودگی کو بڑھاتے ہیں، اور جن پر عمل کرکے کوئی قوم ترقی کرتی ہے، اور جن کو چھوڑ کر قعر تنزل میں گرتی ہے، تو اُس تاریخ کا وہ باب، جس میں اس پُرجلال زمانہ کا ذکر ہو، آب زر سے لکھا جائیگا، اور قیامت تک چمکتا رہیگا۔

شرفاء مکہ میں بنو ہاشم کے خاندان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اُن ہی میں سرور عالم، افتخار

بنی آدم رحمتہ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے مقابل بنو امیہ تھے کہ از روئے اصل و نسل ان کو وہی فخر حاصل تھا جو بنو ہاشم کو، اقتدار و قوت کے لحاظ سے بھی وہ کسی طرح ہاشمیوں سے کم نہ تھے۔ اگرچہ بوجوہ ان پر یہ شبہ تھا کہ وہ لا مذہب اور ملحد ہیں مگر ان کی سیاسی چال یا پالیسی تھی کہ کعبہ شریف کی حمایت و احترام کرنے والوں میں وہ سب سے پیش پیش تھے۔ ان کا بت پرستی کی طرف میلان ان کے ناموں سے ظاہر ہے، چنانچہ ان کے جد اعلیٰ کا نام عبد الشمس تھا۔ شیوخ بنو ہاشم پشتہا پشت سے خانہ کعبہ کے محافظ چلے آتے تھے، اور قبیلہ قریش کے راس و رئیس تھے۔ بنو امیہ میں چونکہ سپاہیانہ جوہر تھے، اور دماغ بھی انہوں نے اچھا پایا تھا، اس لئے سپہ سالاری ان ہی کے شیوخ کے حصہ میں رہی۔ اگرچہ یہ افتخار فی حد ذاتہ کچھ کم نہ تھا، مگر ان کے رقیب بنو ہاشم کو بوجہ روحانی اقتدار اور محافظ خانہ کعبہ ہونے کے کچھ کم وجاہت اور بہم پرستانِ مکہ پر کچھ کم گرفت حاصل نہ تھی۔ یوں یہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے ہم پلہ چلے آتے تھے۔ شہر مکہ اگر ایک طرف واہمہ پرستانِ عرب کا روحانی مرکز تھا تو دوسری طرف تجارتی فوائد بھی اسکو بہت حاصل تھے اور اس ذریعہ سے وہ مالا مال رہتا تھا۔ اس مقدس شہر کی شہرت بنو امیہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بڑے بڑے قافلے جو مقررہ اوقات پر یہاں سے مال تجارت لیکر شام اور مصر کو جاتے اور اپنے غنا کو بڑھاتے تھے ان کی حفاظت ہمیشہ اسی خاندان کے ولاور افراد کے سپرد ہوتی تھی۔ اس خاندان میں دولت و حشمت بہت تھی، اور جتنی اسکی بہتات تھی اسی قدر ان کا غرور بڑھا ہوا تھا۔ بنو امیہ نے بہت جلد یہ تاڑ لیا تھا کہ شیوع اسلام سے ان کے دنیوی اقتدار اور دولت کو سخت نقصان پہنچیگا، اس لیئے بدو اسلام ہی سے انہوں نے حضور سرورِ کونین صلے اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کھلانی شروع کر دی تھی۔ حضور کے اصول دین کو ان ہی نے بدنام کیا۔ حضور کے دعوئے وحی و نبوت پر ان ہی نے مذاق اڑایا۔ ادھر شرفاء قریش کے نوجوانوں کے اشتعالک

ہے اسلام سے پہلے یا پیچھے؟ (مترجم)

سے حضورؐ کے متبعین پر مکہ کے لڑکوں نے پھبتیاں کسیں اور توہین کی جب تک کہ غلامانِ حضورؐ کے سلک جوہر میں معززین عرب شامل نہیں ہو گئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ کی جان دشمنوں کے ہاتھ سے بال بال بچی۔ واقعہ ہجرت (کہ جس پر بادشاہان اندلس بالخصوص اور بادشاہان اسلام بالعموم اپنے تمام واقعات کو مبنی کرتے ہیں) اسی لئے ہوا کہ حضورؐ کے برخلاف بنوامیہ نے بہت بڑی سازش کی تھی۔

جنگ اُحد میں کہ جب حضور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کو چشم زخم پہنچا اور ہزیمت ہوئی اور محاصرہ مدینہ میں کہ جس کا انجام عمارت اسلام کا کلی انہدام ہونے والا تھا، ان ہی بنوامیہ کا ایک سردار ابوسفیان نامی مخالف فوج کا سرگروہ تھا۔ اس کی زبان دراز بیوی ہند

---

* مسٹر سکاٹ یہ اور اسی قسم کے الزامات بنوامیہ پر پہلے بھی لگا چکے ہیں اور آئندہ بھی لگائینگے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کن امور سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ یہ خیالات یقیناً غلط ہیں۔ انہوں نے بصدق دل اسلام قبول کیا اور ان کے اکثر افراد نے اسلام اور مسلمانوں کو بے انتہا فوائد پہنچائے۔ ان میں سے کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ حضور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کی سوء ادبی کا خیال بھی دل میں لاتا۔ اس میں کلام نہیں کہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض نے حضورؐ کے سامنے بےباکانہ گفتگو کی مگر اتنی سی بات پر وہ بڑے بڑے نتائج نہیں نکل سکتے جن کو مسٹر سکاٹ اتنا بڑا کر کے دکھلاتے ہیں۔ باقی رہا ہجرت سے پہلے حضورؐ کا ستایا جانا، اس میں نہ بنوامیہ کو خصوصیت ہے نہ بنوہاشم کو۔ ہر خاندان کا شقی اس میں شامل تھا اس بے ہلکی کے معاملہ میں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ بنوامیہ حضور سرور کونین صلے اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے اس لئے نہ یہ بھولنا چاہئے کہ وہ بھی انسان تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں شانِ عبودیت تھی، اس کے ساتھ ہی حضورؐ میں رحمت بدرجۂ اتم تھی، اس لئے حضورؐ اس کو گوارا فرماتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنوامیہ گونہ غیر جانب دار تھے۔ اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں۔

میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے شواہد و بینات میرے پاس موجود ہیں مگر ان کے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے سردست میرا مقصود صرف یہ ہے کہ ناظرین ان باتوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ (مترجم)

کی آدم خوری نے جو زور کیا تو اس نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکال کر چبا ڈالا، اور جو مسلمان جان بازی دکھلا کر شہید ہوئے تھے۔ اُن کے کان کاٹ کر بازوبند اور حمائل بنائے جب مکہ فتح ہؤا تو ابوسفیان اور اُسکے طرفداروں نے جان کے خوف سے بظاہر اپنے مبغوض دین کو قبول کر لیا +

شامی* بادشاہوں نے علوم و فنون کی اگرچہ خدمت کی، مگر اُن میں سے ہر ایک بلا استثناء فاسق فاجر تھا۔ تعیش اور چھچھورا پن میں وہ ہمیشہ سے مشہور رہتے تھے؛ اُس پر وہ ہوئے رومی سلطنت کے وارث، ان کی خودنمائی اور ریاکاری کو بھی انہوں (بنوامیہ) نے اختیار کر لیا بُرے مذاق اور بداخلاقیوں کے وضع کرنے، اور اُن کے شائع کرنے میں انطاکیہ اور دمشق کو ایسا کمال حاصل تھا کہ وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شراب جو از روء قرآن مجید حرام تھی گھر گھر پی جاتی تھی۔ دربار شاہی کی عیش و عشرت اور بدکاری ویسی ہی تھی جیسی کہ کسی سلطنت کی حالت زوال میں ہوتی ہے؛ اس کو دیکھ دیکھ کر سیاح حیران و پریشان رہ جاتے تھے۔ ناقابل تشریح عیوب کے بانی جہاں ایوان شاہی کو اپنی موجودگی سے بے حرمت کرتے تھے وہاں مساجد کو بھی بے دغدغہ ناپاک کرتے رہتے تھے۔ بادشاہوں کی شراب خوری اور بدمستی کی وجہ سے اسکی ضرورت رہتی تھی کہ غلام ہر وقت اُن کے ساتھ رہیں؛ یہاں تک کہ دربار عام میں بھی مردوں کو عورتوں کا لباس پہنا کر نچانے اور گوانے میں زر خطیر خرچ ہوتا تھا، جسکو دیکھ دیکھ کر دینداروں کو سخت رنج ہوتا تھا، اور اُن کے اس فعل کو سخت مکروہ جانتے تھے۔ نہایت حسین مغنیہ اور رقاصہ اپنے دلکش حسن و جمال سے حسن پرست بادشاہوں کے مزاج پر اس طرح حاوی ہو جاتی تھیں کہ اُس کا خطرناک اثر اکثر دیرپا ہوتا تھا۔ یہ عورتیں بے انتہا خرچ کرکے منگوائی جاتی تھیں۔ شاہی شان و شوکت کی نمائش کے لئے فضول خرچی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ کسی فی البدیہہ مذاقیہ کلمہ یا پھبتی پر ایک صوبہ کی مالگذاری کے برابر انعام دے

---

* "شامی بادشاہ" سے مراد خلفاء دمشق یعنی بنوامیہ ہیں۔ (مترجم)

دیا جاتا تھا٭

بنو امیہ کے زمانہ میں دمشق تکلفات اور عیش و نشاط کا ایسا مرکز بنا ہوا تھا کہ اسلامی دنیا میں اُس سے پہلے یا اُسکے بعد کسی شہر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ وہاں کی تجارت کی اہمیت وہاں کے رہنے والوں کی دولتمندی، اُس کے مضافات کی خوبصورتی اور خوش نمائی، اُسکی تقدیس کی روایات اور اُسکے نام کا رعب ایسا تھا کہ زمانہ قدیم کے تمام شہروں کا سر اُسکے سامنے جھک جاتا تھا۔ وہاں کی مسجدوں کی تزئین میں ایشیا کی تمام خوش مذاقی اور صنعت ختم کر دی گئی تھی، وہاں کے محلات میں سنگ سماق، کہربا، لاجورد، سنگ مرمر، سنگ سیاہ اور ایسے ہی اور پتھر خرچ کئے گئے تھے، وہاں کے باغات کی روشوں پر بھی سنگ موسا اور سنگ مرمر کی پچی کاری تھی، اور اُن کے کناروں پر بہت ہی خوبصورتی سے تاڑ کے چھوٹے چھوٹے درخت لگے ہوئے تھے، ہزاروں قسم کے پھولوں اور خوشبودار پودوں سے ہوا مہکی رہتی تھی؛ موقعہ موقعہ پر نہایت لطافت کے ساتھ نہریں رواں تھیں، ہر ایک مکان کے صحن میں فوارہ ضرور ہوتا تھا۔ امرا کے زنانہ صحنوں میں ان فواروں سے خوشبودار عرقیات یا شراب اوچھلتی تھی کپڑے عام طور پر نہایت تکلف کے بھڑکیلے پہنے جاتے تھے، مگر شامی رؤساء اپنے لئے صرف ریشمی لباس ہی موزوں سمجھتے تھے، سوتی کپڑا پہننا اُن کے خلاف شان تھا۔ جیسا کہ تمام ممالک مشرقیہ کا دستور ہے مختلف اجناس کے لئے مختلف بازار تھے، یہی کیفیت دمشق کی بھی تھی۔ ان بازاروں میں ہندوستان سے لے کر برطانیہ تک کا مال

٭ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو وہ شاندار فتوحات جو خلفاء دمشق نے کیں، وہ نظم و نسق اور اصلاحات ملکی و مالی و فوجی جو بنو امیہ نے کیں اور وہ امن و امان اور ترفہ جو ملک محروسہ میں اس خاندان نے قائم رکھا، کیونکر ہو گیا شخصی حکومتوں میں ایک ہی بندۂ عیش بادشاہ اپنی سلطنت کیلئے پیغام موت ہوتا ہے یہاں تو چودہ بادشاہ ہوئے جن بادشاہوں میں مسٹر سکاٹ کی بیان کردہ صفات ہوں وہ کہیں رومی قالین سے اُٹھ کر گھوڑے کے زین پر سوار ہو سکتا ہے؟ یقیناً مسٹر سکاٹ کے دل و دماغ پر مخالفین بنو امیہ کا گہرا اثر پڑا ہوا ہے ٭ (مترجم)

مل جاتا تھا۔ چونکہ شہر میں مختلف اقوام اور مختلف ممالک کے لوگ رہتے تھے اس لئے نہروں پر اور بازاروں میں اُن کا اپنے اپنے بھڑکیلے قومی لباسوں میں جمع ہونا ٹہلنا اور کاروبار کرنا اتنا دلکش سماں ہوتا تھا کہ جسکو دیکھ کر وہ سیاح حیران رہ جاتے تھے جن کو اس دارالخلافہ کی شان و شوکت اور عجائب پرستی یہاں کھینچ لاتی تھی ؛

مسلمانوں کے قبضہ میں آنے کے بعد جہاں شہر دمشق کا مذہب بدلا، وہاں اُس کی طبعی حالت، آبادی کی کیفیت، سیاسی امور اور محکموں میں بھی زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا۔ ابتدا میں تو اس مقام پر یونانی اور شامی دونوں رنگ ملے ہوئے تھے؛ بعد میں ایرانی اثر پڑا۔ مگر اس وقت وہ بالکل عربی رنگ میں رنگا گیا۔ بدوؤں کی آزاد مزاجی اور وارستگی گو بظاہر اُن میں سے کسی طرح نکلنے والی تھی نہیں، کیونکہ مدنیت کو اُنہوں نے اتنا بھی نہ مانا کہ حکومت اپنے احکام کو آزادی کے ساتھ جاری کر سکتی، یا سوسائٹی بن سکتی، مگر اس وقت یہ جذبات آزادی بے حد پایاں تھی۔ لوگ بادیہ سے اکثر شامی دارالخلافہ کی چار دیواری میں مقید ہو گئے۔ ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا، اور الگ الگ انتظام صفائی وغیرہ؛ ہر ایک کے درمیان میں بڑی مرتفع فصیل تھی، اور فصیل میں مورچے؛ ہر ایک محلہ کا دروازہ غروب آفتاب سے پہلے ہی بند کر لیا جاتا تھا۔ ہر محلہ ایک دوسرے سے کچھ اس طرح جُدا تھا کہ ایک دوسرے کا محتاج نہ تھا۔ ہر محلہ فی نفسہٖ ایک الگ شہر تھا، جس میں بازار، کاروانسراء، مساجد حتّٰی کہ قبرستان بھی الگ ہی تھے۔ ایک دوسرے سے یہ بے تعلقی یہیں ختم نہیں ہو گئی تھی عیسائیوں اور یہودیوں کو علیحدہ علیحدہ محلوں میں آباد کیا گیا تھا۔ یہ رسم اب تک تمام مشرقی ممالک کے شہروں میں چلی آتی ہے۔ ہر ایک محلہ کی فصیل شہر میں ایک یا کئی دروازے ہوتے تھے۔ ہر شخص بے روک ٹوک اُن سے آمد و رفت رکھتا تھا اور جہاں چاہتا جا سکتا تھا۔ یہ انتظام آبادی بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ انتظام شخصی حکومت و استبداد کے خلاف ایک احتیاط تھی۔ بروئے شریعت اسلامی شخصی حکومت و استبداد ممنوع سہی، مگر اس کا ہونا لازمی

بہرحال اس انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی آشوب اور غدر میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ دمشق کی تاریخ میں اسکی بہت مثالیں ملتی ہیں ✦

یہاں کی جامع مسجد، جواز روء عظمت وجلالت حرمہاء مکہ ومدینہ وبیت المقدس سے کچھ ہی کم تھی،✲ عین وسط شہر میں واقع تھی۔ اس کا نقشہ اور اسکی سجاوٹ بالکل بیزنطینی تھی اور اس وقت تک اُسکو سینٹ مارک کے گرجا واقع وینس سے بہت کچھ مشابہت ومماثلت ہے اسکی دیواروں میں قیمتی پتھروں سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پچی کاری کی گئی تھی، اور اسکی ضو بار ترک پڑتی تھی۔ جب کوئی ساربان اپنے تھکے ہوئے اونٹ کو ریگستان سے دوڑاتا ہوا دمشق کی طرف آتا تھا تو اُسکی مشتاق نظر سب سے پہلے اس مسجد کے شاندار اور مہیب گنبد اور نفیس و نازک میناروں پر پڑتی تھی، جو اونچے اونچے محلوں اور درختوں کے روکے بھی نہ رکتی تھی۔ اسکے وسیع صحن میں جو خوش منظر حوض اور فوارہ تھا۔ اُسکے کناروں پر یمنی زایرین شہر اور عراق کے تاجر پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے وضو کرتے نظر آتے تھے، جواز روء دین اسلام مومنین کا فرض اولین ہے۔ اُسکے دالان اور صحن میں ایک ہی امام کے پیچھے جو محراب میں کھڑا ہوتا تھا، مختلف آب وہوا کے ممالک کے باشندے اپنی مختلف صورتوں اور لباس کو لئے ہوئے، ہر درجہ ورتبہ کے دیندار، بادشاہ اور فقیر، آقا اور غلام امیر اور درویش، مساویانہ حالت اور کیفیت میں خداء تعالےٰ کے سامنے سربسجود ہوتے اور اُس کے فضل وکرم کے طالب ہوتے تھے ✦

ایشیائی تکلفات اور شان وشوکت کا اصل تماشا محل شاہی اور دربار شاہی میں نظر آتا تھا۔ بہترین سنگ مرمر کے لئے یورپ، افریقیہ اور ایشیا کی تمام کانوں کا جگر نکال کر یہاں منگوا لیا گیا تھا۔ یہاں کی شان بڑھانے کے لئے بت خانوں کو توڑ ڈالا گیا تھا اور زمانۂ قدیم کے بڑے بڑے کاریگر معماروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ستون اور کنگورے یہاں پہنچا دیئے گئے

✲ یہ مسیحی خیال ہے۔ ہم مسلمانوں کے نزدیک تو ہر مسجد قابل تعظیم وحرمت ہے، خواہ وہ کہیں ہو اور کہیں کی ہو حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ (مترجم)

تھے۔ بیزنطینی پچی کاری ان محلوں کی دیواروں اور فرشوں پر اس لطافت و نزاکت سے کی گئی تھی کہ اُسکی چمک دمک سے نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی، اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی سنہرے حریری کپڑے پر بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ایران کے بنے ہوئے مشجر اور تمامی کے پردے، جن پر جانداروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں گو شرعاً ممنوع تھے، مگر یہاں کے مرمری اور کہربائی اور سماقی محرابوں پر لٹک کر ایک عجیب دلکش سماں پیدا کرتے تھے کہ جس پر انسان کی اگر ایک مرتبہ نگاہ پڑجاتی تھی تو اُٹھنے کو نہ کہتی تھی۔ چھتوں کی کارنسیں کسی خوشبودار لکڑی کی تھیں، اُن پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اس پر ہاتھی دانت، آبنوس، کچھوے کی ہڈی اور سیپ سے اس طرح پچی کاری کی ہوئی تھی کہ جسکو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی تھی۔ یہاں پانی کی بہتات اُس مصیبت کا نعم البدل تھا جو اہل عرب کو قافلوں کے پرمحنت سفر اور بادیہ کے خیمہ میں اس قیمتی سیال چیز کے لئے عموماً پیش آتی ہے۔ اسکو نہ وہ کسی سرسبز وادی میں بھولتے تھے نہ بے آب و گیاہ ریگستان میں۔ ہر ایک صحن میں دریاۓ فرفار اور ربانہ کے پانی کے فوارے چھوٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ پانی ضائع نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اُن چھوٹی چھوٹی نہروں میں ڈال دیا جاتا تھا جو سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھیں، اور امراء کے سرغانون میں ہر طرف پھرتی ہوئی اپنے ساتھ خانہ باغ کی خوشبوئیں بھی لیجاتی تھیں۔ حماموں پر ایسے تکلفات کئے جاتے تھے کہ جن پر آج کل اعتبار نہیں آسکتا۔ ان سے تین کام لئے جاتے تھے، یعنی دینی فرائض غسل و وضو، صحت کی درستی اور لطف صحبت۔ ان کی دیواروں پر قسطنطنیہ کے معماروں نے اپنی تمام کاریگری اور محنت ختم کردی تھی۔ ان کی حوضیں سنگ موسایا سنگ مرمر کی تھیں، اور ان میں جو نل آکر گرتے تھے وہ خالص چاندی کے ہوتے تھے۔ ان نلوں کے مُنہ جہاں سے پانی گرتا تھا، کسی نہ کسی جانور کے تھے جو خالص سونے کے تھے۔ جس بھٹی سے پانی گرم کیا جاتا تھا اُس میں اس غرض سے خوشبودار لکڑیاں جلائی جاتی تھیں کہ اُس کا دھواں آئے تو دماغ کو معطر کردے۔ جن مسندوں پر کہ نہانے والے غسل کرکے آکر بیٹھتے تھے وہ سب مشجر کی ہوتی تھیں اور اُن کے کناروں پر نہایت تکلف سے ایسا زر نشین کام کیا ہوتا تھا کہ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ روشن دانوں میں مختلف رنگوں

کے شیشے لگائے جاتے تھے۔ اُن میں سے ملک شام کی دھوپ چھن چھن کر آتی تھی تو تمام کمروں کو نہایت خوشنما بنا دیتی تھی۔ اور لوگ اپنی مسندوں پر بیٹھے ہوئے حسن کا لطف اُٹھاتے تھے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کے انتقام میں جو فتنہ و فساد پھیلا اُس سے فریقِ مکّہ یعنی ابوسفیان کے خاندان نے عروج پایا! اسکے ساتھ ہی حکومت اسلامی بھی اُن ہی کے خاندان میں آگئی۔ ان لوگوں کی خلوص نیت تو ہمیشہ سے مشتبہ تھی ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ نے (جو اسی خاندان کے ایک فرد تھے) بے سوچے اپنے ہی عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے تو اس سے عام ناراضگی پھیل گئی اور اُس کا انجام یہ ہوا کہ وہ شہید کر دیئے گئے۔ جناب موصوف چونکہ کمزور طبیعت کے آدمی تھے اور مستقل رائے نہ رکھتے تھے اس لئے اُن کے ہر فعل کا مختار ایک شخص حکم نامی بنا ہوا تھا۔ جس نے ایک مرتبہ جناب سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے سے ناخوش کر لیا تھا اور حکماً بہت بُری طرح حجاز سے بدر کر دیا گیا تھا۔ ایک اور اموی ولید کے باپ نے جو حاکم کوفہ تھا، جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بے ادبی کی تھی اور سزاء موت پائی تھی۔ اس شخص کے بیٹے نے اپنے ہی دار الحکومت کی مسجد میں ایسی بے ادبانہ حرکات کی تھیں کہ وہیں ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ ایک اور شخص عبد اللہ ابن سعد حاکم مصر نے یہاں تک درخور پایا کہ وہ حضور رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کا کاتب ہو گیا! مگر اُس نے قرآن مجید کی تحریر میں دخل فصل کیا اور عرب سے بھاگ کر دین اسلام کو چھوڑ دیا اور واجب القتل ہو گیا۔ سب سے پہلے شامی خلیفہ معاویہ رضؓ ہوئے۔ ان کے زمانہ میں تمام دینی مراسم اسلام بظاہر پورے طور پر ادا ہوتے تھے، اور قرآن شریف پر سختی کیساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میں خلوص نہیں ہے بلکہ یہ ملمع محض دنیوی پالیسی کے لئے ہے۔ جن لوگوں کے بزرگ کہ سینکڑوں برس سے بت پرستی چلے آتے تھے، جن لوگوں نے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی کمزوری کی حالت میں دریدہ دہنی سے کام لیا اور تکلیفیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، اور جب حضور والا صلے اللہ علیہ وسلم کو شوکت حاصل ہو گئی تو بادل ناخواستہ مسلمان ہو گئے، جن کا سیاسی اقتدار مسلمان ہونے اور

رہنے پر ہی منحصر تھا، اُن لوگوں کی اولاد کے دین کو اگر بنظر شبہ نہ دیکھا جائے تو تعجب ہے۔ معاویہ کے دل پر زمانہ جاہلیت کی روایات اور اپنے بزرگوں کے کارنامے ہر وقت مستولی رہتے تھے۔ قرآن مجید کی تعظیم اُس کے مقرر کردہ اصول کی ظاہری پابندی اور سیاسی خیال سے اپنی رعایا کو دکھلانے کے لئے اداء فرائض اسلام نے اُن کے اصل عقیدہ پر پردہ ڈال رکھا تھا؛ ورنہ وہ اور اُن کا خاندان اُسی واہمہ پرستی میں گرفتار تھا جو اُن کے خاندان میں متوارث چلا آرہا تھا۔ اُن کا محل مشعبد اور نجومیوں سے بھرا رہتا تھا۔ جب وہ کسی مہم پر جاتے، یا جب وہ اور اُن کا فریق کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا، یا اُن پر کوئی خانگی حادثہ پڑتا، تو وہ ان ہی نجومیوں اور رمالوں سے مدد لیتے؛ حالانکہ جناب رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کو ایام جاہلیت کا نشان اور مبغوض الٰہی قرار دیا تھا ان بت پرستانہ مراسم کے قائم رکھنے میں اُن کی بدویہ ملکہ یزید کی ماں نے بہت مدد دی جو قبیلہ بنو کلب سے تعلق رکھتی تھی، اور باوجود اسکے کہ دارالخلافۂ شام کا عیش وعشرت اُسے نصیب تھا مگر پھر بھی وہ بادیہ کی آزادی کے لطف کو کبھی نہ بھولتی تھی*

---

* اس ملکہ کا نام میسون (بنت بجدل بنت اُنیف) الکلبیہ تھا۔ اس کا قصہ بہت لطیف ہے +
ایک آزاد چڑیا کو پکڑ کر خواہ آپ سونے ہی کے پنجرے میں بند کیجئے، مگر اس سے یہ امید رکھئے کہ وہ نعمت آزادی کو بھول جائیگی۔ امیر معاویہ رضہ کی بیوی کو نعماء دنیوی کی کیا کمی ہو سکتی ہے، مگر میسون تھی کہ محل شاہی میں بیٹھی ہوئی فراق بادیہ میں روتی رہی۔ چنانچہ ایک روز وہ یہ اشعار بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھ رہی تھی:—

لبیتٌ تخفق الارواح فیہ ۔۔۔ احبُّ الیّ من قصرٍ منیف
ولبسُ عباءۃٍ وتقرّ عینی ۔۔۔ احب الیّ من لبس الشفوف
واکلُ کسیرۃ فی کسر بیتی ۔۔۔ احبّ الیّ من اکل الرغیف
واصوات الریاح بکل فجٍ ۔۔۔ احبّ الیّ من نقر الدفوف
وکلبٌ ینبح الطُّراق دونی ۔۔۔ احبّ الیّ من قطٍّ الوف
وبکرٌ یتبع الاظعان صعبٌ ۔۔۔ احبّ الیّ من بغلٍ زفوف
وخرقٌ من بنی عمّی نحیفٌ ۔۔۔ احبّ الیّ من علجٍ علیف

کہتے ہیں کہ امیر معاویہ نے یہ سن لیا۔ ان کو بہت برا معلوم ہوا اور اس کو اس کے بیٹے یزید سمیت دمشق سے نکال کر بادیہ میں بھیج دیا۔ کہتے ہیں کہ یزید نے بادیہ کے مکتب ہی میں رہ کر سنگدلی کا سبق پڑھا تھا +
باشندگان شہر میسون کی حماقت پر ہنسینگے۔ مگر میں کہونگا فطوبیٰ للبوادین ھنیئاً (مترجم)

خلفاء بنو امیہ نے اپنے دارالسلطنت، اپنے دین کے مرکز اور اپنے تخت کو خوبصورت اور شاندار بنانے میں نہ روپیہ کا بخل کیا، نہ محنت و مشقت بچائی۔ یہ اُن ہی کی سیاسی دور بینی تھی کہ انہوں نے اپنے شہر کی فصیل کو اتنا مضبوط بنایا کہ جس سے وہ ایرانیوں کی دراز دستی اور اپنے رقیب و عویداران خلافت کی سازشوں کے اثر سے اُسے بچاتے رہے۔ اُن کی پدرانہ شفقت اور حاتمانہ فیاضی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے ایسی نہریں اور چھوٹی چھوٹی زیر زمین نالیاں بنوائیں کہ جن سے غربا تک کے گھروں میں ہر وقت پانی جاری رہتا تھا۔ یہ اُن کی روشن دماغی تھی کہ رعایا کی تکلیف سے وہ ہمیشہ دردمند رہتے تھے، علم اور عالموں کی قدر کرتے تھے، تجارت کو ترقی دیتے تھے، بیجا جوش مذہبی کو دبائے رکھتے تھے اور جہالت کی تاریکی کو پاس نہ آنے دیتے تھے۔ اُن کے خاندان کا سفید جھنڈا حرم مدینہ شریف، بروج بصرہ، مینار ہا، قلعہ قیروان اور فصیل طُلیطلہ پر لہلہاتا تھا۔ گو اس میں کلام نہیں کہ خلفاء دمشق سائنس اور ادب میں خلفاء بغداد کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے، لیکن اصل یہ ہے کہ شامیوں کا جوہر دماغی سائنس کے مسایل کی سُست رفتار موشگافی اور معملوں کے خاموش کونوں کی محنت کے لئے اتنا موزوں نہ تھا جتنا کہ مباحث دینی کے شور و شغب کے واسطے۔ البتہ مادی زندگی کے لطف اُٹھانے، شاہی شان و شوکت اور قومی صولت قائم رکھنے اور نمود و فضول خرچی میں دمشق بغداد سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ کسی دنیوی رسم کو ادا کرتے وقت بادشاہ کا حریری لباس ایسا زرین ہوتا تھا کہ جسکو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ البتہ جس وقت خلیفہ کو بحیثیت خلیفتہ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم کوئی دینی رسم ادا کرنی ہوتی تھی تو وہ سادہ سوتی کپڑا سفید رنگ کا پہنتے تھے۔ محل شاہی کا معمولی خدمتگار، یہاں تک کہ باورچی بھی جب دربار میں آتا تھا تو مشجر کا لباس پہن کر آتا۔ ارباب نشاط نایب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے جلیس ہوتے تھے۔ اُن کا وقت بیشتر مرغ بازی یا گھڑدوڑوں میں گزرتا تھا۔ ان موقعوں پر گھوڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، یہاں تک کہ بعض وقت ہزار ہزار گھوڑوں پر نوبت پہنچ جاتی تھی۔ رات کو

فسانہ گو اور قصہ خواں کہانیاں کہہ کر خلیفہ وقت کا جی بہلاتے تھے، یا کوئی بدیہہ گو شاعر اُن کا دل خوش کرتا تھا، یا نقال اُن کو رجھاتے تھے، یا کوئی حسینہ و جمیلہ رقاصہ اپنا فن دکھلا کر انہیں اپنی طرف مائل کرتی تھی۔ بدویوں کے وحشی اور گنوار مسخرے بارگاہ خلافت میں آ گئے تھے، مصر کے عیوب اور روم اور قسطنطنیہ کے تمام فواحش کا محلِ شاہی اکھاڑہ بنا ہوا تھا جس شخص کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ قرآن مجید کے احکام کی تعمیل کرے اور کرائے اُسکی مے خواری کے مقابلہ میں سکینڈی نیویا کے بڑے بڑے شرابخوار نہیں جیت سکتے تھے۔ اُن کے جام ہائے شراب بڑے بڑے ہوتے تھے۔ جو شرابِ شاہی دسترخوان پر چنی جاتی تھی وہ طائف کے بہترین انگوروں کی ہوتی تھی۔ اول تو یہ خود لذیذ اور خوشبودار ہوتی تھی، پھر اس میں مشک و عنبر و دیگر مقویات ملا کر پیا جاتا تھا۔ جب معدہ اتنا بھر جاتا کہ ایک قطرہ کی گنجائش نہ رہتی تو قے لانے والی چیزیں استعمال کر کے معدہ خالی کر لیا جاتا، اور پھر از سر نو دور چلنا شروع ہوتا کہ لطف میں کمی نہ آئے اور تکلیف نہ ہو۔

ذرا غور کیجیے کہ خلفاء راشدین کی جزرسی، بزرگانہ سادگی اور متقیانہ زندگی کے مقابلہ میں یہ شان و شوکت اور فضول خرچی کی بدہضمی کیا درجہ رکھتی ہے! کتنا بڑا تفاوت ہے ان خلفاء کی حالت میں اور جناب رحمتہ للعالمینؐ کی اس سادہ زندگی میں کہ حضورؐ بعض وقت اپنا سادہ کھانا خود پکا لیتے تھے اور اپنے جوتوں کی خود مرمت فرما لیتے تھے (اللھم صل علے محمدؐ عبدک و رسولک)۔ کتنا بڑا فرق ہے ان خلفاء کی حالت اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خود دارانہ زندگی اور اتقا میں (اللھم برد مضجعہ)۔ ان خلفاء کی حالت کا اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مجاہدانہ و درویشانہ زندگی اور انتہاء دینداری سے مقابلہ کیا جائے تو کس قدر حیرت ہوگی۔ یہ فاتح اعظمؓ جب بیت المقدس میں آیا ہے تو اسکے جسم پر ایسے پھٹے پرانے کپڑے تھے کہ اُسیؓ کی فوج کے کسی ذلیل ترین سپاہی کے بدن پر نہ ہونگے جب شاہنشاہ ایران کا سفیر مدینہ میں آیا ہے تو اُس نے اس باعظمت و جلال بادشاہ کو فقراء و مساکین کے ساتھ

مدینہ کی مسجد کی سیڑھیوں پر سوتا ہوا پایا تھا (اللہم عظم شانہ لدیک) واقعہ ہجرت کو ابھی پورے سو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ ملک شام میں بنو اُمیہ اپنے عروج کے نصف النہار پر پہنچ کر ان معبولی کے بانی ہو گئے۔

اس زمانہ میں عورتوں کو اتنی آزادی تھی کہ مسلمانوں نے بعد میں اتنی آزادی اُن کو کبھی نہیں دی۔ بادیۂ عرب کی وارستگی کو ابھی تک اس نئے تمدن نے نہیں دبایا تھا۔ خلفاء راشدین کے زمانہ تک خواجہ سرا بنانے کی بد اور وحشیانہ رسم جاری نہیں ہوئی تھی، ان کی تجارت تو اس زمانہ کے خواب خیال میں بھی نہ تھی لیکن زمانہ مابعد میں جب مسلمانوں کا بیزنطینی اور ایرانی درباروں سے اختلاط ہوا تو یہ رسم نہ صرف جاری ہی ہوئی بلکہ اس کے لئے تشویق کی جاتی تھی۔ اُس زمانہ کے مورخین کی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان خواجہ سراؤں کی وجہ سے ان دنوں کی بدکاریوں اور بداخلاقیوں میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ جیسا کہ سیاحان ایشیا کو معلوم ہے اس فرقہ کی وفاداری اور ایمانداری پر اب تک داغ نہیں آیا۔ خلفاء اپنے رعایا کی حرم سراؤں میں پوشیدہ طور پر پہنچ جاتے تھے اور علے رؤس لاشہاد عورتوں کے نام لے لے کر اُن کے حسن کی تعریف میں نظمیں کہتے تھے۔ محلہاء شاہی کی عورتیں بے دھڑک شعراء اور دربار کے مغنیوں سے ساز و باز رکھتی تھیں۔ جب یہ مثالیں اُن کے سامنے ہوں تو غرباء سے یہ کب امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی پرہیزگاری کو قائم رکھیں، خواہ وہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ سوسائٹی کی ایسی ذرہ حالت کہیں کی نہ تھی جیسی کہ دمشق کی۔ باشندۂ شام مترادف تھا مخنث، بے ایمان اور عیب دار کا۔

خلفاء دمشق کی یہ تمام زیادتیاں واقعی نہایت شرمناک تھیں، مگر مسلمان ان سے چشم پوشی کرتے تھے۔ اُن کے غیظ و غضب کی البتہ اُس وقت انتہا نہ رہتی تھی۔ کہ جب خود خلیفہ ایسے فعل کر جاتا تھا جو ایک دیندار مسلمان کی نگاہ میں نہایت مبغوض تھے۔ حرّہ کی لڑائی میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیا گیا تھا، اور اسی لڑائی نے عرب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اسکے خاتمہ پر یزید کے سپہ سالار نے مدینۂ مقدسہ کی لوٹ معاف کر دی تھی۔ سپاہیوں نے وہاں وہ ظلم و ستم

ڈھائے اور وہ قتل عام کیا کہ ان لوگوں کی روح بھی کانپ گئی جو اس قسم کے منظر کے دیکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے ستم ناروا کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک ہزار بچے ایسے پیدا ہوئے کہ جو "ابناء حرۃ" کے بدنام نام سے عمر بھر موسوم رہے۔ ان بدبختوں نے اپنے گھوڑوں کو مسجد نبوی میں باندھا۔ یہ وہ مسجد تھی کہ جسکو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے از روء الہام تعمیر کیا تھا۔ اُس منبر کے قریب کہ جس پر چڑھ کر حضور صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے قرآن مجید لوگوں کو پہنچایا، اُس روضہ مقدسہ کے پاس کہ جہاں جناب رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر واقدس دفن ہے اور جہاں حضورؐ کے دو دوست آسودہ ہیں، جو مقام کہ ریاض الجنۃ کہلاتا ہے، وہ مقام گھوڑوں کی لید سے ناپاک ہوگیا۔ یہ وہ مقام تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی جگہ قابل تقدس ہے تو صرف کعبہ۔ جنگ بدر کے بچے ہوئے صحابہ جنکو مسلمان رتبہ میں انبیاء بنی اسرائیل سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے، ایک ایک کر کے اس جنگ میں کام آئے۔ اس واقعہ کے چند ہی روز کے بعد مکہ شریف کا محاصرہ کیا گیا۔ اس کا وہ احترام جو صدیوں سے ہوتا چلا آتا تھا، قائم نہیں رکھا گیا۔ مسجد میں سپہ سالار کے حکم سے آگ لگا دی گئی، جس سے کعبہ شریف کو بھی نقصان پہنچا۔

بنو اُمیہ کے خلفاء مابعد کی حکومت میں اُن کی "جولانی طبع" انتہا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ بدکاریوں کی انتہا ہے کہ عوام الناس کے خیالات کی پروا نہ کر کے اُن کی زیادتیاں یہاں تک بڑھیں کہ وہ اپنی محبوبہ عورتوں کو شاہی لباس پہنا کر صبح کی نماز پڑھانے کے لئے مسجدوں میں بھیجنے لگے۔ اُنہوں نے اپنے مقدس رتبہ کو یہاں تک ذلیل کیا کہ وہ ادنےٰ درجہ کے آدمیوں کا بھیس بدل بدل کر اپنے ہمسایوں کے گھروں میں پہنچنے لگے، حالانکہ مسلمانوں کی نگاہ میں زنانخانہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کوئی غیر داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ اُن جانوروں کو پالتے اور پیار کرتے تھے۔ جن کا چھونا شرع شریف کی رو سے ناجائز تھا۔ زنا، شرابخواری اور ایسے ہی افعال سے اُن کی صحت بگڑ گئی تھی۔ کوئی مسلمان کسی کاغذ پر اس خوف سے پیر نہیں رکھیگا کہ مبادا اس

میں قرآن شریف کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ہو لیکن ان خلفاء بنو امیہ کی جرات و ہمت قابلِ دید ہے کہ وہ قرآن شریف کو ہی اپنے تیروں کا ہدف بناتے تھے۔ ہر شخص کسی نہ کسی عیب میں مشہور تھا۔ ولید اول شاذ ہی اپنے ہوش میں ہوتے تھے، اور کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ اُن کے یہاں شراب کی وجہ سے شور خرابہ نہ پڑتا ہو۔ یزید ثانی کی ایک محبوبہ مر گئی تو اُنہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اسی میں جان دے دی۔ ولید ثانی کے حالات کو اگر دیکھا جائے تو وہ نقال بھی تھے اور پاگل بھی۔ باوجود اسکے کہ اُن کے تمام رفیق مسلمانوں نے ان کو منع کیا، مگر وہ جب حج کو گئے تو اپنے کتوں کو ساتھ لے کر گئے؛ حالانکہ بحیثیت خلیفہ وقت ہونے کے اُن کو خود حاجیوں کا قافلہ سالار ہونا چاہئے تھا۔ اُن سے یہ اُمید کی جاتی تھی کہ وہ خود اتقاد پرہیزگاری کا نمونہ بن کر دکھائینگے، اور اپنے ساتھیوں سے مناسک حج ادا کرائینگے! مگر جب اُن سے بہت کچھ عرض معروض کیا گیا تو اُس کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اُنہوں نے اپنے روحانی اختیارات اور فرائض ایک اور شخص کو سپرد کر دیئے جب مکہ معظمہ پہنچے تو اُنہوں نے کعبہ شریف کی چھت پر خیمہ نصب کر کے رہنا چاہا تاکہ اگر وہ خرابائیاں کریں تو لوگ اُن کو نہ دیکھیں اور عوام الناس کی ملامت سے محفوظ رہیں لیکن غنیمت ہے کہ بمشکل تمام اُن کو اس ارادے سے باز رکھا گیا۔ اُن کا بہت بڑا رفیق ایک بندر تھا جس کا نام اُنہوں نے ابو القیس رکھا تھا۔ یہ جانور اُن سے کسی وقت جدا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بندر طائف کی بہترین شراب اُسی پیالہ سے پیتا تھا جس سے خود بادشاہ اُسی کے ساتھ خمار میں شریک رہتا تھا سفرائے ممالک غیر سے خلیفہ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ بندر یہودیوں کا ایک برگزیدہ عالم تھا جو غضب الٰہی کی وجہ سے بندر ہو گیا ہے، اور اب مسخ ہو کر اپنی بقیہ زندگی ناپاک جانور کی شکل اور گناہوں میں کاٹ رہا ہے۔ خلیفہ جب کبھی سفر کو جاتے تو ابو القیس بھی ریشمیں لباس پہنے ہوئے ایک قیمتی گدھے پر سوار ہوتا تھا جس پر مکلف چارجامہ کسا ہوتا تھا، ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ابو القیس اپنے مالک کی ہم پیالگی میں بہت زیادہ شراب پی گیا، اور نشہ میں گدھے

گر کر مر گیا۔ ولید نے کئی ہفتہ سوگ منایا، جس پر عمایدِ سلطنت مذاق اُڑاتے رہے۔ اُسکو اسلامی رسوم کے موافق دفن کیا گیا، جس سے مسلمانوں کو بہت ہی غصہ آیا۔ خلیفہ خود بہت اچھے شاعر تھے۔ اُنہوں نے اُس کا مرثیہ کہا اور اُسکی بہت ہی مدح کی٭۔

میں نے دمشق کے متعلق ذرا تفصیل سے کام لیا ہے، کیونکہ اُس کا سیاسی، تمدنی، دینی اور فوجی اثر اندلس پر بہت پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ موخرالذکر مُلک میں شامیوں کی تعداد بہت نہ ہو مگر اُن کا اثر یہاں بہت ہی زیادہ تھا۔ اندلس کا سب سے پہلا خلیفہ بنوامیہ کے باقیات میں سے تھا۔ باشندگانِ اندلس اور بنوامیہ کے عناد، عصبیت اور روایات یکساں تھے۔ اِس شامی جلاوطن (عبدالرحمٰن الداخل) کو وطن کے مناظر اور واقعات کی یاد بہت ہی عزیز تھی۔ اِن کی فوج کی صف بندی بھی بالکل اُسی طریقہ پر ہوتی تھی جیسی کہ معاویہ اور ولید کے سفید علموں کے نیچے۔ اُنہوں نے یہاں کے شہر بھی اُسی طرح بسائے تھے، اور اُن کی ویسی ہی پیچ در پیچ گلیاں رکھی تھیں، جیسی کہ شام کے دارالخلافہ کی۔ اُسکے محلات بھی اُن ہی معماروں نے بنائے تھے جو دارالخلافہ مشرقی کے وہ باشان و شوکت محل دیکھ چکے تھے، جو دمشق کے لئے مایۂ ناز تھے۔ وہ پچی کاری مسجد جو دمشق کی محراب کو درخشاں کئے ہوئے تھی، اُسی کا چربہ دارالخلافہ مغربی کی جامع مسجد میں اُتارا گیا۔ یہ دونوں اُن ہی صناعانِ بیزنطینی کے کام تھے جنھوں نے سینٹ جان بیپٹسٹ کے گرجا کا گنبد بنایا تھا۔ البتہ وہ نسخۂ قرآن مجید جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے خون سے رنگین تھا، اور مدتوں دمشق کی جامع مسجد میں جناب ممدوح کے خون آلود کپڑوں کے ساتھ رکھا رہا، وہ صدیوں سے زیادہ اُن بے تعداد زایرین کی زیارتگاہ بنا رہا کہ جو قرطبہ کی عجائبات کی شہرت سُن کر تمام دنیا سے یہاں کھچے چلے آتے تھے۔ اِس قرآن مجید کی وہ عزت و عظمت کی جاتی تھی جو مُنجر بکفر تھی٭۔

٭ مسٹر سکاٹ نے بنوامیہ کے تمام عیوب ایک ایک کر کے گنائے ہیں۔ غالباً وہ اُن میں کوئی خوبی نہیں دیکھتے۔ کاش کوئی اُن تک یہ پہنچا دے کہ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ (مترجم)

ایک طرف تو ہر اُس چیز پر مذاق اُڑایا جاتا تھا جس کو دین سے تعلق تھا، دوسری طرف وہ طرز معاشرت تھی جس میں اخلاق و آداب حسنہ کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا، اور جو دربار دمشق میں جاری وساری تھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دریائے ٹیگس اور وادی الکبیر کے کناروں کے رہنے والے اسکو خلاف سیاست اور سخت گنوارپن سمجھتے، مگر تمام جزیرہ نمائے اندلس میں تعلیم پھیل گئی، اور ساتھ ہی فلسفہ نے وہ زور پکڑا کہ ہر چیز میں شک کیا جانے لگا، یہاں تک کہ قرآن مجید کے الہامی ہونے پر بھی، اس لئے اس معاملہ میں مسلمانان شام و اندلس یکساں ہو گئے۔ علوم سینہ بسینہ، مثلاً سحر و نجوم کا بھی مغرب میں اُتنا ہی زور تھا جتنا کہ مشرق میں۔ انتہاء ذہانت نے واہمہ پرستی کے بہت سے عیوب سے چھٹکارا کرا دیا، مگر باوجود اسکے مکار ساحروں اور ارباب فال و رمل سے جو اعتقاد پیدا ہو گیا تھا اُس میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی۔

اندلسی عربوں نے اپنے شامی بھائیوں کی تقلید میں عورتوں کو بہت کچھ آزادی دی۔ زمانہ بعید سے وہ مردوں کا کھلونا اور دینی اعتقاد کی کنیزکیں بنی ہوئی تھیں۔ اندلس میں اُن کی وہ حالت نہیں رہی۔ شام کی شاہزادیوں کی رائیں دربار شاہی میں اکثر بے اثر نہ رہتی تھیں۔ قرطبہ کے خاندان شاہی کی خواتین بادشاہ کی مشیر کار، فلسفیوں کی مددگار اور بڑے بڑے طبیبوں، ہیئت دانوں، سپہ سالاروں اور سیاست دانوں کی دست راست ہوتی تھیں وہ اسراف بیجا، شرمناک کفریات اور مضحک حماقت، جو خاندان بنو امیہ کی خصوصیات تھیں ان لوگوں میں نہ تھیں۔ شاہان قرطبہ ایسا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، گو وہ بالواسطہ ہی کیوں نہ ہو، جو اُن کی رعایا کو تجارت کے فوائد، سائنس کے فیضان، صنعت و حرفت کے لطف اور اشاعت علم ادب کی نعمتوں سے مستفید کرے۔ اسکے ساتھ ہی وہ اتنے بلند نظر اور وسیع الخیال تھے کہ وہ اپنے ہی ملک کے اندر محدود نہیں رہنا چاہتے تھے، اور ترقیات کی اُس راہ پر پڑ جانا چاہتے تھے جس نے اقوام کو انتہاء عروج پر پہنچا دیا ہے۔

جس قوم کے مقتدایان مذہبی ملحد ہونے کے ساتھ ہی منافق بھی ہوں، جن لوگوں کے بادشاہ اس دین و مذہب کی حقارت کرتے ہوں، جس کے طفیل میں وہ درجۂ شاہی تک پہنچے ہوں اور جن کی شرارت ضرب المثل ہو چکی ہو، ایسی قوم سخت حملہ کی تاب نہیں لا سکتی۔ یہی کیفیت خاندان بنو امیہ کی دمشق میں ہوئی۔ نہ صرف شام ہی میں، بلکہ انتہاء ملک محروسۂ خلافت میں، امیر المومنین کے عیوب اور تشکیک مشہور ہو چکی تھی۔ لوگ ان کو بہت ہی بُری نگاہ سے دیکھتے اور بُری طرح اُن کا ذکر کرتے تھے جو لوگ کہ خانہ نشین و امن پسند تھے، وہ بھی دربار شاہی کی بدکاریوں سے پریشان تھے۔ اُن حضرات کی اولاد جنہوں نے حرہ اور مکہ کی لڑائیوں میں جانیں دی تھیں، اور وہ فسادی لوگ جن کا دم عراق کے عمال کے فولادی پنجہ سے خفا ہوا جاتا تھا ہر وقت انتقام لینے کے فکر میں لگے رہتے تھے۔ وہ دیندار مسلمان جو دل کے ساتھ احکام قرآنی پر عمل کرتے تھے اور جنکے نزدیک روایات اسلامی اس لئے متبرک تھیں کہ اُن کا تعلق حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی کے ساتھ تھا، وہ لوگ جانشینان رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلمات کفر کو، جو مسجد و محراب میں بھی بے تامل بکے جاتے تھے، سُن سُن کر کانپ جاتے تھے۔ لوگوں کا غیظ و غضب اکثر مختلف بغاوتوں سے ظاہر ہوتا رہتا تھا، مگر چونکہ نہ اُن میں نظام ہوتا تھا نہ کوئی سرکردہ، اس لئے وہ بہت آسانی کے ساتھ فرد کر دی جاتی تھی۔ لیکن مروان ثانی خاندان بنو امیہ کے چودھویں تاجدار کے زمانہ میں جو بغاوت ایران سے شروع ہوئی وہ نہایت شدید تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالے عنہ، یعنی جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا کی اولاد نے تخت خلافت کا دعوے کیا۔ ان کا طرفدار ایک شخص ابو مسلم نامی بنا، جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ باشندگان ایران نسل در نسل محبان علیؓ میں سے تھے، یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں باغیان خلافت کے گروہ میں آ آ کر شامل ہو گئے۔ دعویدار خلافت ابو العباس تھے، وہ جب مشرقی علاقوں پر اپنا تسلط جما چکے تو مغرب کی طرف شام کو فتح کرنے کے لئے بڑھے۔ پہلے تو خلیفہ مروان اس بغاوت کو بہت ہی حقیر جانتے رہے، لیکن آخر خواب غفلت سے ایسے

وقت چونکے کہ دشمن کلہ پر آگیا۔ اب اُنہوں نے آخری مقاومت کے لئے اپنی تمام فوج کو جمع کیا۔ دریاء زاب (معاونِ دجلہ) کی وادی میں، جو نینوہ کے کھنڈرات کے قریب واقع تھا، دونوں فوجوں کا مقابلہ ہؤا۔ اس جنگ کے نتیجہ سے اسلام کے دو گروہوں کی قسمت وابستہ تھی۔ عباسیوں کی جان بازی، اور نمک حراماں خلافت کی ریشہ دوانیاں کام آئیں، مروان کی فوج کو شکست فاش ہوئی، اور اُس خاندان کی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جو بغداد کی شان و شوکت سے دربار دمشق کی نظر کو خیرہ کرنے والے شکوہ کو گہن لگانے والی تھی۔ ادھر عباسیوں کو فتح ہوئی اور اُدھر قتل و جلاوطنی کا دور دورہ ہؤا۔ جس شخص پر بنو امیہ کے حامی ہونے کا ذرا سا بھی شبہ ہؤا وہ خائنین کی تلوار سے نہیں بچا۔ بہت ہی جلد یہ ثابت ہو گیا کہ تاوقتیکہ اموی خاندان کا بچہ بچہ قتل نہ ہوگا عباسیوں کا غیظ و غضب فرو نہ ہوگا۔ حرماں نصیب مروان یہاں سے شکست کھا کر بخط مستقیم مصر کی طرف بھاگا، مگر موت نے وہاں بھی اُس کا راستہ گھیر لیا اور وہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اُن کے خاندان کا ہر فرد جس کے درجہ و رتبہ کو دیکھ کر یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید وہ کسی وقت دعویدار تخت ہو، بے رحمی کے ساتھ قتل کر ڈالا گیا۔ جہاں کہیں یوں وار نہ چلا وہاں بدترین سازش سے کام لیا گیا، اور خفیہ طور پر وہ شخص قتل کر دیا گیا۔ ابو العباس کے چچا عبداللہ، چونکہ مروانیوں کی حمایت کرتے رہتے تھے اس لئے مروانیوں نے غلطی سے اُن کو اپنا خیر خواہ سمجھ لیا۔ عبداللہ نے حتمی وعدہ کیا کہ جو اموی دمشق میں چلا آئیگا وہ اُن کی پناہ میں ہوگا۔ اُن کے وعدوں پر اعتبار کر کے بہت سے لوگ اُن مقامات سے نکل آئے جو نسبتاً محفوظ تھے اور دمشق میں آ کر اپنے دشمن کے جال میں پھنس گئے۔ عبداللہ نے جب دیکھ لیا کہ سب لوگ آ گئے ہیں تو ان لوگوں کے ساتھ اوروں کو بھی دعوت دی۔ اس وقت ستر کے قریب مروانی وہاں موجود تھے۔ ابھی دستر خوان بھی نہیں چُنا گیا تھا، اور لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، کہ ایک اشارہ پر سپاہی مکان کے اندر گھس آئے اور یہ مہمانان عزیز ایک ایک کر کے قتل کر دیئے گئے۔ اُس کمرے میں جتنے قالین اور پردے تھے سب مقتولین کی لاشوں پر ڈال دیئے گئے، اور سب نے اُن ہی پر بیٹھ کر ضیافت

کالطف اُڑایا اور حامیان بنو عباس نے اُس قسی القلب کی تعریفیں کیں جس کی سنگدلی اور فریب نے اپنے مخدوش ترین دشمنوں کو مہمان نوازی کی قربانگاہ پر یوں قربان کر دیا کسی بدو کے خیمہ میں اگر دشمن سے دشمن بھی جا گھستا تھا تو وہ اپنی جان محفوظ سمجھتا تھا لیکن ایرانی اور شامی عربوں کے وعدے اس لئے نہ کئے جاتے تھے کہ اُن کا ایفا ہو بشرطیکہ اس سے ان کا کوئی فائدہ ہو۔ غرض یوں روم اور بیزنطین کے اخلاق ذمیمہ نے اُن لوگوں پر اس بلا کا اثر کیا تھا جن کی مردانہ خودداری اور ذاتی جوہر ایک زمانۂ بعید سے ایشیا بھر میں مشہور و معروف رہے ہیں۔

خون کے پیاسے عباسیوں نے اپنے حریفوں کے ایک ایک فرد کو تلاش کر کر کے مارا، کونے کونے سے ڈھونڈھ کر نکالا اور جانوروں کی طرح شکار کیا۔ بچوں کو والدین کے سامنے ذبح کر ڈالا۔ جن عورتوں نے اپنے عزیزوں کا پتہ بتلانے میں تامل اور اپنے زیورات و جواہرات دکھلانے میں حجت کی اُن کو فوراً قتل کر ڈالا۔ ابو ابن معاویہ جو دمشق کا معزز ترین شہسوار اور سپاہی تھا اُس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹ دیا گیا اور شام کے شہروں میں اُسکو تشہیر کرایا گیا۔ آخر سیلانِ خون اور اس کی تکلیف نے اُسکی دنیاوی مصیبت کا خاتمہ کر دیا اور اُسی حالت میں اُس نے اپنی جان دی۔ خون آشام عباسیوں نے اپنا غصہ زندوں ہی پر نہیں نکالا بلکہ مردوں کو بھی چین نہ لینے دی۔ چنانچہ بہت سے خلفا کی ہڈیاں نکال کر پھینک دیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی شان و شوکت یا اُن کے عیوب نے تخت ممالک مشرقیہ کو مزین یا ناپاک کیا تھا، اور جن کے افسانے ابتک دنیا میں مشہور ہیں۔

اس تباہ شدہ خاندان بنو امیہ میں صرف ایک شہزادہ عبدالرحمن ابن معاویہ نام کسی طرح بچ رہا۔ اپنے ذاتی جوہر اور خوبیوں کے سبب سے یہ دربار شام کے زیور سمجھے جاتے تھے۔ دارالخلافہ دمشق کے بہترین مدارس میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ چونکہ اُنھوں نے بہت سے سفر کئے تھے۔ اس لئے ان کو بہت کچھ تجربات حاصل ہو چکے تھے۔ اُن کا شاہزادہ یا دولتمند ہونا ایسی باتیں نہ تھیں کہ جن کا کوئی بڑا اثر اُن کی شہرت پر پڑا ہو۔ بڑے بڑے علماء کی صحبت، علمی ابحاث، دفتر

شاہی کے تجربات، معززین عمایدِ سلطنت کے اختلاط سے وہ سلطنت اور طرزِ حکومت کی پیچیدہ کلوں سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ اُن کا زمانہ ایسا پُر آشوب تھا کہ شاہی خاندان کے ہر فرد کو فنِ سپاہ گری سیکھنا پڑتا تھا' اس لیے عبدالرحمٰن اُن فنوں سے بھی بدرجۂ اتم واقف تھے جو جنگ کے میدانوں اور فوجی چھاونیوں میں کام آتے ہیں۔ مردانہ کھیلوں، شکار، مردانہ وار تکالیف اُٹھانے، اور ہتھیاروں کے استعمال میں وہ اپنے تمام حریفوں کو نیچا دکھا چکے تھے۔ اتفاق کی بات تھی کہ جس وقت بنو اُمیہ کا قتلِ عام ہوا ہے وہ دمشق سے غیر حاضر تھے جیسے ہی اُن کو اس ناگہانی مصیبت کی خبر پہنچی، وہ اپنی جاگیر پر جو فرات کے کنارے واقع تھی، چلے گئے، اور یہیں اُن کے اقربا وغیرہ آ گئے۔ ابو العباس کی سفاکی کی یہ حالت تھی کہ اُن کا نام ہی سفّاح (یعنی* عوام کے خیال کے مطابق "خون ریز") پڑ گیا تھا۔ اُن کے سوار ہر جگہ بنو امیہ کی تلاش میں پھرتے تھے۔ اُن میں سے ایک دستہ نے عبدالرحمٰن کو بھی ڈھونڈھ نکالا۔ یہ اپنے محل میں تھے کہ اُن کو آ گھیرا۔ عبدالرحمٰن یہ کیفیت دیکھ کر دریا میں کود پڑے اور تیر کر اپنی جان بچائی۔ جانکاہ تکالیف اور سخت مصایب کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح فلسطین پہنچ گئے، مگر ہمت نہ ہاری۔ یہاں اُن کے والد کا ایک آزاد کردہ غلام بدر نامی، بھی اُن سے آملا! بدر اپنے ساتھ شہزادے کی بہن کے بہت سے زیورات اور جواہرات بھی لایا تھا' وہ اس نے اپنے آقازادہ کی نذر کیے' تاکہ اُن سے اپنی ضروریات رفع کریں۔ غرض عبدالرحمٰن فلسطین سے بھیس بدل کر افریقیہ میں جا پہنچے۔ اس ملک نے اس وقت تک بنو اُمیہ کی بیعت نہیں توڑی تھی۔ یہاں کا گورنر اب تک اس مبغوض قبیلہ کا جاں نثار تھا۔ افریقیہ والے اُن سے بڑے تپاک سے پیش آئے' اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا' اور عباسیوں کے جور

---

* یہ ایک پرانی غلطی ہے کہ سفّاح نے اپنی خون ریزی کے سبب سے یہ لقب اختیار کیا تھا اور اس غلطی کا اعادہ اکثر کتب تاریخ میں ہوتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سفّاح کے معنی خون ریز کے بھی ہیں اور مہمان نواز کے بھی۔ اور یہی موخرالذکر معنے ہیں جن کا اطلاق سفّاح کے لقب پر ہوتا ہے۔ (مترجم)

ظلم سے بچے ہوئے جتنے آدمی وہاں جمع تھے سب اُن کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ چونکہ وہ یہاں نسبتاً محفوظ تھے اُن کو کچھ اطمینان ہوا اور فرار کی مصیبت سے اُن کے دل نے کچھ قرار پکڑا۔ اُن کو وہ ہمدرد مل گئے جو اُن کی مصیبت سُن سُن کر اور بھی اُن کے گرویدہ ہوتے چلے جاتے تھے۔ بنوامیہ کی اس تباہی سے سالہاسال پیشتر ایک نجومی* نے بنوامیہ کی اس مصیبت کی پیشینگوئی کی تھی، اور ساتھ ہی یہ بھی بتلایا تھا کہ اُن میں سے ایک مصیبت کا مارا مفرور بڑی شہرت پائیگا۔ عبدالرحمٰن گو بہت ہی عقیل وفہیم تھے، مگر ایسے نہ تھے کہ فال وشگون اور امید افزا نجومی پیشینگوئیوں سے اثر پذیر نہ ہوتے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک مشرقی آدمی کے عقیدہ کے ساتھ ان مشعبد لوگوں کی باتوں کو سُنا۔ اُنہوں نے دیکھ لیا کہ اس پیشینگوئی کا پہلا حصہ پورا ہوگیا کہ باستثناء اُن کی ذات خاص کے اُن کے خاندان کا تمام افراد مار ڈالے گئے تھے۔ اُن کی بیدار مغزی، اُن کے دماغی تفوق، اُن کے سیاسی تجربات، اُن کی بالغ نظری اور اُن کی نیک نہادی نے اُن کے گرویدگان اور خود اُن کے دل میں یہ ڈالا کہ اُن کے خاندان کے کسی آدمی میں تاج وتخت کی وہ قابلیت نہیں ہے جو خود اُن میں ہے۔ اس خیال سے اُن میں ایک طرح کی ہوس اور خیالات میں بلندی آگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات احسان مندی برطرف، وہ افریقیہ کی بادشاہی کے خواب دیکھنے لگے۔ اُن سے ناعاقبت اندیشی ہوئی کہ اس معاملہ میں اُنہوں نے اپنی زبان نہیں روکی۔ اُن کے ارادوں کی خبر عامل افریقیہ ابن حبیب نامی تک پہنچ گئی، جو اکھڑ مزاج کے سپاہی اور یوسف (امیر اندلس) کا رشتہ دار تھے۔ ایک زمانہ میں وہ اندلس کی فوج میں ایک عہدۂ جلیلہ پر رہ چکے تھے۔ ابن حبیب کو بھی اُس نجومی کی پیشینگوئی کی اطلاع ہوئی۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ اپنا عہدہ اور اپنی جان دے کر عبدالرحمٰن کو تخت وتاج دلوائیں۔ اُنہوں نے

---

* کہتے ہیں کہ یہ نجومی مسلمہ بن عبدالملک تھا۔ جس کو نجوم میں بڑا دخل تھا اور اسی نے عبدالرحمٰن کے مستقبل کے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی۔ (مترجم)

اپنے مہمانوں سے کنارہ کشی کرنی شروع کی، اور خاص کر اس لئے کہ ان کے مہمانوں نے ان کی مہمان نوازی کا یہ بدلہ دیا کہ اُن کی جان پر بن جانے کا اندیشہ ہوگیا؛ اس لئے اُنہوں نے خلیفۂ عباسی سے بیعت کر کے اپنے ناشکرے مہمانوں کو ملک بدر کر دیا۔ عبدالرحمٰن کو بھیس بدل کر صحرا کے کسی ایسے گوشہ میں چھپنا پڑا جہاں اُن کا پتہ نہ لگ سکے۔ اُن کی حالت روز بروز نازک ہوتی چلی جاتی تھی۔ اُن کی گرفتاری اور قتل کے لئے ہزار اشرفی کا انعام مشتہر تھا۔ وہ بدوؤں میں جا کر چھپے تھے لیکن اُن کی فیاضانہ مہمان نوازی بھی اُن کو نہ بچا سکتی تھی؛ ابن حبیب کے جاسوس اور سوار اُن کو نہ کسی قبیلہ میں چین لینے دیتے تھے نہ میدان میں۔ ایک موقعہ پر وہ خیمہ میں بیٹھے تھے کہ بربری اُن کو گرفتار کرنے کے لئے آ پہنچے، مگر وہ بال بال بچ گئے۔ ایک اور موقعہ پر ایک شیخ کی بیوی نے اُن کو ایک کونے میں چھپا کر اُن کے اوپر بہت سے کپڑے ڈال دیئے۔ اُن کے پاس جو کچھ روپیہ پیسہ تھا وہ پہلے ہی خرچ ہو چکا تھا اور اب اُن کا گزارہ خیرات کے ٹکڑوں پر رہ گیا تھا۔ اُن کو جو کچھ کھانا ملتا تھا وہ مقدار میں بہت کم اور موٹا جھوٹا تھا۔ کپڑے سارے پرانے ہو کر پھٹ گئے تھے۔ اُن کا بچپن اور جوانی بڑے ناز و نعمت میں گزری، شاہی دسترخوان پر وہ دنیا بھر کی نعمتیں کھاتے رہے، لیکن اس وقت اُن کو جو کی روٹی اور اونٹنی کا دودھ پینے کو ملتا تھا؛ وہ صبر و شکر کے ساتھ ہزار نعمت سمجھ کر اسی سے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ اُن کی شاہزادگی، اُن کی خوش اخلاقی، تعاقب کے موقعوں پر اُن کی ذہانت اور دلیری، اور مصیبت کی حالت میں اُن کا صبر و قناعت یہ سب ایسی صفات تھیں کہ جن کی وجہ سے اُن کے وحشی رفیق جان اُن کی تعظیم کرتے اور اُن پر مٹے جاتے تھے۔ ان پھٹے حالوں پر بھی اُن کے دل سے تخت افریقیہ کی ہوس نہیں نکلی؛ اُن کو گو کامیابی نہیں ہوئی، مگر گورنر افریقیہ نے اپنے آدمی اُن کا سر لانے کے لئے لگائے ہی رکھے۔ آخر پانچ برس کامل خانماں برباد و خوار و پریشان پھرنے کے بعد ایک بربری قبیلہ نفوسہ کے مہمان ہوئے۔ یہ قبیلہ نہ نانتہ

کی ایک شاخ تھا۔ عبدالرحمن کی ننہال بھی اس قبیلہ میں تھی اور اس کے بہت سے آدمی سبتہ میں رہتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اُن کو یہ معلوم ہوا کہ گویا وہ اپنے گھر میں پہنچ گئے، کامیابی کا ہرا بھرا میدان اُن کی آنکھوں کے سامنے آگیا؛ اور ایک بے گھر بے در بے زر آدمی کو دور دراز ملک کے باشندوں، اور نئی قوم نے نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے لئے بلا لیا، جو آئندہ بہت وسیع اور نامور ہونے والی تھی۔

Saragossa

جن دنوں عبدالرحمن پر یہ کچھ گزر رہی تھی، اندلس میں یوسف اور احمر، بادشاہ سرقسطہ کے درمیان میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ اگرچہ متنازعین سخت کشش و کوشش کر رہے تھے مگر فیصلہ کسی فریق کے حق میں نہ ہوا تھا۔ چونکہ افریقیہ اور اندلس کے درمیان میں تعلقات بہت ہی دوستانہ تھے اس لئے موخرالاسم ملک کی فوج کے لئے افریقیہ ہی کے جنگجو جوان بھیجے جاتے تھے دونوں ملکوں کے عامل آپس میں رشتہ دار تھے، دونوں کے سیاسی اغراض ایک دوسرے سے وابستہ تھے، اس لئے عرب اور بربر دونوں کی نگاہیں اندلس ہی طرف لگی رہتی تھیں، اور وہاں کے اہم امور کی خبریں دم بدم ملک مغرب میں پہنچتی رہتی تھیں۔ عامل افریقیہ کی قابلیت اور بیدار مغزی کو دیکھ کر عبدالرحمن کو آخر یقین ہو گیا کہ اُن کے ملک پر ہاتھ مارنا بیکار ہے۔ مگر اندلس پہنچ جانا چنداں مشکل نہ تھا، اُس ملک کی زدہ حالت وہ اچھی طرح جانتے تھے اور وہاں جو مصایب اس وقت پڑ رہے تھے وہ بھی اُن سے پوشیدہ نہ تھے، یہ سب دیکھ بھال کر اُنہوں نے اپنی عمر بھر کی تمنا (یعنی شاہی افریقیہ) سے ہاتھ دھوئے اور ایک اور ملک کی طرف مائل ہوئے جس میں کامیاب ہونا ممکنات سے تھا۔ اس وقت، عین محتاجی کے عالم میں اس مفلس شاہزادے کے بعض دوستوں نے شام سے روپیہ بھیج دیا۔ جسے اُنہوں نے اپنے وفادار غلام بدر کو دے کر اندلس روانہ کر دیا۔ یہ وہی بدر ہے جس نے سخت مصیبتوں اور تکلیفوں میں بھی اپنے آقازادہ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ بدر کے ہاتھ اُنہوں نے ایک خط اپنے خاندان کے حمایتیوں کے نام دیا، جو سینکڑوں کی تعداد میں

مشرقی اندلس میں رہتے تھے؛ اور اس میں اُنہوں نے ہر وئے توریث تاج و تخت اندلس کا اپنے آپ کو حقدار جتلایا۔ بدر نے موقعہ و محل دیکھ کر یہ خط شامی گروہ کے سرکردہ کو دیا؛ اور اُنہوں نے خفیہ طور پر تمام شامیوں کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ نسل در نسل خاندان بنو امیہ کے جان نثار چلے آتے تھے؛ عبدالرحمٰن کا دعوےٰ بھی بالکل بجا اور درست تھا۔ ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی؛ اور قتل و غارت قحط اور وبا کی مصیبتیں ملک کو گھیرے ہوئے تھیں؛ کچھ تو یہ کہ اس جان نثار فریق کو اپنی ترقیات کا سر سبز باغ نظر آ رہا تھا اور وہ مدد کو ہر طرح تیار تھے؛ اور کچھ کام اُس روپیہ نے کیا جو بدر اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے عبدالرحمٰن ہی کے موافق رائے دی۔ ابھی یہ رائے پوری طرح پر قائم بھی نہ ہو چکی تھی کہ ایک نئی مشکل پیش آ گئی، جس سے صرف یہی ہوا کہ اس وقت کامیابی مشکوک ہو گئی؛ بلکہ تمام معاملہ مخدوش ہو گیا۔ امیر اندلس نے تمام شامیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً اُن کے ساتھ شمالی علاقہ کے حملہ میں شریک ہوں۔ مگر اُنہوں نے کچھ ایسی چرب زبانی سے کام لیا اور ایسے بہانے بنائے کہ کچھ مہلت مل گئی؛ اسکے علاوہ ہزار دینار یوسف سے یہ کہہ کر وصول کئے کہ اس رقم سے وہ اپنے پس ماندگان کا فکر کر جائیں۔ مقصود یہ تھا کہ یوسف ہی کے روپیہ سے یوسف کو تخت سے اُتارنے کی سازش میں مدد لیں۔ ایک جہاز کرایہ پر لیا گیا۔ اُسی میں عبدالرحمٰن ایک چھوٹی سی جمعیت بربریوں کی لئے ہوئے ساحل جزیرہ نمائے اندلس پر پہنچے اور بندر المیونےکار[1] پر لنگر کیا۔ یہاں اُن کے استقبال کے لئے ہزاروں آدمی موجود تھے جن کو شوق تماشا، یا جذبات وفاداری یہاں کھینچ لایا تھا اُنہوں نے اُن کے خیر مقدم میں خوب نعرہائے خوشی بلند کئے؛ اور یہیں اُن کو امیر بنا کر لوجا[2] کے قریب ہی ایک قلعہ میں جو عبداللہ کی ملکیت تھا، اُنہیں لے گئے۔ یہ شخص چونکہ بنو امیہ کے جان نثاروں میں سے تھا اس لئے وہی امیر عبدالرحمٰن کا میزبان بنا۔

جنوب میں تو یہ واقعات گزر رہے تھے۔ اُدھر یوسف الفہری نے برابرہ سرقسطہ

کے مقابلہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ یوسف کی زیادہ جمعیت سے غدار اہالی سرقسطہ کچھ ایسے رعب میں آئے کہ انہوں نے امیر وہاب اور خباب کو بطور یرغمال اُن کے حوالہ کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ یوسف نامور سپاہیوں کو لئے ہوئے اطمینان کے ساتھ جنوب کی طرف خراماں خراماں چلے آرہے تھے کہ راستہ میں انہیں خبر ملی کہ قوم بابسک نے اُن کی فوج کو شکست دی ہے۔ یہ سُن کر وہ غصہ میں ایسے دیوانے ہوئے کہ انہوں نے ان قیدیوں کو، جو نسلِ قریش سے تھے، فوراً قتل کرا دیا، حالانکہ ان غریبوں کا اس معاملہ میں ذرا سا بھی قصور نہ تھا۔ اس بے رحمی اور خلافِ حکمت فعل سے امیر یوسف کے آدمی بہت ہی ناراض ہوگئے اور اُن کا ساتھ چھوڑ کر اُن کے رقیب سے جا ملے۔ اس واقعہ کے چند گھنٹوں کے بعد ایک سوار نے آکر امیر عبدالرحمٰن کے اندلس میں داخل ہونے اور ایسے خطرے کے پیدا ہو جانے کی خبر دی، جو اُن کی امارت پر موثر ہونے والا تھا۔ جس سے امیر یوسف بہت ہی پریشان ہوئے اُدھر اس کا اثر یہ ہوا کہ مقتول قریشیوں کے سینکڑوں حامی تھے وہ سینکڑوں کی تعداد میں انتقام لینے کے لئے یوسف کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ عبدالرحمٰن کی جمعیت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی یمنی فریق پر چونکہ بنو امیہ ہمیشہ سے ظلم کرتے چلے آرہے تھے، اس لئے وہ اس خاندان سے سخت متنفر تھے، مگر اُن کو بنو امیہ سے زیادہ یوسف سے نفرت تھی۔ اس لئے لازماً وہ عبدالرحمٰن ہی کی طرف مائل ہوگئے قسمت کی خوبی دیکھئے کہ وہ شخص جو چند ہفتہ پیشتر اپنی جان کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا آج اپنے آپ کو تاج و تخت کا مالک اور کئی ہزار جنگ آزمودہ فوج کا سپہ سالار پاتا ہے۔ یوسف اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بغاوت نہایت خطرناک ہے، اور اگر باقاعدہ طور پر اس فریق سے جنگ کی جائے تو اُس کو طول ہوگا، اور پھر بھی نہیں معلوم اُس کا کیا نتیجہ ہو، اس لئے انہوں نے صلح سے کام نکالنا چاہا۔ چنانچہ یوسف کے ایلچی بڑے بڑے قیمتی تحائف لے کر عبدالرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن ایلچیوں

کو یہ اجازت تھی کہ وہ عبدالرحمٰن پر امیر یوسف کی لڑکی اور ایسی بڑی جاگیر پیش کریں جس سے وہ اپنی حیثیت قائم رکھ سکیں، بشرطیکہ وہ تخت و تاج اندلس کا ارادہ چھوڑ دیں۔ عبدالرحمٰن کے مشیروں کا جوش اس لئے کچھ کم ہوگیا تھا کہ اُن کو بد احتیاطی اور اس کے نتائج بد پر غور و خوض کرنے کا موقعہ مل گیا تھا؛ ان سب نے اپنے امیر کو یہ مشورہ دیا کہ یوسف کی پیش کردہ شرائط کو منظور کر لیں لیکن عبدالرحمٰن کے ایک آدمی نے ان کو ایسے سخت طعنے دیئے گئے کہ ان لوگوں سے سواء خاموشی کے کچھ نہ بن پڑا۔ پیغام صلح ناکامی پر ختم ہوا۔ ایلچی کو قید کر دیا گیا؛ اور اُس کے ساتھیوں کو فوراً چل دینے کا حکم ہوا۔ ان غریبوں پر قرطبہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے ایسے سخت حملے ہوئے کہ اُنھوں نے اُسی کو غنیمت سمجھا کہ وہ اپنی جان و مال بچا کر بعافیت واپس پہنچ گئے ۔

اب سواء اسکے کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ ہتھیار اُٹھائے جائیں۔ ہر جگہ کے اختلال و آشوب، امراء کے جلد جلد بدلنے، وحشیان افریقیہ کے متواتر ملک میں آتے رہنے سے ملک میں سخت بدنظمی پھیلی ہوئی تھی؛ اور معاشری حالت وقتاً فوقتاً بگڑی چلی جاتی تھی۔ رعایا کے ہر فرد کی وفاداری یا تو پالیسی کی وجہ سے تھی، یا اُن کو کسی اچھے حاکم کی تلاش تھی۔ فوج کی یہ کیفیت تھی کہ وہ قزاقوں کا گروہ تھی نہ کہ فوج، انتہا ہے کہ قبیلوں کی عصبیت بھی جاتی رہی تھی؛ ہاں البتہ جب کسی سے انتقام لینا ہوتا تھا تو سب ویسے ہی یک دل ہو جاتے تھے جیسے کہ بادیۂ عرب میں ہوتے تھے۔ بے ایمانی اور فریب ہی کی یہ کیفیت تھی کہ کسی کو نہ اپنے دوست پر بھی اعتبار تھا، نہ اپنے ہمسایہ پر اعتماد۔ یہ کچھ غیر معمولی بات نہ تھی کہ عین نازک موقعہ پر فوج بگڑ جائے اور دشمن سے جا ملے؛ بلکہ اُسی وقت وہ اپنے تیر و تبر اپنے پُرانے رفقا کے خلاف استعمال کرنے لگے۔ ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسی رت میں انصرام جنگ کتنا مشکل اور اُس کا انجام کتنا غیر متیقن ہو سکتا ہے۔ اُدھر عبدالرحمٰن کی کمک کے لئے قبیلہ زناتہ کے بہت سے سپاہی افریقیہ سے آ پہنچے۔ چونکہ یہ لوگ اُن کے ننہالی قبیلہ کے تھے؛ اور اُن کو

اندلس کے سیاسی معاملات، اور یہاں کی سازشوں کی خبر نہ تھی، اس لئے وہ اُن کے زیادہ مددگار ہوسکتے تھے بہ نسبت اُن تجربہ کاروں کے جن کے نزدیک تمام آقا یکساں تھے، اور جن کا اصل اصول لوٹ مار تھی۔

شروع موسم بہار میں عبدالرحمٰن کی فوجوں نے قرطبہ کی فتح کے ارادے سے کوچ کیا لیکن دارالامارت کا سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ جنوب کا رُخ کیا گیا جہاں شامی اور مصری زیادہ تھے، اور وہ بنو اُمیہ کے حامی تھے۔ باغیوں کا ہر جگہ نہایت تپاک سے استقبال ہوتا تھا؛ بڑے بڑے بہادر سپاہی اُن کے ساتھ ملتے چلے جاتے تھے۔ راستہ میں جتنے شہر پڑے، یکے بعد دیگرے اپنے دروازے اس شاہزادے کے لئے کھولتے چلے جاتے تھے۔ ان شہروں میں اہم اشبیلیہ تھا، اور اسکی آبادی بھی سب سے زیادہ تھی۔ ابھی عبدالرحمٰن اپنی اپنی رعایا سے پوری طرح بیعت بھی نہ لے سکے تھے کہ اُن کو خبر ملی کہ یوسف، بامداد صمیل، بہت بڑی فوج صوبہائے طلیطلہ اور مرسیہ میں جمع کئے ہوئے ہیں، اور اُن کا راستہ روکنے کے لئے قرطبہ کی طرف بڑھے آرہے ہیں عبدالرحمٰن شہر کو چھوڑ کر شمال کی طرف، اس غرض سے بڑھے کہ وہ امیر یوسف کی غیبت میں قرطبہ پر قبضہ کرلیں لیکن یہ گرگ باراں دیدہ سپاہی یوں غفلت ہی غفلت میں نہیں پھنس سکتا تھا۔ اُنھوں نے باغیوں کی نقل و حرکت کا پتہ لگالیا، اور واپس ہوگئے۔ دونوں فوجوں کے درمیان میں دریا حایل تھا؛ ایک کنارے پر عبدالرحمٰن کی فوج، اور دوسرے پر یوسف کی؛ دونوں میں خوب دوڑ ہوئی۔ جب دونوں ایک گاؤں موسارا[۴] کے قریب پہنچے، جو قرطبہ سے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر واقع تھا، تو عبدالرحمٰن ٹھیر گئے۔ ایک تو اُن کے سپاہی بہت تھک گئے تھے، دوسرے اُن کو خوراک بھی راستہ میں پوری نہ ملی تھی، اور انہوں نے شور مچانا شروع کردیا تھا، عبدالرحمٰن کو بھی یہ منحوس خبر معلوم ہوگی ایک جنگی مجلس شوریٰ قائم کی گئی، اور اس میں یہ قرار پایا کہ دوسرے روز حملہ کردیا جائے۔ عبدالرحمٰن نے ایک حیلہ کیا جس سے وہ بغیر مقابلہ، یا وقت، کے دریا کے پار پہنچ سکے، مگر یہ حیلہ ایسا تھا کہ جس سے

اُن کے نام پر دھبّہ آتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے دشمن یوسف کو پیغام بھیجا کہ وہ صلح کی گفتگو کو، جو حملہ سے پہلے غیر مختتم رہ گئی تھی، پھر شروع کرنے پر آمادہ ہیں، جو شرائط پیش کی گئی تھیں وہ قبول کی جا سکتی ہیں؛ نیز یہ کہ چونکہ صلح ہو جانے کی قوی امید ہے اس لئے اگر دونوں فوجیں ایک جگہ مل جائیں تو اس میں فریقین کو آسانی ہوگی۔ یوسف ان چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے اور دشمنوں کو وادی الکبیر کو پار ہونے دیا؛ اور جب اُن کو یہ معلوم ہؤا کہ اُن کی فوج بھوکی ہے تو اُنھوں نے بہت سی رسد بھی بھیج دی۔ طلوع آفتاب کے وقت عبدالرحمٰن کی فوج نے حملہ کی تیاریاں کر دیں۔ اتفاق سے وہ دن بھی بہت ہی سعید تھا، کیونکہ اُس روز اُس جنگ کی سالگرہ تھی کہ جس میں شاہزادہ عبدالرحمٰن کے ایک بزرگ نے اپنے ایک دشمن پر فتح پائی تھی؛ اتفاق یہ کہ اُس کا نام بھی یوسف ہی تھا۔ ایک اور عجیب اتفاق وا ہمہ پرست عربوں کے نزدیک یہ بھی تھا کہ امیر اور زید ابن لس دونوں قبیلہ قیس سے تھے۔ کامیابی کی یہ نیک فالی بنوامیہ کی فوج میں مشتہر کر دی گئی، جو پہلے ہی فتح کا یقین کئے بیٹھے تھے۔ یہ اگر ایک کے حق میں نیک فال تھی تو دوسرے کے لئے بدفالی؛ یوسف کے آدمیوں پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ وہ کچھ ایسے گھبرائے کہ یہ سمجھ گئے کہ وہ سب مبغوض الٰہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ لڑائی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ شکست کے قریب حالت پہنچ گئی۔

یمنی فریق کو اپنے سپہ سالار پر اتنا کم اعتبار تھا کہ اُنھوں نے شاہزادہ (عبدالرحمٰن) کو مجبور کیا کہ وہ اپنے گھوڑے سے اُتر کر ایک بوڑھے لنگڑے خچر پر سوار ہو جائیں، تا کہ اگر اُن کی فوج فرار ہی پر مجبور ہو تو وہ ان سب کو مصیبت میں پھنسا کر خود نہ بھاگ جائیں؛ حالانکہ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود اُن کی جان پر بنی ہوئی تھی، اور اُن کی تمام امیدیں اُسی جنگ سے وابستہ تھیں۔ عبدالرحمٰن کا شاہی علم نیزے پر لپٹا ہؤا عمامہ تھا، جو نشان تھا بنوامیہ کی مسکنت کا مگر اس نے شدہ شدہ وہ شہرت حاصل کی جو ایران کے درفش کاویانی کو بھی شاید نہ حاصل ہوئی ہو، جو لوہار کی آگ دھونکنے کی کھال کا تھا، اور نسلوں تک فتح، سلطنت اور شہرت کا نشان

رہا تھا۔ عبدالرحمٰن کے سواروں نے دشمن کے سواروں کو ہزیمت دی اور اُن کو پیدل فوج پر اس طرح دھکیلا کہ موخر الاسم میں ابتری پھیل گئی۔ میمنہ اور قلب تو بہت ہی جلد ٹوٹ گیا، میسر نے چند گھنٹہ مقاومت کی، لیکن تابکے، وہ بھی بھاگے۔ تمام میدان میں مفرورین ہی کی لاشیں نظر آتی تھیں، جن کو خونخوار زناتہ نے روند ڈالا تھا۔ یوسف اور صمیل کے گھوڑے ہی ایسے تیز تھے کہ وہ دونوں کی جانیں بچالے گئے۔ پہلا مرید ابھاگا تو دوسرے نے جیین میں جا کر پناہ لی۔ یہ تھی جنگ موسارا، جسکے نتیجہ پر اندلس کی قسمت معلق تھی *

ابھی جنگ پوری طرح ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یمنیوں کی خلقی غداری بروئے کار آگئی اول تو ان لوگوں کے نزدیک نسل اموی ہی سخت قابل نفرت تھی، قطع نظر اسکے اُن میں سے بہت سے لوگ اُن بزرگوں کی اولاد تھے جو جنگ مدینہ اور حرہ میں شہید ہوئے تھے اُنہوں نے اولاد معد کو شکست دلوا کر تو اپنا جی ٹھنڈا کر لیا، مگر غضب یہ ہُوا کہ عبدالرحمٰن نے اُن کو لوٹنے کی اجازت نہیں دی، اس لئے اُن کے سرکردہ ابو الصباح نے شاہزادہ والاتبار کو مار ڈالنے کی ٹھانی۔ اُن کے رفقا نے اس تجویز کو ٹھنڈے دل سے سنا۔ اس کے متعلق جو بحث اُن کے درمیان میں ہوئی اُس میں اخلاقی گناہ کا تو خیال تھا ہی نہیں، جو کچھ بھی لحاظ تھا وہ تقاضاء وقت اور سیاسی ضرورت کا تھا، سب سے زیادہ یہ کہ اپنے قبیلہ کے اغراض و فوائد کی حفاظت مقصود تھی۔ عبدالرحمٰن کو بھی اُن کے اس نمک حرامانہ مشورہ کی خبر پہنچ گئی، اُنہوں نے فوراً یہ انتظام کر لیا کہ اپنے محافظ تن مقرر کر لئے۔ جب یمنی سرگروہ کے مشورے بار ور نہ ہوئے اور وہ بہت ہی دست پاچہ ہوئے، تو اپنا جرم چھپانے کے لئے بہت کچھ اظہار وفاداری کرتے رہے، لیکن عبدالرحمٰن کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے، اُن کو دھوکا دینا آسان کام نہ تھا؛ چنانچہ چند مہینوں کے بعد دغا باز ابو الصباح کو قتل کر کے اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا *

اگرچہ عبدالرحمٰن کو شروع ہی سے کامیابیاں ہوتی چلی آئیں، لیکن اُن کے کام ایسے آسان نہ تھے جیسے کہ اُنہوں نے سمجھ رکھے تھے۔ اُن کے مخالفین نے بہت جلد اپنی حالت

درست کر لی، اور تازہ جمعیت لے کر پھر سر اُٹھایا۔ یوسف جیین میں جا کر صمیل سے مل گئے۔ عبدالرحمٰن اُن کے مقابلہ کے لئے نکلے ہی تھے کہ یوسف نے اپنے بیٹے ابو زید کو ایک اور دشوار گزار راستہ سے جا کر دارالخلافہ قرطبہ پر قبضہ کر لینے کے لئے بھیجا۔ یہ یکایک وہاں پہنچے اور جو فوج محافظ وہاں تھی اُسکو قید کر لیا۔ لیکن عبدالرحمٰن آندھی کیطرح پلٹے تو شہر کو فوراً خالی کر دینا پڑا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن پھر کوہستان جیین کی طرف جھپٹے۔ یوسف اور صمیل اپنی کمزوری جانتے تھے، ناچار اُنہوں نے پیغام صلح دیا؛ چنانچہ فریقین میں معاہدہ ہوا، جسکے موافق عبدالرحمٰن نے امیر یوسف اور اُن کے وزیر کی جاگیریں بحال رکھیں، دوسری طرف موخرالاسم نے وہ تمام قلعے، جو اُن کے، یا اُن کے حلیفوں کے، پاس تھے عبدالرحمٰن کو دیدیئے۔ ایک یہ شرط بھی قرار پائی کہ یوسف مستقل طور پر اپنی سکونت قرطبہ میں رکھینگے، اور اُن کے دونوں بیٹے، ابو زید اور ابوالاسود، بطور یرغمال کے سمجھے جائینگے ۔

یوسف کے خلع کر لینے سے عبدالرحمٰن برائے نام تمام جزیرہ نماء کے مالک ہو گئے لیکن منافقت و معاندت، جو ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اور جس کی وجہ سے ملک بھر کا ناک میں دم آیا ہوا تھا، وہ ایسا مرض نہ تھا کہ عبدالرحمٰن جیسا جوان عمر آدمی اُس کا علاج کر سکتا، کیونکہ وہ ابھی تک اپنی بیشتر رعایا میں اجنبی ہی تھے تجربہ نہ رکھتے تھے۔ بے لگام اور غدار گروہوں کی بے لگامی اور غداری، اور بے احتیاط سرگروہوں کی بلند نظری سے ملک کی معمولی حالت یہ ہو گئی تھی کہ گویا آشوب و اختلال نے وہاں اپنا گھر ہی بنا لیا تھا۔ اہل ملک ایک دوسرے کے برخلاف ہر وقت شمشیر بکف رہتے تھے۔ جتنے سپاہی پیشہ لوگ تھے وہ اُسکے حامی ہو جاتے تھے جو اُن کو زیادہ دے۔ شروع شروع میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ امیر سابق اور اُن کے وفادار وزیر صمیل اپنی قسمت پر قانع ہو بیٹھے، اور شکست کھا کر حالت غلامی پر صبر کر چکے ہیں۔ ظاہری انداز یہ تھا کہ وہ نئے بادشاہ سے خلوص کے ساتھ ملتے ہیں۔ اکثر اہم معاملات میں اُن سے رائیں لی جاتی تھیں اور اُن پر عمل کیا جاتا تھا۔ اُن کے زعم باطل کا خیال رکھا جاتا تھا؛ کسی بات میں

اُن کو رنج نہ دیا جاتا تھا؛ ان کا جاہ و جلال ویسا ہی قائم تھا جیسا کہ زمانۂ امارت میں لیکن اعیان و ارکان کی پہلی جیسی حالت نہ تھی۔ نیا بادشاہ تھا اور نیا انتظام، تمام بڑے بڑے عہدے امیر عبدالرحمٰن کے دوستوں اور آوردوں کے ہاتھ میں تھے۔ رشوت ستانی اور خیانت کے جو موقعے ان لوگوں کو ملتے تھے، اور یہ اپنے ہاتھ رنگتے تھے، وہ اب خواب و خیال ہو گئے تھے اور اُن نئے اہلکاروں کے ہاتھ میں تھے، جو پشتینی دشمن سمجھے جاتے تھے کہاں تو وہ معتمد بنے ہوئے تھے، اور امیری سے گزر کرتے تھے، اور کہاں وہی نام و نمود کے دولتمند اب کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ یہ شریرالنفس بیشتر یوسف کے ہم قبیلہ ہوتے تھے، اس لئے اُن کی آمد و رفت سابق امیر کے پاس تھی، وہ ہر موقعہ پر اُن کو اشتعال دیتے رہتے تھے، اور اُن کے مخالفین کے فرضی جور و ظلم کے قصے بیان کر کے اُن کو آزادی کی اُمیدیں لاتے رہتے تھے۔ یوسف کچھ قوی دل نہ تھے کہ اُن پر ان خوشامدیوں کی باتوں کا اثر نہ ہوتا، جو ہر وقت کچھ نہ کچھ اُن سے کہتے ہی رہتے تھے۔ آخر اُنھوں نے خفیہ طور پر مریدا کی طرف بھاگ جانے کا قصد کر لیا۔ اُن کا تعاقب کیا گیا، مگر بیکار۔ عبدالرحمٰن کو یہ تسکین ضرور تھی کہ صمیل اور یوسف کے دونوں بیٹے اُن کے قابو میں ہیں لیکن ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ وہ بھی کہیں اسی طرح نہ اُڑ جائیں۔ مجبور ہو کر اُنھوں نے تینوں کو قید خانہ میں بھیج دیا۔

یوسف کے فرار کی خبر مشتہر ہو گئی۔ لوگوں کو تو اختلال کی عادت پڑی ہوئی تھی ہی، چند ہی روز میں اُن ہی کی عنایت سے بیس ہزار آدمی امیر سابق کے پاس جمع ہو گئے۔ یہ جمعیت کافی سمجھ کر اُنھوں نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں اُن دنوں ایک اموی پناہ گزین عبدالملک نامی، حاکم تھے۔ لیکن نہ معلوم کیا سوچ کر اُنھوں نے فوراً ہی محاصرہ اُٹھا لیا، اور یلغار کرتے ہوئے قرطبہ پر قبضہ کرنے کے لئے بڑھے لیکن پھر اُن کو دیر ہو گئی۔ عبدالرحمٰن کی فوج کی نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی۔ اُدھر یوسف اشبیلیہ سے چلے ہی تھے کہ عبدالملک کا بیٹا بہت سی جمعیت لے کر باپ کی مدد کے لئے پہنچ گیا، اور دشمن کے عقبی حصہ پر حملہ آور ہوا

یوسف کو آخر لڑنا پڑا اور ایسی شکست کھائی کہ پھر سر نہ اُٹھا سکے۔ ہزیمت خوردہ یوسف بمشکل اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے، اور طلیطلہ کی طرف بھاگے، مگر وہاں پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ یمنی فریق نے اُن کا راستہ روکا، اور انہیں قتل کر دیا۔ یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس اہم خدمت سے اُن کی قدر بادشاہ حال کی نگاہ میں بڑھ جائیگی، اور ملک میں امن و امان ہو جائیگا۔ یوں بُری طرح یوسف مارے گئے اور عبدالرحمٰن کے طاقتور حریف کا خاتمہ ہو گیا۔

یوسف ایک نامور قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، اُن کو پچاس برس کا فوجی تجربہ حاصل تھا؛ وہ امارت اندلس جیسے عہدہ پر سرفراز رہ چکے تھے، چارلس مارٹل جیسے قومی دشمن کا میابی سے مقابلہ کر کے اُنہوں نے اپنی ناموری کو چار چاند لگائے تھے؛ چونکہ وہ بجالت امارت بادشاہی کر چکے تھے اس لئے اُن کا رعب بہت بڑھا ہوا تھا؛ بہت سے لوگ جن کو اُن کی ذات سے فوائد پہنچے اُن کے حامی تھے، اور اُن کو پھر اُسی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے جس میں وہ پہلے تھے۔ ان تمام باتوں نے مل کر اُن میں ایک خاص وجاہت اور اقتدار پیدا کر دیا تھا۔ اُن کی ذات محاسن و معایب کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ میدان جنگ میں اُن سے بڑھ کر کوئی مستقل مزاج نہیں تھا؛ لیکن اپنے خیمہ یا محل میں وہ ہر مشیر کے غلام اور ہر مکار کے ہاتھ کا کھلونا تھے۔ خدشہ و خطرہ کے موقعہ پر تو وہ صرف اپنی رائے پر عمل کرتے، اور کسی کی نہ سنتے تھے مگر معمولاً حالت امن و عافیت میں وہ اشرار کی باتوں پر کان دھرتے، اور اُسی پر عامل ہو جاتے تھے کسی غیر کے ہاتھ بک جانے کی عادت ان میں ایسی پکی تھی کہ آخر زمانہ حکومت میں اُن کے وزیر صمیل ہی ملک اندلس کے مالک واحد سمجھے جاتے تھے۔ باوجود ان تمام عیوب کے یوسف میں نہ فیاضی کی کمی تھی نہ اُن خوبیوں کی جو انسان کو ملکی اقتدار کامل اور میدان جنگ میں بجا ناموری تک پہنچا دیتی ہیں اگر اُن کے اُن غیر معمولی کارناموں کو دیکھا جائے جن کا اظہار اُن کے زمانہ حکومت میں ہوا ہے تو یہ تسلیم کر لینے کے کافی وجوہ ہیں کہ اُن کے متعلق جو کچھ شہرتیں تھیں اور لوگ اُن کے گرویدہ تھے وہ بلا وجہ موجہ نہ تھے؛ اور اس میں کوئی کلام

نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حکمرانوں میں سے ایک تھے۔

عبدالرحمٰن کو جب اپنے حریف کے مارے جانے کی خبر پہنچی تو اس بنا پر کہ اُن کو پہلے تجربے حاصل تھے اُنہوں نے بالاستقلال اپنے دارالخلافہ کو دشمنوں سے پاک کرنا چاہا؛ کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ جب تک یوسف کا نام رہتا وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وزیر صمیل اپنی ذہن و ذکاوت کی وجہ سے تمام سلطنت اندلس پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ وہ درشت مزاج تھے ہی سزا پا کر اُن کی درشتی اور بھی بڑھ گئی تھی؛ حالانکہ یقیناً یہ بے وجہ تھی اُن کا قیدخانہ ہی میں گلا گھونٹ دیا گیا۔ امیر یوسف کے بڑے بیٹے ابوزیدؔ جو یرغمال تھے مستوجب سزاءموت ہو ہی چکے تھے کیونکہ ان کے والد نے بلاوجہ بغاوت کی تھی، وہ قتل کر دیئے گئے۔ رہ گئے چھوٹے بیٹے ابوالاسودؔ چونکہ اُن کی عمر بہت چھوٹی تھی، اس لئے اُن پر رحم کیا گیا، بجاء قتل کے اُن کو حبس دوام کی سزا دی گئی، اور قرطبہ کے ایک مضبوط قیدخانہ میں بھیج دیئے گئے۔

یہ سخت تدابیر اور فیصلہ کن احکام تھے تو ایسے کہ لوگ ڈر جاتے، اور آئندہ کسی کو بغاوت کی جرأت نہ ہوتی، مگر ان کا جو کچھ بھی اثر ہوا وہ محض عارضی تھا۔ بجاءاسکے کہ فہریوں کی لاشیں قرطبہ کے دروازوں پر دیکھ کر لوگوں میں ہیبت پیدا ہوتی، نفرت اور مخالفت بھڑک اُٹھی ملک میں ابھی تک امن نہ ہوا تھا۔ بربری قطاع الطریق کا دور و نزدیک دَور دورہ تھا، وہ کاشتکاروں کو لوٹتے پھرتے تھے، شہروں کو ڈراتے تھے، تاجروں کے راستے روکتے تھے، امن و عافیت عامہ میں خلل انداز ہوتے تھے۔ اس بے چینی نے شدہ شدہ کھلی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ ہشام الفہری خود ایک رئیس تھے، اور چونکہ وہ یوسف کے عزیز تھے۔ اس لئے اُن کو گونہ سیاسی اقتدار حاصل تھا؛ اُنہوں نے شمالی علاقہ میں خروج کیا اور طلیطلہ پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ باغیوں نے اس مقام کو خوب مضبوط کر لیا تھا، قرطبہ سے فوج گئی تو اُس نے سال بھر تک خوب مقابلہ کیا۔ یہاں تو یہ ہو رہا تھا، اُدھر یکایک یہ خبر پہنچی ایک اور قوی دشمن بڑھا چلا آ رہا ہے جسکی وجہ سے اس نئی حکومت کی جڑیں تک ہل جانے کا

خوف تھا۔ یہ عباسی تھے، جو دمشق سے اپنا دارالخلافہ اُٹھا کر بغداد لے گئے تھے۔ چونکہ اُن کے وہ خلفاء نہایت عقیل و فہیم گزر چکے تھے اس لئے وہ بلحاظ اپنی عظمت و جلالت اور فوجی کامیابیوں کے پوری شہرت پا چکے تھے وہ حسرت و اندوہ کے ساتھ یہ دیکھتے رہتے تھے کہ اُن کے خاندان کا ایک دشمن جانی، ایک دور دراز ملک میں اُن کا مدمقابل بنا جا رہا ہے، اُنہوں نے اُسکے پھانسنے کے لئے ہزار جال بچھائے، مگر وہ پھندے میں نہ پھنسا، اُس کا نکل جانا کرامت سے کچھ کم نہ تھا۔ وہ بیش قرار انعام، جو اُسکے سر کے لئے مشتہر ہو چکا تھا، بربریوں کے پائے ثبات کو بھی متزلزل نہ کر سکا۔ حالانکہ یہ لوگ وہ تھے کہ تھوڑی سی رقم پر پھسل پڑتے تھے جب وہ خانہ خراب، خانماں برباد، جلاوطن، پریشان حال تھا تو ایک خوفناک چیز تھا اور اب کہ وہ پورا رقیب و حریف، اور اپنا انتقام لینے کے قابل ہو گیا تھا، تو اُس سے جتنا کچھ ڈر ہوتا تھوڑا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی سلطنت کا بادشاہ تھا اور اسی عظمت و ادب و عزت کا دعویدار تھا جو خلیفہ وقت ہی کا حصہ تھا۔ عباسیوں نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ قبل اسکے کہ بنو اُمیہ اتنے مضبوط ہو جائیں کہ اُن کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے، بشرط امکان اُن کی جڑیں اوکھاڑ کر پھینک دیجائیں۔ چنانچہ خلیفہ ابو جعفر المنصور نے والی قیروان، علاء ابن مغیث، کو حکم دیا کہ اندلس کو فتح کرنے کی کوشش کریں۔ اس خیال سے کہ عوام الناس کو یہ معلوم ہو جائے کہ علاء معتمد خاص ہیں، امیرالمومنین نے خود اپنا سیاہ علم اپنے سپہ سالار کے پاس بھیج دیا۔ یہ جنگ عبدالرحمٰن کے لئے اس وجہ سے نہایت منحوس تھی کہ اس میں اُن کے تمام مخالفین کو مجتمع ہونے کا موقعہ مل گیا۔ اس کے حالات جو امیر کی شریر اور لوٹ مار کرنیوالی رعایا کو معلوم ہوئے تو اُن کو بہت خوشی ہوئی، اور وہ عباسیوں کی طرف مایل ہو گئے۔ اس جنگ کی جزئیات تک فیصل شدہ تھیں۔ دربار بغداد اور اشرار اندلس کے درمیان میں پہلے ہی قرار دادیں ہو چکی تھیں۔ جو باغی کہ طلیطلہ میں محصور تھے وہ اپنے دوستوں کی معرفت والی افریقیہ سے مسلسل رسل و رسایل رکھتے تھے جب علاء ابن مغیث صوبہ بیجہ میں پہنچے ہیں تو اُن کا

اس دھوم دھام سے استقبال کیا گیا کہ عبدالرحمٰن کا بھی نہ ہؤا تھا۔ خلیفۂ عباسی تو بادشاہ قرار دیئے گئے، اور عبدالرحمٰن باغی و غاصب ٹھیرے۔ سپاہیوں کا جوش اُبھارنے کے لئے اس جنگ کو مذہبی رنگ دیا گیا (حالانکہ جنگ ہی ناجائز بناء پر تھی) اور عبدالرحمٰن کو خارجی اور کافر بتلایا گیا۔ اُن کے سر کے لئے انعام مقرر کیا گیا؛ امیرالمومنین کے نام سے یہ فتوے صادر کیا گیا کہ اُن کو قتل کر دیا جائے؛ قاتل کو مراحم خسروانہ کا امیدوار رکھا گیا؛ سونے اور جواہرات دینے کا وعدہ دیا گیا؛ سب سے بڑی بات، جو مسلمان کی عین خواہش کے موافق تھی، یہ سمجھائی گئی کہ قاتل کو عاقبت میں درجات عُلیا ملینگے۔

بہت ہی جلد معلوم ہو گیا کہ یہ بغاوت کچھ معمولی چیز نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن سے یمنیوں کی وفاداری ہمیشہ مشتبہ رہی تھی؛ فہریوں کو حال ہی میں وہ صدمہ پہنچا تھا کہ اگر وہ انتقام پر مائل نہ ہوتے تو تعجب ہوتا؛ بربری ہر وقت قتل و غارت پر ادھار کھائے رہتے تھے؛ جو لوگ کہ دیندار تھے وہ بنو اُمیہ کو غاصب سمجھتے آ رہے تھے؛ غرض سب ہی تو بنو عباس کے حامی بن گئے۔ چونکہ فوج ہمیشہ بغاوتیں کرتی رہتی تھی، اس لئے اُن پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا، ناچار جو فوج کہ طلیطلہ میں تھی اُسی کو واپس بُلانا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ باغیوں کی یہ فوج محافظ بھی قیروان سے آئی ہوئی فوج کے ساتھ مل گئی۔ بنو عباس کی فوج نے اندلس کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ دارالخلافہ کے سرسبز و شاداب مضافات کو بربریوں کے سواروں نے روند ڈالا۔ عبدالرحمٰن کو قرمونہ میں محصور ہونا پڑا۔ وہاں کی فوج محافظ بہت جلد رسد سے تنگ آ گئی۔ محاصرہ دو ماہ تک قائم رہا؛ اس اثنا میں عباسیوں کو چونکہ اس پر اطمینان تھا کہ اُن کی جمعیت دشمن سے زیادہ ہے اس لئے وہ کچھ بے فکر سے ہو کر غفلت کرنے لگے تھے۔ افسران فوج میں بھی سرگرمی نہ رہی، اور وہ اپنے فرائض منصبی کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔ سپاہیوں اور چوکیداروں نے چشم پوشی سے کام لینا شروع کر دیا۔ اہالی ایشیا کی بے ثباتی مشہور رہی ہے۔ جوں جوں دیر ہوتی جاتی تھی وہ گھبرائے جاتے تھے۔ سختیاں

سہتے سہتے اوکتا گئے، سینکڑوں آدمی بھاگ گئے۔ عبدالرحمٰن کو دم دم کی خبر تھی، وہ تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ایک رات کو انہوں نے موقعہ دیکھ کر یک لخت شبخون مارا۔ دشمن کی فوج میں پریشانی پھیل گئی، کسی کو بھی مقابلہ کا خیال نہ آیا۔ صبح کو دیکھا کہ تمام باغی سرکردہ اور سات ہزار آدمیوں کی لاشیں میدان جنگ میں تھیں۔ علاء اور دیگر افسران فوج کے عضو عضو کاٹ دیئے گئے، اُن کو دھو صاف کر کے کافور اور نمک لگا دیا گیا اور ہر ایک کے کان میں اُس شخص کا نام اور عہدہ وغیرہ لکھ کر لٹکا دیا گیا۔ پھر اُن کو تھیلوں میں بند کر کے اُن پر مہر لگا دی گئی، اور ایک تاجر کو دیدیا کہ اُن کو قیروان کے بازار میں خفیہ طور پر رکھ کر چلا آئے جب خلیفہ ابو جعفر المنصور کو اس مہم کا انجام معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ "یہ تو کسی شیطان کا کام ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے میرے اور ایسے دشمن کے درمیان میں سمندر حایل کر رکھا ہے"۔

قرمونہ کی فوج پر جو مصیبت پڑی اُسکی خبر جو طلیطلہ کی محاصر فوج کو پہنچی تو سب ڈر گئے صلح کے پیام شروع ہوئے عبدالرحمٰن کی طرف سے یہ شرایط پیش کی گئیں کہ بغاوت کے تمام سرکردہ اُن کے سپرد کر دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ شرط ان لوگوں کو ماننی پڑی، اور تمام قیدیوں کو قرطبہ پہنچانے کا حکم ہوا۔ جب قرطبہ تھوڑی دور کے فاصلہ پر رہ گیا تو ان لوگوں کو ایک درزی، ایک حجام اور ایک بوریا بننے والا اپنے اپنے اوزار لئے ہوئے ملے۔ ان کو دیکھ کر سپاہی جو قیدیوں کو لئے جا رہے تھے، ٹھیر گئے۔ حجام نے قیدیوں کی داڑھی اور سر مونڈ ڈالا۔ درزی نے سب کے واسطے ایک ایک لمبا جامہ کسی سخت کپڑے کا سی کر پہنا دیا۔ اور ٹوکرے بنانے والے نے کمر سے لے کر پیر تک ان کے گرد ٹوکرا بُن دیا تاکہ وہ آسانی سے چل نہ سکیں اسکے بعد اُن کو گدھوں پر لاد دیا گیا، اور شہر کی گلی گلی میں تشہیر کر کے اُن سب کو قتل کر دیا گیا۔

بربریوں کی قبیحی عادت نے ابتدا میں امرا کو ہمیشہ گھبراہٹ میں ڈالے رکھا اور آخر میں ان ہی کی وحشیانہ صفات نے اسلامی سلطنت اندلس کا خاتمہ کیا؛ اس وقت انہوں

نے سرکشی کی۔ ایک آوارہ گرد شخص شکیہ نامی، قبیلہ مکناسہ سے تھا۔ اُس کا خود ساختہ دعوے تھا کہ بنو فاطمہ میں سے تھا، اور کشف و کرامات کا بھی دعویدار تھا؛ اس لئے بہت سے واہمہ پرست وحشی برابرہ بھی اُسکے معتقد ہو گئے تھے۔ وہ کسی مکتب میں بچّوں کو پڑھاتا تھا، اور اُس زمانہ جہالت میں عالم بھی مشہور تھا؛ چونکہ قرآن مجید کو اُس نے بہت غور سے پڑھا تھا، اس سے بھی وہ مقدس سمجھا جاتا تھا؛ اُس نے اپنی بلند نظری میں اپنی ان صفات سے بڑا کام نکالا۔ جہاں برابرہ میں خلقی عادت شمشیر زنی اور فتنہ و فساد تھی، وہاں یہ بھی تھا کہ وہ اپنی واہمہ پرستی کی وجہ سے اس قماش کے لوگوں کے بے انتہا معتقد اور ایسے مکاروں کے حامی بن جایا کرتے تھے۔ یہ شخص ملکی سیاست میں قدم رکھنے، اور اپنے آپ کو سپہ سالار سمجھنے لگا۔ اُس کے معتقدین اِدھر اُدھر جاکر اس کا تذکرہ کرتے، اور لوگوں سے اسکی بیعت لیتے پھرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے بڑی جمعیت، جوش مذہبی سے سرشار، بہم پہنچائی تھی۔ اگرچہ شکیہ کو اب تک کہیں جنگ و جدل سے واسطہ نہیں پڑا تھا، لیکن اب جو ضرورت پڑی تو اُنہوں نے فنون حرب میں بھی ایسی قابلیت دکھلائی، جسکی ایک ناتجربہ کار آدمی سے امید نہ تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے کئی مرتبہ عبدالرحمٰن کی فوج کو شکست دی؛ قرطبہ کے قریب تک لوٹ مار کی، اور چونکہ وہ مغربی کوہستان میں رہتے تھے اس لئے وہاں محفوظ رہے اور دس برس تک وہ یوں ہی سلطنت کو تنگ کرتے رہے۔ اسی اثناء میں ایک یہ مشکل پیش آئی کہ یمنیوں نے سر اُٹھایا، اور امیر کی جو فوجیں شکیہ سے لڑ رہی تھیں ان پر عقب سے اُنہوں نے حملہ کر دیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر شکیہ کا معاملہ یوں ہی طول کھینچتا رہا تو عبدالرحمٰن کو حکومت کرنی مشکل ہو جائیگی۔ عبدالرحمٰن کے کچھ آدمی جاکر برابرہ کے ایک بہت بڑے سردار کو یہ ترغیب دے آئے کہ وہ شکیہ کا ساتھ چھوڑ دے۔ ایک گھمسان کی لڑائی میں برابرہ بھاگ نکلے؛ اُن کی صفیں ٹوٹ گئیں، اور ایسا سخت خوفناک قتل عام ہُوا کہ شکیہ کے تیس ہزار آدمی کھیت رہے لیکن اس پر بھی اُسکے معتقدین اُس سے برگشتہ نہ ہوئے؛

اُس نے اس واقعہ کے چار برس بعد تک یہی جدال و قتال جاری رکھا۔ آخر آپس ہی کے جھگڑے میں شکیبہ کو اُسی کے ایک آدمی نے مار ڈالا۔ دو سو برس بعد تک وہ مقام جہاں ان لوگوں کی لاشوں کا تودہ بنایا گیا تھا، اس لڑائی کی یادگار میں قایم رہا، جس میں کہ امیر عبدالرحمٰن کے تمام ذرائع سلطنت ختم ہو گئے تھے، اور جسکی وجہ سے کہ مسلمانان اندلس کی ترقی کئی سال رکی رہی تھی۔

ہر سازش جو امیر عبدالرحمٰن سے تخت و تاج چھین لینے کے لئے کی جاتی تھی اُسکو دبا دیا جاتا تھا، اور سزائیں سخت خون ریز دی جاتی تھیں، مگر ان کا سلسلہ اس بُری طرح جاری رہتا تھا کہ ایک بغاوت و سازش ختم نہ ہونے پاتی تھی کہ دوسری شروع ہو جاتی تھی۔ یاد ہو گا کہ یوسف کا بیٹا ابوالاسود حبس دوام کا سزایاب ہُوا تھا، امیر سابق کا یہی ایک بیٹا باقی رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنے محافظوں کو یہ دھوکا دیا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے، اور ایک دن وادی الکبیر میں تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابوالاسود نے بہانہ کیا تو محافظین کو اس کا پورا اعتبار نہ آیا۔ اُنہوں نے ہر ممکن ذریعہ سے اُسکو آزمایا۔ یہ شخص بھی دُھن کا ایسا پکّا تھا کہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کی، مگر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسکو نظر آتا ہے۔ مہینوں اسی طرح گزر گئے اور وہ اندھا بنا رہا۔ محافظوں نے بھی اُس کا یقین کر کے ذرا غفلت کی، اور اس کو کئی طرح کی رعایتیں دے دیں۔ ایک روز صبح کو وہ اور قیدیوں کے ساتھ دریا میں نہا رہے تھے کہ موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اُس طرف ان کے حمایتی اُن کے منتظر تھے، اُنہوں نے فوراً اُن کو کپڑے پہنائے اور ایک گھوڑا سواری کے واسطے دیا۔ دو ہی چار روز کے بعد وہ بخیریت طُلیطلہ پہنچ گئے۔ اس شہر کو بربری اور یمن والوں نے سازش کا گھر بنا رکھا تھا، اور ایک بڑی اہم بغاوت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے بڑے روح رواں یوسف کے داماد ابن حبیب اور العربی والی برشلونہ تھے۔ ان اشرار کی ایک مدت سے شارلیمین کے ساتھ خط و کتابت تھی، ابوالاسود کا فرار بھی

اسی سازش کا ایک حصہ تھا۔ ایسے والا دودمان شخص کا بچپن سے قید رہنا ان لوگوں کو سخت ناگوار تھا، وہ چاہتے تھے کہ ان کو رہا کر کے اپنے حلیفوں میں داخل کر لیں۔ خلیفہ بغداد اور شاہ فرانس (شارلے مین) کے درمیان میں پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا، اور ایک دوسرے کو تحفہ و تحایف دیئے جاتے تھے٭۔ خفیہ طور پر ان دونوں میں یہ طے پا گیا تھا کہ باغی لوگ عباسیوں کا علم بلند کر کے بالواسطہ عیسائیوں کی سلطنت اندلس میں قائم کرا دیں۔ سازش کے بڑے بڑے سرگروہ پیڈربورن میں اس وقت جا کر شارلے مین سے ملے کہ جب وہ قوم سیکسن کو فتح کر کے ان بت پرست وحشیوں کو بجبر عیسائی بنا کر اپنی خوشی منا رہا تھا۔ شارلے مین کی بلند نظری، جوش مذہبی اور شوق تجارب کو اس تدبیر سے بڑی تشویق ہوئی، اور یہ طے پایا کہ وہ ادھر سے بہت بڑی فوج لے کر جزیرہ نماء اندلس پر چڑھائی کریں، اور ادھر شمال کی طرف مسلمان بغاوت کر کے ان کو مدد دیں۔ تمام تدابیر پر غور کیا گیا، جزئیات تک کا فیصلہ ہوا، اور ہر ایک سازش کنندہ کو ایک ایک کام کا کفیل کر کے یہ سرگردگان سازش واپس آ گئے ٭

امیر المومنین کو واقعی سخت تعجب ہی ہوگا کہ وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ وہ ملک جسکے فتح کرنے میں لاکھوں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا، اور کروڑوں روپیہ خرچ ہوا تھا، اسلام کے دشمنان جانی کے ہاتھ میں چلا جائے۔ دونوں حلیف متحدین کو کامیابی کی بہت زیادہ امیدیں تھیں۔ اہالی فرانس کی سپاہیانہ قوت کا امتحان میدان پوسے ٹیرس میں اس وقت ہو چکا تھا کہ جب ان کے مقابلہ میں وہ جان باز لوگ تھے کہ جن کا ثانی امیر عبدالرحمٰن اس وقت میدان جنگ میں نہیں لا سکتے تھے۔ پچاس برس سے اس ملک میں فتنہ و فساد برپا تھا۔ جسکے فرو کرنے میں بہت کچھ قوت خرچ ہو چکی

٭ اسی موقعہ پر ہارون الرشید نے شارلے مین کو وہ گھڑی تحفہ میں بھیجی تھی جو یورپ میں "جادو کا کھیل" سمجھی گئی تھی ٭ (مترجم)

تھی۔ آئے دن کی بغاوتوں سے لوگوں کی نمک حلالی پر بہت بڑا اثر پڑ چکا تھا؛ نمک حرامی کوئی بڑا گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا؛ عمایدِ سلطنت تک پورے وفادار نہ تھے بربریوں کی بے ایمانی گوفی نفسہ خوفناک چیز تھی، مگر نہ اتنی کہ جتنی قبایل کی باہمی عداوت و منافرت، مقابلہ کی ذاتی خصوصیت اور فریق ناکام کی انتقام کشی۔

شارلے مین نے جو اس مہم کے خرخشہ میں پڑنا منظور کر لیا اُس کی کچھ تو وجہ جوش مذہبی تھی اور کچھ سیاسی؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُس ملک کو کفار کے ہاتھ سے چھڑانے اور دین مسیحی کے پھیلانے کی خواہش اتنی نہ تھی جتنی کہ اپنی حدود سلطنت کے بڑھانے اور فوجی طاقت دکھلانے کی۔ یہ مہم ایسی نئی نہ تھی کہ جس کا خیال شارلے مین ہی کو آیا ہو دس سال پیشتر ان کے والد اس کا نقشہ اپنے ذہن میں جما چکے تھے۔ اگر اُن کو موت مہلت دیتی تو یہ قوہ مین آ چکا ہوتا۔ شارلے مین کو کیتھولک مذہب والے حامی دین بنا کر عرش پر بٹھائے ہوئے ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ سب ہی کچھ تھے، مگر پرجوش دیندار نہ تھے۔ اُن کے زمانہ کے اہالی کلیسا کو اُن کی دینداری پر بہت بڑا شبہ تھا؛ بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ وہ آدھے سے زیادہ بے دین تھے۔ اُن کا ظاہری چال چلن اور خانگی عادات دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس میں کوئی بھی مسیحی خوبی ہے۔ ان کے دامن زندگی پر بے ایمانیوں اور ظلموں کے بہت بڑے بڑے داغ تھے۔ اُن کے درباری بدکاری میں ضرب المثل تھے۔ جب خود بادشاہ کے محل میں سینکڑوں عورتیں تھیں تو عماید اُن کی تقلید کیوں نہ کرتے۔ دربار اے لاشیپل[۵] اور بغداد کے اختلاط کو دیکھ کر اُس زمانہ کے دیندار کانپے جاتے تھے۔ ان وجوہ سے مورخین کلیسا کا بار بار اور بضد ہو کر یہ کہنا کہ شارلے مین کا اندلس کے مسلمانوں پر حملہ کرنا محض مذہب کی بنا پر تھا، یا یہ کہ لڑائی صلیبی لڑائی تھی، بالکل بیہودہ ہے۔ اہالی فرانس کو شرقیین سے صرف اس لئے تعصب نہ تھا کہ وہ دین اسلام کے پیرو ہیں، اور اُن کے بادشاہ کے تعلقات خلیفۂ مشرق سے اتنے دوستانہ تھے کہ یورپ کے عیسائی بادشاہوں

کے ساتھ نہ تھے۔

موسم بہار کے شروع میں شارلےمین کی فوج نے نقل وحرکت شروع کی۔ قرون وسطےٰ کا سواء اس جنگ کے واقعات کے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی تفصیل ہمعصر مورخوں یا مورخین مابعد نے کی ہو۔ عیسائی مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ معمول کے موافق اتنی رنگ آمیزیوں سے پُر اور افسانوں سے مملو ہے کہ اُن کی تحریرات ہرگز قابل اعتماد نہیں ہیں حملہ اور فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُن کو بمجبوری دو حصوں میں منقسم ہوکر پائرےنیز سے دو راستوں سے ہوکر گزرنا پڑا۔ دونوں حصہائے فوج فصیل سرقسطہ کے نیچے آکر ملے۔ یہ شہر شارلےمین کے حلیفوں کے قبضہ میں تھا اور اُن سے سازباز ہو چکا تھا، مگر عین موقعہ پر ان لوگوں کے نفس لوّامہ نے ملامت کی، اور اُن کو یہ خیال آگیا کہ عیسائیوں کی امداد کے یہ معنی ہیں کہ نہ صرف اپنے دین کو بلکہ اپنی قومی عزت اور ایمانداری کو اپنے نفس کے ہاتھ کھوٹے داموں بیچ دیا۔ بعض اور وجوہ بھی ایسی تھیں کہ وہ متزلزل ہوگئے۔ سازش کی ابتدا ہی ناکامی سے ہوئی، نتیجہ ابھی دور تھا۔ سرکردگان سازش ایک دوسرے سے مشکوک تھے اُن کو اپنے ہی حلیفوں کے ہاتھ سے جان جانے کا کھٹکا لگا ہوا تھا اس پر وہی قبیلہ کی عصبیت اور نفاق کوئی کام باتفاق واتحاد کرنے سے مانع آتا تھا۔ اس مہم کے سب سے بڑے بانی کار ابن حبیب تھے، اُن کو العربی کی دیانت پر کچھ شبہ سا ہوگیا، اور بلا پس وپیش دیکھے اُن پر حملہ کردیا، مگر مُنہ کی کھائی، اور ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہوگئے۔ ابوالاسود بیچارا عمر بھر قید رہا، اُس غریب سے یہ کیسے توقع ہوسکتی تھی کہ وہ کچھ کام کرکے دکھلائیگا۔ سرقسطہ کی فوج محافظ نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اُن کی تمام تدابیر ناکام رہیں، آیندہ کے متعلق اُن کو سخت اندیشے پیدا ہوگئے، اس لئے وہ دل چھوڑ بیٹھے اور سرقسطہ کا دروازہ کھولنے سے انکار کردیا۔ شارلےمین کو یہ نقض عہد دیکھ کر بہت ہی غصہ آیا، اور اُنہوں نے محاصرہ کی تیاری کر دی لیکن ابھی وہ دروازہ شہر تک بھی نہ پہنچے تھے کہ اُنہیں اطلاع ملی کہ قوم سیکس نے پھر حملہ

کر دیا ہے، اور وہ دریاء رائن تک پہنچ گئے ہیں۔ مجبور ہو کر محاصرہ اُٹھا لینا پڑا۔ اہالی فرانس کو اتنی بڑی مہم لے کر جانے اور پھر ناکام واپس لوٹنے سے سخت بے شرمی اُٹھانی پڑی، اور وہ پھر بادل بریاں جرمنی کے وحشیوں سے اپنا گھر بار بچانے کے لئے واپس ہوئے۔ شہر پمپلونا نے پہلے ہی اُن کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اُس کی فصیل گرا دی گئی تھی۔ یہاں سے ہو کر یہ فوج ایک اُداسی کے ساتھ وادی رون سسٹس ویلے سے ہو کر نکل گئی؛

جیسے جیسے وہ درہ سے آگے بڑھتے گئے وہ اور بھی دشوار گذار ہوتا گیا۔ اُس کے گرد بڑا گھنا جنگل تھا، اور چاروں طرف نہایت مخدوش کھڈ۔ فوج طلایہ تو بلا مزاحمت نکل کر پایرے نیس کے شمالی نشیب تک پہنچ گئی، لیکن عقبی فوج، جس کے ساتھ تمام سامان تھا، بے طرح گھاٹیوں میں پھنس گئی، جس میں جا بجا قوم باسک کے آدمی کمین لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہزاروں کوہستانیوں نے دفعتاً حملہ کر دیا۔ اہالی فرانس ہر طرف سے اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ اُن کو پس پا ہونا ناممکن تھا۔ پہاڑی آدمی یک لخت حملہ کر سکتے تھے، اور اس علاقہ کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ کمین گاہوں میں بیٹھ کر لڑنا بھی جانتے تھے؛ غرض ان لوگوں کو ہر طرح کا تفوق حاصل تھا۔ ایسے موقعہ پر مقابلہ بیکار تھا جہاں نہ دست بدست لڑائی ہو سکے، نہ تیر کام دیں، نہ دشمن نظر آتا ہو، وہاں بہادری کیا خاک کام دے سکتی ہے۔ شارلے مین کی عقبی فوج بالکل ہی تباہ ہو گئی۔ تمام فوجی سامان فاتحین کے ہاتھ آیا۔ مُردے جتنے پڑے ملے اُن سب کو اُنہوں نے دل کھول کر لوٹا اور اپنی کھوؤں میں جا گھسے، جہاں تک کسی اور کا پہنچنا ناممکن تھا۔ اس مصیبت میں شارلے مین کی آدھی فوج ماری گئی، اور بڑے بڑے نمود کے افسر کام آئے۔ ان ہی میں مشہور و معروف

نوٹ۔ واضح رہے کہ اس سے زیادہ تفصیل اس جنگ کی مصنف علام کو نہیں ملی۔ اُنہیں زمانہ گزشتہ کے عیسائیوں سے یہ شکایت ہے کہ اُنہوں نے تاریخ میں بہت کچھ بڑھا لیا ہے اور ہمیں زمانہ حال کے عیسائیوں سے یہ شکایت ہے کہ اُنہوں نے بہت کچھ گھٹا دیا ہے؛ (مترجم)

رولینڈ، پری فیکٹ آف مارچ آف بریٹینی تھے، جن کے کارناموں کو بھاٹوں اور مطربان سوقی نے بہت سے افسانہ ملا کر چیٹ پٹا بنا دیا ہے ✽

فرانس کے حملہ آوروں سے اگر کسی کو فائدہ ہوا تو وہ امیر عبدالرحمٰن تھے حالانکہ اہالی فرانس ان ہی کو تباہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ دشمن تو بھاگے چلے جا رہے تھے کہ امیر اپنی فوج لیکر سرقسطہ پر پہنچ گئے، شہر کو گھیر لیا۔ اور تھوڑے سے مقابلہ کے بعد فتح کر لیا۔ باغیوں کے سرگروہ العربی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے قتل کر دیئے گئے۔ واپسی سے پہلے امیر قوم باسک کے ملک میں گئے، وہاں انہوں کاونٹ، آف سرڈین کی ریاست کو فتح کر کے اسکو قرطبہ کا باجگذار بنا لیا۔ اسکے چند روز کے بعد ابوالاسود نے اپنی بدقسمتی سے پھر سر اٹھایا آخر وادی العمار پر ایسی شکست کھائی کہ اپنے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ اپنی بھی جان دی ✽

امیر عبدالرحمٰن کی آخری عمر اپنے ہی اعزہ و اقارب کی سرکشیوں کی وجہ سے بہت ہی تلخ گزری، حالانکہ امیر ہی کے طفیل میں اُن کی سیاسی حالت بدلی تھی، اور اُن ہی کی فیاضی کی بدولت اُنہوں نے بہت کچھ دولت و حشمت حاصل کی تھی۔ اُن کے نہایت قریبی عزیزوں نے اُن کے خلاف سازش کی۔ شاہزادے اور عمائد اُن کے تخت و تاج چھین لینے کی کوشش میں عزیزداری اور قبیلہ پروری سب کچھ بھول گئے لیکن یہ جنگ جو بادشاہ اُن کی پوشیدہ اور ظاہری مخالفت کو فرو کرنے کے قابل تھے۔ اُن کی فوج ہر مہم سے مظفر و منصور واپس آئی۔ سازشیوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ محل شاہی کی چار دیواری کے اندر محفوظ ہیں، ریشہ دوانیاں اور خوشک تیرانیاں کیں، مگر اُن ہی کے رفقا نے اقبال مند بادشاہ کے سامنے اپنے جرائم کا اقبال کیا، اور دوسروں کی مخبریاں کیں، اور ایسی ایسی سزائیں پائیں کہ یاد رکھنے کی قابل۔ امیر کے غدار اور ناشکر گذار بھتیجے ابن ابان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا، اُن کا بھائی ولید جلاوطن کر دیا گیا، نسل قریش کے جتنے آدمیوں پر جرم نمک حرامی ثابت ہوا سب کے ہاتھ پیر کاٹ کر اُن کو اتنا پٹوایا گیا کہ وہ مر گئے۔ جتنے مشیروں نے امیر کو دھمکایا تھا اُن سب کو

ملک بدر کر دیا گیا، یا ایسی کس مپرسی کی حالت میں ڈال دیا کہ اُن کی بات بھی نہ پوچھی۔ معتمد اور وفادار بدر نے بھی چونکہ کچھ شوخی دکھلائی تھی، اس لئے اُس کی گزشتہ خدمات کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا۔ اُسکی تمام جایداد منقولہ ضبط کر لی گئی، اور اسکو قید کر دیا گیا جہاں اُس نے اپنی بقیہ عمر نہایت مصیبت اور بے عزتی میں بسر کی*

سابقہ تجربات زندگی اور ضرورت وقت اسکی داعی ہوئی کہ امیر عبد الرحمٰن اپنے جانشین کا تصفیہ کر جائیں۔ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ اذکار اور محنت نے اُن کو کمزور کر دیا ہے؛ اس لئے اُنھوں نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے تیسرے بیٹے ہشام کو اپنا جانشین منتخب کر کے تمام امراء سلطنت کو حکم دیا کہ اُن سے بیعت کریں۔ ہشام کے دو بڑے بھائی، سلیمان اور عبد اللہ تخت سے دست بردار ہو گئے۔ رسم بیعت ادا ہو گئی تو امیر عبد الرحمٰن مریڈا چلے گئے۔ چند ماہ کے بعد یہیں اُنھوں نے اٹھاون برس کی عمر میں تینتیس [۳۳] برس حکومت کر کے انتقال کیا*

اس والاشان بادشاہ کی خصوصیات اور حالات ایسے ہیں کہ صفحات تاریخ اُن سے بجا طور پر مزین ہیں۔ خدا تعالےٰ نے ان کو دل و دماغ کی بہترین خوبیاں عطا فرمائی تھیں اُن کی عادات و خصائل پر اُن کے پُر آشوب زمانہ کے مصایب اور جلاوطنی کا بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ اُن کا اصلی مذاق و میلان تو علم ادب کی طرف تھا۔ لیکن ضرورت و احتیاج نے اُن کو نہایت محتاط اور تجربہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ طبیعت میں فیاضی اور مروت تھی، مگر اُن کے خاندان پر ظلم و ستم، دشمنوں کی متواتر پرخاش، اعزہ کی بے ایمانی اور دغا بازی اور دوستوں کی ناشکری کی وجہ سے اُن کا مزاج تلخ ہو گیا تھا، اس لئے وہ بے رحمی کر بیٹھتے تھے۔ اگرچہ یہ مانا کہ سیاسی ضروریات اسکی متقاضی ہوتی تھیں، مگر اس نے اُن کی نیک نامی کو ماند کر دیا تھا۔ دمشق کے انتہاء تکلفات میں اُن کی ابتدائی عمر گزری تھی، مگر جب مصیبت پڑی اور بے انتہا مفلسی سے سابقہ ہوا تو اُنھوں نے اُسکو نہایت کشادہ پیشانی

سے سب کچھ برداشت کیا۔ یہ ایسی آزمائش تھی کہ اُس نے اُن میں فلسفیانہ خوبیاں اور صبر آزمائیاں پیدا کردی تھیں، نقایصِ انسانی اور تضاد وافتادہائے زندگانی کو اُنہوں نے اپنے اوپر آزمالیا تھا؛ اس سے مقدر اُن کو اُس شاہانہ زندگی کے واسطے تیار کر رہا تھا جو اُن کو حاصل ہونے والی تھی۔ ابھی پوری طرح اُن کی سلطنت قائم بھی نہ ہوئی تھی کہ اُنہوں نے مشرق کے دور دراز علاقوں میں خاندان بنو اُمیہ اور اُن کے متوسلوں کو تلاش کرکے سرکاری خرچ پر اندلس میں بُلوایا؛ اُن کو جاگیریں عطا کیں، اور اُن میں سے اکثر کو اپنا مشیر یا شہروں اور صوبوں کا حاکم مقرر کیا۔ اُن کے جوہر ذکاوت کو دیکھ کر لوگوں کو رشک ہوتا تھا، اور اُن کے جانی دشمنوں سے بھی تعریف کئے بغیر نہ رہا جاتا تھا۔ ادھر تو اُن کی توجہ الیسٹر یاس کے کوہستانیوں کی دراز دستی، اور خانگی بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف تھی، اُدھر اُنہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ دو نہایت قوی، جنگ آزمودہ خونخوار بادشاہوں کے حملوں کو روکا۔ یہ دونوں بادشاہ وہ تھے کہ جو کرۂ ارض کے بہترین اور دولتمند ترین سرزمین پر قابض تھے۔ ان دونوں میں بلحاظ عظمت وجلالت وفوجی طاقت کے شارلیمین بڑا آدمی تھا؛ اس نے اپنی بیٹی کی اُن سے شادی کرنی چاہی، اور اُن کی حمایت کا اسی کو ذریعہ ٹھیرایا؛ لیکن چونکہ امیر کی صحت خراب ہو رہی تھی اس لئے اُنہوں نے انکار کردیا۔ ذرائع اُن کے پاس کافی تھے۔ مگر جوانی کے مصایب اور غموم وہموم نے اُن کو یہ سبق دیا تھا کہ تمام مصیبتوں کو گو بطیب خاطر نہیں، مگر کم ازکم خاموشی کے ساتھ برداشت کریں۔ چونکہ اعراب بربرہ کے خصائل سے وہ اچھی طرح واقف تھے اس لئے اُن کو تقیین کلی تھا کہ مادر بادیہ کی یہ آزاد اولاد ایسی نہیں ہے کہ کسی کی حکومت کو مان لیں، حالانکہ یہی قیام صولت شاہی کے لئے اشد ضروری تھا۔ اس لئے وہ ان کو قابو میں رکھنے کے واسطے سخت جبر وتشدد کو کام میں لانے سے کبھی تامل نہ کرتے تھے۔ قبایل کی خود بینی اور وارستگی کو، خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، اپنے پنجۂ فولادی سے دبائے رہتے تھے۔

ابتداء میں وہ بہت ہر دلعزیز رہے مگر جب وہ وقت آیا کہ اُن کو غیر معمولی سختیاں کرنی پڑیں تو اُن کے تاج و تخت کے سب سے بڑے وفادار اور حامی بھی اُن سے ناخوش ہو گئے۔ مسلسل و متواتر بغاوتوں اور نمک حرامیوں کی وجہ سے سخت ترین ضرورت اور اصول حفاظت خود اختیاری اسکی داعی ہوئیں کہ وہ مطلق العنانی اور استبداد سے کام لیں جب ایک مرتبہ انہوں نے اس ذریعہ سے اپنی صولت کو بٹھا لیا تو پھر اُس کو چالیس ہزار زر پرست و غرض آشنا افریقیوں اور غلاموں کے دبدبہ سے قائم رکھنا پڑا۔ ان لوگوں کی تمام امیدیں تاج و تخت سے وابستہ تھیں، اس پر طوق احسان و غلامی ان کے گلے میں ایسا پڑا ہوا تھا کہ وہ ہل نہ سکتے تھے، اور ان کو سواء وفاداری کے چارہ نہ تھا۔ سیر سیاحت اور جانبازی کی اُن میں کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ ابتداء دوران سلطنت میں وہ اکثر بھیس بدل کر راتوں کو شہر میں نکل جاتے تھے، مگر بعد میں جب بغاوتیں ہونی شروع ہوئیں اور اُن کے دشمنوں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کی ہمت ساقط ہو گئی۔ مجبوراً ان کو تنہا رہنے اور اپنی حفاظت کے لئے سپاہیوں کو پہرہ پر رکھنے کی عادت پڑ گئی، جو بادشاہان ایشیا کی خصوصیات میں سے ہے۔ عہدہ داران سرکاری کے عہدے، اُن کا درجہ و رتبہ، سلطنت کی صوبجات و اضلاع میں تقسیم، حکام کے اختیارات، محکمہ پولیس کے ضوابط وغیرہ بھی بادشاہ نے تغیر ممالک مشرقیہ کے اصول پر قرار دیئے گئے۔ اس سیاسی انتظام میں بارہ کا عدد یا اس کا ضعف، خاص طور پر نمایاں تھا، جو سامی اقوام کے خصوصیات میں سے ہے۔ تمام ملک محروسہ چھ صوبوں میں منقسم تھا، ہر ایک صوبہ میں ایک ایک فوجی سپہ سالار با اختیارات کامل مقرر تھا۔ اس سپہ سالار کے ماتحت دو والی اور چھ وزیر ہوتے تھے جن کو اپنے اپنے اضلاع میں معاملات خفیفہ میں اختیارات حاصل تھے۔ ان حکام کے مددگار بہت سے قاضی اور دیگر حکام ہوتے تھے، جو ایک وقت مقررہ پر اپنی اپنی کارروائیوں وغیرہ کی اطلاع صدر دفتر قرطبہ کو بھیجا کرتے تھے۔ اگرچہ عبدالرحمٰن کو ہر وقت ملکی خلش لگی رہتی تھی، لیکن جو وقت

فرصت اُن کو ملتا تھا۔ وہ اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی تدابیر سوچا کرتے تھے؛ ایسے قوانین و قواعد منضبط کرتے تھے کہ رعایا مرفہ الحال ہو اور اپنے مال و املاک پر بآزادی اور بلا مداخلت غیرے قابض و متصرف رہے تعلیم و تعلم اور علم ادب کی اشاعت میں خاص طور پر اُن کو شغف تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی تدابیر پر غور کرتے رہتے تھے کہ جن پر عمل کرنے سے اُن کی سلطنت کو استحکام ہو جائے۔ جو سڑکیں کہ رومی بادشاہوں نے جزیرہ نماء اندلس میں بنائی تھیں اُن سب کی مرمت کرائی؛ ڈاک کا انتظام کیا؛ ہر پڑاؤ پر گھوڑے رکھے تا کہ ضروری اور اہم خط و کتابت یا ایلچی جلد تر از جلد دار الخلافہ پہنچ سکے۔ جزیرہ نماء میں جتنے جرائم پیشہ لوگ لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور جنکے نزدیک رحم کرنا بزدلی کا کام تھا؛ عبد الرحمٰن نے اُن پر اُس ذریعہ سے حکومت کی جس کے سواء وہ کسی کو ماننے والے نہ تھے؛ یعنی تلوار سے۔ یہ لوگ اگرچہ اُن سے نفرت کرتے؛ اُن کو بدُعائیں دیتے؛ اُن کی جان لینے کے لئے سازشیں کرتے؛ اُن کے عطیات اور مراحم خسرانہ کو رد کرتے؛ اُن دی ہوئی عزت کو نہ مانتے تھے مگر یہ مجال نہ تھی کہ اُن کے احکام سے سرتابی کریں؛ کیونکہ اُن کے ڈر سے اُن کی جان نکلتی تھی۔ اُن کو بہت سے خونین موقعوں پر اُنکی صولت کا سبق مل چکا تھا جب سے کہ اندلس فتح ہُوا تھا۔ سب سے پہلی دفعہ اُن ہی کے عہد دولت میں وحشی بربری؛ جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا کرتے؛ اور امن عامہ میں خلل ڈالتے رہتے تھے؛ پیر توڑ کر بیٹھے۔ امیر عبد الرحمٰن ہی نے اُن وحشیوں کو قانون کی اطاعت سکھلائی؛ اور اُن ہی کی وجہ سے وہ ایک جگہ آباد ہوئے۔ اُنہوں نے ایسا قانون وضع کیا جو تمام ملک محروسہ کی رعایا کے مناسب حال تھا؛ حالانکہ اُس میں مختلف قسم کے آدمی تھے؛ جنکے فوائد و اغراض ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ اسی قانون میں وزیگا تھ کے قائم کردہ قواعد کا؛ بپابندی شریعت اسلامی؛ احترام مد نظر رکھا گیا۔

امیر عبد الرحمٰن اکثر اپنے تمام ملک محروسہ کا دورہ کرتے رہتے تھے؛ تا کہ اپنے حکام کی کارروائیوں اور چال چلن کو بچشم خود دیکھیں؛ اور اپنی رعایا کی ضروریات سے خود واقف ہوں

جہاں جہاں سے ہو کر وہ گزرتے تھے وہاں محتاجوں کی دستگیری کرتے تھے، ضروریات و اصلاح عامہ کے لئے بیش قرار رقوم دیتے تھے، ترقی صنعت و حرفت کی تشویق کرتے تھے، اور بڑے بڑے محل اور مساجد بنواتے تھے۔ یوں تو اُن فیاضیاں ہر جگہ یکساں ہوتی تھیں۔ لیکن دار الخلافہ قرطبہ میں تو وہ بے جگر ہو کر خرچ کرتے تھے! کیونکہ اُسی شہر پر اُن کو ناز تھا اور اُسی سے اُن کو محبت تھی۔ اس کا تمام نقشہ، عمارات، قلعہ، مضافات کو اُنہوں نے دمشق کے نمونہ پر بنایا تھا۔ اندلس میں کھجور کا درخت سب سے پہلے اُن ہی کے طفیل میں نظر آیا۔ ایک پودہ اُنہوں نے شام سے منگوا کر محل شاہی کے وسط میں اپنے بچپن کے رفیق (درخت خرما) کی یادگار میں لگوایا۔ مضافات شہر میں اُنہوں نے ایک باغ نصب کرایا اور اُس کا نام اپنے دادا امیر المومنین ہشام کے باغ کے نام پر رصافہ رکھا۔* یہ باغ تھا بھی اصل رصافہ کی صحیح تصویر۔ قرطبہ میں ایک ٹکسال قائم کی جس میں اُسی وضع، وزن اور سکہ کے اشرفی اور پیسہ مسکوک ہوتے تھے جیسے کہ بنو اُمیہ شام میں چلا چکے تھے۔ بادشاہ اور اُن کے دربار کی شہرت نے دُنیا بھر کے علما و فضلا اور صنّاعوں کو اس دار الخلافہ مغربی میں کھینچ بلایا۔ علمی تحقیقات

---

* اشعار ذیل امیر عبد الرحمن کے ہیں، جو اُنہوں نے اپنے لگائے ہوئے کھجور کے درخت کو دیکھ کر کہے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اشعار اُنہوں نے اس کھجور کی ٹہنی کو پکڑ کر نہایت ذوق و شوق کی حالت میں فی البدیہہ کہے تھے۔ ان کو پڑھتے ہوئے روتے جاتے تھے۔

تبدت لنا وسط الرصافۃ نخلۃ ۔۔۔ تناءت بارض الغرب عن بلد النخل

فقلت شبیھی بالتغرب والنوی ۔۔۔ وطول اکتئابی عن بنی وعن اھلی

نشأت بارض انت فیھا غریبۃ ۔۔۔ فمثلک فی الاقصاء والمنتای مثلی

سقتک غوادی المزن فی منتای الذی ۔۔۔ یسح ویستمری السماکین بالوبل

ان اشعار کا پورا لطف اُن ہی پردیسیوں کو آئیگا جو جور و جبر کے ستائے ہوئے وطن سے دور ہیں۔ الٰہی صدقہ صاحب ہجرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بندۂ مترجم کے گناہوں کو معاف فرما۔ (مترجم)

اور فلسفیانہ موشگافی کی بنیاد امیر عبدالرحمن ہی نے رکھی تھی، اُن کے جانشینوں نے اُسکو بہت کچھ ترقی دی۔ امیر خود نہایت دلکش نظمیں لکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹوں کو اُس زمانہ کی بہترین تعلیم دلوائی تھی، وہ دفترشاہی اور عدالتوں کی کارروائی دیکھنے پر مجبور کئے جاتے تھے؛ اکثر معاہدات بین الاقوامی کے فیصلہ کرنے پر متعین کئے جاتے تھے اور اور اہم کارہاء سرکاری پر تعینات ہوتے تھے۔ عوام الناس میں شوق پیدا کرنے کے لئے مذاکرات علمیہ اور مشاعرے کئے جاتے تھے جن میں اُس زمانہ کے بڑے بڑے علماء اور شعراء بلائے جاتے تھے۔ اچھی اچھی نظموں اور مباحث علمیہ کی جلد میں بیش قرار انعامات تقسیم کئے جاتے تھے۔ ان کو موقّر بنانے کے لئے امیر عبدالرحمن بنفس نفیس اُن میں شامل ہوتے تھے۔

امیر عبدالرحمن کے اتقاء و پرہیزگاری پر دربار دمشق کی عیش و نشاط کی بد لگامی، اور اندلس کی موجودہ بت پرستی، اور کفریات کی شتر بے مہاری نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ خواہ اپنے فوائد و اغراض کے خیال سے، یا محض دلی اعتقاد و خلوص سے وہ ہمیشہ فرائض دینی کے پابند رہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تمام قوم کے فوائد دینی، تمدنی، سیاسی اور تجارتی اُن کے معبد سے وابستہ ہوتے ہیں؛ خاص کر جب وہ معبد بھی نہایت شاندار ہو اور اُسکو ایسا تقدس حاصل ہو کہ دور دراز کے باشندوں کا زیارتگاہ بن جائے وہ ایک مدت سے ایسی ہی مسجد بنانا چاہتے تھے لیکن مسلسل مصائب زمانہ نے اُن کو مہلت نہ دی اور مسجد کی تعمیر ملتوی ہوتی رہی۔ مکہ شریف اور بیت المقدس ایک مخالف بادشاہ کے قبضہ میں تھے، اس سے جزیرہ نماء اندلس کے مسلمانوں کو ان مقدس شہروں کی زیارت کے لئے جانے میں سخت تکالیف ہوتی تھیں۔ علاوہ بریں بنو امیہ اندلس کی رعایا، اندلس کو سلاطین بغداد سخت مشتبہ نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کا آنا ناگوار سمجھتے تھے۔ نیز امیر عبدالرحمن کو ملک عباسیہ کے تمام منبروں پر غاصب، باغی اور مکار قرار دیدیا گیا تھا جن کامیابیوں نے کہ میدان جنگ میں امیر عبدالرحمن کی رکاب چومی، اور جن وجوہ سے کہ اُنہوں نے اپنی سلطنت

اور شوکت وصولت قائم کر لی اُن ہی نے اُن کو اس پر مائل کیا کہ وہ اپنے ارادوں کو فعل سے قوہ میں لائیں اور اپنی بلند نظری کو پورا کر کے دکھلائیں۔ اُنہوں نے اپنی سیاسی دوربین نظر سے سرسری طور پر معلوم کر لیا تھا کہ اگر وہ ایسی مسجد بنا لینگے تو اُس کا کیا اثر اُن کی واہمہ پرست اور سریع الاعتقاد رعایا پر پڑیگا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی مسجد سے اُن کی رعایا میں ایک قومی غرور و ناز پیدا ہو جائیگا۔ ایسی مسجد کے دارالخلافہ ہونے سے سلطنت کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ جلاوطنان عرب اور اُن کی اولاد اب بھی اپنے اور اپنے آباو اجداد کے وطن اصلی کی طرف نگاہ لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر ایسی مسجد کسی دوسری سرزمین پر بن جائے تو اُن کو اُس سے ہمدردی پیدا ہو جائیگی اور اُن کی تمام توقعات اُس سے وابستہ ہو جائینگی۔ اگر وہ مسجد دولت و حشمت میں مکہ کا مقابلہ نہ کر سکے تو کم از کم شان و شوکت اور خوبصورتی میں تو اُس سے بڑھ جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک موقعہ پر یہ کہا بھی کہ "میری مسجد بہت جلد ایک خلیفہ کو مانگیگی، میری اولاد یہ خطاب لیگی، اور خلافت کا جو تنازع مشرق اور مغرب میں چلا آتا ہے اُس کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیگی۔ ہمارے تمام معاملات اصول مملکت دین پر مبنی ہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ میری رعایا سواء ذات احدیت اور سیف رسالت (صلے اللہ علیہ وسلم) کے میری اولاد ہی کو سب کچھ سمجھیگی"۔

فتح کی دارو گیر میں قرطبہ میں عیسائیوں کے جتنے معبد تھے سواء ایک کے سب منہدم کر دیئے گئے تھے۔ صرف ایک بڑے گرجا میں، جو بذریعہ ایک معاہدہ کے عیسائیوں کے قبضے میں رہنے دیا گیا تھا، یہ کفار اپنے مراسم مذہبی ادا کر سکتے تھے بموجب اُس رواج کے جو ممالک مشرقیہ میں جاری تھا (اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ معمولی حالات میں بھی غیر معمولی بات تھی کہ جو معاہدات عیسائیوں سے کئے جائیں اُن کا ایفا نہ ہو) اس گرجا کا نصف حصہ بجبر مسلمانوں کی عبادت کے واسطے لیا گیا تھا لیکن چند ہی سال میں یہ ثابت ہو گیا کہ جو محدود زمین بجبر لی گئی ہے وہ نئے آنے والے لوگوں، اور نو مسلموں کی کثرت کی وجہ سے جمعہ کی

وجماعت کے لئے غیر مکتفی ہے چونکہ یہ گرجا شہر کے ایک نہایت موزوں موقعہ پر واقع تھا، اس لئے امیر عبدالرحمن نے تمام گرجا کو خرید کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بطریق نے اُسکو فروخت کرنے سے اس وجہ موجہ پر انکار کیا، کہ اگر یہ گرجا بیچ ڈالا گیا تو عیسائیوں کو اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائیگی۔ لیکن آخر امیر ہی کی ضد قائم رہی عیسائیوں نے ایک لاکھ دینار لئے اور اسکے علاوہ یہ رعایات حاصل کیں کہ ایک گرجا کے عوض میں، جس کے ایک حصہ کو وہ جنگ کے مصایب اور ظلموں کی وجہ سے صبر کر بیٹھے تھے کئی گرجا بنالیں۔

اس مسجد کا نقشہ خود امیر عبدالرحمن نے بنایا؛ اور اس کا سنگ بنیاد بھی اپنے ہی دست مبارک سے رکھا۔ ان کا سن زیادہ ہو چکا تھا، جسمانی ضعف شروع ہو گیا تھا، اور اُن کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اس مسجد کی تکمیل نہ دیکھ سکینگے؛ اس لئے اُنھوں نے تعمیر میں بہت ہی جلدی کی۔ کثیر التعداد مزدور لگائے، دور افتادہ صوبوں کے گورنروں سے استمداد کی کہ وہ مسجد کے لئے مسالا بہت جلد روانہ کرتے رہیں۔ بوڑھے اور ضعیف بادشاہ نے ہر روز ایک گھنٹہ، بنفس نفیس، آکر مزدوروں کا کام کر کے کاریگروں کے شوق کو بھی بڑھایا؛ خزانہ شاہی کے صندوقوں کا مُنہ کھول دیا گیا کہ اُس عمارت میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا جا سکے، جو رعایا کے دلوں پر اثر ڈالتی، اور دینی ضرورت بھی رفع کرتی تھی۔ کام حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہوا، مگر نہ اتنا کہ جس سے یہ عالیشان اور والا منزلت معمار خوش ہو جاتا۔ آخر بے صبر بادشاہ کو صبر نہ ہوا؛ اُنھوں نے یہ چاہا کہ قبل اسکے کہ وہ ضعف سے کھڑے ہونے کے قابل نہ رہیں، اس مقدس مسجد میں خلیفۃ الرسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کام کر جائیں؛ جو دین اسلام میں سیدھا سادہ کام ہے، اور جسکو کرنے کے لئے ہر مسلمان بطیب خاطر راضی ہو جاتا ہے۔ صحن مسجد میں ایک جگہ صاف کی گئی، ایک شامیانہ تانا گیا اور محل شاہی سے پردے لا کر نامکمل دیواروں پر لٹکائے گئے۔ ادھر اُدھر عمارت کے مسالے

کا ڈھیر تھا، ان گھڑ ستون اور غیر مکمل پتھر پڑے ہوئے تھے، امیر اپنے سفید کپڑے پہنے ہوئے عارضی منبر پر چڑھے؛ اور مسلمانوں کے ایک جم غفیر کو جو شہر کے تمام محلوں سے جمع ہو گئے تھے مخاطب کر کے خطبہ پڑھا۔ بس امیر عبدالرحمٰن کا یہ آخری اہم کام تھا۔ اسکے چند ہفتہ کے بعد اُن ہی لوگوں نے، جنہوں نے خاموشی کے ساتھ اُن کا خطبہ سنا تھا، اُسی جامع مسجد میں اُن کی نماز جنازہ پڑھی اور وہیں سے اُن کا جنازہ لیکر اُن کو آخری منزل پر پہنچا آئے۔

غرض یوں اُنہوں نے اپنا کام پورا کر لیا۔ اور جب انتقال کیا تو اس حالت میں کہ وہ ایسے بڑے خاندان شاہی کے بانی ہوئے کہ جس کا ثانی اُس وقت تک یورپ نے نہیں دیکھا تھا۔ اُن میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ایک عقلمند سیاست دان اور روشن دماغ بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ سالہا سال کے جانکاہ مصایب اور مالایطاق تکالیف سے اُن کے مزاج میں بڑا فرق پڑ گیا تھا، اور اُن کے صبر و استقلال کی بڑی آزمایش ہوئی تھی جتنی بے رحمیاں اُن سے منسوب کی جاتی ہیں وہ براہ راست نتیجہ تھیں۔ اُن کی اُس رعیت کی شرارت و خبث کا، جس پر حکومت کرنے کے لئے وہ وہاں آئے تھے۔ سیاسی مسائل جو اُن کے سامنے تھے اُن پر نہ صرف اُن کا تفوق ہی موقوف تھا بلکہ اُن ہی پر تمام اسلامی سلطنت اندلس کا انحصار تھا؛ اور اسکے ساتھ ہی اُن کی ذات، اور اُن کی سلطنت کا صرف جبر و تشدد ہی وہ حجت تھی جو اُن کے سامنے پیش کرنے کے عادی تھے۔ اسی حجت سے وہ اپنے دشمنوں کو قایل کرتے تھے نفس قرآنی کو تو بھلا کون سنتا تھا۔ اندلس کے باشندے بیشتر بت پرست اور کفار تھے برابر جنکا عنصر اُس ملک میں غالب تھا، اپنے خانگی بتوں کو پوجنے والے اور ساحروں اور مشعبدوں کے سامنے سجدے کرنے والے تھے۔ برسوں کی مادر و پدر آزادی، اور مُنہ زوری نے ان وحشیوں کو اور بھی خونخوار اور وارستہ مزاج کر دیا تھا۔ عام دشمنی اور خاص

خانگی عداوتیں، دو فریقوں کی تیز و تند لڑائی، ایک فریق کا دوسرے کو نکال باہر کرنے، زمانہ آئندہ میں انتقام لینے کی امیدیں، وہ چیزیں تھیں کہ اُن میں صلح و صفائی کی کسی طرح امید نہیں تھی۔ ہر ایک گروہ میں دشمنوں کی بہتات تھی، ایک کی قومیت دوسرے سے نہ ملتی تھی، ایک کو دوسرے سے دینی عناد تھا؛ اگر اُن میں کوئی وجہہ اتفاق و اتحاد تھی تو صرف یہ کہ سب پر ایک ہی سی مصیبت پڑی ہوئی، ہر شخص کے دماغ میں دینی اور سیاسی آزادی کا خبط سمایا ہؤا تھا، بادشاہ کے جو جتنے قریب رشتہ دار تھے اُتنے ہی اُن کے جانی دشمن تھے۔ کوہستان ایسٹریاس میں ایک نئی سلطنت قائم ہوئی تھی، جو مسلمانوں کے ملک کو دباتے چلے آرہے تھے۔ یورپ اور ایشیا کے نہایت طاقتور بادشاہوں نے ماوراء بحر روم اور پائے رے نیز سے ایسے بادشاہ پر حملہ کیا تھا کہ جسکی سلطنت میں آشوب و اختلال تھا، اور جسکے تمام ذرائع کو نمک حرامی اور غداری کھائے چلی جا رہی تھی بنو عباس نے جو امیر عبدالرحمٰن کو بلا وجہ ستایا، تو اُن کو اتنا غصہ آیا کہ وہ ساحل شام پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن خانگی فساد و عناد اُن کو کچھ کرنے دیتا تو وہ سب ہی کچھ کرتے۔ جو صورت اُن کی تھی اُس میں تو یہ حملہ بالکل ناممکن تھا۔ ان ہی وجوہ سے اُن کو غیر ملکی لوگوں کی فوج رکھنی پڑی تھی؛ ان ہی وجوہ سے ان کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا؛ وہ جو کچھ سختیاں کرتے تھے بالکل بجا تھیں؛ ان ہی وجوہ سے وہ یہ کوشش کرتے رہتے تھے کہ اُن کی رعایا کے عقاید دینی مستحکم رہیں؛ ان ہی وجوہ سے اُنھوں نے اتنی بڑی باشان و شکوہ مسجد بنا کھڑی کی تھی؛ انہی وجوہ سے اُن کو یہ سیاسی چال سوجھی تھی کہ علم کی اشاعت صنعت و حرفت کی سرپرستی اور دیگر مفید باتیں ملک میں پھیلا کر رعایا کی توجہ اُن ہی میں لگائے رکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر عبدالرحمٰن خلقتاً بے رحم اور ظالم نہ تھے وہ اپنی رعایا کی شکایات سننے، اور اُن کی دادرسی کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جو لوگ اُن کے سخت

دشمن تھے اُنہوں نے بھی اُن کو بے انصاف اور یک رُخہ نہیں کہا۔ اگر اُن کی سختی میں رحم کی جھلک ہوتی تھی، تو یہ بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ رحم کرنا جانتے ہی نہ ہوں۔ خانگی زندگی میں وہ ذی مروت آدمی تھے۔ ظاہری طور پر وہ خوددار تھے۔ اپنے زیردستوں کے ساتھ وہ اخلاق اور احسان مجسم تھے۔ چونکہ خود میانہ رَو آدمی تھے اس لئے دربارِ قرطبہ میں کبھی وہ شرمناک منظر نہ دکھلائی دیتا تھا جس کو دیکھ کر دینداران قرطبہ آنکھیں بند کر لیتے اور جن کے سننے سے ان کے جذبات دینی کو سخت صدمہ پہنچتا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو خاندان بنو امیہ کا وجود ملک مغرب میں نہ ہوتا؛ اور اگر یہ خاندان نہ ہوتا تو علوم زمانۂ قدیم کا بہت بڑا خزانہ ایسا گاؤ خورد ہوتا کہ اُن کی کسی کو ہوا بھی نہ لگتی؛ سائنس کو اہالی کلیسا کی غیر مسامحت اور عدم رواداری نے روند ڈالا ہوتا؛ دماغی ترقی کی امیدیں خاک میں مل جاتیں، اور یورپ کی تہذیب کئی صدیوں پیچھے جا پڑتی۔

جس تاریخ کہ عبدالرحمن اول نے تخت اندلس پر قدم رکھا اُسی تاریخ سے خلافت مغربی کی آزادی کی بنیاد رکھی گئی۔ یہاں کے بادشاہ گو با اختیار تھے، اور آزاد، اس لئے وہ اسکے مستحق تھے کہ اُن کی رعایا اُن کی تابع فرمان ہو اور دیگر سلاطین اُن کو بادشاہ مطلق العنان تسلیم کریں، لیکن باوجود اسکے عبدالرحمن ثالث کے زمانہ تک اُنہوں نے اپنے آپ کو کھلے طور پر خلیفہ نہیں دکھلایا؛ بلکہ ایک غیر مشہور لقب "امیر" سے حکومت کرتے رہے۔ اس پالیسی پر قائم رہنے کی بہت سی وجوہ تھیں۔ مسلمان اب بھی عام طور پر سمجھتے تھے کہ ملک مشرق ہی اصل سرچشمۂ حکومت اسلامی ہے اور وہیں کے بادشاہوں کو اصلی و حقیقی حق سلطنت حاصل ہے۔ بنو امیہ کی اولاد کو اہالی دمشق و بغداد دونوں بہت ہی بُرا سمجھتے تھے؛ جزیرہ نمائے اندلس کی سیاسی حالت بہت مختل تھی۔ ہر جگہ یہ کیفیت تھی کہ ذرا ذرا سے بہانہ پر لوگ شمشیر بکف ہو جاتے تھے اور ان غداروں کے ساتھ قزاق و قطاع الطریق و مذہبی دیوانوں کے گروہ کے گروہ شامل ہو جاتے تھے۔

خود مطلب لوگ اپنے جوش خود کامی میں کوئی ایسا موقعہ نہ چھوڑتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں آگ نہ لگا دیتے ہوں، جو خود برافروختہ ہونے کے لئے ہر وقت تیار بیٹھے رہتے تھے؛ خاص کر ایسی صورت میں کہ جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ اس سے اُن کو فواید پہنچنے، یا شہرت بڑھنے کی کوئی امید ہے۔ چونکہ بروئے شرع اسلامی دنیوی و دینی حکومت ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس لئے ضوابط و قواعد مقررہ شرع میں ذرا سی بھی دست اندازی کرنا گویا اپنی جان پر کھیلنا تھا۔ اگر یہ جلاوطن بنو اُمیہ خطاب خلافت، ذرا بھی قبل از وقت، اپنے لئے تجویز کر لیتے تو اُن پر بے ادبی اور گستاخی کا الزام لگایا جاتا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنی اُس سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھتے، جو نہ کسی قاعدہ مقررہ و مستمرہ پر قائم ہوئی تھی، نہ رعایا کی محبت کی اُسکو مدد تھی، نہ اُسکے پاس اتنی کافی فوج تھی کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے بعض ایسی باتوں کا دعوے کیا گیا کہ جو بروء شرع چنداں قابل اعتراض نہیں تھیں اُن کا یہ نتیجہ ہو چکا تھا کہ لوگوں میں شورش پیدا ہو گئی تھی اگر یہ خاندان، جو دنیاء اسلام کا سب سے بڑا خاندان تھا، کہیں دعوے خلافت کر بیٹھتا تو جو مصایب اُسکو پیش آتے اُسکی تلافی کسی طرح نہ ہو سکتی۔ اس خاندان کے بادشاہوں کے لئے یہی مناسب تھا کہ شاہی صولت و اختیارات رکھیں مگر خطاب خلافت سے محترز ہی رہیں۔ منجملہ بہت سی اور وجوہ کے یہ چند وجوہ تھیں جن سے مجبور ہو کر انہوں نے ایک عرصۂ بعید تک، براء نام، ایک متابعانہ حیثیت اور نام قائم رکھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بادشاہ یورپ بھر میں بالکل مطلق العنان اور پورے مستبد بادشاہ تھے، کہ جن کو نہ کسی کا خوف تھا، نہ کسی کے پاس جوابدہ تھے۔

اندلس کی خانہ جنگیوں کا نہ صرف یہ نتیجہ ہوا کہ ایسٹریاس کے کوہستانیوں میں قومی بیداری پیدا ہو گئی اور انہوں نے اپنے یہاں ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھ لی۔ بلکہ اس کا بدترین اور مضر ترین اثر یہ ہوا کہ فرانس میں مسلمانوں کے جتنے مقبوضات تھے وہ اُن کے ہاتھ سے چھین لئے گئے جس روز سے پیپن تخت نشین ہوا اسی

دن سے اُس نے یہ کوشش شروع کی کہ وہ اُن آباد کار مسلمانوں کو، جو صوبہ ہائے پروینس اور لینگیوڈاک میں آ بسے تھے، نکال باہر کرے۔ ایک گاتھک سردار کی نمک حرامی نے صوبہ سپیٹے مینیا کے بڑے بڑے شہر باستثناء ناربون کے اُن کے حوالہ کر دیئے۔ اس دارالسلطنت نے چھ برس سے زیادہ کے محاصرہ کی مصیبت اُٹھائی۔ چونکہ رومیوں اور اہل گاتھ کو اہالی فرانس سے سخت تعصب تھا، اس لئے وہ برابر عربی فوج کی مدد کرتے رہے لیکن بالآخر جب یہ ہُوا کہ بے چینی پھیلی اور قُرطبہ سے امداد ملنے کی امید منقطع ہوگئی، تو شہر کے رؤسا نے دشمنوں سے صلح کا نامہ پیام کیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ محصورین کی یہ رعایت کی جائے کہ اُن پر اُن ہی کے قوانین کے موافق حکومت ہو لیکن عین آخری وقت پر مسلمانوں نے اس شرط سے انکار کر دیا۔ لڑائی پھر شروع ہوئی؛ اور چونکہ عربی محافظ فوج بہ نسبت عیسائیوں کی تعداد کے کم تھی اس لئے عیسائی تباہ کر دیئے گئے۔ اکتالیس برس تک جنوبی فرانس میں مسلمانوں کا دین، قانون اور رسم و رواج قائم رہا۔ اگرچہ اب ایک ہزار برس گزر چکے ہیں، اور ہزاروں قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں، مگر اُن کے نشانات اب تک وہاں کے دہقین کی جسمانی ساخت اور دماغی قابلیت میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، یہ قبضہ گو چند روزہ نہایت عارضی تھا، مگر وہاں کے لوگوں کے رسم و رواج، یورپ کے علم ادب، اور دل و دماغ پر نمایاں اثر ڈالے بغیر نہ رہا۔ اندلسی عربوں کی تہذیب، مطربان سوقی اور قوانین شجاعت نے وہاں پھیلائی، اور اس کا اثر وہاں برپا رہا۔ خلافت اندلس کیساتھ جو راہ و رسم چند روز کے لئے مسدود ہوگئی تھی اُسکی تجدید کی گئی؛ بلکہ اختلاط اور بھی بڑھ گیا۔ خیالات، مذاق اور ہمدردی باہمی نے ایک دوسری کی عزّت و حرمت کرنے کا خیال پیدا کیا؛ قرطبہ کی درخشندہ و روشن دماغ سوسائٹی کی روشنی یہاں منعکس ہوئی؛ عیش و نشاط کے رسوم میں بڑی اصلاح ہوئی؛ علم خواب پھیلا، اور عقاید میں گو شک شبہ کیا جانے لگا، مگر ایک مخصوص اسلوب کے ساتھ اس نے الپے جبین نشین بادشاہوں کو درباروں کو ممتاز و نمایاں بنا دیا۔

(الف)

تعلیقات باب ہشتم

(۱) المیونیکار = ALMUNECAR سپین کا ایک ساحلی مقام ہے۔ مجھے اسکے حالات اس سے زیادہ نہیں ملے کہ وہ صوبہ غرناطہ میں واقع ہے نیشکر اور چقندر پیدا ہوتے ہیں ۱۹۰۰ء میں اسکی آبادی ۸۰۲۲ تھی عبدالرحمٰن اول کے یہاں اُترنے کی وجہ سے اس کو تاریخ میں خاص شہرت ہے + (مترجم)

(۲) لوجا = LOJA صوبۂ غرناطہ کا ایک شہر جو دریائے زنیل کے کنارہ پر ایک پہاڑی ڈہلوان پر آباد ہے غرناطہ سے مغرب میں ۳۱ میل اور ملاغہ سے ۴۱ میل شمال و مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس وقت اس کی آبادی قریبًا بیس ہزار ہے۔ یہاں کئی کارخانے اونی کپڑے اور کاغذ بنانے کے ہیں۔ ایک شفاخانہ بھی ہے ایک زمانہ میں غرناطہ کی کنجی سمجھا جاتا تھا جس پہاڑی کے ڈھلوان پر یہ شہر آباد ہے اُس کی چوٹی پر مسلمانوں کے زمانہ کے ایک مضبوط قلعہ کے آثار ہیں۔ غالبًا یہ وہی قلعہ ہے جس میں سب سے پہلے عبدالرحمٰن الداخل مہمان ہے تھے (بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود + سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود) + (مترجم)

(۳) موسارا = MOSARA کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا! ممکن ہے کہ اب بھی باقی ہو۔ اس کا کہیں حال نہیں ملتا۔ سپین کے نقشہ میں بھی اس کا نام نہیں ہے + (مترجم)

(۴) پیڈربورن = PADERBORN جرمنی کے صوبہ ویسٹ فیلیا کا ایک شہر ہے ایک پُرفضاء اور خوشگوار مقام پر دریائے پیڈر کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۰۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ یہاں ایک بڑا گرجا ہے جو ۱۱۴۳ء میں تیار ہوا تھا۔ اور اُس میں سینٹ لی بوری اس کی لاش چاندی کے ایک تابوت میں رکھی ہوئی ہے۔ اس شہر کو شارلے مین نے آباد کیا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں اسکا الحاق پروشیا کے صوبے سے ہوگیا + (مترجم)

(۵) اے لاشیپل = AIX-LA-CHEPELLE اس کا قدیمی نام ایچن ہے۔ پروشیا میں ایک ضلع کا صدر مقام ہے اس کے چار طرف پہاڑیاں ہیں درمیان میں یہ بستی ہے۔ وُرم نامی ندی اس کی ذریعۂ آب رسانی ہے یہاں بہت سے کارخانے ہیں۔ سوئیوں اور پنوں کے کارخانے تو ڈھائی سو برس سے مشہور چلے

آتے ہیں۔ کپڑا بھی بنتا ہے اور اتنا ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں انگلستان کے کپڑے کی تجارت کو امریکہ میں شکست دیدی تھی۔ اس کی تاریخی شہرت پےپن کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ پھر شارلے مین کی وجہ سے اس کو چار چاند لگ گئے۔ یہ امر اب تک مشکوک ہے کہ آیا شارلے مین یہیں پیدا ہوئے تھے یا کہیں اور سنہ ۷۹۶ء میں شارلے مین نے یہاں کے "محل شاہی" اور اُس گرجا کو جس میں سنہ ۷۶۵ء میں پےپن نے کرسمس منایا تھا" از سر نو تعمیر کرایا۔ موجودہ شہر اُس مقام پر آباد ہے جہاں کسی زمانہ میں "محل شاہی" تھا۔ نارمنوں نے گرجا کو بالکل تباہ کر دیا تھا سنہ ۹۸۳ء میں اوتھو سوم نے اس کو پھر بنایا۔ اب یہ بڑے گرجا کا ایک حصہ ہے۔ یہ قدیم بڑا گرجا ایک قدیم ہشت پہل عمارت ہے اس کے وسط میں ایک پتھر ہے جو شارلے مین کی قبر کا نشان ہے۔ کہتے ہیں کہ سنہ ۱۰۰۰ء میں یہ قبر کھولی گئی تو شارلے مین کی لاش کو جوں کا توں دیکھا گیا؛ یعنی وہ سنگ مرمر کی کرسی پر اپنا شاہی لباس پہنے ہوئے بیٹھا تھا؛ انجیل اُس کے گھٹنوں پر کھلی رکھی تھی؛ اور تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی مگر اس روایت میں حضرات کلیسا کی بہت کچھ عنایت شامل ہے۔ آٹو نے اس پر پھر قبر بنادی سنہ ۱۱۶۵ء میں فریڈرک اول نے پھر قبر کو کھلوایا اور شارلے مین کی ہڈیاں سونے اور چاندی کے بکس میں بند کرا کر رکھوا دیں سنہ ۱۲۱۵ء میں فریڈرک ثانی نے ان کو ایک تابوت میں بند کرا کر دفن کرا دیا۔ شارلے مین کی سنگ مرمر کی کرسی پر سونا چاندی مڑھوا کر سنہ ۱۵۵۸ء تک بادشاہان فرانس کی تخت نشینی کی رسم میں کام میں لائی جاتی تھی سنہ ۱۷۹۵ء میں یہ کرسی ویانا دارالسلطنت آسٹریا میں پہنچ گئی۔

اس گرجا میں کچھ قدیمی تبرکات بھی ہیں، جو ہر ساتویں برس کھلائے جاتے ہیں۔ ان کی زیارت کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔

یہاں ایک بہت بڑا کمرہ بھی ہے جس میں ۳۷ بادشاہان جرمنی اور گیارہ ملکہ تخت نشین ہوئی تھیں۔ چند سال ہوئے کہ اس کی مرمت ہوئی ہے اور نقش و نگار پھر کئے گئے ہیں۔ وہ جگہ اب تک باقی ہے جہاں شارلے مین رہتا تھا۔

بہت سے معاہدے یہاں ہوئے ہیں جنہوں نے یورپ کی قسمت پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے مگر یہ باتیں ہمارے مطلب سے خارج ہیں۔ (مترجم)

(۶) رون سس وِیلے = RONCESVALLES نوار کی ایک وادی کا نام ہے پمپلونہ سے بیس میل شمال و مشرق میں واقع ہے۔ تاریخ میں اس کی شہرت شارلے مین کی پس پائی کی وجہ سے ہے جو ۷۷۸ء میں ہوئی +

اس جنگ کے جو حالات مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئے ہیں اُن کا یہ خلاصہ ہے کہ :-
شارلے مین کو ایک طرف تو خلیفہ بغداد نے اُبھارا، دوسری طرف قتلونیہ والوں نے یہ عدہ کیا کہ اُن کو بادشاہ بنا لینگے، اس لئے انہوں نے مسلمانوں کی مدد سے اندلس پر حملہ کیا۔ ایک بہت بڑی فوج لے کر دہ کوہ پائرینیس سے گزرے۔ نوار سے ہوتے ہوئے پمپلونہ پر قبضہ کیا اور اس کی فصیل کو گرادیا۔ چونکہ انہوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ سپین کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے پنجہ سے چھڑاتے آرہے ہیں اس لئے پمپلونہ کو نقصان پہنچانا اس وعدے کے منافی تھا کیونکہ اُس وقت تک یہ شہر عیسائیوں ہی کے قبضہ میں تھا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انہوں نے اُس ملک کا بہت سا حصہ لے لیا جو کوہ پائرینیس اور دریاء ایبرو کے درمیان میں واقع ہے جب وہ شمال کی طرف واپس آنے لگے تو نوار والوں نے پمپلونہ کو تباہ کرنے کے انتقام میں شارلے مین کی فوج کے عقبی حصہ پر حملہ کر کے تباہ کر دیا۔ بڑے بڑے افسران فوج اس جنگ میں کام آئے اور بہت سا سامان رسد رسانی لُٹ گیا۔ اسی واقعہ میں مشہور و معروف رولینڈ بھی مارا گیا +

اس جنگ نے شعراء کے لئے بہت بڑا مسالا بہم پہنچا دیا ہے + (مترجم)

(۷) رولینڈ = ROLAND روایات مروجہ کے مواقق شارلے مین کے پیارے بھتیجے اور جنگ متذکرہ صدر کے سب سے بڑے بہادر اور سپہ سالار ہیں۔ ان کے مارے جانے کا تو وہی قصہ ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔ شعرا اور مطربان سوقی نے ان کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس گیت کا خلاصہ یہ ہے :-
شارلے مین چھ برس تک سپین میں رہے جب وہ فرانس کو واپس آنے لگے تو رولینڈ کے مشورہ پر انہوں نے اپنے سپہ سالار گینے لون کو سرقسطہ کے کافر بادشاہ مارسی لی اس کے پاس بطور سفیر کے بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ جب شارلے مین وہاں سے گزریں تو وہ حسب عہد کورنش بجا لائے۔ یہ معاملہ بہت ہی نازک اور خطرناک تھا کیونکہ پہلے جتنے سفیر وہاں گئے تھے وہ سب مار ڈالے گئے تھے۔ گینے لون رولینڈ کا بڑا

سخت دشمن تھا؛ اُس نے ایک ترکیب سے شارلےمین اور رولینڈ کو ایسے راستے سے بلایا جو بہت خطرناک تھا۔ شارلےمین تو خیریت سے گزر گیا؛ رولینڈ اپنے بیس ہزار آدمیوں کو لئے ہوئے گزرنے لگا تو اُس کو ایک بہت بڑی فوج نے آکر گھیر لیا جس میں تمام دنیا کے کافر جمع تھے۔ رولینڈ کے پاس ایک جادو کا قرنا تھا کہ اگر وہ پھونکا جاتا تو پہاڑوں کے اُس طرف آواز جاتی اور اُن کے چچا اُن کی مدد کے لئے آجاتے مگر ایسا کرنا چونکہ بزدلی تھی اس لئے وہ اپنے بیس ہزار سواروں کے ساتھ ہی لڑتے رہے اور اُنھوں نے ایک لاکھ مسلمانوں کو وہیں کھیت رکھا۔ اُن کے پاس صرف پچاس سوار رہ گئے؛ باقی سب کام آئے۔ آخر قرطاجنہ، حبش اور کینڈیا کے پچاس ہزار نیزا اوڑ کافروں نے اُن کو آگھیرا۔ اب مجبور ہو کر اُنھوں نے اپنا قرنا پھونکا۔ اُس کی آواز سن کر شارلےمین نے یہ سمجھا کہ رولینڈ شکار کر رہا ہے اس لئے وہ مدد کو نہ پہنچے۔ آخر جب اُنھوں نے اس زور سے قرنا پھونکا کہ اُن کے گلے کی رگیں ٹوٹ گئیں تو شارلےمین آئے اور اُن کو خاک و خون میں پایا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ مرتے مرتے رولینڈ ایک زہریلے چشمے تک پہنچ گئے۔ اسی میں اُنھوں نے اپنا قرنا پھینک دیا۔ رولینڈ کا انتقام لینے کے لئے شارلےمین نے وہاں بہت سی لڑائیاں لڑیں وغیرہ وغیرہ +

یہ گیت صدیوں یورپ میں گایا جاتا رہا ہے۔ ولیم آف نارمنڈی جب انگلستان فتح کرنے کے لئے گئے ہیں تو اُنھوں نے حکم دیا تھا کہ یہ گیت کوچ کے وقت سپاہیوں کے آگے آگے گایا جایا کرے یہ اور اسی قسم کے گیت یورپ میں بعض وقت تاریخوں کے ماخذ بن جاتے ہیں + (مترجم)
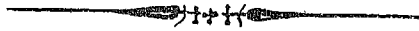
باب نہم

ہشام اوّل حکم اوّل

۷۸۸ء سے ۸۲۲ء تک

عبدالرحمٰن الداخل کی وصیت سے سلاطین کی جانشینی کا قدیم طریقہ ٹوٹ گیا۔ ہشام کی تخت نشینی۔ عبداللہ اور سلیمان کی بغاوت۔ دونوں کی شکست فاش اور اُن کی فوجوں کا فرار۔ امیر ہشام کا رحم و کرم۔ سیپٹے مینیا پر فوج کشی۔ اہالی فرانس کی ہزیمت۔ یہ مہم بلا نتیجہ رہی۔ امیر ہشام کے رفاہ عام کے کام۔ علماء دین کی طرف اُن کا رجحان و حمایت۔ قرطبہ کا جنوبی سواد شہر۔ ہشام کی رحلت۔ حکم سے عام طور پر بے اعتباری۔ سلیمان اور عبداللہ کی بغاوت ثانی۔ خانہ جنگی۔ گاتھک مارچ۔ برشلونہ کا محاصرہ اور فتح۔ امیر کی بے پروائی۔ فتح کی اہمیت۔ خاندان ادریسی۔ طلیطلہ کا فساد۔ یوم الخندق۔ شاہی محافظین۔ فقہا کی بغاوت۔ اس کا نتیجہ۔ الیسٹریاس اور فرانس کے بادشاہوں کی حماقت۔ سینٹ جیمس دی اپاسل کا قصہ۔ حکم کا انتقال۔ اُن کے خصائل۔

امیر عبدالرحمٰن نے اپنے لاڈلے بیٹے ہشام کو اپنا جانشین مقرر کرنے کو تو کر دیا مگر اس سے اُنہوں نے نادانستہ خانگی عناد و فساد کے سلسلہ کی بنیاد ڈال دی، جو کبھی بھی ختم ہونے والا نہ تھا۔ یہ خرابی اُن سیاسی بغاوتوں پر مستزاد تھی جو آئے دن اُن کی رعایا، جس میں متضاد عنصر شامل تھے، کرتی رہتی تھی۔ دست استبداد نے اُس بے چینی کا تو انسداد کر دیا جو روز روز ظاہر ہوتی رہتی تھی، مگر یہ بالکل ظاہر تھا کہ یہ روک تھام عارضی ہے۔ از روء روایت و وراثت و عادت، اعراب و برابرہ کی طبیعت ثانیہ یہ تھی کہ وہ مغرور، آزادی پسند اور حکام کے نافرمان تھے۔ اقتضاء سیاست، اور زمانۂ قدیم کے مہذب قوموں کے تجربہ

نے بلا شک و شبہ یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ سب سے بڑے بیٹے کو جانشین یا وارث قرار دینے
میں سراپا فایدہ ہے۔ اگرچہ اس قانون کو اسلام تسلیم نہیں کرتا، مگر اقتضاء ضرورت نے
اسی قاعدہ کو منظور و تسلیم کرنے پر مجبور کیا، اور شدہ شدہ رسم و رواج نے اسی کو قانون بنادیا۔
مسئلہ جانشینی کو طے کرنا بادشاہ ہی کا کام قرار پاگیا؛ اور اُس کا استحکام عمایدِ سلطنت کے
تسلیم کر لینے پر موقوف رہا؛ مگر یہ محض معمولی بات تھی، کیونکہ مسلمہ امر کی کوئی مخالفت نہیں
کر سکتا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ قبایل کی رگ عصبیت و حمیت جوش میں نہ آجائے؛
ورنہ اس میں کوئی سیاسی بات مستتر نہ تھی۔ اگر یہ رسم ادا نہ بھی کیجاتی تو یہ نہیں ہوسکتا تھا
کہ اُسکے بغیر تخت نشینی ہی نہ ہوتی، یا ولیعہد کا تقرر نہ ہوتا؛ اتنا ضرور ہوتا کہ کسی بلند نظر
شخص کو غدر کرنے اور کرا دینے کے لئے خاصہ بہانہ مل جاتا۔ امیر عبدالرحمن نے ہشام کو
جو منتخب کیا، اور بڑے بیٹوں کو محروم، اُسکی بہت سی وجوہ تھیں۔ اُن کی ماں امیر عبدالرحمن کی
نہایت حسین اور چہیتی کنیزک تھیں۔ ان کو ایک وقتی صلح کے درمیان میں اُن کے حریف یوسف
نے امیر کے سامنے پیش کیا تھا، اور یہ اُسی وقت سے اُن پر حاوی ہوگئی تھیں۔ ہشام
اندلس ہی میں پیدا ہوئے تھے، اور اُن کے دونوں بھائی، سلیمان اور عبداللہ شام میں۔ یہ ظاہر
ہے کہ جو شاہزادہ اندلس میں پیدا ہوا اُس سے لوگوں کو زیادہ محبت ہوگی، لیکن اصل وجہ اس
انتخاب کی یہ تھی کہ امیر عبدالرحمن جانتے تھے کہ ہشام عالم اور روشن دماغ آدمی ہیں، اور اُن
کے اخلاق بھی نہایت ستودہ ہیں۔ شروع ہی سے اُن کے صفات ظاہر ہونے لگے تھے۔
اُن کے بھائی اُن کے بالکل برعکس تھے؛ وہ دونوں کاہل، مسرف اور بادہ مست تھے۔ اُن کے
محل نقالوں اور رقاصوں سے بھرے رہتے تھے اور ہشام کی صحبت میں علماء و حکماء رہتے
تھے۔ ان کو بہترین تعلیم ملی تھی اور اُس سے اُنہوں نے خوب فایدہ اُٹھایا تھا؛ بہت سی
نازک اور آزمائش کے موقعوں پر قابلیت حکومت، اور مختلف جنگوں میں استقلال و ہمت
دکھلائی تھی؛ اُن کی فہم و فراست، حلم و تواضع، لطافت اخلاق، اتقاء و پرہیزگاری پر شروع

ہی سے لوگ گرویدہ تھے اور اُن کے ساتھی اُن پر رشک کرتے تھے | امیر عبدالرحمن کا یہ انتخاب بھی عجیب چیز تھا! وہ - بے قاعدہ، باقتضاء صحبت، رموز سیاست اور شرع شریف کے موافق تھا! مگر اسکی خوبی اُس وقت معلوم ہوئی کہ جب اُن کے دوران سلطنت میں ملک کو ہرطرح کا ترفہ حاصل ہوا سب کچھ صحیح، مگر خلافت مغربی میں یہ مثال ایسی مخدوش تھی کہ وہ انتزاع سلطنت میں کچھ کم ثمر نہیں ہوئی - مگر اس خصوص میں ملک اندلس کی تاریخ دیگر ممالک اسلامی کے بالکل مشابہ و مماثل ہے - اسلامی سوسائٹی کے قابو یافتہ افراد ایسے ہوتے ہی نہیں کہ وہ کسی کے تابع فرمان ہو کر رہیں، یا اپنی سلطنت کو استقلال نصیب ہونے دیں۔

| ضرورت زمانہ اسکی مقتضی تھی کہ کوئی عقیل و فہیم چست و چالاک، ذی ہمت و استقلال بادشاہ تخت پر ہو - لوگوں کے آتشیں جذبات، جو ڈر کے مارے رُکے ہوئے تھے وہ بغاوت کرنے کے لئے موزوں موقعہ کے منتظر تھے - ہر طرف فتنہ و فساد کے سامان تھے، رعایا مضطرب تھی، دعویداران سلطنت اپنی اپنی جا رہے تھے، قبایل کی رقابت کا زور تھا! مگر یہ سب کچھ ایک غایر نظر شخص ہی دیکھ سکتا تھا کہ سکون و اطمینان کے پردہ میں یہ سب کچھ چھپا ہوا ہے مشرقی حدود پر جو والی تھے اُن کی بیعت یوں ہی ہمیشہ سے مشتبہ تھی، مگر اس وقت تو اُن کی حالت اور بھی ناقابل اطمینان ہو رہی تھی - وہ دارالخلافہ سے بہت دور تھے، اہالی فرانس سے اُن کی سرحد ملی ہوئی تھی، وہ آزادی کے دلدادہ تھے کوہ پائے ہنپس کے تمام درّے اُن کے ہاتھ میں تھے اُس طرف کے اہم امور سیاست اُن کے قبضے میں تھے، نتیجہ یہ تھا کہ جتنا اُن کا غرور بڑھتا جاتا تھا اُتنی ہی اُن کی وفاداری میں کمی آتی جا رہی تھی بنو عباس کی معاملات اندلس میں عملی مداخلت اور اُس کے بد انجام نے عباسیوں کے ہوا خواہان کو اچھا سبق دیا تھا! مگر اس سے دربار بغداد اپنے پیر توڑ کر نہیں بیٹھا، بلکہ ہر قسم کی سازش اور خرچ سے وہ ایک طرف عیسائیوں کو اشتعال دیتے اور دوسری طرف حکام و عمال و سپہ سالاران دولت کو ورغلاتے رہتے تھے، تاکہ یہی ذرائع اُس خاندان کی تباہی کا باعث ہو جائیں جس نے

امیرالمومنین کے ہاتھ سے الیسی زرریز وراثت کو چھین لیا تھا۔ یہ سب مشکلات تو ایک طرف،
سلطنت ایسٹریاس نے دانت دکھلانے شروع کر دیئے تھے۔ یاد ہوگا کہ یہ وہ سلطنت ہے کہ
جو مسلمانوں کی خانہ جنگیوں اور خانگی کلچھوں کی وجہ سے قائم ہوگئی تھی، نہ کہ اپنی قوت بازو یا
اپنے عقل و ہنر سے؛ اور جس نے بڑھتے بڑھتے وہ حالت پیدا کی کہ وہ مسلمانوں کی حریف بنگئی۔
(3) جس وقت امیر عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا ہے اُس وقت ہشام (امیر بیدا) ماردہ کے گورنر
تھے جب اُن کے والد دفن ہوچکے تو اُسی شہر میں وہ امیر اندلس مشتہر کیئے گئے۔ اُن سے سب
اچھی طرح واقف تھے، تمام رعایا اُن کی گرویدہ تھی، جب خطبہ میں ہر منبر پر سے اُن کا نام
پڑھا گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ ملک میں خوشی و خوشحالی کا ایک نیا باب کھل گیا ہے مگر یہ محض افسوسناک
سُراب تھا۔ جب امیر عبدالرحمٰن کے انتقال کی خبر قرطبہ میں مشہور ہوئی تو اُس وقت اتفاق سے
سلیمان وہیں تھے، وہ اپنا مکان چھوڑ کر محل شاہی پر قابض ہو گئے، اور انفار شہر کو اپنے ساتھ
ملا لینے کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ چپ چاپ اپنے بھائی عبداللہ
کے پاس طلیطلہ چلے گئے؛ تاکہ دونوں بھائی مل کر تبراضی ہشام کو معزول کر کے ملک محروسہ کو دو
حصوں میں تقسیم کرلیں۔ غالب ثقفی طلیطلہ میں وزیر تھے، ان دونوں بھائیوں نے اُن سے
سازباز کرنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ صرف دیانتدار و نمک حلال ہی رہے، بلکہ اُنہوں نے دونوں
کو امیر حال کے غیظ و غضب سے ڈرایا دھمکایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر مذکور کا عہدہ بھی چھن
گیا، اور قید بھی ہوئے۔ ہشام نے یہ واقعہ سُن کر اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ ایسا پرانا اور وفادار
ملازم سرکاری ایسی سخت بدسلوکی کا مستوجب کیوں قرار پایا؟ تو سلیمان نے وزیر مسجون کو قیدخانہ
سے بلوایا اور اُس ایلچی کے سامنے قتل کراڈالا۔ یہی واقعہ امیر کے خط کا جواب تھا۔ امیر نے اسکو
بجا طور پر نافرمانی اور بغاوت پر محمول کیا؛ اپنے بھائیوں کے غدار ہونے کا اعلان کر دیا، اور
یہ مشتہر کیا کہ جو شخص اُن کی مدد کریگا وہ نمک حرامی کی سزا پائیگا۔ پھر تمام صوبوں کے والیوں
کو اپنی مدد کے لئے بلایا، اور بیس ہزار کی جمعیت لیکر خود اس مہم پر روانہ ہوئے۔ مخالفوں

نے بھی اسی قدر جمعیت فراہم کر لی تھی، سلیمان اُسکے سپہ سالار تھے۔ وہ اس فوج کو لئے ہوئے کچھ فاصلہ جنوب کی طرف طے کر چکے تھے، قلعہ بولک (۱) پر دونوں مخالف فوجوں کا مقابلہ ہوا، دونوں بھائیوں نے شکست فاش کھائی، اور امیر طلیطلہ کی طرف بڑھے۔ یہ شہر جیسا کہ معلوم ہے، بڑا قلعہ بند اور مضبوط مقام تھا۔ یہاں کی فوج محافظ نے عبداللہ جیسے ناعاقبت اندیش آدمی کی قیادت میں یہ ثابت کر دیا کہ اُس کا فتح کرنا مشکل کام ہے اور محاصرہ طول پکڑ یگا۔

سلیمان اپنی بقیۃ السیف فوج کو جمع کر کے اندلوشیا کے میدان میں اُتر آئے اور جو کچھ اُن کے سامنے آیا اُسکو تلوار اور آگ سے تباہ کر ڈالا۔ عبدالملک گورنر قرطبہ (۲) نے سُفینڈا کے قریب اُن کا مقابلہ کیا، اور باغیوں کو شکست دے کر تتر بتر کر دیا۔ سلیمان نے جب یہ دیکھا کہ تمام ذرائع سلطنت اُن کی تباہی کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں تو بمشکل تمام اپنی جان لے کر درۂ کوہ کے راستے صوبہ مرسیہ کی طرف بھاگ گئے۔ اس اثناء میں محصورین طلیطلہ کی حالت نہایت خراب ہو گئی۔ وہاں کی فوج محافظ کے رفقا کو متواتر شکستیں ہو رہی تھیں، جس سے وہ دل باختہ ہو گئے تھے، رسد روز بروز کم ہوتی چلی جاتی تھی، شہر پر مسلسل حملے ہو رہے تھے، سلیمان خود مارا مارا پھر رہا تھا اس لئے کمک ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ عبداللہ نے بحالت مایوسی یہ ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے اُس بھائی کے قدموں پر جا گرے جسکے ساتھ اُس نے یہ غداری کی ہے اور اس سے معافی تقصیرات کرائے، جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ طلیطلہ سے وہ ایک ایلچی کی حفاظت میں، دشمنوں کی صفوں سے نکلتے ہوئے قرطبہ پہنچے، جہاں ہشام چند روز پیشتر آ گئے تھے، تاکہ سلیمان کی نقل و حرکت کی اچھی طرح نگرانی کر سکیں۔ ہشام ایسے سنگدل نہ تھے کہ وہ معترف قصور بھائی کی خوشامد کو نہ سُنتے، وہ اُن سے بڑے تپاک سے پیش آئے اور اُن کو لئے کر طلیطلہ چلے گئے۔ عبداللہ کے حکم سے دروازہ شہر کھول دیا گیا، اُن کے تمام رفقا کو معافی دیدی گئی، خود عبداللہ کو شہر کے قریب ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی، تاکہ اُن کو معافی تقصیرات سابقہ کا اطمینان ہو جائے اور پرانی

باتوں کو بھول جائیں سلیمان کچھ ایسے سخت مزاج اور درشت خو تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر جنگ کی تکلیف، اور اسکے مشتبہ نتیجہ کی آزمائش کرنی چاہی مرسیہ کی گھنی آبادی میں ہزاروں ایسے قسمت آزما لوگ پڑے ہوئے تھے جن کی قدیمی عادات میں متمدن و مہذب ملک نے کچھ اثر نہ ڈالا تھا سلیمان کے وعدوں کی خوش غلافی پر انہوں نے ان کے علم کے نیچے لڑنا بڑی خوشی سے منظور کر لیا میدان لورقہ میں بہت بڑی فوج جمع تھی، امیر کے سپہ سالار کی غیر حاضری میں اُن کے بیٹے حکم، جو چھوٹی عمر کے تھے، فوج طلایہ کے قاید بنے، تھوڑی ہی دیر میں یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکا استقلال اور فوجی قابلیت میں تجربہ کار سپاہیوں کو مات کرتا ہے یہی شاہزادہ باغیوں کے سامنے آیا، اگرچہ شاہزادے کے پاس فوج کم تھی، مگر آخر شاہزادہ تھے، انہوں نے اس شدت وحدت کے ساتھ حملہ کیا کہ تھوڑی ہی سی خون ریز لڑائی کے بعد باغی بھاگ اٹھے جب امیر ہشام اپنی فوج لے کر میدان جنگ میں پہنچے ہیں تو میدان صاف تھا، وہاں یا تو مقتولین کا ڈھیر تھا یا جان توڑنے والوں کا، سلیمان کا اب دل بالکل ٹوٹ گیا، انہوں نے معافی مانگی، رحمدل بھائی نے اس شرط پر معاف کرنا منظور کیا کہ وہ اندلس سے اس طرح نکلیں کہ پھر کبھی اس طرف کا رخ نہ کریں۔ ہشام نے اُن کی جاگیر بعوض ستر ہزار مثقال سونے کے خرید لی، اور غدار شاہ برادر بخیریت تمام تنجیر[۴] چلے گئے۔ یہاں چونکہ اُن کو کسی کی دست اندازی کا خطرہ نہ رہا تھا، اس لئے ہمیشہ وہ اپنے پرانے رفقا سے نمک حرامانہ خط و کتابت کرتے رہے، اور یہ لوگ بھی اسی کے منتظر رہے کہ اگر کوئی موزوں موقعہ ملے تو اُن کی مدد کر کے تخت دلوائیں۔

(۱۱) جب یہ واقعات مغرب میں ہو رہے تھے، اور ہشام کی توجہ اپنے بھائیوں کی سازش کی طرف لگی ہوئی تھی، تو اور مقامات پر جدال و قتال ہو رہا تھا۔ امیر نے ایک شخص کو طرطوشہ[۵] کا والی مقرر کر کے بھیجا تھا، سعید ابن حسین نے، جو وہاں کے والی تھے، اُن کو والی تسلیم کرنا تو درکنار، شہر کے اندر بھی نہ گھسنے دیا۔ والی بلنسیہ[۶] کو حکم دیا گیا کہ اس نافرمان گورنر کو گرفتار کر کے

سزادیں، مگر سعید سخت مکار شخص تھا، اُس نے اُن کو کمینگاہوں میں لاکر پھنسا دیا۔ والی بلنسیہ مارے گئے، اور اُن کے ساتھیوں کو بھگا دیا گیا۔ ابن حسین کی کامیابی پر غرہ ہوکر والیان بدشلونہ، سرقسطہ (ساراگوسا) ہیوسکا (وشقہ) اور طرکونہ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، اور سب نے آپس میں امیر کے خلاف جارحانہ و مدافعانہ معاہدہ کر لیا۔ بلنسیہ کے نئے والی عثمان اپنے پیش روسے یا تو بہت ہی قابل آدمی تھے، یا بڑے خوش قسمت، کہ اُنہوں نے اس بغاوت کو بڑی آسانی سے فرو کر دیا، حالانکہ امید یہ تھی کہ یہ معاملہ بہت طول پکڑ لیگا۔ باغیوں کی تمام فوجوں کو شکست فاش ہوئی، ابو عثمان نے جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا اُن کے سر قرطبہ بھیج دیئے گئے۔ کامیاب سپہ سالار کو بادشاہ نے مبارکباد دی، اور اُن کا شکریہ ادا کیا، اور یہ حکم دیا کہ وہ پائرینیس جائیں، یہاں سے فوج بھیجی جائیگی۔ اُسکو لیکر وہ فرانس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کریں۔

امیر ہشام نے اب تک ہر ایک مہم میں کامیابی حاصل کی تھی، جس سے اُن کا دل بہت بڑھ گیا تھا۔ دوسرے وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کی رعایا کچھ اس طبیعت کی ہے کہ اُسکو ہمیشہ اور ہر وقت جنگی مشغلہ کی ضرورت رہتی ہے، اس لئے باوجود رعایا کی مخالفت کے اُنہوں نے مصلحت اس میں دیکھی کہ وہ جوش جو ابھی حال میں اُن کے خلاف ظاہر ہؤا، اور جس سے اُن کا تخت و تاج خطرہ میں پڑ گیا تھا، کسی اور طرف لگا دیں۔ علاوہ ان خیالات کے اُن کو اپنی سیاسی بلند نظری کے پورا کرنے کے لئے وجہ تحریک بھی اچھی تھی۔ اُن کے ملک کی مالی حالت اُن کے باپ کے زمانہ کی بہ نسبت بھی اچھی تھی، تجارت بڑھ گئی تھی، امن و امان پھیلا ہؤا تھا، حکومت و سلطنت کا ایک مرکز قائم ہو چکا تھا، اس لئے رعایا کو ٹیکسوں کا بار کچھ ناگوار نہ ہوتا تھا۔ چونکہ لڑائی متواتر جاری رہی تھی اس لئے بہت سے ایسے سپاہی پیدا ہو گئے تھے، جو تکالیف صبر سے برداشت کرتے تھے اور نظام فوجی سے گھبراتے تھے، اپنے بادشاہ کے فوائد کو مقدم سمجھتے تھے، اور فتح کے عادی ہو چکے تھے۔ موسیٰ کے زمانہ سے لیکر ہر ایک امیر

ایک وصیت کر جاتا، اور گویا دینی فرض قرار دے جاتا تھا کہ اُس کا جانشین اپنی حدود سلطنت
کے بڑھانے کی فکر میں رہے، کافروں سے خراج لے، اور اُن کو لڑائی سے فرصت نہ دے۔
ان جذبات بلند نظری، اور لوگوں کو مسلمان بنانے کی خواہش پر اب خیال انتقام بھی بڑھ گیا تھا،
جسکی بنا یہ تھی کہ نئی کامیابیاں حاصل کرکے زمانہ گزشتہ کی شکستوں کی بدنامی کو دھو ڈالنا ضروری
تھا، اور جو مصایب مسلمانوں پر پڑی تھیں اُن کا بدلہ اچھی طرح لینا لازمی ہو، مگر اسی میں دیر
ہوئی چلی جاتی تھی۔ ممالک محروسۂ امیر کے ہر مسجد کے منبر پر سے ایک ہی وقت میں جہاد کا اعلان
کیا گیا۔ احکام قرآنی کے موافق جب جہاد کا اعلان ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جہاں تک ہو
سکے وہ ہر طرح اس میں مدد کریں، خواہ روپیہ سے ہو، یا سامان رسد رسانی سے، یا اپنی ذات
کو پیش کر کے۔ اندلس کے تمام سپاہی منش لوگوں کے لئے جنگ دل لگی تھی۔ وہ ہزاروں
کی تعداد میں شاہی علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ چالیس ہزار کی جمعیت جلیقیہ کی طرف گئی، برمیوڈو شاہ
ایسٹریاس کو شکست دی، علاقہ بھر کو تباہ کر دیا، اور بہت سا مال غنیمت، اور ہزاروں قیدی
ساتھ لے کر واپس آ گئے۔ ایک اور دستہ پائرے نیز کی طرف گیا، اُس نے دروں پر قبضہ
کرلیا۔ خواہ بجبر، یا کچھ دے دلا کر، قوم باسک کو بالکل غیر طرفدار رکھا گیا۔ سال آیندہ میں نہایت
سرگرمی کے ساتھ سپٹی مینیا کے بازیافت کی تیاری کی گئی، جس کا دار السلطنت، ناربون، ایک
مدت تک جنوبی فرانس میں مسلمانوں کا پایہ گاہ رہ چکا تھا، قریبًا بتیس برس سے کفار کے ہاتھ
میں تھا۔ شہر گیرونا پر (جسکو فرانس والوں نے حال ہی میں لیا تھا) یک لخت حملہ کیا گیا، اسکو
لوٹا، اور وہاں کے رہنے والوں کو بے رحمی کے ساتھ ذبح کر ڈالا۔ یہ شہر جنگی ضروریات کے لئے
نہایت اہم موقعہ پر تھا، جو کوئی اس پر قابض ہوتا وہ فاتح یا مفتوح فوج کی نقل و حرکت میں
مداخلت کر سکتا تھا۔ جب اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وادی رہون کا راستہ کھلا ہوا تھا
اس مہم کے لئے یہ وقت نہایت موزوں تھا۔ شارلے مین کی توجہ جرمنی کے وحشی نمک
حراموں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ لوئی، بادشاہ اکیوٹین اس لئے اٹلی گئے ہوئے تھے کہ اپنے

بھائی پے پن کو مدد دیں، کیونکہ اُن کو لومبارڈ نے سخت تنگ کر رکھا تھا۔ ملک عملی طور سے بالکل غیر محفوظ تھا، کوئی شخص اُس کا محافظ نہ تھا، تمام فوج ہر طرف سے کھچ چکی تھی، بادشاہ کوئی تھا ہی نہیں، وہاں کے باشندے جتنے تھے وہ قریباً بتیس برس سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے، لڑائی سے سروکار نہ پڑا تھا، ہتھیار اُٹھانا نہ جانتے تھے، یا مصائبِ جنگ سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ تسرقیئن کو بہت ہی کم لڑنا پڑا، کسی نے بھی منتظم طریقہ سے مقابلہ نہیں کیا۔ اُس زمانہ وحشت میں بے رحمی اور قتل عام تو ایک معمولی بات تھی، جہاں جہاں سے وہ نکلتے تھے اپنے نشانات چھوڑ جاتے تھے۔ فتح و ظفر کو ہمرکاب لئے ہوئے اُنہوں نے فاتح فوج کو ناربون پر ریل دیا۔ شہر کی قلعہ بندی نے محاصرین کی تمام کوششوں کو بیکار کر دیا، مگر مضافات کو لے کر اُنہوں نے بالکل تباہ کر ڈالا۔

اب مسلمان کارکسون کی سڑک پر بڑھے۔ دریاء اور بیو پر ناربون کے قریب اُن کو دہاقین وغیرہ کی ایک فوج، بسرکردگی ولیم ڈیوک آف ٹولوس، ملی، جو اس امید سے آئے تھے کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کو روک لیں۔ اس بہادر کی شجاعت کو دیکھ کر اہالی کلیسا نے اُن کو قدوسیت کا درجہ عطا کیا ہوا تھا، اور اُن کے کارناموں کے بھی اُسی طرح گیت بنے ہوئے تھے جیسے کہ رولینڈ کے، مگر خونخوار بربریوں کے رسالہ کے ریلے کے سامنے اُن کی ایک پیش نہ گئی۔ ڈیوک آف ٹولوس جو فوج اپنے ساتھ لے کر آئے تھے وہ فوج کیا تھی، انفار کا ایک گروہ تھا، جسکے پاس ہتھیار بھی پورے نہ تھے، یہ بھاگتے ہی نظر آئے لیکن دوسری طرف فاتحین بھی ایک فوج کے یک لخت آجانے سے گھبرا گئے، اور ڈر کہ کہیں مال مغروقہ نہ جاتا رہے اِس لئے اُنہوں نے نہ جم کر مقابلہ کیا، نہ آگے بڑھے۔ اُس زمانہ کی تاریخ نہایت مبہم اور لاطایل ہوتی ہی ہے، اُس سے جو کچھ نتائج اغلب نکالے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ حدود فرانس کا بہت سا حصہ کئی برس تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔

اسی موقعہ پر ایک اور فوج نے بسرکردگی عبدالکریم جلیقیہ اور الیسٹریاس پر حملہ کیا، چونکہ

مقابلہ بہت ہی کم کیا گیا، اس لئے مسلمان اُس قطعہ ملک میں ہر طرف پھیل گئے فصلیں تباہ کردی گئیں، کاشتکاروں کو قتل کردیا گیا یا غلام بنا لیا گیا، اور گرجاؤں کو جلا کر راکھ کردیا گیا۔ مسلمان مال مغرونہ سے لدے ہوئے چلے آرہے تھے کہ کمینگاہوں میں پھنس گئے، اور سخت شکست کھائی۔ جتنا لوٹ کا مال تھا سب دشمنوں نے واپس لے لیا، اور بڑے بڑے افسران فوج وہیں کھیت رہے۔ اس شکست نے اُن فوائد پر پانی پھیر دیا، جو فرانس کے حملہ سے پہنچے تھے، اور عیسائیوں کی سلطنت کے قیام میں اس نے بڑی مدد دی۔

سیپٹی مینیا میں اتنا سونا، چاندی اور قیمتی مال تجارت فاتحین کے ہاتھ آیا کہ جسکی تعداد و مقدار کا اعتبار آنا مشکل ہے۔ اس کا بڑا حصہ گرجاؤں اور کلیسائی مقامات میں ملا تھا، جن کی اُس حصہ ملک میں کمی نہ تھی۔ اس مال مغرونہ کا خمس، جو بادشاہ کا حصہ تھا، بقدر پینتالیس[۴۵] ہزار اشرفیوں کے ہوا۔ یہ تمام روپیہ جامع مسجد کی تکمیل میں خرچ کیا گیا۔ مسلمانوں کے سپہ سالار عبدالملک نے اپنے غرور کے زور میں اُن بے تعداد قیدیوں سے، جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، سخت مشقت لی جو غیر معمولی بھی تھی اور سخت بھی۔ اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ پتھر، جو ناربون کے فصیل میں لگے ہوئے تھے، اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لائیں، یا اُن کو گاڑیوں میں بھر کر گھسیٹتے ہوئے پہنچائیں۔ ان ہی پتھروں کی چٹانوں سے، جو کئی سو میل کے فاصلے سے پہاڑوں کے نشیب و فراز کو قطع کر کے آدمیوں کے سروں پر آئے تھے، جامع مسجد قرطبہ کی مشرقی دیوار کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ بظاہر یہ حرکت بیکار اور ظالمانہ معلوم ہوتی ہے، عبدالملک نے بھی اسکو اپنی بہادری دکھلانے کے لئے نہیں کیا تھا، نہ اس لئے کہ اس سے بدنصیب قیدیوں کو تکلیف پہنچیگی، بلکہ اصل یہ ہے کہ یہ بات بھی مسلمانوں کے خصائل میں داخل ہے۔ یہ پتھر جنکو شاید آگسٹس کے زمانہ کے معماروں نے درست کیا ہوگا، فتح و ظفر کی نمایاں اور دیرپا نشانیاں تھیں۔ ہمسایہ سلاطین کی حدود سلطنت بڑھ گئیں یا کم ہو گئیں، زبان دین اور رسم و رواج بدل گئے، جزیرہ نماء اندلس کے آباد شہر گم ہو گئے، جہاں دلدل اور جنگل تھا وہاں نئے شہر آباد ہو گئے، زمانہ قدیم کی جنگوں کی نشانیاں اب اگر کچھ ملتی ہیں تو ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کی

شکل میں، جو کہیں کہیں سے نکل آتے ہیں، لیکن ناربون کے یہ پتھر، جو اس وجہ سے اور بھی متبرک ہو گئے ہیں کہ ان کو عیسائی قیدی بادل ناخواستہ اپنے سروں پر وہاں سے اٹھا کر لائے تھے، آج گیارہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی خداء اسلام کے ایک مشہور و معروف معبد میں نہایت فخر کے ساتھ ویسے ہی لگے ہوئے ہیں، جیسے کہ ان کو مسلمان معماروں نے نصب کیا تھا۔

اس باشان و شکوہ عمارت کی تکمیل کی طرف اب امیر ہشام کی تمامتر توجہ مبذول ہوئی۔ اپنے متقی باپ کی تقلید میں یہ بھی اس مسجد کی دیواروں پر ہر روز مزدوروں کا کام کرنے لگے۔ انہوں نے اسکی تکمیل اپنی آنکھ سے دیکھ لی۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار خرچ کرنے کے بعد امیر عبدالرحمٰن کی عزیز عمارت کو ان کے بیٹے نے مکمل کیا۔ اگرچہ ہشام کی عمارت بھی تکلف اور شان میں کچھ کم نہ تھی، تاہم ان دونوں باپ بیٹوں کی عمارت اس سے بہت ہی کمتر درجہ کی تھی جو ان کی اولاد نے اس میں حسن و لطافت اور شان و شوکت پیدا کر دی۔ امیر ہشام کے جذبات نفع رسانی خلق اللہ صرف جامع مسجد تک ہی محدود نہیں رہے؛ انہوں نے وادی الکبیر کے پل کو از سر نو بنایا، جو پھر خستہ ہو گیا تھا۔ اپنے دارالخلافہ کی روز افزوں ضروریات کے پورا کرنے، اس کو خوبصورت بنانے اور اسکے باشندوں کو آرام دینے کے لئے انہوں نے بہت سی عمارات بنائیں؛ مثلاً پر تکلف محلات، حمام، مسجدیں، حوضیں اور فوارے۔ انہوں نے لوگوں کو مضافات شہر میں میوہ دار درخت لگانے اور باغات نصب کرنے کی ترغیب دی۔ ان شائستہ کاموں سے ان کو بہت ہی دلچسپی تھی۔ ان کے خصایل و خصایص میں دین و مذہب کا جزو غالب تھا؛ گو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اپنی جاہل رعایا کے ساتھ ان میں بھی واہمہ پرستی کی کمزوری شامل تھی۔ اپنے عہد حکومت کے شروع میں انہوں نے ایک مشہور منجم کو اپنا زائچہ دکھلایا تھا، اور اس نے یہ حکم لگایا تھا کہ ان کی زندگی چند سال کی ہے مگر یہ سب نہایت ترفہ اور شہرت میں گذریگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پیشینگوئی کا ان پر بہت بڑا اثر پڑا۔ امیر ہشام کی عادات تو ہمیشہ سے نہایت متانت اور خودداری لئے ہوئے تھیں، مگر اس

پیشینگوئی کے بعد تو اُنہوں نے بہت ہی زُہد اختیار کر لیا تھا، جو ایک مسلمان بادشاہ کی ذات سے مستبعد ہے۔ انہوں نے شاہی پرتکلف قیمتی لباس کو بالکل چھوڑ دیا ، اور اکثر او وہ معمولی سادہ سفید کپڑے پہنے ہوئے پھرتے تھے، جو اُن کے خاندان کا خاص رنگ تھا۔ وہ اپنی فرصت کا تمام وقت اپنی رعایا کی شکایات سننے، مظلوموں کی دادرسی، بیکس اور مصیبت زدہ لوگوں کی غمخواری اور غربا کی امداد کرنے میں گزارتے تھے۔ ان رحم آمیز ثواب کے کاموں میں اُن کو نہ رات کی تاریکی مانع آتی تھی، نہ موسم کی سختی۔ راتوں کو وہ زہاد و عُباد کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ سخت سے سخت بارش میں بھی وہ اپنا یہ مشغلہ ناغہ نہ کرتے تھے۔ وہ ان بے خانمان لوگوں کو، جو گھروں کے نہ ہونے سے مسجدوں میں پڑے رہتے تھے، اپنے ہاتھ سے خیرات و مبرات پہنچاتے تھے۔ وہ تن تنہا شہروں کی گلیوں میں پھرا کرتے تھے، فلاکت زدہ لوگوں کے جھونپڑوں تک میں جانے سے اُن کو تامل نہ ہوتا تھا۔ جو لوگ کہ فلاکت زدہ ہوتے تھے اُن کی تسلی و دلدہی وہ بنفس نفیس کرتے تھے۔ اپنے خاندان کے وہ پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے دارالخلافہ کی حفاظت کے لئے وہیں کے باشندوں سے روپیہ وصول کر کے پولیس قائم کی تھی۔ جو زرجرمانہ مجرمین فقعِ امن سے وصول ہوتا تھا وہ خیرات کے کاموں میں صرف کیا جاتا تھا۔ ٹیکس لگانے میں بھی اُنہوں نے اپنی تمام رعایا کو اپنا ممنون بنا لیا تھا، کیونکہ صرف ایک عُشر جو بروء شرع جایز ہے تمام لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اُنکی پدرانہ شفقت تھی کہ جتنے سپاہی جنگوں میں کام آتے تھے اُن کی بیواؤں اور یتیموں کو وظایف دیتے تھے۔ جتنے مسلمان قید ہوتے تھے اُن کا زرفدیہ وہ صرف خاص سے ادا کرتے تھے۔ اس خصوص میں اُنکی تحقیقات اور اُن کی کوششیں اتنی بار آور ہوئی تھیں کہ ایک مرتبہ ایک دولتمند شخص ایک بیش قرار رقم بدیں وصیت چھوڑ مرا تھا کہ اُس سے اُن قیدیوں کا زرفدیہ ادا کیا جائے جو عیسائیوں کے یہاں گرفتار ہوں۔ مگر یہ تمام و کمال روپیہ موصی کے وارثوں کو لوٹا دیا گیا، کیونکہ ایسا کوئی قیدی نہیں پایا گیا۔ اُن کا عدل و انصاف اُن کے خصوصیات میں داخل تھا۔ وہ ایک مکان خریدنا

چاہتے تھے اور اُسکے لئے مالک سے گفتگو ہو رہی تھی کہ اُن کو یہ معلوم ہُوا کہ اُس مکان کا ہمسایہ اُسکو لینا چاہتا ہے مگر اب بادشاہ کی خاطر اور لحاظ سے وہ اسکو نہ خریدیگا۔ یہ سُن کر انہوں نے اُس مکان کے خریدنے سے انکار کر دیا اور اُسی شخص کو خریدنے دیا۔ پیچیدہ اور مشتبہ معاملات سلطنت میں امیر ہشام نے اپنے والد کے انتخاب کو بہت درست اور صحیح ثابت کر دکھایا اور رعایا کو یہ دکھلا دیا کہ امیر عبدالرحمٰن کا بڑے بیٹوں کو سلطنت سے محروم کرنا بہت ہی بجا تھا اُن کی جرأت اور استقلال سے تمام دشمن اُن سے ڈرتے اور اُن کا ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنی طرف سے خاص آدمیوں کو والیان صوبجات کی عدالتوں کو دیکھنے اُن کی کارروائیوں کو پتا لینے کی غرض سے بھیجتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ لوگوں کی شکایات کو سنیں اور اُن کی دادرسی کریں۔ آسائش عامہ کے لئے عمارات بنوانے میں جو فیاضی انہوں نے دکھلائی اُس سے شہر کے اور دولتمندوں کو بھی تشویق ہوئی۔ وہ اپنے مکانات کو خوبصورت اپنے خانہ باغوں کو پُر تکلف بنانے میں ایک دوسرے سے فوقیت لے جانے لگے۔ سائینس اور علم ادب کی اشاعت کا خیال انہوں نے اپنے والد سے میراث میں پایا تھا۔ اُن کی یہ رائے تھی کہ علوم و فنون سے جو دائمی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ اُن مادی خوشیوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں جنکی عمر چند لمحہ یا چند روز کی ہوتی ہے۔ منجم کی پیشینگوئی یہ تھی کہ اُن کی مدت سلطنت آٹھ برس کی ہوگی۔ اس سے اُن کے اخلاق و عادات پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اُن کا دل و دماغ پہلے ہی اخلاق حسنہ اور دین کی طرف مایل تھا۔ اب تو ہر اُس چیز کا جو دین سے تعلق رکھتی ہے وہ بدرجۂ اتم احترام کرنے لگے۔ کچھ اس وجہ سے کہ اُن کی رعایا مختلف النوع تھی کچھ اس خیال سے کہ پُرانی دشمنیوں کی آگ بُجھے مگر بالخصوص اس لئے کہ آیندہ لوگوں کو مسلمان کرنے میں آسانی پیدا ہو انہوں نے یہودی اور عیسائی مدارس میں زبان عربی کو لازمی قرار دیا۔ اس تدبیر سے اگرچہ ذمیوں کے متعلق جو احکام قرآنی ہیں اُن کی خلاف ورزی تو ضرور ہوئی مگر اُن کا جوش اشاعت اسلام تو پورا ہو گیا۔ یہ ایک اہم سیاسی تدبیر تھی جس سے

امیر ہشام نے نادانستہ طور پر چند ہی سال کے عرصہ میں ایک سیاسی اور تمدنی انقلاب پیدا کر دیا؛ اگر یہ تدبیر نہ کی جاتی اور معمولی حوادث پر اس اصلاح کو محول رکھا جاتا تو اس کی تکمیل کے لئے کئی نسلیں بھی گزر جاتیں پھر بھی اتنا نہ کر سکتیں۔ جو قوم اپنی زبان کو چھوڑ کر کسی غیر قوم کی اور غیر مانوس زبان استعمال کریگی وہ یقیناً اپنی ہستی کو گم کر دیگی۔ معاملات و مراسم مذہبی کی پابندی سے جو تمدنی تفریق پیدا ہوتی ہے وہ بھی اتنی گہری اور دائمی نہیں ہوتی جتنی کہ زبان کی تبدیلی۔ فاتحین کی زبان جب مفتوحین کو بجبر استعمال کرنی پڑی تو اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفتوحین اپنے فاتحین کے مذہب، خصوصیات اور آراء سے روز بروز واقف ہوتے چلے گئے۔ ناواقفیت کی وجہ سے جو تعصب ان لوگوں کو اپنے آقاؤں سے پیدا ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوا؛ ضروریات تجارت، اخلاق و آداب اور اختلاط سے بالکل ہی ختم ہو گیا۔ عیسائیوں میں مسلمانوں کا احترام پیدا ہو گیا؛ اور مسلمانوں کے دلوں سے عیسائیوں کی تحقیر رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی؛ ایک دوسرے کی خوبیوں کی قدر کرنے لگے، آپس میں رعایتیں ہونے لگیں، ہر قسم کی آسانیاں پیدا ہو جانے سے تعلقات تجارت بڑھ گئے، آپس میں شادیاں ہونے لگیں اور اختلاط اور دوستی بڑھ گئی؛ جس کا اثر بہت دیرپا ہوا۔ پہلے کوئی عیسائی شاذ و نادر ہی مسلمان ہوتا تھا، اور جب ہوتا تھا تو ایک شور مچ جاتا تھا؛ مگر اب اتنے عیسائی مسلمان ہونے لگے کہ کوئی اُس کا ذکر بھی نہ کرتا تھا۔ گاتھک لباس کی جگہ عمامہ باندھے اور ایشیا کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے جانے لگے۔ اُمرا اور دولتمندوں کے حرموں میں اُن خواتین کا دور دورہ ہو گیا جو ٹیوٹانک اور رومی خاندانوں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اُن کی عادات بھی بادیہ نشینوں سے بہت ملتی جلتی تھیں، اُن کے گرد و پیش جتنی چیزیں اس وقت تھیں اُن کو اُن کے بزرگوں کی روایات

× اگر کہیں اس پر غیر ملکی قوم کا لباس اور رسم و رواج بھی پھیل گیا تو پھر ہلاکت یقینی۔ اندلس میں یہی ہوا اور ہندوستان میں بھی ہو رہا ہے مگر وہاں عیسائیوں کی عقل و ہوش اور اُٹھتی جوانی نے اس زہر کا تریاق پیدا کر لیا، مگر اندیشہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی غفلت و انحطاط کوئی علاج نہ سوچنے دیگی۔ ہل انتم منتھون ٭ (مترجم)

یا اُن کی بچپن کی یادگاروں سے ذرا سا بھی لگاؤ نہ تھا، مگر باوجود اس کے ان سے جو بچے پیدا ہوئے وہ سوا عربی کے اور کوئی زبان نہ جانتے تھے۔ امیر ہشام نے ان عاقلانہ احکام کے یہ نتائج ہوئے کہ انہوں نے تین قوموں کو متفق و متحد کر دیا، ان کی اولادوں کو گویا اپنا بنا لیا اس کے آثار اس وقت تک شمالی اندلس کے وہاقین کی حلقی لہجہ، سانولی رنگت خود دارانہ فتار و گفتار اور اپنی عزت کے تحفظ میں نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ دارالخلافہ کے نزدیک رہنے والے تھے اس واسطے ان پر دربار شاہی کے احکام کے اثرات زیادہ ہوتے تھے سب سے پہلے وہی اُن احکام کی تعمیل کرتے تھے اور اُن کے رسم و رواج بھی اپنے آقاؤں سے زیادہ ملتے چلے جاتے تھے۔

جزیرہ نمائے اندلس کے آیندہ امن و امان کے لئے یہ امر سخت مضر ہوا کہ امیر ہشام علماء دین کے بڑے معتقد بن گئے×۔ اُن کے مصاحبین خاص زیادہ تر فقہا ہوتے تھے جو شارح احادیث نبوی (علے صاحبہا التسلیم) اور ترجمان اصول قانون شرع ہوتے ہیں امیر عبدالرحمن کی سخت پالیسی کی وجہ سے یہ لوگ کس مپرسی کی حالت میں تھے، مگر اُن کے جانشین کے زمانہ میں یہ بدشگونی ہوئی کہ اُن کو یک لخت نمود حاصل ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام میں جوش دینی اور کشمکش مذہبی کا زور تھا۔ ہر جگہ نئے نئے مذاہب و مسالک پیدا ہو رہے تھے، جن سے اہل سیاست کو بھی اُتنا ہی تعلق خاطر تھا جتنا کہ علماء دین کو ان میں سے ایک مذہب نے بہت فروغ پایا تھا، جو مسلمانوں کے چار مذاہب میں سے ایک بننے والا تھا، اور حال ہی میں مدینہ میں قائم ہوا تھا اور اس کے مجتہد مالک ابن انس تھے جنکو مدینہ میں بڑا فروغ حاصل ہوا تھا (رحمہ اللہ) ان مجتہد مدینہ اور بادشاہ اندلس کے درمیان میں اتحاد

× یہ یاد رہے کہ مصنف علام کا یہ اعتقاد ہے کہ جس سلطنت میں علماء دین کا جتنا اقتدار بڑھتا ہے، خواہ عیسائی ہوں یا مسلمان سلطنت اور رعایا کے لئے اُتنا ہی سخت مضر ہوتا ہے۔ مصنف علام اس میں علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کے ہم خیال ہیں جن کا قول ہے کہ "العلماءُ ابعدُ عن السیاسۃ" (مترجم)

واتفاق ہوگیا، جسکی بنا تو اصل یہ تھی کہ یہ دونوں ایک ہی فرقہ یا خاندان کے دشمن تھے۔ باوجود اس کے کہ ابن انس اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے ہر طرح قابل تعظیم تھے، مگر بنو عباس کو یہ شبہ ہوگیا تھا کہ وہ شیعوں کو برانگیختہ کرکے، یا اُن کی حمایت کرکے، اولاد علی (رضی اللہ تعالے عنہ) کو تخت خلافت دلوانا، اور بنو عباس کو تاج خلافت سے محروم کرانا چاہتے ہیں۔ نہ معلوم کافی شہادت نہ ملنے، یا بغاوت کے خوف سے، خلیفہ بغداد نے اُن کو قتل تو نہ کرایا، مگر اُن کو سزاء تازیانہ دی۔ حجاز کے جو شیلے دینداروں نے اُن کو ذلیل کیا، اور اس زور سے دُرّے لگائے کہ ہر شخص کانپ گیا۔ مالک جانتے تھے کہ اُن کا اثر و اقتدار بہت بڑھا ہُوا تھا، اور عباسیوں کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ اُن کے دل میں بھڑک رہی تھی، مگر اس واجب التعظیم بزرگ نے شہیدوں کی طرح یہ سب سختی سہی، اور راضی بقضاء الٰہی کے بہانہ سے اپنی نفرت کو چھپائے رہے۔ اپنے ستانے والوں سے نفرت کا یہ نتیجہ ہُوا کہ اُنھوں نے بنو اُمیہ کو اپنا پشت پناہ بنایا، کیونکہ اس خاندان کے افراد نے بھی خلفاء بغداد کے ہاتھوں وہی مصیبتیں سہی تھیں جو خود اُن پر پڑیں۔ امیر ہشام کی کریم النفسی سے حرمین شریفین کے لوگ واقف تھے۔ مجتہد مدینہ کو شاید امیر ہشام اس لئے زیادہ پسند آئے کہ وہ اپنی پچھلی ذلت سے فائدہ اٹھانا، اور ان کے دشمنوں کو ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ امام موصوف ہر موقعہ پر امیر کی تعریفیں کرتے تھے، اور علانیہ یہ کہتے تھے صرف اُن ہی میں جو ہر شامی ہے اور کسی میں نہیں! اس معاملہ میں انہوں نے یہاں تک غلو کیا کہ بھرے مجمعوں میں یہ کہہ دیا کہ دنیا بھر کے مسلمان بادشاہوں میں اگر کوئی شخص عزت خلافت کا مستحق ہے تو وہ امیر ہشام ہیں۔ دوسری طرف امیر اُن کا بے حد احترام کرتے تھے، اُن کے اجتہاد اور فتاوے کی تقلید کرتے تھے، ہر ذریعہ سے جو انسان کے امکان میں ہے، انھوں نے یہ کوشش کی کہ اُن کے تمام ملک محروسہ کے لوگ اُن ہی کے مقلد ہوجائیں۔ جن لوگوں کو اُن کے مزاج میں زیادہ درخور تھا وہ مالکی ہی تھے۔ یہی لوگ بڑے بڑے دینی و دنیاوی عہدوں پر سرفراز تھے۔ فوج میں بھی ان ہی کو افسر بنایا جاتا تھا۔

جو لوگ کہ امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے علم سے مستفیض ہونا چاہتے تھے۔ اُن کو امیر ہشام ہر طرح کی امداد دیتے اور آسانیاں بہم پہنچاتے تھے۔ جب یہ وہاں سے واپس آتے تو اُن کی خاص عزت و حرمت کیجاتی۔ امیر کی اس غیر سیاسیانہ یک رخی کا نتیجہ یہ ہؤا کہ معاملات سلطنت میں مالکیوں کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا اور انہوں نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اس مذہب کے چند بلند نظر اور فہیم فقہا تھے، جن کی آراء جہال رعایا اس طرح مانتے تھے کہ گویا الہامی ہیں۔ وہ اپنے جوش مذہبی کو رعب جمانے کا نہایت اچھا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کسی بربری یا عرب نے اس مذہب کو جوش و خروش سے قبول نہیں کیا؛ اُس کے سب سے بڑے حامی نومسلم عیسائی تھے؛ یا اُن کی اور غلاموں کی اولاد۔ یہ بے پروا نومسلم کسی خاص شخص کے مذہب کی چنداں پابندی کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہ لوگ پر آشوب زمانہ میں پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے آنکھ کھول کر سوا اختلال اور انقلاب کے کچھ نہ دیکھا تھا۔ اُن کی بے چین طبیعت اور سادگی کے لئے نئے مذہب کے گرم مباحث، اور میدان جنگ کی گرما گرمی، ایک ہی چیز تھی۔ سرکردگان مذہب جدیدہ کے درمیان میں ہمدردی تھی، اور بلند نظرانہ عزموں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک ہی جگہ رہیں، تاکہ کسی خاص موقعہ سازش پردہ ایک دوسرے کے مددگار ہو سکیں۔ مضافات قرطبہ میں ایک محلہ تھا، جسکو وادی الکبیر نے شہر سے الگ کر رکھا تھا۔ یہ مقام دار الخلافہ کا نہایت دلکش اور خوشنما مقام تھا۔ اس کی آبادی بیس ہزار نفوس سے زیادہ تھی۔ اُسکے بازاروں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں تجارت خوب نفع بخش ہوتی ہے۔ اُسکے دروازوں میں سے اُن اجناس کا زیادہ حصہ گزرتا تھا جو دار الخلافہ کے باشندوں کے خرچ میں آتی تھیں۔ ان اجناس کا بیشتر حصہ مشرقی صوبوں سے آتا تھا، اور بازاروں میں اُس پل پر سے گزرتا تھا، جس کو قیاصرہ نے بنایا تھا، اور جس میں امیر سمح اور ہشام نے ترمیم کی تھی۔ یہاں وادی الکبیر کا بایاں کنارہ مسطح تھا، جس سے پل بنانے میں آسانی ہوگئی۔ مغرب اور شمال کی طرف نشیب فراز زیادہ تھا۔ بہ نسبت اور محلوں کے یہاں کے کوچے وسیع تھے؛ بازاروں میں جگہ زیادہ تھی؛ مساجد شاندار

اور پرتکلف تھیں۔ اُسکے گرد ایک باغ تھا، جس کی روشوں پر سنگ موسا وغیرہ کی پچی کاری تھی، اور بے تعداد فوارے ہوا کو ٹھنڈا کرتے تھے، اسی کے سبزہ زار میں اُمرا کے بنگلے تھے۔ اسی مقام کو مالکیوں نے اپنا ملجا و ماوا بنایا ہوا تھا۔ ان کے علماء کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ہمت اپنے معتقدین کو اس دن کے لئے تیار کر رہی تھی کہ جس روز وہ مصیبت آئی کہ جو ناقابل بیان ہے۔

امیر ہشام کے زائچہ کو دیکھ کر منجم نے آٹھ برس کی میعاد بتلائی تھی۔ باوجود اپنی عقل و فہم کے وہ اتنے قوی دل نہ تھے کہ وہ اس پیشینگوئی پر اعتبار نہ کرتے کہ جبکی ایک واہمہ پرست قوم ویسی ہی معتقد تھی جیسے کہ پرانے زمانہ کے لوگ قضاؤں کے۔ وہ دینی خوبیوں کے مجسم نمونہ تھے، انہوں نے اپنی عادت اس طرح ڈال لی تھی کہ وہ اپنی تقدیر پر پوری طرح متوکل تھے، رضاء الٰہی پر پوری طرح راضی تھے، وہ ہر وقت مرنے پر تیار رہتے تھے، اگرچہ اس کا اثر ان کے آئندہ ارادوں پر بہت بڑا پڑا، مگر اُن کی صلاحیت مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب اُس پیشینگوئی کے پورے ہونے کا وقت قریب آگیا تو انہوں نے اپنے تمام محروسہ سے بڑے بڑے آدمیوں کو بلا کر ایک مجلس شورٰے قائم کی، اور سب کو حکم دیا کہ وہ اُن کے بیٹے 'الحکم' سے بیعت کریں جب یہ رسم ادا ہو چکی تو امیر نے بڑے لیعہد کو مخاطب کر کے کہا کہ :-

"عدل و انصاف کرنے میں امیر اور غریب کا امتیاز نہ کرنا۔ جو لوگ کہ تمہارے دست نگر ہیں اُن سے بلطف و رفق پیش آنا، کیونکہ سب لوگ خداء تعالےٰ کی مخلوق ہیں۔ اپنے صوبوں اور شہروں کی حفاظت نمک حلال اور تجربہ کار لوگوں پر چھوڑنا۔ تمہارے حکام جو رعایا کو تنگ کریں اُن کو بے رحم ہو کر سزا دینا۔ اپنے سپاہیوں پر اعتدال اور استقلال سے حکومت کرنا۔ یہ یاد رکھنا کہ اُن کو ہتھیار اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ ملک کی حفاظت کریں، نہ اس واسطے کہ ملک کو تباہ کر ڈالیں خبردار! اُن کو تنخواہیں وقت پر دیتے رہنا۔ اور اُن سے جو وعدے کرو وہ پورے کرنا۔ ہمیشہ اس کوشش میں رہنا کہ تمہاری رعایا تمہاری گرویدہ رہے کیونکہ اُن کی محبت ہی سے سلطنت کا قیام و دوام ہے، اگر وہ تمسے ڈرینگے تو تمہارے لئے خطرناک ہونگے، اور اگر وہ تمسے نفرت کرینگے تو

یاد رکھو کہ یہی تمہاری بربادی کا باعث ہوگا۔ اُن لوگوں کی حمایت و حفاظت کرنا کہ جو کاشتکار کہلاتے ہیں اور ہمارے لئے روٹی مہیا کرتے ہیں خبردار اُن کی فصلیں خراب نہ ہونے پائیں اور اُن کے جنگل اور چراگاہیں تباہ نہ ہوجائیں۔ ہر بات میں ایسا طرزِ عمل رکھنا کہ تمہاری رعایا تمہیں دعائیں دے اور تمہارے زیرِ سایہ خوشی و خرمی سے اپنی عمریں گذارے؛ یہی اور صرف یہی طریقہ ہے جس سے تمہاری نیک نامی ہوگی اور تمہارا نام شاندار بادشاہوں کی فہرست میں آجائیگا۔"

الفاظ مندرجہ بالا سے امیر ہشام کی نیکی اور عاقبت اندیشی اُس سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ اُن کی شان میں ہزاروں قصاید لکھے جائیں۔

دوسرے ہی موسم بہار میں امیر ہشام نے تھوڑی سی علالت کے بعد چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اُن کے عہدِ دولت میں کوئی بڑی فوجی مہم نہیں ہوئی؛ نہ کوئی ایسے کام ہوئے کہ جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اُن میں معمولی قابلیت سے کچھ زیادہ سیاسی جوہر ہیں۔ گو اُن کا زمانہ کچھ بہت درخشندہ نہ تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ نہایت کامیاب تھا۔ اُنہوں نے الیسٹریاس کے لوگوں کے حملوں کی روک تھام کی؛ اُنہوں نے یورپ کے نہایت مشہور اور طاقتور بادشاہوں پر بے دھڑک حملے کئے۔ بہت سے جان باز قسمت آزما لوگوں نے کئی بار اُن کے تخت و تاج چھین لینے کی کوشش کی مگر اُنہوں نے ہمیشہ اُن کو ناکام ہی رکھا۔ اُن کی رحمدلی کا اعتراف اور تعریفیں اُن کے دشمنوں نے کیں؛ اپنے باغی بھائیوں سے جو فیاضانہ سلوک اُنہوں نے کیا اُس سے اُن کے دوست اُن کے گردیدہ ہوگئے۔ کوئی بدنصیب شکستہ حال ایسا نہ تھا کہ جس کی دستگیری کرنے میں اُنہوں نے شرم کی ہو؛ کوئی محتاج ایسا نہ تھا کہ جس کی اُنہوں نے خبرگیری نہ کی ہو۔ اُنہوں نے ایسے ایسے قوانین وضع کئے کہ جنہوں نے اُن تمدنی اور سیاسی موانع کو توڑ دیا کہ جو دو قوموں کے درمیان میں سنگلاخ حدِ فاصل

× اور زبان عربی کا لازمی قرار دینا۔ (مترجم)

بنے ہوئے تھے، اور جن کی وجہ سے اُن کے ملک کی صلاح و فلاح میں خلل آ رہا تھا۔ اُنھوں نے اپنے اثر اور اپنی مثال سے اشاعت علوم و فنون کو بہت مدد دی۔ اُن کی موت پر جو رنج واندوہ اُن کی رعایا نے ظاہر کیا وہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ہر شخص کو اُن کے خصائل و خصائص سے خالص محبت تھی۔

رعایاء امارت اندلس کو اب یہ فکر لگا کہ دیکھئے امیر جدید کا پہلا سیاسی و انتظامی کام کیا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امیر حکم کی قابلیت میں کسی کو شبہ نہ تھا۔ اُن کی سپاہیانہ لیاقت کا اُس وقت امتحان ہو چکا تھا کہ جب وہ لڑکے ہی سے تھے، اور اُنھوں نے تھوڑی ہی سی فوج لیکر اپنے چچا کی بہت بڑی جمعیت سے میدان لورقہ میں مقابلہ کیا تھا، اور اُن کو شکست فاش دی تھی۔ امیر ہشام کی عاقبت اندیشی اور دوربینی ایسی تھی کہ جیسی الہامی ہوتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے خاندان کی رسم کے موافق اپنے بیٹے حکم کو شروع ہی سے اس طرح تعلیم و تربیت کیا تھا کہ وہ بڑے ہو کر بارِ سلطنت سنبھال سکیں وہ اُن کو ابتداء ہی سے بڑے بڑے اہم امور پر تعینات کرتے رہے تھے۔ اُن کو اُس زمانہ کے بہترین علماء سے تعلیم دلوائی تھی، اور حکم نے بھی اپنے آپکو قابل ترین اور ذہین طالبعلم ثابت کر دیا تھا۔ اتفاقی مگر اہم خوبی یہ تھی کہ وہ خوبصورت آدمی تھے، نہ اُن میں رعب و داب کی کمی تھی، حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب بنو امیہ کے یہ خوش نصیب بادشاہ ہر طرح اس قابل تھے کہ اُن کے جانشین بن سکیں۔ باوجود اسکے کہ اُن کی تربیت کھلے دربار شاہی میں ہوئی، اور کاروبار سلطنت وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتے کراتے رہے مگر امیر حکم کے مزاج اور اُن کی آراء سے لوگ بالکل واقف نہ تھے۔ عبادت کے ساتھ مجہولیت، اور سب سے الگ تھلگ اور خاموش رہنے نے اُن کے مزاج اور طبیعت کے اُفتاد پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ اُن کو اپنے آپ پر اتنا ضبط تھا کہ بے تکلف اور رازدان دوستوں کی صحبت میں بھی اُن کے دل کی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنے خصائل کو ہزار پردوں میں چھپائیں مگر یہ تو کسی طرح نہ چھپ سکتا تھا کہ وہ زود رنج مغرور،

لاف زنی اور بے رحم تھے۔ واقعات آئندہ نے یہ ثابت کر دیا کہ غایر نظر لوگوں کے اندیشے بیجا نہ تھے جو ان کی تخت نشینی کو گھبراہٹ کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان پر اعتماد نہ کرتے تھے +
بنو امیہ کے یہاں یہ رسم تھی کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو وہ اپنے پیشرو کے حاجب کو بدل کر اپنا ہی منتخب کردہ حاجب رکھتا تھا۔ اس عہدہ کے فرائض و اختیارات زمانۂ حال کے وزیر اعظم کے برابر ہوتے تھے اس سے بڑا کوئی عہدہ دار نہیں ہوتا تھا اس اہم عہدہ پر امیر حکم نے عبد الکریم ابن ابی الولید کو منتخب کیا۔ ان کے والد ابو الولید اُن کے والد امیر ہشام کے حاجب تھے، عبد الکریم مشہور بہادر اور عالم تھے ان میں اُس زمانہ کے تمام فضائل و کمالات موجود تھے، وہ بچپن ہی سے امیر حکم کے ساتھ رہے اور اُن کے ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے یہ انتخاب لوگوں کو بہت ہی پسند آیا، اور اسکو آئندہ کے لئے نیک فالی سمجھا گیا۔ اُن لوگوں کے اندیشے بھی کچھ کم ہو گئے جن کو نوجوان بادشاہ کے خیالات اور قابلیت سے بوجہہ اُن کے جذبات شباب کے ڈر لگا ہوا تھا۔ یہ خوف بجا بھی تھا؛ کیونکہ شباب وہ چیز ہے کہ اگر اس کے ساتھ مطلق العنانی بھی مل جائے تو پھر اسکے جذبات کو اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو خوف خدا اور اخلاق کریمہ۔ امیر حکم کی سیاسی قابلیت اور سپہ سالاری کی لیاقت بہت جلد بر سر امتحان آنے والی تھی؛ کیونکہ اُن کو فوراً ہی ایک بہت ہی اندیشناک بغاوت کو فرو کرنا پڑا؛ جو تمہید تھی سخت آشوب کی اور سرآغاز افکار سلطنت کی۔ اُن کے چچا سلیمان بحالت جلاوطنی اطمینان کے ساتھ تنجیر میں بیٹھے بیٹھے تاج و تخت اندلس کے لئے ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے تخت و تاج اندلس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اُن کی شاہزادگی اُن کی بے انتہا دولت اور اُن کے حلم و مروت کی وجہ سے سینکڑوں قسمت آزما اور قزاق اُن کے مطیع ہو رہے تھے؛ جو سب تنجیر میں رہتے تھے اور اسکے مضافات کو لوٹتے کھسوٹتے پھرتے تھے بہت و لخوش کن عدوں اور جنگ کی امیدوں سے اُن میں جوش اور شوق پیدا ہو گیا تھا؛ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اُن کی خدمات کا سب

---

*! مقابلہ کیجئے چند فقرات ماقبل سے ۔ مترجم

بڑا معاوضہ اور انعام یہ ملنے والا تھا کہ ان کو بے تعداد دولت اور بے حد اختیارات حاصل ہو جائینگے سلیمان کے روپیہ نے بہت سے غیر قانع عمّال، اور بیشتر سرکردگان بر ابرہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ وقت، جس کا ان سازش کنندوں کو انتظار تھا، اب آ گیا۔ عبداللہ خفیہ طور پر اپنی طلیطلہ کی جاگیر سے بھاگ کر اپنے بھائی کے پاس تیجیر آ گئے۔ اس بغاوت کے جزئیات تک فیصلہ پا گئے، اور کامیابی کے تمام ذرائع استعمال کئے گئے۔ عبداللہ نے بہت عجلت کیساتھ تیجیر سے لے لاشاپل کا سفر کیا۔ اس سفارت کا حال اب تک نہ کھلا، مگر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ انہوں نے شارلیمین سے امداد مانگی، اور پائی، والیان برشلونہ اور وشقہ سے امداد کا حتمی وعدہ لیا گیا۔ بادشاہ ایکیوٹین مسلمان شاہزادے کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ امن پا پرینیس تک پہنچا گئے۔ اور سلیمان پھر غداروں کے گروہ اور پرانے وزیکا تھک دارالسلطنت (طلیطلہ) میں آ گئے۔ سرکردگان بغاوت نے تمام تدابیر بہت خوب کی تھیں ادھر تو طلیطلہ کا قلعہ وہاں کے گورنر کی نمک حرامی کی وجہ سے عبداللہ کے ہاتھ آیا، ادھر سلیمان فوج لے کر بلنسیہ پہنچے اور اپنے آبائی خاندان امیہ میں سب سے حق بتلا کر اپنے امیر اندلس ہونے کا اعلان کر دیا۔ امیر حکم عبداللہ کی بغاوت کا حال سنکر ایک چیدہ فوج لے کر طلیطلہ پہنچے اور اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ابھی وہ صف بندی بھی پوری طرح نہ کرنے پائے تھے کہ یہ خبر پہنچی کہ لوئی، بادشاہ ایکیوٹین نے گیرونا لے لیا جو کوہ پا پرینیس کی کنجی تھا، اور والیان لیریڈا (لاردہ)(۹) اور وشقہ کی نمک حرامانہ امداد سے شمالی و مغربی صوبجات کو روندڈالا ہے۔ شارلیمین رونسس وال کے قتل عام کا بدلہ لینا اور اپنی حدود سلطنت کو بڑھانا چاہتا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو جنگ آزمودہ ڈینیوب اور رہائن کے کار آزمودہ افسروں کی ماتحتی میں ایک چیدہ فوج لیکر بھیج دیا۔ امیر حکم نے بہت صحیح اندازہ لگایا کہ موجودہ حالت نہایت اندیشناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے، نیز یہ کہ اس نئے دشمن کو ان لوگوں سے جو ان کی سلطنت میں اختلال پیدا کرنا چاہتے ہیں، ملنے دینا تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ اس بناء پر انہوں نے فوراً

طلیطلہ کے محاصرہ کو اٹھا لیا اور بیلغار وادی ایبرو میں پہنچ گئے لیکن اہالی فرانس پہلے ہی وہاں سے چلے آئے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا اُسکی تفصیل کسی تاریخ میں نہیں ملتی، اس لئے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس فرار کا محرک کیا ہوا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس شان و شوکت سے اس مہم کا سامان مکمل کیا گیا تھا وہ آرزو پوری نہ ہوئی اور کامیابی کی کوئی امید نہیں نظر آئی اسلئے فرار ہی میں خیریت معلوم ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی یہ فاتحین سکین اور جوان مردان بائے ڈس اور ناربون آن روع پائیرینیس پہنچے ہیں اُنہوں نے اتنی احتیاط کی کہ جو بزدلی کی حد تک پہنچتی ہے۔

امیر حکم کے پہنچنے سے اُن کی رعایا کے خوابیدہ جوش نے کروٹ لی گیروند[10] (جیرونہ)، وشقہ اور لاردہ پھر لے لیے گئے۔ بارسلونا کے دغاباز و عیار عامل زید نے اپنے آپ کو شارلیمین کی حمایت میں دیدیا تھا اور اُس کے بیٹے کی اطاعت قبول کر لی تھی مگر اہالی فرانس کو شہر میں نہ گھسنے دیا تھا۔ اپنے بادشاہ کی آمد پر نہایت اطمینان اور اظہار مسرت کے ساتھ شہر کے دروازے کھول دیئے۔

امیر حکم نے اپنی بالغ خردی کے ساتھ اپنی جمعیت کی امداد سے چند ہی روز میں وہ علاقہ لے لیا جسکو فرانس والوں نے روند ڈالا تھا۔ وہ اپنی سپاہیانہ قوت بازو سے پائرینیس کے پار پہنچ گئے مگر کسی کو اُن کے مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ ناربون کو از سر نو فتح کیا، وہاں کی فوج محافظ کو قتل کر ڈالا، اور رعایا کو قید کر لائے۔ امیر بہت سا مال مغرورتہ لئے ہوئے سالماً و غانماً واپس ہوگئے اور اپنے معتمد الیون یعنی عبدالکریم اور ابن سلیمان کو سرحد کی حفاظت پر چھوڑ کر بہت بڑی فوج کے ساتھ جو اُن کی شہرت کامیابی اور لوٹ کھسوٹ کی امید پر دوگنی اور رات چوگنی ہوتی چلی جاتی تھی، وہ طلیطلہ کی طرف لوٹے۔ اس اثناء میں سلیمان کنارۂ دریائے ٹیگس پر عبداللہ سے آملے۔ یہاں جوان دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا تو اُس میں کچھ تذبذب تھا، کچھ سستی اور کاہلی کیونکہ بجائے اسکے کہ وہ یک لخت حملہ کر دیتے جس سے امیر حکم کی مشکلات بڑھ جاتیں، اور کچھ عجب نہ تھا کہ بساط جنگ

پلٹ جاتی، وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، اور اہالی فرانس سے جو لڑائی ہو رہی تھی اُسکے نتیجہ کا انتظار
کرتے رہے۔ آخر جب امیر اُن کے کلّہ پر آ گئے تو وہ خواب خرگوش سے بیدار ہوئے۔ اب وہ ڈرے
کہ مبادا وحشیوں اور شریر النفس لوگوں کی غیر قواعد دان فوج ایک قواعد دان، منظم اور کار آزمودہ
فوج کا، جس کے سر پر خود بادشاہ موجود تھا، مقابلہ نہ کر سکے۔ چنانچہ دو تین ہی مختصر حملوں کے بعد
انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تاب مقاومت نہ لا سکینگے؛ اس لئے دونوں باغی بھائیوں نے عبیدہ ابن حمزہ
کو طلیطلہ میں فوجی افسر بنا کر چھوڑا اور خود وہاں سے چلتے بنے۔ یہ عبیدہ اُن کے نہایت معتمد علیہ
تھے۔ امیر سے نمک حرامی کر کے انہوں نے طلیطلہ ان دونوں بھائیوں کے حوالہ کر دیا تھا، اور ان کو
بطور انعام ان دونوں نے اپنی طرف سے وہاں کا عامل مقرر کر دیا تھا۔ یہاں امیر عبدالرحمن مرحوم کے نام
تک کی عظمت ہوتی تھی، اور عبداللہ خود بھی ہر دلعزیز تھے؛ اس لئے دونوں بھائیوں کو ایک گونہ اطمینان
حاصل ہو گیا، اور اُن کی قوت بھی کچھ مجتمع ہو گئی۔ امیر حکم نے اپنے معتمد افسر عمرو کو طلیطلہ کے محاصرہ پر
تعینات کیا، خود باغیوں کے تلاش میں روانہ ہوئے، اور یہ چاہا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس فتنہ و فساد
کا بہت جلد خاتمہ کر دیں لیکن اس مرتبہ پھر باغیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ کوہستان کی
طرف بھاگ گئے، جو نسبتاً بہت محفوظ تھا اور اندلس والوں کے سوار وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے
کشش و کوشش نے کئی ماہ کا طول پکڑا۔ امیر کی فوج بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرا گئی اور سپاہیوں کے
فرار ہونے سے تعداد میں کمی آ گئی۔ آخر کار جب باغیوں نے دیکھا کہ اُن کا سامان رسد ختم ہوا جاتا
ہے تو باہر نکلے۔ مرسیہ کے میدان میں، اُس مقام کے قریب جہاں کچھ عرصہ پہلے حکم کے سر پر
جوانمردی کا سہرا بندھا تھا، اور انہوں نے موجودہ دو دشمنوں میں سے ایک پر فتح پائی تھی،
ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ پہلے تو نتیجہ کچھ مشتبہ رہا، کیونکہ باغی بے جگر ہو کر مقابلہ کر رہے تھے
لیکن جب سلیمان کے گلے میں تیر کا ایک زخم کاری آیا اور وہ انتقال کر گئے، تو اُن کی فوج کے
بھی پیر اُکھڑ گئے۔ اب جو میدان جنگ مذبح بنا ہے تو اُس نے اندلس کی آن خانہ جنگیوں کو بھلا
دیا، جو بجاءِ خود روح کو لرزا دینے والی تھیں۔ بقیۃ السیف لوگوں کو اس طرح منتشر کیا گیا کہ اُن کے

دوبارہ متفق ہونے کی امید ہی باقی نہ رہی۔ عبداللہ چونکہ دوران جنگ ہی میں میدان چھوڑ بھاگے تھے اس لئے وہ خستہ حال بلنسیہ پہنچ گئے۔ یہاں شکستہ دل اور سخت شرمندہ ہو کر اُنہوں نے اپنے بھتیجے امیر سے معافی مانگی۔ امیر حکم نے اپنی عالی ظرفی سے، جو اُن کی دانشمندی اور محبت و ادب خوردانہ پر شاہد ہے، اپنے چچا کو معاف کر دیا، اور صرف یہ شرط کی کہ وہ مستقلاً تنجیر میں سکونت رکھیں اور اپنے دو بیٹوں اصبح اور قاسم کو بطور یرغمال اُن کے پاس چھوڑ دیں۔ ان دونوں سے وہ محبت پیش آتے رہے، اُن کے ساتھ وہ احترام مرعی رکھا جسکے وہ شایاں تھے اور دونوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔ اُن کو ابھی دو سال بھی اُن کے پاس رہتے ہوئے نہ ہوئے تھے کہ چھوٹے بھائی کو ایک عہدۂ جلیلہ عطا کیا، اور بڑے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر کے مرسیہ جیسے اہم شہر کا عامل مقرر کر دیا۔

ادھر جنوب میں تو اُس سست رفتاری کے ساتھ لڑائی چلی جا رہی تھی، ادھر محصورین طلیطلہ عمروس کے استقلال اور چستی کی سختی محسوس کرنے لگے۔ بے صبر باشندگان شہر نے شرقت کے خوف اور آنے والے قحط سے گھبرا کر اپنے شہر کو سپہ سالار امیر کے سپرد کر دیا اور اپنے گورنر کو اپنے تحفظ پر قربان کر ڈالا۔ مکار ابن حمزہ قتل کر ڈالا گیا، اور اُس کا سر ایک ایلچی کے ہاتھ امیر کے پاس بھیجدیا گیا۔ جہاں تک جلد ممکن ہو سکا شہر میں امن و امان قائم کر کے معاملات کو معمولی حالت پر لایا گیا۔ عمروس نے اپنے بیٹے یوسف کو وہاں کی فوج محافظہ کا افسر مقرر کیا، اور خود باقی فوج کو لیکر اپنے آقا کے پاس پہنچے، جو اس وقت جنچلا[1] میں تھے۔

ان سخت بغاوتوں کے فرو کرنے میں تین برس لگ گئے جس میں امیر کے تمام تر ذرائع اور پوری توجہ مصروف رہی۔ اس اثناء میں اسلام کے حقیقی اور پشتینی دشمنوں کو ایسا فائدہ بخش موقعہ مل گیا کہ اُنہوں نے اُسکو ہاتھ سے نہ کھونا چاہا۔ ۸۰۰ئہ میں الفانسوی چیسٹ اور شارلیمین کے درمیان میں اتحاد ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ اتحاد مسترانہ ہوا تھا، یا ایسٹر پاس کے بادشاہ نے باجگذار ہونا منظور کیا تھا۔ سرحد کے مسلمان عاملوں (گورنروں) نے پھر امیر حکم کی بیعت توڑ دی،

اور حمایتِ آزادی کے عمدہ پیروی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ شارلیمین کے جوہرِ شجاعت کو پچیس برس پہلے میدان رونسس وال میں ایسا سخت سبق ملا تھا کہ جہاں تک جزیرہ نمائے اندلس کا تعلق تھا انہوں نے ہمیشہ کے لئے اُسکے فتح اور قبضہ کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ تجربہ نے یہ بتلا دیا تھا کہ گو مسلمانوں کا ایک قبیلہ دوسرے سے اور ایک گروہ دوسرے سے دست و گلو رہتے ہیں، مگر بیرونی دشمن کے مقابلہ میں وہ عارضی طور پر بڑی محبت سے متفق و متحد ہو جاتے ہیں اگرچہ شارلیمین کی فوجیں جنوب پائرینیس میں اپنا قدم نہ جما سکیں، بلکہ اُس سلسلۂ کوہ کو حفاظت کے ساتھ قطع بھی نہ کر سکیں مگر مسلمانوں کی نقل و حرکت میں کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوئیں۔ اُن کے دستہائے فوج غل غش اُن کے دور افتادہ صوبوں کو برابر لوٹتے کھسوٹتے رہے۔ یہ بڑے فکر کی بات تھی، کیونکہ ممکن تھا کہ کسی وقت کوئی قابل اور شجاع عرب افسرِ فوج سرسبز جنوبی وادی کو لے کر بیٹھے۔ اُن لوگوں کو یاد تھا کہ وہ علاقہ پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکا ہے۔ اسی بنا پر شاہ شارلیمین کو مناسب معلوم ہوا کہ وہاں ایسے قلعے بنا دیں کہ جو دشمن کو تنگ کر سکیں، اور اگر کوئی حملہ کرے تو اُسکے زور کو توڑ سکیں۔ ان ہی وجوہ سے انہوں نے اِس رو بپائرینیس (اندلس کی طرف) ایک ریاست قائم کی، جس کا نام گاتھنگ مارچ رکھا، اور وہاں ایک فرانس کا رئیس بوریل نامی بادشاہ مقرر کیا، اور اُس کا عزل و نصب بادشاہ ایکیوٹین کے ہاتھ میں دیا گیا۔

ابتدا میں تو یہ نوزائیدہ ریاست بے قدر سی رہی، مگر بہت جلد اس نے زور پکڑ کر اہمیت حاصل کر لی۔ جو علاقہ اس ریاست کو دیا گیا تھا وہ برسوں سے خونیں بغاوتوں، متواتر بدنظمیوں اور خانہ جنگیوں کا اکھاڑہ بنا رہا تھا۔ اُسکی اراضی غیر مزروعہ تھیں۔ وہاں کے باشندے اپنے شہروں کی فصیل سے باہر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مرکزی سلطنت سے اُسکے رسل و رسائل ہمیشہ مخدوش رہتے تھے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مہینوں کے لئے راستے بند ہو جاتے تھے، اور آمد و رفت ناممکن ہو جاتی تھی مگر جیسے ہی اہالی فرانس نے اُس پر قبضہ کیا، اور حفاظت کی صورت پیدا ہو گئی، تو ملک کی حالت میں نمایاں فرق پڑ گیا۔ منہدم قلعوں کی پھر مرمت کر لی گئی۔ والیوں نے

جب یہ سمجھا کہ اُس حصۂ ملک میں آزادی پا جانے کی زیادہ امیدیں ہیں تو اُن کی غداری اور نمک حرامی پھر بروۓ کار آئی اور اُنہوں نے اپنے دین کے دشمنوں سے دوستی گانٹھ لی۔ بہت سی اراضی کے مفت پانے، معافیاں حاصل کرنے اور مختلف عایتوں کے وعدے پر آبادکاروں کا ایک جم غفیر نئی ریاست میں پہنچ گیا۔ اراضی کا پھر تردد ہونے لگا تو وہاں ایک عجیب دلکش سبزہ اور ترفہ نظر آنے لگا۔ گاتھک مارچ نہ صرف اُن عیسائیوں ملجا و ماوا ہو گیا جو مسلمان بادشاہوں سے ناخوش تھے، بلکہ وہ تمام لوگ جو بادشاہ ایسٹریاس اور رؤساء لیسکے سے ناراض ہو گئے تھے وہ بھی یہیں آ بستے تھے۔ بہت سے آدمی اس دھوکے میں آ گئے کہ اگر یہ سلطنت، جسکو عایاء وزیگاتھ قائم کر رہے تھے، مستحکم ہو گئی تو وہ پرانے قوانین، پرانا رعب اور پرانی شان و شوکت قائم کر سکینگے۔ جو سلطنت کہ آئندہ کاونٹی آف بارسلونہ کہلاتی اور تاریخ اندلس میں اہمیت پیدا کرنے والی تھی، اُسکی یہ اصلیت ہے۔ اس سلطنت کا قیام مسلمانوں کی سلطنت کو کمزور کرنے کا دوسرا سبب تھا، سبب اول سلطنت ایسٹریاس کا قیام ہے جو سیاسیانہ پہلو سے کسی اور سے کچھ کم نہیں تھا۔

نئی سلطنت کے بڑے بڑے شہر یہ تھے۔ اوسونا[۱۲]، کارڈونا[۱۳]، مانریسا[۱۴] اور گیرونا (جیرونہ) ان میں سے کوئی شہر ساحل بحر پر نہ تھا۔ شارلیمین کی دوراندیشی اسکی متقاضی تھی کہ اُس کو کوئی بندر مل جائے، تاکہ گاتھک مارچ موسم کی خرابی یا دشمن کی شرارت سے محفوظ رہ سکے۔ اسلئے انہوں نے برشلونہ پر حملہ کرنا چاہا، جو ایک نامکمل سا بندر تھا، اور آثار ایسے تھے کہ اگر اس وقت اسکو تجارتی اہمیت حاصل نہیں ہے تو آئندہ ہو جائیگی؛ چنانچہ یہی ہوا۔ اُس کا جاء وقوع، اور وہاں کے والیوں کی آئے دن کی سازشوں کی وجہ سے وہ براۓ نام آزاد تھا۔ موجودہ عامل (گورنر) زید کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی وہ حکم سے قول و قرار کرتے تھے اور کبھی حفاظت کے لئے شارلیمین کی خوشامدیں کرتے تھے۔ شاہ ایکیوٹین بڑی سی فوج لے کر جب برشلونہ کی دیوار کے نیچے آ کھڑے ہوئے تو زید نے طرح طرح کے بہانہ کر کے صلح کے نامۂ پیام کو طول دیدیا، اور یہ امید لگا تے رہے

کہ موسم سرما کے آتے آتے محاصرہ ناممکن ہو جائیگا۔ حسن، والی وشقہ، نے بھی اہالی فرانس کو اپنے شہر میں گھسنے دیا، حالانکہ وہ شاہ لوئی کے باجگذار تھے۔ ناامید بادشاہ اپنے دل میں یہ خیال جمارہے تھے کہ اس مہم کا انجام اُن کے موافق ہوگا، مگر وہ اس طرح بدنامی کے ساتھ واپس گئے کہ اُنکے سپاہی ہی ان پر پھبتیاں اُڑانے لگے، اور خود اُن کی حدود سلطنت غیر محفوظ رہیں ۔

اہالی فرانس کے دستور کے مطابق ہر موسم بہار میں ایک بہت بڑی مجلس مشاورت قائم کی جاتی تھی۔ ۸۱۰ئہ کے شروع میں یہ مجلس ٹولوس میں منعقد ہوئی۔ ان مجالس میں آئندہ کے فوجی مہمات پر بحث ہوا کرتی تھی، تجربہ کار سپہ سالار اور افسران فوج اس میں شامل ہوتے اور بحثیں کرتے تھے، اور ہمیشہ اُن ہی کی رائے پر فیصلہ ہوتا تھا۔ ابتک جتنی مہمیں ناکامی پر ختم ہوئیں، اُن سے فرانس کے افسروں میں بجاے افسردگی پیدا ہونے کے ایک طرح کی بے صبری پیدا ہوگئی تھی۔ اس مجلس میں باتفاق راے بڑے جوش و خروش سے یہ طے ہوا کہ برشلونہ پر قبضہ کیا جائے۔ سال رواں کے ختم ہونے سے پہلے ایک بہت بڑی فوج کوہ پایرینیس سے اس طرف اُتری۔ اس کی تعداد میں شیخی باز مورخوں نے خوب مبالغہ کیا ہے اور اسکو بہت سی اقوام سے مشتمل بتلایا ہے۔ لوئی کے خیالات باطلہ کی بہت سی مہموں سے تردید ہوچکی تھی، نمعلوم اس وجہ سے، یا افسران فوج کے عرض معروض سے، جو اُسکی حالت سے واقف تھے، وہ روسی لون[۱۵۱] ہی میں ٹھہر گئے اور یہ ارادہ کیا کہ جب تک لڑائی کا نتیجہ یقینی نہ ہو وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں۔ حملہ آور فوج کے دو حصے کئے گئے، ایک نے بسر کردگی کاونٹ آف گیرونا، شہر کا محاصرہ کیا، اور دوسری بقیادت کاونٹ آف ٹولوس بطور فوج محافظ لریدہ اور طرکونہ میں ٹھہری رہی تاکہ مسلمانان قرطبہ کی اگر کوئی مدد آئے تو اُسکی روک تھام کرے۔ فصیل شہر پر بے خوف ہوکر حملہ کیا گیا، اور شہر والوں نے بے جگر ہوکر مدافعت کی شہر کے والی زبید نے تذبذب اور نمک حرامی کو چھوڑ دیا، جس سے وہ ایک مدت بعید سے بدنام ہو رہے تھے، اور نہایت صبر و استقلال سے ایسی مدافعت کی کہ جو نہایت شجاع کاردان سپہ سالار کے شایاں شان تھی۔ اُن کی تقلید سے

وہاں کی فوج محافظ نے حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ یکے بعد دیگرے حملہ ہوتے تھے اور رد کر دیئے جاتے تھے، حالانکہ ایک فرانس کا سپہ سالار بنفس نفیس حملہ کرتا تھا مگر سواء اسکے کہ اُسکی فوج کا قتل عام ہو اور کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ محاصرین نے ان حملوں میں اتنا نقصان شدید اُٹھا کر اور بھی تکلیف دہ، مگر یقینی تدبیر محاصرہ کی اختیار کی۔ صفوف اتنی قریب قریب کر دیں کہ باشندگان شہر بھوک سے تنگ ہو جائیں۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندر بر شلونہ بند نہیں کیا گیا تھا، مگر بھوکی فوج محافظ کو سلطنت قرطبہ نے ذراسی بھی رسد نہیں بھیجی۔ بہت سے آدمی شہر میں بھوکوں مر گئے، باقی جو رہے اُنھوں نے آپس میں لڑ لڑ کر اپنی جانیں بچانے کے لئے وہ چیزیں کھائیں، جن کے نام سے روح کانپتی ہے۔ گلیوں میں جو کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ اُس میں سے جو کچھ ملا نکال کر کھا گئے۔ چمڑے کے بنے ہوئے جو پردے اُن کے دروازوں پر لٹک رہے تھے۔ اُن کو نے کر کھانے کے لئے لڑ مرے۔ بعض تو مصیبت نہ سہ سکے اور اپنے آپ کو فصیل شہر سے گرا دیا، بعض سیدھے دشمنوں کے ہتھیاروں پر جا پڑے۔ باوجود اسکے کہ وہ ایسی مصیبت میں تھے کہ جان سے عاجز آئے ہوئے تھے، مگر کسی طرح اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی بھی جنکی تعداد اُس شہر میں کم نہ تھی، اپنی اپنی باری فصیل شہر پر آ کر اپنے ہم مذہبوں سے نبرد آزما ہوئے۔ کسی شخص کو اس کا یقین نہ تھا کہ امیر اس شہر کو بغیر مدد دیئے اپنے ہاتھ سے نکل جانے دینگے، شہر بھی وہ جس کے تجارتی فوائد اور جس کی جغرافی جاء وقوع ایسی تھی کہ وہ سلطنت کی کنجی تھا۔ آخر لوئی خود اپنی فوج لئے ہوئے کمک کے لئے آ گئے فوج محافظ کی مصیبت روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، اور جب تمام ذرایع آذوقہ ختم ہو گئے تو زہیر نے خود قرطبہ جا کر امیر سے مدد مانگنے کا ارادہ کیا۔ نڈر گورنر تن تنہا، چھپ کر چور دروازے سے رات کو نکلے، صفوف دشمن کے اُس طرف پہنچنے ہی پائے تھے کہ اُن کا گھوڑا ہنہنا پڑا، اور وہ گرفتار ہو گئے۔ یہ ایک اور آفت تھی کہ محصورین پر پڑی، لیکن اُن کی ہمت و استقلال نے اب بھی جواب نہیں دیا۔ آخر جب فصیل شہر کئی جگہ سے ٹوٹ چکی، مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم

رہ گئی تو اُن کا دل بیٹھ گیا اور اُنہوں نے اہالی فرانس سے صلح کا نامہ و پیام شروع کیا۔ نرم ترین شرط یہ تھی کہ مسلمان اپنی جائیدادوں سے ہاتھ دھو کر جلا وطنی اختیار کریں۔ آخر دروازہ شہر کھلا، اور خانماں برباد لوگوں کی ایک لمبی قطار نکلی جن سے ضعف کے مارے چلا نہ جاتا تھا، اور بھوکوں کے مارے قدم نہ اُٹھتا تھا۔ بادل ناشاد دشمنوں کی صفوں کو قطع کرتے ہوئے نکل گئے۔ فرانس کے رؤساء شہر کے اندر داخل ہوئے، اُن کے ساتھ پادری تھے جو نہایت بھڑک دار کپڑے پہنے اور شان و شوکت کی نمائش کرتے ہوئے آئے تاکہ شہر کے بڑے گرجا کے قربانگاہ کے سامنے دین مسیحی کی اُس فتح کا شکرانہ ادا کریں جس سے کہ مشرقی اندلس کا نہایت اہم صوبہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے رلقۂ اطاعت سے نکل گیا۔

عیسائیوں نے اپنے نئے آقاؤں کے آنے سے نہ کچھ جوش ظاہر کیا نہ خوشی منائی۔ جس وقت پادری شاندار لباس پہنے زرہ بکتر لگائے، چمکتی تلواریں ہاتھ میں لئے، اپنی فتح پر نازاں، شہر میں پہنچے ہیں، تو جتنے عیسائی اُن کے دیکھنے کے لئے گھروں سے نکل آئے تھے وہ سب پژمردہ اور اُداس تھے۔ جب سلطنت شروع ہی ہوئی ہے تو مسلمانوں کے مسامح اور فیض رساں عہد میں، مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحوں کے دلوں کو ہاتھ میں لے لیا تھا اور سب گرویدگی کے ساتھ اُن پر اعتماد اور اُن کی عزت کرتے تھے۔ اُن کے عدل و انصاف اور مذہبی آزادی اور فیاضی کا عوض عیسائیوں کی جہالت، ظلم اور غیر مسامحت کسی طرح بجا نہ تھا۔ باستثناء پادریوں کے جو نئی عزتیں پا کر پھول گئے تھے، پرندہ بیس کی ادنے جھونپڑیوں سے لیکر اندلس کے شاندار محلوں تک کے ذی عیسائی صاف طور پر ہمیشہ مسیحیوں سے نالاں اور اپنے غیر مسیحی آقاؤں سے خوش تھے، اور وہ کسی طرح نہ چاہتے تھے کہ موخر الذکر اُن کو چھوڑ جائیں۔

• چونکہ لوئی کو سچا طور پر یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے نو مفتوحہ علاقہ کو اگر اپنے قبضہ میں رکھ سکینگے تو بمشکل تمام، اس لئے جہاں تک اُن سے ہو سکا انہوں نے برشلونہ کے فصیل کی مرمت

کرائی، جو اُن ہی کے سپاہ کی اولوالعزمی سے شکستہ ہوگئی تھی۔ وہاں قوم گاتھک کا ایک گورنر مقرر کیا، اور اچھی تعداد میں فوج محافظ کو وہاں چھوڑ کر، شاہ ایکیدٹن اپنا مقصود حاصل کر کے اُس مقام سے واپس چلے گئے، جس پر ایک مدت اُن کی آنکھ لگی ہوئی تھی، اور جہاں اُنہوں نے اتنا ایثار اور اتنی شجاعت دکھلائی تھی۔ زیدؔ بہادر زیدؔ کو فاتح بادشاہ نے بہت ملامت کی، پھر نہ معلوم کس وجہ سے اُن کی جان بخشی کر کے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا۔ یوں یہ بہادر جانباز ابدالآباد تک کے واسطے صفحہ تاریخ سے مٹ گیا۔

سپین میں نظام اقطاعی[16] عملی طور پر اُسی روز سے شروع ہوتا ہے کہ جس روز سے لوئی نے برشلونہ پر قبضہ کیا۔ یہ طریقہ بہت پہلے فرانس میں جاری ہوا تھا۔ اگرچہ اُسکے تخم نے نشوونما نہیں پائی، مگر وزیگاتھ قواعد میں اُس کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں لیکن حقوق و فرائض بادشاہ و جاگیرداریا رئیس اور بادشاہ کے درمیانی تعلقات کی نہ پوری طور پر تشریح ہوئی تھی، نہ وہ قانون کی صورت میں آئے تھے، نہ اُسکے قانون و قواعد نے آزاد اقوام اندلس میں وہ حیثیت اختیار کی تھی جو اور جگہ ہے وہ ذلیل کُن حقوقِ شاہی، جن کو سرکش نوابان انگلستان و فرانس و جرمنی اپنا مال سمجھتے ہیں وہاں کے بہادر اور خوددار دہاقین پر کبھی نہیں ڈالے گئے۔ یہ قصہ اُس زمانہ سے پہلے کا ہے کہ اُس ملک میں قانون خمس پوری طرح پر نافذ ہوا۔

پایرینیس کے شمال میں جب نظام اقطاعی فرائض کا بوجھ ڈال دیا گیا تو پھر بھی وہ گرفت کم نہیں ہوئی۔ قشتالہ اور ارغون میں یہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی جاگیردار ایک آقا کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس جانا چاہیئے تو اُسکو وہ تمام جاگیر و جائداد، یا اُسکی قیمت، ادا کرنی پڑتی تھی جو پہلے آقا سے اُسکو ملی ہو۔ اس نظام نے گاتھک مارچ میں نہ صرف اس نومفتوحہ علاقہ کو فاتحین کے ہاتھ میں رہنے دیا، بلکہ اس کا یہ اثر ہوا کہ اہالی فرانس کو مسیحیان اندلس پر ایسا اقتدار حاصل ہوگیا کہ وہ اُن کے صلاح و فلاح کے متعلق مداخلت کرتے رہے، اور جس قدر اُن کا اقتدار بڑھتا اُتنا ہی وہ مسلمانوں کے حق میں مضر ہوا۔

بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ برشلونہ کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانا بہت بڑی آفت تھی، جسکے نتائج یہ ہوئے کہ اُس نے مسلمانوں کے رعب کو سخت نقصان پہنچایا، اور مسلمانان اندلس کی سلطنت کو کمزور کردیا۔ اس کا جواب کہیں نہیں ملتا کہ امیر حکم نے ایسی دانستہ بے پروائی، یا نادانستہ غفلت، کیوں کی کہ اپنے دین و خاندان کے دشمنوں کو اس علاقہ کے اتنے اہم اور فوالحا شہروں کو اپنے بہادر گورنر کے ہاتھ سے چھین لینے دیا، اور وہ خود بے خبر بھی نہ ہوئے۔ ایک عجیب حیرت انگیز خاموشی زمانۂ قدیم کے مورخین نے اختیار کر رکھی ہے کہ وہ کسی طرح یہ راز نہیں کھولتے کہ ایسا کیوں ہوا، حالانکہ یہ واقعہ اتنا وقیع، اتنا غیر معمولی، خود امیر وقت کے عادت کے اتنا خلاف، اُن کی سلطنت کے اتنا مضر اور اُن کی آئندہ عظمت و جلال کی امیدوں کو اتنا توڑنے والا تھا کہ جس کا حد و حساب نہیں ہے۔ تجربہ نے یہ بتلا دیا تھا کہ امیر حکم میں خداء تعالےٰ نے نہایت جری اور جسیت بادشاہ ہونے کی تمام خوبیاں ودیعت رکھی تھیں۔ ابتداءِ عمر ہی سے جنگ کا جوش و خروش اور جنگی اشتغال اُن کی دلچسپی کا باعث رہے تھے۔ اُن کے ذرائع کی انتہا نہ تھی، اور اُن کی فوج جتنی زیادہ تھی اُتنی ہی مسلح و منظم۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ اُن کی باقی سلطنت میں اُس وقت امن و امان تھا۔ مانا کہ عیسائیوں کی فوج اتنی زیادہ، اور اتنی قوی تھی کہ وہ اُس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، مگر کیا سمندر بھی اُن کے لئے کھلا ہوا نہ تھا کہ وہ برشلونہ کو کمک اور سامان رسد پہنچا سکتے؟ یہ بھی نہ تھا کہ وقت تنگ ہو کیونکہ محاصرہ سات ماہ متواتر قائم رہا۔ یہ امر کہ اس وقت بادشاہ ایسٹر یا س جنگ کے لئے تیار تھا، یا کسی خانگی بغاوت کا اندیشہ تھا، کہ جو اہالی فرانس کی صلیبی لڑائی کی وجہ سے مورخین کی نگاہ سے پوشیدہ رہی، اور ان ہی بواعث سے وہ خاموشی اختیار کی گئی جو خودکشی کے ہم معنی ہے، ایسی باتیں ہیں کہ ہمیشہ کے لئے قیاسات کے لئے مشغلہ رہینگی لیکن اسباب جو کچھ بھی ہوں یہ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ وہ مصیبت انگیز نکلا کہ جسکی تلافی کبھی نہ ہو سکی۔ اہالی فرانس نے اپنا فولادی پنجہ کسی وقت بھی نرم نہ کیا۔ یہ شہر ایک سلطنت کا دارالسلطنت بن گیا، جس میں رفتہ رفتہ

اور علاقے ملتے گئے اور سلطنت ارغون کے قیام و استقلال کا باعث ہوئے، اور آخر یہی سلطنت ارغون، جنگہاء باز یافت میں سب کی مقدمۃ الجیش رہی ٭

یہاں تک تو تمام مورخ متفق اللفظ ہیں کہ امیر حکم خود برشلونہ کی امداد کے لئے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ اُن کو یہ اطلاع ملی کہ اُسکو عیسائیوں نے لے لیا۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ بغیر اسکے کہ اپنے نقصان کی تلافی کریں، اپنی سپاہ کی کمریں کھلوادیں، اس لئے وہ سرقسطہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں سے ایبرو کے کنارے کنارے بڑھے، اور روشقہ، طرکونہ، اور دوسرے چھوٹے چھوٹے غیر اہم شہروں پر قبضہ کر لیا۔ حسن اور بہلول، وہ سرداران باغی تھے کہ جن کی عنایت سے مشرقی اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، اُن کو پکڑ کر قتل کرا دیا۔ برشلونہ کے سامنے فوج کی نمائش نہیں کی گئی، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو فوج کی تعداد کم تھی، اور رسد رسانی کا انتظام ٹھیک نہ تھا، یا یہ وہاں کے حاکم سے ڈر گئے، اور فوجی نمائش کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دیا ٭

قرطبہ کے پرجوش علماءِ دین امیر حکم کی تخت نشینی سے بہت فکرمند تھے اگرچہ وہ اپنے والد جیسے متقی و پرہیزگار نہ تھے، مگر انہوں نے علماء سے کوئی پرخاش بھی ظاہر نہ کی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ لوگ اُن کے منہ چڑھے نہ تھے۔ امیر کی دلچسپیاں اور مشغلے اُن اصول کے منافی تھے کہ جلوت میں علماءِ دین اُن کا وعظ کرتے تھے مگر خلوت میں اُن پر خود عامل نہ ہوتے تھے۔ اکثر وہ نشہ میں چور رہتے تھے، اور یہ ایسا عیب تھا کہ جس سے تمام مسلمان ناراض اور پرہیزگار کو اُن سے نفرت تھی۔ محل شاہی اپنی خرابیوں کی وجہ سے دارالخلافہ بھر میں بدنام ہو رہا تھا۔ بچپن ہی سے وہ غیر معتدلانہ شہوات میں مبتلا تھے۔ اُن کا بڑا مشغلہ شکار تھا، جس میں ایسے جانوروں سے کام لینا پڑتا تھا جو از روءِ شرع شریف ناپاک تھے٭، مگر حکم اپنی فرصت کا اکثر وقت اسی شغل میں گزارتے تھے۔ مزاج ایسا پایا تھا کہ بہت جلد برافروختہ ہو جاتے تھے، تحکم مبالغہ کے ساتھ

٭ نہ معلوم مصنف علام کیا فرماتے ہیں۔ اگر اُن کا مطلب شکاری کتوں سے ہے تو ان سے شکار میں کام لینا شرعاً جائز ہے۔ (مترجم)

تھا، سنگدلی بدرجۂ غایت تھی، سزائیں دینے میں بے رحمی سے کام لیتے تھے، حتٰے کہ چھوٹے چھوٹے جرائم میں بھی سخت سزا دیتے تھے، ان وجوہ سے تمام لوگ کیا امرا کیا دہاقین کیا علماء سب اُن سے کانپتے تھے۔ یہ جرم تو خیر قابل عفو تھے، مگر سخت خرابی یہ تھی کہ وہ ان اولیاءاللہ اور بزرگان دین کا ادب احترام نہ کرتے تھے کہ جن کے امیر ہشام معتقد تھے، اور اُن کی خاص تعظیم کرتے تھے۔ وہ لوگ اہم امور سلطنت کے رازدان تھے، اور اُن رازوں اور اقتدار کو اپنے اغراض و فوائد کے لئے استعمال کرتے تھے، اگر اب وہ دفتر شاہی کے پاس بھی نہ پھٹکنے پاتے تھے۔ کہاں تو وہ بغیر اذن کے امیر کے پاس چلے جاتے تھے، اور کہاں اب اُن کو باریابی کیلئے غلام گردش میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ وہ انعامات جو زرا ذرا سے بہانوں پر بیت المال سے اُن کو بے غل و غش کھلے ہاتھوں ملتے تھے، اب بند ہو گئے۔ اگرچہ وہ ذلیل ہو گئے، اُن کا غرور ٹوٹ گیا، اُن کی فتوحات میں کمی آگئی، دربار شاہی میں خوار ہو گئے، لیکن اب بھی عوام الناس کو اُن سے ہمدردی تھی۔ مختلف مذاہب کے علماء جو ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے تھے، اس امید پر اپنی دشمنی کو بھول گئے کہ شاید وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو پھر حاصل کرلیں، اُنہوں نے بالاتفاق امیر حکم کی جان اور سلطنت پر حملہ کیا۔

چالباز اور ریا پوس فقہاء مالکی جنکی دینی حیثیت کے ساتھ مکاری بھی ملی ہوئی تھی، اور اس لئے عوام یہ سمجھتے تھے کہ اُن کو کچھ خرق عادت قوتیں حاصل ہیں، اس سازش کے سرغنہ تھے، اُن کی کامیابی کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ کسی شاہی خاندان کے آدمی کا نام اُنکے ساتھ شامل ہو چنانچہ وہ عبداللہ کے بیٹے یعنی امیر کے چچیرے بھائی، ابن شمس نامی کے پاس پہنچے، اور اُن کو اپنے موافق پایا تو اُنہوں نے کھلم کھلا اُن ہی کو تاج پیش کیا۔ لیکن ابن شمس ایسے قوی حوصلہ نہ تھے کہ وہ اسکو منظور کرنے کی ہمت کرتے۔ اس خیال سے کہ یہ فقہا اُن کو ناشکر گذار اور ڈرپوک نہ سمجھیں وہ اپنے ارادہ کو چھپا گئے، اور اُن سے کہا کہ اگر وہ اُن کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں تو وہ اُن لوگوں کی پہلے ایک فہرست دکھلائیں جو اس سازش میں شریک ہیں

فقہا کا جو وفد کہ بسر کردگی یحییٰ اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا، وہ فہرست دکھلانے کو مان گیا، اور یہ قرار پایا کہ رات کے وقت یہ فہرست پیش کر دی جائیگی۔ اس اثنا میں ابن شمس نے امیر کو اطلاع دیدی کہ کیا ہو رہا ہے، اور جب فقیہ یحییٰ اور اُن کے رفقاء آئے تو امیر حکم کے کاتب خاص ایک پردہ کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے تاکہ لوگوں کے نام جلد جلد لکھ لیں۔ اس فہرست میں بڑے بڑے امرا اور قرطبہ کے باشندوں کے نام تھے۔ اب یہ کاتب ڈرے کہ کہیں اپنی اہمیت جتلانے کے لئے اُس فہرست میں خود اُن ہی کا نام نہ دے دیا جائے، جس کا نتیجہ خود اُن کی تباہی ہو۔ اس کے دفعیہ کے لئے اُنھوں نے دانستہ اپنے قلم کو اس طرح کاغذ پر چلایا کہ آواز نکلنے لگی۔ تمام سازش کنندے گھبرا گئے۔ لمحہ بھر میں ابن شمس کا مکان خالی ہو گیا جو لوگ کہ فوراً ہی بھاگ سکے وہ تو بچ گئے، باقیوں کو جنکی تعداد ۷۲ تھی، قتل کر ڈالا گیا۔

۸۰۵ء میں امیر حکم اور خاندان ادریسی کے فرماں رواسے باہم ارتباط ہوا۔ یہ سلطنت افریقیہ میں نئی قائم ہوئی تھی۔ یہ دوستی اندلس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ امن و صلح دونوں حالتوں میں، تباہی غرناطہ تک اس کا نباہ ہوا۔ کئی سال پیشتر، عبدالرحمٰن کی طرح ایک اور شامی معزز خاندان کا شخص، ادریس نامی، عباسیوں کے ظلموں سے تنگ آکر سر بجوۂ بیابان افریقیہ میں پہنچا تھا۔ نہ اُن کا کوئی یار تھا نہ مددگار، نہ خرچ کو پیسہ، اُن کا کوئی رعب و اقتدار، لیکن کوہ اطلس کے باشندوں نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُنھوں نے اپنی جوانمردی اور شجاعت سے اپنے پناہ دینے والوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ حالت قلاشی سے وہ رفتہ رفتہ ایک قبیلہ کے سردار، ایک قوم کے بانی اور ایک خاندان شاہی کے جد اعلےٰ بن گئے۔ ان ہی کے بیٹے اور جانشین ادریس٭ کے پاس امیر حکم نے ایک سفارت بھیج کر تخت نشینی کی مبارک باد دی۔

٭۔ اس خاندان کے تفصیلی حالات دیکھنے ہوں تو علامہ عبدالواحد مراکشی کی مشہور کتاب کا ترجمہ موسومہ "خلافت موحدین" ملاحظہ فرمایئے، جو فرزند کامگار مولوی محمد نعیم الرحمٰن، ایم۔ اے پروفیسر فارسی، عربی گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس، فیلو مدراس یونیورسٹی نے کیا ہے، اور اُن سے مل سکتا ہے۔ (مترجم)

اور یہ خواہش ظاہر کی کہ دونوں سلطنتوں کو مستحکم کرے اور عباسیوں کی سلطنت کا زور اس طرف نہ بڑھنے دے اس سفارت کو اہمیت دینے کے لئے پانچ سو اندلسی سوار بھیجے گئے، اور نہایت قیمتی تحفہ و تحایف ایک نے دوسرے کو دیئے۔ افریقی بادشاہ نے اس سفارت کی بڑی مدارات کی اور ایک معاہدہ ہو گیا؛ جسکے موافق دونوں کے دشمن کے خلاف مدافعت کی تجویز قرار پائی، اور اس سے مسلمانوں کی مغربی سلطنت کو گونہ استحکام و اطمینان ہو گیا اس واقعہ کے دو برس کے بعد شہر فیض کی بنیاد رکھی گئی۔ اسکی آبادی عیسائی، یہودی، آتش پرست اور بت پرست لوگوں سے مشتمل تھی۔ جو دیندار مسلمان کہ وہاں پہنچتا تھا وہ یہ حالت دیکھکر متحیر رہ جاتا تھا۔ سیاسی قسمت آزما، اور مختلف مذاہب کے پرجوش لوگوں کی وجہ سے، جو وہاں رہ پڑے تھے، ایک عجیب اختلال سا برپا رہتا تھا، جو خاندان ادریسی کے دارالسلطنت کے لئے بدفالی تھی۔

امیر حکم مشرقی اندلس کی مہم پر گئے ہوئے تھے کہ اُن کو یہ پریشان کن خبر ملی کہ طلیطلہ میں بغاوت ہو گئی۔ عمرو کے بیٹے یوسف سے امیر نے بالکل اس طرح سلوک کیا تھا جیسے کسی باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اُن کو ایک ایسے اہم عہدے پر مقرر کر دیا گیا کہ جسکے وہ بوجہ اپنی ناتجربہ کاری اور کم لیاقتی کے اہل نہ تھے۔ یوسف نے اپنے تقرر کے ساتھ ہی وہاں ظلم و ستم اور گستاخی پر کمر باندھ لی۔ رعایا طلیطلہ پشتہا پشت سے عادتاً شوریدہ سر تھی؛ ایک ذراسی تحریک پر شورش کرنے پر تیار رہتے تھے اور قوی اتنے ہوتے تھے کہ اُن کے مقابلہ کے لئے تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی۔ اس وقت یوسف سے ایک سخت بے رحمانہ فعل سرزد ہوا کہ سب لوگ شمشیر بکف ہو کر یوسف کے محل پر حملہ آور ہوئے اور وہاں جو پہرہ دار تھے اُن کو بے قابو کر دیا۔ رؤساء شہر نے یہ دیکھ کر کہ یہ بغاوت خطرناک ہوتی جارہی ہے، وہ گورنر اور رعایا کے درمیان میں ثالث بن گئے، اور بمشکل محل کو لٹنے اور گورنر کو قتل ہونے سے بچا سکے لیکن یوسف اس قطع کے آدمی تھے کہ اُنھوں نے نہ اپنے محسنوں کی قدر کی نہ اپنی جان

بچنے کو غنیمت سمجھا بلکہ کمال بے احتیاطی سے کھلم کھلا بے رحمی کے ساتھ لوگوں سے انتقام لینا چاہا۔ رؤساء شہر کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اُن کو بغیر کسی حکم وغیرہ کے موقوف کر کے قید کر دیا۔ ایک خاص قاصد بھیج کر امیر حکم کو تمام واقعات کی اطلاع دی، اور کہلا بھیجا کہ حالت ایسی خطرناک تھی کہ جس سے اُن کو یہ انتہائی کارروائی خود ہی کرنی پڑی۔ امیر نے مرحمت خسروانہ سے اپنی رعایا کی دست درازی سے درگذر کیا؛ بدنام یوسف کو وہاں سے ہٹا دیا؛ عمرو کو رعایا کی درخواست پر وہاں کا والی مقرر کیا۔ شکرگذار رعایا اپنے اپنے کام میں لگ گئی اور شہر اپنی اصلی امن و عافیت کے حالت میں آ گیا۔

مگر امیر کے دل میں اہالی طلیطلہ کی شوریدہ سری سے ایک خلش پیدا ہو گئی۔ یہ شہر ایک مدت مدید سے بغاوتوں کا مرکز، بد امنی کا ملجا اور اشرار و بلند نظر لوگوں کا مامن بنا ہوا تھا۔ ملک کی سیاسی حالت پر جو اثر اس شہر کا پڑتا تھا وہ کیفیت دارالخلافہ کو بھی نصیب نہ تھی۔ یہاں کے باشندوں کی بے خوفی، اور علماء دین کا غرور دونوں مل کر ہمیشہ طلیطلہ کے اقتدار کو تفوق دیتے رہتے تھے۔ وہ محدود رقبہ جو اُسکی فصیل سے محوط تھا اپنے دامن میں اتنی آبادی لئے ہوئے تھا کہ اُسکو گھنی آبادی کہنا اُسکی خفت تھی۔ اس میں عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی؛ جن کے دل سے وزیگاتھ کی شان و شوکت اور روایت نہیں نکلی تھی؛ اسی وجہ سے مسلمان اُن سے بدگمان رہتے تھے؛ اُدھر مسلمان گورنر بھی اُس سے ڈرتا رہتا تھا۔ عربی مورخین نے ہر جگہ غالباً بہت صحیح، یہ لکھا ہے کہ دنیاء اسلام میں کسی جگہ کی رعایا میں اس قدر جذبات بغاوت نہیں ہیں، جتنے کہ طلیطلہ کی رعایا میں کہ وہ ہر وقت شمشیر بکف ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن لوگوں کی اولاد جو اپنا دین اور اپنی قومیت چھوڑ چکے تھے (اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اپنے جوش مذہبی میں ضرب المثل ہوتے ہیں) وہ بھی قصہ کہانیوں اور تاریخی آثار کو دیکھ کر، اور مفتوح وزیگاتھ کی شان و شوکت سُن کر جوش میں آ جاتے تھے۔ جو مسلمان اس بدنام شہر میں رہتے تھے۔ اُن پر بھی اپنے ہمسایوں کا رعب طاری رہتا تھا۔

باوجودیکہ وہ لوگ ان مسلمانوں کے باجگزار تھے، مگر پھر بھی وہ اپنا وہ غرور قائم رکھتے تھے جو ایک متکبر اور عالیشان لوگوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ عمرو ایک مرتبہ پھر گورنر ہوگئے تو لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کا بدلہ لینگے، اور آخر اسکے باپ ہیں، وہ اُن پر ناقابل برداشت تاوان لگائینگے۔ مگر انہوں نے جہاں تک ہوسکا۔ لوگوں کے اس اندیشہ کو رفع اور اُن کو مطمئن کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ ہر طرح اُن کی عافیت کے لئے اپنا فکر جتلایا، ہر بات میں اُن کی حمایت کی اور ہر معاملہ میں اُن کو رعایت دی، اور یوں اُن کو اپنے خلوص کا یقین دلایا۔ انہوں نے خفیہ طور پر سرکردگان رعایا کو یقین دلایا کہ وہ اُن کے خیالات آزادی میں شریک ہیں اور کوئی جابرانہ قانون وہاں جاری نہ ہونے دینگے۔ اس معاملہ میں وہ یہاں تک اپنی حد سے گزر گئے کہ انہوں نے علانیہ امیر کو بُرا بھلا کہا، اور یہ وعدہ کیا کہ اگر آیندہ کبھی قرطبہ سے اُن کی جان یا آزادی پر ناجایز زور ڈالا گیا تو وہ اُسکے رفع کرنے کی تدابیر میں اُن کی مدد کرینگے۔ اہالی طلیطلہ، وہاں کے شرفا اور علماء گورنر کی دو رُخی چالوں میں کچھ اس طرح آئے کہ وہ اُن کو اپنا مربی سمجھنے لگے، اور اُن پر گرویدہ ہو کر اُن کا ادب و عزت کرنے لگے۔ جب یہ سب کچھ ہوچکا تو امیر کی ہدایت کے بموجب عمرو نے درخواست کی کہ جب کوئی موقعہ آکر پڑتا ہے تو ہر ایک خاندان سے سپاہی لے لئے جاتے ہیں، اس سے لوگوں کو رنج پہنچتا ہے۔ اگر ایک قلعہ شہر کے قریب بنا دیا جائے تو لوگوں کی یہ شکایت رفع ہوجائیگی، اور آیندہ بغاوتوں کے موقعہ پر یہ کام آسکیگا۔ اسکی بہت ہی جلد منظوری دیدی گئی۔ قلعہ ایسی جگہ بنانا تجویز کیا گیا کہ شہر اسکی زد میں ہو۔ دولتمندوں نے اپنے روپیہ اور غریبوں نے اپنی محنت مزدوری سے قلعہ بنانے میں مدد دی۔ فن عمارت نے اُسکے جاء وقوع پر بہت کچھ مستزاد کرکے اُسکو ناقابل تسخیر بنا دیا کہ وہ ناقابل تسخیر ہوگیا۔ وہاں بڑی تعداد میں فوج محافظ رکھی گئی اور حکم کو اطلاع دی گئی کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اہالی طلیطلہ سے اپنے بدلے لے لیں +

ایک سرحدی گورنر کو ہدایت کی گئی کہ وہ فوراً یہ بہانہ کرکے کہ اہالی فرانس نے سر اُٹھایا ہے

کمک طلب کریں اِس حکم کی تعمیل ہوئی اور کئی ہزار آدمیوں کی ایک فوج بسرکردگی شاہزادہ عبدالرحمٰن ولیعہد سلطنت جن کی مدد کے واسطے تین معمر اور تجربہ کار وزراء شامل تھے قرطبہ سے بظاہر پیرینیس جانے کے لئے روانہ ہوئی۔ جب یہ فوج طلیطلہ پہنچی تو یہ ظاہر کیا گیا کہ جس ضرورت سے یہ فوج منگوائی گئی تھی اُس میں بہت مبالغہ کیا گیا ہے غنیم سرحد پر سے ہٹ گیا ہے اور اب جنگ کی ضرورت باقی نہیں رہی ابھی یہ فوج طلیطلہ کے قریب ہی خیمہ زن تھی کہ گورنر طلیطلہ تمام رؤساء شہر کو ساتھ لئے ہوئے ولیعہد کے سلام کے لئے آئے۔ ان لوگوں کو نہایت تپاک سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی بڑی تواضع و تکریم کی گئی۔ یہ لوگ اپنے آیندہ بادشاہ کی اخلاق و مروت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے خاص کر اس لئے کہ ابھی اُن کی عمر پندرہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی۔ عمرو کے کہنے پر اب ان مہمانوں نے یہ درخواست کی کہ شاہزادہ اپنے قدوم سے اُن کو سرفراز کریں اور جب تک واپس نہ جائیں شہر طلیطلہ ہی میں قیام فرما ہوں کسی قدر اصرار کے بعد یہ درخواست منظور کی گئی۔ ایک بہت بڑی اور پرتکلف ضیافت کی تیاریاں کی گئیں۔ مہمانوں کی طویل فہرست میں شہر کے تمام رؤساء بڑے بڑے دولتمند نہایت قابل سرکردگان قبائل کے نام تھے جن پر غداری کا شبہ تھا یا جنہوں نے علانیہ غداروں کی مدد کی تھی یا کچھ بھی جوش دکھلایا تھا خود مقابلہ کیا تھا یا آتش بغاوت کو مشتعل کیا تھا جب دعوت کا وقت آیا تو ایک تنگ سی گلی اور دروازے میں سے ہوکر ان لوگوں کو ایک ایک کرکے بلایا گیا۔ اندر کی طرف ایک جلاد کھڑا تھا جو کوئی جاتا اُسکو وہ وہیں قتل کر کے رکھ دیتا۔ جو کوئی آتا اُسکی سواری اور غلاموں کے لئے حکم تھا کہ قلعہ کے دوسری طرف پہنچا دی جائے کہ وہ اپنے مالک کا وہاں انتظار کرے۔ ایک نئی چیز دیکھنے اور شاہزادہ کے شوق زیارت نے ہزاروں آدمیوں کو کھینچ بلایا تھا جو قلعہ کے گرداگرد کھڑے ہوئے تھے سیر دیکھنے والوں میں ایک طبیب بھی تھا جو یا تو اور لوگوں سے زیادہ عقیل تھا یا زیادہ شکی اُس نے کہا کہ قلعہ کے اندر ایک عجیب طرح کی خاموشی طاری ہے جتنے مہمان اندر

گئے ہیں اُن میں سے ایک بھی نہیں لوٹا، حالانکہ دوپہر ڈھل چکا ہے۔ ایک شخص نے اشارہ سے بتلایا کہ دیکھو ابھی تک دھواں اُٹھ رہا ہے؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ضیافت ختم نہیں ہوئی کیونکہ کھانا پک رہا ہے طبیب ایک تجربہ کار آدمی تھا، وہ فوراً چیخ اُٹھا "بدبختو! کھانا پکنے کا دھواں نہیں ہے؛ یہ تمہارے مُردہ بھائیوں کی لاشوں سے دھواں نکل رہا ہے"

اس واقعہ میں جتنے آدمی ضائع ہوئے اُن کی تعداد سات سو سے پانچہزار تک بتلائی جاتی ہے جس وقت قلعہ تیار ہو رہا تھا اُسی زمانہ میں ایک خندق کھودی گئی تھی؛ مقتولین کی لاشیں بے سر اُس میں ڈال دی گئیں۔ مہمان کُشی عربوں کی نگاہ میں نہایت مذموم فعل ہے؛ اس لئے یہ واقعہ تاریخ اندلس میں "یوم الخندق" کے نام سے آج تک یادگار چلا آتا ہے؛ جو لوگ کہ اس بےنظیر فریب کے نذر اور اپنے اعزاء کے اعمال کے بدلے قتل ہوئے تھے اُن کے سروں کی ایک قطار فصیل شہر پر لگادی گئی۔ امراء و رؤساء کے گھروں میں ایک گھر بھی ایسا نہ تھا کہ جہاں سے صداء واویلا و امصیبتا نہ بلند ہوئی ہو۔ ہر جگہ ایک خاموشی طاری تھی؛ مگر ظالم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، رعایا کو ایک سبق سکھادیا۔ کورنمک سرکردے صفحہ ہستی سے مٹ گئے؛ تمام جذبات سرکشی گویا ہمیشہ کے لئے محو کر دیئے گئے؛ سالہا سال گزرنے کے بعد بھی طلیطلہ نے سر نہیں اُٹھایا اور نمک حرامی ظاہر نہیں کی؛ لوگ امن و عافیت سے اپنی زندگی گزارنے لگے۔

اسی موقعہ کے قریب ایک مشکل مرید میں کھڑی ہو گئی یہ یاد ہو گا کہ وہاں کے والی اصبغ امیر کے چچیرے بھائی اور بہنوئی تھے کسی خاص وجہ سے اُنھوں نے اپنے وزیر کو موقوف کردیا تھا۔ وہ امیر حکم کے پاس پہنچے اور اُن سے یہ بیان کیا کہ والی مذکور بغاوت کر کے اُن کے تاج و تخت پر حملہ کرنے والے ہیں؛ ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ اصبغ کو موقوف کر کے اُن کو وہاں والی مقرر کر دیا جائے۔ اصبغ پر یہ بے بنیاد الزام لگے تو اُن کو غصہ آتا ہی؛ اُنھوں نے حکم شاہی کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ رعایاء شہر اُن پر فدا تھی؛ اس نے اپنے والی کا ساتھ

دیا معلوم ہوتا تھا کہ خانہ جنگی شروع ہی ہونے والی ہے کہ امیر حکم کی ہمشیرہ اپنے بھائی کے پاس گئیں، اور ان کی خوشامد و مدارات کر کے اس بلاء ناگہانی کو ٹالا۔ دونوں طرف سے بالمشافہ گفتگو ہو کر معاملہ صاف ہو گیا، دونوں عزیزوں کے دلوں میں صفائی ہو گئی، اصبح پھر لوٹی لایت پر بھیج دیئے گئے، اور اُن کو اُن کی بیوی اور رعایا نے مبارکباد دیں ہیں۔

حکم کسی پر اعتبار نہ کرتے تھے، فوجی شوکت دکھلانے کا اُنہیں بڑا شوق تھا، وہ جانتے تھے کہ اُن کی رعایا سرشور اور دو رخی چالیں چلنے والی ہے، اس لئے انہوں نے اپنی محافظ فوج کی تعداد چھ ہزار تک بڑھا لی تھی۔ ایک تو اہل عرب پابندیوں سے گھبرا کر اپنے لئے کوئی نہ کوئی جنگی مشغلہ پیدا کر لیتے تھے، دوسرے اُن کی وفاداری کا بھی اعتبار نہ تھا، اس لئے امیر نے اُن کو اپنی اُس خاص فوج میں داخل نہ کیا جو بادشاہ کی جان کی محافظ تھی سبق آموز تجربات، اور اصول استبداد، رعایا اور فوج کے درمیان میں ہمدردی نہیں بننے دیتے اسی بنا پر انہوں نے کفار اور غیر ملکی لوگوں کو اپنی اس فوج میں رکھا۔ ان میں سے تین ہزار تو اندلسی عیسائی تھے، اور باقی تمام غلام جو حبش اور ایشیا کے حربی قیدی تھے کہ اُن کو سواحل بحر شام سے خرید اگیا تھا۔ ان لوگوں کو بجا طور سے "عجمی" کہا جاتا تھا، کیونکہ یہ عربی نہ جانتے تھے اُن کے ہتھیار وغیرہ بہترین قسم کے اور نہایت قیمتی تھے۔ وہ ایسے قواعد دان تھے کہ اُس زمانہ میں جہاں تک اس فن نے ترقی کی تھی، اُن سے بڑھ کر قواعد دان نہیں ہو سکتے۔ وادی الکبیر کے جنوبی کنارہ پر دو ہزار آدمیوں کے واسطے رہائش کے مکان بنا دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ وہیں چوکی پہرہ دیتے تھے۔ باقی آدمی، جن کی تعداد بوجہ خواجہ سراؤں اور خدمتگاروں کے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، خاص محل شاہی میں رہتے تھے، جسکو ایسا قلعہ نما بنایا گیا تھا کہ اُس پر قبضہ کرنا ناممکن تھا۔ اس لحاظ سے اسکو محل شاہی کہنا غلط ہے، بلکہ قلعہ کہنا چاہئے۔ بیشتر رعایا، بالخصوص وہ لوگ جو زیادہ دیندار تھے، اس فوج کو بنگاہ نفرت، حسد اور ذلت دیکھتے تھے کیونکہ اس کے وجود کے یہ معنی تھے کہ مؤخر الذکر لوگ غیر وفادار ہیں۔ اس فوج کے لوگوں کے نیزہ لانے

کو کافرانہ سمجھا جاتا تھا۔ خون خوار کٹے دینداراور دینی مقتداء جو بوجہ اپنے پیشہ اور اپنی ترکیبوں کے
لوگوں کی نظروں میں معظم و مکرم تھے اور جن کا اقتدار چند سال گزشتہ سے سلطنت کے لئے مخدوش ہو گیا
تھا اس فوج محافظ تن شاہی کو بہت ہی برا سمجھتے تھے ایسی قواعد دان اور مکمل فوج کا خرچ
اتنا تھا کہ سلطنت کی اسی قدر فوج کا خرچ ان سے بہت ہی کم تھا۔ یہ سارا بار بیت المال پر پڑتا
تھا۔ اس روز افزوں خرچ کو پورا کرنے کے لئے اس مال تجارت پر جو دار الخلافہ میں آتا تھا ایک نیا
ٹیکس لگایا گیا۔ اس ٹیکس کا بار اور اس کی وصولی کا طریقہ ایسا تھا کہ جو جنوبی حصہ شہر کو بہت ناگوار
تھا۔ اس گھنی آبادی میں پانچواں حصہ ان لوگوں کا تھا جو معلم و متعلم علوم دینیات تھے۔ نہ صرف ان
پر بلکہ بہت سے تاجروں اور مزدور پیشہ پر چند فقہاء کی گرفت مطلق العنانی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔
یہ فقہا نہ صرف معلمان دین ہی تھے، بلکہ ان کو اولیاء اللہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی سپاہی تنہا ان
جان پر کھیلنے والے مذہبی دیوانوں کے محلہ میں جاتا تھا تو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر امیر کی
سپاہ خاص کو بدنام کرنے کا کوئی موقعہ نہ چھوڑا جاتا تھا۔ خود بادشاہ ہی کچھ کم ہر دلعزیز نہ تھا۔ فرقہ
علماء اکثر امیر حکم کے مشتبہ خیالات اور عیش و عشرت کا مقابلہ ان کے والد ہشام کے اتقا وغیرہ
سے کرتا رہتا تھا؛ کیونکہ موخر الاسم امیر کی ذات سے ان کے فریق کو خاص طور پر فتوحات حاصل
ہوتی تھیں۔ امیر کے عیوب اور ذلات کو یہ مالکی علما اور بھی ابھار ابھار کر دکھلاتے تھے جب
مسجد کی میناروں پر سے اذان کی آواز آتی تھی تو کوچہ و برزن و باغات سے سینکڑوں آوازیں
نکلتی تھیں کہ "حی علی الصلوٰۃ" پکار لے "حی الصلوٰۃ!" اپنے ساتھیوں کی ترغیب اور ہمدردی
سے یہ اشرار بے خوف و خطر بادشاہ کو بدنام کرتے تھے مسجد کا تقدس، یا وہ موقعہ کہ جب سینکڑوں
مسلمانوں کی جبیں نیاز قبلہ شریف کی طرف جھکتی تھیں نہ سزا جسمانی کا ڈر ان مذہبی دیوانوں کو
جو اپنے تقدس میں مرے جاتے تھے، اپنے بادشاہ پر زبان طعن دراز کرنے سے باز رکھتی تھی
جب امیر بحیثیت خلیفۃ الرسول اپنا فرض منصبی ادا کرتے تھے تو وہ ان پر پھبتیاں کستے تھے
بازاروں میں وہ ان کی حرکات و سکنات پر مذاق اڑاتے تھے۔ امیر حکم کا ان کی وجہ سے

ناک میں دم آیا ہوا تھا۔ آخر جب اُن سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا تو انہوں نے حکم دیا کہ اس گروہ علماء میں سے دس آدمی گرفتار کر کے قتل کر دیئے جائیں۔ اس سرسری حکم کی تعمیل سے، بجاء اسکے کہ اور علماء کو عبرت ہوتی، اور وہ اپنی حرکات سے باز رہتے، اُنکا غیظ و غضب اور بھی بڑھ گیا؛ اور سب کاموں کو چھوڑ کر اپنے دس شہید بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا اُنہوں نے مقدم سمجھا۔ اِس کے مقابلہ میں عیوب کی روک تھام، نئے ٹیکس، کی سختی اور لامذہب کفار کی پرورش کا سوال پس پردہ جا پڑا۔ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ ایک سخت بغاوت ہونے ہی والی ہے ٭

لوگوں کو ورغلانے اور جوش دلانے والے ایک شخص یحییٰ نامی تھے وہ کچھ تو حیلہ باز تھے، اور کچھ جوشیلے؛ اپنے علم و فضل اور سخت مزاجی کی وجہ سے اُن کا شمار نہ صرف اولیاء اللہ بلکہ سیاست دان لوگوں میں تھا۔ وہ امام مالک ابن انسؒ کے شاگردوں اور امام موصوف کے خاص منظور نظروں میں سے تھے۔ اُن کے تقدس اور لیاقت علمی کی شہرت اُن کے ہم مذہبوں میں بہت زیادہ تھی، جس سے وہ اور بھی مغرور ہو گئے تھے۔ اب اُنہوں نے اپنی تمامتر توجہ اور قوتِ سازش کو بغاوت کرا دینے کی طرف مائل کر دیا×٭

ماہ رمضان کے آخری چہارشنبہ کو، جو مسلمانوں میں منحوس دن سمجھا جاتا ہے، راء علم بغاوت بلند کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ یحییٰ اور اُن کے رفقا، پند و نصائح دینی کے بہانہ سے، خفیہ اور علانیہ تقریروں میں لوگوں کو برانگیختہ کر رہے تھے کہ یکایک ایک سپاہی اور ایک صیقل گر میں لڑائی ہو پڑی، جس میں صیقل گر مارا گیا۔ دفعتاً جنوبی حصۂ شہر شمشیر بکف ہو گیا؛ اور دیکھتے ہی دیکھتے بغاوت اور جذبات انتقام کی وجہ سے دارالخلافہ کے اور حصوں میں بھی آفت برپا ہو گئی۔ غصہ میں بھرے ہوئے لوگ قلعہ شاہی پر پہنچے؛ اُنہوں نے محل کے خواجہ سراؤں، غلاموں

× مسٹر سکاٹ کو علماء دین سے جو تعصب ہے اُسی وجہ سے یہ الفاظ اُن کے قلم سے نکلے ہیں۔ ہم مسلمان تو اب تک یحییٰؒ کی تعظیم کرتے اور مقدس سمجھتے ہیں ٭ (مترجم)

اور چوکیداروں کو نکال باہر کیا۔ ادھر رسالہ کو حکم دیا گیا کہ وہ گلیوں کو باغیوں سے خالی کرالیں مگر
اُن کی کچھ پیش نہ گئی، امیر کی جنگ آزمودہ فوج بھی مجبور ہوگئی اور اسکو پسپا کر دیا گیا۔
قلعہ کے دروازے بند کر لئے گئے۔ مگر انفار کا جم غفیر غصہ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے
آگ لگا کر اور بھاری بھاری لکڑیوں سے ٹھوک ٹھوک کر دروازہ کھول لیا۔ قلعہ شاہی کے
لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ معاملہ نہایت نازک ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ متعصب گروہ قلعہ کے
اندر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو نہ کوئی سپاہی بچیگا، نہ خدمتگار شاہی۔ امیر حکم بھی اوروں
کی طرح اِس کو اچھی طرح جانتے تھے، لیکن اُنہوں نے ذرا سا بھی فکر ظاہر نہیں کیا۔ وہ
شور و شغب مچا ہُوا تھا کہ محل شاہی میں کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی، حملہ آور بڑھے
چلے آرہے تھے، کہ امیر نے اپنے خدمتگار خاص کو بلا کر حکم دیا کہ سر میں لگانے کا تیل لائے
غلام سخت حیران ہُوا، اور تیل لے آیا۔ امیر نے نہایت اطمینان کے ساتھ تیل ہتھیلی پر ڈالا،
اور سر اور داڑھی میں لگایا۔ اب تو غلام سے نہ رہا گیا، اور اس نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ
دشمن کلّہ پر موجود ہے، اور ہر شخص کو اپنی جان کا خوف لگا ہُوا ہے، اس وقت سنگار کرنے
کے کیا معنے ہیں؟ امیر نے جواب دیا کہ "ابن الکلب! جو شخص میرا گلا کاٹیگا اُسکو کیونکر معلوم
ہوگا کہ میں بادشاہ ہوں، سوا اسکے کہ اُس کی ناک میں میرے تیل کی خوشبو جائے!"
غرض جب امیر اپنا سنگار کر چکے تو اُنہوں نے اپنی خاص فوج کے افسر کو بلا کر حکم
دیا کہ وہ فوراً فصیل شہر پر جا کر باغیوں کو ان فقہا کے سر دکھا دیں جو پچھلی بغاوت کے موقعہ پر
قید کئے گئے تھے۔ اسکے بعد اُنہوں نے زرہ بکتر پہنی اور ہتھیار لگا کر باہر نکلے، اور اپنے
چچیرے بھائی عبید اللہ کو حکم دیا کہ رسالہ کے چیدہ آدمی لے جائیں اور جس طرح ہو سکے،
دشمنوں کی صفوں کو چیرتے اور گلیوں سے نکلتے ہوئے جنوبی حصہ شہر میں پہنچیں اور وہاں
جا کر آگ لگا دیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جیسے ہی علماء اپنے گھروں
کو جلتا ہُوا دیکھینگے تو وہ اُن کا پیچھا چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو جائینگے۔ چنانچہ یہی ہُوا۔ عبید اللہ

جو دفعتاً سیل کی طرح قلعہ سے نکلے تو لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے دریاء وادی الکبیر کو عبور کر گئے؛ اور چند ہی لمحہ کے بعد بیس جگہوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا، جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے امیر کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب تو باغی امیر کی دشمنی بھول گئے اور اپنے مال، خاندان اور گھروں کے بچانے کی فکر میں لگ گئے۔ وہ گھبرا کر پل کی طرف بھاگے۔ پیچھے سے امیر حکم اپنی فوج لے کر پہنچ گئے اور سامنے سے عبید اللہ نے مضافات کی فوج کی کمک لے کر حملہ کیا۔ کچھ تو یہ لوگ ڈر کے مارے بے حال تھے، کچھ مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں مذہبی دیوانے مارے گئے۔ ان میں سے تین سو آدمی جو بوجہ اپنے درجہ و رتبہ کے مشہور تھے، اور جنہوں نے لوگوں کو اشتعال دلایا تھا، پکڑے گئے؛ اور ان سب کو دریا کے کنارے اُلٹا ٹانگ دیا گیا۔ اسکے بعد مجلس شوریٰ میں ان لوگوں کے متعلق مشورہ ہوا۔ چند وزراء نے تو یہ راء دی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے، لیکن بعض وزراء جو بر سر رحم تھے اُن کی راء مانی گئی؛ اور یہ طے پایا کہ جنوبی حصہ شہر (جہاں یہ علماء رہتے تھے) تباہ کر دیا جائے، اور یہ لوگ تین روز کے اندر اندر جلا وطن کر دیئے جائیں، ورنہ قتل ہوں۔ اس حکم کی سخت بے رحمی کے ساتھ تعمیل کی گئی، جو حصہ شہر کہ تباہ کیا جانے والا تھا، پہلے تو اُسے لوٹا گیا، اور پھر تمام مکانات منہدم کر دیئے گئے۔ جو لوگ جلا وطن کئے گئے تھے اُن میں سے بعض تو بیچارے بہت خوار ہوئے اور بعض کی حالت اچھی رہی۔ بہت سے آدمی یہاں سے چلے تو سرحد پر پہنچتے پہنچتے قزاقوں کے ہاتھوں لُٹ گئے۔ آٹھ ہزار خاندانوں کو ادریس نے اپنے یہاں بُلا لیا کہ فیض کی آبادی ان کی ذات سے بڑھ جائیگی؛ نیز یہ کہ وہ عربوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہ سکینگے۔ پندرہ ہزار مضافاتی آدمی، سمندر کے راستہ سے، مصر بھیج دیئے گئے تھے؛ یہ وہ زمانہ تھا کہ اہالی مصر خلیفۂ بغداد سے نبرد آزما تھے۔ ان لوگوں نے مصریوں کا ساتھ دے کر اسکندریہ پر حملہ کر دیا، اور پھر اپنی آزادی کا اعلان کر کے وہ بندرگاہ دبا بیٹھے، اور عباسیوں کے علی الرغم بارہ برس سے زیادہ اُس پر قابض رہے۔ آخر جب منصو

کی فوج نے اُن کو آکر نکالا تو اُنھوں نے جزیرۂ کریٹ کو جا دبایا، جس کا بڑا حصہ اب بھی قیصر قسطنطنیہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ شدہ شدہ اس جزیرہ کو ان مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی، سو برس سے زیادہ اسکو اپنے قبضہ میں رکھ کر بحری قزاقوں کا مامن بنا لیا، اور تمام بحر شام میں لوٹ مار کرتے پھرے۔ آخر ۹۶۱ء میں یہ جزیرہ پھر بیزنطینی سلطنت کا ایک حصہ بنا۔ ان مسلمانوں کے قبضہ کا یہ نشان اب تک باقی ہے کہ اس کا نام "کندیہ" اب بھی عربی زبان کا ایک بگڑا ہوا لفظ ہے جسکے معنی خندق کے ہوتے ہیں۔

عوام الناس کو تو ایسی سخت سزائیں دی گئیں، اور اصلی گناہگار، جنھوں نے یہ غداری اور نمک حرامی پھیلائی، اُن کے ساتھ غیر معمولی رحیمانہ سلوک کیا گیا۔ اس کا جواب اس واقعہ سے ملتا ہے کہ بیشتر غدار غیر ملکی تھے؛ اور باوجود اسکے کہ وہ سچے اور کٹے مسلمان تھے، مگر پھر بھی وہ اچھی نگاہ سے نہ دیکھے جاتے تھے۔ برخلاف اسکے مالکی حضرات زیادہ تر خاندان قریش سے تھے، امیر حکم کو بہ نسبت اپنی ذاتی اہانت، اور اندیشۂ تخت و تاج کے عزبرداری اور معزز قبیلہ کا زیادہ لحاظ تھا۔ بعض سرکردگانِ بغاوت تو چھوڑ ہی دیئے گئے، بعض کو تھوڑی مدت کی قید بھگتنی پڑی، اور بہت سوں کو معافی دیدی گئی۔ ان سب کے سرغنہ، یحییٰ، اُن ہی لوگوں میں سے تھے جنکی عفو تقصیر ہوئی؛ اور وہ اپنی قابلیت یا بے خوفی کی وجہ سے پھر امیر کے مُنہ لگ گئے۔

جو فوجی مہمات کہ برسوں شرقی اندلس میں جاری رہیں اُنکا کوئی حتمی یا دائمی نتیجہ، بوجہ اہالی فرانس کی اولوالعزمیوں، والیوں کی نمک حرامیوں اور امیر حکم کے ضعف اور بے پروائی کے، نہیں نکلا۔ شارلیمین نے دو مرتبہ طرطوشہ کا محاصرہ کیا، مگر دونوں ہی دفعہ مُنہ کی کھانا، اور شرمندگی کے ساتھ واپس جانا پڑا۔ پہلا محاصرہ تو اس لئے اُٹھا لیا گیا کہ اہالی فرانس نے سخت شکست کھائی، مگر عربوں نے اس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا۔ دوسری بار جو حملہ کیا گیا اُس میں تیاری پوری نہ تھی؛ اور فتح کا ارادہ اس طرح چھوڑا گیا کہ جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ

حملہ آوروں نے بزدلی کی، یا وہ جی ہی ہار گئے۔ مہمات نے زمانۂ قدیم کی کمینگاہوں کی لڑائی کی سی صورت اختیار کر لی، وہ باقاعدہ اور منتظم جنگ ہی نہیں رہ گئی۔ گاتھک مارچ کے آبادکاروں میں صلیبی جنگوں کا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا؛ کیونکہ وہاں کے نظام اقطاعی مالک سخت جابر اور ظالم تھے؛ اُنہوں نے اُن کی زمینیں چھین لیں، اُن پر بڑے بڑے سخت ٹیکس لگائے اور اُن حقوق کی اصلا پروانہ کی جن کا وعدہ اُن سے بشرط نمک حلالی کیا گیا تھا۔ ان خرابیوں کے انسداد کے واسطے شارلیمین سے استمداد کی گئی، لیکن ایک تو اُن کے دارالسلطنت سے گاتھک مارچ بہت دُور تھا، دوسرے اُنہوں نے جو کچھ فیصلے کئے اُن کو یہاں کے مغرور نوابوں نے نافذ نہ ہونے دیا۔ جو احکام کہ شاہنشاہ شارلیمین نے ان نوابوں کے نام صادر کئے، اور جن میں وقتاً فوقتاً اُن کو عدل و انصاف کی طرف متوجہ کیا گیا، اور رعایا کے جزبی حقوق تک بتلائے گئے، وہ قرون وسطےٰ کے دستور العملوں میں نہایت دلچسپ اور قابل دید چیز ہے۔ امیر حکم کی حکومت کے آخری تین برس اہالی فرانس کے ساتھ امن سے کٹے کیونکہ قرطبہ اور اے لاشاپل میں ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔

ہشام اور الحکم کے عہد حکومت میں الیسٹریاس اور قرطبہ کے درمیان میں جو لڑائیاں ہوتی رہیں وہ اگرچہ نہایت زور کی تھیں، اور اُن کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں رہا اور کبھی دوسرے کی، مگر عیسائی اتنے قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ بے دغدغہ جا کر مسلمانوں سے چھیڑ خانی کر کے بچ کر جاتے، اور محفوظ رہتے۔ مسلمانوں کی توجہ خانگی بغاوتوں کے فرو کرنے اور اہالی فرانس کی اولوالعزمانہ تدابیر کا مقابلہ کرنے پر اس قدر مبذول رہی کہ اُنہوں نے اپنے کفار ہمسایہ کے چند حملوں کی تو پروا نہیں کی؛ بعض مہمیں جو کوہستان الیسٹریاس میں گئیں، وہ کامیابی پر ختم ہوئیں، اور بعض میں بالکل تباہ ہی ہو گئیں۔ عیسائیوں کے غزوات نے اسلامی آبادی کے جلیقیہ اور لوسی ٹینیا میں آفت برپا رکھی۔ کبھی کبھی اُن کو سخت ہزیمتیں اُٹھانا پڑیں، لیکن اُن کا بدلہ اُنہوں نے دوسرے سال کی مہم سے اُتار لیا۔ اور جب کبھی تمام سال کی لڑائیوں کے نتائج پر غور کیا گیا

تو معلوم ہوا کہ عیسائی ہی فائدہ میں رہے۔ اس سے اُن کا اقتدار بڑھ گیا اور قوم باسک، نواب گاتھک مارچ اور مشہور و معروف شاہ شارلیمین کو اپنا حلیف بنا کر اُنہوں نے اپنا استحکام کر لیا۔ ابتداءً اُن کی حدودِ سلطنت ناقابلِ اعتنا تھیں مگر اب کوہستان کے جنوب میں بڑھنی شروع ہوگئیں۔ یہ پہاڑ قدرتی سد تھے کہ جنکی چوٹیوں اور کھڈوں کے اُس طرف جاتے ہوئے اُن کو ڈر معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ روز روز لڑائی رہتی تھی اس لئے قوم کی قوم سپاہی ہوگئی۔ اُن کی کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا رعب بڑھتا چلا گیا؛ اور اُن کے تجربہ نے یہ سکھلا دیا کہ وفاداری، نمک حلالی، اطاعت اور نظام کے قائم رکھنے میں اُن کا سراسر فائدہ ہے۔ خواہ اس وجہ سے کہ وہ اتفاق سے اچھے خاندان میں پیدا ہوگئے، خواہ اس لئے کہ اُن میں ذاتی قابلیت تھی، اُن کے جتنے بادشاہ ہوتے رہے اُن میں سے بیشتر وہ لوگ تھے کہ جو اپنے نازک فرائض کے ادا کرنے کے اہل تھے۔ ان میں سے کسی بادشاہ نے حالت امن و جنگ میں وہ شہرت نہیں پائی جو الفانسو دوئم، الملقب بہ چیسٹ (متقی) نے۔ مورخین نے اس لقب "چیسٹ" کی مختلف وجوہ بتلائی ہیں۔ اتفاق اس پر ہے کہ لوگوں نے اُن کو غلطی سے متقی سمجھ لیا تھا، اور نظام قائم کرنے میں نالائق۔ اُن کی زندگی گویا کفار (مسلمانوں) کے برخلاف مجسم مسلسل صلیبی جنگ تھی۔ ہر ایک قسم کی سیاسی چال، تمام تر ہمت، استقلال، آرام و آسائش کو حرام کر کے، بلکہ آزادی کو خطرے میں ڈال کر اُنہوں نے اُن فوائد کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جو مسیحیوں کی ناموری سے پیدا ہو سکتے تھے۔ شارلیمین سے مدد لینے میں اُنہوں نے گویا اُن کے سامنے سجدے کئے ہیں اور لاکھوں روپیہ کے تحفہ و تحائف اُن کو بھیجے ہیں۔ ان ترکیبوں سے قیام سلطنت کے سو برس کے اندر اندر مملکت الیسٹریاس دو مرتبہ ایک غیر ملکی سلطنت کی گویا زمینداری رہ چکی۔ الفانسو دوئم نے برخلاف اپنے بھائی مارے گیٹو کے عیسائیوں سے دوستی پیدا کی۔ موخر الذکر الفانسو اول کا صلیبی بیٹا ایک بربری قیدی عورت کے بطن سے تھا۔ اس نے ہمیشہ امیر قرطبہ کو اپنا بادشاہ سمجھا۔ اسکی آزادی اگر قائم رہی تو

محض اس وجہ سے کہ وہ دربار قرطبہ کا فرمان بردار غلام بنا رہا۔ اور دوسرے اس لئے کہ اُس نے سو کنواری عیسائی لڑکیاں بطور خراج کے دینی منظور کر لی تھیں۔ یہ شرط وہ تھی کہ جس سے بڑھ کر کوئی شرمناک شرط نہیں ہو سکتی۔ الفانسو کی فوجیں کئی مرتبہ آں روڈ ڈورو اور ٹیگس پہنچ گئیں۔ انہوں نے لسبن کو جو مرفہ الحال شہر تھا فتح کر کے لٹوایا۔ لیکن چونکہ یہ مقام اُن کے دارالسلطنت سے دور تھا اور اُن کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ اُس کو اپنے پاس رکھ سکتے، اس لئے وہ چند ہی روز کے بعد اُسکے چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے۔ اُن کے تہور اور جنگی کارناموں کی وجہ سے مسلمانوں کو اُن کے ملک پر قبضہ کر لینے میں ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ باوجود اسکے کہ وہ ہمہ وقت جنگ میں مصروف رہے، مگر پھر بھی اُنہوں نے اتنا وقت نکال لیا کہ نئے گرجا بنوا دیئے، بہت سی خانقاہیں قائم کر دیں، اپنے دارالسلطنت اویڈو کو بڑھایا اور اُسکو خوبصورت بنایا۔ اُن کی سخاوت اور فیاضی کے سب سے بڑے مورد پادری رہے۔ یہی وقت تھا کہ جب ایک بیہودہ فسانہ گھڑا گیا۔ جس نے سپین کی سیاسی اور دینی زندگی پر وہ اثر ڈالا کہ جس کا ظن و گمان بھی اُن پادریوں کو نہ تھا جنہوں نے اس افسانہ کو گھڑا۔ کہا گیا کہ جلیقیہ کے ایک جنگل بیابان میں جہاں انسان کا کم گذر ہوتا ہے یکایک انوار الٰہی نظر آئے جسکے ساتھ فرشتگان ملاء اعلےٰ تھے، ان ہی فرشتوں نے یہ بتلایا کہ اس مقام پر سینٹ جیمس رسول کی قبر ہے۔ دنیا کو بطریق آیریا کا ممنون رہنا چاہیئے کہ اُن ہی کو یہ انوار قدس دکھلائی دیئے، اور اُن ہی سے سروش غیبی نے باتیں کیں۔ اُنہوں نے فوراً اپنے بادشاہ کو اس نعمت غیر مترقبہ سے مطلع کیا۔ وہاں فوراً ایک گرجا بنا دیا گیا، جو رفتہ رفتہ بہت بڑا معبد بن گیا۔ تمام یورپ کے دور و دراز ملکوں سے سریع الاعتقاد دیندار زیارت کے لئے آنے لگے۔ شدہ شدہ وہاں ایک شہر آباد ہو گیا۔ اور جب آیریا سے بطریقیہ یہاں اُٹھ کر آ گیا تو اس شہر کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور وہاں کے باشندوں نے زائرین سے تجارتی داد و ستد کر کے بڑا فائدہ اٹھایا اور وہ گرجا بھی دیکھتے ہی دیکھتے دیندار اور شکر گزاروں کی نذور سے مالا مال

ہو گیا۔ سادہ لوح باشندگان البسٹریاس نے کبھی کسی سے یہ نہ پوچھا کہ اس تمام قصہ میں صداقت کا کوئی ذرہ بھی ہے، نہ انہوں نے یہ قیاس کیا کہ آیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے۔ چونکہ پادری صاحبان ہی اس قصہ کے مصنف تھے اس لئے اُن کا حق تھا کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ مگر اسی پر انہوں نے اکتفا نہ کیا، لوگوں کو ڈرایا، دھمکایا، مکر کا جال بچھایا، غرض ہر ممکن ذریعہ سے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے جُہلا کو لوٹا۔ لطف یہ ہے کہ معجزات و کرامات کا سلسلہ پھر بھی بند نہ ہوا۔ روز کوئی نہ کوئی معجزہ وہاں ہو ہی جاتا تھا، جس سے اس گرجا کی عظمت بڑھتی جاتی تھی، اور پادریوں کا وہاں طمع دن بدن کھلتا چلا جاتا تھا۔ یہ معجزستان اُن کراماتوں سے بھی کہیں بڑھ گیا جو روم کے گورغریباں کے شہدا کی قبروں سے آئے دن ظاہر ہوتی رہتی تھیں۔ یہ تھی اصلیت شہر و کلیساء سینٹیا گوڈی کمپوسٹیلا کی،[۱۶] جسکے قیام سے سلطنت قشتالہ کی وسعت اور دین مسیح کو بڑی تقویت پہنچی، سب سے پہلے جوش دینی کا تخم یہیں بویا گیا، جس سے کہ بہت سی نایٹ ہڈ قائم ہو گئیں، اور جس کا انجام یہ ہوا کہ قبر مسیح (علیہ السلام) کی بازیافت کے لئے چڑھائیاں ہوئیں اور لاکھوں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا۔ چونکہ یہ معبد ایک جنگل بیابان میں واقع تھا، اور سینٹ جیمس کی بدحالی سے اسے بہت مناسبت تھی، اس لئے لوگوں کا اعتقاد، اور اُس مقام کا تقدس بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ امر کہ یہ تبرک فرضی تھا، اور اُس کا یوں معلوم ہونا محض افسانہ اُس وقت تک کوئی اثر نہ رکھتا تھا کہ جب تک لوگ اُسکے معتقد، اور اُسکو سجدے کرتے رہے۔ امید نجات اخروی، جو ہر دیندار کا مقصود بالذات ہے، اور پادریوں کے اقتدار کی ترقی، جو ہر کلیسا کا اصل اصول ہے، اُن سب کا مرکز یہی فرضی اور بے اصل قبر رسول تھی۔ جب کہیں کسی میدان جنگ میں بہادر پرستاران صلیب جی ہارنے لگتے تھے تو رسول موصوف، سفید گھوڑے پر سوار، کسی پادری کو نظر آ جایا کرتے تھے، جس سے سب کا دل بڑھ جاتا تھا اور مشتبہ جنگ کا پاسہ پلٹ جاتا تھا۔ یہ امر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کسی بڑے سیاست دان کی تدبیر اور کسی بڑے نامور سپہ سالار کی بہادری،

تعلیقات باب نہم

(۱) بولک = BOOLK مجھے اسکے حالات باوجود تلاش نہیں ملے۔ غالباً یہ کوئی چھوٹا سا مقام تھا کہ جس کا اب وجود نہیں رہا۔ (مترجم)

(۲) سُفینڈا = SUFENDA بشرح صدر۔

(۳) لورقہ۔ لورکا = LORCA صوبۂ مرسیہ کا ایک شہر ہے ایک دریا کے کنارے آباد ہے مسلمانوں کے زمانہ میں اس نے اچھا عروج پایا۔ اس کے قریب ہی ایک پُرفضا پہاڑ ہے اور اُس پر مسلمانوں کا بنایا ہوا قلعہ اور بہت سے آثار ہیں۔ اس وقت صوبہ مرسیہ میں مرسیہ کے بعد دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ بڑے بڑے مکانات ہیں آٹھ گرجا اور نو دیر (خانقاہ) ہیں۔ آٹا پیسنے اور تیل نکالنے کے کارخانے ہیں۔ شورہ نکلتا ہے۔ بارود بنتی ہے سیسہ کی کان ہے۔ روئی کے کارخانے بھی ہیں۔ آبادی چالیس ہزار سے زیادہ۔ (مترجم)

(۴) تنجیر = مراکش کا ایک بندرگاہ آبنائے جبل طارق پر واقع ہے اسی نام کا شہر بندرگاہ سے ۳۸ میل ہے۔ دو پہاڑیوں پر آباد ہے۔ گندہ سا شہر ہے۔ مکانات اور بازار بہت تنگ ہیں۔ شہر کے گرد پرانے زمانہ کی فصیل ہے۔ یہ مقام کچھ عرصہ اہالی پرتگال کے پاس رہا۔ پھر بائیس برس انگریزوں کے پاس۔ (مترجم)

(۵) طرطوشہ = ٹورٹوسا = TORTOSA سپین کے صوبہ طرکونہ میں دریائے ایبرو کے اوپر شہر ہے۔ جائے وقوع بہت پرفضا ہے مگر شہر بہت گندا ہے مکانات تنگ تاریک ہیں مسلمانوں کے زمانہ میں عروج پر تھا۔ اب تو برائے نام تجارت ہوتی ہے مچھیاروں کی کثرت ہے آبادی پچیس ہزار (مترجم)

(۶) بلنسیہ = ولنشیا = VALENCIA ایک زمانہ میں سپین میں ایک خودمختار علاقہ تھا۔ اب تین صوبوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ مشرقی سپین میں بحر شام پر واقع ہے شمال میں قتلونیہ کا علاقہ اور جنوب مغرب میں مرسیہ۔ اضلاع متوسطہ میں میدان ہیں جو بحر روم سے ملحق ہیں۔ شمال و جنوب میں

پہاڑ ہیں۔ اس علاقہ کی آب و ہوا تمام سپین میں بہترین ہے۔ نہایت سرسبز و شاداب اور زرریز ہے۔
ہیورٹا (لغوی معنی باغ) واقعی باغ ہے۔ ہر سال چار چار فصلیں کاشتکار اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ گیہوں اور
جو بہت زیادہ نہیں ہوتے، مگر چاول اتنے ہوتے ہیں کہ نہ صرف تمام سپین کا گزارہ ان ہی پر ہے بلکہ
بیرون ممالک بھی بھیجے جاتے ہیں۔ لوہے، سیسے، تانبے، شنگرف اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ ضلع الیوفیرا
کی جھیلوں میں مرغابیاں اور مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ بلنسیہ کے باشندوں میں مسلمانوں کے خون کی آمیزش
بہت زیادہ ہے، بلکہ بعض خاندان تو ایسے ہیں کہ وہ خالص مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسی لئے
یہاں کے لوگ بہت محنت کش اور صناع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی سپین بھر میں بوجہ صنعت و
حرفت اس علاقہ کو شہرت ہے۔

شہر بلنسیہ سمندر کے کنارے پر آباد ہے۔ اس وقت تو دار الصوبہ ہے، کسی زمانہ میں دار السلطنت تھا۔
میڈرڈ سے ۲۴۹ میل ہے، اور ان دونوں شہروں کے درمیان ریل جاری ہے۔ ہیورٹا، جو واقعی ایک باغ
ہے، شہر کے گرد کے علاقہ کو کہتے ہیں۔ اسکے شاداب ہونے کا اصل باعث وہ چھوٹی چھوٹی نہریں اور نالیاں
وغیرہ ہیں، جو مسلمانوں نے اب سے نوسو برس پیشتر بنائے تھے، اور باوجود اس کے کہ ان کی خبرگیری نہیں ہوتی
مگر آج تک کام دیئے جاتے ہیں۔ چکوترہ، نارنگی، کھجور، شہتوت وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ آب و ہوا بھی
اس میں بہت کچھ مدد گار ہے۔ شہر بھی خوبصورت ہے۔ گلیوں میں بھی پکا فرش ہے۔ مکانات ایک دوسرے
سے ملے ہوئے بنے ہیں کہ گرمی کی مضرت سے محفوظ رہیں۔ یہاں ایک اسقف رہتا ہے۔ ایک یونیورسٹی
بھی ہے، اور اسکے کتب خانہ میں چالیس ہزار کتابیں ہیں۔ ریشم کا اب بھی بہت کام ہوتا ہے، سوت
بنتا ہے۔ ٹوپیاں، شیشے کی چیزیں، چمڑا وغیرہ بھی بہت بنتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے زمانہ کا عروج نہیں
خیال ہے، پھر بھی ان ہی کی برکت سے اب بھی شہر کی پونے دو لاکھ کی آبادی ہے۔ (ختم)

(۷) برشلونہ = بارسلونہ = BARCELONA سپین کا نہایت مشہور شہر اپنی صنعت سے
کی وجہ سے اسکو بہت شہرت ہے۔ پرانا فصیل بند مقام ہے، مگر مسلمانوں نے ایک پہاڑ جا
بنا کر فصیل شہر اور اسکے برج وغیرہ کو بیکار کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں ایک بہت نا...

تھی اب بھی ایک یونیورسٹی ہے۔ اسکے کتب خانہ میں قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اسکے علاقہ میں بہت سی تاریخی لڑائیاں ہوئی ہیں +

برشلونہ اور حوالی برشلونہ کی شادابی اب تک مسلمانوں کے طفیل میں باقی ہے +

(۸) گیرونا = GERONA رومیوں کے زمانہ کا شہر اب مملکت سپین میں ہے اس پر ہمیشہ سے حملوں کی آفات رہی ہیں۔ برشلونہ سے ساٹھ میل پر واقع ہے۔ شہر کے دو حصے ہیں ایک پرانا، دوسرا نیا پرانا شہر بہت خوش فضا مقام میں آباد ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا گرجا چودھویں صدی کا بنا ہوا ہے یہاں کاغذ، صابن اور چمڑے کی صنعت ہے۔ سوت بھی کاتا اور بنا جاتا ہے۔ بڑی مضبوط فصیل شہر اب بھی باقی ہے۔ آبادی پندرہ ہزار + (مترجم)

۹ لاردہ = لیریڈا = LERIDA سپین کا ایک شہر اسی نام کے صوبہ کا دار الصوبہ دریاء سیگرے (یکے از معاون ایبرو) پر آباد ہے۔ برشلونہ سے پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ شہر کچھ زمین مسطح پر اور کچھ بلندی پر آباد ہے۔ بلحاظ ضروریات جنگی و فوجی اہم مقام ہے۔ شہر کے گرد فصیل اور خندق ہے اور درمیان میں ایک قلعہ شہر کا محافظ ہے۔ بازار اور کوچے پیچ در پیچ تنگ و تاریک ہیں قلعہ میں تیرھویں صدی کا بنا ہوا ایک بڑا گرجا ہے۔ اونی اور سوتی کپڑا بنتا ہے چمڑے شیشے اور بارود کی صنعت بھی چلی جاتی ہے۔ آبادی ڈھائی ہزار سے کچھ زیادہ۔ یہاں رومیوں کے زمانہ میں دو بہت بڑی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ ایک مذہبی کونسل ۵۲۴ء میں یہاں منعقد ہوئی تھی مسلمانوں کے زمانہ میں تو خوب عروج پر تھا۔ اب تو دن بدن آبادی گھٹتی چلی جاتی ہے قلعہ، فصیل اور خندق بھی مسلمانوں ہی کے زمانہ کی ہے (مترجم)

(۱۰) جیرونہ = گیرونا = GERONA سپین کا ایک شہر اور اسی نام کے صوبہ کا صدر مقام ہے شہر برشلونہ سے ساٹھ میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی جانب واقع ہے اس شہر کے دو حصے ہیں ایک قدیم اور ایک جدید مؤخر الذکر ایک پہاڑی پر آباد ہے مگر نہایت خوشنما ہے اس میں ایک خوبصورت اور بلند گاتھک گرجا بھی ہے جسکی تعمیر ۱۳۱۶ء میں شروع ہوئی تھی۔ یہاں کاغذ، صابون اور چمڑے کی صنعت ہوتی ہے شہر کے گرد ایک زبردست شہر پناہ ہے اور اسکے اندر چار قلعہ ہیں۔ اس شہر کی بناء

رومیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، اور ایام گزشتہ میں شاہان آراگون کی جاء رہائش تھا۔ ۱۸۰۹ء میں اہل فرانس نے اس کا نہایت شدید محاصرہ کیا تھا۔ اسکی آبادی پندرہ ہزار کے قریب ہے۔ (مترجم)

(۱۱) چنچیلا = CHINCHILLA سپین کے صوبہ البا سیٹ کا ایک شہر ہے، جو دار الصوبہ سے دس میل کے فاصلہ پر، ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ شہر فصیل بند ہے، اور وسط میں ایک قلعہ ہے۔ یہاں ململ، چمڑہ، مٹی کے برتن، شیشہ، الات بنتے ہیں، اور مقامی غلوں کی تجارت ہوتی ہے۔ آبادی قریباً چودہ ہزار۔ (مترجم)

(۱۲) اوسونا = AUSONA مجھے اس کا حال نہیں ملا۔ (مترجم)

(۱۳) کارڈونا = CARDONA صوبہ قتلونیہ کا ایک شہر، برشلونہ سے ۴۴ میل کے فاصلہ پر دریاء کارڈے نر کے کنارے پر آباد ہے۔ اسکے گرد فصیل ہے، اور چھ دروازے۔ بلندی پر ایک قلعہ ہے۔ اس کی شہرت نمک کے ایک پہاڑ کی وجہ سے ہے جو اس کے قریب ہی ہے، جس کی بلندی پانچ سو فیٹ ہے اور دور قریباً تین میل جب سورج کی شعاعیں اسکے اوپر پڑتی ہیں تو عجیب لطف دیتی ہیں آبادی قریباً تین ہزار۔ (مترجم)

(۱۴) مانریسا = MANRESA اسکے حالات بھی نہیں ملتے۔ (مترجم)

(۱۵) روسی لون = ROUSILLON کسی زمانہ میں فرانس کا ایک صوبہ تھا، جسکے شمال میں لینگیوڈاک، مشرق میں بحر روم، جنوب میں پاے رینیس اور مغرب میں ضلع فایکس تھا۔ اب یہ فرانس کا ایک ضلع ہے۔ (مترجم)

(۱۶) نظام اقطاعی = FEUDAL SYSTEM یہ معاشری نظام اس قسم کا ہے کہ یورپ کی تقریباً ہر سر بر آوردہ قوم نویں صدی مسیحی کے آغاز سے تیرھویں صدی کے اختتام تک اسکے آئین قوانین کے ماتحت رہی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ آج کل بھی یورپ کی موجودہ زندگی میں اسکے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس نظام کی ماہیت سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے طبقۂ ادنےٰ سے شروع کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ طبقات اعلےٰ تک اسکا نشو و نما کیوں کر ہوتا ہے۔ ملک انگلستان میں اس کا آغاز ولیم اوّل کی فتح سے ہوا۔ ترتیب یہ تھی کہ تمام مفتوحہ علاقہ فاتح کی ملکیت تصور ہوتا تھا، جو اس کو

عبدالرحمن ثانی کی تخت نشینی۔ عبداللہ کا تمرد۔ گاتھک مارچ پر حملہ۔ شاہنشاہ یونان کی سفارت
میریڈا کی بغاوت۔ طلیطلہ کا فتنہ و فساد۔ نارمنوں کا حملہ۔ عیسائیوں پر جبر و جور۔ عبدالرحمن ثانی کا
انتقال۔ اُن کا شان و شوکت کا شوق۔ اُن کی خوبیاں۔ اُن کی علوم و فنون کی سرپرستی۔
زریاب۔ اُن کا وفور علم و ہنر طروب کی سازش۔ محمد کی چال۔ اُن کا تعصب مذہبی۔ طلیطلہ کی
بار ثانی بغاوت۔ بنو قصی کا عروج۔ الیسٹریاس سے جنگ۔ ابن مروان کی بغاوت۔ بیسر اپناڈوی
رونڈا۔ ابن حفصون اُن کی اصلیت اور کارنامے۔ محمد کا انتقال اور اُن کے خصایل۔
اسلامی طاقت کا زوالِ اولین۔

سیاسی کامیابی اور دماغی ناموری کے لئے جتنی قابلیت کی ضرورت ہے سالہا سال
کا تجربہ کاروبار ملکی اور مہارت فوج و قیادت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے عبدالرحمن ثانی اکتیس
برس کی پختہ عمر میں تخت امارت پر جلوہ افروز ہوئے اُن کی انصرام امور ملکی کی لیاقت' اور رعایا
کے لئے خدمات جلیلہ نے لوگوں کو اُن کا گرویدہ بنا ہی لیا تھا؛ اس پر اُن کے حسن صورت
اور دلاویز تقریر نے رعایا کی فریفتگی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اُن کی ہر دلعزیزی کا اندازہ
اُن خطابوں سے ہوتا ہے جو اُن کی گرویدہ رعایا نے اُن کو دیئے تھے۔ کم عمری ہی میں

لوگ اُن کو منظفر کہنے لگے تھے؛ اور تخت نشینی سے پہلے جو فیاضیاں اُنہوں نے کیں اُن کی وجہ سے اُن کی کنیت "ابو المساکین" بالکل صحیح تھی۔ چونکہ آخر زمانۂ دولت میں امیر حکَم کو جسمانی و دماغی کمزوری لاحق ہوگئی تھی، اس لئے اُن کو کاروبار سلطنت چھوڑ دینا پڑا تھا؛ عملی طور پر مہمات و فرائض مملکت اُن کے بیٹے اور جانشین ہی ادا کیا کرتے تھے اور تمام ذمہ داریاں اُنہوں نے اپنے سر لے لی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنو امیہ میں یہ ایک لازمی بات ہوگئی تھی کہ جو شخص تخت پر بیٹھے اُسکو خانگی قصہ و قضایا ضرور پیش آئیں؛ چنانچہ امیر عبدالرحمٰن ثانی بھی اس سے محفوظ نہ رہے اُن کے دادا کے بھائی، عبداللہ، بہت مسن ہوگئے تھے، مگر اُن کے دل میں ابھی تک بلند نظری کی آگ مشتعل تھی۔ اُنہوں نے نئے امیر کی تخت نشینی کا حال سنتے ہی اپنے بہت سے رفقاء اور متوسلین کو ساتھ لیکر تنجیر کو خیرباد کہا؛ اور اس بنا پر کہ وہ بانی سلطنت کے بیٹے ہیں، اپنے لئے امیر اندلس ہونے کا اعلان کر دیا۔ اُن کو اپنی کامیابی کا اس لئے اور بھی یقین تھا کہ اُن کے تین بیٹے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے، امیر حکَم کے معتمد علیہ اور مشار الیہ تھے، اور اس قدر مقتدر حیثیت حاصل تھی کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی حیثیت عطا کرنا امیر کے اختیارات سے باہر تھا۔

لیکن عبداللہ کو بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ جس کو وہ یقینی امید سمجھتے تھے، وہ محض اُن کے دل کا فریب تھا۔ جیسے ہی وہ آکر اترے امیر عبدالرحمٰن ثانی کے رسالہ نے اُن کی فوج کو ایسی شکست دی کہ اُن کو چھپنے کو بھی جگہ نہ ملی؛ اور وہ خود بلنسیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے بجاء اسکے کہ اُن کے بیٹے اُن کے مددگار ہوتے، اُنہوں نے حتے المقدور اُن کی ناکامی میں کوشش کی؛ اور خود جا کر اُن کو سمجھایا کہ "آپ کے حق میں یہی بہتر ہوگا، اور آپ کی شفقت پدری کا تقاضاء یہ ہونا چاہئے کہ آپ یہ غدارانہ خیال چھوڑ دیں،" بیٹوں کے عجز و انکسار سے مجبور ہو کر باپ نے، بادل ناخواستہ، اپنے دعوے سلطنت سے ہاتھ اُٹھا لیا، اور اپنے

پوتے کے ہاتھ پر بیعت کر لی حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی عرض و معروض کا تو کچھ خیال نہ کرتے، مگر اتفاق سے ایک بدقانی ہو گئی ممکن نہیں تھا کہ ایشیا کا رہنے والا واہمہ پرست ایسی بات دیکھتا اور پھر اپنی ہٹ پر قائم رہتا۔ عبداللہ کو باریابی کا موقعہ دیا گیا؛ اور اُن کے بیٹے اُن کو امیر کی خدمت میں لے کر آئے۔ امیر نے اُن سے معانقہ کیا؛ اور نہ صرف اُن کا قصور ہی معاف کیا، بلکہ اُن کو مرسیہ کا والی مقرر کر دیا: جہاں وہ اپنے مرتے دم تک امن و عافیت کے ساتھ رہے +

امیر عبدالرحمن ثانی تخت پر بیٹھتے ہی جس فتنہ میں پڑ گئے وہ ایسا تھا کہ شاید اُس کے نتائج بُرے نکلتے؛ تاہم اس کا اثر بلند حوصلہ اور نو دولت گاتھک مارچ پر پڑے بغیر نہ رہا۔ یہاں کے لوگوں نے ایک بڑی فوج جمع کی اور مسلمانوں کی حدود میں آ کر دریا سیگرہ کے کنارے تک کو تباہ و برباد کر گئے؛ اور چونکہ مقابلہ میں کوئی نہیں آیا، اس لئے بے دغدغہ بہت سا مال غنیمت لے کر چلتے بنے۔ اس مہم کے سرکردہ برن ہارٹ کاونٹ آف برشلونہ تھے، جو مشہور و معروف ولیم آف ٹولوس کے بیٹے تھے، جن کو لوئی نے وہاں کی ریاست عطا کی تھی؛ کیونکہ اُن سے پہلے جو رئیس تھا اُس پر اُس زمانہ کی فوجی عدالت نے نمک حرامی کا جرم ثابت کر دیا تھا۔ بجائے کسی گاتھ کے، ایک غیر ملکی کو رئیس بنانا (جسکی خودسری اور آزادی اُس کی رعایا کی نگاہ میں بجائے مبغوض ہونے کے پسندیدہ نظر سے دیکھی جاتی، اور جسکی رگوں میں سپین کا خون ہوتا) نہایت امید افزا معلوم ہوتا تھا اور لوگ اس دلخوش کن دھوکے میں تھے کہ شاید اس تدبیر سے وزیگاتھ کی سلطنت از سرِ نو قائم ہو جائے۔ مگر یہ ایسی پالیسی تھی کہ جو اہالی فرانس کی کامیابی اور استحکام کے لئے لازماً منحوس ہوتی +

امیر عبدالرحمن کو یہ ضروری معلوم ہُوا کہ ان حملوں کی روک تھام کے لئے جو اس وقت اُن کی کمزوری کے خیال سے کئے گئے تھے، کچھ سیاسی مظاہرہ کریں۔ وہ اس پر بھی تیار

BERNHART ※ SEGRE x

تھے کہ ایک غزوہ کو اپنی تخت نشینی کی درخشندہ یادگار بنائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اُس فوج
سے جو عبداللہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے جمع کی تھی گاتھک مارچ پر حملہ کرنے کی تیاری
کردی۔ فوج طلایہ نے بسرکردگی والی عبدالکریم جو بلنسیہ سے آئی تھی، برشلونہ کے عیسائیوں
پر حملہ کیا، اور چھوٹے سے مگر سخت مقابلہ کے بعد اُن کو میدان جنگ سے بھگا کر شہر میں داخل
کردیا۔ امیر خود بھی بنفس نفیس اپنی فوج لئے ہوئے وہاں پہنچ گئے، اور شہر کا محاصرہ کرلیا گیا
کئی مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ سیڑھیاں لگا کر شہر میں داخل ہوجائیں، مگر اس میں کامیابی نہ
ہوئی، اور چونکہ امیر کے پاس محاصرہ کامل قائم رکھنے کے واسطے فوج کافی نہ تھی، اس لئے
یہ ارادہ ہی چھوڑ دیا گیا۔ مسلمانوں کی تمام فوج مضافات میں پھیل گئی، اور تمام علاقہ پر
جو کاونٹ آف برشلونہ کے پاس تھا، قبضہ کرلیا۔ عیسائیوں کو ہر معرکہ میں ہزیمت ہوئی، وہ
گھبراہٹ میں، اپنی حفاظت کے لئے، سب سے اونچی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور کھنڈروں میں جا گھسے۔
قلعوں پر حملہ کرکے فوج محافظ کا قتل عام کردیا گیا۔ وہاں کے رہنے والے بہت ہی ڈر گئے۔ ان
خوفزدہ لوگوں میں بہت سے نہایت تجربہ کار سپاہی فرانسیسی سلطنت کے بھی شامل تھے، جو کہ شاہی
فیاضیوں اور معافیوں کی طمع، اور جنگ اور قسمت آزمائی کے لئے گاتھک مارچ میں آبسے تھے
لیکن یہ مہم جس میں اتنی کامیابی ہوئی، ایک غزوہ سے زیادہ نہیں رہی۔ یہ کوشش نہیں کی گئی کہ
مفتوحہ علاقہ پر مستقل قبضہ رکھا جائے۔ دارالسلطنت گاتھک مارچ ہی اب تک محفوظ رہا تھا،
اور گو اس کو امید کمک باقی نہ تھی، اور اسکی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ وہ ایک بھی حملہ کی تاب نہیں لا سکتا
تھا، مگر باوجود اسکے اسکو نہیں چھیڑا، اور اسکو اسی کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اپنا انتقام لے کر
اور کچھ جزوی فوائد اٹھا کر امیر عبدالرحمن قرطبہ واپس چلے آئے، اور اتنی ہی سی بات پر خوش
ہوگئے۔ یہاں اُن کی رعایا نے اُن کو خوب مبارکبادیں دیں اور اُن کا بڑے زور کا خیر مقدم کیا۔

بیزنطینی سلطنت کی حالت روز بروز ابتر ہوتی چلی جاتی تھی۔ اُن دنوں شاہ میکائیل
(جو لکنت کی وجہ سے ہکلا کہلاتا تھا) سریر آرائے سلطنت تھا، مگر اُسے مامون الرشید خلیفہ بغداد

مختلف امراء میں ملک تقسیم کر دیتا تھا؛ اور یہ امراء اپنے اپنے حصص کو اپنے متوسلین کے حوالے کر دیتے تھے۔ گو یہ ترتیب انگلستان کے ساتھ مخصوص تھی، مگر تقریباً تمام یورپ اس نظام کے اصول پر کاربند تھا۔ یہ اقطاعی امراء صرف اپنی حین حیات تک ہی اپنے اقطاع پر قابض رہتے تھے۔ اس قبضہ کی شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے ولی نعمت کی خاص خدمات بجا لائے۔ ان فرائض کے باوصف وہ نہ صرف آزاد ہوتا تھا، بلکہ اپنی چھوٹی سی ریاست کا مطلق العنان حاکم بھی ہوتا تھا۔ اگر بالفرض اس کی ریاست وسیع ہوتی، تو وہ ایک گڑھی میں رہتا تھا، جو بادشاہ شارلیمین اور اس کے اخلاف کی سخت معاندانہ مساعی کے باوجود عموماً آلات حرب کے ذریعے محصون ہوتا تھا۔ اس کے اس طرح محصون کرنے سے محض ذاتی حفاظت مقصود نہ تھی؛ بلکہ طوائف الملوکی کے اس پُر آشوب زمانہ میں وہ امیر نہایت بے باکانہ طور پر اپنے جارحانہ بغض و عناد کے بخار بھی دل سے نکال لیتا تھا۔ مزید حفاظت کی غرض سے گڑھی عموماً بلندی پر بنائی جاتی تھی، اور اس کی فصیلوں کے نیچے ایک گاؤں آباد ہوتا تھا، جس میں اُس امیر کے تمام متوسلین اور دیگر کشاورزر ہا کرتے تھے۔ ان اقطاعی باشندوں کا کچھ حصہ اس سرزمین سے متعلق ہوتا تھا، اور اس طرح وہ ایک طرح کے غلام تھے اور اس غلامی کی شرائط مختلف علاقہ جات کے حسب حال مختلف ہوتی تھیں۔ ان لوگوں کا اصطلاحی نام بھی "غلام" ہوتا تھا۔ امیر کو حق حاصل تھا کہ ان کاشتکار "غلاموں" کو ہبۃً فروخت کر دے یا خرید لے۔ مگر ان غلاموں کو بھی یہ اجازت تھی کہ وہ اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی اس غلامانہ زندگی کا معاوضہ دے کر آزاد ہو جائے۔ ایک حصہ کا تو یہ حال تھا؛ باقی ماندہ باشندگان آزاد اجارہ دار (یعنی آجکل کی حالت کے مطابق "کاشتکار") ہوتے تھے، اور محاصل ادا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ یہ کل اقطاعی نظام اس نوع کی شکل پیدا کرتا تھا کہ ہر امیر بجائے خود ایک خود مختار بادشاہ تھا، جس کا جلال و جبروت بادشاہ وقت کو بھی اس سے ہر وقت مرعوب رکھتا تھا، کیونکہ ان کو اپنے تمام متوسلین و رعایا کو سخت سے سخت سزا دینے کا اختیار حاصل تھا، خواہ اصالتاً ہو یا وکالتاً۔ اسی غرض سے ہر گڑھی میں تنگ و تاریک قید خانے اور سزا دینے کے طرح طرح کے آلات و ذرائع ہوتے تھے۔ آپس میں تمام امراء ہم رتبہ تھے، اور اکثر ان میں جنگ برپا رہتی تھی

ان امراء سے بالاتر طبقہ میں کاؤنٹ، مارکوئس اور ڈیوک تھے، جن کے تعلقات امراء سے ویسے ہی تھے جیسے امراء کے کاشتکار اور غلام سے۔ قطعات ملک پر ان اعلٰے رؤسا کا قبضہ عموماً موروثی ہوتا تھا۔ اور زمین بتدریج ابًا عن جدٍّ متوارث ہوتی چلی جاتی تھی۔ ایام جنگ میں امراء اور دیگر کاشتکار و غلام طبقات کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کو جان و مال سے امداد دیں اور اس کی گڑھی کی حفاظت کریں۔ ان نیم آزاد طبقات کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو کامل طور پر غلام تھے، جن کو آزادی مطلق نصیب نہ تھی۔ ان کے بھی مختلف طبقات تھے +

نظام اقطاعی کی ان ناخوش آیند کیفیات کو ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت اور مذہب نے بہت کچھ معدوم کر دیا۔ اور بعد میں عوام کی بڑھتی ہوئی آزادی، طاقت اور دولت نے خاتمہ کر دیا تھا۔ گو بیان بالا کے مطابق یورپ میں اس نظام کا دور دورہ نویں سے تیرھویں صدی مسیحی تک رہا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کے بعد بھی اس کا بہت کچھ اثر رہا؛ اور قانونی حیثیت سے اس کا آج تک نفاذ ہے +

ہندوستان میں جاگیرداران بہار و بنگال اور تعلقہ داران اودہ اس نظام کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں + (مترجم)

(۱۷) آیریا = IRIA مجھے اس مقام کا کہیں پتہ نہیں ملا + (مترجم)

(۱۸) سینٹ یاگو ڈی کمپوس ٹیلا = SANTIAGO DE COMOSTELLA

سنٹ یاقوہ سپین میں بڑا شہر ہے۔ ایک زمانہ میں اس کو بڑی عظمت حاصل رہی ہے۔ جلیقیہ کا دارالصوبہ رہ چکا ہے۔ یورپ بھر میں سب سے زیادہ جاتری یہیں آیا کرتے تھے۔ اس کے گرد پہاڑیاں ہیں اور ان کی وجہ سے یہ مقام بہت پر فضا ہو گیا ہے۔ جو بڑا گرجا اس وقت وہاں بنا ہوا ہے وہ قدیم گرجا کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کی عمارت بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پرانے گرجا کی۔ یہ گرجا ۱۰۸۲ء میں بنا تھا۔ شہر میں ایک بہت بڑا چوک ہے جس میں اکثر سانڈوں کی لڑائی (اہالی سپین کا نہایت دلچسپ اور مشہور مشغلہ) ہوا کرتی ہے۔

ٹاؤن ہال کے سامنے سینٹ جاگو (یعنی سینٹ جیمس دی ایلڈر۔ والی محافظ شہر ہٰذا (سپین) کا بت نصب ہے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک پادری کو الہام ہوا تھا۔ کہ یہیں سینٹ موصوف دفن ہیں اور ایک ستارہ نے اپنی شعاعیں عین اُس مقام پر ڈالیں جہاں وہ دفن ہیں۔ (کمپوسٹیلا= ستارہ کا میدان) عوام کا اعتقاد ہے کہ سینٹ کی ہڈیاں گرجا کی بنیادوں میں آئی ہوئی ہیں۔ یہ مکاشفہ ۸۲۹ء میں ہوا تھا۔ اس شہر کے گرد خانقاہوں اور گرجاؤں کے کھنڈرات نظر آتے ہیں چمڑے کی صنعت یہاں ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بت چاندی کے بہت بنتے ہیں۔ آبادی تیس ہزار ہے (مترجم)
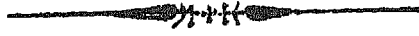
کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ (امیر عبدالرحمٰن ثانی کے تخت نشین ہونے کے دوسرے سال اُس نے قرطبہ میں ایک سفارت بھیج کر اُن سے دوستی کرنی چاہی کیونکہ اُن کی سلطنت کا شہرہ تمام ایشیا میں اُس وقت تک پہنچ چکا تھا۔ سفراء دربار قسطنطنیہ کا نہایت تپاک کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ دارالخلافہ کے قریب اُنکے خیر مقدم کے لئے ایک جم غفیر موجود تھا۔ وہ محل شاہی میں اُتارے گئے امیر نے اُن کے لئے یورپ کے تمام تکلفات اور شان و شوکت کا اظہار کیا۔ تحفہ و تحائف جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے (ان میں بہت سے گھوڑے تھے، جن کے ساز و یراق سونے چاندی کے تھے) اُن کو دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کیونکہ ایسی قیمتی چیزیں وہاں کے لوگوں نے اب تک دیکھی تھیں۔ دغا شعار بیزنطینیوں نے فتوحات کے بہت سے سبز باغ دکھلائے، اور اپنی فوج اور ذرائع امیر کے سامنے پیش کیے، کہ اُن کے ذریعہ سے وہ بنو امیہ کی کھوئی ہوئی میراث، ملک شام، حاصل کر سکیں۔ لیکن رعایا کی آئے دن کی سازشوں سے امیر کی حالت کچھ نازک سی ہو رہی تھی، اور وہ اپنی سلطنت ہی کو بمشکل قائم رکھ سکتے تھے، اس لئے اُس وقت جارحانہ مدافعانہ معاہدہ نہ ہو سکا، اور سفراء صرف تکلفی سلام و پیام اور ایک غیر منفرد امید ہائے امداد با ہمدگری کے ساتھ واپس کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ ہی امیر نے یحییٰ الغزال کو، جو خوبصورت، خوش وضع خوش اخلاق، شاعر اور سیاست دان آدمی تھے، روانہ کیا کہ وہ شاہ قسطنطنیہ سے امیر کا شکریہ ادا کریں، اور اُن کے ساتھ اندلس کی بنی ہوئی بہترین تلواریں اور دیگر اشیاء بھیجدیں۔

اُسی سال ایک اور سفیر، پہلے سفیر سے بالکل مختلف، مگر اُسی غرض کے لئے، قرطبہ میں پہنچا۔ وہ ایسی سلطنت کا وکیل تھا جسکی آبادی اگرچہ خلافت مشرقی کے ایک سب سے چھوٹے شہر کی برابر تھی، مگر بوجہ اپنے جاہ و قورع کے متہم بالشان تھی۔ حال ہی میں ایک نئی ریاست نوار کی قائم ہوئی تھی، جو فی الحقیقت شاہ فرانس کی جاگیر صرف خاص میں تھی۔ بادشاہ وقت نے رعایا سے چیرہ دستانی کرنی شروع کی، جس سے اُن میں اضطراب پیدا ہو گیا۔

اِن کوہستانیوں کو انتہا درجہ کی شخصی آزادی کی عادت پڑی ہوئی تھی؛ وہ ان لوگوں کے ظلم کب سہہ سکتے تھے کہ جن کی وہ رعایا نہ تھے، اور جو محض اس لئے اُن پر سختیاں کرتے تھے کہ اُنہوں نے اپنے ہمسایوں کو ایسا کرتے دیکھا تھا، اور وہ غلطی سے یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ عوام الناس کے فائدہ کے لئے ہے۔ اگرچہ تابع اور متبوع دونوں کا مذہب ایک ہی تھا، مگر جب اس کا مقابلہ اُس قومی تعصب سے کیا جاتا، جو اُن دونوں قوموں کے درمیان میں تھا، تو یہ تعلق کچھ چنداں مضبوط نہیں تھا۔ اس تعصب کو اس وجہ سے اور بھی ترقی ہوئی کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ شارلیمین اور لوئی کے باجگزاروں نے خوب زور پکڑ لیا۔ اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کو بہ نسبت مسلمانوں کے اور بھی زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، حالانکہ موخر الذکر اُن کے ملک و ملت کے دشمن تھے۔

ریاست نوار کے سفیر کے خلاق و آداب اگرچہ مہذب رؤسا بیزنطین کے دلکش آداب کے بالکل برعکس تھے، مگر مسلمانوں کے امیر نے گو اُن کے ساتھ وہ شاہانہ سلوک نہیں کیا، جو ایک بڑے جلیل القدر کے وکیل کے ساتھ مرعی رکھنا چاہئے، مگر شاہانہ مہمان نوازی اور تواضع میں بھی کچھ کمی نہیں کی گئی۔ اُن سے ایک معاہدہ ہوا، جسکے موافق سلطنت قرطبہ نے ان کوہستانیوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا؛ اور اُس کے عوض میں یہ قرار پایا کہ اگر کوئی مہم ماوراء پائرینیس بھیجی جائے تو مسلمانوں کو نہ روکا جائیگا۔ جس دانشمندانہ پالیسی کی بنا پر یہ اتحاد کیا گیا تھا اُس کے اثرات بہت ہی جلد ظاہر ہو گئے۔ کیونکہ اس کے چند ہی ماہ کے بعد ایک بہت بڑی فوج نے لبسر کردگی کاونٹ ابلوس* اور کاونٹ اسے نیری اس٭ باجگزاران شاہان ایکیوٹین، وادیوں سے گزر کر اندلس پر حملہ کیا۔ شہر پمپلونہ پر قبضہ کر لیا گیا؛ چند اور لڑائیوں کے بعد کہ جن میں نہ چنداں نفع ہوا، نہ ناموری حاصل ہوئی، اہالی فرانس اپنے نزدیک پوری طرح محفوظ واپس چلے گئے۔ رونسس ویلا کی گھاٹیوں میں ایک مرتبہ پھر خون برسا؛ حملہ آور ول

COUNT ASENARIUS ٭ COUNT EBLUS *

کو کوہستانیوں اور عربوں نے گھیر لیا! اُن کے ٹکڑے اُڑا دیئے اور دونوں متحد متعاقدین نے قیدی آپس میں تقسیم کر لئے، بقیتہ السیف میں دونوں کاونٹ بھی تھے جو اپنی ناقابلیت اور شکست کی بے عزتی کے یادگار رہ گئے تھے۔ ادھر تو ریاست نوار کو میدان جنگ میں یہ کامیابی ہوئی اُدھر اُنہوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر کے اپنا سیاسی نظام الگ قائم کر لیا۔ اس ریاست نے اپنی آزادی (باستثناء چند سال کہ جب وہ برائےنام ایسٹریاس کے ماتحت رہی) اُس وقت تک قائم رکھی کہ بالآخر اُن کو فرانس اور سپین نے اپنے اپنے ساتھ ضم کر لیا۔

جزیرہ نماء اندلس کے مشرق اور جنوب میں ایک مدت سے فتنہ و فساد چلا آتا تھا' اس لئے مسلمانوں کو وہاں کے عیسائیوں کی طرف توجہ کرنیکی فرصت نہ ملی تھی۔ اب روِن سیس ویلا کی مصیبت آمیز کامیابی سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی تحریص و ترغیب ہوئی۔ متواتر تین مہمیں' بسر کردگی عبید اللہ ابن عبد اللہ دشمنوں کے ملک پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی گئیں؛ مگر کسی میں بھی کوئی بڑا کار نمایاں نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوہستانیوں کے استقلال اور خونخواری نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو اپنے حدود ملک میں کوئی بڑا نقصان نہ پہنچانے دیا۔

عبدالرحمٰن ثانی نے رفاہ عام کے کام بڑے وسیع پیمانہ پر کھولے' اپنے دربار میں بڑی شان و شوکت پیدا کی' اور اپنے منظور نظر لوگوں کو نہایت بیش قرار انعامات دیئے۔ اس سے سلطنت پر خرچ کا بہت بڑا بار پڑ گیا' جس کو خزانہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اُن کو ایک نیا ناگوار ٹیکس لگانا پڑا۔ حکام وقت دور ہائے گزشتہ کے تجربوں کو بھول گئے اور اُنہوں نے ضروریات روزمرہ پر بھی محاصل وصول کر کے عام رعایا میں بے چینی اور بدامنی پیدا کر دی۔ ذمیوں' یعنی یہودیوں اور عیسائیوں' کو یہ محصول نہایت ناگوار ہوا' اور اُنہوں نے سخت واویلا مچایا۔ چند ہی روز کے بعد مختلف شہروں کے مسلمان بھی اُن کے ساتھ شریک

ہو گئے، اور اُنھوں نے اس ناعاقبت اندیشانہ تدبیر کی جو دربار شاہی کی فضول خرچیوں سے پیدا ہوئی تھی، سخت شکایت شروع کر دی۔ اہالی مریڈا کو سب سے زیادہ شکایت تھی اُن کے پادریوں نے اپنے بھائیوں کی شکایات کی زبانی یا تحریری اطلاعیں لوئی بادشاہ فرانس کو دیں۔ انھوں نے ان شکایات سے اپنی تدابیر کی کامیابی اور اپنے کفار ہمسایوں بدامنی پھیلانے کا کام لیا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک خط مریدہ والوں کو لکھا، جس میں اُن سے بوجہ اس ٹیکس کے بڑی ہمدردی ظاہر کی، اور اُن کو یہ راے دی کہ وہ اپنے حقوق سے کام لیں، اور اپنی آزادی کو پھر حاصل کریں۔ نیز اُن سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنی شکایات کو علانیہ ظاہر کرینگے تو وہ (لوئی) خود فوج لے کر پایرینیس کے اُس طرف پہنچینگے۔ یہ امر کہ آیا اس میں لوئی کا کچھ خلوص تھا یا نہیں، ایک مشکوک امر ہے لیکن خلوص کے ہونے نہ ہونے سے کوئی بحث نہیں، کیونکہ اس واقعہ کے بعد فوراً ہی خود اُن کے ملک میں فساد برپا ہو گیا، اس لئے انہیں اپنی توجہ ایک غیر ملک میں سازش کرانے سے ہٹا کر اپنے ہی ملک کے فتنہ و فساد رفع کرنے پر منعطف کرنی پڑی۔ قوم گاتھ کا ایک افسر اعلے آیزون[×] نامی، اپنے بادشاہ سے ناراض ہو کر گاتھک مارچ میں بھاگ گیا، اور یہاں اُس نے اہالی فرانس، بالخصوص کاونٹ آف برشلونہ سے اپنی دشمنی ظاہر کی۔ اپنے تمام خاندان اور قومیت کی وجہ سے، نیز ان قسمت آزما لوگوں کی مدد سے، جو سرحد کے رہنے والے تھے، فرانس والوں کے دشمن تھے، اور فتنہ و فساد میں سب سے پیش پیش تھے، اس شخص نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا، اور بہت جلد ایک قوی فریق کا سرگروہ ہو گیا۔ اُس نے پہلے تو دغا و فریب سے قلعہ اوسونا[1] پر قبضہ کیا؛ پھر قصبہ روز[2] اس کو اس علت میں تباہ کیا کہ اُس نے مقابلہ کیا تھا۔ اسکے بعد اس شخص نے اپنے بھائی کو قرطبہ بھیج کر مدد مانگی، اور یہ کہلا بھیجا کہ یہاں کے لوگوں میں اس قدر بے چینی ہے کہ مسلمان بجا طور پر یہ امید کر سکتے ہیں کہ یہ حصۂ ملک جو اُن کے ہاتھ سے نکل چکا ہے باآسانی پھر اُن کے

× AIZON.

قبضہ میں آجائے۔ اس درخواست پر غور کیا گیا۔ جنگ آزمودہ عبیداللہ کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج تیار کی گئی، تمام اشرار ادھر اُدھر سے آکر اس فوج میں شامل ہو گئے، اور اُس کی صولت اور بھی بڑھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں کاونٹ آف برشلونہ کے ہاتھ سے تمام علاقہ سوائے گیرونا اور اُس شہر کے جس سے اُس کا خطاب منسوب تھا، نکل گیا۔

لوئی اُس وقت جرمنی میں بیٹھے ہوئے دو سرداروں کے آپس میں صلح کرا رہے تھے جنکی بے چین طبیعتیں سلطنت کے امن میں خلل ڈالنے والی تھیں، اُن کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ اتنے ذرائع، کہ وہ اس خوفناک بغاوت کو جو اُن کی انتہاء سلطنت میں ہو رہی تھی، بزور شمشیر دباتے لیکن جو کچھ وہ تلوار کے زور سے نہ کر سکے اُس کو انہوں نے بلطایف الحیل کرنا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے تین آدمیوں کو مقرر کیا کہ وہ گاتھک مارچ کے لوگوں کو افہام و تفہیم کر کے اُن کو پھر اپنے بادشاہ کی اطاعت کی طرف مایل کریں۔

اس سفارت میں ایک تو پادری تھا، اور دو رؤساء۔ اس زمانہ میں کہ فنون امن و امان بدنام تھے، اور جنگی کارنامے باعث شہرت، اس سفارت کے ساتھ، جیسی کہ امید تھی، سخت سرد مہری کا سلوک کیا گیا، اور سفراء کچھ بھی نہ کر سکے۔ بہرحال انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ وہ یہ مشہور کر گئے کہ فرانس والوں کی ایک بہت بڑی فوج اُن پر حملہ کرنے والی ہے۔ اس افواہ سے مذکورالصدر گاتھک اور اُس کے رفقا سخت پریشان ہوئے، اور انہوں نے پھر دربار قرطبہ سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ امیر کی محافظ تن فوج مسلمانوں کے حلیفوں کی کمک کے لئے فوراً بھیج دی گئی۔ فرانس کی فوج آئی مگر دشمن پہلے ہی پسپا ہو کر سرقسطہ چلے گئے۔ اب اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ وہ شمالی خونخواروں سے مقابلہ کرنے کے نتائج سے ڈرتے تھے، یا یہ کہ وہ اس آزمائش میں نہ پڑنا چاہتے ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام ملک مفتوحہ جسے وہ آسانی سے حاصل کر چکے تھے اُن کو چھوڑنا پڑتا۔ فرانسیسی فوج کے افسروں کا یہ فعل کہ انہوں نے مسلمانوں کو بغیر مقابلہ کئے واپس جانے دیا، بہت مشتبہ تھا؛ اسی وجہ

سے اُن پر دغا و فریب کا الزام لگایا گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ آئندہ سال وہ اسی علت میں قومی کونسل کے سامنے پیش کئے گئے، اور اُن کو موقوف کر دیا گیا۔

امیر عبدالرحمٰن ثانی نے فرانس پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ فوج طلایہ بسر کردگی عبدالرؤف (جو امیر حکَم کے عہد دولت میں وزیر رہ چکے تھے) پا یرینیس کی طرف روانہ بھی ہو چکے تھے، امیر عبدالرحمٰن فوج کو لیکر روانہ ہونے ہی کو تھے کہ اُن کو یہ بد خبری پہنچی کہ مریدہ میں بغاوت ہو گئی۔

جس ناگوار ٹیکس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اُسکی وصولی میں محصلین نے وہ سختیاں کیں کہ اُس نے ظلم و ستم کی صورت اختیار کر لی۔ عوام الناس کو متفنی لوگوں کی باتوں نے برافروختہ کر ہی کھا تھا، اور اُن کو یہ جھوٹی امید بھی دلا رکھی تھی کہ شاہ فرانس کے قومی باجگزار اُن کی مدد کرینگے۔ ایک شخص محمد ابن عبدالجبار سابق محصل اس سازش کا بانی کار تھا۔ شہر کے گورنر نے وہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ وزراء کے گھروں کو لوٹ لیا، اور اُن کو یا تو مار ڈالا، یا شہر سے نکال دیا۔ محمد اپنے آپ وہاں کا والی (گورنر) بن بیٹھا، مخازن اور اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا، اور جو کچھ وہاں ملا سب کو، بلا امتیاز مذہب و ملت، تمام رعایا میں تقسیم کر دیا۔ اس فیاضی کے عوض میں اُس نے سب سے یہ درخواست کی کہ اُس کو مخصوص بہ عہدہ پر برقرار رکھیں۔ باغیوں کی کمر ہمت یوں چست ہوئی کہ وہ جانتے تھے کہ اُن کے ذرایع جنگ کافی ہیں، اور اُن کی حفاظت کے سامان ایسے ہیں کہ کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس پر بہت سے خونخوار قسمت آزما لوگوں کو لوٹ مار اور غداری و بغاوت کی کشش وہاں کھینچ لائی۔ باغیوں کی فوج محافظہ روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، یہاں تک کہ اُس کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اب تک کوئی مقامی بغاوت کبھی اس حد تک نہیں پہنچی تھی، نہ اب سے پہلے کوئی اسی قسم کی بغاوت امیر کے مقابلہ کے لئے تیار ہوئی تھی۔ موقعہ کا اقتضا یہ تھا کہ فوری اور نہایت سخت کارروائی کیجائے، چنانچہ عبدالرؤف کو معہ فوج کے فوراً واپس بلا کر شہر کے محاصرہ پر مقرر کر دیا گیا

سخت دل جنگ آزمودہ سپہ سالار نے وہ تدابیر کیں جو وہ دشمنوں کے ملک میں کرنی چاہئے تھیں۔ دلکشا بنگلے، اور دلکش باغات جو بیرون شہر تھے، جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے۔ فصلیں، جتنی کھڑی تھیں، سب کو کاٹ پھینکا گیا۔ شہر کو بزور شمشیر لینے کی تیاریاں کی گئیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ جائدادیں تباہ ہو جاتیں، قتل عام ہوتا، اور اس میں مجرموں کے ساتھ بہت سے بے گناہ بھی مارے جاتے۔ امیر عبدالرحمٰن ایسے تشدد کے سخت مخالف تھے جو سلطنت کے ایک بہت بڑے شہر کو کمزور کر دیتا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا غیر مساوی مقابلہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے اُنھوں نے عبدالرؤف کو حکم دیا کہ شہر میں سامان خورد نوش نہ پہنچنے دیں، وہ خود عاجز آجائینگے۔ چنانچہ سخت ناکہ بندی کی گئی۔ فوج محافظ کے سپاہی چور اُچکے تو تھے ہی، اس پر وہ شہر کی چار دیواری میں قید ہو گئے، اُنھوں نے بیکار بیٹھے رہنے، اور آذوقہ نہ ملنے، کی شکایت کرنی شروع کر دی۔ آخر وہ اپنی پشتہا پشت کی شورہ پشتی پر آگئے، اور شہر والوں کو لوٹنے اور اُن کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ باشندگان شہر میں جو لوگ ذرا ہوشدار تھے، اور جو اس بغاوت کے اس امید پر بانی مبانی ہوئے تھے کہ وہ تکلیف دہ قوانین کو منسوخ کرا لینگے، اب کچھ ہوش میں آئے؛ مگر موقعہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اُنھوں نے یہ دیکھا کہ اُنھوں نے نسبتاً امن و حفاظت و ترفہ کے بدلے میں ہتھیار بند قزاقوں کی بدامنی، مطلق العنانی اور استبداد پایا ہے۔ امیر کی بعض نمک حلال رعایا نے، جو باغیوں کے علم کے نیچے آنے پر مجبور کئے گئے تھے، چپ چاپ یہ تحریک شروع کی کہ شہر کو محاصرین کے حوالے کر دیا جائے۔ عبدالرؤف سے رسل و رسائل شروع ہوئے۔ رات کی تاریکی میں ایک مضبوط دستۂ فوج شہر میں داخل کر لیا گیا۔ فصیل شہر پر قبضہ ہو گیا؛ ہتھیار بند جم غفیر کو بھگا دیا گیا۔ سرکردگان بغاوت گھبراہٹ میں خود بھاگ گئے۔ صبح کے وقت امیر عبدالرحمٰن کی حکومت پھر شہر مریدہ میں ہو گئی۔ چونکہ جو کچھ ہُوا وہ یکایک ہوا اس لئے مقابلہ بہت ہی خفیف سا ہُوا، اور کل سات ہزار باغیوں نے نمک حرامی کی سزا پائی۔ لوگوں کا خوف بہت جلد رفع

ہوگیا کیونکہ فوراً ہی عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ امیر عبدالرحمٰن کی رحم دلی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ایسی سزائیں دی جائیں جو مثال بن سکیں۔ لیکن واقعات ما بعد نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ لوگ اسی کے مستحق تھے کہ بدترین سزائیں پاتے۔

ابھی مرپدہ میں پوری طرح امن و امان ہونے بھی نہ پایا تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ بغاوت کا متعدی مرض طلیطلہ میں پھر پھیل گیا۔ ایک شریر النفس فراری، ہاشم نامی، ایک مدت سے خفیہ طور پر ان زیادتیوں کا انتقام لینا چاہتا تھا جو امیر حکم کے زمانہ میں اس کے خاندان پر ہوئی تھیں۔ کسی خفیف سی شکائت کا بہانہ بنا کر اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ اتفاق سے والی شہر وہاں نہ تھے۔ عوام الناس نافرمانی حکام کے موقعہ ملنے کی تلاش میں رہتے ہی تھے، ان کو فوج محافظ اور امیر کے آدمیوں کے نکال دینے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔ ہاشم کو خلاف امید کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو مجتمع کرتے ہی قرب و جوار میں اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ قزاق اور راہزن، جو علاقہ کوہستان کو اپنا آماج گاہ تاخت و تاراج بنائے رہتے تھے، اور وہ خانہ بدوش لوگ، جو ہمیشہ لوٹ مار کے لئے چشم براہ رہتے تھے، اور بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں منڈلاتے پھرا کرتے تھے، روز بروز ہاشم کی فوج میں بڑھتے چلے جاتے تھے۔ محمد ابن وسیم والی سرحد نے باغیوں پر حملہ کیا، مگر کئی بار منہ کی کھائی۔ رعایاء شہر کی امداد سے طلیطلہ والوں نے امیر کی تمام تر کوششوں کو ناکام رکھا، یہاں تک کہ امیر کے بیٹے امیہ کو بے عزت ہو کر فصیل شہر کے نیچے سے پس پا ہونا پڑا۔[۳] آخرکار ہاشم کی فوج ایک کمین میں پھنس گئی، جسکی تدبیر ایک افسر فوج متعینہ کیلٹراوا نے کی تھی۔ اہالی طلیطلہ کو شکست ہوئی اور انہوں نے سخت نقصان اٹھایا۔ اسکے بعد بہت جلد شہر پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا گیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہاشم کا کیا انجام ہوا، مگر معتبر ترین ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں امیر کی فوج کے ہاتھ میں آگیا اور انہوں نے اس کا سر اتار دیا۔ خانگی دشمنوں کا انتظام کر لینے میں دربار قرطبہ نے جو قابلیت

دکھلائی، اُس کا یہ ثبوت کافی ہے کہ بغاوت بہت دن قائم رہی، اور اُس کو دبانے کے لئے سخت کوششوں کی ضرورت پڑی۔ طلیطلہ، باوجودیکہ قلب مملکت میں واقع تھا، مگر آٹھ برس تک بالکل آزاد رہا۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابھی طلیطلہ والوں کی کامیابیوں کا شباب تھا کہ مریدہ میں ایک مرتبہ پھر بغاوت ہوگئی۔ جب اس شہر پر قبضہ کیا گیا تھا تو محمد لز (۲۸) بن بھاگ گئے تھے، وہ یکایک پھر واپس آگئے، اور پھر لوگوں کو برانگیختہ کیا۔ مخزن میں جتنی چیزیں تھیں، پہلے کی طرح، سب میں تقسیم کردیں، اور اپنے بدمعاش ساتھیوں کو بلاکر پھر وہی بدامنی اور شرارت کے منظر پیدا کردیئے جو اپنے نکلنے کے پہلے وہ کرچکے تھے اور جن کی پاداش میں وہ نکالے گئے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن کو اس نئے واقعہ کی اطلاع دی گئی۔ اُنھوں نے چالیس ہزار آدمیوں کی جمعیت لے کر خود اُس کی قیادت کی، اور یہاں پہنچ کر کئی مرتبہ شہر کو عنوتاً لینے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ فصیل شہر نہایت مضبوط تھی، اور اتنی محفوظ کہ سیڑھی لگا کر اُس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ محاصرین نے ناچار فصیل کو ڈھانے کے لئے سُرنگ لگائی۔ جب سب تیاریاں ہوگئیں تو امیر نے اپنی فوج کے سامنے تقریر کی، اور اُن کو یہ یاد دلایا کہ اُن کے مقابلہ میں بھی اُن ہی کے بھائی مسلمان ہیں، لہٰذا اُنہیں یہ فہمائش کی کہ وہ ہر طرح کے تشدد سے باز رہیں اور صرف اُن ہی پر سختی کریں کہ جو اُن کے مقابلہ میں آئیں۔ سب سے آخر میں خون ریزی اور حملہ کے بدنتائج کو ٹالنے کے لئے اُنھوں نے حکم دیا کہ رقعے لکھکر، اور تیروں میں باندھ کر، فصیل شہر پر پہنچائیں۔ ان رقعوں میں یہ لکھا ہُوا تھا کہ فصیل میں سرنگ لگی ہوئی ہے، حملہ میں کوئی دیر نہیں، باشندگان شہر کو صرف اس شرط پر معافی دی جاسکتی ہے کہ وہ سرکردگان بغاوت کو سپرد کردیں۔ ان رقعوں میں سے چندان ہی سرکردگان بغاوت کے ہاتھ آگئے، وہ ڈر کے مارے اپنی جانیں لے کر بھاگ گئے۔ اب خواہ محاصرین کی غفلت کہو یا اُن کی سازش، کہ یہ لوگ بعافیت نکل گئے۔ ایام محاصرہ میں جو نقصان فصیل کو پہنچے تھے، اُسکی مرمت کردی گئی، محافظت کی جگہوں میں سپاہی مقرر

کر دیئے گئے، جو غربا کہ بھوکوں کے مارے تکلیفیں اُٹھا رہے تھے اُن کی ضروریات بہم پہنچائی گئیں۔ ریدہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے بادشاہ کے رحم کا تجربہ کیا، اور اُس نے پھر اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی، خواہ وہ اطاعت مشتبہ ہی کیوں نہ رہی ہو۔

ثیوفیلُن کی خوش قسمتی تھی کہ اُن دنوں فرانس بھر میں لوئی کے بیٹوں کی بغاوت کی وجہ سے ایک فتنہ برپا تھا، جس نے عیسائیوں کو اپنے دشمنوں کی مصیبت سے فائدہ نہ اُٹھانے دیا، کیونکہ وہ دارالسلطنتوں کی بغاوت اور لوگوں کی روز افزوں بے چینی سے خود تنگ آئے ہوئے تھے۔

جب ملک کا فساد ختم ہو گیا، اور ملک میں امن و امان معلوم ہونے لگا، تو امیر عبدالرحمٰن کا اتقا اور بلند نظری بروئے کار آئی۔ جب سے وہ تخت پر بیٹھے تھے اُن کی نیت تھی کہ وہ اسلام کی روایتی پالیسی پر عمل کریں گے اور کفار کے برخلاف فوج کشی کریں گے۔ جلیقیہ اور گاتھک مارچ میں مہمیں بھیجی گئیں، جن میں ہر طرح کامیابی ہوئی، لیکن اُن کی صورت بالکل زمانۂ قدیم کے غزوات کی سی تھی۔ اُن کا اثر بالکل ناپائیدار رہا۔ اگرچہ ان جنگوں کے جو حالات راہب مورخین نے لکھے ہیں وہ قابل دید ہیں۔ اُن کو شوق تو تھا ہی کہ اُن کے صفحات عجائب و غرائب سے مزین ہوں، اُن میں بڑی بڑی فتوحات کا ذکر ہو، اُس موقعہ پر جو کرامات ظاہر ہوئی ہیں اُن کی جزئیات تک درج ہونے سے رہ جائیں۔ ان لوگوں کی تواریخ کی یہی خصوصیات تھیں۔ امارت اندلس کے جہازوں کا بیڑہ، جو تمام بحر شام میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا، اُن کی فوج کے ساتھ مددگار ہوا، ساحل فرانس پر اُن کی فوج کو اتارا، تمام ملک کو روند ڈالا، اور مارسیلیس[×] کے مضافات کو لوٹ لیا۔

خلافت بغداد کی فوجی اُمنگیں اور غرور زوروں پر تھے۔ اُس نے بیزنطینی سلطنت سے ایشیاء کوچک چھین لیا تھا، اور خود قسطنطنیہ معرض خطر میں تھا۔ اس مصیبت نے شہنشاہ تھیوفلس[*] کو اپنے پیش رو کے قدم بقدم چلنے، اور امارت اندلس سے استمداد کرنے پر مائل کیا۔ کیونکہ

THEOPHILUS. * MARSEILLES ×

اسکی طاقت کی ممالک مشرقیہ میں وہ شہرت تھی جس کی وہ چنداں مستحق نہ تھی، نہ بلحاظ خصوصیات آبادی، نہ بخیال ملکی انتظام، نہ بوجہہ ذرائع فوجی۔ اس سفارت کا بھی وہی نتیجہ ہوا جو شاہ مائکائیل ہکلے کی سفارت کا ہوا تھا۔ سفراء کا بڑی عزت و آبرو کے ساتھ استقبال کیا گیا اور ویسے ہی رخصت کر دیئے گئے؛ بڑے قیمتی تحایف ایک دوسرے کو دیئے گئے؛ امیر عبدالرحمن نے اُن کی امداد کرنے کے حتمی وعدے کئے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ خود ان کے ملک میں امن رہے۔ لیکن گھر کے دشمنوں کی متواتر شورشوں اور بیرونی حملہ کے خوف نے یہ وعدہ پورا نہ ہونے دیا۔ دربار بیزنطینی نے جو چال چلی تھی وہ عباسیوں کی سیاسی سازش سے بارور نہ ہونے پائی؛ کیونکہ انہوں (عباسیوں) نے اہالی فرانس سے گہری دوستی قائم رکھی؛ نیم وحشی باشندگان رہائن پر ایشیائی تکلفات اور عجائبات کی بھرمار کر دی؛ اپنے عیسائی مددگاروں سے انہوں نے معاہدات کئے اُن میں بنو امیہ کو بدعتی، مرتد، دغاباز، ایسے لوگ جن سے مسلمانوں کو بچنا، اور ایسے آدمی جن پر دشمنوں کو رحم نہ آنا چاہئے کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

امیر نے جو وعدے بادشاہ قسطنطنیہ سے کئے تھے اُن کے ایفاء ہونے کی تو پہلے ہی اُمید نہ تھی، مگر اب ایک عجیب غریب اور خوفناک دشمن کے ظاہر ہونے سے تو یہ وعدے اور بھی لاطایل ہو گئے۔ یہ دشمن ایک تباہ کن طوفان کی طرح ساحل لوسی ٹینیا پر آ پڑے۔ قوم نارمن جرمنی کے ایک قوم کی شاخ میں سے تھے۔ اُن کی اور فرانس والوں کی اصل و نسل ملتی جلتی تھی، مگر وہ موخر الذکر کے اس لئے سخت دشمن تھے کہ وہ عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ لوگ پچاس برس کامل شمالی سواحل یورپ کے لئے مجسم قہر رہے تھے۔ یہ لوگ سکینڈے نیویا کے سنگلاخ، دشوار گزار سواحل کے رہنے والے تھے۔ عقل حیوانی اور ضرورت نے ان کو جہاز رانی کا فن سکھلا دیا تھا۔ تجربہ نے اُن کو یہ بتلا دیا تھا کہ جنوب کے باشندوں سے جو اتنے جنگجو نہ تھے، مال و منال کیونکر بآسانی چھینا جا سکتا ہے۔ اُن کی کشتیاں بہت ہی ان گھڑ سی چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں، اور بید کی لکڑی اور چمڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ اُن کے

چپو اور بادبان بھی چمڑے ہی کے ہوتے تھے۔ لیکن باوجود اسکے ان ملاحوں کی جرأت کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ان کمزور کشتیوں میں بیٹھ کر نہایت طوفان خیز موسم میں، خلیج بسکے اور انگلش چینل میں جاتے ہوئے تامل نہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے تباہ کن حملوں سے انگلستان اور فرانس کو ہلا دیا تھا۔ اُن کی سرعت رفتار، اُن کی خوفناک شکل و صورت، اور اُن کی خونخوارانہ حرکات و سکنات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیاطین مجسم ہیں۔ جب وہ حملہ کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دیو اُن میں حلول کئے ہوئے ہیں۔ وہ قوم ٹیوٹن کے جنگی دیوتا، ووڈن، کو پوجتے تھے۔ انسانیت کی کوئی بات اُن میں نظر نہ آتی تھی۔ رحم تو اُن کو چھو بھی نہ گیا تھا، بلکہ اور وحشیوں سے بھی زیادہ بے رحم تھے۔ سن و سال کی کمزوری اور اناث کی حرمت اُن کے ہاتھوں کسی رعایت کی مستحق نہ تھی۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے اُن کے ہاتھوں سے اُسی طرح ذبح ہوتے تھے، جیسے کہ میدان جنگ کے مفتوح دشمن۔ وہ کسی کو قید کرنا نہ جانتے تھے، بلکہ جو جاندار اُن کے سامنے آجاتا تھا، خواہ وہ انسان ہو یا جانور، اُس کو مار ہی ڈالتے تھے۔ اُن کی خونخوارانہ فطرت اُن کے تفریحی مشاغل تک سے ظاہر ہوتی تھی۔ جب وہ کسی ضیافت میں شراب پی کر بدمست ہوتے تھے، تو اُن کی حالت قابل دید ہوتی تھی۔ وہ اپنے دیوتاؤں کے بتوں تک کو جوئے میں ہار جاتے تھے۔ اپنے دشمنوں کے کاسہاء سر میں شراب نوشی کرنا تو روزمرہ کا کھیل تھا۔ اُن کا بلند و بالا قد، اور دیو صفت زور و توانائی، اُن کا نڈر ہونا جسکی وجہ سے وہ ان سمندروں میں پہنچ گئے جہاں جاتے ہوئے نہایت تجربہ کار ملاحوں کا زہرہ آب ہوتا تھا، اُن کی ہمت، جسکی بدولت وہ اپنے سے دس گُنے سے بھڑ جاتے تھے؛ سب مل جُل کر اُن کے یکایک کہیں سر نکالنے، اور عجیب و غریب اصل و نسل نے، اور بھی سب کو مرعوب کر رکھا تھا۔ صدی گزشتہ کے آخری سال میں اُنہوں نے سواحل انگلستان کو لکدکوب کر دیا تھا۔ اپنی کامیابیوں کے غرہ اور مال غنیمت کی طمع میں اُنہوں نے عہد شارلیمین میں مغربی فرانس پر حملہ کرکے اُس علاقہ کو ویران کر دیا تھا، جس کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اُنکی

اولاد ایک سلطنت قائم کریگی جسکو وہ اپنا ہی نام دینگے اور جس کے مدوجزر سے زمانہ آیندہ میں بہت کچھ تمدنی نظام، قوانین ملکی ومالی، شہرت وشوکت برطانیہ عظمے وابستہ ہوگی۔ پہلے وہ ساحل الیسٹریاس پر اترے، مگر وہاں سے بہت ہی جلد واپس چلے گئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ دیکھا کہ ملک مفلس ہے اور ان کی طمع اس سے پوری نہیں ہوسکتی، نہ اس وجہ سے کہ وہاں کے رہنے والوں کی مشہور شجاعت وتہور سے ڈر گئے تھے۔ اسکے چند ہی روز کے بعد نارمنوں کے چون ۵۴ جہازوں (کشتیوں؟) کا بیڑا لوسی ٹینیا کے ساحل پر آکر لگا۔ شہر لزبن کے مضافات نے ان دشمنان بنی نوع انسان کی تباہ کن عقل حیوانی کا پورا مزہ چکھا۔ چونکہ تمام ملک ان کے خلاف شمشیر بکف ہوکر اٹھ کھڑا ہوا اس لئے وہ وہاں سے بھاگے اور جزیرہ نماء اندلس کے گرد ہوتے ہوئے سواحل افریقیہ کو تباہ کردیا، کاڈیز (قادیس) کو خوب لوٹا، اور آخر وادی الکبیر میں آ گئے۔ دریا ہی کے راستہ ہوکر انہوں نے اشبیلیہ کے مضافات پر قبضہ کیا اور اسکو خوب لوٹا۔ وہاں کے باشندے تو ان کی آمد آمد سن کر ہی بھاگ چلے تھے۔ امیر عبدالرحمن کی فوج سے جہاں کہیں ان کو مقابلہ پڑا، ان بحری قزاقوں نے قریبًا ہر موقعہ پر فتح پائی۔ لیکن اب ان کو خبر ملی کہ پندرہ جہازوں کا بیڑہ بہت بڑی فوج لئے ہوئے ان کا راستہ روکنے کو ہے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اپنے جہازوں میں بیٹھ کر راہ فرار اختیار کی۔ مگر اس تمام مہم میں ان کو بہت ہی کم نقصان پہنچا۔ جس آسانی کے ساتھ دریائی رہزن امیر کے ملک میں گھس آئے تھے اور اپنی بے رحمانہ حرکات سے باشندگان ملک کو نقصان پہنچایا تھا، اس نے امیر کو یہ یقین دلا دیا کہ ان کو اپنی بحری طاقت بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان کے ملک کے کمزور مقامات کے حفاظت کی ایک ہی تدبیر ہے اور اسی ذریعہ سے وہ ایسی ہی آیندہ مصیبت کو روک سکتے ہیں۔ چنانچہ بحر شام کے بنادر پر جہاز، اور مناسب مقامات اور فاصلہ پر حفاظتی بروج بنوائے گئے، پیغامات پہنچانے کے لئے نشانات مقرر کئے گئے، چوکیاں قائم کی گئیں، ہر ضلع میں جتنی حفاظت گاہیں ساحل پر تھیں،

وہ ایک تجربہ کار افسر کے ماتحت کردی گئیں، اور بحری فوجیں اُن کی مددگار اور اُن کے ماتحت قرار دی گئیں۔ ان خردمندانہ تدابیر کا نتیجہ بھی بہت جلد ظاہر ہوگیا۔ نارمنوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُن کے روک تھام کے لئے ہر جگہ سخت انتظامات کر لئے گئے ہیں، اس لئے اُن کو ادھر کا رُخ کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی، اور وہ سواحل اندلس پر کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا سکے۔

شارلیمین کی سلطنت دوسری ہی نسل میں اتنی وسیع ہوگئی تھی کہ جس کا انتظام کرنا مشکل ہوگیا تھا جو اُسکے اصلی حدود تھے اُن سے سلطنت کہیں نکل چکی تھی۔ جب یہ تقسیم ہوئی تو فرانس اور گاتھک مارچ چارلس گنجے کے ہاتھ آئے، جو کمزور اور جلد دب جانے والے لوئی کا بڑا بیٹا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا فرانس اور گاتھک دعویداران سلطنت کی بدمزگی اُس حصہ ملک کی بابت بڑھتی چلی جاتی تھی جسکو شاہ شارلیمین نے آنروع پا یرینس قائم کی تھی، اور دونوں ایک دوسرے کے دشمن اور نقصان پہنچانے والے بنتے چلے جاتے تھے۔ کاونٹ برن ہارٹ جو پہلے دربار اے لاشاپل میں حاجب تھا، اور اس وقت فرانس کے غاصبانہ چالوں کے برخلاف ایک قومی گروہ کا سرکردہ بنا ہُوا تھا، اسکی سازشیں بیشتر اس کی ذمہ وار تھیں کہ آزادی کی ہوا لوگوں کے دماغوں میں بھری چلی جاتی تھی، جس سے وہ اکثر غیر ملکی باجگزاروں کے حقوق سے چشم پوشی کرتے رہے۔ بلکہ کفار قرطبہ (یعنی مسلمانوں) سے دوستانہ تعلقات بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ چارلس اپنے خفیہ دشمن کی بے باکی کو جانتے تھے اور چونکہ وہ ہر دلعزیز ہوتے تھے اس لئے چارلس کے حق میں یہ اور بھی خطرناک ہوتا چلا جاتا تھا، یا چاہئے چارلس نے یہ چاہا کہ اُن سے ترقیات وغیرہ کے وعدے کرکے اپنے جال میں پھنسالیں۔ بیچارے کاونٹ برن ہارٹ کو یہ معلوم نہ تھا یہ تمام خوشامد اُس کی جان لینے کے لئے شست ہے جیسے ہی وہ اپنے اس آقا کو کورنش کرنے کے لئے جھکے، چارلس نے اپنے ہاتھ سے کاونٹ کے ایسا خنجر مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہوگئے۔ چارلس کی یہ حرکت اس لئے سخت زبون سمجھی گئی کہ عام خیال یہ تھا کہ اُس نے کاونٹ برن ہارٹ کو نہیں مارا، بلکہ فی الحقیقت پدرکشی کی، کیونکہ

یہ امر سب جانتے تھے کہ کاونٹ برن ہارٹ اور چارلس کی ماں، ملکہ جوڈتھ* کا مدتوں سے ناجائز تعلق تھا، اور شاہ چارلس فی الاصل کاونٹ برن ہارٹ کا صلبی بیٹا تھا۔

اس پدرکشی سے بجاء اسکے کہ اس بے چینی اور بدامنی میں کچھ کمی آتی، جو گاتھک مارچ کے اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی، اور بھی آگ بھڑک اٹھی۔ نہ صرف عوام الناس بلکہ امرا و رؤساء کی بھی راء بدل چکی تھی، وہ برن ہارٹ کو بجاء دخل در معقولات دینے والے کے آزادی دلوانے والا سمجھنے لگے تھے۔ ان سب کو سخت غصہ آگیا؛ تمام ملک میں فتنہ و فساد پھیل گیا، "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" کا معاملہ ہوگیا۔ دربار قرطبہ کے خیرخواہوں یا اُن اشخاص کی تدبیر سے جو اپنے رؤساء سے تنگ آئے ہوئے تھے، مسلمانوں کو اس علاقہ پر حملہ کرنے کا موزوں موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ وہاں پھر وہی تباہی و بربادی ہوئی جو ایک مرتبہ پہلے ہو چکی تھی۔ چونکہ باہمی مناقشات، اور قصہ و قضایا سے ممالک غیر کے راستہ بند ہوگئے تھے، کسی کو یہاں والوں کا اعتبار نہیں رہ گیا تھا، اور ساکھ جاتی رہی تھی، اس لئے یہودیوں کی تجارت میں سخت نقصان آگیا تھا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ہی یہودیوں کی سازش سے برشلونہ امیر کی فوج کے سپرد کر دیا گیا جس طرح اور مقامات میں پہلے ہو چکا تھا، گاتھک مارچ پر مسلمانوں کا قبضہ بہت ہی عارضی رہا۔ سرحدی شہروں کے والی قریباً خودسر تھے، اور کاونٹ آف برشلونہ سے بوجہ اپنے اغراض و مقاصد کے گہری دوستی رکھتے تھے۔ امیر اندلس اگر گاتھک علاقوں کو لینا چاہتے تھے تو بھی والی اُن کی کوششوں کو بیکار کر دیتے تھے، کیونکہ اُن کا میلان اس طرف ہوتا تھا کہ وہ خود رعائتیں حاصل کریں اور اپنی طاقت کو کم نہ ہونے دیں۔ امارت اندلس کی حدود مملکت میں ایک غیر ملکی قوم کے وجود کے یہ معنی تھے کہ اگر دربار قرطبہ نے اپنا تسلط وہاں جمانا چاہا تو لوگ ان غیر ملکیوں سے استمداد کر سکیں۔ عملی طور پر اس کے یہ صاف معنی تھے کہ لوگ بالکل آزاد تھے۔

EMPRESS JUDITH *

امیر عبدالرحمٰن کے عہد دولت کے آخری ایام عیسائیوں پر سختی اور تشدد کرنے کی وجہ سے بہت برے گزرے جس کا اصل باعث یہ تھا کہ مذہبی دیوانے عیسائیوں نے ازراہ تمرد وشوخی، بیہودہ شہرت کے خیال اور لغو شہادت کی آرزو سے قانون کی خلاف ورزی کی، مساجد کو ناپاک کیا، اور جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی شان عالی میں گستاخیاں اور دل آزار بیانات کیں سخت سزائیں بھی دی گئیں اور انتہا سے زیادہ رحم بھی دکھلایا گیا، مگر یہ نیا طریقہ بد امنی جو روزمرہ بڑھتا جاتا تھا، کسی طرح کم نہ ہوا۔ امیر عبدالرحمٰن کی طبیعت ہمیشہ رحم کی طرف مایل رہتی تھی، مسلمانوں کو جو رنج ان عیسائیوں کی حرکات سے پہنچتا تھا اس کی تلافی سخت سزا سے کرتے ہوئے وہ لیت و لعل ہی کرتے رہے، مگر یہ تکالیف ایسی تھیں کہ جنہوں نے ان کی سلطنت کو تنگ کر دیا تھا، اور خود ان کی خانگی زندگی پر ایک قسم کا دھبہ آ گیا تھا اس کا ان کی طبیعت پر ایسا برا اثر ہوا کہ ان کی صحت بگڑ گئی، اور وہ یکایک مرض سکتہ سے ۸۵۲ء میں ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ان کو تکلفات کا بڑا شوق تھا، اور اپنی شان و شکوہ ان کو بہت پسند تھی۔ یہی دو باتیں ان کی بڑی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے دربار قرطبہ میں بڑی تمدنی اور سیاسی تبدیلیاں ہو گئی تھیں، جنکو ان کے پیش رو امیروں کے زمانہ میں کوئی جانتا بھی نہ تھا مسلمان امرا و سلاطین اندلس میں وہ سب سے پہلے بادشاہ تھے جنکے لباس پر ان کا طغرا کاڑھا گیا۔ اس طغرے کو انہوں نے اپنی تخت نشینی کے وقت انتخاب کیا تھا۔ ان کی وضع وروش میں ایک تمکنت تھی، اور وہ اپنی رفتار و گفتار کو بصیغۂ راز رکھنا چاہتے تھے، جو ایشیائی استبداد کی ایک خصوصیت ہے۔ چنانچہ وہ عادتاً، اپنی رعایا کی نظروں سے پوشیدہ رہتے تھے، بغیر نقاب ڈالے کبھی باہر نہ نکلتے تھے، جو ان کے چہرہ و مہرہ کو لوگوں کی نگاہوں سے بالکل چھپا لیتا تھا۔ محافظ تن فوج ان کے والد نے مقرر کی تھی، جسکو انہوں نے خوب بڑھا لیا تھا۔ اس فوج کو انہوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا، اور ان کو مکمل طور پر مسلح رکھنے میں وہ خرچ کی پرواہ نہ کرتے تھے

قرطبہ میں ایک ٹکسال قائم کی تھی جس کی وجہ سے سکّوں کی حیثیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کا سونا چاندی وغیرہ بھی خالص ہوتا تھا اور نقش ونگار میں بھی خوشنمائی آگئی تھی اُن ہی کی نگرانی میں جامع مسجد قرطبہ کے دو طرف کے صحنوں میں بڑی خوبصورت رواقیں بن گئی تھیں جن کی سجاوٹ اندرونِ عمارت سے ملتی جلتی تھی عوام کے لئے حمام، حوضیں اور فوارے بنوا کر اُنہوں نے دارالخلافہ کی شان وشوکت کو بڑھا دیا تھا۔ ان میں پانی سیسے کے نلوں کے ذریعہ سے پہنچایا جاتا تھا۔ یوں شہر کے ہر حصّہ میں سیرا مورینا کا صاف وشفاف پانی ہر شخص کو مل جاتا تھا۔ جذبات دینداری وپرہیزگاری کو اُنہوں نے یوں پورا کیا کہ بے تعداد مساجد بنوا دیں اور اُن کے لئے اوقاف مقرر کر دیئے۔ ان مسجدوں میں قیمتی لکڑی اور قسم قسم کے سنگ زبرجد اور مرمر خرچ کئے گئے تھے ہر مسجد کے متعلق ایک مدرسہ ہوتا تھا یا شفا خانہ۔ وادی الکبیر کے دونوں کناروں پر مسلسل باغات تھے جو عوام کی تفریح کے لئے وقف تھے۔ ان باغات کے خوش آیند احاطہ کے اندر تمام ایشیا کی دلکش نباتات موجود تھیں۔ بلحاظ دینداری اور تشویق علوم وفنون کے امیر عبدالرحمٰن ثانی تمام روشن دماغ خلفاء ممالک مشرقیہ میں سربرآوردہ بادشاہ ہیں۔ سائنس اور صنعت وحرفت کے وہ بہت بڑے مربی تھے فلاسفۂ یونانی کے وہ بہت بڑے قدردان تھے، جنکو اُن ہی کے عہد دولت نے اندلس میں روشناس کرایا تھا فلسفیان زمانۂ قدیم کی تحریرات سننے کا اُنہیں بہت شوق تھا اُن سے لطف اُٹھاتے تھے۔ گاؤں گاؤں میں ایسے مدارس قائم ہو گئے جو وہاں کی ضروریات کو پورا کرتے تھے اُن میں تعلیم کی بہترین آسانیاں رکھی گئی تھیں وہ یتیم بچے جو اپنی بدنصیبی سے بے یارومددگار رہ جاتے تھے اُن خیراتی محکموں سے پلتے اور پرورش پاتے تھے جو سلطنت کی طرف سے قائم تھے۔

قیاصرۂ روم کی قیمتی میراث جو مسلمانوں کو اندلس میں ملی تھی وہ سڑکیں تھیں امیر عبدالرحمٰن ثانی نے ان کا نہایت احتیاط سے ملاحظہ کرایا۔ جو سڑکیں خراب ہو گئی تھیں اُن کی مرمت کرائی

نئی سڑکیں نکلوائیں، اور مکمل کی گئیں سلطنتِ اندلس کے دور افتادہ شہروں تک ان سڑکوں کی وجہ سے آمد و رفت میں وہ سہولت ہوگئی جو سلطنت روم میں بھی نہ تھی۔ ان میں سے بہت سا کام تو محض اس سبب سے کرایا گیا کہ قومی مصایب کی وجہ سے عوام الناس کو تکلیف نہ ہو۔ ایک مرتبہ امساکِ باراں کی وجہ سے تمام فصلیں ویران ہوگئی تھیں، اور تمام جانور اندلس سے نکال دینے پڑے تھے پھر ٹڈیوں کے دل کے دل نے آکر تمام سبزہ زار کو چاٹ کر چٹیل میدان کر دیا تھا۔ لوگ اپنی جانوں کو بھی نہ بچا سکے ہزاروں آدمی افریقیہ بھاگ گئے، یہاں اُن کو خوب تواضع ہوئی، کھانے پینے کو مل گیا، اور تمام ضروریات بہم پہنچ گئیں۔ جو غربا کہ ملک میں رہ گئے تھے اُن کے معمولی ٹیکس معاف کر دیئے گئے؛ اور اُن کو روزگار کے سر لگا دیا گیا اس میں جو کچھ نقصان رہا وہ امیر کے صرفِ خاص سے ادا کیا گیا۔ سرکاری کھتیاں کھول دی گئیں، اور اُن میں جو کچھ بھی تھا وہ غربا و مساکین پر تقسیم کر دیا گیا صنعت و حرفت کی طرف مایل کر کے، تمام ملک میں ہر قسم کی ترقیات کا شوق لا کر، اور شہر قرطبہ اور اُسکے مضافات کو خوبصورت اور لطیف بنا کے، اُن افسوسناک نتایج کا، جو اس عام مصیبت سے تمام ملک کو بھگتنے تھے بہت کچھ انسداد کر دیا گیا اور وہی واقعہ، جو بادی النظر میں تمام قوم کی جان لینے والا تھا، ایک بہت بڑے بادشاہ کی فیاضی اور عقلمندی سے باعث رحمت بن گیا؛ اور اُس سے دوامی فوائد مترتب ہوئے۔

بسا اوقات امیر عبدالرحمٰن ثانی کے مراحم خسروانہ اور سخاوت شاہانہ کمزوری کی حد تک پہنچ جاتے تھے جنکی وجہ سے اُن کے خانگی خدمتگار اور اہل حرم اُن پر مذاق اُڑاتے تھے فطرتاً وہ جبر و تشدد کے مخالف تھے؛ اُن کے سامنے خیانت اور خلاف ورزی احکام ہوتی تھی، مگر وہ کسی کو ملامت تک نہ کرتے تھے۔ وہ موسیقی کا شوق، بلکہ خبط، اپنے ساتھ لیکر دنیا میں آئے تھے۔ ہر ایک گویئے کے فیاض مربی تھے؛ جتنا کوئی اچھا گانے یا کوئی باجا بجانے والا ہوتا تھا اُتنا ہی اُس کا دربار شاہی پر زیادہ اقتدار ہوتا تھا۔ ایک مشہور و معروف موسیقی دان، زریاب نامی کو اُن کے والد امیر حکم نے بغداد سے بلایا تھا۔ لیکن وہ ایسے وقت میں آئے کہ اپنے قدردان

آقا و بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ امیر عبدالرحمٰن ثانی نے اُن کو اُس عزت و توقیر سے لیا جو بڑے سے بڑے بادشاہ کے سفیر ہونی چاہیئے تھی۔ قرطبہ آتے ہوئے جن جن شہروں سے اُن کو گزرنا تھا اُن کے والیوں کو حکم تھا کہ وہ اُن کی مدارات کریں۔ اُن کے استقبال کے لئے فوج بھیجی گئی اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے اُن کے علاوہ بادشاہ نے اپنی طرف سے بہت سے خواجہ سرا بھیج کر اُن کا جاہ و حشم اور بھی بڑھا دیا۔ دارالخلافہ میں اُن کو ایک عالیشان مکان رہنے کو، اور چالیس ہزار دینار سالانہ وظیفہ دیا گیا؛ جو ایک قیمتی علاقہ سلطنت سے وصول کیا جاتا تھا۔ زریاب علم موسیقی میں تو ممتاز تھے ہی، وہ اپنے زمانہ کے نہایت نامور علماء میں سے بھی تھے۔ اُن کا حافظہ ایسا عجیب و غریب تھا کہ اُن کو دس ہزار مختلف راگ اور راگنیاں یاد تھیں۔ ممالک مشرقیہ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ اُن کی عام قابلیت، اور مختلف فنون کے کمال کی یہ حالت تھی کہ نہ صرف عوام الناس، بلکہ بڑے بڑے علماء اُن کی قابلیت اور غیر معمولی دماغی قوت کو دیکھ کر یہ کہتے تھے کہ اُن کو جنّات آکر پڑھاتے ہیں۔ امیر عبدالرحمٰن نے اُن کے کمال کو دیکھ کر اُنہیں اپنا مصاحب خاص بنا لیا تھا، اور اُن کی گفتگو سے لطف اُٹھاتے تھے۔ اگرچہ امیر بالکل زریاب کے ہاتھ میں تھے، مگر زریاب کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے اقتدار کا کبھی بُرا استعمال نہیں کیا، نہ اُس کو کسی بُرے اور کمینہ کام میں لائے۔ اُن کے لطیف مذاق، خوددارانہ اخلاق و تواضع کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کا اثر اندلس کی سوسائٹی پر بہت جلد پڑ گیا۔

* بلکہ صحیح طور پر یوں کہنا چاہیئے کہ تمام یورپ پر پڑا، اور اب تک باقی ہے اور رہیگا۔ یوروپین لباس کی اکثر تراش خراش، ٹیڑھی مانگ نکالنا، ننگے سر رہنا، چمچے، چھری اور کانٹے، ماکولات و مشروبات کی اکثر چیزیں، موسم کے موافق کپڑوں کے رنگوں کا اختلاف، غرض سینکڑوں چیزیں ہیں جو میں باسناد بتلا سکتا ہوں کہ جو زریاب نے یورپ کو دی ہیں جن سے وہ اب تک بلاادائے شکریہ مستفیض ہو رہے ہیں۔ "بلاادائے شکریہ" میں نے اس لئے کہا کہ معمول کے موافق اہالی یورپ کوشش کرکے مسلمانوں کے احسانات پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مگر یوروپین لٹریچر کو خوردبین سے دیکھئے تو سب کچھ صاف نظر آجاتا ہے۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے، اگر بخت نے مساعدت کی، موت نے مہلت دی، اور مسلمانوں نے توجہ قدر افزائی کی تو ایک مستقل کتاب میں سب کچھ ہوگا جس کا مواد میرے پاس جمع ہے (مترجم)

لوگوں کے اخلاق نادانستہ لطیف اور متین ہو گئے۔ مسلمانوں کی اکثر رسوم میں بادیہ کا رنگ بہت تھا عرب اور بربری لوگ اپنی بات اور دھن کے ایسے پکے تھے کہ کئی نسلیں گزرنے پر بھی ان کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ زریاب کے اثر سے آہستہ آہستہ انہوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ زریاب میں خدا تعالےٰ نے عجیب قابلیتوں جو ہر ودیعت رکھے تھے۔ انہوں نے لباس کی تراش خراش وضع ورنگ میں ہر موسم کے موافق تبدیلی کر دی۔ معاملات سیاسی کے قواعد و ضوابط میں نئی باتیں پیدا کر دیں۔ خانگی مشاغل و تفریح کے طریقوں میں نئی ایجادیں کیں۔ معمولی رسم و راہ و ملاقات و آمد و شد میں لطافت پیدا کر دی۔ ان ہی کے جوہر ذاتی سے مختلف پودوں اور بوٹیوں کے خواص معلوم ہوئے۔ اندلسی عربوں کو ان کے نام تو ضرور معلوم تھے، مگر نہ وہ ان کو کھانا جانتے تھے نہ ان کی خاصیت معلوم تھی۔ بربط میں ان ہی کے جوہر ذاتی نے پانچواں تار بڑھایا، جس سے اس کے ترانہ و زمزمہ اور دور میں بہت کچھ ترقی ہو گئی۔ ان ہی کے جوہر ذاتی نے خواتین حرم سرا کی سنگار کے لئے بہت سے مفرح و معطر عرقیات اور عطریات ایجاد کئے۔ ان ہی کے جوہر ذاتی نے امراء کی ضیافتوں میں نہایت لذیذ اور مقوی کھانے نہایت تکلف کے ساتھ بہم پہنچائے، چنانچہ ان میں سے بہت سے کھانے اب تک ان ہی سے منسوب چلے آتے ہیں۔ ان ہی کے جوہر ذاتی نے ایسی ترکیبیں نکالیں کہ جن سے غربا کو صفائی اور آرام کا سامان بہم پہنچ گیا۔ ان ہی کے جوہر ذاتی نے صفائی کے وہ وہ انتظامات سجھائے کہ جن سے شہروں کی صحت میں ترقی ہو گئی۔ ان ہی کے جوہر ذاتی نے بدر روؤں اور نالیوں کا انتظام بتلایا۔ زریاب کا فہم و ذکا ہی ایسی چیز تھا کہ جس سے تمام دربار قرطبہ خوش ہوتا تھا، بلکہ ان کے علم و فضل نے بھی لوگوں کو اپنا گرویدہ کر رکھا تھا ان میں وہ وہ جوہر تھے کہ جنہوں نے روزمرہ زندگی کے لئے فلسفۂ عملی کے نہایت بیش قیمت اصول اختراع کئے۔ ان کے لطایف و ظرایف اب تک اہالی افریقیہ میں بطور ضرب الامثال کے متداول ہیں۔ بدیہہ گوئی میں ان کی قابلیت محیر العقول تھی۔ ہر موقعہ پر کوئی موزوں شعر دوران

گفتگو میں کوئی نکتہ، کوئی ذو فقرتین لطیفہ، بلا تکلف اُن کے منہ سے پھولوں کی طرح جھڑتا چلا جاتا تھا۔ اُن کے ذہن رسا کو اس کے لئے کسی فکر و غور کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ جہاں دوسروں کی طاقت دماغی عالم خواب میں ہوتی تھی وہاں اُن کی قوت فطنت ہر وقت کام میں لگی رہتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنی کنیزکوں کو آدھی رات کو جگا کر اپنے مخترع دماغ کی ایجاد کردہ جدید راگ یا راگنی کی تعلیم دیتے تھے۔ اُن کا دماغ کسی وقت تھکنا نہ جانتا تھا۔ از روء دین اسلام شجاع و بزرگ پرستی قطعاً ممنوع ہے، لیکن تقاضاء انسانیت نے زریاب کے نام کو حیات ابدی عطا کر دی ہے۔ اُن کا نام نسلاً بعد نسلٍ اُسی طرح لوگوں کے زبان زد چلا آتا ہے جس طرح بڑے ممتاز اور معروف فلسفیوں کا۔ یوں ممانعت بزرگ پرستی کی تلافی ہو گئی، کسی اور قوم میں اگر زریاب جیسا شخص ہوتا تو ایک مفید رسم کی پابندی میں جذبات شکرگذاری و محبت اُن کے سنگی اور برنجی بت ترشوا اور بنوا کر رہتی، اور اُن کو زمین و آسمان کے مرئی اور غیر مرئی مقامات میں جگہ ملتی۔

چونکہ زریاب کو اپنے درخشندہ جوہر ذاتی اور اخلاق کریمی کی وجہ سے امیر عبدالرحمٰن ثانی کے مزاج میں بہت بڑا درخور تھا، اس لئے لوگ امداد زر یا عہدہ کے لئے اُن سے درخواستیں کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے آقا سے سفارش کر دیں، مگر انہوں نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی۔ خطرناک کارہاء سیاسی سے اس روشن دماغ اور ادب آموز شخص کو کوئی گرویدگی نہ تھی۔ جو کچھ دولت و شہرت اُن کو نصیب ہو چکی تھی اُس پر قانع تھے۔ اُنہوں نے سازشوں، تکرار تو اور سیاسی امور کے خطرات کو نہایت خوشی کے ساتھ ایک اور شخص کے لئے چھوڑ دیئے تھے، جسکی قابلیت اپنے خاص احاطہ میں خود اُن سے کم نہ تھی۔

یہ شخص فقیہ یحیےٰ ابن یحیےٰ تھے۔ یہ وہی صاحب ہیں کہ جو قرطبہ کے جنوبی حصہ کی اُس بغاوت کے بانی کار تھے، جس کا نتیجہ یہ ہُوا تھا کہ دارالخلافہ کا پانچواں حصہ بے چراغ ہو گیا تھا، اور بیس ہزار محنتی آدمی جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ ان واقعات کا ذکر اوراق ماسبق میں

آچکا ہے۔ ان کٹے دینداروں کی قومیت کا رعب، اور اُن کے جرائم کرانے کی تدابیر ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ اُس سزاءِ سخت سے بچ گئے جس کے وہ مستوجب تھے۔ مغرور اور خود سر امیر حکم ایک مرتبہ پھر اُن پر مہربانیاں کرنے لگے تھے، حالانکہ رحم کی طرف اُن کا میلانِ طبع کم ہی ہوتا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن ثانی تو نرم دل آدمی تھے ہی اُن پر حاوی ہو جانا ان کے لئے کچھ بڑی بات نہ تھی تجربہ نے اُن کو بتلا دیا تھا کہ ایک باضابطہ قائم شدہ طاقت کی کھلی کھلی مخالفت کرنے سے اقتدار حاصل کرنا یقینی نہیں ہے، اس لئے اُنہوں نے اپنی چالوں کو بدل دیا۔ اب اُنہوں نے بادشاہ وقت کے الطاف خسروانہ کو خوشامد اور خفیہ ریشہ دوانیوں سے حاصل کیا۔ جہاں خوشامد کا موقعہ دیکھتے تھے وہاں خوشامد کرتے تھے، جہاں سختی دکھلانے کا موقعہ ہوتا تھا وہاں اس سے درگزر نہ کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ گستاخیاں کرنے سے بھی تامل نہ کرتے تھے، اور وہ اس لئے معاف کردی جاتی تھیں کہ علماءِ دین کو ایسا کرنے اور راہ راست سے بھٹک جانے والوں کو افہام و تفہیم کرنے کا ہر طرح حق حاصل ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر امیر کو بہت ہی کم مشورہ دیا کرتے تھے مگر فی الحقیقت اندلس کے تمام سیاسی اور عدالتی کام اُن کے ہاتھ میں تھے۔ اُن کی خود ستایانہ عاجزی، اور نمائشی فروتنی سے تمام رعایائے ملک اُن کا ادب کرتی تھی۔ تمام علماء اُن کی بڑھی ہوئی ذہانت، اور وسیع معلومات و قابلیت علمی، کے قایل تھے۔ چونکہ مذہب مالکی کو ان ہی نے مملکت اندلس میں پھیلایا تھا اس لئے وہ ہر ایک طالب علم اور ہر ایک عالمِ علمِ دین کے مشارٌ الیہ بنے ہوئے تھے۔ اسی اقتدار کی وجہ سے ملک پر اُن کا اثر و نفوذ بے حد و نہایت تھا۔ بلند نظر لوگوں نے بہت جلد یہ معلوم کرلیا کہ سلطنت کے بڑے بڑے عدالتی عہدہ دار یعنی قاضی القضاۃ، اور محکمہ عدالت کے ماتحت حکام ہمیشہ اُن لوگوں سے منتخب ہوتے ہیں جن پر یحییٰ کی نظر عنایت زیادہ ہوتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصول مذہب ملک میں روز بروز بڑھتے چلے جاتے تھے چند ہی سال کے عرصہ میں ان کے پیرو اور مذاہب کے مقلدوں سے بڑھ گئے۔ یہ بھی یحییٰ کی پالیسی

تھی کہ انہوں نے ہر قسم کے عہدۂ سرکاری کے قبول کرنے سے انکار کرکے اپنا ایثار نفس ظاہر کر دیا۔اس حرکت سے اُن کی طمع چھپ گئی اور اقتدار بہت بڑھ گیا۔جس اعلےٰ طبقہ سے وہ تعلق رکھتے تھے اُس میں اُن کے اختیارات بالکل مطلق العنان تھے۔وہ اپنے بادشاہ سے ذلیل کن مجاہدات (یا کفارے؟) کراتے تھے، اور بادشاہ بھی نہایت صبر و تحمل کے ساتھ اُن کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔عوام الناس سے وہ ایسا ظاہری ادب کراتے تھے جو داہمہ پرستی صرف برگزیدگان الٰہی کے لئے محفوظ رکھتی ہے، جس میں اور بت پرستی میں صرف ایک ہی زینہ کا فرق ہے۔تمام ملک کے دینی امور بالکلیہ اُن ہی کے ہاتھوں میں تھے۔اہم مقدمات کے فیصلہاء عدالت وہ خود لکھواتے تھے، اور جب کوئی حاکم عدالت اپنی ایسی راء پر بضد ہوتا تھا، جو فقیہ سیحیے سے مختلف ہوتی تھی، تو اُس کے پاس فقیہ ممدوح ایک کاغذ پر صرف لفظ "استعفا" لکھ کر بھیج دیتے تھے اور اُن کو استعفا دینا پڑتا تھا۔

امیر عبدالرحمٰن ثانی نے بھی عجیب بوقلمون طبیعت پائی تھی، انہوں نے جہاں ایک مطرب سے فائدہ حاصل کیا، اور ایک سخت مزاج دینی عالم کے رعب میں آ گئے، وہاں وہ ایک شوخ و شریر خود مطلب عورت کے بھی شکار تھے۔محل شاہی میں جہاں بہت سی اور خوبصورت عورتیں تھیں، اُن میں ایک خاتون طروب٭٭ نامی بھی تھی جو طمع و آزاد ربلند نظری کی پتلی تھی۔امیر عبدالرحمٰن

٭ ایک مرتبہ امیر عبدالرحمٰن ثانی رمضان شریف میں کچھ بدعنوانی کر بیٹھے جس سے اُن کا روزہ ٹوٹ گیا۔یحییٰ سے انہوں نے کفارہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ "آپ ساٹھ روزے رکھئے" چنانچہ امیر نے رکھے۔اب نہ وہ بادشاہ ہیں، نہ وہ علما!

بعض علماء نے یحییٰ پر اعتراض کیا کہ کفارہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ بردہ آزاد کراتے یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلواتے۔انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے، لیکن اگر میں یہی کفارہ بتلاتا تو ایک بادشاہ کو اس کفارہ کا ادا کرنا کیا مشکل تھا۔نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ روز روزے توڑتا اور کفارہ کر دیتا۔ (مترجم)

٭٭ امیر عبدالرحمٰن ثانی نے ان ہی طروب سے مخاطب ہو کر کہا تھا:۔

اذا ما بدت لی شمس النہار ۔۔ طالعۃ ذکرتنی طروبا

(الفتح الطیب صفحہ ۲۰۵ ملاحظہ ہو)

ثانی اُن کے حسن کے دیوانے تھے، اور اُن کے ناز و کرشمہ سے بالکل اُن کے غلام بنے ہوئے تھے اگرچہ وہ اس قابل نہ تھیں کہ شاہانہ فیاضی سے اُن کو فائدہ پہنچایا جائے؛ مگر امیر کی یہ کیفیت تھی کہ اپنی اس مطلوبہ کے لئے وہ خزانہ شاہی ختم کئے دیتے تھے لیکن طروب کی طمع تھی کہ کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی۔ اُدھر امیر کے جتنے مشیر تھے سب اُن کی اس حرکت سے اظہار ناخوشی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے ناز و عشوہ کی بدولت امیر سے ایک ہار لیا جسکی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔ ایک اور موقعہ پر وہ اپنا دروازہ بند کرکے بیٹھ رہیں اور جب تک دروازہ کی اونچائی کے برابر روپیوں کے توڑے نہ لے لئے دروازہ نہ کھولا۔ جذبات محبت و احسانمندی سے بالکل مُعرا تھیں؛ اُنہوں نے اپنے اقتدار کی دائمی نشانی ایک ایسا سخت ترین جرم کرکے چھوڑنی چاہی جس کی نوعیت ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت ہی میں سخت بے رحمی اور مادۂ فاسد بھرا ہوا تھا۔ امیر عبدالرحمٰن کے پینتالیس[۴۵] بیٹے تھے، اُن میں سے سب سے بڑے بیٹے محمد کو اُنہوں نے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا تھا۔ مگر طروب چاہتی تھیں کہ تاج و تخت اُن کے بیٹے عبداللہ کو

انا ابن الميامين من غالب	اشب حربا و اطفى حربا

امیر عبدالرحمٰن ثانی نے جلیقیہ پر فوج کشی اور بنفس نفیس قیادت کی جنگ نے طول کھینچا تو وہاں سے اُنہوں نے طروب کو لکھ کر بھیجا:—

عدانی عنك مزار العدا	وقودی عليهم سهاما مصيبا
فكم قد تخطيت من سبسب	ولاقيت بعد دروب دروبا
الاقى بوجهى سموم الهجير	اذكاد منه الحصى ان يذوبا
تدارك بى الله دين الهدى	فاحييته واماتت الصليبا
وسرت الى الشرك فى جحفل	ملأت الحزون به والسهوبا

غالباً مسٹر سکاٹ انگریزی کی یہ مثل بھول گئے کہ "عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے"۔ (مترجم)

ملے۔ اس کے لیئے وہ سب جتن کر رہا ہیں۔ آخر انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ جو کام سمجھانے بجھانے، منت سماجت کرنے سے نہیں نکلا وہ ایک شخص کی جان لینے سے حاصل کریں۔ ایک خواجہ سرا "نصیر" نامی عرض بیگی تھا، اور طروب کا نہایت وفادار غلام۔ وہ امیر عبدالرحمٰن سے چنداں خوش نہ تھا بلکہ نے اس ضروری امر میں اُس کی خدمات سے کام لینا چاہا۔ از روئے نسل یہ شخص سپین کا باشندہ اور اپنے اجداد کے مذہب و ملت کا سخت دشمن تھا عیسائیوں کی شرارت انگیز حرکات سے جو حال ہی میں اُن پر سختیاں کی گئی تھیں، اُن کا اصل بانی یہی شخص تھا بلکہ طروب کے حکم کے موافق یہ حبشی ایک مشہور شامی طبیب، حرّانی نامی کے پاس گیا جس نے چند ہی روز پیشتر قرطبہ میں طبابت کرنی شروع کی تھی۔ نصیر نے پہلے اس پر اپنا اقتدار ظاہر کیا اُن کی تعریفیں کیں اور آخر کنایتاً کہا کہ "جو درخواست میں پیش کرنا چاہتا ہوں اگر اسکو آپ مان لینگے تو آپ کے لئے بہت ہی مفید ہوگا، اور آئندہ عمر میں آپ کو محنت کرنے کی ضرورت نہ رہیگی"۔ یہ کہہ کر اُس نے حرّانی کو ایک ہزار دینار پیش کئے، اور یہ عرض کیا کہ کوئی سخت ترین زہر ہلاہل، جو سائنس اب تک بتلا سکا ہے، ایک خاص وقت اور دن کے لئے تیار رکھیں۔

چونکہ طبیب مذکور ذہین و فریس آدمی تھا، اور اسے دربار ہائے شاہی کے ایسے زبون افعال کا پرانا تجربہ تھا، اُس نے بآسانی یہ معلوم کر لیا کہ یہ تیاریاں کسی کی جان لینے کے لئے کی جا رہی ہے۔ نمک حرام طروب کی باتیں، اور اُن کی بے انتہا بلند نظری، تمام قرطبہ میں طشت از بام تھیں۔ ایک طرف تو حرّانی کسی طرح بھی اس پر راضی نہ تھا کہ اُن کی وجہ سے بالواسطہ بھی، امیر عبدالرحمٰن کی ذات کو چشم زخم پہنچے؛ دوسری طرف وہ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ امید کا جو سبز باغ اُن کے سامنے ہے اُس سے برومند نہ ہوں، یا ایک حبشی کو ناخوش کر کے وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال لیں؛ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر اُس کی نمک حرامی کو ظاہر کر دیا گیا تو اُسکے جتنے دوست ہیں سب اپنا بدلہ لے لینگے۔ اس لئے طبیب نے خفیہ طور پر

کسی طرح امیر کو آگاہ کر دیا، اور کہلا بھیجا کہ عرض بیگی جو چیز اُن کو دے اُسے زبان پر نہ رکھیں۔ چونکہ بادشاہ کی صحت پہلے ہی خراب ہو رہی تھی، اس لئے سازش کنندوں کو اپنا مطلب حاصل کرنے کا بہت اچھا موقعہ حاصل تھا۔ حبشی عرض بیگی کو اس سے بہتر موقع کب مل سکتا تھا؛ اُس نے نہایت خوشامدانہ و عاجزانہ لہجہ میں اپنے آقا کے سامنے ایک نہایت مقوی دوا پیش کی جسکو وہ ایک مشہور طبیب سے لیکر آیا تھا۔ امیر کو حرّانی کی بات یاد تھی، اور وہ ہر طرح کی احتیاط کر رہے تھے حبشی سے کہا کہ پہلے وہ تھوڑی سی دوا خود پی لے تو باقی وہ پی لینگے۔ نصیر کو مجال انکار نہ تھی وہ تھوڑی سی دوا پی گیا؛ اور امیر کے سامنے سے ہٹ کر گھبرایا ہوا حرّانی کے پاس تریاق کے لئے گیا۔ تریاق بھی فوراً دیا گیا مگر زہر ہلاہل اپنا کام کر چکا تھا؛ اپنی ہی نمک حرامی کا قتیل، نصیر وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

امیر عبدالرحمن ثانی ضعیف تو پہلے ہی بہت ہو رہے تھے، اُن سے یہ نہ برداشت ہو سکا کہ جس سے اُن کو اتنی محبت ہو اور جس پر وہ اتنا اعتبار کرتے ہوں، وہی اُن کا دشمن جانی بن جائے۔ یہ نیک نہاد اور ہر دلعزیز بادشاہ ابھی عمر طبعی کو بھی نہ پہنچا تھا کہ اس سازش کا حال معلوم کرنے کے چند ہی ہفتہ بعد راہی ملک بقا ہوا۔

غیور خلفاء دمشق کی پیروی میں بنو اُمیہ کی غیرت نے اپنے ملک میں شروع ہی سے خواجہ سرا مقرر کر لئے تھے۔ یہ لوگ فوراً ہی بعض رازوں پر آگاہ ہو گئے تھے۔ ملکی معاملات میں اُنہوں نے رسوخ، اور حرم سرا کی سازشوں میں ایک طرح کا اثر و نفوذ حاصل کر لیا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُن کے مسخ کر دینے سے وہ اپنے آقاؤں کے وفادار اور نمک حلال رہینگے، مگر اس سے وہ بنی نوع انسان کے اور بھی دشمن ہو گئے۔ درم و دینار کی اُن کو ایسی طمع تھی کہ وہ کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی، اور بغض و حسد کا اُن میں ایسا مادہ تھا کہ جب تک وہ اپنے محسود و مبغوض کو بالکل فنا نہ کر لیں اُنہیں چین نہ آتا تھا۔ انسان تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی وحشت اور سنگدلی کو کام میں لا کر اس گروہ سے جذبہ محبت کی جڑ کاٹ دیتا ہے، جو ہر ایک دل میں فطرتاً موجود ہوتی ہے،

مگر کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اُن کے سینوں میں مہر و وفا کے بدلے میں اور عیوب بھر جائینگے چونکہ یہ فرقہ، ہر ملکہ کا حاضر باش اور رازدار ہوتا تھا اس لئے یہی لوگ سازشوں کے اصل اوزار بھی ہوتے تھے۔ اکثراً یہی فرقہ ایسی تدابیر کے بانی مبانی ہو جاتا تھا جن کے نہایت اہم سیاسی نتائج ہوتے تھے۔

ان ہی میں سے ایک ذلیل ہتھیار، جس کے بغیر ایسی مجرمانہ بلند نظری میں کامیابی ہو ہی نہیں سکتی، ملکہ طروب نے بھی استعمال کیا تھا۔ اگر اُن کو اپنے ارادہ میں کامیابی ہو جاتی تو ہمیشہ کے لئے اُن کو اپنا نصب العین مل جاتا۔ نصیر کا جو کچھ انجام ہُوا اُس سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئیں۔ اِس شخص کی مرگ مفاجات سے جو شبہ لوگوں میں پیدا ہُوا اُس کی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی، جو ترکیب اُن کو سوجھی وہ کی اور جو چال اُن سے چلی گئی وہ چلی۔ کسی کو آیندہ مراحم کے وعدے دیئے کسی کو رعائتوں کا امیدوار بنایا، اور کسی کو اپنی آزادی کے پھندے میں پھنسایا۔ غرض جس طرح بن سکا بہت سے طرفدار پیدا کر لئے۔ یہ سب کے سب اسی فرقہ محافظین حرم سرا ہیں سے تھے۔

امیر عبدالرحمٰن ثانی کی حالت ایسی نہ تھی کہ اُن کا آخری وقت یکایک آپہنچیگا۔ انہوں نے غفلت کی کہ باضابطہ طور پر اپنے جانشین کا اعلان نہ کر گئے۔ لیکن یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے محمدؐ کو وارث تاج و تخت سمجھتے ہیں۔ یہ شاہزادہ گو سرد مہر تنک مزاج اور تنگ دل تھے مگر لائق و فائق بھی تھے۔ بخیل ایسے تھے کہ ایسی مثال خاندان شاہی میں اور نہیں ملتی۔ سپہ سالاری اور حکمرانی کا اُن کو بڑا تجربہ تھا، اور نہایت دیندار تھے۔ برعکس ان کے عبداللہ لذات و شہوات میں منہمک تھے۔ اُن کا محل رات کو بدمستی کا اکھاڑہ بن جاتا تھا، اور طلوع آفتاب تک وہاں شور و شغب برپا رہتا تھا۔ وہ ہر غور طلب اور فکر آزما کام سے علیحدہ رہتے تھے۔ اُن کی گہری دوستی بھی بدقماش لوگوں سے تھی یا مفت خوروں سے، جنکی گفتگو پھکڑ اور بدتہذیبی سے بھری ہوئی ہوتی تھی، اور اُن کی بدزبانی سے نہ حکام ملکی بچتے تھے نہ علماء دینی۔ بہت ہی کم

ایسا ہوتا تھا کہ عبداللہ کسی مسجد کا دروازہ جھانکیں یا دینی کام میں دخل دیں۔ عوام الناس اُن سے نفرت کرتے تھے اور دیندار اُن کی صورت سے بیزار تھے۔ حبشی خواجہ سرا بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی طرح تخت و تاج کے قابل نہیں ہیں۔ اگر اُنکی والدہ طروب صَرفِ بیجا نہ کرتیں تو کوئی شخص بھی اُن کا مددگار نہ ہوتا۔ جن حبشیوں کو اُن سے نفرت تھی اُن میں سے ایک ابوالمفرح تھا۔ اس کا اپنے ہم جنسوں میں بڑا اثر تھا۔ باوجود اسکے کہ اس فرقہ کی بے وفائی اور بے استقلالی ضرب المثل ہے مگر ابوالمفرح نے عبداللہ سے اپنا بدلہ لینے اور دوگنی نمک حرامی کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ عبداللہ کے خیالاتِ بے دینی کو اُس نے اپنی تدبیروں کی کامیابی کا اچھا بہانہ بنایا اور ہر ایک کے کان میں یہ پھونک دیا کہ اگر عبداللہ تخت پر بیٹھ گئے تو امارت اندلس خطرات میں پھنس جائیگی اور اس شاہزادہ کے افعال بد کو اس نے دیندارانہ لہجہ میں سب سے بیان کیا۔ ادھر تمام خواجہ سراؤں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ایسے بادشاہ کے وجود سے اُن کے اغراض و مقاصد کو سخت نقصان پہنچے گا جو شروع عمر سے بے دینوں کی صحبت میں رہے ہیں اور ایسے آدمی اُن کے رفیق بنے ہوئے ہیں کہ جن سے سب لوگوں کو نفرت ہے پہلے تو حبشیوں نے محمد کی سخت مزاجی اور بخل کی وجہ سے اُن کو تخت کے ناقابل بنایا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جہاں حرم سرائے سلطانی کی نازک رائیں اور کھلے ہاتھوں روپیہ کا خرچ تمام مصالح ملکی پر حاوی ہوں وہاں وہ عیوب جو محمد میں بتلائے جاتے تھے اُن کو ناقابل تخت و تاج بنانے ہی تھے۔ طامع ابوالمفرح نے ان اور اسی قسم کے اور اعتراضات کے جواب تسلّی بخش دیدئیے کیونکہ اُس کا تجربہ اور شہرت ایسی تھی کہ اُن کو ایسے کام میں پیش قدمی کرنی پڑتی تھی کہ جس میں بہت کچھ استقلال اور دانشمندانہ چالوں کی ضرورت تھی۔ بہرحال یہ سمجھ لیا گیا کہ محمد اُن امیدواروں میں سے ہیں۔ جن کے لئے تخت زیب دیتا ہے۔ امیر عبدالرحمن ثانی نے آدھی رات کے بعد انتقال کیا تھا اور قلعوں کی طرح محل شاہی کی فصیل بھی الگ تھی اور خندق بھی۔ ایشیا کی رسم کے موافق اُسکے پھاٹک رات کو بند کر لئے جاتے تھے۔ اُس کے بعد

کوئی شخص آمد و رفت کا مجاز نہ تھا تا وقتیکہ وہ تسلی بخش طور پر اپنا مقصد نہ بتا دے جس کے لئے اُسکو باہر جانا یا اندر آنا ہے اور اپنی شناخت کا ثبوت نہ دے دے۔ ایک زمانہ سے یہ رسم چلی آتی تھی اور اُسے قانونی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی کہ جو شاہزادہ کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد سب سے پہلے محل شاہی پر قبضہ کر لے اُس کو تاج و تخت کا حق فایق حاصل ہوتا تھا۔ ایک خواجہ سرا سعدون نامی جس نے بادل ناخواستہ عبداللہ کی حمایت چھوڑی تھی اور اب اُن کے بھائی محمد کا طرفدار ہو گیا تھا اس کام کے لئے منتخب کیا گیا کہ وہ اُن (محمد) کو جا کر خوشخبری دے۔ شہزادہ کا بنگلہ وادی الکبیر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ سعدون نے شہر کے پھاٹک کی کنجی کسی طرح حاصل کی اور اُس دروازہ سے جو پل کی طرف کھلتا تھا سنسان گلیوں سے نکلا۔ راستہ میں اُس کو عبداللہ کے محل سے گزرنا پڑا تو دیکھا کہ اُن کے کمرے روشنی سے جگمگا رہے تھے اور بدمستوں کی آوازیں باہر تک سنائی دیتی تھیں مگر سعدون چپ چاپ چوروں کی طرح اپنا رازدارانہ پیغام لئے ہوئے نکل گیا۔ محمد اُس وقت حمام میں تھے اُن کو بلا کر یہ پیغام دیا جسکو انہوں نے سن کر تعجب کیا مگر اعتبار نہ آیا۔ سعدون اپنے ساتھ امیر عبدالرحمن ثانی کی مہر بھی بطور نشانی کے لے گیا تھا اُسکو دیکھ کر بھی اُن کو تسکین نہیں ہوئی۔ وہ یہ سمجھے کہ اس حبشی کو عبداللہ نے اُن کو قتل کرانے کے لئے بھیجا ہے چنانچہ وہ سعدون سے بہت عاجزی کے ساتھ طالب رحم ہوئے حالانکہ وہ اُن کو نقصان پہنچانے کو نہیں بلکہ تخت پیش کرنے کو گیا تھا۔ آخر سعدون کے قول و قرار و منت سماجت نے اپنا کام کیا۔ محمد نے اپنے خانگی وارد غہ کو بلا کر محل شاہی کے اندر داخل ہونے کی تدبیر دریافت کی جو ابتدائی کامیابی کے لئے نہایت ضروری تھی۔ پہلے تو یہ رائے ہوئی کہ حاکم شہر سے دروازہ کھولنے کی اجازت لیجائے چنانچہ یہی کیا گیا لیکن حاکم شہر محتاط آدمی تھا اس نے ایسا کام کرنے سے انکار کر دیا کہ جس کا انجام سخت مخدوش تھا۔ رات گذرتی چلی جا رہی تھی اور یہ ظاہر تھا کہ جو کچھ کرنا ہو وہ بہت جلد کرنا چاہئے ورنہ صبح ہوتے ہی سب کچھ طشت از بام ہو جائیگا اور ممکن ہے کہ جتنے آدمی اس کار خطیر میں

شریک ہوں سب کی سزا موت ہو۔ آخر داروغہ ابن ہوسیلے ہی کے موجد دماغ نے عقدہ کشائی کی اور وہی اس تردد میں اپنے آقا کا ممد ہوا۔ اس نے کہا کہ "حضور! آپ جانتے ہیں کہ میں نے اکثر آپکی صاحبزادی کو محل شاہی میں پہنچایا ہے! آپ اُن ہی کا لباس زیب تن فرمالیں، انشاءاللہ ہم کو کوئی چوکیدار یا محافظ نہیں روکیگا۔" یہ رائے سب کو پسند آئی۔ محمد نے حرم کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر برقعہ اوڑھ لیا، اور ایک گدھے پر سوار ہوگئے۔ اس کی باگ داروغہ نے پکڑلی، سعدون آگے آگے ہولیا۔ یہ لوگ بلادقت چوکیداروں سے بچ کر نکل گئے؛ مگر دوراندیش حبشی خواجہ سراء کو یہ ڈر رہا کہ مبادا کوئی شخص اُن کے پیچھے آرہا ہو۔ اُس نے ابن ہوسیلے سے کہا کہ "تم عبداللہ کے محل کے قریب ٹھیر جاؤ۔ شاہزادہ کو میں تنہا لے جاؤنگا۔" جب اُنہوں نے محل شاہی پر پہنچکر دستک دی تو ایک دربان نے، جو مُسن آدمی تھا، اور ایک مدت سے اس ذمہ داری کے کام پر متقرر تھا، جواب دیا۔ پھر اُس نے بڑی مجسس نظر سے پھاٹک کے روزن میں سے دیکھ کر سعدون کو پہچانا، اور پوچھا کہ وہ کسکو اپنے ساتھ لایا ہے۔ سعدون نے جواب دیا کہ "شاہزادہ محمد کی صاحبزادی میرے ہمراہ ہیں۔ بہت جلد دروازہ کھول دو۔" دربان نے شک کی نگاہ سے ایک لمبے قد اور لحیم شحیم شخص کو دیکھا، اور مسکرا کر کہنے لگا، "شاہزادی کو میں نے ابھی چند روز ہوئے کہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تب سے تو وہ دوگنی ہوگئی ہیں۔ اِن سے کہو کہ اپنے چہرہ سے نقاب ہٹالیں، میں اُن کو دیکھ تو لوں۔" خواجہ سراء نے تامل کیا، تو دربان نے للکارا۔ شاہزادہ محمد نے اپنا نقاب ہٹالیا۔ دربان مہین پور خلافت کی صورت دیکھ کر ہق دق رہ گیا۔ شاہزادے نے اُس سے کہا کہ "میرے والد ماجد کا انتقال ہوگیا ہے اور میں اُن کے محل پر قبضہ جائز کرنے آیا ہوں۔" دربان نے کہا کہ "میری یہ مجال نہیں ہے کہ آپ کے ارشاد میں کچھ شک کروں، لیکن آپ کو اندر آنے دینے سے پہلے میری آنکھوں کو یقین آنا چاہئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔" سعدون نے کہا "اچھا میرے ساتھ چلو۔" اُس نے شاہزادہ کو تو وہیں چھوڑا، اور دربان کو لے جاکر امیر عبدالرحمن کا تن بے جان دکھلا دیا۔ دربان کو اطمینان

ہو گیا، وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا، واپس آ کر اُس نے دروازہ کھول دیا، اور نہایت ادب اور اظہار وفاداری کے ساتھ شاہزادہ کی دست بوسی کی محل شاہی کے تمام آدمی جگا دیئے گئے؛ تمام اراکین سلطنت فوراً طلب ہوئے، اور اُن کو حکم دیا گیا کہ فی الفور اپنے تاجدار سے بیعت کریں۔ یوں ایک مٹھی بھر حبشیوں کی تدبیر سے (جنہوں نے نہایت ذوق شوق سے ایک کے ساتھ دشمنی کی اور دوسرے سے حق دوستی ادا کیا) ایک بہت بڑا انقلاب رُک گیا؛ اور ایک ایسی قومی خدمت کی کہ جس کا ثمر قیئین کی مستقبل سلطنت پر مستقل اثر پڑا۔

تخت پر بیٹھ کر امیر محمدؒ نے جو کچھ کام کئے۔ اُن سے اُن کی نہایت سرگرمی ظاہر ہوئی علمائے دین نے اُن کی بڑی تعریفیں کیں، اور وہ اُسی وقت سے اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ تمام عمال و حکام، جن کی نسبت یہ شبہ بھی ہُوا کہ وہ عیسائیوں کی طرف مایل ہیں یک قلم موقوف کر دیئے گئے، اور اُن کی جگہ نہایت دیندار مسلمان مقرر کئے گئے۔ موسےٰ ابن نصیر رحمہ اللہ کے عہد نامہ کی رو سے نہ کوئی نیا گرجا بن سکتا تھا نہ اُن میں توسیع ہو سکتی تھی؛ امراء سابقین اس قانون سے غافل رہے تھے، اور باوجود عیسائیوں کی نمک حرامی اور سرکشی کے اس طرف سے چشم پوشی کی تھی؛ اس رعایت کا یہ نتیجہ ہُوا تھا کہ بہت سے نئے گرجا ایسے موقعوں پر بن گئے تھے جہاں عیسائیوں کی تعداد زیادہ تھی، اور ان کو اپنی عبادت کے لئے آسانیاں درکار تھیں۔ امیر محمدؒ نے ایک حکم ناطق جاری کر دیا کہ ہر ایک چھوٹا یا بڑا گرجا جو طارق (علیہ الرحمہ) کے حملہ کے بعد بنا ہو منہدم کر دیا جائے۔ جو لوگ کہ اس حکم کی تعمیل پر متعین ہوئے تھے اُن کو اپنے بادشاہ کی نیک نامی کے علاوہ اپنے دینی جوش کو پورا کرنے کا خیال بھی تھا۔ اُنہوں نے اُن تمام عمارات کو گرا کر برابر کر دیا جو عیسائیوں نے اپنے مذہبی امور کی سرانجام دہی کے لئے بنائی تھیں۔ نہ اُنہوں نے اُن کے تقدس کا خیال کیا، نہ اُن کی روایات کا لحاظ کیا نہ اُن کی تاریخ بنا کو دیکھا۔

فقہاء نے اُن بتدرع اور ضدی عیسائیوں کے خلاف، جو خواہ مخواہ بھی شوق شہادت میں مرے جاتے تھے اور جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، ایذا دہی کی صورت نکالی تھی امیر عبدالرحمٰن

ثانی کے زمانہ میں اس میں کچھ کمی آگئی تھی؛ لیکن اب اُس پر بہت سختی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ آباء کلیسا کی شہادت ایسے معاملات میں ہمیشہ مشکوک ہوتی ہے کہ جہاں اُن کو اپنے پیشہ کے کارنمایاں یا دشمن کی فتح دکھلائی ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کو چھوڑ کر مسلمانوں کے بیانات کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ عربی مورخین ہی کا یہ قول ہے کہ مسیحیوں پر جو سختیاں کی گئیں اُن کے خوف سے بہت سے عیسائی مسلمان ہو گئے۔

لیکن کفارہی کی یہ حالت نہ تھی کہ اُن کی طرف بادشاہ کو متوجہ ہو کر اپنے شاہی اختیارات سے کام لینا پڑا۔ مہد اسلام میں قرآن مجید کی آیات کے معنی اور بعض متنازعہ فیہا اصول کے متعلق ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، متنازعین کے آپس میں وہ عناد پھیلا کہ جسکے مقابلہ میں نبوی عداوت کوئی چیز نہ تھی۔ اس کا اثر اندلس تک پہنچا۔ چونکہ اندلس کے بنو اُمیہ نے شروع ہی سے اپنے آپکو سب کچھ سمجھا لیا تھا۔ اُنہوں نے خلافت کے تمام کام بلا کسی استثناء کے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اسی لئے اُن کو ہر دینی و دنیوی امر پر کامل اقتدار حاصل تھا۔ امیر محمد نے یہ دور اندیشی کی کہ قبل اسکے کہ متنازعین شمشیر بکف ہو کر ایک دوسرے کا خون کریں، وہ خود ان متنازعہ فیہا مسایل کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے بہ اختیارات خلافت فریقین کو یہ حکم دیا کہ وہ اُن کے حضور میں آکر مختلف فیہا مسایل پر بحث کریں۔ دونوں کے بیانات سُنے گئے۔ مالکیوں کا فرقہ چونکہ سلطنت میں انتہاء نشاۃ تک بہت بڑھ گیا تھا اس لئے اُن میں تبختر اور گستاخی پیدا ہو گئی تھی مگر اس وقت وہ حنبلیوں سے بحث میں بے طرح ہار گئے۔ اس موقعہ پر امیر محمد نے بہت آزادی دکھلائی، جسکی ایسے خاندان کے بادشاہ سے امید نہ تھی جس کو نسلہاء مابعد نے سخت متعصب بتایا ہے۔ اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو اعتراضات مذہب حنبلی پر کئے جاتے ہیں وہ فضول ہیں۔ اُسکے اصول نہ قرآن شریف کی تفاسیر کے منافی ہیں، نہ احادیث صحیحہ کے خلاف۔

اس خیال سے کہ اگر رعایا کو جہاد کی طرف مایل کر دیا جائے تو دو فائدے حاصل ہو جائینگے، ایک یہ کہ وہ مناظرات دینی اور فتنہ و فساد سے باز رہینگے دوسرے شمالی علاقہ کے عیسائی، جو

اپنی حدودِ سلطنت بڑھاتے چلے آتے ہیں اور مسلمانوں پر حملے کرتے ہیں اُن کی روک تھام ہو جائیگی، امیر محمد نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ جو فوجیں اس غرض سے جمع کی گئی تھیں اُن پر والیانِ مریدہ اور سرقُسطہ کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ گا تھک مارچ ایک مرتبہ پھر حملہ آوروں کا خوفناک میدان ترکتازبن گیا۔ مشرقیئن کی فوج ایک مرتبہ پھر دشمن کے ملک میں گھس کر ناربون کی دیوار کے نیچے تک پہنچ گئی۔ والی سرقُسطہ موسٰے ابن زیاد، کو شاہ الیسٹریاس کے خلاف جنگ کرنے پر متعین کیا گیا تھا جلیقیہ میں اُنہوں نے چند جگہ معمولی سی کامیابی حاصل کی، مگر آخر البیضاء کے مقام پر سخت شکست کھائی۔ اسکو شاہ اورڈوؤنؐ نے لے لیا عربی فوج محافظ کا قتل عام ہوا اور شہر وحشی فوج کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ؛

باشندگانِ طلیطلہ کو اپنے مسلمان آقاؤں سے ایسی شدید دشمنی آپڑی تھی کہ جو نہ رحم سے کم ہوتی تھی، نہ جبر و تشدد سے۔ اُن کو جو معلوم ہوا کہ اُن کے عیسائی بھائی قرطبہ میں ستائے جاتے ہیں تو وہ ڈر گئے کہ کہیں فقہا کا جوشِ مذہبی اُن کی بھی خبر نہ لے (کیونکہ اُس زمانہ میں سلطنتِ اندلس میں ان ہی کا زور تھا) اس لئے اُنہوں نے بغاوت کی تیاری کی۔ عربی گورنر کو گرفتار کر لیا اور امیر سے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے عوض میں وہ یرغمال جو امیر عبدالرحمٰن ثانی نے اُن سے بجبر لیا تھا واپس کر دیں۔ اگرچہ امیر محمدؐ کی طبیعت میں کمزوری کا عنصر نہ تھا، اور کوئی مورخ بھی یہ نہیں لکھتا کہ وہ کمزور طبیعت کے آدمی تھے، مگر تعجب ہے کہ امیر نے اسکو منظور کر لیا۔ خونریز اہالی طلیطلہ نے باوجود اپنے آدمی لے لینے کے بھی باقاعدہ جنگ کی ٹھان لی۔ چونکہ وہ بچپن ہی سے آلاتِ جنگ سے کھیلتے، اور فوجی زندگی کی سختیاں برداشت کرتے رہے تھے اُنہوں نے کئی مرتبہ یہ ثابت کر دیا کہ افواجِ شاہی میں اُن کے مقابلہ کی تاب نہیں ہے، اور امیر کے قواعد دان جنگ آزمودہ افسر اُن کے سامنے کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ اُنہوں نے کلیٹراوا کی فوج محافظ کو نکال باہر کیا، اور اسکی فصیل کو گرا دیا۔ پھر سیرا موریناکے دروں سے نکلتے ہوئے وہ انڈوجار پر[۸] جا چڑھے۔ جو فوج شاہی کے انکے

ORDOÑO. x

مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی اُسکے سامان پر قبضہ کر کے چھاؤنی کو لوٹ لیا۔ تاریخ بغداد تھا۔ طلیطلہ میں کبھی اہالی طلیطلہ دار الخلافہ کے اتنے نزدیک نہیں پہنچے چونکہ اس میں امیر کی توہین تھی اس لئے اُن کو یہ امر سخت ناگوار گذرا۔ وہ جس قدر فوج جمع کر سکتے تھے اُسکو لیکر بنفس نفیس باغیوں کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوئے اسکی خبر سُن کر دشمن پس پا ہو گئے، اور اپنے سرکردہ سنڈولا کو (جس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسل گاتھ سے تھا) بادشاہ ایسٹریاس کے پاس امداد لینے کے لئے روانہ کیا۔ عیسائی بادشاہ ایک ہی نظر میں یہ تاڑ گیا کہ اگر اس وقت امداد دی تو اس سے غیر معمولی فوائد مترتب ہونگے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قلب مملکت اسلامی میں اُن کی ایک نہایت قوی فریق سے دوستی ہو جائیگی۔ چنانچہ اس نے کار دان لوگوں کی فوج سنڈولا کے ہمراہ روانہ کر دی۔ امیر محمد ابھی طلیطلہ پہنچے بھی نہ تھے کہ یہ فوج شہر میں داخل ہو گئی۔

فصیل شہر کی مضبوطی، اور فوج محافظ کی دلاوری سے حملہ کی کامیابی کی امید نہ تھی۔ امیر محمد نے خدعۃ الحرب سے کام لینا چاہا جو اہل عرب کے مکر و فراست کا خاصہ ہے۔ وادی سلیط(9) کی گھاٹیوں میں اُنہوں نے اپنی فوج کو چھپا دیا اور خود رسالہ کا ایک دستہ لے کر طلیطلہ کے سامنے پہنچے اور وہاں چھاؤنی ڈالنی چاہی۔ باغیوں نے یہ سمجھا کہ اصلی جمعیت کے آنے سے پہلے اس ہراول کو کاٹ ڈالنے کا اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اُنہوں نے شہر سے باہر نکل کر حملہ کیا، مگر قبل اسکے کہ اُن کو اپنی مخدوش حالت کا علم ہو وہ اُس جال میں پھنس گئے جو اُن کے لئے بچھایا گیا تھا، اور ہر طرف سے گھر گئے۔ خوفناک خون ریزی ہوئی۔ معدودے چند ہی آدمی بچ سکے۔ میدان جنگ میں آٹھ ہزار آدمیوں کے سروں کا ایک ٹیلہ بن گیا، جو فاتحین کی دشمنی اور مفتوحین کی بیچارگی کا مجسم منظر تھا۔ آخر فتح کے یہ دلوں کو لرزا دینے والے نشان قرطبہ اور اندلس کے اور شہروں کی فصیلوں پر لے جا کر رکھ دیئے گئے۔ وہ مدتوں تک نمک حراموں کے لئے باعث عبرت رہے یہ ایک خوفناک سبق تھا کہ اہالی طلیطلہ اور اُن کے کفار دوستوں کو وادی سلیط کے کنارے دیدیا گیا تھا۔ اس لڑائی میں باغیوں کے بیس ہزار آدمی قتل ہوئے

تھے (صرف عیسائیوں اور اُن ہی مسلمانوں کے سر کاٹے گئے تھے جو اس بغاوت کے سرکردہ
تھے) مگر باوجود اس شدید نقصان کے اس دارالسلطنت گاتھ کے باشندوں کا مزاج درست نہیں
ہوا، بلکہ اُلٹا اُن کا غیظ اور ہمت و استقلال بڑھ گیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ اب اُن کی مزاحمت پوری
طرح رُک گئی۔ فوج محافظ کو جواب تہائی رہ گئی تھی قلعے میں بیکار پڑا رہنا پڑا دستکار اور دولتمند
آدمیوں کے مقبوضات کو اس وقت تک اس امید پر تباہ نہیں کیا گیا تھا کہ شاید وہ اطاعت
قبول کر لیں مگر اب وہی لوگ غصّہ اور مایوسی کی حالت میں اپنی آنکھ سے اپنے باغوں کو تباہ،
اپنے تاکستانوں کو برباد اور اپنے بنگلوں کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یہی اُن کے ترفہ اور تکلف
کی علامات تھیں جو مشہور دریائے ٹیگس کے کنارے پر کئی میل تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ اُن کو اسلئے
اور بھی زیادہ رنج ہوا کہ اُن کی جو کچھ تباہی ہوئی ہے اُس کا باعث اُن کا کوئی قصور نہیں تھا،
بلکہ سیاسی خرابیاں یہودیوں اور ان لوگوں کی شرارت کی وجہ سے ہوئیں جو باہر سے وہاں آ گئے تھے یہ نو واردین
مجرمین کے بدترین عنصر اور بیسیوں گروہ اشرار کے خارج شدہ لوگ تھے۔ امیر محمد کی فوج کو
جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اُس سے اہالی طلیطلہ افسردہ تو ضرور تھے مگر اُن پر کوئی بھی
مصیبت پڑ جاتی یہ ممکن تھا کہ وہ پھر بھی اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لیتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر
اُس پل کے نیچے سرنگ لگا دی گئی جس پر ہو کر شہر کو راستہ گیا تھا۔ شہر کے ایک دروازہ پر حملہ
کیا گیا، مقابلہ ہوا اور حملہ آور بظاہر پریشان ہو کر بھاگ نکلے محصورین نے اُنکا تعاقب کیا، اور
جب وہ پل پر پہنچ گئے تو سرنگ اُڑا دی گئی۔ پل تمام دشمنوں کو لے کر بیٹھ گیا۔ سب دریائے ٹیگس میں
بہ گئے۔ ایک آدمی بھی نہ بچا؛ کیونکہ بہت سے لوگ تو ڈوب گئے اور جس جس نے نکلنے کی کوشش
کی وہ نشانہ تیر بنا، کیونکہ امیر کے تیرانداز پہلے ہی اس غرض سے کناروں پر کمین کئے گئے
تھے۔ ان پے در پے مصائب میں طلیطلہ والوں نے صلح کی ضرورت دیکھی۔ اُن کی جگہ اگر کوئی اور
ہوتا تو حواس باختہ ہو جاتا۔ یہ مانا کہ انہوں نے اپنی شجاعت و استقلال کو بہت بڑی جگہ صرف کیا،
مگر باوجود اسکے ناظرین میں سے کوئی شخص بھی اُن کی داد دینے کو تیار نہ تھا [illegible] امیر

اُن کے مطیع کرنے کے لئے متواتر کوشش کرتے رہے مگر سب بے سود۔ وہ اُن کی صولت وقوت
کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، خود اُن ہی کے دارالخلافہ میں جا کر اُن کو تنگ کرتے تھے، اُن
کی فوجوں کو جو شاہزادوں اور شاہی خاندان کے لوگوں کی قیادت میں بھیجی جاتی تھیں، مار کر بھگا دیتے
تھے، امیر کے قلعوں کو منہدم کر دیتے تھے جتنی اُن کو شکستیں ہوتی تھیں اُتنا ہی اُن کا تہور بڑھتا
جاتا تھا، اور وہ اور بھی زیادہ کوششیں کرتے تھے۔ میدان جنگ کے سخت نقصانات، قحط کی مصیبت،
اُن کے ساتھیوں کی شکایات نہ اُن کے ارادوں کو متزلزل کرتی تھیں، نہ اُن کو خوف ہوتا تھا
اُن کے قلعوں کو سر کرنے کی بڑی بڑی کوششیں ہوئیں مگر سب کو اُنہوں نے اپنی شجاعت سے بیکار
کر دیا۔ جتنے آدمی اُن کے کم ہو جاتے تھے۔ اُتنے ہی جنگجو جوان وہ لیون اور البسٹریاس کے کوہستان
سے لے آتے تھے۔ آجکل کسی مورخ کے لئے یہ امر تحقیق کرنا بالکل لاحاصل ہے کہ اُن لوگوں کے
سروں میں آزادی کی ہوا کیوں بھر گئی تھی، یا یہ کہ وہ عادتاً کیوں ایسے ہو گئے تھے کہ اپنے بادشاہ
کی نافرمانی کریں اگر یہ سمجھا جائے کہ زمانہ قدیم کی قوم گاتھ کے جذبات ہی ایسے تھے کہ جن سے یہ
خلاف قیاس امور سرزد ہوئے تو یہ بھی صحیح نہیں قرار پاتا۔ یہ ضرور تھا کہ وہاں بہ نسبت اور قوموں
کے عیسائیوں کی آبادی زیادہ تھی لیکن بہرحال اُن میں کوئی ایسا دینی اتحاد نہ تھا کہ جوش مذہبی
میں لوگ ایثار نفس سے شوق شہادت میں سرشار ہو گئے ہوں۔ تمام مورخ متفق الرائے ہیں کہ
طلیطلہ کی آبادی مختلف النوع لوگوں پر مشتمل تھی۔ عیسائی اُسکو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک
مسلمان، بلا استثنائ، یہاں کے لوگوں کو ناقابل اعتبار شریر بتلاتے ہیں۔ ایک راز ہے کہ جو کسی طرح
نہیں کھلتا کہ یہ خودکشی کی پالیسی کیوں اختیار کی گئی، کہ اس بغاوت کے مرکز کا قلعہ اور فصیل نہ ڈھا دیا
گیا، اُن پر سخت ترین تشدد کیوں نہیں کیا گیا، اور جب یہ دیکھا تھا کہ نرمی کچھ کام نہیں دیتی تو تمام
باشندوں کو بلا استثنائ کیوں نہ جلاوطن کر دیا گیا× اس میں کسی بہت بڑی سیاست دانی کی ضرورت نہیں

× اِن سوالات پر یہ بھی ایزاد کرنا چاہئے کہ ان سے ہتھیار کیوں نہ چھین لئے گئے مگر مسلمانوں کی پالیسی کبھی یہ نہیں ہی کہ وہ
دشمن کو اتنا کمزور کر دیں کہ وہ اُٹھنے کے قابل ہی نہ رہے وجہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کو ہر وقت یہ امید بنی رہتی تھی یہ لوگ کبھی نہ کبھی اُن
کے مطیع ہو جائینگے ضعیف دشمن اگر مطیع ہو گیا تو بار ہے اور قوی دشمن اپنا قوت بازو اور مددگار ہے + (مترجم)

ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ بادشاہ اگر کسی پر بے محل رحم کرے تو اُسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُس کو بغاوت کی جسارت ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر بھی یہی ہُوا۔ آخر کار مسیحیانِ شمالی سے مل کر اپنے دشمنوں کے تنگ آنے کا فائدہ اُٹھا کر، اور کچھ خود اندرونی و بیرونی دشمنوں سے تکلیف اُٹھا کر، اُنہوں نے امیر کو ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا جسکے دوسرے معنی اُن کی آزادی ہوتے تھے۔ اس معاہدہ کے رو سے اُنہیں اجازت تھی کہ اپنے حکام خود منتخب کریں، جس میں گورنر بھی شامل تھا، اور اپنے اندرونی اور دینی معاملات میں وہ خود سر ہوں۔ غرض اس طرح کچھ سالانہ خراج ادا کر کے طلیطلہ نے وہی سیاسی حیثیت حاصل کر لی جو کسی نو مفتوح صوبہ کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کے بعد کئی سال تک اُس مقام کو مسلمانوں کی سلطنت کا ایک حصہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

اس عرصہ میں بعض اور شہروں نے بھی طلیطلہ کی تقلید کی۔ وہاں کے باشندے بھی اپنی اپنی شکایات رکھتے تھے، اور اُن کو وہاں کے بلند نظر، اور جری رؤساء برافروختہ کرتے اور بدامنی پھیلاتے رہتے تھے۔ امیر محمد کو اُن کی طرف پوری طرح توجہ کرنی اور اپنی ذہانت اور قابلیت سے کام لینا پڑا۔ عربوں کے انتظام ملکی میں ایک عجیب مضر اور مخدوش خصوصیت تھی کہ وہ نو مسلموں کی ایمانداری اور نمک حلالی کو آزمائے بغیر اہم مہمات اُن کے سپرد کر دیتے تھے۔ اسی قسم کا موقعہ اب پیش آیا۔ ایک شخص موسٰی ابن زیاد نامی تھا کہ جس کا شجرہ نسب خاندان وزیگاتھ کے ایک معزز آدمی سے ملتا تھا۔ اہل عرب اس خاندان کو "بنو قسمی" کہتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس شخص نے البیضاء میں شکست کھائی ہے۔ اسکے بعد پرجوش دینداران دربار شاہی نے اُس پر نمک حرامی کا الزام لگا کر اُس کے عہدہ یعنی سرقسطہ کی گورنری سے موقوف کرا کے، بے عزت کرایا تھا۔ ابن زیاد میں فوجی اور سپاہیانہ قابلیت اور سیاسی لیاقت معمول سے بہت زیادہ تھی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کے لئے امارت اندلس میں ترقیات کے تمام دروازے مسدود ہیں۔ اُن کے ساتھ جو کچھ بے انصافی اور بدسلوکی ہوئی اُس کا بھی اُن کو سخت صدمہ تھا۔ نظر بہ ایں حالات اُنہوں نے بغاوت کی تیاری کی۔ کیونکہ قسمت آزما باشندگانِ سرحد کے لئے جو نمک حرامی اور غداری کے

عادی تھے، یہی ترکیب سب سے آسان تھی۔ چونکہ اپنی رعایا میں وہ ہر دلعزیز رہ چکے تھے، اس لئے تمام وہ علاقہ جو ولایت سرقسطہ میں تھا اُن کے ساتھ ہو گیا۔ تُطیلہ[1] وشقہ اور طلیطلہ نے اُن سے دوستی کی۔ امیر نے اُن کو روندڈالنا چاہا، مگر اس میں وہ ناکام رہے۔ موسےٰ ابن زیاد نے اب اپنے بیٹے موسےٰ کو اپنا کام سپرد کر دیا۔ اس شخص نے اہالی نوار سے دوستی کر کے ماوراءِ پائرینیس فوج کشی کی اور جنوبی فرانس میں آتش بدست و شمشیر بکف پہنچا۔ موسےٰ کی کامیابی، اور فرانس کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہاں کا بادشاہ اس شخص کے حملہ کی تاب نہ لا سکا۔ گنجے چارلس نے نہ صرف اُن سے مساوات کا سلوک کیا بلکہ آئندہ کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے بہت سا روپیہ اور قیمتی تحائف پیش کئے۔ جو شہرت موسےٰ نے اپنی اس مہم میں حاصل کی تھی اُس سے اُن کو اپنی قوت بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔ ان کا بیٹا لوپ[×] طلیطلہ کا حاکم ہو گیا۔ سرحد کے بے چین لوگ ہزاروں کی تعداد میں اُن کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ اُن کے علاوہ مضاربین[※] نواری اور گیسکن عیسائی بھی اُن کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہ لوگ عادی اور تجربہ کار سپاہی تھے اس لئے اُن سے بہت بڑی مدد ملی۔ موسےٰ نے اپنے سپاہیانہ جذبات کی مشق نہ صرف عیسائیوں پر بلکہ مسلمانوں پر بھی کی، اور دونوں کو تنگ کرتے رہے۔ اُن کی شجاعت کی سب تعریف کرتے تھے اور اُن کی خودسری کو دربارِ ہائے قرطبہ، اے لاشپیل اور اُویڈو نے باول ناخواستہ قبول و منظور کر لیا تھا۔ جب کسی کے قبضہ میں کوئی ملک آجاتا ہے اور قوت و صولت حاصل ہو جاتی ہے تو اُس کے تفاخر بھی قابل معافی ہو جاتے ہیں۔ موسےٰ نے خودبینی کر کے اپنا خطاب "سپین کا تیسرا بادشاہ" قرار دیا۔ آخر جب ۸۶۲ء میں اُنہوں نے انتقال کیا تو اُن کی بنائی ہوئی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ امیر محمد نے سرقسطہ، تطیلہ، اور چند اور چھوٹے چھوٹے مقامات پر قبضہ

× LOPE ※ مضاربین اور ذمی عیسائی مرادف الفاظ ہیں یعنی وہ عیسائی جو مسلمانوں کی رعایا رہ کر بھی اپنے دین پر قائم رہے۔ ان کا طریقہ نماز بھی جدا ہے جسکو وہ سینٹ اسے سے ڈور سے منقول بتلاتے ہیں۔ پوپ نے ان کو اپنے طریقہ پر لانے کے لئے ان پر بڑے بڑے ظلم کئے ہیں۔ (مترجم)

کرلیا۔ چند ہی سال بعد موسٰی کے اُس خاندان کو جس نے کہ چند سال پیشتر بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں، امیر کی فوج نے مقابلہ کرکے ملک بدر کر دیا۔ اگرچہ بنوقسی کے مذہبی خیالات کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر عیسائی ہو گئے تھے۔ کیونکہ الفانسو سوئم اُن کے بڑے حلیف تھے، اور اسی نامور خاندان کے رئیسوں کے سپرد انہوں نے اپنے بیٹے اُوردُوں کی تعلیم و تربیت کردی تھی جو آخر میں ایسٹریاس اور لیون کا بادشاہ ہونے والا تھا،

نارمن قزاقان بحری کو عرب مورخین مجوسی کہتے ہیں اور ایک فرضی قوم، یاجوج ماجوج سے منسوب کرتے ہیں۔ اور اُن کو قرون وسطےٰ کی ایک مجہول روایت کے موافق، ان ہی یاجوج ماجوج کی اولاد بتاتے ہیں۔ ان لوگوں نے امیر محمدؐ کی تخت نشینی کے سات برس بعد جزیرہ نمائے اندلس کے سواحل پر پھر حملہ کیا۔ پہلی مرتبہ جس آسانی سے وہ سواحل اندلس و فرانس سے مال متاع لوٹ کرلے گئے، اُسی لالچ سے انہوں نے پھر اُدھر کا رُخ کیا۔ مگر کچھ تو اہالی جلیقیہ کی بہادری کی وجہ سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ امیر عبدالرحمٰن ثانی نے پیش بندی اور دور بینی کرکے سواحل پر قلعے بنادیئے تھے، اور امارت اندلس کے بیڑہ کو اس طرح سمندر میں پھیلا دیا تھا کہ ان بحری جانوروں کا راستہ روکے اور خشکی پر نہ اُترنے دے، اس لئے ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلی مرتبہ جو اُن کی کامیابی کی شہرت ہوئی تو اس سے اُن کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہو گیا تھا، انہوں نے جلیقیہ کے ساحلی شہروں کو لوٹنے کی سخت کوشش کی مگر بے سود۔ وہاں سے وہ اپنے ستر جہازوں پر بہت سے آدمی چڑھا کر اندلس کے ساحل پر پہنچ گئے اور مختلف مقامات پر اُتر کر انہوں نے ساحل پر سخت نقصان پہنچایا۔ مگر اتنی ہمت نہ پڑی کہ خشکی میں اور آگے بڑھ جاتے۔ اس مرتبہ جو اُن کو لوٹ ہاتھ آئی وہ کیا بلحاظ مقدار، اور کیا بلحاظ قیمت، اتنی نہ تھی جتنی کہ وہ پہلے لے گئے تھے۔ اُن کو یہ توقع نہ تھی کہ کوئی اُن کے مقابلہ میں بھی آئیگا۔ مجبور ہو کر وہ ساحل افریقیہ پر قسمت آزمائی کے لئے چلے گئے۔ اس ملک کے بہت سے علاقوں نے ان کے حملوں کی وجہ سے خوفناک نقصان اُٹھایا۔ جو کچھ وہ اُٹھا کر اپنے ساتھ

نہ لے جاسکے اُس کو تباہ کر دیا۔ یہاں سے نکل کر اُنہوں نے جزائر بیلیارک کو ویران کیا، پھر مشرق کا رُخ کیا اور صقلیہ اور مالٹا کو برباد کرتے ہوئے نکل گئے۔ اٹلی اور یونان کے جو ساحل غیر محفوظ تھے اُنہوں نے پھر اُن کی وحشت کا تماشا اور تباہی کی سیر دیکھی۔ مگر اس مرتبہ کچھ ہم مذہبی کا بھی خیال تھا۔ ان وحشیان شمال کی وحشیانہ خونخواری نے ہر چیز پر جو تہذیب سے تعلق رکھتی تھی، بے تامل صفائی پھیر دی۔ اُن کے خون کے رنگے ہوئے تباہی فگن ہاتھ اتنی دولت سے مالامال تھے کہ اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جب اُن کی تسلی ہو گئی تو اُنہوں نے جبل طارق کی راہ سے اپنے وطن کا راستہ لیا۔

اور ڈدوؤں کو جو سلطنت قرطبہ سے مسلسل دشمنی رہی وہ عیسائیوں کے لئے بہت مفید ہوئی۔ البیضا میں جو کامیابی ہوئی، اُس پر غرہ کر کے اس بادشاہ الیسٹریاس نے ڈورو[۱۱] کے جنوب کی طرف پیش قدمی کی۔ پہاڑی آدمی یہ جانتے تھے کہ اُن کے دشمن روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں، نیز اُن کو اپنی بہادری اور ذرائع پر بھی بڑا ناز تھا، اس لئے اُنہوں نے اور بھی زیادہ کوشش کرنی شروع کی۔ جو مہمیں کہ اب تک محض غزوات کی شکل رکھتی تھیں اُنہوں نے اب یہ صورت اختیار کر لی کہ گویا وہ ملک پر دوامی قبضہ کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ آن روئے سرحد جو چوکیاں تھیں اُن میں سے جو مفید مطلب معلوم ہوئی اور جس پر اُنہوں نے قبضہ رکھنا مناسب جانا اُسی کو خوب مضبوط کر لیا، اور وہاں فوج محافظ رکھ دی، جن چھوٹے چھوٹے قلعوں کی فصلیں مسلمانوں نے گرا دی تھیں اُن کو پھر بنا لیا، جن جن شہروں میں عربوں کی آبادی زیادہ تھی وہاں سے اُن کو نکال کر اہالی جلیقیہ اور الیسٹریاس کو لا بسایا، جس مقام کو وہ بزور شمشیر لیتے تھے وہاں کے مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیتے تھے۔ بہت سے بڑے بڑے شہر جن میں کوریا[۱۲] اور شلمنکہ[۱۳] بھی تھے، عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے۔ اُن کی چیرہ دستی کا اثر قرطبہ میں یہ ہوا کہ وہاں اُن کی روک تھام کی تدابیر سوچی جانے لگیں، اور آخر اسکے انسداد کے لئے تمام تر توجہ اُدھر لگانی پڑی، اور ایک بڑی قومی فوج، بقیادت ولیعہد سلطنت، منذر، اُن کی گوشمالی کے لئے بھیجی گئی۔ تجربہ کار اور جنگ جو

شاہزادہ نے دریا ڈورو کے کنارے دشمنوں سے مقابلہ کیا، عیسائیوں نے نہایت سخت شکست کھائی، اور جو علاقہ کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اُس کا بہت سا حصہ واپس لے لیا گیا۔ شہزادہ منذر نے اب ادھر کا فکر چھوڑ کر الاوا[۱۴] اور نوار کا رُخ کیا، اور مسلمانوں کا رایت فتح و ظفر اب بمبلونہ کے سامنے لہرانے لگا۔ اس شہر کے مضافات کو تباہ کر دیا گیا؛ اُس علاقہ کے جتنے قلعوں کو طاقتور قزاقوں کے گروہوں نے اپنا ملجا و ماوا بنا لیا تھا، اُن پر قبضہ کر کے منہدم کر دیا گیا۔ اسکے بعد منذر، بغیر اسکے کہ اُن کو یا اُن کی فوج کو کوئی چشم زخم پہنچے، مظفر و منصور قرطبہ میں واپس چلے آئے۔

اگرچہ ان شکستوں سے یہ نچلے نہ بیٹھنے والے پہاڑی اپنی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آئے، مگر ان پر یہ اثر ضرور ہوا کہ انہوں نے اپنا رُخ بدل لیا، اور اپنی تگاپو کو چھوٹے سے علاقہ تک محدود کر لیا یعنی ٹاپنا کو وہ ایک مرتبہ پہلے بھی بلا وجہ لوٹ چکے تھے، اب پھر اسی کو انہوں نے تاکا۔ لزبن کے کھیتوں اور تاکستانوں کو عیسائی فوج نے روند ڈالا؛ شہر شنترہ[۱۵] کو آگ لگا دی؛ جن جن چھوٹے گاؤں پر اُن کا داؤ چلا، اُن کو ان بے رحموں نے تباہ کر دیا۔ جو سبق اہالی الیسٹر پاس کو حال ہی میں ملا تھا اُسکو وہ ابھی نہیں بھولے تھے، امیر محمد نے بہت جلدی جلدی کر کے اُن کی سزا کے لئے ایک فوج بھیجی، مگر قبل اسکے کہ وہ وہاں پہنچے تمام پہاڑی اُسی عجلت کے ساتھ وہاں سے چلتے بنے جس طرح کہ وہ آئے تھے۔

چونکہ امیر محمد ان آئے دن کے چھاپوں کو معمولی طریقہ سے نہ روک سکے تھے اس لئے انہوں نے دوسری تدبیر اختیار کی یعنی فوج بحری راستہ سے بھیج کر دشمن کے ملک کے قلب لے گئے۔ بیڑہ مغربی ساحل پر حفاظت سے پہنچ گیا، لیکن قبل اسکے کہ وہ خشکی میں اُترتے ایک طوفان نے اُس کو تباہ کر دیا۔ جو مسلمان کہ زیادہ دیندار تھے اُن کے دل اس سے ہل گئے کہ اب اُس عنصر (یعنی پانی) کو لڑائی کے لئے کام میں لایا جا رہا ہے کہ جس سے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم ڈرتے تھے۔ ان لوگوں نے اس بیڑہ کے غرق ہونے کو اس کی سزا سمجھا کہ مسلمانوں نے قرآن شریف کی نافرمانی کی ہے*

* نہایت معقول! ہمنے تو قرآن شریف میں بحری جنگ کی ممانعت کہیں نہیں دیکھی۔ (بقیہ نوٹ صفحہ ۵۲۴ پر ملاحظہ ہو)

طلیطلہ کی بغاوت کی تقلید اور شہر کے باغی بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہے۔ یہاں کے فسادات اگرچہ بحیثیت مجموعی اہم تھے، مگر ان کا معاملات جزیرہ نماء اندلس پر بہت ہی خفیف اثر پڑا۔ ان میں سے ایک کا حال بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ بہت کچھ وزیگاتھ کے قدیم دارالسلطنت طلیطلہ کی آزادی حاصل کرنے کی حالت سے مماثل ہے، اور بہ نسبت تمام تاریخ کے تنہا یہی قصہ ایسا ہے کہ جو یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ سلطنت کہ جسکو عبدالرحمٰن اول نے قائم کیا تھا کس بیچارگی کی حالت میں پہنچ گئی تھی۔ ابن مروان ایک نمک حرام تھا، جو پچھلی بغاوتوں میں بہت کچھ اپنا نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کو مسلمانوں کی حماقت آمیز پالیسی نے پھر ایک ذمہ واری کے عہدہ پر مقرر کر دیا۔ اسکو کسی خفیف سی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ وہ نکل بھاگا اور چند آدمیوں کی مدد سے قلعہ النجے کو لے لیا، جو مریدہ کے قریب واقع تھا۔ ابھی سامان حرب رسد بھی نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ابن مروان محصور ہو گیا۔ لیکن پھر بھی وہ تین مہینہ تک مقابلہ کرتا رہا، آخر اس نے اس شرط پر دست برداری کی کہ اُسے بغداد جانے دیا جائے، مگر آزاد ہوتے ہی اُس نے اپنے آپکو ایک نئے مذہب کا بانی بنایا جسکے اصول اسلام اور مسیحیت دونوں سے لئے ہوئے تھے، اس نے بہت سے قزاقوں اور رہزنوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے اپنی جمعیت بڑھالی، اور اہالی طلیطلہ کے قدم بقدم چل کر بادشاہ البسٹریاس کا حلیف بن گیا۔ اُس کی ترک و تاز نے ایسا تنگ کیا کہ امیر محمد نے اپنے منظور النظر وزیر ہاشم کو اس کے خلاف فوج لے کر بھیجا۔ عیار ابن مروان نے اس فوج کو بہت آسانی سے جال میں پھانس کر ایسے موقعہ پر پہنچا دیا کہ جہاں کمین میں فوج چھپی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہشام کی تمام فوج کٹ گئی اور خود ہشام کو قید کر کے ابن مروان نے الفانسو کے پاس بطور نشان فتح بھیج دیا۔ امیر نے اُن کا خون بہا دے کر اُن کو لینا چاہا تو اُدھر سے ایک لاکھ دینار مانگا گیا۔ اگرچہ امیر چاہتے تھے کہ کسی طرح اُن کا وزیر آزاد ہو جائے، مگر جیسے

عیسائیوں کو زیادہ علم ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کو سمندر کے مہلکہ میں ڈالنے سے ڈرتے تھے کیا اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے؟ (مترجم)

امیر کی عمر بڑھتی جاتی تھی اُن کے بُخل میں ترقی ہوتی جاتی تھی اس لئے اُنھوں نے اتنا خرچ کرنا گوارا نہ کیا۔ کئی مہینہ ہشام قید میں رہے، آخر امیر کے تذبذب پر ہشام کے خاندان کی خوشامدین غالب آئیں، اور خون بہا کا ایک حصہ دینے پر راضی ہو گئے، اور باقی کے لئے یرغمال دیا۔ یوں خدا خدا کر کے وزیر رہا ہوئے۔

جب وزیر قرطبہ میں واپس آئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کا پُرانا دشمن جس کا مقابلہ امیر محمد بھی نہیں کر سکے تھے، اُن کی غیر حاضری میں مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا ہے۔ ابن مروان کی لوٹ مار سے تنگ آ کر امیر اُن سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے، باڈاجوز (بطلیوس) جیسا مضبوط شہر اُن کے حوالہ کر دیا گیا، اُن کا خراج معاف کر دیا گیا، اور ایسی شرائط منظور کر لی گئیں جن کے یہ معنی تھے کہ گویا وہ اُن فرائض کے پابند ہی نہ رہے تھے جو رعایا کے ذمہ ہوتے ہیں اور بادشاہ کے حقوق بالکل جاتے رہے۔

اس بزدلانہ پالیسی کا جو اثر مفسد اور پرجوش لوگوں پر ہوا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے، یہ گروہ مفسدین ایسا تھا کہ جنکے عناصر کا اختلاط باہمی ناقابل عمل تھا، ان میں اتحاد دینی تھا ہی نہیں، حُب الوطنی اور سیاسی خوبیاں اُن کو چھو بھی نہ گئی تھیں، اور سواء زور شمشیر کے کسی قانون کے پابند ہو کر رہنا جانتے ہی نہ تھے بہت ہی کم شہر ایسے تھے جہاں امن و امان باقی رہ گیا ہو ہر قسم کی بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ دشمنیاں بغیر روک ٹوک کے نکالی جاتی تھیں۔ حکام دیوانی و فوجداری کے اختیارات معطل تھے۔ رعایا کی فرمانبرداری حرف غلط تھی۔ ہر طرف ملک پارہ پارہ ہوا جاتا تھا؛ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمارت اب گری کہ گری۔ دار الخلافہ کا قرب، مراحم خسروانہ کی امید، نمک حرامی کے نتائج کا خوف، غرض کوئی ایسی چیز باقی نہ رہی تھی کہ سلطنت کو سنبھالا قائم رکھ سکتی۔ صرف اندلسیہ ہی کا وہ علاقہ رہ گیا تھا، جو اسلام کی شرم اور بادشاہ وقت کی عزت کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ لیکن یہ صوبہ بھی اب فسادات کا تماشا گاہ بننے والا تھا؛ جسکے نتائج ممالک مغربیہ کی تہذیب اور خاندان بنو امیہ کو اس طرح تباہ کرنے والا تھا کہ جس کا کوئی علاج بعد میں

نہیں ہو سکتا تھا۔

زمانہ قیام سے وہ دلکش سلسلہ کوہ جو اس وقت سیرا نیواڈی رونڈا کہلاتا ہے اور جزیرہ نماء اندلس کو جنوب کی طرف قطع کرتا ہے ہمیشہ باغی رہا تھا جسکو کوئی سلطنت بھی پوری طرح زیر نہیں کر سکی۔ کوہستانیوں کی یہ عادت ضرب المثل ہے کہ وہ قانون وقت کی پابندی کرنے میں ہمیشہ مذبذب رہتے ہیں، اس علاقہ میں تو یہ بات بہت زیادہ نمایاں تھی۔ ملک کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ اسکے پیچیدہ راستوں اور پوشیدہ گھاٹیوں سے واقف نہ تھے ان کا وہاں جانا گویا اپنے آپ کو خطرات کے منہ میں دیدینا تھا۔ ان پہاڑوں کے رہنے والے خواہش آزادی، طاقت جسمانی اور سپاہیانہ بہادری میں باشندگان الیسٹریاس کے نمونہ تھے۔ مگر بدن کی ساخت، چہرہ کی خوبصورتی، خوددارانہ چال ڈھال، اور ان سب سے بڑھ کر فطنت و ذہانت میں دہاقین شمالی سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ ان میں بہت سی خوبیاں تھیں، رومیوں کی دلیری، اہل کارتھیج کی ہوشیاری، عربوں کی چستی و چالاکی، اعتدال و پرہیزگاری ان میں پائی جاتی تھی۔ ان کے تعلقات دور دراز ممالک سے تھے، اور وہ سب برادرانہ رشتہ میں ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ برائے نام تو وہ ایک بادشاہ کے ماتحت تھے، مگر فی الحقیقت ان کی سلطنت جمہوری تھی۔ یہی وجہ تھیں کہ ان کو کسی باضابطہ قانون، یا سلطنت کا فرمان بردار ہو کر رکھنا بہت مشکل تھا۔ جو قزاق کہ ایک زمانہ میں رومی چرواہوں کے گلے ہانک لے جاتے تھے، اور روزیگاتھ دہاقین کی جھونپڑیوں کو لوٹ لیا کرتے تھے ان کے ہم شکل آج بھی وہاں چوروں اور رہزنوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ابھی کچھ بہت عرصہ نہیں ہوا کہ سرعسکر قزاقان سیرا نیواڈی رونڈا حکومت سپین کے چوکیداروں اور محافظ سپاہیوں کو پکڑ کر اپنا حق رکھوا لیتے تھے جن ممنوع اشیاء کی تجارت آجکل اس علاقہ میں ہو رہی ہے اسکی مقدار اس جائز تجارت سے کہیں زیادہ ہے جو جزیرہ نماء سپین کے اتنے ہی رقبہ اور اتنے ہی دولتمند ملک میں کہیں ہوتی ہے۔

اس سلسلۂ کوہ کے نشیبی علاقہ میں، ملاغہ کے قریب عہد حکومت امیر محمد میں ایک آتش

مزاج اور وارستہ طبیعت کا نوجوان عمر ابن حفصون نامی رہتا تھا۔ ان کے والد گاتھک خاندان کے ایک سربرآوردہ آدمیوں میں سے تھے، اور بہت سے آدمیوں کی طرح، آیندہ فوائد کے خیال سے نہ کہ حقانیت اسلام سے قایل ہو کر انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے عمر اپنے ہمسایہ محرور المزاج دہاقین کے ساتھ ملکر فتنہ و فساد میں شریک رہتے تھے؛ اور ابھی بچہ ہی تھے کہ بے رحمی اور بیجا تشدد میں انہوں نے ناقابل رشک نام پیدا کر لیا تھا۔ آخر ان کو ایک مرتبہ ایک سخت حریف سے سابقہ پڑ گیا، مگر جب مقابلہ ہوا تو اسکی جان گئی۔ یہ دیکھ کر ابن حفصون کوہستان کی طرف بھاگ کر قزاقوں کے ایک گروہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مگر یہاں شاہی مخبروں کے ہاتھ پڑ گئے اور اتنے دُرّے کھائے کہ بیہوش ہو گئے۔ یہاں سے جان چھڑا کر بھاگے اور باپ کے پاس پہنچے؛ انہوں نے بھی ان کو محروم الارث کر کے گھر سے نکال دیا۔ یہ سوچ کر کہ جو شاہی سراغرساں ان کے پیچھے پیچھے تمام ملک کی خاک چھان رہی ہیں ان سے وہ کہاں تک اپنی جان بچا سکتے ہیں، وہ افریقیہ چلے گئے اور یہاں شہر تاہرت میں ایک درزی کے یہاں جان چھپا کر پڑ رہے۔ یہ درزی ان کے خاندان کو جانتا تھا، مگر جو افتادیں ابن حفصون پر حال میں پڑی تھیں ان سے ناواقف تھا۔ اُس نے اُن کو بخوشی اپنا شاگرد بنا لیا۔ یہاں ان کو چند روز ہی رہتے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے ان کو پہچان لیا؛ وہ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شخص ان کو بجرم فرار پکڑوا نہ دے، اس لئے انہوں نے اپنے مربی کو خیرباد کہا اور پوشیدہ اندلس روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر چار و ناچار ان کو قزاقی پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ بہت سے قسمت آزما لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ کوہ بوباشتر کی چوٹی پر ایک پرانا رومی قلعہ تھا، اسی کو مرمت کرا کر انہوں نے رہنا شروع کیا؛ اور ادھر ادھر راہزنی کر کے اپنا گزارہ کرنے لگے۔ وہ تمام علاقہ مسطح جو اس پہاڑ کی وادی سے لے کر دار الخلافہ تک پھیلا ہوا تھا اب محض ان کے رحم پر تھا۔ جیسے جیسے ان کی کامیابیوں کی خبر مشہور ہوتی گئی ان کا گروہ بڑھتا گیا۔ اندلسیہ شہر ان کا نام سن کر کانپنے لگے۔ صوبہ کے گورنر نے ایک باقاعدہ فوج سے اُن کا مقابلہ کرنا چاہا؛ جس کا نتیجہ ان کی یہ بے حرمتی ہوئی کہ ایک مٹھی بھر قزاقوں نے ان کی

فوج کو بھگا دیا، اور اُن کی چھاؤنی کو لوٹ لیا۔ والی مذکور کی جو نا قابلیت اس وقت ثابت ہوئی وہ
محض بدقسمتی کی بات تھی، کیونکہ اُن کو علیحدہ کر دیا گیا، لیکن اُن کی جگہ جو شخص آیا، اُس کا بھی
وہی حشر ہوا، یہ تجربہ کار اور جنگ آزمودہ سپاہی تھا، چند روز کے بعد وزیر ہاشم ایک زبردست
فوج لے کر آئے، جس نے ابن حفصون کو گھیر کر اطاعت پر مجبور کر لیا۔ مگر وزیر مذکور اُن کی بہادری
اور دانائی پر ایسے گرویدہ ہوئے کہ انہوں نے امیر سے عرض معروض کر کے انہیں فوج کا سر عسکر
مقرر کرا دیا۔ ایک طرف یہ غیر مترقبہ مسرت خسرانہ تھی اور دوسری طرف قید خانہ کی کال کوٹھڑی!
پھر اُن کو یہ عہدہ قبول کرنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا، جو شخص ابھی اشتہاری قزاق تھا وہ امیر کی
فوج میں بڑا افسر ہو گیا۔ کئی جنگوں میں جو باغیوں اور شمالی کوہستانیوں سے ہوئیں اُنہوں نے بڑی
خوبصورتی کے ساتھ عزت و حرمت قائم رکھی، جسکی ایسے شخص سے امید نہیں ہو سکتی تھی جو قزاقی پیشہ
رہا ہو۔ سپہ سالار اُن کی خدمات سے متحیر ہو گئے، ہم چشموں میں اُن کا وقار بڑھ گیا، اور دشمن اُن سے
ڈرنے لگے۔ اُن کو سامنے ترقی کا ایک لہلہاتا ہوا میدان تھا۔ اُن کو بہت جلد امید تھی کہ وہ بڑی
عزت حاصل کرینگے، اور بہت کچھ کما ئینگے، کیونکہ فوج میں نام پیدا کرنے کا ہر جگہ یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔
لیکن دربار شاہی میں جو اُن کے رقیب تھے اُن کے حسد کی وجہ سے ہاشم کے تئے اور وہ فی الفور
ترقی نہیں ملی۔ وزیر کے برخلاف جو گروہ تھا اُس نے اس مغرور شخص کو ہر طرح تنگ اور ذلیل کیا؛
شہر کے گورنر نے مختلف بہانوں سے اُن کو ایک جگہ نہ رہنے دیا، اور بار بار اُن کو اپنا مقام
بدلنے پر مجبور کیا، جس شخص کے سپرد رسد رسانی تھی وہ اپنے مربیوں کے سکھانے بہکانے سے
ابن حفصون کو ایسی رسد دیتے تھے جو استعمال کے قابل نہ ہوتی تھی؛ اگر وہ شکایت کرتے تھے تو
اُس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے مربی نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی شکایات خود
رفع کر لیں۔ اس سلوک سے وہ بالکل تنگ آ گئے؛ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ ستائے جانے
قابل نہ تھے۔ آخر ابن حفصون سے زیادہ بے عزتی نہ سہی گئی، وہ بھاگ گئے، اور پھر انہوں نے
سیرا نیاڈی رونڈا میں اپنی قزاقی شروع کر دی۔ اُن کے گروہ کے آدمی بہت جلد اُن سے آملے

وہ بوباسٹرو کے قلعہ پر جسکو امیر محمد نے بہت کچھ مضبوط کر رکھا تھا، پھر حملہ ہوا، اور یہ دلاور باغی چند ہی ہفتوں کے اندر کوہستانیوں کا معبود اور اندلسیہ کے دہاقین کے لئے ہوا بن گیا لیکن امیر کی فوج میں رہنے کی وجہ سے اُن کی عادات اور چال چلن میں بہت بڑا فرق پڑ گیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو آزادی کا ممد و معاون، اور اُن لوگوں کا مربی اور منتقم بنالیا کہ جن سے خاندان شاہی میں سے کسی نے بدسلوکی یا بےانصافی کی ہو۔ وہ اپنی اس حیثیت سے نومسلموں، عیسائیوں اور بربریوں کے سردار تسلیم کئے جانے لگے۔ اُنھوں نے یہ اپنی عجیب حالت بنائی تھی، اور حکمرانانِ عرب کے خلاف ایک الگ طاقت پیدا کرلی تھی۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو فریادرسِ مظلوماں کہہ کر اپنے گروہ کو ایک طرح کا قومی گروہ بنالیا تھا؛ اور ایک حد تک اپنے اور اپنے گروہ کے نام سے قزاقی کا دھبہ اُڑا دیا تھا۔ وہ اپنے گروہ کے آدمیوں پر سخت بندشیں رکھتے تھے۔ ڈاکہ مارنے اور خلاف ورزی احکام کرنے کی سزا فوری موت تھی۔ تمام کوہستانی علاقہ رفتہ رفتہ اُن کے قبضہ میں آگیا؛ اور یہاں جان و مال کی وہ حفاظت ہونے لگی کہ جو اس وقت تک وہاں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اندلسیوں میں یہ ایک مثل ہوگئی تھی کہ ایک عورت بھی سیر اپناڈی روز پہاڑیں چاندی لے کر راتوں کو بلا دغدغہ سفر کرسکتی تھی۔ ایسا امن و حفاظت اور جگہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں تک کہ سلطنت امیر محمد میں بھی، کہ جہاں آبادی زیادہ تھی، اور پولیس کے آدمی گشت لگایا کرتے تھے، اگر کوئی شخص ایسے علاقوں میں کہ جہاں حفاظت کے سامان کم تھے۔ ہمت کرکے سفر کرتا تو یقیناً مارا جاتا ؛

ابن حفصون نے اپنے سپاہیوں کو قابو میں رکھنے کی وہ تدابیر اختیار کی تھیں کہ جو سیاست کے قائم رکھنے کے لئے سخت ضروری تھیں، اور جو ایک سپہ سالار کو ہر دلعزیز بنانے اور شہرت دینے کے لئے کافی تھیں؛ یعنی بے رو رعایت انصاف، آزادی کامل، خدمات کا فوری اعتراف و انعام، نظام فوجی کے توڑنے کی سخت ترین عقوبت۔ اُن کا بڑھتا ہوا اقتدار و قوت دیکھ کر وہ شریر النفس لوگ بھی اُن کی طرف مائل ہوگئے تھے جو سلطنت میں بڑے عہدوں پر ممتاز تھے؛ اُن میں سے کئی ایک نمک حرام بھی تھے، جو ہر ایک سلطنت میں جونک کی طرح لگے ہی رہتے ہیں، اور دربار شاہی اپنی کمزوری

کی وجہ سے اُن کی خوشامد یا اظہار نمک حلالی کے پھندے میں پھنسا رہتا ہے۔ ۸۹۶ء میں ابن حفصون ایسے ہی بے ایمان کی قلعہ الہمہ میں مدد کر رہے تھے کہ جن کے برخلاف شاہزادہ منذر فوج لے کر آئے ہوئے تھے۔ ایک حملہ میں یہ قزاقوں کا سردار زخمی ہوگیا۔ فوج محافظ الہمہ اپنے آپ کو دشمن کے سپرد کرنے ہی والی تھی کہ شاہزادہ کو یہ خبر پہنچی کہ اُن کے والد نے انتقال کیا، اور اُن کے فوری واپسی کی سخت ضرورت ہے۔ ابن حفصون کی قسمت کی یہ غیر متوقعہ تبدیلی تھی۔ اس سے ہوشمند اور چالاک ابن حفصون نے خوب فائدہ اٹھایا۔ بہت سے معقول بہانے بنا کر اُنہوں نے کئی شہروں کو اپنا تابع کر دیا۔ منذر تخت پر بیٹھے تو اُنہوں نے اپنے مقابلہ پر ایک ایسے قوی دشمن کو کھڑا ہوا پایا۔ جس کے سپاہیانہ جوہر اور ذرائع جنگ ایسے تھے کہ جن سے تفوق و تخت کے لئے طویل اور مشتبہ لڑائی لڑنی ضروری تھی۔

امیر محمد کو یکا یک پیغام اجل آیا، اور اُنہوں نے بلا تکلیف داعی موت کو لبیک کہا۔ اُن کا سی چہار سالہ عہد حکومت نہایت پرفتن تھا، ایسا کہ جس سے اب تک کسی سابق شاہ بنو اُمیہ کو سابقہ نہ پڑا تھا۔ علاوہ اور بہت سے سیاسی مصائب کے اُن کے زمانہ میں ایسا سخت قحط پڑا کہ جس کی مثال اندلس کی پہلی تاریخ میں نہیں ملتی، مزید برآں وبا اور زلزلوں نے موت کی بے مثال گرم بازاری رکھی۔

اُن کا زمانۂ حکومت اندلس میں خاندان بنو امیہ کی بے عزتی کی ایک نمایاں مثال ہے اگر اُن کے عہد حکومت پر نظر تعمیم ڈالی جائے تو وہ خلاصہ ہے اُن تمام عیوب کا جو ہر بادشاہ اور ہر زمانہ میں اندلسی عربوں میں موجود تھے۔ مسلمانوں کے طرز حکومت کی جبلی نقایص، مسلمانوں کی سوسائٹی کے کبھی ختم نہ ہونے والے درمیانی مناقشات، اُس کی شرارت، کینہ توزی، نمک حرامی کو دیکھا جائے تو وہ سب سے پہلے امیر اندلس عبد العزیز سے لے کر ابو عبد اللہ سب سے آخری بادشاہ اندلس کے زمانہ تک یکساں بحالہم موجود تھے۔ بعض وقت تو امیر محمد کی حالت بالکل ناچاری کی ہو جاتی تھی۔ اُن کی رعایا کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ باغی رہتا تھا۔ بیس برس کی متواتر لڑائیوں سے بھی طلیطلہ سر نہ ہو سکا۔ اُس شہر کے ساتھ بہت بڑا حصۂ ملک بھی عملی طور پر آزاد تھا۔ عیسائیوں کی طاقت

روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ اُن کی حدودِ سلطنت رفتہ رفتہ جنوب کی طرف ترقی پذیر تھیں یہاں تک کہ اُن کا پرچم قرطبہ کی دیوار پر سے نظر آنے لگا تھا۔ اہالی فرانس نے گاتھک مارچ میں اپنے قدم مستقل طور پر جما لیتے تھے، اور وہ علاقہ ہمیشہ کے لئے ربقۂ اسلام سے نکل چکا تھا۔ وہ عظیم الشان سلطنت جو دریاء گیرن سے لے کر سواحل بحر روم تک اپنی غلامی میں لئے ہوئے تھی، وہ سمٹ کر ایک چھوٹی سی ریاست کے برابر رہ گئی تھی۔ سپٹے مینیا، لیون، اراگون، قتلونیہ اور قستالہ کا بہت بڑا حصہ دشمنوں کے ہاتھ میں تھا۔ شمال کی طرف جو چھوٹے چھوٹے قلعے کہیں کہیں نظر آتے تھے اُن کے والی برائے نام امیر اندلس کے مطیع تھے، مگر فی الحقیقت خفیہ طور پر انہوں نے کفار سے سازباز کر رکھا تھا۔ مغرب کی طرف دلیر ابن مروان اپنی مرضی سے ایسٹر یمیڈورا اور لیوسی ٹانیا کے دولتمند علاقوں میں لوٹ مار مچائے ہوئے تھے۔ بلنسیہ اور مرسیہ، جو بہت سی بغاوتوں کو اپنی گود میں پال چکے تھے، کھلے طور پر نکلے ہوئے تھے جس کی وجہ ٹیکسوں کی بھرمار اور گورنروں کی لوٹ کھسوٹ تھی۔ جنوب میں نو ہمت ابن حفصون، جو عصبیت کا پتلا اور بہت سے جوان دولت گروہوں کی بلند نظری کی تصویر تھا، اندلسیہ کے بڑے حصہ پر مطلق العنان حکومت کر رہا تھا۔ سڑکوں پر قزاقوں کا غول کا غول پھرتا تھا۔ حفاظت کا پورا سامان کئے بغیر سفر کرنا ناممکن تھا۔ جزیرہ نماء اندلس کے بڑے بڑے شہروں میں آمد و رفت ایسی مشکل تھی کہ گویا اُن میں ایک براعظم کی مسافت ہے یا دونوں کے درمیان میں کوئی سمندر حائل ہے۔ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ آٹھ برس کامل قسطمر اور قرطبہ کے درمیان میں آمدورفت بند رہی تھی۔ تمام لوگوں میں ایک عجیب بیہودہ سا خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے۔ تمام سوسائٹیوں میں علماء دین کی گلچیوں سے ایک اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ ان کی ابحاث گو رکیک باتوں پر ہوتی تھیں، مگر اُن کے نتائج بہت ہی سخت نکلتے تھے۔ تاریخ اسلام کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کسی مذہبی مسئلہ پر یا کسی حدیث شریف کی صحت پر کئی مرتبہ خون بہ گئے ہیں، بلکہ کبھی کبھی دو قوموں میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ اگرچہ بیشتر عیسائی ذمیوں نے ان شرائط کو منظور و قبول کر لیا تھا کہ جو بردہ شریعت اسلامی اُن پر عاید ہوتی تھیں، مگر بہت سے گمراہ مذہبی دیوانوں نے ہر قسم کی بیہودگیاں اور کفریات کو کام میں لا کر ہر طرح کی سختیاں اُٹھائیں اور "شہادت" کی شہرت حاصل کی۔ ملک کا بہت سا

حصہ غیر آباد ہو گیا۔ جہاں کچھ لوگ رہ گئے تھے وہاں تجارت و زراعت میں بہت کمی آ گئی تھی، بعض اضلاع میں تو دونوں ہی معطل تھیں۔ خزانۂ سرکاری میں اس درجہ کمی آ گئی تھی کہ امیر کی تنگ چشمی اور عمّال کی جبر ستانی پر بھی شاہی خاندان کا خرچ بمشکل تمام چلتا تھا جس وقت امیر محمدؒ کا انتقال ہوا ہے اس وقت بمشکل تمام اس ملک کا چوتھائی حصہ جس پر ان کو حکومت کا دعوٰے تھا، بمشکل تمام ان کے حقوق شاہی کو تسلیم کرتے تھے، یا ان کی طاقت کو قائم رکھنے میں مدد دیتے تھے۔

مسلمانوں کے تنزل کے بڑے آثار یہ ہیں کہ ان میں سے عوام کا جوش اور فوجی خوبیاں مفقود ہو گئیں، خانہ جنگیاں ہمیشہ قائم رہیں، عیسائی ان کے ملک کو بزور شمشیر دباتے چلے گئے، فوجی افسروں نے بے ایمانی پر کمر باندھ لی، ارکین سلطنت کے درمیان دشمنی ہو گئی، اور پرجوش لوگ سازشیں کرنے لگے، اصول احکام اسلامی کے موافق جہاد کا بہانہ کیا گیا اور اس میں کامیاب نہ ہوئے، بلکہ اس کا انجام اکثر بدنامی اور بے عزتی پر ہوا۔

امیر محمد کی یہ خصوصیات تھیں کہ وہ غیر مستقل مزاج اور بخیل تھے وہ قزاقوں کے سرگروہوں کی دھمکی پر صوبہ کا صوبہ اور ایسی عاتیں دینے پر راضی ہو جاتے تھے کہ جس سے ان کی شان میں بٹہ لگے اور وہ ذلیل ہو جائیں بخل کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ ایک لاکھ دینار ان کو دینے پڑے تو حکام خزانہ سے انہوں نے بجبر ایک ایک پیسہ کر کے وصول کیا۔ سپاہیوں کی تنخواہوں میں کمی کر دی۔ سرکاری نوکروں کی تنخواہوں میں اپنا حصہ لگا لیا۔ یہاں تک کہ ان کی آمدنیوں کو تقسیم کرا لیا۔ ان عیوب کے مقابلہ میں ان میں خوبیاں بھی بہت تھیں وہ سائنس کے بڑے مربی تھے، علماء کے بڑے دوست تھے، بہت بڑے شاعر اور خطیب تھے، اور اپنے زمانہ کے بہترین خطاطوں میں سے تھے نظام ملکی کی خامی، تمام ارباب سیاست میں کبھی فرو نہ ہونے والی دشمنی عناداً اہالی الیسٹریا کی جرأت و اتحاد، اس پر تمام پادریوں کی (جو ملک محروسہ کے شہر اور گاؤں میں پڑے تھے) ان کے ساتھ ہمدردی اور مدد، قضاء آسمانی کی اٹل مصیبت وہ چیزیں ہیں کہ جن کو دیکھتے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر محمدؒ کی جگہ کوئی ان سے زیادہ لائق بادشاہ ہوتا تو آیا وہ بھی امارت اندلس کے تنزل کو روک سکتا یا نہیں۔

(الف)

تعلیقات باب دہم

(۱) اوسونا = AUSONA } ان دونوں مقاموں کے حالات باوجود تلاش نہیں ملے ۔ (مترجم)
(۲) روزاس = ROSAS }

(۳) کے لیٹ راوا = CALATRAVA = قلطرہ۔ مسلمانوں کے زمانہ میں بڑا شہر تھا، مگر اس وقت تو اس کا نشان صرف ایک ٹوٹا پھوٹا برج رہ گیا ہے۔ باقی ہو کا مقام ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان میں یہاں بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں، جو آپ کو آیندہ معلوم ہونگے۔ اسی وجہ سے کیلٹراوا کا ایک الگ نائٹ ہڈ قائم ہؤا جو بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ ایسے تاریخی شہر کا بالکل نیست نابود ہو جانا واقعی افسوسناک ہے۔ (مترجم)

(۴) لزبن = LISBON = اِستبونہ یا اشبونہ۔ پرتگال کا دارالسلطنت ہے۔ ایسٹر سے میڈورا کے علاقہ میں دریائے ٹیگس پر واقع ہے۔ یہ دریا یہاں چھ میل چوڑا ہو کر بہتا ہے۔ شہر کا بڑا حصہ دریا کے کنارے پر آباد ہے اور کچھ حصہ پہاڑیوں پر۔ بہت خوبصورت مقام ہے۔ دارالسلطنت کی سب چیزیں اور رومن کیتھولک کے لوازمات گرجا اور خانقاہیں بہت موجود ہیں۔ تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اسکے حالات عام جغرافیوں میں ملتے ہیں۔ اتنا بتلا دینا ضروری ہے کہ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ اس کو اہالی فونیشیا نے آباد کیا تھا۔ جب رومیوں کی نظر اس پر پڑی ہے تو یہ خوب آباد تھا، اور اس وقت بھی لوسی ٹے نیا کا صدر مقام تھا۔ ۷۱۲ء میں مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا، اور بہت سے انقلابات کے بعد ۱۱۴۷ء میں الفانسو اول نے اُن سے لے لیا۔ ۱۳۹۰ء میں یہاں اسقفیہ قائم ہؤا اور ۱۷۱۶ء میں بطریقیہ ۔ (مترجم)

(۵) کاڈیز = CADIZ = قادِس۔ یورپ کے نہایت قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کو اہالی فونیشیا نے روم کے آباد ہونے سے ۳۴۷ برس پہلے یا یوں کہنا چاہئے کہ ۱۱۰۰ ق م میں بسایا تھا۔ اس وقت سپین کا اہم تجارتی شہر ہے۔ اسی نام کے صوبہ کا دارالصوبہ ہے۔ بحر اطلانطک اسکے مغرب اور کسی قدر جنوب میں ہے۔ شمال کی طرف خلیج کاڈیز ہے۔ چونکہ خشکی کی ایک تنگناء سے (جس کا عرض بعض مقامات پر تو صرف ۲۰۰ فیٹ ہے) اس کا راستہ ہے اس لئے یہ مقام دشوار گذار سمجھا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے خشکی اور سمندر میں کئی قلعے

اس کی حفاظت کے لئے بنے ہوئے ہیں لیکن تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اس کو فتح کرلینا چنداں مشکل نہیں ہے۔ شہر کے گرد فصیل ہے مکانات عام طور پر سنگ سفید کے بنے ہوئے ہیں اس لئے خوشنما اور صاف معلوم ہوتے ہیں۔ بازار قرینہ و ترتیب سے بنے ہوئے ہیں مگر تنگ ہیں۔ سیرگاہیں اچھی ہیں گو گرجا کچھ قابل تعریف نہیں۔ پہلے تو تجارت کی یہاں بڑی ترقی تھی لیکن جب سے سپین ہاتھ سے امریکہ نکلا ہے کسادبازاری ہوگئی۔ جہازوں کی آمدورفت البتہ خوب ہے۔

اہالی فونیشیا جب کمزور ہوئے تو یہ شہر قرطاجنہ والوں نے لیا اُن کے بعد رومیوں نے، اُنہوں نے اس کو بہت ترقی دی۔ رومیوں سے گاتھوں نے لیا اور اُن سے مسلمانوں نے۔ آخر ۱۲۶۲ء میں اہالی سپین نے مسلمانوں سے لے لیا۔ اس کے بعد اس شہر پر بڑی بڑی آفات آئیں۔ انگریزوں، فرانسیسیوں اور پھر انگریزوں نے اس کا محاصرہ کیا، گولہ باری کی، لوٹا، قتل عام کیا وغیرہ وغیرہ۔ (مترجم)

(۱۰) سیرامورینا SIERRA MORENA سپین میں ایک سلسلۂ کوہ قشتالہ جدیدہ کے جنوبی کنارے پر واقعہ ہے اس پہاڑ پر نہایت صاف و شفاف آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے مسلمانوں نے پانی لینے اور دور دراز مقامات میں پہنچانے میں اپنا ایسا کمال دکھایا تھا کہ آج تک اُس کو دیکھ کر انجنیر حیران رہ جاتے ہیں۔ آبپاشی وغیرہ کے لئے جو نہریں اُنہوں نے نکالی تھیں وہ بھی ایسا بڑا کمال ہے کہ اس فن کے موجودہ ماہر سخت متحیر ہیں۔ مگر "رہے نام اللہ کا"۔ (مترجم)

(۱۷) آپ کا ذکر چونکہ اوراق مابعد میں آچکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مختصر حالات لکھ دیئے جائیں۔

آپ کا نام نامی یحییٰ بن یحییٰ اللیثی ہے۔ اُن بلند مرتبت و عالی منزلت علماء میں سے ہیں جن کی ذات والا صفات پر اندلس ناز کرسکتا ہے (بشرطیکہ زندہ رکھا جاتا) آپ بربریوں کے قبیلہ مصمودہ سے ہیں۔ بہت بڑے فقیہ اور محدث ہیں موطا حضرت امام مالکؒ سے بلاواسطہ روایت کی مشہور ہے کہ حضرت امام مالکؒ درس دے رہے تھے کہ اتفاقاً اُدھر ہاتھی آگیا۔ تمام شاگرد اُسے دیکھنے کے لئے چلے گئے، مگر یحییٰ بیٹھے رہے۔ حضرت امامؒ نے فرمایا کہ "تمہارے ملک میں بھی ہاتھی نہیں ہوتا، تم دیکھنے کیوں نہ گئے"؟ یحییٰ نے عرض کیا کہ "میں اندلس سے ہاتھی دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہوں، بلکہ آپ سے پڑھنے حاضر ہوا ہوں"۔ حضرت امامؒ نے خوش ہو کر فرمایا کہ یہ

شخص عاقل اندلس ہے" اُس روز سے یحیےٰ کا یہی نام پڑ گیا۔ (یحییٰ کو عاقل اندلس، عیسےٰ بن دینار کو فقیہ اندلس اور عبدالملک بن حبیب کو عالم اندلس کہا جاتا ہے) اٹھائیس سال کی عمر تھی کہ یحیےٰ اپنے وطن سے امام مالکؒ کی خدمت میں موطا پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے، اور سوائے دو بابوں کے تمام وکمال پڑھی۔ وہاں سے مصر پہنچ کر لیث ابن سعد اور مکہ شریف میں سفیان ابن عیینہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ وطن میں آ کر یہ کتاب اوروں کو پڑھائی۔ ان لوگوں نے اپنے استاد (یحیےٰ) کی روایت سے مشرق میں پہنچائی۔ ممالک مشرقیہ میں جتنے سلاسل روایت موطا کے ہیں اُن میں بہت ہی کم ایسے ہونگے جو یحیےٰ اللیثی کے سوا کسی اور پر ختم ہوتے ہوں۔ آپ کے شاگرد اتنے ہیں کہ جنکا احصا مشکل ہے۔

نہایت متدین آدمی تھے اور امراء وعظماء میں آپ کی بہت بڑی قدر تھی۔ عہدہ قضا آپ پر پیش کیا گیا مگر آپ اس سے مستغنی تھے اور فی الحقیقت "قاضی گر" تھے۔ آپ کے مشورہ کے بغیر کوئی قاضی مقرر نہ ہو سکتا تھا جس کو چاہتے تھے رکھتے تھے، اور جسکو چاہتے تھے موقوف کر دیتے تھے۔

واقعۂ ربض کی تمام ذمہ داری یحیےٰ ہی کے ذمہ آئی جو ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ آپ طلیطلہ بھاگ گئے، مگر بعد میں امیر حکم نے آپ کی جان بخشی کر کے واپس بلا لیا۔ اُس کے بعد جو عظمت وجلالت آپ کو یہاں حاصل ہوئی وہ کسی عالم کو نصیب نہیں ہوئی۔

ابن بشکوال کا قول ہے کہ یحیےٰ مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے مزار پر آپ کے طفیل سے امساک باراں کے موقعہ پر دعائیں مانگی جاتی تھیں اور قبول ہوتی تھیں۔ رجب ۲۳۴ ہجری میں انتقال کیا اور قرطبہ میں دفن ہوئے۔ جہاں اوروں کے قبور کا نام ونشان مٹا یحیےٰ کا بھی نشان باقی نہیں۔

(۸) انڈوجار = ANDUJAR. مجھے اس کا حال نہیں ملا۔ (مترجم)

(۹) گواڈاسلیٹ = GUADACELETE = بشرح صدر (مترجم)

(۱۰) ٹوڈیلا = TUDELA. = تطیلہ۔ دریاء ایبرو پر صوبۂ نوار کا ایک شہر ہے۔ سرقسطہ سے منحرف وشمال میں ۳۴ میل ہے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان میں ریل جاری ہے۔ بہت ہی بھیانک جگہ ہے۔ مکانات بہت اونچے اونچے ہیں، مگر بازار بہت تنگ ہیں۔ دریا پر جو مکانات اب بنے ہیں وہ البتہ

دلکشا ہیں۔یہاں ایک بہت بڑا گرجا ہے اور ایک اسقف رہتا ہے۔موٹا سا اونی کپڑا، صابن، مٹی کے برتن وغیرہ بنتے ہیں۔آبادی قریباً دس ہزار ۔ (مترجم)

(۱۱) ڈورو = DOURO سپین اور پرتگال کے بڑے دریاؤں میں سے ہے۔قشتالۂ قدیم کے پہاڑوں سے نکل کر پرتگال تک پہنچتا ہے۔راستے میں نہایت خوش فضا پہاڑیوں میں سے گزرتا ہے مگر یہاں بہت تیزی سے چلتا ہے، راستہ میں چٹانیں اور ریت کے ٹیلے بہت پڑتے ہیں اس لئے بہت کم مقامات ایسے ہیں کہ جہاں کشتیاں چل سکتی ہیں ۔ (مترجم)

(۱۲) کوریا = CORIA اس کا حال مجھے نہیں ملا۔ایک کوریا چین میں ہے اُس سے ایسے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ۔ (مترجم)

(۱۳) سلامنکا = SALAMANCA = شلمنکہ (یا شلمنقہ) سپین کا ایک مشہور شہر اسی نام کے صوبہ کا دارالصوبہ ہے۔دریاء ٹارمس کے کنارے تین پہاڑیوں پر آباد ہے ۱۸۱۲ء میں اہالی فرانس نے اس کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔عالیشان عمارات کی وجہ سے بہت مشہور تھا صنعت کی شہرت تو اب تک ہے شہر کے گرد فصیل ہے اور نو دروازے جن میں سے ایک بہت ہی قدیم ہے۔بازار اور گلیاں بہت پیچیدہ اور تنگ ہیں ان ہی میں قدیم عمارات ہیں جو کسی زمانہ میں اُمرا کے تھے۔ان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر نہیں بلکہ تبرک ہے۔ایک بہت پرانے گرجا کے علاوہ اور کئی نئے گرجا بھی ہیں۔اٹھائیسویں صدی کے آخر میں یہاں ۲۷ گرجا، ۹ ۳ خانقاہیں اور ۲۵ کالج ہیں۔ان کالجوں میں سے بیس کالج اور بیس خانقاہیں فرانس والوں نے تباہ کر دیئے۔یہاں کی یونیورسٹی تیرھویں صدی میں قائم ہوئی تھی۔اُس کے متعلق ایک کتب خانہ ہے جس میں ۱۸۴۵ء میں چوبیس ہزار مطبوعہ اور ڈیڑھ ہزار قلمی کتابیں ہیں۔دریاء ٹارمس پر جو پل ہے اُس کی ۲۷ محرابیں ہیں۔یہ پل رومیوں کے زمانہ میں بنا تھا ۔ (مترجم)

(۱۴) الاوا = ALAVA اسی نام کے صوبہ کا دارالصوبہ ہے۔کوئی خاص خوبی اس میں قابل ذکر نہیں ہے ۔ (مترجم)

(۱۵) سنترا = CINTRA. = شنترہ۔پرتگال کا ایک چھوٹا سا، مگر خوبصورت شہر ہے،

جس کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک سلسلۂ کوہ کے دامن میں آباد ہے۔ یہاں ایک قدیم عمارت ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کا طرزِ عمارت لئے ہوئے ہے۔ ایک زمانہ میں اس مکان میں مسلمان بادشاہ رہ چکے ہیں، اور بعد میں عیسائی بادشاہ رہتے آئے ہیں۔ مسلمانوں کے زمانہ کا ایک قلعہ بھی یہاں ہے، اس کی چھت پر چڑھ کر دور دور تک خشکی اور سمندر کا نہایت دلکشا نظارہ ہے ایک اور پہاڑی پر قدیم خانقاہ ہے۔ اہالی فرانس اور انگلستان یہاں پرتگالیوں سے لڑے ہیں، اور ان کو شکستیں دی ہیں۔ (مترجم)

(١٦) البنجے = ALANJE ایک چھوٹا سا مقام تھا۔ غالباً اب موجود نہیں ہے۔ (مترجم)

(١٧) کوہ بوباسٹرو = MOUNT BOBASTRO یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کونسا پہاڑ ہے کوئی کسی مقام کو بتلاتا ہے اور کوئی کسی جگہ کو (مترجم)
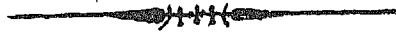
مسلمانوں اور الیسٹر یاس کے دربار شاہی کا مقابلہ۔ الفانسو سوم۔ اُن کی فتوحات۔ المنذر کی چستی وچالاکی۔ بوباشترو کا محاصرہ۔ ابن حفصون کی چال۔ امیر کو زہر سے دیا گیا۔ عبداللہ کی تخت نشینی۔ عام فرقوں اور طبقوں کی حالت۔ فساد۔ البیرا کی سرکشی۔ قبائل عرب کی کامیابی۔ اشبیلیہ کا فساد۔ مختلف صوبوں کی نفرت۔ ابن حفصون کی اگیولر میں شکست۔ متواتر فسادوں اور بغاوتوں کا دوامی مہلک اثر۔ عبداللہ کا مرگ مفاجات۔ برسوں کی خانہ جنگی سے ملکی حالات کا تغیر۔

اوراقِ ماسبق میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسکے بعد جو واقعات گزرے وہ دونوں رقیب سلطنتوں (یعنی عیسائی اور مسلمان) میں عجیب مماثلت رکھتے ہیں۔ بلحاظ طبعی حالات، قومی روایات، رسم و رسوم، اخلاق و عادات، زبان اور دین کے کسی دو قوموں میں اتنا بُعد و مفارقت نہ ہوگی جتنی کہ ان دونوں میں۔ مگر باوصف ان باتوں کے بادشاہان الیسٹریاس اور امراءِ قرطبہ کی تخت نشینی کے بعد جو فتنہ و فساد ہوئے وہ ایک دوسرے کی تصویر ہیں۔ اصولاً دونوں قوموں کے بادشاہ بذریعہ انتخاب کے مقرر ہونے چاہئیں۔ عربوں کے جذباتِ آزادی ہوں یا گاتھوں کی وحشت و خونخواری دونوں ہی اطاعت و فرماں برداری کے مخالف تھے۔ اگر وہ تخت و تاج کے لئے اصول وراثت کو

تسلیم کر لیتے تو اُن کو سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ جیسے جیسے بادشاہ طاقتور ہوتا گیا، اُسکو فطرۃً یہ خیال پیدا ہوتا چلا گیا کہ جو اقتدار شاہی اُس نے اپنی بہادری سے پیدا کیا ہے، یا جسکو اُس نے اپنی عقل و تمیز سے ترقی دی ہے، اُسکو اپنی اولاد کے لئے مخصوص کر جائے۔ اپنے خاندان میں تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ بادشاہ اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے کو عوام سے ولیعہد تسلیم کرا جاتا تھا؛ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یہ ولیعہد کاروبار سلطنت میں اپنے باپ کا شریک رہتا تھا۔ بڑے بڑے ارکین سلطنت، مقتدایان مذہبی اور امراء دولت جمع کئے جاتے تھے، اور اُن سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بادشاہ یا امیر سے اپنی نمک حلالی ظاہر کر کے اُس شاہزادہ سے بیعت کریں، جسکو محبت پدری، اور بعض وقت نمایاں قابلیت، نے آیندہ بادشاہ تسلیم کرایا ہو۔ یہ لوگ اپنے فوائد و اغراض کے خیال اور حصول مراحم شاہی کے لالچ میں اس کو منظور کر لیتے تھے۔ یہ رسم بوجہ اسکے کہ اس نے رواج کی صورت اختیار کر لی تھی بڑھتی چلی گئی اور چند پشتوں کے بعد یہ محض رسمی بات ہو گئی؛ حق ولیعہدی معمولی طور پر ظاہر کر دیا جاتا تھا جو سیاست عامہ کی وجہ سے قانونی صورت اختیار کر ہی چکا تھا۔ گو رسم قدیم کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس رسمی کارروائی سے باضابطہ انتخاب کی گویا خانہ پُری ہو جاتی تھی۔ چونکہ حقیقی آزادی رائے دہندگان اور رعایا انتخاب مفقود ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جیسے ہی کوئی بادشاہ تخت پر قدم رکھتا وہ اپنے آپ کو اپنے سے کم خوش قسمت بھائیوں کے نرغہ میں پاتا تھا، جن میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے حق سے جو خاندان شاہی میں پیدا ہونے کی وجہ سے اُسے حاصل تھا، محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ امر کہ مجلس شورے کی منظوری کچھ لازمی نہ تھی، اس امر سے ثابت ہوتا ہے کہ محض کسی شاہزادہ کا محل شاہی پر قبضہ کر لینا اُس کا بادی النظری حق شاہی تسلیم کر لینا ہوتا تھا۔ یہ اصول اُوِیڈو اور قُرطبہ دونوں جگہ مساوی طور پر جاری تھا۔ شاہ برادروں کی نافرمانی سے خانہ جنگی کے وہ افسوسناک نتائج پیدا ہوتے تھے جو بھائیوں کی جنگ سے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ شاہان گاتھک اپنی وحشیانہ عقل حیوانی سے کام لے کر اپنے بدقسمت رقیبوں کو اندھا کر دیتے تھے، اور اُن کو عمر بھر کے لئے ننگ و نابکار

کال کوٹھڑیوں میں قید کر دیتے تھے مسلمانوں کے جذباتِ انتقام عام طور پر بدنصیب بھائیوں کو چند روز کے لئے قید کر دینے سے پورے ہو جاتے تھے لیکن اگر قیدی بھائی اپنی ندامت ظاہر کر کے تائب ہو جاتا تھا، تو اُسکو بادشاہ پھر اپنا منظورِ نظر بھی کر لیتا تھا، اور اُسکے گناہوں پر خطِ عفو کھینچ دیا جاتا تھا سپین کی تاریخ قدیم کے مطالعہ کرنے والے حضرات پر اس کا گہرا نقش ہوئے بغیر نہ رہیگا کہ جزیرہ نماءِ مذکور کے شمالی اور جنوبی حصوں میں جرائم نمک حرامی کا ارتکاب مختلف طریقوں پر ہوتا تھا۔ یہ دونوں علاقے ہر وقت آپس میں دست و گریباں رہتے تھے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ جن موقعوں پر کسی طرح امید نہیں ہو سکتی وہاں دونوں میں مماثلت ہوتی ہے، جو جرائم کہ تاج و تخت کے خلاف ہوتے تھے اور جن سے بادشاہ کی ذات خاص پر حملہ مقصود ہوتا تھا اُن میں کہیں تو انتہا درجہ کی فیاضی دکھلائی جاتی تھی، جو خودکشی کی مترادف ہے، اور کہیں وہ تشدّد، کہ جسکی توقع اگر ہو سکتی تھی تو صرف انتہا درجہ کے وحشیانہ خونخواری سے ۔

الفانسو سویم (جن کو بجا طور پر "اعظم" کا خطاب دیا گیا ہے) کا عہد حکومت بہت طویل اور باشان و شکوہ رہا ہے، اور اس نے بازیافت سپین کے ابتدائی مراحل میں بڑی مدد دی ہے، یہ زمانہ اُن واقعات اور مصائب کی نمایاں مثال ہے جو من چلے شاہزادگان الیسٹریاس پر پڑتے رہے تھے تخت نشینی سے چار برس پیشتر وہ اپنے باپ آرڈوؤں کے ساتھ مہام سلطنت میں شریک رہے تھے، اس لئے وہ تخت نشینی کے وقت کچھ ناتجربہ کار لڑکے نہ تھے۔ ان کے چاروں بھائیوں کو اپنے باپ کی بے انصافی کا سخت رنج تھا، اور اُن کو اُس رسم کی قانونی حیثیت کے تسلیم کرنے میں تامل تھا جسکے موافق وہ لوگ محروم کر دیئے جاتے تھے جو قانون وزیگاتھ کے موافق تاج و تخت کا حق فائق رکھتے تھے۔ ان چاروں نے اپنی قوت کو یکجا مجتمع کر کے الفانسو کو تخت سے اُتارنے کی کوشش بلیغ کی، مگر سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب قانون کی وحشیانہ سختی بروئے کار آئی۔ برادرانہ ہمدردی سے یہ توقع تھی کہ اس تشدد میں کچھ کمی آ جائیگی، مگر کیسی ہمدردی! نامراد شاہزادے نورِ بصر سے محروم کر کے مادام الحیات اُویڈو کے ایک قلعہ

میں قید کر دیئے گئے۔ ان میں سے تین تو قید کی سختیاں نہ سہہ سکے، اور بہت ہی جلد قید حیات سے
چھوٹ گئے، چوتھا بھائی ویرے منڈو× خوش قسمت تھا کہ قید سے نکل بھاگا، اور اُسکے حمائتیوں نے
نے اُسکو اسٹورگا[1] کا بادشاہ بنا دیا۔ اس مضبوط شہر میں وہ مسلمانوں کی مدد سے سات برس تک
برابر بادشاہ الشریاس کے حملوں کو کامیابی کے ساتھ روکتے رہے جس ہمت استقلال سے
اُنہوں نے اپنے دشمن صعب کا مقابلہ کیا وہ فی نفسہ حیرت انگیز ہے مگر جب یہ خیال کیا جائے کہ جو
شخص یوں مقابلہ کر رہا تھا، اور اس تمام جنگ کا روح و رواں تھا، وہ آنکھوں سے بالکل اندھا
تھا، تو تعجب کی کوئی حد نہیں رہتی اور ایسے شخص کی عزت نگاہ میں بڑھ جاتی ہے۔

الفانسو سوئم کی اعلےٰ درجہ کی قابلیت بہت سی گھمسان لڑائیوں اور سب سے نازک
موقعوں پر ظاہر ہوئی، جو اُن کی طویل مدت سلطنت میں بارہا پیش آئے۔ اُن کی فوجیں دشمنوں کے
اُن علاقوں میں پہنچیں کہ جہاں جانے کی اُن کی پیش روؤں کو ہمت نہیں پڑی۔ کوئمبرا[2]، اوپورٹو[3]
زمورا[4]، ٹورو[5]، سائمن کا[6]، اور اُن کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے شہر عیسائیوں کی سلطنت
میں اگر ایزاد ہوئے تو سب اُن ہی کی شجاعت اور ہیبت سے۔ اُن کی طبل و بوق کی آواز سے وہ وادیاں جاگ
اُٹھے جنکے کھیت سیرا مورینا کے سرسبز نشیبوں میں واقع تھے۔ اُن کے پرچم کئی مرتبہ مریدہ کی فصیل
سے نظر آ چکے تھے۔ اُن کے دستہاء فوج نے مضافاتِ دارالخلافہ قرطبہ کو کئی مرتبہ دھمکایا۔ اُنہوں نے
مسلسل سختی کے ساتھ انعدام دشمنان کی اس پالیسی پر عمل کیا جو اُن کے ہمنام بادشاہوں نے
شروع کی تھی۔ جو قیدی اُنہوں نے اپنی مختلف مہموں میں گرفتار کئے تھے اُن کا بیشتر حصہ کلیساؤں
اور صرف خاص کے علاقوں میں تقسیم کر دیا کہ اُن کو گرجاؤں، دیروں، قلعوں اور محلات شاہی کی
تعمیر میں لگا دیا جائے۔ جیسے جیسے دونوں ملکوں کی جنوبی حدود بڑھتی چلی گئیں ویسے ہی اُن پر
چھوٹے چھوٹے قلعے بنتے چلے گئے۔ ان میں سے سب سے مشہور قلعہ اُس مقام پر واقع تھا جہاں
آج کل برگوس[7] آباد ہے۔ یہ وہ شہر ہے کہ جس کی قسمت عیسائی سلطنت قشتالہ سے بہت زیادہ

VEREMUNDO ×

وابستہ رہی ہے۔ صوبۂ نوار اب تک ایک ناقابل توجہ ریاست تھی، یہ اگر تخت ایسٹریاس کی مطیع
تھی تو محض وہاں کے باشندوں کی غفلت سے، نہ کہ کسی باضابطہ حق کی وجہ سے۔ اب جو الفانسو ہفتم
کی زیمینا× دختر کاونٹ آف نوار سے شادی ہوگئی تو سب سے پہلے اس (کاونٹ آف نوار)
نے مطلق العنان بادشاہ ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اکتیس (۳۱) برس کامل الفانسو برابر امرائے قرطبہ سے لڑتا رہا۔
ان لوگوں کی اولاد کے علاقوں کو جو ڈر کے مارے کوہ پائے رینیس کے جنگلوں میں آکر آباد ہو گئے
تھے انہوں نے خود مسخر کیا، اور اپنی حدود سلطنت کو ڈورو اور ٹیگس سے بڑھا کر وادیانہ کے انتہا تک
پہنچادیا۔ انہوں نے خود اپنی آنکھ سے دنیاوی اور کلیسائی طاقت کو مکمل اور مضبوط ہوتے دیکھا؛
یہ ایک ایسا اتحاد تھا کہ جو سپین کی شہرت کا بھی باعث ہوا اور اسکو ذلیل بھی کر دیا۔ سینٹ یاگو
(سنت یاقوہ) کا کلیسا دینداروں کی خوش اعتقادی اور اشرار کے خوف سے بہت کچھ مالا مال ہو
چکا تھا، اور اس گنوار و پورٹے نے شہر کی صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ گھریلو گرجا کی جگہ اب
بہت بڑا شاہانہ گرجا بن گیا تھا۔ رونے دھونے والے خوش اعتقاد جاتری جوق در جوق آتے تھے
اور اس جوش مذہبی کی جذبات کا ثبوت دیتے تھے، جو بازیافت سپین کی لڑائیوں میں اپنی بہادری
کی وجہ سے بہت کچھ ممد و معاون ہوئے۔ الفانسو کے آخری ایام حکومت میں جزیرہ نمائے اندلس کا تین
چوتھائی حصہ باستثنائے پہاڑی جنگل کے ایک کونہ کے، جو پہلے مسلمانوں کو خراج ادا کرتا تھا، وہ
تمام یا عیسائیوں کے قبضہ میں تھا یا ان کے حلیفوں کے۔

جدید امیر منذر کی جوانی اپنے پیش رووں کی طرح فوجی مشغلوں یا جنگی مہموں میں گزری تھی
کوئی بادشاہ اب تک ایسے سازگار حالات اور اس کے ساتھ ہی اتنا لائق تخت اندلس پر بیٹھا
تھا جیسا کہ امیر منذر یا امیر محمد بھی۔ مسلمانوں کے نام پر جو دھبہ آچکا ہے اسکو وہ اڑا دینگے۔ ان کا حزم
اور ان کی تیز فہمی اتنی ہی تھی جتنی کہ ان کی ہمت، جس نے ان کو میدان جنگ میں ایک شجاع
قوم کے مقابلہ میں اتنا نامور کر رکھا تھا۔ ان کا زور طبیعت اس جواب سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے

XIMENA. ×

اہالیٔ طلیطلہ کو اُس وقت دیا تھا کہ جب اُن کے تخت پر بیٹھتے ہی اُنھوں نے اپنا معمولی خراج پیش کیا۔ یہ روپیہ اُنھوں نے فوراً واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "یہ روپیہ تم جنگ کے خرچ کے لئے اپنے ہی پاس رہنے دو، انشاءاللہ میں تم پر بہت جلد حملہ کرنے والا ہوں"۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے امیر منذر کی غیر حاضری سے جری باغی ابن حفصون کو اپنی جمعیت کے بڑھانے کا موقعہ مل گیا؛ اور بہت سی دھمکیوں اور وعدوں سے اُنھوں نے اندلس کے بہت سے اہم قلعے لے لئے۔ مستقل مزاج و جوان سال امیر اپنے مدمقابل کی خوفناک حالت کو اچھی طرح جانتے تھے؛ اس لئے اُنھوں نے ابن حفصون کو اتنا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ امیر کی خانگی مصیبت سے فائدہ اٹھا لیں اور اپنی اُن قابلیتوں سے فائدہ نہ اُٹھائیں جس نے اُن (ابن حفصون) کو اتنا مشہور کر دیا تھا۔ امیر بہت سے آزمودہ کار لوگوں کی جمعیت لے کر قرطبہ سے روانہ ہوئے اور یک لخت قلعہ آرچی ڈونا کو جا گھیرا، جو ابن حفصون کے اُس حلیف کے ہاتھ میں تھا جو خود نو مسلم تھا۔ یہ ایسا اتنا جری تھا کہ اُس نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ اگر میں گرفتار ہو جاؤں تو قتل کر دیا جاؤں۔ یہ شخص اپنے مذہب کو چھوڑ چکا تھا، اور اپنے اس مذہب کے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا۔ امیر منذر نے یہ کیفیت دیکھ کر باشندگان شہر کو بہت رشوت دی؛ اور اُن کو اپنے ساتھ ملا کر اس برگشتہ قسمت باغی کو اُن کے سپرد کر دیا۔ انجام یہ ہوا کہ وہ اپنے اعلان کے موافق ایسی موت سے مارا گیا جو مسلمانوں کی نگاہ میں ذلیل ترین موت ہے، یعنی وہ نہایت ناپاک جانوروں کے بیچ میں اُن ہی کے ساتھ اسکو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ یہ سختی دیکھ کر ارچیڈونا نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ اسکے بعد امیر کے رسالے نے اُس علاقہ میں جتنا سامان آذوقہ ملا سب کو برباد کر دیا؛ جو لوگ کہ اس بغاوت کے سرکردہ تھے سب قتل کر دیئے گئے؛ امیر منذر فوجی کامیابی کا سہرا اپنے سر اور آیندہ مال مغرورتہ اور انتقام کی امید لے کر بوباسٹرو کے مضبوط قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگرچہ ابن حفصون کو اس کا چنداں خوف نہ تھا کہ اُن کا قلعہ چھن جائیگا، تاہم اس عیّار نے یہ فکر کر لیا کہ ایسی صورت واقع ہی نہ ہونے پائے، اور اُن کی رعایا محصور ہونے کے نتائج بد سے

بھی پہنچ جائے، یعنی اُنھوں (ابن حفصون) نے پورا خلوص ظاہر کرکے دائمی صلح کر لینے کے ارادہ کا اظہار کیا۔ امیر منذر ہزار تجربہ کار سہی، مگر وہ ابن حفصون کی عاجزی، اظہار افسوس اور آیندہ کی نمک حلالی کے وعدوں کے دھوکے میں آہی گئے۔ ایک عہدنامہ ہوا جو اس ہی باغی کے املا کرانے سے لکھا گیا۔ اُن ہی کی درخواست پر سو خچر، جنکی حفاظت پر ایک سو ساٹھ سوار متعین تھے، اُن کو دیئے گئے کہ وہ اپنے خاندان کو قرطبہ پہنچا دیں۔ اُنھوں نے اپنی اطاعت کچھ اس طرح ظاہر کی کہ کسی کو اُن پر دغا بازی کا شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بلا وقت رات کے وقت نلوہ نکل کر بھاگ گئے۔ امیر کی فوج نے بوباسٹر کو پہلے ہی خالی کر دیا تھا، مگر کچھ لوگ حفاظت کے لئے وہاں رہ گئے تھے۔ ابن حفصون یہاں پہنچے تو اُنھوں نے کچھ جمعیت اکٹھی کرکے ان سب کو قتل کر دیا، اور آپ پھر قلعہ پر قابض ہو بیٹھے۔ ابن حفصون کی اس دو رخی چال سے منذر کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی، اُنھوں نے قسم کھالی کہ جب تک اس نمک حرام کو انتہائی سزا نہ دے لینگے، چین نہ لینگے۔ محاصرہ پھر شروع ہوا، مگر اس میں وہ شدت نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی، کیونکہ نظام فوجی میں نہ صرف کمی ہی آگئی تھی، بلکہ بوجہ اسکے کہ محاصرہ کے بہت طویل ہونے کی امید تھی، سپاہی کچھ دل شکستہ سے ہو گئے تھے۔ اُن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ بوباسٹر ناقابل تسخیر ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہو چکا تھا کہ بے چینی پھیلتی جاتی ہے، اس لئے امیر کے بھائی، عبداللہ، اور خواجہ سرایان محل شاہی نے امیر کے خلاف ایک سازش کی طبیب شاہی پر زور ڈالا گیا کہ وہ امیر کی فصد زہر کے بجھے ہوئے نشتر سے لیں۔ امیر کچھ خفیف سے علیل ہوئے تو یہی کیا گیا۔ اس بہادر شاہزادے نے جسکے چال ڈھال سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے سب سے بڑے نامور بادشاہوں میں سے ہونے والا ہے، دو برس سے کم ہی سلطنت کرکے نہایت کرب کی حالت میں جان دی۔ اُنھوں نے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا! اسی وجہ سے عبداللہ کی مجرمانہ تدابیر کو بہت جلد عمل میں لایا گیا، اور جب اس میں کامیابی ہو گئی تو اُنھوں نے اپنے بھائی امیر منذر کی موت کی خبر سب سے پہلے خود ہی دی، یکایک فوج میں پہنچے، تخت اندلس کا دعوے کیا، اور افسران فوج نے بادل ناخواستہ اُن سے بیعت کر لی۔

ابن حفصون کی قابلیت کی قدر تمام سپاہی کرتے تھے، اور اُن کے خونخوارانہ جذبات سے ڈرتے تھے، اُنہوں نے اپنے بادشاہ کے مرنے کا کچھ غم نہ کیا، بلکہ بڑی خوشی ظاہر کرکے بوباسٹر کے قلعے سے، بہت پریشان ہوکر، بلا پابندی قواعد فوجی، اپنے گھروں کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ اُن کے راستہ میں جو گاؤں پڑا اُس میں سینکڑوں سپاہی رہ گئے، اور وہاں کے باشندوں کو، جو پہلے ہی اپنی جان سے تنگ آئے ہوئے تھے، خوب لُوٹا۔ ابن حفصون کی نگاہ سے بھلا اس فوج کا یوں پریشان ہوکر بھاگنا کب چھپا رہ سکتا تھا، خاص کر اس صورت میں کہ وہ اس فوج مفرور کے عقب میں بہت ہی قریب تھے۔ یکایک امیر عبداللہ کی طرف سے ابن حفصون کو پیغام پہنچا کہ وہ باطمینان بیٹھے رہیں، نیز یہ کہ اُن کو اِن (ابن حفصون) سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ باغی نے اتنی عنایت کی کہ امیر کی درخواست کو منظور کرلیا۔ امیر نے اپنے بھائی منذر کی لاش کو بڑی احتیاط سے اونٹ پر لادا اور ابن حفصون نے اُن کو بعافیت قُرطبہ پہنچ جانے دیا۔ فوج کی بدنظمی اور پریشانی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس فوج میں کئی ہزار آدمی تھے اُس میں سے صرف چالیس یا پچاس آدمی امیر عبداللہ کی اردلی میں قُرطبہ پہنچے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو تاج کہ نمک حرامی اور برادرکشی کی وجہ سے ناپاک ہوگیا تھا وہ اس طرح گردش میں آگیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے بدقسمتیوں کا آلہ بنا رہیگا۔ جزیرہ نما کی سیاسی حالت بے انتہا پیچیدہ ہوگئی تھی۔ ہر جگہ کی سوسائٹی میں بے قراری تھی، اور ہر ایک سوسائٹی میں آثار شکستگی نظر آرہے تھے۔ عربوں کو اوّل تو اپنے عربی النسل ہونے کا غرور تھا، دوسرے اُن کو یہ دعوے تھا کہ جتنی فتوحات ہوئی ہیں وہ خود اُن ہی نے کی ہیں، حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ فتوحات میں زیادہ حصہ اُن کے حلیفوں اور نومسلموں کا تھا۔ عربوں نے اپنی حالت امرایانہ بنالی جسکے وہ مستحق نہ تھے، اور جو عوام کو بھی سخت ناگوار تھی۔ بجاے اسکے کہ وہ بتعمیل حکم قرآن مجید نومسلموں کو اپنا بھائی سمجھتے وہ اُن کو ذلیل سمجھتے تھے، اور اکثر اُن کو اس طرح بے عزت کرتے کہ وہ اپنے غلاموں سے بھی ویسا سلوک کرتے ہوئے تامل کرتے۔ باوجودیکہ ان نام نہاد نومسلموں کو

مسلمان ہوئے کئی نسلیں گزر چکی تھیں، اُن میں بڑی قابلیت کے لوگ تھے، اُنہوں نے وہ وہ
بہادریاں دکھلائی تھیں کہ دشمن اُن کا لوہا مان گئے تھے، اور اُن کی قدر کرتے تھے، مگر یہ سب باتیں
ان بت پرست اور قزاقوں کی مغرور اولاد کے نزدیک اُن کافروں کی اولاد، یعنی نومسلموں، کے
گناہوں کا کفارہ نہ تھیں۔ عربوں کے آپس میں اگر اتحاد تھا تو صرف ان نومسلموں، اور ان کی
اولاد ہی کے مخالفت میں تھا۔ شامیوں اور حجاز کے بدوؤں میں وہی دشمنی چلی آتی تھی جو کبھی
ختم ہونے والی نہ تھی، اہالی یمن اور اولاد معد کے درمیان میں جو نسلاً بعد نسل دشمنی تھی، وہ اُسی
تلخی اور سختی کے ساتھ موجود تھی جس کیفیت سے کہ شروع ہوئی تھی، گو اور اغراض و مقاصد کی وجہ
سے اس دشمنی کا اظہار، بہ نسبت پہلے کے، بہت کم ہوتا تھا۔ جلاوطن گاتھک لوگوں کی ضبطی
جائداد، اور فتح کی فتوحات، نے عربوں کو یہ موقعہ دیا تھا کہ اُن کے پاس بہت سی جائداد ہو گئی
تھی اور دولت بھی اُنہوں نے بہت جمع کر لی تھی۔ چونکہ بدوؤں کو ایک جگہ مقید ہو کر رہنے سے
ضد تھی، اس لئے اُمراء جزیرہ نما نے اپنی سکونت بڑے بڑے شہروں، مثلاً جین، قرطبہ، اشبیلیہ
اور ملاغہ کے مضافات میں اختیار کر لی تھی۔ وہاں وہ اپنے غلاموں اور خدمتگاروں کی ایک فوج
کی فوج کے ساتھ رہتے، اور آزادی اور دہقانی زندگی کا پورا لطف اُٹھاتے تھے، جس کا شوق
اُن کو اپنے اجداد، باشندگان وسطی و مغربی عرب، سے میراث میں ملا تھا۔

لیکن جن مختلف گروہوں میں عربوں نے اپنے آپ کو تقسیم کر لیا تھا، اگر اُن کا مقابلہ اور
باشندگان ملک کی تعداد، اقتدار، یا دولت سے کیا جاتا تو عربوں کی کوئی ہستی نہ تھی۔ عیسائیوں کے
مقابلہ میں اُن کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ یہ عیسائی طارقؒ کی فتح کے وقت سے سیاسی اور دینی آزادی
کے مزے ایسٹریاس کے جنگلوں میں اُڑا رہے تھے۔ آبا و اجداد کی مقدس روایات، تعلقات ہم وطنی،
بچپن کی یادگاروں، تنگدستی کے خوف اور دولت و شہرت کی امید کی وجہ سے بیشتر لوگ اپنے
ہی گھروں میں رہ گئے تھے، اور اپنے تعزز اور دولتمندی کے لطف حاصل کرتے تھے، بعض
لوگ ایک معقول خراج ادا کرتے تھے، اور اس کے عوض میں اُن کو وہ امن و امان نصیب تھا

جو سلطنت گا نٹھ میں اُن کے خواب خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ یہ لوگ "اہل الذمہ" یا "ذمی" کہلاتے تھے۔ ایک اور فرقہ بھی تھا جو "عجمی" کہلاتا تھا وہ اپنے فاتحین کے اقتدار کو تسلیم نہ کرنے میں بالکل بے دھڑک تھا۔ پہاڑوں کی کھوؤں میں وہ برائے نام آزاد تھا، البتہ اُن میں نظام نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بمشکل تمام قزاقی کی حیثیت سے بھی نہ بڑھے۔ حصول دولت کی ترغیب اور سیاسی فوائد کی امیدوں نے ایک اور برادری یا فرقہ پیدا کر دیا تھا جسکے افراد کی تعداد بھی زیادہ تھی اور جزیرہ نماء اندلس کی قسمت کے متعلق اُن کا اقتدار بھی ایک اہمیت رکھتا تھا۔ یہ فرقہ مولدین کا تھا۔ لفظ "مولد" کسی قدر وسیع معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ گو اُن میں کچھ کچھ حصہ خون عرب کا تھا لیکن کسی غیر ملکی خون کی کثافت بھی اُن کی رگوں میں دایر و سایر تھی۔ یہ لفظ بگڑ کر یورپین زبان میں "ملٹو" بن گیا، اور اس وقت تک یورپ کی بہت سی زبانوں میں رائج ہے۔ یہ لقب اُن لوگوں کا تھا جو وہاں کے نو مسلموں کی اولاد تھی۔ عرب ان کو "مسلمہ" کہتے تھے اور سپین والے "موریسکو"* یا نو عیسائی، فتح غرناطہ کے بعد پرجوش رہبنیس، اور اُن کے جلیسوں نے ان کو شکنجوں میں کس کر، یا سولی کا خوف دلا کر عیسائی کیا تھا؛ کیونکہ اُن کے پاس دین مسیحی کی حقانیت کی یہی ایک دلیل تھی⊗۔ ان کے علاوہ ایک اور فرقہ تھا جو "مرتدین" کہلاتا تھا۔ یہ لوگ وہ تھے کہ جو پہلے مسلمان ہو چکے تھے، مگر بعد میں پھر عیسائی ہو گئے، اور از روئے شرع اسلامی مستوجب سزاء قتل ہوئے؛ کیونکہ بموجب شریعت غراء محمدی (علے صاجبہا التحیتہ و السلام) یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ یہ لوگ قزاقی پیشہ تھے۔ جو سلطنت کی مقرر کردہ کمزور پولیس کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اور عین قرطبہ کی میناروں کے سایہ میں مسافروں کو لوٹا کرتے تھے۔ سوسائٹی کے ان پریشان اور پریشان کن عناصر کی فہرست میں نیم وحشی بربریوں کو اور اضافہ کرنا چاہئے، جو مذہبًا زیادہ تر

MORISCO. * MULATTO. x. ⊗ اس اجمال کی تفصیل میری کتاب "مولدین" میں ملاحظہ فرمائیے جو اخبار الاندلس کے متصل ہی شائع ہوگی انشاءاللہ العزیز۔ اگر مسلمانوں کو کچھ بھی اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ممکن نہیں کہ اس قصہ درد کو دیکھ کر اپنے آنسو اپنے قابو میں رکھ سکیں ۔ (مترجم)

بُت پرست تھے، اور سپاہیانہ حیثیت سے محض خونخوار و خون ریز۔ اب اس فہرست پر نظر ڈالیئے اور دیکھئے کہ خاندان بنو اُمیہ کے قابل ترین بادشاہ کو کن کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہوگا۔ فرقۂ یہود جو بوجہ اپنے تجارت پیشہ ہونے کے امن و عافیت کا بہت بڑا حامی اور مفید فرقہ تھا اُس کو ہر ایک گروہ جسکے ہاتھ میں وہ بد قسمتی سے پڑ جاتے تھے دونوں ہاتھوں سے لوٹتا کھسوٹتا تھا۔ دنیا کا کوئی ملک جس کا اندلس کی برابر رقبہ تھا اتنے مختلف گروہ اشرار نہ رکھتا تھا جتنا کہ یہ جزیرہ نما، زمانہ قبل از باز یافت میں اپنے پہلو میں دبائے ہوئے تھا۔ جیسی کہ تمام مستبد بادشاہوں کی حالت ہے کہ اُن کو ہر وقت اپنے انتزاع کا اندیشہ ہتا ہے اندلس کے بادشاہوں کی بھی یہ حالت رہتی تھی۔ کہ جب کسی فرقہ سے سلطنت میں نقض اُن کا خوف پیدا ہوا تو اگر وہ خوف عرب کی طرف سے ہوا تو اُن پر اور اگر مولدین کی طرف سے ہوا تو اُن پر مراحم خسروانہ زیادہ مبذول ہوجاتے تھے مگر یہ پالیسی اُلٹا اثر پیدا کرتی تھی؛ اور جس خرابی کا یہ علاج سمجھا جاتا تھا وہی بڑھ جاتی تھی۔ جو فرقہ فتحمند ہوتا وہ اپنے حاصل کردہ اقتدار کو بری طرح استعمال کرنے، اور وحشیانہ تشدد دکھلانے میں کبھی کمی نہ کرتا تھا۔ جو گروہ ایک وقت خاص میں بادشاہ وقت کا مبغوض ہوتا وہ اُس حکومت و سلطنت کی عزت و حرمت اور نمک حلالی کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا، جو اس کی حفاظت سے ہاتھ اُٹھا لیتی تھی، یا اُس کی دشمن ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عرب اور مولدین، بادشاہ کے برخلاف صف آرا تھے اور اُس کے ساتھ ہی آپس میں دست و گریباں۔ امیر منذر کا انتقال گویا بدامنی کی بارود میں ایک چنگاری تھی؛ امیر عبداللہ جیسا کمزور اور ریاکار ڈرپوک آدمی اس آگ کو بجھانے کے بالکل ناقابل تھا۔ اشراف عرب مدت سے یہ چاہ رہے تھے کہ اُس بدلگامی اور مادر پدر

× بد قسمتی دیکھئے کہ یہودیوں کی اب تک یہی حالت ہے بلکہ مسیحی سلطنتوں میں، سوا انگلستان کے ان کی حیثیت اور بھی بدترین ہو گئی ہے۔ انگلستان میں یہ ستائے نہ جاتے ہوں، مگر تعصب ان سے بدرجۂ شدید ہے۔ مقابلہ کیجئے ان لوگوں کا، جن کو خدا تعالےٰ نے ملعون کیا، ان لوگوں سے، جن کو پادری ملعون بناتے آئے ہیں۔ (مترجم)

آزادی کے زمانہ کو ایک غیر ملک میں آکر پھر تازہ کردیں جس کی حکائتیں بادیہ کے قزاقوں اور چرواہوں کی نظموں میں آکر اُن کے خون میں جوش پیدا کردیتی تھیں۔ مشہور و معروف ابن حفصون، جن کے نام سے گاؤں اور پوردے تک میں لرزہ چڑھا رہتا تھا، جو بوباسٹرو کے باغیوں کے سردار اور ہر شریر النفس گروہ کے حلیف تھے، اور جن کی طاقت خود امیر اندلس سے بڑھی ہوئی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اُن کو حقیقتہً اقتدار و شوکت شاہی حاصل ہو جائے، جو معناً اُن کو اب بھی حاصل تھی۔

امیر عبداللہ کی حالت نہایت خطرناک تھی۔ فیسلہا نسل سے شامی عرب اور قریشی خاندان بنو اُمیہ کے نمک حلال رہے تھے، مگر اب اس میں بھی بڑا فرق آگیا تھا۔ خزانہ خالی تھا۔ جو خراج والیوں کے ذمہ واجب الادا تھا اُس کا سب سے بڑا حصہ روک لیا جاتا تھا۔ مولدین عیسائیوں کو اپنا مربی سمجھتے تھے، اُن ہی کے اغوا سے عیسائی، باستثناء باشندگان قُرطبہ و مضافات، خراج ادا نہ کرتے تھے۔ سفیران شاہی راستہ میں لوٹ لئے جاتے تھے، اور اُن کو لوگ روک رکھتے تھے۔ دارالخلافہ کے باشندگان پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ خفیہ طور پر دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن پر اعتبار نہ تھا۔ چنانچہ ابن حفصون گداگروں کا بھیس بدل کر قلعہ میں پہنچے، اور اپنے تفاخر کی وجہ سے چند روز وہیں رہے۔ امیر عبداللہ کے مصاحبین نے اُن کو باغیوں کے ساتھ ملنے پر مجبور کیا۔ ابتداءِ عمر میں وہ اُن افسرانِ فوجِ محافظ کے بڑے دوست رہے تھے، جو بعد میں باغیوں کے سرگروہ بن گئے۔ ابن حفصون نے جو کامیابیاں حاصل کی تھیں اُن سے بجاء اسکے کہ لوگوں کو نفرت ہوا اور بھی محبت، اور اُن کی قدر بڑھ گئی تھی۔ امیر عبداللہ کو اپنی مایوسانہ حالت معلوم تھی، وہ یہ چاہتے تھے کہ فریق مخالف کے اس سب سے بڑے طاقتور سرگروہ سے کسی نہ کسی طرح صلح و صفائی کرلیں۔ اس کوشش میں وہ یہاں تک حد سے بڑھے کہ اُنہوں نے اس شرط پر کہ وہ پھر اطاعت قبول کرلیں ریگیو[۹] کا علاقہ اُن کو پیش کیا۔ اس عیار باغی کے نزدیک حلف اُٹھانا ایک بے معنی بات تھی، وہ تو صرف اپنا چاہتے

تھے کہ اُن کو اپنی فوج کے از سر نو مرتب کرنے کی فرصت مل جائے، اُنھوں نے اُس کو فوراً
بے تامل منظور کر لیا، بلکہ یہاں تک کیا کہ اپنے بیٹے، اور کئی افسروں کو بطور یرغمال امیر کے پاس
بھیجدیا۔ امیر نے اپنے باغی، اور نمک حرام غلام کے اس یرغمال کی وہ خاطر و مدارات کی جو سفراء
شاہی کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اُن کی بڑے زور کی دعوت کی، ایک بڑے محل میں اُن کو
ٹھیرایا، اور بہت کچھ تحفہ و تحایف دیئے۔ یہ "یرغمال" چونکہ بالکل آزاد تھے، اس لئے جیسے ہی
چند ماہ کے بعد ابن حفصون نے اُن کو قلعہ بوباسٹرو بلایا، وہ بلا دقت وہاں سے بھاگ گئے۔ ان
لوگوں کے بھاگ جانے سے نمک حلال رہنے کی جو ضمانت ابن حفصون نے دی تھی وہ بھی ختم ہو گئی،
اور اب اُنھوں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت حدت کے ساتھ اپنی لوٹ مار شروع کر دی۔ چند
ہی روز کے بعد ایک ایسے صوبہ کے باغیوں نے اُن سے استمداد کی جواب تک اُن کے ساتھ
دوستی کرنے سے بچتے رہے تھے، یعنی شہر صوبہ البیرا نے۔

جس زمانہ میں کہ اندلس کے امیر خلافت دمشق کے ماتحت تھے اُن دنوں جو تقسیم اراضی
ہوئی تھی اُس کے موافق وہ شاداب علاقہ، جو بعد میں ویگا آف گراناڈا کہلایا، باشندگان شام کو
دیا گیا۔ بدوؤں کے سچے جذبات کے موافق، اور آزادی کی محبت کی وجہ سے ان لیبر لوگوں نے
جنھوں نے یہ علاقہ اپنے زور بازو سے حاصل کیا تھا، اپنے مکانات جہاں تک ہو سکا اور لوگوں
کی گنجان آبادی سے دور بنائے، گو اس کا خیال رکھا کہ وہ اپنی جاگیروں سے دور نہ جا پڑیں۔
بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کی بہتات، اور ایک سیر حاصل زمین کے تردد سے، جسکو اُن کے
غلاموں کا ایک جم غفیر کاشت کرتا تھا، اُن کی اولاد بے انتہا دولتمند ہو گئی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا
گیا کچھ اراضی تو نمک حرامی کی علت میں ضبط ہوئی، کچھ جنگوں کی مصایب میں ہاتھ سے نکل
گئی، کچھ بیماری اور وباؤں سے خالی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عرب خاندان بے نام و نشان ہو گئے،
اور ان کی جائدادیں بذریعہ بیع یا جبر ستانی اُن بڑے بڑے زمینداروں میں منقسم ہو گئی، جو اس صوبہ
کے سب سے بڑے مالک بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنا الگ فریق قائم کر لیا، جو اپنے تکبر اور الگ

تھلگت ہنےمیں تمام جزیرہ نمامیں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شامی اشراف کے غرور میں اس لئے اور بھی زیادتی ہوتی چلی جاتی تھی کہ بادشاہان وقت اُن کو اپنا ہموطن سمجھ کر ان کی خوشامدیں لگے رہتے تھے خاندان بنو امیہ اپنی غلطی سے یہ سمجھتا تھا کہ اُس کا بقا خاص بادشاہ کی کوششوں پر منحصر ہے اور بادشاہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ خاندان قائم ہے تو محض اُسکے بزرگوں کی عاقبت اندیشی کی وجہ سے عربوں اور شامیوں کی وفاداری کا کئی مرتبہ امتحان ہوا اور وہ مشتبہ ٹھہرے جس طرح اور جگہ ہوتا رہا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ شاہی اغراض و مقاصد کو کئی مرتبہ فریق بندی کی شرارتوں پر قربان کر دیا گیا۔ کیونکہ اہالی یمن اور اولاد معد کے درمیانی عداوت کا اظہار جتنا الویرا میں ہوتا تھا اُتنا کہیں بھی نہ ہوتا تھا۔ اپنے اور بھائیوں کی طرح جو اس وقت مہذب بنا کے جھگڑوں میں پھنس گئے تھے اعراب دیگا کا سلوک اپنے ہمسروں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو شجاعانہ اخلاق اور مہذب آداب کا نمونہ تھا لیکن جب اُن کا تعلق باشندگان شہر سے پڑتا تھا تو اُن کی روش اور ہی ہو جاتی تھی یعنی شہریوں کو وہ محض اس علت میں ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ یہ لوگ نو مسلم تھے اور تجارت پیشہ۔ اسی لئے ان امن پسند لوگوں کو ذلیل کرنے میں وہ کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ باوجودیکہ وہ سب متقی مسلمان تھے تاہم عرب اُن پر بے دینی کا الزام لگاتے تھے اور عربی کی تمام لغات کو ڈھونڈ ڈھونڈ ڈھونڈھ کر سخت وہ الفاظ نکالتے اور اُن کے حق میں استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے ایک لفظ ہم تک بھی پہنچا ہے جو تہتک توہین کا خلاصہ ہے۔

باشندگان الویرا کا تکبر سخت بدعملی کی چکی میں پسا چلا جاتا تھا اور اُن کو یہ سب کچھ مجبوراً برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان کو اپنے عالی خاندان ہونے پر ناز اور اپنے تمغجات پر بڑا غرور تھا۔ تمام جزیرہ نماء سپین کو اگر بت پرستی کا ایک خوفناک بنجر فرض کر لیا جائے تو صحیح ہوگا، اس بنجر میں الی بے رس[11] ہی ایسا مقام تھا جو ابتداء سلطنت وزیگا تھہ میں بنداری کی وجہ سے صحرا میں ایک سرسبز نخلستان کہلانے کا مستحق تھا۔ سپین کے سب سے پہلے اسقف کا یہی صدر مقام بنا، چوتھی صدی کے ربع اول کے شروع میں یہیں ایک مشہور دینی کونسل منعقد ہوئی جسکے قوانین اب بھی کیتھولک کلیسا میں نافذ العمل

ہیں منجملہ اور قوانین کے یہ قانون کہ تمام پادری مجرد رہیں، اسی کونسل میں وضع ہوا تھا۔ جسکو گریگوری ہفتم نے نافذ کیا۔ اسی کونسل نے نظام دینی قائم رکھنے کے لئے ایک ترکیب ایجاد کی جس کے اصل منشاء و مورد تو یہودی تھے مگر شدہ شدہ یہی ترکیب آزار و ایذا کا آلہ بن گئی۔ وہ کیا تھی؟ محکمہ احتساب و محنہ اور اسکی ایذائیں، جس میں کلیسا کی شیطنت نے بہت کچھ ایزاد کر لیا تھا اور جس نے ہزار برس سے زیادہ گزرنے کے بعد دنیا بھر کو نعرہ ہائے آہ و نالہ سے بھر دیا تھا۔ یہ شہر (الی بیرس) اگرچہ بلحاظ قدرتی فوائد اپنے روزافزوں ترقی کرنے والے ہمسایہ شہر غرناطہ سے بہت کم درجہ کا تھا مگر از روء اہمیت سیاست و تجارت بڑھا ہوا تھا۔ گاتھک امراء کی پرہیزگارانہ سخاوت نے وہاں کے اسقفیہ کو بیش قرار اوقاف سے بہت دولتمند کر دیا تھا، اور اسکے کلیسا خوبصورتی شان و شوکت میں سلطنت کے اور کلیساؤں کے مقابل تھے۔

اُس زمانہ کی بے دینی (یعنی اسلام کی طرف میلان، یا مسلمان ہو جانے) کا تعدیہ یہاں بھی پھیلا ہوا تھا۔ یہ حالت اس قسم کی تھی کہ اس میں خراج ادا کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی، اور ساتھ ہی یہ بے احتیاط اور خود مطلب بلند نظروں کے بھی بہت کچھ کام کی تھی۔ اس کا اثر مذہب مسیحی کے اس قلعہ (الی بیرس) میں بہت جلد ظاہر ہونے لگا تھا۔ ان دنوں پادریوں کے سرگروہ اسقف سموئیل تھے۔ جتنے وہ بلندپایہ عہدہ دار تھے، اُسی درجہ کی ان میں بدکاری تھی، جتنا بڑا رتبہ رکھتے تھے، اُتنا ہی اُس کو اپنی ذات سے ناپاک کیا ہوا تھا۔ ان کے ماتحت پادری بدکاری میں اُن سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سینکڑوں نفوس عیسائی مسلمان ہوئے چلے جاتے تھے۔ جو لوگ کہ کلیسا کے وفادار رہے وہ اتنے ستائے گئے کہ ان کو سواء اسکے کوئی مفر نہیں رہ گیا کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ جا کر شامل ہو جائیں۔ ان میں سے بہت لوگوں نے اپنا مذہب کسی بیہودہ وجہ تحریک پر قربان کر دیا، نہ کہ حفاظت خود اختیاری پر۔ اس طرح گروہ کے گروہ مسلمان ہوتے چلے گئے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان کے رستے میں چھوٹے درجہ کے پادریوں کے ساز دیائے اور اسقف اور ان کے رفقا کی کھلی کھلی سختیوں نے بہت آسانیاں

پیدا کردیں۔ لوگوں کو مسلمانوں نے مذہب مسیحیت سے بداعتقاد کر ہی دیا تھا؛ پادریوں نے اپنا سارا زور لگایا، اور بجاء اسکے کہ وہ مذہب مسیحی کو ترقی دیتے، عیسائیوں کو مسلمان کرا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر اس نالایق استقف کی زیادتیاں اتنی بڑھیں کہ گوارا نہ ہو سکیں؛ وہ اپنے عہدہ سے برطرف ہؤا اور اُسکی تمام تقدیس چھین لی گئی۔ جب یہاں تک نوبت پہنچی تو وہ فوراً قرطبہ پہنچا، اور کھلے طور سے اُس نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا۔ اسکے بدلے میں اُس کو عیسائیوں کو تکلیفیں دینے کا کام سپرد ہؤا۔ اُس کا معاوضہ اگرچہ بیش قرار تھا، مگر کام نہایت بدنامی کا تھا، جسکو اُس نے اُسی سختی اور تندی سے کیا جو ایک نومسلم کا بوجہہ جوش مذہبی کے خاصہ ہوتا ہے۔

امیر عبداللہ کی تخت نشینی سے بہت پہلے مولدین الویرا کی ناراضگی انتہا کو پہنچ گئی تھی؛ وہ اپنے اُجڈ ہمسایہ اشراف عرب کے برخلاف کھُلم کھلا شمشیر بکف ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غرناطہ کے یہودی موخرالاسم کے ہمدرد ہو گئے، کیونکہ وہ اُن کی ہمسائگی کی وجہ سے کئی مرتبہ تباہ ہونے سے بچے تھے۔ باغی تعداد میں زیادہ تھے، اور جرأت و دلاوری میں اپنے مدمقابل سے کم، مگر ہر ایک لڑائی کا نتیجہ ان ہی کے حق میں رہا۔ چونکہ دونوں فریق ایسے نہ تھے کہ اپنی ہٹ سے باز آجاتے، اس لئے ان جنگوں نے تباہ کن لڑائیوں کی صورت اختیار کر لی۔ ۸۸۹ء میں عارضی سی صلح ہو گئی۔ شامی اُمراء صوبہ کی دارالامارت میں گئے ہوئے تھے، مولدین کو موقعہ مل گیا، اُنہوں نے ان سب کو بازار میں قتل کر ڈالا۔ وہ طاقتور تو ہی گئے تھے، اس فعل سے اُن کا چندروزہ رعب اور بھی بڑھ گیا۔ چونکہ مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے روز بروز عربوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی تھی، اس لئے وہ تھوڑے دنوں کے لئے اپنے آپس کی پشتینی دشمنی کو بھول گئے، جسکو وہ سخت مصیبتوں کی حالت میں بھی نہ بھولتے تھے، گو اُن کے جذبات انتقام میں کبھی کمی نہ آتی تھی۔ اُنہوں نے ایک شخص سوار نامی کو اپنا سرکردہ تجویز کر لیا۔ یہ شخص بوڑھا آدمی تھا، اور اس عالم ضعیفی میں اُن کو اپنے اکلوتے بیٹے کا داغ اُٹھانا پڑا تھا، جسکو باغیوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس مصیبت

سے ساور کے دل میں رحم کا مادہ اور انسانیت کا خیال بالکل باقی نہ رہا تھا اور ان میں خونخواری سی پیدا ہوگئی تھی۔ دشمن کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرنے کو وہ جرم سمجھتے تھے، اسی خصوصیت کی وجہ سے عربوں نے ان کو اپنا سرگروہ تسلیم کر لیا تھا تاکہ ان کے ذریعہ سے ان کی کھوئی ہوئی عظمت پھر مل جائے سب سے پہلی کامیابی جو اس خونخوار سپاہی نے حاصل کی وہ مانٹ سیکرو* کی تسخیر تھی۔ یہ مقام غرناطہ کے شمال میں واقع تھا۔ مولدین کو یہیں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اسی جنگ میں شیخ کا اکلوتا بیٹا کام آیا تھا۔ باوجودیکہ وہاں مولدین کے چھ ہزار آدمیوں کی جمعیت حفاظت کے لئے تھی، مگر ایک ایک کر کے سب مارے گئے۔ اپنی کامیابی سے عربوں کا دل بڑھا اور جذبۂ خونخواری کو ترقی ہوئی، شیخ نے اپنی خونریزی کی پیاس کو خوب ہی بجھایا؛ ان کا وہ رعب بیٹھا کہ بہت سے شہروں نے خود بخود اطاعت قبول کر لی اور شیخ کو ہاتھ بھی نہ ہلانا پڑا لیکن مطیع ہونے کے یہ معنی نہ تھے کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی جاتی۔ خونریزی بدستور جاری رہی۔ جو مولد اپنی بدقسمتی سے عربوں کے ہاتھ آیا وہ جیتا نہ بچا۔ جس کسی پر ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ اس میں گاتھک یا اسپین کے خون کی ایک بوند بھی ہے تو اس کا فوراً مارا جانا یقینی تھا؛ یہاں تک کہ اپاہج آدمی بھی، جنکو دیکھ کر آدمی کو رحم آ ہی جاتا ہے، اس قتل عام سے نہ بچے۔ بڑے بڑے معزز اور نمود کے خاندان، جن کے تعلقات کا رومیوں اور گاتھکوں کے زمانہ تک کا پتہ ملتا تھا صفحۂ دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔

یہ مصیبت ایسی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولدین کا نام و نشان مٹ کر رہیگا۔ آخر باغیوں نے مجبور ہو کر اس عربی گورنر سے مدد مانگی، جس کی اطاعت سے وہ پہلے انکار کر چکے تھے اور اسکو خراج دینا انہوں نے بند کر دیا تھا۔ جب گورنر کو ان کے خلوص کا اطمینان ہو گیا تو وہ بہت بڑی جمعیت لے کر اس خوفناک شیخ کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ عربوں کو ایک فیصلہ کن فتح ہوئی، سات ہزار مقتولین کی لاشوں سے میدان جنگ پٹ گیا، اور گورنر دشمنوں کے

---

* MONT SACRO.

ہاتھ میں قید ہو گیا۔

شیخ کی اس کامیابی کو دیکھ کر بہت سے ہمسایہ شہروں نے اُن سے دوستی کرنی چاہی جن میں کیلٹراوا اور جین بھی شامل تھے۔ مولدین جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے ازسرِ نو امیر سے بیعت کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن اس وقت امیر اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ وہ اُن کی قرار واقعی مدد کر سکتے۔ خزانہ شاہی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اس فوج کی بھی تنخواہ ادا نہ کر سکتا تھا جو دار الخلافہ کی حفاظت کر رہی تھی۔ خود امیر عبداللہ کی ذاتی خوبیاں ایسی نہ تھیں کہ لوگوں کو اُن سے ہمدردی ہوتی یا رعایا کو اپنے بادشاہ کی حمایت کا جوش آتا، اور یوں خلوءِ خزانہ کی کچھ تلافی ہو جاتی۔ صوبوں کے والی عملی طور سے بالکل خود مختار بادشاہ بنے بیٹھے تھے۔ قرطبہ میں عربوں کے کُلھاء سر سبد رہتے تھے، اور اُن سب کو شیخ اور اُن کے رفقاء کے ساتھ اس معاملہ میں ہمدردی تھی کہ وہ مولدین کو تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ اس کام کو وہ کفار دشمن کے ساتھ جہاد سے بھی زیادہ ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ امیر دل سے چاہتے تھے، مگر یہ نہ کر سکتے تھے کہ اپنی بد قسمت رعایا کی باختیارات خود مدد کر سکیں؛ اس لئے انہوں نے ثالث بالخیر ہونے کے کم خطرناک کام کو ترجیح دی۔ چنانچہ انہوں نے شیخ اعراب کو کئی شہر دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ وہ امیر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں، اور نو مسلموں کو ستانا چھوڑ دیں۔ چونکہ اس میں سراسر فائدہ ہی فائدہ تھا اس لئے مان لیا گیا، دونوں فریق نے بیعت کر لی؛ فتنہ و فساد رفع ہو گیا، اور کئی برس کے بعد پہلی دفعہ البیرا کو سکون و اطمینان کی برکات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔

من چلے شیخ کو میدانِ جنگ اور تماشا گاہِ مقاتلہ کی عادت پڑ گئی تھی؛ وہ ملکی قانون کی غلامی اور فوجداری حکام کی پابندی کی وجہ سے بےحس و حرکت سُست پڑے پڑے گھبرا گئے۔ جو حصۂ ملک کہ ابن حفصون نے لے لیا تھا، اور جس پر وہ مطلق العنان حکومت کر رہے تھے، اسکی سرحد صوبۂ البیرا سے ملتی تھی۔ شیخ اپنی طمع پر غالب نہ آ سکے اور انہوں نے مولدین کے اس مشہور مربی (ابن حفصون) کی طرف توجہ کی۔ مشرقی اندلسیہ کی وادی اور گانودوں میں وہی آفت

برپا ہوئی جسکی نظیر وینڈال کے حملہ کے بعد نہیں ملتی۔ شیخ کی رعایا میں جتنے مولدین تھے اُن کو اپنے بھائیوں سے ہمدردی تھی اُنہوں نے شیخ کے حملوں کی اپنے بھائیوں سے مدافعت کو گویا اپنا ہی کام سمجھا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ جاکر شامل ہوگئے نتیجہ یہ ہوا کہ عرب شہر سے نکال دیئے گئے اور ہر طرف اُن کا تعاقب کیا گیا۔ مجبور ہوکر عربوں نے عارضی طور پر غرناطہ میں جاکر پناہ لی ٭

یہ پہلا موقعہ ہے کہ اِلویرا کی خانہ جنگی میں قلعہ الحمرا کا نام تاریخ کے صفحات آتا ہے۔ یہ قلعہ بہت ہی پرانا تھا۔ رفتح کے کم از کم ایک صدی کے بعد اہل عرب اُسکو قلعتہ الحمرا (لال قلعہ)* کہنے لگے تھے۔ اسکی زرد ودر دو رنگ پڑتی تھی اور اسکو ایسی جگہ بنایا گیا تھا جو قدرتاً بہت ہی مضبوط تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ سلطنت قرطاجنہ میں اس جگہ ایک قلعہ تھا، مگر جس طرح آج کل الحمرا نے تمام پہاڑی کو احاطہ کیا ہوا ہے اُن دنوں نہ تھا، بلکہ جہاں کوئی جگہ مرتفع تھی وہیں برج بنا دیا گیا تھا۔ اور اُن کا رُخ اُس حصہ کی طرف نہ تھا جسکو آج کل "القصبہ" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ قلعہ یہودیوں کا بنایا ہوا ہے اس لئے اس سے تعصب چلا آتا تھا۔ اسی وجہ سے نہ سلطنت وقت نے اس کی طرف توجہ کی، نہ باشندگان شہر نے پروا کی، اسی لئے یہ یادگار سلف تبرک یوں ہی بے مرمت پڑا رہا۔ اتنا ضرور ہوتا رہا کہ لوگ اپنی حفاظت کے واسطے اس میں پناہ لے لیتے تھے، مگر مدافعت کے لئے اپنے تہور کا تماشا گاہ اس کو کسی نے نہیں بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف فریقوں کی مسلسل لڑائیوں میں اس کا برابر محاصرہ ہوتا رہا، اور تباہیاں تو ایک طرف ان محاصروں کی آفت سے یہ قلعہ اور بھی کھنڈر ہو گیا تھا، اور اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ کوئی وہاں سے دشمن کا مقابلہ کرسکے۔ عربوں کی موجودہ نازک حالت میں ایک ایک آدمی کی جانبازی کی ضرورت تھی کیوں کہ کہیں سے کمک کی امید ہی نہ تھی۔ اسمہ یوں ہی عجیب چیز ہے

---

*عجیب بات ہے کہ دہلی کا شاہجہانی قلعہ بھی "لال قلعہ" ہی کہلاتا ہے۔ ان دونوں قلعوں نے ایک دوسرے سے دُور المشرقین پر مسلمانوں کی شوکت کی آخری مشعل کو بجھتا دیکھا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ ابتدا کیلئے تھا اور یہ انتہا کیلئے" (مترجم)

اُس پر اہلِ عرب کا دور رس تخیل نے پرسہا گہ تھا۔ وہ ہر چیز اور ہر بات سے بُری یا بھلی فال لینے
کے عادی تھے۔ اُن کی خوش قسمتی کہ جس دن محاصرین کی فوج بیس ہزار کی تعداد میں آئی اور اُن پر
حملہ کرنے والی تھی اُس روز تمام اچھے ہی شگون ہوئے۔ شیخ ایک عیار آدمی تھے؛ اُنہوں نے
بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی فوج کی زد کو ترکیبیں اور چالیں چل کر روکنا چاہا۔ لڑائی ہو رہی تھی
ہر شخص ہمہ تن اسی میں مصروف تھا کہ شیخ بے خبری میں کچھ چیدہ آدمی لے کر نکلے اور اپنی اس چھوٹی
سی جمعیت سے حملہ آوروں کے عقبی حصہ فوج پر آ پڑے۔ یہ دیکھ کر مولدین کی فوج گھبرا اُٹھی اور
اُن کے پیر اُکھڑ گئے۔ شیخ کی فوج نے الویرا کے شہر تک اُن کا تعاقب کیا۔ مولدین کی فوج بالکل
تباہ ہوگئی۔ تمام صوبہ میں سوگ پڑ گیا؛ کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اپنے ایک دو آدمیوں کو نہ روتا ہو؛
کوئی سپاہی ایسا نہ تھا جو اپنے ایک آدھ ساتھی کا غم نہ کرتا ہو۔ سخت ذلت و خواری کی حالت میں
جو کچھ فوج بچ رہی تھی اُسی سے دار الامارت کے بچانے کا فکر کیا گیا؛ حالانکہ چند گھنٹہ پیشتر یہ
امید تھی کہ اس شہر میں فتحیاب ہو کر داخل ہوں گے۔ عربوں کو اس کامیابی سے بڑا گھمنڈ پیدا ہوگیا؛
جو اس قوم کی خصوصیت تھی۔ شیخ کی شہرت تمام اندلس میں پھیل گئی۔ اُن کے کارناموں کو دونوں
فریق کے شعراء نے ولولہ انگیزانہ نظم کیا؛ جن میں اپنے اپنے فریق کی رعایت کی جھلک پائی جاتی
ہے۔ اس قسم کی نظمیں اکثر دلچسپ ہوتی ہیں؛ کیونکہ مورخین بعض وقت تسلی بخش حالات بیان نہیں
کرتے تو نظمیں اُن کا معاوضہ کر دیتی ہیں۔ اپنے جوش میں آکر شعراء مفصل واقعات بیان کر جاتے
ہیں؛ اور جن لوگوں نے کارنمایاں کئے ہوتے ہیں اُن کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے
ایک مورخ کے لئے یہ نظمیں نہایت مفصل اور قیمتی بن جاتی ہیں۔

دل شکستہ مولدین نے اب اپنے آپکو بالکلیہ ابن حفصون کی حمایت میں دے دینے کا
قصد کر لیا۔ ابتک اُنہوں نے اُن سے مدد نہیں مانگی تھی؛ اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن
حفصون نے بھی اب تک نہ اُن کے موافق توجہ کی تھی نہ مخالف۔ بلند نظر قاید نے
نہایت خوشی سے اُن کا حامی بننے پر رضامندی ظاہر کی؛ جو اُن کے منشا کے عین مطابق تھی۔

اُن کو چونکہ ہر مہم میں کامیابی ہو چکی تھی اس لئے اُنھوں نے اپنے اوپر اعتماد کر کے میدان جنگ میں عربوں کے مقابلہ میں آنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر مولدین کو پھر شکست ہوئی؛ ابن حفصون بری طرح زخمی ہوئے! اُنھوں نے اپنی آنکھ سے اپنے اُن کار آزمودہ لوگوں کو قتل ہوتے دیکھا جن پہ اُن کو بہت زیادہ بھروسہ تھا اور کئی مہموں میں وہ آزمائے جا چکے تھے بمشکل تمام وہ کسی طرح اپنی جان لے کر بھاگے اور کوہستان رونڈا میں روپوش ہو گئے ۔

جو بات کہ مولدین میدان جنگ میں حاصل نہ کر سکے تھے وہ اب اُنھوں نے خدعتہ الحرب سے پالی۔ شیخ اور اُن کی فوج کو اُنھوں نے ایک کمینگاہ میں جا پھنسایا اور سب کو ذبح کر ڈالا۔ عادت انسانی ہے کہ جب وہ اپنے وحشیانہ جذبات کی مشق زندہ آدمی پر نہیں کر سکتا، تو مُردوں کو مسخ کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی البیرا کی عورتوں نے عربوں کی لاشوں کو اس بُری طرح مسخ کیا کہ جسکے خیال سے بھی گھن آتی، اور روح کانپتی ہے۔ درندوں کی طرح آپس میں لڑ لڑ کر اُنھوں نے اپنے ستانے والوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا؛ بعضوں نے تو اُن کے بعض اعضا چبا ڈالے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی مردم خواری کر کے عربوں اور اُن کی رعایا نے اکثر اپنا انتقام لیا ہے؛ زمانۂ قبل از اسلام کی نظموں اور روایات سے اس کا اکثر پتہ لگتا ہے؛ اسکی ایک نمایاں مثال جنگ اُحد کے واقعات میں ملتی ہے۔ اسکے علاوہ اسکی بہت سی نظیریں اُن خانہ جنگیوں میں ملتی ہیں جو خلافت مشرقی و مغربی میں بعض وقت مسلسل و متواتر رہی ہیں خصوصیات انسانیت و آدمیت کو اس طرح بعض وقت خیر باد کہا گیا کہ جن کو سن کر وحشیوں کو بھی شرم آئے اُن لوگوں کا تو کیا ذکر ہے کہ جو عمرانی دنیا میں رہتے اور تمدن و تہذیب سے واقف تھے ۔

البیرا میں جو فساد و عناد اور فقدان امن امان تھا وہ اپنی آپ ہی مثال نہ تھا بلکہ اُس حالت کا ایک نمونہ تھا جو تمام جزیرہ نمائے اندلس میں جاری و ساری تھی۔ اشبیلیہ میں باغی اعراب محض بادشاہ وقت کی نافرمانی میں کبھی نو مسلموں سے مل جاتے تھے اور کبھی اُن کے خلاف ہو جاتے تھے باشندگان کے اس دارالسلطنت کی بنیاد کچھ ایسے وقت میں پڑی تھی کہ وہ ہمیشہ ہی جنوبی سپین کا دارالسلطنت

بنا رہا۔ گو اور شہر بھی برائے نام دارالامارت بنے، لیکن اس "ملکۂ اندلس" کو جس طرح اہالی قرطاجنہ و گاتھ کے زمانہ میں دارالامارت بننے کا فخر رہا، اسی طرح اس نے عربوں کے زمانہ میں اپنی اس شہرت کو قائم رکھا جس کا وہ ہر طرح مستحق تھا۔ اسکی قدرتی خوبیاں بے نظیر تھیں، یورپ کے نہایت سرسبز و شاداب علاقہ میں واقع تھا۔ ممالک مشرقیہ کے خزانے دریاء وادی الکبیر اسکے دروازوں پر لاکر ڈالتا تھا۔ چونکہ وہ ہمیشہ سے اپنی سلطنت کے اسقف کا مستقر رہا تھا، اس لئے عیسائی اسکو ایک عجیب تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چونکہ تجارت کے لئے یہ مقام نہایت موزوں تھا، اس لئے بہت سے بڑی خاندان یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ مختلف اقوام اور مختلف خاندانوں کے اختلاط نے وہاں کے باشندوں میں ایک عجیب خصوصیت پیدا کردی تھی، جوہر ذاتی کی ترقی کے لئے یہاں ایک غیر معمولی سامان تھا؛ جوہر دماغی کے لئے یہ سرزمین قدرت الٰہی کا ایک نمونہ تھی۔ یہاں کے رہنے والوں کی ادبی قابلیت اور حاضر جوابی کی خوبیوں پر ایک یہ خرابی تھی کہ سیاسی معاملات اور مذہبی عقاید میں وہ مذبذب متلون تھے، اسی لئے اُن پر اکثر اعتراض ہوتے رہتے تھے، جو اُن کے باعث بدنامی ہوتے تھے۔ جیسے ہی اُن کو مسلمان ہونے کے فوائد معلوم ہوئے اُنھوں نے بکزبان ہو کر صداقت اناجیل سے انکار کردیا۔ اُن کے صدق نیت کا یہ انعام دیا گیا کہ اُن کے لئے بڑی شاندار مسجد بنادی گئی، لیکن روزانہ فرائض اسلام کی ادائیگی، یا زبان عربی کی مزاولت، یا لباس کی تبدیلی نے اُن کی اُن نمایاں قابلیت دماغی پر کوئی اثر نہیں ڈالا کہ جو خانگی زندگی اور بارہ سو برس کی روایات اُن میں پیدا کر چکی تھی۔

وہی قومی تعصبات اور قومی دشمنی، جو مولدین اور عربوں کے درمیان میں البیرا میں تھی، وہی کیفیت شبیلیہ کی تھی صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں اُن کی درمیانی نفرت نے خون ریزی تک نوبت پہنچائی تھی۔ قانون شکن اعراب الزرافہ[11] کے سرسبز علاقہ پر قابض تھے، جو وادی الکبیر کو گھیرے ہوئے تھا؛ چونکہ ان نومسلموں کو ان کا قرب بہت ہی خطرناک معلوم ہوتا تھا اس لئے وہ پوری مدافعت کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے اس کے لئے ایک باقاعدہ جمعیت قائم کی گئی؛

اُسکے تمام ارکین کا فرض تھا کہ جب وہ بلائے جائیں کارزار کے لئے حاضر ہوں۔ یہ جمعیت اپنے نظام اور فرائض میں آج کل کے ملیشیا* سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔

امراء اشبیلیہ کے طاقتور شیوخ دو قبیلوں یعنی بنو خلدون اور بنو حجاج کے مسلّمہ سرگروہ تھے دارالامارت اندلسیہ کے گردونواح کا نہایت قیمتی اور زرخیز علاقہ اُن کی جاگیر میں تھا۔ عربوں کو جو تعصب تجارت اور استعمال آلات سے تھا۔ اُس میں ایک حد تک کمی آگئی تھی، یمن کے بدوؤں کی مغرور اولاد جہازوں کو کرایہ پر چلانا، مال تجارت کی خرید و فروخت کرنا، اور آلات حرب کا بنانا اور بیچنا، اور اُس سے روپیہ پیدا کرنا اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ ان نفع بخش ذرائع کی آمدنی اُن کے باغات کی آمدنی کے ساتھ مل کر اُن کی حیثیت کو اتنا بڑھائے ہوئے تھی کہ جس شان وشوکت سے وہ رہتے تھے اسکے سامنے دربار قرطبہ کی شاہانہ شان وشوکت بھی ماند پڑی ہوئی تھی۔ یہ شاہانہ زندگی بسر کرنے والے امراء اپنے اجداد کی روایات بادیہ نشینی پر اس قدر ثابت قدم تھے کہ وہ اپنا زیادہ وقت اُن مقامات میں گذارتے تھے جو انہوں نے گاؤں میں بنا رکھے تھے شہروں میں بھی اُن کے مکانات اور عملہ وفعلہ نہایت شان وشوکت کا رہتا تھا، یہاں وہ صرف جمعہ کے دن آتے تھے کہ جمعہ کی نماز بھی پڑھ جائیں، اور آنکھوں کو چوندھیا دینے والے بھڑکدار لباس اور اپنا تجمل دکھلا کر لوگوں کو اپنا حاسد اور اپنے اوپر معترض بنا جائیں۔

یہ مشہور بات ہے کہ انسان کا دولتمندی اور ترفہ کی طرف میلان اُس کے جذبات بلند نظری اور آزادی کو بجاء بڑھانے کے کم کر دیتا ہے۔ اس کا قابل ذکر استثناء اگر کہیں نظر آتا تھا تو اشبیلیہ کے عربی اشراف میں۔ یہ لوگ ملک محروسہ بھر میں سب سے زیادہ دولتمند اور عیش پرست تھے اور باوصف اسکے نہایت تنگدل جنگ آور اور خودراء بادیہ کے عیوب، جو بدوؤں کے خمیر میں تھے یعنی خانہ جنگی اور بادشاہ کی نافرمانی (جس کے یہ معنی تھے کہ اگر ایک طرف وہ آقا تھے تو دوسری طرف غلام) تمام میدہاء امن وامان پر غالب ہتے تھے۔ جو لوگ کہ شہروں سے باہر یعنی گانوؤں میں رہتے تھے

MILITIA *

اُن کی طبیعتوں میں فتنہ و فساد کی طرف میلان زیادہ تھا کیونکہ ایسے لوگوں میں نمایاں طور پر عقل کی کمی ہوتی ہے اور تعصبات کی زیادتی۔ ان لوگوں کی مشہور و معروف خصوصیات یہی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی جگہ اپنی زندگیاں گذارتے ہیں جہاں اغراض و مقاصد کا تصادم، بے وجہ دوا دوش، بلند نظری، روز روز کے تبدل و تغیر اور شہری زندگی کے تکلفات کی مصیبت نہیں ہوتی۔ اعراب اشبیلیہ اپنے الزراقہ کے رہنے والے بھائیوں کی بے صبری کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے ہم قبیلہ ہونے کی محبت و شفقت اور آبائی غرور بھی اُن کی اس حرکت سے اعراب اشبیلیہ کو خوش ہونے دیتی تھی لیکن بلحاظ تعداد و اقتدار رؤساء الزراقہ کی قوت ناقابل اعتنا تھی۔ گاؤں کے رہنے والے شرفاء کی تعداد، قوت، غلام، مزارعین سب کچھ اتنے تھے کہ اُن کے مستقر دارالسلطنت معلوم ہوتے تھے۔

اگرچہ اُن کو بڑے بڑے عوے تھے مگر ان میں بہت سے شرفاء کا خون، بوجہ کفار کے ساتھ تعلقات تجارت کے ناپاک ہو چکا تھا۔ بنو خلدون کے شجرۂ نسب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں باہر کی عورتیں اتنی آگئی تھیں کہ حضر موت کا خون اُن میں بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا بنو حجاج اپنے ناتھالی سلسلہ میں وزیگاتھ کے شاہی خاندان کو شامل کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کے خون میں عیسائیوں کا میل بہت زیادہ تھا مگر اُن کے عادات و خصائل کی خشونت کم نہ ہوتی تھی۔ اُن میں وہی باغیانہ خیالات تھے جو اُن وحشی بدوؤں کے تھے جو اب تک ایام جاہلیت کے بتوں کو پوجے چلے جاتے تھے، اور مکہ و مدینہ کے آتے جاتے قافلوں کو لوٹتے رہتے تھے۔

اشبیلیہ کے اعراب کے سرکردہ ایک شخص کریب نامی تھے جو خاندان بنو خلدون کے شیخ تھے۔ سیاسی سازشیں کرنے، نافرمانی دکھلانے، اور اپنے قبیلہ کی آبرو قائم رکھنے کی ضد میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ وہ سالہا سال سے تنہائی میں آزادی کے خواب دیکھا کرتے تھے، اور اُس کو وہ جبر و تشدد اور مقابلہ و مقاتلہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ فتنہ و فساد پھیلانے میں وہ اپنی ذاتی اغراض کی پروا کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو بادشاہ وقت سے بلا وجہ نفرت تھی،

اور یہ جنون تھا کہ زمانہ اسلام سے پہلے کی آزادیاں پھیلا دیں۔ اس خوفناک شر انگیز شخص کا یہی حال زندگی تھا، حالانکہ یہ ظاہر تھا کہ وہ اپنی جاگیر و جائداد کو اگر اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے تو محض بادشاہ وقت کی عنایت سے۔ مگر بغض و کینہ و تعصب نے اُن کے دل کو اتنا تاریک کر دیا تھا کہ وہ اس کی پروا بھی نہ کرتے تھے۔

شہر والوں نے کریب سے بدسلوکی کی تو وہ باشندگان مضافات کی طرف متوجہ ہوئے الزراعۃ میں اُن کا اثر اتنا وسیع، اور اُن کے مقاصد اتنے پسندیدہ تھے کہ بہت جلد وہ اس قابل ہو گئے کہ وہ جارحانہ پیش قدمی کریں۔ بہت سے مقتدر عربی اور بربری شیوخ نے اُن کو مدد دینے کا وعدہ کیا۔ صوبہ اشبیلیہ کی قیمتی لوٹ مریدہ کے بربریوں اور اُن قزاقوں کے سامنے پیش کی گئی جو سیرا مورینا میں جمع ہو گئے تھے۔ ایک اشارہ پاتے ہی یہ بے رحم وحشی، غیر محفوظ دہاقین کے کھیتوں اور گھروں پر ٹوٹ پڑے۔ بیچارے محنتی گنوار تعجب اور خوف سے یہ دیکھ رہے تھے کہ لمحہ کے لمحہ میں اُن کی مدت العمر کی کمائی لوٹ لی گئی، اُن کے گھروں کو آگ لگا دی گئی، اُن کے بیٹوں کو سفاکی کے ساتھ قتل کر ڈالا گیا، اور اُن کی بیویوں اور لڑکیوں کو کنیزک بنا لیا گیا۔ جیسے ہی دشمنوں کی آمد کی خبر معلوم ہوئی صوبہ دار نے تمام ہمسایہ سرداروں کو اپنی فوج کی امداد کے لئے بلا لیا ان ہی لوگوں میں کریب بھی تھے، انہوں نے برابرہ سے پہلے ہی اسکے متعلق کہہ کہا تھا، چنانچہ جیسے ہی اُن کو موقعہ ملا وہ وہاں سے بھاگ گئے۔ پہلے ہی حملہ میں باغیوں نے کامل فتح پائی، علاقہ کو اپنی مرضی کے موافق لوٹا، اور مریدہ کی طرف لوٹ آئے۔ مگر مضافات اشبیلیہ کو ایک مفتوح علاقہ کی صورت میں چھوڑ آئے، جس پر وہ آفتیں توڑی گئیں جس سے زیادہ وحشت بے رحمی نہیں کر سکتی۔

اس کامیابی کی خبر ہر ایک قطاع الطریق اور قزاق کے گھر میں پہنچ گئی۔ اگرچہ یہ لوگ ایک مدت سے اس امر سے واقف تھے کہ بادشاہ وقت نہایت کمزور ہے، اور اسکے پاس کافی فوج نہیں ہے لیکن اُن کی اب تک یہ ہمت نہیں پڑی تھی کہ اشبیلیہ جیسے بڑے بڑے شہروں کے پاس پہنچ

آکر بھٹکیں۔ اُن کی ترکتاز صرف دور اُفتادہ پورگوں اور اُن شاہراہوں تک محدود تھی جو مختلف صوبوں کے دارالاماروں کو سمندر سے ملاتی تھیں۔ اب تو اُنکے جذبات قتل و غارت کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ ہر چہار طرف سے ہتھیار لگائے ہوئے بدمعاش اور مجرم جنکو بچپن سے بے رحمی کرنے اور لوٹنے کھسوٹنے کی عادت پڑی ہوئی تھی ایک ایک کرکے، یا گروہ کے گروہ بنا کر اشبیلیہ کی طرف سیل کی طرح چلے آرہے تھے۔ تمام ملک میں ایک آفت برپا ہوگئی۔ کاشتکار اپنا گھر بار چھوڑ اور اپنے بال بچوں کو لے کر دارالسلطنت میں بھاگ آئے۔ یوسٹ ہینیا اور البیٹرے میڈورا کے طاقتور سردار امیر کی بیعت کا جُوا تو پہلے ہی اپنے کندھوں سے اُتار چکے تھے مگر اس وقت تک وہ اسی پر قانع تھے کہ برسوں سے اپنا اپنے علاقوں کی آزادی قائم رکھے ہوئے ہیں؛ اب یہ بھی دوڑ پڑے کہ لوٹ مار میں شریک ہوجائیں۔ باغی ابن مردان، جنکی ترک و تاز کے حالات بیان ہوچکے ہیں، اندلسیہ میدان میں باڈا جوز کے آدمیوں کی بہت سی جمعیت لے کر میدان میں اُتر آئے *

مختلف صوبوں کے والی بھی ویسے ہی نالائق تھے، جیسے کہ اُن کے آقا۔ وہ اس قابل ہی نہ تھے، یا یہ نہ چاہتے تھے کہ اس فتنہ و فساد کو روکیں۔ اگرچہ بظاہر حالت بالکل مایوسانہ تھی لیکن ابن غالب نے، جو اسے سی جا[12] کے رہنے والے مولد تھے، اس طرف توجہ کی اور اپنی قابلیت اور ہمت سے تمام اندلسیہ میں چند روز کے اندر اندر نسبتاً امن قائم کردیا *

جس قابل نفرت قوم کو ایک بدگُن فریق کے تعصبات تباہ کردینا چاہتے تھے، اُس کے ایک فرد نے جو یہ کام کرکے اپنا اقتدار قائم کرلیا تو یہ شرفاءِ عرب کو بالخاصہ ناگوار ہوا۔ دو رقیب گروہوں میں جو کشمکش ایک طرف اپنی ہستی کے قائم رکھنے اور دوسری طرف اقتدار بڑھانے کے لئے ہورہی تھی وہ اب اتنی بڑھ گئی کہ دونوں میں صلح و صفائی ناممکن ہوگئی۔ شہروں میں ایک فتنہ برپا ہوگیا۔ امیر کی کھلم کھلا توہین ہونے لگی۔ آخر دربار و دفتر شاہی میں گروہ عرب کو فتح ہوئی اور ابن غالب کو اُن کے دشمنوں کے دغا و فریب نے نفرت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا؛ یعنی اُنہوں نے اپنے آقا کے اغراض و مقاصد کی حفاظت میں اپنی جان دیدی *

اُن کی موت کی خبر جو اشبیلیہ میں پہنچی تو وہاں لوگ شمشیر بکف ہو گئے۔ اشراف عرب سے اُن کے نقیض نے عوام الناس کو اُن کا ہمدرد بنا دیا تھا۔ اُن کی ہر دلعزیزی کے بہت سے باعث تھے۔ وہ خود نو مسلم تھے، اور اُن کے سیاسی اغراض شہر کے بیشتر لوگوں سے وابستہ تھے اُس صوبہ کے بہت سے آدمیوں نے اُن کے علم کے نیچے کام کیا تھا۔ اُنہوں نے شاہراہوں پر سے قزاقی بالکل موقوف کرا دی تھی۔ اُن ہی کی سخت تدابیر سے تجارت کو فروغ ہو گیا تھا، اور ایک حد تک ساکھ قائم ہو گئی تھی۔ نہ صرف اُن ہی کے فریق نے، بلکہ اُن لوگوں نے بھی، جو کسی پالیسی کی وجہ سے اب تک بے تعلق رہے تھے، اُن کے قاتلوں کے سر طلب کئے۔ شہر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو غیظ و غضب سے دیوانے ہو رہے تھے۔ والی اپنے ہی محل میں محصور تھا۔ یہ بغاوت ایسی تھی کہ اس کے نتائج بہت ہی بُرے نکلنے والے تھے، سلطنت کو اسکے دبانے کے لئے اپنا سارا زور لگا دینا پڑا۔

جن لوگوں نے کہ ہتھیار اُٹھائے تھے، یا جن پر اس بغاوت میں مدد دینے یا ہمدردی رکھنے کا ذرا سا بھی شبہ تھا، اُن کو سخت سزائیں دی گئیں۔ گروہ مولدین کے سرکردہ، جو شہر کے نہایت نمود کے تاجر تھے، قتل کر ڈالے گئے، یا اُن کا کوئی عضو کاٹ ڈالا گیا۔ بہت سے بدقسمت، جو مخالفین کے اندھے جوش و خروش کے ڈر سے نکل بھاگے تھے، اُن کو تعاقب کرنے والوں نے قتل کر ڈالا۔ اُن کے گھروں کو وحشی سپاہیوں کے رحم، اور اُن کے حرموں کو فوجیوں کی بدکاری کے حوالہ کر دیا گیا۔ گروہ مینا کے بڑے بڑے آدمیوں نے، جو خود رحم کرنا نہ جانتے تھے، اپنا تمام زور خرچ کیا تب جا کر کہیں اُن کے ہمسایوں کا یہ قتل عام بند ہوا۔ لیکن اصل فساد چند ہی روز کے لئے بند رہا۔ دونوں مخالف گروہوں کے جبر و تشدد نے قاتلانہ کشمکش پھر شروع کرا دی۔ آخر دربار شاہی کی کمزوری کی وجہ سے یہ صوبہ عربوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا، جن وحشی لوگوں کو رحم چھو بھی نہ گیا تھا، اور جو انسان یا خدا کے بنائے ہوئے قوانین کی پروا نہ کرتے تھے، اُنہوں نے جو جو ستم ناروا کئے اور جو جو ایذائیں مخلوق الٰہی کو پہنچائیں، اُن کو لکھتے ہوئے تاریخ کانپ اُٹھتی ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اشبیلیہ کے تمام مولدین کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ ان مصائب کا اتنا گہرا نقش جزیرہ نماء اندلس پر پڑا کہ جنوبی سپین کے افسانوں

اور کتابوں میں اس وقت تک اُن کا ذکر چلا آتا ہے۔

اب عربی گروہ کی فتح کامل ہوگئی۔ توازن اقتدار جاتا رہا، قرطبہ کے عیسائیوں نے قیاس لگایا کہ مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ قریب آ لگا ہے۔ اُنہوں نے ابن حفصون سے سازوباز کرنی شروع کی کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اُن کا اثر و اقتدار اتنا ہے کہ وہی اُن کے ناجی بن سکتے ہیں۔ ابن حفصون کو جو کچھ فوائد اس سے حاصل ہوسکتے تھے اُس سے وہ غافل نہ تھے۔

ابن حفصون اپنی قابلیت کو جانتے تھے، اُن کو اکثر مہمات میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، جزیرہ نما کے نہایت دولتمند حصّہ کے وہ معناً مالک تھے، اُن کے ساتھی اُن کے ایسے گرویدہ تھے کہ گویا اُن کے غلام تھے، ان وجوہ سے اُن کو یہ شوق پیدا ہوا کہ کسی طرح وہ مطلق العنان حکومت حاصل کرلیں۔ اسی کو مدنظر رکھ کر اُنہوں نے ایک سفارت بڑے قیمتی تحایف لے کر عباسی نائب السلطنت افریقیہ کے پاس اس غرض کے ظاہر کرنے کے لئے بھیجی کہ اگر اُن کو امیر اندلس بنا دیا جائے تو وہ خلافت بغداد کا باجگزار رہنا منظور کرتے ہیں۔ ابن حفصون کی یہ درخواست بغداد بھیج دی گئی، اُن کو یہ اُمید دلائی گئی کہ وہ بہت جلد اپنا مطلب حاصل کرلینگے۔

یہ منحوس تدبیر خفیہ نہیں چلی گئی تھی کہ دربار شاہی کو اسکی خبر نہ ہوتی۔ امیر عبداللہ نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ اُن کا تاج و تخت سخت مخدوش حالت میں ہے، اس میں کچھ شک نہ تھا کہ عباسیوں کے اس باجگزار نے جو شرط کی ہے اُس سے یہ باغی ضرور فوراً مستفید ہوگا، اُس کی طاقت گو حصول سلطنت کے لئے غیر مکتفی ہو مگر اُسکو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ حدود دار الخلافۂ قرطبہ کے باہر امیر کے اختیارات تسلیم نہیں کئے جاتے تھے، محل شاہی بے ایمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک چالاک اور بے وفا گروہ شہر میں پھیلا ہوا تھا، جو دم دم کی خبر دشمن کو پہنچاتا تھا، اور سخت بے صبری کیساتھ اُس موقعہ کا منتظر تھا کہ وہ اپنی مفتوحانہ ذلت اور ایذادہی کا بدلہ لے لے۔ حالت مایوسی میں امیر نے دشمن سے صلح کرنی چاہی مگر بیکار، جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اُنہوں نے فوج کشی کا قصد کرلیا، لیکن شاہی اُن کے اس ارادہ کو سُن کر بہت پریشان ہوئے اور اُنہوں نے امیر کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا،

مگر امیر نہ مانے وہ اوہام پرستی کے اقتضا اور اپنے جرائم کے خیال سے بدقسمت امیر عبداللہ کی طبیعت بہت ہی پست ہوگئی تھی لیکن مایوسی نے پھر ان کی ڈھارس بندھائی اور آخر ان میں پھر ہمت جرأت پیدا ہوگئی۔ جب ابن حفصون کو یہ خبر پہنچی کہ امیر نے اپنے ذلیل خیالات نامردی کو چھوڑ کر تلوار ہاتھ میں لینے کا ارادہ کیا ہے تو وہ ایسے متحیر ہوئے کہ انہیں کسی طرح اس خبر پر اعتبار نہ آیا لیکن جب ان کو یہ بتلایا گیا کہ دشمن کی فوج میں نقل و حرکت شروع ہوگئی، خیام شاہی سقندہ میں نصب کر دیئے گئے ہیں اور امیر کی تشریف آوری کا انتظار ہے تو ان کا شک رفع ہوا۔ اور وہ اسکو اپنی فتح کا پیش خیمہ سمجھے۔ باغیوں کی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی ان میں وہ آزمودہ کار لوگ شامل تھے جو فوجی چھاؤنی کو اپنا گھر سمجھتے تھے، سوا لڑائی کے کسی بات میں ان کی تفریح نہ ہوتی تھی اور سوا اپنے سپہ سالار کے حکم کے کسی قانون کو نہ جانتے تھے۔ امیر کی فوج کی تعداد بمشکل تمام چودہ ہزار تھی۔ ان میں سے ایک تہائی تو امیر کے محافظ تن ہی تھے، باقی نئے بھرتی کئے ہوئے سپاہی، جنکی ہمت و وفاداری کا ابتک امتحان نہ ہوا تھا۔

دونوں فوجیں اگیولر[13] کے پاس صف آرا ہوئیں۔ امیر کے ناتجربہ کار سپاہی چاہے پہلے کتنا ہی تذبذب کیوں نہ دکھا چکے ہوں، مگر اس وقت تو دشمنوں کے مقابلہ میں انہوں نے منہ نہیں موڑا۔ اس واسطے اور بھی مرنے مارنے پر تل گئے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ شکست کے معنی یقینی موت ہے کیونکہ ابن حفصون کسی کو پناہ دینا جانتے ہی نہ تھے۔ لڑنے والے سپاہیوں کے دل اماموں اور علماء کی تقریروں نے بڑھائے، جو وہ نڈر ہو کر بغیر ہتھیار لگائے ہوئے، اس گھمسان کی لڑائی میں خود شامل ہوئے۔ غرض امیر عبداللہ کی سپاہ ایسی بے جگر ہو کر لڑی کہ انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں دشمن کی صف کو توڑ دیا۔ ایک مرتبہ قدم اکھڑا تو پھر کیا تھا، وہ ہر طرف کو پریشان ہو کر بھاگے، متعاقبین نے لاکھوں کشتوں کے پشتے لگا دیئے، ابن حفصون قید ہوتے ہوتے بچے، اور بمشکل تمام اپنے پہاڑوں میں پہنچ گئے۔

امیر عبداللہ نے اگیولر پر قبضہ کیا تو اسکے ساتھ ہی بہت سے ہتھیار، خزانہ اور اسباب حرب بھی ان کے ہاتھ آیا۔ بہت سے نومسلم، جو عیسائی ہوگئے تھے انہوں نے ازسرنو مسلمان ہونے پر موت

کو ترجیح دی، چنانچہ ایک ہزار آدمیوں کا سر اُتار دیا گیا۔ اس فتح کا جو اخلاقی اثر پڑا وہ نہایت اہم اور وسیع تھا۔ اسے سی جا بہت ہی تھوڑے مقابلہ کے بعد فتح ہو گیا۔ آرچی ڈونا اور جین از خود فاتحین کے رحم کے طالب ہو گئے۔ اُدھر نائب السلطنت افریقیہ نے بوباسٹر کے بد قسمت باغی کو اطلاع دیدی کہ خلیفۂ بغداد کا حکم ہے کہ اُن کی امارتِ اندلس منظور نہیں کی جا سکتی۔ ہر گروہ کے امن پسند لوگ جن میں شرفا، تاجر، بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک، صنّاع اور کاشتکار شامل تھے، تھوڑی دیر کے لئے اس سے تو مطمئن ہو گئے کہ جس مہم سے ناامیدی تھی وہ کچھ تو بارور ہوئی، لیکن جو آس پیدا ہوئی تھی۔ وہ بعد کے واقعات سے یاس سے مبدل ہو گئی۔ ابن حفصون کو جو ہزیمت ہوئی تھی وہ محض عارضی تھی، اُس سے نہ اُن کی شہرت اور ہر دلعزیزی کو چنداں نقصان پہنچا، نہ لوگوں کی گرویدگی کم ہوئی۔ بہت ہی تھوڑی کوشش میں اُنھوں نے، ایک حد تک، اقتدار پھر قائم کر لیا جو شہر کہ اُن کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ وہ پھر اُنھوں نے بدغا و فریب یا بجبر لے لئے۔ امیر کی طرف سے جلنے والی مقرر تھے اُن کے بعض اعضا کاٹ دیئے گئے، تاکہ امیر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کے عہدہ دار باغی تھے اور ایک غاصب کے ملازم۔ اعراب غرناطہ کو ایک بڑی لڑائی میں شکست ہوئی، اور ان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے جاتا رہا۔ ابن حفصون کا اثر و اقتدار بہت ہی بڑھتا جاتا تھا کہ اُنھوں نے ایک غلطی کی جس نے اُن کے سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیا، یعنی اُنھوں نے دین اسلام کو چھوڑ دیا، یہ ایسا بُرا فعل تھا کہ عیسائیوں میں اُن کی کچھ عزت نہیں بڑھی، اور مسلمان اُن سے سخت ناراض ہو گئے۔ اگر اُن کو بیسیوں شکستیں بھی ہوئیں تو اُن کو اتنا نقصان نہ پہنچتا، جتنا کہ ارتداد سے۔ امیر عبداللہ کے آخری نو برس ایسے گذرے کہ اُن میں زیادہ فتنہ و فساد نہیں ہا۔ اشراف عرب نے جو امداد سلطنت کو دی اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو وابستگان دولت امارت ہی سمجھتے ہیں، اس سے امیر کا بھی اقتدار کچھ بڑھ گیا۔

آئے دن کی خانہ جنگیوں نے جزیرہ نماء اندلس کی سیاسی و تمدنی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ فرقہ بندی عملی طور پر ختم ہو گئی تھی مختلف گروہوں کے سرکردے، بجز ایک شخص کے، یا تو عمر طبعی

پر پہنچ کر ختم ہو گئے، یا بیماری میں مبتلا ہوئے، یا قتل کر ڈالے گئے۔ نمک حرامی کی جو اصل بنا تھی اُسکو لوگ بھول بسر گئے۔ مذہب کی وجہ سے جو فسادات ہوتے تھے وہ براءنام رہ گئے۔ پہلے تو لوگ خود مختار ہونے کی کوشش کرتے تھے، اب اُنہوں نے قزاقی پیشہ اختیار کر لیا۔ رعایاء امارت کی حالت میں پوری پوری تبدیلی ہو گئی۔ اُن میں سے اُن کے بزرگوں کی خونخواری اور نقض امن کی خواہشات نکل گئیں۔ بادشاہ وقت کے جور و ظلم کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا، کیونکہ امیر اتنے درماندہ ہو گئے تھے کہ اُن کی کمزوری اور حماقت ہر جگہ بُری نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ایک دوسرے مخالف فریق میں جو دشمنی باقی رہ گئی تھی وہ ظاہری تھی، نہ کہ حقیقی۔ مہمات فوجی میں پہلی سی سختی نہ رہی تھی، بلکہ سُستی آ گئی تھی۔ مقابلہ ہوتے تھے، مگر بغیر خونریزی کے ختم ہو جاتے تھے۔ چونکہ فتنہ و فساد کسی وقت بھی کم نہ ہوتے تھے، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ملک کی معمولی حالت یہی ہُوا کرتی ہے۔ اختیارات شاہی میں جو ایک طرح کی قوت حیات تھی اُسی کو یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ ہر قسم کی نمک حرامیوں کا مقابلہ کر سکیگی۔ کیونکہ یہ دیکھا جا چکا تھا کہ ہزاروں جانیں اس بے سود کوشش میں ضائع کر دی گئیں کہ اُس سلطنت کو غارت کر دیا جائے جو نہ اپنی فوج کی شجاعت پر قائم تھی، نہ ارکین سلطنت کے جوہر دماغی پر، نہ رعایا کی محبت و گردیدگی پر۔

رعایاء جب سخت مصایب اُٹھا چکی تو ہوش آیا، اور یہ سوچا کہ بادشاہ کی اطاعت اور امن و امان کے قائم رہنے میں سراسر فائدے ہی فائدے ہیں۔ نافرمانی اور شرارتوں کا نتیجہ سواء مصیبت کے کچھ نہ ہُوا۔ موجودہ خاندان شاہی کے بانی کے بڑے بڑے کارنامے اور آثار جو پہلے زمانہ کے ترفہ اور نامورى کی نشانیاں تھیں، وہ اپنے گرد و پیش دیکھتے تھے۔ وہ اصول جنکو اُن کے آباؤ اجداد اپنے لئے نہایت اہم سمجھتے تھے، وہ اُن کی نگاہ میں بے معنی نہیں ہوئے تھے۔ یہ خیالات پہلے اُن لوگوں میں پیدا ہوئے جن کے تجارتی اغراض کو نقصان پہنچا تھا۔ بہت سے صوبوں کے دار الامارت خود بخود امیر کے مطیع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اور شہروں نے بھی اُن کی تقلید کی۔ یہاں تک کہ پہاڑی علاقوں میں بھی اطاعت شاہی کے خیالات پیدا ہو گئے۔ بدامنی اور نقصان نے وہ نتائج پیدا کئے

جو جبر نہ پیدا کر سکا تھا مسلمانوں کے ایک نہایت کمزور بادشاہ کے انتظامات ملکی میں وہ امن و امان پیدا ہو گیا جو بڑے بڑے جوہر داغی اور بڑی بڑی خوبیاں رکھنے والے بادشاہوں سے نہ ہو سکا۔

باوجود ان تمام اندرونی فتنہ و فساد کے جو صلح کہ دربارہائے قرطبہ اور اُدیڈو میں ہو چکی تھی اُس میں کوئی فرق نہیں آیا، نہ اُن کے درمیان میں کوئی بڑا مناقشہ پیدا ہوا۔ اسی وجہ سے سلطنت اسلامی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہر چیز اور بات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک اُن خرابیوں سے بچ گیا ہے کہ جنہوں نے رعایا کو اتنا پریشان اور سلطنت کو اتنا دق کر رکھا تھا، کہ یکایک امیر عبداللہ کو اُنہتر ۶۹ برس کی عمر میں پیغام اجل آگیا۔

اس زمانہ کے مسلسل خونین واقعات پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان ہی سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مغربی یورپ میں مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے کیا سبب تھے۔ امیر عبداللہ کے تاریخی حالات کا بیان کرنا گویا باغی ابن حفصون کے حالات لکھنا ہیں۔ مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگرچہ یہ بلند نظر شخص عقیل آدمی تھا، مگر اُس کی شہرت کا باعث اتنی اُس کی قابلیت نہیں ہوئی، جتنی کہ اُس کے دشمنوں کے درمیانی تنازعات و مناقشات۔ تعصبات مابین القبایل کا یہ نتیجہ ہوا کہ قزاقوں کا ایک گروہ فتنہ و فساد پر کمر بستہ ہو گیا، حالانکہ اُسکی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی، کہ ایک دستۂ فوج اُسکو زیروزبر کر ڈالتا۔ جذبات نافرمانی متعدی ہو گئے دور افتادہ صوبوں کے گورنروں نے بیعت توڑ دی، سلطنت کی آمدنیوں کے جتنے ذرائع تھے وہ سب خراب و خستہ ہو گئے، بار بار کے مصایب نے رؤساء کے اُن مشکوک جذبات نمک حلالی کی جڑوں کو ہلا ڈالا، جن کی وحشت انگیز روایات نے اُن کے خیالات باطل کو مدد دی، اور آزادی کی طرف مایل کیا، جس کا حاصل ہونا خود مشتبہ تھا، تخالف مذہبی کی آگ ہر گروہ میں مشتعل ہو گئی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ سلطنت، جو عملی طور پر رعایا سے محروم تھی، گور کنارے پہنچی ہوئی ہے۔ بادشاہ کے خصایل، ایک حد تک، ان تمام خرابیوں کی باعث ہوئے، جو ان کے زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے امیر کی ذات میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی کہ لوگ اُن کا احترام کرتے، دوست اُن کے

ہوتے، اور دشمن اُن سے ڈرتے۔ امیر عبداللہ دورویہ چال چلنے والے، ریاکار اور ڈرپوک آدمی تھے۔ انہوں نے بھائی کو قتل کر کے تخت حاصل کیا تھا۔ جرم برادرکشی اُن سے ایسی حالت میں سرزد ہوا کہ اُن کا گناہ اور بھی بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنے دو بیٹوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ وہ قابل اعتماد نہ تھے، اگر انہوں نے اپنے حلیفوں کو دھوکا دیا تو دشمنوں کے ساتھ بھی وفا نہ کی۔ انہوں نے اپنے اُن وفاداروں کی نصائح اور افہام و تفہیم کو نہ سنا، جن کی نمک حلالی محک امتحان پر کامل العیار اُتری تھی۔ وہ بارہا اُن غداروں کی خوشامد کے دھوکے میں آ گئے، جو متعدد موقعوں پر جھوٹے اور بے عزت ثابت ہو چکے تھے۔ نہ اُن میں سپہ سالاری کی قابلیت تھی، نہ وہ ہمت و استقلال تھا جو ایک عام سپاہی میں ناگزیر ہوتی ہے۔

اُن کی بدکاریاں اتنی مشہور ہو گئی تھیں کہ ہاجی شعراء کو ایک مضمون ہاتھ آ گیا تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ امامانِ جامع مسجد اکثر خطبوں میں اُن کا نام تک نہ لیتے تھے۔ جب ایسا بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہو تو پھر کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ امارت قرطبہ اُس آخری حد پر پہنچ گئی تھی جس کے بعد سوائے انتزاع کے اور کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ہر جگہ بادشاہ کے اختیارات متنازعہ فیہ تھے۔ بڑے بڑے شہر، مثلاً اشبیلیہ، قادیز، طلیطلہ، جیان، غرناطہ، بلنسیہ، جو کسی زمانہ میں باعث فخر و ناز تھے، اپنا اپنا نگان دارالخلافہ قرطبہ کو نہیں سمجھتے تھے۔ سر رات کو باشندگانِ قرطبہ کسی نہ کسی دہقانی کی چیخ پکار سے جاگ اٹھتے تھے، جو کسی قاتل قزاق کی تلوار سے بچنے کے لئے مدد مانگتا ہو۔ ہر رات کو لوگ شہر میں بیٹھے بیٹھے اتنی بڑی آگیں لگی ہوئی دیکھا کرتے تھے کہ جو مضافات شہر کو دوپہر کی طرح روشن کر دیتی تھیں۔ شاہراہوں پر مسافر نظر نہ آتے تھے۔ بازار خستہ حال اور خالی پڑے ہوتے تھے۔ بد امنی کی وجہ سے زراعت کا کام معطل ہو گیا تھا۔ ضروریات زندگی گویا تکلفات بن گئے تھے کہ سوائے امیروں کے کوئی اُن کو نہ خرید سکتا تھا۔ بہت سے علاقے ایسے تھے کہ بھوکوں کے مارے لوگ اپنے ہی دوستوں اور ہمسایوں کی لاشوں کو کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔ یہ افسوسناک زندگی مقتدایان دینی کی لعنت و ملامت اور

پیشینگوئیوں سے اور بھی بار معلوم ہوتی تھی۔ یہ علماء دین اپنے مخصوص طریقۂ تیقن کے ساتھ اس مصیبت عام کے ذمہ وار خود اُن لوگوں کو قرار دیتے تھے، جو اس مصیبت کے شکار ہوتے تھے، اور گنہگاروں اور خوش باشوں کو اُس غضب الٰہی کا امیدوار بناتے تھے جو ایک مدت سے معلق چلا آرہا ہے ۔
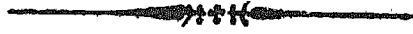
بڑی بڑی سرکش اقوام کو زیر کیا، اٹلی کو فتح کرکے بڑے زور کی حکومت کی، شاہ لعمبارڈی اور پوپ کو اپنا مطیع فرمان کیا، مذہب مسیحی کو سکینڈی نے ویا اور اسلامی علاقوں میں بجبر پھیلایا۔ بیوہ ملکاے ڈل ہیڈ کی، جو اپنی خوبصورتی میں ضرب المثل تھی، مدد کرکے اُس کو اُس کے متوفی شوہر کا علاقہ فتح کرکے دیا، اور اُس سے شادی کرلی۔ پوپ نے اس کو "شارلے مین کا جانشین" قرار دیا۔ آخری عمر گھر کے جھگڑوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت ہی تلخ گزری۔ ۹۷۳ئہ میں مرگیا۔ (مترجم)

(۱۶) نہایت افسوس ہے کہ اس قابل زیارت اسقف اعظم کا نام ونشان مصنف علام نے نہیں لکھا، ورنہ معلوم ہوتا کہ اُن سے زیادہ لائق آدمی اُس زمانہ میں یورپ پیدا نہیں کرسکا تھا۔ امیرالمومنین الناصر لدین اللہ ہزار لایق ہوں مگر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ مردم شناس تھے۔ اُن کا نامۂ زیر بحث واقعی فن ادب کا نمونہ ہوگا افسوس ہے کہ یہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ حضرت مسیح علیہ الصلواۃ والسلام نے اپنے حواریوں اور دیگر حضرات کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ "تم لوگوں کے سامنے وعظ کرنا سوروں کے سامنے موتی بکھیرنا ہیں" اسی طرح ادب کا نمونہ جرمنی کے وحشیوں کے سامنے پیش کرنا سوروں کے سامنے موتی بکھیرنے تھے۔ جو کچھ جواب ملا وہ مستبعد تھا عیسائیوں کے پاس سواء گالیاں دینے کے اور کون سی دلیل رکھی ہے۔ کیا اب تک بھی نہیں ہو رہا ہے؟ (مترجم)

(۱۷) جان ڈی گورزا = JOHN DE GORZA۔ مجھے اس کے حالات نہیں ملے (مترجم)

(۱۸) فریک سی نٹ = FREXINET ایضاً

(۱۹) ٹیورن = TURIN = شمالی اٹلی کا شہر ہے کسی زمانہ میں پیڈمانٹ کا دارالسلطنت تھا، پھر اٹلی کا دارالسلطنت رہا۔ دریاء پو اور ڈورا ای پے را کے سنگم کے قریب واقع ہے۔ آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ اس کی اہمیت ۱۵۶۲ئہ سے شروع ہوئی۔ اسی سال میں شاہ امے ڈی اس نے اس کو سیوائے کا دارالسلطنت قرار دیا تھا، اور یہاں ایک قلعہ بنا کر اس میں خود رہنے لگا تھا۔ ۱۸۰۱ئہ تک اس کو ترقی ہی ہوتی رہی مگر اس سال اہالی فرانس نے اس کو تباہ کرڈالا، اور اس کے تمام بُرج وغیرہ گرادیئے۔ بعد میں پھر اور عمارات گرائی گئیں۔ اس وقت یہ بہت خوبصورت مقام ہے۔ یہاں بہت سے گرجا ہیں، منجملہ ان کے ایک بہت بڑا ہے۔ یہاں ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں سوا لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ان میں سے دو ڈھائی ہزار قلمی

ہونگی۔ یہاں اونی، سوتی کپڑا، مخمل کی ٹوپیاں، کاغذ، چینی کے برتن، چمڑا، ہتھیار اور شراب بنتی ہے ۔ (مترجم)

(۲۰) مانٹ فراٹ = MONT FERRAT پہلے اٹلی کی ایک آزاد ریاست تھی۔ پیڈمانٹ، میلان اور جینوا کے درمیان میں واقع ہے، اب اٹلی کا ایک حصہ ہے۔ شروع صدی چہارم میں، جب فرانس کے خاندان شاہی پر تباہی آئی تو یہ ریاست بالکل ہی آزاد ہوگئی۔ یہاں کے فرمان روانے صلیبی لڑائیوں میں اپنے اتنے آدمی بھیجے کہ کسی اور ملک نے نہیں بھیجے تھے۔ اسی خاندان کے افراد یہاں تھسیلی اور یروشلم پر حکمران رہے۔ ۱۳۰۵ء میں ملکۂ قسطنطنیہ یہاں کی حکمران قرار پائی۔ ۱۵۳۳ء میں اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوا اور ۱۷۰۳ء میں بادشاہ جرمنی کے منشا سے یہ ریاست اٹلی میں مدغم کر دی گئی ۔ (مترجم)

(۲۱) پیڈمانٹ = PIEDMONT ایک زمانہ میں اٹلی کی ایک ریاست تھی، اب اسی ملک کا شمالی و مغربی حصہ ہے۔ اس کے حدود پر پہاڑ ہیں۔ یہ علاقہ بہت سیر حاصل ہے۔ بہت سے دریا ہیں، زراعت اچھی ہوتی ہے اور مختلف اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی تاریخ دلچسپ اور طویل ہے۔ ایک زمانہ میں یہ ریاست بہت اہم تھی۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ ۱۸۶۰ء سے اس کا نام ہی اڑا دیا گیا اور اس کا علاقہ مختلف اضلاع میں تقسیم کر کے اس کا نشان ہی اڑا دیا گیا ۔ (مترجم)

(۲۲) پو = PO اٹلی کا سب سے بڑا دریا۔ کوہ ایلپس کے فرانسیسی حصہ سے نکلتا ہے۔ بیس میل بہ کر میدان سطح میں پہنچ جاتا ہے۔ اس میں بہت سے دریا آکر مل جاتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۴۵۰ میل ہے۔ (مترجم)

(۲۳) لی گوریا = LEGURIA اٹلی کا وہ علاقہ جو جینوآ کے آس پاس ہے۔ اب اس کی کچھ بہت باقی نہیں ۔ (مترجم)

(۲۴) جینوآ = GENOA اٹلی میں بحر روم پر آباد ہے۔ ٹیورن سے ۷۹ میل ہے۔ سارڈی نیا کا بندر بڑا تجارتی شہر ہے۔ آبادی قریب دو لاکھ۔ قدرتی طور پر خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں کا سلح خانہ، جیل خانہ بہت اچھا ہے۔ شفاخانہ اور غریب خانہ بالخصوص قابل دید ہیں۔ یہاں کے کتب خانہ میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ صنعت و حرفت کے مدارس ہیں۔ یہی اسٹر قابل ذکر ہے۔ یہاں کے باشندے بہت محنتی ہیں۔ ملاحی کا کام خوب کرتے ہیں۔ تجارت کا خوب ملکہ ہے۔ کولمبس یہیں کا رہنے والا تھا ۔

تعلیقات باب دوازدہم

(۱) فنانہ = FINANA مجھے باوجود تلاش اس کا حال کہیں نہیں ملا۔ (مترجم)

(۲) ٹولوش = TOLOX اس نام کا کوئی مقام کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ طولوس ہو۔ مگر یہ مقام شمال میں واقع ہے۔ (مترجم)

(۳) نیابلہ = NIEBLA یہ مقام بھی کہیں نہیں ملتا۔ (مترجم)

(۴) پرائی گو = PRIEGO بشرح صدر

(۵) الی کنٹا = ALICANTA = القنت اسی نام کے صوبہ کا صدر مقام ہے۔ اس میں قدیم سلطنتہاء بلنسیہ اور مرسیہ کا بہت سا حصہ شامل ہے۔ یہ شہر سپین کے بڑے بندروں میں سے ایک ہے۔ سجی، روئی، سوتی کپڑا، غلہ، تیل، ریشم اور شراب کی یہاں سے نکاسی ہوتی ہے۔ ۱۳۳۱ء میں بھی اس مقام کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا تھا۔ ۱۷۰۹ء میں اہالی فرانس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ آبادی بیس ہزار سے کچھ زیادہ۔ (مترجم)

(۶) سنٹارم = SANTAREM پرتگال کا ایک قصبہ ہے۔ لسبن سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر دریاء ٹیگس پر آباد ہے۔ دریا ہی کے راستہ سے لسبن سے تجارت ہوتی ہے۔ آبادی نو ہزار۔ (مترجم)

(۷) باڈاجوز = BADAJOZ = بطلیوس سپین کے صوبہ ایسٹرے میڈورا کا دار الصوبہ ہے۔ سرحد پرتگال سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریاء وادیانہ پر آباد ہے۔ یہاں اس پر ۲۸ محرابوں کا پل ہے۔ بارہ ہزار کی آبادی ہے۔ یہاں ایک سقف بنتا ہے۔ گولے ڈھالے جاتے ہیں۔ صابن، موٹے اونی کپڑے، چمڑا وغیرہ بنتا ہے۔ ملک پرتگال کی کنجی سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں عروج پا چکا ہے۔ ان کے بعض آثار اب بھی موجود ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں اس پر بہت آفتیں آ چکی ہیں۔ (مترجم)

(۸) سرٹوریس = SERTORIUS = رومیوں کا ایک نہایت مشہور سپہ سالار ری پبلک کے آخری زمانہ میں تھا۔ ۸۰ ق م میں اس تباہ کن لڑائی میں لڑا جس میں رومیوں کا ایک سپہ سالار مارا گیا تھا۔ جب امراء میں گلخپ ہوئی تو اس نے ایک فریق کا ساتھ دیا۔ بقول پلوٹارک کے یہ شخص بڑا بہادر، مستقل مزاج اور

دیانت دار تھا۔ اس کے بہت سے کارنامے ہیں۔ ۸۴ ق م اس کے مخالف فرقہ نے اس سے تنگ آکر قتل کرا دیا۔ پلوٹارک نے اس کی سوانح عمری لکھی ہے اور اس کی موت کو بڑے لولہ انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ (مترجم)

(۹) نیکور = NECOUR اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا ۔ (مترجم)

(۱۰) میوٹونیہ = MUTONIA ایضاً (مترجم)

(۱۱) اوسمہ = OSMA ایضاً (مترجم)

(۱۲) کلونا = CLUNA ایضاً (مترجم)

(۱۳) جن کیورا = JUNCURA ایضاً (مترجم)

(۱۴) کانس ٹین ٹن پورفری اورجے نی ٹس = CONSTANTINE 'POR-PHRYOGENITUS - کانس ٹین ٹن ہفتم کہلاتا ہے۔ لیو چہارم کا بیٹا ہے ۹۱۲ء سے ۹۵۹ء تک قسطنطنیہ کا بادشاہ رہا۔ اس کا زمانہ حکومت فی الجملہ اچھا رہا۔ بہت ذہین آدمی تھا گو مستقل راء نہ رکھتا تھا۔ خود مصنف تھا، چنانچہ بڑی ضخیم سات کتابیں چھوڑ گیا ہے علم و ہنر کا قدرداں و مربی تھا۔ مصور تھا اور اس فن کا مبصر۔ اس کو اس کے بیٹے رومانس نے ۹۵۹ء میں زہر دے کر مار ڈالا ۔

اس کے زمانہ کا بہت بڑا واقعہ یہ سفارت ہے جو اس نے اظہار نیازمندی کے لئے امیر المومنین الناصر لدین اللہ کی خدمت میں بھیجی تھی عیسائی مورخین اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کرتے کیونکہ اس سے یورپ اور ایک مسیحی بادشاہ کی گونہ سبکی ہوتی ہے لیکن "تاریخ سب سے بڑی منصف ہے" واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔ (مترجم)

اس سفارت اور اس موقعہ پر تکلفات کی تفصیل میرے ملخص ترجمہ نفح الطیب میں ملاحظہ فرمائیے (جسکو انجمن ترقی اردو فروخت کر رہی ہے) اجمالاً اتنا عرض کرنا ہے کہ اس موقعہ پر امیر المومنین نے جو جاہ و جلال دکھلایا تھا اس کی یہ کیفیت تھی کہ عمائد تک مرعوب تھے، چہ جائے کہ یورپ کے گنوار۔ امیر المومنین نے یہ انتظام کیا تھا کہ شعراء نظمیں پڑھیں اور خطباء تقریریں کریں تاکہ رعب دوبالا ہو۔ چنانچہ شاہزادہ حکم نے فقیہ محمد عبد البر الکیسانی کو اس کام کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور خطیب بھی ایسے کہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شاہزادۂ ولیعہد

اور امیر المومنین کی صحبت میں رہتے تھے، مگر اس جلیل القدر دربار کا رعب اتنا تھا کہ وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے مگر ایک لفظ نہ بولا گیا، اور غش کھا کر وہیں گر پڑے۔ اب تردد ہوا کہ ان کی جگہ کون تقریر کرے۔ اتفاق سے مشہور و معروف ادیب و خطیب ابو علی البغدادی اسمٰعیل بن القالی صاحب امالی والنوادر مشرق سے آئے ہوئے تھے اور اس وقت دربار میں حاضر تھے (ممالک مشرقیہ میں کون ہے جو ابو علی القالی کو نہیں جانتا، اسی میں علماء ہند شامل ہیں۔ ممدوح امیر الکلام اور بحر اللغت ہیں۔ انکا نام نامی و اسم گرامی ہی ادیبوں کو مرعوب کر دیتا ہے) ان کی طرف اشارہ کیا گیا یہ کھڑے ہوئے اور بہت ہمت کر کے حمد و ثنا کرنے پائے تھے کہ ایسے دہشت میں آئے کہ چپ لگ گئی، ایک لفظ نہ بول سکے، بے ہوش ہو گئے۔ تمام دربار کو فکر لگ گیا کہ اب کس کو اس خدمت کے لئے کھڑا کیا جائے کہ منذر بن سعید آگے بڑھے اور انہوں نے وہیں سے سلسلۂ کلام شروع کیا جہاں ابو علی القالی نے چھوڑا تھا، اور نہایت خوبصورتی سے اس تقریر کو ختم کیا۔ یہ تقریر اب تک محفوظ ہے اور قابل دید ہے۔

مقابلہ کیجئے اپنی اس حالت کا موجودہ حالت سے، اس تنزل کے اسباب پر غور کیجئے، اور اگر ہو سکے تو پھر اسی حالت پر پہنچنے کی تدبیر سوچئے۔ اگر یہ نہیں تو تواریخ کا پڑھنا بیکار ہے۔

سعید ابن منذر بلوطی ہیں اور ان علما میں سے ہیں جو اندلس سے مشرق میں آئے اور یہاں بھی اپنا لوہا منوا گئے۔ نہ معلوم علامہ سکاٹ ان کو ایرانی کیوں فرماتے ہیں۔ یقیناً ان کو سہو ہوا ہے۔ یہ قرطبہ کے قاضی تھے، بہت بڑے ادیب، بہت بڑے شاعر، بہت بڑے فقیہ، بہت بڑے مصنف۔ چنانچہ ان کی بہت سی کتابیں قرآن، سنت وغیرہ اور رد علی الاہواء والبدع پر تھیں (نہ معلوم اب کوئی باقی ہیں یا نہیں) ۲۶۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۳۵۵ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ یہ "آیت من آیات اللہ" کہے جاتے ہیں۔ دین کی باتوں میں ہرگز کسی سے نہیں ڈرتے تھے یہاں تک کہ امیر المومنین سے بھی۔ چنانچہ ان کا ایک یہ قصہ مشہور ہے کہ امیر المومنین الناصر لدین اللہ اپنے حرم کے لئے ایک پر تکلف مکان مضافات دار الخلافہ قرطبہ میں بنانا چاہتے تھے۔ [illegible] مکان کا مالک یہ بچے یتیم تھے اور قاضی سعید بن منذر کے زیر ولایت تھے۔ امیر المومنین اس مکان کو لینا چاہتے تھے لیکن قاضی صاحب اسکے فروخت کرنے پر راضی نہ تھے، کیونکہ یتیموں کے لئے کوئی مکان نہ رہ جاتا تھا۔ امیر المومنین قیمت دینا چاہتے تھے، مگر کم، اور اس کے بدلے میں کوئی اور مکان نہ دینا چاہتے تھے۔ قاضی سعید نے حکم دیا کہ یتیموں کے

مکان کو کہیں کہیں سے گرادیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ امیر المومنین کو یہ سُن کر بہت غصّہ آیا، اور قاضی صاحب سے جواب طلب کیا
قاضی صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں نے خدا تعالے کے قول پر عمل کیا ہے کہ "واما السفینۃ فکانت لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبھا وکان وراءھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا" یہ سُن کر امیر المومنین چپ ہو گئے اور انہوں نے قاضی صاحب کا بہت ہی شکریہ ادا کیا۔ آہ! اب نہ وہ بادشاہ ہیں نہ وہ قاضی۔ زمانہ دگرگونہ آئین نہاد۔

تعجب ہوگا کہ اس خشونت پر آپ کے مزاج میں مذاق بھی بہت تھا۔ چنانچہ اکثر لطایف وظرایف مشہور ہیں
لطف یہ ہے کہ خیر بہت قاضی صاحب جب مذاق پر اُتر آتے تھے تو پھکڑ میں بھی تامل نہ فرماتے تھے۔

ناظرین معاف فرمائیں کہ میں نے یہ بے وقت کی شہنائی بجائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اندلس کا ایک ایک آدمی اور ایک ایک چیز اس قابل ہے کہ مسلمان اُن کو دیکھیں اور عش عش کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک مستقل کتاب رجال الاندلس کے نام سے لکھوں۔ اس کا مواد میرے پاس تیار ہے۔ مگر کس کے لئے لکھوں؟ کس کو دکھلاؤں؟ کس طرح اوروں میں شوق پیدا کروں؟ کس طرح لوگوں کو ترغیب دوں کہ اپنے بزرگوں کے حالات شاید تم میں کوئی شوق پیدا کرے۔ مجھے اخبار الاندلس کی اشاعت میں مسلمانوں کی بدمذاقی اور بدعہدی کا ثبوت مل رہا ہے اور میری جزو ورگ بن رہی ہے میرا ہی جی جانتا ہے۔

میں اس نوٹ کو قاضی سعید ابن منذر رحمہ اللہ کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں:۔

"حتی متی، والی متی اعظ ولا اتعظ، ازجر ولا انزجر، ادل الطریق الی المستدلین وابقی مقیما مع الحائرین۔ کلا ان ھذا لھو البلاء المبین۔ ان ھی الا فتنتک تضل بھا من تشاء وتھدی من تشاء (الآیہ) اللھم فرغنی لما خلقتنی لہ ولا تشغلنی بما تکفلت لی بہ، ولا تحرمنی وانا اسئالک ولا تعذبنی وانا استغفرک، یا ارحم الراحمین"

(۱۵۱) اوتھو ابن ہنری دی فاولر = OTHO SON OF HENRY THE FOWLER

جرمنی کا نہایت مشہور ومعروف بادشاہ تھا۔ ۹۱۲ء میں پیدا ہوا، اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد ۹۳۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانۂ حکومت نہایت کامیاب رہا، بڑے بڑے واقعات اس میں رونما ہوئے۔ ہر لڑائی میں وہ فتحیاب رہا

اس شہر کی ابتدائی تاریخ غیر تیقن ہے اور اس میں بہت سے افسانے ملے ہوئے ہیں۔ یہی قرار نہیں پاتا کہ قوم لنگوریا حقیقت میں کون تھی، جو ابتداءً اس مقام پر آباد تھی مختصر یہ ہے کہ یہ شہر اور اُس کا علاقہ پہلے فونیشیا والوں کے قبضہ میں رہا۔ پھر رومیوں کے پاس آیا اور اس زمانہ میں اپنے اندرونی معاملات میں آزاد رہا۔ تجارت و صنعت میں ترقی کی۔ جب رومی تباہ ہوئے تو اس کو لومبارڈ نے لیا؛ پھر فرانس والوں نے پھر جرمنی والوں نے۔ ہر حالت میں اس نے بوجہ تجارت وغیرہ کے اپنی عزت قائم رکھی۔ پسا اور وینس والے بحری تجارت میں ان کے رقیب تھے اس لئے اُن سے لڑتے رہے۔ سنہ ۹۳۵ء میں مسلمانوں نے اس پر حملہ کیا۔ اس پر اہالی جینوآ نے پسا والوں سے مل کر مسلمانوں کو کورسی کا اور سر ڈانیہ سے نکالنا چاہا۔ سنہ ۱۰۱۶-۱۰۲۱ء میں پوپ نے جینوآ کو کورسی کا دلوایا اور پسا والوں کو سر ڈانیہ؛ اس سے ان کے آپس میں خوب جنگ رہی۔ پھر انہوں نے صلیبی جنگوں میں مدد دی؛ اور اس کے بدلے میں بہت سی عنایتیں ارض مقدس میں حاصل کیں۔ آخر سنہ ۱۱۴۶ء منورقہ سنہ ۱۱۴۷ء میں المیریا اور سنہ ۱۱۴۸ء میں طرطوشہ مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لئے۔ اس کے بعد کے واقعات کے واسطے یورپ کی تاریخ ملاحظہ کیجئے ۔ (مترجم)

(۲۵) کوہ سے نس = MT CENIS کوہ ایلپس کی ایک چوٹی ہے، جو سیوائے اور پیڈمانٹ کے درمیان میں واقع ہے ۔ (مترجم)

(۲۶) کوہ برنارڈ = MT BERNARD یہ بھی ایلپس کی چوٹی ہے۔ یہاں سخت سردی پڑتی ہے۔ نوماہ برابر اس پر برف جما رہتا ہے۔ سنہ ۹۶۲ء میں سیوائے کے ایک دولتمند نے یہاں ایک مکان بنوا دیا تھا، اس میں اب تک کچھ راہب رہتے ہیں اور آیندوروند کی آسایش کی خبر رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے کُتّے پال رکھے ہیں۔ جو لوگ سردی میں اکڑ جاتے ہیں اُن کو یہ کتّے ڈھونڈھ نکالتے ہیں؛ پھر اُن کی خبر گیری یہ راہب کرتے ہیں ۔ (مترجم)

(۲۷) سوٹنزرلینڈ = SWITZERLAND اس کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ ہر طالب علم جانتا ہے۔ اس کی تاریخ بیان کرنی ضروری نہیں ۔ (مترجم)

۲۸ کانس ٹینس کی جھیل = LAKE CONSTANCE سوٹنزرلینڈ میں کوہ ایلپس کے

دامن میں ہے۔ دریاء رائن اسی میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کا طول ۴۴ میل عرض ۹ میل اور عمق ۹۶۴ فیٹ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یکایک پانی بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ اس کے گرد کاشت خوب ہوتی ہے۔ شکار بہت ہے ۔ (مترجم)

(۲۹) نائیس ۔ NICE کوہ ایلپس کے دامن میں ایک شہر فرانس کی عملداری میں ہے۔ خوش فضا اور صحت افزا مقام ہے۔ بیمار اکثر جا کر یہاں رہتے ہیں۔ دوسری صدی قسام میں رومیوں کے ہاتھ میں آیا۔ پھر گاتھ، برگنڈی والوں، وزیگاتھ، نوابان آرلس، بادشاہان نے پلس کے ہاتھوں میں رہا۔ آخر میں نوابان سیوا کے پاس ۱۸۶۰ء تک رہا۔ اب فرانس کے پاس ہے ۔ (مترجم)

(۳۰) ڈافی نے ۔ DAPHINE جنوب مغرب فرانس میں واقع ہے۔ رومیوں کے ختم ہونے کے بعد یہ علاقہ سلطنت برگنڈی کی انتہاء جنوبی حد رہا۔ پھر فرانسیسیوں کے ہاتھ آیا۔ اُن سے جرمنی والوں نے ۱۰۳۲ء لیا۔ آخر میں پھر فرانس کے پاس آ گیا ۔ (مترجم)

(۳۱) لیوٹ پرانڈ ۔ LUITPRAND مشہور مصنف مورخ ہے۔ دسویں صدی کے تاریخی واقعات اسی شخص کی تحریرات سے ماخوذ ہیں۔ ۹۲۲ء میں پیدا ہوا۔ شاہ لیوگو نے اس کو تعلیم دلوائی۔ ۹۷۰ء میں مر گیا ۔ (مترجم)

(۳۲) گرے نوبل ۔ GRENOBLE فرانس کا پرانا خوبصورت شہر ہے۔ اس کی دوہری فصیل ہے۔ ایک مضبوط قلعہ بھی یہاں بنا ہوا ہے ۔ (مترجم)

(۳۳) کیپ ری ۔ CAPRE بحر روم کا ایک نہایت دلکش جزیرہ موجودہ شہر نیپلس سے تیس میل جانب جنوب واقع ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ میل ہے۔ اس کے مناظر و مرایا نہایت دلکش ہیں اور زمانۂ قدیم کے آثار ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر تاریخی جگہ ہیں۔ اس میں دو ودرّے ہیں، اور دو پہاڑوں اور اُن کی ترائی میں تمام آبادی ہے جس کی تعداد چھ ہزار ہے۔ آگسٹس اور ٹی بیریس کے زمانہ میں اس کو بہت شہرت نصیب ہوئی اور اُس زمانہ کے تمام تکلفات اس پر خرچ ہو گئے۔ رومیوں کے حماموں اور پلوں وغیرہ کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ ان میں سے بارہ بڑے بڑے محلوں کے آثار بھی ہیں، جو بارہ دیوتاؤں کے نام پر ٹی بیریس نے بنائے تھے۔ اس بادشاہ نے

اپنی زندگی کے آخری دس برس یہاں نہایت عیش و عشرت اور ظلم و ستم میں گزارے تھے شہر کے مغرب میں ایک مشہور کھوہ ہے، جو اندر سے بہت ہی خوبصورت مقام قابل دید ہے۔ اس شہر میں اب تو مچھیارے ملاح، چند سوداگر، شراب کشید کرنے والے کلال رہتے ہیں اور بس ۔ (مترجم)

۳۴ سائے بیرس = SYBERIS یہ شہر کروٹون کے ساتھ وابستہ ہے۔ دونوں یونان میں ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ پہلا ۷۲۰ ق م اور دوسرا ۷۱۰ ق م آباد ہوا۔ ان کے متعلق جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شہر بہت ہی جلد بڑھے، اور دولت و طاقت میں بہت ہی جلد ترقی کی۔ جس جزیرہ نما میں یہ واقع ہیں اُس میں ہر طرف اُن ہی کا زور بیٹھ گیا اور اپنی بستیاں بسائیں لطف یہ ہے کہ دونوں میں صلح و موافقت رہی۔ سائے بیرس چھ میل میں اور کروٹون بارہ میل میں آباد تھا۔ پہلا اگر اپنے انتہائے تکلف و تعیش میں مشہور تھا تو دوسرا مردانہ کھیلوں میں۔ فیثا غورس یہاں مدتوں رہا ہے۔ وہ حکومت میں بڑا اقتدار رکھتا تھا۔ جمہوریہ کے ایک سرکردہ موسومہ ٹیلیس نے وہاں کی حکومت کو خراب کرکے پانسو آدمیوں کو نکال باہر کیا، اور خود شہر پر قبضہ کر لیا جلاوطنوں نے کروٹوں میں جاکر پناہ لی ٹیلیس نے اُن کو طلب کیا اور نہ دینے پر جنگ چھیڑ دی۔ کروٹوں کی طرف سے ایک لاکھ فوج تھی اور دوسری طرف سے تین لاکھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہالی کروٹوں کو شکست ہوئی اور شہر کا نام و نشان مٹادیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سائے بیرس کی عظمت بھی ختم ہوگئی ۔ (مترجم)

(۳۵) انطاکیہ۔ یونانی بادشاہان شام کا دارالسلطنت۔ اس نام کے سولہ شہر شاہ سیلوکس نکاٹر نے آباد کئے تھے، اُن میں سب سے زیادہ شاندار یہی تھا اس کا جاء وقوع بھی نہایت عجیب تھا تھے۔ دریاء اورُن ٹیس کوہ لبنان سے نکلتا ہوا اُس کے قریب سے گزرتا ہے اور اس کے منظر کو دلکش بناتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس کے بندر پر ممالک مغربیہ کے تمام شہروں کا مال تجارت آتا تھا۔ دوسری طرف ممالک مشرقیہ کے مال کی منڈی بنا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے پیچھے صحراء افریقیہ ہے، جس میں سے ہو کر عراق اور عرب کے قافلے گزرتے تھے۔ ابتداء میں اس شہر کا ایک حصہ ایک جزیرہ میں آباد تھا، مگر اب وہ جزیرہ ناپید ہوگیا! باقی حصہ کچھ میدان سطح میں تھا، اور کچھ پہاڑ کے نشیب میں پہاڑ کا یہ ڈھلوان انگوروں کے باغات سے ڈھکا ہوا تھا، اور دریا کی سمیت اب تک تمام میوے کے درخت

چلے آتے ہیں۔ زمانہ قدیم کے لوگ انطاکیہ کو "حسین" "تاج مشرق" وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے تھے دنیا بھر کے تکلفات اور سامان عیش یہاں جمع تھے عمارات نہایت شاندار تھیں اُن کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ شروع زمانۂ سلطنت روم میں یہ شہر آج کل کے پیرس کی برابر تھا، زمانہ مابعد میں بھی بادشاہان روم اس کی شان و شوکت بڑھاتے رہے قسطنطنیہ کے آباد ہونے اور دار السلطنت بننے سے بھی اس کی عظمت کم نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ ضرور ہوا کہ ممالک مشرقیہ کا سب سے بڑا شہر نہ رہا مگر مذہب مسیحی کا عہد ہو گیا، بہت سے بڑے بڑے گرجا بن گئے، کئی مذہبی کونسلیں یہاں منعقد ہوئیں۔ آخر اس کی تباہی انطاکیہ والوں ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مذاق اُڑانے اور پھبتیاں کہنے میں مشہور تھے خسرو شاہ ایران نے ملک شام پر ۵۳۸ء میں حملہ کیا، اور جب وہ انطاکیہ کے پاس سے گزرا تو یہاں کے لوگوں نے حسب معمول اُس کا مذاق اُڑایا۔ یہ دیکھ کر ایرانیوں کو غصہ آیا اور اُنھوں نے اس کو بالکل تباہ کر ڈالا لیکن جسٹینیں نے اس کو پھر آباد کیا۔ اس کے بعد سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس پر ساتویں صدی میں قبضہ کیا نویں صدی میں یونانیوں نے اس کو پھر لے لیا، لیکن ۱۰۸۴ء میں مسلمانوں نے پھر اس کو لے لیا۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے اس کا محاصرہ کر کے ۳ جون ۱۰۹۸ء میں اس کو فتح کیا تیرھویں صدی میں بادشاہ مصر نے اس کو الحاق کر لیا۔ اس وقت جو شہر ہے اُس میں زمانۂ قدیم کی کوئی عمارت نہیں؛ البتہ ایک قلعہ ہے جو صلیبی "بہادروں" نے بنایا تھا، اور جسٹینیں کے زمانہ کی فصیل کچھ باقی ہے۔ بیرون شہر رومیوں کے کچھ آثار ہیں۔ مکانات عموماً پتھر کے ہیں صنعت و حرفت برائے نام آبادی سات اور آٹھ ہزار کے درمیان ہے (مترجم)

(۱۳۳) جب قاضی منذر نے دیکھا کہ امیر المومنین تین متواتر جمعوں کی نماز میں شریک نہیں ہوئے تو انھوں نے ارادہ کیا کہ بذریعہ وعظ و تذکیر امیر المومنین کو اس انہماک سے خوف دلائیں اور توبہ کرنے اور خداء تعالٰی کی طرف رجوع ہونے کی طرف مایل کریں چنانچہ جب وہ چوتھے جمعہ کے روز مسجد میں آئے تو قاضی صاحب نے خطبہ کو خداء تعالٰی کے اس قول سے شروع کیا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ

اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ o (کیا بسا لیتے ہو تم بیچ ہر زمین نرم کے ایک نشانی کھیلتے ہوئے اور بنا لیتے ہو تم مکان کاریگری کے تو کہ تم ہمیشہ ہو اور جس وقت پکڑتے ہو تم پکڑتے ہو تم سرکش ہو کر۔ پس ڈرو اللہ سے اور کہا مانو میرا۔ اور ڈرو تم اُس شخص سے کہ مدد دے تم کو ساتھ اُس چیز کے کہ جانتے ہو تم مدد دی تمکو ساتھ چارپایوں کے اور بیٹوں کے اور باغوں کے اور چشموں کے تحقیق میں ڈرتا ہوں اوپر تمہارے عذاب دن بڑے کے سے) ۔

پھر اس کے ساتھ ہی یہ آیت شروع کی مَتَاعَ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی اس کے بعد اُنہوں نے مکانات کے مضبوط بنانے، اُن کی خوبصورتی میں مستغرق ہو جانے اور خرچ عمارات میں اسراف کرنے کی مذمت دلنشیں الفاظ میں کی۔ اسی سلسلہ میں اُنہوں نے یہ آیت پڑھی اَفَمَنْ اُسِّسَ بُنْیَانُہٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اُسِّسَ بُنْیَانُہٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ o (کیا پس جو شخص کہ بنیاد رکھے عمارت اپنی کی اوپر پرہیزگاری کے اللہ کی طرف سے اور رضامندی کے بہتر ہے یا جو شخص کہ بنیاد رکھے عمارت اپنی کی اوپر کنارے گھاٹی کرنے والے کے پس لے گرا اُس کو بیچ آگ دوزخ کے اور اللہ نہیں ہدایت کرتا قوم ظالموں کو) اور اس کے ساتھ وہ باتیں کہیں جو تخویف موت اور اُس کی تکلیف کو یاد دلاتی تھیں، اور اس دار فانی میں زہد کرنے کی تشویق کرتی تھیں۔ اس شوق کے چھوڑنے اور توبہ کرنے کی طرف توجہ دلائی، لذات دنیا کے انہماک سے بچنے کی ہدایت کی اور نفس کو اُس کی خواہشوں کے موافق چلنے دینے کے عیوب بیان کئے۔ اس خصوص میں اُنہوں نے آیت حدیث و آثار سب ہی کچھ بیان کئے۔ اس بیان پر سب لوگ رو رہے تھے۔ امیر المومنین بھی شرمندہ ہوئے اور بہت ہی روئے، اور خدا کے غضب سے پناہ مانگی لیکن دل میں قاضی منذر سے بہت ناراض ہوئے ۔

واپس آئے تو اپنے بیٹے اور ولیعہد الحکم سے قاضی صاحب کی شکایت کی اور کہا کہ قاضی منذر کے خطبہ کا مخاطب سوا میرے اور کوئی نہ تھا، اُنہوں نے مجھ پر سخت زیادتی کی اور میری ذلت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ مجھے اس طرح نصیحت کرنے میں اُنہوں نے سیاست ملک کا بھی خیال نہ رکھا۔ اُن کا لہجہ ایسا سخت تھا کہ قریب تھا کہ وہ اپنے عصا سے مجھ پر حملہ کر بیٹھیں۔" امیر المومنین نے قسم کھائی کہ اب میں اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھونگا چنانچہ اُنہوں نے جامع مسجد زہراء ہی میں

نماز پڑھنا شروع کردی۔ ایک روز الحکم نے عرض کیا کہ "جب آپ قاضی منذر سے اس قدر ناراض ہیں تو انہیں معزول کر دیں"۔ یہ سن کر امیر المومنین بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ "قاضی منذر جیسے عالم کو معزول کرنا سخت حماقت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم ولیعہدی سے معزول ہو مگر قاضی منذر معزول نہیں ہو سکتے۔ مجھے خداء تعالے سے شرم آتی ہے کہ میرے اور نماز جمعہ کے درمیان میں منذر جیسے باورع وصدق آدمی شفیع نہ ہوں۔ مجھے اس وقت رنج تھا کہ میں نے قسم کھالی تھی۔ مجھے اپنی قسم کا کفارہ دینا آسان ہے۔ جب تک میں اور وہ زندہ ہیں اور ان کے ساتھ ان ہی کے پیچھے نماز پڑھونگا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ میں ان سے ناراض نہیں ہوں"۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بڑی پرتکلف دعوت کی اور تمام علماء اور بالخصوص قاضی صاحب کو مدعو کر کے ان سے معافی مانگی۔ قاضی صاحب "خو سے لاچار تھے کچھ وعظ بھی فرمائے گئے"۔ اس موقعہ پر بھی نہ چوکے اور پند و نصیحت کرتے رہے۔ مگر وہ ہمارے مطلب سے خارج ہے ٭

مسلمانو! یہ تھے آپکے بادشاہ، اور یہ تھے آپکے علماء۔ غالباً آپ میں سے بھی اکثر قاضی صاحب کو سخت بدتہذیب اور گستاخ کہینگے لیکن اگر غور کیجئے تو دنیا میں ان لوگوں کا وہی درجہ ہے اور رہا ہے جو گھڑی میں فنر کا ہے اس کے ساتھ ہی نعوذ باللہ من علماء السوء ٭ (مترجم)

(۳۷) **زخرفۃ العرب**۔ یہ پچی کاری کی ایک قسم ہے جس کا بہترین نمونہ آگرہ کے تاج محل میں نظر آتا ہے ہونے کو تو یہ فن مصری انجینیروں کی ایجاد ہے مگر اس میں عربوں نے ترقی کی اور کمال کو پہنچایا۔ مصریوں کے زخرفۃ العرب میں انسان اور حیوانوں کی تصاویر ہوتی تھیں ان کو مسلمانوں نے ناجائز سمجھ کر چھوڑ دیا اور پھول، پتی، بیل، بوٹے، پھل پر اکتفا کیا۔ اندلس والوں نے اس فن کو کمال پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے نمونے اگر کسی خوش قسمت کو دیکھنے ہوں تو اب بھی جامع مسجد قرطبہ میں دکھلائی دیتے ہیں، اور جا بیوں کے غرناطہ کی الحمراء میں وہ یقیناً ایسے ہیں کہ تاج محل کو آدمی بھول جائے۔ اندلس ہی سے یہ یورپ میں پھیلے اور "زخرفۃ العرب" کے نام سے موسوم ہوئے۔ عیسائی اس کو جناب پوپ کے محل میں لے گئے۔ یوں مسلمانوں نے اتنے بڑے کفرستان کو فتح کیا۔ آپ آگے پڑھینگے کہ اس محل کے رو کار پر کلمۂ توحید لکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جاہل عیسائی یہ سمجھے کہ یہ بھی زخرفۃ العرب ہے یوں نادانستہ خود عیسائیوں نے اپنے ہاتھ سے

پوپ کے محل میں مسلمانوں کا علَم گاڑ دیا۔ اب جو ہوش آیا ہے تو اس کو چھپا یا جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ پر سفیدی پھیر دی گئی ہے، مگر علامہ سکاٹ کا یہ دعوے ہے کہ وہ اب تک موجود ہے +

چونکہ زہر فتنہ الحرب کا اس کتاب میں اکثر ذکر آئیگا اس لئے بصیرت کے لئے اتنا ذکر کر دینا کافی ہے (مترجم)

(۳۸) ابو ایوب عتّاب بن ہارون بن عتّاب بن بشر الغافقی۔ شارونہ کے رہنے والے تھے۔ اپنے والد اور دیگر حضرات سے حدیث کی روایت کرتے تھے ۳۵۱ھ ہجری میں مشرق کی طرف سفر کیا، اور ۳۵۲ھ میں حج کیا۔ مکہ شریف میں ابوبکر محمد ابن احمد بن موسیٰ الانیاطی، ابو حفص الجمحی، ابو محمد الطوسی اور ابو الحسن الخزاعی سے حدیث شریف سُنی۔ مصر میں ابوبکر ابن الحدّاد التینسی وغیرہ سے روایت کی۔ بہت سے علماء نے آپ کے پاس شذونہ آکر علم حاصل کیا۔ حضرت امام مالک رح کے مذہب کے موافق فتوے دیتے تھے۔ مطالعہ بہت وسیع رکھتے تھے۔ اکثر علماء کو آپ کے وفور علم کا اعتراف تھا۔ مشہور تھا کہ آپ مستجاب الدعوات تھے ربیع الاول ۳۱۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۶ شعبان ۳۸۱ھ ہجری کو انتقال فرمایا۔ ظہر کی نماز کے بعد دفن ہوئے۔ (ملخص از ابن الفرضی)

اگر مسلمانوں کی چشم عنایت ہوئی تو "رجال الاندلس" میں تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ انشاء اللہ تعالےٰ (مترجم) +
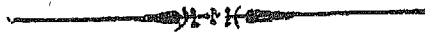
حکم ثانی کی تخت نشینی پر باشان و شکوہ مراسم۔ اُن کی دانشمندانہ و دُور اندیشانہ تدابیر۔ اور ڈوئوں کی حاضری دربارِ خلافت۔ عیسائیوں کے خلاف کامیاب فوج کشی۔ افریقیہ میں فتنہ و فساد۔ خلیفہ کی فوج کو شکست۔ اُمرائے بربرہ کو خراب کر کے اُن کی فوج کا موقوف کر دینا۔ بحیثیت دینی مرکز ہونیکے قُرطُبہ کی اہمیت۔ جامع مسجد کے حالات۔ الحکم ثانی کی رحلت۔ اُن کی علمی قابلیت۔ علوم کی سرپرستی۔ اُنکا کتبخانہ علوم کے خزائن۔ تعلیم عام۔ رفاہِ عام کی ترقی۔ خلیفہ الحکم اپنے زمانہ کے تہذیب و تمدن کا مجسم نمونہ تھے۔ سلطنت کا ترفہ۔

جو لوگ کہ مسلمانوں کے طرزِ حکمرانی کے نقایص سے واقف نہیں ہیں اُن کے نزدیک تو امیر المومنین الناصر لدین اللہ عبدالرحمٰن ثالث کے انتقال کے وقت اندلس میں سلطنت عربی اس قدر قوی تھی کہ کسی اندرونی یا بیرونی دشمن کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس پر حملہ کرے۔ اُس بیدار مغز بادشاہ کے کمال قابلیت نے ایک وقت خاص تک اُن اختلافات کو دبائے رکھا جو قبائل کی باہمی عداوت اور مذہبی مباحث سے پیدا ہوئے تھے۔ زر آشنا اجیروں سے ایسی فوج تیار ہو گئی۔ جس میں نمک حرامی اور فتنہ انگیزی کا مادہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا؛ اُن کو باغیانہ خیالات کے لوگوں سے بالکل علیحدہ رکھا گیا؛ یہی اُن کی وفاداری کی پوری ضمانت تھی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ

اس پالیسی پر ہمیشہ عمل ہوتا رہیگا، جسکو ایک بڑے سیاست دان بادشاہ نے قائم کیا تھا۔ ملکی انتظام لائق اور تجربہ کار وزراء کے ہاتھ میں تھا سلطنت کی آمدنی اتنی تھی کہ اُس زمانہ کے کسی دولتمند ترین بادشاہ کی بھی نہ تھی۔ جس طرح مادی دنیا میں کشش اتصال کا قانون ہے کہ قوی ضعیف کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے، وہی کیفیت سیاسی کششات کی ہے ہمسایہ سلطنتوں اور خلافت مغربی کے درمیان میں اتنے قومی قومی تحرکات کی ایک خلیج حائل تھی کہ جس سے یہ امید ہی نہ ہوسکتی تھی کہ وہ انسان کے دل و دماغ کو آغشتہ کریگی، یعنی قومی دشمنی، مذہبی تعصبات، نسل در نسل مسلسل جنگوں کی یاد، یہ معاندانہ روایات کہ ان ہی لوگوں کی بدولت اُن کی سلطنت مٹ گئی اور اُن کو ذلیل و خوار ہوکر اطاعت پذیر ہونا پڑا، مگر باوصف اسکے اُن کو خاندان بنوامیہ کے اقتدار کو تسلیم کرنا پڑا۔ بادشاہان لیون و نوار کو اُس ذلت کے ساتھ، جو ایک بھکاری کو برداشت کرنی پڑتی ہے، ایک کافر سے مدد کا طالب ہونا پڑا۔ خلیفہ قرطبہ نے اُن کی سلطنتوں پر ایک ایسے معاہدہ کے رو سے قبضہ کیا کہ جسکے رو سے، صاف صاف تو نہیں، مگر معناً، وہ امیرالمومنین کے باجگزار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ سرکش اور مغرور وزیگاتھ کے جانشینوں کے لئے یہ صورت شرمناک تھی۔ ہر چیز اور ہر خیال نے، جو انسان کے دل میں حرمت اور شیدائیت پیدا کرسکتا تھا، دربار قرطبہ کی شہرت کو بڑھانے اور اُسکی عظمت کو چار چاند لگانے میں مدد کی۔ بڑے سے بڑے ممتاز بادشاہوں نے خلفاء کی دوستی کے لئے خوشامدیں کیں۔ اُن کا دارالخلافہ مغربی دنیا میں علوم و فنون کا مرکز ہو گیا۔ نادر گیتی ہے اُس جلیل القدر زمانہ کے بعد کہ یونان کے جو ہر دماغی نے آے اونیا[1] اور اٹیکی[2] کا کے مدارس کو غیر فانی بنا دیا تھا، اتنی دماغی قابلیت کبھی نہیں دکھلائی جتنی کہ قرطبہ میں مسلمانوں کے جہازوں کے بیڑوں نے تمام بحر روم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ کلوں کے علم زراعت کے سائنس، اندرونی و بیرونی تجارت کی شاخوں نے رعایا کی اطمینان و فارغ البالی کی وجہ سے وہ ترقی کی کہ جسکی مثال کہیں ملنی مشکل ہے۔ ان وجوہ سے خلیفہ الحکم ثانی نے اڑتالیس برس کی عمر اور بڑے مبارک وقت میں، بہترین شاہی خصائل و خصایص کے ساتھ، تخت خلافت پر قدم رکھا۔

خلیفہ الناصرلدین اللہ کے انتقال کے دوسرے روز اُن کے بیٹے کی رسم تخت نشینی ایسے شان و شوکت اور جاہ و جلال سے ادا کی گئی کہ روز قیام خلافت مغربی سے اب تک نہیں ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجہ کے عہدہ داران دولت، نہایت فاخرہ لباس پہنے ہوئے نئے خلیفہ سے بیعت کے لئے حاضر ہوئے جب ارکین خاندان شاہی، عہدہ داران بالا دست، وزراء سلطنت، قاضی اور عرض بیگیوں نے بیعت کر لی تو اُنہوں نے وکالتاً قصر شاہی کے خدمتگاروں وغیرہ سے بیعت لی۔ جو جاہ و جلال و حشم اس موقعہ پر ظاہر کیا گیا تھا وہ واقعی ایک نہایت قوی، نہایت دولتمند اور نہایت پر تکلف سلطنت یورپ کے شایان شان تھا۔ رسم تخت نشینی قصر زہرا کے صدر کمرے میں ادا ہوئی۔ اُسکی زیبایش کا سامان دھوپ میں ایسا چمکتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایشیائی خیالات کے موافق پرستان کا خواب اور جادو کا کھیل تھا۔ خلیفہ حکم ثانی کے آٹھ بھائی خدم و حشم اور اُس عزت و توقیر کے ساتھ، جو اُن کے شایاں تھی، قصر شاہی تک پہنچائے گئے۔ لیکن یہ آٹھوں شاہزادے دیکھ رہے تھے کہ جو سخت پہرہ اُن کے گرد بنام نہاد خدم و حشم ہے اور جو فوج کی قطاریں اُن کے راستہ میں استقبال کے بہانہ سے لگی ہوئی ہیں، وہ عزت افزائی کے لئے نہیں ہے بلکہ اس احتیاط کے واسطے ہے کہ وہ فتنہ برپا نہ کر سکیں۔ وزراء سلطنت اپنے اپنے قلمدان وزارت لئے ہوئے اور اپنے اپنے عہدہ کا لباس پہنے ہوئے اور امراء دولت، ارکین خاندان شاہی کے پیچھے، جو دونوں طرف سے تخت خلافت کو گھیرے ہوئے تھے، کھڑے تھے۔ اُن کے پیچھے غلام گردش میں بلکہ خالی کمروں میں بھی، ملک محروسہ کے دیوانی و فوجداری حکام، فوج کے سپہ سالار، صوبجات کے گورنر اور دارالخلافہ اور بڑے بڑے صوبوں کے عام عہدہ داران بالا دست امیرالمومنین کے حضور میں اپنی نذریں پیش کرنے اور کورنش بجا لانے کے لئے حاضر تھے۔ وہ دیوصفت فرقہ جو اپنی ذلت اور مسخ کئے جانے کا معاوضہ اقتدار حاصل کرنے اور روپیہ جمع کرنے سے کرتا تھا، جو سوسائٹی سے اپنا انتقام اپنی مربی سلطنت کو تباہ کر کے لیتا تھا، اور جس کی زیادتی

زمانۂ خلافت میں نجس اور قابل نفرت ہوگئی تھی یعنی خواجہ سرا ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ اُن کی قطاریں بلحاظ اُن کی قومیت درجہ اور اُن خدمات کے جس پر وہ مقرر تھے لگائی گئی تھیں۔ اُن میں سب سے زیادہ آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے جن کے حاشیوں پر سنہرا کام تھا؛ کیونکہ خاندان بنو اُمیہ میں ماتمی رنگ سفید تھا۔ حرم سرائے سلطانی کے خدمتگار اُس کمرہ میں کھڑے کئے گئے تھے جس میں سے ہوکر دربار عام کو راستہ جاتا تھا۔ یہ گورے بھی تھے اور کالے بھی۔ اُن سب کے چمکدار ہتھیار لگے ہوئے تھے جن پر سونے چاندی کا کام تھا اور جن کے دستے قیمتی جواہرات سے دمک رہے تھے۔ سنگ مرمر کے اُس زینہ پر جو سراپردۂ سلطانی کے نیچے تھے، سکلاو ونیا کے سوار اونچی بنے ہوئے تعینات تھے۔ اُن کے ہتھیار قیمتی اور کاری ہونے میں اُن لوگوں کے ہتھیاروں سے کچھ کم نہ تھے جو اوپر کی قطاروں کے سپاہیوں اور خدمتگاروں کے پاس تھے۔ اُن کے بعد شہر کے پھاٹکوں تک شاہی تیر انداز، غلام اور مختلف دستہاء فوج، اس طرح ساکت اور بےحرکت کھڑے تھے کہ گویا بت ہیں، زندہ آدمی نہیں۔

جب یہ پرجلال رسم تخت نشینی ادا ہوچکی تو الناصر لدین اللہ دفن کئے گئے۔ خلیفہ حکم کا دل و دماغ کسی وقت نچلا بیٹھنے والا نہ تھا۔ اُنہوں نے فی الفور ہی اُن امور سلطنت کے جزئیات پر نظر ڈالی جن کا تعلق ملک محروسہ کے ہر محکمہ سے تھا۔ اپنے والد کے تمام وزراء کو بلا استثناء اُنہوں نے ازسرنو مستقل کردیا۔ دورافتادہ صوبجات کے والیوں سے بیعت لینے کے لئے سفیر روانہ کئے۔ تمام فوج متعینہ دارالسلطنت کا جائزہ لیا، اور مختلف مقامات کی فوج کو ملاحظہ کے لئے طلب فرمایا۔ ایک نیا حاجب یا وزیر اعظم مقرر کیا کیونکہ خلیفہ حکم بالطبع خاموشی کے ساتھ اُس درخشاں شعبۂ علمی کی طرف مائل تھے، جسکو ادب کہتے ہیں؛ وہ سلطنت کی ذمہ داریوں اور فتنہ انگیز باتوں کو اپنے لئے سخت بارگراں سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں اُنہوں نے اپنے والد مرحوم کی تاکیدوں کو نظر انداز کیا۔ مرحوم یہ جانتے تھے کہ جو وسیع اختیارات حاجب کو حاصل ہوتے ہیں اگر وہ کسی بلند نظر اور بے احتیاط سیاست دان کے ہاتھ میں دیئے جائیں

تو اُن کے نتائج مہلک نکلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اُنہوں نے اپنے ولیعہد کے دل میں تکرار یہ بات ڈالنی چاہی تھی اور اسکی اشد ضرورت ظاہر کی تھی کہ امیر المومنین کو تمام اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھنے چاہئیں۔ جو شخص کہ اس عہدہ گرانبار کے لئے چُنے گئے وہ جعفر صقلبی تھے۔ چونکہ وہ غلام تھے، خلیفہ الحکم یہ سمجھتے تھے کہ اُن کا فرقہ اور قومیت اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ نیک چلن رہینگے۔ اُن کی اس رائے کی تائید جعفر کی آیندہ عقل و تمیز اور بیدار مغزی سے ہو گئی، جو اُنہوں نے اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں ظاہر کی۔ مراسم دربار خلافت کی پابندی میں جعفر کو بیش بہا تحائف خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے پڑے۔ جس میں بیش قیمت لباس پہنے ہوئے غلام، مرصع ہتھیار، زرہ بکتر، وغیرہ شامل تھے۔

بادشاہان لیون و نوار نے امیر المومنین الناصر لدین اللہ کے انتقال کی خبر سنکر بظاہر تو بہت رنج ظاہر کیا، مگر دل میں بہت ہی خوش ہوئے۔ خلیفہ مرحوم کا رعب اور اپنے دعاوی کو فعل سے وہ میں لے آنے کی قابلیت اُن کی طویل مدت حکومت اور صولت سلطنت سے بارہا ظاہر ہو چکی تھی۔ جلے ہوئے کھیت، سرحد کے منہدم قلعے، میدان جنگ میں سفید ہڈیوں کے ڈھیر اُن کی بے رحمانہ دشمنی اور اُن کی فوج کی شجاعت کی منہ بولتی شہادتیں تھیں۔ لیکن اُن کے جانشین کی حالت و کیفیت اب تک معلوم نہ تھی۔ اگرچہ اُن کی عمر کا آفتاب ڈھل چکا تھا، مگر اُن سے کوئی ایسا جنگی کارنامہ ظاہر نہیں ہوا تھا جو رعایا میں گرویدگی پیدا کر لیتا، اُن میں بادشاہ کی توقیر بڑھ جاتی اور دشمنوں پر رعب چھا جاتا۔ امیر المومنین خلیفہ الحکم کی عزلت پسندی اور علماء کی صحبت کے میلان کو وحشی عیسائی سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ اُن کے نزدیک جس آدمی میں ذرا سی بھی جان ہو اُس کا کام صرف جنگ تھا؛ اور حصول علم صرف عابدوں، راہبوں اور ایسے آدمیوں کا جن کا پیشہ ایسا ہو کہ اُن سے ہتھیار اُٹھ ہی نہ سکیں۔ شروع زمانہ میں اگرچہ اس معاملہ کے متعلق جناب پوپ کی منظوری صاف طور پر حاصل نہیں کی گئی، مگر طرز عمل یہ تھا کہ اُن معاہدات کی خلاف ورزی کرنا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا جو دشمنان کلیسا سے کئے جائیں۔ اب تک

ایسے معاہدں پر عمل کرنا اقتضاءِ ضرورت پر تھا، نہ کہ اخلاق اور قومی عزت کے لحاظ پر سینکو نے
معاہدہ کیا تھا کہ اگر ان کو پھر تاج و تخت مل جائے تو وہ اُسکے عوض میں بہت سے قلعے امیر المومنین
کے حوالہ کر دینگے، مگر اس بادشاہ لیون نے اس کی اب تک تعمیل نہیں کی تھی۔ اب تو اُس کی
خلاف ورزی پا لیت و لعل کا اُن کو بہت ہی اچھا موقعہ مل گیا تھا۔ خلیفہ حکم نے ان قلعوں کو
مانگا تو سینکو نے اس کے جواب میں حیلہ حوالہ کیا، اور زمانہ سازی کی سی بات کی۔ اس میں شک
نہیں کہ بادشاہ نوار نے اس معاملہ میں اپنے ہمسایہ کے ساتھ ساز و باز کر رکھا تھا، اور وہ بظاہر نرم
ہونے والا نہ تھا۔ فرڈی نینڈ گانسر لینر، جو بادشاہ نوار کے ہاتھ میں پڑ چکے تھے، پمپلونا میں قید تھے۔
خلیفہ اس سخت دشمن کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتے تھے۔ اور اس پر آمادہ تھے کہ اگر گارشیا اس مشہور
و معروف شخص کو قرطبہ بھیج دیں تو وہ اپنے دعوے کی تعمیل کرانے پر زور نہ دینگے۔ شاہ نوار نے نہ صرف
فرڈی نینڈ کو قرطبہ بھیجنے سے انکار کیا، بلکہ ان کو رہا کر دیا، اور یہ سمجھا کہ وہ اپنے داماد اور ڈوؤان چہارم
کو جو برگس میں پناہ گزیں تھے، نکال باہر کرینگے، اور خلیفہ حکم کے برخلاف فوراً اعلان جنگ کر دینگے۔
فرڈی نینڈ نے فوراً ہی یہ ساری امیدیں پوری کر دیں۔ بد قسمت اورڈوؤں کو اپنے خاندان سے
جدا کر کے ایک فضیحت کے ساتھ سرحد پار نکال دیا گیا۔ فرڈی نینڈ کے اعلان جنگ کرتے ہی اُن کے
سب پرانے آدمی آ کر اُن کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ ایسٹر یمیڈورا اور اندلسیہ جو ایک مدت سے برکات
امن سے فیضیاب ہو رہے تھے، ایک مرتبہ پھر جنگ کی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ کہاں تو ڈوؤان اور
کے پاس سینکڑوں آدمی ہوتے تھے، اور کہاں صرف بیس ایک آدمی اُن کے ساتھ دینے پر راضی
ہوئے لیکن ہی کو لیکر وہ دشمن کے ملک سے نکلتے ہوئے شہر مدینہ سیلی[۴] پہنچ گئے۔ خلیفہ حکم کا یہ خیال تھا کہ
اگر عیسائی مطیع رہ سکتے ہیں تو صرف فوجی نمایش اور صولت ظاہر کرنے سے! مدینہ سیلی کی بھی یہی
کیفیت تھی کہ وہاں گلی گلی فوج پھر رہی تھی، بلکہ کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ جہاں جنگ کی تیاریاں نہ ہو رہی
ہوں۔ یہ حالت دیکھ کر اس بدنصیب پناہ گزیں بادشاہ کے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی، اور اُن کو یہ امید
ہو گئی کہ اگر خلیفہ کی فوجی تیاریوں میں مدد دیجائے اور اس کا قرار واقعی انتظام ہو جائے تو یہ خو

اُن کے لئے نہایت مفید ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے حاکم شہر سے خواہش کی کہ وہ اُن کو بحفاظت قرطبہ پہنچا دیں، تاکہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کی حمایت میں دیدیں۔ اُن کی یہ درخواست منظور کر لی گئی اور ایک دستہ فوج اس غرض سے متعین کر دیا گیا کہ اُن کو بعافیت دارالخلافہ پہنچا دیں۔ سڑک قبرستان شاہی کے پاس سے گزرتی تھی۔ اورڈونو نے امیرالمومنین الناصرلدین اللہ کی قبر کی زیارت کرنی چاہی۔ قبر پر پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر پڑے، اپنی ٹوپی اتار لی اور گھٹنے ٹیک کر اُنہوں نے بہت دیر تک بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اُس شخص کی مغفرت کی دعا مانگی جو زندگی میں اُن کا جانی دشمن رہا تھا۔ اسکے چند روز کے بعد امیرالمومنین نے اُن کو مدینہ زہرا میں باریاب کیا بطور نشان عزت و باجگزاری اُن کو حکم دیا گیا کہ وہ بنو اُمیہ کا سفید لباس پہن کر حاضر ہوں عبیداللہ ابن قاسم اسقف طلیطلہ اور ولید ابن خیزران مجسٹریٹ مسیحیان قرطبہ نے (جنکے عربی نام اُن کے مذہب اور عہدہ کے لحاظ سے عجیب معلوم ہوتے ہیں) اُن کو درباری کمرہ میں پہنچایا۔ ان دونوں کی موجودگی اس لئے ضروری تھی کہ وہ ترجمانی کریں، نیز آداب دربار شاہی سے اُنکو آگاہ کرتے رہیں جنکی سخت پابندی قرطبہ میں کرائی جاتی تھی۔ یہ صحیح قیاس کر لیا گیا تھا کہ اس سابق بادشاہ کی صحبت چونکہ وحشیوں میں رہی ہے اس لئے وہ یقیناً اس سے نابلد ہونگے۔

اس عیسائی بادشاہ کی باریابی کے موقعہ پر اُسی شان و شوکت کا اظہار کیا گیا جو بڑے بڑے بادشاہوں یا اُن کے سفیروں کی حاضری پر ہوتا تھا۔ خلیفہ کی محافظ تن فوج کے آدمی چمکتے ہوئے قیمتی ہتھیار لگائے، اونچی بنے ہوئے قطار در قطار کھڑے ہوئے تھے، اراکین سلطنت اپنے اپنے عہدہ کا لباس پہنے ہوئے حاضر تھے تخت کے گرد شاہزادے، وزراء اور صرف خاص کے جلیل القدر عہدہ دار موجود تھے۔ زینوں اور کمروں میں خدمتگاروں وغیرہ کی فوج کی فوج کمربستہ کھڑی تھی حرم شاہی کی درخشندہ جالیوں میں سے جو دربار عام کی طرف تھیں، جواہرات کی ضو اور آہو چشم خواتین کا نور کبھی کبھی نظر آجاتا تھا؛ کیونکہ باشندگان ایشیا اپنی غیرت کی وجہ سے بہت ہی شاذو نادر کسی رسم کی ادائیگی کے وقت خاتونان حرم کے حُسن سے شاہی محل کے جھروکوں کو منور ہونے کا

موقوف ہیئے تھے ؛

بادشاہ اور امراءِ لیون ادب اور رعب سے سر جھکائے ہوئے سپاہیان متعینہ کے درمیان سے
گزرے، تو سپاہیوں کی خونخوار آنکھوں سے وہ اس طرح ڈر گئے کہ انجیل کی آیتیں پڑھنے، دعائیں مانگنے
اور بار بار صلیب کا نشان اپنے سینوں پر بنانے لگے۔ بہت سی دفعہ کورنشات بجالانے کے بعد اور ڈیوڑھیاں
امیرالمومنین کے حضور میں پہنچے، اور ممدوح نے اپنا ہاتھ اُن کو چومنے کو دیا۔ اسکے بعد تخت خلافت سے
کچھ فاصلہ پر اُن کو بٹھلایا گیا؛ خلیفہ نے اُن سے کہا کہ وہ اوبھی مرحمت شاہی کے امیدوار ہیں۔
اس موقعہ پر اور ڈوؤں کی ناقابلِ بیان کمینگی ظاہر ہوگئی٭۔ جب سے کہ وہ اسلامی حدود میں داخل ہوئے
تھے انہوں نے اپنی شاہی حیثیت کا مطلق خیال نہیں کیا؛ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں وہ اوصاف
مردانہ تھے ہی نہیں کہ جنکی وجہ سے ادبار کی حالت میں کسی بہادر سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو
فوج کہ اُن کے استقبال کے لئے گئی تھی اُسکے سرکردہ کو انہوں نے کچھ خوشامد اور کچھ تحفہ و تحایف دیکر
نہایت ذلیل طریقہ سے اپنے اوپر مہربان کیا؛ سخت مکاری سے، جو اہالی اندلسیہ کی طبایع کے بالکل
خلاف تھا، انہوں نے سخت رنج ظاہر کر کے امیرالمومنین الناصر لدین اللہ کے مقبرے کے سامنے سجدہ
کیا؛ ایک ذلیل خوشامد اور مداہنت سے انہوں نے ارکین سلطنت کو رام کیا لیکن اب وہ وقت آگیا تھا کہ یہ
بیعزتی جو انہوں نے از خود کرائی تھی، ماند ہو جائے، اور وہ انتہاء قعر ذلت میں جا گریں۔ جیسے
ہی خلیفہ حکم کی تقریر کا ترجمہ انہیں سنایا گیا۔ انہوں نے فوراً کھڑے ہو کر عرض کیا کہ "میں امیرالمومنین کا
غلام ہوں، میں اُن کی اولوالعزمی پر بھروسہ کرتا ہوں، میں اُن کی نیکی کی حمایت میں اپنے آپ کو دیتا ہوں،
میں اپنے اوپر اور اپنے سب کاموں پر اُن کو اختیارات کامل دیتا ہوں" یہ الفاظ انہوں نے اس طرح کہے
کہ اُن کے دل سے نکلے معلوم ہوتے تھے، نہ کہ ذات شاہی یا دربار شاہی کے مبالغہ کے طور سے۔ اس کے
بعد انہوں نے اُس لہجہ سے جو ایک کمینہ غلام کے شایاں ہے، اپنے تخت کی بازیافت کے لئے امیرالمومنین
سے امداد کی درخواست کی؛ اور آخر میں اپنی بطوع اطاعت، اور اپنے چچیرے بھائی سینکو کی شرارت کا

٭ لیکن اگر معاملہ برعکس ہوتا تو کیا اُس وقت بھی "کمینگی" ہی کہا جاتا؟ (مترجم)

مقابلہ کیا، جن کو الناصر لدین اللہ نے مجبور کرکے معاہدہ لکھوایا تھا۔ امیر المومنین اُن کی تقریر نہایت حقارت کے ساتھ سنتے رہے اور یہ وعدہ کیا کہ جو کچھ وہ مانگتے ہیں اُن کو دیا جائیگا؛ نیز یہ کہ اُن کو اُن کے دشمنوں سے محفوظ رکھا جائیگا۔ اسکے بعد دربار ختم کیا گیا؛ حبشی خواجہ سرا، اہالی لیون کو دربار عام سے باہر لائے۔ اور ڈووؤں نے وزیر جعفر کی بھی ویسی ہی خوشامدیں کیں، جیسی کہ خلیفہ کی کی تھیں؛ یہاں تک کہ جعفر کا ہاتھ چومنے سے بمشکل اُن کو باز رکھا گیا۔ ایک کمرہ میں سے وہ گزر رہے تھے، تو اُن کو ایک تخت نظر پڑا، کہ جہاں کبھی کبھی امیر المومنین آکر بیٹھا کرتے تھے؛ اُنہوں نے وہاں بھی وہی ذلت دکھلائی، اور نہایت ادب کے ساتھ اُس تخت کے سامنے بھی اس طرح گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو گئے کہ گویا کہ یہ مقام کوئی نہایت مقدس اور متبرک تھا۔

ایک بڑا شاندار مکان بادشاہ اور اُن کے ہمراہیوں کے رہنے کو دیا گیا؛ سب کو خلعت عطا کئے گئے (جو اپشیاء والوں میں سب سے بڑی عزت کا نشان ہے)، نہایت قیمتی تحفہ و تحایف بارگاہ خلافت کی طرف سے اُن کو بھیجے گئے، جن سے اُن کو اپنے مربی کی فیاضی اور ہمدردی کا اور بھی یقین ہو گیا۔ چند روز کے بعد ایک عہد نامہ ہوا، جسکے روسے اور ڈووؤں نے یہ عہد کیا کہ وہ امیر المومنین سے صلح رکھینگے، اور نواب قستالہ سے ہمیشہ برسر جنگ رہینگے۔ سلطنت عظمٰی کے قابل ترین سپہ سالار غالب کو بہترین اسلامی فوج دے کر اس مہم پر متعین کیا گیا؛ طلیطلہ کے اسقف اعظم اور قرطبہ کے اسقف اور مجسٹریٹ کو فوج کے ساتھ بھیجا گیا؛ نہ اس لئے کہ وہ اس نازک مزاج بادشاہ کو اپنے مشورہ سے مدد دیں، بلکہ اس لئے کہ وہ اُسکی رفتار و گفتار کو بغور دیکھتے رہیں، اور یہ خیال رکھیں کہ وہ کسی ایسے امر کا مرتکب نہ ہو جس کا اثر امیر المومنین پر بُرا پڑے؛ یا یہ کہ کسی دوُر دراز طریقہ پر بھی اُن کی بلند نظری پر اثر پذیر ہو۔

اس اثناء میں سینکو بھی یہ خبریں سُن سُن کر دست پاچہ ہو رہے تھے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ اور ڈووؤں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو اُنہیں ہوش آیا کہ میں نے امیر المومنین حکم کی امن پسندی اور خلوت گزینی کا غلط اندازہ کیا ہے۔ یہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ اب

قوی فوج اُن کے ملک پر حملہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ دشمن کی ایک یہ بھی تدبیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی فوج کی تعداد اضعافاً مضاعفہ بتلایا کرتا ہے۔ وہ کچھ ایسے بڑے سر لعزیز بھی نہ تھے اور از سرِ نو تخت پر بیٹھے تھے تو ایسے ذرائع سے کہ جو اُن کی رعایا کو ناگوار ہوئے تھے۔ اُن کے بہت سے باجگزار ایسے تھے کہ جن پر کسی طرح اطمینان نہ ہو سکتا تھا۔ جلیقیہ جیسا بڑا صوبہ جو بادشاہ لیون کا علاقہ بصرف خاص تھا اُن کی اطاعت سے منکر ہو چکا تھا۔ وہاں کے نواب ایسی باتیں کرتے تھے جن سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی آزادی کا اعلان کرنے کے لئے کوئی موزوں موقع تلاش کر رہے ہیں۔ نظر بایں حالات سینکو کے لئے صرف ایک ہی تدبیر باقی تھی، اور وہی اُنہوں نے کی، کہ فوراً ایک سفارت قرطبہ بھیج کر یہ عرض کرایا کہ وہ فی الفور اُس عہدنامہ کی شرائط کے پورا کرنے پر آمادہ ہیں جو اُنہوں نے امیرالمومنین الناصر لدین اللہ سے کی تھیں ۔

امیرالمومنین حکم کی دو رُخی چالوں کے منہ پر سے پردہ اُٹھ گیا۔ بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے کہ اُن کی قوم میں ایسی چالیں شاذ و نادر ہی چلی گئی ہیں، یہ دھبہ اُن ہی کے دامن پر رہے۔ اُنہوں نے بلا اظہار افسوس وہ عہد توڑ دیا جو اور ڈونو سے کیا تھا۔ یہ شخص بحالت مایوسی و آلام اپنی امیدوں کو ٹوٹا ہوا دیکھ کر، اور اپنی انتہاء ذلتوں کے خیال میں اُس پر تکلف قید خانہ میں مر گیا جو اُسکے واسطے مضافات قرطبہ میں تیار کیا گیا تھا۔

سینکو نے جب یہ دیکھ لیا کہ اُن کے رقیب سے راستہ صاف ہو گیا ہے، اور فرڈی نینڈ گانزلیز اُن کی مدد پر آمادہ ہے، تو اُنہوں نے سوچا کہ اُن کو دوبارہ عہد شکنی کا اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اُنہوں نے خلیفہ کی آنکھوں میں خاک ڈالنی چاہی۔ ادھر اسکے جواب میں جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ حملہ آور فوج کی قیادت غالب کے ہاتھ میں دی گئی۔ ایک گھمسان کی لڑائی میں نواب قستالہ کو شکست فاش ہوئی۔ یحییٰ ابن محمد گورنر سرقسطہ نے بڑی آسانی سے شاہ نوار کو زیر کر لیا۔ سان الیس تفے ون ڈی گورمز، اور کے لاہورا کے قلعے جو منہدم کر دیئے گئے تھے از سرِ نو بنائے گئے، اور اُن میں مسلمانوں کی فوج محافظ رکھ کر حدود خلافت میں شامل کر دیا گیا۔ عربی فوج نے کٹالونیا کی سرحد کو

آگ اور تلوار سے بالکل تباہ کر دیا؛ کیونکہ میرون[8] اور بوریل[9] کے نوابوں کو بادشاہ نوار نے پھسلا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان دونوں نے بھی شجاعت کے زعم میں عقل سے کام نہیں لیا؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنی عہد شکنی کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ اُن کے شہر لوٹے گئے، اور اُن کی رعایا پر سخت مصیبتیں آئیں۔ ہر جگہ مسلمانوں کو کامیابی کامل نصیب ہوئی۔ دشمن تو یہ اطمینان کئے ہوئے تھا کہ امیر المومنین ایک نالائق اور سست بادشاہ ہیں، جو انہماک علم ادب کا لازمی نتیجہ ہے، اور اُن کو جنگ اور میدان جنگ سے طبعی منافرت ہے، مگر اب اُسی دشمن کو اس کا قایل ہونا پڑا کہ فی الحقیقت امیر المومنین نہایت عقیل و فہیم ہیں؛ نیز یہ کہ جنگ کی طرف اُن کا ویسا ہی میلان ہے جیسا کہ علم ادب کی طرف، اور اس میں بھی وہ کامیاب رہ سکتے ہیں۔ ہر شخص نے یکے بعد دیگرے امان مانگی اور صلح کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ جلیقیہ جیسے دور اُفتادہ علاقہ سے بھی ایک سفارت بسر کردگی ایک معزز خاتون، یعنی والدۂ نواب جلیقیہ کے آئی۔ اُن کی بڑے تپاک سے آؤ بھگت کی گئی، جسکے لئے قرطبہ مشہور تھا؛ اور بہت سے تحایف دے کر اُن کو رخصت کر دیا گیا۔ یہ تحایف ایسے تھے کہ اُن کو دیکھ کر وحشی شاہزادی کی، جو پایرے نیس کے بنجر اور مفلس علاقہ میں پیدا ہوئی اور رہی تھی، آنکھیں خیرہ ہو گئیں +

اس کامیاب مہم پر امیر المومنین کی شمالی مہمات کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنہوں نے اپنے بدانجام دشمنوں کو سخت اور مفید سبق دیا۔ اُن کے دنوں میں ایک مرتبہ پھر سرکشی اور بغاوت کی آرزو رہی ہو، مگر آپس ہی میں وہ اختلافات پیدا ہو گئے کہ اُن کو سواء خاموش رہنے کے کچھ نہ بن پڑا۔ بہت ہی جلد جلیقیہ اور لیون کے درمیان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ وہ باغی صوبہ جسکے سر میں ہوائے آزادی بھری ہوئی تھی، بہت آسانی سے فتح ہو گیا۔ آخر دغا و فریب سے وہ کام لیا گیا جو کہ بلکہ لڑائی سے نہ ہو سکا تھا؛ یعنی دریاءِ ڈورو کے کنارے پر ایک مجلس شورے منعقد ہوئی، وہیں سینکو کو زہر دے دیا گیا۔ بادشاہ لیون سخت تکلیف اُٹھا کر چند روز کے بعد مر گیا! نئی جگہ اُن کا بیٹا رامیر[x]

[x] RAMERO

تخت پر بیٹھا، جسکی عمر کُل پانچ برس کی تھی۔ اُن کی جنگجو رعایا نے ایک بچّہ کی حکومت، اور اُن کی چچی (راہبہ ایلویرا[×]) کی ولایت کو نہ مانا۔ اس راہبہ نے حکومت کی تعلیم اگر کہیں پائی تھی، تو ایک دیر کے حجرہ میں، یہ تعلیم جیسی کچھ ہو سکتی ہے محتاج بیان نہیں۔ علاقہ شمالی کے اور مقامات میں بھی خلافت کی حفاظت اور ترقّی کے سامان پیدا ہو گئے۔ قوم ڈینس کی ایک بہت بڑی فوج، جو ڈیوک نارمنڈی کے زیر قیادت کام کر چکی تھی، طوفان کی طرح سے آئی، اور جلیقیہ کے میدان مسطح اور روادی کو تباہ کر گئی۔ آخر میں فرڈی ننینڈ گانزلیس کے مرنے نے امیرالمومنین حکم کو ایک سخت خطرناک دشمن کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ اُن کی بقیہ زندگی میں نہ اُن کی رعایا کو عیسائیوں نے تنگ کیا، نہ اُن کی سلطنت میں کسی طرح کا نقص امن ہوا۔

اگرچہ شمال کی طرف سے تو مستقلاً امن و عافیت کا اطمینان ہو گیا، مگر افریقیہ کی طرف سے ہر وقت دغدغہ لگا رہتا تھا۔ بادیہ کے وحشی باشندے اسکو نہ بھولے تھے کہ اُن کے اجداد نے نہایت آسانی سے سمندر کے پار جا کر فتوحات حاصل کی تھیں، اور ایک بہت بڑی آباد و شاد سلطنت کو بادنےٰ کوشش، زیر کر لیا تھا۔ ماری ٹین یا کے نیم برہنہ وحشی وہ لوگ تھے کہ جن کا تہوّر رومی باقاعدہ فوجوں پر غالب آ چکا تھا۔ اس وقت اُن کی للچائی ہوئی نظریں اندلس کے بھرے پُرے بازاروں، وہاں کی بے انتہا دولت، وہاں کے پُر تکلف محلات و قصور، وہاں کی حسین و دلکش عورتوں پر پڑ رہی تھیں۔ فتوحات کے جذبات ابتک اُن کے دل سے نہ نکلے تھے۔ اُن کو یہ خیال تھا کہ اگر وہ بھی طارق ابن زیاد رحمہ اللہ کے قدم بقدم چلیں تو اُن کی ساری امیدیں آئینگی۔ یہ خیالات عوام الناس ہی کے نہ تھے، بلکہ مختلف خاندانوں کے تمام بادشاہ، جنھوں نے مختلف موقعوں پر ملک مغرب کو ہلا ڈالا تھا، بلا استثناء اسی خبط میں گرفتار تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ جزیرہ نماء اندلس کی دولت، گو اُن کی میراث نہ ہو مگر اُن کا مال ضرور ہے۔ وہاں کی سیاسی، تمدنی، دینی اور تجارتی حالت وہ اچھی طرح جانتے تھے، کیونکہ اُن کی اور وہاں کی حالت یکساں

NUN ELVERA ×

تھی۔ بڑی بڑی تجارتی منڈیوں، دور اُفتادہ پورودن، فوج کے سپاہیوں، قصر شاہی کے غلام گردشوں یہاں تک خود امیر المومنین کی خوابگاہ میں اُن کے جاسوس موجود تھے۔ اُن کو کوئی نہ جانتا تھا اور بعض پر تو شبہ بھی نہ ہوتا تھا؛ مگر اُن کا اثر بہت سی بغاوتوں میں اُس وقت پایا جاتا تھا کہ جب آخری فیصلہ کا وقت ہوتا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی فتوحات کی امیدوں کو نہ بھولتے تھے! وہ ذراسی دیر کے لئے بھی اپنی اس بلند نظری سے غافل نہ ہوتے تھے (جو بدقسمتی سے پوری ہونے والی تھی) کہ اُن کو اپنا فاتحانہ علم اُس سرزمین پر نصب کرنا، اور وادی الکبیر کے کنارے پر اپنا تخت بچھانا ہے۔ جب سے کہ امیر المومنین الناصر لدین اللہ نے افریقیہ کے سرحدی علاقہ کو اپنا باجگزار بنایا تھا اُس وقت سے شاہنشاہی حیثیت قائم رکھنے کے لئے اندلس کے خزانہ پر کچھ کم بار نہیں پڑ رہا تھا۔ اپنے کم زور باجگزار کی امداد کے لئے فوج رکھنے، اور وحشی سرداروں کو فتنہ برپا کرنے سے باز رکھنے کے لئے رشوتیں دینے میں زرِ خطیر خرچ ہوتا تھا۔ اس خرچ کے بدلہ میں جو کچھ سلطنت عظمےٰ کو معاوضہ ملتا تھا وہ صرف اس قدر تھا کہ بربریوں کا حملہ چند روز کے لئے رُکا رہتا تھا اور بس۔

فاطمیوں کی توجہ کئی برس تک ممالک مشرقیہ کی طرف مصروف رہی۔ تھوڑی سی فاتحانہ کشمکش و کوشش کے بعد اُس خاندان کے بادشاہ اپنا دارالسلطنت ماریٹینیا کے ریگستان سے اُٹھا کر وادی نیل کے سرسبز میدان میں لے گئے۔ اس سے بنو امیہ کی سلطنت کو جو بہت بڑا خوف پیدا ہو گیا تھا وہ بظاہر کم ہو گیا۔ اس وقت خاندان ادریسی کی آخری یادگار حسن ابن کنون، سواحل افریقیہ کی ایک بے ثبات سی سلطنت پر حکمران تھا، جس کا دارالسلطنت طنجہ تھا۔ حسن برائے نام تو خلیفہ حکم کے باجگزار تھے، مگر اُن کی وفاداری بیشتر اُس خوف پر موقوف تھی جو اُن کو اپنے ہمسایہ سلطنت کے دباؤ اور مداخلت بیجا کی وجہ سے ہر وقت لگا رہتا تھا۔ جب ابو الفتوح قائم مقام سلطنت بنو فاطمیہ نے اُن کی حدود سلطنت پر حملہ کیا۔ تو اُنہوں نے بے تامل خلیفہ مصر کو اپنا حلیف بنا لیا۔

ابن کنون کی بغاوت اور نائب السلطنت بنو فاطمہ کی خوفناک پیش قدمی سے امیر المومنین حکم کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ اُس حصۂ ملک میں کوئی فوری اور فیصلہ کن کارروائی کریں۔ اپنی عادت کے موافق اُنہوں نے نہایت سرگرمی اور جوش سے ایک قوی بحری و بری فوج کو حکم دیا کہ وہ فوراً جا کر اس باجگزار کو اُسکی کورنمکی کی سزا دے آئے، اور خام کار و بے وفا افریقی سرداروں کی سرکوبی کر دے۔ فوج کی منزل مقصود طنجہ، دار السلطنت ابن کنون تھی۔ بنو اُمیہ کے بیڑہ نے بندر کا سدباب کر دیا، اور بری فوج نے شہر کے قریب ہی دشمن سے لڑ کر ایک فیصلہ کن لڑائی میں فتح پائی۔ لیکن یہ کامیابی تھوڑے ہی دن کے لئے تھی۔ سرزمین مغرب سے، جو چست و چالاک اور جنگجو لوگوں سے پٹی پڑی تھی، ایک فوج بھرتی کر لینی نہایت آسان کام تھا۔ باشندگان بادیہ لوٹ کی لالچ اور لڑائی کی جوش و خروش کی امید پر جوق درجوق ادریسی بادشاہ کے جھنڈے تلے آ کر جمع ہو گئے۔ یوں یہ بادشاہ از سرنو اس قابل ہو گیا کہ میدان جنگ میں اُتر آئے۔ اس لڑائی میں خلیفہ حکم کی فوج کو سخت شکست ہوئی، اُن کا سپہ سالار وہیں قتل ہوا، اور بقیۃ السیف نے طنجہ کی فصیل کے نیچے پناہ لی۔ زر پرست اور بے وفا افریقیوں پر اس فتح کا بہت بڑا اثر ہوا، ابن کنون کی طاقت و شہرت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی، اور چھوٹے چھوٹے باجگزاروں نے، جو ایک مدت سے خلافت قرطبہ کے نمک پروردہ چلے آتے تھے، بیعت توڑ دی۔ دور و نزدیک افریقیہ کے ریگستان میں، وہ لوگ فوج در فوج ابن کنون کی طرف آتے ہوئے نظر آتے تھے، جنکو کوئی بادشاہ زیر نہیں کر سکا، اور کوئی حکومت آدمی نہ بنا سکی۔ کوئی جگہ، سوائے چند قلعہ بند مقامات کے، امیر المومنین کی وفادار نہیں رہی، وہ بھی اُس حالت میں کہ وہ زیر محاصرہ تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر فوراً ہی سخت تدابیر نہ کی جائیں تو بربریوں کے رجز کی آوازیں بہت جلد اندلس کے میدانوں میں سنی جانے والی تھیں *

جس خطرہ میں کہ خلیفہ الحکم اس وقت پھنسے ہوئے تھے اُس سے وہ غافل نہ تھے۔ اُنہوں نے تمام ملک محروسہ سے نہایت بہادر فوج اور آزمودہ کار افسران فوج طلب کئے۔ غالب کو سپہ سالار مقرر کیا جنکی بہادری اور حسن تدبیر حال ہی میں عیسائیوں کی جنگ میں ظاہر ہو چکی تھی۔ اس

موقعہ پر اُن کو خاص طور پر یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہوئے اور فتح حاصل نہ کی، تو اُن کی خیر نہیں ہے۔ امیر المومنین حکمؔ نے صرف فوج کشی اور اُسکے غیر مقرر نتیجہ ہی پر تکیہ نہیں کیا، بلکہ اُنھوں نے خزانہ کا خزانہ غالب کے سپرد کر دیا، کہ وہ شیوخ افریقیہ کو جتنا چاہیں دیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بربری شیخ محض زر پرست ہوتے ہیں۔ جو شخص کہ اُن کو زیادہ رشوت دے یا بعد میں دے، وہ اُسی کے طرفدار ہوتے ہیں۔ اُن کو اپنے سپہ سالار کی قابلیت، حسن تدبیر اور فوج کی شجاعت و بہادری پر اتنا بھروسہ نہ تھا، جتنا کہ روپیہ خرچ کرنے پر۔ غالب کو یہ بھی تاکید کی کہ جہاں تک ہو سکے ابن کنون کی فوج سے مقتدر سردارانِ افریقیہ کو علیحدہ کر لیں، اسکی پرواہ نہ کریں کہ اُس سردار کا اثر تھوڑے آدمیوں پر ہے یا بہت پر، نہ اس کا خیال کریں کہ یہ سردار کتنا روپیہ طلب کرتے ہیں۔ اُن کو حکم تھا کہ بشرط زندگی وہ ابن کنون کے خاندان کو قرطبہ لے آئیں۔ غالب جب بخیریت وہاں پہنچ گئے تو اُنھوں نے باحتیاطِ تمام یہ کوشش کی کہ کوئی بڑی لڑائی نہ ہونے پائے۔ اُن کی پیش قدمی میں ابن کنون کی طلایہ فوج نے بہت روک ڈالی، کیونکہ اُدھر سے یہ کوشش ہوئی کہ فوراً ہی صف بندی ہو کر جنگ شروع ہو جائے۔ مگر قائد بنو اُمیہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کے آقا کی قسمت اور خود اُن کی جان کا انحصار لڑائی کے نتیجہ پر ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے لوگوں کو توڑ لیں۔ ایک معتبر آدمی کی معرفت خفیہ طور سے اُنھوں نے قیمتی ہتھیار، بیش بہا کپڑے اور سونے کا ڈھیر شیوخ بربر کے سامنے پیش کیا۔ بھلا اتنی بڑی دولت کے مقابلہ میں شیوخ کی وفاداری اور ایمانداری کہاں ٹھہر سکتی تھی۔ اُنھوں نے ابن کنون کا ساتھ چھوڑنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کی۔ چند ہی روز میں ابن کنون نے یہ دیکھا کہ سب لوگ اُن کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اور صرف مٹھی بھر آدمی، جو اُن کے خدمتگار تھے، رہ گئے ہیں۔ بحالم مجبوری اُن کو ایک مضبوط قلعہ میں پناہ لینی پڑی، جو ایک دور افتادہ پہاڑ موسومہ ایگلس راک (۱) پر بنا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنی عاقبت اندیشی سے اپنے خاندان اور اپنے خزانہ کو پہلے ہی وہاں پہنچا دیا تھا +

غالب نے خزانہ عامرہ سے روپیہ برآمد کرنے کے لئے جو بار بار رقم خطیر کے لئے حکم خزانہ بھیجے، اُن سے امیر المومنین کو تعجب اور گھبراہٹ ہوئی۔ کسی مہم میں اتنا کبھی خرچ نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ الحکم کو یہ شک ہو گیا کہ بیت المال کا روپیہ صرف بربریوں کو رشوت دینے میں خرچ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُس کا بہت سا حصہ غبن ہوا ہے۔ اس پر اُنہوں نے اسکی تحقیقات کے لئے ایک خاص افسر کو، جو مالی معاملات میں نہایت تجربہ کار تھے، اس کام پر تعینات کیا۔ اُن کو مطلق العنان اختیارات عطا کئے تاکہ یہی نہ ہو کہ وہ افسر خزانہ ہی ہوں، بلکہ وہ اپنے وسیع اختیارات کے رو سے ضرورت پڑے تو سپہ سالار کا کام بھی کریں، اور مشیر خزانہ بھی رہیں۔ جو شخص کہ اس نازک کام پر مقرر کئے گئے تھے وہ ابن ابی عامر تھے۔ یہ نام جتنا شاندار تھا اُتنا ہی نحس اور زبون بھی تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اندلسی عربوں کی تاریخ میں اُن کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک چیدہ فوج، بسرکردگی یحییٰ ابن محمد نایب السلطنت، شمالی سرحد بھیجی گئی، جس سے خلیفہ الحکم کا یہ منشا تھا کہ وہ غالب کی کمکی فوج کا بھی کام دے، کیونکہ اُن کو افریقیہ کی مہم کے نتیجہ کا اب بھی سخت شک تھا۔

باغی قلعہ کا محاصرہ گو سخت تھا، مگر اُس طرف مدافعین بھی ایسے سخت تھے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اُنہوں نے صلح کی درخواست کی۔ اس پر ایسی شرائط پیش کی گئیں جو اُن کے مفید مطلب تھیں۔ سپاہیوں کی ذات اور جائداد کی حفاظت دربار خلافت نے اپنے ذمہ لی اور خاندان ادریسی کے متعلق جو ہدایات امیر المومنین کی تھیں کہ وہ اور اُن کا خاندان قرطبہ پہنچا یا جائے، وہ شرط بھی مان لی گئی، اگرچہ بہت تامل ظاہر کرنے کے بعد، مگر اس سے کیا ہوتا تھا، یہ تو بہر حال ماننا ہی پڑتا۔ ایگلس راک کے فتح ہو جانے سے افریقیہ کی مہم ختم ہو گئی۔ باقی ادریسیوں نے ابن کنون کی دفعتاً خرابی کو نہایت دہشت کی نظر سے دیکھا، اور اُنہوں نے بہت ہی جلد قایم مقامان امیر المومنین سے درخواست کر کے صلح کر لی۔ تمام ماری ٹینیا میں کامل امن ہو گیا، مگر یہ سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ برابرہ پھر اپنے ریگستان کے خلوتکدہ میں

چلے گئے" تاکہ کو نمکی کا جو انعام اُن کو ملا تھا اُس سے بہرہ ور ہوں، اور وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کریں کہ شاید کوئی اور شخص اُن کی خدمات کو زیادہ قیمت دے کر حاصل کرے۔ بنو فاطمہ اپنی نئی سلطنت پر قانع ہو گئے؛ ملک افریقیہ کے انتظام کے لئے اُنہوں نے ایک نائب السلطنت مقرر کر دیا؛ اور دریاء نیل کے نئے مقبوضات کی کشش نے اُنہیں ایسا منہمک کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے حدود مملکت کو وسیع کرنے پر مائل نہیں ہوئے۔

غالب اپنے معزز قیدیوں کو (جنکی تعداد ستر سے زیادہ تھی) لئے ہوئے قرطبہ واپس آ گئے۔ جس وقت سے کہ وہ الجزیرہ میں اُترے اُسی وقت سے اُن کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ جیسا کسی مہم کو سر کر کے آنے والے کا ہونا چاہئے تھا۔ اُن کا راستہ لوگوں کے ہجوم سے رک جاتا تھا؛ کیونکہ لوگ اُن کے دیکھنے کے مشتاق تھے، اور دُور دُور سے وہاں آ گئے تھے۔ ہر ایک گاؤں اور پورہ جہاں سے یہ فوج گزرتی تھی، پرجوش لوگوں کے نعرہاء خوشی سے گونج اُٹھتا تھا۔ قیدیوں کے قیمتی لباس، اُن کی شریفانہ صورتیں، اور گفتار و رفتار، اُن کے خاندان شاہی کے قیام کا قصہ، اُن کا اولاد رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہونا گو کئی پشتوں کے بعد اور مشتبہ سا تھا، لوگوں کی حیرت کو دو بالا کرتا تھا، گو ہمدردی نہ پیدا کرتا ہو؛ کیونکہ یہاں والے اُن کی ذلت میں اپنے بادشاہ کی عزت افزائی سمجھتے تھے۔ جب دار الخلافہ قریب آیا تو امیر المومنین بنفس نفیس اس فوج اور قیدیوں سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ جیسے ہی ابن کنون کو امیر المومنین کی تکلیف فرمائی کا حال معلوم ہؤا وہ گھوڑے سے اُتر پڑے، کورنش بجا لائے اور خلیفہ کی دست بوسی کی۔ غالب اور اُن کے افسران فوج سے امیر المومنین اس طرح پیش آئے جیسے کہ اُن لوگوں سے پیش آنا چاہئے، جنہوں نے سخت ترین موانع اور تکالیف کے بعد اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہو۔ شاہزادگان ادریسی کو ایک قلعہ نما محل میں پہنچا دیا گیا، اور اُن کے رفقا کو شہر کے مختلف حصوں میں بھیج دیا گیا؛ تاکہ اُن کی طرف سے اطمینان رہے۔ بنو ادریس کی محافظت فوج، جو اُن کے ساتھ ہی قید ہو کر آئی تھی، فوج شاہی میں

شامل کرکے اُن کا ایک دستہ الگ بنا لیا گیا۔ اب امیر المومنین کو یہ موقعہ ملا کہ وہ اپنے قوت فیصلہ اور اپنی اُس سرگرمی اور جوش پر اپنے آپ کو مبارکباد دیں جس سے کہ انہوں نے یہ مہم تیار کی اور بھیجی تھی، اور جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دشمن اُن کا لوہا مان گئے، اور اُن کی رعایا کو ایک مرتبہ پھر امن و عافیت کامل نصیب ہوئی +

مقدرات کا تلون بھی عجیب چیز ہے، اُس نے امیر المومنین کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے ادبی مذاق کو پورا کریں، یا اپنی کامیابیوں کے لطف سے بہرہ ور ہوں۔ مطالعہ کتب کے انہماک نے اُن کی صحت پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا۔ اُن پر فالج گرا، جس سے اُن کو مہام دولت اور افکار سلطنت کو بمجبوری چھوڑنا پڑا۔ وزیر مصحفی کے ہاتھ میں تمام سیاہ و سفید دیدیا گیا۔ یہ نہایت تجربہ کار اور کامل سیاست دان شخص تھے۔ انہوں نے اپنی مطلق العنان اختیارات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا اور بہت سی اصلاحیں امورِ سلطنت میں کردیں، جنکی سخت ضرورت تھی۔ محکمہ بیت المال میں بہت بددیانتی ہونے لگی تھی، اُسکو انہوں نے از سرِ نو مرتب کیا، اس کے بعد نہایت جزرسی اور بالغ نظری سے اُس محکمہ کا کام چلنے لگا۔ فوجی نظام میں ترقی کی گئی۔ شمالی سرحد کے سابق نایب السلطنت، یحیےٰ ابن محمد افریقیہ سے واپس بلالئے گئے، اور ان کو پھر اپنے سابقہ عہدہ پر بھیج دیا گیا، جس سے کہ مسیحی صوبوں میں پھر سکون ہو گیا۔ یہ لوگ حال ہی میں پھر ذرا کان ہلانے لگے تھے، اور ان میں پھر شور خرابہ پیدا ہونے لگا تھا۔ بعض مقامات پر تو انہوں نے کھلی کھلی نافرمانی اور سرکشی دکھلائی تھی۔ ماری ٹینیا میں تحفظِ حقوقِ خلافت کے خیال سے ایسے دو آدمیوں کو وہاں باجگزار بادشاہ بنا دیا گیا کہ جن کی وفاداری پر کامل اعتبار تھا۔ بظاہر تو یہ بہت چھوٹی سی بات تھی، مگر بڑی زبردست پالیسی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر مصحفی نے وہاں سے تمام عربی فوج کو (باستثناء چند مقامات کے، جہاں محافظت کے لئے چند دستے چھوڑنے پڑے) واپس بلوا لیا، اور وہاں بھیج دیا کہ جہاں اُن کی خدمات کی سلطنت کو بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس سے خزانۂ عامرہ پر بھی بار کم ہو گیا۔ قیسی خاندان بنو ادریسی ویسی ہی شان و شوکت سے

رکھا جاتا تھا جیسا کہ قرطبہ کا خاندان شاہی رہتا تھا۔ یہ بات جزورس وزیر مصحفی کو سخت ناگوار تھی؛ کیونکہ اُس کا تمام بار اُن کے خزانہ پر آکر پڑتا تھا۔ اس خیال میں وہ اکثر غلطان و پیچان اور پریشان رہتے تھے۔ بنو ادریس بھی بیٹھے بیٹھے تنگ آگئے تھے۔ گو بظاہر وہ آزاد تھے مگر اُن کی حفاظت قیدیوں کی بہ نسبت بھی زیادہ سختی کے ساتھ کیجاتی تھی، جو اُن کو ناگوار ہوتی تھی۔ مصحفی نے اُن کو اور بھی اشتعال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن کنون نے خود درخواست دی کہ ہمیں تونس بھیج دیا جائے۔ یہ درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی گئی کہ وہ کبھی ماری ٹینیا کی سرزمین پھر قدم رکھنے کا خیال بھی دل میں لائیں۔ جب ان لوگوں کے جانے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں، تو جزورس وزیر مصحفی نے خزانہ کے بار کو کم کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ امیر المومنین کے ان مہمانان ناگوار کو مجبور کیا کہ جتنا عنبر اُن کے پاس ہے وہ داخل سرکار کرتے جائیں۔ واضح ہو کہ ابن کنون کے پاس بڑی مقدار میں عنبر تھا، جسکی قیمت بہت زیادہ تھی اور وہ اُس کو اپنی مال و دولت کا سب سے بڑا حصہ سمجھتے تھے۔ ابن کنون کو وزیر کے اُس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ تونس میں پہنچنے کے بعد یہ جلاوطن سکندریہ چلے گئے، اور وہاں مدتوں خلفاء بنو فاطمہ کے عزیز مہمان اور تحفظ میں رہے۔ اس وقت کے بعد شاہ و شاہزادگان بنو ادریس کا نام شمالی افریقیہ کی تاریخ میں کبھی نمایاں طور پر بروء کار نہیں آیا۔

اگرچہ قرطبہ نہایت آباد و شاد شہر تھا، مگر اُسکے تفوق میں ایک حد تک اس لئے ترقی ہوئی تھی کہ وہ ایسے موقعہ پر واقع تھا کہ دور دور سے زایرین اُس میں آتے تھے اور وہ خلافت کا مذہبی مرکز بنا ہوا تھا؛ یہاں تک کہ خاندان بنو امیہ کے جانی دشمن بھی اس مغربی دار السلطنت کو مقدس سمجھتے تھے؛ کیونکہ یہاں اسلام کی ایک نہایت مقدس زیارتگاہ تھی۔ جو لوگ کہ اس خاندان کے دوست تھے اُن کے دلوں میں جو تقدس اس مقام کو حاصل تھا اُس کا تو کوئی حد و حساب ہی نہیں تھا۔ یہی جگہ امیر المومنین کی تختگاہ تھی، جنکی ذات میں ہر مومن نہ صرف بنو امیہ ہی کا جلوہ دیکھتے تھے جن کے جوہر نے مسلمانوں کی سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا، بلکہ وہ اُن کو رسول عربی صلواۃ اللہ علیہ وسلام کے سچے جانشین سمجھتے تھے۔ اُسی کے دروازوں سے وہ فوجیں نکلی تھیں جنہوں نے جزیرہ نمائے

اندلس کو ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک روند ڈالا تھا؛ فرانس کے بہترین حصّہ کو فتح کرلیا اور کئی مرتبہ کفار کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ہر طرف مسلمانوں کی فتح اور عیسائیوں کی ذلت نظر آتی تھی۔ اُسکی منڈیاں گرجاؤں کے مال مغروقہ سے بھری ہوئی نظر آتی تھیں پردہ نشین حسین عورتیں سینکڑوں کی تعداد میں بکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُسکی مسجدیں عیسائی قیدیوں نے بنائی تھیں۔ جامع مسجد کے دروازے پر سینٹیاگو کے گرجا کا وہ گھنٹہ لٹک رہا تھا جسکو مسلمان جتنا بھی ناز کریں بجا تھا۔ یہ وہ گھنٹہ تھا کہ جسکو الیسٹرپاس کے محافظ ولی کی قوت روحانی بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے ناپاک ہونے سے نہ بچا سکی! افریقیہ اور ایشیا کا کوئی اسلامی دارالسلطنت بھی وہ فوجی شان و شوکت نہیں دکھلا سکتا تھا جو قرطبہ دکھلا رہا تھا۔ دنیاء اسلام کا کوئی شہر قرطبہ کے برابر بادشاہ کی فیاضی، معابد کی دولت و حشمت، رعایا کا علم و ہنر، علماء دین کی فصاحت و بلاغت، اور دینی صولت نہیں دکھلا سکتا تھا۔

وادی الکبیر کے داہنے کنارے پر وہ جامع مسجد تھی جو مسلمانان افریقیہ و اندلس کی نگاہ میں کعبہ شریف کے بعد سب سے زیادہ مقدس تھی۔ اسکی بنیاد امیر عبدالرحمن اول نے رکھی تھی۔ جوش مذہبی اس کا محرک اُتنا جوش مذہبی نہ تھا جتنا کہ سیاسی ضرورت۔ اسکے بعد دیگرے نو بادشاہوں نے اس پر اپنی دولت خرچ کرنے میں کمی نہیں کی، اپنا تمام جوش اسی پر ختم کیا؛ لطافت و نزاکت کا اسی پر خاتمہ کیا؛ اور دنیا بھر میں بیمثال بنا دیا۔ پھر یہ بادشاہ بھی وہ تھے کہ جن کے پاس دولت کا اتنا ذخیرہ تھا کہ اُتنا دُنیا بھر کے کسی دولتمند بادشاہ کے پاس نہ تھا۔ ایشیائی اسلامی سلاطین سے جو کچھ بھی تھوڑے بہت دوستانہ تعلقات اِن بادشاہوں کے تھے وہ رفتہ رفتہ جاتے رہے سلاطین دمشق و بغداد کا برائے نام ادب احترام جو زبردستی اُنہوں نے اپنے سر لیا ہوا تھا اور وہ اُنہیں خراج بھی ادا کرتے تھے یک قلم ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس مسجد کے بانی کا جو خیال تھا، اور جو

---

*۔ اسی قبیل کی باتیں مسٹر سکاٹ پہلے بھی فرما چکے ہیں اور آگے بھی فرمائینگے۔ مگر وہ قابل معافی ہیں، کیونکہ نہ وہ عربی جانتے ہیں نہ مسلمانوں سے اُن کو تعلق پڑا ہے، وہ مسلمانوں کے جذبات کو کیا جانیں۔ (مترجم)

ایسی سیاسی عاقبت اندیشی اور دوربینی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ جسکو خرق عادت کہہ سکتے ہیں، آخر مثمر ہوا؛ اور خاندان بنو امیہ کی رعایا اور باجگزاروں میں اس مسجد کو وہ درجہ و رتبہ حاصل ہو گیا جو عبادتگاہ مکہ شریفہ کو حاصل تھا، جس نے حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی تکالیف اور کامیابیوں کا تماشا دیکھا تھا۔ ایسے موقعوں پر یہ نہ بھول جانا چاہئیے کہ بنوامیہ وہ لوگ تھے کہ جنکو اہل عرب مردود و مطرود سمجھتے تھے۔ ہونے کو تو یہ ایک چھوٹی سی بات تھی کہ ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی، مگر یہ اتنی بڑی سیاسی چال تھی کہ جس نے از روے دنیاوی بلند نظری، اور فخر دینی، براہ راست، مسلمانوں کے دلوں پر اثر کیا؛ اور ایک نئے ترقی کرنے والے خاندان شاہی کی بنیادوں کو مستحکم و مضبوط کر دیا۔* نیک پاک مسلمان جب اس مسجد کے متعلقات کو دیکھتے تھے تو اس کا عجیب اثر اُن کے دلوں پر ہوتا تھا۔ یہ مسجد اُس مقام پر بنی تھی کہ جہاں زمانہ گذشتہ میں ایک بہت بڑا گرجا تھا، جو بت پرستان زمانہ قدیم کے بت خانہ کو تباہ کر کے بنایا گیا تھا۔ اس کی بنیاد کے لئے ناربون سے پتھر منگوائے گئے تھے جس زمین میں کہ یہ بنیاد رکھی گئی تھی وہ کفار کے خون سے رنگین تھی ہزاروں پابجولان عیسائی قیدی دو سو فرسنگ سے زیادہ مسافت طے کر کے اسکے مسالوں کو جانکاہ مصیبت اُٹھا کر یہاں لائے تھے۔ اُن کے علاوہ اور ہزاروں قیدیوں نے کئی نسل متواتر اس کے لئے ٹوکریاں ڈھوئی تھیں۔ بہت سی کامیاب مہموں میں جو مال مغروقہ حاصل ہوا تھا اُس سے اس کے اندرونی حصہ کی زینت ہوئی تھی۔ اس مسجد کے ہر طرف سنہری کتبوں اور فتح کی نشانیوں سے بادشاہان اسلام کی صولت و شوکت ظاہر ہوتی تھی؛ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی فوجیں اس قدر قوی ہیں کہ جہاں جائینگی فتح پائینگی۔ یہ جامع مسجد صرف لطافتہاء فن تعمیر کا خلاصہ ہی نہیں ہے، جس سے بہت سی دور و دراز اُفتادہ اقوام کی صنعت گری معلوم ہوتی ہو بلکہ یہ مسجد ایک مجسم صداقت نامہ ہے اُس جوہر دماغی کا جو معمولی طور پر او ہمہ پرست دماغوں پر اپنا خاص اثر ڈالتی ہے، اور جس نے علم ادب میں جان ڈال دی ہے، اور ایک خاص فن کی بنیاد رکھ دی ہے۔

---

* اسی واسطے ارشاد ہوتا ہے کہ حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطےٰ وقوموا للّٰہ قانتین ﴿ (مترجم)

یہ وہ مسجد ہے کہ جس نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ رومی ستون، افریقی مرغولے شامی محرابیں بنزنطینی پچی کاری، ایرانی فصیل قلعہ کو اگر ایک موزونیت اور لطافت کے ساتھ ملا دیا جائے تو وہ محیرالعقول کیفیت پیدا کر دے سکتی ہے، مانا کہ ان سب ممالک اقوام کے درمیان میں سات سمندر حایل ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق و نسبت نہیں ہو سکتی۔ اس مسجد نے مسلمانان اندلس کی دماغی ترقی، اور وحشی یورپ کی تہذیب میں اتنی مدد کی ہے کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

جو طالب علم اور سیاح جوق در جوق قرطبہ میں آتے تھے۔ وہ نہایت ذوق و شوق و محبّت کے ساتھ سب سے پہلے اس مسجد میں آکر سجدۂ شکر بجا لاتے تھے۔ اہالی عرب اس مسجد کی محرابوں کی خمیدگی کو دیکھ کر نجد و یمن کے نخلستان، اور وہاں کے کھجوروں کی شاخوں کی خمیدگی کو یاد کرتے تھے۔ چونکہ ان کے دل سے ریگستان کی محبت، وہاں کی زندگی اور عادات کسی وقت نہ نکلتی تھی اس لئے ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادیہ کی لطافتوں کو وہ براء العین دیکھتے ہیں، جسکو وہاں کے معمارو نے اپنے فن تعمیر کے سحر سے غیر فانی کر دیا ہے۔ روشن دماغ شامی وہاں کی پچی کاری کو دیکھ کر نقش حیرت سے رہ جاتے تھے، جن کے پیچیدہ اور لطیف نقشے دمشق کی کمخواب اور بادلے کو مات کرتے تھے اور وہ زیب و زینت تھی کہ ایشیائی بادشاہوں کے محل ان کو دیکھ کر شرما جائیں۔ وہاں کی جالیوں میں جو گلکاری تھی اس میں ہندوستان کا ترسول بھی بنا ہؤا تھا۔ یہ عجیب نشان ہے کہ جس کی اصلیت زمانۂ قدیم سے لیکر اب تک معرض خفا میں ہے۔ یہ سیلون اور ہندستان کے مندروں میں اب تک بنا ہؤا ہے۔ باوجود اسکے کہ یہ ایسی قوم کا نشان ہے کہ جو مسلمانوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے، مگر مسلمانوں کی مسامحت قابل دید ہے کہ اسکے لینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایسی قوم کے نشان کو دنیاء اسلام کے ایک نہایت مشہور اور شاندار معبد میں جگہ مل گئی۔ دیواروں کی سرخیوں پر قرمزی رنگ تھا جو شعلہ کی علامت ہے اور ایران سے یہاں پہنچا تھا۔ یہ گبروں، یعنی قابل نفرت آتش پرستوں کی نشانی ہے۔ یوں اس بے نظیر مسجد میں معماروں کے تخیل نے بہت سے زمانوں، اور بہت سی قوموں کے مسالے، زیبائش، ترکیب

خیالات اور عقاید کو لاکر جمع کردیا تھا۔ کوئی عالم دین، صناع، مصور، شاعر، طالب علم، یا زمانۂ قدیم کے اشیاء کا شوقین جتنی دفعہ اس مقدس مقام میں جاتا تھا اُتنی ہی مرتبہ ایک نیا شرح صدر ہوتا تھا۔ ایک زیارتگاہ کی حیثیت سے جو تقدس اس مسجد کو حاصل تھا وہ زمانۂ قدیم کے کسی معبد کو نصیب نہیں ہوا۔ اُس زمانہ میں کوئی مذہب ایسا نہ تھا جو اپنا ایسا ہی معبد پیش کرسکتا ہو علاوہ بریں یہ عمارت بہت صحیح طور پر اُن لوگوں کی روشن دماغی کا عجیب و غریب نمونہ تھا، جنھوں نے اس کو تعمیر کیا تھا، اور جو حقیقتاً تعریف کے مستحق تھے کہ اُنھوں نے ایسی عجوبہ اور حسین عمارت بنا کر کھڑی کردی۔ ملک محروسہ کے تمام صوبوں کے ہر شہر نے اس نیک کام میں ہاتھ بٹا کر ثواب دارین حاصل کیا، مثلاً قرطبہ نے مزدوروں کی فوج کی فوج کو تنخواہیں دیں، مریدا نے ایسے ستون اور اور مسالے بہم پہنچائے کہ معماروں کو اُن پر کچھ بھی مشقت نہ کرنا پڑی۔ اُن چٹانوں اور تماشاگاہوں سے لئے گئے تھے جو ایک زمانہ میں لوسی ٹینیا میں رومیوں کی زیب و زینت کے اسباب بنے ہوئے تھے۔ المیریا اور غرناطہ کی کانوں سے بڑی مقدار میں زبرجد، مرمر اور سماق آیا۔ سیرا کے جنگلوں سے سردیوں کے لئے عرعر کی لکڑی لی گئی جو اس قدر مضبوط تھی کہ پادریوں کی طمع اور تعصب مذہبی نے اُن کو تباہ کرنا چاہا مگر اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکے، نہ صدیاں گزر جانے پر بھی اُن کے اوپر کچھ اثر ہوا، دیمک وغیرہ کے چاٹ جانے کا تو کیا ذکر ہے۔ شاہان ماری ٹینیا اور بیزنطینی باجگزاروں یا حلیفوں نے بنظر حصول ثواب یا برعایت دوستی اس معبد کے لئے صنعت زمانۂ قدیم کے وہ بہترین تبرکات بھیجے جو اُن کو میسر آسکتے تھے۔ جہاد کے مال مغروقہ کا خمس (جس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہی لڑائی میں پینتالیس ہزار دینار آئے تھے) تمام کمال اسی مسجد پر خرچ کیا جاتا تھا، پھر بھی یہ عمارت کے روز افزوں خرچ کے لئے غیر مکتفی ہوتا تھا، اور بیت المال پر بار پڑتا تھا۔ عام مسلمان جو کچھ مسجد کے لئے دیتے تھے وہ ان سب کے علاوہ تھا۔ جیسے جیسے دار الخلافہ کی آبادی بڑھتی جاتی تھی عمارت کی وسعت کی ضرورت پڑتی جاتی تھی جن لوگوں کی زمین مسجد کے ہمسایہ میں واقع تھی اُن کو قرار واقعی قیمت دے کر

اراضی خرید لی جاتی تھی، اور اس پر نہایت فیاضی کے ساتھ اس صلہ میں اُن کو انعام دیا جاتا تھا کہ اُنھوں نے اپنے آرام و آسائش کو قربان کر کے اپنی جائداد فروخت کردی۔ اس مسجد کے بنانے اور وسیع کرنے میں اوّل سے آخر تک دو سو برس لگے تھے، اور خاندان بنو امیہ کے نو بادشاہوں نے اپنے خزانوں وغیرہ سے اس میں مدد کی تھی۔ اہل عرب اس مسجد کی قیمت کا اندازہ ڈیڑھ کروڑ روپیا صرف کرتے ہیں۔ جامع مسجد جب مکمل ہو گئی تو ۶۲۰ فیٹ لمبی اور ۴۴۰ فیٹ چوڑی تھی۔ اس کے قریب ایک تہائی حصہ میں تو ایک چمن تھا جس میں نارنگی، انار اور کھوپے کے درخت تھے۔ اس چمن کی آبپاشی بہت سے فواروں سے ہوتی تھی۔ شمالی دیوار تیس فیٹ بلند تھی۔ جیسے جیسے دریا کا قرب ہوتا جاتا تھا یہ بلند ہوتی چلی جاتی تھی (کیونکہ اُس طرف نشیب تھا) یہاں تک کہ وادی الکبیر کے کنارے سے ستر فیٹ بلند ہو گئی تھی۔ چھت کی حفاظت کے لئے ایک انچہ موٹی سیسے کی چادر لگائی گئی تھی، جسکو زمانہ مابعد میں لوٹیرے پادریوں نے بیچ کر ایک بیش قرار رقم اپنے پیٹوں میں بھرلی۔ اس عمارت کا بیرونی منظر جتنا مضبوط تھا اُتنا ہی دلکش بھی تھا صورت سے وہ بالکل چھوٹا سا قلعہ معلوم ہوتی تھی حقیقت یہ ہے کہ جس دین کا اوڑھنا بچھونا جنگ ہو اُسکے معبد کے لئے اس سے زیادہ موزوں صورت ہو بھی نہیں سکتی دیوار کے بوجھ اور محرابوں کی ثقل کی وجہ سے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پشتے لگانے کی ضرورت ہوئی تھی۔ اُن کی صورت بھی بالکل قلعوں کے بروج کی سی ہو گئی تھی۔ اندر جانے کے لئے نعلی شکل کے محرابوں کے اکیس دروازے تھے، تین صحن میں کھلتے تھے، نو دروازے مشرق اور مغرب کی طرف، علی الترتیب، تھے، تین صرف مستورات کے لئے مخصوص تھے۔ ان دروازوں پر زرد اور سُرخ چینی کا کام تھا، اور سرخ اور نیلی زمین پر جگہ جگہ سنہرے کتبے تھے۔ کواڑوں پر تانبے کی مجلا چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ بہت ہی بڑے بڑے خوشنما کڑے لگے ہوئے تھے، جو دستک دینے کے سامان تھے۔

دنیاءِ مسیحی کا کوئی گرجا عبادت کرنے والے کی نگاہ میں وہ دلکش منظر پیش نہیں کرتا تھا جو ایک مسلمان کو نظر آتا تھا۔ یہ گلی کوچوں کے گرد و غبار اور شور و شغب سے نکلتے ہی جب مسجد

کے صحن نارنج میں قدم رکھتا تھا تو اُسکو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یکایک جنت میں پہنچ گیا ہے۔ یہ
چمن، یا باغیچہ، بالکل منطقہ حارہ کے سے باغوں کی صورت اور ٹھنڈک رکھتا تھا۔ وہاں کی ہوا
نارنگی، گلاب اور یاسمین کی خوشبو سے بسی رہتی تھی۔ وہاں کے کھجوروں کے ہرے ہرے پتّے مدینہ
منورہ کے مشہور و معروف نخلستان کو یاد دلاتے تھے۔ زائرین کے چشم تصوّر کے سامنے ایشیا کے
مناظر آجاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے نارنگی کے دلکش درختوں، اُن کے نرم نرم چمکدار پتّوں، سنہرے
پھلوں اور سفید برّاق پھولوں کو دیکھ کر ایشیا کا لطف آجاتا تھا۔ پاکیزہ پھولوں کی لطیف اور
خوشنما کیاریاں، دلکش شکل و صوت کی احاطہ کی محرابوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ پھولی رہتی تھیں۔
چار بڑی بڑی حوضیں، اور اُن میں فوّارے، مسلمانوں کی اُس ضرورت کو رفع کرتی تھیں، جو از روئے
شرع اُن پر فرض قرار دی گئی ہے۔ ان حوضوں پر سے، مسلمانوں کے پرے کے پرے سفید کپڑے
پہنے ہوئے، شان خودداری لئے ہوئے، مسجد اور اُسکے دروازوں کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے تھے
دالان مسجد کے جو دروازے صحن کی طرف تھے اُن میں، گلکار اور چھپے ہوئے چمڑے کے خوشنما پردے
پڑے رہا کرتے تھے۔ آدمی اندر پہنچتا تھا تو ستونوں کا ہجوم دیکھ کر آنکھیں گھبرا جاتی تھیں۔ اُن کی تعداد چودہ سو
سے کچھ زیادہ تھی۔ ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان ستونوں کا سلسلہ کبھی ختم
ہونے والا نہیں ہے۔ ان ستونوں کی کرسیاں نہ تھیں، اور اُن کا زیادہ حصّہ سونے کے پتروں سے
ڈھکا ہوا تھا۔ ان ستونوں کے اوپر دوہرے دوہرے محراب، سُرخ اور سفید رنگ کے تھے اِن
کے اوپر چھت تھی کہ جس میں زخرفۃ العرب کا کام تھا، اور جگہ جگہ قرآن مجید کی آیتیں تھیں چھت
کہیں بیضوی، کہیں شش پہل، اور کہیں گول تھی۔ یہ ایک دوسرے سے ملحق اور ملتی جلتی ہوئی
تھی لیکن رنگ و روغن اور سجاوٹ کے اعتبار سے ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فرش بہت
سے رنگوں کے پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ اُن کا نقشہ اگرچہ سادہ تھا، مگر نہایت خوش آیند و لطیف
جالیاں زبرجد کی تھیں۔ اُن کی کھدائی عجیب و غریب تھی۔ ایک کے پھول بوٹے دوسرے سے
نہ ملتے تھے۔ ان ہی میں سے چھن چھن کر دھوپ آتی تھی، اور عجیب لطف پیدا کر جاتی تھی۔ انتہا سمت

جنوب میں محراب تھی، جس کا رُخ صحیح طور پر قبلہ شریف کی طرف تھا۔ اُسی کی طرف مُنہ کرکے مسلمان پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں مسلمانوں کے یہاں محراب کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو یہودیوں کے معبدوں میں "قدس" کی، فرق صرف اتنا ہے کہ اُس کا رخ بیت المقدس کی طرف ہوتا ہے۔ اسکو خلیفہ حکم ثانی نے بنایا تھا۔ اس کی سجاوٹ لاثانی تھی، اور اس کے پھول بوٹے اپنی کہیں نظیر نہ رکھتے تھے محراب کا قُبّہ نہایت خوبصورت اور نازک محرابوں پر قائم تھا۔ اس قبہ کے نیچے جتنا فرش تھا اُس کا رقبہ پندرہ فیٹ تھا اور اسی قدر اونچا تھا۔ نیچے سے یہ ہشت پہل تھا اس میں دو دروازے تھے، جو دو خوبصورت چھوٹے چھوٹے کمروں میں کھلتے تھے۔ ان دروازوں کے اوپر چار ستون سنگ سبز اور لاجورد کے نہایت نازک تھے اور اُن پر نعلی محرابیں قائم تھیں محراب کے فرش میں سنگ مرمر کی جو سلیں لگی ہوئی تھیں اُن میں نقش و نگار تھے اور جگہ جگہ سونے کا کام تھا۔ اسکی چھت صرف ایک پتھر کی تھی، جسکو معمار کی صنعت نے کھود کر بڑی ساری سیپ کی شکل کا بنا دیا تھا۔ دہلیز اور دیواروں میں، ستونوں اور قبہ میں، بیزنطینی پچی کاری چمک چمک کر قسطنطنیہ کے کاریگروں کی محیر العقول صنعت کی داد مانگتی تھی۔ شاہ قسطنطین اور عبدالرحمٰن کے درمیان میں جو معاہدہ ہوا تھا اُس کے موافق یہ طے ہو گیا تھا مسجد کی پچی کاری کا تمام سامان قسطنطنیہ سے مہیا کیا جائیگا۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک ہی جہاز بادشاہ قسطنطنیہ کے حکم سے امیر المومنین الحکم کے پاس ساڑھے چار سو من قیمتی پتھر لے کر آیا تھا ٭

کوفی خط میں جتنے کتبے تھے وہ سب خالص سونے کے تھے۔ یہ خط بذاتہ ایسا ہے کہ بلا کسی قسم کی تصنع کئے ہوئے دیواروں کی سجاوٹ اور پھول بوٹوں کا کام دیتا تھا۔ زمین مختلف رنگوں مثلاً قرمزی، سیاہ، نیلی، سبز اور سرخ دی ہوئی تھی، اور ان میں ایسا اسلوب اور موزونیت پیدا کی گئی تھی کہ آنکھوں کو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پچی کاری میں جو خم و پیچ آتے تھے وہ خط کوفی کے حروف کے مختلف زاویوں میں کھپ کر نہایت لطیف صورت پیدا کرتے تھے

شیشے کے ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، جو ایک انچ مربع میں کئی سو لگے تھے، اس کام کے لئے مسدس الاضلاع تراشے گئے تھے۔ اتنی بڑی عمارت میں اتنا نازک کام کرنے میں جتنی محنت اور جتنا وقت صرف ہوا ہوگا اُس کا اندازہ اگر ہم آج کرنے بیٹھیں تو ناممکن ہے۔ اس کی تکمیل میں برسوں صرف ہوئے۔ اس کی پختگی اور مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ عیسائی وحشی مردم خواروں کے تباہ کن ہاتھوں سے جہاں کہیں بچ گئے ہیں وہ اس وقت بھی ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آج بن کر ختم ہوئے ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ ہزاروں انقلاب ہو گئے، لاکھوں صدمات ان پر پڑ گئے، گیارہ صدیوں میں کروڑوں تباہ کن ہاتھوں نے ان کو پامال کرنا چاہا، مگر ان کی چمک اس وقت تک ویسی کی ویسی ہی ہے جیسی کہ اُس دن کہ جب یہ بنائے گئے تھے۔

محراب کے اندر منبر تھا، جو امیر المومنین الحکم ثانی کے زیر ہدایت و نگرانی بنا تھا۔ یہ اُس موقعہ پر استعمال ہوتا تھا کہ جب خلیفہ بحیثیت جانشین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھتے تھے×۔ یہ قیمتی لکڑیوں کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بنا ہوا تھا، جن کے ساتھ ہی ویسے ہی نازک ٹکڑے ہاتھی دانت، کچھوے کی کھوپری اور سیپ کے تھے۔ اس کی میخیں سب چاندی یا سونے کی تھیں۔ اس نمونۂ صنعت کی تکمیل میں سات برس لگے تھے۔ اسکو دیکھ دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اس کی کھدائی کا کام عجوبۂ روزگار تھا۔ اُسکی قیمت ذاتی میں جواہرات کی منبت کاری سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس منبر کے اندر٭ ایک قیمتی کپڑے کے جزدان میں، جس میں سنہرا کام تھا اور موتی ٹکے ہوئے تھے، وہ مشہور قرآن مجید تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی شہادت کے وقت آپ کے سامنے تھا، اور آپ کے خون سے اُسکے صفحات رنگین ہو گئے تھے۔ یہ اس کی نشانی تھی کہ خاندان بنو امیہ پر سخت ظلم ہوئے تھے۔ خاندان بنو عباس و بنو فاطمہ، جناب رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے تبرک کو بھی اتنی قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے، جتنا کہ اس کو اندلس کی رعایا و بادشاہ

× یہاں مسٹر سکاٹ کی تخیل کام کر رہا ہے۔ ورنہ منبر کے لئے کوئی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ (مترجم)

٭ اندر یا اوپر؟ (مترجم)

سمجھتے تھے۔ یہ قرآن شریف اُن کی حفاظت، شان و شوکت اور دینی و دنیاوی شاہی قوت کے لئے گویا ایک تعویذ تھا۔ اُس کی رحل عود کی لکڑی کی بنائی گئی تھی جس میں جواہرات لگے ہوئے تھے۔ جمعہ کے دن مراسم شاہی کے ساتھ یہ قرآن شریف کھولا جاتا تھا اور اسی میں سے پڑھا جاتا تھا۔ اس قرآن شریف اور رحل وغیرہ کے اُٹھانے کے لئے چار آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے سامنے امام مسجد اور موذن وغیرہ ہوتے تھے؛ قندیل روشن کئے جاتے تھے، اور عود سلگائی جاتی تھی جس زمانہ میں کہ مذہب رومن کیتھولک اپنے شباب پر تھا، اور اُس مذہب کے پادری کوس لمن الملکی بجا رہے تھے اُن دنوں بھی اُن کے جاہ و جلال کا وہ اثر نہ ہوتا تھا جو ہر جمعہ کو اس قرآن شریف کو بارہ ہزار نمازیوں کے سامنے نکالنے کا اثر پڑتا تھا۔

عین محراب کے سامنے مقصورہ تھا، جو امیر المومنین، خاندان شاہی اور بڑے بڑے علمان دین کے لئے مخصوص تھا۔ یہ سات ستونوں کے اوپر بنا ہوا تھا، اور اُس کا دروازہ محراب کی طرف کھلتا تھا۔ لمبائی میں ۷۲ فیٹ اور چوڑائی میں ۳۴ فیٹ تھا۔ اس کو خوشبودار لکڑی کی جالیوں سے گھیرا ہوا تھا اور جگہ جگہ اس میں بھی قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ باوجودیکہ ان جالیوں میں فاصلہ چھوڑا گیا تھا، مگر وہ کچھ اس طرح بنائی گئی تھیں کہ باہر کے آدمی کو اندر کا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ ان جالیوں کی اونچائی ۵ فیٹ تھی جس سے مقصورہ حقیقت میں ایک دیوار سے گھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سب سے اوپر جا کر اس میں مُجلّا بروج بنے ہوئے تھے۔ مقصورہ کے اندر چاندی کی اینٹوں کا فرش تھا۔ جس بڑے دروازہ سے کہ اس میں امیر المومنین داخل ہوتے تھے اُس پر سونے کی چادر مڑھی ہوئی تھی۔ جب امیر المومنین نماز کے لئے مسجد میں آتے تھے تو اُن کو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ قریب ہی محل شاہی تھا۔ اُسکے اور مسجد کے درمیان میں جو گلی تھی اُس میں ہر طرف سے چھتا ہوا ایک پل تھا۔ اس پر سے گزر کر وہ ایک چور راستہ میں داخل ہوتے تھے، جو مسجد کی جنوبی دیوار پر ختم ہوتا تھا۔ اسی کے اوپر محراب تھی۔ یہاں سے ہوتے ہوئے امیر المومنین اپنے مقصورہ میں داخل ہو جاتے تھے۔ اس چور راستے کے آٹھ دروازے تھے، ہر دروازے پر ایک ایک سپاہی بطور چوکیدار کے کھڑا رہتا تھا۔ یہ دروازے

یکے بعد دیگرے مشرق اور مغرب کی طرف کھلتے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر کسی سپاہی کے دل میں بے ایمانی آجائے تو اُسکی دغابازی پورے طور پر کارگر نہ ہوسکے، اگر اُن میں سے ایک بھی وفادار رہا تو وہ اکیلا ساٹ آدمیوں کو روک سکتا تھا جب امیر المومنین مسجد میں داخل ہوجاتے تھے تو اور بھی جاہ و حشم کی نمائش کیجاتی تھی۔ ایک ریشمین پردہ، جس میں رو پہلا کام بنا ہوا تھا، محل شاہی کے دروازے سے لے کر مقصورہ تک کھول دیا جاتا تھا۔ کالے اور گورے خواجہ سرا، قیمتی لباس پہنے ہوئے، بادشاہ کے آگے اور پیچھے ہوتے تھے۔ اس وقت محافظ تن فوج کا کام اراکین خاندان شاہی کرتے تھے۔ وہ ننگی تلواریں لئے اور زرہ بکتر پہنے ہوئے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ احتیاطیں اُن حوادث کی بنا پر کی جاتی تھیں جو جانشینان جناب سرور کائنات علیہ التحیتہ و الصلوٰۃ کو پیش آچکے تھے۔ جو تقدس حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو حاصل تھا اُس نے بھی اُن کو سفاک قاتلوں کی تلوار سے نہیں بچایا۔ باشندگان قُرطبہ مشہور جرائم پیشہ اور مذہبی دیوانے تھے، اُن کی وجہ سے بادشاہ اگر خوفزدہ رہتا تھا تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے کہ بعض وقت تمام فوج شاہی اُن کے اُن انقلابی بدنیتی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی، جو دنیاء اسلام کے قسمت آزما لوگ اُن کے دلوں میں پیدا کردیتے تھے۔ مسجد کے مغرب کی طرف شاہی محل کے سامنے ایک مکان تھا کہ جہاں امیر المومنین کی طرف سے خیرات و مبرات تقسیم کیجاتی تھی، جس کا دنیا اُن کے مذہب نے اُن پر فرض کر رکھا تھا۔

مسجد کا دالان چونکہ بہت وسیع تھا، اور اُسکی چھت اُسکی وسعت کے لحاظ سے کم اونچی تھی اس لئے وہاں اندھیرا رہتا تھا، یہاں تک کہ دوپہر کے وقت بھی وہاں چراغ روشن رہتے تھے۔ تانبے اور چاندی کے ۲۰۰ جھاڑ اُسکی محرابوں میں لٹکتے رہتے تھے، ان میں جو تیل جلایا جاتا تھا وہ خوشبودار ہوتا تھا۔ ان میں سے سب سے بڑے جھاڑ میں ۱۴۵۴ چراغ تھے اور اس کا دور ۳۸ فیٹ کا تھا۔ اس کی روشنی کو منعکس کرنے کے لئے ۳۶ ہزار چاندی کے چمکدار ترپے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سونے کی کیلوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اس جھاڑ کی خوبصورتی اُن جواہرات کی وجہ سے اور بھی دوبالا ہوگئی تھی جو

اس میں مناسب قمقموں پر جڑے ہوئے تھے چونکہ جگہ جگہ آئینے لگے ہوئے تھے، اس لئے روشنی اصل سے نوگنی زیادہ ہوجاتی تھی۔ تمام رمضان شریف کے مہینہ میں ۲۰ ہزار چراغ مسجد میں روشن کئے جاتے تھے۔ ایک بہت بڑی بتی، قریباً تیس سیر وزن کی، مقصورہ میں جلتی تھی۔ اسکو اس اندازہ سے بنایا جاتا تھا کہ وہ رمضان کی آخری تاریخ کو ختم ہوتی تھی۔

دنیاء اسلام میں رمضان شریف کو ایک عجیب اور گہری حیثیت حاصل ہے لیکن جیسی شان و شوکت اور لطف اس مہینہ میں قرطبہ میں ہوتا تھا وہ اسلامی دنیا میں کہیں بھی نظر نہ آسکتا تھا۔ اس مہینہ میں طلوع آفتاب سے لے کر غروب تک نہ کھانے کا ایک لقمہ نہ پانی کا ایک قطرہ مسلمان کے حلق میں جاسکتا ہے۔ غروب کے بعد دن بھر کے فاقہ کا بدلہ مسلمان ایک حد تک نکال لیتے ہیں۔ قرطبہ میں آفتاب غروب ہوتے ہی میناروں اور برجوں پر چراغ جلائے جاتے تھے، ارغنون اور بانسریوں کی خوش آیند آوازیں رواقوں سے سنی جاتی تھیں، امرا کے محلات میں آدھی آدھی رات تک کھانے پینے کا چرچا رہتا تھا، ہر طرف عوتوں کے سامان نظر آتے تھے، لوگ زرق برق کپڑے پہنے ہوئے ہر طرف گھومتے دکھلائی دیتے تھے۔ بازاروں کے چوکوں وغیرہ میں جہاں لیموں اور نارنگی کے ہرے بھرے درخت ہوتے تھے، رقاصہ اور قصہ خوان کے گرد ایک ہجوم ہوتا تھا اور لوگ ناچ دیکھنے یا قصہ سننے میں منہمک ہوتے تھے۔ مے نوشی کی ممانعت فراموش کردی جاتی تھی جہاں ان سرمستان بادۂ غفلت کا مجمع ہوتا تھا وہاں کوئی نہ کوئی متقی مسلمان ان کو ان کے افعال بد پر ملامت کرنے کو بھی پہنچ جاتا تھا۔ ہر طرف خوشی خرمی، بے فکری اور عیش و نشاط کا دور دورہ ہوتا تھا۔

لیکن مسجد کے اندر ایک اور ہی منظر ہوتا تھا۔ بلند میناروں کی بلند غلام گردش سے جس کا درمیانہ حصہ نظر نہ آتا تھا، مگر اس کا سنہرا چمکدار قبہ چراغوں کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کئے دیتا تھا، مؤذن کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ امیدواران صلاح و فلاح کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ ہر ایک دروازے سے نمازیوں کے گروہ درگروہ سیل کی طرح مسجد کے اندر جاتے دکھلائی دیتے تھے۔ ان نمازیوں میں مردوں سے الگ کچھ اور جاندار خاص دروازوں کی طرف بڑھتے نظر آتے تھے، جنکے ساتھ لمبے لمبے تشمین

چُغہ پہنے ہوئے ہیبت ناک خواجہ سرا ہوتے تھے۔ یہ حرم سراؤں کی خواتین ہوتی تھیں، جن کو آزاد خیال اندلسیوں نے برقعہ و نقاب سے بھی آزاد کر دیا تھا۔ وہ ایسے موقعوں کو بھیس بدلنے اور سازشیں کرنے کے لئے ہزار غنیمت سمجھا کرتی تھیں۔ اب مسجد کے اندر دیکھئے تو نظر کو طلسم کا دھوکا ہوتا تھا؛ اتنی بڑی عمارت کا کونہ کونہ ہزاروں چراغوں سے روشن ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ چراغ آفتاب نصف النہار کو اپنا رقیب سمجھ کر اپنے مقابلہ میں اُسکو ماند کرنے کی کوشش کرتے ہیں چمکتی ہوئی دیواروں پر چھت اور اُسکے سنہرے روپہلے کتبوں پر، ہزاروں ستونوں کی سنہری چادروں پر مقصورہ کے سونے اور جواہرات پر یہ روشنی پڑتی تھی تو اور بھی چار چاند لگ جاتے تھے۔ لوبان، عود اور عنبر کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا۔ ستونوں کے جنگل میں سے ہو کر بہت فاصلہ پر نظر بے ساختہ محراب سے جا کر ٹکراتی تھی، جس کا چمکدار فرش، ہر قسم کے رنگوں، بے تعداد جواہرات کی ضو اور اس روشنی میں اور بھی جگمگا اُٹھتا تھا؛ آخر میں محراب ہر مسلمان کو ستارو کی سی رہبری کے ساتھ سمت قبلہ کو دکھلاتی تھی۔ امام محراب میں صاف کھڑا دکھلائی دیتا تھا؛ اس کی تقلید میں یہ بے تعداد مجمع گویا کسی منتر سے متاثر ہو کر یک جان و چندیں قالب، نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے؛ اور اسلامی قواعد و رسوم کے موافق اُس کی حرکات و سکنات میں اُس کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ انہماک پیدا کر دینے والا تماشا تھا کہ ہر رات کو رمضان بھر اُس مسجد قرطبہ میں نظر آیا کرتا تھا، جو اُس زمانہ کے سب سے زیادہ روشن دماغ بادشاہوں کی دیندارانہ فیاضی و سخاوت سے گویا خزانہ و جواہر خانہ بن گئی تھی؛ اور جس کی ہر بات میں وہ شوکت و صولت تھی کہ آج چشم تصور بھی اُس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ زمانۂ قدیم کے بُت خانوں کی زیب و زینت اور صناعان ایشیا کی کاریگری کا آج ہر شخص مداح نظر آتا ہے؛ مگر اُن کو اور مسجد قرطبہ کو خاک عالم پاک کی نسبت بھی نہ تھی۔ اس مسجد میں چاندی سونا، جواہرات، اور قیمتی (اس وقت ناممکن الحصول) لکڑیاں اس بے دردی کے ساتھ خرچ کی گئی تھیں کہ کنکر پتھر کی بھی قدر تھی مگر وہاں اُن چیزوں کی قدر نہ تھی۔ اس مسجد میں اسلامی فتوحات کی یادگاریں عام منظر پر رکھ کر دین اسلام کے فاتحانہ جذبات کو برأی العین

دکھلادیا تھا۔اس مسجد میں چاندی کے قطار در قطار جھاڑ اور قندیل تھے' جن میں خوشبودار بتیاں اور خوشبودار تیل جلتا تھا۔ چاندی کی مجمریں تھیں کہ جن میں عود واگر وعنبر منوں سلگ جاتا تھا۔ یہ بات جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے نہ کسی معبد کو حاصل ہوئی' نہ حاصل ہوگی۔

متذکرۂ بالا چمنِ نارنج کے شمال کی طرف امیر المومنین الناصر الدین اللہ کا بنوایا ہوا ایک مینار تھا' جو فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا' اور ہر طرح اس قابل تھا کہ وہ اُس عالیشان اور خوبصورت عمارت میں اُس کام کے لئے مستعمل ہو' جسکے لئے وہ موضوع تھا۔ ہر زمانہ کے ہر شخص نے اسکو تسلیم کیا ہے کہ یہ مینار دنیا بھر میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا' ۲۷ فٹ مربع اور ۱۰۸ فٹ بلند' ریختہ کئے ہوئے سنگ رخام کا بنا ہوا تھا۔ اسکے لئے پتھر افریقیہ سے آیا تھا۔ اُسکے ہر کناروں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار کھود کر بنائے گئے تھے' اور اسکی زمین لاجوردی اور چمکتے ہوئے سرخ رنگ کی تھی۔ روشنی کے لئے اس میں کھڑکیاں رکھی گئی تھیں' جن میں بہت ہی خوبصورت محرابیں تھیں' اور یہ محرابیں نہایت نازک اور خوبصورت ستونوں پر قائم تھیں' کہ سُرخ اور سفید سنگ یشب کے تھے۔ ان میں آدھی کھڑکیاں تو دو دو طرف کھلتی تھیں اور باقی تین تین طرف۔ مختلف قسم کی درخشندہ زیبائش کے ساتھ ایک عجیب لطف انگیز سماں اُن سے پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے اندر کی طرف دو زینے اس طرح بنائے گئے تھے کہ اگر ایک شخص اُترتا ہو اور دوسرا چڑھتا ہو تو ایک کو دوسرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زمین سے ۸۱ فیٹ بلندی پر ایک غلام گردش جیسا چھوڑا ہوا تھا جس پر موذن کھڑا ہو کر اپنا فرض منصبی ادا کرتا تھا۔ اس سے چھوٹا ایک اور مینار تھا' جسکی شکل وصورت بڑے مینار کی سی تھی۔ یہ بارہ فیٹ بلند تھی۔ اس میں بھی موکھے وغیرہ اُسی طرح بنے ہوئے تھے جیسے کہ مسجد میں۔ اسکے اوپر تین گیندیں جیسی بنی ہوئی تھیں' دو سونے کی اور ایک چاندی کی' جنکے گرد چاندی کے بنے ہوئے چنبلی کے پھول لپٹے ہوئے تھے اور ان تینوں کے اوپر ایک سونے کا نہایت چمکدار انار بنا ہوا تھا۔ تین سو بڑے بڑے عہدہ دار' جو خادمانِ کعبہ کی طرح خواجہ سراء ہوتے تھے' اس مسجد کی خدمت کے لئے مختلف

عہدوں پر مقرر تھے چھوٹے چھوٹے خدمتی لوگ مسجد کے اندر ہی رہتے تھے۔ مقصورہ کے اوپر دن رات پہرہ رہتا تھا۔ اسکے نیچے ایک تہ خانہ تھا جس میں جھاڑ، فانوس، قندیل وغیرہ رکھے رہتے تھے، اور عیدین وغیرہ کے دن کام آتے تھے۔

یہ تھا قرطبہ کا وہ عالیشان معبد جو ایک زمانہ میں اسلام کا مایۂ فخر و ناز تھا۔ یہ تھی وہ بہترین شاندار عمارت جس سے بہتر خیال واہمہ پرستی اور سیاسی تدبیر کبھی انسان کے دل میں نہیں پیدا کر سکتی، نہ اس سے بہتر عمارت کا خیال کسی بڑے سے بڑے آدمی کے دل و دماغ میں آسکتا ہے، نہ کوئی انسانی طاقت اس سے بہتر عمارت بنا سکتی ہے۔ اس کی تکمیل نے خاندان بنو امیہ کو انتہاء عروج پر پہنچا دیا، جن کا اثر بالواسطہ مسیحی اقوام پر بھی پڑا، اور ان میں انسانی دماغ سے کام لینے کی تحریک پیدا کر دی۔ اس سے پہلے تو وہ کلیسائیوں کی غیر مسامحت کے بندے، اور بت پرستوں کی روایات کے غلام تھے۔ اس مسجد کے معماروں کو مختلف ذرائع سے اس عمارت کا نقشہ سوجھا، کہیں اس کو یہودیوں کے کینسہ سے مماثلت ہے، کہیں بیت المقدس سے مشابہت ہے۔ اسکی سجاوٹ اور نقش و نگار میں یونان کے شاندار گرجا کا نقشہ معلوم ہوتا ہے اسکی بتیاں اور مجمر لاطینیوں کی مذہبی رسوم کو یاد دلاتی تھیں، جنہوں نے اس کو بت پرستوں کے مذہبی قربانیوں کے رسوم سے لیا تھا۔ اس وقت بھی، کہ اسکی حالت بہت ہی بُری ہے، قدم قدم پر ان اغراض کے نشانات نظر آتے ہیں جنکے لئے ایک ایک چیز بنائی گئی تھی۔ تاوقتیکہ اس عمارت کا قطعاً نام و نشان نہ مٹا دیا جائے، اس جوش مذہبی کی علالت نہیں مٹ سکتی، جو اسکے بانیوں میں بدرجۂ اتم تھا۔ دالان میں ستونوں کا جنگل دیکھ کر وہ ہیبت پیدا ہوتی ہے، کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جب تک یہ بالکلیہ مٹ جائے ایشیائی شان و شوکت اور رعب و داب کی نشانی جو بہت کچھ مسخ ہو چکی ہے، کسی طرح نہیں مٹ سکتی۔ یہ مسجد جتنی کچھ بھی باقی ہے، ایک مٹی ہوئی قوم کی تہذیب کی تصویر ہے، جسکے کارنامے صرف یہی نہیں کہ تانبے کے پتروں، یا سنگ مرمر کے سلوں، پر لکھے ہوئے ہوں۔ بلکہ کسی اور چیز پر تحریر ہیں جنکے نقش کبھی مٹنے والے نہیں۔ ان کے

مٹنے کے بعد جتنی نسلیں گزری ہیں اُن کے دلوں پر اُن کے چھوڑے ہوئے آثار اُن کی شان و شوکت کا رعب ڈالتے ہیں، اور جن لوگوں نے اسکو بنایا تھا اُن کی صنعت کا سب کو قایل ہونا پڑتا ہے اور پڑتا رہیگا*۔

امیر المومنین الحکم کی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی تھی۔ اُنہوں نے یہ چاہا کہ جہاں تک ہوسکے اس کا انتظام کرلیں کہ اُن کے بعد جانشینی کے لئے فتنہ و فساد نہ ہونے پائے۔ اُن کا صرف ایک ہی بیٹا، ہشام، تھا، جسکی عمر اُس وقت چودہ برس کی تھی لیکن اُن کے خاندان

* مسلمانو! یہ ہے وہ مسجد اور اُس کے متعلقات، جس پر آپ جتنا فخر کریں بجا ہے۔ آج یہ مسجد پرستاران صلیب کے قبضہ میں ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیئے گئے ہیں، اس کو مسخ کردیا گیا ہے۔ میرے آقا و مولےٰ صلے اللہ علیہ وسلم (نسبت خود بسگت کردم وبس منفعلم * زانکہ نسبت بسگ کوے تو شد بے ادبی) کا نام مبارک مٹا دینے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے، مگر میری غیرت و حمیت لایق دیدداد ہے کہ دل پر کچھ اثر نہیں۔ ایک انگریز نے لکھا ہے کہ وہ اس مسجد میں کھڑا ہوا اُس عمارت اور اس کے بانیوں کی عظمت و جلالت سے مرعوب ہو رہا تھا کہ چند افریقی مسلمان آئے، اُنہوں نے بھی اس عمارت کو دیکھا، اور ہنستے کھیلتے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ ہماری بنائی ہوئی ہے یہ مقام فلاں کام کے لئے تھا اور یہ جگہ فلاں ضرورت کے لئے" اور نہایت بے پروائی سے نکل گئے، اُن کے دلوں پر مطلق کسی طرح کا اثر نہ تھا (مری تربت پہ سب روئے نہ رویا پردہ سنگین دل) یہ ہے میری غیرت و حمیت۔ یاد رکھئے کہ غیرت و حمیت ہی وہ چیز ہے جو قوم کو باقی رکھتی ہے جتنی اس میں کمی ہوتی ہے اُتنا ہی قوم کی زندگی پر اثر ہوتا ہے۔ یہ آپ کی مٹی ہوئی عظمت کے آثار نہیں ہیں آپ کے لئے تازیانۂ غفلت ہیں۔ بشرطیکہ آپ اُن سے فائدہ اُٹھائیں، بشرطیکہ آپ کو اُن سے تنبیہ ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی قوم کی انحطاط کی حالت چنداں بُری نہیں ہوتی کیونکہ اس حالت میں قوم اپنی شمشیرزنی اور ملک گیری کرتے کرتے تھک کر آرام کرتی ہے مسلم۔ مگر خدا نہ کرے کہ اُس قوم کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ ضعف و صد عیب سے اتنی کمزور ہو جائے کہ اُٹھ ہی نہ سکے، جیسے بد قسمتی سے ہم میں افراد جو حالت انحطاط و زوال میں پیدا ہوں، جیسے ہم ہیں جانتا اور مانتا ہوں کہ آپ کچھ نہیں کرسکتے، آپ ہل نہیں سکتے، لیکن کیا آپ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ اس مسجد کے بانیوں اور اس میں نماز پڑھنے والوں کے حق میں دعاء مغفرت کریں؟ کیا میں اتنی ذرا سی بھی امید آپ سے نہیں رکھ سکتا؟ (مترجم)

میں کئی مثالیں ایسی ہیں کہ اُن کے ایک جدی رشتہ دار نے تخت و تاج کا دعوےٰ کیا ہے اور اسکے لئے تیغ و تفنگ تک نوبت پہنچا دی ہے۔ اس لئے امیر المومنین الحکم نے بلا اظہار مدعا اُمرا، گورنران صوبجات، افسران و سپہ سالاران فوج اور وزراء دولت کو بلا کر مجلس شوراے منعقد کی۔ امیر المومنین سب سے آخری دفعہ کانپتے ہوئے اور ضعف سے سر جھکائے ہوئے تخت خلافت پر متمکن ہوئے۔ وزیر کی معرفت انہوں نے تمام لوگوں کو یہ بتلایا کہ وہ کس غرض کے لئے بلائے گئے ہیں، اور سب سے یہ درخواست کی، جو بمنزلہ الحکم کے تھا، کہ سب لوگ ایک دستاویز پر دستخط کر دیں، جس میں لکھا تھا کہ ہم سب ہشام کو امیر المومنین الحکم کا ولیعہد تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ ہو چکا تو ویسی ہی دستاویزات فوراً تمام صوبجات ملک محروسہ میں بھیج دی گئیں کہ وہاں کے حکام ماتحت اور رعایا سے دستخط لے لئے جائیں، تاکہ ہر عملی تدبیر سے اپنے خاندان کے استقلال و استحکام کا یقین ہو جائے، آخر اس خاندان میں قاعدۂ توریث تو جاری ہی تھا۔ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ ان احتیاطی تدابیر کا کیا نتیجہ نکلا۔

شاہزادہ ہشام کو ولیعہد قرار دلانے کے بعد جو چند ماہ امیر المومنین الحکم کی عمر کے باقی رہ گئے تھے وہ انہوں نے نیک کاموں میں گزارے۔ اپنے دنیاوی کام اور سلطنت کا آیندہ انتظام انہوں نے دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ اُن کے دل کی حالت خراب تھی، اور بینائی کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی، اس لئے وہ علم ادب کا بھی لطف نہیں اُٹھا سکتے تھے، جسکے وہ بہت ہی شوقین تھے۔ اُن کو اپنے روز افزوں ضعف کا احساس تھا، اور اُن کو اپنے آخری وقت سے متنبہ ہوتا جاتا تھا، اس لئے وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ اپنے فرائض دینی کو ادا کریں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی زیادتی کی ہے، نہ انہوں نے کسی کو ستایا، نہ وہ کسی جرم کے مجرم ہوئے۔ وہ فیاضی اور خیرات و مبرات میں ہمیشہ سے ممتاز شہرت رکھتے تھے، تہمت بھی اُن پر یہ الزام نہیں لگا سکتی کہ وہ متعصب تھے، نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ کبھی اُن پر غا بازی کا دھوکا بھی ہوا ہے۔ نہایت سخت اور کٹے مفسرین و ناقلین دین، اور نہایت آزاد منش ملحد اُن کے دربار میں، بفراخ دلی ایک وقت میں جمع رہتے تھے اور دار الخلافہ کے کتب خانوں میں بکشادہ پیشانی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ جو دماغی آزادی کہ اُن کے زمانہ

ہیں ہر شخص کو حاصل تھی اُس سے کم تہذیب یافتہ ملکوں کے جاہل مسلمان سخت ناخوش تھے کیونکہ وہ لوگ کفار سے مسامحت کرنے اور بدعقیدہ لوگوں کو آزادی دینے کو اچھا نہ سمجھتے تھے لیکن اہلی اندلس جہاں تعلیم عام اور جبری تھی، اور تمام رعایا اس سے متاثر ہو چکی تھی، اس عایت کی بہت بڑی قدر کرتے تھے ٭

اگرچہ امیر المومنین سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوا تھا کہ ان کا نفس لوامہ ان کو ملامت کرتا؛ مگر جس طرح ہر نیک خدا ترس آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے دین کے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کیا وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ میں سخت گنہگار ہوں۔ اب ان کا نصب العین یہ تھا کہ جس طرح ہو سکے وہ اس کا کفارہ کریں، اور عاقبت کے لئے کچھ ذخیرہ جمع کر لیں۔ بہت سا روپیہ انہوں نے خیراتی کام پر صرف کیا، اور رعایا پر جتنا ٹیکس لگا ہوا تھا وہ بقدر چھٹے حصہ کے معاف کر دیا؛ جس سے اُن کی رعایا اُن کی بہت شکر گزار ہو گئی؛ اور چونکہ ملک میں امن و امان کامل تھا اس لئے بیت المال پر بھی چنداں برا اثر نہیں پڑا؛ بلکہ وزیر مصحفی کے زیر نگرانی، اور ان کی جزرسی سے خزانہ اور بھی معمور ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے ہزاروں غلاموں کو آزاد کر دیا، اور ان کے نان و نفقہ کا بھی فکر کر دیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ بازار کے اُس حصہ کا تمام کرایہ جہاں زین سازوں کی دکانیں ہیں (جن کی ضرورت سرکار کو پڑتی تھی) ہمیشہ کے لئے ان مدارس پر خرچ کیا جائے جو غربا کے بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ چونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ رعایا کی آسایش و آرام و اطمینان کا انحصار اُن کے بادشاہ کی خصایل پر ہے، اس لئے وہ ہمیشہ بدلایل قاطعہ پدرانہ شفقت کے ساتھ اپنے ولیعہد شاہزادہ ہشام کو بادشاہ کے فرایض اور ذمہ واریوں کو دلنشیں کیا کرتے تھے جنگ کے معایب گنایا کرتے تھے، بلند نظری کے تباہ کن نتایج سے ڈرایا کرتے تھے امن و عافیت کے برکات جتلایا کرتے تھے، عدل و انصاف کی ضرورت، اور اسکے ابدی فوائد سے آگاہ کیا کرتے تھے، قناعت کے فوائد کا سبق دیا کرتے تھے؛ حصول علم سے جو لطف زندگی حاصل ہوتا ہے وہ بتلایا کرتے تھے، افعال و اعمال صالحہ سے جو طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے، اور اخلاق حسنہ سے جو مزہ انسان کو ملتا ہے، وہ اُن کے سامنے بیان کیا کرتے تھے ٭

آخرکار یہ عظیم الشان بادشاہ جسکے امتیاز و تفوق کا دعوے اُس کے اخلاق کریمہ سے ثابت ہوتا ہے، نہ کہ اُس شہرت سے جو ایک فاتح اپنی کامیابیوں سے پیدا کرلیتا ہے، اپنے آباؤاجداد کے ساتھ جا ملا۔ اُن کے بیٹے نے، جن کے بشرہ سے اُن کی نیک دلی مترشح ہوتی تھی، اور جن کی نسبت یہ امید تھی کہ وہ عقیل و فہیم مشیروں کے مشوروں سے فائدے اُٹھائینگے اور اپنے نیک والد کے قدم بقدم چلینگے، امیرالمومنین الحکم کے جنازہ کی نماز پڑھائی، اور اُن کے جسم کو سپرد خاک کردیا۔ اُن کے جنازہ کے ساتھ بے تعداد آدمی تھے۔ جنکے نالہ و بکا سے اُن کا دلی رنج ظاہر ہوتا تھا؛ اور اُن کو آیندہ مصیبت کا جو خطرہ لگا ہوا تھا وہ اُن کے اِن الفاظ سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ چلاتے جاتے تھے کہ "آہ آج ہمارا باپ مرگیا! اُسی کے ساتھ اسلام کی تلوار مرتی ہے؛ یہ شخص مصیبت زدوں غریبوں اور مظلوموں کا حامی تھا، اور سرکش اُس سے جان چھپاتے پھرتے تھے۔"

امیرالمومنین الحکم کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اُن کو علم سے عشق تھا۔ اپنی رعایا کو اُنھوں نے اس طرح آزادی دے رکھی تھی کہ جو نقصان دہ تھی۔ اصول و احکام قرآنی کے وہ سختی کے ساتھ پابند تھے اور ملکی قانون کا احترام کرتے تھے۔ چند مقامات پر اُن کو فوج کشی کرنی پڑی، اُن میں اُنھوں نے پوری سرگرمی اور قوت دکھلا دی۔ اِن مہمات نے یہ ثابت کردیا کہ اگر بدامنی زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی تو وہ نہایت کامیاب سپہ سالار ثابت ہوتے۔ اُن کا علم ادب کی طرف میلان مراق کی برابر تھا۔ دنیا کا کوئی بادشاہ، جس کا نام اِس وقت تک تاریخ محفوظ رکھتی چلی آرہی ہے، اُن کی برابر عالم نہ تھا۔ کسی کو اُن کی برابر مختلف شعبہاے علمی میں کمال حاصل نہ تھا۔ دنیا کے تمام ممالک میں، جہاں تک تہذیب کا قدم پہنچ چکا تھا، ایشیا کے تمام بڑے بڑے دارالسلطنتوں اور تجارتگاہوں میں، بغداد، قاہرہ، دمشق، سکندریہ قسطنطنیہ میں اُن کی معتبرین متعین رہتے تھے کہ اُن کے کتب خانوں کے لئے کتابیں تلاش کرکے بھیجیں۔ خواہ کتنی ہی بڑی قیمت کوئی طلب کرتا، یا کتنی ہی دقتیں اور تکالیف کسی کتاب کے حاصل کرنے میں اُٹھانا پڑتیں سب بکشادہ پیشانی برداشت کیجاتی تھیں، مگر قرطبہ کے محل شاہی کے لئے کتاب خریدلی جاتی تھی۔ کوئی کتاب جتنی کمیاب ہوتی اُتنی ہی زیادہ اُسکے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی

تھی اگر کوئی مالک اپنی کتاب فروخت کرنے میں تامل یا انکار کرتا تو اُسکی خوشامد درآمد کر کے اُسکی نقل دینے پر اُسکو آمادہ کر لیا جاتا، اور محض اس لئے کہ اُس نے نقل دینا منظور کر لیا اُسکو بیش قرار انعام دیا جاتا۔ ایشیا کے بادشاہوں کے پاس بھی بڑے بڑے کتب خانے تھے، لیکن وہ سب امیر المومنین الحکم کے کتب خانہ کے مقابلہ میں ہیچ تھے۔ ایشیائی بادشاہ کا کوئی کتب خانہ ایسا نہ تھا کہ جہاں اس روشن دماغ، اوران تھک بادشاہ، امیر المومنین الحکم کے کاتب اور نقلنویس پائے جاتے ہوں۔ یا اُن کے متعینہ ایسے علماء نہ ملتے ہوں کہ جنکا قلم کبھی تھکتا ہو یا جو محنت سے کسی وقت بھی جی چراتے ہوں۔ یہ اعلان عام تھا کہ جو مصنف کوئی نئی کتاب لکھے یا تصنیف کرے امیر المومنین کے حضور میں پیش کریگا وہ بیش قرار انعام پائیگا۔ اس اعلان کا یہ نتیجہ تھا کہ قبل اسکے کہ کتاب شائع ہو یا جس ملک میں وہ لکھی گئی ہو اس ملک والوں کو خبر ہو اصل کتاب قرطبہ پہنچ جاتی تھی۔ نہایت نامور اور بلند خیال مصنف اپنی کتاب نہایت دور دراز ممالک سے امیر المومنین کے حضور میں بھیج دیتے تھے۔ المغرب، مصر، بین لطین، شام اور ایران سے کتابوں کے آنے کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ کوئی اچھی کتاب ہوتی تھی تو کم ازکم ایک ہزار دینار انعام پاتی تھی۔

جب تلاش کتب کی یہ کیفیت، اور قدر دانی کی یہ حالت ہو تو یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ علم کے ہر شاخ اور ہر شعبہ کا شوق بڑھ گیا۔ علماء قدیم کے نتائج دل و دماغ، جو ایک زمانہ سے کسی کے گھر کے کونے میں خاک آلود پڑے تھے، موتی بن کر نکل آئے۔ فلاسفۂ یونان کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہو گئیں۔ ارسطو کا فلسفہ، اور اقلیدس کی تصانیف، رعایا کے فائدے کی غرض سے بازار میں آ گئے۔ جس سوسائٹی میں کہ دماغی تفوق بڑے بڑے عہدہاء سرکاری کے لئے سفارش بن گیا تھا، وہاں مطالعۂ انہماک علوم نہ صرف ہر لعزیزی ہی ہو گیا تھا، بلکہ وہ نہایت لابدی پیشہ بن گیا تھا۔ جو شخص کہ سرکاری ملازمت کا خواہش مند ہوتا، یا سیاسی شہرت حاصل کرنا چاہتا اُس کے لئے کتابوں کا جمع کرنا اور اُن کو بغور پڑھنا، لازمی ہو گیا تھا۔ یہی اُسکی ترقیات کا زینہ تھا۔ ہر خوشحال گھر میں کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع رہتا تھا؛ نہ صرف نمود دولت اور شہرت علم کی غرض سے بلکہ اس لئے کہ اُس گھر کے آدمیوں کو مطالعہ کا شوق تھا، اور سب نے اُن کتابوں کو پڑھا تھا۔ اُن لوگوں کے

فائدے کے لئے جنکے پاس اتنے کافی ذرائع نہ تھے کہ وہ کتابیں خرید سکیں (جو اُس زمانہ میں ظاہر ہے کہ بہت گراں ہونگی) نیز اس غرض سے کہ عوام الناس کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ علم میں ترقی اور سائنس کی اشاعت کریں، ملک محروسہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کتب خانہ عام کھلے ہوئے تھے۔ چونکہ کتابوں کی طلب دنیا بھر کے بازاروں میں روز افزوں تھی، اس لئے قیمت بڑھتی چلی جا رہی تھی، اور اُن کی تلاش اور نقل کرنے کے شوق سے لوگوں کو خواہی نخواہی علم کی طرف توجہ ہوگئی تھی۔ یہ مشہور ہوچکا تھا کہ اگر کوئی تحفہ امیر المومنین کے حضور میں پیش کرنے کے قابل ہے اگر کوئی چیز امیر المومنین کی شرف قبولیت حاصل کرسکتی ہے تو وہ کسی ناقابل حصول کتاب کی نقل ہے یا کسی مشہور و معروف عالم کی سب سے پہلی تصنیف۔ اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے کہ خلیفہ الحکم کا کتب خانہ سب سے پہلا علم کا ذخیرہ تھا جو یورپ میں قائم ہوا۔ یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کتابوں کی وہاں کیا قدر تھی، کتب خانہ کے انتظام اور کتب خانہ کی عمارت پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس عمارت میں کہ یہ کتابیں جمع تھیں وہ شان و شوکت میں کسی طرح قصر شاہی سے کم نہ تھی۔ اُس کا فرش نہایت قیمتی سنگ مرمر کا تھا؛ دیواریں اور چھتیں بہترین سنگ خام کی، اُس میں سنگ سبز اور سرخ کی پچی کاری تھی۔ الماریاں نہایت قیمتی صاف شفاف لکڑیوں کی تھیں، اُن میں سے بعض کی لکڑیوں کو اس لئے انتخاب کیا گیا تھا کہ وہ مشکل الحصول تھیں، اور بعض کو اس لئے کہ اُن سے نہایت خوش آیند خوشبو نکلتی تھی۔ ہر ایک الماری پر سونے کے پتر سے لکھا ہوا تھا کہ اس الماری میں کس مضمون کی کتابیں ہیں جگہ جگہ دیواروں پر مختلف لوگوں کے اقوال سنہرے حروف میں لکھے ہوئے تھے، تاکہ اُن کو دیکھ دیکھ کر لوگوں میں علم کا شوق، اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کے قدم بقدم چلنے کا خیال پیدا ہو۔ رفتہ رفتہ کتابوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کتب خانہ میں، باوجود اس کی وسعت کے، اُن کے رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ دار الکتابت میں ایک فوج کی فوج کاتبوں اور جلد بندوں کی مقرر تھی۔ بہترین کتابوں پر سونا چڑھایا جاتا تھا اور اُن کو نقش و نگار سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس صنعت میں وہ لوگ ایسی کاریگری دکھلاتے تھے کہ اب تک اُن کی نقل

نہیں ہوسکی نہ ہوسکیگی۔ امیر المومنین کے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے لیکر چھ لاکھ تک بتلائی جاتی ہے۔ فہرست کتب چالیس جلدوں میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں بہت ہی کم کتابیں تھیں کہ جو امیر المومنین کے مطالعہ سے نہ گزری ہونگی، بہت زیادہ ایسی کتابیں تھیں کہ جن پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے حاشیہ لکھے تھے، اور شرح کی تھی۔ کتاب کے صفحہ اولین پر نہ صرف کتاب ہی کا نام ہوتا تھا، بلکہ مصنف کا نام، اُن کا نسبت نامہ، سال پیدائش و وفات۔ یہ سب کچھ تحقیق و تدقیق کے ساتھ علماء شامی لکھتے تھے۔ امیر المومنین کو عجیب قوت حافظہ حاصل تھی، یہی حالت اُن کی قوت استنباط و استخراج کی تھی، اُن کی نظر نہایت نقاد واقع ہوئی تھی، وہ نظم و نثر لکھنے پر پورے قادر تھے، سب سے زیادہ حیرت انگیز جو بات اُن میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کے مہام کے بار کے باوجود وہ مطالعہ کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اور پھر مطالعہ بھی ایسا کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو تمام عمر میں بھی یہ بات حاصل نہ کر سکتا۔ امیر المومنین خود بہت بڑے مورخ تھے، بے رو رعایت نقاد تھے اور مسلم شارح۔ انہوں نے اندلس کی تاریخ لکھی تھی، جو دنیا کی بدقسمتی سے گم ہوگئی، وہ اُس زمانہ میں اس فن کی معتبر ترین کتاب سمجھی گئی تھی۔ عام شہرت یہ ہے کہ وہ نہایت آزادانہ روش سے لکھی گئی تھی۔ چونکہ خود بادشاہ کی تصنیف تھی اس لئے یہ امید ہی نہیں ہوسکتی کہ اُن پر کسی کا دباؤ تھا، یا کسی کی رو رعایت اُن کا مقصود تھا۔ اُن کے علم و فضل کی یہ کیفیت تھی کہ علم الانساب اور اسکے بعض غوامض میں، قرطبہ جیسے عالم خیز شہر اور قرطبہ جیسے متبحر دربار میں بھی وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ علم تاریخ میں وہ اتنے کامل تھے، اور اُن کی قوت فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ تمام علماء و فضلاء دنیاء اسلام اُن کی رائوں کو بلاچون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔ جیسا کہ قیاس ہوسکتا ہے اُن کی انتہاء قدردانی سے علم کی طرف عام طور پر رجحان ہوگیا تھا، اور ہر شخص کو اس طرف تشویق و تحریص ہوگئی تھی۔ افریقیہ، ایشیا اور یورپ کے تمام علوم و کمالات قرطبہ میں سمٹ آئے تھے۔ امیر المومنین الحکم کی فیاضی، قدردانی اور اُن کے دربار کی شان و شوکت کی خبریں، خاص کر یہ خبر کہ لیاقت علمی ہی اُن کے حضور میں سب سے بڑی سفارش ہے، تاجروں کے ذریعہ سے اقطاع عالم میں پھیل گئی

تھیں۔ ہر طالب علم کی یہ تمنا تھی کہ کسی طرح اُس سوسائٹی میں جا کر تحصیل کرے کہ جہاں اُس کو بے انتہا فوائد حاصل ہونے کی امیدیں تھیں۔ دارالخلافہ قرطبہ کی گلیوں میں دنیا بھر کی اقوام کے طالب علم گروہ در گروہ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ سر رشتۂ تعلیم کے الگ قاعدہ و قانون بنا دیئے گئے تھے اور اُن پر اُسی سختی کے ساتھ عمل کرایا جاتا تھا جیسا کہ فوجی نظام پر محکمۂ تعلیم کے استحکام اور اُسکے رعب کو قائم رکھنے کے لئے امیر المومنین نے اپنے بھائی منذر کو اُس محکمہ کا افسر اعلیٰ اور نگراں مقرر کیا تھا۔ امیر المومنین نے اپنی فیاضی سے قرطبہ میں ستائیس مدارس ایسے قائم کر رکھے تھے کہ جہاں غربا کے بچے بھی ویسی ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے جیسے کہ ملک مصر و عرب کے بہترین کالجوں میں ہوتی تھی ؛

قوم کی دماغی ترقی میں اس امر نے بہت زیادہ مدد دی کہ ہر جگہ آزادی خیالات جاری و ساری تھی۔ فلسفہ کے مطالعہ کا شوق دلایا جاتا تھا۔ نہایت متبدعانہ خیالات کی اشاعت عام خیالات کے موافق نہ ممنوع تھی، نہ سخت دیندار اور کٹّے مسلمان اُن میں حارج ہوتے تھے۔ چونکہ خیالات میں اکثر اختلاف ہوتا رہتا تھا، اسناد کی تلاش کرنا پڑتی تھی اور مختلف اقوام کے مذہب کا مقابلہ کرنا ہوتا تھا اس لئے تحقیقات کی طرف عام میلان ہوتا تھا۔ اور چونکہ یہ باتیں پھیلتی چلی جاتی تھیں، اس لئے یونیورسٹیوں کے پروفیسروں پر غلطی سے بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ الحاد کی طرف مایل ہو گئے ہیں ؛

خلیفہ حکم نے شروع ہی سے اپنی رعایا کی اصلاح اخلاق و عادات کی طرف توجہ کی تھی۔ یہ اتنا بڑا خطرناک اور بدنامی کا کام تھا کہ اگر کوئی سب سے بڑا سیاست دان اور بڑی ہمت بادشاہ بھی ہوتا تو تنگ ہو کر بیٹھ رہتا۔ ایشیا کی تقلید و تمدنی تکلفات اور عیش و عشرت کے اثر سے اندلس میں مے نوشی خوب پھیل گئی تھی۔ جس طرح کہ اندلس کی شراب آج کل خوش ذائقہ و خوش بو مشہور ہے اُسی طرح اُن دنوں بھی وہاں نہایت اچھی شراب بنتی تھی۔ تمام ملک میں انگور بے انتہا پیدا ہوتے تھے اس لئے جزیرہ نمائے اندلس میں شراب کی کشید بہت

ہوتی تھی اور یہاں سے بڑی مقدار میں شراب باہر جاتی تھی۔ پہلے تو زناکاری چوری چھپے ہوتی رہی لیکن بعد میں تو یہ فعل بدعلم کھلا ہونے لگا حکام دیکھتے تھے اور چشم پوشی کرتے تھے، چونکہ یہ گناہ بہت کچھ بڑھ گیا تھا اس لئے چنداں معیوب بھی نہیں رہ گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ علماء دین بھی اس سے مُبرا نہیں ہے تھے۔ مسکرات صرف انگور کی شراب ہی پر محدود نہیں رہ گئے تھے، بلکہ انجیر، کھجور، نیز اور میووں سے بھی بڑی مقدار میں شراب کشید کر لی جاتی تھی۔ یہ عیب صرف امراہی میں نہ تھا، بلکہ عام ہو گیا تھا۔ مرد اور عورت، سب میں، شراب کباب کا وہ زور تھا، کہ اگر وہ لوگ دمشق کے زمانۂ عروج کے دربار شاہی سے بڑھ نہیں گئے تھے، تو اُن کے برابر تو پہنچے ہوئے تھے۔ فقہا اس خلاف شرع فعل کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ سپاہیوں کے لئے شراب پینا ضروری ہے، کیونکہ اس سے اُن میں ہمت و استقلال پیدا ہوتا ہے اور مدہوشی میں وہ تکالیف خوب برداشت کرتے ہیں، اس لئے کم از کم اہالی فوج کو، جو دشمنوں کی زد میں رہتے ہیں، شراب پینا جائز ہے۔ لیکن صاحب تمیز و بصیرت امیرالمومنین پر اس مکاری کا جادو نہیں چل سکتا تھا۔ چونکہ وہ تہیہ کر چکے تھے کہ جس طرح ممکن ہو شراب نوشی کی جڑ اُکھاڑ کر پھینک دی جائے اس لئے اُنھوں نے یک قلم یہ حکم ناطق جاری کر دیا کہ تمام ملک محروسہ کے انگور کے درخت ضائع کر دیئے جائیں لیکن وزراء دولت نے اُن کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خزانہ عامرہ کو سخت نقصان پہنچیگا، جس سے عوام کو سخت تکالیف برداشت کرنا پڑینگی۔ اُنھوں نے یہ بھی گزارش کیا کہ چونکہ شراب اور میووں سے بھی نکالی جاسکتی، اور نکالی جاتی ہے اس واسطے یہ لازم آئیگا کہ تمام میوہ دار درخت اُکھاڑ کر پھینک دیئے جائیں۔ یہ سُن کر امیرالمومنین نے اپنا حکم منسوخ کر دیا، جس سے لوگوں میں سخت گھبراہٹ پھیل گئی تھی لیکن اُن کو جو اپنے فرض کے ادائیگی کا احساس تھا، اُس نے یہ نہ کرنے دیا کہ اس طرف سے مایوس ہو کر بیٹھ رہیں۔ اُنھوں نے تمام مساجد کے اماموں کے نام حکم بھیج دیا کہ وہ بر سر منبر یہ اعلان کر دیں کہ عام تقاریب اور تہواروں میں شراب نوشی ناجائز ہے۔ قاضیوں کو تاکیدی احکام دیئے کہ، بلا لحاظ اسکے کہ مجرم امیر ہے یا

غریب، بڑے درجہ رتبہ کا آدمی ہے یا معمولی حیثیت کا، سرکاری ملازم ہے یا عامی، شراب نوشی کے جرم میں سختی کے ساتھ حد شرع جاری کریں۔ لیکن یہ عیوب کچھ اس طرح جڑ پکڑ گئے تھے کہ علماء دین کی تہدید اور احکام فوجداری کی دھمکیوں سے رعایا پر کوئی اثر پڑنے والا نہ تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ یہ عالمان دین، اور حکام ملک خود اُسی آفت میں مبتلا تھے جس سے دوسروں کو منع کرتے تھے۔ قُرطبہ کی تمام سوسائٹی بندۂ عیش و نشاط تھی، اُسکے ساتھ ہی تمام ملک کے لوگ کم و بیش عیاش تھے فلسفی اپنے قومی دین کے احترام اور اُسکے رسوم کی پابندی کو امن عامہ کے قائم رکھنے کے لئے ضروری اور لابدی جانتے تھے، گو وہ اپنے ہم خیالوں کی تخلیہ کی صحبت میں اس پر مذاق اُڑاتے تھے۔ اُن کا دامن برہمنان ہندوستان کے عقیدۂ ہمہ اوست سے آلودہ تھا۔ حالت یہاں تک خراب ہو رہی تھی کہ جہلا میں بھی جوش و خروش باقی نہ رہا تھا، جو جہالت کا جزو لاینفک ہے۔ تعلیم کے عام ہو جانے سے رفتہ رفتہ، اور نادانستہ طور پر بہت سے وہ تعصبات لوگوں کے دلوں سے نکل گئے تھے، جن کے قیام پر واہمہ پرست مقتدایان مذہبی کی عزت و احترام کا انحصار ہوتا ہے عوام الناس پر خوش حیثیت لوگوں کا اثر پڑنا لازمی ہی ہے جمعہ و جماعت میں لوگوں کی تعداد ایسی کم نہ ہوتی تھی کہ وہ معلوم ہو سکے، لیکن یہ عادت کی بات یا رسمی رہ گئی تھی، نہ کہ اعتقادی اور دینی فرض۔ عوام کے رفتار و گفتار سے ایسا تشکک ظاہر ہوتا تھا، کہ جسکو دیکھ کر ہر وہ شخص گھبرا اُٹھتا تھا، جو قُرطبہ کی زیارت کے لئے آتا تھا، حالانکہ اس شخص کے دل میں کعبہ شریف کے بعد قُرطبہ کی عظمت بیٹھی ہوتی تھی۔ امیر المومنین کی عیش پرست رعایا کا یہ اصول قرار پا گیا تھا کہ "اس ناپائدار زندگی کے لطف اُٹھالو، حیات سرمدی کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ" اسی پر اُن کا عمل تھا، اور اسی کو وہ مآل زندگی سمجھتے تھے۔ ایسی صورتوں میں عام بداخلاقی کی روک تھام اور ہر شخص کے دل گزیں عیوب کا قلع و قمع، اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو ضرور تھا۔ مے نوشی کے خلاف امیر المومنین کا جو حکم تھا، اُسکی علی رؤس الاشہاد تو تعمیل کیجاتی تھی، مگر پوشیدگی اور تخلیہ میں اُسکی پروا بھی نہ کیجاتی تھی عیش پرستی اتنی بڑھ گئی تھی، اور دلوں میں اتنی جاگزیں ہو گئی تھی کہ اُس پر اعلان شاہی یا خود بادشاہ کی

نیک مثال کا اثر پڑنے والا نہ تھا۔

رفاہ و آسایش عامہ کے کاموں میں امیر المومنین کو اپنے مشہور و معروف اجداد سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ اُنہوں نے بہت سی چیزیں بنانے اور بہت سی چیزوں کی مرمت کرنے اور ترقی دینے میں اپنے آبا و اجداد کی شہرت کا ساتھ دیا۔ اس خصوص میں اُن کی فیاضیوں سے جہاں بڑے بڑے شہروں نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا، وہاں چھوٹے چھوٹے دور افتادہ پورے تک محروم نہیں رہے۔ اُنہوں نے سڑکوں کی مرمت کرائی، ایک معین فاصلہ پر مسافروں کی آسائش کے لئے حوضیں کھدائیں اور فوارے لگوائے، اور بہ تعمیل حکم محکم قرآنی جسکے موافق مہمان نوازی نہایت ثواب کا کام ہے، ہر منزل پر ایک ایک سراء بنوادی، تاکہ تھکے تھکائے مسافر قطع منزل پر وہاں آرام پائیں۔ مدارس غریب خانے اور شفا خانے ہر شہر میں بن گئے۔ ان کے لئے جتنے روپیہ کی ضرورت ہوئی وہ امیر المومنین کے صرف خاص سے دیا گیا۔ اُن کی خدا ترسی اور افتخار خاندانی نے اُن کو اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلنے کی تحریص کی۔ پھر اُنہوں نے جامع مسجد قرطبہ میں ترقیات کیں، عمارت مسجد کو بہت کچھ وسیع کرایا، مقصورہ بنوایا کہ امیر المومنین بآسایش تمام نماز پڑھ سکیں، اور اُن کو آتے جاتے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس کی بناء غالباً یہ ہو کہ ایشیائی خیالات کے موافق بادشاہ کو عوام سے بالکل الگ رہنا چاہیئے اسکی وجہ کچھ تو احتیاط تھی اور کچھ اپنے آپ کو ایک حیرت انگیز بنانا۔ اندلس میں اس رسم کو جاری ہوئے کل تین نسلیں گذری* تھیں۔ امیر المومنین الحکم کی تخت نشینی سے پہلے وہ حوض کہ جہاں مسلمان وضو کرتے تھے، گو مجسم علامت طہارت تھی، مگر چھوٹی تھی، وہ نمازیوں کے جم غفیر کے لئے غیر مکتفی تھی، اور کسی طرح اُس مسجد کے شایان شان نہ تھی، جو بلحاظ تقدیس دنیاء اسلام میں دوسرے درجہ پر تھی۔ یہ بہت ہی ان گھڑ اور پرانی وضع کی سی بنی ہوئی تھی۔ اکثر اُس کا پانی بدبودار ہوجاتا

* میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس مقصورہ کے بنوانے سے یہ نیت رہی ہو کہ امیر المومنین کی زیارت کے لئے لوگوں کا خیال نہ بٹے، اور نمازیوں کا دل بحالت نماز اُن کے دیکھنے کی کوشش ہی کی طرف مایل نہ رہے۔ میرے اس خیال کی بنا یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اس مقصورہ میں نماز پڑھنے کی اجازت تھی جنکو امیر المومنین کو دیکھنے کے موقعہ حاصل رہتے تھے۔ (مترجم)

تھا۔ اس میں پانی بھرنے کے لئے ایک قریب ہی کے کنوے سے جانوران باربرداری پر پانی لاکر ڈالا جاتا تھا۔ کہاں تو مسجد کی وہ شان و شوکت اور کہاں یہ بیہودگی اور بدانتظامی امیرالمومنین پر یہ کیفیت سخت گراں گزرتی تھی۔ صرف کثیر اور محنت شاقہ کے بعد چار سنگی حوض مسجد کے چاروں گوشوں میں بنے۔ اُن میں سے دو عورتوں کے استعمال کے لئے تھے اور دو مردوں کے۔ درمیان میں ایک بڑا لمبا مینار تھا، جو پانی کا خزانہ تھا۔ اسکے اندر سنگ مرمر کا فرش تھا؛ اسی میں سے ایک فوارہ اُچھلتا تھا جو تمام چمن کی آبیاری بھی کرتا تھا، جو صحن مسجد کا باعث زینت تھا۔ اس خزانہ آب کے لئے پتھر اُس کان سے آیا تھا جو قُرطبہ سے کئی میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ سب سے بڑے پتھر کو یہاں لانے کے لئے ستر بیلوں، اور ایک فوج کی فوج آدمیوں کی ضرورت ہوئی تھی۔ اتنا بڑا کام صرف بارہ روز میں مکمل کر دیا گیا۔ پانی بذریعہ چھوٹی چھوٹی نہروں اور نلوں کے سیراسے مسجد کے نیچے نیچے ہوکر حوضوں میں براہ راست پہنچا یا گیا۔ پانی کی اس طرح حفاظت کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ اگر قرطبہ کا محاصرہ ہو یا کہیں آگ لگ جائے، تو پانی ہر وقت اور ہر حالت میں مل سکے۔ یہ نہریں شہر کے اور بہت فواروں وغیرہ کو بھی پانی پہنچاتی تھیں۔ خلیفہ الحکم کے زمانہ میں ان فواروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اور عوام کو بڑی آسائش اور آسانیاں ہوگئی تھیں۔ ان کے بنائے ہوئے تمام نل اور ذرائع آب سانی نوسو برس کی پامالی اور بڑے بڑے مصایب گزرنے پر بھی اب تک جوں کے توں اچھی حالت میں باقی ہیں۔ وہ سنگ مرمر کا خزانۂ آب، جو ایک زمانہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے غسل و وضو کے کام آتا تھا، اب قُرطبہ کے عیسائیوں کو پانی بہم پہنچاتا ہے؛ جن کی غلیظ اور نفرت انگیز صورت، وحشیانہ خصائل اور بے ڈول جسم اس پاکیزہ و مطہر، عالی دماغ اور روشن خیال قوم سے متباین ہیں، جن کی قوم سے یہ وحشت کے مارے ہوئے لاعلم محض ہیں، اور جن کی صنعت و ایجاد کے آثار اس امر کے کافی شہادت ہیں کہ انتہاء درجہ کی ترقی اور تہذیب کو قیام نہیں، اور فطرت انسانی کا میلان اس طرف ہے کہ وہ تنزل کرتے کرتے جانوروں کی وحشیانہ حالت تک پہنچ جائے، نیز یہ کہ اگر فاتحیں غیر مذہب یا غیر قوم کے ہوں تو ان میں

نہ اپنے مفتوحین کے تجربات کے قدر کرنے کی قابلیت ہوتی ہے نہ اُن کے عقل و فہم سے فائدہ اُٹھا جانتے ہیں اس وجہ سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ دینی سلطنت اور مقتدایان دین دُنیا کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں کیونکہ اُن کا قیام ہی اس پالیسی پر ہوتا ہے کہ وہ مفتوحین کی ذہنی طاقتوں کو ایک باقاعدگی کے ساتھ نقصان پہنچائیں۔

امیر المومنین کا ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے، جو اُن کی صلاحیت طبع، اخلاق حسنہ نیز علم و عالم کی قدر دانی کی نہایت اچھی مثال ہے۔ اس میں بادشاہ کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ رعایا بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ کوئی متکبر مطلق العنان اسکی تاب نہیں لا سکتا کہ وہ کسی کو کچھ حکم دے اور اُسکی تعمیل میں لیت و لعل کیا جائے، یا باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا جائے مگر اس عظیم الشان بادشاہ کی نرم دلی اور صبر و سکون کا یہ عالم تھا کہ اُن کی رعایا بعض موزوں موقعوں پر یہ ہمت کر جاتی تھی کہ اُن احکام کو جو ناطق ہوتے تھے، اپنی آسانی کے لئے ٹال دیں۔ فقیہ ابو ابراہیم قوانین شرع کے ایک مستند عالم تھے۔ قرطبہ کی یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ اُسکے پروفیسر تھے۔ ایک روز وہ طالبعلموں کی ایک بڑی جماعت کو پڑھا رہے تھے کہ اُن کو امیر المومنین نے ایک خواجہ سراء کے ہاتھ محل شاہی میں فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔

ابو ابراہیم نے جواب دیا کہ "حضرت امیر المومنین کی طلبی سے میری بڑی عزت افزائی ہوئی مگر اُن سے عرض کر دینا کہ تم مجھ سے خانۂ خدا میں ایسی حالت میں ملے کہ طالب علم مجھے گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں، اور اُن کو میں حدیث شریف پڑھا رہا ہوں۔ میری طرف سے عرض کر دینا کہ جس وقت میں اس مقدس سبق کو پڑھا چکونگا تو حاضر خدمت ہونگا اگر اس وقت میں حاضر ہوں تو طالب علموں کا ہرج ہوگا" خواجہ سرا یہ جواب سُن کر بہت گھبرایا اور محل شاہی میں جا کر تمام قصہ سنا دیا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے واپس آ کر ابو ابراہیم سے کہا کہ "میں نے آپ کا جواب گوش گزار بارگاہ خلافت کر دیا۔ امیر المومنین آپ کی نیکی سے خوش ہوئے، اور دین کی جو خدمت آپ روزانہ کرتے ہیں اُسکی وہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ وہ آپ کی فرصت کے منتظر رہینگے، آپ جس وقت چاہیں باریاب ہوں مجھے یہ حکم ہے کہ جب تک آپ سبق حدیث سے فارغ نہ ہولیں میں یہاں حاضر رہوں، تاکہ آپکے ہمرکاب امیر المومنین کی

خدمت میں پہنچوں" خلیفہ الحکم کے اس خلق و مروت کے دکھلانے کا یہ پہلا ہی موقعہ نہ تھا بلکہ بکرات و مرات ایسا ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ عالم کبیر السن اور ضعفاء سے ایسا ہی سلوک کیا کرتے تھے اُنھوں نے محل کا وہ دروازہ جو ابو ابراہیم کی مسجد سے قریب تھا کھلا رکھنے کا حکم دیا تاکہ ان کو آنے میں تکلیف نہ ہو کیونکہ وہ ضعف پیری کی وجہ سے بمشکل چل پھر سکتے تھے گھوڑے پر سوار ہونا تو کجا جب وہ دروازہ پر پہنچے تو اُنھوں نے بہت سے اہلکاروں اور شاہی خدمتگاروں کو اپنا منتظر پایا تاکہ وہ ان کو ان رسوم کے ساتھ اندر لیجائیں جو اُن کی علم و شہرت کے شایان شان تھی۔ یوں امیر المومنین اپنی حلیم الطبعی مروت سے اپنے شاہانہ حقوق اور مستبدانہ احکام کو علم اور علما ن سائنس پر قربان کر دیا کرتے تھے، حالانکہ ایک مستبد بادشاہ کے حکم کی نافرمانی کی وہی سزا ہے جو نمک حرامی کی، اور جیسی فوری تعمیل کرانا ہر ایک مطلق العنان بادشاہ کا حق اولین ہے۔ اُن کی عظمت معمولی داب شاہی اور پابندی رسوم سے رائے اور اعلیٰ حسن بے تکلفی کے ساتھ وہ علماء کے ساتھ پیش آتے تھے، جتنا بے تصنع گہری دوستی کا برتاؤ وہ عوام سے کرتے تھے وہ اُس استبداد اور عجلت کے بالکل منافی ہے جو ایک مطلق العنان بادشاہ اکثر کر جایا کرتا ہے +

دنیا میں بہت ہی شاذ و نادر ایسے بادشاہوں کی ملتی ہیں جو اپنے زمانہ اور اپنی رعایا کے لئے اتنے موزوں واقع ہوئے ہوں جیسے کہ امیر المومنین الحکم اپنی رعایا کے واسطے تھے۔ خدا تعالے نے اُن کو وہ انتظامی قابلیت اور گویا الہامی دور اندیشی اور دور بینی نہیں دی تھی، جو اُن کے خاندان کے بانی عبدالرحمٰن اوّل میں تھی، نہ ان میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ کی سی سیاسی تدبیر اور جنگی قابلیت تھی، مگر تمام مفید علوم میں وہ کامل تھے تمام متہم بالشان تصانیف اور کاموں کی وہ قدر کرتے تھے اور ان کے لئے قرار واقعی انعام دیتے تھے جن علوم و فنون، صنایع و بدایع سے کہ انسان کو راحت آسائش، خوشی و خرمی حاصل ہوتی ہو اور تکالیف رفع ہوتی ہوں اُن کی تشویق کرتے تھے۔ اُن خوبیوں اور نیکیوں میں، جو رعایا میں ترقی پیدا کر کے اُن میں شان و شوکت بڑھاتی ہوں اور سلطنت کو چار چاند لگاتی ہوں، کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ اُن سب باتوں میں اسلامی اندلس کے بادشاہوں میں امیر المومنین الحکم سب سے بڑے بادشاہ تھے۔ اُن کی ذات ستودہ صفات انتہاء تہذیب، سائنٹفک قابلیت شعر و شاعری اور عربی اندلس کے تمدن کی مجسمہ تھی۔ اسکے مقابلہ میں ماضی تاریکی نفرت انگیز بد اخلاقی گھناونی

خصوصیات میں سے تھی خلیفہ الحکم کی ان تھک محنت
ناپاکی اور ذلیل واہمہ پرستی اُس زمانہ کے مسیحی یورپ کے خصوصیات میں سے تھی خلیفہ الحکم کی ان تھک محنت و مشقت، اور ان کا بے انتہا علم اُس زمانہ کا ایک عجوبہ تھا۔ علم ادب سے جو شغف اُن کو تھا اُسکی تقلید اُن کی رعایا کرتی تھی، اور دل و جان ایسے کاموں میں مصروف رہتی تھی کہ جن سے غربا کا بار کم ہو اور غریب نصیبوں کی خوشی میں ترقی ہو۔ بڑے سے بڑے عہدے اور بڑی سے بڑی تنخواہیں اُن لوگوں کو دی جاتی تھیں جنہوں نے علم ادب میں شہرت و قابلیت حاصل کی ہو۔ اِس میں نہ کسی کی سیاسی خدمت کا لحاظ تھا، نہ نسل و قوم کا خیال۔

امیر المومنین اکثر اپنے ہاتھ سے باغبانی کا کام کرتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر قاضیوں، مفتیوں اور امراء دولت نے بھی کچھ کرنا شروع کر دیا۔ جزیرہ نماء اندلس کے قدرتی ذرائع سے اُنہوں نے خوب ہی کام لیا۔ فن زراعت میں وہ ترقی کی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس سے زیادہ ترقی ہونا ناممکن ہے۔ قادیز، اشبیلیہ، مریڈا اور بلنسیہ کے جہاز بے خطر ہو کر نہایت خوفناک سمندروں میں سفر کرتے تھے۔ مرینہ کی بھیڑوں (یعنی وہ بھیڑیں جنکے نرم اُون سے وہ کپڑا بُنا جاتا ہے جو ہندوستان میں مرینہ کے نام سے بکتا ہے) کے لئے ایک قانون تھا کہ وہ ایسٹرے میڈورا اور قشتالہ سے آگے نہ جانے پائیں۔ یہ بھیڑیں لاکھوں کی تعداد میں پلی ہوئی تھیں۔ خلیفہ کے الحکم کے بنائے ہوئے اس قانون پر اہالی سپین آج تک عمل کر رہے ہیں۔ مختلف قیمتی دھاتوں کی کانیں معلوم کر کے کھول لی گئیں، اور اغراض تجارت و صنعت کے لئے اُن سے کام لیا گیا۔ مختصر یہ ہے کہ امیر المومنین کے زمانۂ امن و عافیت نے اقوام سالفہ کے تمام علم و ہنر اور تجربات کو اپنی ذات میں مجتمع کر لیا تھا، علوم و فنون نے وہ ترقی کی تھی کہ اُس کے خیال سے حیرت ہوتی ہے۔ علم کی ہر شاخ اور ہر شعبہ ایسی حالت میں پہنچ گیا تھا کہ اقوام عالم، عیسائی، یہودی اور مسلمان، اُن کو دیکھ کر حیران رہ جاتی تھیں۔ فی الحقیقت اس زمانہ میں جوہر دماغی اور علمی کی آخری نمائش ہوئی۔ آخر امیر المومنین الحکم اپنے مشہور و معروف خاندان کے سب سے بڑے اور سب سے آخری درخشندہ گوہر تھے، کہ جن تک نہ کوئی بادشاہ پہنچا ہے نہ پہنچیگا۔

(الف)

تعلیقات باب سیزدہم

(۱) آئےونیا = IONIA ایشیاء کوچک کے ایک نہایت آباد و شاد علاقہ کا قدیمی نام ہے۔ اس نام کو بھی یونانی خرافات الاصنام سے تعلق ہے کیونکہ یہ علاقہ آئے اون سے منسوب ہے جو کروسا بنت شاہ لے تھنس کے بطن سے اپولو دیوتا کا بیٹا تھا۔ اس کی تاریخ ۱۰۵۰ق م سے شروع ہوتی ہے۔ ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان میں یہاں بڑی زور آزمائیاں ہوئی ہیں۔ ۱۳۱۳ء میں یہ ترکوں کے قبضہ میں آیا۔ یہاں کے باشندے بہت ہی بزدل سمجھے جاتے تھے اور سخت عیش پرست۔ انہوں نے صنعت حرفت میں ایسی ترقی کی تھی کہ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان کی طرز عمارت خاص ہے اور نہایت خوبصورت۔ (مترجم)

(۲) اے ٹی کا = ATTICA یونان قدیم کا ایک علاقہ ہے جس کا دارالسلطنت اے تھنس تھا۔ اس علاقہ کے تین طرف پہاڑ ہیں اور ایک طرف سمندر۔ دو دریا بھی اس علاقہ میں بہتے ہیں پھر بھی پانی کی اتنی کمی ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں سے نکل کر اپنی آبادیاں بسانی پڑی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۱۵۵۰ق م کے قریب یہاں آبادی شروع ہوئی۔ اصلی باشندے دریاء نیل کے قریب سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ اُن ہی نے یہاں زیتون اور کچھ غلوں کی کاشت کی اور اپنے یہاں کے دیوتاؤں کو یہاں پہنچایا۔ خدا کی شان ہے کہ شدہ شدہ ان ہی کی اولاد نے علم و ہنر میں وہ ترقی کی کہ دنیا بھر میں ضرب المثل ہو گئے۔ اس کی تاریخ دلچسپ ہے۔ مگر ہمارے مطلب سے خارج ہے۔ (مترجم)

(۳) سکلے ونیا = SCLAVONIA نہ معلوم یہ کونسا علاقہ ہے۔ (مترجم)

(۴) المدینہ سلی = MEDINA CELI اس کا حال معلوم ہوا۔ مسلمان اس کو مدینہ سالم کہتے تھے۔ (مترجم)

(۵) سان ایس ٹے ون ڈی گورمز = SAN ESTEVAN DE GORMEZ

اس کا پتہ نہیں لگا۔ (مترجم)

(۶) کے لاہورا = CALAHORA سپین کا ایک شہر ایک ندی پر آباد ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کی شہرت اس لڑائی کی وجہ سے ہے جس میں یہاں کے رہنے والوں نے ۷۸ق م میں رومیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ محاصرہ

اس غضب کا تھا کہ لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو کاٹ کر کھا لیا، مگر جنگ سے مُنہ نہ موڑا۔ افسوس ہے کہ اس پر بھی انہیں اپنے آپ کو اپنے دشمن کے حوالہ کرنا پڑا۔ یہاں ایک پُرانا گرجا ہے۔ آلات کشاورزی کی تجارت ہوتی ہے۔ آبادی قریباً سات ہزار ہے۔ (مترجم)

(۷) کٹالونیا = کٹالوآں = CATALONIA = قتلونیہ یا قطلونیہ۔ پہلے ایک صوبہ تھا، مگر اب اس کا علاقہ صوبہاء برشلونہ، طرکونہ، لریدہ اور جیرونہ میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا رقبہ بارہ ہزار ایک سو اسی میل تھا سپین کا شمال مشرقی حصہ ہے۔ شمال میں فرانس ہے، مشرق اور جنوب مشرق میں بحر روم ہے۔ دو دریا اور دریاء ابرہ کے چند معاون اس کو سیراب کرتے ہیں۔ کنارۂ بحر کا داک ہے۔ سوائے تھوڑے سے میدان مسطح کے باقی تمام علاقہ پتھریلا ہے۔ وسط صوبہ ہی سے پائرینیس کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ آب و ہوا فی الجملہ صحت بخش ہے۔ گو یہاں مینہ اکثر برستا اور کُہر رہتا ہے۔ برشلونہ کے قریب نارنگیاں بہت پیدا ہوتی ہیں۔ بلوا اور عود بہت پیدا ہوتا ہے۔ زیتون بھی بہت ہوتا ہے۔ کارک کے درخت پہاڑ پر بکثرت ہیں۔ مختلف قسم کے پھل اور پھول ہوتے ہیں۔ شمالی حصہ میں، بہ نسبت جنوبی حصہ کے سردی سخت ہوتی ہے۔ لیکن انگور، زیتون، سن، چھاڑ چھڑیلہ، زعفران وغیرہ بہت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں یہاں مسلمان لے گئے تھے اور اب تک اُن ہی کی برکت چلی جاتی ہے۔ گھوڑے اور شاخدار مویشی اس علاقہ میں بہت ہیں۔ بھیڑ بکریاں، شہد کی مکھیاں، ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں معدنیات میں کوئلہ، تانبا، جست، سیسہ، نمک، گندھک وغیرہ اور کئی قسم کے سنگ مرمر نکلتے ہیں۔ کپڑا بہت بنتا ہے اور اور صنعتیں بھی ہیں۔ آدمی ذہین اور محنت کش ہیں۔

اس صوبہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے آخر وقت تک رومیوں کا ساتھ دیا۔ (مترجم)

(۸) میرون = MERON نہ معلوم یہ کونسا مقام ہے۔ (مترجم)

(۹) بوریل = BOREL اس کا حال بھی نہیں معلوم ہوا۔ (مترجم)

(۱۰) ایگلس راک = EAGLE'S ROCK بشرح صدر۔ (مترجم)
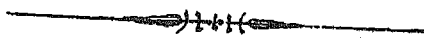
ابن عامر کی اصلیت۔ ایک باغ کا نظارہ اور وہاں کا ایک واقعہ۔ نوجوان سیاست داں کی قابلیت۔ اُن کا یکایک عروج پانا۔ خواجہ سراؤں کا اقتدار۔ اُن کی ایک سازش کا طشت ازبام ہونا۔ ابن عامر کی انتہاء ترقی پر پہنچنے کی خواہش۔ اُن کا حاجب مقرر ہونا۔ اپنے رقیبوں کو تباہ کرنا۔ فوجی و ملکی محکموں کی اصلاحات۔ ہشام ثانی کا بتدریج ذلیل کیا جانا۔ حاجب کا تمام ملک پر حاوی ہونا۔ عیسائیوں سے کامیاب جنگیں۔ افریقہ میں فتنہ و فساد۔ لیون کی تباہی۔ سینٹیاگو کی تباہی و بربادی۔ المنصور (ابن ابی عامر) کا انتقال۔ اُن کی سلطنت کی خدمات عظیمہ۔ جنگوں میں اُن کی دوامی کامیابی۔ المظفر۔ محمد۔ عبدالرحمٰن۔ سلیمان۔ ہشام ثانی کا گم ہو جانا۔ سلطنت کا فوری پارہ پارہ ہونا۔

خلیفہ ہشام ثانی کے تخت پر بیٹھتے ہی ایک مہیب اور منحوس شخص بلاد ... کے جزیرہ نمائے اندلس کے تماشاگاہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ شخص اگرچہ جلالت شان ... شاہ خلافت ساتھ ہی تباہی و بربادی کا مقدمۃ الجیش بھی* ہے۔ ہشام ثانی سے

---

* اوراق آئندہ بتلا دینگے کہ مصنف علام کے یہ الفاظ بالکل صحیح ہیں۔ ... اور لکھا کہ منصور فی النار ہوا کو ابن ابی عامر منصور سے سخت دشمنی ہے؛ حتّٰی کہ اُن کے انتقال کے ... مسیحی دشمنی اب تک اُن کو دوزخ میں دیکھ رہی ہے۔ لیکن میں تو

مغربی کے تخت پر بیٹھے' اُن دونوں کے زمانوں میں مفید علوم' تجارت کی مرفہ الحالی اور اُن کے علاوہ اور تمام فنون میں' جو قوم کو تہذیب و تمدن کے عروج پر پہنچانے کا باعث ہوتے ہیں' بے نظیر و بے مثال ترقی کی۔ حدود سلطنت اسلامی میں ہر جگہ امن و امان عافیت و اطمینان کا دور دورہ تھا۔ کورنگی کی طرف میلان کو جس نے ایک زمانۂ بعید تک ملک کے ترفہ کو روکے رکھا' اور آبادی کو کم کر دیا سختی اور کامیابی کے ساتھ پامال کر دیا۔ حکام سلطنت اس طرح عدل و انصاف کرتے تھے کہ اُن پر بددیانتی کا شبہ تک نہ ہو سکتا تھا؛ کسی شخص کی کسی قسم۔ وو رعایت کا تو کیا ذکر ہے۔ اُس سلطنت کے طریقۂ تعلیم اور اُسکے نتائج ایسے تھے کہ اُن کو دنیا بنظر استعجاب و دیکھتی تھی۔ اُسکے علماء تمام یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے کمالات کی یہ کیفیت تھی کہ عیسائیوں کو اُن پر جادوگر ہونے کا شبہ تھا؛ بلکہ بہت سے موقعوں پر تو اُنہوں نے وہ سزائیں پائی ہیں کہ جو جادوگروں کو جاہل یورپ

وجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔ اُن کا قصور صرف اتنا ہے کہ اُنہوں نے اپنے زمانۂ عروج میں عیسائیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ بہت بڑے سیاسی دوربین آدمی تھے دیکھ رہے تھے کہ عیسائیوں کی قوت بڑھ رہی ہے دشمن کی قوت کا بڑھنا اپنے ضعف کا مترادف ہے۔ اس لئے اُنہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ حفاظت خود اختیاری ہیں۔ ترکوں کے ضعف کے ممکن ہے کہ اور وجوہ بھی ہوں مگر کیا دانشمندان یورپ نے یہی پالیسی ان مسلمانوں کے متعلق روا نہیں رکھی؟ کہا جا سکتا ہے کہ قدرتی قانون معاوضہ ایسا تیر ہے کہ جو کبھی خطا نہیں کرتا۔ مگر میں نے ترکوں کا ذکر تمثیلاً کیا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی منصور سے شکایات کے جو رہیں لیکن جب اس کو غور کیا جائے کہ اُن کی خدمات سے قریباً سو برس مسلمانوں کا اندلس میں رعب رہا تو اُن کا جرم خفیف ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اُن کی ذات سے جو اور فوائد پہنچے اُن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے' معزز ناظرین خود نتائج اخذ فرما سکتے ہیں۔ میں منصور کا وکیل نہیں ہوں کہ اُن کی "صفائی" پیش کروں۔ اتنا ضرور ہے کہ اُن میں ہزار عیب ہوں مگر خدا شاہد ہے کہ وہ ایسے نہیں ہیں کہ اُن کو بے ایمان کہا جائے جیسا کہ اُن کی تاریخ وفات نکالتے ہوئے ایک صاحب نے فرما دیا ہے۔ غرض مقصود یہ ہے کہ اُن کے متعلق ناظرین احتیاط سے کام لیں اور اُن پر اثبات جرم کرنے میں جلدی نہ کریں اور غور و فکر سے کام لیں۔ منصور کے مفصل حالات میرے ترجمہ نفح الطیب میں ملاحظہ فرمائیے' جس کو انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے اور ایسا بُرا چھاپا ہے کہ مجھ بدنصیب کو شرم آتی ہے۔ (مترجم)

میں دی جاتی تھیں۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اور باوصف اسکی عظمت، جلال، شہرت کے، یہ مقدر ہو چکا تھا کہ شاہ شطرنج، ہشام ثانی، آخری تاجدار بنو امیہ کے دوران حکومت میں خلافت مغربی اقوام دنیا میں اور بھی رفعت حاصل کر لے۔ یہ بے انتہا امتیاز، پچاس سے زیادہ مہمات کا سلسلہ، دشمنوں کا اُن ہی کے مقامات منیع میں، جنکو وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے، جا کر مقہور کرنا، اُن کے نہایت مقدس معبدوں کو ناپاک کرنا اور لوٹنا، اُن کے ملک کو بے آب و گیاہ کر کے مفلس قلاش کر دینا، اُن سے باقاعدہ طور پر خراج وصول کرنا اور غلام بنا لینا، یہ تمام باتیں حاجب المنصور کے دل و دماغ کے نتائج تھے، جن میں سیاسی و جنگی جوہر دماغی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اسلام نے جتنے بھی ملک فتح کئے، اور اپنے زیر نگین رکھے (اور سب جانتے ہیں کہ یہ ممالک بہت وسیع اور مرفہ الحال تھے) اُن میں سے کسی کو ان جیسا آدمی نصیب نہیں ہوا۔

جو قسمت آزما لوگ کہ طارق (رحمتہ اللہ علیہ و علی شرکائہ) کے علم کے ساتھ ساتھ فتح و ظفر ہمرکاب لئے ہوئے اندلس میں آئے۔ اُن میں سے ایک عرب عبدالملک نامی بھی تھا، جو ازروئے نسل یمن کے شریف زادے تھے۔ ان کو سیاسی جھگڑوں اور مالی مشکلات نے خطرناک، مگر دلکش، پیشہ سپاہ گری اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ذہین اور دیانتدار آدمیوں کا حبشیوں کی فوج میں قحط تھا، اس لئے اس معزز جلاوطن کو فوج کے ایک دستہ پر افسر مقرر کر دیا گیا۔ اسی حیثیت میں انہوں نے زمانۂ قدیم کے شہر کارٹیا کو فتح کیا۔ یہ سب سے پہلا قلعہ بند شہر تھا جو فاتحین کے ہاتھ آیا۔ طارق اور موسیٰ کی مہمات کی شمولیت کے بعد عبدالملک قلعۂ توروش میں عزلت گزیں ہو گئے۔ وزیگاتھ کی جائداد ضبط ہو کر تقسیم ہوئی تو یہ مقام اُن کے حصہ میں آیا۔ اگرچہ وہ معزز قبیلہ قریش سے نہ تھے، مگر اُن کا خاندان سابقہ خدمات سلطنت، خوش حیثیت اور ذی علم ہونے میں ہمیشہ ممتاز رہا۔ عبدالملک کے پرپوتے امیر محمد کے حاجب رہے۔ امیر کی داد و دہش کی وجہ سے وہ مالا مال ہو گئے تھے، اور بہت بڑی عزت پا لی تھی۔ اُن کی اولاد میں سے بہت سے آدمیوں نے بڑے بڑے طبیبوں، علماء دین اور سیاسی عہدہ داروں کی بیٹیوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ کچھ لوگ نہایت تعریف کے ساتھ

... رسول اللہ صلے اللہ

دربار شاہی کے بڑے بڑے عہدوں پر متازادر دیوانی و فوجداری کے حاکم رہ چکے تھے۔ باستثناء بانی خاندان کے کسی شخص نے محکمۂ جنگ میں ملازمت نہیں کی، حالانکہ سپاہگری ہی وہ پیشہ تھا کہ جس سے اس خاندان کو شہرت نصیب ہوئی۔ امیر المومنین الحکم ثانی کے شروع زمانہ تخت نشینی میں اس خاندان کے نام لیواؤں میں ایک شخص، محمد ابن ابی عامر، یونیورسٹی قُرطبہ کے طالب علم، ایک سرکاری باغ عامّہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے باغات قُرطبہ کے مضافات میں بہت سے تھے۔ کچھ اندھیرا ہو گیا تھا؛ کئی میل تک قندیلوں کا جو سلسلہ چلا جاتا تھا، اُن کی روشنی بے شمار ناریل کے پیڑوں اور منطقہ حارہ کے درختوں پر پڑ رہی تھی، جو اس منہ میں بہت سے تھے، اور باغ کی نضارت و خضارت کو بڑھاتے تھے۔ بہت سے قندیل اِدھر اُدھر درختوں کے تنوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے ہوا رچ بس رہی تھی۔ اندلس کی روح پرور ہوا اپنا کام کر رہی تھی، مشکبار ہوا، شہر کے اُن پیشہ وروں کی آوازیں، گوشہاء نیم خواب میں دور سے پہنچاتی تھیں، جو دن بھر کی محنت کے بعد اب آرام کی تیاریاں کر رہے تھے؛ یا وہ خوش آیند نغمے کانوں کی دعوت کرتے تھے، جو قرطبہ کے کسی جھروکے سے، کسی دل جلے محبت کے مارے ہوئے، دل سے بانسری کے ساتھ نکلتے تھے۔ ان طالب علموں کے سامنے بجائے فواکہات، مٹھائیاں اور شراب جیریز[۳] کی خالی شیشے رکھے ہوئے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لطف اندوز طالب علم احکام شرع کی چنداں پروا نہ کرتے تھے۔ ان میں سے چار آدمی اِدھر اُدھر کی باتوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے، پانچواں دیر سے کسی فکر میں اس طرح غرق تھا کہ اُسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی، اور بہت دیر سے کسی فکر و غور میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اسکو دیکھ کر ایک نے کہا کہ "ابن ابی عامر! تم کیوں چپ بیٹھے ہو؟ تم تو فقیہوں کی طرح غور و فکر کے دریا میں غوطے لگا رہے ہو، اس طرح چپ ہو جیسے ریگستان میں چلنے والا اونٹ، کہیں اپنا محبوب تو نہیں کھو بیٹھے؟"

متفکر طالب علم نے جواب دیا کہ "مجھے ایک مدت سے یہ خیال ہے کہ ایک نہ ایک دن میں اس سرزمین پر حکمران ہونگا۔ تم میں سے ہر ایک جو عہدہ پسند کرتا ہو وہ ابھی مجھے بتلا دے؛

میں اسی وقت وعدہ کئے دیتا ہوں کہ جب میں بادشاہ ہو جاؤنگا تو جو کچھ تم مانگو گے تمہیں دونگا۔"
اس جواب پر، جو کسی کے شان گمان میں بھی نہ تھا بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا۔

ان میں سے ایک خوش مذاق نے کہا کہ "یہ انجیر بڑے مزہ دار ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ملاغہ میں جا رہوں، جہاں انجیر بہت ہوتے ہیں۔ مجھ سے اگر پوچھو تو میں ملاغہ کی گورنری زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

دوسرے چلبلے طالبعلم نے کہا کہ "بھئی! یہ روٹیاں جو ابھی ہم نے کھائی ہیں بہت ہی خوش ذائقہ تھیں۔ تم مجھے تو بازار کا داروغہ مقرر کر دینا۔ اُسی وقت مجھے ان پر تکلف چیزوں کا پورا مزہ آئیگا، اور لطف یہ ہے کہ میرا ایک پیسہ بھی نہ خرچ ہوگا۔"

تیسرے نے ہنس کر کہا کہ "میں تو اس شہر قُرطبہ کا عاشق ہوں، جس کی شاندار مسجد اسلام کی شان ہے، جسکے شاندار مضافات باغ فردوس سے کسی طرح کم نہیں، جسکی دولت و حشمت تمام ایشیا کی دولت کے برابر ہے، جسکے محل و قصر عجائبات روزگار ہیں۔ مجھے تو تم یہاں کا محتسب مقرر کر دینا۔"

چوتھا ذرا جلے مزاج کا آدمی تھا، وہ چیں بہ جبیں خاموش بیٹھا ہوا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک طالبعلم نے کہا کہ "عبداللہ! تم کیوں چپ بیٹھے ہو؟ تم بھی آیندہ بادشاہ اندلس کی فیاضی سے کچھ خوشہ چینی کر لو۔"

عبداللہ کھڑا ہو گیا اور ابن ابی عامر کی داڑھی پکڑ کر بڑے غصہ سے کہنے لگا کہ "او لغو شیخی باز! تیرے گستاخانہ خیالات تو ابلیس سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ تو اور اندلس کی بادشاہی! اچھا جب تو بادشاہ ہو تو سب سے پہلا کام یہ کرنا کہ مجھے ننگا کر کے میرے بدن پر شہد ملوا دینا، تاکہ شہد کی مکھیاں مجھے کاٹیں، اور مکھیاں میرے اوپر بھنکیں۔ پھر مجھے گدھے پر اس طرح سوار کرانا کہ دُم کی طرف میرا منہ ہو اور مجھے تمام دارالخلافہ میں تشہیر کرانا۔ پس تجھ سے میں یہی عطیہ مانگتا ہوں۔ تو ایسا بر خود غلط اور اتنا مغرور ہے کہ نہ تو بادشاہ وقت کا احترام کرتا ہے نہ جانشین رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا ادب"

ابن ابی عامر نے بمشکل تمام اپنی داڑھی کو اس جلے تن کے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ کسی مسلمان کی اس سے بڑھ کر کیا بے عزتی ہوسکتی ہے کہ اُسکی داڑھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو! مگر ابن ابی عامر نے چنداں پروانہ کی اور نہایت متانت سے کہا کہ "ایک دن وہ آنے والا ہے کہ تم اس وقت کی باتوں کو یاد کروگے میں اپنا وعدہ کبھی نہ بھولونگا۔ اور جو کچھ جس جس نے مانگا ہے وہ اُسکو ضرور ملیگا اور ٹھیک اُسی طرح ملیگا جیسا کہ اُس نے مانگا ہے"

ابن ابی عامر کو اپنی ذات خاص، اپنے جوہر دماغی اور اپنے منصوبوں کی کامیابی پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ لڑکپن ہی میں، بحالت غربت و گمنامی، کہ قرطبہ یونیورسٹی کے ہزاروں طالبعلموں میں سے بہت کم اُن کو جانتے ہونگے، وہ ایسے بظاہر لایعنی اور دور دراز کار خواب دیکھا کرتے تھے۔ مگر اس زعم باطل سے اگر قطع نظر کرلیجائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ معمولی آدمی نہیں تھے۔ اُن میں وہ تمام اوصاف جمع تھے، جو انسان کو سیاسی تفوق عطا کرتے ہیں۔ وہ ایسے ذی ہمت تھے کہ اُن کو بالکل نڈر کہنا چاہئے، چست و چالاک، مستقل مزاج، ہر بات کے پیچھے پڑجانے والے، اور سخت دلشکن موقعوں پر بھی دل نہ ہارنے والے تھے؛ اُن کے ذریع کامیابی کبھی ختم ہونے والے نہ تھے؛ جب کسی معاملہ میں وہ کوشش کرنا چاہتے تھے، تو وہ اس امر کو وہ بالکل نظرانداز کردیتے تھے کہ آیا جو ذریعۂ کامیابی وہ اختیار کررہے ہیں وہ اخلاقاً جایز بھی ہے یا نہیں، انہیں اپنے مطلب سے مطلب تھا؛ دوستوں کے شکر گزار دوست تھے، اور دشمنوں کے جانی دشمن؛ مہام سلطنت میں نہایت ہوشدار تھے؛ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حکومت ہی کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے؛ بچپن ہی سے اُنہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت خداداد کو اپنے بلند نظرانہ مقصد حاصل کرنے میں لگا رکھا تھا۔ وہ خوبصورت آدمی تھے، اُن کی گفتگو دلکش ہوتی تھی؛ اُن کے اوضاع و اطوار ایسے تھے کہ لوگ اُن پر گرویدہ ہوجاتے تھے، اور اُس سوسائٹی میں، جو اپنے اخلاق میں ضرب المثل تھی اُن کا بڑا احترام ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ وہ ملک تھا کہ جہاں کے داب سلطنت ایسے تھے کہ اُس زمانہ میں

یا اُسکے بعد کوئی ملک اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مردم شناسی میں اُن کو وہ کمال حاصل تھا کہ وہ کسی شخص کی نسبت کبھی غلطی نہیں کرتے تھے! یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُن کو الہام ہوتا ہے جس مجمع میں وہ ہوتے تھے تو لوگ مسحور معلوم ہوتے تھے جب وہ کسی سے ناراض ہوتے تو اُس کے اثر بد سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا تھا۔ مگر باوجود اسکے کہ وہ آتش مزاج تھے، مگر کچھ اس ترکیب کے آدمی تھے کہ اُس وقت تک اپنے غصّہ کو دبائے اور اپنے جذبات کو روکے رکھتے تھے کہ جب تک انتقام کا وقت نہ آجائے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے بالخصوص اصول فقہ کے۔ ابتداء عمر سے ہی اُن کو بدوِ اسلام کے پرجوش واقعات اور تاریخ بانی اسلام (علیہ التحیتہ والسلام) آپ کی کوشش، صحابیوں کی مصیبت، شہداء کی جانبازی، فتح و ناکامی، مسلمانوں کی ترقی و تہذیب و شجاعان اسلام کے کارناموں سے دلچسپی رہی تھی۔ اُن کو اُن سپہ سالاروں اور سیاست دانوں کے حالات از بر یاد تھے، جو خود اُن کی طرح، ایک گمنام خاندان میں پیدا ہوئے، مگر اپنی قابلیت سے اُنہوں نے مشرق اور مغرب میں اسلام کو ایسے چار چاند لگائے کہ نظریں خیرہ ہوگئیں۔ اﷲ تعالےٰ نے اُن کو ہر طرح کی قابلیتیں عطا فرمائی تھیں۔ اپنے قواء دماغی کی اصلاح و تربیت کرکے اُنہوں نے اپنے تمام قواء کو طاقتور بنا لیا تھا۔ وہ اپنے پہلو میں فولادی دل رکھتے تھے اس کی تمام تر قوتوں کو اُنہوں نے اپنے نصب العین کے حاصل کرنے پر اس طرح لگا دیا کہ اور ہر طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں ایک گمنام بے زر بے پَر قسمت آزما اُس شاہراہ پر پڑ گیا کہ جس کی منزل مقصود یقینی کامیابی تھی۔

فارغ التحصیل ہوکر اُنہوں نے عارضی طور پر اپنی شکم پُری کی یہ تدبیر کی کہ لوگوں کو امیر المومنین کے حضور میں عرضداشتیں لکھ دیتے تھے اور اُسکی اُجرت لیتے تھے گزارہ کرتے تھے۔ اُن کی خطاطی، انشا پردازی اور واقفیت اصول فقہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ قرطبہ کے ایک صدر عدالت میں نایب مقرر ہوگئے لیکن جن قاضی کے ماتحت وہ مقرر ہوئے تھے وہ سخت متدین، خوددار اور خشک مزاج آدمی تھے۔ برخلاف اسکے، اُن کے نایب ایک خوش مزاج اور شاعرانہ خیالات

کے جوان تھے نتیجہ یہ ہوا کہ گو قاضی صاحب اُن کی غیر معمولی قابلیت کے تو معترف تھے مگر اُن کی شوخی سے کانپ کانپ اُٹھتے تھے، اُن سے ناراض ہو گئے اور وزیر مصحفی سے کہکر اُن کو اپنے یہاں سے تبدیل کرا دیا۔ وزیر کو معلوم تھا کہ امیر المومنین کو شہزادہ ہشام کی جاگیر کے انتظام کے لئے ایک آدمی درکار ہے۔ انھوں نے ابن ابی عامر کا نام اس عہدہ کے لئے تجویز کر دیا۔ امیر المومنین تو اُن کے تقرر پر آمادہ تھے، مگر اس کے لئے اُن کی چہیتی ملکہ اورؔ ورا (عر عریا صبح) کی منظوری کی ضرورت تھی بلکہ از روئے نسل عیسائیہ تھیں، اور بہت ہی خوبصورت، لالچی، بدچلن اور آتش مزاج۔ بنو اُمیہ کے خاندان شاہی میں صرف وہی ایک عورت نظر آتی ہے، جس کو یہ مشکوک امتیاز حاصل تھا کہ اُس کا اثر ملک کی سیاسی حالت پر پڑتا تھا۔ چونکہ وہ امیر المومنین الحکم کے اکلوتے بیٹے ولیعہد کی والدہ تھیں، اس لئے اپنے شوہر پر حاوی تھیں، اور اپنے اقتدار کو جہاں اُن کا مطلب ہوتا تھا، بے طرح استعمال کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتی تھیں۔ غرض، اس جلیل القدر عہدے کے لئے اور بہت سے امیدوار تھے اگرچہ یہ لوگ بلحاظ اپنے علوء شان اور آمدنی کے ہر طرح اسکے شایاں تھے لیکن اُن میں خفیہ سازشوں کا وہ مادہ نہ تھا جو ابن ابی عامر میں تھا۔ بڑے بڑے عہدوں کے لئے اسی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے :

ایک مرتبہ اُن کا ایسے عہدہ پر مقرر ہونا کافی تھا کہ جہاں وہ اپنی قابلیت دکھلا سکیں۔ چند ہی روز میں ترقی کر لینا خود اُن کا کام تھا۔ بہت جلد انہوں نے سلطانہ عرعر کے مزاج میں درخور پیدا کر لیا، حتےٰ کہ وہ ملکہ کے صرف خاص کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ ملکہ ہی کے اثر و اقتدار سے (جو خلیفہ حکم پر بھی حاوی تھیں) وزیر مصحفی کے تعارف کرانے کے سات مہینہ کے بعد کہ ابھی اُن کی عمر پورے ستائیس برس کی بھی نہ ہوئی تھی، وہ ٹکسال کے نگراں مقرر کئے گئے۔ یہ بڑی ذمہ داری کا عہدہ تھا، اور اس عہدہ دار کو وزیر مال کا بھی کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس نوعمر، غایر نظر، افسر نے بہت جلد یہ سمجھ لیا کہ یہ عہدہ ایسا ہے کہ جس میں آدمی بہت

آسانی سے روپیہ جمع کر سکتا، اور سیاسی ترقیاں حاصل کر سکتا ہے؛ بشرطیکہ اُس میں انتھک قوت ہو، چال چلن میں بے احتیاط ہو اور بے انتہا بلند نظر ہو۔ اُن کے فرائض منصبی ایسے تھے کہ اُن کو ارکین سے ہر روز ملنا جلنا پڑتا تھا، بہت بڑی تعداد میں روپیہ اُن کے پاس رہتا تھا، اُن پر سب کو بے انتہا اعتبار تھا۔ امیر المومنین اُن پر بڑی مرحمت خسروانہ کرتے تھے، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ بغیر اُن کو اطلاع دیئے کوئی شخص اُن کے حساب کتاب کی پڑتال کرکے بدرات نکالتا یا روپیہ میں کمی پاتا، اور ابن عامر اُسے پورا نہ کر دیتے۔ اُن کی عادات ایسی باقاعدہ تھیں کہ ترک لذات کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں معاملات سلطنت کا اُن کو خوب علم تھا۔ اُن کے جوہر دماغی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ عقدہائے لاینحل چٹکیوں میں حل کر لیتے تھے۔ سیاسی اور اقتصادی مسایل اُن کے سامنے بالکل پانی تھے؛ ان معاملات میں کوئی انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان وجوہ سے وہ ہر طرح ہر ایک بڑے عہدہ کے لئے موزوں تھے۔ اُن کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا اور گردوپیش کی ہر چیز، اُن کے دماغی جوہر اور اُن کی بلند نظری اور کامیابی کی ہر طرح مساعد تھی۔ خوددار بلکہ مغرور امراء ملک، ایک نوجوان طماع شخص کی اس قدر ترقی بہت بُری نگاہ سے دیکھتے تھے؛ مگر ابن ابی عامر کے اخلاق نہایت وسیع تھے، اور وہ اپنے افسرِ بالادست کا بہت ہی ادب و احترام کرتے تھے اس لئے سب امراء اُن کے رام ہو گئے۔ نئے کمتر درجہ کے لوگ اُن پر اُن کی اپنی فروتنی و انکسار، داد و دہش، مروت، اخلاق کا، لیاقت و فراست کا، جو اپنے پُرانے دوستوں کو کبھی نہ بھولنے دیتی تھی، اُس مادہ احسانی کا، جو احسانات قدیم کو فراموش نہ کرنے دیتا تھا، وہ جادو پڑا کہ سب کو غلام بنا لیا۔ نوجوان افسر نے شاہی خزانہ کو نہایت بےفکری کے ساتھ ٹکسال کے عملہ و فعلہ کو اپنا ثنا خواں بنانے میں خرچ کیا۔ مصیبت زدہ ماتحت جب کبھی اُن سے کسی قسم کی امداد مانگتے تو خالی نہ جاتے۔ اُن کی فیاضی کی شہرت اقطاع ملک میں پھیل گئی۔ غرض اُن ترکیبوں سے ہر موقعہ فائدہ اٹھا کر، اور جو لامحدود ذرائع اُن کے ہاتھ میں تھے، اُن سے سلیقہ کے ساتھ کام لے کر ابی عامر نے اپنے گرد ایسے مخلصین کا گروہ جمع

کر لیا کہ جو اپنے بادشاہ سے بھی زیادہ اپنے افسر کے جان نثار تھے۔

ابن ابی عامر کو اپنی کامیابیوں کو جو امیدیں تھیں وہ نہ اُمرا کی مدد کے ساتھ وابستہ تھیں، نہ غربا میں ہر دلعزیز ہونے سے۔ اُن شکل وصورت نے حساس دل سلطانہ کو اپنے اوپر فریفتہ کر لیا۔ ملکہ کے اقبال نے اُن کو ایسا شوہر دیا تھا کہ جس کو اُن پر شک ہی نہ ہو سکتا تھا اور ہر طرح اُن کی رضامندی کا جویان رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے حسین وجمیل آوردہ کے ساتھ جو شغف اُن کو تھا وہ چھپاتی بھی نہ تھیں۔ دونوں کے درمیان میں تعلقات گہرے ہو گئے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ایشیائی درباروں میں جو غیرت کا مادہ ہوتا ہے وہ بھی بر روئے کار نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گمنام ہجوگو شعراء کو جلی کٹی نظمیں لکھنے کا ایک مضمون ہاتھ آ گیا (ملکہ عرعر کو اپنے داروغہ سے اپنی تمام تمنائیں پوری کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ خواہش ابھی اُن کے دل ہی میں ہوتی تھی کہ پوری کر دیجاتی تھی) حرم سراء کے غلاموں اور خدمتگاروں کی غمازی ونمامی کا انسداد قیمتی تحفہ وتحایف سے کر دیا گیا۔ خود ملکہ نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ ایک موقعہ پر ابن ابی عامر نے خالص چاندی کا ایک چھوٹا سا محل بنوا کر اُن کے سامنے پیش کیا۔ اس نہایت قیمتی اور عجیب کھلونے میں محل شاہی کا کوئی ایسا مکان نہ تھا کہ نہ پایا جاتا ہو، خواجہ سراء، دربان، خدمتگار اپنے اپنے لباس پہنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی صورت میں اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ فوارں میں سے بجاء پانی کے خوشبودار عرقیات اُچھلتے تھے۔ محلوں میں جو زیب وزینت اور سجاوٹ بناوٹ عام طور پر ہوتی تھی وہ نہایت خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ ہو بہو دکھلائی تھیں۔ یہ تحفہ جب قریباً بیس مزدوروں کے سر پر رکھ کر قرطبہ کے گلیوں میں سے نکلا تو جو کوئی دیکھتا تھا وہ نقش حیرت ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب وہ ملکہ کے قدموں میں لے جا کر رکھ دیا گیا، تو وہ بھی اُسکو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئیں لیکن اسراف وفضول خرچی کی اس نمائش نے نہایت بُرے نتائج پیدا کئے۔ باوجود اُن کی خوش تدبیریوں اور فیاضیوں کے جنہوں نے اہالی دربار کے کینہ اور شرارتوں کو بہت کچھ دبا دیا تھا، مگر اُن کی ترقیات عاجلہ نے اُن کے بہت سے قومی دشمن پیدا کر دیئے تھے۔ یہ لوگ اُن کو

علے رؤس الاشہاد دار الضرب میں تغلب کرنے کا مجرم قرار دینے لگے۔ ایک نہایت سرسری کارروائی کے بعد، جو ایسی مطلق العنان سلطنت کا خاصہ ہوتا ہے اُن سے باز پرس ہوئی، اور اُن کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تمام کتابیں، اور روپیہ پیش کریں، اور پڑتال کرائیں۔ ہوشیار وچالاک افسر ٹکسال بھی کامل العیار تھے۔ چونکہ خود ریاضی کے بڑے ماہر تھے، اُن کو ہر روز یہ معلوم رہتا تھا کہ اگر کہیں پڑتال ہوئی تو اُن کو کتنا روپیہ ادا کرنا پڑیگا۔ وزیر ابن حضیر بہت سے معاملات میں اُن کے ممنون احسان تھے اس لئے ابن عامر نے کئی ہزار دینار اُن سے دست گردان مانگے۔ ابن حضیر اپنے پرانے محسن کو گرویدۂ احسان کر کے بہت خوش ہوئے؛ حساب بالکل صحیح نکلا۔ سمجھا تو یہ گیا تھا کہ بہت کچھ تغلب نکلیگا، مگر پیسہ پیسہ درست نکلا؛ جن لوگوں نے کہ اُن پر الزام لگایا تھا وہ سخت شرمندہ ہوئے، اور اُن کو وہی سزا دی گئی جو کسی دیانتدار کو خیانت کا الزام لگانے کی دیجاتی تھی۔

اب تو ابن ابی عامر کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔ جو جال اُن کے پھنسنے کے لئے بچھایا گیا تھا اُس سے بچ نکلنے میں جو کامیابی اُنھوں نے حاصل کی، اُس سے اُن کے دشمن بھی، بادل ناخواستہ ثناخواں ہوگئے۔ جو بےانصافی اور سختی اُن پر بظاہر ہوئی تھی اُس کے عاوضہ میں امیر المومنین الحکم نے اُن پر بہت سی مراعات اور مرحمت خسروانہ مبذول کیں۔ پہلے وہ لاوارثوں کی جائدادوں کے امین مقرر ہوئے، پھر اشبیلیہ کے قاضی بنائے گئے؛ اُس کے بعد بُنّہ کی پولیس کے افسر اعلیٰ کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ چند ہی روز کے بعد ایک اور بڑا عہدہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ وہ اُن کی اہمیت کو بڑھاتا تھا اور اُن کے اغراض و فوائد میں مؤید ہوتا تھا، اس لئے ابن ابی عامر نے اُس کی بڑی قدر کی۔

یاد ہوگا کہ مہم ماریٹینیا میں ابن کنون کے نابربریوں کو اُن سے جدا کرنے کے لئے رشوت دینے میں سپہ سالار غالب نے اتنا روپیہ خرچ کیا کہ امیر المومنین کو اُن (غالب) پر شک ہو گیا تھا۔ افریقیہ کے علاقہ کے لئے ایک قابل منتظم خزانہ و مال کی ضرورت تھی، جس کی قابلیت اور اختیارات ایسے ہونے ضروری تھے کہ وہ افسر اخراج کی فضول خرچیوں وغیرہ کو روک سکتا؛

کیونکہ یہ لوگ بیت المال کے روپیہ کو پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ ابن ابی عامر کی شہرت ہو چکی تھی، ان سے بہتر کوئی اور آدمی ایسا نہ تھا کہ اس اہم و خطیر عہدہ پر مقرر کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ صوبۂ ماری ٹینیا کے قاضی مقرر کئے گئے، اور ان کو کچھ غیر معمولی اختیارات بھی دیئے گئے۔ مالی و فوجی دخل و خرچ بالکلیہ طور پر اُن کے تحت میں کر دیئے گئے۔ اُن کو حکم تھا کہ حساب کتاب کی نہایت غور سے جانچ کریں اور اس محکمہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ امیر المومنین کو اُن کی روشن دماغی پر اتنا بھروسہ تھا کہ گو اُن کو نہ فوجی تعلیم ملی تھی، نہ کوئی تجربۂ جنگی تھا، مگر تجربہ کار افسران فوج افریقیہ کو یہ حکم دیدیا گیا کہ تا وقتیکہ وہ پہلے قاضی ماری ٹینیا سے مشورہ نہ کرلیں کسی مہم کو شروع نہ کریں۔ اس قسم کے انتظامات اور ذمہ داری کوئی ہنسی کھیل نہ تھی، ابن ابی عامر کی جگہ اگر کوئی اور کم استعداد اور معاملات سیاسی سے اُن کی برابر واقف نہ ہوتا تو حواس باختہ ہو جاتا۔ اہالی فوج اُن کو ایک بیوقوف نو دولت سمجھتے تھے، اور حکام ملکی ایک جاسوس اور مخبر لیکن اُن کی غیر معمولی قابلیت، ناقابل مقابلہ طاقت اور اخلاق کریمہ کی وجہ سے تمام تعصبات بہت ہی تھوڑے دنوں میں خود بخود رفع ہو گئے۔ بغیر اسکے کہ اپنے آقا و ولی نعمت کے اغراض و مقاصد کو کوئی نقصان پہنچنے دیں، افسران فوج اُن کا ادب و عزت کرنے لگے، اور اہالی فوج اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ افسر تو یوں حیران رہ گئے کہ موقعہ موقعہ پر انہوں نے اُن کو ایسے مشورہ دیئے کہ معاملات جنگ سے جو شخص قطعاً نابلد ہو، اور جو عملی طور پر جنگ میں شریک نہ رہا ہو، وہ ایسے مشورہ دے ہی نہیں سکتا تھا۔ سپاہی یوں رام ہوئے کہ ابن ابی عامر اُن سے مساویانہ گفتگو کرتے، اُن کے کھیل تماشوں میں شریک ہوتے، اور اُن کی تکالیف میں کام آتے۔ اُن کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جس شخص سے وہ ایک مرتبہ مل لیتے تھے، مدتوں اُس کا نام اُن کو یاد رہتا تھا۔ اس سے اُن کی ہر دلعزیزی بہت ہی بڑھ گئی۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ آیندہ کام آئیں، دوربین قاضی، بربریوں کے سرداروں کو خوش کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے، اُن کی گنوارو دعوتوں میں شریک ہوتے، اور وحشیانہ جلسوں میں شامل ہوتے، اُن کے بیہودہ وعادی اور تعلیون

سے ہمدردی دکھلاتے، اُن کے پشتینی تعصبات و خیالات سے اتفاق کرتے تھے، اپنی شان و شوکت اور فیاضی دکھلا کر اپنا اثر اُن پر ڈالتے تھے۔ جو تحفہ و تحایف وہ اُن کو دیتے افریقیہ کے ریگستان میں اُن کا مبالغہ سے تذکرہ ہوتا، اور اُن کا اندازۂ قیمت بیحد لگایا جاتا۔ ماری ٹینیا کے یہ خونخوار ڈاکو ابن ابی عامر کی ایسی عزت کرتے تھے، جیسی وہ شیخوں کی کرتے تھے۔ یہ شیوخ اپنے علاقہ کے حاکم فوجداری بھی ہوتے تھے، مگر اُسی وقت تک کہ جب تک لوگ اُن کے تابع فرمان رہیں، یہ بات نہ تھی کہ ان شیخوں کو اپنی قوم پر کوئی مستقل گرفت تھی، اور وہ اپنے قدرتی حقوق کو اُن کے ہاتھ میں دے چکے تھے۔

جب ابن ابی عامر فاتح غالب کے ساتھ واپس آئے تو اُن کی حیثیت، درجہ و رتبہ اور عوام الناس کی نگاہ میں اُن کی وہی وقعت ہوگئی جو اس فاتح سپہ سالار کی تھی۔ مضافات قرطبہ میں محلہ رصافہ نہایت دلکش مقام تھا، یہاں اُنہوں نے اپنا محل بنایا، جو قصور شاہی سے باعتبار تعمیر شان کسی طرح کم نہ تھا۔ اُسکی دیواروں میں نہایت خوبصورت سجاوٹ تھی، اُسکے خانہ باغ میں گرم ممالک کے تمام تکلفات موجود تھے، پھولوں کے تختوں پر بلبلوں کا شور رہتا تھا، اور تمام چمن میں نہایت خوشنما چڑیاں اُڑتی پھرتی تھیں، ہر طرف فوارے اُچھل کر آیندہ روند کا دامن اپنی طرف کھینچتے تھے، غلاموں کی ایک فوج کی فوج ریشمین زرق برق وردیاں پہنے ہوئے غلام گردشوں میں پھرتے نظر آتے تھے۔ ایک سنگ مرمر کا کمرہ تھا، جس میں ہر وقت دسترخوان بچھا رہتا تھا۔ اذن عام تھا کہ جو کوئی آئے بے تکلف ابن ابی عامر کی ضیافت کا لطف اُٹھائیے۔ اُن کی ہر دلعزیزی اور اقتدار کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ طلوع آفتاب سے لے کر غروب تک اُن کے دروازے پر سایلوں کا میلہ لگا رہتا تھا؛ ان میں سے کوئی ذلیل سے ذلیل آدمی بھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ سرکاری کام اُن کے پاس بہت رہتا تھا، اور مختلف محکموں کے افسروں سے اُن کا تعلق تھا، اس لئے اُن کو محرروں وغیرہ کی کثرت کے ساتھ ضرورت رہتی تھی۔ یہ عہدے ایسے نہ تھے کہ بلا خدمت تنخواہ ملے، مگر قرطبہ کے نہایت معزز خاندانوں کے نوجوان اس کو اپنی عزت سمجھتے تھے کہ ایسے استاد کامل

کے پاس کام کرکے سیاسی امور کی تعلیم مکمل کریں۔ وہ سب یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آیندہ کی ترقی، اختیارات اور ناموری کا اگر کوئی زینہ ہے تو وہ ابن ابی عامر کی خدمت جس وقت خلیفہ الحکم نے انتقال کیا ہے اُس وقت ابن ابی عامر کی ہر دلعزیزی انتہاء پر پہنچی ہوئی تھی۔ علاوہ اور محکموں کے وہ محل شاہی کے داروغہ بھی تھے۔ امیرالمومنین کے بعد وہ بشراکت وزیر مصحفی وکیل مطلق مقرر کئے گئے اور اُنھوں نے مہام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

امیرالمومنین الحکم کو یہ اندیشہ تھا کہ ایک نابالغ کو تخت نشین کرنے سے لوگ ناخوش ہونگے؛ وہ صحیح ثابت ہوا۔ عربوں کے قاعدہ کے موافق صرف وہی شاہزادے تخت پر بیٹھ سکتے تھے جو پکی عمر کے ہوں اور کسی کارنمایاں میں شہرت حاصل کرچکے ہوں۔ اب ایک لڑکے کو جو تخت دیا گیا تو عام طور پر سب لوگوں نے اس کارروائی کو نہایت شک کی نگاہ سے دیکھا، اور اسکو پسند نہیں کیا محض شاہزادہ ہونا اُن کے نزدیک اُن خطرات کا کافی معاوضہ نہ تھا، جو ایک لڑکے کی ناتجربہ کاری اور ناقابلیت سے پیش آنے لازمی تھے۔ جو لوگ کہ واہمہ پرست تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک بچہ کا تخت نشین ہونا بہت بُرا شگون ہے؛ اور اسکے یہ معنی ہیں کہ انتزاع سلطنت کا وقت آ لگا ہے۔ اسکے علاوہ تاریخ خلافت مغربی میں کبھی یہ واقعہ نہیں ہوا کہ ایک بچہ تخت نشین ہوا ہو۔ خاندان بنو اُمیہ کے عقیل و فہیم بادشاہ محبت و شفقت پدرانہ کو ایسے موقعوں پر سلطنت کے فوائد و اغراض پر اکثر قربان کرتے رہے ہیں؛ مگر یہاں اسکے خلاف کرنے کی ضرورت پڑی عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ امیرالمومنین الحکم کے بھائی ہر طرح اس قابل تھے کہ وہ نازک اور اہم فرائض شاہی ادا کرسکیں۔ ان خیالات سے خواجہ سرا ناواقف نہ تھے خواجہ سراؤں کا ہڑک مفت خور فرقہ مستبد بادشاہان ایشیا کے لئے باعث شرم رہا ہے؛ اس فرقہ کی عمریں سازش اور خیانت میں گزرتی تھیں۔ اب اُن کو خوب موقعہ ہاتھ لگا، چنانچہ اُنھوں نے نہایت ہوشیاری سے اس آشوب عام میں پیر پھنسا کر اپنا اُتو سیدھا کرنا چاہا۔ یہ شیطان مجسم جو اپنے ہم جنسوں کو دھوکا دینا، اپنے مسخ ہونے کا نا کافی انتقام سمجھتے تھے ہر بادشاہ کے زمانہ میں اپنے

غرور اور گستاخانہ افعال میں ترقی کرتے رہے تھے۔ ایک ہزار چیدہ آدمیوں کا گروہ حرم سراء ثانی کی حفاظت کرتا تھا۔ اگرچہ وہ غلام تھے، مگر ان کو وہی مراعات حاصل تھیں جو ہر آزاد شخص کو حاصل ہوتی ہیں وہ اپنے جذباتِ طمع کو پورا کرنے کے لئے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، اور بہت سا مال و دولت جمع کر لیتے تھے۔ جہاں اور بہت سی خرابیاں ایشیا سے آئیں وہاں یہ بیہودہ خیال بھی یہاں پہنچا کہ اگر خواجہ سراء اپنی شان و شوکت کا اظہار کریں تو اس میں اُن کے آقاؤں کی عزت افزائی ہے۔ ان خیالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس طاقتور فرقہ کی بے شرمی اور دست درازی اس درجہ کو پہنچ گئی کہ وہ ناقابل برداشت ہو گئی وہ نہایت آزادی سے تاجروں کو لوٹتے تھے، جو غریب کہ اُن کے راستہ میں حایل ہوتے اُن کو سخت بے رحمی کے ساتھ مار پیٹ بیٹھتے تھے، وہ لوگوں کے زنانخانوں میں گھس جاتے تھے، اور عورتوں کا تہتک کرتے تھے، حالانکہ مسلمانوں کے یہاں یہ ناقابل معافی جرم ہے، وہ بڑے بڑے دولتمند تاجروں سے ایسی شرائط پر قرض لیتے تھے کہ جس کے معنی قرضہ کی ضبطی تھی، جس کو چاہتے تھے گالیاں دے لیتے تھے، پولیس والوں کو یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اُس میں دست اندازی کریں، اس سے اکثر امن عامہ میں خلل پڑ گیا ہے، کسی عدالت کی یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان ظالموں کے خلاف استغاثہ سُن لے، انتہا ہے کہ جب کبھی اس فرقہ کے آدمی کو سزا دینے کا موقع آتا تھا تو خود امیر المومنین کی حمایت و رعایت کر جاتے تھے، کیونکہ اُن کے وجود کو وہ اپنے جان کی حفاظت کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے۔ خواجہ سراؤں کے دستۂ فوج کے سرگروہ، دو آدمی، فائق اور جوذر نامی تھے۔ ان دونوں سے تمام دارالخلافہ کا پتا تھا، اور دونوں قُرطبہ بھر کے لئے باعث شرم تھے۔ ان میں سے ایک توشہ خانہ کا داروغہ تھا اور دوسرا بازداروں کا افسر۔ ان دونوں کی مرفہ الحالی اور اقتدار اُن کو ایسے عہدوں پر ممتاز ہونا کہ جن میں آمدنی کی بڑی امیدیں تھیں، اُن کو بہت سے ذرائع دولت حاصل تھے، اور اس میں ترقی کرتے رہتے تھے، اُن کا بغیر روک ٹوک کے بادشاہ کے حضور میں حاضر رہنا، اُن کا

محل شاہی اور حرم سرائے سلطانی پر قریباً خود مختارانہ اختیارات' وہ پاتیں تھیں اور اُن کو وہ حیثیت حاصل تھی جو بارگاہ خلافت کے بڑے بڑے ارکین سلطنت کو بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ جو لوگ کہ اُن سے ملتے تھے اُن سے یہ دونوں ہی کورنشات ادا کرا کرتے تھے جو بہت بڑے آدمیوں کا حق تھا۔ جب وہ باہر نکلتے تھے تو ایسے جاہ و حشم کے ساتھ کہ سینکڑوں آدمی ان کی اردلی میں ہوتے تھے۔ اسلامی اندلس کی عجیب متضاد کیفیت تھی کہ سپاہی خواجہ سراؤں کے خدمتگار تھے اور آزاد لوگ غلاموں کے خدمت گزار۔ تعداد کثیر میں خدمتگار اور نوکر' جن پر نہ مسخ ہونے کی مصیبت پڑی تھی' نہ اُن پر غلامی کا دھبہ تھا' ہر وقت ان بے اصول منظورِ نظر بادشاہ کے احکام پر گوش بر آواز رہتے تھے۔ اُن کی وقعت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ ہزاروں آدمی ان کے دروازے کو گھیرے رہتے تھے۔ ان کے متعلق جو خطرات لوگوں کے مرکوز خاطر رہتے تھے' اس سے تمام لوگ اُس وقت کانپ اُٹھتے تھے کہ جب کوئی شخص' جس سے وہ ناراض ہو جاتے تھے' اس طرح غایب ہوتا تھا کہ کسی کو اُس کا حشر معلوم نہ ہوتا تھا۔

امیر المومنین الحکم کا انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ کسی کو اُن کی موت کی امید بھی نہ تھی' نہ اُس وقت اُن کے پاس سوائے فایق اور جوذر کے کوئی اور موجود تھا۔ یہ دونوں مکار جانتے تھے کہ اُن کا فرقہ لوگوں کی نگاہ میں کتنا مبغوض ہے۔ اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ ابن ابی عامر اور مصحفی اُن کی کوئی رعایت کرنے والے نہیں ہیں' اس لئے اُنہوں نے یہ سوچا کہ خلیفہ کی موت کو چھپا کر کسی دوسرے شخص کو اُن کا جانشین کر دیں' اور یوں اپنی قوت کو قائم رکھیں۔ جو شاہزادہ تخت نشینی کے لئے ان دونوں نے تجویز کیا' وہ امیر المومنین الحکم کا بھائی مغیرہ تھا۔ جوذر کی یہ رائے تھی کہ اپنی کامیابی کے لئے سب سے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ وزیر مصحفی کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن فایق کو وزیر موصوف کی قوت فیصلہ کا غلط اندازہ تھا' وہ جوذر کی رائے سے متفق نہیں ہوا۔ تھوڑے سے مشورہ اور بحث کے بعد یہ قرار پایا کہ مصحفی کو بلایا جائے' اور اُن پر دباؤ ڈال کر' یا لالچ دے کر جس طرح بن پڑے ہشام کی بیعت توڑ وا دیں۔ مصحفی اگر اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے تو اس سے بڑھ کر اُن کے مفید مطلب

اور کوئی بات نہ ہو سکتی تھی بغرض مصحفی آئے، اُنھوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ بدل و جان اُن کے ساتھ شامل ہیں، اُن کو بہت سے مفید مشورہ دیئے اور یہ وعدہ کیا کہ عین وقت پر وہ دروازہ محل شاہی کی حفاظت خود کرینگے۔ پھر اپنے مکان پر واپس آکر اُنھوں نے بہت جلدی بہت سے ملکی و فوجی عہدہ داروں کو، جن کی نمک حلالی پر اُن کو اعتبار تھا، طلب کیا، اور اُن سے اُس سازش کا حال بیان کیا جو ابھی اُن کو معلوم ہوئی تھی۔ چونکہ خطرہ کا احتمال فوری تھا، اگر مغیرہ تخت نشین ہو جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ خواجہ سراؤں کا اقتدار بہت ہی بڑھ جاتا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونے والا تھا کہ موجودہ ارکین سلطنت کی جان و مال کی خیر نہ تھی، اس لئے یہ طے ہوا کہ جو کچھ کیا جائے وہ فوراً کیا جائے۔ بالاتفاق یہ قرار پایا کہ مغیرہ کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ راۓ قائم کر لینا بہت آسان کام تھا، مگر اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔ شاہزادہ مغیرہ بڑے نیک نفس اور منکسر المزاج آدمی تھے۔ ان کا یوں بے وجہ قتل کر دینا اُن بے رحم آدمیوں کو بھی گوارا نہ تھا، جن کو بڑے بڑے افسوسناک موقعوں پر بھی رحم نہ آتا تھا۔ آخر کار اس خاموش مجمع میں سے ابن ابی عامر نے کھڑے ہو کر کہا کہ اس وقت جلاد کا کام میں کرونگا۔ ایک مضبوط دستہ فوج لیکر وہ فوراً بدقسمت مغیرہ کے قصر کی طرف گئے۔ اُس غریب کو نہ اپنے بھائی کے موت کی خبر تھی، نہ اُس جان پر بنانے والی عزت کی خبر تھی جو خواجہ سرا اُن کے لئے تجویز کر رہے تھے، نہ وہ یہ جانتے تھے کہ چند لمحہ پہلے اُن کی قسمت کا کیا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پیغامبر موت نے نہایت ادب کے ساتھ اپنا پیغام اُن کو دیا۔ اُن کو اپنے بھائی کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا، پھر فوجی سپاہیوں کو دیکھ کر وہ بہت ڈرے اور اپنے بھتیجے کی وفاداری اور جان نثاری کا انھوں نے یقین دلا کر چشم پرنم اپنی جان بخشی چاہی، اور ابن ابی عامر سے رحم کی درخواست کی۔ شاہزادہ مغیرہ کی یہ حالت دیکھ کر اُن کا بھی دل ہل گیا، وہ لیت و لعل میں پڑ گئے، اور مصحفی کے پاس ایک آدمی بھیج کر اُنھوں نے یہ کھلوایا کہ "مجھے شاہزادہ مغیرہ کی نمک حلالی اور ایمانداری پر اطمینان ہے"، اور یہ راۓ دی کہ جو فیصلہ اُن کی نسبت ہو چکا ہے اُسکو یوں ترمیم کر دیا جائے کہ

بجائے قتل کے قید کر دیا جائے۔ مصحفی نے فوراً جواب دیا کہ "اُن کو قتل کر دو۔ اگر تم سے یہ کام نہ ہو سکے، جسکے کرنے کی تمنّے خود ہامی بھری تھی، تو میں دوسرا آدمی بھیجتا ہوں، جسکے رحم آمود خیالات ایسے بے موقعہ نہیں ہیں"۔ اب تو کسی طرح دیر ہو ہی نہ سکتی تھی، مغیرہ کا گلا گھونٹ دیا گیا اور جس کمرے میں اتنا بڑا جرم ہوا تھا اُس کا فوراً تیغہ کر دیا گیا۔ یہ قتل جتنا بے رحمانہ تھا اُتنا ہی خلاف عقل و دانش، اسکی یاد ہمیشہ ابن ابی عامر کو ستاتی رہی۔ اُنہوں نے وزیر مصحفی کی خطا جو اُن کے ذریعہ سے ان کے ہی ہاتھوں سرزد ہوئی تھی، عمر بھر کبھی معاف نہیں کی۔ یہ فعل بھی ایسا تھا کہ جسکی ضرورت نہ کسی دلیل و حجت سے ثابت کی جا سکتی تھی، اور نہ کوئی سیاسی اشد ضرورت قرار دی جا سکتی تھی۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا تھا کہ بے رحم وزیر مصحفی پر بھی یہی افتاد پڑے اور اُن کو بھی وہی ذائقہ موت چکھنا پڑے جس کا جام اُنہوں نے بے گناہ مغیرہ کو پلایا تھا۔ نفس لوّامہ جس طرح دینی قوانین کی خلاف ورزی پر ملامت کرتا ہے اُسی طرح دنیاوی عدل و انصاف اور پیش پا افتادہ اصول اخلاق کے توڑنے پر بھی ملامت کرتا ہے۔ نفس لوّامہ کی ملامت خواہ کتنی ہی سزا سخت کیوں نہ ہو، انسان جسمانی سزا سے بھی بمشکل بچتا ہے۔

ابن ابی عامر کی سلیم الطبعی نے اُن کو اپنے خیالات کے اظہار سے روکے رکھا۔ جس وقت وہ اپنے دوستوں سے آکر ملے ہیں تو اُن کی روح کانپ رہی تھی۔ چونکہ کینہ ور آدمی تھے اس لئے اُنہوں نے وزیر مصحفی سے کسی موزوں موقعہ پر اس کا حساب لینے کے لئے یہ جرم اپنے دل میں ذخیرہ کر رکھا۔

خواجہ سراؤں کے سرداروں کو جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ اُن کی سازش کھل گئی، اور شاہزادہ قتل کر دیئے گئے، تو اُن کو سخت فکر اور گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ مگر اُن کو اپنی قوت اور حفاظت پر اس درجہ اطمینان تھا کہ اُنہوں نے اپنی نمک حرامانہ کارروائی کو ایک لمحہ کے لئے بھی ملتوی نہیں کیا۔ اُن کے آدمیوں نے تمام رعایا میں مبالغہ کے ساتھ یہ پھیلا دیا کہ اگر ایسا بادشاہ تخت پر بیٹھا جسکے کھیل تماشے کے دن بھی ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں، تو سلطنت معرض خطر میں پڑ جائیگی۔ جن وجوہ سے کہ مغیرہ قتل کر دیئے گئے تھے وہ اپنی نوعیت میں ایسے تھے کہ اُسکی تاویل نہیں کی جا سکتی تھی، مگر ان لوگوں نے

اسکو خوب توڑ موڑ اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ پھر کیا تھا، ہر جگہ وزرا، دولت کے خلاف آگ بھڑک اُٹھی، لوگ یہ کہنے لگے کہ ان لوگوں کی زیادتیاں اور بلند نظریاں جتنی ہیں وہ اپنی خود غرضی کے لئے ہیں۔ وہ سلطنت عظمیٰ کے امن و امان اور ترفہ کو برباد کر کے اپنا مطلب نکالینگے اور بس۔ فوراً ہی مقتدر لوگوں اور بڑے بڑے آدمیوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا گیا۔ خواجہ سراؤں نے لوگوں کو اپنا حامی بنانے کے لئے اپنی دولت کو پانی کی طرح بہا دیا۔ ہر طرف حکام کے خلاف لعن طعن سننے میں آتے تھے ان مبغوضوں میں سے کوئی بھی باہر نظر آجاتا تھا تو لوگ برافروختہ ہو جاتے تھے۔ قرطبہ کی تیتے چلین اور نمک حرام رعایا پھر غدر و انقلاب پر تیار نظر آتی تھی۔

یہ ظاہر ہو گیا کہ مصحفی اس قابل نہ تھے کہ وہ موجودہ حالت کو سنبھال سکتے۔ مجبوراً ابن ابی عامر نے، جو اس وقت وزیر ہو گئے تھے، خود ہی ارکین قصر شاہی کو مفید مشورے دیئے۔ کہنے کو تو یہ مشورے تھے، مگر حقیقت میں حکم تھے۔ رعایا میں جو غداری کی آگ بھڑک اُٹھی تھی، اُسکو فوجی نمائش کر کے فرو کیا۔ اس نمائش میں نوعمر خلیفہ نے بھی دخل دیا۔ اُدھر غربا کو یوں خوش کیا کہ بہت سے وہ ٹیکس معاف کر دیئے، جو خلیفہ الحکم کے زمانہ میں لگے تھے، اور لوگوں کو اُن کی وجہ سے شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو اندیشۂ فتنہ و فساد کا پیدا ہو گیا تھا، وہ تھوڑی دیر کے لئے جاتا رہا۔ اب ابن ابی عامر نے اپنی تمامتر توجہ خواجہ سراؤں کے تباہ کرنے میں صرف کی۔ ان کے جاسوسوں نے اُن کے حرکات و سکنات کی خوب نگرانی کی، اُدھر انہوں نے اپنا روپیہ خرچ کر کے اُن دونوں کے خدمتگاروں کو توڑ لیا۔ داروغۂ توشہ خانہ و بازداران کے اکثر ماتحتوں نے اُن کی طمع و آز اور ناانصافی کی شکایت کی، اس پر خفیہ طور سے اُن کو ترغیبیں دی گئیں، اور ان پر نالشیں دائر ہو گئیں، اُن کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے خواجہ سراؤں کو سزائیں ہوئیں کوئی قید ہوا، کوئی قتل، کوئی جلاوطن کر دیا گیا، رہ گئے اُن کے افسر، جوذر کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا، فایق کو میورقہ بھیج دیا گیا، وہ وہیں گمنامی اور افلاس کی حالت میں مر گیا۔ ان شر انگیزوں کو سزا ہوئی تو اوروں پر بھی رعب بیٹھ گیا، اور فتنہ و فساد وہیں کا وہیں دب گیا، جسکے اصل بانی یہی دونو خواجہ سرا تھے۔ ادھر سے گونہ اطمینان ہوا تو اُن کو

عیسائیوں کی طرف توجہ کرنے کی مہلت ملی جو بڑھے چلے آتے تھے اور اُن کے بڑھنے سے گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔

امیرالمومنین الحکم کے انتقال کے بعد جو سیاسی ابتری نایب السلطنت کے تقرر تک پیدا ہوگئی اُس سے سلاطین لیون ونوار بے خبر نہ تھے۔ معاہدات سابقہ کی تنسیخ، قابل نفرت خراج کے ادا کرنے سے انکار، جو علاقے مسلمانوں نے لے لئے تھے اُن کے بازیافت، امیرالمومنین الناصر لدین اللہ کے زمانہ سے جو فوجی شکستیں عیسائیوں کو ہوئی تھیں اُن کے سب کے انتقام لینے کیلئے یہ موقعہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ علاقہ شمالی کے لوگ غیر محفوظ صوبوں پر آپڑے، کیونکہ وہاں کی رعایا امیرالمومنین الحکم کے زمانہ کی امن و عافیت کی وجہ سے بیفکر ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اُن کے ہتھیار زنگ آلود ہو رہے تھے۔ سرحد کی حفاظت پر جو افسر مقرر کئے گئے تھے اُن کی ناقابلیت کی وجہ سے کہیں سخت مقابلہ نہیں ہوا۔ یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مصحفی کی سہل انکاری اور کاہلی سے ان قزاقوں کی روک تھام ناممکن ہے۔ ان بدبختوں نے اپنی فوج پھیلا کر ہر جگہ خوف پیدا کر دیا، اور اندلس کے سرسبز شاداب کھیتوں اور باغوں کو تباہ کر دیا۔ آخر کار وہ اپنی کامیابیوں پر ایسے مغرور ہوئے کہ سیرا مورینا میں آگھسے۔ کفار کے منحوس علم ایک مرتبہ پھر دارالخلافہ کے بروج سے نظر آنے لگے۔ یہ گستاخی ایسی نہ تھی کہ جسکو مغرور سلطانہ گوارا کر لیتیں۔ انہوں نے ابن ابی عامر کو بلا کر فہمائش کی کہ وہ عیسائیوں کو اُن کی گستاخی کی سزا دیں۔ ایک مجلس شوریٰ قائم کی گئی، اور یہ قرار پایا کہ فوراً مہم بھیجی جائے۔ وزیر ابن ابی عامر نے اپنی معمولی ترکیبوں سے اپنے آپ کو سپہ سالار بنوایا۔ اُنہوں نے اس خیال سے کہ شکست کا احتمال بھی نہ رہے، چیدہ فوج، منتخب آدمی اور تجربہ کار افسروں کو اپنے ساتھ لیا۔

اس وقت ابن ابی عامر کو انتالیسواں سال شروع ہوا تھا۔ فنون جنگ سے اُن کو بہت کم واقفیت تھی، عملی طور پر جنگ کو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کی تمام عمر ایسے اشغال میں گزری تھی کہ بجائے اسکے کہ وہ میدان جنگ میں مددگار ہوں رکاوٹ پیدا کرنے والے تھے۔ مگر وہ ایسے

قوی دل آدمی تھے کہ اپنے آپ کو ہر کام کے لئے تیار کر لیتے تھے، چنانچہ انہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ اُن تمام مشکلات کو رفع کر لیا جو اُن کے راستے میں حایل تھیں۔ اگر اُن میں یہ نقص تھا کہ اُن کو فوجی امور کا علم یا تجربہ نہ تھا، تو وہ خوبیاں بھی تھیں جو ایک ضابط مدقق میں ہُوا کرتی ہیں۔ خوش تدبیری، احتیاط، قوت فیصلہ اور ہمت و استقلال میں بڑے سے بڑا کامل و ماہر افسر فوج، جسکے ہاتھ میں اب تک فوج کی قسمت دی گئی تھی، اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب تک جس کام میں اُنہوں نے ہاتھ ڈالا اُن کو برابر کامیابی ہوتی چلی گئی۔ اس سے اُن کو اپنے جوہر دماغی پر صحیح طور سے اطمینان، نہ کہ غرور، پیدا ہو گیا تھا۔ اُن میں یہ ایک عجیب بات تھی کہ وہ سپاہیوں کے دل میں گھر کر لیتے تھے، یہی وجہ تھی کہ بڑی بڑی گھمسان کی لڑائیوں اور مشکوک جنگوں میں، سپاہی اپنے آپ کو اُن پر فدا کرنے پر تیار ہو جاتے تھے، اور کامیاب رہتے تھے ہر ایک سپاہی، خواہ وہ کسی درجہ و رتبہ کا کیوں نہ ہوتا، اُن کے خوانِ کرم سے فیضیاب ہوتا تھا جتنے افسرانِ فوج تھے وہ دونوں وقت اُن کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے کسی شخص سے اگر کوئی بہادری اور تہور کا کام ہوتا تھا تو اُسکو خاص طور پر انعام ملتا تھا۔ نظام فوجی کی اگر کوئی ذرا سی بھی خلاف ورزی کرتا تھا، تو وہ سخت سزا پاتا تھا۔ یہ وہ پالیسی تھی کہ جس پر نیا سپہ سالار جو اس وقت اپنا فوجی کام شروع کرتا ہے، تمام عمر عمل پیرا رہا۔ ایسی صورتوں میں یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ پچیس برس کامل تک جہاں کہیں اُن کے قدم گئے، فتح و ظفر اُن کے ہم رکاب رہی۔

ابن ابی عامر کی پہلی مہم کے نتائج، فوجی نقطہ نگاہ سے، چنداں قابل التفات نہیں ہیں۔ لیکن اس کا اخلاقی اثر عیسائیوں اور مسلمانوں پر بہت بڑا پڑا، صرف وہی صورت نہیں رہی، جو محض ایک غزوہ کی ہوتی ہے۔ خلافت کے رعب داب میں جو ایک طرح کی کمی آ گئی تھی وہ پھر بحال خود قائم ہو گیا، سپاہیوں کی کمر ہمت پھر بندھ گئی، اُن میں جو نقص آ گئے تھے وہ بھی جلتے رہے، طول و طویل زمانۂ امن کی وجہ سے جو عیوب فوج میں پیدا ہو گئے تھے وہ بھی رفع ہو گئے۔ اس سے بجا طور پر یہ امیدیں بندھ گئیں کہ ایک نئے اور باحوصلہ سپہ سالار کے ماتحت فتوحات

اور صولت حاصل ہوجائیگی۔ اِس نے اسلام کے جانی دشمنوں کو یہ یقین دلا یا کہ جن جنگی جذبات نے اُن کی امیدوں پر اتنی مدت سے اُوس ڈالے رکھی تھی وہ اب تک مری نہیں تھی۔ اہالی لیون کی طلایہ فوجیں جو اندلسیہ کے گانوؤں کو لُوٹتی پھرتی تھیں، مایوس ہوکر بیٹھ رہیں۔ چرواہے اور کاشتکار پھر باطمینان تمام اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کُفّار کے عَلَم، اپنے قابل نفرت نشان صلیب کے ساتھ، اب دارالخلافۂ اسلام کی سُبکی نہ کر سکتے تھے؛

ابن ابی عامر کی قوت وطاقت چونکہ کچھ مستحکم ہوگئی تھی، اس لئے اب اُنہوں نے وہ تدبیریں چلنا شروع کیں جو اُن کے اصلی مقصود، یعنی حکومت مطلق العنان، کی مؤید ہوں۔ جو ہوشیاری اُنہوں نے دکھلائی، جو کامیابیاں اُنہوں نے حاصل کیں، اُنہوں نے اُن کو تمام سلطنت میں ایک ممتاز آدمی بنا دیا تھا۔ اب اُنہوں نے ایسے آدمیوں کو اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہا جو اُن کے خارِ راہ بنے ہوئے تھے، اور اُن کی بلند نظری اور بلند ہمتی میں حایل تھے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے مصحفی کو تاڑا؛ کیونکہ وہی ایسے آدمی معلوم ہوتے تھے جو بلحاظ اپنی علوء شان اور جلالت قدر کے اُن کے رقیب بننے والے تھے۔ اس نصب العین کے حاصل کرنے میں نفرت قومیت نے، جو مسلمانان اندلس کی کشمش و کوشش میں بہت نمایاں رہی ہے، بہت کچھ مدد دی۔ مصحفی از روء نسل بربری تھے اس لئے عرب اُن کو بُری نگاہ سے دیکھتے تھے؛ ابن ابی عامر خود عرب تھے۔ امیرالمومنین الحکم کی نگاہ میں جو وقعت وزیر مصحفی کی تھی اُسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے؛ امیرالمومنین کے نزدیک یہی سب سے بڑی خوبی تھی، نہ کہ سیاسی قابلیت یا جنگی شہرت۔ مصحفی کا غرور حد درجہ پر پہنچا ہوا تھا؛ اُن میں قوت فیصلہ کی کمی تھی؛ اُن کی تنگ چشمی ضرب المثل تھی؛ جس دربار شاہی میں کہ اخلاقی اور سیاسی خوبیاں اتفاقات و مستثنیات میں داخل تھیں وہاں تغلب و خیانت میں وہ نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے ہم چشموں کے ہاتھ کے ایک کٹ پتلی بنے ہوئے تھے؛ خود ایک مکر و طبیعت کے آدمی تھے، اس لئے اور اہالی دربار بوجہ اپنے جوہر ذاتی کے اُن پر حاوی ہو رہے تھے۔ ابن ابی عامر نے ایک طرف تو مصحفی سے اپنے تعلقات

بہت ہی گہرے تھے، دوسری طرف اُنہوں نے کوئی موقعہ اُن کو تباہ کرنے کا اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ اکثر ملکہ صبح کو اُن کے برخلاف اشتعال دیتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے غالب کو (جو فوج میں بڑے نمود کے آدمی تھے، اور مصحفی کے اور اُن کے درمیان میں سخت دشمنی چلی آتی تھی) محکمہ فوج میں سب سے بڑا عہدہ دلوایا۔ لطف یہ ہے کہ بیچارے سیدھے سادے وزیر کے سامنے اُنہوں نے اس سپہ سالار سے آشتی پیدا کر لینے کی ضرورت ظاہر کر کے اس ترقی میں مدد دے لی۔ اصل یہ ہے کہ اُنہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ سپاہ اُن کی جان نثار ہے، اور خود اُن کی بلند نظری اُن کی پشت پر ہے، اس لئے موجودہ وزرات وغیرہ کا زور آسانی کے ساتھ ٹوٹ جائیگا۔ اسکے بعد اس فن سازش کے کامل اُستاد نے غالب سے گہرے تعلقات پیدا کئے؛ ان کا بھی مقصود اصلی یہی تھا کہ کسی طرح اس مکروہ وزیر مصحفی کو تباہ کر دیا جائے۔ ان دونوں دوستوں نے ایک خاص وقت تک اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں مل کر کام کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی عقل و فہم اور محاسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دئیے۔ غالب نے اپنی ترقی کے عوض میں اپنے دوست کے کمالات گنانے میں سخت مبالغہ کیا۔ اُن کی تعریفوں کا یہ نتیجہ ہؤا کہ ابن ابی عامر قُرطبہ کے حاکم اعلےٰ مقرر ہو گئے۔ اُن کے تقرر سے مصحفی کے بیٹے کو موقوف کرنا پڑا؛ جو اتنے بڑے عہدہ کا کام نو کرتے نہ تھے اور مفت تنخواہ پاتے تھے۔ اس زر پرست نوجوان کی لغو بیت کی یہ کیفیت تھی کہ روپیہ خرچ کرنے سے بڑے سے بڑے مجرم سزاؤں سے بچ سکتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی حرکات سے دارالخلافہ کے تمام محکمہ پولیس کو خراب کر رکھا تھا کوئی رات ایسی نہ گزرنے پاتی تھی کہ قتل یا سرقہ نہ ہوتا ہو۔ شہر والے مجبور ہو کر اپنی ہمت کے بھروسہ پر اپنی حفاظت خود کرتے تھے؛ حالانکہ یہ کام سلطنت کا تھا۔ نوجوان حاکم کی زر پرستی اور حکام ماتحت کی بددیانتی، سے دارالخلافہ کے بدچلن لوگوں کے علاوہ بہت سے بدمعاش باہر آ گئے تھے کیونکہ یہاں ہر طرح کے جرائم کر کے بچ رہنے کا یقین تھا۔

مگر اب بہت جلد ایک بڑی تبدیلی ہونے والی تھی۔ نئے حاکم قُرطبہ (ابن ابی عامر) نے

اپنے محکمہ کو عدل و انصاف کا ایک نمونہ بنا دیا، اور وہی سرگرمی وہی عدل و انصاف وہی سختی، وہی مستقل مزاجی امور عدالت میں دکھلائی، جو وہ ہر موقعہ پر دکھلا چکے تھے۔ پولیس کا ازسرنو انتظام کیا گیا۔ چونکہ بہت سے اہالی پولیس کو بضرورت سخت سزائیں دی گئیں اس لئے تمام محکمہ پر ایسا رعب پڑا کہ اُنہوں نے ڈر کے مارے مجرموں کو پناہ دینا چھوڑ دیا۔ باہر سے جتنے بدمعاش آ گئے تھے سب روپوش ہو گئے۔ شہروں کی گلیوں میں پھر اطمینان کی حالت پیدا ہو گئی۔ مضافات شہر میں پھر امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ ابن ابی عامر کے حدود اختیارات میں مجرم خواہ کسی رتبہ کا، اور خواہ کیسا ہی دولتمند ہوتا، سزا سے نہیں بچ سکتا تھا؛ انتہا ہے کہ یہ بے رو رعایت حاکم فوجداری رشتہ داری و عزیزداری کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کے بیٹے نے کوئی خلاف قانون کام کیا۔ اُسکو اس سختی کے ساتھ دُرّے لگوائے کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اثناء میں وزیر مصحفی کے دوستوں نے اُن کو جتلایا کہ اُن کی حالت نہایت مخدوش تھی خود ان کی عقل و ہوش اتنی نہ تھی کہ وہ اس کو سمجھ سکتے۔ اب اُن کو معلوم ہوا کہ طوفان دفعتًا اور یقینًا آنے والا ہے۔ اپنے رقیب کے آسیب سے بچنے کے لئے اُن کو سواء اسکے اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ وہ اپنے قدیمی دشمن غالب کی خوشامد کریں۔ اُنہوں نے ہمت کر کے یہ پالیسی چلی کہ منت و سماجت سے غالب کی بیٹی کی اپنے بیٹے کے لئے خواستگاری کی۔ یہ درخواست بھی کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ باوجود دشمنی کے اُنہوں نے اس کو غنیمت سمجھ کر منظور کر لیا۔ مصحفی کا خاندان اگرچہ کچھ معزز نہ تھا، لیکن اندلس بھر میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ برسوں کی خیانت سے اُنہوں نے اتنا جمع کر لیا تھا کہ اُن کی دولت کی شہرت تھی، اور عنان خلافت گویا اُن ہی کے ہاتھ میں تھی۔ چونکہ اس جدید تعلق سے بہت سے فوائد متصوّر تھے اس لئے غالب فوراً ہی مصحفی کے یہاں شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مصحفی یہ معلوم کر کے بے انتہا خوش ہوئے اور اُنہوں نے فوراً ہی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کابین نامہ پر دستخط ہو گئے، اور نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ ابن ابی عامر کے جاسوسوں سے پوشیدہ رہتی، کیونکہ ان میں سے کئی آدمی خود مصحفی کے خدمتگاروں

میں سے تھے۔ اُنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنے مدمقابل کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آخر سازش کا جواب سازش ہی سے دیا گیا۔ ملکہ صبح کے اثر و اقتدار اور ابن ابی عامر کے تمام دوست و احباب (جن میں سلطنت کے بڑے بڑے ارکان شامل تھے) کی کوشش نے غالب کو اپنے ارادہ سے باز رکھنا چاہا؛ مصحفی کو بدنیت بتلایا گیا؛ اُن کی اصل وجہ تحریک ظاہر کی گئی؛ اُن سے کنایتاً یہ کہا گیا کہ یہ مصحفی کا ایک جال ہے کہ جس میں اُنھیں پھانسنا مقصود ہے؛ وزیر موصوف کو جو معاندت اُن سے تھی اُسکو خوب رنگ آمیزی کرکے اوبھار اوبھار کر دکھلایا گیا۔ آخر ابن ابی عامر نے خود اپنے لئے اسماء بنت غالب کی خواستگاری کی؛ اور یہ دکھلایا کہ مصحفی جیسے ذلیل آدمی کا بیٹا اس قابل نہیں ہے کہ جس کا پیوند غالب کے یہاں ہو؛ اسماء کا حُسن اور رتبہ اسی قابل ہے کہ وہ سلطنت اسلامی کے سب سے بڑے مقتدر آدمی سے بیاہی جائیں۔ غالب کچھ ایسے مستقل مزاج نہ تھے کہ ابن ابی عامر کی طرف نہ پھسل پڑتے۔ اُنھوں نے بلا وجہ فوراً ہی مصحفی کے یہاں قطعی انکار کردیا۔ اُن کی بیٹی ابن ابی عامر کے نکاح میں آگئیں۔ رسوم شادی ایسی دھوم دھام سے ادا ہوئیں کہ اُس وقت تک قرطبہ میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اسکے چند ہی روز کے بعد دولھا حاجب مقرر ہوگئے، جس سے بڑا کوئی عہدہ خلافت اندلس میں نہ تھا۔

اب کیا تھا؛ مصحفی پر پے درپے مصیبت آنا شروع ہوئی۔ اُن کے انحطاط کی یہ کیفیت تھی کہ صبح کچھ تھا اور شام کچھ۔ اُن کے جتنے چاشتہ خور دوست تھے سب نے ایک ایک کرکے وزیر موصوف کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُن کو اُن کے خاندان کے تمام مردوں کے ساتھ قید کردیا گیا؛ اور اُن کی تمام جائداد اُس وقت تک کے لئے ضبط کرلی گئی کہ جب تک اُن کی خیانت کی تحقیقات نہ ہو جائے؛ اس جرم کے ثابت ہو جانے میں کیا دیر لگتی تھی؛ وہ نہایت شدید اور صاف تھے۔ اُن کی تمام جائداد ضبط ہوئی جس سے خزانہ شاہی کو بیش قرار مدد ملی۔ جو کچھ ضبط ہوا وہ مصحفی نے فریب سے حاصل کیا تھا یا بجبر۔ اُن کے جن رشتہ داروں نے اس معاملہ میں حکام کا مقابلہ کیا تھا وہ مارڈالے گئے؛ جو باقی رہے اُنھوں نے نہایت ذلیل پیشہ اختیار کرکے بلکہ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالا۔ رہے

قابل تعظیم مصحفی، اُنھوں نے برسوں وہ ذلتیں سہیں جو نفرت و معاندت اختراع کر سکتی تھیں۔ اور آخر کار اُن کو مار ڈالا گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس طرح۔ وہ معمولی غریب آدمیوں کی طرح دفن کر دیئے گئے۔

ادھر تو یہ واقعات گزر رہے تھے اُدھر خلیفہ کو قتل کرنے اور اُن کے چچیرے بھائی، عبدالرحمٰن ابن عبیداللہ کو تخت پر بٹھانے کی قرطبہ میں سخت سازش ہو رہی تھی۔ وہ ادیب و عالم جو ابن ابی عامر کے پرانے ہم مکتب اور استاد تھے اور دیگر عمال جو خلیفہ ہشام کی تخت نشینی کو بری نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اُن کی نااہلیت کا یقین رکھتے تھے، سب اس سازش میں شریک تھے اس سازش کی سرکردگی گو سخت خطرناک تھی مگر خواجہ سراء جوذر نے اپنے ہاتھ میں لی، کیونکہ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینا، اپنے فرقہ کے نقصان کی تلافی کرنا، اور اس کا اقتدار پھر قائم کرنا چاہتے تھے۔ کوئی قاضی، کوئی مفتی، کوئی شاعر اور کوئی یونیورسٹی کا پروفیسر ایسا نہیں رہ گیا تھا کہ اس سازش میں شریک نہ ہو۔ تمام فقہا اور علماء دین، جو ابن ابی عامر کے عقائد مذہبی سے بدظن تھے، سب اس سازش میں شامل تھے۔ ابن ابی عامر کی جگہ زیاد ابن افلح حاکم شہر قرطبہ مقرر ہوئے تھے اُنھوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا اور سازشیوں کو اپنی فوج دینے کو کہا۔ یہ طے پایا گیا کہ جوذر خلیفہ کو قتل کرے۔ بہت جلد وہ وقت آ گیا کہ جس غرض سے یہ سازش ہوئی تھی وہ پوری ہو جائے، پولیس ناگہاں محل شاہی سے ہٹ گئی، اور جوذر بے دغدغہ بغیر اسکے کہ کوئی شک کرے خلیفہ ہشام کے حضور میں پہنچ گئے لیکن نہ معلوم وہ گھبرا گئے یا ہمت ہی نے جواب دیدیا کہ خلیفہ کے اوپر جو وار اُنھوں نے کیا وہ اوچھا پڑا، قاتل فوراً گرفتار ہو گیا، زیاد ابن افلح حاکم شہر فوراً قصر شاہی میں طلب ہوئے، اُنھوں نے یہ دیکھ کر کہ کام بگڑ گیا، اپنے اوپر سے شک مٹانے کے لئے سختی کے ساتھ تحقیقات کرنی شروع کی اور اپنے ساتھیوں کو گرفتار کیا، اس سازش کے بڑے بڑے آدمی قتل کر دیئے گئے، باقیوں کو سخت سزائیں دی گئیں دو رخی چال چلنے والے زیاد ابن افلح نے اس تحقیقات میں خوب جوش دکھلایا، اور اپنے سابقہ رفقا کو سزائیں

دیتے ہیں پیش پیش رہے۔

ابن ابی عامر جانتے تھے کہ مذہب کے متعلق اُن کے آزادانہ خیالات اور فرصت کے وقت فلسفہ کا مطالعہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے لوگوں کے خیالات اُن کے متعلق خراب ہو رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ سازش ہے، ممکن ہے کہ اسکے نتائج اور بھی خراب نکلیں اس لئے انہوں نے اپنے رویہ میں کچھ ترمیم کرنا چاہی چنانچہ علماء دین کی بزرگ داشت کرنے لگے۔ چونکہ پچھلے دو بادشاہوں کے زمانہ میں بہت کچھ آزادی دی جا چکی تھی، اتنی کہ ہر امر میں شک کرنا اُن دنوں کا ایک فیشن بن گیا تھا، فلسفہ کا شیوع عام اور ہر لعزیز ہو گیا تھا، موجودہ زمانہ میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اسی کا ردعمل تھا۔ مالکیوں کا اثر پھر بڑھ گیا۔ ان مذہبی دیوانوں کا یہ کام تھا کہ کسی شخص کی نسبت مشتبہ عقائد خیالات کا شبہ ہوا، اور انہوں نے عوام الناس کو اسکے خلاف بھڑکا دیا۔ اگر یہ کروہ شخص کسی عہدہ پر ممتاز ہوتا تو اسکی سزاءِ موت کے لئے کسی فقیہ کا ذرا سا اشارہ کر دینا کافی ہوتا تھا۔ ابن ابی عامر کی بیدار مغزی اور پختہ کاری نے اس خطرہ کی روک تھام کی ترکیب سمجھا دی۔ انہوں نے نہایت احتیاط سے قرطبہ بھر کے اُن علماء کو جمع کیا جو زیادہ متعصب تھے، اور اُن سے نہایت متانت کے ساتھ یہ کہا کہ امیر المومنین الحکم کے کتب خانہ میں فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا ہونا اُن کی طبیعت پر سخت بار ہے، اسلئے اُن سے درخواست کی کہ اُن تمام کتابوں کو وہ الگ کر دیں جو قرآن مجید کے خلاف تھیں۔ وہ سب لوگ اس کتب خانہ میں گئے جسکی الماریوں میں یورپ اور ایشیا کے تمام خزانے موجود تھے، اور ان بے رحم دشمنانِ علم نے نہایت ذوق شوق سے اپنا متعصبانہ کام کرنا شروع کیا۔ ایک ایک کتاب کو انہوں نے بغور دیکھا، اور جس کتاب پر اُن کو ذرا سا بھی شبہ ہوا فوراً جلا دیا۔ اس کام میں ابن ابی عامر نے بھی نائب کی حیثیت سے بڑا جوش دکھلایا اور بہت سی کتابوں کو خود اپنے ہاتھ سے جلایا۔

تاریخ یہ نہیں بتلاتی کہ اس وحشیانہ حرکت سے کتنا نقصان پہنچا، فقیہوں اور مفتیوں کی جہالت سے اگر چشم پوشی کر لی جائے کیونکہ ان کو سوا دینیات کے اور کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، نیز یہ کہ جو

لاکھ جلدوں کو بغور دیکھنا، اور اُن میں سے سائنس و فلسفہ کی کتابوں کو چھانٹنا، بہت بڑا کام تھا، لیکن پھر بھی یقیناً اُنہوں نے اتنا بڑا نقصان دنیا کو پہنچا دیا کہ اُس کی تلافی کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ حاصل نتیجہ یہ ہُوا کہ اسکے بعد کسی شخص کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وزیر ابن ابی عامر کے عقاید مذہبی پر ذرا سا بھی شک کرتا۔ وہ تمام علماء دین کے سخت حامی اور مربی بن گئے؛ اُن کی فصاحت و بلاغت، اور فطانت و ذکاوت کے بہت مداح ہوگئے؛ اپنی فیاضی سے اُن کو گرویدہ کرلیا؛ کفار سے ناخوشی دکھلا کر تو اُن کو غلام ہی بنا لیا۔ اُنہوں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ خطاطی، جو اُنہوں نے جوانی میں سیکھی تھی، وہ بھول نہیں گئے ہیں، قرآن مجید کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا؛ جس کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، اور اسکی تلاوت ایسے موقعہ پر کرتے تھے کہ لوگ اُن کو دیکھ کر اُن کے زہد و اتقا کی تعریفیں کریں۔

وزیر مصحفی کا تو خاتمہ ہوچکا؛ اب غالب کی باری آئی۔ ابن ابی عامر پر سلطانہ بہت ہی مہربانی فرماتی تھیں، اُدھر امراء دولت اُن کے گرویدہ تھے؛ اسی نے اُن کو حاجب بنا دیا تھا، اور اُن کی سیاسی حیثیت اپنے خسر غالب کی برابر ہوگئی تھی۔ غالب اپنے ہم چشموں سے غرور کے ساتھ پیش آتے تھے، اور سب کو اپنے آپ سے کمتر درجہ کا سمجھتے تھے لیکن مجبوری یہ تھی کہ کار ہائے سرکاری میں اُن کو اُن ہی لوگوں سے کام لینا، اور اُن کے ناز سہنے پڑتے تھے۔ باہمی تکرار بڑھتی جاتی تھی؛ جس سے ابن ابی عامر بہت ہی دق ہوگئے تھے۔ اب غالب ہی ایک شخص رہ گئے تھے جو اُن کی بلند نظری، اور عملی طور پر مطلق العنان بادشاہی کے راستے میں حایل تھے۔ اُنہوں نے فوراً اپنے اس ہم نشین کو تباہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔ کامیابی کے لئے سب سے پہلی اور لازمی شرط یہ تھی کہ فوج کو بالکل اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ بڈر حاجب کی قوت اور اختیارات سے تمام ملکی ارکین خلافت کانپتے تھے؛ مگر ان اختیارات کی حدود قریب ترین فوجی چوکی پر ختم ہوجاتی تھی۔ سپاہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ معمولی قاضی ہیں۔ اگرچہ اُنہوں نے ایک سے زیادہ مہموں میں اپنے جوہر دکھلائے تھے اور فیاضی میں اپنا نام پیدا کرلیا تھا، مگر اُن کی جنگی شہرت اور ہردلعزیزی نہ کچھ درخشاں تھی

نہ دیرپا۔ فوج اب تک غالب پر قربان تھی، کیونکہ انہوں نے ان ہی کے ساتھ بہت سی تکلیف دہ مہموں میں شوکت حاصل کی تھی۔ فوج اور سپہ سالار کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ اگر ذرا بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ سپہ سالار کی عزت یا جان پر حملہ ہونے والا ہے تو تمام سلطنت کی فوج اُن کے دشمن کا مقابلہ کرتی اور اپنی جان تک فدا کر دیتی۔ فوج میں بیشتر تعداد عربوں کی تھی۔ امیر المومنین الناصر لدین اللہ نے بربریوں کو بھرتی کیا۔ مگر امیر المومنین الحکم نے اُن کو نکال کر اندلسیوں کو رکھ لیا۔ اپنے افسر کی حمایت اور رعایت کے بھروسہ پر سپاہی اکثر فوجی نظام کو توڑتے رہتے تھے۔ اُن کی وردی اور اسلحہ وغیرہ یکساں نہ تھے، اور اکثر ناقص تھے۔ اُن کی شہسواری پر بھی لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ بہت سی باتوں میں مختلف دستوں کا نظام ایک بے قاعدہ فوج سے زیادہ نہ تھا۔

ابن ابی عامر کو افریقیہ میں رہ کر جو تجربہ ہوا تھا اُس سے اُن کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ موریٹینیا کا رسالہ نہایت اچھا ہوتا ہے۔ اسکی شہرت پہلی پیونک جنگ ہی سے پھیلی ہوئی تھی۔ اس ملک سے سواء سبتہ اور اس علاقہ کے جو زیر حمایت خلیفہ اندلس رہ چکا تھا، تمام اندلسی چوکیاں اُٹھالی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بربروں کے روک تھام کے لئے کوئی مرکزی حکومت نہیں رہی، اور اس علاقے میں بدامنی پھیل گئی۔ جس وقت کہ وزیر ابن ابی عامر از سرِ نو فوج کا انتظام کرنے والے تھے، اُن کو حاکم سبتہ نے اطلاع دی کہ "بربریون کا ایک بڑا گروہ جو حال ہی کی لڑائی میں شکست کھا کر مفلس قلاش ہو چکا ہے، اُن کے زیر حمایت آنا چاہتا ہے، چنانچہ اسکو بانتظار حکم صدر میں نے عارضی طور پر منظور کر لیا ہے" اسکے جواب میں فوراً یہ حکم دیا گیا کہ اُن کو خلیفہ وقت کی فوج میں بھرتی کر دیا جائے۔ بربریوں نے فوراً بلا تامل اسکو منظور کر لیا۔ باشندگان الجزائر نے سخت حیرت اور گھبراہٹ کے ساتھ یہ دیکھا کہ یہ خونخوار لوگ، چیتھڑے لگائے ہوئے ایسے گھوڑوں پر سوار ہیں کہ جن کی ایسی ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں کہ وہ اپنے سواروں کا بوجھ بھی نہیں سنبھال سکتے۔ لیکن پیش بین حاجب ان ہی ان گھڑ وحشیوں میں وہ لوگ دیکھتے تھے کہ جو اُنکی بلند نظری

ہیں سب سے زیادہ مددگار ہونے والے تھے۔ انہوں نے اپنے ان نئے آوردوں کو بڑے تپاک سے لیا، اور خوب تواضع کی، بہترین ہتھیار اور گھوڑے اُن کو بہم پہنچائے۔ اُن کی لوٹ مار کی عادت ایسی تھی کہ وہ کسی طرح قانع نہ ہو سکتے تھے۔ انہوں نے ایسی رعایتیں مانگیں جو جاہلانہ گستاخی انہیں سجھا سکتی تھی، اور وہ رعایتیں دی گئیں جو اسراف عطا کر سکتا تھا۔ وہ مفلس قلاش قزاقوں کا گروہ، جس کو سر چھپانے کو گھر بھی نہ تھا، بڑے پرتکلف مکانوں میں رہنے لگا؛ وہ ذلیل وخوار آدمی، جو چند ماہ پیشتر ایک آوارہ شیخ کی آواز سن کر کانپ اٹھتا تھا، آج سینکڑوں غلاموں کا مالک تھا۔ اس حیرت انگیز خوش بختی کی خبر بہت جلد افریقیہ میں پہنچ گئی۔ ہزاروں متطوعین نے ایسے فیاض آقا کی خدمت کے لئے درخواستیں دیں۔ ابن ابی عامر کا مطلب حاصل ہو گیا۔ وہ ایک قوی فوج کو اپنے ساتھ دیکھ کر بہت ہی مطمئن ہوئے؛ پھر فوج بھی ایسی کہ جو اُن کی جان نثار تھی، اور اُن ہی کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی؛ جو حب الوطنی کے نام سے بھی واقف نہ تھی اور جس کو موجودہ فوجی انتظام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے بربری اجیروں کے رکھنے پر ہی بس نہیں کیا؛ دور دراز ممالک اور ایسی قوموں سے، جن پر یہ شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت کے لئے تیار ہو جائینگی، انہوں نے اپنی فوجی قوت کو خوب بڑھا لیا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خلیفہ ہشام سے پہلے شمالی علاقے کے عیسائیوں کو اسلامی فوج میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ لوگ اپنے ہمسایوں کے پشتینی اور پیدائشی دشمن تھے؛ اسکی وجہ کچھ تو جذبات حب الوطنی تھے اور کچھ مذہبی اور مسیحی خیالات مذہبی۔ پچاس برس کی خانہ جنگیاں، مسلسل غاصب، اور ایسے بادشاہوں سے، جو ازروئے قانون مشکوک طور پر بادشاہ ہو سکتے تھے، ان کی وفاداری، پادریوں کا غرور، جو اپنے آپ کو بادشاہ سے بھی برتر سمجھتے اور قرار دلوانا چاہتے تھے، ان سب نے مل کر ان کے اتحاد کو خراب کر دیا تھا، اور شمالی سپین کی سلطنتوں کے محدود مالی ذرائع کو ختم کر دیا تھا۔ وہاں کی آبادی بڑھتی چلی جاتی تھی، اور سامان آذوقہ روز بروز کم ہوتا چلا جاتا تھا۔ چونکہ جائدادیں غیر محفوظ تھیں اس لئے زراعت کی بری حالت ہو گئی تھی۔ وہ علاقہ ہی ایسا تھا کہ جب تک سخت ترین محنت و مشقت

کی جائے معمولی روزمرہ کے خرچ کی چیزیں بھی وہاں پیدا نہ ہو سکتی تھیں۔ ملک کو تیغ بند لوگ پامال کئے ڈالتے تھے۔ جب اُن کو موقعہ ملتا تھا تو وہ بدقسمت مزارعین کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو تمام و کمال لوٹ لینے میں بھی تامل نہ کرتے تھے۔ یہ پہاڑی آدمی بڑے طویل القامت، جسیم اور قوی تھے؛ تکلیفیں برداشت کرنے میں اُن کو کمال حاصل تھا؛ میدان جنگ میں اُن کی شجاعت اور استقلال بے مثل تھا۔ ان ہی صفات کی وجہ سے وہ ہر طرح اس قابل تھے کہ فوج میں قدر کے ساتھ بھرتی کر لئے جائیں۔ ابن ابی عامر کے آدمیوں نے بڑی آسانی کے ساتھ اُن کو یہ یقین دلادیا کہ اگر وہ اپنے موجودہ آقا کو چھوڑ کر ایک نئے آقا کی ملازمت کر لینگے تو اُن کا سراسر فائدہ ہے۔ بڑی تعداد میں یہ لوگ قرطبہ پہنچے اور خلیفہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ حاجب ممدوح نے اُن کے ساتھ افریقیوں سے بھی زیادہ اچھا سلوک کیا؛ اُن کو دوگنی تنخواہ دی گئی؛ پُر تکلف مکان میں رکھا گیا؛ بڑے قیمتی ہتھیار اور گھوڑے دیئے گئے؛ اور ہر طرح کا آرام و آسائش اور تکلفات کی چیزیں بہم پہنچائی گئیں۔ ان اجیروں کی ابن ابی عامر اتنی حمایت کرتے تھے کہ بعض وقت وہ اصول انصاف کو بھی چھوڑ بیٹھتے تھے؛ حالانکہ عدل و انصاف اُن کے خصوصیات میں داخل تھا۔ اُن کو اکثر ایسے مخاصمات فیصل کرنے پڑتے تھے جن میں یہ عیسائی اور کوئی مسلمان فریق ہوتے تھے؛ ان سب میں تمام فیصلے مسلمانوں کے خلاف اور ان عیسائیوں کے موافق ہوتے تھے۔ اس سیاسی ترکیب کا اثر بہت جلد ظاہر ہونے لگا۔ اہالی قشتالہ اور نوارے نے بربریوں کی طرح بخوشی خاطر اپنی خدمات اتنی تعداد میں پیش کیں کہ اُن کے رکھنے کو جگہ ہی نہ رہی۔ بھرتی کرنے والے افسروں نے صرف چیدہ آدمی لئے باقی سب کو انکار کر دیا۔ ایک الگ فوج ان لوگوں کی قائم کی گئی جو بلحاظ جسمانی طاقت، تن و توش، ہتھیاروں کی نفاست اور نظام فوجی کے یورپ بھر میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔

یوں ابن ابی عامر روز بروز ملکی و فوجی محکموں پر اپنا عمل دخل بٹھائے جاتے تھے؛ اور ساتھ کے ساتھ ہی اپنے رقیب کے حامیوں کو خستہ اور اُن کی قوت کو کمزور کئے چلے جاتے

تھے۔ قبیلہ کا جو نظام اسلام سے پہلے کا متوارث چلا آتا تھا، اُس کی پابندی اب بھی فوج میں چلی آرہی تھی۔ ہر ایک قبیلہ کا دستۂ فوج الگ تھا، اور اُس میں اُسی قبیلہ کے افسر تھے۔ بہت سی مثالیں ایسی بھی تھیں کہ لوگوں نے اور قبیلہ کی عورتوں سے شادیاں کرلی تھیں، جس سے رشتۂ عزیزداری ٹوٹ چکا تھا، مگر قبیلہ کی عصبیت نسب پر بھی غالب ہورہی تھی۔ بہت لوگ ایسے تھے کہ جو مختلف قبایل کی فوج میں شامل تھے، حالانکہ ایک دوسرے سے علاقہ نہ رکھتے تھے۔ ابن ابی عامر نے اب یہ چاہا کہ زمانۂ قدیم کے یہ امتیازات بالکل مٹ جائیں؛ چنانچہ عربوں کو اُنہوں نے بربری اور عیسائی اجیروں کے مضبوط دستوں میں تقسیم کردیا۔ اس تدبیر سے عربوں کی ہستی ایسے غیر ملکیوں میں غائب ہوگئی، جو نہ ان کی راہ و رسم سے واقف تھے، نہ اُن کی روایات کو جانتے تھے، بلکہ اکثر تو ان کی زبان سے بھی ناآشنا تھے۔ یوں وہ فوج، جو غالب کی جان نثار تھی، اور جس پر غالب جان دیتے تھے، بہت ہی جلد، اور خاموشی کے ساتھ اس طرح اِدھر اُدھر بکھر گئی کہ اُسکے اصلی حالت پر آنے کی توقع ہی نہ رہی۔ نظام فوجی میں بڑی ترقی ہوگئی۔ فوجی افسروں کے مقرر کرنے میں سب سے پہلی اور لازمی شرط تو یہ تھی کہ وہ لوگ حاجب کے دلدادہ اور اُن کے اغراض و مقاصد کے مددگار ہوں؛ اور دوسری صفت یہ کہ جنگ آزمودہ ہوں، اور ہمت و استقلال میں شہرت یافتہ۔ فوجی قوانین کا اس سختی کے ساتھ نفاذ کیا گیا کہ اگر قواعد کے موقعہ پر کسی سپاہی کی تلوار ذرا سی بھی میان سے باہر رہ جاتی تو اُسکو موت سے کم سزا ہی نہ دی جاتی تھی۔

ابن ابی عامر کو جب پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ فوج بالکلیہ اُن کے ہاتھ میں آگئی ہے تو اب اُنہوں نے نوجوان خلیفہ کو دوامی طور پر اپنی صیانت میں رکھنے کی سینہ زور تدبیر کا فکر کرنا شروع کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُن کی والدۂ ملکۂ صبح بھی جو اب تک اُن کے ہاتھ کی کٹ پتلی بنی ہوئی تھیں، اس قابل نفرت کام میں اُن کی مددگار ہوگئیں۔ اُس وقت خلیفہ ہشام کی عمر پندرہ برس کی ہوچکی تھی۔ معاصر مورخین لکھتے ہیں کہ اُن کی قابلیت اعتدال سے زیادہ ہی تھی؛ اگر زمانہ اُن کی مساعدت کرتا تو ممکن تھا کہ اپنے خاندان کے ممتاز بادشاہوں سے کچھ کم نہ ہوتے؛ لیکن بدقسمتی

کہ تمامتر کوشش اس میں صرف کر دی گئی کہ اُن کی دماغی قابلیت کو ضعف پہنچایا جائے اور جسمانی طاقت کو کمزور کر دیا جائے۔ وہ مدینتہ الزہراء کے محل میں پردہ میں بٹھا دیئے گئے۔ اُن کے اُستادوں کو الگ کر دیا گیا، اور یہ کوشش کی گئی کہ وہ تعلیم ہی حاصل کرنے پائیں۔ اُن کے دل میں یہ بٹھا دیا گیا کہ بحیثیت بادشاہ کے اُن کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہیں، اور خیرات تقسیم کیا کریں۔ اُن کے دینی مشیروں نے اُن سے مسلسل روزے رکھوا رکھوا کر انہیں لاغر و نحیف اور اُن کی دماغی قوتوں کو تباہ کر دیا۔ یہی صورت فی نفسہ کسی نوجوان کے جسم و جان کو سخت نقصان پہنچانے کے لئے کافی تھی؛ اس پر غضب یہ ہوا کہ حرم سرائے کی حسین عورتوں میں پھنس کر کثرت عیاشی سے اُنہوں نے اپنی رہی سہی صورت کا اور بھی ستیاناس کر لیا۔ جس کمرہ میں وہ پردہ میں بٹھائے گئے تھے، اُس میں عیش رانی کے ہر طرح کے سامان مہیا رہتے تھے؛ نہایت حسین کنیزکوں کا غول ہر وقت اُن کے گرد رہتا تھا، اور الشیبا کا شہوت انگیز رقص اُن کے سامنے ہوتا رہتا تھا۔ نہایت پر تکلف مجمروں میں وہ خوشبوئیں سلگتی رہتی تھیں کہ جن سے آدمی خود بخود مدہوش ہو جاتا تھا۔ یہاں وہ فقہا کی نظروں سے بالکل محفوظ تھے، اس لئے اندلس کی بہترین شراب پیٹ بھر کر اتنی پیتے تھے کہ ہوش ہی نہ رہتے تھے۔ جتنے خدمتگار تھے۔ اُن کو سخت ہدایات تھیں کہ وہ اپنے آقا کے اخلاق کو خراب کرنے کا کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے جانے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدقسمت ہشام نہایت شرمناک عیوب کے عادی ہو گئے۔ چونکہ اُن کی طاقت بے وقت ختم ہوئی جا رہی تھی، اس لئے چند روز تو مقویات کھلا کھلا کر اسکو سنبھال رکھنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن بعد میں تو اُن کی رجولیت ایسی دواؤں سے بالکل کھوئی گئی جو حاجب کے رشوت خوار خواجہ سرا اُن کو کھلاتے رہے۔ خلیفہ کی عمر بڑھنے پر بھی اُن کی حالت اور اشتغال میں کوئی فرق نہیں آیا؛ وہی کھلونے اُن کے دل بہلاتے رہے؛ وہی پرانی مشقتیں اُن کے دینی معلم اُن سے لیتے رہے۔ اُن کے کمرے کی چار دیواری اُن کی دنیا تھی جسکے اندر کوئی شخص بغیر حاجب کی اجازت کے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ غائر نظر ہوشیار جاسوس اُن کی ہر خفیف حرکت کو

جو وہ کرتے تھے، اور ہر چھوٹی سی بات کو جو اُن کے منہ سے نکلتی تھی، حاجب کو اطلاع دیتے تھے
نہایت متانت کے ساتھ اُن کے دل میں یہ بٹھایا جاتا تھا کہ کاروبار سلطنت اتنے بوجھل
ہیں کہ وہ اُن کے متحمل نہیں ہوسکتے، یہ کہ خداء تعالےٰ کی خوشنودی کا طلب کرنا ہر مسلمان کا
مآل زندگی ہونا چاہیئے، اور یہ بذریعہ زہد و اتقا ہی کے بآسانی حاصل ہوسکتی ہے، نیز یہ کہ
مہام سلطنت دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینے چاہئیں، جس سے نہ امیر المومنین کو تکلیف ہوگی،
نہ اُن کی حیثیت میں فرق آئیگا۔ حاجب کے حاضر و ناظر آدمیوں نے اقطاع ملک میں مشتہر کر رکھا
تھا کہ امیر المومنین نے ان تمام باتوں، بالخصوص آخری، کو بطوع خاطر منظور فرمالیا ہے۔ گو یہ لوگ
عوام الناس میں اس کا چرچا کرتے پھرتے تھے مگر اُن کا دل اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ ترکیبیں محض
اس لئے کی جارہی ہیں کہ خلیفہ ہشام ثانی کو شاہ شطرنج بنا دیا جائے۔ ابن ابی عامر اچھی
طرح جانتے تھے کہ اس ظاہری ہر دلعزیزی کا مطلق اعتبار نہیں ہے، ممکن ہے کہ لوگوں کی سرگرمی
ایک ذراسی بات میں انقلاب کی طرف مایل ہوجائے۔ اُن کے خفیہ دشمن، جن میں سے بہت سے
نہایت قابل اور مستقل مزاج آدمی تھے، اہل علم کے حلقوں، اور عوام الناس کے جلسوں میں
بھرے پڑے ہیں۔ یہ مانا کہ بادشاہ لاشئے محض، اور مقید مطلق ہے، لیکن کسی چوکیدار کی ذراسی
بے ایمانی، اور کسی غلام کی چھوٹی سی ناراضگی سے، ذراسی دیر میں، بہت بڑی سازش ہوسکتی،
اور بادشاہ کو آزاد کرا سکتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اگر حاجب کہیں مدینۃ الزہراء میں مل
گئے تو اُن کی جان ایک پرپشہ کی وقعت نہ رکھیگی۔ حفظ ماتقدم کے طور سے اُنہوں نے دار الخلافہ
کے مشرق کی طرف بہت بڑی جائداد خرید کر مکان بنایا، جو قلعہ بھی تھا اور قصر بھی، اور اس کا نام
"زاہرہ" رکھا۔ اس مقام کو اُنہوں نے ایسا مضبوط اور فراخ بنایا کہ اُس میں محافظ فوج بھی رہ
سکتی تھی۔ جب یہ عمارت مکمل ہوگئی تو ابن ابی عامر نے تمام سرکاری کاغذات وہیں منتقل کرلئے
اس کے بعد تمام قوانین و فرامین، خلیفہ ہشام کے نام سے یہیں سے جاری ہوتے تھے، جن کی
پابندی تمام رعایاء جزیرہ نماء اندلس پر فرض تھی۔ الکین سلطنت کی سکونت کے لئے یہیں

بڑی بڑی عمارات بن گئیں، اور زاہرہ نے بالکل شہر کی سی صورت اختیار کر لی۔ متوسلین دربار حاجب کے خاص خدم وحشم، مفت خورے جو ہر شہر کے اطراف میں مکھیوں کی طرح گرد رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں اور کاریگروں نے اُس شہر کے پاس اپنے سکونتی مکانات بنا لئے۔ زاہرہ کی وسعت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قُرطبہ سے ابن ابی عامر کا قصر بارہ میل کے فاصلہ پر تھا، لیکن اسکے باغات وادی الکبیر کے کنارے تک پہنچے ہوئے تھے۔ دوسرے کنارے پر دارالخلافہ آباد تھا۔ اس مقام کی نسبت عرب مورخین نے ایک قصہ لکھا ہے جس سے وہاں کے تمول، اسراف اور اظہار شان وتجمل کا پتہ لگتا ہے، جو اہلی ایشیا کے خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ بادشاہ نوار کے سفیر آنے والے تھے، حاجب چاہتے تھے کہ اُن پر اپنی دولت کا اظہار اور اپنی قوت کا رعب ڈالیں۔ اسکے لئے زاہرہ کے باغ میں ایک بہت بڑی جھیل بنوا کر اُس میں نیلوفر لگوا دیئے گئے۔ بہت سے درم ودینار نئے مسکوک کرا کر اُنہوں نے حکم دیا کہ رات کو ہر پھول میں ایک ایک سکہ رکھ دیا جائے۔ اس میں ڈھائی من سونا چاندی خرچ کر دیا گیا۔ سفیر کو علی الصباح باریاب کیا گیا تو علاوہ اور ملکی احتشام اور فوجی نمائش کے، جو اس موقعہ پر معمولاً کیا جاتا تھا، ہزار حبشی غلام مساوی تعداد میں، تخت کے پیچھے کھڑے کئے گئے، یہ سب سفید پشمین کپڑے پہنے ہوئے تھے، پانچ سو آدمیوں کے کپڑوں پر سنہرا کام تھا، باقیوں پر روپہلا، کسی کی پیٹی سنہری تھی کسی کی روپہلی، ہر ایک کے ہاتھ میں سونے یا چاندی کی ایک ایک تھالی تھی۔ جیسے ہی آفتاب طلوع ہوا یہ حبشی فوجی قاعدہ کے موافق جھیل کی طرف بڑھے، اور اُنہوں نے نیلوفر کے پھول توڑ کر درم ودینار اپنی اپنی تھالی میں جمع کئے، اور سب کا ڈھیر ابن ابی عامر کے قدموں میں لا کر لگا دیا۔ نوار کے سادہ لوح پہاڑیوں پر اس کا جو کچھ اثر پڑا ہو گا وہ محتاج بیان نہیں ہے حاجب کے ذرائع کی شہرت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی، اب تو اُس سے بھی سو گنی بڑھ گئی۔ سفیر اس عجوبہ کو دیکھ کر نقش حیرت بنے رہ گئے، اور اُنہوں نے اپنے بادشاہ سے جا کر کہا کہ زمین اور پانی بھی اپنے چھپے ہوئے خزانے مسلمانوں کے بادشاہ کے سامنے بطور خراج پیش کرتے ہیں۔

ادھر تو ذہین و فطین ابن ابی عامر، بادشاہ کو یوں اپنے جال میں پھنسا کر محض مضغۂ گوشت بنانے اور سلطنت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی تدابیر کر رہے تھے، ادھر غالب کا اعزاز و اکرام اور بھی زیادہ بڑھا رہے تھے۔ ہر موقعہ پر اُن کی عزت و حرمت کرتے تھے، جزوی معاملات میں اپنی راء پر اُن کی راء کو فوقیت دیتے تھے۔ جب اُن کو یہ اطمینان ہوتا کہ اُن کی راء اپنی بلند نظری کی سدراہ نہ ہوگی تو وہ نہایت ادب کے ساتھ اُن کا مشورہ لیتے تھے۔ لیکن وہ دوربین تجربہ کار سپاہی بھی ایسا نہ تھا کہ ان خوشامدوں، ظاہری لفاظیوں اور اظہار لطف و مکرمت کے جال میں پھنس جاتا۔ وہ بدل و جان خاندان بنو اُمیہ پر فدا اور اُن کے نمک حلال تھے۔ وہ خلیفہ کو پردہ میں بٹھا دینے اور اُن کے اختیارات شاہی کو غصب کر لینے کا تماشا دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں پریشان ہوتے اور جلتے تھے، اپنے رفیق کی بلند نظری اور ہر طرف چھا جانے کو دیکھ کر وہ بہت ہی گھبراتے تھے۔

غالب پہلے تو اس کو نہ سمجھے کہ فوج کا نیا انتظام، اُن دستہاء فوج کو جو اُن کے گرویدہ ہیں، موقوف اور دور دراز مقامات میں تبدیل، اُن کے خاص آدمیوں کو اجیروں میں شامل کیوں کیا جا رہا ہے اور اس کا مقصود اصلی کیا ہے۔ مگر جب اُنہوں نے اسکو سمجھا تو اپنے داماد کی پالیسی کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؛ وقت گزر چکا تھا؛ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آزمودہ کار سپہ سالار جو کچھ بھی کر سکتے تھے وہ صرف اتنا تھا کہ ابن ابی عامر کو لعنت ملامت کر دی اور بس۔ اتفاقاً ایک مہم کے موقعہ پر جو فوج روانہ ہونے لگی تو ابن عامر اور غالب ایک بلند مقام پر کھڑے ہوئے اُس کا جایزہ لے رہے تھے، وہاں بھی اُن دونوں کے درمیان میں کچھ تو تو میں میں ہوئی اور غالب تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے۔ ابن ابی عامر کے ظن و گمان میں بھی نہ تھا کہ غالب اس موقعہ سے فائدہ اٹھائینگے۔ اُن کو اپنی جان بچانے کی سواء اسکے کوئی سبیل نظر نہ آئی کہ وہ وہیں سے کود پڑے۔ اُن کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے ایک جگہ پھنس گئے اور اُن کی جان بچ گئی۔ دونوں رقیب ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو اپنی آشفتگی میں ایک نے دوسرے سے انتقام

لینے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ دونوں میں فوراً ہی گویا اعلانِ جنگ ہو گیا۔ بیچارے غالب کی جان نثار فوج ہی کتنی رہ گئی تھی، معدودے چند جو لوگ تھے اُن کی کمک کے لئے بادشاہ لیون نے اپنے سوار بھیج دیئے۔ ابتداء میں تو دونوں فریق اپنی زور آزمائی میں برابر رہے اور نتیجہ جنگ غیر منفصل رہا مگر ایک حملہ کے دوران میں غالب اپنے تہور میں اس طرح آگے بڑھ گئے کہ اپنی حفاظت کا بھی خیال نہ رکھا، اور قتل ہوئے۔ اُن کے جتنے ساتھی تھے سب پریشان ہو کر بھاگے اور فتح و ظفر خوش قسمت ابن ابی عامر کے ہاتھ رہی ؂

اب ابن ابی عامر تمام خلافت مغربی کے مالک واحد تھے۔ اپنے خصایل کے زور، اپنے بے باکانہ عزیمت اور اپنی ان تھک محنت سے اُنہوں نے اپنی مدت العمر کی آرزو کو پالیا۔ اُن کے نہ کوئی مقتدر دوست و آشنا تھے کہ سفارش کرتے، نہ وہ کسی ایسے خاندان کے فرد تھے کہ اُس سے مدد ملتی، اس پر بھی اُنہوں نے وہ اقتدار پالیا کہ کسی کو نصیب نہ ہُوا۔ اُن کی بیدار مغزی اور فیاضی سے نہایت قوی فوج مہیا ہو گئی، اور ایک الگ گروہ اُن کا جان نثار بن گیا، دونوں نہایت سرگرمی کے ساتھ اُن کی خدمت کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ جو شخص کہ برائے نام بادشاہ تھا وہ اُن کا غلام بنا ہُوا تھا۔ وہ کل، جو مہام سلطنت کو چلا رہی تھی، مملکت کے خزاین، حکام و عمال کا عزل و نصب، عطیات و انعامات، سزا و جزا، ملکی پالیسی، فوجی مہمات سب کچھ اُن کے ہاتھ میں تھے۔ یہ تھی وہ شان و شوکت، دولت و حشمت، رعب و داب جو قرطبہ یونیورسٹی کے ایک گمنام مفلس قلاش کو مل گئی۔ یہ وہی غریب ہے جو درخواستیں لکھ لکھ کر اپنا پیٹ پالتا تھا، اس کا بھی اعتبار نہ تھا کہ اگر صبح کو اجرت مل گئی تو شام کو بھی ملنے کی امید تھی۔ جن لوگوں کے نام یہ شخص عرضیاں لکھتا تھا آج اُن میں سے بہت سے اُن کے منتظر فرمان غلام تھے۔ اتنے سال گزر گئے، ایسی ایسی عجیب و غریب تبدیلیاں اور انقلاب ہو گئے، مصایب میں، تکالیف میں، جوش و خروش میں، کامیابیوں میں جو ابن ابی عامر کو عروج پانے میں پیش آئیں، ان کے دل سے باغ کا وہ منظر محو نہیں ہُوا کہ جہاں ہنسی، مذاق میں اُنہوں نے اپنے رفیق طالبان علم سے کھیل ہی کھیل میں اپنے بادشاہ

ہو جانے کی پیشینگوئی کی تھی۔ غالب کی موت نے اُن کو اپنی من مانی باتیں کرنے کے لئے بالکل آزاد کر دیا۔ اُنہوں نے اپنے اُن چاروں رفقا کو، جو اُس روز باغ کی دعوت میں شریک تھے، اپنے سامنے بلوایا۔ تین صاحبوں کو تو خود اپنے ہاتھ سے حاجب موصوف نے اُن عہدوں کے پروانے عطا فرمائے، جو اُنہوں نے اُس روز مذاق میں مانگے تھے؛ چوتھے صاحب کو پہلے تو اُنہوں نے خوب دھمکایا کہ "ہم تم کو عزت عطا فرماتے تھے، جسکے بدلے میں تم نے بے ضرورت ہماری داڑھی پکڑ کر ہماری ذلت کی۔" اسکے بعد اُن کی تمام جائداد ضبط کر کے غلاموں کو حکم دیا کہ جو کچھ سلوک اُنہوں نے اپنے ساتھ کرنے کو کہا تھا وہی کریں ٭

جو قیدیں کہ خلیفہ ہشام پر عائد کی گئی تھیں اُن میں اور بھی سختی کی گئی۔ پہلے تو اُن کو شاذ موقعوں پر اپنے رعایا کے سامنے نکل آنے کی اجازت تھی لیکن اب ابن ابی عامر کی غیرت نے یہ رعایت بھی چھین لی، اور اُن کو مدینۃ الزہراء کے قصر شاہی میں محبوس دوام کر دیا۔ اگر وہ نماز پڑھنے کے لئے باہر نکلتے تھے تو حکم تھا کہ گُندہ نقاب ڈال کر نکلیں، اور تاوقتیکہ ایک ایک کر کے تمام نمازی مسجد سے نہ چلے جائیں، مقصورہ سے باہر قدم نہ نکالیں۔ اُن کو یہ بھی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے ہی دار الخلافہ میں قدم رکھیں، جو دولت سے پٹا پڑا تھا، اور اُس خاندان کی شہرت سے مالا مال تھا جسکے وہ بھی ایک فرد تھے۔ اُن کے آبا و اجداد کا نام اور خطاب تو ورثتاً اُن کو مل گیا، مگر اُن کے اختیارات اُن کو نصیب نہیں ہوئے۔ البتہ اُن کا نام جمعہ کے روز خطبہ میں لیا جاتا تھا، حاجب کے نام کے ساتھ سکّوں پر مسکوک تھا، شاہی لباس پر اُن کا تمغہ کڑھا ہوا تھا؛ صرف یہی نشانیاں خاندان بنو امیہ کی اُن میں باقی رہ گئی تھیں اور بس ٭

جو نئی فوجی پالیسی ابن ابی عامر نے اختیار کی تھی وہ بھی خود مطلبی سے خالی نہیں تھی۔ وہ اپنی رعایا کی بے چین طبیعت اور نمک حرامی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تجربہ اس کا شاہد تھا کہ اگر ملک میں ایک عرصۂ دراز تک امن و عافیت رہے تو اُس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ قرآن شریف کا حکم تھا کہ کفار سے ہمیشہ لڑتے رہو۔ تمام رعایا جہاد پر مرتی تھی، بالخصوص علماء دین

جنکا جوش مذہبی قتل کفار ہی سے ٹھنڈا ہوتا تھا' تاجروں کی تجارت اس سے بڑھتی تھی اور اُن کے خزانے بھرتے تھے' امرا کی شہرت و ناموری کے راستے کھلتے تھے' سپاہیوں کو اپنی شجاعت دکھلانے' اور بے انتہا مال مغرونہ پانے کا موقعہ ملتا تھا۔ جب سے کہ ابن ابی عامر غالب کے شریک حال ہوئے' وہ جہاد کا اعلان کرتے رہے تھے۔ عیسائیوں کے خلاف جو مہمیں بھیجی گئیں اُن میں یہ خود شریک ہوئے تھے۔ یہ ایسی پالیسی تھی کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا تھا؛ اب تو اُنہوں نے عام طور پر اعلان کردیا کہ وہ اسی پالیسی پر کاربند رہینگے۔ یہ سن کر لوگوں نے بڑی خوشیاں منائیں' فقہا نے حاجب کے تدین کی نہایت جوش خروش کے ساتھ ایسی تعریفیں کیں کہ شاید وہ اولیاء اللہ کی بھی نہ کرتے۔ چونکہ اہالی فوج کے آپس ہی میں رقابت اور چشمک تھی' اسلئے انقلاب کے رُکے رہنے کی یہ کافی ضمانت تھی' اور اسی بنا پر نمک حرامی و ملکی فتنہ و فساد کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ ملک کے جذبات اور جوش ملک کے باہر ہی لڑائیوں میں نکلتے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک اور خیال بھی اس پالیسی کے اختیار کرنے کا باعث ہوا تھا۔ جب ابن ابی عامر اپنے ملک کی عزت و آبرو اور شان و شوکت کے دل سے خواہاں تھے۔ وہ اپنے حدود سلطنت کو بڑھانا' اور وہ حصہ ملک جو اُن سے فتح کرلیا گیا تھا' یا اُن کے بادشاہوں نے وقاحت کے ساتھ' عیسائیوں کو دیدیا تھا' چھیننا اور اپنے کفار دشمنوں کو سزا دینا چاہتے تھے۔

ابن ابی عامر نے باون لڑائیاں لڑیں' مگر افسوس ہے کہ اُس زمانہ کے مورخین نے اُن کی تفصیل نہیں رکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اُن میں سے بہت سے تو محض غزوات ہی تھے' لیکن کوئی جنگ ایسی تھی کہ اُس میں اُن کو کامیابی نہ ہوئی ہو۔ ایک لڑائی میں بھی اُن کی نہایت خفیف سی پس پائی نے اُن کی درخشندگی کو ماند نہیں کیا۔ ہر سال عیسائیوں کی سلطنتوں کی حدود کم ہوتی چلی جاتی تھیں' یہاں تک کہ وہ پہاڑوں کے نشیب تک محدود رہ گئیں۔ مسلمانوں کی سرحد کے اُس طرف سواء تباہی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جہاں چند روز پیشتر سرسبز فصلیں اور ہرے ہرے باغ نظر آتے تھے وہاں خاک اُڑتی دکھائی دیتی تھی کہیں کہیں جلے ہوئے مکانات کے ڈھیر و

سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کبھی آبادی ہوگی۔ تباہی کا یہ عالم تھا کہ لیون اور قسطالہ کے میدانوں میں آج تک اُس کا اثر باقی ہے۔ جو جنگل اُس زمانہ میں کاٹ ڈالے گئے تھے وہ اب تک پھر سرسبز نہیں ہوئے، وہاں اب تک میدان ہی پڑا ہوا ہے، وہاں کی زمین شور ہے اور ہوائیں ایسی سرد چلتی ہیں کہ کسی کا وہاں ٹھیرنا مشکل ہے۔ اسکو بھی ایک غضب الٰہی سمجھنا چاہئے۔ امید نہیں ہے کہ ان ہی وجوہ سے وہ کبھی آباد ہو سکے، یا پہلی سی سرسبز ہو جائے۔ چونکہ پچیس برس کامل یہ علاقہ مسلمانوں کی فوج کا لگدکوب رہا اس لئے وہاں ایک پتہ کا پتہ اور جاندار کا سراغ بھی نہیں ملتا*۔

ابن ابی عامر کا غصہ عیسائیوں کے خلاف اس لئے اور بھی بھڑک اُٹھا تھا کہ باوجود اسکے کہ بادشاہ لیون کو اُنہوں نے فہمائش کردی تھی، مگر اُس نے اُن کے رقیب مصحفی کو مدد دی۔ حاجب نے اس کا انتقام لینا چاہا۔ اُنہوں نے اتنی بڑی مہم کی تیاریاں کیں کہ ویسی مہم اُس وقت تک کبھی عیسائی ملک پر نہیں بھیجی گئی تھی۔ زیمور اجیسا مضبوط شہر جسکی سات خندقیں، اور سات فصلیں تھیں بزور شمشیر لے لیا گیا۔ چار ہزار دشمن قتل کردیئے گئے، اور اُتنے ہی آدمی گرفتار ہوئے۔ شہر کے قریب بستیاں ایسی تھیں کہ جنکو محنت کش زمینداروں نے گلزار بنا رکھا تھا، وہ سب جلادی گئیں، سینکڑوں دیر اور خانقاہ تباہ کردیئے گئے، اور وہاں کے رہنے والے بربریوں کو دے دیئے گئے، جنہوں نے اُن کی ہر قسم کی وحشیانہ حرکات سے بے حرمتی کی اور دل کھول کر تکلیفیں دیں۔ جب شاہان لیون اور نوار نے دیکھا کہ دونوں کی حالت مخدوش ہے تو اُنہوں نے نواب قسطالہ کے ساتھ مدافعت کا معاہدہ کرکے مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکنے کی جرأت کی۔ دونوں فریق کی فوجیں ریوڈا[۴] میں، جو سائی من کاس کے قریب تھا، ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی، عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی اور فاتح و مفتوح دونوں ایک ساتھ ہی سائی من کاس میں داخل ہوئے۔ شرقیئین نے ایک شخص کو

---

* ھذا ایضاً من برکاتک یا بن ابی عامر رحمۃ اللہ علیک وجزاک اللہ عنا خیر الجزاء ۔ (مترجم)

بھی پناہ نہیں دی۔ ہر عیسائی، جو اُن کو ملا، تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ سردی کا موسم قریب تھا؛ لیکن ابن ابی عامر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فتحمند کو آگے بڑھنا ضروری ہے؛ اُنہوں نے نہ سردی کا خیال کیا نہ طوفان سے ڈرے، اور لیون کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ شہر کی حالت نہایت ہی خراب ہو رہی تھی، اور اہل شہر متابعت کرنے والے ہی تھے کہ موسم نے اُن پر کچھ رحم کیا اور ایسی غیر معمولی سردی پڑی کہ فاتحین کو واپس ہی بھاگنا پڑا۔

سائی من کاس کی فتح کے بعد سپاہیوں نے اپنے سپہ سالار ابن ابی عامر کو "منصور" کا خطاب دیدیا۔ یہ نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ وہی مشہور ہو گیا۔ خاندان خلافت کے رسم کے موافق اُنہوں نے اس کو خطاب شاہی سمجھ کر قبول کر لیا۔ اسکے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو بہت دور کھینچنے لگے؛ چنانچہ اُنہوں نے اپنے لئے اور بہت سی باتیں انتخاب کر لیں، جو اب تک خاندان شاہی ہی کے لئے مخصوص تھیں۔ اُن کے خطابات سنہرے حروف میں کپڑوں پر کاڑھے گئے اور خلیفہ ہشام کے نام کے ساتھ اُن کا نام بھی خطبہ میں شامل کر لیا گیا۔ جو کوئی اُن کے پاس جاتا تھا اُسکو سخت ذلیل کورنش کرنی پڑتی تھی۔ مراسم و داب دربار شاہی پہلے ہی بہت پیچیدہ تھے، اب اُن میں بہت کچھ زیادتی ہو گئی۔ یہ قواعد وضع کئے گئے کہ جس طرح خود اُنہیں کورنش کی جائے، اُسی طرح اُن کے خاندان کے ہر فرد کو کی جائے، یہاں تک کہ گود میں جو بچہ ہوتا تھا اُسکو بھی۔ جتنے بادشاہ تخت اندلس پر بیٹھے تھے اُن میں سے کسی نے بھی ایسے سخت قواعد نہیں بنائے، نہ کسی نے اپنے آپ کو ایسے فضول اور لغو رسموں کا پابند کیا۔ اگر کوئی ان کی تعمیل نہ کرتا تو سخت سزا پاتا۔ اور اگر کوئی شخص اُن کی کسی حرکت یا وجہ تحریک پر نکتہ چینی کرتا، یا کسی بات میں ذرا سی بھی سبکی کرتا، تو اُس پر غضب ٹوٹ پڑتا۔ جعفر شاہزادہ زاب، جو منصور کی بربری فوج کے سپہ سالار تھے، رشک و حسد سے ایسے مجبور ہوئے کہ اُنہوں نے علی رؤس الاشہاد اُن کی پالیسی پر کچھ لے دے کر ڈالی۔ جب منصور کو معلوم ہوا کہ موری نے بنا کے یہ سردار جن پر اُن کے اتنے مراحم خسروانہ مبذول ہو چکے تھے اُن پر یوں نکتہ چینی کرتے ہیں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اسکے چند روز بعد زاہرہ میں ایک بہت بڑی دعوت ہوئی، اس میں جعفر بھی مدعو ہوئے، منصور نے اوروں کی نسبت ان پر بہت زیادہ مہربانی فرمائی۔ یہ معلوم ہی ہے کہ ان دعوتوں میں احکام شرعی کا چنداں لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا، شراب کا خوب دور چلا، اور جب جعفر نشہ میں چور اپنے مکان پر جا رہے تھے تو ایک شخص نے جو اسی کام پر تعینات تھا اُن کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے +

سپین کی عیسائی سلطنتوں کی حالت دسویں صدی میں زمانۂ حال کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے زیادہ نہ تھی۔ یہ سب ریاستیں آپس میں دست وگلو رہتی تھیں۔ اُن کے بادشاہ عادتاً اس اصول کو بھولے ہوئے تھے کہ اگر اُن کی جان بچ سکتی ہے تو صرف اتحاد و اتفاق سے۔ انتہا ہے کہ جب شرقیئین کی فوجیں اُن کے سامنے ہوتی تھیں، تب بھی اُن کی رقابت اور معاندت میں کمی نہ آتی تھی، حالانکہ یہ ظاہر تھا کہ یہ صورت اُن کے لئے خودکشی سے کم نہ تھی۔ جو منافرت باہمی محض اپنے اپنے علاقہ کی عصبیت سے پیدا ہوئی تھی، وہ اس قدر تلخ اور شدید تھی کہ جس پر اعتبار نہیں آ سکتا۔ قومی تفاخر اور جذبات حب الوطنی بالکل مفقود تھے۔ ہر ایک ریاست یہ چاہتی تھی کہ اپنے رقیب کی بات نہ چلنے دے، خواہ وہ کیسی ہی قابل تعریف اور فائدہ مند کیوں نہ ہو۔ کلیسا کی مُہر ہر قانون اور ہر سیاسی محکمہ پر ثبت ہوتی تھی۔ کلیسائی جذبات کا بہت زور تھا، پادری ہی قانون ساز تھے، یہی بادشاہ گر تھے، یہی ٹیکس لگاتے تھے، یہی سپہ سالار تھے۔ لیون اپنی خانہ جنگیوں کے باعث سے بہت ہی کمزور رہ گیا تھا۔ اُمرا کی بلند نظری یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ خود تاج و تخت کی کوشش کرتے تھے، اور اسی میں بہت سے نئے نئے نالایق غاصبوں کو برانگیختہ کرتے اور اُن کے دعاوی کی تائید کرتے رہتے تھے۔ قستالہ ہی کو لیجئے۔ یہ ریاست اپنا تعلق اپنے بادشاہ سے بالکلیہ قطع کر کے آزاد ہو گیا تھا، مگر برائے نام۔ لطف یہ ہے اُس کے پاس اتنے ذرائع نہ تھے کہ وہ اپنی حیثیت بادشاہی قائم رکھ سکتا۔ شمالی علاقہ کے نہایت بہادر جنگجو سپاہی زیادہ تنخواہ اور لوٹ کے وعدوں اور لالچ میں اپنے بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر خلیفۂ اندلس کے علم کے نیچے لڑ رہے

تھے۔ مسلمانوں کی کامیابیوں اور اپنے ملک کے چھن جانے کی وجہ سے عیسائی بادشاہ ایک دوسرے پر اعتبار نہ رکھتے تھے، اور اُن کا نفاق و شقاق روز بروز بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اُن کے خانگی فسادات اور ناقابل صفائی عناد نے اُن کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنے قدرتی دشمنوں سے طالب امداد ہوں۔ اسکے یہ معنی تھے کہ وہ اُن کو خراج بھی دیں اور اُن کی غلامی بھی کریں جلا وطن عیسائیوں سے قرطبہ بھرا رہتا تھا وہ سلطنت اندلس کی برابر خوشامدیں کرتے رہتے تھے کہ اُن کی مدد کر کے اُن کے ہموطنوں اور رشتہ داروں کو تباہ کر دیا جائے۔ بعض بڑے بڑے فتنہ و فساد اور جانکاہ انقلاب جو سلطنتہاء شمالی میں ہوئے۔ اُن کے بانی بیشتر یہی لوگ تھے، یا وہ زنہیں جو اسی طرح کے قسمت آزما لوگوں نے جا جا کر اُن کے ملک میں کیں، جنکا مقصود اصلی یہ تھا کہ عیسائیوں کی تباہی ہو اور مسلمانوں کے اغراض و فوائد کو مدد پہنچے۔ نوعمر و ناتجربہ کار رے میر ثالث بادشاہ لیون، تخت پر بیٹھتے ہی بعض مشکلات میں پھنس گئے۔ برموڈو نے اُن کا تخت چھین لیا۔ آخر تنگ آ کر اُنھوں نے اس شخص کے برخلاف قرطبہ میں مرافعہ کیا، اور مسلمانوں سے اس غاصب کے نکال دینے کے لئے مدد مانگی۔ اس کے معاوضہ میں رے میرو نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ خلفاء اندلس کے باجگزار رہینگے لیکن قبل اسکے کہ عہدنامہ کی تکمیل ہو رے میرو نے انتقال کیا۔ ان کے رقیبوں کی تعداد زیادہ تھی، اور وہ سب کے سب بھی طاقتور، وہ جس کا ساتھ دیتے، یا جس کو وہ انتخاب کرتے وہ یقیناً کامیاب ہوتا، بشرطیکہ وہ واقعی حق دار بھی ہوتا۔ برموڈو نے اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے مسابقت کی اور اپنے متوفی رقیب کے قدم بقدم چل پڑے۔ اپنی ذاتی عزت و وجاہت اور اپنی ملک کی آزادی کو اس پر قربان کر دیا کہ جو اقتدار اُنھوں نے بذریعہ غصب حاصل کیا ہے وہ کسی طرح قائم رہے۔ منصور نے اس کے بدلے جو ذلیل کن شرط اُس کے سامنے پیش کی اُس کو اس ذلیل بزدل نے فوراً بلا تامل مان لیا۔ وہ اسی طرح کورنش بجا لایا جس طرح اور باجگزار۔ مسلمانوں کی فوج سے ڈر کر وہ سلطنت لیون، جسکی ایک ایک گز زمین سینکڑوں جانیں دے کر اور بہادری دکھلا کر کافروں (مسلمانوں) سے

لی گئی تھی، تیسری مرتبہ پھر اُن ہی کی باجگزار اور غلام ہو گئی۔

جب منصور نے دیکھ لیا کہ شمالی عیسائی سلطنتیں اتنی بے دست وپا ہو گئی ہیں۔ کہ اُن کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، تو اب اُنھوں نے اپنی توجہ ایسے ملک کی طرف منعطف کی جو ایک مدت سے مسلمانوں کے حملہ سے محفوظ تھا۔ قتلونیہ کی ریاست اگرچہ برائے نام فرانس کی باجگزار تھی، مگر وہاں کا حاکم ہی وہاں کا مطلق العنان فرمانروا تھا۔ سابقہ خلفاء کی کمزوری، یا خوف، نے اُن کو ایسے دشمن کے ساتھ جنگ چھیڑنے سے باز رکھا، جس سے یہ اندیشہ تھا کہ نہ صرف اُن کے خانگی دشمن ہی اُسکے ساتھ ہو جائینگے، بلکہ فرانس کی تمام فوج اُسکی مدد کے لئے آجائیگی۔ مگر یہ اندیشہ ہی بے بنیاد تھا۔ اس سلطنت کے جتنے صوبہ تھے وہ مسیحی سپین کی طرح خانہ جنگی کے شکار بنے ہوئے تھے۔ فرانس کی سوسائٹی اس وقت تغیر کی حالت میں تھی۔ باجگزاروں اور بادشاہ کے درمیان ایک تلخ مقابلہ ہو رہا تھا۔ سلطنت کے پاس اتنے ذرائع نہ تھے کہ وہ اُن کو ایک دور دراز باجگزار کی مدافعت میں، جس سے کچھ حاصل وصول نہ ہوتا تھا، بیکار ضائع کرتی۔ مغرور امرا کبھی اس پر راضی نہ ہوتے کہ فوج کو پا یرے نیس کے اُس طرف ایسی مہم پر بھیجا جائے کہ جس کا انجام مشکوک ہو۔ یہ ساری باتیں منصور کو معلوم تھیں، کیونکہ اُن کے جاسوس یورپ کی ہر سلطنت کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ جب منصور نے اپنا عزم مصمم کر لیا۔ تو اُلہٰی قتلونیہ کے برخلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ اُن کی دوران حکومت کی تیئسویں[۲۳] مہم تھی۔ آیندہ کی فتوحات کی امیدوں پر ہزاروں متطوعین جمع ہو گئے۔ ایک بہت بڑی فوج تیار ہو گئی۔ اسکے مقابلہ میں کاونٹ بوریل، بذات خاص، قتلونیہ کی فوج لے کر پہنچے۔ ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔ عیسائی جو ایک مدت سے لڑائی کے نام سے بھی آشنا نہ رہے، جنگ آزمودہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے؛ اُنھوں نے سخت نقصان اُٹھا کر شکست کھائی۔ اسکے پانچ دن کے بعد فاتحین نے برشلونہ پر قبضہ کر کے اُسکی لوٹ معاف کر دی۔ وہاں کے رہنے والوں میں، سوائے یہودیوں کے، کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ قتل یا قید نہ ہوا ہو۔ یہودی ہمیشہ سے مسلمانوں کے

ہمدرد رہے تھے۔ ان لوگوں نے برشلونہ کو محفوظ سمجھ کر وہاں رہایش اختیار کر لی تھی، اور بہت سی دولت بھی جمع کر لی تھی۔ فن طب میں اُن کی خاص طور پر شہرت تھی، تجارت کو بھی اُنہوں نے خوب فروغ دیا تھا؛ اسی وجہ سے اُن کا اقتدار دنیا بھر میں مانا جاتا تھا۔ کاونٹ بوریل نے اپنی باقی سلطنت کو بہت بڑی تعداد میں زر فدیہ دے کر بچا لیا۔ اگرچہ اُنہوں نے سخت گراں قیمت دے کر امان کو خریدا، مگر اس سے مشرقی سپین کو نجات مل گئی؛ ورنہ وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ کیونکہ اس حصۂ ملک کو اور کہیں سے امداد ملنے کی امید نہیں تھی؛ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اسلام کے ربقۂ اطاعت میں آئے بغیر رہ جاتا۔

اب منصور نے ہر طرف نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی ملک فتح کے لئے، یا کہیں کوئی دشمن ذلیل کرنے کے لئے مل جائے۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو اُنہوں نے افریقیہ کے معاملات میں ایک مرتبہ پھر دست اندازی کا تہیہ کیا۔ اُس ملک میں خاندان بنو اُمیہ کے حمایتی، بہت سی مصائب کے بعد، پھر برسرِ اقتدار آ گئے تھے، لیکن ابھی اُن کا قدم پوری طرح جمنے بھی نہ پایا تھا کہ ابن کنون نے (جو خاندان بنو ادریس کے آخری یادگار تھے، اور اپنی ہی درخواست پر اس شرط سے تونس بھیج دیئے گئے تھے کہ وہ کبھی اپنے قدیمی ملک میں قدم نہ رکھیں) خروج کیا، اور موریٹینیا کی سلطنت کا اس دلیل پر دعوے کیا کہ وہ اُن کا قدیمی ملک ہے۔ دس برس تک وہ خلفاء بنو فاطمہ کے مہمان رہ چکے تھے؛ کیونکہ وہ دونوں واقعی، یا روحانی طور سے ایک ہی نسل سے تھے۔ صرف اتنا ہی ذرا سا بہانہ فاطمیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔ ابن کنون کی فرمائشوں اور تقاضوں سے تنگ آ کر سلطان مصر نے آخر اپنے تکلیف دہ مہمان کو بازیافت تخت کے لئے مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔ بربریون کے ساتھ سازوباز اور خط و کتابت کی گئی۔ بادشاہ مصر نے اُن کو بیش قرار رقم اور ایک دستہ فوج کا دے کر روانہ کر دیا؛ اور ابن کنون کو اُن کی سابقہ رعایا نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وفاداری کا خوب اظہار کیا۔ بنو اُمیہ کے اقتدار میں بہت جلد کمی آ گئی؛ کئی لڑائیوں میں اُن کے حمائتیوں کو فرار ہونا پڑا؛ اُن کے

قلعے دشمنوں کے ہاتھ آ گئے، اور باشندگان اندلس کو از سر نو افریقیہ کے حملوں کا خوف پیدا ہو گیا۔
اس نئی مصیبت کی خبر برشلونہ میں پہنچی تو منصور پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اس زر فدیہ
کی بھی پروانہ کی، جو کاونٹ بوریل نے پیش کیا تھا، اور قتلونیہ کی فتح سے دست بردار ہو کر فوراً
واپس ہوئے منصور نے فاتح فوج کا ایک حصہ اپنے چچا زاد بھائی ابو الحکم عمر کو دے کر سبتہ
بھیج دیا۔ ابھی ابن کنون کو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے مقابلہ کے لئے کوئی فوج آ رہی ہے کہ
وہ وہاں پہنچ گئے۔ اس ادریسی بادشاہ کو شکست ہوئی، اور انہوں نے اپنے آپ کو اس شرط
سے حوالہ کر دیا کہ ان کو بحفاظت تمام قرطبہ پہنچا دیا جائے، اور وہیں ان کو رہنے کی اجازت
دے دی جائے۔ جب اس معاہدہ پر دستخط ہونے لگے تو بر خود غلط سپہ سالار اپنے اختیارات سے
تجاوز کر گئے، اس خیال سے کہ ابن کنون ایک مخدوش آدمی تھے، اور امن عامہ کا اقتضا یہ تھا
کہ خلافت کے اس جانی دشمن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے، ابو الحکم عمر کے معاہدہ کو منصور
نے منظور نہ کیا اور جیسے ہی ابن کنون الجزائر میں پہنچے وہ قتل کر دیئے گئے۔ اس معاہدہ کی
جو یوں خلاف ورزی کی گئی، اس سے نہ صرف منصور کے ایک افسر فوج کی بےعزتی ہوئی بلکہ یہ
قتل بدترین گناہ سمجھا گیا۔ اس سے تمام اندلس میں منصور کے خلاف ایک بے چینی پیدا ہو گئی۔
جو شخص کہ یوں خلاف عہد مارا گیا وہ اولاد علی (رضی اللہ عنہ) سے تھا، جن (حضرت سیدنا اسد اللہ
علیؓ ابن ابی طالب) کو بہت سے فرقے مظہر الٰہی سمجھتے ہیں، اور دنیا بھر کے باقی مسلمان آپ کا احترام
کرتے ہیں۔ لوگوں میں ہر طرف شور و غوغا ہو گیا۔ ابو الحکم عمر کو تو یہاں تک غصہ آیا کہ انہوں نے
اپنے بھائی اور آقا کو اپنی فوج کے سامنے برا بھلا کہہ دیا۔ ضرورت قیام امن و امان اور
فوجی نظام، ایسی نافرمانی اور شرارت کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ آشفتہ سر ابو الحکم عمر بجرم نمک حرامی
فوراً گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر جرم ثابت ہو گیا اور قتل کر دیئے گئے۔ اگرچہ اس عدل و انصاف کو
دیوان شاہی نے منظور کر لیا، مگر اس سے عوام الناس کے دلوں میں اور بھی شورش بڑھ گئی۔
حاجب کو ایک مرتبہ پھر یہ معلوم ہوا کہ جو سلطنت انہوں نے بذریعہ سازش کے حاصل کی ہے

وہ اگر اُن کے قبضہ میں رہ سکتی ہے تو بزور شمشیر۔ یہ ضروری تھا کہ لوگوں کی توجہ اس واقعہ سے جو ملکی وخانگی امن وعافیت کے لئے ناگزیر تھا، ہٹا کر غیر ملکی فتوحات کی طرف لگادی جائے۔ اتفاق کی بات کہ فوراً ہی منصور کو بادشاہ لیون سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ مسلمانوں کی کچھ فوج برموڈو نے اپنے یہاں اس خیال سے رکھی ہوئی تھی کہ وہ (برموڈو) اپنا رعب قائم رکھ سکیں مگر حقیقت میں جس کا مقصود منصور نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ اس غاصب پر رعب قائم رہے اور وہ خراج دینے میں چون وچرا نہ کرسکے۔ اس فوج کے مسلمان سپاہیوں نے یہاں رہ کر کفار کے ساتھ ہر قسم کی زیادتیاں کیں۔ برموڈو نے ہزار اُن کو منع کیا مگر کون سنتا تھا؛ اُنہوں نے قرطبہ میں شکایتیں کیں تو یہاں بھی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ ایسی صورت میں سواء اسکے کوئی تدبیر باقی نہ رہ گئی تھی کہ اُنہوں نے اپنی رعایا کی حب الوطنی کے جذبات کو برانگیختہ کیا، ایک فوج جمع کی اور مسلمانوں کو نکال باہر کیا۔ منصور کا غرور بھلا اس گستاخی کو کب گوارا کرسکتا تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی فوج نے کوامبرا پر حملہ کیا۔ یہ مقام چونکہ معمولی میدان جنگ سے فاصلہ پر واقع تھا، اس لئے اب تک یہ ہر طرح محفوظ رہا تھا۔ اس پر قبضہ کرکے اسکی تمام عمارات جلادی گئیں یا منہدم کردی گئیں۔ یہ شہر جو آباد اور مرفہ الحال تھا سات برس کامل بے چراغ رہا۔ کوامبرا سے ڈورو کو عبور کرکے حاجب نے سیدھا دشمن کے دارالسلطنت کا رُخ کیا۔ پہلے تو فصیل شہر کی مضبوطی اور سخت سردی کی وجہ سے فوج محافظ نے اُن کا خوب مقابلہ کیا اور بزور شمشیر اس شہر کو نہ لینے دیا۔ علاقہ شمالی میں لیون سب سے زیادہ مضبوط اور اہم مقام تھا۔ اُسکے مورچے اور فصیل رومیوں کے زمانہ کے بنے ہوئے تھے۔ سیزر کے معماروں نے اس کی فصیل بنائی تھی، اور اس کی موٹائی بیس فیٹ سے زیادہ تھی، بہت بڑے بڑے برج، مورچوں کے ساتھ اُسکے تمام دور میں بنے ہوئے تھے۔ اسکے اندر شہر آباد تھا، جسکے مکانات بیشتر سنگی تھے اور ایک دوسرے سے متصل۔ شہر کے دروازے کانسی کے تھے، اور بہت ہی بھاری۔ اس کی دہلیزیں سنگ مرمر کی تھیں، اس میں نقش ونگار تھے اور ہر جگہ مجسمے بنے ہوئے تھے۔ یہ قلعہ کا قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اندر جنگ آزمودہ فوج زیادہ تعداد میں رہتی تھی، اور ایک عرصہ

کے لئے مقابلہ کا سامان مہیا رہتا تھا۔

لیکن جب اُس کا محاصرہ ہوا تو مسلمانوں کی شجاعت اور ہمت و استقلال نے محصورین کے حوصلے پست کر دیئے اور اُنہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح اُن کو پہلے شکست ہو چکی ہے اب بھی ہونے والی ہے ادھر مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ کہیں پہلے کی طرح بے نیل مرام ہی پس پا نہ ہونا پڑے منصور کی شہرت کا دار و مدار اسی لڑائی پر آ رہا تھا۔ بہت ہی قابل افسران فوج نے جو فوجی کلوں کے استعمال کے ماہر تھے (یہ فوجی کلیں وہ تھیں جو روم اور بیزنطین سے مسلمانوں نے لی تھیں) راستے روکے ہوئے تھے اور فصیلوں کے نیچے سرنگیں لگا رکھی تھیں۔ مقابلہ سخت ہوا! آخر فصیل ایک جگہ سے ٹوٹ گئی، منصور کے جنگ آزمودہ آدمی بڑے زور شور سے شہر کی طرف بڑھے۔ شہر کے گورنر کاونٹ گانزلیز* بیماری کی وجہ سے صاحب فراموش ہو رہے تھے وہ اس جنگ مدافعت میں شریک نہ ہو سکے۔ مگر جب اُنہوں نے سُنا کہ دشمن شہر کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے، تو اُنہوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ میرے بدن پر ہتھیار لگا کر کسی طرح مجھے صف فوج میں پہنچا دو اپنے سپہ سالار کی تقریر سن کر، اور اُن کو یوں ضعف کی حالت میں اپنے درمیان میں دیکھ کر، فوج نے اپنی بہادری دکھلائی، لیکن ایک نہ چلی عیسائیوں کی صف اولین ٹوٹ گئی، اور مسلمان آندھی کی طرح شکستہ فصیل کی طرف بڑھے۔ گورنر ضعیف تو ہو ہی رہے تھے اُس پر اُن کے آ یا زخم، رہا سہا خون بھی بہہ گیا اور وہ اپنی ڈولی میں جان بحق تسلیم ہو گئے۔ ایک سپہ سالار کے شایان شان بھی یہی بات تھی۔ چونکہ مسلمانوں کا مقابلہ شدید کیا گیا تھا، اس لئے وہ بھی غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے مفتوحین کو کہیں چھپنے کو جگہ نہ دی۔ پہلے تو شہر کو خوب لوٹا اور پھر اُسکو منہدم کرا دیا۔ یہاں کی فصیل رومی عمارت تھی، جو اتنی مضبوط بنائی گئی تھی کہ نہ اُس پر موسم کا اثر ہو، نہ انسان کا تباہی افگن ہاتھ اُس کا کچھ بگاڑ سکے، مگر سنگدل منصور کی باقاعدہ تدبیروں اور فوجوں کے سامنے ایک پیش نہ گئی۔ صرف ایک بُرج چھوڑ دیا گیا، تاکہ وہ ایک تباہ شدہ شہر

---

* COUNT GONZLEZ

کی یادگار، اور اسکی عمارات کا ایک نمونہ عبرت کے لئے قائم رہے۔ پتھر اور مٹی کا ایک بہت بڑا ڈھیر اُس مقام کا نشان تھا جہاں عیسائیوں کا نہایت آباد و شاد دارالسلطنت تھا، جو آگسٹس کے زمانہ میں بسایا گیا تھا، اور رومی سلطنت کا بڑا اہم سرحدی شہر تھا۔

شرقینین کی فوج جاتے ہوئے زیمورا سے گزری، جہاں برموڈو پناہ گزیں تھے منصور نے لگے ہاتھوں اُس کے محاصرہ کی تیاری کی۔ وہاں جو اختلال برپا تھا اُس سے برموڈو نے فائدہ اُٹھایا اور اپنے رفیقوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل بھاگے۔ اہالی زیمورا نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ شہر سپاہیوں کو لوٹ مار اور ہر طرح کے عیوب کے لئے دیدیا گیا۔ رؤسا لیون نے جب یہ دیکھا کہ اُن کا بادشاہ خود چلتا بنا ہے، اور اُن کو مصیبت میں چھوڑ گیا ہے، تو اُنہوں نے فوراً ہی فاتح سے صلح کر لی۔ اُنہوں نے اپنی اپنی ریاست کی طرف سے کورنش ادا کی۔ اُن کے علاوہ اور لوگوں نے اپنی عمر بھر کے تعصبات اور کلیسا کی نافرمانی کو عارضی فوائد پر قربان نہ کرنا چاہا۔ اُن کو اپنے ملک پر جان نثاری کا یہ صلہ ملا کہ اُن کو خوب ستایا گیا، اور خوب توہین کی گئی۔ اِس مہم کے بعد جو کچھ برموڈو کے قبضہ میں رہ گیا وہ اُس سے بھی کم تھا جو اُن کے اولے غلام کے پاس تھا۔

منصور کی غیبت سے اشرار نے، جو قرطبہ میں بھرے پڑے تھے، فائدہ اٹھا کر ایک سازش کی، جس کا مقصود یہ تھا کہ تمام ارکین سلطنت اور خلیفہ ہشام کو قتل کر کے سلطنت اندلس کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس سازش کے سرگروہ عبدالرحمٰن ابن مطرف، شمالی سرحد کے گورنر تھے منصور کے سب سے بڑے بیٹے عبداللہ، بہت سے ارکین خاندان شاہی، جو اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز تھے، اور بہت سے ملکی اور فوجی عہدہ دار، جو بلحاظ اپنے اقتدار کے سخت نقصان پہنچا سکتے تھے، اس سازش میں شریک تھے۔ ابھی یہ سازش مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ منصور کے جاسوسوں کو اس کا حال معلوم ہو گیا۔ منصور نے اپنی وہی معمولی ترکیب کی کہ جو جو آدمی شریک تھے اُن پر زیادہ عنایات مبذول کیں، تا کہ اُن کو کسی طرح شک بھی نہ ہونے پائے، اور پھر خفیہ طور پر بہت سے آدمیوں سے کہلا بھیجا کہ اُن سب کے برخلاف مختلف جرائم کے استغاثہ دائر کردیں

اس سازش کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی بعضوں کو تغلب اور بددیانتی کے جرم میں سزا دی گئی اور آدمی یہ حالت دیکھ کر عیسائیوں کے ملکوں میں بھاگ گئے۔ ان ہی میں عبداللہ ابن منصور اور ایک اور عبداللہ نامی شاہزادے جن کی حرص و طمع مشہور تھی شامل تھے۔ گارشیا فرنین ڈیز نواب قستالہ نے اُن کی خوب تواضع کی اور حق مہمانی ادا کیا۔ مگر جب منصور کی فوجیں وہاں پہنچ گئیں تو اُن کو معلوم ہوا کہ سیاسی ضروریات کے مقابلہ میں مہمان نوازی کے خیال سے دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ جیسے ہی یہ بیوقوف صاحبزادے اپنے باپ کے ہاتھ آئے ویسے ہی قتل کر دیئے گئے۔ اسکے بعد کمال بے رحمی کے ساتھ منصور نے اپنا انتقام لینا چاہا۔ اگرچہ اسکی صورت بہت ہی بُری تھی مگر تھی نہایت موزوں۔ اپنے بیٹے کا جو صدمہ خود اُن کو اٹھانا پڑا بعینہ وہی بدلہ انہوں نے نواب قستالہ سے لینا چاہا۔ انہوں نے گارشیا کے بیٹے سینکو کو اشتعال دیا کہ سازش کر کے اپنے باپ کو ملک بدر کر دیں۔ جتنے امرا تھے سب نے سینکو کا ساتھ دیا، مسلمانوں کی فوج نے اُن کو مدد دی، منصور نے کلونیا اور سین اسٹی وان کو اپنا حصہ سمجھ کر قبضہ میں لے لیا، گارشیا ایک لڑائی میں زخمی ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ میں پڑ گئے، اور ان ہی کے قید میں گئے سینکو نے اپنی بے ایمانی کا یہ صلہ پایا کہ اسکو قستالہ کی سلطنت مل گئی اور خلیفہ کا باجگزار ہو کر رہا۔

جلاوطن بادشاہ برموڈو جن کی غضب نے یہ مسلسل مصیبتیں برپا کی تھیں، اور جن کی حکومت اب بہت ہی تھوڑے سے علاقہ میں محدود رہ گئی تھی، جس کا دارالحکومت اسٹورگا تھا۔ اس کی سلطنت اُن کے باجگزاروں اور مسلمانوں میں تقسیم ہو گئی۔ برموڈو نے اب بھی ایک شخص عبداللہ کو پناہ دے رکھی تھی، جو سازش کرنے والے لوگوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ مگر جب اسٹورگا میں مسلمانوں کی فوجیں پہنچ گئیں، اس پر قبضہ کر کے لوٹ لیا گیا۔ تو اس ضدی بادشاہ نے اطاعت قبول کرنی ضروری سمجھی۔ انہوں نے عبداللہ کو منصور کے حوالہ کر دیا۔ یہ قرطبہ میں پہنچے

GARCIA

تو اُن کو ایک اونٹ پر بٹھا کر تمام شہر میں تشہیر کیا کہ یہ شخص اپنے بادشاہ کا باغی اور اپنے دین سے مرتد ہے۔ اگرچہ اُن کی جان تو نہیں لی گئی، مگر جب تک منصور رہے اُس وقت یوں ستایا جاتا رہا کہ روز اُن سے کہہ دیا جاتا تھا کہ آج تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس مصیبت کے ٹالنے کے لئے اُنہوں نے نہایت ذلیل شرائط پیش کیں، نہایت ذلت کے ساتھ اپنے کئے پر تاسف ظاہر کیا اور سخت ترین غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کا وعدہ کیا۔ مگر منصور کو رحم آنا تو درکنار اُن کا غصہ اور نفرت اور بھی بڑھتا چلا گیا۔

ایک نیا اور رجانی دشمن منصور کا اور پیدا ہو گیا، دشمن بھی وہ کہ جس کا مقابلہ کرنا، قابو میں لانا، یا انتقام لینا اُن کے مان کا نہ تھا۔ یہ ملکہ صبح تھیں۔ وہ اپنے عاشقانہ مزاج کے ساتھ قوم باسک کی (جبکی وہ ایک فرد تھیں) ضد اور کینہ توزی بھی رکھتی تھیں۔ برسوں سے ان کے تعلقات ابن ابی عامر المنصور کے ساتھ بہت ہی گہرے چلے آتے تھے، اُن ہی نے ان کی ترقیات کی بنیاد رکھی تھی، اُن کی کامیابیوں کی باعث ہوئیں اور اُن کو یہاں تک پہنچا دیا۔ امیر المومنین الحکم کی زندگی ہی میں ان دونوں کے تعلقات کے متعلق قرطبہ میں بدنامی کے ساتھ افسانے مشہور تھے لیکن اور جنس اناث کی طرح، ملکہ بھی بے وفا نکلیں، اور کئی آدمی اُن کے منظور نظر ہو گئے، جن میں قاضی ابن سُلیم بھی شامل تھے۔ منصور نے جب دیکھ لیا کہ اُن کو اپنے اغراض و فوائد کے لئے اس مغرور ملکہ کی مدد کی ضرورت نہیں رہی ہے، تو اُنہوں نے اُن کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے ملکہ کے دل میں بغض پیدا کر دیا اور وہ انتقام لینے پر تل گئیں۔ اُن کا درجہ و رتبہ بحیثیت ملکہ کے اُن کی ذات خاص کا احترام اور حرم شاہی میں رہنا وہ باتیں تھیں کہ جن سے اُنہوں نے فایدہ اُٹھایا۔ اپنی طبعی آتش مزاجی اور سرگرمی سے اُنہوں نے اپنے بیٹے خلیفہ کے سامنے، نہایت دلسوزی کے ساتھ، یہ کہا کہ اُن کی حالت نہایت ذلیل کر دی گئی ہے، اور یہ سمجھایا کہ اُن کو حقوق و اختیارات شاہی خود اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہئیں۔ اب تک خلیفہ ہشام نے اپنی موجودہ ذلیل حالت پر نہ کبھی غور کیا تھا، نہ اُسکی کبھی شکایت پیدا ہوئی تھی، اپنی والدہ کی باتیں سُن کر گویا چونک

اُٹھے۔ ملکہ ہی کے کہنے سے اُنہوں نے حاجب سے اپنے حقوق شاہی طلب کئے، جنکو وہ غصب کئے بیٹھے تھے۔ افریقیہ کے نایب السلطنت زیری ابن عطیہ نے سلطانہ کے آدمیوں کے اشتعال پر بغاوت کرادی، اپنے آپ کو قانون رائج الوقت کا حامی اور مظلوم خلیفہ کا مددگار ظاہر کیا۔ ملکہ صبح نے اپنی ترکیبوں سے زیری کو بہت سا روپیہ بہم پہنچا دیا۔ مدینۃ الزہراء کے قومی خزانہ میں ساٹھ لاکھ دینار سرخ جمع تھے۔ یہ اشرفیاں مٹی کی ہانڈیوں میں رکھ کران پر لاکھ سے شاہی مہریں کردی گئی تھیں۔ ذہین ملکہ نے اُن میں سے سو ہانڈیاں خزانہ سے نکلوالیں۔ ان میں اسّی ہزار دینار نکلے، ان کی مہریں توڑلیں دیناروں کو شہد شربت اور دواؤں میں ڈال کر ان نئے برتنوں پر مختلف دواؤں کے نام لکھ کر اپنے غلاموں کے ہاتھ قرطبہ کے ایک محل میں بھجوادیا، اور یہاں سے سیدھا افریقیہ چلتا کیا۔ جب منصور کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کو ایک عورت نے یوں چل دیا تو اُن کو بہت ہی غصہ آیا، مگر وہ ملکہ کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ اُن کی مجال تھی ہی نہیں کہ اُس بادشاہ کی اُلٹ پر جسکے وہ برائے نام ملازم تھے، تشدد کریں یا اُن کو ملامت کریں۔ جو واقعات گزر رہے تھے اُن پر غور کرنے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلیفہ ہشام ہی نے اس روپیہ کو اپنے اختیارات شاہی کے بازیافت کے لئے نکلوایا ہوگا۔ اس اہم معاملہ کو قانونی رنگ دینے کے لئے منصور نے تمام ارکین سلطنت کو جمع کیا اور اُن سے یہ بیان کیا کہ حرم سلطانی خزانے کو لوٹے ڈالتی ہیں، اس لئے، اگر وہ سب صاحب اجازت دیں، تو محل شاہی سے خزانہ کسی اور جگہ منتقل کرلیا جائے۔ یہ فوراً منظور کرلیا گیا، مگر جب افسروں نے خزانے کے اُٹھانے کا حکم دکھلایا تو اُن کو قصر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی، اور صاف کہہ دیا گیا کہ چونکہ خود خلیفہ نے خزانہ کو منتقل کرنے کا حکم نہیں دیا ہے، اس لئے اس کی تعمیل نہیں کی جا سکتی۔ منصور ایسے ذہین آدمی تھے کہ بڑے بڑے اہم موقعوں پر اُن کو وہ باتیں سوجھتی تھیں کہ کبھی اُن کو ناکامی ہوئی ہی نہیں، مگر اب کے وہ دوسری مرتبہ ایک عورت کے مقابلہ میں ہارے۔ اب اُنہوں نے وہ ترکیب چلی کہ اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اُسکی ہمت ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ محل شاہی کے تمام راستوں اور چور دروازوں

سے وہ واقف تھے، ان ہی میں سے ایک میں کو ہو کر وہ خلیفہ کے خاص کمرے میں پہنچ گئے۔ منصور کے یکایک غصہ کا چہرہ بنائے ہوئے پہنچنے سے مجہول اور کمزور بادشاہ گھبرا گئے، اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "میرا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ آپ کی مخالفت کروں" اسکے بعد انہوں نے بے تامل اس حکم پر دستخط کر دیئے کہ خزانہ قصر شاہی سے منتقل کر لیا جائے۔ چال باز منصور نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک دستاویز پر دستخط کرا لئے، جسکے موافق امیرالمومنین نے اپنے حقوق سے دست برداری کر کے تمام مہام سلطنت بالکلیہ اُن ہی کو تفویض کر دیئے۔ یہ ایسا صاف وصریح حکم تھا کہ کسی کو مجال چون وچرا نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد منصور جو کچھ کرتے وہ قانوناً نافذ العمل تھا۔ اسکے دوسرے معنی یہ تھے کہ اُن کے آقا کی تقدیس اُن کو بھی حاصل ہو گئی تھی، اور جو شخص اُن کے خلاف لب کشائی کرتا وہ وہی سزا پا سکتا تھا جو ایک مطلق العنان بادشاہ کی نمک حرامی کی ہو سکتی تھی۔

اب منصور نے ایک نہایت جوکھم اور مخدوش مہم کی تیاریاں کیں۔ اب تک کسی بہادر ترین بادشاہ بنو امیہ کی یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ ایسی مہم کا خیال بھی اپنے دل میں لاتا۔ نہ منصور ہی جیسا سب سے بڑا سیاست دان اور جنگجو ہونا۔ اسکی ہمت پڑے۔ سینٹ جیمس آف کمپوسٹیلا کا مقبرہ تمام مسیحی دنیا میں، بلحاظ دولتمندی و تقدس، اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کی بنیاد رکھتے وقت جو کرامات ظاہر ہوئی تھیں، اسکے متعلق خرق عادت کی جو شہرت تھی، اُس میں جتنے متعدد مقدس تبرکات تھے، اُس کی روایات کو جو تقدیس حاصل تھی، وہ کسی طرح شہر روم یا بیت المقدس سے کم نہ تھیں۔ جہاں جہاں مسیح کا نام لیا جاتا تھا، اُن ملکوں کے بے تعداد زائرین یہاں جوق در جوق آتے تھے، اور اپنی نذر و نیاز اسکی قربانگاہ پر چڑھا جاتے تھے، یہ کئی نسلوں سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ متقی بادشاہ الفانسو کے زمانہ میں یہ پتہ لگا تھا کہ اس ولی کامل کی قبر اس مقام پر ہے۔ پہلے تو اس پر ایک متوسط درجہ کا خوبصورت سا مقبرہ بنا دیا گیا، اسکے بعد اس پر نہایت شاندار سنگ مرمر کا گرجا بنا دیا گیا۔ اس گرجا پر گنوار پنے کے ساتھ زیبائش کی گئی،

جس سے بہتر اُس زمانۂ جہالت کی صنعت نہ کر سکتی تھی۔ متعدد پادری وہاں رہتے تھے، جنکے عیش و عشرت اور تکلفات کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنہوں نے اپنا پیشہ اختیار کرتے ہوئے جو افلاس کا عہد کیا تھا وہ توڑنے ہی کے واسطے کیا تھا۔ یہی لوگ زایرین کی خاطر و مدارات کرتے تھے، اور جو کچھ نذر و پیش کرتے تھے اُن کو دیندارانہ شکریہ اور مقدسانہ عاجزی کے ساتھ قبول کرتے تھے، کیونکہ خداء تعالٰے سے وہ یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ ہمیشہ مفلسی کی حالت میں اپنی زندگی گزارینگے۔

سپین کے عیسائی سینٹ جیمس کی قبر کی جو تعظیم کرتے تھے، وہ اُس سے کہیں بڑھی ہوئی تھی، جو پرجوش دیندار مسلمان مدینہ* کی کرتے ہیں۔ راہبوں کی مکاری و عیاری، اور عوام الناس کی سریع الاعتقادی اور دینداری نے وہاں پہلے ہی بہت سی کرامات مشہور کر رکھی تھیں۔ ایک نئی کہانی یہ گھڑی گئی تھی کہ ولی مذکور ایک نقرہ گھوڑے پر سوار عیسائیوں کے ایک ستہ فوج کی سپہ سالاری کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ جسکے یہ معنی لگائے گئے کہ عیسائیوں کے دن پھر گئے۔ اُن کو یقیناً اب فتوحات نصیب ہونگی اور شرقیئین خایب و خاسر ہونگے۔ اس بیہودہ قصہ کا جو اثر جاہل عیسائیوں پر ہوا اُسکی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ جناب سینٹ جیمس کے ظاہر ہونے کا نہ وقت بتلایا گیا، نہ اُس مقام کا پتہ دیا گیا۔ جہاں وہ ظاہر ہوئے تھے۔ اُسکی صحت کو لوگوں نے بلالحاظ درجہ و رتبہ تسلیم کر لی۔ اسکی تصدیق باشندگان مقامات دور و دراز نے کی، وہ آنکھوں اور دل کا اندھا اعتقاد، جو ایسے ناممکن الوقوع معجزات و کرامات کو عین الیقین کا درجہ دیدیتا ہے، اس امر کی کافی سے زیادہ دلیل ہے کہ کیتھولک پادریوں کا کتنا بڑا اثر لوگوں پر تھا اور وہ زمانہ کتنا واہمہ پرست اور ذلیل تھا۔

منصور کا نصب العین تھا کہ کلیساء سینٹیاگو کو کسی طرح برباد کر دیا جائے۔ یہ قیاس کرنے کے وجوہ تھے کہ اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو اس کا اتنا بڑا اثر دشمنان اسلام پر پڑیگا کہ جس کا

---

* بلا تشبیہ ۔ مترجم

حدو حساب نہیں۔ عیسائیوں کا یہ مقدس مقام جواب تک مسلمانوں کے دست برد سے بچا ہوا تھا اُس کی وجہ مسیحیان اندلس کے اعتقاد کے موافق یہ تھی کہ ولی موصوف یہاں مدفون ہیں' اس لئے یہ مقام اُن ہی کے زیر حمایت و حفاظت ہے' نہ یہ کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے دشمن کو سخت دقتیں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑتیں' اس لئے اُس طرف رُخ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اگر کوئی دشمن اُس مقدس مقام پر حملہ کرکے اُسے ناپاک کرنے کا ارادہ کرے تو عیسائیوں کے اعتقاد کے موافق ایسا نہ ہوسکیگا' اور یہ گرجا امداد غیبی سے اُسی طرح محفوظ رہیگا جس طرح بیت المقدس کہ رومی اُس کو تباہ کرکے پھر نہ بنا سکے۔ آخر تو یہ دنیاء مسیحی کا مقدس ترین مقام ہے' اُدھر مسلمانوں کی یہ دلیل تھی کہ اگر یہ خیالات باطلہ لوگوں کے دلوں سے اُڑا دیئے جائیں' اور یہ دکھلا دیا جائے کہ سینٹ جیمس اس قابل بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی تبرکات کو بچا سکے' تو یقیناً اس کا یہ اثر ہوگا کہ لوگوں کے دلوں سے یہ لغو اعتقاد بھی نکل جائیگا کہ وہ اوروں کی جان و مال کو بچا سکتا ہے' امداد غیبی پر جو بھروسہ جہلا کئے بیٹھے ہیں۔ وہ بھی اُن کے دلوں سے زائل ہوجائیگا سپین کے اس ولی نعمت کے روحانی اثرات کے اعتقاد سے اُس کے معتقدین میں جو مذہبی دیوانگی پیدا ہوجاتی ہے' جس سے وہ مسلمانوں کی فوج کو آئے دن دھمکاتے رہتے ہیں' وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیگی' اور مسلمانوں کا رعب ہمیشہ کے لئے عیسائیوں پر بیٹھ جائیگا۔ منصور نے اپنے اس حملہ سے یہ فوائد سوچے تھے' مگر انجام کار وہ سب غلط ثابت ہوئے۔ بُت اہم پرستانہ عزت و عظمت جسکو اندھی جہالت اور بیہودہ سریع الاعتقادی نے صدیوں سے وہاں والوں کے دلوں کو تاریک کر رکھا تھا' ایسا کمزور نہ تھا کہ اُس مقام مقدس کو عارضی طور سے ناپاک کرنے سے لوگوں کے دلوں سے محو ہوجاتا۔

بہرکیف مہم کی نہایت احتیاط سے تیاریاں کی گئی تھیں۔ ہر قسم کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ کہ شکست کا احتمال ہی نہ رہے۔ فوج نے مغرب کی طرف رُخ کیا' اور کوریا میں جاکر تمام فوج

جمع ہوگئی، اوپورٹو میں جہازوں کا بیڑہ فوج سے جاملا جو پیادہ فوج کو لے کر آیا تھا۔ بہت سے عیسائی باجگزار اپنے آدمیوں کو لے کر مسلمانوں سے آملے اور اپنے مذہب کو نقصان پہنچانے اور اپنے ملک والوں کو تباہ کرنے میں بادل ناخواستہ مددگار ہوگئے*۔ کشتیوں کا پل بنا کر دریائے دورہ سے عبور کیا، پہاڑوں کو کاٹ کر فوراً ہی سڑکیں بنائیں، ندیوں اور دریاؤں سے پار ہوئے۔ چونکہ ایک مدت سے اس علاقہ پر حملہ ہوتے رہے تھے اس لئے وہ اس وقت غیر آباد سا پڑا ہوا تھا، مقابلہ کون کرتا۔ جب جلیقیہ کے پہاڑ دور سے نظر پڑے تو عیسائی حلیفوں کے دلوں میں کھوٹ آ گیا، بعض نوابوں نے خفیہ طور پر دشمنوں سے خط و کتابت شروع کر دی، مگر یہ بات کھل گئی، اور لیون کے بہت سے نوابوں کو نمک حرامی کی سخت سزا دی گئی۔ اس سخت سزا کا یہ نتیجہ ہوا کہ باقی عیسائیوں کو اپنے ہم مذہبوں سے سازباز کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی، اُنھوں نے اسی میں اپنی خیریت دیکھی کہ فرماں برداری اور نمک حلالی کے پردہ میں اپنے اصلی خیالات کو چھپائے رہیں۔

جس علاقہ میں اس وقت مسلمان داخل ہوئے تھے وہ اب تک ان کے حملوں سے محفوظ رہا تھا۔ ایک تو یہ وجہ تھی، دوسرے یہ تمام علاقہ ہی مقدس سمجھا جاتا تھا، اس کے علاوہ پادریوں کی شہرت دولتمندی سے سینٹیاگو کے قرب جوار میں بہت گھنی آبادی ہوگئی تھی۔ گرجاؤں اور پادریوں کا عملہ فعلہ بھی بہت تھا۔ پہاڑ کے دامن میں بہت سے مناسک، مزارات اور معابد تھے، تمام ترائی میں دیر اور خانقاہ ہی نظر آتی تھیں۔ یہاں جتنی اراضی قابل کاشت تھیں ان کو کلیسا ہی کے غلام اور خدمتگار جوتتے بوتے تھے، ان کی حالت پشتینی غلاموں کے قریب قریب تھی۔ بڑے بڑے رتبہ کے پادریوں کے مکانات نہایت شاندار تھے، ان میں خدمتگار اکثر عورتیں تھیں، ان کے دلکش صورتوں اور سڈول جسموں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرات پادری حسن زنانہ کے بڑے مبصر اور قدردان تھے، جسکی ان کے دیندارانہ اتقا کے لحاظ سے امید نہ تھی۔

---

* یاد رکھئے کہ قدرتی قانون معاوضہ مکان و زمان کی قید سے بری ہے۔ (مترجم)

چونکہ عیسائیوں کی سلطنتیں خانہ جنگیوں اور مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے بہت ہی خراب حال ہو رہی تھیں، اس لئے منصور کا نام ہی سُن کر اُن پر وہ رُعب چھایا کہ کانپ گئے، اور اُن کو مقابلہ کی تاب ہی نہ رہ گئی۔ وہاں کے باشندے اپنی تمام منقولہ چیزیں اور اپنے اولیاء اللہ اور بادشاہوں کی ہڈیاں لے کر پہاڑوں پر یا دور دراز جزیروں میں بھاگ گئے۔ سینٹیاگو بے چراغ پڑا تھا۔ حملہ آوروں کو وہاں کے گرجاؤں، بے تعداد خانقاہوں اور دیروں سے بے انتہا لوٹ ہاتھ آئی۔ شہر کی تمام عمارتیں، خاص کر یہ مقدس مقبرہ بالکل منہدم کر دی گئیں۔ یہ مقبرہ سنگ مرمر اور رخام کا بنا ہوا تھا، اُس کے نقشہ اور سجاوٹ سے اُس گنوارپن کا اظہار ہوتا تھا جو زیگا تھ سے میراث میں آیا تھا۔ جلیقیہ کے معماروں کے گنوارپن نے اس کی سجاوٹ کے نقشہ کا اور بھی ناس کر دیا۔ قربانگاہ کے عین مقابل میں سینٹ جیمس کا مجسمہ تھا، جسکو ایک بیندار مگر نومشق گا تھک بت تراش نے بنایا تھا۔ اسکے گرد چاندی کا کٹہرا بنا کر ایک چھوٹا سا صومعہ بنا دیا گیا تھا۔ سواء چہرہ کے اس مجسمہ کے ہر حصہ پر رنگ آمیزی تھی یا ملمع سازی۔ اس کے ایک ہاتھ میں انجیل تھی، اور دوسرا ہاتھ اس طرح اُٹھا ہوا تھا جیسے کوئی پادری کسی کو برکت دے رہا ہو۔ بے تعداد آدمیوں کے بوسے دینے سے اس بُت کا چہرہ مُہرہ، جو پہلے ہی نہایت بھدا تھا، بالکل ہی مسخ ہو گیا تھا۔ اسکے پہلو میں اس آوارہ گرد ولی کے تبرکات مثلاً عصا، تونبی اور مشکے رکھے ہوئے تھے۔ اُن کے سر پر گویا ایک قسم کا کپڑا پڑا ہوا تھا، جو ہر ایک زائر اوڑھتا ہے، اور اس میں جواہرات لٹکے ہوئے تھے۔

یہ بُت اور سینٹ جیمس کی قبر چھوڑ دی گئی، اور اسکی کوئی بے ادبی نہیں کی گئی۔ یہ بھی منصور کی ایک چال تھی اور نہ اُنہیں ان دونوں کے توڑ پھوڑ ڈالنے میں کون مانع آسکتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ وہ اپنے حلیفوں کو ناراض کرتے ہوئے ڈرتے تھے، وہ لوگ پہلے ہی اپنے کفار حلیفوں سے اس لئے کچھ بگڑے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے اس مقام مقدس کی توہین اور بے ادبی کی ہے۔ سپہ سالار کی اس مسامحت کے معنی پادریوں نے یہ لگائے کہ یہ بہت بڑا معجزہ ہے کہ منصور کو بھی ولی موصوف کی قبر اُکھاڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ موزی ٹینیا کے رسالے نے قریب جوار کی آبادیوں

کو خوب لوٹا، اور بہت سے فراریوں کے گروہوں کو راستہ ہی میں روک لیا؛ ان میں بہت سے پادری بھی تھے، جنکا عقیدہ اس مجسمہ کی کرامات اور ولی کے تبرکات کے اثرات کا مشرقیین کے چمکدار نیزوں کو دیکھ کر تشریف لے جا چکا تھا۔

جب یہ فاتح فوج قرطبہ میں واپس آئی تو اُس کا استقبال اُسی شان و شوکت سے کیا گیا جس طرح رومی فاتحین کا کیا جاتا تھا۔ فوج کے پیچھے پیچھے ہزاروں عیسائی قیدی قید و بند میں لوٹ اور فتح کا مال سر پر اٹھائے ہوئے سخت دقت اور تکلیف کے ساتھ رینگتے چلے آتے تھے۔ بہت سوں کے سروں پر مقدس کلیساؤں کا وہ مال تھا جس کا وہاں سے ہٹایا جانا ہی بے ادبی میں داخل تھا۔ بہت سے قیدیوں کے کندھوں پر شہر سینٹیاگو کے پھاٹک کا دروازہ تھا۔ بہت سے وہاں کے گرجا کے گھنٹے کے بوجھ کے نیچے دبے مرے جاتے تھے۔ یہ وہ گھنٹہ تھا کہ جسکے بنانے میں لاکھوں مرد اور عورتوں کا روپیہ اور زیور لگ گیا تھا؛ جسکی آواز نے بہت سے بڑے بڑے پادریوں کی تقدیس اور ان میں سے بڑے اولیا کے مرنے اور دفن کرنے کا اعلان کیا تھا؛ جس نے مختلف مقامات و ممالک کے زایرین کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا تھا؛ جس کی آواز اُسکے وہاں سے اُتارے جانے کے وقت تک اُس علاقہ میں سنی جاتی تھی۔ کہ جسکی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ وہ کفا کی بے ادبی سے محفوظ رہیگا لیکن وہی گھنٹہ ایک اور معبد میں لگایا جا کر یہ ثابت کرنے والا تھا کہ اسلام کی طاقت کے سامنے مذہب مسیحی کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ علاوہ جامع مسجد کے جس میں اُس وقت منصور کچھ ایزادیاں کرا رہے تھے، اس فتح کی نشانیاں بہت سی مسجدوں میں تقسیم کر دی گئیں حقیقت میں یہ فتح بھی اتنی بڑی تھی کہ جو خلافت مغربی ہی کا کام تھا، کسی اور سے نہ ہو سکتا تھا؛ مسلمان اس پر جتنا فخر کرتے بجا تھا، اور جتنی خوشی مناتے کم تھا۔ سینٹیاگو کے پھاٹک کے کواڑ مسجد کی کارنس کے نیچے لگوائے گئے؛ وہیں اُلٹا کر کے وہاں کا گھنٹہ لٹکوا دیا گیا؛ اُس سے عیدین وغیرہ میں فانوس کا کام لیا جاتا تھا۔

زیری ابن عطیہ موریٹینیا کے باغی جو سلطانہ صبح کی انگیخت پر خلیفہ کو آزاد کرانے کے بہانہ

سے شمشیر بکف ہوئے تھے، چند ہی روز کے بعد ٹھنڈے پڑ گئے۔ منصور نے پہلی مرتبہ جو فوج اُن کو سزا دینے کے لئے بھیجی تھی اُس نے شکست کھائی۔ دوسری جمعیت بسرکردگی عبدالملک المظفر گئی اُس نے ایک گھمسان کی لڑائی میں زیری کی فوج کو شکست فاش دی۔ اُن کے نہ صرف مقبوضات ہی نکلے، بلکہ تمام اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ چونکہ لڑائی میں کاری زخم کھائے تھے۔ وہ اُنکی جان لیکر ٹلے۔

۱۰۰۲ء کے شروع موسم گرما میں ان تھک منصور نے پھر عیسائیوں پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ اُن کا نصب العین سینٹ ایمی لین کے مقبرہ کو تباہ کرنا تھا، یہ ولی اللہ قشتالہ کے حامی و محافظ سمجھے جاتے تھے۔ اُن کا مقبرہ قصبہ کنالیس میں تھا۔ یہ قصبہ اس کے معابد و دیرو خانقاہ، معہ پادریوں کے تمام سامان دغا و فریب اور واہمہ پرستی کے مٹا دیئے گئے۔ لیکن یہ لڑائی اس مشہور سپہ سالار کی آخری لڑائی تھی، جس نے کبھی آج تک معمولی پس پائی بھی نہیں دیکھی اور مسلمانوں کی طاقت کو آسمان پر پہنچا دیا تھا، کئی مہینہ پیشتر سے ایک تکلیف دہ مرض اُن کو لاحق ہوگیا تھا۔ قُرطبہ کے بہترین اطبا بھی اس بیماری کے اسباب معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ اس آخری لڑائی کے جوش نے مرض کو اور بھی بڑھا دیا۔ دوران جنگ ہی میں وہ اتنے ضعیف ہوگئے کہ اُن کو ڈولی میں سفر کرنا پڑا۔ اُن کی صورت اور ہر وقت کی تکلیف سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا آخری وقت قریب آتا جا رہا ہے۔ مدینہ سیلی میں تمام فوج نے مقام کیا، کیونکہ سپہ سالار آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ جب چھاؤنی میں اُن کی نازک حالت کی خبر پہنچی۔ تو سب لوگوں کو سخت رنج ہوا۔

آخری وقت میں منصور کو اس کا سخت رنج رہا کہ دارالخلافہ قُرطبہ کے لوگ نہایت شریر اور فسادی ہیں، اور اُن کو رام کرنے میں اُنہیں اپنی تمام تر طاقت صرف کرنی پڑی ہے۔ وہ اس سے ڈرتے تھے کہ اُن کے مرتے ہی وہاں وہ فتنہ و فساد برپا ہو جائیگا کہ جس کا نتیجہ خلافت اندلس کا مختلف طوایف الملوکی میں تقسیم ہو جانا یقینی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس سلطنت کی عظمت و شان کا تار و پود صرف اُن ہی کے جوہر دماغی کے طفیل سے قائم ہے، اور اُسکو

اُن ہی کی ذات نے اتنا عظیم الشان بنایا ہے۔ اگرچہ اُن کو قانوناً کوئی استحقاق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے اختیارات کو اپنے بیٹے پر منتقل کریں، مگر اس خیال سے کہ جتنی مدت بھی ہوسکے اُن کی اولاد کا اقتدار قائم رہے انہوں نے اپنے بیٹے عبدالملک کو حکم دیا کہ فوراً قرطبہ جاکر وہاں کی فوج محافظ کا جائزہ لے لیں۔ دوسرے بیٹے عبدالرحمٰن کو یہاں اپنی جگہ فوج کا سپہ سالار بنادیا۔ دونوں بیٹوں کو شفیق باپ نے بستر مرگ پر بہت سی پند و نصایح کیں۔ ان کو فوجی مشق و تجربہ باپ کے زیر نگرانی ہی بہت سی لڑائیوں میں ہوچکا تھا۔ بڑا بیٹا اس قابل تھا کہ وہ اپنے جلیل القدر باپ کا جانشین بن سکے؛ چنانچہ اُس نے ایسے موقعوں سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ چھوٹے میں ایسی قابلیت نہ تھی کہ وہ مہام سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ مقدر ہوچکا تھا کہ جو امیدیں اس غلط کار، بر خود غلط اور عیاش نوجوان کے متعلق اُسکے دوستوں نے لگائی تھیں وہ غلط ہی ثابت ہوں۔

جیسے ہی منصور کی پند و نصایح کا سلسلہ ختم ہوا اُن کی طاقت نے بالکل جواب دیدیا، اور اُنہوں نے نہایت اطمینان سے راضی بقضا ہوکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی غالباً مدت العمر کی یہ تمنا تھی کہ اگر عین لڑائی میں نہیں، تو میدان جنگ میں مروں۔ یہ صرف تمنا نہ تھی بلکہ وہ روز دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ خداء تعالےٰ اُن کو بحالت جہاد موت دے، تاکہ اُن کو شہادت کا درجہ نصیب ہو۔ اس امید پر کہ اُن کی دُعا ضرور قبول ہوگی، وہ ہر لڑائی میں اپنا کفن ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ اُس کا کپڑا اُس روئی کا بنا ہوا تھا۔ جو اُن کی جدی جاگیر واقع تورِش میں پیدا ہوئی تھی؛ اور اس کو ان کی بیٹیوں نے کاتا اور بُنا تھا۔ اُن کو ہر طرح اطمینان تھا کہ اس کپڑے میں کوئی ایسی ناجائز کمائی شامل نہیں ہے جس کا احتمال اُن کے مقبوضات میں تھا۔ یہ پیش بین و دور رس سیاست دان، جن کی بلند نظریاں کچھ دنیاوی معاملات تک ہی محدود نہ تھیں، دینی معاملات میں بھی وہ اُسی دور اندیشی سے کام لیتے تھے، جس سے دنیوی کاروبار میں۔ وہ اپنی عاقبت اور اپنی نجات کے فکر سے کسی وقت غافل نہ ہوتے تھے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے کہ جو شخص خداء تعالےٰ

کے سامنے اس طرح جائے کہ جہاد کی گرد اُسکے پیروں پر پڑی ہو تو وہ عذاب دوزخ سے نجات پا ئیگا۔ قیامت میں سرخ روئی حاصل کرنے کے لئے وہ چاندی کی بڑی خوبصورت صندوقچی ہر مہم میں اپنے ساتھ رکھتے تھے حکم تھا کہ دن بھر کے کوچ کے بعد جب مقام ہو تو اُن کے کپڑے نہایت احتیاط سے جھاڑے جائیں اور جتنی گرد جمع ہو وہ اُس صندوقچی میں رکھ دی جائے اُن کو اُسی کفن میں، جسکو وہ برسوں سے اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے کفنایا گیا، اور وہی مٹی جو اس صندوقچی میں جمع تھی کفن پر چھڑک کر اس جلیل القدر و عظیم الشان سپہ سالار کو مدینہ سیلی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

محمد ابن ابی عامر المنصور کے خصائل کے متعلق اوراق ماسبق میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اُن میں بہت سے عیوب اور بہت سی خوبیاں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ وہ بیحد ہوشیار، سیاست داں، بے باک اور مستقل مزاج آدمی تھے۔ اُن میں ایک یہ خصوصیت تھی کہ وہ دوسروں کے ہاتھ سے ایسے افعال کرا دیتے تھے کہ جن کا اعتبار آنا مشکل ہے۔ وہی بدنام ہوتے تھے اور خود اُس سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ اپنے جوہر دماغی کی طاقت سے وہ گمنامی کی حالت سے بادشاہی حیثیت تک پہنچ گئے تھے۔ اُن کے انتظامات ملکی بے وجہ بے رحمی سے کبھی ناپاک نہیں ہوئے، انہوں نے اپنے انتظامات ملکی و مالی پر کوئی بدنامی نہیں آنے دی۔ اُن کا استقلال، ہمت اور رعب اتنا تھا کہ جب تک وہ برسر عروج رہے کسی کو نمک حرامی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، نہ کسی اور طرح نقض امن ہوا۔ جہاں کہیں اُن کے ذاتی اغراض و فوائد کی مصادمت نہ ہوتی تھی وہ ہمیشہ عدل و انصاف کے اصول کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، امن عامہ کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا، ظلم و تشدد کے جو افعال اُن سے منسوب کئے جاتے ہیں، اور اُن کی بنا پر انہیں بُرا بھلا کہا جاتا ہے، وہ سیاسی ضرورت کا نتیجہ ہیں، یا تو موقعہ ہی نازک ہوتا تھا، یا اقتضاء ضرورت ہی مجبور کرتی تھی، یا حفاظت خود اختیاری کے لئے لازمی تھا کہ اُن کو وہ فعل ناگزیر کرنے پڑتے

تھے۔ وہ نسبتاً ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اُن کے ساتھ تعلقات صہریت قائم کرنے کے لئے خاندان شاہی کے ارکان خوشامدیں کرتے تھے۔ برموڈو بادشاہ ایسٹریاس اور سینکو بادشاہ نوار کی بیٹیاں اُن کے حرم میں داخل تھیں۔ باوجود اُن کے سیاسی جوہر دماغی اور مسلسل فتوحات کے اُن کی ہرولعزیزی نمائشی اور سطحی تھی، اسی لئے وہ اپنی حیثیت کو بمشکل تمام قائم رکھ سکتے تھے۔ وہ ہر جگہ اپنے عرف "لوٹری" سے یاد کئے جاتے تھے، جو واقعی اُن کا نہایت موزوں نام تھا۔ وہ اپنے رفیق طالب علموں کے محسود تھے، وہی اُن کو بدنام کرتے تھے۔ اہالی دربار اُن کی سرعت ترقی اور شہرت سے بہت جلتے تھے، اور جہاں تک ہوسکتا تھا اُن کی قابلیت پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ خواجہ سرا بہت صحیح طور پر اُن ہی کو اپنے سیاسی اقتدار کے زایل کرنے کا آلہ سمجھتے تھے، اس لئے اُن سے نفرت کرتے تھے، اور اُن کو اپنے فرقہ کا جانی دشمن سمجھتے تھے۔ اُمرا اُن کے اظہار شان و شوکت پر چیں بر جبیں ہوتے تھے، اور تخلیہ میں اُن کو نو دولت کہتے تھے۔ جو لوگ کہ دینذار تھے وہ اُن کے ادعائی ملحدانہ کلام کو ہر جگہ بڑے تقدس سے اعادہ کرتے پھرتے تھے۔ حالانکہ اُنہوں نے بہت کچھ فیاضی کی اور فرائض دین ایک متدین مسلمان کی طرح ادا کئے، مگر ان لوگوں کے نزدیک جو گناہ اُن سے سرزد ہو چکا تھا اُس کا کفارہ کسی چیز سے نہیں ہوسکتا تھا، باوجودیکہ ان ہی جاہل مذہبی دیوانوں کی خاطر سے اُنہوں نے امیرالمومنین الحکم کے کتب خانہ سے بہت سی سائنس کی کتابیں نکال کر جلوا ڈالیں۔ از بسکہ یہ واقعہ ہر شخص کے ذوق علمی کا منافی معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ باوجود اس حرکت کے وہ علم کے بڑے قدردان اور علماء کے بڑے مربی تھے۔ ان کے محل پر ہمیشہ علماء فحول اتنی تعداد میں جمع رہتے تھے کہ وہ محل شاہی نہیں، بلکہ مذاکرہ علمیہ بنا رہتا تھا۔ وہ اکثر یونیورسٹی میں جاتے تھے، اُستادوں کو پڑھاتے سنتے اور دیکھتے تھے، اور لائق طلبہ کو انعامات دیتے تھے۔ اُن کا سخت حکم تھا کہ اُن کے آنے یا جانے کے وقت بھی سبق بند نہ کیا جائے۔ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے طلباء اور علماء اُن کی خدمت میں اُسی طرح حاضر رہتے تھے جیسے کہ امیرالمومنین الحکم کے پاس یہ لوگ

اُن کی دربار کی زیب و زینت تھے اور قرطبہ کی نکتہ نواز اور عالی دماغ سوسائٹی کو اُن کے علم سے بے انتہا فوائد پہنچتے تھے۔ ان جلیل القدر مہمانانِ شاہی کی تواضع و تکریم کے لئے ایک بیش قرار رقم خزانہ شاہی سے خاص طور پر علیحدہ لے لی جاتی تھی۔ مشہور نحوی، شعراء اور مورخین جو اپنے فن کو عزت و آمدنی کا ذریعہ سمجھتے تھے، مستقل طور پر قرطبہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اندلس کے اطباء و جراحین کی شہرت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی، منصور کے وقت میں تو وہ تمام قطع یورپ میں پھیل گئے تھے۔ جب وہ کسی مہم پر جاتے تھے۔ تو اُن کے ساتھ بہت سے شعراء اور مورخین ہوتے تھے، تاکہ وہ فوراً اُس مہم کے واقعات اور کامیابیوں کو قلم بند کریں، اور اس جلیل الشان حامیِ اسلام کی شجاعت، فیاضی اور تدیّن کو ایسی دلکش، پرجوش اور دلنشین نظموں میں ادا کریں کہ جس سے بہتر نظم شعراءِ بادیہ نہ لکھ سکے ہیں، نہ لکھ سکینگے۔ جب وہ قتلونیہ کی مہم پر گئے ہیں، تو اکتالیس قابل ترین مورخ و شعراء اُن کے ہم رکاب تھے۔

جامع مسجد میں منصور نے جو ایزادیاں کرائیں اُن سے مسجد بقدر دو گنے کے بڑھ گئی۔ اسکی محرک کچھ تو یہ وجہ تھی کہ دینداروں کو اُن پر اعتماد نہ رہا تھا، اُس کو از سر نو قائم کرنا تھا، اور کچھ ضرورت بھی اسکی داعی تھی، کیونکہ جمعہ کے روز جو خلق اللہ اس خانۂ خدا میں آتی تھی اُس کے لئے یہ غیر مکتفی ہو گئی تھی۔ اس کے لئے جتنی زمین لی گئی۔ اسکی قیمت اُس منہ مانگی قیمت سے دوگنی ادا کی گئی جو مالکان اراضی پہلے ہی بڑھا کر طلب کیا کرتے تھے۔ ایک بوڑھیا کا باغ مسجد کے لئے لینا نہایت ضروری تھا، اس میں ایک بہت بڑا کھجور کا درخت تھا۔ پہلے تو اس عورت نے سختی کے ساتھ اپنی جائداد کو فروخت ہی کرنے سے انکار کیا۔ سخت خوشامد درآمد پر بھی وہ اپنی اراضی کو بیچنے پر تو راضی نہ ہوئی، مگر اس پر آمادہ ہو گئی کہ اُسکے بدلے میں اُسکو کوئی اور جائداد دیجائے جس میں اُتنا ہی بڑا اور ویسا ہی خوبصورت کھجور کا درخت ہو جیسا کہ اُسکے گھر میں تھا۔ لیکن قرطبہ یا مضافاتِ قرطبہ کے باغوں میں نہ ویسا باغ تھا نہ اُس صفت کا کھجور کا درخت۔ آخر بمشکل تمام مدینۃ الزہراء کے قریب ایک ایسی جائداد مل گئی جس میں اس بوڑھیا کے نام

بالغ کی سی صفات تھیں۔ یہ جائداد اتنی قیمت پر خرید کر اسکو دی گئی کہ جو ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے

اپنے پیش رو خلفاء کی تقلید میں منصور نے ہفتوں مسجد کی بنیاد اور عمارت میں معمولی مزدور کی طرح کام کیا۔ جتنی ایزادی انہوں نے کی وہ اب تک جوں کی توں باقی ہے۔ یہ ان گھڑ پتھروں کی بدنما سی عمارت ہے۔ باقی کا اندرون عمارت اُن کی عمارت سے بالکل الگ معلوم ہوتا ہے۔ پہلی عمارت کی نعل اسپی محرابوں کی لطافت اور پھول بوٹوں کی سجاوٹ سے یہ کچھ بھی لگا نہیں کھاتی۔ یہ عمارت کچھ ایسا ثواب کا کام سمجھی گئی کہ علماء دین نے صاف کہہ دیا کہ صرف اسی ایک کام سے منصور کے سارے گناہ بخشے جائینگے اور وہ بہشت میں جگہ پائینگے۔

منصور کی توجہ مہمات فوجی اور حصول شان و شوکت ہی تک محدود نہ تھی جب کبھی وہ قرطبہ میں بحالت امن بیٹھتے تھے تو اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی تدابیر سوچتے اور اُس کے لئے کوشش کرتے رہتے تھے کسی حکمران کی شہرت کے لئے اس سے بڑا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ معاملات عدالت میں جو نقص اور خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں انہوں نے اُنکی اصلاح کی۔ خائنین کی خیانت مجرمانہ اور تغلب سے خزانہ خالی ہوتا چلا جا رہا تھا انہوں نے حساب کتاب اور جانچ پڑتال کا نیا طریقہ جاری کرکے اور مجرمین کو سخت سزائیں دے کر اسکو بالکلیہ روک دیا۔ جو شیلے دیندار لوگ بے ضرورت اُن لوگوں کو دھمکاتے اور ذلیل کرتے تھے جنکے خیالات اُن کے خلاف ہوتے تھے اور جنکو وہ خلاف شرع سمجھتے تھے، منصور نے ایسے لوگوں کو سخت دھمکا کر اس خرابی کا سدباب کیا۔ جیسے ہی اُن کو عروج ہوا خواجہ سراؤں کا انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ ان کا اثر و نفوذ محل شاہی میں کچھ بھی باقی نہ رہ گیا۔ پیچ در پیچ خطرناک سیاسی راستہ کو چھوڑ کر وہ اعلماء علم و ادب اور صنعت کے صاف اور سیدھے راستہ پر پڑ گئے۔ بجائے اسکے کہ وہ اپنی چالوں اور شرارت سے لوگوں کو نقصان پہنچائیں اب وہ خلق اللہ کے لئے فائدہ رساں ہو گئے۔ عرب سے صحیح النسل گھوڑے منگوا کر اندلس میں انہوں نے بہترین گھوڑے پیدا کرائے ملک بھر میں کوئی دریا ایسا نہ تھا کہ

۞ ۱۱۰ھ/ ۱۱ اضافہ ۲۰۰ کا [illegible] رحمہ اللہ ۔ (مترجم)

جس پر پل نہ ہو کسی جگہ اس ان تھک زیرک نے نیا پل بنوایا اور کہیں پرانے پل کی مرمت کرائی۔ بڑی بڑی نئی سڑکیں نکلوائیں۔ پرانی سڑکوں کو چوڑا کرایا اور اُن کی وسعت میں ترقی دی۔ اس رفاہ عامہ کے کام سے نہ صرف فوجوں کی آمد و رفت میں آسانی پیدا ہو گئی بلکہ ملک کی تجارت کو فروغ ہو گیا۔ تمام اجناس ارزاں ملنے لگیں، شہروں میں بہتات سے آنے لگیں، اور ارزانی کی وجہ سے ہر شخص نے اُن سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی قابلیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جس ملک پر انہوں نے اس شان و شوکت اور ایسی کامیابی کے ساتھ حکومت کی تھی۔ وہ اُن ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اُن کا شاہانہ تشخص ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے تھا۔ تمام تاریخ اسلام اُن جیسے آدمی کی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتی، جو اتنا ہمہ گیر ہو اور جس کے سامنے ہر فن اور ہر مذاق کے آدمی کا سر نگوں ہو جائے۔ یہ غیر معمولی جوہر عجیب چیز تھا، جس پہلو سے دیکھو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ نو دولتوں میں طمع و آز بڑھ جاتی ہے، مگر منصور کو حرص چھو بھی نہ گئی تھی۔ اُن میں وہ خلاف فطرت عیوب نہیں تھے جنہوں نے بنو امیہ کے بڑے بڑے بادشاہوں کے دامنوں کو ناپاک کر رکھا ہے۔ اُن کا حرم شان و شوکت کے اظہار کا ذریعہ تھا، نہ کہ شہوت رانی کا۔ ملکہ صبح کے ساتھ جو ان کا تعلق خاطر[*] تھا جس پر اتنی ہجویں لکھی گئیں، اور اس قدر مذاق اڑائے گئے، اسکو بھی انہوں نے اول سے آخر تک اپنے عروج کا وسیلہ بنائے رکھا۔ ملکہ کے جذبات کو انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنی بلند نظری کا زینہ بنائے رکھا تھا، جب اُن کا مطلب حاصل ہو گیا تو انہوں نے ملکہ کی طرف التفات بھی نہ کیا۔ اگرچہ اُن کو بے انتہا دولت جمع کر لینے کے ذرائع حاصل تھے، مگر انہوں نے صرف اتنے ہی پر کفایت کی جو اُن کی شان و شوکت اور جاہ و حشم کو قائم رکھتی، اور اُن کو اپنی حیثیت سے نیچے نہ گرنے دیتی۔ حرص و طمع اُن کی طبیعت میں تھی ہی نہیں۔ خود اپنا خزانہ اور خزانہ شاہی رفاہ عام اور رعایا کی صلاح و فلاح میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اگر اُن کو اپنے کسی ماتحت کی خیانت معلوم ہو جاتی تھی تو اُس کو ایسی سخت سزا دیتے تھے کہ وہ بیک بینی و دو گوش محض اپنی جان ہی بمشکل بچا سکتا تھا۔

---

[*] اس معاملہ میں اس کو نہ بھولنا چاہئے کہ ملکہ صبح عیسائی تھیں۔ (مترجم)

جس شخص کا اُن پر ذرا سا بھی احسان ہوتا تھا ممکن نہیں تھا کہ اُسکو کسی وقت بھی بھول جائیں یا کوئی بڑا عہدہ اسے نہ دیدیں، اور جس شخص سے وہ ذرا بھی ناراض ہوجاتے تھے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا تھا اپنے نصب العین کے حصول میں وہ پیش پا اُفتادہ اصول اخلاق کو بھی بھول جاتے تھے چھوٹے سے لیکر بڑے حکام وعمال کے عزل ونصب اور محکمہ عدالت کے معاملات میں وہ عدل وانصاف کو ملحوظ رکھتے تھے ہر فتح کے بعد وہ سینکڑوں غلاموں کو آزاد کردیا کرتے تھے۔

اُن کا فریب نفس اُن کی اس میانہ روی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے خلافت کی شان وشوکت تمام اپنے لئے مخصوص کرلی تھی مگر اُس تقدس کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو امیر المومنین کے لئے مخصوص ہوتا ہے اگو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ ہزار جان سے اسکے خواہاں تھے۔ بہرحال اُن کی بلند نظری اتنے پر قانع نہ تھی کہ بادشاہی اختیارات اُن کے ہاتھ میں ہوں۔ بادشاہی اختیارات تو وہ سنبھال ہی بیٹھے تھے خطاب تقدس امیر المومنین کے علاوہ باقی تمام خصوصیات خلافت کو انہوں نے لے ہی لیا مظلوم خلیفہ ہشام کی مُہر کی جگہ خود اُن کی مُہر ثبت ہوتی تھی۔ انہوں نے یہاں تک جرأت کی کہ اپنے ہی اختیار اور حکم سے اپنے بیٹے کو وزیر اعظم مقرر کردیا، یہ وہی عہدہ تھا کہ جس سے ترقی کرکے وہ اس رتبہ پر پہنچے تھے۔ اُن کی روشن ودرخشندہ کامیابیاں اُن کی بیحد شہرت وناموری اُن کے مطلق العنان اختیارات نے رعایا کو کچھ اس طرح متحیر کررکھا تھا کہ جیسے کسی کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں، لیکن یہ نہ تھا کہ عوام الناس کو اُن سے ساتھ کچھ گرویدگی ہو۔ لوگ جلوت میں اُن کی تعریفیں کرتے تھے اور خلوت میں اُنکی غیبت کرتے تھے، اسلامی اندلس کی آبادی مختلف اقوام سے مشتمل تھی، بہت سے معاملات میں وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اس معاملہ میں سب متفق اللفظ تھے کہ شاہی اختیارات ایسے نہیں ہیں کہ وہ کسی اور پر منتقل کئے جاسکیں۔ چونکہ خلیفہ کو ایک مذہبی حیثیت اور عزت بھی حاصل تھی اسلئے ان خیالات میں اور بھی غلو ہوگیا تھا منصور کی دوراندیشی نے اُن کو یہ دھوکا نہ دینے دیا کہ وہ اپنی مرضی کے موافق عوام الناس کے تعصبات اور دینی خیالات کی خلاف ورزی کریں۔ اسکے علاوہ

ایک قدیم روایت یہ چلی آرہی تھی کہ خاندان شاہی کے تبدل سے خلافت کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اس پیشینگوئی کے سب لوگ متفقاً معتقد تھے۔ باوجود ان خیالات کے اگر کوئی شخص غصب کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ تمام مسلمانوں کا دشمن تھا' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نمک حرام اور بے ایمان۔ وجوہ ہی ایسے لابد تھے کہ منصور بادشاہ نہیں بنے' اگر وہ خود بادشاہ بن گئے ہوتے تو یقیناً سلطنت بطور توریث کے اُن کی اولاد میں چلی جاتی۔ موجودہ صورت میں اُنہوں نے اُس ادب و احترام کو ضعیف کر دیا' جو صحیح النسبی کے متعلق انسان کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے' لیکن اسکے بدلے میں اُنہوں نے اپنی اولاد کو کوئی مستقل فائدہ نہیں پہنچایا۔ ان امور کا سب سے زیادہ احساس منصور کو تھا۔ مرتے وقت اُن کو سلطنت اندلس کے آیندہ قیام و دوام کا سخت فکر و اندیشہ پیدا ہوگیا تھا' مجلس شورےٰ ہوتی' یا یونیورسٹی کے مذاکرات علمیہ' فوج کی صف بندی ہوتی' یا بے تکلف صحبت' یہ خیال کسی وقت بھی اُن کے دل سے نہ نکلتا تھا؛ سوتے سوتے وہ اسی خیال میں چونک اُٹھتے تھے' مرتے وقت یہی خلش اُن کو ستاتی رہی جب اُن کو یہ خیال آتا تھا کہ رعب خلافت کو اُنہوں نے اس طرح نقصان پہنچایا ہے کہ وہ کسی طرح اپنی اصلی حالت پر نہیں آسکتا۔ تو اُن کو ایسا دلی رنج پہنچتا تھا کہ جو کسی بڑے سے بڑے گناہ کے خیال سے بھی نہیں پہنچ سکتا۔

منصور کی مہموں کی تاریخ اُن مہمات کی نوعیت سے بالکل مختلف ہے جو اُنکے پیش رو بادشاہ ہونے کی تھیں۔ اُن کے وقت تک یہ کیفیت تھی کہ عیسائی ہمیشہ مہاجمانہ پیش قدمی کرتے تھے۔ مگر خلیفہ ہشام کے حاجب کے زمانہ میں مسلمانوں نے عیسائیوں پر حملے کئے' مفتوح ہوکر یا شکست کھا کر دوسرے بادشاہوں کو دب کے صلح کرنی پڑی۔ بیس برسوں میں اُنہوں نے کبھی اپنی طرف سے کفار کے سامنے شرائط صلح پیش نہیں کیں۔ اُن کی کامیابی کی یہ کیفیت تھی کہ گویا عادتاً وہ کامیاب ہی رہا کرتے تھے۔ اُن کے سپاہیوں کو پورا اعتماد کامیابی تھا۔ جس وجہ اُن کو اپنی فتوحات کا یقین تھا' اتنا ہی اُن کے دشمنوں کو اپنے خائب و خاسر ہونے کا یقین تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلا موقعہ تھا کہ قرآن مجید کے احکام جہاد کی منصور نے

لفظاً لفظاً بلکہ حرفاً حرفاً تعمیل کی۔ ایک مہم کے تباہ کن اثرات میں ابھی کمی نہ آتی تھی کہ دوسری مہم کے مصایب سامنے کھڑے نظر آتے تھے۔ عیسائی بادشاہوں کی حدودِ سلطنت برابر کم ہوتی چلی جاتی تھیں۔ زیمورا، لیون، اسٹورگا، برشلونہ، پمپلونا، سینٹیاگو جیسے بڑے بڑے شہر خاک میں ملا دیئے گئے۔ گرجاؤں اور خانقاہوں کی وہ تمام دولت جو دیندار بادشاہوں اور خوش اعتقاد عایا نے جمع کی تھی، بالکلیہ لٹ گئی۔ چونکہ پادریوں کی تمام جائدادیں تباہ ہو چکی تھیں، اس لئے انکی آمدنی بھی مفقود ہو گئی۔ عیسائی معابد کے تباہ ہو جانے، اور وہاں کے آدمیوں کے افلاس کا یہ نتیجہ ہوا کہ عیسائیوں کی دینداری، مراسم اور عبادت میں بھی بہت کمی آ گئی۔ پادریوں کا اقتدار بہت کم ہو گیا۔ جو وسیع علاقہ کہ گرجاؤں اور دیروں سے پٹا پڑا تھا۔ اس میں اب عیسائیوں کی خال خال نشانیاں باقی رہ گئی تھیں۔ یورپ کے دو مقدس ترین معابد کی بے ادبی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تبرکات کا اعتقاد عیسائی عوام کے دلوں سے اٹھ گیا، اولیاء اللہ کی غیبی امداد لغو معلوم ہونے لگی، یہاں تک کہ خود دین مسیحی آنکھوں میں حقیر و ذلیل معلوم ہونے لگا۔ پادری اب بھی اپنی پرانی وضع قائم رکھے ہوئے تھے، مگر ان پر جو مصایب پڑے اس کا اثر عام سوسائٹی پر پڑے بغیر نہ رہا۔ جو پہلے ہی نہایت خراب حال ہو رہی تھی۔ بادشاہ اور امراء اہالی کلیسا کی پروا بھی نہ کرتے تھے، جو کچھ وہ مانگتے تھے۔ اس کے دینے میں تامل کرتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پادریوں نے ان کو لعنتی قرار دیا، اور مورخین نے ان کو بدنام کیا۔ بادشاہ نے اپنی رعایا کی جائدادیں بلاوجہ ضبط کر لیں۔ نوابوں نے شاہی جائدادیں چھین لیں، اور غلاموں اور بھیڑ بکریوں کے گلوں پر، جن پر انہوں نے قبضہ کیا تھا، قرعہ اندازی کی۔ عیسائیوں نے جو کچھ تین سو برس میں حاصل کیا تھا وہ بیس برس سے بھی کم میں کھو دیا۔ ان کے مقبوضہ پہاڑوں پر بھی مسلمانوں کی فوج محافظ رہنے لگی۔ ایسٹریاس کے کسان اپنے گاڑھے پسینہ کی ساری کمائی مسلمانوں کے حوالہ کر دیتے تھے اور ان ہی کی بدولت بمشکل اپنی ایام گزاری کرتے تھے۔ یہ تھے وہ اثرات جو منصور کی پالیسی سے دو رقیب قوموں پر مترتب ہوئے۔*

* ابھی کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ "صحیح سیاسی چال اس کو کہتے ہیں" مقابلہ کیجئے موجودہ حالت سے۔ (مترجم)

ہوئے۔ یہ پالیسی اُسی شخص کے ساتھ ختم ہوگئی جس نے اُسکو شروع کیا تھا۔ لیکن مقدر ہوچکا تھا کہ اُس پالیسی کے اثرات بدقومی فتنہ وفساد اور مصایب میں اور بھی بڑھ کر قائم ودایم ہوجائیں[۸]۔

اُن مراحم خسروانہ کے لالچ سے جو افریقی فوج پر مبذول ہوتی رہیں، اُن انعامات کی امید اور لوٹ مار کی توقعات پر جو یہاں حاصل ہوتی رہیں، ہزاروں کی تعداد میں برابر یہاں پہنچ گئے یہی لوگ آخر اس سلطنت عظمےٰ کی شکستگی کے باعث ہوئے منصور کے زمانہ میں قبیلہ کے قبیلہ مال مغروتہ کی امید پر اندلس میں پہنچ گئے۔ شہر اور مضافات شہر کی آبادی پہلے ہی کم نہ تھی، ان خونخواروں کے آنے سے تِل رکھنے کو بھی جگہ نہ رہی، یہاں تک کہ اُن کی چھاؤنی ڈالنے کے لئے بیرُن شہر بھی جگہ نہ نکل سکی لاچار پہاڑوں کے دامن میں اُن کو خیمے ڈال کر رکھنا پڑا۔ اُن کی خوفناک صورت دیکھ کر ہر شخص ڈر جاتا تھا، اُن کے کپڑے اور ان کے ہتھیار عجیب غریب معلوم ہوتے تھے وہ عربی جانتے نہ تھے۔ موری ٹینیا کی زبان اور حلقی اصوات روشن خیال اندلسیوں کے کانوں کو ناگوار ہوتی تھی۔ بڑی بڑی فتوحات کے موقعہ پر جب لوگ خوشیوں میں مدہوش ہوتے تھے، تو کچھ فہمی ہوش آدمی ایسے بھی تھے کہ جوان مخدوش حلیفوں کو دیکھ دیکھ کر کانپے جاتے تھے، لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ منصور کی مسلسل فتوحات کے اصلی باعث بھی یہی بربری تھے۔ اُن کی آمد کا سلسلہ کچھ غیر منقطع سا ہوگیا تھا، اُن کی تعداد تمام فوج سے بڑھ گئی تھی۔ شمالی علاقہ پر چڑھائی کرنے سے پہلے ایک مرتبہ قرطبہ میں فوج کا جایزہ لیا گیا تو چھ لاکھ صرف بربری ہی نکلے تھے۔

قرطبہ کی آبادی میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو منصور کے انتقال کی خبر سُن کر بہت خوش ہوئے*۔ منصور کی خدمات ہزار اچھی ہوں مگر وہ اس گناہ کا کفارہ نہ ہوسکتی تھیں کہ وہ ایک گمنام خاندان کے فرد تھے، اور باوجود اسکے انتہاء عروج پر پہنچ گئے تھے۔ دو گروہوں کی دشمنی، ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے والے تاجروں کا باہمی حسد، عوام الناس کا دولتمندوں سے

---

* کیا کسی کو اس حماقت پر تعجب نہ ہوگا؟ (مترجم)

رشک، غربا کے ساتھ امیروں کی بدسلوکی سب کچھ فراموش ہوگئی، اور ہر شخص فرداً فرداً اس فکر میں لگ گیا کہ اس شخص کے خاندان کو بے عزت کردیں کہ جسکے جوہر دماغی کے طفیل میں مسلمانوں کی اس سلطنت کو غیر معمولی امن و امان، تمول، ترفہ اور شہرت حاصل ہوئی ہے۔ یکایک بلوہ ہوگیا جن لوگوں نے محل شاہی کو گھیر لیا تھا انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ خلیفہ زمام سلطنت خود اپنے ہاتھ میں لے لیں لیکن خلیفہ یہ سمجھتے تھے، اور اس وقت تو انہیں اور بھی یقین ہوگیا کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ سلطنت کا بار گراں اٹھا سکیں، چنانچہ انہوں نے بخوشی خاطر یہ کہدیا کہ میں حقوق سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں۔ مگر فتنہ و فساد بڑھتا ہی چلا گیا۔ فوج کو مدد کے لئے بلانا پڑا، اور مظفر نے اپنے حاجب ہونے کی گویا خوشی میں کئی سو آدمیوں کا قتل عام کردیا۔ گو تھوڑی دیر کے لئے یہ فساد مٹ گیا، مگر لوگ اس ظلم و ستم کو نہیں بھولے، منصور اپنے بستر مرگ پر پڑے ہوئے اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ مصایب ٹلنے والے نہیں ہیں۔ اتنا غنیمت ہے کہ اس بلوہ نے زیادہ طول نہ پکڑا، ورنہ اسکے بہت ہی برے نتایج نکلتے۔ المظفر میں اپنے باپ ہی کی سی فوجی قابلیت تھی، معاملات ملکی میں بھی ان کا دماغ منصور سے کچھ ہی کم کام کرتا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ باپ کے تمام اصولوں پر وہ کاربند تھے۔ ان کے انتظامات کی بہت ہی کم تفصیل تواریخ میں مذکور ہے، مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ بہت ہی ہر دلعزیز اور کامیاب حاکم ثابت ہوئے۔ مگر جو مہمات انہوں نے عیسائیوں کے برخلاف کیں، ان کے وہی نتایج نہیں نکلے جو عادتاً ان کے والد کو حاصل ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک غیر آباد جنگل اور آوارہ گرد قزاقوں پر حملہ کرنے سے نہ کچھ فوائد حاصل ہو سکتے تھے، نہ شہرت و ناموری۔ ان کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ عیسائیوں کی رگ غیرت جوش میں آگئی، اور ان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے بازیافت کی ایک تحریک شروع ہوگئی۔ منصور کی پالیسی کے موافق جو اسراف بیجا، اور فوجی مہمات کا خرچ، بڑھا ہوا تھا اس میں کمی آئی تو جزیرہ نماء اندلس کے کبھی ختم نہ ہونے والے ذرائع سے پھر خزانہ معمور ہونے لگا۔ تجارت، صنعت، حرفت اور زراعت میں وہ ترقی ہوئی جو اب تک

نہ ہوئی تھی۔ مورخین مابعد المظفر کے عہد حکومت کو نہایت افسوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اسکو اسلامی اندلس کا بہترین زمانہ بتلاتے ہیں +

سات برس کی حکمرانی کے بعد المظفر نے انتقال کیا، مگر جس طرح اُن کی موت واقع ہوئی وہ خالی از شبہ زہر خورانی نہیں ہے۔ پہلے ہی یہ انتظام کیا جا چکا تھا کہ اُن کے عہدۂ حجابت پر اُن کے بھائی عبدالرحمٰن مقرر کئے جائیں، عام افواہ یہ تھی کہ اُن کی موت کی وجہ تحریک ہی یہی ہوئی۔ یہ ایک عیسائی شاہزادی یعنی سینکو بادشاہ نوار کی بیٹی، کے بطن سے تھے۔ اُن کے عیوب اور کلمات کفر کی وجہ سے عوام الناس اُن سے ناراض ہو گئے تھے، اور علماءِ دین اُن کو لعنت ملامت کرتے تھے۔ اول الذکر نے محض اس وجہ سے کہ اُن کے نانا کافر تھے اُن کو "سینکی" کا خطاب دیا تھا، جو بطور توہین کے تھا۔ مؤخر الذکر نہایت ذلت و نفرت کے ساتھ اُنکی مے نوشی کا ذکر کرتے تھے، اور اسلام کی مذہبی مراسم کی خلاف ورزی پر اُن کا مذاق اُڑاتے تھے عبدالرحمٰن باوجود اسکے کہ یہ جانتے تھے کہ لوگ اُن کو برا سمجھتے ہیں، مگر وہ لوگوں کے خیالات کی پروا نہ کرتے تھے، اور اس کی کوشش نہ کرتے تھے کہ کسی طرح رعایا کو اپنا گرویدہ اور علماءِ دین کو اپنے سے خوش کریں۔ وہ یہاں تک گستاخ ہو گئے کہ اُنہوں نے خلیفہ ہشام سے یہ درخواست کی کہ اُن کو اپنا ولیعہد تسلیم کر کے رسم بیعت ادا کرا دیں۔ اُنہوں نے خلیفہ پر کچھ مکر و فریب کا جال بچھایا، کچھ دھمکایا کہ اس غیر سیاسی مطالبہ کو پورا کریں۔ آخر ایک دستاویز حسب معمول لکھی گئی جسکے موافق قابل نفرت "سینکی" خاندان بنو امیہ کے جانشین قرار پا گئے +

عبدالرحمٰن کا جانی دشمن بھی ایسی ترکیب نہیں چل سکتا تھا، جیسی کہ اُنہوں نے ایک مظلوم بادشاہ سے یہ رعایت حاصل کر کے خود اپنے پیر میں کلہاڑی ماری۔ یہ جو کچھ ہوا اس سے اگر ایک طرف مذہب کی توہین متصور تھی، دوسری طرف یہ حرکت نمک حلالی کے بھی منافی تھی۔ یہ اگر خلیفۃ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم کی تقدیس پر سخت ترین حملہ تھا، تو دوسری طرف اختیارات شاہی کا کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہونا بادشاہ کی ذات کا نہتک تھا، کیونکہ نمک حلال عوام الناس

کے نزدیک بادشاہ اور اختیارات بادشاہ ایک دوسرے سے غیر منفک تھے سینکی نے ایک اور غضب یہ کیا کہ سپاہیوں کو مجبور کیا کہ وہ خود اتار کر عمامہ باندھا کریں۔ اس سے عوام الناس میں اور بھی ناراضی پھیل گئی، کیونکہ عمامہ علماء دین کے لئے مخصوص تھا، سپاہیوں کو عمامہ بندھوا دینا اس فرقہ کی گستاخی سمجھی گئی۔

عام رائے کی تو انہوں نے پروا کی ہی نہیں، اپنی قوت پر ان کو پورا بھروسہ تھا ہی، اس لئے فوجی نام و نمود حاصل کرنے کے لئے بھی انہوں نے ہاتھ پیر مارنے شروع کئے، چنانچہ لیسٹر پائس پر فوج کشی کر دی۔ اس مہم کے نتائج ان کے خیالات خام کے مؤید نہ نکلے۔ ان دنوں پہاڑوں پہ برف پڑا ہوا تھا، اس سے ان کی فوج کو آگے بڑھنے میں دقت ہوئی، چونکہ سامان رسد رسانی کا کافی انتظام نہیں تھا، لامحالہ قحط اجناس ہوا، فوج کو رجعت کرنی پڑی۔ اس کے واپس آتے آتے قرطبہ میں بغاوت ہوگئی۔ اس کی بنا ایک سازش تھی، جس کے سرگروہ عبدالرحمٰن ثالث الناصر لدین اللہ کے پرپوتے محمد نامی تھے۔ وہ فوج لے کر فصیل شہر پر چڑھ آئے تھے۔ بدقسمت ہشام جو ہر شخص کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتے تھے، تخت چھوڑنے پر مجبور کئے گئے۔ مذہبی لوگوں اور عام رعایا نے تو بادشاہ کی تبدیلی پر بڑی خوشیاں منائیں، اور خوب شور مچایا، مگر اس سے دولتمند اور سمجھ دار لوگ چنداں خوش نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے کھلم کھلا یہ پیشینگوئی کی کہ فوجی قسمت آزماؤں کے ہاتھوں تباہی ہونے والی ہے۔

محمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ زاہرہ کو جا گھیرا۔ خاندان بنو عامر نے جو قلعہ بنایا تھا۔ اس میں غیظ و غضب میں بھری ہوئی رعایا جا گھسی اور اسکو لوٹ لیا۔ چار روز برابر منصور کا خوبصورت محل شہر کے باغیوں اور قزاقوں کے ہاتھ میں رہا۔ جو بنگلوں کی قطار کھجوروں اور نارنگیوں کے درختوں کے جھنڈوں میں، وادی الکبیر کے کنارے تک چلی جاتی تھی اس کا بھی وہی حشر ہوا جو منصور کے محل کا۔ ہر چیز جو وہاں سے اٹھائی جا سکتی تھی، حتے کہ عمارتوں کی لکڑیاں تک لوگ اٹھا کر لے گئے لٹیروں نے اس لوٹ میں جتنا کچھ مال پایا اس کا اندازہ کوئی نہیں

لگا سکتا۔ لیکن محمد کے سپاہیوں نے اپنے آقا کو اکیس لاکھ درم اور پندرہ لاکھ دینار لاکر دیئے۔ اس کے بعد آگ لگادی گئی، تمام شہر زاہرہ اور اسکے مضافات راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ وہاں کے پتھر آہستہ آہستہ کر کے اٹھا کر دوسری عمارتوں میں لگا دیئے گئے۔ چند روز کے بعد زاہرہ پایۂ تخت بنو عامر کا نام و نشان تک مٹ گیا، اور لوگ اسکو بالکل بھول بسر گئے۔

جب اِن واقعات کی اطلاع "سینکی" کو طلیطلہ میں پہنچی تو وہ فوراً اپنی فوج لے کر قرطبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی اُن کا کوچ شروع بھی نہ ہوا تھا کہ اُن کو اپنے غیر ہر دلعزیز ہونے کا تجربہ ہوا، اب تک تو اُن کو اس کا اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ ہر روز اُن کی فوج میں سے سپاہی بھاگ جاتے تھے، جو باقی رہے انہوں نے اُن کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ دارالخلافہ کے قریب پہنچے تو بربر جن پر اُن کو بڑا اعتماد تھا، آدھی رات کے وقت چلتے بنے۔ صبح کے وقت دیکھا تو اُن کے پاس معدودے چند آدمی رہ گئے، جن کی تعداد اُن کے معمولی محافظوں سے بھی کم تھی۔ باوجود اس بدوفائی کے برخود غلط "سینکی" یہ سمجھتے رہے کہ اہالی قرطبہ اُن کی صورت دیکھتے ہی اُن کے ساتھ ہو جائینگے۔ یہی بیہودہ خیالات تھے جو اُن کی تباہی میں ممد و معاون ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کو محمد کی فوج نے فوراً گرفتار کر کے اُن کا سر کاٹ لیا، اور اُن کے جسم کو گودڑ میں لپیٹ کر ایک جگہ لٹکا دیا، اور سر کو ایک نیزہ پر چڑھا کر شہر کے ایسے مقام میں لے جا کر رکھ دیا کہ جہاں آمد و رفت زیادہ تھی۔ سینکی کی موت نے ابو عامر کے خاندان کا خاتمہ کر دیا، جو مدتوں وہاں حکومت کرتا رہا، جنکی پالیسی اہالی ملک پر ایک مسلسل مصیبت لائی، اور جس نے ہمیشہ کیلئے اُن کو تباہ کر دیا۔

منصور نے جو عملی طور پر غصب کیا تھا اُس کے اثرات اب ظاہر ہونے لگے۔ ہر بلند نظر شخص کو یہ شوق پیدا ہوا کہ اُس روشن دماغ شخص کے قدم بقدم چلے جسکی قابلیت نے اُن (منصور) کو انتہاءِ عروج و ناموری پر پہنچا دیا تھا۔

محمد ابھی پوری طرح مسند پر متمکن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ رعایا شہر بڑا اثر

کر دیا۔ فتنۂ انقلاب کا جب ایک مرتبہ یہ لوگ مزہ اُٹھا چکے تھے تو وہ ایسانہ تھا کہ پھر وہ قانونی شکنجہ میں پھنسنا پسند کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے پاس دوسری مرتبہ فساد کرنے کی کافی وجوہ بھی تھیں۔ نئے بادشاہ بے رحم، دست دراز اور آشفتہ مزاج آدمی تھے۔ اُنہوں نے اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ مفسد غلاموں، جاگیرداروں اور رعایا کے سر اُن کے پاس بھیج دیں۔ ان کی کھوپریوں کو صاف کرا کر اُن میں اُنہوں نے پھول بوٹے لگوا کر ان عجیب و غریب گملوں کو اپنے محل کے پائیں باغ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجا دیئے۔ اُن کی عیش پرستی اور مے نوشی سے تمام دربار شاہی چیخ اُٹھا۔ اُنہوں نے علماء دین سے بے طرح بے رخی کی تو اس گروہ کو یہ معلوم ہُوا کہ ان سے تو "سینکی" ہی جیسا بد قماش اور بے دین اچھا تھا۔ محمد نے بربریوں کو ستانا شروع کیا۔ ان لوگوں میں اگرچہ خواجہ سراؤں کے تمام عیوب آ گئے تھے، مگر اتنا تو غنیمت تھا کہ وہ پچیس برس تک حامی سلطنت رہے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں ہشام کو پھر تخت پر بٹھانے کی کوشش نہ کی جائے محمد نے عام طور پر یہ مشہور کر دیا کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایک عیسائی کو، جو خلیفہ کی صورت سے بہت مشابہ تھا، قتل کرا کے اُس کی لاش کو خلیفہ کی لاش ظاہر کیا، اور شاہانہ شان و شوکت سے مراسم تکفین و تدفین ادا کیں۔ ایک کافر پر اسلامی مراسم ادا کرنا مسلمانوں کے نزدیک بدترین بے ادبی تھی غرض محمد سے روز بروز ناراضی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ ایک اور سازش ہوئی، اور الناصر لدین اللہ کے ایک پوتے، ہشام نامی، نے محمد سے اپنے دادا کے تخت کا مطالبہ کیا۔ غاصب نے یہ ظاہر کیا کہ اُن کے لئے وہ تخت چھوڑنے پر تیار ہیں، مگر خفیہ طور سے بربریوں کو بھکا دیا کہ وہ شہر کو لوٹ لیں۔ اس تدبیر میں کامیابی ہوتی نظر آتی تھی، مگر جیسے ہی تاجروں نے ان افریقیوں کو دیکھا وہ اُن کے برخلاف شمشیر بکف ہو گئے، اور شاہی محافظین فوج کی مدد سے اُن کو شہر سے نکال دیا۔ اس دار و گیر میں تخت ہشام کے دعویدار ہشام بھی پکڑ کر قتل کر دیئے گئے۔

ان ہشام کی جگہ خاندان بنو امیہ کے ایک اور شاہزادے سلیمان نامی نے خروج کیا۔ اس شخص نے نواب قستالہ سے رسل و رسایل کی؛ انہوں نے اس شرط پر کہ کچھ علاقہ ان کو دے دیا جائے، سوار و پیادہ فوج سے مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ادھر بربر بھی اپنی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ تیار ہوئے۔ انہوں نے دارالخلافہ پر حملہ کر دیا۔ کینٹچ[x] کے میدان میں لڑائی ہوئی؛ قرطبہ کے محض شور و شغب مچانے والے غیر قواعد دان آدمی افریقیوں کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے۔ محمد کے دس ہزار آدمی بربریوں نے اپنی تلوار کی گھاٹ اُتار دیئے، اور ہزاروں آدمی وادی الکبیر میں ڈوب گئے۔ یہ حالت دیکھ کر محمد تخت سے دست بردار ہو گئے، اور خلیفہ ہشام بن امیر المومنین الحکم کو، جن کی لاش وہ دفن کر چکے تھے، پھر تخت پر بٹھا دیا؛ اور ان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اہالی قرطبہ نے بربریوں کو شہر کے اندر داخل کر لیا اور سلیمان نے خلفاء کے محل پر قبضہ کر لیا ؛

اسکے بعد جزیرہ نمائے اندلس کی تاریخ فتنہ و فساد، اختلال و انحطاط، تباہی و بربادی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہر ایک صوبہ اور ہر ایک پورا دو عملی کی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا؛ دو مخالف گروہوں کے عناد میں رعایا پسی چلی جاتی تھی۔ روز خون ریزی اور ظلم و ستم کے تماشے سب جگہ نظر آتے تھے۔ عیسائی اجیر دونوں فریق کے ساتھ ہو کر لڑتے تھے، اور ان کو دشمنوں کے لوٹ کے مال سے تنخواہ ملتی تھی۔ دہاقین کو بے رحمی کیساتھ لوٹا اور قتل کیا جاتا تھا۔ اہالی قتلونیہ اور بربر اور خود شہر کے بدمعاشوں نے قرطبہ کو خوب لوٹا۔ محاصرہ کے موقعہ پر جو مصایب قحط و وبا کے پڑتے ہیں وہ سب ہی تو دارالخلافہ کو برداشت کرنے پڑے۔ ادھر تو قرطبہ پر یہ مصیبت نازل تھی ادھر مدینۃ الزہراء پر وحشی خونخوار بربریوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کی چہاردیواری کے اندر جتنے جاندار تھے سب کو ذبح کر دیا گیا۔ وہ شاہ نشین مقام جسکی تعمیر میں چالیس برس تک عبدالرحمٰن اور الحکم نے بے دریغ بیت المال کا روپیہ خرچ کیا، بالکل

---

[x] CANTICH

تباہ ہو گیا*۔ خزانہ خالی تھا۔ خلیفہ ہشام (جو پھر خلیفہ بنا دیئے گئے تھے) کے گورنر شہر قرطبہ واضح نامی نے مجبوراً امیر المومنین الحکم کے بقیہ کتب خانہ کو فروخت کر دیا۔ تاکہ کسی طرح فوج کی تنخواہ کا تو انتظام کیا جا سکے۔ آخر بربریون نے بزور شمشیر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اہالی شہر کا جو میلان ہمیشہ بغاوت کی طرف رہتا تھا اس کا انھوں نے خوب خمیازہ اٹھایا؛ وہاں بہت ہی بری طرح قتل عام کیا گیا؛ وہ خاندان جنکی دولتمندی مشہور تھی، چند ہی گھنٹوں کے اندر مفلس قلاش ہو گئے؛ نالیوں میں انسانوں کا خون بہا؛ گلیاں لاشوں سے پٹ گئیں؛ وہ علماء مشاہیر جو انقطاع عالم سے اندلس میں کھچ آئے تھے؛ ایک ایک کر کے مارے گئے۔ فاتحین کے وحشیانہ جذبات نے نہ رحم کی پروا کی، نہ پالیسی کا خیال رکھا، نہ مذہب کا احترام کیا۔ عورتوں اور بچوں کو یا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، یا گھوڑوں کے ٹاپوں میں روند ڈالا۔ ہزاروں غربا، جنہوں نے ہانپتے کانپتے مسجدوں میں پناہ لی تھی، قتل کر دیئے گئے۔ حرم سراؤں کی سخت بے رحمی کے ساتھ بے حرمتی کی گئی، اور جذبات شہوت مٹائے گئے۔ جو محل کہ بلند نظر، مغرور اور دولتمند امراء نے بنائے تھے سب راکھ کے ڈھیر ہو گئے۔ سلیمان نے تخت پر بیٹھتے ہی ایک فرمان جاری کیا۔ جس کے موافق ان لوگوں کی بھی جائدادیں ضبط کر لی گئیں، جو اب تک نسبتاً مصائب سے محفوظ رہ گئے تھے؛ اور مالکان جائداد کو جلا وطن کر دیا گیا۔ وحشی خونخوار افریقیوں نے یورپ کی تہذیب کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ چند ہی مہینوں میں سلطنت کا وہ تار و پود جو بڑے بڑے روشن دماغ بادشاہوں نے بمشکل تمام دو سو برس کے عرصہ میں بنا یا تھا، خاک میں مل گیا۔ محلات شاہی پر ان وحشیوں نے قبضہ کیا؛ جو معدودے چند محل باقی رہ گئے تھے ان کے پر تکلف اور باشان و شوکت کمروں کو ان خونخواروں نے اپنے قدموں سے ناپاک کیا؛ بڑے بڑے باغوں کو، جس پر یہ اسلامی تختگاہ بجا طور پر ناز کرتا تھا، ان تباہ کن درندوں نے گندہ کر دیا۔

---

* من از بیگانگان ہرگز ننالم ؛ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد ؛ (مترجم)

سلطنت کے شقاق کی اب یہ کیفیت تھی کہ وہ صبح کچھ تھی تو شام کو کچھ، دیکھتے دیکھتے اُس کے ٹکڑے اُڑے چلے جاتے تھے۔ بربادی سلطنت کے لئے دو گروہوں نے گویا اُدھار کھا یا ہوا تھا؛ دونوں اپنے اپنے دشمنوں کو تباہ کرنے کے لئے عیسائیوں سے مدد لیتے تھے کچھ عرصہ تو اُن کی خوشامدیں مانی جاتی رہیں، لیکن بعد میں ہر درخواست امداد کے ساتھ وہ علاقے مانگے گئے جہاں کے قلعے خلافت کے سرحدی صوبوں کے باعث حفاظت تھے۔ جیسے جیسے اُس فریق کے مصایب بڑھتے گئے، جس کے برائے نام سرپرست خلیفہ ہشام تھے، ویسے ویسے شاہان لیون اور قستالہ کے مطالبوں میں اور بھی شدت آتی چلی گئی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کاونٹ آف کسٹائل نے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ قلعے، جن کو منصور نے چھینا، اور از سر نو مرتب کیا تھا، اُن کے حوالہ نہ کر دیئے گئے، تو وہ بربریوں سے مل جائیں گے اور اپنی تمام فوج اُن کی مدد پر بھیج دینگے۔ حکومت قرطبہ کی کمزوری و بزدلی و بدنی ہے کہ اس نے مجبور ہو کر یہ شرمناک رعایت دے دی۔ بہت سے قلعہ بند شہروں سے، جن کو منصور کے جنگ آزمودہ سپاہیوں نے اپنی شجاعت و بسالت سے لیا تھا، افواج محافظ کو ہٹا لینا پڑا، جن کو دیکھ کر لیون اور نوار جیسے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے بھی ایسے ہی پیغام قرطبہ میں بھیجے۔ نالایق واضح، جو خلیفہ کی طرف سے گویا بادشاہ بنے ہوئے تھے، ان جھوٹی دھمکیوں سے کچھ ایسے ڈرے کہ اُنہوں نے قرطبہ کو بچانے کے لئے سرحد کے تمام قلعے، جو اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں تھے، جلدی جلدی کر کے، عیسائیوں کے حوالہ کر دیئے۔ اس میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ عیسائیوں نے بغیر ہاتھ پیر ہلائے، ایک تلوار بھی میان سے نکالے، یا معاوضہ میں کوئی علاقہ دیئے، وہ تمام علاقے لے لئے جو اُن کے باپ دادا کی ہمت و استقلال بھی اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکی تھی۔

سلیمان کے قرطبہ پر قبضہ ہونے سے یہ نہیں ہوا کہ باقی شہر بھی، جو امیر المومنین کے قبضہ میں تھے، اُن کے مطیع ہو جاتے۔ بربریوں کی زیادتیوں، اور قابل نفرت کفار قستالہ سے استمداد،

نے تمام ملک کو اُن کے خلاف کردیا۔ حکام و عمال شاہی کے زنانہ پن سے علاقۂ شمالی کے تمام قلعے ہاتھ سے نکل گئے۔ صوبہاء مشرقی و مغربی کے صوبہ داروں نے اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ ہزاروں سرسبز و مرفہ الحال گاؤں بالکل برباد ہو کر رہ گئے؛ جن میدانوں میں کہ کھیت لہلہا رہے تھے۔ اُن کی وہی صورت ہوگئی جو زمانہ امارت کی خانہ جنگیوں میں ہوگئی تھی۔ تباہی کامل کی یہ کیفیت تھی کہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص قرطبہ سے شمال کی طرف سفر کرتا تو کئی کئی روز تک اُسکو انسان کی صورت نظر نہ آتی تھی ؞

جب سلیمان کے جانشین، علی، دار الخلافہ میں پہنچے تو اُنہوں نے خلیفہ ہشام کی ہر جگہ تلاش کرائی مگر کہیں پتہ نہ لگا۔ جس لاش کو محمد نے ہشام کی لاش کہکر دفن کیا تھا، وہ تک اُکھاڑی گئی، مگر معلوم ہوا کہ وہ اُس بد قسمت بادشاہ کی نہ تھی۔ باوجود سخت تحقیقات کے بھی یہ پتہ نہ لگا کہ آخر اُس بادشاہ کا کیا انجام ہوا۔ خاندان وزیگاتھ کی آخری یادگار اور خاندان بنو اُمیہ کے تاجدار کا بالکل یکساں انجام ہوا؛ دونوں کا کچھ پتہ نہ لگا۔ دونوں کے آباؤ اجداد نہایت باشان و شکوہ بادشاہ تھے؛ اور یہ دونوں اپنے اپنے خاندان کے ناخلف اور بدنام کنندۂ نکو نامے چند تھے۔ ایک نے اپنی جان اور اپنا تاج بلاواسطہ اپنے ہی ظلم و ستم سے کھویا؛ دوسرے نے اپنا تخت بالواسطہ اپنے ہی عزیز کی زیادتی اور اپنے ناشکرے وزیر کی وجہ سے ضائع کیا۔ دونوں نمک حرامی کا شکار ہوئے؛ دونوں آخری مصیبت کے دوران میں گم ہو گئے۔ جب بربریوں نے دار الخلافہ کو تباہ کیا ہے تو اُس کے بعد ہشام کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک بیہودہ سی روایت یہ ہے کہ جس وقت شہر میں فتنہ و فساد برپا تھا تو وہ ایشیا کی طرف بھاگ گئے۔ لیکن غالب خیال یہ ہے کہ وہ دوران حملہ میں مارے گئے؛ اُن کی لاش کو کوئی پہچان نہ سکا اور اُن کو اور ہزاروں گمنام لاشوں کے ساتھ کسی گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ اُن ہی کے ساتھ خاندان بنو اُمیہ کا ترفہ، آسودہ حالی اور شان و شوکت قبر میں گیا۔ اُس کے بعد خلافت مغربی پارہ پارہ ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگئی؛ جو عیسائیوں کا ایسا لقمۂ تر تھی کہ وہ اُس کو

(الف)

تعلیقات باب چہاردہم

(۱) کارٹیا = .CARTEYA انتہاء حدود سپین کا ایک شہر دریاء گیڈس پر واقع ہے۔ غالباً یہی مقام آج کل کیپلپے کہلاتا ہے ۔ (مترجم)

(۲) تورروش = .TORROX غالباً یہ مقام اب موجود نہیں ہے۔ ورنہ کہیں تو اس کا ذکر ہوتا ۔ (مترجم)

(۳) جیریز = .JEREX اندلوشیہ کا ایک شہر ہے۔ یہاں کی شیری (شراب کی ایک قسم) زمانہ بعید سے مشہور چلی آتی ہے بلکہ یہیں سے منسوب ہے ۔ (مترجم)

(۴) ریوڈا = .REUDA اس مقام کا پتہ نہیں لگتا ۔ (مترجم)

(۵) سین ایسٹی وان .ESTEVAN ایضاً ۔ (مترجم)

(۶) کوریا = .CORIA ایضاً ۔ (مترجم)

(۷) مدینہ سیلی = .MEDINA CELI مجھے اس مقام کے حالات نہیں ملے۔ اور ملتے بھی کیوں؟ منصور یہیں دفن ہوئے تھے۔ عرب اس کو مدینہ سالم کہتے تھے ۔ (مترجم)

(۸) مصنف علام نے اس جلیل القدر رفیع الشان شخص کے حالات کو یہاں ختم کر دیا ہے۔ یقیناً یہ بہت کچھ تشنہ ہیں، مگر کتاب کے موضوع کے موافق اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں کسی طرح کا کلام نہیں کہ منصور اسلام کے اُن فرزندوں میں سے ہیں جن کے حالات نہایت فخر و مباہات کے ساتھ ہر مسلمان کے نوک زبان ہونے چاہئیں۔ اگر کوئی مسلمان اس طرف توجہ کرے تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر احسان کریگا۔ لے دے کر مولوی عبدالرزاق صاحب صاحبِ لبرامکہ و نظام الملک طوسی پر نگاہ جاتی ہے، کیونکہ ممدوح نے سلسلہ وزراء لکھنے کا قصد فرمایا ہے کئی برس ہوئے ہیں نے اُن کو اس کے متعلق لکھا تھا؛ لیکن ممدوح نے اس طرف توجہ فرمانا تو کجا جواب دینے کی بھی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ مشاہیر کو مجھ جیسے گمنام و ناقابل کو مخاطب کرنا گونہ ہتکی ہے۔ اس لئے مجھے اس کی شکایت نہیں ۔

بہرکیف اپنے ناظرین کرام کی اطلاع کے لئے یہ گزارش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مقری نے نفح الطیب میں منصور کے حالات کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے مگر باوجود اس کے وہ فرماتے ہیں کہ "منصور رحمہ اللہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ اس مختصر میں سما سکیں۔ اس کے لئے بڑی بڑی مجلدات کی ضرورت ہے" لیکن اگر وہ اس کو ملاحظہ فرمائینگے تو بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہونگی۔ سردست مجھے بطور تتمہ دو چار باتیں عرض کرنا ہیں۔

"ملک الاعظم المنصور ابن ابی عامر محمد بن عبداللہ بن عامر بن ابی عامر بن ولید بن یزید بن عبدالملک المعافری" (ملاحظہ ہو ابن سعید) کے حالات پڑھ کر خیال ہوگا کہ انہوں نے عیسائیوں پر سخت ظلم و ستم کئے ہیں، اس لئے وہ ظالم ہیں، اور اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کو ان سے ہمدردی ہو۔ میں رفع دخل کے لئے بہت سے واقعات میں سے چند ذیل میں درج کرتا ہوں :-

مقری کہتے ہیں کہ "شنت یاقو میں صرف ایک راہب یعقوب رسول کی قبر پر بیٹھا ملا۔ اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں قبر شریف کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ منصور کے حکم سے اس پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کی گئی۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "یہاں (شنت یاقو) کی عمارات خوبصورت اور مضبوط تھیں، مگر اس طرح تباہ کی گئیں کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا، فصیل شہر اور گرجا تمام گرا دیئے گئے اور ان کے آثار تک نہ چھوڑے۔ البتہ یعقوب رسول کی قبر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ قبر پر آدمیوں کو حفاظت کے لئے مقرر کر دیا کہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔" ان باتوں کو عیسائیوں نے صاحب قبر کا معجزہ بتلایا ہے، اور علامہ سکاٹ نے منصور کے حلیفوں کا خوف کہا ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر منصور کو عیسائیوں کے مذہبی خیالات کی عزت برداشت بھی ہوتی۔ تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا تھا؟

مسٹر برنارڈ اور مسٹر وشلے نے اپنی قابل قدر کتاب "عربک سپین، ہسٹری اینڈ آرٹ" میں ایک باب باندھا ہے "المنصور اور عیسائی" اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ منصور ان عیسائیوں کے خلاف مسلسل مہمات بھیجتے رہے جو مسلمانوں کی حدود پر حملہ کر چکے تھے، اور گو ان میں سے اکثر مہموں کی قیادت وہ خود کرتے رہے لیکن کیا بحیثیت افراد اور کیا بحیثیت جمعیت و قومیت، منصور کا برتاؤ عیسائیوں سے نہایت فیاضانہ رہا ہے

عیسائی مورخین اس کو خود تسلیم کرتے ہیں۔ . . . . چنانچہ ان ہی عیسائیوں کی بتلائی ہوئی چند مثالیں ہم درج کرینگے ۔"

اس کے بعد وہ یہ صحیح اصول قائم کرتے ہیں کہ "جب مسلمان اور عیسائی مورخین معاملہ زیر بحث (یعنی مسلمانوں کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ) میں مختلف الراء ہوں تو عیسائیوں کی تحریر کو مستند سمجھنا چاہیئے ۔"

موصوفین لکھتے ہیں کہ "اسپاآن سیگرینڈا" نے محاصرہ لیون واقعہ ۹۸۴ئہ میں لکھا ہے کہ "المنصور کے اخلاق، ہر سپاہی سے اچھا برتاؤ کرنے اور بہت کچھ دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے "برے عیسائی" اپنے قومی مذہبی مقاصد کو چھوڑ کر ان کے علم کے نیچے جا پہنچے، اور اس میں انہوں نے کچھ شرم نہیں کی ۔"

اسی کتاب کے حوالہ سے موصوفین لکھتے ہیں کہ "ایک موقعہ پر اپنے فتوحات کے سلسلہ میں منصور "مقدس شہدا" سینٹ کلوڈیو وغیرہ کے گرجا، واقعہ لیون، سے گزرے۔ اس گرجا میں شادیاں بہت ہوا کرتی تھیں، چنانچہ اس روز بھی بارہ عیسائی امرا کی شادیاں ہونے والی تھیں منصور کو اس کی اطلاع ملی تو وہ گرجا کی طرف اس نیت سے آئے کہ سب کچھ تباہ کر کے ان بارہ معاقدین کو قید کر کے لے جائیں۔ لیکن ایک عجیب معجزہ ہوا کہ جس کی وجہ سے انہیں اپنے ارادہ سے باز رہنا پڑا، یعنی گرجا کے دروازہ پر پہنچ کر یکایک ان کا گھوڑا مر گیا۔ منصور نے پوچھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ جب ان کو معلوم ہوا کہ شادیاں ہو رہی ہیں تو وہ اہالی لیون کی دینداری سے اتنے مرعوب ہوئے کہ وہ اپنی نیت فاسد سے باز رہے اور وہاں کچھ پردے اور کچھ چادریں نذر دے کر واپس چلے آئے . . . . اس چڑھاوے کا ذکر اس گرجا کی تاریخ میں ہے، اور ان میں سے بارہ قیمتی چادریں آج تک سینٹ کلاڈیو میں موجود ہیں ۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر منصور کی نیت بد اور ان کے گھوڑے کے مرجانے کے معجزہ کو عیسائیوں کی ایجاد بندہ سمجھ کر حذف کر دیا جائے تو منصور اصلی صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ "ترکش مارا خدنگ آخریں" "حضرت عالمگیر اعظم کے کئے دھرے پر ہندوستان میں بھی اسی طرح سفیدی پھیری جاتی ہے، چنانچہ آج بہت کم حضرات اس سے واقف ہیں کہ بہت سے مندروں کے لئے اسی مزعومہ "بت شکن" نے معافیاں عطا فرمائی ہیں، اور کچھ ایسی نیک نیتی سے یہ عطیہ دیا ہے کہ وہ باوجود ہزارہا مقامات

پڑ جانے کے اب تک بحال چلی آتی ہیں۔

میں ابھی علامہ مقری کے حوالہ سے (جس کے مؤید ابن حیان ہیں) لکھ آیا ہوں کہ یعقوب رسول کی قبر کو منصور نے نقصان نہیں پہنچایا مسٹر برنارڈ اور مسٹر وشا ایک دیندار عیسائی مورخ میزیانا کی تحریر کا اقتباس کرتے ہیں۔

"یہ مورخ کہتا ہے کہ حالات نہایت افسوسناک تھے' اور مذہب مسیحی کی سخت توہین کی گئی تھی جلیقیہ کی حالت حملوں اور وحشی سپاہیوں کے ہتھیاروں سے بہت ہی بری ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ شہر کمپوسٹلا بھی لے لیا گیا اور سینٹ یاگو کی ایک دیوار گرا دی گئی مگر ان لوگوں نے رسول کی قبر کو نہیں چھیڑا۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ منصور کو ایک شخص نے یہ بتلایا کہ حضرت عیسےٰ ابن مریم (علی نبینا و علیہم السلام) کے ایک حواری یہاں دفن ہیں' تو وہ قبر اکھاڑنے سے رک گئے۔"

اگر میریانا کا یہ قول صحیح ہے تو (بقول علامہ مقری) شنت یاقو کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائی گئی۔ موصوفین نے ایک بات نہایت معقول لکھی ہے' جس پر ہر معقول پسند کو غور کرنا چاہئیے وھو ہذا:۔

"یہ ہر صورت میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ المنصور عیسائیوں سے بہت ہی اچھی طرح پیش آتے تھے اس کو دیکھتے یہ قصہ جو اکثر بیان کیا جاتا ہے' سخت مشکوک ہوجاتا ہے کہ انہوں نے سینٹ یاگو سے پکڑے ہوئے عیسائی قیدیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے گرجا کے گھنٹوں کو اپنی کمروں پر لاد کر سینٹ یاگو سے قرطبہ پہنچائیں۔ ابن حیان صاف طور پر کہتے ہیں کہ جب منصور سینٹ یاگو پہنچے ہیں تو وہاں سے تمام آدمی بھاگ چکے تھے اگر یہ صحیح ہے تو وہاں اتنے قیدی کہاں سے آئے کہ ان کی کمروں پر گرجا کے گھنٹے لادے گئے۔ یوں یہ قصہ ہی غیر اغلب ہوا جاتا ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک طرف تو اتنا فیاض اور فراخ دل ہو کہ ایک عیسائی ولی کی قبر کا احترام کرے' اور اپنے عیسائی غلاموں کے مذہبی جذبات اور جسمانی راحت کا خیال رکھے (منصور خود یکشنبہ کے دن تعطیل رکھتے تھے تاکہ ان کے عیسائی غلام بھی نماز پڑھ اور آرام پا سکیں) دوسری طرف وہی شخص عورتوں اور بچوں کا قتل عام کرے' ان کے گھر لوٹے اور گرجاؤں کو تباہ کرے۔"

یہ دلیل اتنی قوی ہے کہ علامہ مقری اور ابن حیان کے قول کو اس کے مقابلہ میں بہت احتیاط سے قبول کرنا چاہئیے

اب لیجئے وہ سلوک جو منصور کا عیسائی افراد کے ساتھ تھا۔

"مصنفین موصوفین لکھتے ہیں کہ :-

"۹۹۵ء یا ۹۹۶ء میں منصور نے گارشیا ابن سینکو کو گرفتار کیا تو وہ ایسے زخمی تھے کہ باوجود منصور کے علاج معالجہ کرانے اور ہر طرح کی خبرگیری کرنے کے اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُنہوں نے حکم دیا کہ بادشاہ موصوف کی لاش ایک منقش صندوق میں رکھی جائے، اُس پر ایک قیمتی زرکار سرخ چادر ڈالی جائے اور خوشبوئیں جلائی جائیں، اور پھر عیسائیوں کے حوالہ کردی جائے۔ گارشیا کے دربار کے ارکین اُن کو اس لاش کے بدلے میں بہت کچھ دینا چاہتے تھے، مگر منصور نے ایک حبہ تک نہیں لیا۔"

جب منصور کے بیٹے عبدالملک نے افریقیہ میں فتح پائی ہے تو اُس کی خوشی میں منصور نے جہاں اور فیاضیاں کی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی کیا کہ شکرانۂ الٰہی میں اُنہوں نے تین سو عیسائی عورتوں کو، جو قید تھیں، آزاد کردیا۔

علامہ ڈوزی نے راہب سائولوس کا قول لکھا ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان اور عیسائی کا کوئی تنازعہ ہوتا، اور مقدمہ منصور تک پہنچتا، تو وہ ہمیشہ عیسائی کی حمایت کیا کرتے تھے۔

امید ہے کہ ناظرین کو اب اُن کی طرف سے تسکین ہو جائیگی۔ مقابلہ کیجئے منصور کی اس مسامحت کا عیسائی راہبوں کے اس قول سے کہ "منصور فی النار ہوا، اور وہ اب بھی جہنم میں عذاب پا رہا ہے۔"

علامہ مقری نے لکھا ہے کہ "المستعین بن ہود کا غلام کہتا ہے کہ جب میں شاہ اذفونش کے پاس مدینہ سالم میں گیا تو میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنا تخت منصور کی قبر پر بچھا رکھا ہے، اور اُس کی بیوی تکیہ لگائے ہوئے اُس کے پاس بیٹھی ہے۔ اذفونش نے مجھ سے کہا کہ "اے شجاع! تو دیکھتا ہے کہ میں نے مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرلیا ہے، اور میں اُن کے ایک بادشاہ کی قبر پر بیٹھا ہوں۔" یہ سُن کر مجھے غیرت آئی، اور میں نے کہا کہ "اگر کہیں یہ شخص سانس لینے لگے تو تیری زبان سے کبھی ایسی بات نہ نکلے جو اُس کو ناگوار ہو۔" یہ سُن کر اُس نے مجھے مارنے کا قصد کیا؛ مگر اُس کی بیوی میرے اور اُس کے درمیان میں حائل ہوگئی، اور مجھ سے کہنے لگی کہ "تو سچ کہتا ہے،" اور اپنے شوہر سے کہا کہ "کیا تو ایسی ہی حرکات سے منصور جیسے آدمی پر فخر کرسکتا ہے؟"۔

یہ ہیں ان لوگوں کے اخلاق جو منصور جیسے آدمی کو فی النار کر رہے ہیں۔

بقول علامہ مقری کے "منصور صفائی باطن، اپنے گناہوں کے اعتراف، خوف الٰہی اور کثرت جہاد میں مشہور ہیں۔ اُن کے سامنے خداء تعالےٰ کا ذکر کیا جاتا تھا تو وہ متاثر ہو جاتے تھے۔ عذاب الٰہی سے ڈرائے جاتے تھے تو کانپ اُٹھتے تھے۔" جس شخص میں یہ صفات ہوں ممکن نہیں کہ اُن کو ذرہ نواز ستار العیوب غفار نہ بخش دے۔ لیکن کیا یہ ناشکری نہ ہوگی کہ ہم اُن کے لئے دعاء مغفرت نہ کریں، اُن کے کارناموں کو یاد نہ رکھیں اور اُن کے ذلات سے، اگر کچھ ہوں، تو چشم پوشی نہ کریں؟

ذیل میں ہیں منصور کی قبر کا کتابہ لکھتا ہوں جو نہ صرف اُن کے کارناموں پر ریویو ہے بلکہ زمانۂ آیندہ کے لئے پیشینگوئی ہے۔ یرحم اللہ علی قائلہ:—

آثاره تنبيك عن اخباره — حتّٰى كانك بالعيان تراه

تالله لا ياتى الزمان بمثله — ابدًا ولا يحمى الثغور سواه
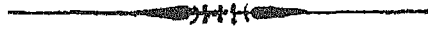
ہفتم کر گئے مسلمانوں نے باوجود تجربہ کار ہونے کے سب کچھ کھویا' اور عیسائیوں کو
کے تجربہ نے یہ سکھلایا کہ اتفاق و اتحاد سے سب کچھ مل سکتا ہے ✽

بِهٰذَا تَمَّتْ جُزْءُ الاَوَّل اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلاً وَّ اٰخِرًا

اَلَسْنَا بَنِی مَرْوَان کَیْفَ تَبَدَّلَتْ
بِنَا الْحَالُ اَوْ دَارَتْ عَلَیْنَا الدَّوَائِرُ
اِذَا وُلِدَ الْمَوْلُودُ مِنَّا تَهَلَّلَتْ
لَهُ الاَرْضُ وَاهْتَزَّتْ اِلَیْهِ الْمَنَابِرُ

(محمد بن عبد الملک بن الناصر لدین اللہ)

وَلَمَّا دَعَوْتُ الصَّبْرَ بَعْدَكَ وَالْاَسٰی

اَجَابَ الْاَسٰی طَوْعًا وَّلَمْ یُجِبِ الصَّبْرُ

فَاِنْ یَنْقَطِعْ مِنْكَ الرَّجَاءَ فَاِنَّهٗ

سَیَبْقٰی عَلَیْكَ الْحُزْنُ مَا بَقِیَ الدَّهْرُ